تاریخ کے قاتل

یعنی

دارالعلوم دیوبند سے شائع شدہ غیر معتبر کتاب

"دارالعلوم دیوبند کی جامع و مختصر تاریخ"

کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

مصنف

ابو عکاشہ رحمٰن

تاریخ کے قاتل

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
(فیض احمد فیض)

یعنی

دارالعلوم دیوبند سے شائع شدہ غیر معتبر کتاب

"دارالعلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ"

کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

مصنف

ابو عکاشہ رحمن

abuukasharahman@gmail.com

حق طباعت غیر محفوظ

تفصیلات

کتاب کا نام : تاریخ کے قاتل

مصنف : ابوعکاشہ رحمٰن

کمپوزنگ : نظام گرافکس، مہدی پٹنم، حیدرآباد

صفحات : 860

تعداد : دوہزار(۲۰۰۰)

طباعت : اے پی آفسیٹ پرنٹرس، حیدرآباد

سن اشاعت : جنوری ۲۰۱۹ء

ملنے کے پتے

ہندوستان پیپر امپوریم، مچھلی کمان حیدرآباد، دکن ٹریڈرس مغل پورہ حیدرآباد

فرید بک ڈپو دہلی، عبدالسلام قاسمی، محمد علی روڈ ممبئی

انتساب!

دارالعلوم دیوبند کی اُس عظمت کے نام جس کے وقار کو سیاسی لیڈر کے انسلاک اور موجودہ صاحبِ اقتدار افراد کی فریب کاریوں نے بٹّہ لگا دیا ...

مآلِ جذب و جنوں جو بھی ہو خدا کے سپرد
وفورِ شوق میں تیغوں پہ رکھ دیئے ہیں گلے
(مولانا عامر عثمانی)

وجہِ تصنیف

اس کتاب کو تحریر کرنے کا مقصد کسی شخصیت سے عناد، کسی بزرگ سے بغض کسی مومن بھائی سے ذاتی پرخاش نہیں ہے اور خدائے عالم الغیب خوب جانتا ہے کہ ہمارے قلب میں احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی تڑپ کے سوا کسی بھی چھوٹی یا بڑی شخصیت کے لیے ذرہ برابر عداوت و کبیدگی کا شائبہ تک نہیں ہے، اسی لیے ہم اپنے اللہ سے اُمید رکھتے ہیں کہ ہماری نادانستہ کوتاہیوں اور لغزشوں کو اپنی لامحدود رحمت و مغفرت سے نوازے گا۔ اور اگر حق بیانی کے ساتھ ساتھ تحریک اقامتِ دین کی کوئی خدمت ایک ناکارہ اور عاصی و خاطی کے قلم سے اُس قادرِ مطلق نے انجام دلوادی ہے تو یہ اس کا فضل و احسان ہے جس کے تشکر میں ہم اُس سے اِس کے سوا کچھ نہیں مانگتے کہ اے اللہ! ہمیں اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق دے! اپنی محبت سے نواز! اپنے لیے جانوں اور مالوں اور تمام دنیاوی منفعتوں سے گزر جانے کی ہمت عطا کر! ہمارے دلوں میں وہ سوز بھر دے کہ بس تیرے ہی لیے جئیں، تیرے ہی لیے ہماری ساری طاقتیں اور صلاحیتیں مصروفِ عمل ہوں اور تیرے ہی لیے ہمارا مرنا ہو، خواہ گھر کی چار دیواری میں یا زنداں کے پتھریلے فرش پر، یا دار و رسن کے امتحان میں یا سنگینوں اور گولیوں کی باڑھ پر۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ۚ وَ بِذٰلِکَ اُمِرْتُ. (سورۂ انعام، پارہ:۸، رکوع ۲۰)

ترجمہ: کہہ دو کہ: ’’بیشک میری نماز، میری عبادت اور میرا جینا مرنا سب کچھ اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے ﴿۱۶۲﴾ اُس کا کوئی شریک نہیں، اِسی بات کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔‘‘

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

”تاریخ کے قاتل“

”دارالعلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ“ کے نام سے جو کتاب دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اور شوریٰ کے ممبران کی تصدیق کے بعد شائع ہوئی ہے اس میں کتاب کے مرتب نے تاریخ کے ساتھ وہ وحشیانہ سلوک کیا ہے کہ اسے ”تاریخ سے کھلواڑ“ کا عنوان دینا بات کو ہلکا کرنے کے مترادف ہوگا۔ فاضل مرتب نے تاریخ کو نہ یہ کہ صرف مسخ کیا ہے؛ بلکہ کہا جائے تو تاریخ کو قتل کر دیا ہے؛ بلا شبہ کتاب کے مرتب کے ساتھ ساتھ اس کو شائع کرنے کی اجازت دینے والے دارالعلوم کے ذمہ داران بھی تاریخ کے قاتل ہیں۔

”قیمتی دستاویز اور تحقیقی سرمایہ“

آپ کے ہاتھوں میں موجود یہ کتاب کوئی معمولی کتاب نہیں ہے؛ بلکہ ایک قیمتی دستاویز ہے جو آنے والی نسلوں کے لیے حق وصداقت کی ایسی بنیاد ثابت ہوگا جس پہ آئندگان اپنے روشن مستقبل کی تعمیر اُٹھا سکیں گے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد بے جا شخصیت پرستی اور غلو آمیز عقیدت کے اندھیروں سے نجات مل جائے گی۔

یہ کتاب ایک تحقیقی سرمایہ بھی ہے؛ کیونکہ اس میں ہم نے ایسا ایسا تحقیقی مواد جمع کر دیا ہے، جسے پڑھنے کے بعد آپ کے قلوب و اذہان میں پھیلی ہوئی کم علمی کی تاریکی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دُور ہو جائے گی۔ بلا شبہ کتاب کے اندر پیش کی گئی مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی و تحقیقی تحریریں ایسی اَنمول متاع ہیں کہ جنھیں پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے، علمی تحقیق اور صدائے حق کیا شے ہے۔ اب آپ یہ کتاب پڑھیے اور ہو سکے تو اپنے اندر سچائی کو قبول کرنے اور سچ بولنے کی ہمت پیدا کیجیے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

......❖......

دارالعلوم کی جدید تاریخ مرتّب کرنے والے فاضل مرتب کی نذر
ایک شعر

کوئی بھی بات دیانت سے کیوں نہیں لکھتے
ضمیر بیچ کے تم نے قلم خریدا کیا؟

فہرست عناوین

مفکر ملّت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں معروف اور معتبر علماء کرام کا اظہارِ خیال

ملّت فروش کا پوسٹ مارٹم (ازقلم: صادق صابری)

علمائے دیوبند اور جماعتِ اسلامی کے اختلاف کا قضیہ (مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ)

ساتواں و آٹھواں باب

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا مرغوب الرحمٰن کے نام

مکالمۃ الصدرین

دارالعلوم اور اہلِ دیوبند

دارالعلوم دیوبند میں ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء کے جلسۂ تقسیم اسناد میں حضرت مولانا قاسم نانوتوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تقریر کے دوران دارالعلوم کے قیام واستقلال کا ذکر ذیل کے الفاظ میں فرمایا تھا:

''سب نزدیک و دُور کے رہنے والے جانتے ہوں گے کہ اس مدرسے کی بناء دیوبند والوں نے ڈالی۔ اس امر میں وہ سب کے امام ہیں۔ ہر چند اور باہر کے صاحب اس کارِخیر میں شریک ہوئے، مگر جو کچھ ہے وہ دیوبند والوں ہی کا طفیل ہے اور اگر اس وجہ سے یوں کہا جائے کہ جتنا اور سب کو اس کارِخیر کا ثواب ملے گا اتنا ہی تنہا دیوبند والوں کو ملے گا تو عین مطابق قول نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم:

''مَنْ سَنَّ سَنَةً حَسَنَةً فَلَهُ اَجْرُهَا وَاَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ اَوْ كَمَاقَالَ''

ہوگا۔ واقعی اہلِ دیوبند نے یہ وہ کام کیا ہے کہ قیامت تک صفحۂ روزگار پر ان کی یادگار رہے گی۔ یہ نامی مدرسہ ہمیشہ ہمیشہ اہلِ دیوبند کی یادگاری کا باعث رہے گا، چونکہ اور مدارس اس کی دیکھا دیکھی مقرر کیے گئے ہیں یا کیے جاتے ہیں تو گو کوئی مدرسہ اس سے ترقی پاجائے پر اہلِ عقل کے نزدیک وہ بھی دیوبند ہی کا پَرتو ہوگا اور اس پر جب یہاں کے باشندوں کی شکستہ حالی اور پریشان روزگاری پر نظر کی جائے تو ان کی ہمت کی بات ہے۔ اور کسی طرح اُن کاموں سے کم نہیں جو اہلِ سلطنت نے رفاہِ عام کے لیے کیے ہیں۔

بایں ہمہ کھانے کی امداد میں طالبِ علموں کے ساتھ جو دلسوزی یہاں کے باشندوں نے کی وہ اتنی نہیں کہ ہم زبان سے ادا کرسکیں فرشتوں نے اگر طالبانِ علوم کے قدم کے نیچے پر بچھائے تھے تو اِنہوں نے ان کے سر پر دستِ شفقت رکھا ماں باپ کو بھلا دیا، یہ وہ خاص بات ہے جس میں شرکائے چندہ میں سے کوئی ان کا شریک وسہیم نظر نہیں آتا''۔

(قاسم العلوم بابت ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ)

......❖......

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دارالعلوم مَر رہا ہے

تین صفحات کا پیش لفظ، دو صفحات کا عرضِ ناشر اور چند غیر معتبر مصنوعی تقریظات جیسی چیزوں سے کتاب کا غیر ضروری توصیفی تعارف کرانے کے بجائے آئیے ڈائریکٹ مطلب کی بات کرتے ہیں۔

''دارالعلوم مَر رہا ہے'' ''دارالعلوم'' اگر اینٹ پتھر، سمینٹ اور روغنی نقش ونگار کا نام ہے۔ دارالعلوم اگر سال بہ سال بڑھتے ہوئے بجٹ، روز افزوں عملے اور نئے نئے جلسوں اور جشنوں کا نام ہے، دارالعلوم اگر کسی ایسی درسگاہ کا نام ہے جہاں علوم وفنون کو فلسفے کے نقطۂ نظر سے پڑھایا جاتا ہو اور کردار وعمل سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو تو ہم اعتراف کریں گے کہ ہمارا عنوان مہمل ہے، جھوٹ ہے، بے محل ہے، لیکن اگر دارالعلوم اُس دین کی تعلیم و تربیت دینے والی مقدس درسگاہ کا نام ہے جس میں تمام تر اہمیت کردار وعمل، اعتقاد اور ذہن وقلب کی طہارت کو ہے، دارالعلوم اگر اُن پاکیزہ رفعتوں اور بیش بہا عظمتوں کا نام ہے جن کے مجموعے کو ہم ''اسلام'' کے محترم نام سے تعبیر کرتے ہیں، دارالعلوم اگر اُس خیر، اُس سلامت رَوی، اُس خوش فکری کی نمائندہ یونیورسٹی کا نام ہے جسے حسنِ کردار، حسنِ فکر اور بیداریٔ قلب وضمیر کا عنوان دیا جاتا ہے تو ہم نہایت رنج اور صدمے کے ساتھ عرض کریں گے کہ ہمارا عنوان نہ صرف صحیح، برمحل اور مبنی برصداقت ہے بلکہ وہ دارالعلوم کی جانکنی اور نزع کی کیفیات کو پورے زور اور وزن کے ساتھ ظاہر کرنے کے لیے بہت ہلکا ہے۔

....

حقیقت میں دارالعلوم دیوبند، فقط ایک دینی مدرسے کا نام نہیں ہے۔ یہ تو اشاعتِ دین اور بقائے اسلام کا وہ عظیم مرکز ہے جو ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے حنفی مسلک کا معتبر ترجمان اور دینی حمیت وعلوم شرعیہ کی ترویج کا علمبردار رہا ہے۔

دارالعلوم دیوبند ایک ایسا ادارہ ہے جس کے قیام میں رضائے الٰہی اور اپنے وقت کے پاکباز علماء وعظیم المرتبت شخصیات کا خلوص اس درجہ شامل ہے کہ آج کے دورِ انحطاط میں بھی صدقِ دل اور اخلاص کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے والے کے لیے یہاں کے در ودیوار سے روحانیت اور نُورانیت کا ظہور جاری ہے۔

دنیا میں تعلیمی درسگاہوں اور تاریخی عمارتوں کے قیام واستحکام کی تاریخ لکھنے کا سلسلہ بہت پرانا ہے۔ مؤرخین نے بڑی عرق ریزی اور جاں فشانی کے ساتھ تاریخ رقم کرنے کا کام انجام دیا ہے۔ اسی قدیم سلسلے کی روایت کو باقی رکھتے ہوئے دارالعلوم دیوبند کی بھی تاریخ لکھی گئی۔ اس کام کے لیے دیوبند کے معروف قلم کار و ادیب سید محبوب رضوی رحمۃ اللہ علیہ کا انتخاب کیا گیا۔ فنِ تاریخ سے آپ کی غیر معمولی دلچسپی جگ ظاہر تھی۔ ''تاریخ دیوبند'' کے نام سے آپ نے دیوبند کی مفصل تاریخ رقم کی جس میں دارالعلوم کے قیام واستحکام اور نظام واہتمام کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور آج بھی دیوبند کے بارے میں جاننے کا شوق رکھنے والے حضرات اسے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ گزشتہ پچاس سالوں میں دیوبند کے تبدیل شدہ حالات کا ذکر کرتے ہوئے اضافوں کے ساتھ ''تاریخ دیوبند'' کا جدید ایڈیشن شائع کیا جائے۔ تاریخ دیوبند کے بعد محبوب رضوی صاحب نے ۱۹۷۶ء میں ''تاریخ دارالعلوم دیوبند'' کے نام سے دو جلدوں میں دارالعلوم کی مفصل اور معتبر تاریخ تحریر کی۔ حالانکہ کہیں کہیں اُن کا قلم بھی صاحب اقتدار کی مہربانیوں کا شکار محسوس ہوتا ہے لیکن پھر بھی مجموعی طور پہ دارالعلوم کے قیام سے لے کر اس کی ترقی کے دور اور نظام واہتمام و دیگر شعبہ جات کے تذکرے کے ساتھ اِدارے کی علمی خدمات کا معتمد تفصیلی ذکر اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ دارالعلوم کی تاریخ اور تعارف کے لیے جیسا کام ہونا چاہیے تھا محبوب رضوی صاحب نے اسے اسی عزم وصداقت سے انجام دیا۔ آج ۲۰۱۸ء تک بھی اس کتاب کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اسی لیے ۱۹۷۶ء سے آج بیالیس سال گزر جانے کے بعد بھی محبوب رضوی صاحب کی کتاب ''تاریخ دارالعلوم دیوبند'' مسلسل مکتبہ دارالعلوم سے شائع ہو رہی ہے۔ لیکن وائے کم نصیبی محبوب رضوی صاحب دیوبندی تھے۔ دیوبند کی علمی سرزمین سے ان کی نسبت ہے۔ اور یہی بات دارالعلوم کے موجودہ مصنوعی ہمدردوں کو پسند نہیں کہ دارالعلوم سے کسی بھی دیوبندی کا کوئی رشتہ باقی رہے۔ اسی لیے باقاعدہ پلاننگ کے تحت ایک غیر معتبر کتاب نااہل قلم کار سے دارالعلوم کی تاریخ کے عنوان پر مرتب کرائی گئی، مقصد واضح ہے کہ مستقبل میں محبوب رضوی صاحب کی تحریر کردہ معتبر تاریخ دارالعلوم کو ختم کر کے بس اپنی مرضی کے مطابق چاپلوس قلم سے تحریر کی ہوئی کتاب ہی امت کو فراہم کی جائے۔ یہ کوئی الزام نہیں ہے، اِس حقیقت کو ہم آگے وضاحت کے ساتھ بیان کریں گے۔

نظامِ قدرت ہے وقت گزرتا رہتا ہے۔ ادوار بدلتے ہیں، لوگوں کے اطوار بدلتے ہیں۔ اور یہی تبدیلی علاماتِ قیامت کے ظہور کا سبب بن رہی ہے۔ کم ظرف و کم نسب مسندوں پر آجائیں گے۔ حکومت کی باگ ڈور جہلاء اور ظالموں کے ہاتھ میں ہوگی، قلم کا ظاہر ہونا عام ہو جائے گا۔

لاریب یہی ہو رہا ہے۔ رسولِ پاک ﷺ پر میری جان قربان، کس وضاحت کے ساتھ آج کے حالات ڈیڑھ ہزار سال پہلے بتا گئے ہیں۔ سبحان اللہ!

آج سب دیکھ رہے ہیں مسندوں پر کون ہے اور شرفاء و اشراف کا کیا حال ہے۔ حاکمِ وقت کے ظالم ہونے سے کون انکار کرسکتا ہے۔ اور قلم کے ظاہر ہونے کا مطلب محدثین نے یہی بیان کیا ہے کہ بے شمار کتابیں لکھی جائیں گی۔ ہر کس و ناکس خود کو مصنف باور کرانے کے لیے کتاب لکھے گا۔ ہم سبھی جانتے ہیں فقط اُردو یا عربی ہی میں نہیں بلکہ دنیا بھر کی زبانوں میں بے شمار کتابیں شائع ہو رہی ہیں جن میں زیادہ تر گمراہ کن ہیں۔ اسلام مخالف ہیں اور اردو و عربی میں بھی بے شمار لاحاصل کتابیں آرہی ہیں۔ ایک ہی موضوع پر ایک ہی طبقے کے لوگوں کی درجنوں کتابیں موجود ہیں۔ اگر چہ کام کی بات کسی میں نہیں ملتی۔ نہ زبان ادب کی حلاوت لیے ہوئے ہے اور نہ ہی جملے ادبی ساخت کے علمبردار معلوم ہوتے ہیں۔ زبان و بیان کی خامیوں کے علاوہ خیانت کا معاملہ بہت تشویشناک ہے اور یہ خائن حضرات کوئی غیر مسلم یا اسلام دشمنی کا پرچم ہاتھ میں لینے والے نہیں بلکہ اکثر مسلمان ہی ہیں۔ ایسی بہت سی کتابیں پہلے بھی لکھی گئی ہیں اور آج بھی لکھی جارہی ہیں جن میں حقائق کو مسخ کرنے کی ناکام کوشش اور حوالوں کے طور پر پیش کردہ عبارتوں میں چھیڑ چھاڑ کی گئی ہے۔ پرانی کتابوں کا تذکرہ تو کیا کرنا کہ اُن کے ذکر سے بھی ان کی شہرت ہو جائے گی اور مکروفریب کا شاخسانہ ثابت ہو چکی کتابوں کی تشہیر یقیناً بے سود ہے۔

سردست جس کتاب کی حقیقت بیان کرنے کے لیے قلم نے جنبش کی ہے وہ بھی جھوٹ، افترا، مکروفریب اور چاپلوسی کے جراثیم سے بھرے ذہن کی پیداوار ہے۔ گزشتہ صفحہ پر جس غیر معتبر تاریخی کتاب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ کتاب اس لائق ہرگز نہیں کہ اس پر کسی بھی طرح کے کلام کی ضرورت ہو، نہ ہی اُس کے مرتب اس قابل ہیں جن کے نام کی وجہ سے کتاب کو اہمیت حاصل ہو سکے۔ ہمیں کتاب کی اصلیت عوام کے سامنے لانے کے لیے جس چیز نے مجبور کیا، وہ ہے دارالعلوم جیسی عظیم درسگاہ سے اس کتاب کا منسوب ہونا۔ بدنصیبی یہ ہے کہ امتِ مسلمۂ ہند کی دینی حمیت اور آبرو سمجھے جانے والے دارالعلوم دیوبند نے اس پُرفریب کتاب کو شائع کیا ہے۔ مقامِ افسوس ہے کہ مولانا قاسم و حضرت شیخ الہند اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی و علامہ شبیر عثمانی رحمہم اللہ جیسے بہت سے عظیم المرتبت مفکر و مدبّر علماء کی امانت و یادگار یہ ادارہ اب ایسے ہاتھوں میں آچکا ہے جو دیانت کے قاتل اور امانت کے خائن ہیں۔ یہ الزام نہیں صداقت ہے جس کو آپ آئندہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ ملاحظہ کریں گے بے بنیاد الزام لگانے کے ہم قطعی قائل نہیں ہیں۔ اس کتاب کا آغاز ہی دیانت کی لاش پر پاؤں رکھ کر کیا گیا ہے اور آغاز کرنے والے دیانت کے یہ قاتل فاضل مرتب نہیں بلکہ وہ ہیں جن کے ہاتھوں میں دارالعلوم کی زِمام ہے۔

ہم ہرگز اس معمولی کتاب پر قلم نہ اُٹھاتے لیکن دارالعلوم کی نسبت کے علاوہ دوسری اہم وجہ یہ بنی کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد چند اہلِ بصیرت نے کتاب میں برتی گئی لاپرواہی اور تنگ نظری کی نشان دہی کرتے ہوئے مہتمم دارالعلوم دیوبند کو تحریری توجہ دلائی اور اس کتاب میں اصلاح کرنے یا اس کی اشاعت و فروختگی کو

روکنے کی گزارش کی لیکن حیف صد حیف زعم اقتدار سے خرد کا مفلوج ہو جانا نئی بات نہیں۔ نہ تو کتاب میں تصحیح کی گئی اور نہ ہی اس کی اشاعت کو روکا گیا۔ اس کے برعکس طلبہ کو انعام میں یہ کتاب تقسیم کر کے مزید ترویج وتشہیر کی گئی۔ اور آج بھی یہ کتاب نسلِ نَو کے ذہنوں کو غلط معلومات کا زہر فراہم کر رہی ہے۔

اسی لیے ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ اس کتاب میں بیان کی گئی غلط تاریخ اور چاپلوسی کی کہانیوں سے جتنی جلد ہو سکے لوگوں کو آگاہ کر دیا جائے۔ ہم یہ تو نہیں کر سکتے کہ دارالعلوم کو زبردستی اس کتاب کی اشاعت سے روک دیں لیکن بہرحال یہ ضرور کر سکتے ہیں کہ اپنی بساط بھر لوگوں تک یہ بات پہنچا دیں کہ: اے میری قوم کے معصومو! رہنمائی شکل میں رہزنی کرنے والے ان فریبیوں سے بچو اور جھوٹی و غیر معتبر تاریخ ہرگز نہ پڑھو جو تمہیں غلط معلومات دینے کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی اور مطلب پرست خاندان کی توصیف اور ستائش کے بے کیف جذبات کے علاوہ کچھ نہ دے سکے۔

ابوعکاشہ رحمٰن ۵؍فروری ۲۰۱۸ء

abuukasharahman@gmail.com

آ اب میں حقیقت سے تجھے آشنا کروں!

آئیے قارئین! اب دارالعلوم دیوبند سے شائع ہونے والی غیر معتبر کتاب کی حقیقت آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

کتاب کا نام ہے: ''دارالعلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ''

نام ہی سے جھوٹ کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ کتاب کے ٹائٹل پر بڑے بڑے حرفوں میں جامع ومختصر تاریخ لکھا گیا ہے۔ حالانکہ کتاب نہ تو جامع ہے اور نہ ہی اس میں تاریخ کو مختصر طور پر پیش کیا گیا ہے۔

جامع اور مختصر دو الگ الگ لفظ ہیں ہم دونوں ہی پر کلام کر کے وضاحت کریں گے کہ کتاب کا نام ہی جھوٹ پر مبنی ہے۔ پہلا لفظ جامع ہے جس کے لغت میں کئی معنیٰ دیے گئے ہیں۔ یہاں اس کے معنیٰ مکمل مراد ہیں۔ کیونکہ جب کسی کتاب کے ساتھ جامع کا لفظ لکھا یا بولا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہی بتانا ہوتا ہے کہ یہ کتاب مکمل ہے۔ اس میں موضوع کی مناسبت سے تمام اہم چیزیں جمع کر دی گئی ہیں اس لیے جس کتاب کو جامع لکھ دیا جاتا ہے اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ یہ تو ہوئے جامع لفظ کے معنیٰ جو کہ اس کتاب کے ساتھ کسی بھی طرح مطابقت نہیں رکھتے۔ یہ کتاب کسی طور مکمل نہیں ہے۔ اس میں دانستہ دیوبند کی اہم شخصیات کو نظر انداز کیا گیا ہے لفظِ دانستہ تحریر کرنے کا مقصد الزام نہیں ہے بلکہ یہ حقیقت ہم آگے واضح کریں گے۔ مرتب کتاب مولوی محمد اللہ نے جان بوجھ کر کتاب میں دیوبندی حضرات کے ساتھ تنگ نظری کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی ایسی بہت سی غیر ثقہ باتیں ہیں جن سے اِس کتاب کی جامعیت پر حرف آتا ہے۔

اب آئیے دوسرے لفظ مختصر کو لیتے ہیں۔ ہم سبھی جانتے ہیں مختصر کے معنیٰ چھوٹا، کم، قلیل اور تھوڑے کے آتے ہیں جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اس کتاب میں دارالعلوم کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہوگی۔ کیونکہ محبوب رضوی صاحب نے چالیس سال قبل دو جلدوں میں دارالعلوم کی مفصل تاریخ تمام عالم کے سامنے پیش کر دی ہے۔ اس لیے موجودہ کتاب میں وہ سب تو ہوگا نہیں جو پہلے سے شائع ہوتا چلا آرہا ہے یقیناً اس کتاب میں دارالعلوم کی ابتدائی تاریخ کے علاوہ ۱۹۷۶ء کے بعد کی تاریخ پیش کی گئی ہوگی۔ لیکن قارئین! یہ گمان غلط ہے ایسا ہرگز نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس کتاب کو مختصر کا جھوٹا عنوان دے کر بڑی تفصیل کے ساتھ محبوب رضوی صاحب کی تحریر کا سرقہ کیا گیا ہے۔ نہ تو اس کتاب میں تاریخ مختصر ہے اور نہ یہ کتاب ہی اپنے وجود کے اعتبار سے مختصر ثابت ہو سکتی ہے۔

میرے بھائیو! ایمانداری سے بتائیے مختصر کتاب کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ یہی نا! کہ کتاب کم صفحات کی ہوتی ہے۔ چھوٹی سی ہوتی ہے۔ ویسے تو مختصر کا مطلب چالیس پچاس صفحات کی کتاب ہوتا ہے لیکن ہم اگر کتاب کے عنوان پر مختصر کے معنیٰ میں وسعت اختیار کریں تو زیادہ سے زیادہ سو دوسو یا بس تین سو صفحات کی کتاب کو مختصر کہا جاسکتا ہے لیکن سر دست کتاب نہ تو صفحات میں کم ہے نہ ہی اپنے سائز کے اعتبار سے چھوٹی ہے۔ یہ ۷۵۲ رصفحات کی بڑے سائز والی ایک ضخیم کتاب ہے۔ یہ بجا کہ کتاب کے نام میں تاریخ کو مختصر کہا جارہا ہے کتاب کو نہیں لیکن عزیز ساتھیو! تاریخ بھی تو اس کتاب میں اختصار سے نہیں دی گئی۔

سچ تو یہ ہے کہ محبوب رضوی صاحب کی دونوں جلدیں اگر اس کتاب کے برابر میں رکھ دی جائیں تو یہ کتاب تنہا ہی اُن دونوں جلدوں کی برابری کرنے کے لیے کافی ہے۔ پھر بھی اسے مختصر کا نام دیا ہے۔ یہ مذاق نہیں تو کیا ہے۔

کتاب کے نام کے بعد اب کتاب کے مشمولات کی حقیقت جاننے کے لیے کتاب کھولتے ہیں تو تیس ۳۰ رصفحات کی فہرست کے بعد دارالعلوم کے مہتمم مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب کے مقدمے سے کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔ چند صفحے پہلے ہم نے لکھا ہے کہ ''اس کتاب کا آغاز ہی دیانت کی لاش پر پاؤں رکھ کر کیا گیا ہے''۔ ہم اپنے اس دعوے کی دلیل میں مہتمم صاحب کی یہ تحریر پیش کرتے ہیں۔ اسی سے کتاب کا آغاز ہورہا ہے اور یہی مقدمہ جھوٹ پر مبنی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ سچائی جانتے ہوئے بغیر کسی شرعی مجبوری کے ضرورت کے وقت سچ کا اظہار کرنے کے بجائے اس پہ پردہ ڈالنا جھوٹ ہی کے مترادف ہوتا ہے۔ اس کی مستند مثال یہ مقدمہ ہے۔ کوئی ہم پہ یہ الزام نہ رکھ دے کہ ہم نے عبارت کی نقل میں حذف و اضافے سے کام لیا ہے اس لیے طوالت کی پرواہ کیے بغیر بڑے سائز کے ڈیڑھ صفحے کا پورا مضمون یہاں نقل کر رہے ہیں۔ آپ بھی اس تحریر کو پڑھیے۔ بار بار پڑھیے۔ پورے مضمون میں یہی نمایاں ہے کہ دارالعلوم کی تاریخ اور اس کا تعارف عوام کے سامنے لانے کے لیے بہت شدت کے ساتھ محسوس کیا جارہا تھا کہ اس کی تاریخ پر کام ہو۔ نئی نسل اور بالخصوص وہ لوگ جنہوں نے محبوب رضوی صاحب کی تاریخ دارالعلوم کو نہیں دیکھا وہ تو مہتمم صاحب کے اس مقدمے سے یہی تاثر لیں گے کہ اس کتاب سے پہلے دارالعلوم کی کوئی تاریخ مرتب ہی نہیں کی جاسکی۔ لیجیے قارئین آپ مہتمم صاحب کی تحریر ملاحظہ فرمائیے۔

....

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

(از: مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب)

"دارالعلوم دیوبند نہ صرف دینی تعلیم کی ایک مرکزی درسگاہ ہے بلکہ اسلامی تہذیب وثقافت اور دینی تربیت کا ایک بین الاقوامی مرکز بھی ہے۔ اس کے فضلاء تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور اس مکتبِ فکر کے ماننے والے پوری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ دارالعلوم کے علمی اور تہذیبی رشتے عالمی شخصیتوں اور اداروں سے قائم ہیں اور اس کے اثرات شعوری اور غیر شعوری طور پر عام قلوب تک پہنچے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متعلقین دارالعلوم کے علاوہ واردین وصادرین کا ایک سلسلہ ہے جو نہ صرف اطرافِ ہند سے بلکہ غیر ممالک سے اس کی طرف کھنچتا چلا آتا ہے۔ یہ سلسلہ علمی افراد اور ریسرچ اسکالرز تک محدود نہیں بلکہ عام مسلمان اور غیر مسلم افراد، تعلیم یافتہ حضرات، حکومتوں کے نمائندے، میڈیا کے کارندے اور عرب وعجم کے وفود دارالعلوم کی شہرت وعظمت کی داستانیں سن کر کشاں کشاں اس کے مشاہدہ کے لیے آتے رہتے ہیں۔ ان زائرین اور دارالعلوم کے عقیدت مندوں کے دلوں میں قدرتاً دارالعلوم کی تاریخ اور اس کی خدمات کو جاننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

اسی پس منظر میں اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی تھی کہ دارالعلوم کا جامع تعارف مختلف زبانوں (خصوصاً اردو، عربی، انگریزی اور ہندی) میں کتابی صورت میں پیش کیا جائے تاکہ دنیا دارالعلوم کی تاریخ سے واقف ہو اور مسلمانوں کے سامنے ان کے اسلاف کی اس عظیم الشان علمی یادگار کا ماضی آجائے؛ کیونکہ تاریخ ہی کسی قوم کا سرمایہ اور بیش قیمت اثاثہ ہوتی ہے جس کے ذریعہ اپنے اکابر واسلاف کے زندہ کارناموں اور ان کی روشن خدمات کی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ تاریخ ہی قوم کی مردہ رگوں میں خون دوڑانے، مستقبل کے چیلنجوں سے نبرد آزما ہونے اور ترقی کی بلندیوں پر کمندیں ڈالنے کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے۔

دارالعلوم کی ویب سائٹ کے لیے دارالعلوم کے تعارف کی تیاری کے سلسلہ میں ایک نیا پہلو یہ

سامنے آیا کہ انہیں مواد کو ضروری ترمیمات کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا جائے تاکہ اس کی افادیت کا دائرہ وسیع تر ہو جائے۔ مجھے بے حد مسرت ہو رہی ہے کہ اس سمت میں اچھی پیش رفت ہوئی اور سب سے پہلے ہندی کا مجموعہ تیار ہو کر سامنے آیا۔ الحمدللہ یہ کتاب ہمارے ان مقاصد کو بہ خوبی پورا کر رہی ہے۔ اس کتاب میں دارالعلوم دیوبند کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کو مختصر اور جامع طور پر سمیٹ لیا گیا ہے۔ دارالعلوم کے قیام اور اس کے پس منظر، دارالعلوم کے ڈیڑھ سو برسوں کے سال بہ سال اہم واقعات، دارالعلوم کے مکتبِ فکر، دارالعلوم کے نظم و انتظام، دارالعلوم کے نظامِ تعلیم و نصابِ تعلیم، دارالعلوم کے کارنامے اور خدمات اور دارالعلوم کے علماء و مشاہیر وغیرہ عناوین پر مشتمل معلومات شامل ہیں جو ان شاء اللہ عام لوگوں کے لیے دارالعلوم سے واقفیت کا ذریعہ بنیں گی، نیز اہلِ علم، جویانِ حق اور ریسرچ اسکالرز کے لیے مفید معلومات کا ذخیرہ ثابت ہوں گی۔ ہندی زبان کے بعد اب اُردو زبان میں قدرے تفصیل کے ساتھ دارالعلوم کا جامع تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

الحمدللہ عربی اور انگریزی میں بھی اسی انداز سے دارالعلوم کا جامع تعارف تیار کیا جا رہا ہے جو ان شاء اللہ مستقبل قریب میں اہلِ ذوق کے ہاتھوں میں ہوگا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شجرِ طوبیٰ کی تا قیامت آبیاری فرمائیں، ہماری ان حقیر کاوشوں کو قبولیت سے نوازیں اور ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں!

ابوالقاسم نعمانی (مہتمم دارالعلوم دیوبند)

۲۵/ذوالقعدہ ۱۴۳۷ھ مطابق ۲۹/اگست ۲۰۱۶ء

دیکھا آپ نے! یہ ہے دیانت کا قتل جس کے بارے میں ہم پیچھے لکھ آئے ہیں۔ کیا یہی ایک عالم دین اور مفتی کی تحریر کا انداز ہونا چاہیے۔ کیا مہتمم صاحب کو یہ نہیں لکھنا چاہیے تھا کہ: ''بہت دنوں سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی محبوب رضوی صاحب کی تاریخ دارالعلوم کی دو جلدوں کے بعد اب اس سے آگے کی تاریخ بیان کرتے ہوئے تیسری جلد شائع کی جائے۔ جس میں گزشتہ چالیس سال کا تفصیلی ذکر موجود ہو اسی لیے اِس ضرورت کو پورا کرتے ہوئے تاریخِ دارالعلوم کی جلد سوم آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے ہمیں خوشی محسوس ہو رہی ہے''۔

یہی دیانت کا تقاضا بھی تھا آپ کو تاریخ کے عنوان سے جو بھی کام کرانا تھا وہ ۱۹۷۶ء کے بعد کے حالات پہ کرانا تھا اور تاریخ دارالعلوم دیوبند کی جلد سوم شائع کرتے نہ کہ ایک نئی نویلی تاریخ۔ ستم تو دیکھیے دیانت کا تقاضا کیا

نبھاتے مقدمے کے دوسرے پیراگراف کی پہلی سطر ہی میں رقمطراز ہیں کہ ''اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی تھی کہ دارالعلوم کا جامع تعارف مختلف زبانوں (خصوصاً اردو، عربی، انگریزی اور ہندی) میں پیش کیا جائے'' اب کیا مہتمم صاحب وضاحت فرمائیں گے کہ تاریخ دارالعلوم دیوبند جو اُردو زبان میں ۲ جلدوں پر دارالعلوم کا مفصل تعارف گزشتہ چالیس سال سے کرا رہی ہے اُس کے علاوہ بھی کسی جامع تعارف کی ضرورت ہے جس کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی تھی۔ اور اُردو زبان میں کوئی کتاب میسر نہیں تھی۔ مہتمم صاحب کے پورے مقدمے میں ایک سطر بھی ایسی نہیں ہے جس سے معلوم ہوسکے کہ اس سے قبل بھی دارالعلوم دیوبند کی تاریخ لکھی جاچکی ہے۔ حیرت کی بات ہے محبوب رضوی صاحب کی تحریر کردہ ''تاریخ دارالعلوم'' کو قطعاً نظرانداز کر کے یہی ظاہر کیا گیا ہے کہ فقط ہم نے ہی دارالعلوم کی تاریخ لکھوا کر اس کا جامع تعارف پیش کیا ہے۔ حیف صد حیف۔ کتاب کی ابتدا جب اس فریب دہی کے ساتھ کی گئی ہو تو پوری کتاب میں سوچیے کیا کیا نہ گل کھلائے ہوں گے۔

....

کتاب کا دوسرا مضمون صفحہ نمبر ۳۵ پہ تعارف کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ دارالعلوم کے شعبہ شیخ الہند اکیڈمی کے ڈائریکٹر اور مجلسِ شوریٰ کے رکن جناب بدرالدین اجمل صاحب کے قلم سے نکلی ہوئی وہ نگارشات ہیں جن میں نہ تو سچائی کا نور ہے نہ ہی حق گوئی اور اخلاص کی تاثیر۔ مہتمم صاحب کی طرح ہی انہوں نے بھی کتاب کا تعارف کراتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اُس کا لُبِّ لُباب اور ماحصل اُمت کو یہی بتانا ہے کہ دارالعلوم کے حالات اور واقعات کی تاریخ کو بس اس کتاب میں جمع کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے دارالعلوم کی کوئی تاریخ مرتب نہیں کی گئی۔ دلیل کے طور پر بدرالدین اجمل صاحب کی یہ تحریر ملاحظہ کریں۔ اپنے مضمون کے چوتھے پیراگراف کی ابتداء وہ ان سطور سے کرتے ہیں:

> ''ایک عرصے سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ دارالعلوم دیوبند کے حالات و واقعات اور شخصیات و خدمات کو جمع کر دیا جائے۔ مجھے بے انتہا خوشی ہورہی ہے کہ مولانا مفتی محمد اللہ خلیلی قاسمی فیض آبادی نے اس اہم ضرورت کی تکمیل کرتے ہوئے دارالعلوم کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کو جامع و مختصر طور پہ جمع کر دیا ہے۔ جس کو حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند کی نظرثانی اور دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کی اجازت کے بعد شیخ الہند اکیڈمی سے شائع کیا جارہا ہے''۔

دیکھ لیجیے قارئین ان سطور میں تحریر ہر ایک لفظ چیخ چیخ کر ڈائریکٹر صاحب کے جھوٹ کا اعلان کر رہا ہے۔ مولانا فرمارہے ہیں کہ ''مجھے بے انتہا خوشی ہے کہ دارالعلوم کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کو جامع و مختصر طور پر جمع کر دیا ہے۔ کوئی بتائے کہ

چالیس سال سے چلی آرہی محبوب رضوی صاحب کی کتاب ''تاریخ دارالعلوم دیوبند'' میں پہلے سے ہی دارالعلوم کی مستند تاریخ اور حالات و واقعات موجود ہیں وہ کیا ہے۔ پھر ایک عرصے سے کون سی تاریخ لکھنے کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔کیا تاریخ کو مسخ کرکے پیش کرنے کی بے انتہا خوشی ہے؟۔اور کمال تو یہ ہے کہ مہتمم صاحب کی نظر ثانی کے علاوہ شوریٰ نے بھی اس کتاب کے مسودے کو ہری جھنڈی دکھادی۔کیا اُمت اب یہی سمجھ لے کہ چندلوگ ہی نہیں بلکہ آج دارالعلوم کی شوریٰ بھی اپنی بصیرت اور بصارت سے ہاتھ دھو چکی ہے۔کیاواقعی یہ مقام دارالعلوم کی علمی اور روحانی موت کا اعلان نہیں کہ اب ایسی ایسی غیر معتبر کتابیں باقاعدہ شوریٰ کی مرضی اور اجازت سے شائع ہو کر امت کو گمراہ کریں گی۔

کیا اب شوریٰ فقط اسی لیے رہ گئی ہے کہ اس کے ممبران وقتِ مقررہ پر آئیں لمبا چوڑا ناشتہ کریں، اپنا ٹی اے ڈی اے لیں اور چلے جائیں۔شوریٰ کے کسی ممبر کو یہ خیال تک نہیں آتا کہ جس مقصد کے لیے ہمیں دارالعلوم جیسی درسگاہ کا خادم منتخب کیا گیا ہے اُس کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔کیا کوئی ایک بھی ممبر ادارے کے متعلق ملنے والی شکایتوں پر غور کرنے کے لیے شعبہ جات کا دورہ کرتا ہے۔کیا کسی کے دل میں اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ ایئر کنڈیشن کمرے سے نکل کر تمام شعبہ جات اور درسگاہوں کا دورہ کیا جائے۔اور دیکھا جائے مطبخ کا کیا حال ہے۔ درسگاہوں کی حالت کیسی ہے۔نودرہ میں بچھے ہوئے ٹاٹ پھٹ رہے ہیں۔مولسری میں نَل کے پاس کس قدر پانی جمع رہتا ہے۔اس کیچڑ کو دُور کرنے کے لیے کوئی تدبیر ہو۔لائبریری میں داخل ہوتے وقت باہری حصے میں بچھے ہوئے ٹاٹ کا حال یہ ہے کہ کسی بھی نفاست پسند اور ذی حس انسان کو اسے دیکھنے کے بعد قے آنا طے ہے۔اتنا گندہ ہے کہ بس!معلوم ہوتا ہے بکریوں کے نیچے سے اُٹھالائے ہیں۔ایسے بڑے بڑے دھبے ہیں جیسے جانوروں کے پیشاب کرنے سے ہوتے ہیں۔کیا جواب دیں گے یہ شوریٰ کے ممبران جب اللہ رب العزت انصاف کے دن ان سے اس بابت سوال کرے گا۔اوّل تو انتظامیہ کی طرف سے شوریٰ تک کوئی شکایت پہنچ ہی نہیں پاتی اور اگر کسی حق گو کی جانب سے بگڑے ہوئے حالات کا تذکرہ کر بھی دیا جائے تو اس کی تحقیق کے لیے فقط کمیٹی تشکیل دی جاتی ہے کارروائی کچھ نہیں ہوتی۔جس کی زندہ مثال شعبۂ تجوید کی بدحالی اور اس میں پھیلی بدامنی کو لے کر کیے گئے وہ سوالات ہیں جو قاری ابوالحسن اعظمی صاحب نے اپنے استعفےٰ میں اُٹھائے ہیں۔آج تک اس عنوان پر نہ ہی شوریٰ کے ممبران نے تحقیق کی اور نہ ہی کسی قسم کی کارروائی عمل میں آئی۔کمال تو یہ ہے کہ جس دیدہ دلیری سے قاری ابوالحسن اعظمی کا استعفیٰ منظور کیا تھا اُس ڈھٹائی سے ان کا متبادل نہیں لایا گیا۔اور آج اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی دارالعلوم سعبۂ عشرہ کا کوئی ایسا قاری پورے ہندوستان سے نہیں لاسکا جو قاری ابوالحسن کے متبادل کہلائے جانے کا مستحق ہوسکے۔خیر باتیں تو بہت ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ دارالعلوم کی شوریٰ اب اخلاص سے خالی احساسِ ذمہ داری سے محروم فقط ایک کمیٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔جس کے ممبران دارالعلوم کی شوریٰ کا ممبر ہونے پہ فخر

محسوس کرتے ہیں لیکن اس منصب کا حق ادا کرنا کیا ہوتا ہے یہ ان ٹی اے، ڈی اے والوں کو ہرگز معلوم نہیں۔ ہم نے اسی لیے اپنی معروضات کو "دارالعلوم مَر رہا ہے" کے نام سے موسوم کیا ہے کیونکہ یہ تنگ نظری، یہ لاپرواہی، یہ بدعملی، یہ غیر ذمہ داری بلا شبہ دارالعلوم کی موت کے مترادف ہے، بیشک دارالعلوم عمارات کا مرکز تو بن رہا ہے مگر تعلیم کا محور نہیں۔

بلاؤ غسّالوں اور کفن دوزوں کو بلاؤ۔ بچی کچی عظمت، غیرت، حمیّت، خودداری، وقار، شرم ولحاظ اور زندہ ضمیری کا لاشہ انتظار میں ہے۔کہو فاتحہ خوانوں سے سج بن کر آجائیں۔ پکارو محرم کا بین کرنے والوں کو جنازہ تیار ہے۔آواز دو چادر چڑھانے والوں، قوالی پڑھنے والوں، چراغ جلانے والوں کو ایک بہت بڑے بزرگ کا روضہ شریف سنگِ مرمر کی سلوں اور رنگ یاقوت کے کتبوں سے جلد مرصع ہونے والا ہے۔سلام اے محمود وقاسم کی مقدس روحو! سلام اے کردار، اے سادگی، اے خود آگاہی، اے عزتِ نفس!! آج تم گئے کل ہماری باری ہے۔ اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّآاِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔اب اس خاک سے کوئی قاسم کوئی محمود، کوئی حبیب، کوئی انور، کوئی شبیر، کوئی حسین نہیں اُٹھے گا۔اب یہاں فقر نہیں فقیری ہے، تواضع نہیں نیازمندی ہے، عجز نہیں بزدلی ہے، ابوالوقتی نہیں ابن الوقتی ہے۔

بے شک درج بالاسطور کو آپ سخت گوئی اور تلخ کلامی یا بے ادبی کا عنوان دے سکتے ہیں، لیکن بات حرف بہ حرف مبنی برصداقت ہے۔ہمارا اندازِ بیان تلخ سہی مگر یہ حقیقت ہر آنکھ والا اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ آج دارالعلوم سے کیسے کیسے لڑکے تعلیم حاصل کر کے باہر نکل رہے ہیں۔وہی درسگاہیں، وہی کتابیں، وہی نصابِ تعلیم پھر بھی کیوں کوئی ایک بھی ہاں فقط ایک بھی محمود حسن، انورشاہ، مفتی عزیز الرحمٰن، شبیر عثمانی، یا حسین احمد مدنی جیسا نہیں نکل رہا ہے۔نہ اساتذہ میں اخلاص ہے نہ ہی طلبہ میں تعلیم حاصل کرنے کا وہ جذبہ جو شروحات پڑھ کر پاس ہونے کے بجائے پورے سال انہماک اور ادب کے ساتھ علم حاصل کرنے والوں میں پایا جاتا تھا۔

بہرکیف بات دوسرا رُخ لیے جارہی ہے۔آئیے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔تو گفتگو ہو رہی ہے دارالعلوم سے شائع شدہ غیر معتبر تاریخ کی۔جس کی ابتدا کے بارے میں آپ نے دیکھ ہی لیا دو ذمہ دار عہدے داروں نے کس دیدہ دلیری کے ساتھ چالیس سال سے مسلسل شائع ہوتی آرہی تاریخ دارالعلوم کو بالکلیہ نظرانداز کرکے اس کتاب کی کیسے سراہنا کی ہے۔

اللہ رب العزت اس طرح کی خیانت اور فریب کاریوں سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے اور ہر عہدیدار کو ایمانداری کے ساتھ ذمہ داری ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

دارالعلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ

اس کتاب کو مرتب نے آٹھ ابواب پر تقسیم کیا ہے۔ ویسے تو کتاب کے آٹھوں ابواب پر نظر ثانی کی ضرورت ہے بلکہ نظر ثانی کی نہیں اس پوری کتاب کو آگ لگانے کے بعد از سرِ نَو تاریخ دارالعلوم کی تیسری جلد مرتب کرنے کی ضرورت ہے جس میں ۱۹۸۰ء سے لے کر آج ۲۰۱۸ء تک کے حالات کا تفصیلی اور ایماندارانہ ذکر ہو۔ ایماندارانہ لکھنے سے مراد یہ ہے کہ ۱۹۸۰ء کے بعد مولوی اسعد مدنی کی ریشہ دوانیوں اور دارالعلوم پر ان کے قبضے کی پوری تاریخ بیان کی جائے۔ کیونکہ مؤرخ کا قلم چاپلوسی کی سیاہی سے نہیں بلکہ حق بیانی کی روشنائی سے چلتا ہے۔ لیکن آج کے اس مفاد پرست دَور میں حق گو ہیں ہی کتنے۔ اور جو ہیں وہ اس پوزیشن میں نہیں کہ مدنی گروپ کے انتقام کی فکر سے آزاد ہو کر حق بیانی سے کام لے سکیں۔ سبھی کے ذہنوں پر ٹانڈوی دہشت کے سائے ہیں۔ فی الحال بہت چھوٹی سی مثال اس بات کی صداقت کے لیے پیش ہے۔ قاری رفعت صاحب نے مسائل تراویح کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی تھی، اس میں نوافل کی جماعت کے متعلق حق بیانی سے کام لیا تو ان بے چاروں کو حفظ کی درسگاہ میں سے ہٹا کر لائبریری میں پھینک دیا گیا۔ انتقام اس خاندان کی سرشت میں ہے۔

(واضح رہے قاری رفعت قاسمی صاحب دارالعلوم کے شعبۂ حفظ میں جید استاذ کا درجہ رکھتے ہیں، آپ کے تلامذہ میں بہت سے وہ علماء شامل ہیں جو آج کئی بڑے مدارس میں صاحبِ مسند ہیں، لیکن حق بیانی کا صلہ ان کو یہ ملا کہ کلام اللہ کی تعلیم سے علیحدہ کر کے آج ایک لائبریرین بنا دیا گیا ہے۔ قصور بس یہ تھا کہ اپنی کتاب ”مسائل تراویح“ میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے عمل کو حنفیہ کے نزدیک مکروہ ہونا بہ دلیل نقل کر دیا۔ (فقط نقل کیا تھا، خود کوئی فتویٰ نہیں دیا تھا، تب بھی سزا سے نہ بچ سکے)۔

بہر حال ہم اس کتاب کے ابواب کے مطابق ہی اس کی اصلیت واضح کریں گے بالترتیب ابواب پر کلام کرنے سے پہلے ذرا عرضِ مرتّب پر بھی تو ایک نظر ڈال لیں:

حرفِ آغاز کے عنوان سے مرتب موصوف اپنی اس تحریر کے آٹھویں پیراگراف میں فرماتے ہیں کہ: ”شخصیات کے باب میں اُن حضرات کا ذکر شامل کیا گیا ہے جن کا دارالعلوم سے تعلیم، تدریس، رکنیت وملازمت کا رشتہ ہو“ اس سطر کو ذہن نشین رکھیے ہم اس کے بارے میں آگے وضاحت سے کلام کریں گے۔

پہلا باب

کتاب کے صفحہ نمبر ۴۱؍ سے پہلا باب شروع ہوتا ہے۔ جو تین عنوان پر مشتمل ہے: (۱) دارالعلوم دیوبند (۲) قیام دارالعلوم کا پس منظر (۳) دارالعلوم دیوبند کا نصب العین اور بنیادی اُصول۔

محترم قارئین! آپ کو معلوم ہی ہوگا ایک ترتیب شدہ کتاب میں کسی بھی عنوان کے تحت پیش کی گئی تحریر کے اختتام پر حوالہ ضرور دیا جاتا ہے، جس سے پتہ چل سکے کہ پیش کردہ اقتباس کہاں سے نقل کیا گیا ہے۔ اور مضمون کے آخر یا ابتدا میں اس بات کا کوئی حوالہ یا ذکر نہ کیا جائے کہ تحریر شدہ مضمون کہاں سے لیا ہے تو اُس تحریر کو فاضل مرتب کے قلم کی نگارش تصور کیا جاتا ہے۔ یہی ہوتا بھی ہے، مختلف کتابوں کا سہارا لے کر جو کتاب تیار کی جاتی ہے اُس میں مرتب ہر ہر بات کا حوالہ پیش کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ اور جو مضمون خود مرتب کے قلم سے لکھے جاتے ہیں ان کے اختتام پر کسی حوالے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پڑھنے والے خود ہی اس بات کو محسوس کر لیتے ہیں کہ یہ مرتب کتاب کی تحریر کردہ سطور ہیں۔ زیرِ تذکرہ کتاب میں پہلے باب کے عنوان ''دارالعلوم دیوبند'' کے تحت لکھے گئے ساڑھے تین صفحات کے اختتام پر کوئی حوالہ درج نہیں ہے۔ جس سے قاری کا فہم یہی ادراک کرتا ہے کہ یہ مضمون مرتب کی دانست ہی سے نکلا ہے۔ ہمیں بھی یہی خیال ہوا اور ہر کتاب پڑھنے والے کو یہی محسوس ہونا بھی چاہئے۔ یہی مرتب کا مقصد ہے۔ لیکن یہ مقصد کتنا پُر فریب ہے اس کا اندازہ ہمیں ذرا سا غور کرنے پر ہو گیا تھا۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے فریب اور افترا کا ذکر کرنے کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ محبوب رضوی صاحب کی تحریروں کا سرقہ کیا گیا ہے۔ ان سطور کو لکھنے کا سبب زیرِ بحث مضمون بھی ہے۔ مرتّب کتاب محمد اللہ صاحب کی تحریری صلاحیت اور علمی لیاقت کی ہمیں خبر ہے اسی لیے جب یہ مضمون پڑھا تو مضمون کی جامعیت اور طرزِ نگارش نے نگاہِ اوّل ہی میں سوچنے پر مجبور کر دیا اور ذرا سی فکر و تدبّر ہی سے اصلیت سامنے آ گئی۔ یہ پورا مضمون جو حوالہ نہ ہونے کی وجہ سے مرتب کے قلم کا شاہکار محسوس ہوتا ہے اصل میں محبوب رضوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا لکھا ہوا ہے۔ جسے تاریخ دارالعلوم جلد اوّل (صفحہ نمبر ۵۸ تا ۶۲) سے سرقہ کیا گیا ہے۔ فاضل مرتب نے بے ڈھنگے پن سے اصل تحریر میں حذف و اضافے کا کام کیا ہے۔ اضافے کے طور پر آغاز مضمون کے بعد پہلے پیرا گراف کی آخری چھ سطروں کے علاوہ آٹھواں اور دسواں پیرا گراف مرتّب نے اصل مضمون میں اضافہ کیا ہے۔ اور کیا ہی بے کیف و بے سود اضافہ ہے۔

حذف کے عنوان پر موصوف نے چوتھا پیرا گراف جہاں ختم کیا ہے وہاں اصل کتاب (تاریخ دارالعلوم دیوبند) میں ساڑھے پانچ لائن اور لکھی ہیں جو واقعی دارالعلوم کے تعارف کے لیے اہم سطور ہیں۔ اب پوچھے کوئی فاضل مرتب سے کہ بھائی آپ نے یہ پانچ سطریں کیوں نقل نہیں کیں۔ جب نقل کرنی ہی تھی تو پورے مضمون کی کرتے۔ اگرچہ حذف شدہ سطور میں محبوب رضوی صاحب نے ملک کی حکومت سے بے نیاز ہو کر ترقی کرنے کا تذکرہ کیا ہے لیکن نہ جانے کیوں محمد اللہ صاحب کو یہ پسند نہیں آیا۔ حذف شدہ اقتباس ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔

> ''اور عجیب تر بات یہ ہے کہ دارالعلوم نے یہ تمام ترقیات حکومت سے بے نیاز رہ کر کی ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی برکات اور عالم گیر فیضان بتلا رہا ہے کہ اس درسگاہ پر علمِ الٰہی اور علمِ نبوی کی ایک تجلیٔ خاص پرتو فگن ہے جو برابر قلوب کو اپنی جانب جذب کرتی رہتی ہے۔ دارالعلوم دیوبند نے کیا اور کتنے عظیم کارنامے انجام دیے اور کیسی کیسی نامور شخصیتیں پیدا کیں اور انہوں نے دینی زندگی کے ہر میدان میں کس طرح اپنی خدمت اور افادیت کے نقوش قائم کیے یہ سب باتیں آپ کو تاریخ دارالعلوم کے مطالعے سے معلوم ہوں گی''۔

یہ وہ تحریر ہے جو فاضل مرتب محمد اللہ صاحب نے شاید اس لیے چھوڑ دی؛ کیونکہ اس کے آخر میں تاریخ دارالعلوم کے مطالعہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور دارالعلوم کی انتظامیہ اب محبوب رضوی صاحب کی مستند تاریخ دارالعلوم کو ناپید کرنے کے درپے ہے اسی لیے تو اپنی مرضی کے مطابق ''جامع و مختصر تاریخ دارالعلوم'' کے نام سے یہ غیر معتبر کتاب شائع کی ہے۔ آپ کتنی بھی دیر تک سوچتے رہیں یہ بات قطعاً سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر فاضل مرتب نے یہ اقتباس نقل کیوں نہیں کیا۔

قیامِ دارالعلوم کا پس منظر (پہلے باب کا دوسرا عنوان)

کتاب تاریخ کی ہو یا کسی اور موضوع کی طریقہ سب میں یہی دیکھا گیا ہے کہ جب بھی مرتب و مصنف کسی دوسری کتاب سے کوئی اقتباس نقل کر کے اس کا حوالہ دیتا ہے تو نقل کیے گئے اقتباس کو یا تو بین القوسین میں لکھا جاتا ہے یا اس کا خط کچھ الگ کیا جاتا ہے یا کوئی اور شکل اختیار کی جاتی ہے تاکہ قاری کو حوالے کے طور پر تحریر کیے گئے کتاب کے نام کو پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہو جائے کہ کہاں سے کہاں تک کتاب سے نقل کردہ اقتباس ہے اور کہاں تک مرتب یا مصنف کے مضامین ہیں۔ جیسے کہ خود ہم نے اس کتاب میں چند صفحات پہلے مہتمم صاحب کا مقدمہ حوالے کے طور پر پیش کیا ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں ہم نے اُس تحریر کی سطور کا سائز کتاب کی مستقل سطور سے کم رکھا ہے تاکہ غیر شعوری طور پر بھی یہ واضح رہے کہ یہ نقل کردہ اقتباس ہے۔ خود ہماری نگارش نہیں، یہی قاعدہ بھی ہے کوئی بھی مصنف کسی بھی کتاب یا تحریر کو پیش کرتا ہے تو اسے اپنی نگارشات میں خلط ملط نہیں کرتا بلکہ وضاحت کے ساتھ پیش کرتا

ہے۔لیکن وائے نصیب یہ دورِ انحطاط! اب ایسے ایسے ٹٹ پونجیا قسم کے لوگ قلم چلا رہے ہیں کہ جسے دیکھ کر دل خون کے آنسو بھی روئے تو کم ہے۔ستم بالائے ستم دیکھئے کہ جس شخص میں ایک صفحہ بھی علمی طور پر تحریر کرنے کی صلاحیت نہیں ہے اسے دارالعلوم کے مہتمم صاحب نے مؤرخ بنا دیا ہے۔مبتدی سے انتہا کا کام لینا کہاں کی دانش مندی ہے۔

جس غیر معتبر کتاب کا ذکر خیر چل رہا ہے اس کی ابتدا ہی اس درجہ غیر معیاری اور فریب دہی پر مبنی ہوگی اس کا اندازہ نہیں تھا۔ ۷۵۲ رصفحات کی اس کتاب کے ابھی چند ورق ہی ہوئے ہیں اور نمونہ آپ کے سامنے ہے۔ پہلے باب کے پہلے ہی مضمون کا حال آپ نے دیکھ لیا ہے، دوسرے مضمون کا حال بھی ویسا ہی ہے۔ پانچ صفحہ کے اس مضمون کے اخیر میں دو کتابوں کے نام مآخذ کا عنوان دے کر حوالے کے طور پر لکھے گئے ہیں۔لیکن برصغیر ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ ملے گا جو اس مضمون کو پڑھ کر یہ بتا سکے کہ اس مضمون کا وہ کون سا حصہ ہے، کون سی سطر ہے جو حوالے کے طور پر پیش کی گئی دو کتابوں سے ماخوذ ہے۔ پانچ کے پانچ صفحے پڑھ جائیے ایک سطر سے بھی معلوم نہ ہوگا کہاں فاضل مرتب کا قلم ہے اور کہاں مآخذ کے نام پر پیش کی ہوئی کتابوں سے اخذ کی گئی تحریریں۔

دوسری کمی ترتیب کی ہے فاضل مرتب نے کتاب کے ٹائٹل پر اپنے نام سے پہلے مرتب کا عنوان ثبت کیا ہے اور پوری کتاب میں جی ہاں پوری کی پوری کتاب میں ترتیب ندارد ہے۔ ہم بالترتیب اس کی وضاحت کرتے چلیں گے۔ فی الحال آپ اسی مضمون کو لیجئے صفحہ نمبر ۵۰ر پر یہ مضمون ختم ہوتا ہے اور اختتام پر مآخذ کا عنوان دے کر ان دو کتابوں کے نام اسی ترتیب سے لکھے ہوئے ہیں:

تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد اول سید محبوب رضویؒ

دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ زندگی حکیم الاسلام قاری محمد طیب قاسمیؒ

دیکھئے قارئین نمبر ایک پہ تاریخ دارالعلوم کا نام ہے اور نمبر دو پہ صد سالہ زندگی کا۔اگر چہ مضمون کی ابتدا جن سطور سے کی گئی ہے وہ پورا پیراگراف قاری طیب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ زندگی کے صفحہ نمبر ۱۳ر سے نقل کیا گیا ہے۔

''کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا'' جس کتاب سے اقتباس نقل کر کے اپنے مضمون کا آغاز کیا ہے حوالے کے طور پر اسی کتاب کو نمبر دو پہ تحریر کرتے ہیں۔کیا یہی حسنِ ترتیب ہے۔دس بیس کتابوں کے نام نہیں ہیں مآخذ میں جس کی بنا پر یہ کہا جاسکے کہ ترتیب دینے میں سہو ہو گیا۔فقط دو ہی کتابیں ہیں؟ لیکن مسئلہ ہے ظرف کا، شعور کا، ادراک کا، تدبر کا اور سلیقے کا۔جو فاضل مرتب میں ہے نہیں۔قارئین یاد رکھئے بات کڑوی لگ سکتی ہے مگر سچ ہے۔ چند

چیزیں ایسی ہیں جو کبھی تعلیم سے حاصل نہیں ہوتیں نہ ہی ہو سکتی ہیں۔ اوّل سلیقہ و شعور، دوم فہم و فراست سوم بصیرت افروز تدبر اور اعلیٰ ظرف۔ ہم نے بھی بڑے بڑے تعلیم یافتہ دیکھے ہیں جنہوں نے حرص اور خود نمائی کے نشے میں کلف کے سفید کپڑے تو پہننے شروع کر دیے، لیکن جوتے پہننے کا شعور انہیں آج تک نہیں آیا۔ بہر حال یاد رکھئے یہ چیزیں تعلیم سے نہیں آتیں بلکہ یہ نسبی اور خاندانی وجاہت کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ جو اللہ کی طرف سے ہر کس و ناکس کو ودیعت نہیں کی جاتیں۔ ہاں! خاندانی و سلیقہ مند نفیس شخصیات کی صحبت سے تو انسان اِنھیں حاصل کر سکتا ہے لیکن فقط تعلیمی ڈگریاں کسی انسان کو ان صلاحیتوں سے بہرہ ور نہیں کر سکتیں۔ سلیقے اور شعور کا یہی فقدان کتاب کو حسنِ ترتیب سے محروم کیے ہوئے ہے۔ آپ خود سوچئے مضمون کا آغاز جس تحریر سے ہو رہا ہے وہ مرتب کے اپنے قلم سے نہیں بلکہ قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب سے ماخوذ ہے، جس کی طرف مرتب نے مضمون کے اخیر میں حوالے کے طور پر اشارہ کیا بھی ہے، لیکن حسنِ ترتیب کا تقاضا کیا یہ نہیں تھا کہ پہلے اخذ کیے ہوئے اقتباس کا حوالہ پہلے اور بعد میں لیے گئے مضمون کا حوالہ بعد میں لکھا جاتا۔ بے شک ترتیب کا حسن اسی کا متقاضی تھا، لیکن تقاضے وہاں پورے کیے جاتے ہیں جہاں شعور کے چراغ میں وجدان کی باتی روشن ہو، جہاں ضمیر کے چاند کو چاپلوسی کا گھن نہ لگا ہو، جہاں احساس کے نُور کو بے حسی کے اندھیرے نہ کھا گئے ہوں۔ لاشعور، بے ضمیر، چاپلوس اور احساس سے عاری لوگوں کو دیانت کا تقاضا پورا کرنے کا خیال نہیں آتا۔ ایسے لوگ صاحبِ اقتدار اور فرماں روا کے تلوے چاٹنے کو سعادت سمجھتے ہیں۔ یہاں تحریر ایک ایک لفظ مبنی بر حقائق ہے۔ الزام تراشی سے اللہ محفوظ رکھے، ہم درج بالا ہر لفظ کو حق بہ جانب ثابت کریں گے۔ ابھی تو کچھ بھی نہیں قارئین آپ شخصیات کے باب میں دیکھئے گا فاضل مرتب کی بے ضمیری اور چاپلوسی کے کیسے کیسے نمونے دیکھنے کو ملیں گے۔

ہاں تو بات چل رہی تھی حوالہ دے کر کسی دوسری کتاب سے اقتباس اخذ کرنے کی۔ ہم نے عرض کیا تھا، جب کوئی عبارت حوالے کے طور پر پیش کی جاتی ہے تو اس کو بین القوسین یا خط کے سائز میں فرق کے ساتھ کتاب کا حصہ بنایا جاتا ہے، تاکہ پڑھنے والے کو آسانی سے معلوم ہو جائے کہ یہ صاحبِ کتاب کی کاوش نہیں، بلکہ نقل کردہ نمونہ ہے جس کی مثال خود اسی مضمون میں صفحہ (نمبر ۴۸) پر پیش کی ہے۔ آپ اصل کتاب کا صفحہ (نمبر ۴۸) دیکھئے اس کے شروع ہی میں حوالے کے طور پر دی گئی تحریر کا سائز کتاب کی اصل تحریر سے کم ہے، ایسا ہی ہوتا ہے اور ایسا ہی ہونا چاہئے تھا لیکن ہوا نہیں یہ پیراگراف بھی غالباً کمپیوٹر سے ٹائپ کرنے والے نے اپنی فہم سے اس طرح کر دیا ہوگا۔ ورنہ فاضل مرتب کو تو یہ شعور ہے ہی نہیں کہ حسنِ ترتیب کہتے کسے ہیں۔ اس کی اہم مثالیں آپ کو ہم شخصیات کے باب میں دکھائیں گے۔ حیرت تو شوریٰ کے ممبران پہ ہے جنہوں نے اس کتاب کو پاس کر دیا۔ ع

"متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی"

خیانت

ہم نے کتاب کے آغاز میں لکھا تھا کہ زیرتبصرہ کتاب ''دارالعلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ'' کو لکھنے میں خیانت سے کام لیا گیا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں آگے اپنے مقام پر بھی آئیں گی۔ فی الحال جس مضمون کا ذکر چل رہا ہے یعنی ''قیام دارالعلوم کا پس منظر'' اس کے تحت مرتب کی بے ترتیبی تو آپ نے ملاحظہ فرمالی ہے، اب آئیے آپ کی توجہ فاضل مرتب کے خائن ہونے کی طرف مبذول کرتے ہیں۔

کتاب کے صفحہ (نمبر ۴۹) پر تیسرے پیرا گراف میں دارالعلوم کے قیام میں شامل علماء کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جن میں ایک اہم نام کو نظرانداز کر کے فاضل مرتب نے اپنی وُسعتِ علمی کا خوب ثبوت پیش کیا ہے اور نام بھی اُس شخصیت کا کہ جس کے بغیر دارالعلوم کے قیام واستحکام کی تاریخ لکھی ہی نہیں جاسکتی۔ ایک ایسی شخصیت جو فقط اپنی قابلیت، فراست، ذکاوت، درایت اور اوصافِ حمیدہ کے سبب ہی قابل ذکر نہیں، بلکہ اپنی صالح اور عظیم المرتبت اولادوں کی وجہ سے بھی معروف ہے۔ جی ہاں خاقانیٔ ہند، حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، یہ وہ اہم نام ہے جو دارالعلوم کے بانیوں میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ بیان کرتے ہوئے جس نے بھی حق گوئی اور غیر متعصب ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے اس نے دارالعلوم کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کے نام کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ لیکن موجودہ مہتمم صاحب کے معتمد مؤرخِ اعظم جو کتاب کے مرتب ہیں انہیں نہ جانے مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی روح اقدس سے کون سا بغض ہوگیا جو ان کا نام تک اکابرستہ سے باہر نکال دینے کی نازیبا حرکت کر بیٹھے۔ مضمون کے اخیر میں فاضل مرتب نے تاریخ دارالعلوم دیوبند اوّل محبوب رضوی کا حوالہ دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ اِن کی یہ تحریر اسی کتاب سے لی گئی ہے۔ قارئین آپ کو یہ جان کر حیرانی ہوگی کہ فاضل مرتب کا یہ عمل سہو نہیں بلکہ دانستہ کیا گیا ہے۔ ہمارے اس قول کی دلیل یہ ہے کہ فاضل مرتب نے جس تاریخ دارالعلوم سے دارالعلوم کے قیام میں شامل بزرگانِ دین وعلماء کا تذکرہ نقل کیا ہے اُس کتاب میں ہر جگہ مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کا نام درج ہے، اس کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے:

تاریخ دارالعلوم جلد اوّل کے صفحہ نمبر ۱۲۳ پہ اکابرستہ کے عنوان سے یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:

''جو حضرات شروع سے دارالعلوم کے قیام اور اس کے نظام کو چلانے میں شریک رہے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی، حضرت حاجی سید محمد عابد حسین، حضرت مولانا رفیع الدین دیوبندی، حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی اور حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی دیوبندی رحمہم اللہ''۔

اور یہی نہیں آگے صفحہ نمبر ۱۴۹ پہ علمی و دینی درس گاہ کے قیام کی فکر کرنے والوں کا تذکرہ کرتے ہوئے محبوب رضوی صاحب نے لکھا ہے کہ:

''اس مرکزی فکر کی روشنی میں حضرت نانوتوی اوران کے رفقاء خاص حضرت مولانا ذوالفقار علی، حضرت مولانا فضل الرحمٰن اور حضرت حاجی محمد عابد رحمہم اللہ نے یہ طے کیا کہ اب دہلی کے بجائے دیوبند میں یہ دینی درسگاہ قائم ہونی چاہئے''۔

دیکھ لیجئے حضرات جس کتاب کا حوالہ فاضل مرتب دے رہے ہیں اسی کتاب میں دارالعلوم کے قیام کا جہاں بھی ذکر ہے وہاں مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کا نام ضرور درج ہے۔کیا اب بھی کوئی دیدہ ور یہ کہہ سکتا ہے کہ مرتب نے خیانت سے کام نہیں لیا ہے۔اس خیانت اور عناد کی وجہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، سر دست ہم تو یہی سوچ سکتے ہیں کہ مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کا نام قصداً اس لیے بھی فراموش کیا ہوگا کیونکہ ان کے نام کے ساتھ ان کی عظیم المرتبت اولادوں کی یاد بھی تازہ ہو جاتی ہے۔اور یہ بات بھی ساری دنیا جانتی ہے دیوبند کے کسی ایک ہی خاندان میں اتنے صاحب علم و صاحب کمال علماء دین پیدا نہیں ہوئے جتنے کہ اس عثمانی خاندان میں ہوئے ہیں۔اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

قارئین! کیوں نہ کتاب کے جائزے کو آگے بڑھانے سے پہلے اس موقع پر مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمہ اللہ کا ذرا تفصیلی تعارف پیش کر دیا جائے جب ذکر چھڑ ہی گیا تو بہتر معلوم ہوتا ہے کہ نسل نو کے علاوہ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ہم یہاں دارالعلوم کے بانیوں میں سے ایک حضرت عثمانی کا تذکرہ کریں، بلاشبہ یہ تفصیل مستقبل میں کام آئے گی۔مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ پر کسی نے کوئی تصنیفی کام نہیں کیا۔جب ہم نے ان کے بارے میں تحقیق کرنا شروع کی تو دارالعلوم کی ابتدائی رودادوں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔اس کے علاوہ مولانا اصغر حسین میاں صاحب کی کتاب ''حیاتِ شیخ الہند:'' میں خاقانئ ہند کے نام سے ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ہماری تلاش جاری تھی کہ اللہ کی نصرت کے طور پر ہمیں ایک کتاب نظر آئی، جس میں مولانا عثمانی کا سوانحی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔کتاب ایک غیر معروف مصنف کی تحریروں کا مجموعہ ہے؛ لیکن تحریریں دلکش اور مبنی برحقائق کا عنوان رکھتی ہیں۔اُسی کتاب ''کشکول عثمانی'' سے ہم آپ کے لیے مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کا سوانحی خاکہ پیش کر رہے ہیں۔

جس شخصیت کا نام تک لکھنا دارالعلوم کی جدید تاریخ لکھنے والے نے گوارا نہ کیا اس کا مختصر تعارف پیش کرنے سے دو فائدے ضرور ہوں گے، پہلا: آپ کی معلومات میں اضافہ اور دوسرا: فاضل مرتب کی دانستہ غلطی کا ازالہ بھی ہو جائے گا۔

یکے از بانیان دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

اور کچھ تاریخی حقائق

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہِ الکریم

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ مولانا فضل الرحمٰن عثمانی نوراللہ مرقدہٗ کا نام و ذکر آتے ہی ہمارے ذہن میں یہ خیال اور زبان پہ یہ الفاظ ہوتے کہ اب مولانا فضل الرحمٰن عثمانی جیسی مشہور و معروف اور یکے از بانیان دارالعلوم جیسی عظیم المرتبت شخصیت پر مضمون یا مقالہ پڑھ کر، کیا نئی بات معلوم ہوگی۔ انہیں کون نہیں جانتا؟ تمام علمی دنیا کے لوگ ان سے واقف ہیں، کئی کتابیں ان کی سوانح حیات پر اہل قلم کی کاوشوں اور حق بیانی کا نتیجہ بن کر شائع ہو چکی ہیں، کئی درسگاہیں ان سے منسوب ہیں، کئی عمارتیں ان کی یادوں کے امین کی حیثیت سے اپنی جلوہ نمائی کو ثابت کر رہی ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ قیام دارالعلوم دیوبند میں مولانا فضل الرحمٰن عثمانی اُس تناور درخت کا نام ہے جس کی شاخوں کے گھنے پتوں کا سایہ آج بھی تمام عالم کو اپنے علمی سائے سے مستفیض کر رہا ہے۔ لیکن......

لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن عثمانی جیسی شخصیت کو تاریخ کے گم گشتہ اوراق کی طرح ایسے نظر انداز کیا گیا ہے جیسے ہندوستان کی حکومت نے ملک کی آزادی میں حصہ لینے والے اور ملک پر اپنی جانیں قربان کرنے والے مسلمانوں کے کارناموں کو فراموش کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ سرکاری یا غیر سرکاری تمام اسکول کی کتابیں اٹھا کر دیکھ لیجئے، آزادیٔ ملک کی بالکل ہی جھوٹی داستان بنا کر بچوں کے ذہنوں کو غلط معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ دراصل اقتدار جس کے ہاتھ میں ہوتا ہے بات اُسی کی چلتی ہے۔ وہ کہتے ہیں نا... "جس کی لاٹھی اس کی بھینس"

اب یہ غلط فہمی تھی یا فقط ایک ہی نام کو مشہور کر کے اس کے خاندان کی تشہیر کرنے کا مقصد، یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے لیکن یہ بات ہے بڑی عجیب اور حیرت انگیز کہ آخر کیوں دارالعلوم کے بانیوں میں سے صرف ایک ہی نام کی اس درجہ تشہیر کی گئی کہ باقی چار اہم ناموں کو قیام دارالعلوم کی تاریخ سے اس طرح محروم کر دیا گیا جیسے بابری مسجد سے مسلمانوں کے تمام استحقاق چھین لئے ہیں۔

بانی دارالعلوم کی حقیقت جاننے کے لئے مزید تفصیلات ۲۰۱۴ء میں مولانا عبدالحفیظ رحمانی صاحبؒ کی شائع شدہ کتاب ''بانی دارالعلوم اور تاریخی حقائق'' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں جو ایک صداقت آمیز انکشاف کی حیثیت رکھتی ہے۔

دیکھا جائے تو دیگر بانیین کو بالخصوص ۱۹۴۷ء کے بعد ایسے نظرانداز کیا گیا جیسے خوبصورت عمارت بننے کے بعد لوگ بنیاد کو نظرانداز کردیتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ پوری عمارت کا بوجھ ان ہی بنیاد کے پتھروں نے اپنے سینے پر اٹھا رکھا ہے۔ کوئی تعمیر بغیر بنیاد کے ممکن نہیں اور بنیاد بھی مضبوط و سلیقے سے رکھی جانا ضروری ہے کیوں کہ بنیاد اگر مضبوط ہو تو عمارت کھنڈر بھلے ہی ہوجائے لیکن کبھی گرتی نہیں۔

مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام بھی دارالعلوم کے قیام میں بنیاد ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ خلیفۂ سوم حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سلسلے کے امین مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ۷ ۱۲۴۷ھ ۱۸۳۱ء کو دیوبند کے معزز عثمانی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دیوبند اور گھر کے ہی بزرگوں سے حاصل کی بعد ازاں استاذ الاساتذہ مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ سے اکتساب فیض کے لیے دہلی کالج میں داخل ہوئے اور منطق و فلسفہ، علم کلام وغیرہ تمام علوم و فنون کی کتابیں انہیں سے پڑھیں پھر اس کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی درسگاہ میں حاضر ہو کر حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلوی سے حدیث کی متداول کتابوں کی سند حاصل کی۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد حکومت کی طرف سے ڈپٹی انسپکٹر آف مدارس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ حاجی فضل حق صاحبؒ اپنی کتاب ''مولانا احسن نانوتوی'' میں لکھتے ہیں:

> ''حضرت مولانا بریلی، بجنور اور سہارنپور وغیرہ اضلاع میں ڈپٹی انسپکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ ۱۸۵۷ء میں بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے، اِس ہنگامہ میں مولانا محمد احسن نانوتوی کو بریلی چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا تو اپنے بعض معاملات اُن ہی (حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی دیوبندی) کے سپرد کئے تھے۔'' (مولانا محمد احسن نانوتویؒ: ص ۵۳)

حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کی شعرگوئی

شاعری اللہ رب العزت کی طرف سے عطا کیا ہوا ایک لطیف اور حساس فن ہے۔ ایسا فن جو انسان کے ظاہر ہی نہیں بلکہ باطن پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ کون جانے کب کس کا شعر کسی کے جذبات سے ہم آہنگ ہو کر دردِ دل کو چھوتا ہوا گزر جائے اور سامع کی آنکھوں پر سائے بان کی مانند سجی پلکیں برسات کے موسم میں کسی ٹپکتے ہوئے چھپر کی طرح غم و بے بسی کا اظہار کرنے والی دیدۂ نمناک کا عنوان بن جائیں۔ حضرت حسان بن ثابت سے لے کر علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی اور مولانا عامر عثمانی تک شاعری نے ہر عنوان پر لوگوں کو کیف و آسودگی دینے کے ساتھ ساتھ قوم کے سرد جذبوں میں گرمی اور جوش بھی پیدا کیا ہے۔ اچھی اور سچی شاعری کبھی اسلامی عقائد اور الوہیت سے

اختلاف نہیں کرتی۔ایسی ہی سچی اور پُر اثر شاعری کا ہنر حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ میں بھی تھا۔آپ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ کو عربی، فارسی و اردو تینوں زبانوں میں نظم ونثر پر کلام کرنے کی قدرت تھی۔ دارالعلوم کی پرانی روئیداد میں متعدد نظمیں اور غزلیں آپ کے فن کی آئینہ دار ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کا نظام تعلیم اور طلبہ کی حاضری کا نظم

چونکہ مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ڈپٹی انسپکٹر آف مدارس تھے تو مدارس کے نظام اور انتظام سے بہ خوبی واقف تھے۔اسی لیے ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم کے قیام کے کچھ سالوں بعد جب طلبہ کی تعداد بڑھی تو مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے باقاعدہ طالب علموں کی حاضری کا نظام بنایا اور کچھ دستی کاغذ کی جلد سازی کروا کر حاضری کا رجسٹر بنایا گیا۔اس سے پہلے ایسا کوئی نظام اس مدرسہ عربیہ میں نہیں تھا۔

مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی قابلیت اور دینی فہم وادبی لیاقت کا شاہد تمام قصبہ تھا، دیوبند میں اُن کی عزت ووجاہت کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سوانح قاسمی میں رقمطراز ہیں:

''مولانا فضل الرحمٰن عثمانی دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ اپنی علمی حیثیت اور تعلیمی تجربے کے لحاظ سے قصبہ میں ممتاز تھے'' (ج ۲ ص ۲۵۳)

قیام دارالعلوم اور مولانا عثمانی کا پہلا چندا

مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر رفقاء کے مشورے کے بعد جب چھتہ مسجد سے مدرسے کی ابتدا کردی گئی تو ضرورتِ رقم کی وجہ سے سب سے پہلے سید حاجی عابد حسین صاحب ؒ نے عوامی چندے کی مہم شروع کی اور ایک دن بوقت اشراق اپنے رومال کی جھولی بنا کر تین روپئے اپنے پاس سے ڈال چھتہ مسجد سے تن تنہا نکلے اور مولوی مہتاب علی عثمانی ؒ کے پاس گئے مولوی صاحب نے خوش دلی کے ساتھ چھ روپئے عنایت کیے اور دعا کی، اس کے بعد حاجی صاحب محلہ ابوالمعالی میں واقع مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تشریف لے گئے مولانا عثمانی نے فوراً کشادہ پیشانی کے ساتھ اپنی جیب میں موجود بارہ روپئے حاجی صاحب کے رومال میں ڈال دیے۔سن ۱۸۶۶ء/ ۶۷ءیعنی آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے جب تین اور چار روپئے میں ایک بھرے گھر کا مہینے کا سودا آجاتا تھا، جس سودے میں دیسی گھی بھی شامل ہوتا تھا۔اُس زمانے میں بارہ روپئے صرف ایک آواز پر اللہ کی رضا اور اس کے دین کی بقا وفلاح کے لیے خوش دلی اور خوش اخلاقی کے ساتھ نہ یہ کہ صرف پیش کر دیے بلکہ خود بھی حاجی صاحب کے ساتھ دین کی اس خدمت میں شریک ہو کر اپنے خالہ زاد بھائی مولانا ذوالفقار علی عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تشریف لے گئے، اتفاق سے اُنہوں نے بھی بارہ ہی روپئے چندہ دیا وہاں

سے پھر یہ لوگ محلہ ابوالبرکات کی طرف سے ہوتے ہوئے مسجد میں واپس آئے تو شام تک تقریباً تین سو روپئے جمع ہو چکے تھے۔ خیر یہ باتیں سب کو معلوم ہیں تاریخ دارالعلوم میں اس کی مزید تفصیل موجود ہے۔ یہاں اس کے ذکر کا مقصد فقط یہی ہے کہ وہ مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم کے قیام سے لے کر اپنی وفات تک دارالعلوم کی خدمت اور اس کی فلاح و بقا میں دامے درمے سخنے ہر طرح سے سرگرم عمل رہے ان ہی کے ساتھ ایسا سوتیلا پن اختیار کیا گیا، ایسی خود غرضی کا مظاہرہ کیا گیا کہ اُن کی آخری نشانی یعنی اُن کی قبر تک کو نہیں بخشا۔ مولانا عثمانی کا انتقال ۱۹۰۷ء میں ہوا اور حضرت مولانا قاسم نانوتوی علیہ الرحمہ کے مزار سے نیچے کی جانب اُن کی تدفین کی گئی، دیوبند اور تاریخ دارالعلوم کے علاوہ دیگر کتب و قدیم روئداد میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ اور ہم نے خود مولانا حسین احمد مدنی کے برابر میں اُن کی قبر پر بچپن سے فاتحہ پڑھی ہے ایک باضابطہ قبر کو ۲۰۰۸ء میں بہ زور ختم کر دیا گیا، صرف اس لیے کہ وہاں مولانا اسعد مدنی کو دفنایا جاسکے تا کہ والد کے برابر میں بیٹے کی قبر بن جائے۔

اس مختصر مضمون میں مولانا عثمانی کی مکمل و مفصل سوانح کا موقع نہیں یہ سطور فقط اس لیے قلم کی نوک پہ آ گئیں کیونکہ حال ہی میں اخبار روز نامہ انقلاب اردو کے دارالعلوم ضمیمے میں شائع ہوئے مضامین دیکھ کر افسوس ہوا کہ کیسے تاریخ گوئی کے بجائے تاریخ سازی کے فن کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ اس سے بڑی تنگ نظری اور کیا ہوگی کہ جمعیۃ علمائے ہند کے عہدے داران کا تعارف لکھتے ہوئے ایک اہم اور کامیاب رکن مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کو یکسر نظرانداز کر دیا گیا۔ جمعیۃ کے ورکنگ صدر رہنے کے علاوہ جمعیۃ علمائے ہند کو ایک اعلیٰ مقام عطا کرنے والے بے باک وبے راو اور ایماندار شخص کا نام تک مولانا ارشد مدنی سے منسلک مضمون میں نہیں ہے۔

مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے بس اتنا ہی نہیں کہ خود دارالعلوم کی تاحیات بے لوث خدمت کر اُسے پروان چڑھایا بلکہ اپنی اولادوں کو بھی ایسی اعلیٰ تعلیم اور بے مثال تربیت دی کہ آج تک اُن کی اولادوں کا ثانی چشم فلک نے نہیں دیکھا اور نہ ہی اِس زمین نے اُن کے بعد اس درجہ عظیم المرتبت شخصیات کے قدموں کی دھمک اپنے سینے پر محسوس کی۔

مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی کل تین شادیاں ہوئیں پہلی زوجہ لاولد رہیں اور دیگر دو بیویوں سے دس اولادیں ہوئیں ۹ ربیٹے اور ایک بیٹی۔ یوں تو مولانا عثمانی کے تمام ہی فرزند صاحب کمال اور صاحب فن ہیں لیکن آپ کے چار بیٹے ایسے ہوئے ہیں جن کی علمی قابلیت اور دینی خدمات کا پرچم آج تک ''شہرت'' اپنے ہاتھوں میں لیے تمام عالم میں گھوم رہی ہے۔ اُن عظیم المرتبت میں اول الذکر آپ کے دوسرے نمبر کے فرزند دارالعلوم دیوبند کے اولین مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ (ایک ذراسی وضاحت یہ کہ راقم ابھی اگست ۲۰۱۵ء میں پاکستان گیا تھا وہاں خاندان کے بزرگوں سے مولانا عثمانی کی اولاد کے بارے میں گفتگو

ہوئی تو ایک نیا انکشاف ہوا، مولانا کے آٹھ نہیں نو بیٹے تھے، راقم نے کہا بھی کہ ہم نے ہمیشہ آٹھ ہی کا تذکرہ سُنا اور پڑھا ہے، اُس کے جواب میں مولانا عثمانی کے پوتے مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (مصنف تفسیر فیض الرحمٰن) کی صاجزادی (عمر تقریباً ۷۰ سال) نے بتایا ''نہیں نو ہی بیٹے تھے ہم نے خود اپنے والد صاحب اور چچا شبیر سے سُنا ہے سب سے بڑے بیٹے کا نام عبدالرحمٰن تھا یہ مفتی عزیز الرحمٰن سے بڑے تھے اور دارالعلوم دیوبند کے قیام کے وقت والد صاحب کے ساتھ شریک تھے ان کا انتقال اٹھارہ سال کی عمر میں ہی ہوگیا تھا ان کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔'' شاید اسی لیے ان کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اس بات کی تصدیق مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کے سب سے چھوٹے پوتے یوسف عثمانی صاحب نے بھی کی بقول اُن کے ''چچا شبیر ۹/ بھائی تھے'') اسی لیے راقم نے مفتی صاحب کو دوسرے نمبر کے فرزند لکھا ہے۔

مفتی صاحب کے تقویٰ اور زہد وورع کے واقعات سے کتابوں کے اوراق روشن ہیں اور فتاویٰ دارالعلوم کے نام سے حضرت مفتی صاحب کے فتاویٰ کی اشاعت کا عظیم سلسلہ جاری ہے اب تک ۱۶/ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

ثانی الذکر **فخر الهند حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ** ہیں جو دارالعلوم دیوبند کے پانچویں مہتمم تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی ترقیات میں سب سے اہم کردار مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ ہی کا ہے۔ آپ ہی کے دور میں دارالعلوم نے سب سے زیادہ ترقی کے مراحل طے کیے ہیں۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ مولانا منیر نانوتوی کے بعد جب حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مہتمم بنایا گیا تو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب نے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کو اہتمام کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے کہا اور دارالعلوم کی قدیم روئیداد میں مددگار مہتمم کے نام سے ہر ماہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کا نام شائع کیا جاتا تھا۔ (اب یہ بات تو بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ مدد کس کی جاتی ہے۔) دارالعلوم کی تاریخ میں پہلے اور اس کے بعد کبھی مددگار مہتمم کے نام کا کوئی عہدہ نہیں رہا۔ مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ کی عظیم نسبت کے سبب مہتمم بنائے گئے تھے۔ اصل محرک اور اہتمام کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب نے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کو ہی مہتمم بنایا تھا۔ احقر کی بات پر تصدق کی مہر ثبت کرنے کی غرض سے مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحب کی کتاب حکیم الاسلام ایک شخصیت ایک عہد میں سے مولانا منظور نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تحریر پیش ہے:

''حضرت حافظ محمد احمد صاحب کے حیدرآباد تشریف لے جانے سے پہلے بھی اہتمام سے متعلق کاموں کا زیادہ تعلق حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحب ہی سے رہتا تھا۔'' اس کے بعد لکھتے ہیں: ''ایک دفعہ دارالعلوم کی میری طالب علمی ہی کے زمانے میں ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں اپنے کو دارالعلوم کا نائب

مہتمم کہتا اور لکھتا ہوں لیکن واقعہ یوں ہے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے جب مجھے اس خدمت کے لیے ماموراور مقرر کیا تھا تو مجھے ''نائب مہتمم'' نہیں بلکہ ''مہتمم ثانی'' بنایا تھا۔'' (حکیم الاسلام قاری محمد طیب: ص ۷۲)

مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت مولانا قاسم نانوتوی علیہ الرحمہ سے بے حد عقیدت و محبت تھی، اسی وجہ سے آپ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کو اپنے بیٹے کی طرح چاہتے تھے۔ خود بے اولاد تھے، شاید اسی لیے دل کے گوشے میں دبی تمام پدرانہ شفقت و محبت حضرت قاری طیب صاحب کی طرف مبذول رہتی تھی ۔اسی شفقت، محبت، توجہ اور مولانا کی شخصیت سازی نے حضرت قاری صاحب کو حکیم الاسلام بنا دیا تھا۔

حضرت قاری صاحب کو مہتمم بنانے کے لیے سب سے اختلاف

فخر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت قاری صاحب سے اس درجہ محبت تھی کہ حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (والد ماجد قاری صاحب) کے انتقال کے بعد جب کہ آپ باضابطہ خود مہتمم کے عہدے پر فائز تھے اپنی جگہ حضرت قاری محمد طیب صاحب کو مہتمم بنانے کا فیصلہ کیا۔ قاری صاحب اُس وقت ر۳۱ سال کے تھے اس لیے علامہ انور شاہ کشمیری، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی و حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی وغیرہ علمائے وقت نے اس پر اعتراض ظاہر کیا۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے ایک جلسے میں مہتمم صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''دارالعلوم وقف ہے ارث نہیں، کہ باپ کے بعد بیٹے کو ہی لازمی مہتمم بنایا جائے'' علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب نے بھی اپنے برادر اکبر اور مہتمم مدرسہ سے اپنی بات پیش کرتے ہوئے کہا'' آپ علامہ کشمیری کو اہتمام کی ذمہ داریاں عنایت فرمادیں وہ اس کے بخوبی اہل ہیں، قاری صاحب ابھی بہت کم عمر ہیں''، لیکن.....

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحبؒ فیصلہ کر چکے تھے، جب اختلاف زیادہ ہوا تو اُنہوں نے کہلوا دیا:'' جسے میرے اس فیصلے سے اعتراض ہے اُسے اختیار ہے کہ وہ دارالعلوم میں رہنا چاہے تو رہے ورنہ چلا جائے'' اس بات سے اپنے وقت کے کبائر و جید علماء کا یہ وفد دارالعلوم کو خیر آباد کہہ کر ڈابھیل (گجرات) منتقل ہو گیا۔ اور دارالعلوم بہت بڑے علمی سائے بان سے محروم ہوتا رہا۔

(اس تاریخی حقیقت پر مبنی واقعے کو پڑھنے کے بعد ہر بات کا حوالہ معلوم کرنے والی ذہنیت یہاں بھی یہ سوال پوچھے گی: ''تم کیسے اس بات کو ثابت کروگے کہ یہ واقعہ اسی طرح پیش آیا تھا''۔ تو اسی بابت عرض ہے کہ کچھ باتیں کتابوں سے نہیں ملتیں بلکہ سینہ بہ سینہ چلتی ہیں اور صحبت سے حاصل ہوتی ہیں ۔ یہ واقعات راقم نے اپنے گھر کے بڑے بزرگوں سے سُنے ہیں اور اُنہوں نے اپنے والد یعنی مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے برادران سے سنے جو ان واقعات کے عینی شاہدین میں سے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک مرتبہ ۲۰۰۲ء میں احقر نے خود حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی یہ واقعہ اسی طرح سنا تھا۔) خبر نہیں کیوں حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب نے بھی کبھی

اس واقعے کو منظر عام پر نہیں آنے دیا، یہاں تک کے تاریخ دارالعلوم دیوبند میں بھی محبوب رضوی صاحب کو علامہ عثمانی اور علامہ کشمیری کے ڈابھیل جانے کا سبب بیان کرنے کے بجائے بس اتنا ہی لکھنے پر مجبور کیا گیا: "دارالعلوم سے بعض اختلافات کے سبب حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی وغیرہ حضرات جامعہ اسلامیہ ڈابھیل تشریف لے گئے"۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند: ج ۲ ص ۹۹)

بہر حال جو ہوا سو ہوا اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی بہترائی شامل تھی۔ اسی کے بعد علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب نے مسلم شریف کی شرح کا کام شروع کیا تھا۔

وقت گزر گیا مگر ستم دیکھئے کہ وہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی! جنہوں نے حضرت قاری صاحب کی محبت اور مولانا قاسم نانوتوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عقیدت میں اپنے دوست علامہ کشمیری اور اپنے بھائیوں تک سے اختلاف کر لیا تھا، اُنہیں کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا کہ قاسمی قبرستان میں موجود ان کی باضابطہ قبر کا نام ونشان تک مٹا دیا۔ حاجی متحسن صاحب مرحوم کی قبر کے نزدیک ہی مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر تھی جس پر تقریباً تین فیٹ اونچا پتھر بھی لگا ہوا تھا جس پر مرحوم کے نام کے ساتھ مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند بھی تحریر تھا، جسے پڑھ کر ہر آنے والے کو معلوم ہوتا تھا کہ مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کے فرزند فخر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی یہاں مدفون ہیں۔ بڑی بے رحمی سے اُن کی قبر کے پتھر کو اُکھاڑ پھینکا، کیوں.....؟ اس کا جواب تو قبرستان کے متولی ہی دے سکتے ہیں۔ ایسی کون سی دولت یا راحت ہے جو مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی قبر کے پتھر کو اُکھاڑ کے حاصل کی گئی ہے۔

حضرت مولانا الشیخ مطلوب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ: یہ مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کے چھٹے ر ۶ نمبر کے فرزند ہیں آپ عمر میں علامہ شبیر احمد عثمانی سے بڑے ہیں۔ حضرت شیخ الہند کے خاص تلامذہ میں سے ہونے کے ساتھ ساتھ اُن کے خلیفہ بھی تھے۔ آپ تحریک ریشمی رومال میں شیخ الہند کے ہمراہ ملک کی آزادی کی لڑائی میں شریک رہے۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد انگریزی بھی پڑھی اور پھر حکومت کی جانب سے انجینئر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ کچھ سال ملازمت کرتے رہے، لیکن دل کو قرار نہیں تھا اپنی بے چینی اور اضطرابی کیفیت کا ذکر اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ الہند سے کیا تو اُنہوں نے انگریزوں کی ملازمت ترک کرنے کا مشورہ دیا۔ اپنے شیخ کی فرمانبرداری میں اُسی دن ملازمت چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ زہد وورع اور تقوے کی شدت کے سبب اللہ رب العزت نے لوگوں کے دلوں میں آپ کے لیے محبت پیدا فرما دی۔ آپ جس پر بھی شفقت کا ہاتھ رکھ دیتے، جس کے لیے دعا فرما دیتے اُس کی زندگی سنور جاتی۔ ملک آزاد ہو جانے کے بعد اپنے برادر اصغر علامہ شبیر احمد عثمانی کے کہنے پر پاکستان تشریف لے گئے ۱۹۵۰ء میں واپس بھارت آئے اور پھر ۱۹۵۲ء میں ہمیشہ کے لیے ہندوستان کو خیر آباد کہہ کر کراچی کے پیر الٰہی بخش کالونی میں سکونت اختیار کی۔ آپ کا انتقال وہیں جون ۱۹۶۰ء میں

ہوا۔ پاکستان میں آپ کے مریدین کا بہت بڑا حلقہ ہے۔آپ کے چھ بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔شہرہ آفاق شاعر اورشہنشاہِ قلم حضرت مولانا عامر عثمانی صاحب (مدیر ماہنامہ تجلی) آپ ہی کے صاجزادے ہیں۔

حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی یکے از بانیان دارالعلوم دیوبند کے چوتھے مشہور صاجزادے **شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہ** ہیں۔اللہ رب العزت نے شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب کو وہ بلند و بالا مقام عطا کیا ہے کہ علمی دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جو آپ کے نام اور مقام سے واقفیت نہ رکھتا ہو۔بے شمار کتابوں میں آپ کے سوانحی خاکے شائع ہو چکے ہیں۔تفسیر عثمانی کے نام سے قرآن پاک کی شہرہ آفاق تفسیر سے لے کر دیگر علوم وفنون کی لازوال کتابیں تصنیف کرنے والے علامہ شبیر احمد عثمانی کا دوسرا عظیم کارنامہ حدیث کی مشہور کتاب مسلم شریف کی عربی شرح ہے، جو آپ نے فتح الملہم کے نام سے تحریر کی۔برصغیر میں عربی زبان میں مسلم شریف کی یہ سب سے جامع شرح ہے۔آپ کے بارے میں مزید تفصیل سے لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

ہر چھوٹا بڑا آپ کے علم وفضل اور حیات مجاہدانہ سے بخوبی واقف ہے۔آپ ۱۸۸۵ء کو ضلع بجنور میں پیدا ہوئے جہاں آپ کے والد ماجد حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ڈپٹی انسپکٹر آف مدارس کے عہدے پر فائز تھے۔آپ نے ایک عرصے تک دارالعلوم دیوبند میں درس دیا اور ۱۹۲۸ء کو ڈابھیل تشریف لے گئے پھر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد پر ۱۹۳۵ء میں دارالعلوم دیوبند میں واپس بلا لیے گئے اور ۱۹۴۴ء تک صدر مہتمم کے عہدے پر فائز رہے مسلم لیگ کی سربراہی کرتے ہوئے ایک آزاد مسلم مملکت کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی غرض سے پاکستان کی تکمیل میں حصہ لیا اور ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی اول پرچم کشائی کی۔

۱۳/دسمبر ۱۹۴۹ء کو آزاد پاکستان کے شہر بہاول پور میں انتقال ہوا آپ کو وہاں سے کراچی لایا گیا اور یہیں اسلامیہ کالج کے احاطے میں آپ کا مزار واقع ہے۔

بات طویل ہوگئی لیکن حقیقت یہی ہے فقط مولانا فضل الرحمٰن عثمانی یکے از بانیان دارالعلوم دیوبند نے تنہا ہی دارالعلوم کی خدمت کرتے ہوئے اپنے خونِ جگر سے اسے نہیں سینچا بلکہ آپ کی فائق اور لائق اولاد نے بھی تا عمر اس شجرِ دینیہ کی آبیاری کی ہے۔ (کشکولِ عثمانی: ص ر ۱۸۰)

......❖......

اس مضمون کو نقل کرنے سے پہلے ہم نے لکھا ہے ''دیوبند کے کسی ایک ہی خاندان میں اتنے صاحب علم اور صاحب کمال پیدا نہیں ہوئے، جتنے کہ اس عثمانی خاندان میں ہوئے ہیں''۔اپنے اس قول کی توثیق وتصدیق کے

لیے ہم آپ کی خدمت میں مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کے بیٹوں اور پوتوں و پڑپوتوں کا نام درج کر رہے ہیں۔آپ بھی دیکھئے کیسے کیسے بڑے بڑے نامور عالم دین اور قلم کار اس خاندان نے دنیا کو دیے ہیں۔

۱-مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (یکے از بانیانِ دارالعلوم دیوبند)

۲-فقیہ اعظم مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اوّل مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند

۳-فخر الہند مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند

۴-الشیخ مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ

۵-شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند

۶-مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ استاذ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد

۷-مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ بانی ندوۃ المصنفین دہلی

۸-مولانا قاری جلیل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ استاذ دارالعلوم دیوبند

۹-مسعود جاوید عثمانی رحمۃ اللہ علیہ استاذ حسین آباد انٹر کالج لکھنؤ (جاسوسی دنیا کے ناول نگار)

۱۰-مولانا زبیر افضل عثمانی رحمۃ اللہ علیہ معاون مدیر ماہنامہ تجلی

۱۱-مدبر اسلام مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ مدیر ماہنامہ تجلی دیوبند

۱۲-عمر فاروق عاصم عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (شاعر و ادیب)

۱۳-مبلغ اسلام مولانا شمس نوید عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (مصنف: کیا ہم مسلمان ہیں اور اگر اب بھی نہ جاگے تو)

۱۴-مفسر قرآن مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مفتیٔ اعظم دارالعلوم وقف دیوبند

۱۵-مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی رحمۃ اللہ علیہ مفتی دارالعلوم دیوبند

۱۶-انجم عثمانی صاحب مدظلہ العالی (فاضل دارالعلوم اور معروف ادیب و افسانہ نگار)

۱۷-مولانا انیس الرحمٰن عثمانی صاحب فاضل دارالعلوم اور کئی چھوٹی کتابوں کے شارح۔

۱۸-مولانا مفتی انور عزیز عثمانی فاضل دارالعلوم و شارح طحاوی شریف بنام تسہیل الطحاوی

حضرات! یہ ہیں دیوبند کے عثمانی خاندان کی وہ نامور شخصیات جن کے فن اور کام سے ایک جہاں آشنا ہے۔

اور اِن اٹھارہ ۱۸/ناموں میں فقط ۳/نام ایسے ہیں جو دارالعلوم سے فارغ نہیں باقی تمام اہلِ علم کی تعلیم دارالعلوم دیوبند ہی میں ہوئی ہے۔ان تین افراد میں اوّل تو دارالعلوم کے بانیوں میں سے ایک مولانا فضل الرحمٰن عثمانی ہیں کہ انہیں کی فکر و جدو جہد سے یہ ادارہ قائم ہوا اور باقی دو نام یہ ہیں، جن کی تعلیم کالج و یونیورسٹی کی مرہون منت رہی ہے۔(۱) مسعود جاوید عثمانی (۲) شمس نوید عثمانی،ان کے علاوہ باقی سبھی شخصیات نے دارالعلوم دیوبند

سے اکتسابِ فیض کیا ہے؛ حالانکہ ان دونوں کی بھی ابتدائی تعلیم تو دارالعلوم ہی میں ہوئی،لیکن مکمل عربی سے فراغت نہیں ہے۔

یہ وہ عظیم خاندان ہے جس کے ہر ہر فرد نے علم وادب کی درخشاں خدمات انجام دی ہیں۔درج بالا ناموں میں چند اسمائے گرامی تو ایسے ہیں جن کی علمی خدمات کو تاریخ مرتب کرنے والا کوئی بھی شخص فراموش نہیں کرسکتا۔

لیکن دارالعلوم دیوبند کے موجودہ مہتمم صاحب نے جس شخص سے دارالعلوم کی جدید تاریخ مرتب کرانے کا کارنامہ انجام دلوایا ہے اُن مؤرخ اعظم کی قلتِ معلومات، کج فکری اور تنگ ذہنی کا اندازہ آپ اس بات سے بخوبی لگا سکتے ہیں کہ انہوں نے اس خاندان کے عظیم المرتبت اُن افراد کا ذکر کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا، جن کی علمی خدمات اظہرمن الشمس ہیں۔جس کی زندہ مثال مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحب ہیں۔جن کی متعدد کتابیں مختلف موضوعات پرشائع ہو چکی ہیں اورنورالقرآن کے نام سے ۷/جلدوں میں قرآن پاک کی تفسیر بھی منظر عام پر آچکی ہے۔لیکن فاضل مرتّب نے دیوبند کی شخصیات کا ذکر کرتے ہوئے مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی کا کہیں نام تک نہیں لکھا۔بہر حال!''کوئی دیکھے یا نہ دیکھے اللہ دیکھ رہا ہے''

......❖......

آئیے حضرات جائزے کو آگے بڑھاتے ہیں۔پہلے باب کے عنوان کے بعد صفحہ ۵۱/سے تیسرا عنوان شروع ہوتا ہے''دارالعلوم کا نصب العین''اس میں اُصول ہشت گانہ کی خصوصیات کے تحت صفحہ نمبر ۵۵ پہ لکھا ہے:

> ''حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے تحریر فرمودہ ہشت نکاتی دستور العمل کی تیسری دفعہ میں اس امر پر زور دیا ہے کہ مشیران ہمیشہ مدرسہ کی خوبی اور خوش اُسلوبی کو مدنظر رکھیں، اور اپنی رائے کی مخالفت اور تنقید کو ناگوار نہ سمجھیں ورنہ مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائے گا۔اخلاص اور آزادیٔ اظہار رائے،جمہوری نظام کے یہ دو عمدہ اُصول ہیں جن سے بہتر کوئی دوسرا طریق کار نہیں ہوسکتا''۔

دیکھ لیجئے قارئین مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کیا فرما گئے ہیں، پڑھیے اور بار بار درج بالا سطور کو غور سے پڑھیے پھر آج کے مہتمم صاحب کا عمل دیکھئے، جو سراسر اس اُصول کے خلاف ہے۔موجودہ مہتمم صاحب کو اپنی رائے کے خلاف رائے رکھنے والے پسند نہیں اور نہ ہی اصلاحی وتعمیری تنقید پسند ہے۔جس کی تازہ مثال یہی جھوٹی کتاب ہے۔''دارالعلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ''اس کتاب کی اشاعتِ اوّل کے بعد ہی مہتمم صاحب کو دیوبند

کے کئی لوگوں نے کتاب کی ترتیب و تالیف میں برتی گئی لاپرواہی، بد دیانتی اور تنگ نظری کی طرف تحریری توجہ دلائی۔لیکن مہتمم صاحب نے کسی ایک کو بھی لائق اعتنا نہیں سمجھا اور کتاب میں تصحیح نہیں کی بلکہ کتاب کے اسی طرح غلط اور غیر معتبر مواد سے بھرے ایڈیشن پہ ایڈیشن شائع ہو رہے ہیں۔ پہلا ایڈیشن محرم ۱۴۳۸ھ مطابق اکتوبر ۲۰۱۶ء، دوسرا ایڈیشن ربیع الاول ۱۴۳۸ مطابق دسمبر ۲۰۱۶ کے بعد بھی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، لیکن کتاب میں اب تک کوئی تصحیح نہیں کی گئی۔ حالانکہ مہتمم صاحب کو پہلے ہی ایڈیشن کے بعد اغلاط کی طرف توجہ دلادی گئی تھی۔ جن لوگوں نے مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب کو توجہ دلائی ان کے تحریری نوٹ بھی اس کتاب میں پیش کیے جاسکتے تھے؛ لیکن ہمارے اس تجزیے اور تبصرے کے بعد ان کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ تو یہ دیکھیں کہ موجودہ مہتمم کو اُصول ہشت گانہ کا کوئی خیال نہیں ہے۔ انہیں اصلاحی وتعمیری تنقید بھی گوارہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کتاب کے مفصل جائزے کے لیے قلم اُٹھایا۔ تاکہ عوام اس غیر معتبر تاریخ سے مانوس نہ ہو جائے۔ ایسی غیر معتبر تاریخ جس میں تاریخ گوئی نہیں بلکہ تاریخ سازی سے کام لیا گیا ہے۔ حق بیانی نہیں بلکہ چاپلوسی اور مدح سرائی کا شیوا اختیار کیا گیا ہے۔ دیانت اور ایمانداری کا نہیں بلکہ خیانت اور بے ایمانی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ خلوصِ دل اور بالغ نظری کا نہیں افترا، فریب اور تنگ نظری کا نمونہ پیش کیا ہے۔ حسنِ ترتیب اور سلیقے کے بجائے بے ڈھنگے پن کو اپنایا گیا ہے۔ جس کے شواہد ہم آپ کے سامنے بالترتب پیش کر رہے ہیں۔ اور بات فقط اس کتاب کے نقائص کی طرف توجہ مبذول کرانے کی نہیں، موجودہ مہتمم صاحب کو اپنے خلاف کوئی بھی بات گوارہ نہیں۔ سابق شیخ القراء قاری ابوالحسن اعظمی کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔ ان پر بے بنیاد الزامات لگائے گئے اور جب قاری ابوالحسن نے اپنے استعفے میں الزامات کے بے بنیاد ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہوئے مہتمم سے تحقیق کی گزارش کی تو مہتمم صاحب نے کوئی تحقیق نہیں کی بلکہ دارالعلوم کو سبعہ عشرہ کے ایک عظیم استاذ سے محروم کردیا۔

••••• ❖ •••••

دوسرا باب

"دارالعلوم دیوبند کا ڈیڑھ سو سالہ سفر" عنوان دے کر صفحہ نمبر ۵۸ سے دوسرے باب کی ابتدا ہوتی ہے "بنائے دارالعلوم" کے عنوان سے جو مضمون مرتب نے پیش کیا ہے اسی کے آخر میں تاریخ دارالعلوم جلد اوّل کا حوالہ دیا گیا ہے، لیکن تاریخ دارالعلوم جلد اوّل کو جستہ جستہ اور اس کا ابتدائی حصہ بہ غور دیکھنے کے بعد یہ تحریر کتاب میں نظر نہیں آئی جس سے مضمون کا آغاز کیا گیا ہے۔ حالانکہ مضمون اپنی ثقاہت میں کوئی خامی نہیں رکھتا، یہی تاریخ ہے جو پیش کی گئی ہے، لیکن دیانت کا تقاضا ہے کہ مرتب کو یہ حوالہ مع صفحہ نمبر ضرور دینا چاہئے تھا کہ پیش کردہ تحریر کہاں سے ماخوذ ہے۔ صفحہ نمبر ۵۸ تا ۵۹ کے تین پیراگراف تاریخ دارالعلوم جلد اوّل سے ہیں یا کسی اور کتاب سے اس کا پتہ تو تاریخ دارالعلوم جلد اوّل کا مکمل مطالعہ کرنے کے بعد بھی معلوم نہیں ہوتا۔ ہوسکتا ہے یہ جلد اوّل ہی سے ماخوذ ہوں، لیکن ہماری سرسری نظر سے نہیں گزرے، مرتب کو چاہئے تھا کہ کتاب کے نام کے ساتھ صفحہ نمبر بھی تحریر کرتے لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ حالانکہ تاریخ جیسا موضوع منتخب کرنے کے بعد یہ لازمی ہے کہ لکھنے والے کا مطالعہ عمیق، نظر بالغ، قلب شفاف، ذہن کشادہ، طبیعت محققانہ اور طرز نگارش جامع و شگفتہ ہو مگر حیف صد حیف۔ دارالعلوم دیوبند! جسے دنیا قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے، اُس کے مہتمم کو یہی مرتب صاحب ملے، جن کے مطالعے اور معلومات کی وسعت کا اندازہ آپ اس سے لگا لیجیے کہ زیر تبصرہ کتاب میں صفحہ نمبر ۳۷۴ پہ علمائے دیوبند کے اُردو رسائل و جرائد کا ذکر کیا گیا ہے۔ کمال دیکھیے اور حیرانی کے عالم میں اپنا سر پیٹ لیجیے کہ آزاد ہندوستان کا سب سے مشہور اور کثیر الاشاعت ماہنامہ جریدہ جس کا مماثل آج تک بھی کوئی پیدا نہ ہوسکا، اُس رسالے ہی کا نام فاضل مرتب نے اس پیراگراف میں نہیں لکھا۔ اور وہ ہے "ماہنامہ تجلی" ایک ایسا رسالہ جو آج بند ہونے کے چالیس سال بعد بھی اپنی اہمیت اور وقعت نہیں کھو سکا، آج بھی لوگ مولانا عامر عثمانی کے اس رسالے کو تلاش کرتے ہیں۔ اور ہمارے فاضل مرتب نے اس رسالے کا نام تک اپنی تحقیق میں نہیں لکھا۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی مغلوں کی تاریخ لکھے اور شاہ جہاں کا ذکر ہی نہ کرے۔ اب آپ ہی بتائیے کیا ایسے ہی تاریخ مرتب کی جاتی ہے؟ کیا ایسے ہی شخص کو اتنا اہم اور دقیق کام دینا چاہیے تھا۔ ایسی مثالیں اور بھی بہت ہیں لیکن ہم انہیں اپنے مقام پر ہی پیش کریں گے۔ ورنہ ترتیب کا حسن جاتا رہے گا۔ اللہ ہم سے بہ حسن و خوبی کام لے لے، کم سے کم اتنا شعور تو اس پاک پروردگار نے ہمیں

بخشا ہے کہ ہم حسنِ ترتیب کے تقاضوں کا خیال رکھ سکیں۔ یہاں تو حال یہ ہے کہ فاضل مرتب نے حوالوں کے طور پر کتابوں کے نام تو درج کیے ہیں؛ لیکن کوئی بھی حوالہ مکمل نہیں دیا یعنی صفحہ نمبر کسی بھی حوالے میں درج نہیں ہے۔ اگر چہ تاریخ مرتب کرنے میں سب سے زیادہ حوالوں ہی کو اہمیت دی جاتی ہے۔کہ یہی کتاب کی ثقاہت کا معیار بنتے ہیں، مگر یہاں تو کوئی معیار قائم ہی نہیں کیا گیا۔ نہ تو مآخذ نقل کرنے میں دیانت ہے اور نہ ہی شخصیت کے انتخاب میں کوئی معیار ہے۔

مآخذ کے نقل کا جہاں تک تعلق ہے، تاریخی کتابوں میں جب کوئی واقعہ یا اقتباس نقل کیا جاتا ہے تو نقل کرتے ہوئے حذف و اضافہ نہیں کیا جاتا ورنہ ناقل کی ثقاہت پر حرف آتا ہے۔ دوسری بات اگر نقل کردہ عبارت میں الفاظ کا تغیر و تبدل کرنا بھی ہو تو کم سے کم اس کا لحاظ رکھنا تو ضروری ہے کہ اضافی الفاظ سے تحریر میں حسن پیدا ہو جامعیت پیدا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ مرتب نے عبارت نقل کرتے ہوئے اپنی دانست سے کسی لفظ یا جملے کا اضافہ تو کر دیا لیکن یہ اضافہ مفید ہونے کے بجائے مرتب کی نااہلی، کم علمی، اور زبان سے ناواقفیت کا سبب بن جائے، بالکل ایسا ہی یہاں ہے۔فاضل مرتب بے چارے دارالعلوم دیوبند کے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ شعبے میں ملازم ہیں۔ نہ جانے کس خبط نے انھیں تحریر و تصنیف کی طرف متوجہ کر دیا۔ لفظِ خبط ہم نے کسی قسم کی تضحیک یا الزام کے طور پر نہیں لکھا بلکہ یہ حقیقت پر مبنی ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ موصوف کو یہ تک معلوم نہیں تحریر میں کہاں کونسا لفظ استعمال کرنا ہے تو بتائیے پھر سنجیدہ الفاظ میں اسے خبط نہ کہیں تو اور کیا کہیں۔ اپنی ترتیب شدہ کتاب کے صفحہ نمبر ۵۹ میں فاضل مرتب نے دارالعلوم کے قیام کا ذکر کیا ہے۔ یہ ذکر موصوف تاریخ دارالعلوم جلد اوّل کے صفحہ ۱۵۵ سے نقل کر رہے ہیں۔ اگر چہ دیانت کے تقاضے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے فاضل مرتب نے حوالے میں صفحہ نمبر درج نہیں کیا ہے، یہ تو ہم آپ کو بتا رہے ہیں کہ نقل کردہ عبارت صفحہ نمبر ۱۵۵ سے لی گئی ہے۔ ممکن ہے صفحہ نمبر اس لیے بھی درج نہ کیا ہو، کیونکہ حوالے نقل کرتے ہوئے انھوں نے کافی حذف و اضافے سے کام لیا ہے۔ کہیں کوئی صاحبِ ذوق اصل کتاب سے حوالہ نہ ملالے اور موصوف کی خیانت واضح نہ ہو جائے، اسی لیے صفحہ نمبر لکھا ہی نہیں گیا۔ اب ایک حوالہ تلاش کرنے کے لیے کوئی پوری کتاب تو پڑھنے سے رہا۔ عوام تو بے چاری کم علم اور انجان ہے، اس نے تو ابتداء میں مہتمم صاحب کی تصدیق پڑھ کے کتاب کو حرفِ آخر ماننا ہی ہے۔ چاہے یہ تصدیق کتنی ہی غیر معتبر اور خیانت پر مبنی ہو۔ بہر حال مرتب صاحب کی تحریری صلاحیت اور علمی قابلیت کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ صفحہ نمبر ۵۹ سطر نمبر ۹ میں انہوں نے اپنی طرف سے ایک لفظ کا اضافہ کیا ہے۔ ''بچہ''

ویسے تو نقل کردہ اس پورے پیراگراف میں مرتب نے بلاوجہ حذف و اضافے سے کام لیا ہے؛ لیکن ''بچہ'' لفظ کا اضافہ خوب ہے۔

دیکھیے تاریخ دارالعلوم جلد اوّل میں اصل عبارت یہ ہے:

''حضرت مولانا ملّا محمود دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کو جو علم وفضل میں بلند پایہ عالم تھے مدرس مقرر کیا گیا، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے وہ اوّلین شاگرد تھے، جنھوں نے استاد کے سامنے کتاب کھولی، یہ عجیب اتفاق ہے کہ استاد اور شاگرد دونوں کا نام محمود تھا''۔

(تاریخ دارالعلوم: ج ر ۱، ص ر ۱۵۵)

اب دارالعلوم دیوبند کے جدید مؤرخ کے انداز دیکھیے جو عبارت نقل کرنے میں کس بلا کی قابلیت رکھتے ہیں:

''حضرت مولانا مُلّا محمود دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ، جو علم وفضل میں بلند پایہ عالم تھے، کو پہلا مدرس مقرر کیا گیا اور محمود حسن نامی بچہ اس درس گاہ کا پہلا طالبِ علم تھا جو بعد میں شیخ الہند کے نام سے پوری دنیا میں جانا پہچانا گیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس درس گاہ کے سب سے پہلے استاذ اور شاگرد دونوں کا نام محمود تھا''۔ (دارالعلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ: ص ر ۵۹)

آپ کے سامنے اصل اور نقل دونوں ہی عبارتیں موجود ہیں۔ دیکھیے اور سوچیے اپنی طرف سے بے معنیٰ اور غیر ضروری الفاظ کے اضافے کی کیا ضرورت ہے۔ فاضل مرتب نے ملّا محمود کے مدرس سے قبل ''پہلا'' لفظ بڑھا دیا ہے۔ اس سے کیا حاصل ہوا۔ جہاں سے عبارت نقل کی ہے وہاں مضمون کی ابتداء میں یہ واضح ہے کہ دارالعلوم کے افتتاح کا ذکر ہو رہا ہے تو لازمی امر ہے افتتاح کے موقع پر جو مدرس مقرر کیے جائیں گے وہ ادارے کے پہلے ہی مدرس ہوں گے۔ یہ بات کسی وضاحت کی طلبگار نہیں ہے۔ یہاں ''پہلا'' لفظ بے سود اضافہ ہے۔ دوسرا کمال اگلی ہی سطر میں دیکھیے: شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے نام کے ساتھ ''بچہ'' لفظ اپنی دانست سے تحریر کیا ہے۔

جس شخص کو یہ تک معلوم نہ ہو کہ ''بچہ'' لفظ کا استعمال کہاں اور کیسے کیا جاتا ہے، اُسے لکھنے کا شعور کیونکر ہوسکتا ہے۔ اسی کتاب میں صفحہ نمبر ۲۶۴ پہ شیخ الہند کا سن پیدائش لکھا ہے ۱۸۵۱ء اور دارالعلوم کا قیام ہے ۱۸۶۶ء۔ اب ذرا کوئی صاحبِ عقل بتائے کہ ۱۵ سال کی عمر کے لڑکے کو دنیا میں کوئی ''بچہ'' کہتا ہے کیا؟ ہاں ماں باپ، دادا دادی یا گھر کے بڑے لوگ تو ۴۰ سال کے آدمی کو بھی اپنا بچہ، ہی کہہ دیں تو مضائقہ نہیں؛ لیکن عرفِ عام میں کیا کسی نے ۱۵ سال کے لڑکے کو بچہ کہا یا لکھا ہے؟

فاضل مرتب نے فرطِ عقیدت میں اپنی تحریر کو غلو آمیز مرقعہ بنا دیا ہے، وہ بڑے اہتمام کے ساتھ لکھ رہے ہیں:

''محمود حسن نامی بچہ اس درس گاہ کا پہلا طالبِ علم تھا''۔

حالانکہ اُس وقت محمود حسن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی عمر ۱۵ برس تھی۔ اور اس عمر والے کو بچہ کہنا بلا شبہ ایک بھدا مذاق ہے۔ کیا فاضل مرتب کا تاریخی مطالعہ اتنا قلیل ہے کہ انہیں یہ بھی یاد نہیں مغل شہنشاہ ہمایوں کے انتقال

کے بعد جب اکبر کو بادشاہ کا تاج پہنایا گیا تب اس کی عمر ۱۴ برس تھی۔ اُٹھائیے تاریخ کی کتابیں اور کیجیے ورق گردانی۔ دیکھیے مؤرخ کس سلیقے سے تاریخ مرتب کرتا ہے۔ جلال الدین اکبر ۱۵۴۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۵۵۶ء میں ہمایوں کے انتقال کے بعد بادشاہ کے تخت پر براجمان ہوئے۔ اس کے علاوہ فاضل مرتب کیا فاتح ہند محمد بن قاسم کو بھی بھول گئے، جنہوں نے ۱۷ برس کی عمر میں ہند کو فتح کیا تھا، ظاہری بات ہے فتح کے وقت ان کی عمر ۱۷ برس تھی؛ لیکن فتح سے ۲/سال پہلے بھی وہ کوئی بچوں کے ساتھ نہیں کھیل رہے تھے، بلکہ جوانی کی آمد کو تلواروں کی چھاؤں، گھوڑوں کی پناہوں اور تیر وترکش کے ماحول میں پروان چڑھا رہے تھے، کیونکہ کسی بھی انسان کے بننے اور بگڑنے کی یہی عمر ہوتی ہے، اسی عمر میں انسان کے اندر کارزارِ ہستی کے نشیب وفراز طے کرنے کا شعور بیدار ہوتا ہے اور عمر کے اس اہم پڑاؤ کو ''دارالعلوم کی جامع ومختصر تاریخ'' لکھنے والے فاضل مرتب بچپن سے تعبیر کر رہے ہیں۔ اور کیا فاضل مرتب کو فقہ کی وہ اصطلاحات بھی یاد نہ رہیں جن کے تحت ۱۵ سال کی عمر کے لڑکے کو بالغ مانا جاتا ہے۔ بلوغ کی اگر کچھ بھی علامتیں ظاہر نہ ہوں تو ۱۵ برس کو شرعی اعتبار سے بلوغ کی عمر تسلیم کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ اس بات کی وضاحت یا دلیل کے لیے کسی حوالے کی ضرورت نہیں، یہ تو دینی مدارس کے مبتدی طلباء بھی جانتے ہیں۔ بس نہیں جانتے تو یہ فاضل مرتب ہی نہیں جانتے۔ قارئین! دیکھ لیجیے دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم ادارے کی تاریخ لکھی جارہی ہے، اور لکھنے والے کی قابلیت اور صلاحیت آپ کے سامنے ہے۔ ہم نے گزشتہ صفحات میں غلط نہیں کہا کہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے شعبے میں کام کرتے کرتے نہ جانے کیوں آنجناب کو لکھنے کا خبط سوار ہوگیا۔ خبط کی علامت کے ظہور کو مستند کرنے کے لیے ایک اور نمونہ ملاحظہ کیجیے! حوالے کے طور پر تاریخ دارالعلوم (جلد اوّل صفحہ ۱۵۵) کی جو عبارت ہم نے پیچھے نقل کی ہے اس کے متصلاً بعد محبوب رضوی صاحب نے یہ تین سطریں بھی تحریر کی ہیں:

> ''اُس وقت رب السمٰوات والارض کے التفات اور چشم کرم پر بھروسہ کرنے کے سوا اور کوئی ظاہری ساز وسامان نہ تھا۔ اخلاص وخدمتِ دین اور توکل علی اللہ کے جذبات کے سوا ہر سرمائے سے ان حضرات کا دامن خالی تھا۔ چنانچہ اس بے سروسامانی کے ساتھ افتتاح عمل میں آیا''۔

نہ جانے کیوں اور کیا سوچ کر جدید تاریخ کے مرتب صاحب نے نقل کرتے وقت یہ سطور حذف کردیں۔ ''اُس وقت... سے لے کر، دامن خالی تھا'' تک چھوڑتے ہوئے مرتب صاحب اگلے جملے نقل کرتے چلے گئے۔
ہم اب تک یہ بات سمجھ ہی نہیں پارہے ہیں کہ فاضل مرتب نقل کردہ اقتباس میں حذف واضافے کی روِش کیوں اختیار کیے ہوئے ہیں۔ کتاب کے آغاز سے یہی سلسلہ جاری ہے۔ گزشتہ صفحات میں پہلے باب کی تفصیل آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں اور اب دوسرے باب کا حال بھی آپ کے سامنے ہے مطالعہ کرنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ

حذف واضافے کا یہ طریقہ قطعاً غلط اور غیر مہذب ہے۔کسی کی بات کو نقل کرنے میں کتر بیونت سے کام لینے والے کو دنیا کے کسی بھی خطے،کسی بھی طبقے میں اچھا نہیں مانا جاتا۔اور اسلامی شعار میں تو ایسے شخص کو کاذب، جھوٹا اور منافق تسلیم کیا جاتا ہے جو کسی کی بات کو کہیں نقل کرتے وقت اس میں اپنی طرف سے کمی یا زیادتی کا شیوا اختیار کرے۔

زیرِ تبصرہ کتاب کے مرتب نے یہی روِش پوری کتاب میں اپنائی ہوئی ہے اب آپ ہی ایمانداری سے فیصلہ فرمائیں،کیا یہ مرتب صاحب کاذب اور جھوٹے کہلائے جانے کے حقدار نہیں؟ ایک جھوٹے، کاذب اور خائن کو دارالعلوم دیوبند کے موجودہ مہتمم صاحب کس دیدہ دلیری کے ساتھ تاریخ مرتب کرنے جیسا اہم کام دے چکے ہیں۔

تاریخ لکھنا ایسے نااہل اور بے سلیقہ شخص کا کام نہیں جو کسی کتاب کا حوالہ تک صحیح طریقے سے نقل نہ کرسکتا ہو۔ تاریخ لکھنا ایسے شخص کا کام نہیں جو شخصیت پرستی کی اسیری کا طوق اپنے گلے میں ڈالے ہوئے ہو۔کیونکہ تاریخ مرتب کرنے والے کو ہر کردار اور ذکر کردہ ہر شخصیت کا تذکرہ نہایت ایمانداری سے کرنا ہوتا ہے۔عقیدت مندی میں لکھی گئیں غلو آمیز تحریریں تاریخی کتابوں میں اچھی نہیں لگتیں۔تاریخ لکھنا ایسے شخص کا بھی کام نہیں جس کا قلم صاحبِ اقتدار کی جوتیوں کو سجدہ کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہو۔ پُرانا قول ہے: ''مورخ کا قلم بے رحم ہوتا ہے''۔ یہی حقیقت ہے،اصل مورخ وہی ہوتا ہے جو سچائی اور ایمانداری سے تاریخ مرتب کرتا ہے،تاریخ لکھنا بلاشبہ ایسے شخص کا کام ہے جو کسی کے دباؤ یا رعب میں آکر حقیقت سے انحراف نہیں کرتا۔جو شخصیت پرستی سے آزاد ہو کر ہر کردار و ہر فرد کا دیانت اور حق کے ساتھ تذکرہ کرتا ہے۔ یاد رکھیے! تاریخ لکھنا عقیدت مندوں کا نہیں حقیقت پسندوں کا کام ہے۔لیکن اب اس کا کیا کیا جائے جو یہ جھوٹی اور مکروفریب پر مبنی تاریخ امتِ مسلمہ کو دارالعلوم کی طرف سے فراہم کی جارہی ہے،جس میں نہ تو حق بیانی کا پاس رکھا گیا ہے نہ ہی دیانت کا لحاظ۔بہر حال اپنی بساط بھر ہم پوری کوشش کریں گے کہ آپ کے سامنے اس کتاب کی حقیقت آئینے کی طرح صاف کردیں،تاکہ پھر کوئی اور ایسی غیر معتبر تاریخ شائع کرنے کا ارادہ نہ کرے۔دارالعلوم کسی کی جاگیر نہیں،امتِ مسلمہ کا سرمایہ ہے،ہندوستان و دیگر ممالک میں آباد کروڑوں مسلمانوں کے تعاون اور امداد سے چلنے والے اس ادارے کے موجودہ ذمہ دار یہ ہرگز خیال نہ کریں کہ وہ جو چاہیں گے تاریخ کے نام پر پیش کردیں گے اور امت خاموشی سے اس کو ہضم کرلے گی۔ نہیں ابھی زمانہ اتنا بھی خراب نہیں آیا کہ جھوٹوں کو جھوٹا کہنے والے بالکلیہ طور پر ختم ہوگئے ہوں۔غور فرمالیں مہتمم صاحب اور شوریٰ کے ممبران بھی۔آج کے روبہ زوال دَور میں بھی حق کو حق کہنے والے اور غلط بات کا صحیح جواب دینے والے اسی ملک میں زندہ ہیں۔آپ دارالعلوم کے اندر کیسی ہی سیاست کریں،ملازم وطلباء پر کیسا ہی ظلم ڈھائیں،امت کے پیسوں کو کتنی ہی لاپرواہی سے خرچ کریں،اُس سے ہمیں کوئی بحث نہیں،اِس کا جواب آپ کو اللہ کے حضور پیش کرنا ہی ہے،لیکن اکابر دارالعلوم دیوبند اور تاریخ کے صحیح واقعات کے ساتھ اگر چھیڑ چھاڑ کرکے کسی

قسم کی بھی ناانصافی اور جانبداری کا معاملہ کیا گیا تو اہلِ حق خاموش نہیں رہیں گے۔ بے شک اہلِ حق کی تعداد روز بہ روز کم ہوتی جارہی ہے۔ ممکن ہے کل ہماری آنکھ بند ہونے کے بعد کوئی اور اس طرح باطل کا سامنا نہ کرسکے، لیکن اہلِ اقتدار کو یہ بات ہمیشہ ذہن نشیں رکھنی چاہیے کہ یہ دنیا فانی ہے اور یہاں کے فائدے بھی محدود وقت تک ہی مفید رہ سکتے ہیں، اس لیے اپنے ہر عمل کی جواب دہی کے لیے آخرت کی طرف بھی توجہ کرلیجیے گا۔ جہاں ہر ظلم، ہر خیانت اور ہر ناانصافی کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

اوفو قارئین! بات کہاں سے کہاں نکل آئی۔ لیکن اس حقیقت سے آپ انکار بھی تو نہیں کرسکتے جو راقم نے درج بالا سطور میں بیان کی ہے۔ خیر چھوڑیے! تو بات چل رہی تھی حوالوں میں نقل کرتے وقت کیے گئے حذف و اضافے کی، آپ نے دیکھ ہی لیا ''پہلا'' اور ''بچہ'' جیسے الفاظ کا کیسا غیر ضروری اور بے محل استعمال کیا ہے، اضافے کے علاوہ حذف کا حال زیادہ افسوس ناک ہے۔ ایک صفحہ پہلے جو ہم نے تاریخ دارالعلوم جلد اوّل سے تین سطریں نقل کی ہیں، آپ بغور انہیں پڑھ کر بتائیے، کیا واقعی وہ سطریں اس لائق تھیں کہ انہیں کتاب میں شامل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ حالانکہ ان جملوں میں عمدہ الفاظ اور بہترین زبان کا استعمال کیا گیا ہے، جسے پڑھ کر یہی خیال آتا ہے، آخر کیوں فاضل مرتب نے محبوب رضوی صاحب کی تحریر کردہ یہ سطور نقل کرنے سے پرہیز کیا۔ اس کی جگہ بے سروسامانی کے اسی مفہوم کو بیان کرتے ہوئے اپنے آپ کو ادیب وقت ثابت کرنے کے لیے بے کیف الفاظ کا استعمال کر کے چند جملے لکھ دیے ہیں۔ جس سے کسی بھی قسم کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

دوسرے باب کے پہلے عنوان کے اختتام پر حواشی کا جلی عنوان دے کر فاضل مرتب نے ایک عجیب تفصیل بیان کی ہے۔ عجیب اس لیے کہ اس سے کسی بھی طرح کا کوئی علمی فیض نہیں پہنچتا۔ مرتب صاحب حواشی کا عنوان دے کر وضاحت فرمارہے ہیں کہ دارالعلوم کے قیام کی تاریخ ۱۵ رمحرم ۱۲۸۳ھ کو عیسوی تاریخ ۳۱ رمئی ۱۸۶۶ء ہوتی ہے۔ یہ جو سالہا سال سے سب کتابوں میں ۳۰ رمئی لکھا آرہا ہے یہ غلط ہے اصل تاریخ ۳۱ رمئی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ۳۰ رمئی ہو یا ۳۱ رمئی اس سے کوئی فرق کسی بھی عنوان پر نہیں پڑتا۔ دارالعلوم کے نظام و اہتمام میں قیام کی تاریخ کو لے کر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی اور بلاشبہ اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تاریخ کے تعین کی اہمیت تب لازمی ہوتی جب دارالعلوم میں ہر سال یوم تاسیس منایا جاتا۔ تب تو ایک تاریخ متعین کرنا لازمی تھا کہ سالگرہ ۳۰ رمئی کو منائیں یا ۳۱ رمئی کو۔ لیکن دارالعلوم میں روز اوّل ہی سے اس طرح کی لغویات پر کبھی عمل نہیں کیا گیا۔ دارالعلوم مسلمانوں کو علمِ دین سے آراستہ کرنے اور اس کی صحیح ترجمانی کے لیے قائم کیا گیا تھا جس میں وہ ۱۹۸۲ء تک ہمیشہ سے تاریخی اور نمایاں کردار پیش کرتا رہا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ فاضل مرتب کا یہ کہنا: ۱۵ رمحرم ۱۲۸۳ھ کو ۳۰ نہیں ۳۱ رمئی تھی غلط معلومات پر مبنی

ہے۔کمال ہے مرتب صاحب دارالعلوم کے انٹرنیٹ اور کمپیوٹر شعبے کے ملازم ہیں پھر بھی انہوں نے انٹرنیٹ سے صحیح تاریخ دیکھنے کے لیے تحقیق نہیں کی۔سبھی کے پاس موبائل ہیں۔آپ بھی ابھی اپنے موبائل میں پلے اسٹور سے کیلنڈر کنورٹر Calendar Converter ڈاؤن لوڈ کریں اور ۱۵ رمحرم ۱۲۸۳ ہجری کو عیسوی میں کنورٹ کر کے دیکھ لیں نتیجہ وہی آئے گا جس کو پرانے لوگ سالہاسال سے لکھتے آرہے ہیں۔یعنی ۳۰ رمئی ۱۸۶۶ء۔

اب بتائیے جو شخص جدید دور کے تقاضوں سے واقف ہو اور پھر بھی تحقیقی کتاب مرتب کرتے ہوئے صحیح بات نہ تحریر کر سکے کیا اُسے تاریخ جیسے عنوان پر کام کرنے کا اہل سمجھنا چاہیے؟ کاش یہ بات کوئی ہمارے موجودہ مہتمم صاحب کو سمجھا سکے۔محترم کام لیتے وقت یہ تو دیکھ لیتے کہ جس سے کام لیا جارہا ہے وہ اس کارِاہم کے اہل ہے بھی یا نہیں۔خیر کیا کہا جائے خود مہتمم صاحب کی شخصیت دارالعلوم جیسے ادارے کا اہتمام سنبھالنے کے لائق ہونے کے طور پر قابلِ غور ہے۔

......❖......

اس کے بعد دارالعلوم دیوبند کو سالِ اوّل سے دورِ حاضر تک چار ادوار پر تقسیم کر کے تاریخ وار مختصر مختصر تفصیل پیش کی گئی ہے۔کتاب کے صفحہ ۶۱ سے پہلا دور شروع ہوتا ہے جو تیس سالوں پر محیط ہے۔ ۱۸۶۶ سے ۱۸۹۵ تک۔دس صفحات کے اس تذکرے میں ہر سال کی اہم کارگزاری کا ذکر کیا ہے۔جو دارالعلوم کے ابتدائی حالات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔مضمون کے اختتام پر مآخذ کا عنوان دے کر تین نام نقل کیے ہیں۔لیکن وہی فاضل مرتب کی نااہلی! یہاں بھی حوالوں میں دی گئی کتابوں کے صفحہ نمبر نہیں لکھے ہیں۔اب بتائیے حوالہ ملانے کے لیے تاریخ دارالعلوم کی جلد اوّل دیکھیں یا جلد دوم کی ورق گردانی کریں۔مرتب صاحب نے تو بس تاریخ دارالعلوم دیوبند سید محبوب رضوی لکھ کے اپنا فرض پورا کر دیا۔صفحہ نمبر تو درکنار مرتب صاحب نے تو جلد نمبر تک کی وضاحت نہیں کی۔ اب قاری پریشان ہوتا ہو تو ہوتا رہے۔

دوسرا دَور

دارالعلوم دیوبند کا دوسرا دَور کے عنوان سے صفحہ ۷۲ پر نئے مضمون کا آغاز ہوتا ہے جو ۱۸۹۵ سے ۱۹۳۰ یعنی ۳۶ رسال کے تاریخی تذکرے کو اپنے اندر سمیٹے ہے۔

یہاں بھی آپ فاضل مرتب کی معلومات کے جوہر دیکھئے۔معلومات کے علاوہ عبارت نقل کرنے اور سمجھنے کا

شعور تو آپ گزشتہ صفحات میں ملاحظہ کر ہی چکے ہیں۔ وہی لاشعوری یہاں بھی نظر آتی ہے۔ پہلے ہی صفحہ پہ دورِ اہتمام کا عنوان دے کر دو نام مع مدت اہتمام لکھے ہیں۔

(۱) حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب ۳۴ سال

جمادی الثانیہ ۱۳۱۳-جمادی الاولی ۱۳۴۷ھ/ ۱۸۹۵-۱۹۲۸ء

(۲) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی سوا سال

جمادی الثانیہ ۱۳۴۷-رجب ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۸-۱۹۲۹ء

چند صفحات قبل صفحہ ۶۱ پر دارالعلوم دیوبند کا پہلا دَور جو پیش کیا ہے اس کی ابتداء ہی میں مہتمم کے عہدے پر فائز ہونے والے دونوں حضرات (حاجی عابد حسینؒ اور مولانا رفیع الدین صاحبؒ) کے دورِ اہتمام کو مجموعی طور پر لکھا گیا ہے، کیونکہ یہ دونوں حضرات مختلف وقتوں میں ایک سے زیادہ بار مہتمم بنائے گئے تھے۔ صحیح کیا، ایسے ہی لکھنا چاہئے تھا۔ لیکن یہ کیا ستم ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحب کے سوا چار سال کی مدت کو سوا سال لکھ دیا۔ اگرچہ فاضل مرتب نے اسی کتاب میں چھ صفحات کے بعد پیج نمبر ۶۹ پر سن ۱۹۲۱ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''دولتِ آصفیہ حیدرآباد دکن کی عدالت عالیہ کے منصب افتاء پر تین سال کے لیے حضرت حافظ محمد احمد کا انتخاب ہوا۔ اس درمیان حضرت حافظ صاحب صدر مہتمم رہے اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی بطور مہتمم سرگرم عمل رہے''۔

غور فرمائیے قارئین! یہ ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں، بلکہ خود فاضل مرتب ہی نے اپنی اسی کتاب میں لکھا ہے اور تاریخ بھی یہی ہے۔ تو پھر ایسا کیوں کیا گیا کہ حافظ محمد احمد صاحب کے ۳۱ سال کی جگہ ۳۴ اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے سوا چار سال کی جگہ سوا سال لکھ کر تاریخ کو جامع کا عنوان دیا جا رہا ہے۔ کیا اسی طرح لاپرواہی اور بے توجہی سے تاریخ مرتب کی جاتی ہے؟ ہم اسے لاپرواہی سے زیادہ خیانت کہنا مناسب سمجھتے ہیں، کیونکہ لاپرواہی ایک مرتبہ ہوتی ہے، دو مرتبہ نہیں۔ دوسری مرتبہ قصور ہوتا ہے۔ یہ بات فقط صفحہ ۶۲ پہ ہی ہوتی تو سہو تسلیم کیا جا سکتا تھا لیکن کتاب کے صفحہ نمبر ۱۴۷ پر دارالعلوم کے مہتمم حضرات کا ذکر کرتے ہوئے بھی یہی روش اختیار کی گئی ہے۔ ابتدائی مہتمم حضرات کے دَور کی مکمل تفصیل لکھی ہے، لیکن مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے ساتھ یہی معاملہ کیا جو یہاں لکھا ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کس عظیم شخصیت کا نام ہے اس کا اندازہ فاضل مرتب کو ہے ہی نہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی اپنی فہم و فراست، تدبر و متانت اور انتظامی صلاحیت کے لیے مشہور و معروف تھے۔ دارالعلوم کو مرکزی حیثیت عطا کرنے میں یہی فرد واحد ایک ہیرو کی طرح نمایاں کردار لیے ہوئے ہے۔ تاریخ کا علم رکھنے والے ہر ایماندار شخص نے اس کا اظہار کیا ہے کہ جو دورِ اہتمام حافظ محمد احمد صاحب کے نام سے معروف ہے اس کے اصل

مہتمم مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ہی ہیں۔مولانا محمد احمد صاحب نہایت قابل اور مرنجا مرنج انسان تھے،لیکن ’’انتظامی صلاحیتیں جو دارالعلوم جیسے عظیم ادارے کے لیے ضروری تھیں آپ ان سے بہرہ ور نہیں تھے۔اسی لیے آپ کو مہتمم منتخب کرنے کے ساتھ ساتھ ہی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب نے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کو مددگار مہتمم کے طور پر اہتمام کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے مقرر فرمایا تھا۔یہ بات ہم اپنی دانست سے بیان نہیں کر رہے ہیں،بلکہ یہی حقیقت ہے۔اس کے لیے ہم دلیل بھی پیش کریں گے اور وضاحت بھی۔

معلومات نہ ہونے کی وجہ سے جب کوئی بات نئی اور حیران کن لگتی ہو تو اس پہ برملا جھوٹ کی پھبتی نہیں کسنی چاہئے،بلکہ پہلے تحقیق کر لینی چاہیے۔ایسا نہیں کہ آپ کو گزرے ہوئے وقت کے سب حالات کا علم ہو۔اس لیے ہم نے جو اوپر عرض کیا ہے اسے آپ عقیدت مندانہ غلو آمیز تحریر نہ سمجھیں بلکہ یہ ایک حقیقت ہے جس کی دلیل کے لیے دارالعلوم دیوبند کی قدیم روداد کے صفحات آج بھی لائبریری میں موجود ہیں۔جن میں مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے نام کے ساتھ مددگار مہتمم لکھا جاتا تھا۔’’مددگار مہتمم‘‘ یہ عنوان دارالعلوم کی تاریخ میں کبھی کسی کے لیے استعمال نہیں کیا گیا۔نہ ہی یہ کوئی عہدہ ہے۔یہ بڑوں کی حکمتِ عملی کا مظہر ہے۔مولانا رشید احمد گنگوہی سے کون واقف نہیں آپ ہم سب کے لیے قابل صد احترام،لائق تعظیم اور واجب الاعتبار شخصیت ہیں۔یہ آپ ہی کی حکمتِ عملی تھی کہ دارالعلوم کے بانیوں میں سے ایک حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند مولانا حافظ محمد احمد صاحب کو مسند کے اعتبار سے تو دارالعلوم کے مہتمم کا عہدہ عنایت کر دیا،لیکن اہتمام کو سنبھالنے اور ادارے کے نظام و انتظام کو چلانے کے لیے آپ نے دارالعلوم کے دوسرے بانی حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کے بیٹے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو مددگار مہتمم کے عنوان سے منتخب فرمایا،کیونکہ آپ جانتے تھے دارالعلوم جیسے ادارے کو چلانے اور اس کے اہتمام کو سنبھالنے کے لیے جن صلاحیتوں اور مردم شناسی کی ضرورت ہے وہ حافظ محمد احمد صاحب میں نہیں تھیں۔

اکابرِ دیوبند کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ اعلیٰ خاندانی نسبتوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔اسی احترام کے سبب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی صاحبؒ نے مولانا قاسم نانوتوی علیہ الرحمہ کی نسبت کو دارالعلوم سے وابستہ رکھنے کے لیے حافظ محمد احمد صاحب کو مہتمم کے عہدے پر بٹھایا۔

اکابر دیوبند کا یہ طریقہ بالکل درست ہے۔نسبتیں ضرور اثر انداز ہوتی ہیں،اسی لیے ہمیں بھی علمائے دیوبند کے اونچے خاندانوں کی اولادوں کا احترام کرنا چاہیے،کیونکہ ان کی رگوں میں اُن حضرات کا خون دوڑ رہا ہے جنھوں نے دارالعلوم جیسا ادارہ قائم کر کے امتِ مسلمہ پر یقیناً احسانِ عظیم کیا ہے۔موجودہ وقت میں سرزمین دیوبند کے وہ مشہور خاندان یہ ہیں کہ جن کے بڑوں نے دارالعلوم کی بنیاد رکھی اور اس کی ترقی و بقا کے لیے تاحیات دل و جان سے سرگرم عمل رہے۔اوّل حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان ہے جس میں قاری محمد طیب

رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی اولادیں ہیں۔ دوسرے مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کا خاندان ہے جس میں مفتی عزیز الرحمٰن مولانا مطلوب الرحمٰن وغیرہ کی اولادیں ہیں۔ تیسرا مولانا اصغر حسین میاں صاحب کا خاندان ہے جس میں مولانا خلیل حسین میاں صاحب کے بعد اب ان کے بھائی و دیگر افراد ہیں۔ چوتھے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کے دادا مولانا یٰسین رحمۃ اللہ علیہ کی اولادیں ہیں۔ پانچواں علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان ہے، اسی طرح مولانا شاہ رفیع الدین اور حاجی عابد حسین کے خاندان بھی معتبر گھرانوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بہر حال ذکر ہونا ہے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی اور دورِ اہتمام کا۔ یہ وضاحت تو آپ نے ملاحظہ فرما ہی لی ہے کہ مولانا محمد احمد صاحب فقط نام کے مہتمم تھے۔ دار العلوم کے اہتمام کی تمام تر ذمہ داریاں مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ہی کے ذمہ رہتی تھیں۔

اگر ہماری اس بات سے کسی کو اعتراض ہے تو معترض کے لیے ہمارے پاس بہت سے معتبر جواب موجود ہیں۔ یہاں سب جوابوں کی ضرورت تو نہیں، اس لیے چند جواب دلائل کے طور پر پیش کر دیتے ہیں، تاکہ آپ کو مصدق ہو جائے کہ ہاں بات یہی صحیح ہے کہ دار العلوم کے اصل مہتمم خاص مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ہی تھے۔ وہی دفتر اہتمام کی تمام تر ذمہ داری سنبھالتے تھے۔

پہلی دلیل: ''مددگار مہتمم'' کا عنوان دار العلوم کی بہت سی روداد میں عہدے داران کی فہرست شائع کرتے ہوئے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے نام کے سامنے لکھا ہوا ہے۔ بہت سی روداد میں ہے۔ اب بدگمان ذہنیت یہاں حوالہ طلب کرے گی تو فی الحال ایک حوالہ دے دیتا ہوں جو بات کو سند یافتہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ ۱۳۲۷ھ ہجری کی روداد کا صفحہ نمبر ۴۰ دیکھ لیجیے گا۔

قارئین ذرا ایک بات بتائیے! مددگار کا مطلب کیا ہے؟ مددگار کسے کہتے ہیں؟ ظاہر ہے مدد کرنے والے کو، اور مدد کس کی کی جاتی ہے؟ بلا شبہ جو کمزور ہوتا ہے۔ اس بات سے کیا یہ واضح نہیں ہو رہا ہے کہ حافظ محمد احمد صاحب منصب اہتمام کے لیے کمزور تھے اس لیے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کو ان کا مددگار بنایا گیا۔ اب جو شخص کمزور ہو، لائق امداد ہو تو اس کو عملی طور پر مہتمم نہیں کہا جا سکتا، اس لیے اُس زمانے میں اہتمام کے ہر کام کے لیے لوگ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ دوسری بات غور کرنے کی یہ بھی ہے کہ اگر ایسا نہیں تھا تو مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کو نائب مہتمم کیوں نہیں بنایا گیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کو نائب مہتمم کی جگہ روداد میں مددگار مہتمم ہی لکھا گیا ہے، کیونکہ سب جانتے ہیں نائب مہتمم کے کام اتنے اہم نہیں ہوتے نہ ہی اسے تمام اختیار ہوتے ہیں۔ وہ مہتمم کی غیر حاضری میں تو کارآمد ہوتا ہے، لیکن مہتمم کی موجودگی میں اس کی حیثیت اس درجہ اہم نہیں ہوتی۔ اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی حیثیت مہتمم ہی کی تھی نائب کی نہیں۔

دوسری دلیل: حضرت مولانا قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی کتاب سید المرسلین کے پیش لفظ میں صفحہ نمبر ۴ پر محدث جلیل حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کا قول نقل کرتے ہیں کہ ''محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ شخص (مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ) مشائخ کبار میں سے ہوتا، اگر اہتمام کے جھگڑے اس کے سر پڑے ہوئے نہ ہوتے''۔

آئیے قارئین! حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر کلام کرتے ہیں۔کیا اس قول سے یہ واضح نہیں ہو رہا ہے کہ جس شخص کے بارے میں بات کی جارہی ہے وہ کسی ادارے کا ایسا مہتمم ہے جس کے سر پر اہتمام کا اتنا بوجھ ہے کہ اہتمام کے جھگڑے یعنی تمام تر کام اسی کے ذمہ ہیں۔اور اسے ذرا بھی فرصت اپنی ذمہ داری سے نہیں ملتی۔اگر یہ اہتمام کی ذمہ داریوں سے فرصت نکال لیتا تو مشائخ کبار میں سے ہوتا۔بتائیے قارئین! یہی مطلب ہے نہ مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا؟ بلاشبہ یہی ہے۔اب ذرا سوچیے کیا کسی ایسے شخص کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے جو فقط ایک یا سوا سال کے لیے مہتمم رہا ہو۔لاریب نہیں۔ایک دوسال تو یونہی گزر جاتے ہیں، اتنے کم وقت میں تو نئے مہتمم کو دفتر اہتمام کی مکمل شُد بُد بھی حاصل نہیں ہوتی۔تو پھر مولانا خلیل صاحب جیسا محدث جلیل ایسی بات کیوں کہہ رہا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص جس کے سر اہتمام کے جھگڑے پڑے ہوئے ہیں.....! یقیناً ایک سوا سال کی مدت میں تو کوئی مہتمم اتنا مصروف نہیں ہو سکتا، جس کے لیے اس طرح کا جملہ استعمال کیا جائے۔یہ بات بے شک ایسے ہی شخص کے لیے کہی جا سکتی ہے جو سالہا سال سے دفتر اہتمام کی ذمہ داریاں نبھا رہا ہو۔اور منصب اہتمام کا حق ادا کرنے میں اس درجہ منہمک ہو کہ اُسے سوائے دفتری امور کے اور کسی چیز کا خیال نہ ہو۔اسی مصروفیت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جناب محدث سہارنپوری رحمہ اللہ نے درج بالا قول ارشاد فرمایا تھا، کیونکہ وہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کو اہتمام کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔مولانا خلیل احمد صاحب ۱۹۰۷ء میں مظاہر علوم کے ناظم منتخب کیے گئے اور ۱۹۲۵ء تک وہیں مقیم رہے، یہی زمانہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے اہتمام کا ہے۔اس لیے مولانا خلیل احمد صاحب نے یہ بات کہی جس کو قاری محمد طیب صاحبؒ نے نقل کیا۔ورنہ خلیل احمد صاحب تو سہارنپور میں رہتے تھے وہ مولانا حبیب الرحمٰن کے بارے میں یہ کیوں لکھتے کہ:''اہتمام کے کام اس کے سر پڑے رہتے ہیں۔'' اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے بہت قریب سے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کا دَورِ اہتمام دیکھا ہے۔اسی لیے مولانا خلیل احمد صاحب کے قول سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے جو دور اہتمام منسوب ہے اس میں اصل کارکردگی مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ہی کی ہے۔

تیسری دلیل: یہ ہے کہ مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے دو مہتمم ایسے گزرے ہیں، جن کی مدت

اہتمام ایک سال اور ڈیڑھ سال ہے؛ لیکن تاریخ میں ان کی کوئی اہم کارکردگی نمایاں نہیں ہے۔ ۱۸۹۳ء سے ۱۸۹۴ء تک حاجی منشی فضل حق صاحب مہتمم رہے اور ۱۸۹۴ء سے ۱۸۹۵ء تک مولانا منیر نانوتوی کو دفتر اہتمام کی ذمہ داری دی گئی۔ لیکن کیا تاریخ کا کوئی بھی عالم، کوئی بھی طالبِ علم ان دونوں حضرات کے دورِ اہتمام کو یاد رکھے ہوئے ہے، کیا کوئی بتاسکتا ہے کہ ان دونوں کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم نے کیا کیا ترقیاں کی ہیں۔ یا کوئی بھی ایسا اہم کام جو ان حضرات کے دورِ اہتمام میں ہوا ہو۔ نہیں بتا سکتا! کوئی نہیں بتا سکتا؛ کیونکہ اتنے کم وقت کے مہتمم کا زمانہ یادگار نہیں بنتا۔ اتنا وقت تو ایسے عہدے کے کام سمجھنے اور ذمہ داریاں محسوس کرنے ہی میں گزر جاتا ہے۔ ہمیشہ یادگاریں تبھی چھوڑی جاتی ہیں جب وقت زیادہ گزارا جائے۔ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اگر ایک سوا سال کے مہتمم ہوتے تو آج ان کا نام بھی منشی فضل حق اور مولانا منیر کی مانند کسی گم گشتہ یاد کی طرح تاریخ کی ایک آدھ کتاب کے صفحات میں گم ہو کے رہ جاتا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کیوں! وجہ اس کی یہی ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی سوا سال یا سوا چار سال مہتمم نہیں رہے، بلکہ ۲۵ رسال تک مہتمم رہے۔ اسی لیے آج ان کا نام فقط مؤرخین ہی نہیں بلکہ بے شمار علمی لوگوں کی زبان پر ہے۔ اور ان کے اہتمام کی ترقیات نے جو دارالعلوم کو مرکزی حیثیت عطا کی ہے وہ از خود اس کی شاہد ہے کہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۹ء تک دارالعلوم کے اصل مہتمم مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ہیں۔

چوتھی دلیل: مولانا منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم اور عظیم مصنفین میں سے ایک ہیں۔ چوتھی دلیل کے طور پر ہم یہاں نعمانی صاحب کے الفاظ نقل کرتے ہیں جو انہوں نے اپنی خودنوشت ''تحدیث نعمت'' میں بیان کیے ہیں۔ صفحہ نمبر ۱۳۱ر پر مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کا عنوان دے کر وہ لکھتے ہیں:

> ''راقم السطور شوال ۱۳۴۳ھ میں جب ایک طالبِ علم کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا تھا تو اگر چہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس وقت کاغذات میں نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند ہی لکھا جاتا تھا اور ضابطہ میں ان کا عہدہ اور منصب یہی تھا۔ لیکن فی الحقیقت وہی مہتمم تھے، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو عہدے کے لحاظ سے اصل مہتمم تھے، کچھ مدت پہلے سے مرحوم ریاست حیدرآباد کے مفتی عدالتِ عالیہ کا منصب قبول فرما چکے تھے اور اس کی وجہ سے وہیں قیام فرماتے تھے۔ بلکہ کہا جاتا تھا کہ حضرت حافظ صاحب کے تشریف لے جانے سے پہلے بھی اہتمام سے متعلق کاموں کا زیادہ تعلق حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ہی سے رہتا تھا''۔

پھر اگلے پیراگراف میں لکھتے ہیں کہ:

> ''ایک دفعہ دارالعلوم کی میری طالبِ علمی ہی کے زمانے میں ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں اپنے کو دارالعلوم کا نائب مہتمم کہتا اور لکھتا ہوں لیکن واقعہ یوں ہے کہ حضرت

گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے جب مجھے اس خدمت کے لیے مامور اور مقرر کیا تھا تو مجھے ''نائب مہتمم نہیں؛ بلکہ ''مہتمم ثانی'' بنایا تھا۔ بہر حال ہر قسم کی ذمہ داری اور عمل دخل کے لحاظ سے وہی اُس وقت دار العلوم کے مہتمم تھے اور حق یہ ہے کہ مثالی مہتمم تھے۔ ہر طرف سے یکسو ہو کر صرف دار العلوم ہی کو انھوں نے اپنی زندگی کا مصرف وموضوع بنالیا تھا، اہل وعیال کے جھمیلوں سے بھی اللہ نے آزاد رکھا تھا۔ بس اپنی اکیلی زندگی تھی دار العلوم کا دار الاقامہ (یا دفتر اہتمام) ہی انکا مسکن تھا۔ اسی کے ایک کونے میں پلنگ پر ان کا بستر لگا ہوا تھا''۔

دیکھا قارئین! یہ ہم کوئی نئی بات بیان نہیں کر رہے ہیں۔ نہ ہی تاریخ کی زمین پر اپنی دانست سے غیر ثقہ باتوں کی فصل اُگا رہے ہیں۔ بلکہ ہم ماضی کے اوراق سے وہ حقائق آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں جنہیں محمد اللہ صاحب جیسے نام نہاد مرتب پس پشت ڈال کر تاریخ گوئی کے بجائے تاریخ سازی کی فن کاری کا جوہر دکھاتے ہیں۔ مولانا منظور نعمانی کی تحریر آپ نے ملاحظہ کر ہی لی، وہ وضاحت کے ساتھ لکھ رہے ہیں: ''فی الحقیقت وہی مہتمم تھے'' اور صرف ایک بار نہیں بلکہ حقیقت کو مزید مضبوطی سے بیان کرنے کے لیے چند سطر بعد پھر واضح کرتے ہیں کہ: ''حافظ محمد احمد صاحب کے جانے سے پہلے اہتمام سے متعلق کاموں کا زیادہ تعلق حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ہی سے رہتا تھا''۔ چند سطور کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحب کی تقریر کا حوالہ دے کر مزید مستحکم دلیل سے اس حقیقت کو اور آئینہ کر دیا ہے۔

کیا تاریخ کا علم رکھنے والا کوئی بھی شخص مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کا ذکر کرتے ہوئے ان سب باتوں کو نظر انداز کر کے ان کے اہتمام کی مدت کو فقط سوا سال تحریر کر سکتا ہے؟

لیکن مولانا ابوالقاسم نعمانی صاحب کے چہیتے مرتب جب تاریخ ترتیب دیتے ہیں تو وہ اپنے کمالِ فن اور مفلوج ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسی تاریخ مرتب کرتے ہیں، جو حقیقت سے خالی غیر معتبر روایات کا پلندہ ہوتی ہے۔

درج بالا مضبوط اور مبسوط دلائل کے علاوہ اور بھی حوالے پیش کیے جا سکتے ہیں جس سے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے دورِ اہتمام کی مدّت سوا سال یا سوا چار سال نہیں بلکہ ۲۴،۲۵ سال واضح ہوتی ہے؛ لیکن بات کو زیادہ طول دینے سے کچھ حاصل نہیں۔ ایماندار اور حقیقت پسندانہ ذہنیت رکھنے والے لوگوں کے لیے اتنی تفصیل کافی ہے اور رہی بات حقیقت سے آنکھیں چُرانے والوں کی، تو اِن کی مثال اُن کفار کی سی ہے جن کے سامنے اسلام کی حقانیت کو ظاہر کرنے والی تمام نشانیاں پیش کر دی گئی تھیں، مگر وہ پھر بھی ایمان نہ لائے تھے، کیونکہ انہیں اپنے اقوال و افعال پر ضد ہوگئی تھی اور ضد کا تو کبھی کوئی علاج کر ہی نہیں سکا، اس لیے ضدی اور کاذب لوگوں کے لیے تو ہماری ثقہ اور معتبر دلیلیں بھی ''چہ معنیٰ دارد'' کا مصداق ہی رہیں گی۔

اللہ رب العزت بہت مہربان نہایت رحم کرنے والے ہیں۔اُس مالکِ حقیقی کا خاص کرم ہے کہ اُس نے ہماری دلیل کو مستند اور معتبر کا درجہ فراہم کرنے کے لیے ہمارے دل میں یہ خیال پیدا کیا کہ ہم خود دارالعلوم کی لائبریری جا کر اس موضوع پر مزید تحقیق سے کام کریں۔ بلاشبہ یہ حق تعالیٰ ہی کا فیض ہے جو ہمیں اس موضوع پر لکھتے لکھتے معلومات ہونے کے باوجود بھی یہ خیال آیا کہ آخر مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی انتظامی صلاحیتوں کے بارے میں اتنا کیوں مشہور رہے۔انہوں نے ایسا کیا کیا ہے جو پرانے وقت کے تمام اکابر و اصاغر یہ کہنے پر مجبور ہو گئے:
''اگر مولانا کو ملک کی حکومت سونپ دی جاتی تو اُن سے بہتر ملک چلانے والا کوئی نہ ہوتا اور وہ اپنی ذہانت، فراست اور متانت سے پورے ملک کا بہترین نظام چلا سکتے تھے''۔

اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے راقم نے خود دارالعلوم دیوبند کی لائبریری سے پرانی روئداد اور القاسم والرشید کے شمارے نکلوا کر دیکھے تو جانا کہ صندل کی لکڑی جہاں بھی ہوگی اپنی مہک کا احساس ضرور کرائے گی۔مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی انتظامی صلاحیت اُن کا سلیقہ، اُن کے کام کرنے کا انداز، اُن کا تدبّر آج بھی دارالعلوم کی قدیم روئداد دیکھ کر صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہاں اتنی تفصیل کا موقع نہیں ہے کہ ہم ان کے دَور کے اہتمام اور ان سے پہلے کے دَورِ اہتمام کا فرق ظاہر کرنے کے لیے ان روداد کو تفصیل سے نقل کریں، لیکن پھر بھی ایک دو نمونے مثال کے طور پر بات کو مدلل و محقق بنانے کے لیے پیش کر دیتے ہیں۔ہم نے ان روداد کے موبائل سے فوٹو لے کر ان کا پرنٹ نکالا اور سن کے مطابق الگ الگ فائل بنا کر رکھ لیا ہے۔ یہ فرق ویسے تو اصل کو دیکھ کر خود محسوس کرنے کی چیز ہے؛ لیکن ہر انسان دیوبند آ کر دارالعلوم کی لائبریری میں تو نہیں بیٹھ سکتا، اس لیے ہم آپ کو اپنی بساط بھر چند باتیں بتاتے ہیں، جو ہم نے محسوس کی ہیں۔جن کو محسوس کرنے کے بعد یہ بات روزِ روشن کی طرح ہمارے دل پر واضح ہوگئی کہ بلاشبہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی جیسا مہتمم دارالعلوم دیوبند کو کبھی نصیب نہیں ہوا۔اسی لیے ہندوستان کے عظیم قلم کار مولانا عامر عثمانی نے بھی اپنے رسالے ماہ نامہ تجلی میں ایک بار مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ''دارالعلوم کی ترقی میں آپ کا کردار ایک ہیرو کی طرح ہے''۔

بے شک تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے اصل ہیرو تھے۔جس طرح ایک ہیرو ہر بُرائی سے لڑ کر کامیابی کی طرف بڑھتا ہے، ایسے ہی مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی تمام زندگی دارالعلوم کی کامیابی اور اس کی ترقی کے لیے وقف تھی۔رات دن انہیں دارالعلوم ہی کی فکر رہا کرتی تھی، اپنی عمر کے آخری تیس ۳۰ رسال تو انہوں نے مکمل طور پر دارالعلوم ہی کے نام کر دیے تھے۔
مولانا تقی عثمانی صاحب آپ کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب''اکابر دیوبند کیا تھے؟''میں صفحہ نمبر ۶۸ پہ لکھتے ہیں:

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے جن بزرگوں کا تذکرہ بکثرت فرماتے تھے ان میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ کا اسم گرامی بھی بہت نمایاں ہے۔آپ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے۔اور والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ انتظامی مصروفیت کی بنا پر آپ کا علمی اور عملی مقام لوگوں پر واضح نہ ہوسکا۔ورنہ حقیقت یہ ہے کہ علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو عجیب کمالات عطا فرمائے تھے۔

۱۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ کو عربی ادب کا بڑا ستھرا ذوق تھا۔اور آپ کی عربی تحریریں بڑی چست اور ادیبانہ ہوتی تھیں۔آج کل درالعلوم دیوبند کے فضلاء کو جو سند دی جاتی ہے اس کا پورمضمون حضرت مولانا ہی کا مرتب فرمایا ہوا ہے۔اور جب ہم لوگوں نے حضرت شاہ صاحب کی سرپرستی میں عربی نظم ونثر کی مشق کے لیے ''نادیہ الادب'' قائم کی تو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ اس میں بڑی دلچسپی کے ساتھ حصہ لیا کرتے تھے۔

۲۔ فرمایا کہ مجھے تصنیف وتالیف اور مضمون نگاری کی طرف متوجہ کرنے میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بڑا حصہ ہے۔مولانا کی عادت یہ تھی کہ انتظامی کاموں میں مصروف رہنے کے باوجود دارالعلوم کے طلباء پر خاص نظر رکھتے تھے۔اور جس طالبِ علم میں کوئی صلاحیت دیکھتے اس کی ہمت افزائی فرما کر اس کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کی کوشش فرماتے۔

میں ابھی دارالعلوم میں پڑھتا ہی تھا کہ مولانا کی خاص نظرعنایت مجھ پر مبذول ہوگئی۔بارہا ایسا ہوا کہ جب میں امتحان گاہ میں بیٹھا پرچہ لکھ رہا ہوتا تو حضرت مولانا میرے پاس تشریف لا کر میرے لکھے ہوئے جوابات دیکھتے۔اور بعض اوقات اتنے مسرور ہوتے کہ دوسرے اساتذہ کو جا کر اطلاع دیتے تھے۔

ایک مرتبہ کسی اخبار یا رسالے میں کوئی مضمون شائع ہوا جس میں امت کے کسی اجماعی مسئلے کے خلاف رائے ظاہر کی گئی تھی۔حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے احقر کو حکم دیا کہ اس کا جواب لکھو۔میں نے تعمیل حکم کی۔اور یہ میرا پہلا مضمون تھا۔میں نے جب یہ مضمون لکھ کر حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دکھایا تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سمائے۔اور اسی وقت مجھے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے اساتذہ کے پاس لے گئے۔اور ان کو میرا لکھا ہوا یہ مضمون دکھایا۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ میرا پڑھنے کا زمانہ تھا اور میں نے پہلا مضمون لکھا تھا۔اس

لیے اس میں یقیناً بہت سی خامیاں ہوں گی۔لیکن حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے جو معاملہ میرے ساتھ فرمایا، اس نے میری ایسی ہمت افزائی کی کہ تحریری کام کا ایک شوق پیدا ہوگیا۔اس کے بعد "القاسم" کے نام سے دارالعلوم دیوبند کا جو رسالہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ کی ادارت میں نکلتا تھا، میں نے اس میں مضامین لکھنے شروع کردیے۔

فراغت کے بعد کچھ عرصہ حالات ایسے رہے کہ مجھے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دینے کا موقع نہ مل سکا۔اس لیے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس زمانے میں مجھ سے کچھ شاکی رہے۔اس کے بعد جب میں نے دو تین رسالے لکھ کر انہیں دکھائے تو وہ کھل اُٹھے اور فرمایا:

"یہی تو وہ کام ہے جس میں تمہیں مشغول دیکھنا چاہتا ہوں"۔

۳۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ کو انتظامی صلاحیت اور سیاسی سوجھ بوجھ اس قدر غیر معمولی عطا فرمائی تھی کہ درحقیقت وہ وزیر بننے کے لائق انسان تھے۔دارالعلوم دیوبند پر سخت سے سخت وقت آئے، بڑی بڑی شورشیں اُٹھیں، لیکن میں نے اس بندۂ خدا کو کبھی ہراساں یا پریشان نہیں دیکھا۔سنگین سے سنگین حالات میں بھی ان کے اطمینان اور خود اعتمادی میں کبھی فرق نہیں آتا دیکھا۔

انہوں نے دارالعلوم میں خلافِ اُصول باتوں کو کبھی برداشت نہیں کیا۔اور اپنے حسنِ تدبیر سے مدرسے کو بڑے بڑے فتنوں سے محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کی۔جس کا ایک واقعہ یاد آیا ہے۔

۴۔ فرمایا کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے مثالی ضبط وتحمل عطا فرمایا تھا۔دارالعلوم دیوبند کی زمین سے متصل کسی دیوبند کے رئیس کی زمین تھی۔اس کا کچھ حصہ دارالعلوم کے لیے خرید لیا گیا تھا۔اس رئیس کے انتقال کے بعد اس کے ایک وارث نے ایک روز دارالعلوم کے صحن میں پہنچ کر اس زمین کی حق داری کا دعویٰ کیا اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خطاب کرکے باآوازِ بلند بہت بُرا بھلا کہنا شروع کردیا۔اس کا اندازِ گفتگو اس قدر اشتعال انگیز تھا کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے بعض خدام کو بھی فطری طور پر اشتعال ہوا۔اور انہوں نے بھی اس کو اسی کی زبان میں جواب دینے کا ارادہ کیا، لیکن مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو روکا اور ان صاحب سے فرمایا کہ "شیخ صاحب! آپ فضول ناراض ہوگئے، ذرا اندر تشریف لائیے، اطمینان سے بات کریں گے"۔مگر وہ صاحب بدستور غیظ وغضب کا اظہار کرتے رہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ دیر بعد پھر فرمایا: "اندر چل کر بیٹھئے تو سہی، وہاں بات کریں گے" اور پھر انہیں زبردستی دفتر اہتمام میں لے گئے۔ان کی خاطر تواضع کی، اور جب وہ ذرا ٹھنڈے ہوگئے تو مولانا رحمۃ اللہ علیہ اطمینان کے ساتھ اپنی جگہ سے اُٹھے، ایک الماری کھولی، اس میں سے کچھ کاغذات لے کر آئے اور ان صاحب کے سامنے

پھیلا دیے کہ دیکھئے یہ زمین آپ کے مورث نے فلاں تاریخ کو دارالعلوم کے ہاتھ فروخت کردی تھی اور اس کی رجسٹری بھی ہو چکی ہے۔

ان صاحب نے کاغذات دیکھے تو بے حد شرمندہ ہوئے اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے جس صبر و ضبط اور تحمل کا مظاہرہ فرمایا اس سے بے حد متاثر ہو کر گئے۔

۵۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں دارالعلوم دیوبند کا کام بہت پھیل گیا تھا۔ بہت سے شعبے قائم ہو چکے تھے اور سیکڑوں طلباء دارالاقامہ میں رہتے تھے۔ اس لیے مولانا رحمۃ اللہ شب و روز انتظامی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ اس کے باوجود ان کی نوافل اور تلاوت وغیرہ کے علاوہ روزانہ سوا لاکھ مرتبہ ذکر اسم ذات کا معمول کبھی قضا نہیں ہوا۔

۶۔ ایک مرتبہ دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ کے خلاف ایک شدید طوفان کھڑا ہوا جس میں بعض لوگ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جان تک کے دشمن ہو گئے۔ ان حالات میں بھی مولانا کھلی چھت پر تن تنہا سوتے تھے۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ میں نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ ''حضرت! ایسے حالات میں آپ کا اس طرح سونا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ آپ کم از کم کمرے کے اندر ہی سو جایا کریں''۔ لیکن مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی بے نیازی کے ساتھ ہنس کر فرمایا:

> ''ارے میاں! میں تو اس باپ (یعنی سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ) کا بیٹا ہوں، جس کے جنازے کو چار اُٹھانے والے بھی میسر نہ آئے۔ اور جسے رات کے اندھیرے میں بقیع کی نذر کیا گیا، لہٰذا مجھے موت کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے''۔

......❖......

محترم قارئین آپ مفتی شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے فرمودات غور سے پڑھیے اور دیکھئے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے بارے میں کیا کیا فرما رہے ہیں۔

مفتی شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے: ''مولانا کی عادت یہ تھی کہ انتظامی کاموں میں مصروف رہنے کے باوجود دارالعلوم کے طلباء پر خاص نظر رکھتے تھے''۔ ذرا غور کیجیے انتظامی کاموں میں مصروف رہنے کے باوجود مولانا کی عادت کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ مفتی شفیع صاحب اپنے طالبِ علمی کے زمانے کی بات کر رہے ہیں، انہوں نے مسلسل مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کو اہتمام کی انتظامی ذمہ داریوں میں مصروف دیکھا۔ جس کا اظہار چند صفحات قبل مولانا منظور نعمانی کی تحریر میں بھی آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ یہ دونوں بزرگ بالکل حقیقت بیان فرما رہے ہیں، مولانا حبیب

الرحمٰن نہایت انہماک کے ساتھ دارالعلوم کے اہتمام کی ذمہ داریوں میں مصروف رہتے تھے۔اب اِس بات کی وضاحت تو شاید ضروری نہیں ہے کہ انتظامی مصروفیات میں کون شخص مشغول رہتا ہے۔ظاہر ہے مہتمم کے ذمہ ہی انتظامی اُمور رہا کرتے ہیں۔اس بات سے بھی یہی تصدیق ہوتی ہے کہ اہتمام کی تمام ذمہ داریاں مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ہی نبھایا کرتے تھے۔حافظ محمد احمد صاحب نہیں۔مفتی شفیع نے مولانا کی جس عادت کا ذکر کیا ہے وہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کا اندازِ تربیت تھا۔وہ ذہین اور باشعور طلباء پر خاص نظر رکھتے تھے،ہم نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے دارالعلوم کے بڑے اساتذہ کو یہ تاکید کررکھی تھی کہ اپنی درسگاہ کے تمام طلباء میں سے جو طالبِ علم بھی حاضری کا پابند اور ذہین و باشعور ہو اس پر خاص توجہ رکھی جائے ساتھ ہی مہتمم کو بھی اس کی خبر دی جائے،تاکہ اچھے طلباء کی تربیت کر کے اُن کی فنی صلاحیتوں کو نکھار کر انہیں مستقبل کے لیے تیار کیا جاسکے۔

یہ تھا تربیت کا طریقہ،یہ تھی مردم شاسی یہ تھی مہتمم کی بالغ نظری اور توجہ۔آج جو آپ کے ہمارے سامنے بے شمار معتبر کتابیں موجود ہیں جن میں تفسیر حدیث اور فقہ کے علاوہ تاریخ و اخلاق کے عنوان پر بھی لازوال تحریریں لکھی گئی ہیں وہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی اور دارالعلوم کے صدر مہتمم علامہ شبیر احمد عثمانی کے تربیت یافتہ طلباء ہی کے قلم سے نکلی ہوئی نگارشات کا ذخیرہ ہے۔

معارف القرآن،معارف الحدیث،سیرت المصطفیٰ،قصص القرآن،تاریخ اسلام،یہ تو چند کتابوں کے نام ذہن میں آگئے۔برصغیر کا کوئی طالبِ علم ایسا نہیں جو ان کتابوں کے بغیر اپنی تعلیم مکمل کر لے۔مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے تربیت یافتہ حضرات میں سے چند کے نام یہاں لکھ دوں تاکہ آپ کو معلوم ہو سکے کہ آج جن بڑے بڑے لوگوں کو ہم علمائے دیوبند کے نام سے جانتے ہیں وہ ان ہی مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے شاگرد اور تربیت کردہ ذریں ستارے ہیں۔

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ،مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ،مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ،مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ،مولانا ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ،مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ،مولانا بدر عالم میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ،مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ،مولانا سعید احمد اکبر آبادی رحمۃ اللہ علیہ،مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ،مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ،مولانا عبد الحفیظ بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ

یہ وہ حضرات ہیں جن کی علمی خدمات اتنی درخشاں ہیں کہ دینی مدارس کا کوئی بھی فرد ان درخشندہ خدمات کی تابانی سے فیضیاب ہوئے بغیر اپنی زندگی میں علم کے چراغ روشن نہیں کرسکتا۔اور یہ تمام کے تمام مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ہی کے تربیت یافتہ ہیں۔اسی لیے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کا دَورِ اہتمام اتنا مقبول ہے کہ آج تک

تاریخ لکھنے والا ہر شخص دارالعلوم کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے دورِ اہتمام ہی کو اہم اور درخشاں دَور بتاتا ہے۔

ایسے عظیم اور فعال مہتمم کے ۲۵ سالہ دَورِ اہتمام کو فاضل مرتب نے فقط سوا سال لکھ کر تاریخ پر ستم نہیں کیا تو کیا کیا ہے؟

بہر حال مفتی شفیع صاحب کے فرمودات میں آپ دیکھئے انہوں نے کہا ہے: ''میں نے جب یہ مضمون حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دکھایا تو وہ پھولے نہیں سمائے''۔

لیجیے صاحب! دارالعلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ لکھنے والے فاضل مرتب صاحب نے جن مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کا دَورِ اہتمام ۱۹۲۸ء تا ۱۹۲۹ء لکھ کر سوا سال کی وضاحت بھی تحریر کی ہے، ان ہی حبیب الرحمٰن عثمانی کو مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ جیسا بلند پایہ عالم اپنے طالبِ علمی کے دَور میں مہتمم کہہ رہا ہے۔ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا سن فراغت ۱۹۱۸ء ہے ظاہر سی بات ہے پہلا مضمون اپنی تعلیم کے ابتدائی دَور ہی میں لکھا ہوگا، جس سے بلا شبہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ بات ۱۹۱۴ء، ۱۹۱۵ء کی ہے۔ اب ذرا فاضل مرتب صاحب بتائیں کہ جب ۱۹۱۴ء میں مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحب مہتمم ہیں تو پھر صرف ۱۹۲۸ء سے ۱۹۲۹ء تک کیوں لکھا گیا۔ اور زمین کے جس واقعہ کا ذکر مفتی شفیع صاحب نے کیا ہے، وہ بھی ان کے طالب علمی کے زمانے کا ہے یعنی ۱۹۱۸ء سے پہلے ہی کا۔ اگر ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۷ء میں حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم تھے تو پھر زمین کے کاغذات خود انہوں نے الماری کھول کر کیوں نہیں دکھائے؟ یا اُس آنے والے شخص نے حافظ محمد احمد صاحب کو مخاطب کر کے ہنگامہ کیوں نہیں کیا؟ کیوں اس نے مولانا حبیب الرحمٰن کو بُرا بھلا کہا؟

خیر بات دراصل یہی ہے کہ مولانا منظور نعمانی نے جو مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی تقریر کا حصہ نقل کیا ہے وہ ہی حقیقت واقعہ ہے مولانا رشید احمد گنگوہی نے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کو مہتمم ہی بنایا تھا۔ اسی لیے ۱۹۰۵ء سے لے کر تاحیات یعنی ۱۹۲۹ء تک ۲۵ سال کا زمانہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ہی کا دورِ اہتمام ہے۔ اور یہ جو ۱۹۰۶ء میں مجلس شوریٰ کے انتخاب کا ذکر ہے۔ جس کے تحت لکھا گیا ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کو نائب مہتمم منتخب کیا گیا وہ دراصل مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد ان کے حکم کو باضابطہ نافذ کرنے کی صورت ہے، کیونکہ مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۰ء پانچ سالوں تک حافظ محمد احمد صاحب کے دورِ اہتمام میں جب کوئی خاص اور نمایاں کارکردگی محسوس نہیں کی تبھی مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کو مہتمم ثانی بنایا۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے سرپرست تھے اور خوب جانتے تھے کہ کس کام کے لیے کون شخص بہتر ہے۔ حافظ محمد احمد صاحب کو اپنے والد حضرت نانوتوی صاحب کی نسبت سے مہتمم بنا دیا تھا لیکن جو انتظامی

صلاحیتیں دارالعلوم جیسے عظیم ادارے کے مہتمم میں ہونی چاہئے تھیں وہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے علاوہ کسی اور میں نظر نہیں آئیں، اسی لیے تو مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ہی کی محنت اور لگن سے دارالعلوم نے خوب ترقی کی اور اگر حافظ محمد احمد صاحب مہتمم ہوتے تو مفتی شفیع، مولانا منظور نعمانی، مولانا مناظر احسن گیلانی جیسے بڑے بڑے جید علماء اپنی طالبِ علمی کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کو مہتمم کبھی نہ لکھتے، کیوں کبھی کسی ایک نے بھی حافظ محمد احمد صاحب کو مہتمم نہیں لکھا۔؟ کیونکہ جناب حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ بس نام کے مہتمم تھے۔ باقی اہتمام کی تمام تر ذمہ داری مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ہی کے سپرد رہتی تھی۔ اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی شاندار و نمایاں کارکردگی ہی کے سبب اُن کا نام آج تک دارالعلوم کی تاریخ میں سنہرے لفظوں کی مانند تحریر ہے۔

بات طویل ہوگئی، لیکن اس طوالت کی ضرورت تھی اور یہ طول بے سبب نہیں، یہ وہ حق ہے جس کو جانتے تو سب ہیں، لیکن ہم سے پہلے کسی نے اتنی تفصیل سے بیان نہیں کیا۔

یہاں دارالعلوم کی جدید تاریخ کے فاضل مرتب یہ بھی کہہ سکتے ہیں، بلکہ کہہ سکتے ہیں نہیں یہی کہیں گے۔ کہ ہم نے کوئی جھوٹ نہیں لکھا ہے، تاریخ دارالعلوم قدیم میں جو لکھا تھا وہی ہم نے نقل کیا ہے۔ کاغذی دستاویز کے حساب سے حافظ محمد احمد صاحب کو ہی مہتمم لکھا جاتا رہا ہے۔ بے شک ہم بھی فاضل مرتب صاحب کے اس جواب کو غلط نہیں کہیں گے، لیکن کیا فاضل مرتب اپنے شعور کی آنکھیں کھول کر تاریخ مرتب نہیں کر سکتے تھے۔ کوئی بھی تاریخ لکھنے کے لیے کسی بھی فقط ایک قدیم کتاب سے واقعات نقل نہیں کیے جاتے، بلکہ موضوع کے متعلق بہت سا مواد ثقہ اور معتبر حضرات کی تحریروں میں تلاش کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہر تاریخ ایک ہی کی نقل معلوم ہوگی۔ ۵۰، ۱۰۰ سال پہلے کسی نے جو تاریخ لکھ دی، پھر آنے والی نسل کے مؤرخ اگر فاضل مرتب جیسی صلاحیت کے مالک ہوئے تو بلا مزید تحقیق کے اُس قدیم تاریخ کے حوالے ہی نقل کرتے رہیں گے، اور عوام کو مزید تحقیقی اور مستند تاریخ معلوم ہی نہ ہو سکے گی۔ اسی لیے مورخ کا سب سے پہلے یہی کام ہوتا ہے کہ جس موضوع یا شخصیت کے بارے میں لکھنا ہو اُس عنوان پر خوب تلاش و بسیار کے ساتھ تحقیق کرے، پھر جو باتیں قدیم تاریخ سے متضاد محسوس ہوں ان پر حق بیانی اور صدقِ نیت کے ساتھ مدلل کلام کرے، تاکہ عوام کو جدید اور مزید تحقیقی مواد فراہم ہو سکے۔ جیسا کہ علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرت النبی میں کیا۔ کیا سیرت کی کتابیں اس سے پہلے نہیں لکھی گئیں؟ بے شک لکھی گئیں، لیکن جس تحقیق سے سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں عیسائیوں کو جواب دیے ہیں اور جس تحقیق سے سیرت کو تحریر کیا ہے اس کی مثال اس سے پہلے شائع شدہ کتب میں نہیں ملتی۔ کیا ہمارے فاضل مرتب کی طرح علامہ ندوی پہلے سے شائع شدہ عربی کتب کو اُردو میں نقل نہیں کر سکتے تھے؟ بالکل کر سکتے تھے، لیکن اللہ رب العزت نے انہیں جو بے دار مغز، وسعتِ نظر اور غیر جانب دار قلب عطا کیا تھا اس کے سبب انہوں نے اپنے شعور و وجدان کے

چراغوں کو روشن رکھتے ہوئے ایسی تحقیقی سیرت پیش کی کہ آج تک امت اس سے مستفید ہو رہی ہے۔ان ساری باتوں سے ہمارا مقصد بس یہی کہنا ہے کہ تاریخ لکھنا آسان کام نہیں ہے،اس کے لیے عمیق مطالعے اور وسیع النظری کے ساتھ ساتھ شعور و وجدان کے اُجالے بھی درکار ہوتے ہیں۔

ہم نے تحقیق اور معتبر علماء کرام کے فرمودات سے وہ مستند تاریخ آپ کے سامنے پیش کی ہے جو فاضل مرتب کبھی نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ اس کام کے لیے محنت لگتی ہے۔ بہت سی کتابوں کو پڑھنا پڑتا ہے،کتب خانوں کے چکر لگانے پڑتے ہیں،تب جا کے کتابیں حاصل ہوتی ہیں۔فاضل مرتب صاحب نے تو بس محبوب رضوی صاحب کی تاریخ دارالعلوم کا چربہ کرنا تھا سو انہوں نے کیا۔عوام کو صحیح تاریخ سے آگاہ کرنا مقصود ہوتا تو اس درجہ غیر ذمہ داری سے کام نہ لیا جاتا، جیسا کہ لیا گیا ہے۔

بہر حال چند صفحات پہلے مفتی شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے فرمودات سے قبل ہم نے دارالعلوم کی روداد کا ذکر کیا ہے، آیئے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی سے پہلے کی روداد اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی تحریر کردہ روداد کا فرق محسوس کریں، ہوسکتا ہے کہ کوئی صاحب ہماری طول بیانی سے تنگ آ کر یہاں بے ساختہ یہ بھی کہہ دیں: ”مان گئے بھائی ہم مان گئے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کا دَورِ اہتمام سوا سال یا سوا چار سال کا نہیں ہے ۲۵ سال کا ہے اب مزید تفصیل کی ضرورت نہیں“۔ایسے موقع پر ہم یہی کہیں گے کہ: میرے بھائی بے شک ہمیں احساس ہے کہ یہ موضوع کافی طول اختیار کر گیا،لیکن اس کتاب سے پہلے کسی بھی کتاب میں اس موضوع پر اتنی تفصیل سے کوئی معلومات آپ کو نہیں ملے گی اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارے بعد اور کوئی بھی صاحبِ قلم مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے حق کی خاطر کسی قسم کا قلمی جہاد نہیں کرے گا۔جس عظیم المرتبت شخصیت کی قبر کے پتھر کو دیوبند کے لوگ نہیں بچا سکے اس کی کارگزاریوں کا تذکرہ ہی کیونکر کر سکیں گے۔قاسمی قبرستان کے مہتمم نے نہ جانے کس تعصب اور تنگ دلی کے سبب مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی قبر پر تقریباً ساٹھ سال سے لگے پتھر کے کتبے کو تڑوا دیا یہ کوئی نہیں جانتا۔اگر چہ قبرستان کے مہتمم مولانا سفیان قاسمی صاحب کے دادا حضرت قاری طیب رحمۃ اللہ علیہ کو حکیم الاسلام اور دارالعلوم کا مہتمم بنانے والی واحد یہی شخصیت تھی۔قاری طیب رحمۃ اللہ علیہ نے خود اس کا بارہا اعتراف و اظہار کیا ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ہی نے مجھے قلم پکڑ کے لکھنا سکھایا اور انتظامی اُمور کی باریکیاں سمجھائیں۔تو میرے بھائی تاریخ کی ایسی مظلوم شخصیت جس کو اپنوں ہی نے زخم دیے ہوں اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا تذکرہ جتنا بھی تفصیل سے آجائے اُتنا ہی اُمت کی معلومات میں اضافہ ہوگا،اسی لیے ہم اس موضوع پر معلومات یکجا کرنے کے لیے کوئی دقیقہ اُٹھا کر نہیں رکھنا چاہتے۔کسی کو اگر اس تفصیل سے بوریت ہوگئی ہو تو وہ چند صفحات پلٹ کر اگلے مضامین کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ویسے بھی تاریخ ایک رُوکھا سوکھا موضوع ہے۔اس کے اندر افسانوی نثر کی طرح ادب

کی چاشنی اور رنگینیاں تو ہوتی نہیں ۔تاریخ تو تاریخ کی طرح ہی بیان کی جاسکتی ہے ۔ہم بے جا لفاظی یا بے سود قصے کہانیاں تو بیان کرنے سے رہے۔

آئیے! اب دارالعلوم کی سالانہ روداد کی بات کرتے ہیں ۔ دارالعلوم کے قیام کے بعد ہی سے ہر سال اس کے نظام واہتمام، آمدنی واخراجات، کارکردگی وضروریات کی تفصیل تحریری شکل میں عوام کے سامنے پیش کرنے کا معمول رہا ہے، چونکہ دارالعلوم کسی فردِ واحد کی جاگیر یا ملکیت نہیں ہے، بلکہ امت کے صاحب خیر حضرات کے تعاون سے چلنے والا ایک ایسا ادارہ ہے جس کا قیام دیوبند کے چند مخلص اور صاحب دل وصاحب علم افراد نے کیا تھا۔ اِنھیں افراد کو اکابرینِ بھی کہا جاتا ہے، جن کے نام اور تفصیل آپ گزشتہ صفحات میں پڑھ آئے ہیں ۔ان ہی اکابرینِ میں مولانا قاسم نانوتوی کا شمار ہوتا ہے، جنہوں نے دارالعلوم کے قیام کے بعد اس کو چلانے کے لیے آٹھ اُصول تحریر فرمائے ہیں ۔ان ہی اُصولوں پر دارالعلوم دیوبند اور اس کی طرز پر چلنے والے مدارس عمل پیرا ہیں ۔ ان ہی اکابرینِ میں مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کا نام شامل ہے، یہ اپنے زمانے میں انسپکٹر آف مدارس تھے، اس لیے مدارس کو چلانے کے نظام واہتمام وطلباء کے تعلیمی انتظام وطریقے سے بخوبی واقف تھے، انہوں نے عوامی چندے سے چلنے والے ادارے کے احوال وکوائف سے عوام کو آگاہ کرنے کی خاطر ہر سال دارالعلوم کے احوال و کوائف روداد کی شکل میں شائع کرنے شروع کیے تھے۔

ان روداد میں پورے سال خرچ ہونے والی رقم کی تفصیل کے ساتھ پڑھنے والے طلباء کے نام، امتحان کی تفصیل، چندہ دہندگان کے نام مع رقم، طلباء کے لیے اُصول وضوابط اور ساتھ ہی مہتمم کے لیے بھی کن اوصاف کی ضرورت ہے اس کے اختیار کیا ہیں اس کی بھی وضاحت ہوتی تھی ۔ یہ روداد ابتدا میں تو ۳۰-۴۰ صفحات پر مشتمل ہوتی تھی پر چند سالوں بعد ۷۰ سے ۸۰ صفحات تک اس کی ضخامت پھیل گئی تھی ۔وقت گزرتا گیا اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے جب روداد کی ذمہ داری اپنے ہاتھ میں لی تو پھر اس روداد کا معیار بلند ہو گیا اور ذکی وفہیم حضرات نے محسوس کیا کہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی تیار کردہ روداد کا رنگ ڈھنگ ہی الگ تھا۔ان کے قلم کی تاثیر ہر سطر سے محسوس کی جاسکتی تھی ۔مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی جن انتظامی صلاحیتوں کا ذکر اُس دَور کے تمام اکابر وعلماء نے کیا ہے وہ صلاحیتیں اِن روداد میں خصوصی طور پر نمایاں ہوتی ہیں ۔ دل تو یہی چاہ رہا ہے کہ آپ کے سامنے کئی سالوں کی روداد دلیل و برہان کے طور پر پیش کردوں، لیکن مزید طوالت کا خطرہ اور کتاب کو زیادہ ضخیم نہ کرنے کی فکر نے ہاتھوں کو روک رکھا ہے ۔مگر پھر بھی اِس دَور میں جبکہ دارالعلوم سے اُس طرح کی روداد شائع ہونے کا سلسلہ زمانہ ہوا ختم ہو چکا ہے، اور نئی نسل تو کیا پچاس ساٹھ سال کی عمر کے لوگ بھی نہیں جانتے کہ دارالعلوم کی روداد کیسی ہوتی تھی ۔اس لیے معلومات میں اضافے اور آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کردینے کی نیت سے ہم یہاں ایک

روداد مکمل پیش کر رہے ہیں، تاکہ آپ کو معلوم ہو یہ روداد کیا اور کس طرح کی چیز کا نام ہے ساتھ ہی مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے زیر اہتمام شائع ہونے والی روداد کا بھی کچھ حصہ پیش کریں گے تاکہ آپ اُس فرق کو محسوس کرسکیں جو مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی عظمت کا ضامن ہے۔

بلاشبہ ہمیں احساس ہے کہ روداد کا نمونہ پیش کرنے سے دس، بیس صفحات کا اضافہ ہو جائے گا، لیکن یہ اضافہ جو فی الحال ایک غیر ضروری چیز معلوم ہو رہا ہے آنے والی نسلوں کے لیے ایک دستاویز کی حیثیت اختیار کرلے گا، کیونکہ بات دارالعلوم دیوبند کی ہے، ہندوستان ہی نہیں بلکہ برصغیر کے اُمّ المدارس کی ہے اتنے بڑے ادارے سے جب غیر معتبر مواد سے بھری کتاب جامع تاریخ بنا کر پیش کی جائے گی تو اس سے پھیلنے والی تاریکی کو مٹانے کی غرض سے دیے گئے جواب کے لیے ہمیں ہر طرح سے دلیل و برہان کے چراغ تو روشن کرنے ہی پڑیں گے۔ اب اگر دلائل کا یہ اُجالا کچھ صفحات کا احاطہ کرلیتا ہے تو اس کو غیر ضروری تو نہیں کہا جاسکتا۔ ویسے بھی دارالعلوم دیوبند کی نئی لائبریری تعمیر ہو چکی ہے، یاد رکھئے گا پُرانی عمارت سے جب نئی بلڈنگ میں کتابوں کو منتقل کرنے کا سلسلہ شروع ہوگا تو یہ روداد جو آج موجود ہیں ان میں سے بہت سی ضائع بھی ہو جائیں گی یا کر دی جائیں گی۔

لیجیے پہلے حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مہتمم بننے کے بعد کی روداد ملاحظہ فرمائیے۔ حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۹۵ء میں مہتمم بنائے گئے۔ ابتدا میں کوئی بھی مہتمم فوری طور پر تمام کام کی طرف توجہ نہیں کر پاتا، اس لیے ہم ۱۸۹۶ء کی نہیں، بلکہ اہتمام سنبھالنے کے پانچ سال بعد کی روداد نقل کر رہے ہیں۔

....

نوٹ

قارئین! یہاں سے دارالعلوم کی روداد کا آغاز ہوتا ہے۔ گزشتہ صفحات کی تفصیل سے آپ کو معلوم ہی ہوگیا ہے کہ ایک روداد مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے مہتمم بننے سے پہلے کی ہے اور دوسری اُن کے مہتمم بننے کے بعد کی۔ یہ دونوں روداد یہاں پیش کرنے کا مقصد موازنہ کرنے کے علاوہ ایک یہ بھی ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ یہ روداد محفوظ ہوجائیں۔ آج دارالعلوم کی قدیم رودادیں کہیں بھی نہیں ملتیں، اگر کوئی تاریخ کا طالبِ علم دارالعلوم کی قدیم روداد دیکھنا چاہے تو دارالعلوم دیوبند کی لائبریری کے علاوہ بہت مشکل ہی سے کہیں وہ ان روداد کا دیدار کرسکے گا۔ اس لیے ہم نے سوچا کہ ہماری کتاب کے صفحات بھلے ہی بڑھ جائیں؛ لیکن دستاویز کی حیثیت سے کم سے کم ایک دوروداد تو ہم اپنی اس کتاب کے ذریعہ محفوظ کر ہی سکتے ہیں۔

اگر آپ کو ان روداد سے دلچسپی نہ ہو تو بلا شبہ آپ تقریباً یہ ۵۳ رصفحات چھوڑ کر کتاب کا مطالعہ جاری رکھ سکتے ہیں۔ یہ مختصر نوٹ ہم نے اسی لیے دیا ہے، اگر اس وقت یہ روداد آپ کو کتاب کے تسلسل میں رُکاوٹ محسوس ہوں یا ہمارے جائزے کو پڑھنے کی روانی میں خلل کا باعث لگیں تو آپ یہ صفحات چھوڑ کر صفحہ نمبر ۱۳۰ سے کتاب کا مطالعہ تسلسل اور روانی کے ساتھ جاری رکھیں۔

....

یہ روداد سن ۱۹۰۰ء کی ہے۔اُس زمانے میں تمام تر روداد مولانا محمد عبدالاحد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تیار کرتے تھے۔اور تمام روداد میں ہمیشہ ایک جیسی ہی تحریر ہوتی تھی۔کسی شخصیت کا انتقال ہوگیا تو اس کا ذکر آتا تھا ورنہ ہر سال ایک سی ہی بات تحریر کر کے گوشوارہ اور طلباء وامتحان کا تذکرہ کر دیتے تھے۔بالکل اسی طرح جیسے درج ذیل روداد میں ہے:

روئداد سال سی و پنجم مدرسہ اسلامی عربی دیوبند

بابت ۱۳۱۷ھ بماہ ستمبر ۱۹۰۰ء

فارسی زبان میں مناجات کے اشعار کے بعد روداد کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

الحمدللّٰہ وکفٰی وسلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی خصوصًا علٰی خیر خلقہ محمد المجتبٰی وعلٰی آلہٖ وأصحابہ ائمۃ الھدٰی ومصابیح الدنیا وعلی من اقتفا بآثارھم واھتدیٰ امّا بعد ہزار شکر خدا صد ہزار شکر خدا کہ ایں سال فرخ فال یکہزار وسہ صد وہفد ہم ہجری یعنی سال سی و پنجم برمدت عمر این نوبادۂ بستان دین سید المرسلین افزودہ وابواب فرخندگی وکامرانی برروے ہمہ اسلامیان بلکہ برجملہ جہانیان کشود وباآنکہ سی و پنج سال ازسنین خیر قرینش سپری شدہ اند ہنوز آوازہ فیض رسانیش ہمچناں تازہ بلکہ کارش روبترقیات بے اندازہ ہست چہ از وفورِ آمد صرف چندہ تعلیم وچہ از بسیاری اجتماع طلبہ نزدیک و دورو چہ از وسعت تعلیم علوم دینیہ وچہ ازکثرت جمعیت کتب درسیہ وغیر درسیہ وچہ از افزونی کار تعمیرات وچہ از اسلوبی انتظامات واہتمامات لابدی کہ کارکنان مدرسہ حسب اقتضاے وقت بعمل آوردہ اند چنانچہ از ملاحظہ تفصیلی روئداد ہذا خاطر نشین ناظرین باتمکین خواہد شد الحمدللہ علٰی ذلک حمداً کثیراً۔منتظمان این کارسترگ رااز شکرگزاری گروہ بزرگ مدرسان ومہتمم مدرسہ گزیر نیست کہ ایشان کارہائے مفوضہ خود را خالصاً لوجہ اللہ بحسن وخوبی انجام دادہ مستحق اجرعقبیٰ وآفرین دنیاشدہ اندومحنت وجانفشانی جماعت طلبہ نیز لایق تحسین ومستحق آفرین است کہ شب وروز گرد محنت شاقہ بودہ از یک وگرگوے سبقت ربودہ اند۔شکر توجہ فرمائی حضرات معاونان مدرسہ بیش از حد بیان ست کہ ایشان درتقرر واداے چندہ بذل توجہ موفور فرمودہ۔ذخیرۂ حسنات اُخروی وخزینۂ برکات دنیوی اندوختہ اند۔سلسلہ تعمیر مکانات متعلقہ تعلیم مثل سال ذشتہ سال نیز مسلسل جاری ماند واز اکثرے از ضروریات تعمیر فراغ ہم حاصل شد تاہم بسیارے از تتمیجات ضروریہ این عمارات کہ تخمینہ اتمام آنہا کم از دوسہ ہزار روپیہ نیست ہنوز باقیست کہ اگر آنرا ہمچناں برحالت موجودۂ او گزاشتہ و بروقت دیگر موقوف داشتہ آید بالضرور خالی ازحرج کارونقصان تعمیر موجودہ نخواہد بودہ وکیسۂ مد تعمیر بالکل خالی شدہ است۔پس محض بتوکل ذات باری عزاسمہ کہ ہرآئینہ کامرواے ناداران وگرہ کشاے بستہ کاران است وباعتبار بذل وسخاوت اہلِ خیر کہ

ہموارہ تحصیل اجر آخرت وتکثیر ثواب عقبیٰ راو جہ ہمت خود دارند۔کار تعمیر رابندکردہ ایم تاباشید کہ بعض بندگان خاص بارگاہِ خداوندی جل شانہٗ راخیال حمایت علوم دین خیرالانام دردل جوش زند ورگ حمیت اسلام بحرکت آید و دستے درتمشیت ابن کار اَہَم دہند دلے برتکمیل ابن کار مُہِم نہند وحق تعالیٰ وتقدبرکت ہمت ایشان این کار را با تمام رساند۔ برکریمان کارہا دشوارنیست، واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔خدایا سلسلۂ این روئداد سالانہ کہ بارشتہ سالگرہ ابن رعنا برنائے سی و پنجالہ عقد موافقت بستہ است باسلسلۂ ابد پیوستہ باد۔ من عمرتو جاودانہ خواہم کہ شود ❁ آمین یارب العباد بحرمت النبی وآلہ الامجادج

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

ذکر تغیرات سال ہٰذا

(۱) بصد افسوس ظاہر کیا جاتا ہے کہ مولوی عبد العلی صاحب مدرس دوم مدرسہ یہاں سے یکا یک تعلق ترک کر کے مدرسہ حسین بخش واقع دہلی تشریف لے گئے۔مولوی صاحب موصوف حسبِ معمول تعطیل رمضان شریف میں مکان کو تشریف لے گئے تھے اور ہم کو ظاہراً کوئی وجہ اس گمان کی نہ تھی کہ تشریف نہ لائیں گے مگر بعد ختم تعطیل مولوی صاحب نے ایسے قطعی طور سے یہ لکھا کہ میں نہ آؤں گا کہ ہم کو ہرگز موقع عرض کرنے کا نہ رہا اور تعجب وحسرت کے ساتھ ساکت ہونا پڑا۔خیر اللہ تعالیٰ ہر جگہ مولوی صاحب کو خوش رکھے اور اس مدرسہ کے واسطے کوئی عمدہ صورت پیدا کردے چونکہ اس عہدہ کا انتظام جلدی سے ہونا مشکل تھا،لہٰذا بمنظوری حضرت سرپرست صاحب یہ رائے قرار پائی کہ سردست اسباق متعلقہ مدرس دوم کو دیگر مدرسان سے متعلق کردیا جائے سو الحمدللہ کہ اب تک یہ کارروائی عمدہ طور سے ہوئی اور طلبہ کی خواندگی میں کسی طرح کا حرج ونقصان واقع نہیں ہوا۔منتظمان مدرسہ اپنے لائق اور بااخلاص مدرسان کے شکرگزار ہیں اور تدبیر کررہے ہیں کہ جلد کوئی ایسا انتظام ہو کہ ہمارے مدرسان کو اس زائد بار سے سبکدوشی حاصل ہوجائے۔

(۲) چونکہ درجات ابتدائی عربی کی حالت عرصہ سے اچھی نہ تھی اور اُن کی تعلیم کے واسطے کوئی مدرس بالاستقلال ذمہ دار نہ تھا اور اسی سبب سے زیریں درجات میں طلبہ بھی کم تھے،لہٰذا یہ مشورہ ہوا کہ مولوی گل محمد صاحب مدرس منگلور کو لکھا جائے کہ اگر وہ دس روپیہ تنخواہ پر تشریف لائیں تو اُن کو امتحاناً مقرر کیا جائے چنانچہ وہ آئے اور امتحاناً مقرر ہوئے۔اگرچہ اُن کا تقرر ۲۴؍شوال ۱۳۱۶ھ سے ہوا تھا مگر چونکہ وہ زمانہ قریب ختم سال کا تھا اس لیے ان کا ذکر روئداد سالانہ ۱۳۱۶ھ میں نہیں ہوا بہرحال مولوی گل محمد صاحب اب تک موجود ہیں اور جس قدر تجربہ ہوا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے تقرر سے درجات زیریں کو بہت نفع پہونچا ہے اور تعداد طلبہ میں بھی ترقی پائی گئی مگر

چونکہ جو امر خاص واسطے تعلیم طلبہ مبتدی اور کم عمر کے معلم میں ہونا لازمی ہے، اُس کی نسبت ہنوز کامل اطمینان نہیں ہوا لہٰذا اُن کے استقلال کی نوبت نہیں پہونچی۔

ذکر خزانہ وخزانچی مدرسہ

قدیم سے خزانچی مدرسہ ہٰذا کے جناب مولانا مولوی ذوالفقار علی صاحب رئیس دیوبند وممبر مشورہ مدرسہ ہٰذا کے ہیں اور خزانہ سے روپیہ لینے اور داخل کرنے کے واسطے ایک ہی نمونہ کی دو کتابیں مجلد رہتی ہیں جن میں مدات ضرور پڑی ہوئی ہیں ایک کتاب خزانچی صاحب کے پاس رہتی ہے اور دوسری مہتمم صاحب کے پاس ہوتی ہے جب کچھ روپیہ لیا جاتا ہے یا داخل کیا جاتا ہے تو دونوں کتابوں میں درج ہو کر دونوں خزانچی صاحب اور مہتمم صاحب کے دستخط ہو جاتے ہیں اور اوقاتِ خاص میں خزانہ کی پڑتال بمواجہ چند اہل مشورہ ہوتی ہے۔

قوانین متعلقہ اہلِ شوریٰ

(۱) جو اہلِ مشورہ مسلمہَ اہلِ چندہ ہیں اور ابتدا سے مدرسہ سے اُن کے اعتماد پر چندہ آتا ہے۔ اور کیفیات سالانہ ہیں اُن کے دستخط ہوتے ہیں۔ یا جو اور بزرگوار باتفاق اہلِ مشورہ زمرۂ اہلِ مشورہ میں داخل ہوں اور اُن میں سے کوئی شخص کسی وجہ سے کم ہو جائے تو بشرط ضرورت اُس کی جگہ جدید شخص حسبِ انتخاب واتفاق اہلِ مشورہ مقرر ہوگا عموماً اہلِ مشورہ کا تجربہ کار اور اہلِ صلاح میں سے ہونا ایک ضروری امر خیال کیا جائے گا۔ اور یہ ضروری نہیں کہ جملہ اہلِ مشورہ باشندگان دیوبند ہی ہوں بلکہ بیرون جات سے بھی لائق لوگ شامل اہلِ مشورہ ہو سکتے ہیں بشرطیکہ اُن کو شریک جلسہ ہونے کا یا درصورت کسی عذر کے تحریری رائے دینے کا حتی الوسع التزام واہتمام ہو۔

(۲) تجویز اہل مشورہ درباب تقرر وترقی وتنزل وموقوفی ملازمان ومدرسان مدرسہ ہٰذا اور خرچ کرنے زرچندہ ودیگر انتظامات مدرسہ کی قطع ہوگی مگر بڑے اُمور میں حتیٰ الامکان رائے جملہ اہلِ مشورہ کی تقریراً یا تحریراً ضروری ہوگی اور یہ بات لازمی سمجھی جائے گی کہ جملہ اہلِ شوریٰ سے رائے طلب ہو۔

(۳) تغیر وتبدل اہلِ شوریٰ ومہتمم ومدرسان عربی ہمیشہ درج کیفیت سالانہ ہوا کرے گا۔

قوانین متعلقہ مہتمم مدرسہ ہٰذا

(۱) تقرر وتبدل ورخصت وموقوفی مہتمم باختیار اہل مشورہ ہے۔ لیکن اہلِ مشورہ کو درباب تقرر مہتمم بہت غور اور فکر ودور اندیشی چاہیے۔ مہتمم ایک مدبر اور تجربہ کار ذی استعداد امانت دار شخص ہونا چاہیے جس میں قوت انتظامیہ

پوری ہو اور ہر طرح سے لائق اطمینان و اعتماد اور قدر دان علم و اہل علم ہو۔

(۲) مہتمم صاحب جملہ محرران و ملازمان مدرسہ و دفتر کی درستی حساب و کتاب و ترتیب دفتر کے ذمہ دار ہیں اور مدرسان کی حاضری اور تعلیم کی درستی وغیرہ کی ذمہ داری اور نگرانی بھی اُن کا کام ہے مہتمم صاحب کو اس کا بھی لحاظ ضروری ہے کہ قواعد متعلقہ تعلیم طلبہ و نقش جات تعلیم و داخل خارج وغیرہ متعلقہ طلبہ کی تعمیل پوری ہوتی ہے یا نہیں اور خصوصاً اُن طلبہ کے حال کی نگرانی جو مکان مدرسہ میں سکونت رکھتے ہیں اور ان کے حجرات کے تغیر و تبدل کا خیال لازم ہوگا، تاکہ طلبہ میں کوئی شورش اور فتور اور بے تہذیبی واقع نہ ہو۔

(۳) اُمورِ انتظامیہ اور مصارف معمولی روزمرہ میں مہتمم صاحب مجاز ہیں جو مناسب سمجھیں وہ کریں اور جزوی غیر معمولی خرچ بھی اپنے اختیار سے کر سکتے ہیں۔ مگر کثیر اخراجات غیر معمولی اور کسی خاص انتظام میں اہلِ مشورہ سے رائے لینا چاہیے، مہتمم صاحب مجاز ہیں کہ مدرسان و ملازمان کو بشرط استحقاق و عدم حرج کار کے چھ ماہ میں رخصت ایک ہفتہ کی بہ تفاریق یا ایکبارگی حسبِ قواعد رخصت دیدیں لیکن زیادہ رخصت دینے میں منظوری اہل مشورہ ضروری ہے۔

آئین رخصت ملازمان مدرسہ

(۱) رخصت ملازمان مدرسہ کو علاوہ تعطیلات مذکورہ آئندہ کے بلاوضع تنخواہ صرف دو قسم کی مل سکے گی اول بوجہ بیماری دوم اتفاقیہ۔ چونکہ ایک تعطیل کلاں زائد از یک ماہ دی جاتی ہے۔ اس لیے اور کوئی رخصت رعایتی بلاوضع تنخواہ نہ دی جائے گی۔

(۲) رخصت اتفاقیہ مذکورہ سال بھر میں دو ہفتہ سے زائد کی نہیں مل سکتی۔ اور اس رخصت کا تجزیہ بھی ہوسکتا ہے لیکن اگر ملازم جدید ہوگا تو بعد کارگزاری ششماہی رخصت اتفاقیہ سے مستفید ہوسکتا ہے۔ درصورت ضرورت قوی قبل کارگزاری چھ ماہ کے رخصت مذکورہ بعد وضع تنخواہ دی جائے گی۔

(۳) رخصت بوجہ بیماری سال بھر میں ایک ماہ کی مل سکتی ہے۔ بشرطیکہ مہتمم کی رائے میں بیماری ایسی ہو کہ مدرس کار تدریس نہ کر سکے۔ اور اس رخصت کا تجزیہ بھی ہوسکتا ہے یعنی بیمار اس قسم کی رخصت بدفعات لینا چاہے تو مل سکے گی مگر مجموعہ رخصت سال بھر کا ایک ماہ سے زائد نہ ہوگا۔ اگر ایک ماہ سے زائد ہوگا تو ایامِ زائد کی پوری تنخواہ وضع ہوگی۔

(۴) چونکہ قواعد رخصت میں بہت رعایت مدرسان کی ہوئی ہے اس لیے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ کوئی مدرس ایک گھنٹہ کو بھی بلا اجازت مہتمم غیر حاضر نہ ہو۔ اگر ہوگا تو باز پُرس ہوگی اور تنخواہ اُس روز کی وضع کی جائے گی۔

(۵) اگر کوئی مدرس ایک ہفتہ تک بلاحصول رخصت غیر حاضر رہے گا تو لائق معزولی سمجھا جائے گا۔

(۶) رخصت خواہ کو چاہیے کہ استفادہ رخصت سے جس قدر پہلے ہو سکے درخواست تحریری مہتمم کو دے اور جو جواب تحریری بہ پابندی قواعد ملے اُس پر کاربند ہو۔

(۷) جو ملازم نوکری چھوڑنا چاہے اُس کو لازم ہے کہ ایک ماہ پیشتر مہتمم کو تحریراً مطلع کرے۔

ذکر قوانین متعلقہ انتظام مدرسہ ووقت درس وتعطیلات وغیرہ

(۱) مدرسہ ہٰذا کی جملہ کارروائی میں دو قسم کے سال مستعمل ہیں۔ایک سال مالی اور دوسرا تعلیمی یعنی ایک متعلق آمدوخرچ اور دوسرا متعلق تعلیم اور تفصیل ہر دو کی ذیل میں درج ہے۔مالی جملہ اقسام کی آمدنی اور خرچ وغیرہ کا حساب وکتاب اور تیاری روئداد سالانہ سن ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے رو سے ہوتا ہے۔یہ سال محرم سے شروع ہوتا ہے اور ذی الحجہ پر ختم ہوتا ہے۔تعلیمی: یہ سال شوال سے شروع ہوتا ہے اور شعبان پر ختم ہوتا ہے۔

(۲) وقت درس موسم سرما میں ۷ بجے سے ۱۱ بجے تک اور ۲ بجے سے ۴ بجے تک۔اور موسم گرما میں ۶ بجے سے ۱۰ بجے تک اور ۳ بجے سے ۵ بجے تک مقرر ہے۔

(۳) پابندی وقت درس کی جملہ طلبہ کو ضروری ہے۔اور تمام وقت درس میں حاضر رہنا ہوگا یہ نہ ہوگا کہ طلبہ سبق پڑھ کے جہاں چاہیں بیٹھیں۔

(۴) اگر کوئی طالبِ علم بلا رخصت ایک ہفتہ غیر حاضر رہے گا یا بخوف شرکت امتحان غیر حاضر ہوگا اُس کا نام مدرسہ سے خارج کیا جائے گا۔

(۵) جب کوئی طالبِ علم بوجہ بیماری یا رخصت غیر حاضر ہو تو کتب مدرسہ جو اُس کو مدرسہ سے واسطے پڑھنے کے دی گئی ہیں مہتمم صاحب کے حوالے کر دے پھر جس وقت حاضر مدرسہ ہوگا تو اُس کو کتب دے دی جائیں گی۔

(۶) کسی طالب علم کو خواہ اُس کو کھانا من جانب مدرسہ ملتا ہو یا نہ ملتا ہو بلا حصولِ رخصت مدرسہ سے غیر حاضر نہ ہونا چاہیے، اگر ہوگا تو باز پُرس ہوگی۔

(۷) مہتمم صاحب گاہ گاہ بلا تعین وقت کے خود یا بذریعہ کسی ملازم مدرسہ کے حاضری لیا کریں گے۔پس جو طالبِ علم بلا وجہ قوی کے زیادہ غیر حاضر رہے گا اُس کا نام خارج کیا جائے گا۔

(۸) طلبہ کو بوجہ سخت ضرورت کے رخصت دے دی جائے گی۔جس کی مقدار ایک ماہ سے زائد نہ ہوگی لیکن ایامِ مقررہ امتحانات میں سوائے مرضِ شدید یا کسی سخت مجبوری کے رخصت ہرگز نہ ملے گی۔اور باایں ہمہ تامقدور اُن سے امتحان سالانہ کی قضاء کرائی جائے گی۔

(۹) اگر طالبِ علم بیرونی جس کی منجانب مدرسہ امداد کھانے وغیرہ کی ملتی ہے دفعات اعلیٰ میں سے سالانہ

امتحان میں اور دفعات ادنیٰ میں سے سہ ماہی امتحان میں اچھا نہ رہے گا یا بلا اجازت مہتمم صاحب غیر حاضر ہوگا اُس کا کھانا موقوف کیا جائے گا۔ اسی طرح جو طالبِ علم مطالعہ کتب اچھی طرح نہ دیکھے گا اور اپنی عادت ایسی ہی رکھے گا وہ مدرسہ سے خارج کیا جائے گا۔

(۱۰) تقسیم اسباق جس طرح بین المدرسین کی جائے، اُس کی پابندی طلبہ کو لازم ہوگی، یہ نہ ہوگا کہ کوئی طالبِ علم ایک مدرس کے پاس سے سبق چھوڑ کر دوسرے مدرس سے پڑھنے لگے اور در بارہ تقسیم اسباق مدرس اعلیٰ کے حکم کی تعمیل طلبہ اور مدرسین پر واجب ہوگی کیونکہ مدرس اول تعلیم کا ذمہ دار ہے۔

(۱۱) امتحان خواندگی سہ ماہی دار ہوا کرے گا۔ اور ایک دفعہ سال تمام میں ہوگا اور لایق طلبہ کو سالانہ امتحان کی عمدگی پر انعام بھی دیا جائے گا۔

(۱۲) امتحان سالانہ شعبان میں ہوا کرے گا۔ اور بعد فراغت امتحان فوراً انعام تقسیم کیا جائے گا۔ اور تمام مدرسہ کو ۲۵ رشعبان المعظم سے ۳ رشوال تک تعطیل دی جائے گی۔ سوائے فارسی و قرآن کے کہ اُن کو صرف تین روز کی تعطیل بعد ختم امتحان سالانہ دی جائے گی۔ مگر چونکہ بغرض امتحانات دیگر مدارس اسلامیہ متعلقہ مدرسہ ہٰذا کے ۱۵ رشعبان تک امتحان مدرسہ ہٰذا ختم کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے مدرسان کو حسبِ رائے مہتمم صاحب و مدرس اعلیٰ عربی امتحان میں جانا ہوگا اور یہ کام بھی اسی مدرسہ کے کاموں میں شریک ہوگا۔ کل مدرسہ کو تعطیل عید الضحیٰ پانچ روز تک یعنی ۹ رسے ۱۳ رتک دی جائے گی اور تعطیل عاشورہ محرم منسوخ کی گئی۔

آئین تقرر خوراک طلبہ

(۱) کوئی طالبِ علم کم از کم کافیہ و شرح تہذیب و منیۃ المصلی میں جب تک امتحان نہ دے گا اُس کا کھانا وغیرہ مقرر نہ کیا جائے گا۔

(۲) تعداد اُن طلبہ کی جن کی خوراک وغیرہ بذمہ مدرسہ ہوتی ہے موافق رائے مہتمم صاحب و حسبِ گنجائش روپیہ کے محدود و معین ہوگی۔ پس جب تک اُس میں سے کوئی جگہ خالی نہ ہو دوسرے شخص کا ذمہ دار مدرسہ نہیں ہے، اُس کو بطور خود اپنے کھانے کا انتظام کرنا ہوگا۔

(۳) مہتمم اور مدرسین کو ہمیشہ تفحص حال اُن طلبہ کا رہے گا جن کی خوراک وغیرہ بذمہ مدرسہ ہے۔ پس جو طالبِ علم کم شوق اور کم محنت پایا جائے گا اُس کی خوراک موقوف کر کے دوسرے مستحق کو دی جائے گی۔

(۴) اگرچہ تقرر وظیفہ زیادہ تر اُن طلبہ بیرونی کے واسطے ہے، جن کو اپنے پاس سے وسعت کھانے کی نہیں لیکن یہ رعایت صرف بحق طلبہ بیرون جات ہی منحصر نہیں، بلکہ گاہ گاہ نہایت مفلس طلبہ باشندے دیوبند بھی اس کے

مستحق سمجھے جائیں گے بشرطیکہ اُن کو کوئی ذریعہ تحصیل علومِ عربیہ و دینیہ کا بلا امداد حاصل نہ ہو۔ اور مد وظائف میں گنجائش بھی ہو۔ مگر اس میں وسعت زیادہ نہ دی جائے گی کہ یہ حق دراصل طلبہ بیرون جات کا خیال کیا گیا ہے کیونکہ اُن کو بہ نسبت باشندگان دیوبند کے گزارہ زیادہ مشکل ہے۔

(۵) خوردسال طلبہ بیرون جات کو جو کہ صاحب وسعت ہوں اور اُن کے وارث متکفل تمام اخراجات کے ہو کر ان کو داخل مدرسہ کرنا چاہیں تو وہ داخل ہو سکتے ہیں؛ لیکن اُن کی بیرونی نگرانی کے ذمہ دار منتظمان مدرسہ نہیں، مگر حتی الوسع اُن کا ہر طرح خیال رکھیں گے اور اُن کے تمام حالات کے نگران رہیں گے۔

ضوابط متعلقہ خواندگی عربی و داخلہ طلبہ عربی خوان مدرسۂ ہٰذا

(۱) مدرسہ ہٰذا میں باعتبار خواندگی عربی کے آٹھ جماعتیں مقرر ہوئی ہیں اور ہر سال میں خواندگی مقررہ مندرجہ نقشہ کی ضرور پوری ہو جایا کرے گی۔

(۲) چوکہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ طلبہ کو ایک روز میں چار اسباق سے زیادہ نہ پڑھائے جایا کریں کہ زیادتی اسباق میں پریشانی اور ضعفِ دماغ کا احتمال ہے، لہٰذا سلسلہ ہائے اسباق باعتبار مدارج خواندگی کے ہر سال کے واسطے مقرر کیے گئے۔ اور مدت ختم کل اسباق اور تحصیل کے واسطے آٹھ برس معین کیے گئے۔ ہر سال میں بعد منائی ایامِ تعطیل اور ایامِ امتحان کے ۲۴۰ یوم ماہوار تعلیم کے واسطے خیال کیے گئے۔ اور ہر سال ایک سلسلۂ کتب درسی اور اسباق اوقات کا تحریر ہوا ہے جس کا مفصل حال نقشہ مشت سالہ تخمینہ تحصیل علم عربی منسلکہ کیفیت ہٰذا سے واضح ہوتا ہے۔ ترتیب کتب درسیہ مندرجہ نقشہ میں اس امر کا بہت لحاظ کیا گیا ہے کہ طلبہ کی استعداد و لیاقت بتدریج ترقی پذیر اور قابل فہم کتب ہو۔ پس کوئی طالبِ علم اس کے خلاف نہ کر سکے گا۔

(۳) ابتدائی کتب اور نیز کتب درسی کے لیے نصف یا پون گھنٹہ اور حدیث کی کتب کے واسطے ڈیڑھ یا دو گھنٹہ باقی کتب کے لیے ایک گھنٹہ مقرر ہوا ہے۔

(۴) ہر ایک طالب علم بلا قید عمر حسبِ صلاح و رائے مہتمم صاحب مدرسہ کے بعد تحقیق حال و کیفیت درستی چال چلن داخل جماعت ہائے عربی کیا جائے گا۔ اور نام اُس کا فوراً کتاب داخلہ میں لکھا جائے گا۔ بلا اندراج نام کے رجسٹر حاضری و رجسٹر داخلہ میں کوئی طالب علم مدرسہ میں تعلیم نہ پا سکے گا۔

قواعد متعلقہ خواندگی فارسی و ریاضی و قرآن شریف و داخلہ طلبہ

(۱) تمام طلبہ کو جو مدرس فارسی کی حراست میں ہیں قوانین خواندگی و داخلہ کی پابندی ضرور ہوگی۔ اور تعلیم

فارسی وریاضی حسبِ تفصیل دفعہ بندی مندرجہ نقشہ منسلکہ کیفیت ہذا ہوا کرے گی۔

(۲) مدرس فارسی بغیر اجازت مہتمم کے کسی طالبِ علم کو داخل نہ کرے گا۔ اور کیفیت داخلہ و خارجہ کی کتاب حاضری ورجسٹر داخلہ میں مندرج ہونی چاہیے۔ مہتمم مدرسہ اُس کی نگرانی زیادہ کریں گے کہ اس دفعہ کی تعلیم پوری ہوتی ہے اور کوئی غیر طالبِ علم بلا اندراج نام کو شامل نہیں ہوتا۔

(۳) طلبہ ساکن قصبہ ہذا خصوصاً نابالغ لڑکے بغیر اجازت و درخواست اُن کے بزرگوں یا سرپرست کے داخل نہ ہوسکیں گے۔

(۴) جو طالبِ علم بلا وجہ معقول اور بلا حصول اجازت پندرہ روز برابر غیر حاضر رہے گا اُس کا نام خارج کیا جائے گا اور اگر دوبارہ داخل ہونا چاہے تو باجازت مہتمم مدرسہ داخل ہوسکے گا۔ لیکن اگر اسی طرح سال بھر میں تین بار غیر حاضر ہوا ہرگز داخل مدرسہ نہ کیا جائے گا۔

(۵) کوئی طالبِ علم بغیر اجازت مدرس کے واسطے حوائج ضروری کے نہ اُٹھے۔ اور جو جگہ نشست کی مدرس نے اُس کے واسطے تجویز کردی ہے، اُس کو باختیار خود نہ بدل سکے گا۔ اگر اس کے خلاف ہوا مستوجب سزا ہوگا۔

(۶) کوئی طالبِ علم بغیر اجازت مدرس کے نہ کوئی کتاب شروع کرسکے گا نہ چھوڑ سکے گا۔ اور خواندگی فارسی کتب نقشہ خواندگی میں منحصر رہے گی۔

(۷) کسی طالبِ علم کو دفتر سے کوئی کتاب بغیر اجازت مدرس اوّل فارسی کے نہ ملے گی۔

(۸) نقشہ دفعہ بندی میں جو موقعہ اور وقت واسطے شروع کرانے عربی کے مقرر کیا گیا ہے اُس پر عربی ضرور شروع ہو، مگر اس سے پہلے عربی کا شروع کرانا مناسب نہیں۔

(۹) مدرس فارس کی یہ بڑی کارگزاری سمجھی جائے گی کہ اُس کی جماعت میں سے طلبہ عربی خوان وقتاً فوقتاً دستیاب ہوں۔ تاکہ آبادی درجات عربی میں امداد ملے۔ اور مقصد اصلی دینیات کا حاصل ہو۔

(۱۰) کوئی طالبِ علم کسی اجنبی شخص کو بلا جازت مدرس کے اپنے پاس نہ بٹھائے۔ اور نہ خود بلا ضرورت شدید کے دوسرے طالب علم کے پاس اُٹھ کر جائے۔ ورنہ مستوجب سزا ہوگا۔

(۱۱) طلبہ فارسی خوان کے واسطے وقت درس موسم سرما میں سات بجے سے گیارہ بجے تک اور موسم گرما میں ۶ بجے سے ۱۰ بجے تک اور شام کو ہمیشہ ۲ بجے سے عصر تک ہے۔

(۱۲) طلبہ لایق کی ترقی اور کم محنت کا تنزل باختیار مدرس ہوگا۔

(۱۳) جہاں تک ممکن ہو ایک کتاب دو جگہ سے نہ پڑھائی جائے اور کثرت اسباق و جماعت سے احتراز واجب ہے۔

(۱۴) حاضری وغیر حاضری طلبہ مدرس اوّل کے سپرد کی گئی۔ باختلاف اوقات جب چاہے حاضری لے لے۔
(۱۵) مبتدی طلبہ کو سبق مدرس یا نائب مدرس فارسی خود پڑھا دیں طلبہ کی سپرد نہ کریں۔
(۱۶) جو طلبہ قرآن شریف نہ پڑھ چکے ہوں اُن کو داخل درجات فارسی نہ کیا جائے، بلکہ مدرس قرآن کے سپرد کریں۔
(۱۷) ہفتہ میں دو روز خواندگی نہ ہوگی یعنی جمعہ کو تعطیل ہوگی اور جمعرات کو مسودہ نویسی۔ اور آموختہ یاد کرایا جائیگا۔
(۱۸) سہ ماہی امتحان ہوا کرے گا۔ اور نتیجہ امتحان پر لحاظ کیا جائے گا۔ پرچہ امتحان داخل دفتر ہوگا اُس کی ایک نقل مدرس اپنے پاس رکھے گا۔
(۱۹) طلبہ قرآن شریف خوان کو بھی مثل طلبہ فارسی خوان کے پابندی قواعد حاضری و خواندگی کرنی ہوگی۔

ذکر آئین اقسام چندہ

(۱) چندہ کی کوئی تعداد مقرر نہیں۔ اور نہ کسی مذہب وملت کی تخصیص ہے۔
(۲) چندہ کی آٹھ قسمیں قرار دی گئی ہیں۔ اور ہر ایک کا جمع خرچ جدا۔ اور تاریخ وار درج حساب ہوتا ہے۔ وہ آٹھ قسمیں یہ ہیں:

اوّل: چندہ امدادی اس کی دو قسمیں ہیں ایک سالانہ جو معین طور سے وصول ہوتا ہے۔ دوسری عطاء یکمشت جو غیر معین طور سے لیا جاتا ہے۔ اور ہر دو قسم کی آمدنی محض تنخواہ مدرسان وملازمان و سائر خرچ مدرسہ میں صرف ہوتی ہے لیکن بشرط اشد ضرورت خوراک و پوشاک و دیگر حوائج طلبہ مساکین و مسافرین میں بطورِ عاریت و قرض صرف ہو سکتی ہے۔

دوم: زکوٰۃ و صدقات اس چندہ کی آمدنی صرف خوراک و پوشاک و دیگر حوائج طلبہ میں صرف ہوتی ہے۔

سوم: قیمت چرم قربانی وعقیقہ۔ اس کی آمدنی بالتخصیص خرید کتب دینیہ اور اُن کی جلد بندی وغیرہ میں صرف ہوتی ہے اور در صورت سخت حاجت کے بطور عاریت خوراک و پوشاک طلبہ میں صرف ہوتی ہے۔

چہارم: انعامی جو خاص بمد انعام طلبہ کامیاب شدہ امتحان سالانہ ہیں خرچ ہوتا ہے۔

پنجم: خرید کتب وقفی۔ اس قسم کے چندہ میں خواہ کوئی صاحب ہمت کتب عطا فرمائیں۔ یا زر نقد واسطے خرید کتب کے عطا کریں ہر دو صورت میں کتب وقفی مدرسہ کی ہوں گی۔

ششم: خوراکی۔ اس قسم کے شریک کو اختیار ہے خواہ کھانا پکا ہوا طلبہ کو دے۔ خواہ زر نقد بقدر قیمت خوراک دیں۔

ہفتم: متفرقات۔اس مد میں وہ رقوم جمع ہوتی ہیں۔جو اسباب مثل پارچہ یا اسباب یا ظروف یا زیور وغیرہ بغرض ایصال ثواب میت کے اہلِ میت ارسال فرماتے ہیں۔یا کسی قسم کی جنس یا نقد واسطے امداد طلبہ مساکین کے عنایت فرماتے ہیں۔اور مد کی آمدنی طلبہ مسافرین و مساکین کی خوراک و پوشاک وغیرہ میں صرف ہوتی ہے۔

ہشتم: تعمیر۔جو ضروری ترمیم اور شکست و ریخت مکان مدرسہ یا تعمیر حجرات جدیدہ میں صرف ہوتی ہے۔

(۳) چندہ امدادی سالانہ حتی الوسع پیشگی یعنی شروع ماہِ محرم میں جمع کیا جائے گا۔

(۴) جو حضرات زکوٰۃ و کفارہ وغیرہ واسطے صرف طلبہ مساکین کے مرحمت فرمائیں گے وہ مثل دیگر چندوں کے کمال احتیاط سے اُسی مصرف میں صرف ہوگا۔اور حساب ان کا درج کیفیت سالانہ ہوتا رہے گا۔

(۵) ایک کتاب اسم اور چندہ امدادی کی اور سات کتابیں جدا جدا ساتوں قسم کے چندہ آمد و خرچ مفصل کی۔اور ایک روزنامچہ روزانہ آمد و خرچ جملہ قسم کی مدات کا اور ایک گوشوارہ آمد و خرچ ماہانہ کا دفتر مدرسہ میں رہتا ہے جو چاہے اُن کو ملاحظہ فرمائے۔اور علاوہ کتب مذکورہ کے رسید بھی ہر ہر مد کی جدا تیار ہوتی ہے۔اور اُس کا ایک پرت فوراً چندہ دہندہ کے پاس بھیج دیا جاتا ہے علاوہ ان کے ہر قسم کے چندہ کی تقسیم کی بابت رجسٹر و قبض الوصول دفتر میں رہتے ہیں۔

(۶) چندہ دینے والوں کو ایک رسید حسب نمونہ ذیل دی جائے گی۔اور ایک پرت اُس کا یعنی مثنیٰ رجسٹر میں رہیگا۔

نمبر شمار	نام چندہ دہندہ	تعداد وصول زر چندہ	قسم چندہ	کس کی معرفت	کس سال کی بابت	تاریخ وصول	العبد مہتمم	کیفیت و مہر مہدرسہ

(۷) جو صاحب شرکاء چندہ وقت مقررہ پر چندہ عطا نہ کریں گے خط طلبی اُن کی خدمت میں روانہ ہوگا۔ درصورت انکار اُن کا نام رجسٹر سے علیحدہ کیا جائے گا۔

(۸) ایک قسم کا چندہ دوسری قسم میں شامل نہ کیا جائے گا۔

(۹) اگرچہ چندہ میں بعد خرچ کے جس قدر زیادہ توفیر اور بچت رہے بہر اور موجب اطمینان ہے۔مگر آمدنی چندہ امدادی میں اس قدر زر نقد ہمیشہ مد توفیر میں جمع رہنا چاہیے جو کم سے کم چھ ماہ کے مصارف کو کافی ہو۔بلکہ کوشش ہو کہ ایک سال کے مصارف کی گنجائش رہے۔

(۱۰) جو صاحب کسی قسم کے چندہ میں شریک ہوں اور چندہ عنایت فرمائیں تو یہ تفصیل بھی تحریر فرمادیں کہ یہ چندہ دوامی ہے یا یکمشت یا انعام یا خوراک وغیرہ۔خصوصاً جو صاحب زر زکوٰۃ و کفارہ وغیرہ عنایت فرمائیں تو مہتمم کو ضرور مطلع فرمائیں۔تاکہ اُس کو ایسے ہی مصرف میں صرف کرے کہ زکوٰۃ وغیرہ بھی ادا ہو جائے۔اور مدرسہ کو بھی امداد ملے۔فقط

نقشہ نمبر ا تعداد و اسمائے مدرسان و ملازمان و شرح تنخواہ ماہوار و کل خرچ تنخواہ سالانہ

متعلقہ مدرسہ عربیہ دیوبند بابت سنہ ۱۳۱۷ھ

نمبر شمار	نام عہدہ دار	نام عہدہ	شرح تنخواہ ماہوار	کل تنخواہ سالانہ	کیفیت
۱	مولوی محمود حسن صاحب	مدرس اوّل عربی	-/50 روپے	-/600 روپے	
۲	مولوی عبد العلی صاحب	مدرس دوم عربی	-/45 روپے	-/360 روپے	مولوی صاحب آٹھ ماہ اِس سال مدرسہ ہذا میں رہے بعد کو ترکِ ملازمت کر کے دہلی تشریف لے گئے۔
۳	مولوی حکیم محمد حسن صاحب	مدرس عربی ۔۔۔	-/26 روپے	-/312 روپے	
۴	مولوی محمد منفعت علی صاحب	مدرس عربی	-/26 روپے	-/312 روپے	
۵	مولوی عزیز الرحمٰن صاحب	مدرس و نائب مہتمم و مفتی			
۶	مولوی غلام رسول صاحب	مدرس عربی	-/29 روپے	-/288 روپے	
۷	مولوی حبیب الرحمٰن صاحب	معین	بلا تنخواہ		
۸	مولوی گل محمد صاحب	مدرس عربی	-/10 روپے	-/120 روپے	بوجہ عدم استحقاق رخصت ۴ ر یوم کی تنخواہ وضع کی۔
۹	مولوی محمد یٰسین صاحب	مدرس اوّل فارسی	-/15 روپے	-/180 روپے	
۱۰	منشی منظور احمد صاحب	نائب مدرس فارسی	-/8 روپے	-/96 روپے	
۱۱	حافظ نامدار خان صاحب	مدرس اوّل قرآن شریف	-/7 روپے	-/84 روپے	
۱۲	حافظ محمد عظیم صاحب	نائب مدرس قرآن شریف	-/5 روپے	-/60 روپے	ان کو تنخواہ مد چرم قربانی سے دی جاتی ہے۔
۱۳	مولوی حافظ احمد صاحب	مہتمم مدرسہ	-/30 روپے	-/360 روپے	
۱۴	منشی محمد امداد الحق صاحب	محرر اوّل	-/10 روپے	-/120 روپے	
۱۵	منشی محمد یٰسین صاحب	محرر دوم	-/7 روپے	-/84 روپے	
۱۶	حافظ محمد خان صاحب	صحاف و محافظ بشب	-/7 روپے	-/84 روپے	انکو مد تعلیم اور مد چرم قربانی سے تنخواہ دی جاتی ہے۔
۱۷	حاجی محمد اسحاق صاحب	محافظ مدرسہ	-/5 روپے	-/60 روپے	

نقشہ نمبر ۲ مظہر تعداد طلبہ مدرسہ اسلامیہ عربیہ دیوبند موجودہ آخر ذی الحجہ ۱۳۱۷ھ

نام درجہ تعلیم	تعداد طلبہ		
	اہلِ دیوبند	بیرون جات	میزان
خاص عربی	۲۰	۱۲۰	۱۴۰
خاص فارسی وریاضی	۴۹	۷	۵۶
خاص قرآن شریف	۴۴	۴	۴۸
میزان	۱۱۳	۱۳۱	۲۴۴

واضح رہے ناظرین باتمکین ہوکہ مدرسہ ہٰذا میں آخر سال حال پر ۲۴۴ طلبہ ہر قسم کے موجود تھے جن میں سے ۱۴۰ بیرون جات کے اور ۱۱۳ خاص دیوبند کے رہنے والے ہیں جن میں سے ۳۹ کو اہلِ شہر کھانا دیتے ہیں اور ۴۸ کو نقد برائے خوراک مدرسہ سے دیا جاتا ہے اور بعض طلبہ اپنے پاس سے کھانا کھاتے ہیں۔ یہ امر بھی قابل گزارش ہے کہ جملہ طلبہ خوراک پانے والوں کو خواہ اُن کو اہلِ شہر کھانا دیتے ہیں یا مدرسہ سے نقد برائے خوراک دیا جاتا ہے سال بھر میں چار جوڑے پارچہ تیار شدہ معہ کلاہ و کمر بند اور ایک چادر اور دو جوڑے جفت پاپوش اور موسم سرما میں انگہ روئی دار اور لحاف مدرسہ سے دیا جاتا ہے اور ہر ماہ میں دُھلائی پارچہ کے واسطے نقد اور مطالعہ کتب کے لیے روغن تلخ و بکس دیا سلائی ملتا ہے۔ اور بیمار طالبِ علم کے علاج کا اہتمام منجانب مدرسہ ہوتا ہے۔ علاوہ بریں طلبہ کے اکثر حوائج کا انتظام و اہتمام کیا جاتا ہے۔ مثلاً جاڑوں میں حمام گرم کرانا اور طلبہ کو گرم پانی پہنچانا۔ اور لوٹہ ہائے گلی اور فرش بوریہ اور کلوخ استنجا کا ایک ذخیرہ رہنا اور دیگر ضروریات و حوائج کا بھی خیال اور اہتمام رہتا ہے۔ یہ تمام مصارف جو تھوڑے تھوڑے رقم ہو کر ایک مقدار کثیر ہو جاتی ہے۔ آمدنی زکوٰۃ و دیگر صدقات سے پورے ہوتے ہیں یہاں سے خیال کیا جاسکتا ہے کہ مدزکوٰۃ متفرقات میں کس قدر زرکثیر کی حاجت ہے اور یہ روپیہ کیسے مواقع خیر میں صرف ہوتا ہے۔ چونکہ سال حال میں بمد متفرقات بہت کم آمدنی ہوئی ہے یعنی بہ نسبت سال گزشتہ کے قریب نصف کے آمدنی ہوئی، اس لیے دوسری مد سے قرض لے کر خرچ پورا کیا گیا اُمید کہ صاحبان ہمم واہلِ خیر اس طرف زیادہ توجہ مبذول فرمائیں تا کہ باطمینان تمام طلبا سے مساکین و مسافرین کے حوائج کا بندوبست کافی ہوتا رہے۔ اور حضرات معاونین کے لیے موجب فوز کبیر و اجر عظیم ہو۔ اللہ تعالیٰ اُن کے اموال و اولاد میں برکت عطا فرمادے۔ آمین وَاللّٰہُ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ

فہرست نمبر ۳/۳ اسمائے گرامی عطا کنندگان طعام طلبہ مساکین و مسافرین بابت ۱۳۱۷ھ ہجری

نمبر شمار	اسمائے گرامی عطا کنندگان	تعداد طلبہ
۱	مولوی ذوالفقار علی صاحب (ممبر مدرسہ ہٰذا)	۱
۲	مولوی فضل الرحمٰن عثمانی صاحب (ممبر مدرسہ ہٰذا)	۱
۳	حاجی ظہور الدین صاحب (ممبر مدرسہ ہٰذا)	۱
۴	مولوی حافظ محمد احمد صاحب (مہتمم مدرسہ ہٰذا)	۱
۵	دیوان داد الٰہی صاحب	۱
۶	منشی فضل عظیم صاحب	۱
۷	از جانب منشی صفت احمد صاحب (مرحوم)	۱
۸	قاضی رونق علی صاحب	۱
۹	منشی محمد ناظم علی صاحب	۱
۱۰	از جانب حکیم مشتاق احمد صاحب (مرحوم)	۱
۱۱	منشی سراج الحق صاحب (کوتوال امبالہ)	۱
۱۲	منشی ظہور احمد صاحب (مختار کار)	۱
۱۳	شیخ عبد الرزاق صاحب	۱
۱۴	شیخ ولایت حسین صاحب	۱
۱۵	از جانب منشی محمد قاسم صاحب (مرحوم)	۱
۱۶	منشی فیض الحسن صاحب (وکیل)	۱
۱۷	منشی غلام باری صاحب	۱
۱۸	منشی اشفاق احمد صاحب	۱

۱۹	از جانب منشی محمد اسماعیل صاحب (مرحوم)	۱
۲۰	مولوی محمد قاسم صاحب (سابق کمشنر بندوبست)	۱
۲۱	حافظ مہدی حسن صاحب	۱
۲۲	شیخ محمد حسین صاحب خانقاہی	۱
۲۳	گھسیٹا خشت پز	۱
۲۴	منشی حبیب الرحمٰن صاحب و محمد شفیع صاحب	۱
۲۵	شیخ انوار کریم صاحب	۱
۲۶	شیخ اشفاق کریم صاحب	۱
۲۷	حاجی عنایت کریم صاحب	۱
۲۸	منشی محمد قاسم صاحب کوٹلوی	۱
۲۹	منشی رکن الدین صاحب (وکیل)	۱
۳۰	منشی محمد خلیل صاحب	۱
۳۱	منشی سید امجد علی شاہ صاحب (پیش کار تحصیل دیوبند)	۱
۳۲	حاجی عبد الرحمٰن صاحب	۱
۳۳	منشی محمد فایق صاحب	۱
۳۴	منشی منظور احمد صاحب	۱
۳۵	منشی ارشاد حسین صاحب	۱
۳۶	عبد المجید صاحب	۱
۳۷	نتھن بھٹیارہ	۱
۳۸	مسجد حاجی مدد علی صاحب	۱
۳۹	مسجد صیقل گراں	۱

یہ اُن لوگوں کی فہرست ہے جو دار العلوم کے طلبہ و مسافرین کو کھانا دیا کرتے تھے۔

گوشوارہ نمبر ۴ آمد و صرف جملہ رقومات متعلقہ مدرسہ اسلامی عربی دیوبند

بابت ۱۳۱۷ھ

نمبر شمار	قسم مدات	بقایا ۱۳۱۶ھ	آمد سال حال	میزانِ کل	صرف	باقی	کیفیت
۱	چندہ دوامی وعطاء یکمشت	۷۴۷۹ روپیے ۲ آنے اور ۹ نئے پیسے	۴۲۱۰ روپے ۱۲-۶	۱۱۶۸۹ روپے ۱۵-۳	۴۱۵۳ روپے ۱۰-۶	۷۵۳۶ روپے ۴-۹	
۲	چندہ تعمیر مکان مدرسہ	۱۸۳۲ روپے ۷-۹	۲۷۰۸ روپے ۱۱-۶	۴۵۴۱ روپے ۳-۳	۴۵۴۱ روپے ۳-۳	۰ ۰ ۰	
۳	چندہ زکوٰۃ	۲۸۵ روپے ۱۳-۹	۱۳۴۲ روپے ۴-۰	۱۶۲۸ روپے ۱-۹	۱۶۲۸ روپے ۱-۹	۰ ۰ ۰	
۴	چندہ متفرقات	۱ روپے ۷-۳	۵۰۳ روپے ۷-۰	۵۰۷ روپے ۱۴-۳	۵۰۷ روپے ۱۴-۳	۰ ۰ ۰	
۵	چندہ قربانی	۶۶۶ روپے ۳-۶	۵۵۵ روپے ۷-۰	۱۲۲۱ روپے ۱۰-۶	۷۰۲ روپے ۱۲-۶	۵۱۸ روپے ۱۴-۰	
۶	چندہ کتب وقفی	۰	۰	۰	۰	۰	
۷	چندہ انعام طلبہ	۱۴۲ روپے ۱۳-۹	۱۴۲ روپے ۱۳-۹	۱۴۲ روپے ۱۳-۹	۱۴۲ روپے ۱۳-۹	۰ ۰ ۰	
۸	میزانِ کل	۱۰۲۶۵ روپے -۳	۹۴۶۶ روپے ۷-۹	۱۹۷۳۱ روپے ۱۰-۹	۱۱۶۷۶ روپے ۸-۰	۸۰۵۵ روپے ۲-۹	

داخل تجارت مدراس ۲۰۰۰ روپے موجود خزانہ مدرسہ ۶۰۵۵ روپے ۹-۲ پیسے

ذکر چندہ امدادی سال حال

ملاحظہ گوشوارہ ۵ وفہرست مفصل ۶ سے ظاہر ہے کہ منجملہ رقم واجب الوصول ۵۱۲۲ روپے ۹-۱ پیسے کے ۳-۶-۳۶۳۶ معہ رقم پیشگی ۱۳۱۸ھ مبلغ ۸-۹۰ وصول ہوئے اور ۹-۶-۱۶۷۴ باقی رہے۔ اگر حضرات معاونان باہمت پوری توجہ اس طرف فرمایا کریں اور چندہ مقررہ سال بسال عطا فرماتے رہیں تو منتظمان مدرسہ کو تکمیل اُمور ضروریہ میں دِقت نہ پیش آئے اور ترقی نمایاں مدرسہ میں حاصل ہو۔ زیادہ تر افسوس یہ ہے کہ شرکاء چندہ میں سے امسال بھی مثل سال سابق بہت سے حضرات کا نام فہرست معاونین سے جُدا کیا گیا۔ حضرات معاونین سے اُمید ترقی چندہ ہے۔ اور جن حضرات کے ذمہ بقایا سنین ماضیہ چلی آتی ہے وہ اُس کو ادا فرما کر مصداق وَسَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ کے ہوں اور عموماً اہلِ اسلام اس منبع علوم دینیہ کی اعانت کو لازم خیال فرمائیں۔ واللہ لایضیع اجر المحسنین۔

گوشوارہ نمبر ۵: آمد وصرف و باقی زر چندہ متعلقہ مدرسہ اسلامی عربی دیوبند

بابت ۱۳۱۷ ہجری

	بقایا موجودہ آخر ۱۳۱۶ھ	
۱	داخل تجارت ویلور ملک مدراس	۲۰۰۰
۲	موجودہ خزانہ مدرسہ	۹-۲-۵۴۷۹
۳	میزانِ کل	۹-۲-۷۴۷۹
	آمد سال حال یعنی ۱۳۱۷ھ خاص چندہ دوامی	
۴	وصول بابت سنین ماضیہ	۳-۷-۳۵۱
۵	وصول بابت سال حال	۹-۳-۳۱۹۶
۶	وصول پیشگی بابت ۱۳۱۸ھ	۰-۸-۹۰
۷	میزانِ کل	۰-۳-۳۶۳۸
۸	چندہ عطائے یک مشت	۶-۹-۵۴۲
۹	میزان کل دوامی و یک مشت	۶-۱۲-۴۲۱۰

۱۰	میزان کل وصول زر چندہ سال حال و بقایا سنین ماضیہ یعنی مجموعہ خانہ ۳و۹	۱۱۶۸۹-۱۵-۳
	صــــــــــرف	
۱۱	تنخواہ ملازمان مدرسہ ہٰذا	۳۱۴۳-۱۰-۹
۱۲	طبع روئداد سالانہ	۱۹۴-۱-۹
۱۳	انعام طلبہ	۱۴۲-۱۳-۹
۱۴	منہائی رقم پیشگی ۱۳۱۸ھ	۹۰-۸-۰
۱۵	سفر خرچ مہتمم صاحب وغیرہ	۲۳-۱۴-۰
۱۶	خرید فرش، دری برائے نو درہ	۱۰۰-۵-۰
۱۷	محصول بلٹی و فیس منی آڈر و صرف لفافہ و کارڈ	۱۶۰-۳-۶
۱۸	خرید کرہ و الماریاں	۱۰۷-۱-۶
۱۹	سائر خرچ	۷۰-۱۲-۳
۲۰	میزان کل صرف	۴۱۵۳-۱۰-۶
۲۱	باقی آخر سال یعنی حاصل تفریق خانہ ۱۰و۲۰	۷۵۳۶-۴-۹
	کــیــفــیــت	
۲۲	داخل تجارت مدارس	۲۰۰۰
۲۳	موجودہ خزانہ مدرسہ	۷۵۳۶-۴-۹

چندہ امدادی کے بعد روداد کے صفحہ نمبر ۱۷ تا ۵۵ "فہرست نمبر ۶ وصول و باقی زر چندہ، دوامی بابت ۱۳۱۷ ہجری مدرسہ اسلامی عربی دیوبند" کا عنوان دے کر ۵۸۲ لوگوں کے نام مع عطا شدہ رقم تحریر کیے گئے ہیں۔ جس سے دارالعلوم میں چندہ کی آمد کا مفصل تذکرہ سامنے آجاتا ہے۔ اس کے بعد صفحہ ۵۶ تا ۵۸ ایسے چالیس لوگوں کے نام مع مقدار چندہ دیے گئے ہیں جو انتقال یا کسی اور وجہ سے سال حال میں چندہ دینے سے علیحدہ ہو گئے۔

پھر صفحہ نمبر ۵۸ پر نقشہ نمبر ۷ مفصل آمدنی زر عطاء یکمشت بابت ۱۳۱۷ھ کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ یہ تفصیل ۱۳۹ لوگوں کے نام کے ساتھ ۷ صفحات پر مشتمل ہے۔

اس کے بعد زکوٰۃ و متفرقات برائے صرف طلبا و مسافرین کی آمدنی کا ذکر کرتے ہوئے درج ذیل عنوان دے کر تحریر ہے:

ذکر آمدنی زرزکوٰۃ ومتفرقات برائے صرف طلبہ ومساکین ومسافرین

مدرسہ عربیہ دیوبند بابت ۱۳۱۷ ہجری

الحمدللہ کہ امسال بھی اکثر حضرات اہلِ خیر و کرم نے زرزکوٰۃ ومتفرقات وخوراک سے امداد طلبہ فرمائی جزاء ہم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء۔ ہمارے معاونین ذوی الاقتدار پر مخفی تر ہے کہ طلبا مساکین ومسافرین کے تمام مصارف خوراک و پوشاک وجفت پاپوش وروغن تلخ وغیرہ انہیں مدات سے متعلق ہیں جو حضرات زکوٰۃ و دیگر صدقات عطاء فرماتے ہیں وہ نہایت احتیاط کے ساتھ اپنے مصرف میں صرف ہوتے ہیں۔ اگر تمام اہلِ اسلام خصوصاً صاحبان وسعت و ہمت اس طرف پوری توجہ فرمائیں تو اُن حضرات کو ادائے زکوٰۃ سے سبکدوشی حاصل ہو۔ ادھر ذخیرہ طلبہ مساکین کے لیے جمع ہو جائے جس سے باطمینان خاطر وہ غربا اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں مصروف رہیں اور جن طلبا کو بوجہ عدم گنجائش جواب دیا جاتا ہے اُن کو داخل کیا جائے اور سال حال میں بہ نسبت سال گزشتہ کے بہت کم آمدنی ہوئی، مجبوراً دوسری مد سے قرض لے کر صرف کیا۔ اس لیے گزارش ہے کہ صاحبانِ اہلِ ہم اِس طرف کامل توجہ فرمادیں۔ اور یہ امر ظاہر ہے کہ اس زمانۂ شیوع جہل میں جس قدر علمِ دین کی اعانت اور طلبا مسافرین کی خبر گیری و امداد میں اجرِ دارین حاصل ہے حاجتِ بیان نہیں رکھتا۔ طالبانِ علمِ دین مہمانانِ رسولِ کریم صلوات اللہ وسلامہ علیہ ہیں، اُن کی مدارات اور خدمت گزاری کی برابر کوئی سعادت نہیں اہلِ دُول کو فرض زکوٰۃ سے سبکدوش ہونا ضرور ہے، پس کیسی خوش قسمتی اُن حضرات کی ہے جو اُس کو مہمانانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی طالبانِ علمِ دین کی ضیافت میں صرف فرمائیں اور اجر مضاعف کے مستحق ہوں۔ ہم خدام مدرسہ ہٰذا دل سے شکریہ اُن حضرات معاونین کا ادا کرتے ہیں جو دیگر مصارف سے اس مصرف خیر کو مقدم سمجھ کر زکوٰۃ وصدقات سے امداد وطلبہ مساکین فرماتے ہیں۔ حق تعالیٰ اُن کی اولاد و اموال میں برکت عطا فرمائے، آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

....

بعد ازاں روداد کے صفحہ نمبر ۶۶ سے جو تفصیلات دی گئی ہیں ہم یہاں ان کے فقط عنوانات ہی دے رہے ہیں؛ کیونکہ درج ذیل عنوانات کے تحت مفصل فہرست ان لوگوں کی ہے جو مدرسہ کا تعاون فرماتے تھے۔ اگر ہم سب کے ناموں کی یہ فہرست یہاں نقل کر دیں تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا؛ بلکہ بلاوجہ صفحات کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا۔

''گوشوارہ نمبر ۸ آمد و صرف مد زرزکوٰۃ و متفرقات برائے صرف طلبا مساکین و مسافرین مدرسہ عربیہ دیوبند بابت ۱۳۱۷ھ''

''نقشہ نمبر ۹ مفصل آمدی زر زکوٰۃ بابت ۱۳۱۷ ہجری''

''نقشہ نمبر ۱۰ آمدنی متفرقات بابت ۱۳۱۷ ہجری''

''فہرست نمبر ۱۱ وصول اشیاء متفرقہ بابت ۱۳۱۷ ہجری''

صفحہ ۷۳ پہ قربانی کے چندے کی تفصیل کے طور پر تحریر ہے:

ذکر چندہ پوست قربانی وعقیقہ

واضح ہو کہ اس مد کی آمدنی کا بہت زیادہ حصہ خرید کتب دینیہ حدیث و تفسیر و فقہ وغیرہ میں صرف ہوتا ہے، پس جو حضرات باہمت ارسال قیمت چرم قربانی سے امداد مدرسہ فرماتے ہیں اور ذخیرۂ کتبِ دینیہ کا بڑھانے میں اُن کے لیے ان شاء اللہ تعالیٰ یہ صدقہ جاریہ ہے تاابد اس کا اجر اُن کو ملے گا۔ واللّٰہ یضٰعف لمن یّشآءُ واللّٰہ واسع علیم

اس موقع پر خاص شکریہ جناب مولوی محمد واصل صاحب مددگار صفائی بلدہ حیدرآباد دکن و مولوی حکیم حافظ عبدالرحمٰن صاحب محدث و مولوی عبداللطیف خان صاحب درسالدار میجر منور خان صاحب و مولوی عباداللہ صاحب مدرس مدرسہ احمدیہ نواب پورہ اورنگ آباد وغیرہم کثر اللہ تعالیٰ امثالھم و احج حاجاتھم و آمالھم کا ادا کیا جاتا ہے کہ ان حضرات نے سعی موفور سے اس مد کی رقم مجتمع فرما کر امداد مدرسہ ہٰذا فرمائی اور... علی الخیر کفاعلہ اجر کامل کے مستحق ہوئے، حق تعالیٰ ان کو اور جمیع معاونین و شرکاء کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کے مساعی جمیلہ کو مشکور فرما کر مستحق ثواب بحساب فرمائے۔ آمین

''گوشوارہ نمبر ۱۲: آمد و صرف چرم قربانی وعقیقہ مدرسہ عربیہ اسلامیہ دیوبند بابت ۱۳۱۷ھ''

''نقشہ نمبر ۱۳: مفصل آمدنی زر چندہ چرم قربانی وعقیقہ وغیرہ بابت ۱۳۱۷ھ'' کا عنوان دے کر تقریباً دس صفحات میں ۳۲۸ معاونین کے نام درج ہیں۔

ذکر چندہ تعمیر مکان مدرسہ ہٰذا

للہ الحمد ہر آن چیز کہ خاطر می خواست ❖ آمد آخرز پس پردۂ تقدیر پدید

اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ جس ضرورت کو خدام مدرسہ بار بار معاونین ذی ہمت کی خدمت میں گزارش کرتے

تھے یعنی طلبہ مدرسہ ہٰذا کی سکونت و راحت کے لیے ایک ایسے مکان کا تیار ہونا جس میں ایک جماعت معتدبہ طلبہ کی بآسائش رہے گی۔ اُس کو حق تعالیٰ نے پورا فرمایا کہ بہت سے حجرے طلبہ کے لیے ایک جدے احاطہ میں مکان مدرسہ ہٰذا کے بالکل متصل تیار ہو گئے جو دارالطلبہ کے نام سے موسوم ہیں اور جو کچھ متعلق استر کاری و فرش وغیرہ کے باقی رہ گیا ہے وہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ ہمت اربابِ ہمم سے مکمل ہو جائے گا۔اس کے سوا بعض ضروری تعمیرات مثل مکان دفتر بالا سے دروازہ کلاں مکان مدرسہ ہٰذا چندہ مکانات بیرونِ دروازہ کلاں برائے راحت مہمانان تیار ہو گئے اور اس کے ذیل میں اور یہی بعض ضروریات تعمیر پوری ہوئی۔الحمدللہ کہ حضرات اہلِ ہمم کی اعانت و ہمت سے۔بہت سی ضروریات تعمیر سے اہل مدرسہ کو سبکدوشی ہوئی؛ مگر اس تعمیر میں اب تک تخمیناً ایک ہزار روپیہ مدتعمیر کے ذمہ قرض ہو گیا اور ایک نہایت ضروری تعمیر پاخانوں کی بالکل باقی ہے جس کی ضرورت اشد ہے اور اس کی تعمیر و تکمیل کی طلبہٴ مدرسہ کو سخت حاجت ہے۔اور یہ حاجت ایسی نہیں ہے کہ کسی صاحب پر مخفی ہو،اس کے لیے تخمیناً پانچ سو روپیہ کی ضرورت ہے،پس کل ''......'' کی ضرورت اس کام کے لیے اب باقی ہے کہ اس مقدار میں پچھلا قرض بھی ان شاء اللہ تعالیٰ ادا ہو جائے گا اور باقی تعمیر بھی پوری ہو جائے گی یہ رقم بمقابلہ رقم صرف شدہ کے ایک بہت قلیل مقدار ہے،کہ جس کا تکفل ہمارے معاونین باہمت میں سے ایک دو صاحب بھی فرما سکتے ہیں۔آخر میں اُن تمام حضرات باخیر کے لیے دعا کی جاتی ہے کہ جنھوں نے رقوم کثیرہ عطا فرما کر طلبہ و مسافرین کے لیے سامانِ راحت و مکان سکونت مہیا فرمایا۔اور دیگر ضروریات کی تکمیل اُن کی ہمت و سعی سے ہوئی اور ان شاء اللہ تعالیٰ ہوگی۔اللہ تعالیٰ اُن کے اموال و اولاد میں خیر و برکت عطا فرمائے اور اس اعانت کو ذخیرۂ آخرت فرمائے۔آمین وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین۔

''گوشوارہ نمبر ۱۴ مجمل آمد و صرف تعمیر مکان مدرسہ بابت ۱۳۱۷ ہجری''

''فہرست نمبر ۱۶ کتب وقفی جو سال حال میں داخل کتبخانہ مدرسہ ہوئیں یعنی بابت ۱۳۱۷ھ''

''خرید کتب از چرم قربانی مدرسہٴ اسلامیہ عربیہ دیوبند بابت ۱۳۱۷ ہجری''

ذکر چندہ انعام طلبہ مدرسہ عربیہ اسلامیہ دیوبند بابت ۱۳۱۷ھ

مدانعام طلبہ میں امسال بالکل آمدنی نہیں ہوئی؛ چونکہ انعام کا تقسیم ہونا ہر طرح مفید مدرسہ و طلبہ کے لیے موجبِ ترقی شوق ہے؛ اس لیے بضرورت ۱۳ امد تعلیم سے قرض لے کر انعام طلبہ میں صرف کیے گئے۔اگرچہ حیثیت و مقدار طلبہ کے اعتبار سے یہ رقم بھی کم ہے؛ مگر بحکم مالا یدرک کلہ لایترک کلہ اسی قدر پر اکتفا کیا گیا۔اُمید کہ ہمارے معاونین باہمت اس طرف بھی توجہ مبذول فرمائیں اور مستحق اجر و انعام اُخروی ہوں۔

وَاللّٰهُ لَا يُضِيعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمدللّٰه الکریم المنعام. والصلوٰة والسلام علٰی خیر خلقه وصفوة عبادہ سیّدنا و مولانا محمد سیّدالانام وعلٰی اٰله وأصحابه واعوانه البررة الکرام. أمّابعد!

بندہ مہتمم و منتظمان مدرسہ اوّل شکریہ حضار جلسہ ادا کرتے ہیں کہ اُنہوں نے قدم رنجہ فرما کر مدرسہ کو رونق اور ہم نیازمندوں کو عزت بخشی اللہ تعالیٰ اُن کو اجرِ جزیل عطا فرمائے۔ اور ثانیاً عرض کرتے ہیں کہ ہزار شکر بجناب واہب العطایا کہ یہ پینتیسواں سال اس شجرۂ مبارکہ علوم دینیہ یعنی مدرسہ اسلامیہ دیوبند کا بخیر وخوبی انجام کو پہونچا، اس کی سرسبزی و شادابی خیرخواہان اسلام کے لیے عموماً اور معاونانِ علومِ دین کے لیے خصوصاً مبارک ہو۔ حسبِ معمول قدیم امسال بھی امتحان طلبہ مدرسہ ہٰذا ماہ شعبان میں لیا گیا۔ قواعد امتحان برابر ملحوظ رہے اور وقت جوابات تحریری طلبہ کی پوری نگرانی کی گئی، تاکہ کوئی طالبِ علم کتاب سے یا دوسرے شخص سے مدد نہ لے۔ امتحانِ تحریری وتقریری جناب مولانا مولوی محمود حسن صاحب مدرس اوّل اور جناب مولوی حافظ عبدالعلی صاحب مدرس دوم و مولوی حکیم محمد حسن صاحب و مولوی غلام رسول صاحب و مولوی عزیز الرحمٰن صاحب مدرسان مدرسہ ہٰذا نے اور امتحان ریاضی و فارسی جناب مولوی فضل الرحمٰن عثمانی صاحب ممبر مدرسہ ہٰذا و مولوی محمد منفعت علی صاحب مدرس مدرسہ ہٰذا نے باحتیاط تمام لیا اور حسبِ لیاقت نمبر تجویز کیے۔ امتحان کے بعد جوابات تحریری دیکھے گئے اور بجائے نام طلبہ حروف ابجد بطور ہوز لکھے گئے تاکہ افشائے راز امتحان نہ ہو۔ احقاقِ حق میں پوری سعی ہوئی، نمبر کامل جواب کے پچاس اور کم کے واسطے کم اور زیادہ کے واسطے زیادہ یعنی اکیاون و باون تک بھی دیے گئے؛ لیکن انعام چالیس نمبر سے کم میں نہیں دیا گیا۔ الحمدللہ کہ امسال بھی مقدار طلبہ کامیاب شدہ اور مستحق انعام کی اچھی رہی۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ منجملہ ایک سو اکیاسی طلبہ عربی و فارسی کے ایک سو اٹھتر حاضر و شریک امتحان ہوئے۔ اور منجملہ ایک سو اٹھتر شرکاء امتحان کے پندرہ ناکامیاب اور ایک سو تریسٹھ کامیاب ہوئے یعنی فیصدی تقریباً اکیانوے کو کامیابی ہوئی جو اعلیٰ درجہ کامیابی کا ہے۔ تفصیل اِس اجمال کی یہ ہے کہ درجہ عربی میں منجملہ ایک سو چھپن طلبہ کے تیرہ ناکام اور ایک سو تینتالیس کامیاب ہوئے۔ منجملہ کامیاب کے چوراسی طلبہ نے تحریری امتحان من حیث المجموع چارسو چھہتر کتب میں اور بہتر طلبہ نے تقریری امتحان دوسو تریسٹھ کتب میں دے کر اکثر کتب میں عمدہ نمبر حاصل کیے۔ اور پینتیس طلبہ امتحان تحریری وتحریری میں مشترک رہے۔ اور درجہ فارسی و ریاضی میں منجملہ چونسٹھ طلبہ کے دو غیر حاضر اور باسٹھ حاضر وشریک امتحان ہوئے۔ شرکاء امتحان میں سے دو ناکام اور ساٹھ کامیاب ہوئے۔ طلبہ کامیاب نے دوسو چھہتر کتب میں امتحان دے کر عمدہ نمبر حاصل کیے۔ اور درجہ قرآن شریف میں منجملہ ۶۲ طلبہ کے ۱۸ طلبہ حفظ کرنے والے اور ۴۴ ناظرہ خواں ہیں۔ حفاظ میں سے ۱۳ کامیاب اور ۵ ناکام اور منجملہ ناظرہ خواں کے ۱۷ ناکام اور ۲۷ کامیاب ہوئے۔ **والحمد للّٰه علٰی ذٰلك**

واضح ہوکہ امسال بھی مثل سال گزشتہ انعام طلبہ مستحقان انعام بفور ختم امتحان تقسیم کردیا گیا، کہ درصورت تاخیر اکثر طلبہ اپنے وطن کو چلے جاتے تھے اور بعض اُن میں سے کسی وجہ سے سال آئندہ میں نہ آسکتے تھے، اس وجہ سے کتب انعام سے محروم رہتے تھے؛ لیکن درجہ قرآن شریف میں چونکہ اکثر باشندگان دیوبند ہی ہوتے ہیں اور نیز قرآن شریف کا دَور رمضان شریف میں کرتے ہیں اور تراویح ونوافل میں قرآن شریف سناتے ہیں، اس وجہ سے اُن کے امتحان کو حسبِ سابق ماہ شوال پر مؤخر کیا گیا۔

ظاہر ہے کہ یہ کامیابی طلبہ کی محنت ومدرسین کی توجہ وشفقت اور معاونان کی علو ہمت کا ثمرہ ہے۔ اب ہم اس مختصر کیفیت کو حضار جلسہ اور معاونان وخیر خواہانِ مدرسہ کی مبارک باد پر ختم کر کے عرض کرتے ہیں۔ الحمدللہ تعالیٰ آپ حضرات کی سعی وکوشش مشکور ہوئی۔ طلبہ مسافرین ومساکین کی تعلیم وتربیت ومدارات وخدمت ودلداری وہمدردی میں جو کچھ آپ صاحبان نے اعانت فرمائی وہ ٹھکانے لگی۔ خداوند کریم آپ صاحبان کو اس کا اجر عظیم بروزِ یوم الحسن عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

''فہرست نمبر ۱۷۔امتحان سالانہ تحریری طلبہ عربی خوانان معہ نمبر حاصل کردہ وکتاب انعامی بابت ۱۳۱۷ھ''

''فہرست نمبر ۱۹۔امتحان سالانہ طلبہ حفاظ قرآن شریف مع نمبر حاصل کردہ بابت ۱۳۱۷ھ''

''فہرست نمبر ۲۰۔امتحان طلبہ قرآن شریف ناظرہ خواں بابت ۱۳۱۷ ہجری''

''فہرست نمبر ۲۱۔امتحان طلبہ حفاظ وناظرہ خواں جن کے نمبر انعامی نہیں ہوئے بابت ۱۳۱۷ ہجری''

تذکرہ اخبارات ورسالہ جات جو مدرسہ میں آتے ہیں معہ شکریہ حضرات مہتممان اخبار ومطابع

جملہ اراکین ومنتظمین مدرسہ ہٰذا حضرات مہتممان اخبار ومالکان مطابع کا شکریہ تہِ دل سے ادا کرتے ہیں اور اُن کے لیے دست بدعا ہیں کہ حق تعالیٰ اُن کے اموال واولاد میں برکت عطا فرمائے۔

ضروری التماس

اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ یہ پینتیسواں سال مدرسہ اسلامیہ عربیہ دیوبند کا بخیر وخوبی انجام کو پہنچا، جملہ حساب آمد وصرف سال حال مفصلاً ملاحظہ روداد ہٰذا سے واضح رائے ناظرین باتمکین ومعاونین اہلِ دین ہوگا۔ اشاعت روداد سالانہ سے جیسا کہ یہ مقصود ہے کہ آمد وصرف مفصل سب حضرات پر روشن ہو، اسی طرح سے یہ بھی عرض ہے کہ جس قسم کی ضرورت ظاہر کی جائے اُس پر ہمارے معاونین پوری توجہ فرمائیں اور قلیل وکثیر کا خیال نہ فرمائیں، ایک پیسہ سے لے کر سو اور ہزار روپیہ تک بقدر وسعت وہمت شریک چندہ ہوں۔ اس زمانہ پُر جہل وشیوع بدعات

میں اشاعتِ علمِ دین وسنن سید المرسلین صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین فرمانا موجب فوز کبیر واجر عظیم ہے ظاہر ہے کہ مَدار اِس کارخانۂ خیر ومجلسِ علم کا حضرات اہلِ خیر کی توجہات واعانت پر ہے اور مبنی تمام ترقیات مدرسہ کا اہلِ کرم کی امداد ہے۔ اُمید کہ ہمارے معاونین ہمیشہ اس مصرف خیر کو مثل دیگر مصارف ضروریہ خود خیال فرما کر ارسال زر چندہ میں تاخیر نہ فرمایا کریں۔

وَاللّٰهُ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

المشتهريه

بندہ رشید احمد عفی عنہ گنگوہی سرپرست مدرسہ، ذوالفقار علی عفی عنہ دیوبندی، فضل الرحمٰن عفی عنہ دیوبندی، محمد ظہور الدین عفی عنہ دیوبندی، احمد حسن عفی عنہ امروہوی، محمد محی الدین عفی عنہ مرادآبادی، محمد عبدالحق عفی عنہ قاضی پوری، مظہر حسین عفی عنہ گنگوہی، محمد اسماعیل عفی عنہ گنگوہی، محمد سعید احمد عفی عنہ انبہٹوی۔

العبد

احمد مہتمم مدرسہ عربیہ دیوبند عفی عنہ ابن حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق سرپرست مدرسہ

.....❖.....

قارئین حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ اہتمام کی روداد آپ نے ملاحظہ کرلی ہے۔ابتدائی مضمون کی زبان اور اسلوب نگارش آپ نے دیکھا اب ہم آپ کو مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے دورِ اہتمام کی روداد دکھاتے ہیں۔ گزشتہ صفحات میں ہم نے ایک جملہ لکھا ہے کہ چندن کی لکڑی جہاں بھی ہوتی ہے وہیں اپنی موجودگی کا خوشبودار احساس کراتی ہے۔یہی امتیاز آپ گزشتہ روداد اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی تحریر کردہ روداد میں محسوس کریں گے۔

مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی بے پناہ انتظامی وعلمی صلاحیتوں سے ایک جہاں آشنا ہے۔ بلاشبہ آئندہ صفحات میں پیش کی جانے والی تحریریں پڑھ کر آپ بھی اس حقیقت سے انکار نہ کرسکیں گے کہ دارالعلوم کو مرکزی حیثیت عطا کرنے میں مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ہی کی محنتِ شاقہ اور تگ و دو شامل ہے۔

پڑھیے اور محسوس کیجیے۔کیا ادیبانہ طرزِ نگارش ہے، کیا الفاظ ہیں، کیا جملوں کا دروبست ہے اور کیا معنیٰ خیز تحریر ہے۔ہم مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے ابتدائی دَور کی روداد پیش کر رہے ہیں، جو کہ سن ۱۳۲۷ھ کی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

روداد سالانہ

مدرسہ اسلامیہ عربیہ دیوبند بابت ۱۳۲۷ ہجری

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الشّٰکِرِیۡنَ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَیۡرِ خَلۡقِهٖ سَیِّدِنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحۡبِهٖ اَجۡمَعِیۡنَ ؕ

اَمَّا بَعۡدُ۔خدا تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ مدرسۂ اسلامیہ دیوبند کی عمر کا پینتالیسواں سال نہایت خیر وخوبی کے ساتھ انجام کو پہنچا۔اور یہ وقت آگیا کہ مدرسہ کی مفصل روداد اور اس کے مسعود و مسرت انگیز حالات حامیانِ مدرسہ و فدائیانِ اسلام کے سامنے پیش کر دیے جائیں۔ ۱۳۲۶ھ کے اختتام پر سن زیر بحث کے متعلق جس قسم کی اُمیدیں ظاہر کی گئیں تھیں بفضلہ تعالیٰ پوری ہوئیں۔فالحمد للہ علی ذلك حمداً کثیراً۔

مسلمانانِ عالم اس وقت جس حیص بیص اور اضطراب میں مبتلا ہیں، اُس کی صورت بالکل اس جہاز کی سی ہے جو تیز وتند ہوا کے جھونکوں میں ایک حالت پر مستقر نہ رہ سکے۔اُن کی ضرورتیں اگر مختلف اور بکثرت ہیں، تو اُن کی سعی اور کوشش کے ذریعے بھی بے حد پریشان اور غیر منضبط ہیں۔مسلمان اس بات کے سوا کہ اُن کے مذہبی، اخلاقی، علمی، عملی، دینی، دنیوی، معاشرتی، تمدنی اور مالی حالات سب خراب اور قابل اصلاح ہیں۔کسی اور امر میں متفق

نہیں ۔ اُنہوں نے آج تک اپنی ضروریات کا اندازہ بھی نہیں کیا۔ اور نہ اُن کی اہمیت اور ترتیب کو سمجھا۔ اصلاح کے طریقوں پر بھی غور نہیں کیا۔ اور نہ اُن کو آج تک یہ معلوم ہوا کہ کوششوں کے منتج ہونے کے وسیلے اور ذریعے کیا ہیں ۔ انہوں نے صرف ایک بات کو سمجھ کر کہ ہم کو اپنی حالت کے سنبھالنے اور اصلاح کی ضرورت ہے بے ترتیب اور بے قاعدہ کوشش شروع کر دی ۔ ان کی مثال بالکل اس جماعت کی ہے جو غافل پڑی سوتی ہو اور ایک دفعہ ہی کان میں آواز آئی ''کہ آگ لگ گئی'' اور وہ اُٹھ کر بے اوسان اِدھر اُدھر بھاگنا شروع کر دے۔ مسلمانوں کی یہ حالت بیداری کی حالت سمجھی جاتی ہے ۔ اور وہ اپنی بیداری سے اس قدر کام ضروری لے رہے ہیں کہ جابجا تدبیر و سعی میں مشغول ہیں؛ مگر ایسی پریشانی کے ساتھ کہ جو نتیجہ سعی کا ظاہر ہونا چاہئے وہ نہیں ہوتا، اگر تھوڑے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے تو توقع سے زیادہ نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔

ہمارا فرض تھا کہ ہم اول اپنی ہر قسم کی ضرورتوں کو متعین کرتے اور متفق ہو کر ہر ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ایک مرکز بناتے اور اس مرکز کی جابجا شاخیں قائم کر کے ہر چیز کو ضابطہ اور قاعدہ میں منسلک کر لیتے ۔ کیا ہمارے سامنے اتفاق و اتحاد کی ایسی نظیریں موجود نہیں ہیں کہ چھوٹی انجمنیں ایک مرکز کی طرف رجوع کر کے اتفاق کے ساتھ کام کر رہی ہیں، اتفاق کی برکات کا کون شخص انکار کر سکتا ہے، علاوہ اس کے کہ اتفاق کی صورت میں خدا تعالیٰ کی طرف سے تائید اور اعانت ہوتی ہے، اس کے ظاہری منافع یہ ہیں کہ جو کام متفرق سعی سے ہزاروں روپیہ خرچ کر کے بھی پورا نہیں ہوتا تھوڑے سے صَرف میں انجام پا سکتا ہے ۔ مسلمانوں کی نہایت ہی اہم ضرورت مذہبی حفاظت اور اشاعتِ اسلام ہے، جو ایسی کھلی ہوئی بات ہے کہ ہر شخص جس کے دل میں ذرا بھی اسلام کی محبت اور اپنے مذہب کی عزت ہے سب ضرورتوں سے مقدم اسی کو سمجھتا ہے کوئی شخص خواہ کتنا ہی آزاد اور اسلامی قواعد و عقائد سے ناواقف اور غیر عامل یا کسی درجہ میں آزاد و معترض بھی ہو؛ مگر اسلام کے دائرہ اور حلقۂ اثر میں داخل ہونے کے ساتھ ہی اس کو یہ ضرورت محسوس ہو جاتی ہے کہ ہم کو اپنے مذہب کی حفاظت کرنا۔ اور اغیار کی دستبرد سے بچانا چاہئے ۔ اگر مذہبی پابندی کی وجہ سے نہیں تو قومی تحفظ کی وجہ سے؛ مگر اس میں بھی باوجود اس قدر شدید حاجت اور اہمیت کے ہماری سعی بالکل بے قاعدہ ہے ۔ کوشش تو جان توڑ ہو رہی ہے؛ مگر بالکل بے سود اور غیر نافع، ہم نے نہ اشاعتِ اسلام کے شرائط و قواعد کو سمجھا ہے اور نہ اُصولِ سعی و تدبیر کو خیال کیا ہے۔ خود مختار حکومتوں یا طوائف الملوک کی طرح جگہ جگہ مستقل انجمنیں قائم ہوتی چلی جاتی ہیں؛ مگر نہ وہ کسی ایک قاعدہ کی پابند ہیں نہ ایک سلسلہ میں منسلک ایسی پریشان اور منتشر کوشش کا نتیجہ جیسا ہونا چاہیے وہی مترتب ہوتا ہے۔ مسلمانوں کا روپیہ تو بے دریغ صرف ہوتا ہے ۔ اور ہر مقامی انجمن سر توڑ کوشش سے روپیہ جمع کرتی ہے ۔ مسلمان بھی حیثیت و وُسعت سے زیادہ چندہ دیتے ہیں؛ لیکن اس تمام جدوجہد کے نتیجہ کو دیکھا جاتا ہے، تو بجائے مسرت

کے افسوس کرنا پڑتا ہے، جس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم نے حفاظت و اشاعت کی ضرورت کو تو محسوس کیا؛ لیکن اس کے شرائط و اُصول کو خیال نہیں کیا ؎

ز دلبری نتواں لاف زد بآسانی ❖ ہزار نکتہ دریں کار ہست تادانی

بجز شکر دہنی مایہ ہاست خوبی را ❖ بخاتمے نتواں زد در سلیمانی

ہماری سعی کی پراگندگی اور کوششوں کی پریشانی کا خاتمہ اسی پر نہیں ہوا کہ ہر مقام پر جُدا جُدا مستقل انجمنیں قائم ہوتی ہیں، جن میں کوئی رابطۂ اتحاد نہیں ہوتا؛ بلکہ ایک مقام پر کئی کئی انجمنیں قائم ہوتی ہیں، جن کی غرض وغایت ایک، مقصد ایک، ہر ایک انجمن کے اراکین جس جوش اور مستعدی کے ساتھ کوشش کرتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے سچے فدائی یہی ہیں؛ مگر بااین ہمہ ایک دوسرے کے مخالف، اگر ہم کو یہ توفیق نہیں کہ اپنی قوت کو مجتمع کرکے اور مل کر کام کریں، تو کم از کم اتنا ہی ہوتا کہ ایک دوسرے کے مخالف نہ ہوتے؛ لیکن بدقسمتی کہیں پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ہماری تمام تر قوت اغیار کی جگہ اپنی ہی جماعت کی طرف متوجہ ہوجاتی ہے اور بجائے تقویت کے ہم کو اپنے ہی ہاتھوں سے ضعف پہنچتا ہے۔ کیسا مبارک وقت ہوتا اگر ہم سب ایک قبلہ مقصود کی طرف گردن جھکائے ہوئے ایک رشتۂ اتحاد میں منسلک ہوکر قدم بڑھاتے اور ہر قدم پر کامیابی کا سہرا سر پر باندھتے جاتے ؎

بر آستانِ جاناں گر سر تواں نہادن ❖ گلبانگ سربلندی بر آسماں تواں زد

ایک ہی شعبہ میں ہمارا یہ حال نہیں ہے۔ مذہبی اور اسلامی مدارس کو دیکھیے، تو ان کی حالت اِس سے زیادہ اَبتر اور افتراق کے تیز اور تُند جھوکوں کی نذر ہے۔ ہر مدرسہ بجائے خود مستقل درسگاہ اور مسلمانوں کی ہمتوں اور کوششوں کا مرجع بنا ہوا ہے۔ نہ کوئی رشتۂ اتحاد، نہ قواعد وضوابط، اِس تفریق اور انتشار کا اثر طلبہ کی تعلیمی و اخلاقی حالت پر جو کچھ پڑتا ہے اس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کو مدارسِ اسلامیہ کی تعلیمی و انتظامی حالت سے کسی قدر تعلق ہے۔

ہمارے اختلاف کا رنگ سب جگہ ایک سا ہے۔ ایسے مقامات تو بہت سے ہیں کہ باوجود ضرورتِ شدید وہاں کوئی اسلامی مذہبی مدرسہ موجود نہیں ہے؛ مگر ایسے مقام بہت کم ہیں جہاں ایک مدرسہ قائم ہونے کے بعد دوسرا مدرسہ قائم نہ ہوا ہو۔ کیا یہ بدقسمتی نہیں ہے کہ ہم ایک مدرسہ کو تو چلا نہیں سکتے؛ لیکن تھوڑی سی باہمی شکر رنجی یا کسی اور بنا پر دوسرا اور تیسرا مدرسہ قائم کردیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہوتا کہ ایک مدرسہ بھی اپنا کام پورا نہیں کرسکتا۔ طلبہ اس قدر آزاد اور مطلق العنان ہوتے ہیں کہ کسی مدرسہ کی قانونی پابندی اُن کو سخت دُشوار ہوتی ہے۔ مسلمان ہیں کہ چندہ دیتے دیتے تنگ آجاتے ہیں۔ اور بے چاروں کی محنت ومشقت کا روپیہ جیسا چاہیے ٹھکانے نہیں لگتا۔ یہ سب اُسی بے قاعدگی اور بے انتظامی کا نتیجہ ہے جس میں مسلمان اس سرے سے اس سرے تک مبتلا ہیں۔ ہمارے اس اختلافِ سعی اور انفرادی کوشش کا ثمرہ ہے کہ طلبہ کی استعدادیں ناقص رہتی ہیں۔ اور

معترضوں کو علماء پر جا و بے جا نکتہ چینی کا موقعہ ملتا ہے، ہم اُصولِ اتفاق واتحاد پر عمل کرتے، سلسلۂ ارتباط واتحاد قائم کرتے، تو ہر مدرسہ بجائے خود کار آمد اور مستحکم نظر آتا۔ ان کی مالی انتظامی حالت درست ہوتی۔ طلبا میں ایک سے ایک اعلیٰ استعداد اور لیاقت کا نظر آتا۔

یہ حالت تو ہماری اِس پر ہے کہ ہم مذہب کی اشاعت اور علومِ اسلامیہ کی تعلیم کو فرض اور نہایت ضروری سمجھتے ہیں؛ لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہم میں سے بہت بڑی جماعت ایسی بھی ہے، جو ادھر متوجہ ہی نہیں۔ ان کی تمام تر کوشش دوسری جانب مبذول ہیں؛ بلکہ ایک درجہ میں اسلامی مدارس کو بے سُود، تحصیلِ علوم کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، تب تو ہماری اختلافی حالت اور بھی ہولناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور ہم کو اس دوادوش کے بعد کسی مفید نتیجہ پر پہونچنا سخت دُشوار بلکہ محال ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں جبکہ مسلمان متوجہ ہی کم ہوں۔ تحصیل چندہ اور امداد کی کیا صورت ہے۔ اور اگر کوشش و جدوجہد کے بعد کچھ وصول بھی ہوا۔ تو باہمی اختلاف سے ایک موقعہ پر خرچ نہیں ہوسکتا۔ خدا تعالیٰ مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ اپنی حالت کا اندازہ کر کے ہر ایک ضرورت کے انصرام کو ایک جماعت کے سپُرد کریں، ہر جماعت اپنے فرض کو ادا کرنے میں اخلاص و نیک نیتی کو ملحوظ رکھے۔ اور ایک جماعت دوسری جماعت کی معین و مددگار رہے۔ ارشادِ خداوند جل جلالہٗ پر عمل رہے تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ یہ مسلمانوں کی موجودہ حالت کا خاکہ ہے، جو مختصر الفاظ میں کھینچا گیا ہے ایسے تلاطمِ خیالات اور تشتتِ حال اور افتراق و پراگندگی کے وقت کسی مذہبی کام کا ایک حال پر مستقر رہنا یا اس میں کسی قسم کی ترقی کا نمودار ہونا بلا شبہ نہایت مسرت کی بات اور اسلام کی کھلی کرامت ہے۔

خدا تعالیٰ کا محض احسان ہے کہ مدرسہ اسلامیہ دیوبند اسی پُر آشوب زمانہ میں اپنی خدمات کو بخوبی انجام دے رہا ہے۔ اور وہ نہ صرف ایک حال پر مستقر؛ بلکہ بزرگانِ اسلام کی توجہ سے ہمیشہ کچھ نہ کچھ ترقی کرتا جاتا ہے۔ باوجود خیالات کے اختلاف اور مقامی چندوں اور ضرورتوں کی بھرمار کے بااخلاص مسلمان مدرسہ اسلامیہ دیوبند کی خدمت کو اس کی مرکزی حیثیت اور عمومِ فیض رسانی کے لحاظ سے اہم اور اقدم سمجھتے اور امداد میں حظ وافر لیتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کی اسی عام توجہ کا ثمرہ ہے کہ مدرسہ کے کام بحمد اللہ حُسنِ اسلوب کے ساتھ جاری اور مدرسہ اپنی معتدل رفتار کے ساتھ کچھ نہ کچھ آگے ہی کو قدم بڑھاتا ہے۔ خادمانِ مدرسہ کو بزرگانِ قوم کی مخلصانہ توجہ پر اعتماد کر کے یہ موقعہ ملتا رہتا ہے کہ مفید تجاویز کا اجراء کر کے امداد و اعانت کی درخواست کریں۔ خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس گئی گزری حالت میں بھی مسلمانوں میں ایسے افراد موجود ہیں جو تمام جوانب سے قطع نظر کر کے دینی خدمات کو انجام دینے میں لوم لائم اور طعن طاعن کی پرواہ نہیں کرتے۔

مدرسہ کا اصل سرمایہ اگرچہ بظاہر غیر مستقل ہے اور اس کے مقدس بانیین حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ

وغیر ہم نے اس کے لیے مستقل سرمایہ کو پسند بھی نہیں فرمایا کہ جس پر اعتماد کر کے مسلمانوں کی ہمدردی اور توجہ سے مستغنی ہو جائے۔ اور کسی وقت یہ استغنا و استقلال ہی موجب نقصان ثابت ہو؛ بلکہ عام چندوں پر اس کی بنا رکھی ہے۔ اور کثیر التعداد مسلمانوں کی شرکت اور غرباء کے چندوں کو موجب خیر و برکت سمجھا ہے؛ مگر بنظر غور دیکھا جائے تو یہی سرمایہ مستقل ہے؛ کیونکہ اس حالت میں توجہ الی اللہ پوری رہتی اور عام چندوں کی احتیاج میں شانِ توکل نظر آتی ہے۔ اور یہ وہ سرمایہ ہے، کہ عام اصطلاحی مستقل سرمایہ اس کے سامنے غیر مستقل نظر آتے ہیں۔ توکل علی اللہ ایسا سبب اور علّت ہے کہ تمام اسبابِ ظاہری اس کے سلسلہ میں منسلک ہیں، اسی حقیقی علت اور سبب کا اثر ہے کہ مقبول بندوں کے دل خود بخود اس کی امداد کی طرف متوجہ ہوتے اور مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ اعانت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب خود خداوند تعالیٰ متکفل جملہ اُمور ہوں تو ظاہری اسباب کیوں نہ تابع ہوں گے۔ ؎

گرچہ بے ساماں نماید کارِ ما سہلش مبیں ❖ کاندریں کشور گدائی رنگِ سلطانی بود

بزرگانِ اسلام! آپ کو مبارک ہو، کہ آپ کے حسنِ توجہ اور اخلاصِ قلبی سے مدرسہ میں مفید تجاویز کا اجرا ہوتا جاتا ہے۔ اور مدرسہ کے اکثر ضروری کام رفتہ رفتہ پورے ہوتے جاتے ہیں۔ سالِ زیر بحث کی حالت بہت کچھ حوصلہ افزاء اور اُمید دلانے والی ہے، کہ ان شاء اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی ہمت کے سامنے کسی نہایت اہم کام کا انجام کچھ دشوار نہیں ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ جس طرح سالِ زیر بحث مدرسہ کی تاریخ میں مبارک سال ہے، اسی طرح آپ کی ہمت سعی سے سالِ رواں اس سے زیادہ مبارک و مسعود ہوگا۔ اور آپ کی توجہ بیش از بیش اس کی جانب مبذول ہوگی؛ کیونکہ بہت سی تجاویز کے ظہور پذیر ہونے اور مدرسہ کے تمام شعبہ ہائے تعلیمی و انتظامی و تعمیری وغیرہ کے پورے ہونے میں آپ کی بہت زیادہ کوشش و سعی درکار ہے۔

اِس اجمالی عرض کے بعد ہم آپ کی خدمت میں مدرسہ کے ہر شعبے کے مفصل حالات پیش کرنا چاہتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ آپ کی ہمتوں اور ارادوں میں برکت اور اخلاص و ہمدردی میں یوماً فیوماً ترقی عطا فرمائے۔ آمین

آمدنی چندہ و شکریہ اہلِ ہمم

سالِ زیر بحث میں جملہ مدات کی کل آمدنی (۳-۵-۳۲۰۵۵) بتیس ہزار پچپن روپے پانچ آنے تین پائی ہوئی۔ اور کل خرچ چھبیس ہزار تین سو دو روپیہ پندرہ آنہ نو پائی ہوا۔ آمدنی کی مجموعی حالت بحمداللہ بہت اچھی ہے۔ اور نہ وہ صرف گزشتہ سال سے زیادہ ہے؛ بلکہ مدرسہ کی تاریخ میں ابتداء بنا سے اس وقت تک کسی سال اس قدر آمدنی نہیں ہوئی۔

اگر چہ آمدنی میں اس قدر بیّن ترقی اور اضافہ کی بڑی وجہ تعمیر مسجد کے چودہ ہزار روپیہ ہیں؛ لیکن اِس رقم کو منہا کرنے کے بعد بھی آمدنی کی مقدار سترہ ہزار روپیہ سے کچھ زیادہ ہوتی ہے جو فی حدّ ذاتہٖ قابل اطمینان ومسرت ہے۔ اور ان سترہ ہزار میں سے عام تعمیراتِ مدرسہ کی آمدنی کو جو دو ہزار پانچ سو سینتالیس روپیہ چودہ آنہ چھ پائی ہے منہا کر دیا جائے تو تعلیم اور مصارف طلبہ وکتب خانہ کے لیے کل آمدنی پندرہ ہزار ایک سو چھ روپیہ چار آنہ چھ پائی ہوتی ہے۔ آمدنی کی یہ مقدار اگر چہ موجودہ حالت میں کافی نظر آتی ہے؛ لیکن فی الحقیقت اُن تعلیمی تجاویز کے لحاظ سے جن کا اجراء شروع کیا گیا ہے اور مدرسان کی جدید تقرر کے لحاظ سے تعلیمی چندہ بالکل ناکافی اور دردمندانِ اسلام کی بہت زیادہ توجّہ کا محتاج ہے؛ چونکہ مدرسہ کی شہرت کے ساتھ ساتھ طلبہ کی رغبت ورجوع بھی بڑھتا جاتا ہے؛ اس لیے خاص مصارف طلبا میں ہر سال بہت زیادہ اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ۱۳۲۶ھ میں سنین ماسبق سے کچھ زیادہ تھا۔ اور ۱۳۲۷ھ یعنی سال زیر بحث میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہوگیا۔ یعنی بہ نسبت ۱۳۲۶ھ کے اس سال روپیے زیادہ خرچ ہوئے۔ اور سن رواں یعنی ۱۳۲۸ھ میں مصارف اور بھی بہت زیادہ بڑھ گئے؛ کیونکہ ایسے طلبہ کی تعداد جن کو مدرسہ سے امداد ملتی ہے بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ علاوہ بریں ۱۳۲۷ھ کے ختم تک طلبہ کو مدرسہ سے خوراک کے لیے پیسہ ملتا تھا اور سن رواں میں باورچی خانہ قائم ہوگیا، جس سے پختہ کھانا ملتا ہے اور اس انتظامِ جدید سے خرچ بہت کچھ بڑھ گیا، جیسا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ۱۳۲۸ھ کی روداد میں دکھلایا جائے گا۔ الغرض! مصارف ہر سال بڑھتے جاتے ہیں؛ لیکن آمدنی کو دیکھتے ہیں تو حالت موجودہ میں بھی کافی نہیں؛ کیونکہ سن زیر بحث میں کل آمدنی زرزکوٰۃ ومتفرقات کی چار ہزار چار سو ستّر اور کل خرچ پانچ ہزار تین سو چھ روپیہ ہوا۔ جو آمدنی سے بقدر (۸۲۹) بڑھا ہوا ہے۔ یہ رقم دوسرے مدّات سے قرض لے کر طلبہ پر صرف کی گئی ہے۔ اس مختصر بیان سے معزز ناظرین خود خیال فرما سکتے ہیں کہ جب موجودہ حالت میں یہ آمدنی کافی نہیں ہے، تو ان روز افزوں مصارف اور مفید تجاویز کے بعد کس طرح کافی ہو سکتی ہے۔ ہمیں خدا تعالیٰ کے فضل سے قوی اُمید ہے کہ وہ اپنے نیک اور مخیّر بندوں کو پہلے سے زیادہ اِس طرف متوجہ فرمائے گا۔

آمد وصرف میں موازنہ دکھلانے کے بعد اُن حضرات کا ذکر خیر کرنا چاہتے ہیں، جن کی ذات وتوجہ خاص سے سال زیرِ بحث میں مدرسہ کو امداد پہنچی ہے۔

(۱) گزشتہ سال کی روداد میں ریاست عالیہ بھوپال سے دو سو روپیہ سالانہ چندہ کے اضافہ کی خبر لکھ کر اُمید ظاہر کی گئی تھی کہ ان شاء اللہ تعالیٰ جلد ہی اور مژدہ سننے کا موقعہ ملے گا۔ خادمانِ مدرسہ کی یہ توقع بحمد اللہ پوری ہوئی۔ اور ماہِ رمضان المبارک میں سرکار والا جاہ دام ملکہا و بقاء ہا نے اپنے خاص حکم سے سابق حکم کو ترمیم کر کے بجائے دوصدر روپیہ سالانہ کے اُس تاریخ سے دوصدر روپیہ ماہانہ کا اضافہ فرمایا۔ اور معہ سابق چندہ کے دو سو پچاس

روپیہ ماہانہ مدرسہ کے لیے جاری فرمائے۔ اور یہ عجب حسنِ اتفاق ہے کہ مدرسہ کی نوتعمیر مسجد میں سب سے اوّل ۸ ررمضان المبارک کو عصر کے وقت سے نماز شروع کی گئی اور ۹ ررمضان المبارک کی صبح کو سرکار والا کا یہ فرمان مدرسہ میں پہنچا۔

مسلمانوں کے لیے کس قدر خوش قسمتی اور کامیابی و فلاحِ دارین کے لیے کیسی مبارک فال ہے کہ والیانِ ریاست ان کی اسلامی و مذہبی درسگاہوں کی سرپرستی فرمائیں، ہماری دعا ہے اور تمام مسلمانوں کو اس پر آمین کہنا چاہیے کہ سرکار والا رفاہِ خلق، ہمدردیٔ اسلام و راحت رسانیٔ خلق اللہ کے لیے تادیر جلوہ افروز سریر سلطنت رہیں۔ اور آپ کی ذات سے دِین مبین کو تقویت اسلام اور مسلمانوں کو عزت حاصل ہوتی رہے۔

چراغ شرع ز احکامِ تو منور باد ❖ دماغِ دہر ز انفاس تو معطّر باد

اور سب خادمان و متعلمان مدرسہ باخلاص قلب دعا کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ سرکار والا کے اس تردد کو جو عالی جانب کرنل نواب محمد عبیداللہ خاں صاحب بہادر کی علالت سے درپیش ہے رفع فرمائے۔ اور کرنل صاحب بہادر صحت و عافیت کے ساتھ تادیر نعمائے حیات سے متمتع رہیں۔ آمین۔

وقتِ دعا رسید سخن مختصر کنم ❖ عالم بکام باد سعادت مدام باد

سرکار والا دام ملکہا کی علمی سرپرستی اور اسلامی ہمدردی اگرچہ عام اور ہندوستان کے اسلامی مدارس اور انجمنوں سے تجاوز ہو کر ام القریٰ مکہ معظمہ زادہا اللہ شرفاً و تعظیماً کی ایک مذہبی درسگاہ تک پہنچ چکی ہے؛ مگر مدرسہ اسلامیہ دیوبند کو بجا طور پر یہ فخر حاصل ہے کہ سرکار والا نے اس کی سرپرستی قبول فرمائی اور غالباً بیرونی ریاست اسلامی مدرسوں میں سب سے اوّل مدرسہ دیوبند کو دوامی امداد دی گئی ہے۔

(۲) اس زمانہ کے موجودہ والیانِ ملک اور روٴساء ذوی الاقتدار میں عالی جناب نواب میر خواجہ محمد سلیم اللہ خاں صاحب رئیس ڈھاکہ کی ذات پر مسلمان جتنا فخر کریں تھوڑا ہے۔ آپ کی توجہ ہمیشہ مسلمانوں کے فلاح و بہبود میں صرف رہتی ہے۔ اور آپ تمام ضروری مشاغل و راحت و آرام سے اِس کو مقدم سمجھتے ہیں۔ یہ امر کسی قدر حیرت انگیز تھا کہ جناب موصوف کو اس وقت تک کسی نے مدرسہ دیوبند کی طرف توجہ نہ دلائی تھی۔ اور اس کوتاہی کے ذمہ دار زیادہ تر خود منتظمانِ مدرسہ تھے۔ شعبان ۲۷ھ میں ایک تحریر کے ذریعہ سے جناب موصوف کی خدمت میں مدرسہ کے حالات عرض کیے گئے اور حسنِ اتفاق سے ماہ ذیقعدہ ۲۷ھ میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب دامت برکاتہم کا ڈھاکہ تشریف لے جانا ہوا اور مولانا مدظلہم نے مدرسہ کے حالات بیان فرما کر جناب نواب صاحب کو اس کی طرف توجہ دلائی۔ جس پر جناب موصوف نے بہت خوشی کے ساتھ مدرسہ اسلامیہ دیوبند کے لیے پچاس روپیہ ماہوار کی مستقل امداد اور چارسو روپیہ عطاء یکمشت کا حکم دیا۔ جناب نواب صاحب بہادر نے جس اخلاص اور للّٰہیت کے ساتھ یہ امداد

فرمائی ہے اس کا اندازہ صرف ایک بات سے ہوسکتا ہے کہ مدرسہ سے جب شکریہ کا خط گیا، تو بجواب اُس کے یہ تحریر فرمایا کہ میں کسی شکریہ کا مستحق نہیں ہوں؛ کیونکہ میں نے جو کچھ کیا ہے اپنے لیے کیا ہے۔ سبحان اللہ کیا اخلاص ہے۔ بیشک نواب صاحب بہادر کا یہ ارشاد صحیح ہے اور آپ کو ہرگز کوئی دوسرا امر مطلوب و مقصود نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے آپ نے اخباروں میں اعلان و اشاعت کو بھی پسند نہیں فرمایا۔ اور آپ کے ارشاد کے بعد کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں رہی۔ تاہم حسبِ اجازت شرع خادمانِ مدرسہ کو گنجائش ہے کہ شکریہ ادا کریں اور یہ نہ ہوسکے تو دعائے خیر کریں۔

(۳) جناب منشی محمد رحمت اللہ خاں صاحب رئیس خورجہ پنشنر تحصیلدار ریاست حیدرآباد دکن نے اپنی دختر مرحومہ کی یادگار میں ایک مکان تعمیر کرنے کے لیے ایک ہزار دو سو اُنتیس روپیہ نقد اور کئی سو روپیہ کا سامان پارچہ عطا فرمایا۔ خدا تعالیٰ تحصیلدار صاحب موصوف کے مال و دولت دین و ایمان میں برکت عطا فرمائے۔ اور اللہ تعالیٰ اُن کی دختر مرحومہ کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ مرحمت فرمائے۔ آمین

(۴) بڑی مسرت اور اطمینان کی بات ہے کہ مدرسہ اسلامیہ دیوبند کی تائید و امداد کا سلسلہ ہندوستان سے متجاوز ہوکر جنوبی افریقہ تک پہنچ گیا۔ جوہانسبرگ واقع جنوبی افریقہ کے مسلمانوں نے مولوی احمد صاحب سورتی و مولوی حافظ احمد صاحب ہزاروی کی تحریک و ترغیب سے چندہ کر کے چار سو روپیہ سے زیادہ مدرسہ میں بھیجیے۔ جزاہم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء

(۵) عالی جناب مولانا مولوی عبدالملک خان صاحب خلف الصدق حضرت مولانا مولوی محمد نصر اللہ خاں صاحب قدس سرہٗ رئیس خورجہ ضلع بلندشہر محض مدرسہ کو ملاحظہ کی غرض سے دیوبند تشریف لائے اور شب و روز قیام فرما کر واپس تشریف لے گئے اور اپنی جیب خاص سے مدرسہ کی امداد کے لیے مبلغ ساٹھ روپیہ عطا فرمائے۔ جناب موصوف کا ایسی ضعیفی کی حالت میں قدم رنجہ فرمانا اہلِ مدرسہ کے لیے موجب فخر و عزت ہے۔ اسی طرح دوسرے دیندار اور غیور مسلمانوں کے لیے موجبِ تحریص و ترغیب ہے۔

(۶) بعض عطیات اگرچہ مقدار میں زیادہ نہیں ہوتے؛ مگر خاص وجوہ سے مہتم بالشان اور قابل قدر ہو جاتے ہے۔ مثلاً اگر کوئی صاحب اپنی سواری کا گھوڑا یا رہنے کا مکان یا اپنا خاص لباس عطاء فرما دیں، یہ عطیّہ عام نظیروں میں بہت زیادہ وقعت معلوم ہوتا ہے اور فی الحقیقت اپنے کسی محبوب و مخصوص چیز کا فی سبیل اللہ خدمتِ دین کے لیے دے دینا نقد کی بڑی مقدار سے بھی زیادہ سبب اجر ہو جاتا ہے۔

اس سال جناب منشی انتظام الدین صاحب رئیس اتھائیں و جناب منشی رحمت الٰہی خاں صاحب رئیس شاہپور نے اپنے گھوڑے مدرسہ میں عطا فرمائے۔ اور اسی طرح جناب منشی احمد حسن صاحب رئیس جلال آباد ضلع مظفرنگر ملازم ریاست بھوپال نے اپنا گھوڑا مدرسہ میں عطا فرمایا۔ جو جناب مولوی سعیدالدین صاحب ناظم آنٹھہ کی

معرفت فروخت ہوا۔اور قیمت اس کی داخل مدرسہ ہوئی۔جزاہم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء۔

خدائے تعالیٰ کا شکر ہے کہ سال زیر بحث عطیات جدید کے لحاظ سے بہ نسبت سنین سابقہ بہت بڑھا ہوا ہے، ہمیں اس کے فضل سے اُمید ہے کہ سالِ رواں میں بھی مدرسہ کو ہر قسم کی ترقیات وفتوحات زائد از خیال نصیب ہوں گی۔

جائداد موقوفہ واقعہ قصبہ شاملی ضلع مظفر نگر

واقف کار اور مسلسل طور پر روداد سالانہ ملاحظہ فرمانے والے حضرات کو معلوم ہے کہ چھ سات سال ہوئے، جناب قاضی محمد علیم الدین صاحب رئیس شاملی ضلع مظفر نگر پنشنر ڈپٹی انسپکٹر مدارس نے اپنی کل جائداد صحرائی وسکنائی مالیتی دس ہزار روپیہ مدرسہ کے نام وقف کر دی تھی۔اور تاحیات اُس کی تولیت خود اپنے ہاتھ میں رکھی تھی۔اور بعد اپنی وفات کے مہتمم مدرسہ کو متولی قرار دیا تھا؛ چنانچہ اس عرصہ میں جناب قاضی صاحب خود انتظام جائداد فرماتے رہے۔اور بیس روپیہ معاوضہ اس خدمت کا لیتے رہے۔اس سال بماہ جمادی الاولی ۱۳۲۷ ہجری مطابق مئی ۱۹۰۹ء جناب قاضی صاحب مرحوم نے وفات پائی۔اللہ تعالیٰ اُن کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے بعد وفات جناب قاضی صاحب مرحوم انتظام جائداد مذکورہ براہِ راست زیرِ نگرانی مہتمم مدرسہ کیا جاتا ہے۔اور ایک مختار عام تنخواہ دار مقرر کر دیے گئے ہیں۔

مفید تجاویز

گزشتہ رودادوں میں اِس امر کا اظہار کیا گیا ہے کہ حفاظت و اشاعتِ اسلام کس قدر مہتم بالشان امر ہے اور یہ کہ مدرسہ دیوبند نے اس امر کی طرف خاص توجہ کی ہے؛ چنانچہ بحمداللہ یہ سلسلہ برابر جاری ہے اور جس جگہ ضرورت ہوتی ہے مدرسہ کی جانب سے علماء و مناظرین کو بھیج دیا جاتا ہے؛ مگر اس کام کے لیے مستقل سرمایہ درکار ہے۔جلسہ دستار بندی کے موقع پر بھی اِس امر کا اعلان کیا گیا اور ان طلبہ کا جو خاص اِس کام کے لیے تیار کیے جاتے ہیں، نمونہ بھی دکھلایا گیا ہے۔ ہم مکرر اس امر کو غیور اہلِ اسلام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، کہ آپ کی تھوڑی سی ہمت سے یہ کام بہت کچھ سہولت کے ساتھ قائم و جاری ہوسکتا ہے اور غالباً اجتماع شرائط کے اعتبار سے دیوبند سے بہتر جگہ اس غرض کے لیے ہے۔ بالفعل سو روپیہ ماہوار کے صرف سے مستقل محکمہ اس کا قائم ہوسکتا ہے اور بتدریج اِس کو ترقی دی جاسکتی ہے۔

خورد سال اطفال کی تعلیم ونگرانی

اکثر باوسعت حضرات اپنے خورد سال بچوں کو مدرسہ میں تعلیم و تربیت کے لیے بھیجنا چاہتے تھے؛ لیکن بوجہ خاص انتظام نہ ہونے کے اُن کی ذمہ داری سے انکار کر دیا تھا۔اور سوائے اس خاص صورت کے کہ کوئی مدرس اُن کی نگرانی اپنے ذمہ رکھیں۔ایسے بچوں کو نہ لیا جاتا تھا اور اس کی وجہ بجز قلتِ سرمایہ کچھ نہ تھی؛ مگر یہ امر کچھ کم قلق کا نہ

تھا کہ جن بچوں کی تربیت زیادہ کارآمد و مفید ہو وہی اس دولت سے محروم رہیں۔ لہٰذا اب یہ تجویز ہے کہ خورد سال بچوں کی تعلیم، نگرانی، قیام اور طعام کا خاص انتظام کیا جائے اور اس کے لیے لائق استاد نگران رکھے جائیں۔ مکان وغیرہ علیحدہ بنائے جائیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ انشاء اللہ یہ سلسلہ بہت زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ اِس انتظام میں جو کچھ صرف ہوگا، بچوں کے مربیوں سے لیا جائے گا۔

ہم نے محض اہل اسلام کے گوش گزار کرنے کی غرض سے اِس تجویز کو شائع کر دیا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ شروع سال تعلیمی سے اس کا انتظام کیا جائے گا۔ جو حضرات اپنے کسی عزیز کو بھیجنا چاہیں، نہایت اطمینان کے ساتھ بھیج سکتے ہیں۔

انتظامِ طلبہ

۱۳۲۶ھ کی روداد میں یہ امر ظاہر کر دیا گیا تا کہ طلبہ کی آسائش اور راحت کے لیے مدرسہ میں باورچی خانہ قائم کرنے کا خیال ہے، جس سے ان طلبہ کو جو مدرسہ سے وظیفہ پاتے ہیں اور نیز اُن طلبہ کو جو اپنے پاس سے کھاتے ہیں، پختہ کھانا ملا کرے یہ تجویز چند سال سے پیش تھی؛ مگر اخراجات کے بڑھ جانے کے اندیشہ سے جو اس صورت میں لازمی امر تھا، اس وقت اس پر عمل نہ ہوسکا اور یہ امر دیکھ کر کہ سال رواں کے سن تعلیمی میں یعنی شوال ۱۳۲۷ ہجری میں جو داخلہ طلبہ کا وقت ہے، اس کثرت سے جدید طلبہ آئے کہ مجبوراً باوجود عدمِ گنجائش کے وظائف کی تعداد بڑھانی پڑی؛ چنانچہ بجائے اس کے کہ زیادہ سے زیادہ سو (۱۰۰) طلبہ کو وظیفہ دیا جاتا تھا، قریب ایک سوتیس (۱۳۰) طلبہ کو وظیفہ دیا گیا۔ اور خرچ میں بہت کچھ اضافہ ہوگیا کسی طرح موقع نہ تھا کہ باورچی خانہ قائم کر کے اور بھی مصارف بڑھا دیا جائے؛ مگر حسبِ دستور و عمل درآمد قدیم مدرسہ خدا تعالیٰ پر بھروسہ کر کے اس اہم اور مہتم بالشان کام کو جاری کر دیا گیا۔ گو ۲۷ ہجری میں اِس کا اجراء نہیں ہوا۔ مگر انتظام سب کچھ طے ہوگیا تھا۔ اور محرم ۱۳۲۸ ہجری سے باورچی خانہ کا افتتاح ہوگیا۔ جس میں نہایت صفائی اور سادگی کے ساتھ طلبہ کو ایک جگہ بٹھلا کر دو وقت کھانا کھلا دیا جاتا ہے؛ لیکن جیسا کہ خیال تھا، اِس جدید انتظام کی وجہ سے خرچ بڑھ گیا۔ جس کی تفصیل ناظرین کو ان شاء اللہ تعالیٰ ۱۳۲۸ھ کی روداد میں موازنہ کر کے دکھلائی جائے گی۔

اب معزز معاونین مدرسہ خیال فرمالیں، کہ مدرسہ کی وقعت و عظمت کا مدار طلبہ کی کثرت پر ہے اور بوجہ شہرتِ مدرسہ طلبہ ہر ملک و دیار سے کھنچے چلے آتے ہیں۔ امتحانِ داخلہ کی قیود و شرائط سے بہتوں کو جواب دے دیا جاتا ہے؛ مگر کہاں تک۔ پھر بھی قابل طلبہ کو داخل کرنا ہی پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے طلبہ کی تعداد ہر سال بہ نسبت سابق بڑھتی جاتی ہے؛ چنانچہ ۱۳۲۶ھ کے اختتام پر بیرونی طلبہ کی تعداد ایک سو تاسی تھی، ۲۷ھ کے اختتام پر دوسو چوبیس تھی۔ ایک سال میں ۵۷ طلبہ بڑھ گئے۔

زمانہ کی رفتار کا یہ اثر ہے کہ مستطیع حضرات بہت کم اپنے بچوں کو علمِ دین کی طرف لگاتے ہیں، اکثر طلبہ ایسے ہوتے ہیں کہ بلا امداد و اعانت تکمیل علوم نہیں کر سکتے۔ اگر مستطیع طلبہ ہی کو تعلیم دی جائے تو سلسلۂ تعلیم دین تقریباً منقطع ہو جائے، انہیں غریب طلبہ میں بحمد اللہ ایسے لائق نکلتے ہیں جو کسی وقت مسلمانوں کے پیشوا اور ہادی بننے والے ہیں۔ ایسی حالت میں اوّل تو تعداد وظیفہ کے بڑھ جانے کی وجہ سے اور پھر اُس کے بعد بجائے نقد کے باورچی خانہ سے طعام دیے جانے کی وجہ سے مدرسہ پر خرچ کا بہت بار پڑ جاتا ہے۔ ہم اہلِ خیر کو بار بار اِس طرف توجہ دلاتے رہتے ہیں اور اب پھر مکرر عرض کرتے ہیں کہ طلبہ کے امداد کا بار زیادہ تر صدقات و زکوٰۃ پر رہتا ہے، اہلِ خیر زکوٰۃ نکالتے ہیں، صدقات دیتے ہیں، اگر وہ حضرات تھوڑا تھوڑا بھی مدرسہ دیوبند میں بھیجتے رہیں، تو حالتِ موجودہ سے بہت زیادہ طلبہ بآسانی مدرسہ سے فیض اُٹھا سکتے ہیں۔ ہمارے مسلمان بھی علاوہ صدقات نفلیہ و مفروضہ کے دنیاوی اُمور میں بہت سا روپیہ خرچ کرتے ہیں، اگر دنیا کی تقریبات شادی وغیرہ میں خرچ کرنے کے ساتھ سو میں ایک روپیہ بھی اس مد میں بھیج دیا کریں، تو کچھ بھی دشواری نہ ہو۔ اور یہاں بہت کچھ ہو جائے۔ ہم نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ جاگیر دار، زمیندار اور زراعت پیشہ حضرات اگر زمین کی آمدنی یا غلّہ میں سے بہت خفیف سا حصّہ اسلامی تعلیم کا مقرر کر دیں، تو نہ صرف مدرسہَ دیوبند؛ بلکہ بہت سے اسلامی مدارس کو سہولت ہو جائے، ہم نے یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ جو حضرات غلّہ عطا فرمائیں گے، وہ بجنسہٖ طلبہ کے کام میں آئے گا۔

ہمارے اس معروض پر اگرچہ عام طور پر عمل نہیں ہوا؛ مگر الحمد للہ کہ قصبہ کٹھور اور اس کے نواح کے دیہات کے سچّے مسلمانوں نے اس طریقہَ حسنہ کو جاری فرما دیا ہے۔ ۱۳۲۷ھ میں جناب مولوی حکیم محمد اسحاق صاحب کی کوششِ بلیغ سے قریب سومن پختہ کے غلّہ چند دیہات سے جمع ہو گیا۔ جو بجنسہٖ مدرسہ میں پہونچا دیا گیا تھا؛ لیکن چونکہ اُس وقت باورچی خانہ قائم نہ ہوا تھا اور غلّہ کو رکھنے میں نقصان کا اندیشہ تھا، اس وجہ سے اُس کو فروخت کر کے طلبہ کے خرچ میں لگا دیا گیا۔ امسال یعنی ۱۳۲۸ھ میں جو غلّہ آئے گا وہ ان شاء اللہ تعالیٰ بجنسہٖ خرچ کیا جائے گا۔ اس غلّہ کی تفصیل وار فہرست نام بنام علیٰحدہ بطور ضمیمہ روداد چھاپ کر ان حضرات کے پاس بھیج دی گئی۔ اِس روداد میں مجملاً ذکر کافی سمجھا گیا۔

کٹھور و نواح کٹھور کے معزز اصحاب کا صدق دل سے شکریہ ادا کرنے کے ساتھ اُن کے لیے دعائے خیر کرتے ہیں۔ اور اُمید کرتے ہیں کہ دوسری جگہ کے مسلمان اِس طریقہ کو اختیار فرمائیں، تو چند ہی دنوں میں مدرسہ دیوبند ہزاروں طلبہ کو بلا تردد تعلیم دے سکے گا، اور یہ خیر کثیر اُن حضرات کے حصّہ میں آئے گی جو بہت تھوڑی سی مقدار غلّہ کی عطا فرمائیں گے۔ وَالْاَمْرُ بِیَدِ اللّٰہِ الْکَرِیْمِ

سلسلۂ تعمیرات وضروریاتِ تعمیر

سلسلۂ تعمیر بحمداللہ سال زیر بحث میں برابر جاری رہا، جس کو ہم جُدا جُدا تفصیل سے دکھانا چاہتے ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مدرسہ میں تعمیری ضرورتیں کس قدر ہیں۔

تعمیر مسجد مدرسہ

گزشتہ سال کی روداد میں مسجد متعلقہ مدرس کی تعمیر اور جلسۂ بنیاد کا ذکر ہو چکا ہے۔ اور یہ کہ عالی جناب حاجی سیٹھ غلام محمد اعظم صاحب نے تعمیر مسجد کے واسطے مبلغ سولہ ہزار روپیہ منظور فرمائے ہیں۔ مدرسہ کے معاون و خیر خواہ یہ خبر سن کر نہایت خوش ہوں گے کہ اختتام سال زیر بحث پر مسجد کے دونوں مسقف درجے قریب تکمیل ہو گئے تھے۔ اور طبع روداد کے وقت دونوں درجے تعمیر کے اعتبار سے مکمل ہیں۔ صرف چند کام باقی ہیں، استرکاری اندرون مسجد و برون مسجد وغیرہ۔ مسجد کی شرقی دیوار بہت عمدہ منقش پتھر کی بنائی گئی ہے اور منار بھی پتھر کے ہیں۔ مسجد بحمداللہ نہایت خوبصورت شاندار تیار ہوئی ہے۔ پیشانی پر سنگِ مرمر کا کتبہ لگایا گیا ہے۔ جس میں تاریخ بناو تاریخ اختتام اور مختصر حال بناء کا درج ہے۔ قطعہ تاریخ جو اس پر کندہ کرایا گیا ہے، حسبِ ذیل ہے ؂

در مدرسہ مسجدے بنا شد ❖ ایں مژدہ ز دوستاں شنیدم
بر لوحِ جبینش اسم اعظم ❖ خواندم چو بصحن او رسیدم
در سجدۂ شکر چوں فتادم ❖ در گوش رسید ایں نشیدم
مقروں شدہ عبادت و علم ❖ در مدرسہ خانقاہ دیدم

۱۳ ھ ۲۸ ۱۳ ھ ۲۸

چونکہ مسجد میں پتھر کا کام خیال سے زیادہ بڑھ گیا؛ اس لیے جو تخمینہ اوّل کیا گیا تھا، اُس میں مسجد اور اس کے متعلق مکانات کی تکمیل نہ ہو سکی، جناب سیٹھ صاحب کی خدمت میں اس امر کو ظاہر کر دیا گیا۔ جناب موصوف نے استرکاری کے واسطے مبلغ تین ہزار روپیہ اور منظور فرمائے۔ یہ رقم ۱۳۴۸ھ کے آمدنی میں درج ہو گئی۔

علیٰ ہذا مسجد کے اندر حوض و کنوئیں کے لیے جناب اعظم بہام صاحب رئیس اعظم راندیر نے مبلغ دو ہزار روپیہ منظور فرمائے۔ یہ رقم بھی ان شاء اللہ تعالیٰ ۱۳۲۸ھ کی آمدنی میں دکھلائی جائے گی۔ مسجد کے متعلق تکمیل مکانات و حجروں کے لیے ابھی اہلِ اسلام کی بہت زیادہ امداد کی حاجت ہے؛ کیونکہ مسجد کے احاطہ میں اس قدر حجرے اور کمرے تیار کرنے کا خیال ہے کہ مستقل دارالطلبہ کا کام دے سکیں۔ اس غرض کے حاصل کرنے کے لیے ایک

قطعہ زمین متصل مسجد خرید اگیا ہے، اُمید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ایک سال کے اندر بشرط توجہ حضرات اہلِ اسلام مسجد معہ متعلقات کے مکمل ہو جائے گی۔ مسجد کی آمدنی چونکہ بالکل علیٰحدہ تھی؛ اس لیے اس کے حساب کا گوشوارہ بھی عام تعمیرات سے علیٰحدہ بنایا گیا ہے۔

تعمیرات متعلقہ مدرسہ

مدرسہ کا دار الطلبہ جو ۱۳۱۷ھ میں تیار ہوا تھا، ابھی تک بعض وجوہ سے غیر مکمل تھا۔ اس کے حجروں اور برآمدوں میں استرکاری بالکل نہ تھی۔ چھجّے اور مُنڈیریں تیار نہیں ہوئی تھیں۔ امسال بحمد اللہ اس کی بخوبی تکمیل ہوگئی۔

جناب منشی رحمت اللہ خاں صاحب رئیس خورجہ نے جو روپیہ اس غرض کے لیے عطا فرمایا تھا، کہ صاجبزادی مرحومہ کی یادگار میں ایک مکان بنوا دیا جائے، اگرچہ سال زیرِ بحث میں تیار نہیں ہوا؛ مگر سنہ رواں یعنی ۲۸ھ میں طبع روداد ہٰذا سے قبل تیار ہو گیا ہے؛ اس لیے اس کا تذکرہ بھی اسی جگہ کر دینا مناسب ہے۔

یہ مکان دو درجہ کا تیار ہوا ہے، نیچے کا درجہ طلبہ کی اقامت کے لیے اور اوپر کا درجہ کتب خانہ جدید کے متعلق بنایا گیا ہے، دونوں کمرے بحمد اللہ نہایت خوبصورت اور شاندار ہیں۔

تعمیر مکان متعلقہ مدرسہ واقع حیدر آباد دکن

حیدر آباد دکن میں بہت عرصہ سے ایک مکان مدرسہ کے متعلق ہے، جس کو جناب صفیہ بیگم صاجبہ مرحوم نے مدرسہ کے لیے وقف فرمایا تھا اور جناب منشی سید نور الحسن صاحب ساکن امروہہ ضلع مرادآباد محافظ دفترِ ملکی کے زیرِ اہتمام کرایہ پر جاتا تھا۔ اور اس کا کرایہ ہمیشہ وصول ہو کر درجِ روداد ہوتا تھا۔ گزشتہ سال وہ مکان منہدم ہو گیا۔ جناب منشی سید نور الحسن صاحب نے سعی بلیغ سے خاص حیدرآباد میں چندہ جمع فرما کر اس کو ازسرِ نو تعمیر کرایا۔ اور پہلے سے زیادہ اُس کو آرام دہ بنا کر کرایہ پر دے دیا۔ اس کی تعمیر کا حساب بھی درج روداد ہٰذا ہے۔ حق تعالیٰ جناب منشی صاحب موصوف اور اُن حضرات کو جنہوں نے بکمالِ اخلاص اِس میں امداد فرمائی، جزائے خیر عطا فرمائے۔

ضروریات تعمیر

اب ہم حضرات معاونین مدرسہ و ہمدردانِ اسلام کو ضروریاتِ تعمیر کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

مدرسین کی تعداد میں اضافہ ہونے کی وجہ سے درسگاہوں کی ضرورت پیدا ہوگئی ہے۔ امسال بھی بعض مدرس مسجد مدرسہ میں بیٹھ کر درس دیتے تھے۔ اور بعض کسی اور جگہ بیٹھتے تھے، جتنی درسگاہیں موجود ہیں، وہ اب ناکافی ہیں اور جبکہ مدرس اور بھی بڑھ جائیں گے تو ظاہر ہے کہ جدید درسگاہوں کی ضرورت کس قدر ہوگی۔

علیٰ ہٰذا طلبہ کی اقامت کے لیے مکانِ مدرسہ اور دار الطلبہ بالکل ناکافی ہے، طلبہ کو ٹھہرانے کا انتظام دُشوار ہو رہا ہے، ان دونوں ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے مدرسہ کے جانب جنوب ایک قطعہ زمین اُفتادہ ہے، جو تقریباً اٹھارہ سو درعہ مکسّر ہے، اس قطعہ میں چند درسگاہیں اور بہت سے کمرے طلبہ کے لیے تیار ہو سکتے ہیں۔ اس تعمیر کا تخمینہ پچیس ہزار روپیہ کیا گیا ہے۔ اس قطعہ زمین میں سے اکثر حصّے خرید لیے گئے ہیں، کچھ خریدنے باقی ہیں، اُمید ہے کہ اہلِ ہمم کی بلند ہمتی سے جلد یہ مکان تیار ہو جائے گا۔

نو عمر اطفال کے رہنے اور قیام کے لیے ایک مستقل مکان کی از حد ضرورت ہے۔ یہ مکان ایسا ہو گا کہ ایسے لڑکوں کے تمام حوائج کا انتظام اس میں ہو سکے۔ اُن کے اُستاد و نگراں بھی اس میں رہیں گے، کھانے وغیرہ کا انتظام بھی اس میں ہو گا۔

مدرسہ کے باورچی خانہ اور طلبہ کو کھانا کھلانے کے واسطے بھی ایک علیحدہ اور مستقل مکان کی ضرورت ہے۔

ایک ایسے مکان کی بھی حاجت ہے، جس میں طلبہ کو بیماری کی حالت میں ٹھہرایا جائے اور ان کی تیمارداری و پرہیز و علاج کا بندوبست سب اسی جگہ ہو۔ مدرسہ کے متعلق مختصر سادواخانہ بھی اس میں رہے۔

ہم اُمید کرتے ہیں کہ مدرسہ کے حالات کو ملاحظہ فرمانے والے ان معروضات کو بغور ملاحظہ فرمائیں گے اور اُن کے انصرام میں سعی بلیغ فرمائیں گے۔ جو حضرات خود اپنی پاک کمائی کے لیے بہترین مصرف کی فکر میں رہتے ہیں، ان کے لیے اس سے بہتر کیا موقع ہو گا۔ واللّٰہ الموفّق والمعین۔

کتب خانہ مدرسہ

ناظرین حالات مدرسہ پر مخفی نہیں کہ مدرسہ اسلامیہ دیوبند میں بحمد اللہ عظیم الشان کتب خانہ کی بنیاد قائم ہو چکی ہے۔ مدرسہ کا کتب خانہ تعداد کتب کے لحاظ سے تو بہت سے اسلامی کتب خانوں پر سبقت لے گیا ہے۔ نادر اور قلمی کتابوں کے اعتبار سے بھی ایک حد تک قابل وقعت ہے۔ منتظمانِ مدرسہ اس کی توسیع اور قیمتی کتب کے بہم پہنچانے میں سعی کرتے رہتے ہیں۔ اسی سال میں کتاب الجواہر المضیہ کا ایک خوشخط اور قدیم نسخہ ۱۵۰ میں خریدا ہے۔ واقف کار اہلِ علم کو معلوم ہے کہ اس کتاب کے نسخے ہندوستان بھر میں سواء چند جگہ کے نہیں ہیں۔ اور جہاں ہیں، ناقص و بدخط ہیں۔ کتب خانہ آصفیہ کا نسخہ ہم نے خود دیکھا ہے؛ مگر وہ نسخہ جو مدرسہ میں خریدا گیا ہے، نہایت خوش خط اور صحیح ہے؛ لیکن بایں ہمہ ابھی مدرسہ کا کتب خانہ اس اعتبار سے بہت ناقص ہے۔ ہم نے بار بار روداد مدرسہ کے ذریعہ سے بزرگانِ اسلام کو توجہ دلائی ہے، کہ وہ اس کتب خانہ کی تکمیل میں توجہ فرمائیں۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو ایک ایسے عام اور مفید کتب خانہ کی بے حد ضرورت ہے، جس سے عام طور پر اہلِ علم فائدہ اُٹھا سکیں اور

یہ بھی ظاہر ہے کہ مدرسہ دیوبند کے کتب خانہ سے زیادہ کوئی کتب خانہ عام فائدہ کے لیے وقف نہیں ہے۔اس وقت بھی اکثر اہلِ اسلام اور اکثر مدارس اس کتب خانہ سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

بہت دفعہ عرض کیا گیا کہ اکثر خاندانوں میں قدیم کتب خانے موجود ہیں۔جو ان کے بزرگوں نے محنت اور جاں فشانی سے جمع کیے تھے۔اور اب اس وجہ سے کہ خاندان سے علم گُم ہو گیا،کیڑوں کی نذر ہو رہے ہیں،کوئی نگراں وخبر گیراں بھی نہیں ہے۔اگر یہ کتب خانے مدرسہ دیوبند میں وقف کر کے بھیج دیے جائیں،تو کتب بھی محفوظ رہیں، جمع کرنے والوں کی ارواح کو ثواب پہنچے،مسلمان بھی فائدہ اُٹھائیں۔

اس وقت تک ہماری اس معروض پر عام طور سے توجہ نہیں کی گئی۔ہم اُمید کرتے ہیں کہ حضرات اہلِ اسلام اس مضمون کو توجہ سے ملاحظہ فرمائیں گے۔

شکریہ عالی جناب مولانا نظام الدین صاحب ڈپٹی کلکٹر ضلع بلیا

البتہ اس موقع پر عالی جناب مولانا نظام الدین صاحب کا ذکرِ خیر خاص طور پر کیا جاتا ہے،کہ جناب موصوف نے اپنے کتب خانہ کی بہت سی کتابیں جو دستبردِ نقصان سے محفوظ رہ گئی تھیں وقف فرما کر مدرسہ میں بھیج دیں۔ان کتابوں میں قاموس کا قلمی نسخہ نہایت خوش خط اور بہت عمدہ ہے۔جناب موصوف نے ایسے طریقۂ حسنہ کی بنیاد ڈالی ہے جو بفضلِ الٰہی اگر جاری ہو گیا اور قدیم خاندانوں کے سرپرستوں نے اس طریق کا اقتداء فرمایا،تو ایک جانب پُرانے ذخیرے محفوظ ہو جائیں گے، دوسرے جانب اہلِ علم ان بیش قدر خزائن سے منتفع ہو سکیں گے،جن کو ہوا تک لگنی مشکل ہو رہی ہے۔

لیکن جس طرح جناب موصوف کی عالی ہمتی قابلِ شکریۂ کافۂ اہلِ اسلام ہے،اسی طرح نہایت افسوس وحسرت کے ساتھ بحالتِ مجبوری ہم اس نہایت رنجیدہ واقعہ کے اظہار پر مجبور ہوئے ہیں،کہ مسلمانوں کے محترم ومعظم بزرگ جناب مولوی عبدالرحمٰن صاحب ساکن ناصری گنج ضلع آرہ مدرس مدرسہ مطلع العلوم بنارس نے وفات سے پہلے اپنی تمام عمر کے ذخیرہ کو جس کی تعداد ۲۵۰ مجلد اور ۳۶۰ غیر مجلد۔کل چھ سو دس کتابیں تھیں،مدرسہ دیوبند میں بھیج دینے کے لیے اپنی زوجہ محترمہ کے سپرد فرمایا۔بعد وفاتِ مولانا ان کی زوجہ محترمہ نے تمام کتابیں مولانا مرحوم کے شاگردِ خاص و بااختصاص مولوی جمال الدین ساکن موضع بھروارا ڈاک خانہ کنس سمری ضلع دربھنگہ کو جن پر مولوی صاحب مرحوم کو بڑا اعتماد تھا،سپرد کر دیں،کہ یہ کتابیں دیوبند بھیج دی جائیں۔مولوی جمال الدین مذکور سب کتابیں انتقال سے چوتھے روز اپنے ہمراہ لے گئے اور ان کی خدمت میں اطلاع بھیج دی کہ وہ سب کتابیں دیوبند بھیج دی گئیں؛لیکن افسوس ہے کہ ایک کتاب بھی مدرسہ میں نہیں پہنچی۔کیا یہ حسرت انگیز امر نہیں،کہ مسلمان کے خاص گروہ زمرہ علماء میں بھی ایسے رہزن اور ناسپاس موجود ہیں،جنہوں نے نہ دیانت وامانت کا خیال کیا اور نہ حقِ اُستادی کا۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

ہمارے پاس بنارس کی متعدد تحریریں اور مولانا کی زوجہ محترمہ کی بھیجی ہوئی خاص تحریریں وغیرہ موجود ہیں۔ کاش مولوی جمال الدین اب بھی سمجھیں اور اس مذہبی رہزنی کی بُری مثال قائم نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ ہدایت فرمائے۔

مسلمانو! کس قدر عبرت کی جگہ ہے، کہ ہزاروں اللہ کے بندے خود امداد کرتے اور دوسروں سے امداد کراتے ہیں اور ایک ایسے بھی کہ مدرسہ کے مال کو خود ہضم کر کے اپنی عاقبت خراب کر کے دوسرے لوگوں کو کارِ خیر سے روکنے کا بُرا طریقہ جاری کرتے ہیں۔ اعاذنا اللہ منہا

صیغۂ تعلیم وطلبۂ قدیم مدرسۂ اسلامیہ دیوبند

صیغۂ تعلیم میں تعداد مدرسین کا اضافہ، ترتیب وتقسیم فنون وغیرہ چند اُمورِ مہتم بالشان زیرِ تجویز ہیں، جو ان شاء اللہ تعالیٰ ایک عمدہ اور پسندیدہ صورت میں ظاہر ہو کر اہلِ اسلام اور حامیانِ علم کے لیے مزید اطمینان ومسرت کا سبب بنیں گے۔ مدرسہ میں طلبہ کی رجوع اور یوماً فیوماً ازدیاد اور تعلیم کی خاص طور پر نگرانی وغیرہ اُمور کے لحاظ سے یہ امر ضروری ہوگیا ہے کہ جدید مدرسین کا تقرر کیا جائے۔ اِس موقع پر معاونانِ مدرسہ وجملہ اہلِ اسلام اِس بات کو سن کر نہایت خوش ہوں گے کہ مدرسہ دیوبند کے قدیم وجدید ہونہار ولایق طلبہ میں مدرسہ کی خدمت گزاری اور تائید کا ایک خاص اثر پیدا ہو رہا ہے، اُن میں یہ خواہش نظر آتی ہے کہ بلا معاوضہ مدرسہ کی خدمت کریں۔

ان حضرات میں سے جناب مولوی سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری وجناب مولوی سید حسین احمد صاحب مہاجر مدنی قابلِ ذکر ہیں۔ مولوی انور شاہ صاحب نہایت لایق اور ذی استعداد جامع وحافظ علوم اور نہایت متقی نمونہ علمائے سلف ہیں۔ حال کے جلسہ دستار بندی میں سب سے اوّل آپ ہی کو دستار عطا کی گئی تھی۔ مولوی صاحب موصوف کو بوجہ خدمت والدین یہ امر تو دُشوار ہے کہ مستقل طور پر وطن کو ترک کر کے مدرسہ میں قیام فرماسکیں؛ مگر آپ نے باجازت والدین یہ امر طے کرلیا ہے کہ دو تین سال رہ کر مدرسہ میں کارِ تعلیم وغیرہ کو انجام دیں اور تنخواہ نہ لیں؛ چنانچہ شعبان ۲۷ھ سے آپ دیوبند میں موجود ہے ہیں۔ اور مثل مدرسین درس دیتے رہے۔ علاوہ اس کے اور بھی جس قسم کی ضرورتیں پیش آئیں، اُن کو نہایت سرگرمی سے انجام دیا۔

مولوی سید حسین احمد صاحب مدرسہ کے نوجوان لایق اور مستعد علماء میں سے ہیں۔ ۱۳۱۶ ہجری میں آپ کے والد ماجد مولوی سید حبیب اللہ معہ کل عیال کے ہندوستان سے ہجرت کر کے مدینہ طیّبہ زادہا اللہ شرفاً وتعظیماً میں مقیم ہو گئے۔ اور مولوی حسین احمد صاحب خاص حرم مبارک میں تعلیم دیتے ہیں۔ ڈیڑھ سال سے ہندوستان میں تشریف لا کر دیوبند میں مقیم ہیں۔ اور جس قدر خدمت مدرسہ کی ممکن ہوتی ہے ادا کرتے ہیں۔ غالباً اس سال یا آئندہ سال واپس تشریف لے جائیں گے اور پھر حسبِ موقعہ آ کر مدرسہ کے کام میں مشغول ہوں گے۔ مولوی حسین احمد صاحب

کے دو بڑے بھائی مولوی صدیق احمد صاحب و مولوی سید احمد صاحب بھی مدرسہ دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں اور خاص حرم محترم کی خاکروبی میں مشغول ہیں۔

مدرسہ دیوبند کے طلبہ میں یہ ایک ایسی عمدہ نظیر ہے کہ اگر اسی طرح لایق اور مستعد طلبہ دائمی یا عارضی طور پر اپنی خدمات مدرسہ کو عطا کرتے رہیں، تو مدرسہ کو بہت بڑی تائید ملے اور مسلمانوں کے ایثار اور شکرگزاری کی عمدہ مثال قائم ہو جائے۔

جلسۂ دستار بندی

گزشتہ سال کی روداد میں اعلان کر دیا گیا تھا، کہ حسبِ تجویز ممبران مدرسہ جلسۂ دستار بندی کا انعقاد قرار پایا ہے، جس میں چھبیس سال کے فارغ التحصیل علماء کو دستارِ فضیلت عطا کی جائے گی؛ مگر سن زیر بحث یعنی ۱۳۲۷ھ میں باوجود عزمِ مصمم بوجوہِ چند در چند جلسہ منعقد نہ ہوسکا۔ اور ممکن تھا کہ ابھی اور تاخیر اس میں ہوتی؛ لیکن اہلِ اسلام کے انتظار و شوق نے زیادہ مہلت نہ دی؛ اس لیے سن رواں یعنی ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ میں اس کا انعقاد قرار دیا گیا اور چار ماہ قبل سے اس کے ہر قسم کے انتظامات شروع ہو گئے۔

جلسہ تواریخ مقررہ یعنی ۶، ۷، ۸ ربیع الثانی ۱۳۲۸ مطابق ۱۷، ۱۸، ۱۹ اپریل ۱۹۱۰ء کو نہایت عظمت و شان کے ساتھ منعقد ہوا۔ اور بحمد اللہ اس خوبی و کامیابی کے ساتھ منعقد ہوا کہ تاریخ اسلام میں ایسے اسلامی اور مذہبی جلسے کی نظیر بمشکل مل سکے گی اور اس زمانہ میں تو باوجود کثرتِ جلسہ ہائے قومی و اسلامی یقیناً اس کی نظیر کوئی نہیں بتلا سکتا۔ جلسہ کی عظمت کا اندازہ صرف اِس ایک بات سے ہوسکتا ہے کہ مہمانوں کی تعداد تیس ہزار یا کچھ زیادہ تھی اور سب کی مہمانداری مدرسہ کے ذمہ تھی۔ مہمان ہر طبقے کے حضرات اس کثرت سے تھے کہ اس سے قبل آج تک کسی ایک جگہ ایسے لوگوں کا جمع ہونا، ایک مجلس میں زانو بزانو بیٹھے دیکھنا تو درکنار سنا بھی نہیں گیا۔ پھر عجیب امر یہ ہے کہ اعلیٰ جاگیردار و عہدہ دار سے ادنیٰ کاشتکار تک سب ایک اسلامی رنگ میں ڈوبے ہوئے، اس دلفریب منظر پر فریفتہ اور پُر اثر نظارہ سے متاثر مواعظِ حسنہ کے استماع سے محظوظ اور منشرح نظر آتے تھے۔ یہ امر بلا مبالغہ ہے کہ جس کشادہ پیشانی اور مسرت کے ساتھ دُور و نزدیک سے لوگ آ کر جمع ہوئے اور جو اثر اپنے دلوں میں لے گئے دیوبند کے سوا کسی جلسہ میں ایسا نہیں ہوا۔ اسلامی برکات و کرامات کا نزول بھی ایسا کھلا ہوا تھا کہ ایک غیر حساس اور نہایت بلید و متعصب بھی بمشکل انکار کرسکتا ہے۔ الحمد للہ کہ اسلام کے فطری محاسن کو زمانہ نہیں مٹا سکا، مسلمانوں کے دلی خیالات اور محبتِ اسلامی کو کسی کی تدبیر و سعی زائل نہیں کرسکتی۔

جلسہ کے مفصل حالات انتظامی کیفیات اور آمد و خرچ کا موازنہ سب اس مفصل روداد سے معلوم ہوں گے، جو عنقریب طبع ہو کر ناظرین کی خدمت میں پہونچے گی۔ ہم یہاں اِس مختصر ذکر ہی پر قناعت کرتے ہیں۔

جلسۂ سالانہ ممبرانِ مدرسہ

حسبِ معمول اس سال بھی ممبرانِ مدرسہ کا سالانہ جلسہ ۷ رربیع الثانی سے ۱۱ رربیع الثانی ۲۷ھ تک منعقد ہوا۔ ممبران بیرونی میں سے (۱) مولانا احمد حسن صاحب (۲) مولانا عبدالرحیم صاحب (۳) مولانا اشرف علی صاحب (۴) مولانا محی الدین خاں صاحب قاضی ریاست بھوپال (۵) مولانا عبدالحق صاحب (۶) مولوی ظہور علی احمد صاحب وکیل عدالتہائے دیوانی بھوپال (۷) مولوی سعید الدین صاحب مہتمم سائرکل بھوپال (۸) مولوی حافظ احمد صاحب رامپوری تشریف لائے۔ اور مولانا حکیم مسعود احمد صاحب و جناب حاجی شاہ سعید احمد صاحب و جناب مولوی مظہر حسین صاحب تشریف نہ لاسکے۔

پانچ روز تک سرگرمی کے ساتھ جلسہ ہوتا رہا۔ مدرسہ کے سالانہ حسابات تفصیل وتحقیق کے ساتھ جانچے گئے اور بعد جانچنے کے ممبران نے اُس پر دستخط ثبت فرمائے۔

اور خزانہ کی جو بہ تحویل جناب مولانا مولوی محمود حسن صاحب مدرس اول رہتا ہے پڑتال کی گئی۔ جو موافق اندراج کاغذات پورا نکلا۔ ممبران نے بعد پڑتال کتاب پر اپنے دستخط ثبت فرمائے۔

معاینہ مدرسہ

چند سال سے روداد مدرسہ میں معزز حضرات کے معائنے بھی نقل کیے جاتے تھے؛ مگر ۱۳۲۶ھ کی روداد میں بخیال اختصار درج نہیں کئے گئے۔ ۱۳۲۶ اور ۲۷ھ میں بہت سے مقتدر حضرات مدرسہ میں تشریف لائے اور حکام ذوی الاقتدار نے بھی مکرر مدرسہ کا معائنہ فرما کر اپنی رائے کتاب معائنہ پر تحریر فرمائی۔ تمام معائنوں کے پورا درج کرنے میں وقت طویل ہوتا ہے؛ اس لیے بعض معائنے بجنسہٖ اور بعض کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔ ناظرین ان معائنوں کو ضرور بغور ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ حکام ذوی الاقتدار اور مسلمانوں کے مقتدر حضرات نے مدرسہ کی نسبت کیسے خیالات کا اظہار کیا ہے اور کس طرح اس کی امداد کی طرف متوجہ کیا ہے، اِن معائنوں کے بعض خاص فقرات پر بغرض مزید توجہ خط کھینچ دیا گیا ہے۔

جناب مولانا مولوی انوار اللہ خاں صاحب حیدرآبادی

استاذ اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہ

میں نے آج اس مدرسہ کو دیکھا۔ طریقۂ تعلیم درست، اساتذہ اپنے فرائض منصبی میں نہایت مستعد، طلبہ

نہایت جفاکش اور سرگرم تحصیل علوم ہیں، علاوہ تحصیل علوم کے غیر مذاہب کی تردید کی تعلیم بھی عمدہ اُصول پر ہو رہی ہے۔ قرآن مجید فن تجوید کی پابندی کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے، جس کے سننے سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔ غرضیکہ تحصیل و تکمیل علوم کے جس قدر لوازم و ذرائع ہیں، بفضلہٖ تعالیٰ سب مہیا ہیں؛ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مدرسہ کی پوری ترقی اور کامیابی کے لیے امداد مالی کی اشد ضرورت ہے۔ حق تعالیٰ اہلِ اسلام کو توفیق عطا فرمائے کہ اس کی تائید کر کے مستحق اجرعظیم ہوں۔ فقط ۱۴ر رجب ۱۳۲۷ھ

جناب مولانا موصوف کی معیّت میں جناب مولوی حکیم محمود صاحب صمدانی و جناب سرفراز الدین صاحب و جناب ابو احمد خواجہ غلام غوث صاحب و جناب محمد اکرام علی صاحب بھی تشریف ہائے مدرسہ ہوئے تھے۔ سب حضرات نے مولانا کی اِس تحریر پر دستخط ثبت فرمائے۔

عالی جناب صاحب کمشنر بہادر قسمت میرٹھ

ٹرسٹیان مدرسہ عربیہ دیوبند نے جو مجھ کو اپنی تعلیم گاہ کے معائنہ کے لیے مدعو کیا تھا، اس کے منظور کرنے میں مجھ کو نہایت مسرت ہوئی۔ میں نے پیشتر بھی اِس مدرسہ کی بابت کچھ سُنا تھا؛ مگر میں اتنی بڑی اور ایسی سرسبز تعلیم گاہ کے دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھا، نہ مجھ کو یہ خیال تھا کہ میری ملاقات ان طلبہ کو کرائی جائے گی، جو یورپین، روس و ایشیائی روس و جملہ اقطاع ہند و متصلّہ خودمختار ممالک سے تحصیل علم کے لیے آئے ہوں۔ یہ امر نہایت قابل اطمینان ہے کہ مسلمان اِس مدرسہ کی بہت پوری امداد کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے بیرونی امداد کی ضرورت نہیں۔ میں اِس مدرسہ کے لیے ہر قسم کی کامیابی کے لیے دعاء کرتا ہوں۔ ۹ر دسمبر ۱۹۰۹ء

شیخ غلام محمد صاحب ڈاکٹر

ہر ایک صیغہ، فقہ، حدیث، فلسفہ، قرأت وغیرہ کی تعلیم بڑی خوش اسلوبی اور اسلامی طرز پر ہوتی ہے۔ میرے خیال میں اِس مدرسہ سے بڑھ کر اور کہیں دینی تعلیم ہوتی مشکل ہے۔ ظاہر اُطور پر اخراجات اسکول ایسے نظر آتے ہیں، کہ آمدنی جو سال میں ہوتی ہے کافی نہیں ہے، لہٰذا قوم کے ہر فرد و بشر کو یہاں کی امداد ضروری معلوم ہوتی ہے اور میں بھی حتی الامکان گاہ بگاہ امداد نذر کرتا رہوں گا اور جہاں ہو سکے گا مدرسہ ہٰذا کی امداد میں کسی طرح بھی دریغ نہ کروں گا۔

جناب مسٹر سیل صاحب بہادر جنٹ مجسٹریٹ سہارنپور

و چیرمین میونسپل بورڈ دیوبند

میں نے پہلے بھی مدرسہ کا کئی بار معائنہ کیا؛ لیکن آج پہلا موقعہ ہے کہ تمام عمارت کو دیکھوں اور طلبہ کو درسوں

کے اندر دیکھوں، عمارت کا کام بہت سرعت سے جاری ہے اور اس وقت ایک دارالطلبہ اور ایک مسجد تیار ہو رہی ہے۔ مؤخرالذکر آگرہ کے عمدہ نقش ونگار پتھروں سے تیار ہو رہی ہے اور موجودہ نقشہ نہایت ہی دلچسپ اور دلفریب معلوم ہوتا ہے۔ مجھے اِس بات کی خوشی ہے کہ یہ ایسے لوگوں کے زیر اہتمام ہے، جو نہایت اعلیٰ درجہ کے گورنمنٹ کے وفادار ہیں، اس وجہ سے گورنمنٹ کو اس کی طرف خاص توجہ کرنی چاہیے۔ میں جمعیۃ الانصار کے قواعد وضوابط کو دیکھ کر بہت ہی محظوظ ہوا۔

جناب مسٹر ڈی واسٹ صاحب بہادر لفٹنٹ کرنیل سِول سرجن سہارنپور

آج میں نے عربی اسکول کا معائنہ کیا اور جو کچھ میں نے دیکھا نہایت محظوظ ہوا۔ ایک نیا کتب خانہ زیر تعمیر ہے، اساتذہ نہایت خلیق ہیں، طلبہ تقریباً چارسو ہیں، جن میں سے بعض سنٹرل ایشیا اور یورپین روس کے ہیں۔

جناب مسٹر ڈبلیو گارڈن صاحب بہادر جنٹ مجسٹریٹ ضلع سہارنپور

آج صبح میں مشہور ومعروف عربک تھیوجیکل کالج دیوبند کو دیکھ کر بہت مسرور رہوا۔ وہ ایک درسگاہ ہے، جو عرصہ چالیس سال سے قائم ہے، اس کی شہرت عالمگیر ہے۔ جیسے کہ اس کے طلبہ کی جماعتہائے مختلفہ ظاہر کرتی ہیں۔ طلبہ کی تعداد چارسو ہے اور بعض روس اور وسطِ ایشیا جیسے دُور دراز ملک سے آئے ہیں۔ مکان مدرسہ ایک مستقل آبادی معلوم ہوتا ہے۔ اور کالج میں ایک عظیم الشان کتب خانہ ہے، جس میں نہایت قیمتی کتابیں موجود ہیں۔ کالج کے جملہ مصارف قومی چندہ پر مبنی ہیں، عمارت عمدہ اور خوبصورت وہوادار ہے؛ لیکن یہ بات قابل رحم ہے کہ جتنی زمین ان کو درکار ہے، اتنی میسر نہیں آتی۔ مجھے بتلایا گیا ہے کہ طلبہ کو تعلیم اور کمرہائے رہائش مفت دیے جاتے ہیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ایسے حقوق اس قسم کی دوسری درس گاہوں میں دستیاب نہیں۔ اور یہ اس وجہ سے قابل ستائش ہے۔ اس وقت ایک مسجد زیر تعمیر ہے، جو مدرسہ کی عمارت کے متصل اور اس کے احاطہ میں ہے، میں آئندہ کے لیے درسگاہ کے واسطے ہر قسم کی ترقی کا آرزومند ہوں۔

جناب مسٹر این آرسٹ صاحب بہادر انسپکٹر مدارس قسمت میرٹھ

میں نے نہایت خوشی کے ساتھ مینجر صاحب کی دعوت قبول کی، تاکہ مشہور مدرسہ کا معاینہ کروں اور میں تمام کو دیکھ کر نہایت محظوظ ہوا، عمارات عمدہ اور وسیع ہیں۔ کتب خانہ اور دارالمشورہ اب مکمل ہیں اور ایک عمدہ اور دلچسپ کتب خانہ عنقریب اپنی اصلی جگہ میں منتقل ہوگا جو اسوقت بطور درسگاہوں کے مستعمل ہیں۔ کتب خانہ میں بعض کتابیں بہت پُرانی ہیں، طلبہ کی اکثر جماعت مدرسہ میں اقامت پذیر ہے اور تمام کو چندہ سے مدد دی جاتی ہے۔ جماعت ہائے اعلیٰ کے طلبہ کو علمِ ہیئت وفلسفہ اور دوسرے مضمون پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہاں کئی ایک انجمنیں

ہیں، جن کو طلبہ نے منعقد کیا ہے، جن کی غرض اخلاقی اور تعلیمی ترقی ہے اور انہوں نے مہربانی سے اپنا کام معائنہ کرانے کے لیے دعوت دی ہے۔

صیغۂ تعلیم کو اِس مدرسہ کا ممنون ہونے کے لیے کافی دلیل ہے کہ وہ عمدہ عربی علماء پیدا کرتا ہے، جو مختلف سرکاری مدارس میں بطور مولوی کام کر رہے ہیں۔ مجھے ایک دفعہ مینجر اور ان تمام لوگوں کا جنہوں نے مدرسہ دکھلایا ان کے عمدہ اخلاق کا شکریہ ادا کرنے دیجیے۔

جناب مولوی امیر حسن صاحب ڈپٹی کلکٹر سہارنپور

آج بتقریب دورہ متعلقہ صیغہ بٹوارہ میرا گزر قصبہ دیوبند میں ہوا۔ اور میں نے مشہور مدرسہ عربیہ دیوبند کو نہایت شوق سے جا کر دیکھا، جس امر نے مجھ کو بحرِ تحیّر میں غوطہ زن کیا وہ یہ ہے کہ چند بوریہ نشین علماء کی مساعئ جمیلہ نے عام مسلمانوں کے چندہ سے ایک معمولی مکتب کو عظیم الشان عربی کالج کے پیمانہ پر پہونچا دیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے: کہ اس دار العلوم نے اپنے تئیں ایشیاء کا ویسا ہی مرکزِ علوم بنا رکھا ہے جیسا جامع از ہر نے افریقہ کا، ان خیالات نے میرے دماغ میں اسلامی دنیائے سلف کے مدارس، قرطبہ، بغداد، بخارا، سمرقند، نظامیہ وغیرہ کا نقشہ کھینچ دیا۔ جس کا ذکر میں نے تاریخوں اور سفرناموں میں پڑھا ہے۔ یہ ایسے ہی مدارس کا فیض اور ایسے ہی علماء کی تصانیف کی برکت ہے کہ اسلامی سلطنتیں مِٹ گئیں اور موجودہ حکومتیں معرضِ تزلزل میں ہیں؛ مگر اسلام بحیثیت ایک حقانی مذہب کے اپنی خالص وحدانیت کے ساتھ اُسی طرح قائم ہے جیسا ابتداء میں تھا اور ان شاء اللہ تا قیام قیامت قائم و برقرار رہے گا۔

الجملہ مدرسہ عربیہ دیوبند میں جملہ اقسام علوم اسلامی کی تعلیم و تعلم کا پورا انتظام ہے، اگر چہ رفتارِ زمانہ اس کی داعی تھی کہ علومِ دین کے ساتھ کچھ تعلیم انگریزی بھی دی جاتی؛ مگر اس میں شک نہیں کہ ایسا کرنے سے اس مدرسہ کی خصوصیّت اور ناموری خیرباد کہہ کر رخصت ہو جاتی۔

اگر ملک میں دس بیس مدرسے اس قسم کے اور قائم ہو جائیں، تو یقیناً علوم دین کی کساد بازاری دُور ہو جائے؛ مگر مسلمانوں میں ایسی ہمت کہاں! اگر دیگر مدارس نہ قائم کریں تو ایک اس ایک دار العلوم مذہبی کا قائم رکھنا ہر مسلمان کا فرض ہے اور اس کی آئے دن کی ضروریات کو بذریعہ عطاء چندہ رفع کرنا واجب ہے۔ دانہ دانہ سے انبار اور قطرہ قطرہ سے دریا ہو سکتا ہے؛ چنانچہ منتظمانِ مدرسہ نے اپنی غایت قابلیت انتظامی سے ایسا کر دکھایا ہے اور مدرسہ کے کارخانہ کو بفضلہٖ ایسی روز افزوں ترقی دے رہے ہیں کہ ہر بے تعصب دیکھنے والے کی زبان سے مرحبا احسنت بے اختیار نکل جاتا ہے۔ ایک وصف خاص جو اس مدرسہ میں معلوم ہوا، یہ ہے کہ اس مدرسہ

میں وفاداری گورنمنٹ عالیہ انگلشیہ کی مذہبی پیرایہ سے تلقین کی جاتی ہے۔ اور یہ مدرسہ بفضلہ تعالیٰ ہر قسم کی پولٹیکل شورشوں سے منزہ اور پاک ہے۔ یہ امر مسلمانوں کے لیے خاص طور پر باعثِ فخر ہے۔ آھ مختصر و ملتقط

عالی جناب حاذق الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب کا عربی معائنہ

الی زرت هذه المدرسة التی قد اسسها و بناها الفاضل البارع مولانا محمّد قاسم رحمه الله تعالیٰ بعد ستة و عشرین سنة وکان اوّل زیارتی فی زمانٍ کان الشیخ الفاضل مولانا محمد یعقوب رحمه الله فیه مدرسًا اوّلًا وکان متنفسًا فی کرة الحیوة وهی الاٰن ترقت الی الذروة العلیا مع قلة مبالاة المسلمین بشانها لان ابنیتها قد کثرت واشتاتها قد اجتمعت لتوجهٍ بدله اصحابها فی إصلاح شیونها وشدازرها وارجو الله أن یرقیها إلیٰ أعلی درجةٍ هی علیها الاٰن۔ إلیٰ حضرت جلسة الإرشاد التی کانت الطلبة قد انقسموا فیها إلیٰ قسمین وباحثوا فیما بینهم فی مسئلة الذبح ففرحت بسمه هٰذا البحث اللطیف وأظن لو دام لإفاد الطلبة والمسلمین فائدة عظیمة إلی اوجه انظار المدید إلیٰ نظافة المدرسة وإصلاح مایفرش فیها لأنّهما لایلیقان بشان المدرسة الاسف کل الاسف علیٰ ضیق الوقت وإلّا لَبَسَطْتُ افکاری المتعلقة.

جناب مولوی حافظ عبد الاحد صاحب و جناب ڈپٹی محمد حسین صاحب سہارنپوری

میں نے عالی جناب حاذق الملک کے ہمراہ معاینہ مدرسہ کیا۔ طلبہ بوجہ تعطیل باہر گئے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے تعلیم کا حاصل کچھ معلوم نہ ہوسکا؛ مگر میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ طلبہ کو مناظرہ میں مشق کرائی جاتی ہے۔ ایک مختصر مناظرہ میرے سامنے بھی ہوا۔

عالی جناب چودھری حاجی لیاقت حسین خاں صاحب مختصر

میں نے آج مدرسہ دیوبند کا معائنہ کیا۔ اِس مدرسہ کی عمارت نہایت مستحکم تیار ہوئی ہے اور جو کام اس وقت ناتمام ہیں، ان کی کوشش بلیغ ہورہی ہے کہ جلد تمام ہو۔ میرے روبرو قرآن شریف کچھ طلبہ نے پڑھا، جو نہایت قابل قدر قرأت سے پڑھایا جارہا ہے۔ ایک انجمن ہے، جو اسلام کے مخالفین کے جواب کے واسطے تیار کیجارہی ہے، جس سے بہت بڑا فائدہ اہلِ اسلام کو ہے۔ اس انجمن کی درخواست پر میں نے کچھ مناظرہ فریق اوّل وفریق دوم کا سُنا، جس سے مجھ کو ایک خاص خوشی حاصل ہوئی، اس جلسہ میں اِس کتب خانہ کی تعمیر کا شکریہ جناب قبلہ آنریبل نواب محمد یوسف علی خان صاحب مرحوم مغفور کا ادا کیا گیا، جو جناب ممدوح نے ایک رقم کثیر اس کتب خانہ کے واسطے اس مدرسہ کو دی تھی۔

چونکہ آنریبل نواب محمد یوسف علی خان صاحب کو اس مدرس سے ایک خاص تعلق تھا، اگر وہ کچھ عرصہ زندہ رہتے، تو بہت کچھ امداد اس مدرسہ کی فرماتے؛ چونکہ میں ایک اُن کے خادموں میں سے ہوں؛ اس لیے جناب موصوف کی طرف سے ایک ہزار روپیہ دینا مناسب خیال کرتا ہوں۔

عالی جناب و مولانا عبد الملک خان صاحب

خلف اکبر عالی جناب مولانا نصر اللہ خان صاحب مرحوم

مجھے ایک عرصہ سے اس مدرسہ کے دیکھنے کی آرزو تھی، بحمداللہ وہ پوری ہوئی۔ مدرسہ کی عمارت نہایت شاندار اور تعلیم علوم مذہبی وغیرہ باقاعدہ ہوتی ہے۔ عمارت دیکھنے کے لایق اور قابل قدر ہے۔ منتظمین مدرسہ نہایت خوش اخلاق ہیں۔ خداوند تعالیٰ ان کی برکت و توجہ سے ہمیشہ فیضان جاری رکھے۔

عالی جناب مسٹر فرگسن صاحب بہادر کلکٹر و مجسٹریٹ سہارنپور

میں مشہور و معروف درسگاہ کو دیکھ کر نہایت محظوظ ہوا۔ تمام لوگ نہایت محنت سے اپنے کام میں مصروف تھے، گروہا گروہ طلبہ موجود اور ایک جدو جہد کے اندر تھے۔ جو اصلیت و حقیقت کا ثبوت دیتی ہے۔ بوجہ ہجوم طلبہ و دیگر اُمور بہت کوشش ہو رہی ہے، جن کی نسبت میں کامیابی کی اُمید رکھتا ہوں۔

جناب ابراہیم شاہ صاحب ساکن جبل پور۔ باختصار

میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے چوبیسویں سالانہ جلسہ کی غرض سے اپنے وطن جبل پور سے لاہور گیا۔ عرصہ سے مدرسہ دیو بند کے دیکھنے کا اشتیاق تھا، لہٰذا واپسی میں ۱۹/اپریل کی شام کو جناب حافظ احمد صاحب مہتمم مدرسہ کا مہمان ہوا۔ مدرسہ کا معائنہ کیا۔ الحمد للہ یہاں کی کیفیت دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی۔ یہ بالکل دینی مدرسہ ہے، اس میں نئی روشنی کی ہوا نہیں لگی۔ یہاں کے جملہ مدرسین باشرو پابند مذاہبِ اسلام ہیں، خصوصاً جناب مولانا محمود الحسن صاحب صدر مدرس اللہ کے پاک مخلص بندوں سے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں کے طلبہ باوجودیکہ بہت دُور دراز شہروں کے رہنے والے ہیں؛ مگر وضع ولباس سب کا شرعی ہے اور پابند صوم وصلوٰۃ ہیں۔ بہت بڑی تاکید اس امر کی ہے کہ طالبِ علم بے شرع کام نہ کرنے پائیں۔ تعلیم باقاعدہ دی جاتی ہے۔ طلبہ کی تعداد ندا کر رہی ہے کہ عمارت مدرسہ جلد بڑھائی جائے۔ یہ اسلامی مدرسہ زیادہ تر اس کا محتاج ہے کہ اہلِ اسلام اللہ کے واسطے امدادِ کثیر فرمائیں؛ اس لیے کہ طلبہ کی خوراک ولباس وغیرہ کا بار بالکل مدرسہ پر ہے۔

مولوی عبدالکریم صاحب سوداگر چرم علاقہ ٹونک۔ مختصراً

مجھ کو برخوردار حافظ عبدالرحمٰن کی فکر تعلیم نے مجبور کیا، کہ میں نے خود مدارسِ عربیہ کو دیکھ کر کسی کو اس کے لیے منتخب کروں؛ چنانچہ مدارسِ عربیہ کو دیکھتا بھالتا۔ ۱۴ر صفر ۲۷ھ کو مشہور و معروف مدرسہ عالیہ دیوبند میں پہونچا۔ خوش قسمتی سے مجھ کو اس جگہ دو شبانہ روز سے زیادہ قیام کرنے اور اس مذہبی درسگاہ کو تفصیلی نگاہ سے دیکھنے کا کافی موقعہ ملا۔ ماشاء اللہ مدرسہ کی شانِ عمارت اور اس کی ہر ہر چیز کو اس سے زیادہ قابل ستائش اور تحسین پایا، جیسا کہ سُنا کرتا تھا۔

میں حضرات منتظمین مدرسہ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ میں نے جملہ مدرسین وطلبہ کو خوش اخلاق متقی پایا۔ فللّٰہ الحمد۔ اس موقعہ پر میں اپنے سچے بہی خواہ اسلام حضرات منتظمین مدرسہ ہٰذا کی شفقت آمیز توجہ کو جدید دارالاقامہ کی بنیاد ڈالنے کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں؛ کیونکہ موجودہ دارالاقامہ کسی صورت میں موجودہ طلبہ کے واسطے کافی نہیں ہے۔

اس کے علاوہ مطبخ قائم کرنے کی درخواست کرتا ہوں، کہ ان غریب الوطن طلبہ کو بجائے وظیفہ کے مدرسہ عالیہ سے کھانا دیا جائے، اس موقعہ پر ہمدردانِ اسلام کو بھی ترغیب دلانے کی جرأت کرتا ہوں۔

عالی جناب مولوی مشفع احمد صاحب ڈپٹی کلکٹر ضلع مظفر نگر۔ باختصار

آج صبح میں اِس درسگاہ میں حاضر ہوا، جس کا عرصہ ہائے دراز سے باوجود یہ کہ میں تذکرہ سنتا تھا؛ لیکن بھلی اور بُری دونوں افواہوں نے آج سے پہلے مجھ کو اس مدرسہ کی طرف سے کچھ بدعقیدہ سا کر رکھا تھا۔ اور اس تنگدلی نے فی الواقع تحقیق کی طرف بھی رجوع نہ ہونے دیا۔

میں نے مدرسہ کے ہر گوشہ، ہر کمرہ، ہر درجہ کو دیکھا، ہر اُستاد سے ملا اور بعض طلبہ و اساتذہ سے مختلف قسم کی گفتگو کی۔ میں نے ان میں ایثار و اخلاق پایا اور زیادہ پایا، جس کی کمی میں سنتا تھا۔ میں نے مدرسہ کی عالی شان و مضبوط عمارت کو باقاعدہ پایا، جس کی ترقی ہنوز جاری ہے۔ اس میں اُصولِ حفظانِ صحت کے موافق ہر ضروری بات موجود ہے۔ دارالاقامہ جس قدر بھی ہے (اگرچہ کافی ہے) اس میں بجز بعض کمروں کے اُمید سے زیادہ صفائی و سامان آرائش موجود ہے۔ لاجواب کتب خانہ کو بہت تھوڑا میں دیکھ سکا۔ اور جس قدر دیکھا، اس سے اسلامی شان کی جھلک پائی گئی۔ ایک نوعمر حافظ قرآن نے میرے دل کو بے چین کر دیا اور بفضلہ تعالیٰ اب شکوک باقی نہیں ہے اور بلاخوف تردید میں اس درس گاہ کو ہندوستانی قرطبہ یا جامع ازہر کہنے کو تیار ہوں۔ ایسی قدیم اور عالی شان مشرقی درسگاہ کے بدگویاں کا منہ روکنے والا بحمدہٖ پہلا شخص میں ہوں گا۔

اس حاضری مدرسہ کے موقع پر میرے بعض دوستوں نے پچاس روپیہ پیش کیے ہیں، جو نذر کرتا ہوں اور

علاوہ بریں ایسے دو طلبا کو جو اس سال امتحان میں سب سے زیادہ نمبروں پر بالخصوص حدیث میں اور تفسیر میں پاس کریں دو جیبی گھڑیاں ایک میری طرف سے اور ایک میری بی بی کی طرف سے بطور یادگار دی جائے، تیس روپیہ پیش کرتا ہوں اور میں اراکین مدرسین کو شکریہ کے ساتھ خدا حافظ کہتا ہوں۔ والسلام

ترجمہ معاینہ عالی جناب سیّد ضمیر الدین صاحب

چیف سکریٹری حضور فرمانروائے بھوپال۔ مختصر

خوش قسمتی سے مجھ کو مدرسہ دیوبند کے دیکھنے اور اُس کے طلبہ کو قرآن مجید پڑھتے ہوئے اور عربی میں تقریریں کرتے ہوئے سننے کا موقعہ ملا۔ انہوں نے نہایت قابل تعریف پیرایہ میں اپنی تقریروں کو انجام تک پہنچایا۔ اور ہندوستان میں مشرقی تعلیم کا ایک بے نظیر سماں دکھلا دیا۔ ان قلیل التعداد مدارس عربیہ کے متعلق جو ہندوستان میں موجود ہیں، یہ شکایت بالعموم کی جاتی ہے کہ اُن میں تعلیم پائے اشخاص اپنے خیالات کا عربی میں اظہار نہیں کر سکتے۔ لیکن اس مدرسہ کے طلبہ نے اس عام طور پر پھیلے ہوئے خیال کی پوری طرح تکذیب کر دی اور اپنی عربی تقریروں کے انداز سے اچھی طرح ثابت کر دیا کہ وہ نہایت آسانی اور روانی کے ساتھ گفتگو کرنے کے عادی ہیں۔ میں اس تعلیم گاہ کے اساتذہ اور منتظمین کو مبارک باد دیتا ہوں اور مسلمان پبلک اور والیان ریاست کی فیاضی سے اپیل کرتا ہوں کہ اس مدرسہ کی معقول مالی اعانت کریں؛ کیونکہ کوئی تعلیم گاہ خواہ کیسی ہی کامیاب کیوں نہ ہو بغیر روپیہ سرسبز نہیں ہو سکتی، مسلمان جو اپنے مذہب کے اس قدر شایق ہوتے ہیں، اگر اعانت و امداد کی آواز کی مستعدی سے جواب نہ دیں گے، تو وہ ثابت کر دیں گے کہ وہ اُن اُصولِ اسلام میں قاصر ہیں جو ایک انسان کو پکا مسلمان بناتے ہیں۔

ساتھ ہی میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ تعلیم گاہ کے منتظمین اس پر اچھی طرح غور فرمائیں گے اور اس کے مفہوم کو اس پیرایہ میں لیں گے جس میں وہ کہی جاتی ہے۔ میرا اشارہ مالی ذرائع سے انتظام کی طرف ہے۔ اب تک تعلیم گاہ کی آمدنی کا روپیہ زیر حفاظت رکھا جاتا ہے اور اس سے کوئی کام نہیں لیا جاتا۔ سالانہ بچت کے روپیہ کو کسی نفع کے کام میں لگانے کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے، جب تک زر پس انداز شدہ کو کسی مفید موقعہ پر خرچ کرنے کا طریقہ تجویز نہ کیا جائے گا، تعلیم گاہ کی پائیداری قابل تیقن نہیں ہو سکتی، مجھ کو اُمید ہے کہ منتظمین براہِ عنایت اِس امر کی طرف خاص طور پر توجہ کریں گے۔

حسابات مدرسہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ تعلیم گاہ انتہائی کفایت شعاری کے اُصول پر چلائی جا رہی ہے۔ سالانہ بچت کی مقدار اچھی ہے، گو پوری قابل اطمینان نہیں ہے۔ آمدنی کے ذرائع کچھ بھی نہیں ہیں۔ دونوں

(ریاست حیدرآباد و بھوپال ادامہا اللہ تعالیٰ) درباروں کے عطیات کے علاوہ دیگر چندوں کی شرح بہت ہی غریبانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آمدنی کی حالت نا قابل اطمینان ہے اور سالانہ بجٹ بھی پوری قابل اطمینان نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس تعلیم گاہ کی مالیات کو کسی قابل اطمینان بنیاد پر قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔ تعلیم گاہ کی مد تعمیر میں روپیہ آمدنی سے زیادہ خرچ ہو چکا ہے اور ایسی متعدد تعمیرات کی اشد ضرورت ہے، مجھ کو اُمید ہے کہ فیاض مسلمان آگے بڑھ کر اس ضرورت کو پورا کریں گے۔

قابل اور ممتاز طلبہ کو انعام عطا کرنے کے لیے اب تک مدرسہ میں کوئی مد نہیں ہے۔ میرے خیال میں اس مد کے لیے روپیہ جمع کرنے کی کوشش جلد ہونی چاہیے۔ مجھ کو یقین ہے کہ توجہ دلانے پر فیاض مسلمان مستعدی کے ساتھ آگے بڑھ کر اعانت کریں گے۔

علاوہ مذکورہ بالا راویوں کے اور بہت سی رائیں درج کتاب معائنہ ہیں، بوجہ طول اِنہیں پر اکتفا کیا گیا۔

انتقال جناب مولوی عبدالصمد صاحب مدرّس مدرسہ ہٰذا

مولوی عبدالصمد صاحب مدرسہ دیوبند کے عمدہ و مستند ذکی و قابل عالم مدرسہ ہٰذا کے فارغ التحصیل علماء میں سے تھے۔ دیوبند سے فراغت حاصل کرنے کے بعد نہٹور، نگینہ، سہارنپور اور روڑکی کے مدارسِ اسلامیہ میں مدرس رہے۔ شوال ۲۴ میں روڑکی سے دیوبند بلائے گئے اور بجائے مولوی محمد یٰسین صاحب مرحوم شیرکوٹی کے مدرس مقرر کیے گئے مولوی صاحب موصوف بسی کرتپور کے رہنے والے ایک برہمن خاندان سے تھے۔ ابتداءِ عمر میں اسلام کی محبت قلب میں راسخ ہوگئی تھی۔ اسلام لانے کے بعد وطن کو ترک کر کے تحصیل علم کی اور نگینہ ضلع بجنور میں اقامت اختیار کی۔ نگینہ ہی میں جناب حافظ عبدالکریم صاحب کے یہاں آپ کی شادی ہوگئی تھی۔ مولوی صاحب موصوف ایک نہایت لایق اور مستند ذکی و مستعد عالم تھے تحریر و تقریر میں بہت عمدہ ملکہ رکھتے تھے۔ طلبہ ان سے بہت مانوس و مربوط رہتے تھے۔ انجمن الارشاد طلبہ مدرسہ ہٰذا کے ناظم و منتظم بھی تھے۔ جلسہ دستار بندی میں شریک ہوئے۔ عمامہ و سند اساتذہ کے ہاتھ سے حاصل کیے۔ الغرض! مولوی صاحب موصوف ایسے ہونہار اور لایق مدرس تھے جو کارِ تعلیم کے علاوہ اور بھی ہر قسم کی خدمات مدرسہ کی کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ جس قسم کی اُمیدیں مولوی صاحب موصوف کی ذات سے وابستہ تھیں پوری نہ ہونے پائیں اور چند ماہ عارضہ تپ و کھانسی میں مبتلا رہ کر بمقام بجنور ۱۹رجمادی الاولیٰ ۱۳۲۸ء مطابق ۲۷رجون ۱۰ء یوم دوشنبہ کو انتقال فرمایا۔ اور وہیں مدفون ہوئے۔ انّا للہ وانّا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ مولوی صاحب موصوف کی مغفرت فرمائے اور آپ کے صاجنرادہ میاں عبدالاحد کو علم باعمل نصیب فرمائے۔ آمین

قوانین متعلّقۂ اہلِ شوریٰ

(۱) اہلِ شوریٰ مسلمہ اہل چندہ ہیں ۔ اور ابتداء مدرسہ سے اُن کے اعتماد پر چندہ آتا ہے اور کیفیات سالانہ میں ان کے دستخط ہوتے ہیں یا جو اور بزرگوار باتفاق اہلِ شوریٰ زمرۂ اہلِ مشورہ میں داخل ہوں اگر ان میں سے کوئی شخص کسی وجہ سے کم ہو جائے تو بشرط ضرورت اس کی جگہ جدید شخص حسبِ انتخاب و اتفاق اہلِ مشورہ مقرر ہوگا۔ عموماً اہلِ مشورہ کا تجربہ کار اور اہلِ صلاح میں سے ہونا ایک ضروری امر خیال کیا جائے گا۔ اور یہ ضرور نہیں کہ جملہ اہلِ مشورہ باشندگان دیوبند ہی ہوں؛ بلکہ بیرونجات سے بھی لایق لوگ شامل اہلِ مشورہ ہو سکتے ہیں ۔ بشرطیکہ اُن کو شریک جلسہ ہونے کا یا درصورت کسی عذر کے تحریری رائے دینے کا حتی الوسع التزام واہتمام ہو۔

(۲) تجویز اہلِ مشورہ درباب تقرر و ترقی و تنزل و موقوفی ملازمان و مدرسان مدرسۂ ہٰذا اور خرچ کرنے زرچندہ و دیگر انتظامات مدرسہ کے قطعی ہوگی؛ مگر بڑے اُمور میں حتی الامکان رائے جملہ اہلِ مشورہ کی تقریراً یا تحریراً ضرور ہوگی ۔ اور یہ بات لازمی سمجھی جائے گی کہ جملہ اہلِ مشورہ سے رائے طلب ہو۔

(۳) تغیّر و تبدّل اہلِ شوریٰ و مہتمم و مدرسان عربی ہمیشہ درج کیفیت سالانہ ہوا کرے گا۔

قوانین متعلّقۂ مہتمم مدرسۂ ہٰذا

(۱) تقرر و تبدّل و رخصت و موقوفی مہتمم باختیار اہلِ مشورہ ہے؛ لیکن اہلِ مشورہ کو درباب تقرر مہتمم بہت غور اور فکر اور دُوراندیشی چاہیے ۔ مہتمم ایک مدبّر اور تجربہ کار ذی استعداد امانتدار شخص ہونا چاہیے، جس میں قوتِ انتظامیہ پوری ہو اور ہر طرح سے لایق اطمینان و اعتماد اور قدردان اہلِ علم ہو۔

(۲) مہتمم صاحب جملہ محرران و ملازمان مدرسہ و دفتر کی درستی حساب و کتاب و ترتیب دفتر کے ذمہ دار اور مدرسان کی حاضری اور تعلیم کی درستی وغیرہ کی ذمہ داری اور نگرانی بھی ان کا کام ہے ۔ مہتمم صاحب کو اس کا بھی لحاظ ضروری ہے کہ قواعد متعلقہ تعلیم طلبہ و نقشہ جات تعلیم و داخل خارج وغیرہ متعلقہ طلبہ کی تعلیم پوری ہوتی ہے یا نہیں اور خصوصاً اُن طلبہ کے حال کی نگرانی جو مکان مدرسہ میں سکونت رکھتے ہیں اور اُن کے حجرات کے تغیّر و تبدّل کا خیال لازم ہوگا تاکہ طلبہ میں کوئی شورش اور فتور اور بے تہذیبی واقع نہ ہو۔

(۳) اُمورِ انتظامیہ اور مصارف معمولی روزمرّہ میں مہتمم صاحب مجاز ہیں جو مناسب سمجھیں وہ کریں اور جزوی غیرمعمولی خرچ بھی اپنے اختیار سے کر سکتے ہیں؛ مگر کثیر اخراجات غیرمعمولی اور کسی خاص انتظام میں اہلِ مشورہ سے منظوری لینی چاہیے ۔ مہتمم صاحب مجاز ہیں کہ مدرسان و ملازمان کو بشرط استحقاق و عدم حرج کار کے چھ ماہ میں

رخصت ایک ہفت کی بتفاریق یا ایک بارگی حسب قواعد دے دیں؛ لیکن زیادہ رخصت دینے میں منظوری اہلِ مشورہ ضروری ہے۔

آئین رخصتِ ملازمانِ مدرسہ ہٰذا

اس عنوان کے تحت حسب سابق اُصول درج ہیں۔ (حسبِ سابق یعنی جو پچھلی روداد میں پیش کیے جاچکے ہیں)

ذکر قوانین متعلّقہ انتظام ہٰذا و وقت درس و تعطیلات وغیرہ

یہاں بھی حسبِ سابق اُصول وضوابط درج ہیں۔

آئین تقرّر خوراکِ طلبہ

یہاں بھی حسبِ سابق اُصول وضوابط درج ہیں۔

ضوابط متعلقہ خواندگی عربی و داخلہ طلبہ عربی مدرسہ ہٰذا

یہ ضوابط بھی حسبِ سابق ہیں۔

قواعد متعلقہ خواندگی فارسی و ریاضی و قرآن شریف و داخلہ طلبہ

یہ ضوابط بھی حسبِ سابق ہیں۔

ذکر آئین اقسام چندہ

حسبِ سابق اقوال ہیں۔

.....❖.....

قارئین! اگر آپ نے دلچسپی، دل جمعی اور توجہ کے ساتھ یہ روداد پڑھی ہے تو آپ کے شعور پہ یہ بات واضح طور پر عیاں ہوگئی ہوگی کہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کا طرزِ نگارش کس درجہ بلندیٔ کمال لیے ہوئے ہے۔ روداد کے پہلے ہی صفحہ سے مہتمم صاحب کا قلم اُمت کے انتشار و بے ترتیبی کی فکر میں اتحاد و اتفاق کی جو پُرسوز اپیل کرتا ہے اور جس ادیبانہ انداز میں اپنی بات کو امت کا درد رکھنے والے دردمندوں کے سامنے ظاہر کیا گیا ہے وہ روداد کے آخری صفحہ تک قائم ہے۔

کیا ابتدائی مضمون پڑھ کر ایسا نہیں لگتا جیسے یہ تحریر دَورِحاضر کے مسلمانوں کا حال بیان کرنے کے لیے لکھی گئی ہو۔ اسے کہتے ہیں تحریر کی جامعیت۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ تحریر آج سے ایک سونو (۱۰۹) سال قبل لکھی گئی ہے۔ ہر لفظ، ہر سطر دَورِحاضر کے مسلمانوں کی تصویر پیش کر رہی ہے۔

ابتدائی مضمون کے علاوہ روداد کے دیگر عناوین بھی قابل غور ہیں، ہم یہاں الگ الگ ہر ایک عنوان کی اہمیت اور طرزِ نگارش پر کلام کر کے مزید صفحات سیاہ نہیں کریں گے۔ آپ خود ہی محسوس کیجیے کہ مولانا حبیب الرحمٰن کے آتے ہی روداد کا رنگ ڈھنگ کیا بدل گیا ہے۔ یہ فقط ایک سالانہ گوشوارہ نہیں؛ بلکہ علمی متاع کے ساتھ ساتھ امتِ مسلمہ میں دارالعلوم کی عظمت و اہمیت کو مستحکم کرنے کا مضبوط ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ اس روداد میں آپ نے دیکھا، ایسا بہت کچھ ہے جو اس سے پہلے کبھی کسی روداد میں پیش نہیں کیا گیا۔ یہی وہ انتظامی صلاحیت ہے جس کی وجہ سے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کا دَورِاہتمام دارالعلوم کی تاریخ کا سب سے سنہرا دَور کہا جاتا ہے۔ اسی لیے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام آج تک لوگوں کی زبانوں پر ہے۔ اور ایسے فعال و یکتا مہتمم کو اس دَور کی تاریخ مرتب کرنے والے فقط سوا سال کا مہتمم لکھ کر تاریخ سے آنکھیں چرانے کا کام کر رہے ہیں۔

اطمینان وسکون کے ساتھ غیر جانب دار ہو کر سوچیے کیا ایسی ہی تاریخ مرتب ہونی چاہیے تھی دارالعلوم دیوبند کی، جیسے کہ محمد اللہ صاحب نے مہتمم مفتی ابوالقاسم صاحب کے کہنے پر کی ہے؟ کیا زیرِتبصرہ کتاب تاریخ گوئی کے فن پر ایک بدنما داغ نہیں؟

.....❖.....

انسان جب اخلاصِ نیت کے ساتھ حق بات کہنے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ رب العزت کس کس طرح اس کی مدد کرتے ہیں یہ وہ لوگ بہ خوبی جانتے ہوں گے جنھوں نے تنگ دستی و نامساعد حالات میں چراغِ حق روش کیا۔ کبھی کبھی تو رب السمٰوات والارض کی نصرت و امداد اتنی آسانی پیدا کر دیتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فرشتے مدد کرتے ہوئے راہ نمائی فرما رہے ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے دَورِ اہتمام کی اہمیت اور ان کی بصیرت افروز انتظامی صلاحیت کے بارے میں مضبوط دلائل کے ساتھ اتنا کچھ پیش کر چکا ہوں کہ اب مزید ضرورت باقی نہیں رہی؛ لیکن اللہ رب العزت کا ہزار ہزار شکر ہے، اس موضوع کو ختم کرتے ہوئے کتاب کے آئندہ صفحات کا جائزہ شروع کرنے ہی والا تھا کہ اچانک مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی عظمت اور ان کی انتظامی صلاحیت کو سلام کرتی ہوئی ایک نہایت معتبر تحریر سامنے آگئی۔ یہ تحریر مولانا اسحاق صاحب قاسمی کی ہے، جو ایک کتابچے کی شکل میں شائع کر کے تقسیم کی گئی تھی، جس کو دارالعلوم کے مہتمم حضرت قاری طیب رحمۃ اللہ علیہ کو مخاطب کر کے لکھا گیا تھا۔ مولانا اسحاق صاحب دیوبند کے معروف و قدیم کتب خانہ رحیمیہ کے مالک تھے اور قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ کے دوستوں میں جانے جاتے تھے۔ آپ نے دارالعلوم کی ترقی و استحکام کے لیے مہتمم صاحب کے سامنے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے نقوش و اصول پیش فرمائے ہیں۔ آپ بھی ملاحظہ کیجیے، ہمیں یہ کتابچہ اپنی لائبریری کی قدیم کتابوں کے اندر سے ملا، بلاشبہ یہ نصرتِ خداوندی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

....

حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہٗ مہتمم حال دارالعلوم دیوبند کی تحریر، گزارشِ احوالِ واقعی
صفحہ نمبر ۴۶، ۴۷ کے مطالبہ پر

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحبؒ

استاذ حضرت شیخ الاسلام، علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا اعزاز علی صاحب، مولانا عبدالسمیع صاحب، علامہ بلیاوی وغیرہ حضرات اساتذہ دارالعلوم دیوبند سابق مہتمم وقائد و زعیم امیر جماعت دیوبندیہ کے رہنما خطوط کی روشنی میں چند تجاویز جو مدارسِ عربیہ کے لیے بالعموم اور دارالعلوم دیوبند کے لیے بالخصوص مشعلِ راہ ہیں

بگرامی حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند لازالت فیوضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج اقدس! حضرت والا کا مضمون گزارش احوال واقعی نظر سے گزرا۔ اس میں ص ر ۴۶ وص ر ۴۷ پر یہ مضمون درج ہے کہ اگر واقعی نظام دارالعلوم میں کچھ نقائص ہیں اور کچھ نہ کچھ ضرور ہوں گے الخ جو اُمور واقعی اصلاح طلب سمجھے جائیں اور یقیناً ایسے اُمور ہوں گے ان کی ایک فہرست نمبر وار بنا کر دفتر اہتمام میں بھیج دی جائے الخ اب سوال طلب امر یہ ہے کہ یہ تحریر عام ہے یا مولانا اسعدؔ صاحب کے ساتھ مخصوص ہے؛ چونکہ ان کے جواب سے اہتمام کی جان بچتی ہے۔ اور اگر کوئی شخص یہ باتیں لکھ کر بھیجے تو آپ وہاں کے وہاں ہی کھڑے ہیں۔ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ مولانا اسعد صاحب اور ان کے ہم نوا لوگوں کو اہمیت دیتے ہیں، چنانچہ اجلاس صد سالہ کا ریکارڈ اس کا شاہد ہے کہ آپ نے بڑے سے بڑے عالم کو وہ وقعت نہیں دی جو ان کو دی گئی۔ بہرحال اپنے زعم میں یہ خیال کرتے ہوئے کہ دارالعلوم تمام مسلمانوں کی مقدس امانت ہے۔ چند توجہ طلب اُمور پیش خدمت ہیں۔ اگر کوئی بات مفید معلوم ہو تو اس پر توجہ مبذول فرمائیں۔

(ا) مدرسہ تعلیم وتعلّم کا نام ہے جس زبان یا مذہب کا مدرسہ ہو اسی کی تعلیم سے بحث ہوگی۔ انتظامیہ اور مالیات تعلیم وتعلّم کو فروغ دینے کے ذرائع واسباب ہیں۔ اب اگر تعلیم بلند و بالا ہے تو کہا جائے گا کہ مدرسہ ترقی پر

ہے خواہ اخراجات کتنے ہی ہوں ۔ پروپیگنڈہ ہو یا نہ ہو اور اگر تعلیمی حالت اَبتر ہو تو کہا جائے گا کہ مدرسہ تنزل پذیر ہے ۔

(۲) جیسا کہ امتِ مرحومہ کے متعلق یہ اُصول مسلمہ ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کا راز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباعِ اُسوۂ حسنہ میں مضمر ہے اسی طرح مرکزِ علومِ دینیہ دارالعلوم دیوبند کا حال ہے کہ اس کو جس قدر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب، حاجی محمد عابد صاحب، مولانا فضل الرحمٰن عثمانی صاحب، حاجی امداد اللہ صاحب اور دیگر اکابر دارالعلوم کے رویہ پر چلایا جائے گا تعلیمی ترقی کرے گا، جس قدر ان حضرات کے رہنما خطوط سے روگردانی کی جائے گی، اسی قدر یہ اپنی اساس اور مرکزیت سے دُور ہوتا چلا جائے گا۔ ان حضرات کا امین دارالعلوم کا محسن اعظم ایک شخص دارالعلوم کی تاریخ میں گزرا ہے **حبیب الرحمٰن عثمانی**، اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے آمین ثم آمین ۔ اس نے اپنے اساتذہ سے جو دارالعلوم کی مرکزیت اور تعلیمی بلندی کے لیے اُصول موضوعہ حاصل کیے ان پر عمل کر کے دارالعلوم دیوبند کو بلندی کے آخری عروج پر پہنچایا۔ چنانچہ اس کے تیار کردہ اساتذہ میں آخری کڑی علامہ ابراہیم بلیاوی کی وفات کے بعد مدرسہ انحطاط ہی انحطاط کی طرف رواں دواں ہے، آج ان کو حضرت مولانا محمد طیب صاحب ایک خود ساختہ داستان کی حقیقت کے ص ر ۴ پر مددگار مہتمم بتاتے ہیں ۔ مولانا اسعد صاحب "داستان حقائق کے آئینہ میں" کے ص ر ۲۳ پر کون کیا ہے کے ذیل میں انگریز کا وفادار بتاتے ہیں ۔ یا للعجب عام دارالعلوم کے طلبہ کو فاضلین دارالعلوم کی اپنی اپنی تنظیم کرنے والے یہ دونوں حضرات اپنی طرف تو بتلاتے ہیں، مگر محسن اعظم کے اخلاص وللّٰہیت کی قدر اس کے رہنما اُصول کی پیروی تو کیا کرتے اس کے اُصول اور رہنما خطوط کو قابل اعتناء بھی نہیں سمجھتے ۔ میں سب حضرات کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ امت میں حضرت مولانا شاہ عبدالقادر جیلانی گزرے ہیں، جنہوں نے فرمایا: قدمی علی رأس کل اولیاء اللّٰہ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ میں حبیب الرحمٰن عثمانی کا قول تھا: کون علامہ انور شاہ ۔ کون شبیر احمد ۔ حبیب الرحمٰن کا قلم حبیب الرحمٰن کی زبان علامہ انور شاہ وشبیر احمد ہے وغیرہ وغیرہ ۔

میں اپنی طرف سے نہیں کہتا دیکھئے نقشِ حیات جلد اوّل ص ۸۷ مولانا محمد طیب صاحب اور مولانا اسعد صاحب دونوں کے مسلمہ بزرگ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کیا تحریر فرماتے ہیں ۔ نقشِ حیات کے ص ر ۴۵ پر مولانا حبیب الرحمٰن سے مولانا حسین احمد صاحب کا مقاماتِ حریری اور دیوانِ متنبی پڑھنا درج ہے ۔ مولانا حسین احمد صاحب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کے شاگرد تھے ۔ نقشِ حیات ص ر ۸۷ پر مولانا حسین احمد صاحب لکھتے ہیں: اس زمانہ میں حضرت استاذ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی دیوبندی وہاں ہی خانقاہ میں رہتے تھے اور مشاغل سلوک کے انہماک کے ساتھ حضرت قطب عالم رحمۃ اللہ علیہ کی ڈاک کی خدمات بھی انجام دیتے تھے ۔ جب ہم دونوں وہاں پہنچے تو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم نے دونوں کو یہ کہہ کر پیش کیا کہ مولوی صدیق احمد

صاحب نے اپنے دونوں بھائیوں مولوی سید احمد اور حسین احمد کو بیعت ہونے کے لیے بھیجا ہے وہ حاضر ہیں الخ۔ بہر حال ہم دونوں پیش ہوئے تو کچھ پس و پیش نہیں فرمایا مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے پیش فرمایا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بیعت فرمالیا۔ (نقش حیات: ج ۱/ص ۷۸)

علامہ انور شاہ صاحبؒ نے جو تعریف مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی دیوانِ حماسہ کی تقریظ میں کی ہے، ملاحظہ فرمائیے۔ مولانا اعزاز علی صاحب کیا لکھتے ہیں دیوانِ متنبی کے حواشی کا مقدمہ ملاحظہ فرمائیں۔ ان کے علاوہ موجودہ ممبر دارالعلوم دیوبند اور ۱۳۴۲ھ کے طالبِ علم مولانا منظور احمد صاحب نعمانی سنبھلی الفرقان اگست ۱۹۷۳ء جس کی نقل ماہنامہ تعمیر سیرت مالیر کوٹلہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۷۷ء میں کی ہے۔ یوں رقم طراز ہیں: ”حبیب الرحمٰن عثمانی صاحب کو اس وقت کاغذات میں نائب مہتمم دارالعلوم ہی لکھا جاتا تھا اور ضابطہ میں ان کا عہدہ اور منصب یہی تھا؛ لیکن فی الحقیقت وہی مہتمم تھے۔ ایک دفعہ دارالعلوم کی میری طالبِ علمی ہی کے زمانے میں ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں اپنے کو دارالعلوم کا نائب مہتمم ہی کہتا اور لکھتا ہوں؛ لیکن واقعہ یوں ہے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے جب مجھے اس خدمت کے لیے مامور کیا تھا تو مجھے نائب مہتمم نہیں؛ بلکہ مہتمم ثانی بنایا تھا۔ بہر حال ہر قسم کی ذمہ داری اور عمل دخل کے لحاظ سے وہی اس وقت دارالعلوم کے مہتمم تھے اور حق یہ ہے کہ مثالی مہتمم تھے ہر طرف سے یک سُو ہو کر صرف دارالعلوم ہی کو انھوں نے اپنی زندگی کا مصرف اور موضوع بنالیا تھا۔ دارالعلوم کا دارالاہتمام یا دفترِ اہتمام ہی ان کا مسکن تھا“ الخ۔

غرضیکہ اجمالاً ہماری گزارش کا مقصد یہی ہے کہ مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی عالم اسباب میں دارالعلوم کو بامِ عروج پر پہنچانے والے بزرگ ہیں ان کے رہنما خطوط دارالعلوم میں موجود ہیں ان کے تیس سالہ دَورِ اہتمام میں جو دارالعلوم نے علمی ترقی کی اور آج جو تعلیمی حالت ہے، اس کو واپس لانے کے لیے ان کے رہنما خطوط ہی دارالعلوم کی رہبری کر سکتے ہیں۔ انھوں نے دارالعلوم کو عالم اسباب میں مرکزِ علم بنایا اور آج مکتب سے پھر مرکز بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے رہنما خطوط کو سامنے رکھ کر ان پر عمل کیا جائے تاکہ دارالعلوم کی مرکزیت اور مسلکِ دیوبند جس کے متعلق اسی مقالہ میں مولانا منظور احمد صاحب نعمانی رقم طراز ہیں۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اس دَور میں صرف دارالعلوم کے مہتمم اور انتظامی افسر ہی نہیں تھے؛ بلکہ واقعہ یوں ہے کہ پوری جماعت کے زعیمَ و قائد ترجمانَ اور گویا غیر رسمی امیر کا مقام بھی ان کو حاصل تھا ہر اہم معاملہ میں وہی پالیسی طے فرماتے تھے، ان کو اطمینان رہتا تھا کہ پوری جماعت دارالعلوم میرے ساتھ ہے۔ یہ اطمینان برحق ہوتا تھا۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کوئی رسمی قسم کے واعظ اور خطیب نہیں تھے لیکن بڑی ٹھوس اور مدلل اور دل نشیں تقریر فرماتے تھے، میں نے ان سے بہتر کسی سے مسلکِ جماعت دیوبند کی ترجمانی نہیں سنی۔ لہٰذا مسلکِ دیوبندی اور مرکزیت

دارالعلوم جب تک ان کے رہنما خطوط پر عمل نہیں کیا جائے گا واپس نہیں آسکیں گے۔ان کے رہنما چند خطوط مشتے ازخروارے پیش ہیں۔

(۱) دارالعلوم میں جب طالبِ علم داخل ہوتا تھا اسی وقت سے اس کی ذہانت، تعلیمی شغف، کیرکٹر اور دوسرے حالات پر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحب ؒ نظر رکھتے تھے۔

(۲) جب طالبِ علم پڑھ کر فارغ ہوتا تھا آپ ہی اس کو تدریسی یا تبلیغی یا تالیفی خدمت پر کہیں مشاہرہ پر مامور فرماتے تھے، جس سے مستقل وفاق مدارس کی ضرورت ہی پوری نہیں ہوتی تھی دارالعلوم کا فاضل ہر طرح دارالعلوم سے منسلک رہتا تھا۔

(۳) دارالعلوم کا فاضل جہاں کہیں بھی رہتا تھا مولانا سے متعلق رہتا تھا اور خط وکتابت رکھتا تھا اس کی دینی و دنیوی تربیتوں کا مولانا خیال رکھتے تھے چنانچہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب ؒ نقشِ حیات ص ۸۷/ پر تحریر فرماتے ہیں جس کی ہم پہلے بھی نقل کر چکے۔وہاں ملاحظہ فرمالیں۔حضرت کا گنگوہ جانا اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا مرید بنانے کے لیے آپ کو پیش کرنا۔

یہ تو دینی تربیت کا اظہار کیا۔مولانا عبدالاحد صاحب مرحوم نے مجھے سنایا کہ ایک مرتبہ جمعیۃ العلماء کی صدارت کے لیے دو اُمیدوار کھڑے ہوئے ایک مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم جو دارالعلوم کے فاضل تھے، دوسرے مولانا عبدالباری فرنگی محل لکھنؤ کے عالم تھے، تو مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے دارالعلوم کے فضلاء کو لکھا، خطوط لکھائے کہ اس انتخاب میں مفتی کفایت اللہ صاحب کی تائید کریں۔

حالیہ حضرت مہتمم صاحب کا زور دارالعلوم کے الہامی مدرسہ ہونے پر بہت زیادہ ہے، مجھے اس سے انکار نہیں مگر حضرت عالم اسباب میں عادۃ اللہ جاری ساری ہے کہ کسی کو بڑا چھوٹا بنانے میں، اسباب کا بھی دخل ہوتا ہے، اسباب کے درجہ میں جب آدمی تھک جاتا ہے تب اسی قسم کی باتوں پر بھروسہ کرتا ہے۔جب دارالعلوم مرکز سے مکتب کی طرف رواں دواں ہے تو اسی قسم کا تکیہ کافی سمجھا جاتا ہے، جس سے عوام اس دھوکہ میں آسکتے ہیں مگر علماء، صلحاء، عارفین اس کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کو اس قسم کے پروپیگنڈہ کی کیوں ضرورت نہیں ہوئی؟ سوانح قاسمی کی تین مجلدات جن میں عبارت آرائی کے سوا مواد اور مغز کچھ نہیں۔اُس زمانہ میں مرتب کیوں نہیں ہوئی، جبکہ وہ حضرت مولانا قاسم ؒ کے قریب وفات کا زمانہ تھا پھر سوانح قاسمی میں جنگ آزادی، انگریز دشمنی کے وہ واقعات کیوں درج نہیں جن کو حضرت قاسم العلوم والخیرات کے خاص شاگرد رشید مولانا محمود الحسن شیخ الہند ؒ قاسم العلوم کا مشن اور اس پر تعلیم کا پردہ بتاتے تھے، انگریزوں کے خلاف جہاد اور تعلیم کا پردہ وغیرہ وغیرہ وہ حالات جو

دوسرے بزرگوں سے سننے میں آئے ہیں آزاد ہندوستان میں بھی مصنف سوانح قاسمی نے درج نہیں کیے، حالانکہ اگران کوعلم ہوتا تو آج انگریز کے خلاف لکھنے سے کون منع کرسکتا تھا،معلوم ہوتا ہے عوام کوکئی کئی سوصفحات کی مجلدات سے مرعوب کرنا مقصود ہے۔حضرتؒ کے حالات و واقعات سے بحث نہیں یہی حال تاریخ دارالعلوم کا ہے کہ مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مدرسہ مظاہرعلوم نے تاریخ مظاہرعلوم جلد اوّل میں تاریخ کی تعریف لکھی ہے کہ جس فن میں سنہ وار اچھے اور بُرے حالات درج کیے جائیں اس کوفن تاریخ کہتے ہیں اور اگر کتاب میں تعریف ہی تعریف ہو تو اس کوفن مدح کہتے ہیں فن تاریخ نہیں، وہ فن تاریخ سے خارج ہے؛ چنانچہ تاریخ دارالعلوم تاریخ نہیں، مدح خاندانِ قاسمیہ ہے، مدرسہ مظاہرعلوم جوگُم سُم لوگوں کا مدرسہ کہلاتا ہے۔بہت سی اسٹرائکوں، مدرسہ کی مخالفت اس کے منتظمین کے خلاف آوازوں سے پُر ہے مگر تاریخ دارالعلوم جہاں ہمیشہ سے ہر قسم کی آزادی ہے، علامہ انورشاہ کی اسٹرائک کے واقعات تفصیلی اور کوائف سے خالی ہے۔

بہرحال مولانا عثمانی کے بعد دارالعلوم تعلیم میں مرکزیت سے اور عمل میں مسلک سے دُور ہوتا چلا جارہا ہے۔ پروپیگنڈہ، ظاہرداری، تعمیرات، تکثیر چندہ بلاتخصیص حرام وحلال پر اربابِ اہتمام کا زیادہ زور ہے، بینک کے سود کا روپیہ دارالعلوم میں قبول کرنے کے لیے مدّ اضافی دارالعلوم میں مولانا عثمانیؒ کے انتقال کے بعد ہی قائم کیا گیا ہے۔جس میں بینکوں کے سود کی رقم آتی ہے اور جمع ہوتی ہے پھر جہاں منتظمین مناسب خیال کرتے ہیں خرچ کی جاتی ہے۔

(۴) روحانیت والی بات صحیح ہے کہ اکابرِ دارالعلوم کی روحانیت ہمیشہ کام کرتی رہی مگر عالم اسباب میں ایک بات ظاہر ہے کہ جس قسم کے واقعات ظہور میں آنے والے ہوتے ہیں ویسے ہی اس کے اسباب ہوجاتے ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ مظاہرعلوم سہارنپور دونوں لگ بھگ ایک ہی زمانہ میں معرضِ وجود میں آئے بلکہ مظاہرعلوم سہارنپور میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے استاذ حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ محدث سہارنپوری نے بھی درس دیا، جس کا اثر یہ ہونا چاہیے تھا کہ مدرسہ مظاہرعلوم سہارنپور پہلے ہی سے دارالعلوم سے فائق و برتر ہوتا مگر واقعات بتاتے ہیں کہ یومِ اوّل سے دارالعلوم دیوبند کا فاضل جہاں بھی گیا وہ تدریسؔ وتصنیفؔ، تبلیغؔ، مناظرہؔ، سیاستؔ سب میں ایسا صحیح فِٹ ہوا کہ بلانے والوں نے محسوس کیا کہ دارالعلوم نے اس کو اسی کام کے لیے تیار کیا تھا، برخلاف مظاہرعلوم کے فاضل کے کہ ان کو بلانے والے حضرات بلاتے ہی تعلیم دینیات، امامت وغیرہ کے لیے تھے چنانچہ جو مرتبہ دارالعلوم کے فاضل کا لوگوں کی نظر میں ہوتا تھا وہ مظاہرعلوم کے فاضل کا کبھی نہیں ہوا۔آخر عالم اسباب میں اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ چنانچہ تجزیہ کرنے کے بعد یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ مولانا عثمانیؒ کے زمانہ میں دارالعلوم نے کبھی اپنے طالبِ علم کو بلا معقولاتؔ، منطقؔ وفلسفہؔ وعلمِ کلامؔ کی تکمیل کتب کے بغیر کبھی دورۂ حدیث نہیں پڑھایا، جس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ معقولات کا ایک خاصّہ ہے انجلاءِ ذہن روشن دماغی۔دارالعلوم دیوبند نے جب تک اپنے ہونے

والے فاضل کو اس کا اہل نہیں بنادیا اور انجلاء ذہن روشن دماغی اس میں پیدا نہیں کردی آخری کلاس یعنی دورۂ حدیث میں اس کا داخلہ نہیں کرایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کا فاضل جہاں گیا اس کی بہت عزت وتوقیر اس بنا پر کی گئی کہ قوم نے جس کام کے لیے اس کو بُلایا وہ ان ہی روشن دماغی اور علمی معلومات کی بنا پر، جو کام قوم اس سے لینا چاہتی تھی اس کو بدرجۂ اتم اس نے پورا کیا قوم خوش اور دادِ تعلیم دیتی دیتی تھک جاتی تھی، برخلاف دوسرے مدارس کے کہ وہ دورۂ حدیث کے لیے معقولات کی تکمیل کو شرط نہیں کرتے تھے۔ قطبی پڑھائی، دورۂ حدیث پڑھادیا چنانچہ وہاں کا فاضل صرف منقولات دینیات میں دسترس رکھتا تھا، اس کا دماغ معقولات نہ پڑھنے کی وجہ سے نہ روشن ہوتا تھا، نہ بات میں سے بات پیدا کرسکتا تھا۔ جو علومِ معقولہ کا خلاصہ ہے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا جو درجہ معقولات میں ہے وہ علماء پر پوشیدہ نہیں کہ اُردو کے رسائل میں نہ قرآن کی کوئی آیت ہے نہ حدیث مگر استدلالِ احکام اسلامیہ وحِکم جس قدر بیان ہوئی ہیں وہ کسی پر پوشیدہ نہیں۔ یہی اثر مولانا عثمانی ناظم دارالعلوم میں پیدا ہوا اور آپ نے علومِ معقولہ اس طرح دارالعلوم میں پڑھوائے کہ یہاں کے فاضل نہ کسی مناظرہ میں ہارے اور نہ کسی علمی جگہ کو پُر کرنے میں ان کو کوئی دقت ہوئی۔ چنانچہ تاریخ دارالعلوم میں کتاب اُقلیدس جو فنِ حساب کی ایک کتاب ہے، جس کے متعلق لوگ یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو حساب نہیں آتا، چہ جائیکہ ملاؤں کو لکھا ہے کہ ایک انگریز حساب میں ماہر دارالعلوم دیکھنے کے لیے آیا اس نے دیکھا کہ دو اندھے جو آنکھوں سے نابینا تھے، آپس میں تقریر کررہے تھے، اس نے مترجم سے پوچھا کہ یہ کیا کررہے ہیں۔ مترجم نے بتایا کہ یہ تکرار کررہے ہیں، انگریز نے دریافت کیا، تکرار کیا ہوتی ہے؟ مترجم نے کہا کہ جو سبق طلبہ استاذ سے پڑھتے ہیں استاذ کی تقریر کو بعد سبق دوبارہ دُہراتے ہیں اور استاذ نے جو کہا ہے اس کو یاد کرتے ہیں چنانچہ فاضل انگریز نے دریافت کیا کہ یہ کس کتاب کی تکرار کررہے ہیں؟ مترجم نے کہا اوقلیدس۔ فنِ حساب کی وہ تھوڑی بہت اُردو بھی جانتا تھا، ہمہ تن گوش ان دو اندھوں کی تقریر کو سننے میں مشغول ہوگیا فنِ حساب میں چونکہ شکلیں بھی بنتی ہیں ایک اندھا دوسرے اندھے کی پشت پر وہ شکلیں ہاتھ سے بنا کر بتا رہا تھا، جب انگریز نے یہ دیکھا اور تقریر سنی تو یورپ جا کر اس نے یہ تأثر دیا کہ جب سے صاحبِ اوقلیدس نے کتاب تصنیف کی آج تک شاید کوئی اس سے زیادہ اس کتاب پر تقریر نہ کرسکا ہو جتنی کہ یہ دو اندھے آپس میں کررہے تھے۔

حضرات! غور فرمائیے یہ ہے حبیب الرحمٰن کے زمانۂ اہتمام کا دارالعلوم آج یہ کہہ کر، فلسفہ پُرانا ہوچکا فلاں کتاب کا مدرس نہیں ملتا، علومِ معقولہ کو تقریباً برطرف کردیا گیا۔ علومِ معقولہ کو ختم کیا جارہا ہے۔

(۵) حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو اگر بانی لکھنا اور کہنا ہے تو علومِ معقولہ کو دارالعلوم دیوبند میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رکھنا ہوگا، علاوہ ازیں تمام دارالعلوم والے حنفی المذہب ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تمام احکام معلّل بالاغراض ہیں۔ فقہ حنفی کو سمجھنے سمجھانے کے لیے معقولات ازبس ضروری ہیں۔

(۶) خداوند تعالیٰ حکیم ہیں، احکامِ خداوندی کو سابقہ تفاسیر کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کے لیے علومِ معقولہ ازبس ضروری ہیں۔

(۷) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحبؒ کا اُصول دارالعلوم میں مدرس رکھنے کے لیے یہ تھا کہ جس طالبِ علم نے دارالعلوم میں تعلیم پائی ہے اور مولانا اس کی ذہانتِ علم، کردار سے واقف ہیں تو پہلے کسی دوسرے مدرسہ میں تدریسی خدمات انجام دے کر شہرتِ تامہ حاصل کر چکا ہو تب وہ دارالعلوم کی مدرسی کے قابل سمجھا جاتا تھا۔

(۸) جب دارالعلوم کا فاضل کسی دوسرے مدرسہ میں تعلیم دے کر شہرتِ تامہ حاصل کر کے دارالعلوم میں آتا تھا تو اس کو مطالعۂ کتب کی تاکید کی جاتی تھی چنانچہ اونچے درجہ کے مدرّس حضرات کے متعلق اساتذہ سے یہ سننے میں آیا ہے کہ جب وہ دارالعلوم میں تعلیم دینے کے لیے برسہا برس دوسری جگہ تعلیم دے کر تشریف لائے اور طلبہ نے شکایت کی اور طالبِ علموں کی تشنگی نہ بجھ سکی تو مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحبؒ نے فرمایا: اے صاحب! مطالعہ کرو، بھائی مطالعہ کرو۔ یہ دوسری جگہ کی مدرّسی نہیں دارالعلوم کی مدرّسی ہے۔ مولانا چونکہ..... استاذوں کے استاذ تھے اس لیے استاذوں نے ان کے فرمانے پر مطالعہ کیا اور کبھی بلا مطالعہ کتاب نہیں پڑھائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایک مسئلہ میں سات سات اور آٹھ آٹھ دن لگ جاتے تھے اور وہ اساتذہ آسمان پر اُبھر کر زیرِ زمیں تشریف لے گئے۔

(۹) مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحبؒ کا تقرب علم، تقویٰ، عمل صالح سے ہوتا تھا۔ رشتہ داری، ثنا خوانی سے نہیں ہوتا تھا، ہم جیسا پہلے ذکر کر چکے مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ جن کی صدارت جمعیۃ العلماء کے لیے مولاناؒ نے سر توڑ کوشش کی کیا رشتہ داری تھی کچھ نہیں۔ برخلاف اس کے سنہ ۱۳۴۴ھ کی اسٹرائک میں دو حقیقی بھائی مفتی عزیز الرحمٰن صاحب اور علامہ شبیر احمد صاحب کو مدرسہ سے الگ کر دیا۔ یہ تھے حقائق پر عامل اور علوم کے قدرداں حضرات جن کا عمل اُصول پر مبنی تھا نہ کہ مصالح پر۔

(۱۰) آج بھی اگر معیار مدرسی تعلیم و قابلیت ہو تو ہندوستان و پاکستان میں علوم معقولہ کے ماہر اور حدیث و تفسیر کے ممتاز مدرس دارالعلوم کی تدریسی خدمات کے لیے مل سکتے ہیں۔ ہندوستان سے تو بلانے میں کچھ دُشواری ہی نہیں پاکستان سے بھی حکومت کی اجازت سے اساتذہ بُلائے جاسکتے ہیں، جو مثل ایامِ تعطیل میں رخصت پر اوطان جاسکتے ہیں۔

(۱۱) دارالعلوم میں انتظامیہ کے مقابلہ میں مدرسین کی بہت کمی ہے، موجودہ کسی مدرس کو علیٰحدہ کرنے کی حاجت نہیں، صرف قابل اساتذہ کے اضافہ کی ضرورت ہے، جس کو حضرت مہتمم صاحب مدظلہٗ مجھ سے زیادہ سمجھتے ہیں اور اگر پاکستانی حضرات کا علم نہ ہو تو ایک سفر حضرت خود کر لیں یا کسی ماہر تعلیم استاذ کو بھیج دیں جو اس اُصول کے تحت شہرت تامہ علماء میں حاصل کر چکا ہو کہ وہاں سے طلب فرمالیں۔

(۱۲) حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہٗ کے زمانہ اہتمام میں مولوی شریف حسن کشمیری، مولوی شمس

الدین صاحب ملتانی، مولوی عبدالحق صاحب خٹک اور مولانا بشیر احمد گلاؤٹھی وغیرہ وغیرہ بہت حضرات قابل قابل اساتذہ دارالعلوم میں مدرس رہ چکے ہیں، تو اب کیا وجہ ہے کہ اس قسم کے قابل حضرات کو کیوں دارالعلوم میں تدریسی پر مامور نہیں کیا جاتا۔

(۱۳) دارالعلوم ہمارے اور آپ کے دونوں کے اکابر کی مقدس امانت ہے، مصارف خرچ، مالیات، تعمیرات وغیرہ اصل مدرسہ نہیں؛ بلکہ علومِ دینیہ بدرجہ اتم مقصدِ مدرسہ ہیں، ان کو اگر آپ زندہ رکھنے کی کوشش کریں گے تو حصولِ مقصد ہوگا، اس کے خلاف فوتِ مقصد ہے، اسی جدوجہد سے مرکزیت دارالعلوم و مَسلکِ دیوبندی واپس آسکتے ہیں، اس کے بغیر آج نہیں تو کل دارالعلوم مثل دوسرے مدارسِ عربیہ ایک عربی مدرسہ ہوجائے گا اور مسلکِ لادَینیت یا رضاخانیت میں بدل سکتا ہے، جیسے کارکن ہوں گے ویسا مدرسہ ہوجائے گا۔

(۱۴) دارالعلوم کو کالج یا یونیورسٹی بنانا انگریزی، ہندی دنیوی تعلیم اس قدر رائج کرنا کہ اپنے اسلاف کے طرق سے منحرف ہوجائے دارالعلوم کو برباد کرنا ہے، دنیوی تعلیم کے بہت سے کالج، یونیورسٹیاں ہندوستان میں موجود ہیں، جن حضرات کو تعلیم دلانا ہو وہاں دروازے کھلے ہیں، ایک دارالعلوم کو سائنسی کالج بنانا کیا ضروری ہے۔

(۱۵) ماحولِ دارالعلوم میں ملازمین واساتذہ وطلبہ ظاہر میں متشرع ہونے چاہئیں باہر سے آنے والے زائرین حضرات خود گو ظاہر شریعت پر عامل نہ ہوں؛ مگر واپسی پر اپنے اپنے گھر لوٹ کر یہ تاثر لے جائیں کہ دارالعلوم کے اندر سب لوگ متشرع، نمازی، ڈاڑھی والے ظاہر شریعت کے پابند ہیں، جن لوگوں کی وضع قطع دارالعلوم کے ماحول کے مطابق نہ ہو، ان کو ذمہ دارانِ مدرسہ تنبیہ کریں کہ وہ اپنے اندر تبدیلی لاکر اپنی وضع وقطع حضرات دارالعلوم کے مطابق بنائیں۔

(۱۶) دارالعلوم کے موجودہ ملازمین میں سے کسی کو علیحدہ نہ کیا جائے؛ بلکہ مزید اسامی خالی ہونے پر ہر جگہ کے لیے دارالعلوم کے اُس فاضل کو ترجیح دی جائے جو مفوضہ کام کو بطریق اتم انجام دے سکے، مجھے اُمید ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا انشاء اللہ کہ نئے دربان تک دارالعلوم کے فاضل دارالعلوم کو میسر ہوں گے۔

(۱۷) دارالعلوم اک دینی مدرسہ ہے، اس میں امانت و دیانت کا ہونا ازبس ضروری ہے، سنا ہے کہ دارالعلوم کو جو لوگ چندہ سفراء کے ذریعہ بھیجتے ہیں ان میں ایک رسید تو وہ ہوتی ہے جو دارالعلوم کا نمائندہ چندہ دہندہ کو دیتا ہے، اس کے بعد ایک رسید دارالعلوم جاری کرتا ہے جو چندہ دارالعلوم میں جمع ہونے کے بعد چندہ دہندہ کو ڈاک سے بھیجی جاتی ہے، اوّل رسید چندہ دہندہ کو سفیر یا نمائندہ دارالعلوم نے دی، اس پر کہیں یہ تحریر نہیں کہ یہ رسید عبوری ہے، اس کے بعد اصل رسید چندہ جمع ہونے کے بعد دارالعلوم سے بھیجی جائے گی، لہٰذا پہلی رسید جو کسی بھی سفیر یا نمائندہ کو دی جائے اس پر یہ بات چھپوانا ضروری ہے۔

(۱۸) دارالعلوم اس قدر بڑا اور پُرانا ادارہ ہے جس پر عامۃ المسلمین اعتماد کلی کرتے ہیں، دارالعلوم کی

رسیدیں مثل ڈرافٹ چیک ایک قیمتی چیزیں ان کی صحیح تعداد چھپنے کے وقت سے لے کر روزانہ کسی رجسٹر میں صحیح اندراج ہونا چاہیے۔

(۱۹) دارالعلوم کے ہر محکمہ میں ملازم رکھتے وقت ہر ملازم کے لیے ضروری ہونا چاہیے کہ جس کام کے لیے اس کا تقرر کیا جارہا ہے وہ اس کی اہلیت وقابلیت رکھتا ہو۔ نااہل کو ملازم رکھ کر دارالعلوم کی بدنامی کا باعث نہ بنانا چاہیے۔

(۲۰) مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دارالعلوم کے ہر کام کو معیاری طریق پر کرانا چاہتے تھے؛ چنانچہ اس کے لیے معیاری آدمی تلاش کرتے تھے، اگر مقامی میسر آجائے تو ہم خرما و ہم ثواب اگر میسر نہ آئے تو تلاش کر کے بلاتے تھے؛ چنانچہ عثمانی صاحبؒ کے زمانۂ اہتمام میں دارالعلوم کا طباخ باہر سے ماہر آدمی کو بلا کر رکھا گیا تھا، بڑھئی تک ہوشیار اور معیاری تھے، ہمارا منشاء تو سب باتوں میں یہی ہے کہ ماضی میں جب دارالعلوم بامِ عروج پر تھا وہ مولانا عثمانی کے رہنما خطوط تھے، آج اگر انحطاط آگیا ہے اس کو دُور کرنے کے لیے کسی باہر کے آدمی کے مشورہ کی ضرورت نہیں، دارالعلوم میں ہر کام کے لیے ان کے رہنما خطوط موجود ہیں، ان کو بجائے پس پُشت ڈالنے کے ان کو بروئے کار لانا ضروری ہے، تاکہ دارالعلوم پھر ماضی کا دارالعلوم بن جائے۔ شیخ الہند زندہ نہیں ہوسکتے؛ مگر ان کے پیروکار مشق اور کارکردگی کر کے شیخ الہند بن سکتے ہیں، مختصر المعانی کا وہ جملہ اَلصَّلٰوۃُ وَاجِبَۃٌ کے مانند یاد دہانی ہے ورنہ آپ حضرات مجھ سے بہت زیادہ عالم فاضل، جاننے والے ہیں۔

(۲۱) مولانا عثمانی کے زمانہ میں دارالعلوم میں سُفرا نہ تھے؛ بلکہ مولانا سال میں دو مرتبہ دو اشتہار ایک رمضان المبارک دوسرا عید الاضحیٰ کے موقع پر نکالتے تھے، جن کا مضمون یہ ہوتا تھا کہ اپنی مقامی ضروریات کو پوری کرتے ہوئے مرکزِ علومِ دینیہ دارالعلوم دیوبند کا خیال رکھا جائے۔ اشد ضرورت پر بہت قابل اعتماد حضرات یعنی مدرسین یا معتمد کو باہر بھیجا جاتا تھا اس کا فلسفۂ راز علماء خوب سمجھ سکتے ہیں۔

(۲۲) یہ نمبرات اجمال اور اشارات ہیں؛ چونکہ فضلاء اور اربابِ دارالعلوم ان کو خوب اچھی طرح سمجھ لیں گے ورنہ اگر ہر نمبر کو تفصیلاً بیان کیا جائے تو کئی سو صفحات کی ایک کتاب بن جائے۔ خاکسار کے دماغ میں دارالعلوم کے ہر شعبہ کے لیے مولانا عثمانیؒ کے رہنما سیکڑوں خطوط موجود ہیں جو بشرطِ زندگی اور بشرطِ ضرورت کسی وقت بھی پیش کیے جاسکتے ہیں۔

وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ

لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَاءً وَّلَا شُکُوْرًا

خادم

محمد اسحٰق قاسمی دیوبند (یوپی)

۱۵/۴/۱۹۸۱ء

بس بہت ہوگیا! یہ کتاب جامع مختصر تاریخ دارالعلوم کا تحقیقی جائزہ پڑھنے کے لیے خریدی ہے، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی حیات و خدمات جاننے کے لیے نہیں۔ بلاشبہ اگر اِس طرح کا کوئی جملہ کسی کی زبان پر آجائے تو وہ بے جا نہیں، حق بہ جانب ہے؛ اس لیے ہم بھی اب اس موضوع کو یہیں ختم کر کے آگے بڑھتے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے بس اتنا ضرور عرض کریں گے کہ ہماری اس تحقیق میں آئندہ صفحات کے اندر حق بیانی کا آئینہ بہت سے نامور حضرات کی حقیقت ظاہر کرے گا جس کے سبب ہمیں یقین ہے کہ اس کتاب کی اشاعت شاید دوبارہ نہ ہوسکے؛ اس لیے ہم نے بھی جتنا ہوسکا تحقیق کا حق ادا کرتے ہوئے آپ کے سامنے سچ واضح کردیا ہے۔ بے شک طوالت کا شکوہ جائز ہے؛ لیکن یہ طوالت مستقبل میں تاریخی دستاویز کی حیثیت سے کام آئے گی۔ ہم تہہ دل سے معذرت خواہ ہیں کہ آپ کو اتنے سارے صفحات کا سفر طے کرنا پڑا۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

تاریخ ملک کی ہو، شخص کی ہو، عمارت کی ہو یا کسی کے دورِ اقتدار کی۔ لکھنے والے کے لیے اوّلین شرط تحقیق کرنا ہے، مستند اور معتبر تحقیق کے خاردار راستوں سے گزرنے کے بعد قلم کو دیانت کی روشنائی میں ڈبا کر ہی تاریخ لکھنے کی ابتدا کرنی چاہیے۔ اسی لیے جن مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو محمد اللہ صاحب نے ایک سوال سال کا مہتمم لکھ کر مورخ ہونے کا حق ادا کرلیا ہے ہم نے ان ہی مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کو تحقیق و مستند دلائل کے ساتھ آپ کے سامنے ۲۵/سال کا سب سے کامیاب مہتمم ثابت کردیا ہے۔

یاد رکھئے! اگر انسان کو ایک ایاغ تسلیم کرلیا جائے تو مطالعہ و تحقیق اس میں گرنے والا شربت ہیں شربت سے بھر جانے کے بعد چھلکنے کے عمل کو لکھنا کہتے ہیں۔ جب تک آپ بھریں گے نہیں تب تک چھلکنا ممکن نہیں۔ اور ہل ڈُل کر چھلکنے سے ڈگمگا کر گر جانے کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے؛ اس لیے پہلے خود کو تحقیق و مطالعے کے عمل سے بھریے پھر چھلکیے گا، تو لوگوں کو کام کی باتیں مل سکیں گی۔ یہ نصیحت محمد اللہ صاحب جیسے ہر اُس شخص کے لیے ہے جو چاپلوسی اور شخصیت پرستی کا شکار ہو کر بغیر تحقیق کے غیر معتبر مواد تحریر کرنے کو تاریخ گوئی کا ہنر سمجھ لیتا ہے۔

.....❖.....

ذکر دارالعلوم دیوبند کے دوسرے دَور کا شروع ہوا تھا۔ کتاب کے صفحہ ۲۷ پہ آگے بڑھتے ہیں: صفحہ کی ابتدا یعنی سطر نمبر ۵ میں لکھا ہے کہ: ”یہ دَور دارالعلوم کا دَورِ شباب کہلاتا ہے۔ جو حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کے دَورِ اہتمام سے شروع ہوتا ہے۔ یہ دَور ۳۶/برسوں پر محیط ہے“۔

یہ جھوٹ جو تحریر کیا گیا ہے، اس کی حقیقت آپ گزشتہ صفحات میں بہت تفصیل سے پڑھ آئے ہیں۔ یہ دَور حافظ

محمد احمد صاحبؒ کے اہتمام سے شروع تو ہوتا ہے؛ لیکن ۳۶ برسوں تک ان ہی پر ختم نہیں ہوتا۔ اصلاً یہ دَور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کا دَور ہے۔ گزشتہ صفحات کی تحقیق اِس پر شاہد ہے، لہٰذا ہم اب مزید کوئی وضاحت پیش نہیں کریں گے۔

صفحہ نمبر ۴۷ ر پہ ۴۰ واں سال کے تحت حضرت شیخ الہند کے والد کے انتقال کی خبر ہے۔ تنگ دلی دیکھئے آپ! وہ شخصیت جو دارالعلوم کے اولین بانیوں میں شامل ہے، وہ شخصیت جس نے مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کے بعد دارالعلوم کے پہلے چندے میں سب سے زیادہ رقم دی اُس کو دارالعلوم کے اوّلین معماریں میں سے ایک یا یکے از بانیانِ دارالعلوم لکھنے کے بجائے بس دارالعلوم کا رکن شوریٰ اور خزانچی لکھ دیا۔ حالانکہ صفحہ نمبر ۱۰۸ پہ خالص سیاسی شخصیت مولانا اسعد مدنی کا نام خوب القاب و آداب کے ساتھ لکھ کر ان کے مرنے کی خبر دی اور یہ بھی جھوٹ بولا کہ ''دارالعلوم کی ترقی اور توسیع میں آپ کا اہم حصہ ہے۔'' یہی تو ہے وہ شخصیت پرستی اور چاپلوسی جس کا ذکر ہم نے گزشتہ صفحات میں بار بار کیا ہے۔ مولانا اسعد مدنی کیا تھے اور اُن کے کارنامے کیا کیا ہیں، موقع ملا تو آئندہ صفحات میں اس پر روشنی ڈالی جائے گی۔

اور دیکھئے! اسی صفحہ پر ۴۱ واں سال کے تحت مولانا رشید احمد گنگوہی کے انتقال کی خبر ہے، ان کے نام کے ساتھ بھی کوئی القاب نہیں لگائے گئے، حالانکہ یہ بات تو کسی اجہل مطلق سے بھی پوشیدہ نہیں کہ مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب کا نام علمائے دیوبند میں کس احترام و مقام سے لیا جاتا ہے، بات فقط یہ ہے کہ یا تو کسی بھی شخصیت کے نام کو القاب و آداب سے نہ نوازا جائے، ورنہ پھر کم سے کم یہ تو دیکھ لے کہ کس شخصیت کو کس انداز سے پکارنا ہے۔ اب کہاں مولوی اسعد مدنی صاحب جیسے خالص سیاسی لوگ اور کہاں مولانا ذوالفقار علی و مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب جیسی علمی شخصیات۔

اور دیکھئے! صفحہ نمبر ۷۵ ر ۴۳ واں سال۔

''حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کا انتقال ہوا۔'' بس فقط نام لکھ کر خبر دے دی، ان کے ساتھ تو زیادتی کی حد ہی کر دی۔ یہ بھی نہیں لکھا کہ یہ دارالعلوم کی اوّل شوریٰ سے لے کر تاحیات شوریٰ کے ممبر رہے۔ دارالعلوم کے بانیوں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی و علامہ شبیر احمد عثمانی کے والد تھے۔ بتائیے، قارئین ایمانداری سے بتائیے! کیا یہ خیانت نہیں کہ کسی کے نام کو تو اتنا بڑھا چڑھا کے لکھو کہ چاپلوسی کے جراثیم چلتے ہوئے نظر آنے لگیں اور کسی مستحق شخص کے نام کو بغیر تعارف و القاب کے لکھ دیا جائے۔

صفحہ نمبر ۸۲ پہ دارالعلوم دیوبند کا دوسرا دَور ختم ہوتا ہے اور یہاں بھی فاضل مرتب نے حسبِ سابق روش قائم رکھی کہ مآخذ کے عنوان پر کتاب کے نام تو درج کر دیے؛ لیکن یہ نہیں بتایا کہ کون سی تحریر یا کون سا اقتباس کس کتاب سے ماخوذ ہے۔ ترتیب و تزئین کا سلیقہ کیا ہے یہ فاضل مرتب صاحب کو معلوم ہی نہیں۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ شعور و سلیقہ فقط تعلیم سے حاصل نہیں ہوتا۔

دارالعلوم دیو بند کا تیسرا دَور

کتاب جامع ومختصر تاریخ کے صفحہ نمبر ۸۳ سے تیسرا دَور شروع ہوتا ہے، بلاشبہ یہ دَور حضرت مولانا قاری طیب رحمۃ اللہ علیہ کا دَور ہے۔

آدھی صدی کے اس دَور میں قاری طیب صاحب نے بہت اسفار کیے دارالعلوم کو دنیا بھر میں متعارف کرایا اور دارالعلوم کا بجٹ روز افزوں بڑھتا ہی رہا۔ نئے نئے شعبہ قائم کیے گئے، دارالعلوم کی ترقی کے لیے اہم اور ضروری فیصلے لیے گئے، جس کی تفصیل کتاب میں موجود ہے۔

......❖......

فقط قدیم کتب سے اقتباسات نقل کرنے کو تاریخ لکھنا نہیں کہتے۔ تاریخ لکھنے کے لیے عمیق مطالعہ اور پختہ معلومات کے ساتھ ساتھ بیدار مغز کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کی بصیرت سے مؤرخ ماضی میں پیش آئے ہوئے حالات کو لکھنے کا صحیح ڈھنگ اختیار کرتا ہے۔

لکھنے کا صحیح ڈھنگ ہی کتاب کو قابل دید اور لائق مطالعہ بناتا ہے، جس کتاب پر آپ ہمارا تبصرہ پڑھ رہے ہیں وہ لکھنے کا ڈھنگ نہ ہونے کی وجہ سے ہی تو لائق مطالعہ ہے نہ ہی قابل تحقیق۔ کوئی کہاں تک خامیوں کی نشاندہی کرے ابھی تھوڑے ہی صفحات ہوئے ہیں اور حالت آپ کے سامنے ہے؛ لیکن ہم کیا کریں دیانت کا حق تو ادا کرنا ہی ہے، بھلے ہی بات طویل ہوجائے۔ کمال تو یہ ہے کہ فاضل مرتب صاحب نے ایسی ایسی بچکانی غلطیاں کی ہیں کہ یہ کتاب تاریخ کم اور مذاق زیادہ لگتی ہے۔

آپ ہی دیکھئے! صفحہ نمبر ۸۴ پہ ۷۰واں سال کے تحت ۱۹۳۳ میں دارالعلوم سے منسلک عظیم المرتبت اور شہرہ آفاق شخصیت کے انتقال کی خبر تک نہیں ہے۔ یعنی حضرت علامہ انور شاہ کشمیری۔ شروع سے ہر سال کسی نہ کسی کے انتقال کی خبر شائع کی ہے، یہاں تک کہ اسی صفحہ پر ۱۹۳۲ء میں پہلی سطر یہ لکھی ہے ”مجلسِ شوریٰ کے موقر رکن حضرت مولانا حکیم مسعود احمد گنگوہی کا انتقال“۔

بتائیے! جن کا نام تاریخ کے اوراق میں گم گشتہ کی حیثیت رکھتا ہے وہ تو فاضل مرتب نے درج کردیا؛ لیکن تین سطر بعد ۱۹۳۳ء میں علامہ انور شاہ جیسی مشہور ومعروف شخصیت کا نام تحریر کرنا بھول گئے۔

مسئلہ بھولنے کا نہیں ہے، درحقیقت کوئی بھی شخص جب فقط نقل کرنے کو ہی تحقیق سمجھنے لگتا ہے تو اس سے ایسے ہی کارنامے انجام پاتے ہیں جیسا کہ یہ کتاب تیار ہوئی ہے۔ فاضل مرتب نے جہاں سے ۱۹۳۳ء کے حالات نقل کیے ہوں گے وہاں اتفاقاً کھو یا، دانستہ علامہ انور شاہ صاحبؒ کے انتقال کی خبر تحریر نہ ہوگی، پس جب وہاں نہ ملی تو فاضل مرتب نے بھی نہیں لکھی اور مطالعہ عمیق و معلومات پختہ نہ ہونے کے سبب انھیں پتہ ہی نہیں رہا کہ اس سال تو بڑی اہم شخصیت دارالعلوم سے رخصت ہوگئی تھی وہ یہ بھی بھول گئے کہ گزشتہ صفحات میں ہر مرنے والے کی خبر لکھتے آئے ہیں۔

دیکھ لیجیے قارئین! ہم کتاب میں بے جا کیڑے نہیں نکال رہے ہیں۔ خامیاں ہیں تو سامنے آرہی ہیں۔ کیا برصغیر جیسے بڑے خطے کی سب سے بڑی اسلامک یونیورسٹی سے مہتمم کی تصدیق کے بعد شائع ہونے والی کتاب ایسی ہونی چاہیے؟ بتائیے! کیا اس سے دارالعلوم کی امیج خراب نہیں ہو رہی؟

اسی سال یعنی ۱۹۳۳ء کے تحت لکھا ہے کہ ''درسِ حدیث کے لیے دارالحدیث فوقانی کے نام سے ایک ہال کی تعمیر کی ابتدا ہوئی''

یہ جملہ اتنا ہی ہوتا تو پڑھنے والے کی معلومات میں کوئی کمی نہیں آتی؛ لیکن جس شخصیت پرستی کا ذکر ہم گزشتہ صفحات میں بارہا کر چکے ہیں اس کا ایک اور نمونہ یہاں نظر آتا ہے۔ فاضل مرتب ہندوستانی نسل کے مدنی کہے جانے والے اشخاص سے بہت عقیدت رکھتے ہیں، اسی لیے موقع ہو یا نہ ہو ان کے ذکرِ خیر کی جگہ ضرور نکال لی جاتی ہے۔ درسِ حدیث کے لیے ہال کی تعمیر کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ یہ جملہ بڑھانے کی کیا ضرورت ہے کہ ''حضرت مدنی نے تاعمر اس ہال میں درس دیا''

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اگر یہ جملہ بڑھا بھی دیا تو کیا غلط کیا بات تو سچ ہے! محترم قارئین! ہمارا اعتراض حضرت مدنی سے کسی قسم کی مخالفت پر مبنی نہیں۔ اللہ پاک حضرت مدنیؒ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے وہ بلاشبہ ایک عالم دین اور قابل قدر استاذ تھے۔ ہمارے اعتراض کی وجہ یہ ہے کہ فقط حضرت مدنی ہی کا نام کیوں لکھا گیا، حالانکہ اس ہال میں حضرت مدنی کے علاوہ اُس زمانے سے لے کر آج تک بہت سے علماء دین حدیث کا درس دے چکے ہیں۔ اگر نام لکھنا ہی ضروری تھا تو پھر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، علامہ ابراہیم بلیاویؒ، مولانا سید فخرالدین احمدؒ، مولانا شریف حسن صاحبؒ وغیرہ کا بھی ذکر کرنا چاہیے تھا۔ مؤرخ تنگ نظر اور شخصیت پرست نہیں ہونا چاہئے۔

ویسے بھی جب مختصر تاریخ کا نام دے کر کتاب ترتیب دی جارہی ہو تو اس طرح کے اضافی جملوں کی تو کوئی ضرورت ہونی ہی نہیں چاہئے تھی۔

.....❖.....

صفحہ نمبر ۸۷ پہ سال ۱۹۴۳ء کے تحت دارالعلوم کے سرپرست اور امت کے عظیم رہنما حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ کے انتقال کی کوئی خبر نہیں ہے۔ دارالعلوم سے منسلک ہر چھوٹے بڑے کی رحلت کا ذکر کیا ہے؛ لیکن علامہ انور شاہ ؒ اور حضرت تھانوی ؒ کو فراموش کر دیا گیا۔ کیوں؟

اس کے بعد صفحہ ۸۸ پر ۱۹۴۹ میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کی وفات کا تذکرہ نہیں ہے۔ فاضل مرتب کی نااہلی اور تنگ نظری کے سبب اب تو ہمیں ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے ہم کچھ زیادہ ہی غلطیوں کی نشاندہی کر رہے ہیں؛ لیکن کیا بھی کیا جا سکتا ہے، کتاب ہے ہی اغلاط کا پلندہ، اب فاضل مرتب کی طرح ہم دیانت کا گلا گھونٹ کر متانت کے ساتھ کھلواڑ کرتے ہوئے تو قلم کا ناجائز استعمال نہیں کر سکتے۔ اللہ رب العزت ہمیں ہمیشہ حق گوئی کی خصلت سے معمور رکھے اور شخصیت پرستی و چاپلوسی کے جراثیم ہمارے خون سے ہمیشہ ہمیشہ دُور رہیں۔ آمین

مرتب کی نااہلی کا مظاہرہ کتاب کے ورق ورق پر عیاں ہے۔ ایک بار پھر دیکھئے! شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی ؒ کے انتقال کی خبر صحیح مقام یعنی ۱۹۴۹ میں نہ دے کر اگلے صفحہ پر ۱۹۵۴ کے تحت دے رہے ہیں۔ اور کس طرح دے رہے ہیں یہ بھی دیکھ لیجیے!

ایک ہی جملے میں چار حضرات کے انتقال کی خبر یعنی صاف ظاہر ہے کہ بس کام چلاؤ انداز اختیار کرتے ہوئے متانت سے کھلواڑ کرو اور ۱۹۵۴ میں مرنے والوں کے ساتھ ساتھ ۵ سال قبل گزرے ہوئے شخص کا نام بھی شامل کرلو، تاکہ صحیح مقام پر نام چھوڑ دینے کا اِزالہ ہو جائے۔ حد ہوتی ہے حماقت کی۔ یہ ایشیا کے سب سے بڑے دینی ادارے دارالعلوم دیوبند کی تاریخ مرتب کرنے والوں کا حال ہے۔ آگے چلیے...

ہم مسلسل فاضل مرتب کو شخصیت پرست کہتے آرہے ہیں اور یہ الزام نہیں؛ بلکہ مصدقہ حقیقت ہے، جس کو ہم نے ہر بار ثابت کیا ہے۔ ایک بار اور ملاحظہ فرمائیے۔

کتاب کے صفحہ نمبر ۸۸ پہ علامہ شبیر احمد عثمانی ؒ کے انتقال کی خبر تک نہ لکھنے والے دارالعلوم کی تاریخ کے مرتب صاحب الگ الگ وقتوں میں مرنے والے حضرات کا نام ۱۹۵۴ کے تحت ایک سطر میں لکھ کر سستی اور کاہلی کا نمونہ پیش کرتے ہوئے اگلے ہی صفحہ پر شخصیت پرستی کی اسارت میں اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتے ہیں اور خوب جوش سے حضرت مدنی ؒ کے انتقال کی خبر اس طرح تحریر کرتے ہیں کہ ان سے پہلے کسی اور کی خبر اس انداز سے نہیں لکھی یعنی قمری، شمسی دونوں تاریخوں اور مہینوں کے نام کی تفصیل کے ساتھ۔ کتاب کے گزشتہ صفحات میں بہت سے علماء حضرات کے انتقال کی خبر دی گئی ہے؛ لیکن جس طرح حضرت مدنی ؒ اور آئندہ صفحات میں مولوی اسعد مدنی ؒ کے انتقال کی خبر تحریر ہے اس طرح کسی شخص کے مرنے کا تذکرہ نہیں کیا۔ اسی کو شخصیت پرستی کہا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شخصیت پرستی کے اسیر اپنی آنکھوں پر غلو آمیز عقیدت کا ایسا چشمہ لگا لیتے ہیں جس کے بعد

انہیں حقائق کا نظر آنا بالکل بند ہو جاتا ہے۔ آخر غلو آمیز عقیدت کے علاوہ اور کون سا جذبہ ہے جس کی وجہ سے مولانا مدنی کا تذکرہ غیر ضروری طور پر فاضل مرتب صاحب خصوصیت و اہمیت کے ساتھ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ مولانا حسین احمد مدنیؒ ایک عالم دین اور معزز شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے استاذ بھی تھے۔ اس کا ذکر ہم گزشتہ صفحات میں بھی کر چکے ہیں؛ لیکن بے جا اہمیت دینا دیانت کو منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ مولانا حسین احمد مدنی پر اللہ پاک کی رحمتیں نازل ہوں، ہمیں بھی ان سے محبت اور عقیدت ہے؛ لیکن جہاں تک علمی حیثیت کی بات ہے تو علمی معیار پر مفسر کبیر محدث عظیم شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا مقام آپ سے بہت اونچا ہے، بہت اونچا؛ لیکن وائے قسمت اب ایسے ایسے لوگ تاریخ لکھ رہے ہیں کہ جو عقیدت کو حقیقت پہ ترجیح دینے کے قائل ہیں۔ ع

روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

ہم یہاں ایک بات عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ مولانا مدنی اور علامہ عثمانی و شاہ صاحب کے مقام و مرتبہ کے فرق کو بیان کرنے کا مقصد کسی قسم کی تضحیک یا تقابل کا اظہار نہیں ہے؛ بلکہ انسانوں کا ایک دوسرے پر فوقیت و برتری رکھنا تو ہمیشہ ہی سے دنیا میں ہوتا آیا ہے اور یہ کوئی غلط بات نہیں ہے، اللہ رب العزت نے تمام انسانوں کے اندر بعض کو بعض پر فوقیت دی ہے۔

اس کی بہت سی مثالیں ہیں جیسے تمام انبیاء قابل تعظیم اور لائق تکریم ہیں؛ لیکن جو مقام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے وہ کسی نبی کا نہیں۔ آپ تمام نبیوں میں افضل ہیں۔ اسی طرح تمام صحابہؓ ستاروں کے مانند ہیں، رضی اللہ عنہ کا عنوان حاصل کیے ہوئے ہیں پھر بھی جو مقام خلفائے راشدین کا ہے وہ کسی اور کا نہیں۔ پھر اتنا ہی نہیں؛ بلکہ خلفاء راشدین میں بھی جو مرتبہ حضرت ابو بکرؓ کا ہے وہ کسی اور صحابیؓ کا نہیں۔

اس کے علاوہ تمام ازواجِ مطہرات امت کی مائیں ہیں؛ لیکن حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام بیویوں میں حضرت عائشہؓ ہی سے زیادہ محبت تھی۔ مقصد یہ ہے کہ کسی کی عظمت یا بڑائی بیان کرنے کا مطلب مد مقابل کو کم تر ثابت کرنا نہیں ہوتا۔ سب کا اپنا اپنا مقام ہوتا ہے اور علمی اعتبار سے علامہ عثمانی و شاہ صاحب کا مقام اکابرِ دیوبند میں بہت بلند حیثیت رکھتا ہے؛ لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہ سمجھا جائے کہ مولانا مدنی کسی کم درجے کے عالم تھے۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ مولانا مدنی بھی ایک زبردست عالم دین اور بلند پایہ استاذ تھے۔ لیکن حدیث اور تفسیر کی تصنیفی خدمات میں اُن کا کوئی کام میدانِ عمل میں بشکل کتاب محفوظ نہیں ہے۔ مولانا مدنی سیاسی مزاج شخصیت تھے۔ سیاست میں دلچسپی ان کا خاص وصف ہے۔ اسی لیے شیخ الہندؒ نے انگریزوں کو ملک سے بھگانے میں جو تحریک چلائی اور دیگر کوششیں کی ہیں، ان میں مولانا مدنیؒ آپ کے رفیق رہے ہیں، اس کے برعکس جب بھی کوئی علمی مسئلہ ہوا تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ

نے اپنے شاگردِ عزیز علامہ عثمانی کو پیش پیش رکھا۔ ہر علمی موضوع پر تقریر یا تحریر کے لیے حضرت شیخ الہند علامہ عثمانی ہی کو آگے رکھتے تھے، یہاں تک کہ ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے خطبۂ صدارت کے لیے بھی شیخ الہندؒ نے علامہ عثمانی ہی کے لکھے خطبہ کو پسند فرمایا تھا اور پھر یہ خطبہ صدارت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ ہی نے پڑھا بھی تھا۔

اور ہاں! ایک بات اور یہ کہ مولانا مدنی کا سیاسی مزاج فقط آپ تک ہی محدود نہ رہا؛ بلکہ نسلاً بعد نسل آج تک اس مدنی خاندان میں منتقل ہوتا آرہا ہے۔ مولوی اسعد مدنی کی سیاسی سرگرمیوں سے کون واقف نہیں کہ دارالعلوم کی عظمت کو بٹہ لگانے والے اور اس کی علمی قدروں کو پامال کرنے والے یہی سیاسی دماغ کے مالک حضرت تھے۔ اس کے علاوہ مولوی ارشد مدنی ہوں یا محمود مدنی جتنی دلچسپی ان حضرات کو سیاست اور اعتکاف کے مینا بازار لگانے میں ہے اتنی علمِ دین کے فروغ اور امت کی اصلاح اور فلاح و تربیت کی نہیں۔ بہر حال

۹۸ رواں سال ۶۱-۱۹۶۰

حضرت قاری طیب رحمۃ اللہ علیہ کو وہاں کی تمام راحتیں نصیب ہوں کہ آپ ہی کی حکیمانہ اور مدبرانہ کاوشوں کے طفیل دارالعلوم دیوبند میں طلبہ کو علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ علومِ طب کی بھرپور تعلیم دے کر انہیں حکیم وطبیب بنا کے روزگار مہیا کرنے کا ایک شاندار سلسلہ شروع کیا گیا، جو خوب کامیاب رہا۔ آج جہاں مسجد رشید کے سامنے دارالعلوم کا مکتبہ اور عظمت ہسپتال ہے اسی جگہ جامعہ طبیہ کی وہ عمارت تھی جس میں جدید سائنسی آلات سے مزین ایک مکمل لیبورٹری تھی۔ ہم نے خود اس عمارت کو نہ یہ کہ صرف دیکھا؛ بلکہ ان جدید آلات کے ذریعہ اپنی معلومات میں اضافہ بھی کیا۔

نہ جانے کتنے ہی ماہر و معروف حکیم وطبیب آج بھی زندہ ہیں، جو دارالعلوم دیوبند کی اس جامعہ طبیہ سے فارغ ہو کر اپنا مطب چلا رہے ہیں۔ ایسا کامیاب اور کارگر شعبۂ طب کہ جس کو آج مزید جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ ہو کر دارالعلوم کا ایک بہترین شعبہ ہونا چاہیے تھا، جس سے دینی علم کے ساتھ ساتھ دنیاوی علم بھی ہمارے طلبۂ عزیز کو میسر آسکتا؛ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

دارالعلوم کی جامع ومختصر تاریخ لکھنے والے فاضل مرتب صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ”قانونی مجبوریوں کی وجہ سے اسے دارالعلوم سے ختم کر دیا گیا“ (ص ۹۱ جامع ومختصر تاریخ)

لیکن تاریخ فقط اتنی نہیں ہے کہ بس درج بالا ایک جملہ تحریر کر کے حق تالیف ادا کر دیا جائے؛ بلکہ تاریخ یہ ہے کہ دارالعلوم پہ قبضہ کرنے کے بعد مولوی اسعد مدنی صاحبؒ نے اس شعبہ کو بند کروا دیا تھا۔ یہ وہی اسعد مدنی صاحب ہیں جن کی عقیدت میں فاضل مرتب صاحب کا دل اس درجہ گرفتار ہے کہ حقائق کی روشنی بھی ان کے دل میں داخل نہیں ہوتی۔ اس لیے صحیح تاریخ بیان کرنے کے بجائے بس ایک بچکانہ سا اصطلاحی جملہ تحریر کر کے دامن چھڑا لیا۔

آئیے! ہم آپ کو اس موضوع کی ذرا سی تفصیل بتاتے چلیں۔

''جامعہ طبیہ'' دارالعلوم دیوبند کا ایک شاندار اور قابل قدر شعبہ تھا، حکیم الاسلام قاری طیب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی ابتدا اسی غرض سے کی تھی کہ دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد پچاس یا ساٹھ طلبہ طبِ یونانی میں حکمت کا کورس کرکے اچھے روزگار کے ساتھ امت کو فائدہ بھی پہنچا سکیں گے۔ اور یہی ہوا، بیس سال میں بہت سے طالبِ علموں نے اس جامعہ طبیہ سے ڈپلوما کورس کرکے اپنے اپنے شہروں میں مطب قائم کیے۔ کچھ نے تو اس کورس کی بنیاد پر مزید اعلیٰ میڈیکل تعلیم حاصل کی اور کامیاب ڈاکٹر بن گئے۔

۱۹۸۰ء میں مولوی اسعد مدنی صاحب کی ریشہ دوانیوں نے زور پکڑا تو دارالعلوم کے حالات بد سے بدتر ہونے شروع ہوگئے۔ ۱۹۸۱ء میں یہ ہوا کہ سرکار نے طبِ یونانی کے ڈپلوما کورس کو ڈگری کورس بنا دیا، جس کی وجہ سے یہ اب باقاعدہ بی یو ایم ایس کے نام سے ایک ڈگری کورس مانا جانے لگا۔ ڈگری کورس کرانے کے لیے کسی بھی ادارے کو سرکاری ضابطے کے مطابق دس لاکھ، روپیے گورنمنٹ کے کھاتے میں جمع کرنے ہوتے ہیں، جو واپس نہیں ملتے۔ یہ قاعدہ ہنوز جاری ہے۔ اِسی بات کی خبر جب دارالعلوم پہنچی تو مہتمم حضرت قاری طیب رحمۃ اللہ علیہ نے جامعہ طبیہ کے استاذ ڈاکٹر شمیم احمد سعیدی صاحب کو بلوایا اور اِس بابت مشورہ طلب کیا۔

مزید تفصیل اور تمام سرکاری ضابطوں کی معلومات کے لیے ڈاکٹر شمیم احمد سعیدی صاحب کو لکھنؤ بھیجا گیا۔ ویسے بھی جامعہ طبیہ سے متعلق تمام ذمہ داری اور اسفار ڈاکٹر شمیم احمد سعیدی صاحب ہی کے ذمہ رہا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب لکھنؤ گئے اور تمام معلومات حاصل کرکے قاری طیب صاحب کے گوش گزار کردیں، مہتمم صاحب نے فرمایا:

''بھائی ڈاکٹر صاحب دس لاکھ روپیۓ کافی بڑی رقم ہے، بے شک جامعہ طبیہ کے ہونے سے امت کو بہت فائدہ ہوا ہے۔ آپ دعا فرمائیں اللہ یہ مرحلہ آسان فرمائے۔ میں آئندہ شوریٰ میں اس تجویز کو پیش کروں گا اور ان شاء اللہ اُمید ہے کہ شوریٰ بھی امت کی فلاح و بہبودی کے لیے اس شعبہ کو قائم رکھنے کے حق میں ہی فیصلہ کرے گی۔

لیکن اس سے پہلے کہ شوریٰ میں یہ بات رکھی جاتی حضرت قاری طیبؒ نے مولوی اسعد مدنی صاحب کی سازشوں، الزام تراشیوں اور بدعنوانیوں کے سبب خود کو دارالعلوم سے الگ کرلیا۔ یہاں تک کہ دارالعلوم کی تاریخ میں وہ تاریک دن بھی آیا جب ۲۳؍مارچ ۱۹۸۲ء کو مولوی اسعد مدنی صاحب اور ان کے گروپ کے لوگوں نے بالکل غنڈوں کی طرح زور آوری سے دارالعلوم پر قبضہ کرلیا۔ وہ دن تھا اور آج کا دن ہے دارالعلوم دیوبند اپنی قدیم عظمت اور روایتی قدروں سے دن بہ دن دُور ہوتا چلا گیا اور آج ساری دنیا کے سامنے ہے کہ دارالعلوم نے فقط بڑھتے ہوئے بجٹ اور درو دیوار کی تعمیر و عمارت میں تو خوب ترقی کی ہے؛ مگر علم، تعلیم اور تربیت اس درجہ انحطاط پذیر ہیں کہ آج دارالعلوم دیوبند کے فارغ اپنے نام کے آگے قاسمی تو لگاتے ہیں؛ لیکن ان کے معاملات، ان کا انداز اور ان کا علم کس درجہ پستی میں اُترا ہوا ہے، یہ اُن سے گفتگو کرکے فوراً ہی معلوم ہوجاتا ہے۔

دھیرے دھیرے اچھے اور خاندانی اساتذہ رخصت ہوتے گئے اور چاپلوس قسم کے غیر اشرف وغیر انسب ایسے استاذ رکھے جانے لگے جو خوفِ خدا میں نہیں؛ بلکہ خوفِ اسعد یا ملازمت کے چلے جانے کے ڈر کے ساتھ یہاں استاذ کی حیثیت سے مسند نشین ہوئے۔ آج اُسی کا نتیجہ ہے کہ تمام عالم دیکھ چکا دارالعلوم دیوبند نے گزشتہ ۳۵ رسالوں میں کوئی ایک بھی تو ایسا عالم دین دنیا کو نہیں دیا جس کے علم سے ایک جہاں مستفیض ہو رہا ہو۔ بتائیے ہے کوئی نام، آپ کے ذہن میں جس نے ۱۹۸۲ کے بعد دارالعلوم میں داخلہ لیا ہو اور وہ عالم اسلام میں ایک قابل قدر انسان کی شکل میں سب کے سامنے ہو۔ ایک! فقط ایک نام بھی آپ نہیں بتاسکتے۔

اسی دارالعلوم نے شیخ التفسیر ومحدث اعظم علامہ شبیر احمد عثمانی دنیا کو بخشے، اسی دارالعلوم کے فرزندوں میں محدث عظیم علامہ انور شاہ بھی شامل ہیں، اسی نے مفسر قرآن مفتی محمد شفیع صاحب عطا کیے، یہیں سے معارف القرآن ادریسی کے لکھنے والے مفسر مولانا ادریس کاندھلوی نے تعلیم حاصل کی، اسی دارالعلوم سے مفسر کبیر مولانا اشرف علی تھانوی رحمہم اللہ علیہ ہیں اور بھی بہت نام ہیں جنھوں نے تفسیر وحدیث دونوں میدان میں اپنے علم کے جوہر دکھائے؛ مگر اب کیوں کوئی ایک بھی مفسر یا محدث دارالعلوم سے نہیں نکل رہا ہے ۳۵ رسال کا عرصہ کم نہیں ہوتا، اِس طویل مدت میں دارالعلوم ایک بھی تو مفسر پیدا نہ کرسکا۔ ہاں! اگر دارالعلوم نے دنیا کو اس ۳۵ سال کے عرصے میں کچھ دیا ہے تو یہ دارالعلوم کی غیر معتبر تاریخ مرتب کرنے والے نااہل مرتب اور فقط کاروباری نیت سے شروحات لکھ کر خود چھاپ کے پیسہ کمانے والے تاجر اساتذہ۔ بارہ مہینوں کے عنوان پر گھسی پٹی بے کیف وبے اثر تقریری کتابیں لکھنے والے طلبہ اور اب ایک نئی بیماری چلی ہے ”نوٹ“ کی، جسے دیکھو وہ گزشتہ امتحانات کے سوالات جمع کر کے ہر کتاب کا نوٹ تیار کر رہا ہے۔ اور بڑے شوق وخود نمائی کے جذبے کے ساتھ اپنے نام کے آگے قاسمی لگاتا ہے۔ کمال تو اِس بات کے ہیں کہ بچوں کی صلاحیتیں مفلوج کرنے والے یہ نوٹ دارالعلوم کے بڑے اساتذہ کی تقریظ اور پسندفرمودہ تحریروں کے ساتھ شائع کیے جاتے ہیں۔ جب اصل کتابوں کو پڑھنے کے بجائے طلبہ فقط نوٹ پڑھ کر امتحان دینے کے عادی ہو جائیں اور علم حاصل کرنے کے لیے کیجانے والی کڑی محنت سے ان کا کوئی واسطہ نہ رہے تو پھر ایسے ایسے ہی طلبہ فارغ ہو کر نکلتے ہیں کہ جن سے ایک صفحہ کی عربی کا ترجمہ بھی صحیح نہیں ہوتا۔ جب کھیتوں میں ہل چلانے والے اور کپڑا بننے والے لوگ استاذ کی مسند پہ آجائیں اور اسی طرح غیر اَنسب وغیر اَشرف گھرانوں کے لڑکے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے لگ جائیں تو زوال یقینی ہو جاتا ہے۔ یہی ہو بھی رہا ہے اعلیٰ تعلیم ہمیشہ ہی سے اشراف وانساب کے خاندانوں میں پروان چڑھی ہے، کم نسبوں اور نااہلوں سے علم کو ہمیشہ نقصان ہوا ہے۔ یہاں بس ایک بات اور بتادوں سورۂ حجرات کی آیت نمبر ۱۳ کو دلیل بنا کر تمام انسانوں کو برابر ماننے والے ابھی ہمیں برا بھلا نہ کہیں اشرف وانسب لکھنے کا مقصد قرآن کی اسی آیت سے واضح ہوتا ہے۔ عنداللہ کی شرط لگا کر یہی ثابت کیا گیا ہے کہ سب مسلمان ”اللہ کے نزدیک“ برابر ہیں۔ اعمال آخرت میں دیکھے جائیں گے، دنیا کے معاملات میں

صلاحیتوں اور ہنر مندی کا امتیاز قبیلے اور برادری ہی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔(یہ موضوع مستقل ایک بحث کا حامل ہے،ان شاءاللہ پھر کبھی اس پر تفصیل سے کلام کریں گے)۔خیر بات طویل ہوگئی!

تو دارالعلوم پہ قبضہ کے بعد تمام تر حکومت مولوی اسعد مدنی کی چلنے لگی،کس کی شوریٰ،کیسی شوریٰ،میٹنگ تو ہوتی؛ لیکن فیصلہ فقط ایک شخص کا چلتا۔جب ڈاکٹر شمیم صاحب نے ہنگامے کے بعد جامعہ طبیہ کے بارے میں بات کرنا چاہی تو کوئی بات نہ بن سکی،پھر آپ نے دہلی میں مقیم حکیم عبدالحمید اور حکیم عبدالرزاق صاحب سے ملاقات کر کے جامعہ طبیہ کی بحالی کے لیے گفتگو کی،انہوں نے دارالعلوم میں بات چلائی؛ لیکن دس لاکھ روپیے جمع نہ کرنے کی بات کہہ کر معاملہ ختم کرنا چاہا،تو ڈاکٹر شمیم صاحب نے کہا کہ آپ دارالعلوم سے یہ شعبہ ختم نہ کریں،رقم کا انتظام ہم طب پڑھنے کے خواہش مند حضرات سے ڈونیشن لے کر پورا کرلیں گے؛ لیکن ڈاکٹر شمیم احمد صاحب کی محنت اور تگ و دو کو نظرانداز کر دیا گیا۔ حکیم عبدالحمید اور حکیم عبدالرزاق صاحب نے کہا تھا کہ:''ڈاکٹر شمیم صاحب خواہش تو ہماری بھی یہی ہے کہ یہ شعبہ قائم رہے؛ لیکن موجودہ حالات میں جو لوگ دارالعلوم پہ قابض ہیں وہ کسی کی صحیح بات سننے کا ہنر نہیں رکھتے،انہیں قیادت پسند ہے اور قیادت کا مزاج رکھنے والے صرف حکم دینے کے عادی ہوتے ہیں،حکم ماننے کے نہیں''۔اس طرح مولوی اسعد مدنی کی حکومت میں یہ طبِ یونانی کا شعبہ دارالعلوم سے ختم کر دیا گیا۔فاضل مرتب صاحب جن مولوی اسعد مدنی کو کتاب کے صفحہ نمبر ۱۰۸ پر امیرالہند اور فعال و مؤثر قیادت کرنے والا بتارہے ہیں،اگر وہ حقیقت میں فعال قائد ہوتے تو ایک اہم تعلیمی شعبہ کو ختم نہ کرتے؛ بلکہ اسے مزید پروان چڑھاتے۔اور اگر اس وقت کے حالات سازگار نہ تھے تو دو چار سال بعد،دس سال بعد کبھی تو کوئی ایسا کام کر دیتے جس سے دارالعلوم کے اس شعبہ کو حیات مل جاتی؛ لیکن ایسا نہیں ہوا۔اور دارالعلوم ہمیشہ کے لیے طبِ یونانی کی تعلیم دینے سے محروم کر دیا گیا۔اس کے بعد ڈاکٹر شمیم احمد صاحب نے ۱۹۸۷ میں جامعہ طبیہ دیوبند کے نام سے ایک میڈیکل کالج قائم کیا جو الحمدللہ آج تک امت کو فائدہ پہنچا رہا ہے۔

....

یہ تھی تفصیل جامعہ طبیہ کو ختم کرنے کی،جس کو فاضل مرتب نے بس ایک جملہ لکھ کر نظرانداز کر دیا۔

رب السمٰوات والارض کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے۔اس مضمون کی کتابت بھی ہو چکی تھی اور ہم آگے کے تقریباً پچاس صفحات مزید تحریر کر چکے تھے کہ تبھی ترجمانِ دارالعلوم کا مولانا وحیدالزماں کیرانوی نمبر نظر سے گزرا جو ۵۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔اس کے صفحہ ۳۸۶ پر ہمیں وہ عبارت ملی جو ہماری درج بالا حقیقت کو مدلل بناتی ہے۔اللہ کا شکر ہے کہ پوری کتاب میں کوئی بات بھی بلا دلیل یا غیر معتبر نا لکھنے کا ہمارا ارادہ فضل ربی کے طفیل ہر عنوان پر پورا ہو رہا ہے۔قارئین! یقین کیجیے آئندہ صفحات میں بھی ہم جو کچھ لکھیں گے وہ صدفی صد سچ ہوگا،حق ہوگا۔آپ دیکھ لیجیے! جو بات ہم نے لکھی ہے وہی ترجمان دارالعلوم کے اس ضخیم نمبر میں بھی درج ہے۔مولانا

محمد مزمل الحق الحسینی صاحب کے مضمون میں تحریر ہے:

"جامعہ طبعیہ" دارالعلوم دیوبند کا ایک نہایت قابل قدر اور فعال شعبہ تھا، جس نے حضرت مہتمم (مولانا قاری محمد طیبؒ) صاحب کی خصوصی دلچسپیوں کی وجہ سے ہندوستان کے طبی اداروں میں ایک خاص مقام حاصل کرلیا تھا، اس کے فضلاء کامیاب اطباء کی حیثیت سے ملک کے طول و عرض میں آج بھی فن طب کی نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ افسوس! کہ دارالعلوم کی موجودہ انتظامیہ نے ایک خاص پس منظر کے تحت قانونی مجبوریوں کا بہانہ لے کر اس اہم شعبہ کو بند کردیا۔ اس شعبہ کے بند ہونے پر عالی جناب حکیم عبدالحمید صاحب قبلہ نے خلافِ عادت ایک اخباری بیان جاری کر کے اپنے افسوس و احتجاج کا اظہار فرمایا تھا۔ اور پیش کش فرمائی تھی کہ اگر دارالعلوم کی انتظامیہ اپنے اس فیصلے سے رجوع کرے تو وہ موہومہ قانونی اڑچنوں کو دُور کرنے میں مدد کرسکتے ہیں۔" (ترجمان دارالعلوم کا وحید الزماں کیرانوی نمبر)

دیکھ لیا قارئین آپ نے! ہر لفظ سے ہمارے درج بالا اقوال کی تصدیق کس عمدگی کے ساتھ ہو رہی ہے۔ سچ کی یہی خوبی ہوتی ہے، اس کو بیان کرنے والے کتنے بھی لوگ ہوں وہ بدلتا نہیں۔ دیکھ لیجیے جو ہم نے کہا وہی مولانا مزمل بھی کہہ رہے ہیں۔

....

صفحہ نمبر ۹۵ پہ مولانا محمد میاں صاحب کے انتقال کی خبر ہے، تاریخ لکھی ہے ۷ رشوال ۱۳ را کتوبر ۱۹۷۵ اور اسی کتاب میں صفحہ ۶۴۸ پہ لکھا ہے کہ آپ کا انتقال ۱۶ رشوال ۲۲ را کتوبر ۱۹۷۵ کو ہوا۔ اب اس تضاد کو کیا نام دیں۔ صحیح تاریخ وفات کیا ہے یہ کیسے پتہ چلے گا؟

....

صفحہ نمبر ۹۶: ۱۸:۱۱ رواں سال ۸۰-۱۹۷۹ کے تحت یہ عبارت لکھی ہے:

"۲۱، ۲۲، ۲۳ رمارچ ۱۹۸۰ء (جمادی الاولیٰ ۱۴۰۰ھ) میں دارالعلوم کا تاریخ ساز اور عہد آفریں صد سالہ اجلاس عام ہوا جس میں پندرہ سے بیس لاکھ مسلمانوں نے شرکت کی۔ ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش کے علاوہ ایشیا، افریقہ اور امریکہ و یورپ کے آٹھ ہزار سے زائد سرکاری نمائندے، وفود اور مندوبین نے شرکت کی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کا یہ عظیم الشان اجلاس تھا۔ جس کی گونج سارے عالم میں محسوس کی گئی اور جس نے اتحادِ ملت اور اشاعتِ اسلام کی نئی شاہراہیں تیار کیں۔"

قارئین! یہ عبارت ہم نے اس لیے مکمل نقل کی ہے تاکہ کوئی یہ الزام نہ لگائے کہ بیچ میں سے ایک دو سطر نقل کرکے

بات کا مطلب بدل دیا۔اصل کتاب"دارالعلوم کی جامع ومختصر تاریخ" کے گزشتہ صفحات میں آپ نے بار ہا پڑھا ہے کہ دارالعلوم میں گاہے بہ گاہے کسی نہ کسی بڑی شخصیت کی آمد ہوتی رہی ہے۔اور فاضل مرتب نے ہر آنے والے کا تذکرہ لازمی کیا ہے۔

کبھی کسی صدر نے کبھی کسی شاہ نے تو کبھی منسٹر نے دارالعلوم کا دورہ کیا۔غرض یہ کہ دارالعلوم میں جب بھی کوئی نامور شخصیت آئی اس کا ذکر اس کتاب (دارالعلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ) میں کیا گیا ہے؛ لیکن ۱۹۸۰ کے صدسالہ جلسہ میں اندرا گاندھی کی آمد کا ذکر آپ کو نقل کردہ اقتباس میں نہیں ملے گا، آخر کیوں فاضل مرتب نے ملک کی وزیراعظم جیسی مشہور شخصیت کی آمد کا ذکر یہاں نہیں کیا؟ اور فقط درج بالا اقتباس ہی نہیں؛ بلکہ پوری کتاب میں کہیں بھی اندرا گاندھی کی آمد کا ذکر نہیں ملتا، حالانکہ گزشتہ صفحات کے علاوہ آئندہ صفحات یعنی صفحہ نمبر ۱۱۰ پہ سن ۲۰۱۰ میں دارالعلوم کا دورہ کرنے والے تمام ہی لوگوں کا تذکرہ کیا ہے، کیا نہیں تو بس اندرا گاندھی ہی کا ذکر نہیں کیا۔اس پردہ پوشی کا سبب تو فاضل مرتب ہی بتاسکیں گے، ہم تو فقط اتنا سمجھ سکتے ہیں کہ علماء دین کے مجمع میں ایک بے پردہ و بے دین عورت کا اسٹیج پر جلوہ افروز ہونا شاید عوام کے سوالوں کا مرکز بن جائے اور فاضل مرتب اس کی وضاحت تحریر نہ کرسکیں کہ ایک عورت عظیم المرتبت علماء کرام کے اسٹیج پر کیوں کر آگئی۔

بلاشبہ اس بات کی وضاحت کرنا فاضل مرتب کے لیے بہت مشکل ہوتا؛ کیونکہ ایسا کرنے کے لیے انھیں حق گوئی سے کام لینا پڑتا اور حق گوئی کرنے میں ہوجاتی مولوی اسعد مدنی صاحب کی مخالفت، اگرچہ یہ کسی طور ممکن نہیں؛ کیونکہ چاپلوسی کرنے والا ذہن کبھی حق گوئی کی جرأت نہیں کرتا۔

یہاں ہم اس موضوع پر زیادہ تفصیل بیان نہیں کریں گے، بس اتنی حقیقت عوام کے سامنے ظاہر کردیتے ہیں کہ دارالعلوم کے مہتمم حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ نے اندرا گاندھی کو نہیں بلایا تھا، وہ تو مولوی اسعد مدنی صاحب نے کانگریس کی عقیدت میں اپنی سیاست چمکانے اور ملک کی وزیراعظم کو ایک جم غفیر کے سامنے لاکر خود کو مسلمانوں کا لیڈر باور کرانے کی غرض مہتمم صاحب سے دعوت نامہ لے کر اندرا گاندھی کو بھیج دیا تھا۔مہتمم صاحب نے منع بھی کیا؛ لیکن صدسالہ اجلاس میں مولوی اسعد صاحب نے کافی چندہ دارالعلوم کے لیے کیا تھا اور پھر ان کی ریشہ دوانیوں کے سامنے قاری صاحب کے انکار کی حیثیت بھی کیا تھی۔بے چارے مہتمم صاحب کو بھی ہامی بھرنی پڑی اور اُسی کے بعد پھر مولوی اسعد صاحب ایم پی بھی بنادیے گئے۔

باتیں تو اور بہت سی ہیں؛ لیکن یہاں مزید تفصیل کی ضرورت نہیں، ہمارا مقصد مولوی اسعد مدنی صاحب کے سازشی ذہن کے کارنامے بیان کرنا نہیں؛ بلکہ دارالعلوم کے موجودہ دور کے مؤرخ کی تاریخ گوئی کا نمونہ پیش کرنا ہے۔

آئیے! اب صدسالہ کے موقع پر کی گئی اندرا گاندھی کی تقریر کا کچھ حصہ بھی آپ کی خدمت میں پیش کردیا جائے تو بہتر۔

ملک کے سب سے بڑے منصب پر فائز انسان نے اسی ملک کے سب سے بڑے مدرسہ کے تاریخ ساز

اور تاحال سب سے بڑے اجلاس میں شرکت کی اور عوام سے خطاب بھی فرمایا اور اس اہم واقعہ کو فاضل مرتب صاحب نے دارالعلوم کی تاریخ میں شامل کرنے کے قابل بھی نہیں سمجھا۔ ہائے یہ فن تاریخ گوئی......

لیجیے تقریر کا کچھ حصہ ملاحظہ فرمائیے:

مسز اندرا گاندھی کی تقریر

دارالعلوم دیوبند نے ملک میں آزادی کا جذبہ اور شعور پیدا کیا ہے

اجلاس صدسالہ کی اس اوّلین نشست میں پندرہ بیس لاکھ انسانوں کے عظیم الشان اجتماع کو وزیراعظم مسز اندرا گاندھی نے خطاب فرمایا ان کی تقریر بہت صاف اور شستہ اُردو میں تھی۔

مسز اندرا گاندھی نے اپنی تقریر میں دارالعلوم دیوبند کی اسلامی تہذیبی اور قومی وملکی خدمات کا بھرپور الفاظ میں تذکرہ کرتے ہوئے پُرزور الفاظ میں خراجِ تحسین پیش فرمایا۔

آپ نے کہا کہ اس چھوٹی سی بستی میں اتنا بڑا کام ہوا ہے اتنا بڑا اجتماع جس میں ساری دنیا سے اسلامی اسکالر علماء اور فضلاء اور دوسرے دانشور شریک ہوئے ہیں یہ بہت بڑی بات ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی عزت اور اس کا مقام دنیائے اسلام میں کتنا بلند ہے۔ مسز گاندھی نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ یہاں بہت اچھے انتظامات کیے گئے ہیں اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

مسز اندرا گاندھی نے فرمایا کہ دارالعلوم دیوبند کے بزرگوں نے ہندوستان کی آزادی کی جو تحریک شروع کی تھی وہ اگرچہ ظاہری اور وقتی طور سے کامیاب نہیں سمجھی گئی؛ لیکن اُس سے لوگوں کے دلوں میں آزادی حاصل کرنے کا جذبہ اُبھرا اور اُمنگ پیدا ہوئی، اور ان ہی کوششوں کی بدولت ہندوستان آزاد ہوا، اسلام اور مسلمانوں نے اس ملک کو بہت کچھ دیا ہے، اس کی ثقافت کو مالامال کیا ہے اور یہاں کی زندگی پر گہرے اثرات قائم کیے ہیں۔

مسز اندرا گاندھی نے یقین دلایا کہ یہاں اقلیتوں کو ہر طرح کی سہولت اور برابر کے حقوق حاصل رہیں گے، وزیراعظم نے آخر میں تمام علمائے کرام مہمانانِ گرامی اور شرکائے اجلاس کو اس اجلاس صدسالہ پر مبارک باد پیش کی اور کہا کہ میری دعا ہے کہ یہ اجلاس پوری طرح کامیاب ہو اور دارالعلوم اسی طرح اسلام، علم و دین و مذہب اور انسانیت کی شاندار خدمت کرتا رہے؛ کیونکہ مخلوقِ خدا کی خدمت سے بڑھ کر کوئی خدمت نہیں ہے۔ (مختصر روداد اجلاس صدسالہ دارالعلوم دیوبند: ص/۲۶)

صفحہ نمبر ۹۷ پہ تیسرا دَور ختم ہوتا ہے اور حسبِ سابق مآخذ کا عنوان دے کر تین نام درج ہیں؛ لیکن کسی کا بھی صفحہ نمبر نہیں لکھا اور تو اور تاریخ دارالعلوم لکھ کر حوالہ دینے کا حق ادا کرنے والے فاضل مرتب صاحب نے دو جلدوں کی اس کتاب کے جلد کا حوالہ بھی نہیں لکھا کہ ماخوذ عبارات جلد اوّل سے ہیں یا دوم سے۔

دارالعلوم دیوبند کا موجودہ دَور

صفحہ نمبر ۹۸ سے ''دارالعلوم دیوبند کا موجودہ دَور'' کے عنوان سے کتاب کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔ ابتداہی میں تصحیح کی غلطی ہے ایک سے چار تک نمبر ڈال کر دَورِ اہتمام کی تفصیل لکھی ہے؛ لیکن ایک اور دو نمبر کی جگہ دوبارہ سے ایک ہی نمبر لکھا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ تصحیح کی غلطی ہے۔

اس کے بعد حضرت مولانا غلام رسول صاحب خاموش کی مدت اہتمام لکھی ہے ۲۰۰۴ تا ۲۰۰۹؛ لیکن کمال یہ ہے کہ اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۱۵ے پہ ان ہی صاحب کے دَورِ اہتمام کی مدت کا سن ۲۰۰۳ تا ۲۰۱۰ تحریر ہے، ساتھ ہی مدت بھی لکھی ہے ''سات سال'' ظاہر سی بات ہے یہ فقط تصحیح کی غلطی نہیں ہے نہ ہی یہ ٹائپ کرنے والے کی غلطی ہے؛ کیونکہ اُس نے تو وہی ٹائپ کیا جو اُس کے سامنے تحریر تھا۔ یہ غلطی اصلاً کتاب کے فاضل مرتب کی ہے، جنھوں نے فن تاریخ کا مذاق بناتے ہوئے پہلے تو بلاتحقیق ۲۰۰۴-۲۰۰۹ لکھ دیا اور جب کتاب کے اختتام پر دارالعلوم کے مہتمم حضرات کی تفصیل لکھی تو کہیں سے غلام رسول خاموش صاحب کی مدتِ اہتمام صحیح معلوم ہوئی ہوگی سو تحریر کردی۔ اِنھیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ کتاب کے آغاز میں یہ اسی شخص کے منصب کو کتنا وقت دے کر آئے ہیں۔

اس کے بعد نمبر (۳) ڈال کر مولانا غلام محمد وستانوی صاحب کے دَورِ اہتمام کی مدت لکھی ہے ''سات ماہ''

غلام محمد وستانوی جیسا فعال شخص، جس کے زیرنگرانی متعدد مدارس و مکاتب، اسکول اور کالج بہت کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں، آخر کیوں؟ ایسا شخص فقط سات ماہ تک ہی دارالعلوم کا مہتمم رہ سکا۔ اور تو اور ان سات ماہ میں غلام محمد وستانوی صاحب نے سات مرتبہ بھی دارالعلوم کے دفتر اہتمام میں قدم نہیں رکھا۔ ایسا کیا ہوا تھا کہ جو شخص دارالعلوم کو تعلیمی اور تعمیری دونوں اعتبار سے ترقی دے سکتا تھا وہ کیوں یہاں مہتمم بن کر نہ رہ سکا؟۔

کمال تو یہ ہے کہ ''دارالعلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ'' لکھنے والے فاضل مرتب صاحب نے مختصر طور پر بھی تو اس بارے میں کچھ نہیں لکھا کہ وستانوی صاحب جب مہتمم بنادیے گئے تھے تو آخر ہٹائے کیوں گئے۔ پوری کتاب میں اس بارے میں کوئی وضاحت درج نہیں ہے۔ بس صفحہ نمبر ۱۱۰ر پر ۱۵۰ رواں سال کے تحت یہ عبارت لکھی ہے:

''دارالعلوم میں حالات خراب ہونے کی وجہ سے ۱۹ر ربیع الاوّل میں مجلسِ شوریٰ دوبارہ بلائی گئی''

کیسے حالات خراب ہوئے اُس کا کوئی ذکر نہیں۔ کس نے حالات خراب کیے اور کس کے کہنے پر کیے، فاضل مرتب نے کچھ بھی تو نہیں لکھا! کیا اسی طرح تاریخ مرتب ہوتی ہے۔ یہ تو وہی بات ہوگئی:

''میٹھا میٹھا ہپ ہپ، کڑوا کڑوا تھو تھو''

یعنی میٹھا میٹھا تو ہپ ہپ کر کے کھالو اور جو کڑوا ہو اُسے تھوک دو۔ غلط! بالکل غلط! تاریخ ماضی میں

گزرے واقعات کو لکھنے کا نام ہے اچھے اور بُرے دونوں طرح کے واقعات ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سیرت نگار مؤرخ کبھی اُن غزوات کا ذکر نہ کرتے جن میں اہلِ ایمان کو فتح نصیب نہیں ہوئی ۔ ناساز گار حالات کے تذکرے سے خالی تاریخ اصل میں تاریخ نہیں؛ بلکہ مدح سرائی ہوتی ہے ۔

کیا ہوا تھا؟ کیسے حالات خراب ہوئے تھے یہ ہم آپ کو تفصیل سے نہ سہی؛ مگر مختصر طور پر ضرور بتائے دیتے ہیں ۔

مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کے انتقال کے بعد تمام ممبرانِ شوریٰ و دیگر خیر خواہانِ دارالعلوم کی نگاہیں منصب اہتمام کے لیے ایک ایسے شخص کی متلاشی تھیں جو دارالعلوم جیسے قدیم اور وسیع ادارے کا اہتمام بہ خوبی سنبھال سکے، اہلِ مدارس کا طبقہ غلام محمد وستانوی کے نام سے اچھی طرح واقف ہے، آپ کے اداروں کی کارکردگی اور روز افزوں ترقی کو دیکھ کر یہی فیصلہ ہوا کہ غلام محمد وستانوی صاحب کو مہتمم بنا دیا جائے، فیصلہ قبول کیا گیا ۔

لیکن ہمیشہ کی طرح مدنی خاندان کو یہ بات گوارہ نہ ہوئی کہ دارالعلوم کا اہتمام ایک ایسے شخص کے ہاتھوں میں چلا جائے جو کہ اس خاندان کے سامنے جی حضوری اور چاپلوسی نہ کر سکے ۔ راقم نے ”ہمیشہ کی طرح“ کے الفاظ پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ تحریر کیے ہیں ۔

مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی رہیں آپ ایک عالم دین اور فعال شخص تھے ۔ حقیقت یہ بھی ہے کہ آپ اوروں کی طرح ایک عام انسان تھے اور انسانی فطرت کے مطابق ہی آپ کا رہن سہن تھا؛ لیکن آپ کے بعد آپ کے فرزندان اور غلو پسند عقیدت مند تلامذہ نے ایسے ایسے غلو آمیز کمالات و کرامات کے ساتھ آپ کا تذکرہ کر کے آپ کو زندہ کیا ہے کہ الامان الحفیظ ۔

آپ کے مزاج کی سختی اور بلاتحقیق سنی سنائی بات پہ یقین کر لینے کی عادت کا تذکرہ کبھی ہندوستان کے کسی حقیقت پسند ذہن سے نہیں نکلتا ۔ مولانا کا مزاج حاکمانہ طبیعت کا تھا، وہ اقتدار کے قائل تھے، اسی لیے کسی کے طابع ہو کر کام کرنا انھیں پسند نہیں تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی اور حضرت تھانوی رحمہما اللہ کا ساتھ نہ دے کر کفار و مشرکین کی حمایت کی ۔ پاکستان کی مخالفت کر کے کفار کی جماعت کانگریس کا ساتھ دیا؛ کیونکہ پاکستان کی حمایت میں آپ کو علامہ شبیر احمد عثمانی کے زیر اثر رہنا پڑتا جو آپ کے حاکمانہ مزاج کے قطعی مطابق نہیں تھا اور کانگریس کی حمایت میں مسلمانوں کی طرف سے آپ ہی سب سے بڑے لیڈر کے طور پر نمایاں تھے؛ اس لیے آپ نے یہ لیڈرشپ اختیار کی اور اہلِ ایمان کی مخالفت کر کے کفار کی حمایت میں لگے رہے ۔

اہلِ دانش اور اہلِ بصیرت کی نظریں بہت دُور اندیش ہوتی ہیں ۔ یہی دُور اندیشی تھی جو حضرت تھانوی اور علامہ عثمانی رحمہما اللہ کو ہنود سے الگ مسلم حکومت کے ساتھ ایک مسلم مملکت بنانے کے لیے کوشاں کیے ہوئے تھی ۔ ویسے تو سن ۴۷ ہی سے اس ملک میں مسلمانوں کے ساتھ سوتیلا رویہ اختیار کیا گیا ہے اور ہر عشرہ میں ملک

کے کسی نہ کسی حصہ میں مسلم کش فساد کا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ ۶۰ کی دہائی میں ہونے والا جبل پور فساد ہو یا اس کے بعد آسام میں مسلمانوں کا قتل عام، پھر ۲۰۰۲ کا گجرات ہو یا ۲۰۱۳ کا مظفر نگر، مسلمانوں کا خون اس ملک کی سڑکوں کو ہمیشہ لال کرتا رہا ہے۔

اور آج تو! یعنی ۲۰۱۸ میں کون ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے محفوظ ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ گلی، محلے، کھیت، بازار، بس، ٹرین کہیں بھی کبھی بھی ہندو شر پسند کبھی کسی مسلم کی ڈاڑھی کاٹ دیتے ہیں، کبھی کسی کو پیٹ کر مار ڈالتے ہیں اور کبھی بھارت ماتا کی جے بولنے کے لیے اذیتیں پہنچاتے ہیں۔ اسی دن کے لیے علامہ عثمانی نے مولانا مدنی سے کہا تھا کہ ”محترم آپ جن کفار کا ساتھ دے رہے ہیں یہ کبھی اہلِ ایمان کے وفادار نہیں ہو سکتے“ اور آج ساری دنیا دیکھ رہی ہے کہ ہندوستان کا مسلمان کس پریشانی و لاچاری میں مبتلا ہے۔ لاچاری تو دیکھئے کہ اپنے مسلم پرسنل لا تک کی حفاظت یہاں کا مسلمان نہیں کر پا رہا ہے، اس کے برعکس پاکستان کا حال بہتر ہے، وہاں کم سے کم یہ خطرہ تو نہیں کہ سفر کے لیے گھر سے نکلتے وقت واپسی کی دہشت میں پورے راستے انسان خوفزدہ رہے۔ پاکستان کے حالات یہاں سے بہت اچھے ہیں، یہ تو ہندوستان کا جھوٹا میڈیا ہے جو وہاں کی غلط تصویر پیش کر کے عوام کو بدگمان کرتا ہے۔

بہر حال قیادت کے شوق میں مولانا مدنی نے کفار کی جماعت کانگریس کا ساتھ دیا اور اسی قیادت کے شوق نے جب دیکھا کہ مولانا مودودی کی جماعتِ اسلامی مشہور اور معروف ہونے کے ساتھ ساتھ عوام میں مقبول ہو رہی ہے تو فقط اس خوف سے کہ اگر جماعتِ اسلامی ہٹ ہوگئی تو جمعیت علماءِ ہند کا مرتبہ کم ہو جائے گا، جس کی وجہ سے ہماری قیادت کمزور پڑ جائے گی، بس پھر کیا تھا سنی سنائی باتوں پر بلاتحقیق یقین کر کے اور مولانا مودودی کی تحریروں میں کتر بیونت کے ساتھ خیانت کی روش اختیار کرتے ہوئے ایسے ایسے بے محل اور بچکانے اعتراض کیے گئے کہ کہیں کہیں تو ہنسی آتی ہے کہ واہ رے سیاست! فقط اقتدار کے لیے کیسے ایک اچھی خاصی تحریر کو بھی غلط ڈھنگ سے بیان کر کے اس میں کیڑے نکال لیے گئے۔ خیر اندھی عقیدت کا چشمہ لگا کر دنیا کو دیکھنے والے حضرات یہ تحریر پڑھ کر زیادہ خفا نہ ہوں؛ بلکہ حقیقت کی کسوٹی پر اسے پرکھیں اور دیانت کے ساتھ مطالعہ کریں۔ درج بالا تحریر میں ایک ایک لفظ سچائی کا ضامن ہے، آپ کو دلیل چاہیے تو پڑھیے۔ حیاتِ عثمانی شائع شدہ دارالعلوم کراچی۔ ۱۹۵۴ سے لے کر ۱۹۵۷ تک کے ماہنامہ تجلی خاص طور پر اپریل ۱۹۵۶ کا، اور پڑھیے ”علامہ شبیر احمد عثمانی کا تحریک پاکستان میں کردار“ ناشر پاکستان اسٹڈی سینٹر پنجاب یونی ورسٹی لاہور۔ ان کتابوں کا مطالعہ کیجیے اور حقیقت سے روشناس ہوئیے۔ مولانا حسین احمد مدنی کے بعد ان کے فرزند ارجمند مولوی اسعد مدنی صاحب نے بھی اپنے اسی مزاج کا مظاہرہ کیا جو اقتدار کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتا۔ انھوں نے بھی جم کر مولانا مودودی کی مخالفت کی، تاکہ

جماعتِ اسلامی کی مخالفت میں کوئی کمی نہ آجائے۔ یہی نہیں جمعیۃ علماء ہند کے علاوہ کبھی کسی اور مسلم تنظیم کو مستحکم ہونے ہی نہیں دیا۔

مسلم مجلس مشاورت قائم ہوئی تو اس کی مخالفت کی اور فقط مخالفت نہیں؛ بلکہ اکتوبر ۱۹۶۶ کو دیوبند میں ہونے والے مشاورت کے جلسہ کو بھی طلبۂ عزیز کو بھڑکا کر برباد کروا دیا گیا۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے اصغریہ کے میدان کا وہ جلسہ اور دارالعلوم کے طلبہ کا ہنگامہ۔ اس کے بعد حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کو پریشان کر کے دارالعلوم پہ قبضہ کرلیا گیا۔

......❖......

اسی لیے ہم نے گزشتہ صفحات میں ''ہمیشہ کی طرح'' کے الفاظ استعمال کیے تھے؛ کیونکہ اس خاندان کا ہمیشہ یہی مزاج رہا ہے اور اسی لیے وستانوی صاحب کے مہتمم بننے کے بعد مولانا ارشد مدنی صاحب نے چند طلبہ کو بھڑکا کر ان کے خلاف نعرے لگوانے شروع کر دیے۔ اسجد مدنی صاحب نے اخبار والوں کو ہینڈل کیا اور لاکھوں روپیے صحافت اخبار کے دفتر بھیج دیے گئے۔ پھر جو کھیل شروع ہوا ہے وہ دیوبند اور دارالعلوم والوں نے تو دیکھا ہی ہے اخبار کے ذریعہ دنیا والوں نے بھی اس کا مظاہرہ کیا۔

کیا کیا نہ صحافت کے نام پر جھوٹ چھاپا گیا۔ ہر اخبار میں وستانوی کی بُرائی کی گئی۔ صحافت اخبار جو دیوبند میں سوڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں آتا تھا، اچانک سے اس کی ۲دو ہزار کاپیاں آنے لگیں اور وہ بھی اس طرح کہ دارالعلوم کے مدنی گیٹ پر ۱۵۰۰ اخبار کا بنڈل اور دارالعلوم وقف کے گیٹ پر ایک بنڈل، مسجد رشید پہ ایک بنڈل چھوڑ دیا جاتا، اِس طرح فری میں اخبار تقسیم کیا گیا اور مولانا وستانوی کے خلاف ماحول بنایا گیا۔ وجہ ان سب کی، بس وہی کہ وستانوی ایک معروف اور مستحکم شخصیت ہے یہ مدنی گروپ کے ماتحت ہو کر کام نہیں کرے گا۔ دوسری بات یہ کہ رشتہ داری بھی ہے۔ سمدھی ہونے کے ناطے ان پہ زور آوری بھی نہیں چلے گی۔ اسی لیے یہاں تو ایسا آدمی لا کر بٹھانا تھا جو دارالعلوم کی چھتہ و رشید مسجد میں لگنے والے اعتکاف کے بازار کی مخالفت کرنے کی جرأت نہ کر سکے جو ہمارے اشاروں پر کام کرنے والا ہو۔ لانا تو مولانا عثمان منصور پوری کو تھا؛ لیکن مصلحت کو مدنظر رکھتے ہوئے مولوی ابوالقاسم نعمانی کو مہتمم بنا دیا گیا۔ اور اب کیونکہ ان کو دنیا میں ایک شناخت مل گئی اور یہ تقریریں بھی خوب کرنے لگے؛ اس لیے دیکھ لینا قارئین جلد ہی اب یہ بھی اس منصب سے علیحدہ کر دیے جائیں گے۔

تو یہ تھی اصل وجہ مولانا وستانوی کو ہٹانے کی۔ معاف کیجیے گا بات ذرا طویل ہوگئی؛ لیکن مدنی خاندان کے مزاج کی تفصیل بتائے بغیر بات آسانی سے سمجھ میں نہ آتی۔ ہم نے ایک لفظ بھی جھوٹ یا الزام کے طور پر نہیں لکھا۔ عوام جن کو فرشتہ سمجھنے لگتے ہیں ان کی کوتاہیاں ظاہر ہونے پر ٹھنڈے دل سے بات پر غور نہیں کرتے؛ بلکہ سچ

بولنے والے سے بدگمان ہوکراس پہ بھڑ کنے لگتے ہیں۔اس وقت بھی ہماری یہ تحریر پڑھ کر نہ جانے کتنے ہوں گے جو ہمیں گالیاں دے کر ہمارے نامۂ اعمال میں نیکیوں کا اضافہ کر رہے ہوں گے اور بہت سے تو عقیدت کے اسیر ایسے بھی ہوں گے جو ہمیں جان سے مارنے کے بارے میں سوچ رہے ہوں گے؛لیکن اللہ جانتا ہے ہم نے یہ حقائق کسی سے ذاتی عناد یا توہین مومن کے جذبے سے قطعاً تحریر نہیں کیے ہیں۔ یہ تاریخ ہے جو چھپائی گئی۔ دَورِ حاضر کے مؤرخ بنے محمد اللہ صاحب جیسے لوگ جب تاریخ مرتب کرتے ہیں تو وہ تاریخی واقعہ کو بیان کرنے کے بجائے بس ایک جملہ لکھ دیتے ہیں کہ ''حالات خراب ہو گئے تھے۔'' یہ تھے وہ حالات جن کو جاننا عوام کا حق ہے؛ کیونکہ دارالعلوم کسی خاندان یا فردِ واحد کی جاگیر نہیں؛ بلکہ عوام کے چندے سے چلنے والا ایک ایسا ادارہ ہے جس کے ہر سفید وسیاہ کا حساب لینا یا اس کے بارے میں جاننا عوام کا مکمل حق ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی یہی تو بدنصیبی ہے کہ انھیں تاریخ کے تلخ حقائق بتانے کے بجائے مفاد پرست علماء تصوف کے نام پر رہبانیت کے اندھیروں میں جھونک رہے ہیں۔ یہاں کے طلبہ میں نہ جہاد کا جذبہ بیدار کیا جاتا ہے نہ ہی تاریخ کی صحیح معلومات فراہم کی جاتی ہے، برعکس اس کے اذکار ومراقبے کی ترغیب دے کر قیادت کے بجائے غلامی واطاعت کی تعلیم کا سلسلہ عام ہے۔اسی وجہ سے ہندوستان کا مسلمان اب ایک خوف کے سائے میں زندگی بسر کر رہا ہے۔اللہ تعالیٰ امت میں دشمن سے لڑنے کا حوصلہ اور اسے زیر کرنے کی طاقت پیدا فرمائے۔آمین یارب العٰلمین

.....❖.....

صفحہ نمبر ۹۸ کے آخری پیراگراف کی سطر نمبر چار میں لکھا ہے کہ:

''اس دَور میں دارالعلوم نے تعلیمی، انتظامی اور تعمیری جہتوں سے خوب ترقی کی''۔

اس جملے میں لفظِ ''تعلیمی'' پر ہمیں اعتراض ہے۔فاضل مرتب نے خالص جھوٹ لکھا ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ دارالعلوم کی تاریخ میں یہی وہ دَور ہے جس میں تعلیمی معیار بد سے بدتر ہوتا چلا گیا۔اور تعلیمی جہت نے ترقی نہیں کی؛ بلکہ انحطاط وزوال کی لامتناہی پستیوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ آج دارالعلوم کا تعلیم یافتہ دنیا میں کسی بھی کام کا نہیں رہتا۔ یہ حقیقت آج ہر انسان اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ روزگار کا ہو گیا ہے۔

پوری دنیا میں جی ہاں فقط بھارت یا ایشیا میں نہیں پوری دنیا میں صرف دارالعلوم سے فراغت حاصل کرنے والے کو کہیں کوئی ملازمت یا کام نہیں ملتا۔جب تک کہ وہ کسی اور ادارے سے کوئی اضافی ڈپلومہ کورس نہیں کر لیتا۔

آپ یہاں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ عالموں کو دنیاوی شعبوں میں تو پہلے بھی ملازمت نہیں ملتی تھی؛ لیکن یہ کہنا غلط ہوگا؛ کیونکہ دارالعلوم کے بانیوں میں سے ایک حضرت مولانا قاسم نانوتوی خود میرٹھ میں ایک اخبار کے لیے تصحیح کا کام کرتے تھے۔ دارالعلوم کے قدیم تعلیم یافتہ آج بھی بہت شاندار زندگی گزار رہے ہیں۔ آج بھی بہت ہیں جو عربی ممالک کے سفارت خانوں میں عرصہٗ دراز سے ملازم ہیں۔ نہ جانے کتنے ہیں جو ترجمان کی حیثیت سے برسرروزگار ہیں۔ غرض یہ کہ پرانے زمانے کا فارغ عربی زبان وادب پر اتنی مہارت رکھتا تھا کہ اُسے کہیں بھی اچھی ملازمت مل جاتی تھی؛ لیکن ۱۹۸۲ یعنی مولوی اسعد مدنی کے دَورِ اقتدار کے بعد سے دارالعلوم میں سب سے زیادہ گراوٹ اور تنزلی تعلیم ہی کے شعبے میں آئی ہے۔ حالانکہ سبھی جانتے ہیں کہ دارالعلوم کے قیام کا مقصد، تعلیمی بہبودی، معاشرتی خوشحالی اور دین کی بقا وتحفظ کے ساتھ ساتھ امتِ مسلمہ کو ایسے صالح افراد فراہم کرنا تھا جو مسلمانوں کو ایک بامقصد اور مستحکم زندگی کی طرف گامزن کرسکیں۔

اور یہی ہوا بھی دارالعلوم دیوبند نے اپنی ابتدا ہی سے امت کو ایسے ایسے نابغہ وصالح افراد عطا کیے ہیں کہ جنھوں نے امتِ مسلمہ میں دین کی روح پھونک کر اُنھیں اسلام کے حقیقی معنیٰ سمجھائے۔ جنھوں نے قرآن و حدیث کی مشکل راہوں کو شائقین علم کے لیے آسان سے آسان تر کر دیا۔ اور دینی علوم کے ایسے چراغ روشن کیے کہ آنے والی نسلیں قیامت تک ان چراغوں کی روشنی سے جہالت کے اندھیروں کو شکست دیتی رہیں گی۔

یہ وہ لوگ تھے جنھیں کبھی روزگار کی فکر نہ ہوئی۔ یہ جہاں جہاں گئے دنیا نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اسی دَور کے فاضلین وتعلیم یافتہ حضرات کو اکابرِ دیوبند کہا جاتا ہے، جس کی فہرست آپ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے تلامذہ کی شکل میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کی تعلیمی ترقی کا دَور اس کی ابتدا سن ۱۸۶۶ سے ۱۹۶۵ تک کا دَور ہے۔ ان سو سالوں تک دارالعلوم حقیقی معنوں میں اکابر ستہ کے خوابوں کا محل رہا ہے۔ ان ہی سو سالوں میں دارالعلوم نے خالص علوم دینیہ کے علمبردار کی حیثیت سے اپنی شناخت بنائی ہے۔ ان ہی سو سالوں میں دارالعلوم سے مفسر بھی پیدا ہوئے اور محدث بھی، فقیہ بھی پیدا ہوئے اور مبلغ بھی؛ لیکن ۱۹۶۵ کے بعد دارالعلوم وہ دارالعلوم نہ رہا جس کے فارغ قرآن کی تفسیر کیا کرتے تھے۔ احادیث کی تفہیم کیا کرتے تھے۔ ۱۹۶۵ کے بعد دارالعلوم دیوبند اخلاص کا تاج محل نہیں رہا؛ بلکہ مولوی اسعد مدنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ریشہ دوانیوں کا مسکن بن گیا۔ سیاست کا اکھاڑہ بن گیا۔ جس کے بعد دارالعلوم کے طالبِ علم کو پڑھائی کی طرف توجہ کرنے کے بجائے اُسے جمعیۃ علماء ہند کے جلسوں کی تیاری کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ اور تو اور دوسری مسلم تنظیموں کے اجلاس کو برباد کرنے کے لیے بھی دارالعلوم کے طالبِ علم ہی کام میں لائے جانے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیمی معیار میں جو گراوٹ شروع ہوئی وہ بد سے بدتر حالت پر پہنچتے پہنچتے آج سب کے سامنے ہے۔ آج دارالعلوم ایک سال میں

تیس ۳۰۰ر کروڑ روپئے خرچ کرنے کے بعد بھی ایک ایسا عالم پیدا کرنے میں ناکام ہے جو مفسر بھی ہو اور محدث بھی۔ بتائیے ۳۰۰ر کروڑ روپئے خرچ کرنے کے بعد ایک بھی آدمی تیار نہیں کیا جارہا ہے، یہ ادارے کی ناکامی نہیں تو کیا ہے۔ بتائیے! ایسا کون سا طالبِ علم دارالعلوم سے نکل رہا ہے جسے دنیا ہاتھوں ہاتھ لے رہی ہو۔

درج بالا باتیں کوئی الزام نہیں ہیں؛ بلکہ ہم سب کچھ دلیل و برہان کے ساتھ واضح کریں گے کہ کیسے اکتوبر ۱۹۶۶ میں مولوی اسعد صاحب نے مسلم مجلس مشاورت کے جلسے کو دارالعلوم کے طلبہ کے ذریعہ تباہ کروایا تھا۔ اس کی تفصیل مولوی اسعد صاحب کے تذکرے میں ملاحظہ کیجیے گا۔ سن ۲۰۰۶ کے تحت۔

۱۹۶۵ کے بعد دارالعلوم میں مولوی اسعد مدنی صاحب کا زور بڑھنا شروع ہوگیا تھا اور یہ زور دھیرے دھیرے مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ کوئی علمی صلاحیت تو موصوف کے اندر تھی نہیں؛ اس لیے تدریس کا سلسلہ بھی اہلِ ذوق طلبہ کی درخواست کے سبب بند ہوگیا تھا۔ طلبہ نے اہتمام میں درخواست دی تھی کہ محترم مولانا اسعد مدنی صاحب ایسے انداز سے پڑھاتے ہیں کہ کچھ سمجھ نہیں آتا؛ اس لیے برائے مہربانی ہمارے لیے کسی دوسرے استاذ کا انتخاب فرمادیں تو نوازش ہوگی۔

ایسے ایسے دن بھی دارالعلوم کی تاریخ میں آئے ہیں کہ نااہل استاذ کو طلبہ نے درخواست دے کر تبدیل کروایا ہے۔

بہرحال یہ تعلیمی زوال ۱۹۸۰ کے بعد تو اپنے عروج کو جاپہنچا۔ جب صدسالہ کے بعد قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی دارالعلوم سے الگ ہوگئے پھر اس زوال کا سیاہ سورج طلوع ہوا۔ ۲۳ر مارچ ۱۹۸۲ کا وہ ناقابل فراموش دن جب مولوی اسعد مدنی صاحب کے کارندوں نے دارالعلوم پہ قبضہ کرکے مائک پہ بہ آوازِ بلند نصر من اللہ وفتح قریب ایسے پڑھی جیسے کفار و مشرکین سے جنگ جیتی ہو۔ اگرچہ یہاں نہ کفار مقابل تھے اور نہ ہی مقصد دین اسلام کی بقا تھا۔ اقتدار کی ہوس نے دارالعلوم جیسی دینی درسگاہ کو بھی سیاست کا میدان بنا کر رزم آرائی کا نمونہ دکھادیا، جس دَور کو محمد اللہ نام کے فاضل مرتب صاحب تعلیمی ترقی کا دَور کہہ رہے ہیں، اِس دَور کے ذرا ایک کسی ایسے فارغ کا نام تو کوئی ہمیں بھی بتادیں جس کے علم کا شہرہ دنیا بھر میں نہ صحیح ملک بھر میں ہی ہو رہا ہو۔ ۱۹۸۰ سے لے کر ۲۰۱۸ تک یعنی تقریباً چالیس سال۔ ذرا کوئی بتائے کہ ان چالیس سالوں میں دارالعلوم دیوبند نے کتنے طلبہ فارغ کیے ہیں جن کے علم کا ڈنکا دنیا بھر میں بج رہا ہو۔ یا کتنے فضلاء دنیا کو دیے ہیں جنھوں نے رہنما و قائد کی حیثیت سے ہندوستان کے مسلمانوں کی ترقی کے لیے کچھ کردیا ہو۔ یا کتنے ایسے صالح عالم امتِ مسلمہ کو بخشے ہیں کہ جنھوں نے قرآن پاک کی تفسیر کی ہو۔ یا حدیث کے موضوع پر کوئی بڑا کام کیا ہو۔ افسوس ہے کہ چالیس سالوں میں دارالعلوم ایک مفسر تک پیدا نہیں کرسکا۔ اور اگر کوئی ہو جو ہماری معلومات کی دسترس سے باہر رہ کر کام کرگیا ہو تو برائے کرم ہمیں ای میل پر ضرور مطلع کریں تاکہ ہم اپنی اصلاح فرمالیں۔

تعلیمی ترقی کا ایک معنیٰ یہ بھی ہوتا ہے کہ ادارے میں تعلیم کے جدید شعبے قائم کیے جائیں۔ اصل تعلیمی ترقی اُسی کو کہتے ہیں جس میں مختلف علوم وفنون کی تعلیم سے طلبہ کو آراستہ کیا جاتا ہے۔ پہلے سے قائم شدہ علمی شعبہ جات کو ختم کرنے کا نام تعلیمی ترقی نہیں ہوتا۔ فاضل مرتب صاحب نے دارالعلوم کے قدیم دَور کو نہیں دیکھا اسی لیے معلومات کی کمی اور اندھی عقیدت کے طفیل اس دَور نا مسعود کو وہ دارالعلوم کے لیے تعلیمی ترقی کا دَور کہہ رہے ہیں۔ کیا مؤرخ صاحب کو نہیں معلوم کے علوم طب کا شعبہ بنام جامعہ طبیہ اسی تعلیمی ترقی کے دَور میں ختم کیا گیا۔ اور دارالعلوم سے معقولات وفلسفہ کی تعلیم میں کمی بھی اس دَور کی دَین ہے کمال تو یہ ہے کہ فارسی کے ابتدائی چار سالہ کورس کو بھی اسی دَور میں سمیٹ کر کم کر دیا گیا ہے۔ تعلیم کی اس غیر معمولی تنزلی کو فاضل مرتب صاحب تعلیمی ترقی کہہ رہے ہیں۔ ہائے یہ کج فکریٔ عقیدت منداں، ہائے یہ سادہ لوحی۔

ہاں! موجودہ دَور کی تعلیمی ترقی یہ تو ہوئی ہے کہ طلبہ کے اندر عربی کی استعداد کم سے کم ہوتی جارہی ہے۔ شروحات نے طلبہ عزیز کی صلاحیتوں کو ہمیشگی کا گھن لگا دیا ہے۔ مقام افسوس تو یہ ہے کہ یہ شروحات کا زہر خود اساتذہ کے ہاتھوں سے طلبہ کی علمی زندگی میں گھولا جارہا ہے۔ پیسہ کمانے کے لالچ میں دارالعلوم کے اکثر استاذ شارح بن کر کتاب چھاپنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اور اس کام پر اہتمام کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہیں کی جاتی۔

بد سے بدتر حال تو اب نوٹ نے کر رکھا ہے، جس طالبِ علم کو دیکھو وہ گزشتہ سالوں کے امتحانی پرچے جمع کر کے نوٹ تیار کر رہا ہے، ہر کتاب کا نوٹ بازار میں موجود ہے۔ اب تو طلبہ نے بالکل ہی محنت سے پڑھنا چھوڑ دیا۔ تمام تو نہیں؛ لیکن ۹۵ فیصد طلبہ وہ ہیں جو دارالعلوم میں صرف سند لینے آتے ہیں پڑھنے نہیں۔ اور کمال تو یہ ہے کہ کم نسب اور لاشعور و بے بصیرت نظر رکھنے والے اساتذہ کو اس کا احساس تک نہیں ہے! کیا اسی کو تعلیم کی ترقی کہتے ہیں؟ حیف صد حیف! چاپلوسی کی بھی حد ہوتی ہے، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مولوی محمد اللہ صاحب دارالعلوم کے تعلیمی معیار میں آئی گراوٹ کا تفصیل سے تذکرہ کر کے مہتمم صاحب سے اس کی اصلاح کا تقاضہ کرتے۔ اصل تاریخ وہی ہوتی ہے جس میں ماضی کے غلط فیصلے یا بُرے واقعات کو پڑھ کر مستقبل میں صحیح فیصلے لینے کا شوق اور حوصلہ پیدا ہو۔

جس دَور کو فاضل مرتب صاحب ترقی پذیر دَور کہہ رہے ہیں اُسی دَور کے طالبِ علم کرکٹ کے شوق میں ایسے گرفتار ہیں کہ پوچھیے مت۔ دیوبند میں کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا کہ کوئی آدمی اپنے گھر کے کسی بڑے ہال کمرے میں ٹی وی پر کرکٹ میچ چلا کر لوگوں کو دکھائے اور ان سے پیسے وصول کرے۔ ہمیں یاد ہے اس کی شروعات ۱۹۹۶ کے ورلڈ کپ سے ہوئی تھی۔

ایک دوکاندار جس کی دوکان میں ٹی وی رکھا تھا اُس سے دارالعلوم کے دو یا تین طالبِ علم جو دوست تھے انہوں نے کہا کہ آپ اپنے ٹی وی پر ہمیں میچ دکھائیں، بدلے میں ہم سے کرایہ وصول کرلیں۔ اُس آدمی نے اپنی

بیٹھک یعنی گھر کے باہری کمرے میں ٹی وی لگا کر ان طلبہ کو چھوڑ دیا اور وہ آرام سے آٹھ گھنٹے کا پورا میچ دیکھ کر باہر نکلتے۔ یہ بات دیگر شوقین طلبہ کو معلوم ہوئی تو وہ بھی اس نیک کام میں شریک ہو گئے بس پھر کیا تھا بات پھیلنی شروع ہوگئی کہ فلاں جگہ میچ دکھایا جارہا ہے۔ اب تو طلبہ کا ایک ہجوم میچ دیکھنے کے لیے اُمڑ آیا تھا۔ ہم نے خود دیکھا ہے محلہ ابوالمعالی کی شگفتہ منزل میں ایک وقت سات سے آٹھ سو طلبہ میچ دیکھتے تھے۔ ایک طالبِ علم سے پانچ روپیے کرایا لیا جاتا تھا۔

پھر تو یہ سلسلہ اتنا بڑھا کہ دیوبند میں جگہ جگہ میچ دکھائے جانے لگے اور مختلف مقامات پر بلا مبالغہ ہزاروں طلبہ میچ دیکھتے ہیں۔

قارئین یقین کیجیے! اللہ گواہ ہے آج بھی جب کبھی کسی گھر سے طلبہ کا غول میچ دیکھ کر باہر آتے ہوئے دیکھتا ہوں تو دل روتا ہے۔ ذہن متفکر ہوتا ہے کہ جس قوم کے نوجوانوں کو اپنے مستقبل اور اسلام کی بقا کے لیے فکرمند ہونا چاہیے، اس قوم کا یہ حال ہے کہ روزانہ آٹھ گھنٹے یہ کس بے دردی سے برباد کر رہے ہیں۔ یہود وہنود اس قوم کو برباد کرنے میں مصروف عمل ہیں۔ ان کی ریشہ دوانیاں گہری سے گہری تر ہوتی جارہی ہیں اور ایک ہماری قوم کا وہ طبقہ ہے جسے صالح ہونا چاہیے تھا، مصلح ہونا چاہیے تھا، امیر ہونا چاہیے، حاکم ہونا چاہیے تھا اور یہ ہے کیا؟ بیڑی پیتے ہوئے، پان مسالہ منہ میں دبائے اسلامی تاریخ کے سب سے بُرے دَور کا بدترین نمونہ! حیف صد حیف!

عزیز طلبہ یہ فلمیں، یہ میچ یہ جھوٹی خبروں کی بے سود بحثیں بلاشبہ اہلِ خرد، اہلِ علم اور اہلِ شعور کے لیے ہرگز نہیں ہیں، یہ سازش ہے نوجوانوں کو اُلجھائے رکھنے کی۔ یاد رکھو اگر زندگی میں کچھ کرنا ہے تو ایمانداری سے پڑھو، اہلِ علم کی تحریریں پڑھو۔ سنتِ نبوی کے مطابق زندگی گزارو، پیارے بچوں محنت کرو۔ تعلیمی دَور بہت جاں فشانی کا دَور ہے، اس وقت کو برباد مت کرو، یہ کرکٹ وفٹ بال کے میچ تمہارے کام نہیں آئیں گے۔ یہ واٹس ایپ اور یوٹیوب سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اپنے اکابر کی کتابیں پڑھو، تفاسیر کا مطالعہ کرو، دھیان رکھو اگر زندگی میں کچھ بننا ہے تو محنت کرو، جھونک دو اپنے آپ کو علم کی بھٹی میں، سونا بغیر آگ میں جلے کبھی نہیں نکھرتا۔ کاش! کہ یہ نصیحت کسی کے دل میں اُتر جائے۔

بڑی تکلیف ہوتی ہے امت کے نوجوانوں کو اس حال میں دیکھ کر اللہ نے تو حیات کے ساتھ ساتھ نظامِ حیات بھی عطا کیا ہے کامیابی وکامرانی کی راہیں بھی بتادی ہیں؛ لیکن کیا کریں ہم آپ ہی اپنے دشمن ہیں۔ اسلامی تاریخ کے سنہرے دَور کو دیکھیں تو شرم آتی ہے، کیا تھے ہم اور کیا ہو گئے ہیں۔

اس وقت دیوبند کے ہی کسی شاعر کا شعر یاد آرہا ہے ؎

کل تلک آہنی تیغوں کے مجاہد تھے مگر!
آج ہم لکڑی کی تلوار تک آ پہنچے ہیں

تعلیمی ودیگر ترقی کا ذکر کرتے ہوئے اس جملے کے ساتھ پیرا گراف ختم ہوتا ہے۔

''ذیل کے صفحات میں دارالعلوم کی اسی ترقی کی جھلک پیش ہے'' (دارالعلوم کی جامع ومختصر تاریخ صفحہ ۹۸)

مقامِ افسوس ہے کہ تنزلی کو ترقی کا نام دے کر کتنی صفائی سے جھوٹ عوام تک پہنچایا جارہا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے مودی جی اپنی ناکام حکومت کی ناکامیوں کو خوبیاں بتا کر بیان کرتے ہیں، نوٹ بندی سے ملک کی معیشت تباہ ہوگئی، مہنگائی آسمان چھونے لگی؛ لیکن بھاجپا کے چاپلوس چمچے یہی کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ دیش ترقی کررہا ہے۔نوٹ بندی سے بڑا فائدہ ہوا ہے۔ بالکل یہی روش فاضل مرتب نے اختیار کی ہے۔ دارالعلوم جو ۱۹۸۲ کے بعد مکمل طور پر مولوی اسعد مدنی صاحب کے زیراثر ہوکے رہ گیا تھا، جس نے تعلیمی میدان میں انحطاط کی مثال قائم کردی، وہ یہ کہ چالیس سال میں ایک بھی توڈھنگ کا مفسر یا محدث یا عالم اس ذرخیز ادارے سے نہیں نکل سکا۔ مولانا ندیم الواجدی ہوں یا مولانا حسن الہاشمی اور مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ہوں یا عام علمی کام کرنے والے علماء حضرات سب ۱۹۸۰ سے پہلے کے فارغ ہیں۔ بہرحال چلیے آگے چلتے ہیں۔اگلے صفحہ سے فاضل مرتب کی چاپلوسی کا مظاہرہ مزید سے مزید تر کی طرف رونما ہے۔

۱۱۹واں سال ۱۴۰۱ھ/ ۸۱-۱۹۸۰

اُس ذاتِ لم یزل کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اب تک ہم نے جو بھی لکھا ہے وہ حق بیانی کے جذبے سے لکھا ہے، پوری دیانت کے ساتھ لکھا ہے، اعتماد اور وثوق سے لکھا ہے۔ان شاء اللہ یہی روش کتاب کے آخری صفحہ تک قائم رہے گی۔ یہ بات یہاں اس لیے بتائی ہے؛ کیونکہ اب جو گفتگو ہوگی وہ انتہائی سنگین دَور کی ہوگی۔ دارالعلوم کی تاریخ کے سب سے سیاہ باب کی ہوگی۔ جو دشمن تھے ایسے احباب کی ہوگی، جو تھے لالچی بس قیادت کے اپنی اُنہیں کانگریسی ارباب کی ہوگی۔ یہ گفتگو بھی ہم اللہ کو حاضر وناظر جان کر بلاشبہ پوری صداقت اور تحقیق کے ساتھ کریں گے، یہ چند سطریں فقط اس لیے نوکِ قلم سے نکلی ہیں، تاکہ آپ آئندہ صفحات میں بیان ہونے والے حقائق کو پڑھ کر کسی عقیدت مندی میں مبتلا ہوتے ہوئے ہم سے بدگمان نہ ہوں۔ گزشتہ صفحات میں بھی ہم نے کہیں لکھا ہے کہ معلومات کی کمی کے سبب کسی بھی نئی اور حیران کن بات کا علم ہونے پر سامنے والے سے بدگمان نہیں ہونا چاہیے، ممکن ہے تحریر شدہ بات صحیح ہو اور آپ کی معلومات کم۔

کتابی دنیا میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں، جیسے علامہ شبلی نعمانی کی ''الفاروق''۔حضرت عمر فاروقؓ کی سیرت نگاری میں علامہ شبلی نے بڑی تحقیق وعرق ریزی سے کام کیا ہے۔حالانکہ کبھی کبھی کسی کو شبلی کے الفاظ سخت معلوم ہوتے ہیں اور حضرت عمرؓ کے مزاج کے بارے میں شبلی کے بیان کو بہت سے عقیدت مند غیر ذمہ دارانہ جملوں سے تعبیر کرتے ہیں؛ لیکن حقیقت میں علامہ شبلی کے الفاظ نہ خلافِ تحقیق ہیں نہ غیر ذمہ دارانہ، ہاں! بزرگوں کی جو افسانوی نوع کی تصویریں ہم

لوگ اپنے ذہنی فریم میں فِٹ کرنے کے عادی ہو گئے ہیں اُس کے اعتبار سے بے شک شبلی کے الفاظ قدرے سخت ہیں ۔حضرت عمرؓ کتنے بھی عظیم القدر رہوں؛ مگر کیا اس حقیقت سے بھی انکار ممکن ہے کہ ان کے مزاج میں وہ نرمی و شگفتگی اور رافت وگداز کی وہ کیفیت نہیں تھی جو نبی کریم ﷺ میں تھی، حضرت ابو بکرؓ میں تھی، حضرت عثمانؓ میں تھی۔ یہ اللہ کی خلقت ہے۔کسی بھی صحابیؓ یا نبیؑ کے مزاج و سیرت کے کسی خاص پہلو کو صحت کے ساتھ بیان کر دینا توہین و تحقیر ہرگز نہیں ہے۔ نہ ہی شبلی نے حضرت عمرؓ کی کیفیت مزاج بیان کر کے ان کی اہانت کا ارادہ کیا ہے۔

بحمد اللہ ہمارا مقصد بھی تاریخی حقائق بیان کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں،کسی شخصیت سے ذاتی عناد و بغض کی کیفیت سے اللہ پاک محفوظ رکھے۔

دار العلوم کی تاریخ کا یہ سیاہ باب بھی ہم اس لیے آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں تا کہ جن سیاسی اشخاص کو لوگوں نے پیری مریدی کے سہارے فرشتوں کی صفوں میں لا کر کھڑا کر دیا ہے ان کی ریشہ دوانیوں سے بھی آپ واقف ہو جائیں۔

دولت اور اقتدار وہ ظالم شے ہیں جن کا حصول انسان کو ایسا حاکم بنا دیتا ہے کہ اُس کی دسترس سے باہر اور مرضی کے خلاف عوام کے فیصلے نہیں جاتے۔ یہی ہوا بھی۔مولوی اسعد مدنی صاحبؒ ایک بااثر شخصیت تھے اور سیاسی ہونے کے سبب جابر و سفاک بھی تھے،اسی لیے کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ ان کے خلاف زبان کھول سکے۔ یہی حال آج بھی ہے انتقام اس خاندان کی سرشت میں ہے؛اس لیے آج بھی کوئی چالیس سال قبل دار العلوم کے قبضے کی صحیح تاریخ بیان نہیں کرتا۔سب کو معلوم ہے کہ کچھ پتہ نہیں سچائی سامنے آنے کے بعد ارشد و محمود مدنی کس قسم سے حق گو کو سبق سکھائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ دار العلوم وقف جیسے بلند ادارے سے حیاتِ طیب دو جلدوں میں شائع ہوئی اور اس میں قاری طیب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے اہم باب کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا،اِس بابت جب اشاعتی ادارے کے ناظم سے معلوم کیا کہ آپ نے اس میں قبضے کے حالات کیوں نہیں لکھے؟ تو اُن کے الفاظ یہ تھے:

”بھائی سچائی لکھ کر ان سے مخالفت کون مول لے گا۔یہ بہت مضبوط پوزیشن میں ہیں؛اس لیے ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ جو ہو گیا سو ہو گیا۔مولانا اسعد بھی اب نہیں رہے تو اب پرانی باتیں کرنے سے کیا حاصل“۔

اس جواب پر سامنے والے نے کہا:

”تو اس کا مطلب آپ ڈر گئے مدنی گروپ سے؟“

”ہاں یہی سمجھ لو! بھائی ڈرنا پڑتا ہے“

اس کے بعد اس موضوع پر اور کوئی بات ناظم صاحب نے نہیں کہی۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں مدنی خاندان سے مشہور مولوی اسعدؒ کے گھرانے کا ہر فرد منتقم مزاج ہے، چاہے کتنا بھی وقت گزر جائے یہ لوگ اختلاف کو بھولتے نہیں اور انتقام ضرور لیتے ہیں، اِس بات کی بھی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ سچ بولنے والے کو انہوں نے ہمیشہ سزائیں دی ہیں۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ہوں یا حکیم الاسلام قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ہوں یا مولانا وحید الزماں کیرانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ یا پھر دَورِ حاضر کے افراد۔

اس خاندان کے نامور حضرات نے ملتِ اسلامیہ کی عظیم شخصیات کو غم بھی دیے ہیں اور تکلیف بھی۔

ایک مثال پیش کر کے بات ختم کرتے ہیں دارالعلوم کے سابق استاذ قاری رفعت قاسمی صاحب نے اپنی ترتیب شدہ کتاب مسائل تراویح میں رمضان کی جماعت۔ نوافل کے بارے میں جو سچ ہے وہی لکھا ہے یعنی نوافل کی جماعت مکروہ ہے۔ اور مدنی خاندان اس عمل کو بڑے اہتمام سے انجام دیتا ہے۔ قارئین! کمال دیکھئے اپنے مکروہ عمل کو ترک کرنے کے بجائے قاری رفعت صاحب کو دھمکایا گیا کہ اپنی کتاب میں سے یہ مسئلہ نکال دو۔ اور جب قاری صاحب نے ایسا نہیں کیا تو ان بے چاروں کو استاذ کی مسند سے ہٹا کر لائبریری میں لا کر بٹھا دیا۔ سیکڑوں بچوں کو حافظ بنانے والا ایک لائق و فائق استاذ سچ بولنے کی پاداش میں لائبریرین بنا دیا گیا۔ قاری رفعت صاحب نے ہی کسی کا جملہ نقل کیا تھا کہ: ''یہ منتقم مزاج لوگ ہیں، انتقام ضرور لیتے ہیں'' یہ مثال ہم کتاب کی ابتدا میں بھی نقل کر چکے ہیں۔ معاف کیجیے گا سچائی ہے، بے ساختہ قلم پر دوبارہ آگئی۔ بہر حال!

....

اس مختصر سی تفصیل کے بعد آئیے کتاب کے جائزے کو آگے بڑھاتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کی جدید تاریخ مرتب کرنے والے فاضل مرتب صاحب کو اللہ ہوش وخرد کی سلامتی کے ساتھ زندہ ضمیری کی دولت بھی عطا فرمادے۔ آمین۔ ہمیں ان سے کوئی ذاتی پرخاش یا اختلاف نہیں ہے۔ حقیقتِ حال تو یہ ہے کہ ہم ان سے کبھی بالمشافہ ملے بھی نہیں ہیں، بس شکل سے جانتے ہیں کہ یہ ہیں مولوی محمد اللہ قاسمی۔ گزشتہ سال جب دیوبند جانا ہوا تو دارالعلوم کے نزدیک سے گزرتے ہوئے ہمارے ساتھ والے طالبِ علم نے اشارے سے بتایا وہ ہیں محمد اللہ قاسمی، تب موصوف پر نظر پڑی تھی، ہم نے انہیں اوپر سے نیچے تک ایک نظر دیکھا اور ان کے جوتے دیکھ کر یہ تو اندازہ ہو ہی گیا تھا کہ یہ شخص کسی اونچے خاندان کا فرد نہیں ہے۔ یاد رکھئے! انسان کے علم کی پہچان اس کی گفتگو سے اور اس کے معیار و خاندانی وجاہت، سلیقہ و نفاست، شعور و تربیت کا پتہ اس کے جوتوں سے چلتا ہے۔

ایک خاندانی تربیت یافتہ باسلیقہ انسان کے پیٹ میں چاہے روٹی نہ ہو؛ لیکن اس کے پاؤں میں قیمتی جوتا ضرور ہوتا ہے۔

بہرکیف! یہاں مقصد فاضل مرتب کا تعارف نہیں ہے۔ یہ ذکر تو ضمناً ہوگیا۔اصل گفتگو یہ ہے کہ دارالعلوم کے موجودہ دَور کے عنوان سے جو باب فاضل مرتب نے صفحہ ۹۸ سے شروع کیا ہے،اس کی کچھ تفصیل تو آپ ''تعلیمی ترقی'' کے موضوع پر گزشتہ صفحات میں ملاحظہ کر ہی چکے ہیں۔اب مزید جائزے سے پہلے ہم نے فاضل مرتب کا ذکر اور تعارف اس لیے کیا ہے؛ کیونکہ فاضل مرتب صاحب بھی اسی ترقی یافتہ دَور کے فارغ ہیں۔اور دیکھئے کیا کمال فارغ ہیں۔وہ دارالعلوم جس نے دنیا کو بے باک اور حق گو عالم دین دیے ہیں اسی دارالعلوم میں جب تعلیمی ترقی کا دَور آتا ہے تو محمداللہ صاحب جیسے بے ضمیر اور چاپلوس قلم کار پیدا ہوتے ہیں۔ہمیں اتنا اندازہ نہیں تھا کہ کوئی اس درجہ بھی اپنے ضمیر کا سودا کرسکتا ہے۔جہنم کی شروعات غالباً ایسے ہی عالموں سے ہوگی،جو سچ جانتے ہوئے بھی اسے تحریر کرنے کی ہمت تو کیا کرتے؛ بلکہ اس کی جگہ جھوٹ پیش کرکے تاریخ ہی بدل دینے کا کارنامہ انجام دینے کو کارِثواب سمجھ رہے ہیں۔

فاضل مرتب صاحب نے پیش کردہ تاریخ میں جھوٹ ہی جھوٹ لکھا ہے۔چاپلوسی کی بھی حد ہوتی ہے۔انسان کہیں تو دیانت کا پاس رکھ لے۔ایسی بھی کیا شخصیت پرستی جو بت پرستی کو مات دے جائے،تاریخ گوئی کی بجائے ایسی بھی کیا تاریخ سازی،کہ حقیقت سے بالکل نظریں پھیر لی جائیں۔

قارئین!صفحہ ۹۸ پر پیراگراف شروع ہوتا ہے:

> ''دارالعلوم کے موجودہ دَور کی ابتداء اجلاس صدسالہ کے دَور سے ہوتی ہے،اجلاس صدسالہ کے بعد دارالعلوم ایک نازک وقت سے گزرا اور شدید اختلافات رونما ہوئے۔''

حقیقت سے نظریں پھیرنا اسی کو کہتے ہیں۔فاضل مرتب نے یہ تو لکھ دیا کہ دارالعلوم میں ''شدید اختلافات رونما ہوئے''مگر اختلافات کی ذراسی بھی تفصیل پوری کتاب میں کہیں نہیں دی۔آخر کیا وجہ ہے جو ۷۵۲ صفحات کی ضخیم کتاب میں چار صفحات بھی وہ شدید اختلافات کی تفصیل پر نہ لکھ سکے۔حالانکہ اس کتاب میں فاضل مرتب نے بہت سی غیرضروری چیزیں دے کر بلاوجہ صفحات کا اضافہ کیا ہے۔جیسے صفحہ نمبر ۵۳۸ سے ۵۶۴؍تک جن لوگوں کا تعارف پیش کیا ہے ان میں دو حضرات مفتی محمود اور مفتی نظام الدین صاحب کو چھوڑ کر باقی ایک بھی اس لائق نہیں،جس کا تاریخ دارالعلوم جیسی کتاب میں تعارف پیش کیا جائے۔اور نہ یہ لوگ اکابر دارالعلوم کہلائے جانے کے کسی طور مستحق ہیں۔ہمارے اس قول کی تصدیق آپ آئندہ صفحات میں مولانا وحیدالزماں کیرانوی صاحب کی تحریر سے بخوبی کرلیں گے۔

قارئین! ہم آپ کو بتاتے ہیں فاضل مرتب صاحب نے دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کے سب سے سیاہ دَور کی حقیقت یعنی اختلافات کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ اصل وجہ اس عمل کی چاپلوسی کا وہ جذبہ ہے جو انسان کو حق بیانی کی جرأت

سے محروم کر کے مصلحت پسندی کا بے معنیٰ نام دے کر گدھے کی طرح غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔
دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ جو انسان خدا سے نہیں ڈرتا وہ دنیا میں سب سے ڈرتا ہے۔ اپنی چند سالہ دنیاوی زندگی کے لیے خوفِ خدا اور خوفِ آخرت سے خالی لوگ دنیا کے جابر و سفاک سربراہوں ہی سے ڈرا کرتے ہیں۔
اختلافات کا تذکرہ کرنے میں ایسے ہی ایک نام نہاد امیر الہند کا ذکر خیر آتا اور بار بار آتا۔ یعنی مولوی اسعد مدنی صاحب، جنھوں نے خالص اقتدار کے لیے ایک بازیگر کی طرح ہر وہ کھیل کھیلا ہے جس میں مفاد پرستی کے لیے فریب دہی کی سب سے نچلی سطح تک جانے سے بھی گریز نہیں کیا۔

....

واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۶۵ کے بعد سے جب جمعیۃ علماء ہند پر مولوی اسعد مدنی صاحبؒ کا مکمل طور پر قبضہ ہو گیا تو ملک کے مقتدر و اہلِ بصیرت علماء اس جمعیۃ سے الگ ہو گئے اور مولوی اسعد صاحب کی ریشہ دوانیوں کا فسانہ ہر خاص و عام کی زباں پر آنے کی وجہ سے جمعیۃ علماء ہند اپنا وقار کھو رہی تھی۔ تب مولوی اسعد صاحب نے خوب اسفار کیے، ملک و بیرونِ ملک وفود بھیجے گئے، خوب تقریریں کی گئیں اور دیہاتی عوام کو اپنے دامِ فریب میں پھنسا کر مصنوعی پیری مریدی کے مینا بازار سجائے گئے، حالانکہ ہر ذی شعور جانتا ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی صاحبؒ نے آخری سانس تک بھی اپنے بیٹے کو خلافت نہیں دی تھی؛ لیکن اقتدار کے شوق میں مجمع لگانے کی خواہش ہر سیاست داں کو ہوتی ہے۔ آپ کو بھی تھی اور ملک کا پڑھا لکھا و سنجیدہ طبقہ آپ کو خوب پہچانتا تھا؛ اس لیے جاہل دیہاتیوں کی طرف رُخ کیا گیا اور وہ معصوم بے چارے کیا جانیں حقیقت کیا ہے، انہیں تو بس حضرت مدنی کے صاحبزادے نظر آرہے تھے۔
عوام سے مربوط ہونے کے بعد جمعیۃ علماء ہند کی بحالی اور بقا کے لیے اب کسی بڑے پلیٹ فارم کی ضرورت تھی، جہاں سے پورے ملک ہی نہیں؛ بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں تک رسائی آسان ہو جائے۔
جمعیۃ علماء ہند پہ قبضہ کرنے کے بعد دیوبند میں مسلم فنڈ قائم کیا گیا۔ جس کا بنیادی مقصد سودی جال سے نکالنا تھا، عنوان خوشنما تھا، اس لیے عوام الناس کا اس جانب متوجہ ہو جانا لازمی تھا۔ دراصل یہ عوام تک رسائی کا ایک آسان اور سہل راستہ تھا۔ چونکہ سود سے نجات دلانے کی بھی بات تھی؛ اس لیے مسلم فنڈ کی مقبولیت میں روز بہ روز اضافہ ہوتا رہا۔ بالیقین مسلم فنڈ سود تو نہیں لیتا تھا؛ لیکن کاغذات اور فارم کے نام پر اپنی آمدنی کا راستہ کھلا رکھا۔
کسی بھی ادارے کے لیے عوام کا یقین سب سے بڑی شے ہوتا ہے۔ اسی اعتماد و یقین کے سبب مسلم فنڈ نے چند سالوں ہی میں استحکام و ترقی حاصل کر لی تھی، مولوی اسعد مدنی صاحب جو جمعیۃ پہ قبضہ کرنے کے بعد اب قیادت کے نشے میں سرشار اقتدار کو وسیع سے وسیع تر کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے ان کی نظریں ہندوستان کے سب سے بڑے دینی ادارے دارالعلوم دیوبند پر مرکوز ہو گئیں۔ ظاہری بات ہے اس سے بڑا اور کوئی پلیٹ فارم انھیں مل ہی

نہیں سکتا تھا۔ بلاشبہ جمعیۃ علماء ہند خالص سیاسی جماعت بن کر رہ گئی تھی، گو وہ کھڑی تو مذہبی طبقے کے کاندھوں پر ہی تھی؛ لیکن اس کے ذریعہ غیر سیاسی یا عام مسلمانوں کے ذہنوں پر حکومت نہیں کی جا سکتی تھی۔ اسی لیے دارالعلوم کو ہی اپنا ہدف بنا کر اس پہ قبضہ کرنے کی پلاننگ شروع کر دی گئی۔ ظاہر ہے دارالعلوم دیوبند ایک ایسا ادارہ ہے جس کے ساتھ فقط عوام ہی نہیں؛ بلکہ امتِ مسلمہ کے خاص طبقہ کا بھی قلبی و ایمانی رشتہ ہے۔ اسی بات کا فائدہ اُٹھا کر مولوی اسعد مدنی صاحب نے اپنی سفاک ذہنیت اور شاطرانہ مزاج سے ایسی ایسی سازشیں رچی ہیں کہ:

''بول اُٹھا شیطان بھی استاد بس!''

دارالعلوم فقط ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں ہے؛ بلکہ ہندوستان میں یہ مسلمانوں کے لیے مرکزیت اور علومِ دینیہ کی حفاظت کرنے والے عظیم ترین قلعے کی طرح ہے۔ جس کی عظمت کا احساس ہر صحیح العقیدہ مسلمان کے سینے میں دھڑکتے ہوئے دل کی طرح زندہ ہے۔

دارالعلوم ایک ایسا ادارہ ہے جس کا ماضی شاندار ہے، تابناک ہے درخشاں ہے، مثالی ہے۔ جس کی ایک معتبر تاریخ ہے جو اکابر دارالعلوم کی زندگیوں اور علمی کاوشوں کی شکل میں سب کے سامنے ہے۔

دارالعلوم کی اسی عظمت کے سبب مولوی اسعد مدنی صاحب چاہتے تھے کہ اگر دارالعلوم پر قبضہ کر لیا جائے تو پھر ہمیں ملک میں مسلمانوں کا سربراہ بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ دارالعلوم کی حمایت اور دارالعلوم کا پلیٹ فارم حاصل ہو جانے کے بعد پھر کسی دوسری جماعت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہے گی۔

یہی ہوا، بالکل یہی ہوا۔ دارالعلوم پہ قبضے کے بعد سے آج تک آپ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ جمعیۃ علماء ہند کے علاوہ پورے ملک میں کسی اور جماعت کو اس گروپ نے اُبھرنے ہی نہیں دیا۔ اور پچاس سال سے زیادہ ہو گئے ہیں ایک ہی خاندان اس جمعیۃ پر قابض ہے، کسی کی ہمت نہیں جو اس جمعیۃ علماء ہند کا صدر یا ناظم بن جائے۔
یہاں ایک بات اور نقل کر دوں کہ مولوی اسعد مدنی کا یہ منافقانہ مزاج ہمیشہ رہا ہے کہ وہ ظاہر میں کچھ تھے اور باطن میں کچھ۔ اسی لیے وہ سدا یہی کہتے رہے کہ میرا دارالعلوم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہوں نے ہمیشہ پیچھے سے وار کیا ہے۔ اور جھوٹ تو ان کی زبان سے آواز کی طرح نکلتا تھا، آج بھی ان کی تقریر کا ٹیپ لوگوں کے پاس موجود ہے اور بہت سے لوگ حیات بھی ہیں، جنھیں وہ تقریر یاد ہے جس میں موصوف نے کہا تھا کہ دارالعلوم میں میرے گھر کا کوئی فرد، میرا رشتہ دار یا میں خود کبھی ملازمت کروں تو وہ ایسا ہے جیسے خنزیر کا گوشت کھا لیا ہو۔ ان کے اسی بیان کو دیوبند کے مزاحیہ شاعر جناب صادق صابری مرحوم نے اس طرح بیان کیا تھا۔

ٹیپ شاہد ہے بھری محفل میں اُس تقریر کا
جس میں فرمایا تھا منصب گوشت ہے خنزیر کا

صرف مقصد ہے خدا کے دین کی تشہیر کا
دوسرا رُخ بھی ذرا اب دیکھیے تصویر کا
مہتمم سمدھی، محدث چھوٹا بھائی زندہ باد
شیخ اعلیٰ خود بنیں گے بے حیائی زندہ باد

(مولانا مرغوب الرحمٰن مولوی اسعد صاحب کے سمدھی تھے۔)

آج سب کے سامنے ہے کہ ان کے بہنوئی ان کے بھائی دارالعلوم ہی میں ملازم ہیں۔اور بات یہیں تک محدود نہیں ہے؛ بلکہ وہ ایسا حکم نافذ کر کے گئے ہیں کہ دارالعلوم کے اندر آج جتنے بھی ملازم ہیں ان میں زیادہ تر ان کے اقربا یا تعلق والے ہیں اور مزید یہ کہ ان کے ضلع فیض آباد کے اطراف میں جو اضلاع ہیں۔گونڈا، اعظم گڑھ، بستی، بہرائچ، اسی جانب کے لوگ دارالعلوم میں ملازمت کے لیے رکھے جاتے رہے ہیں۔مولوی اسعد صاحب کو دیوبندیوں سے سخت نفرت تھی، اسی لیے انھوں نے سختی سے یہ حکم دے رکھا تھا کہ دارالعلوم میں کسی بھی بڑے عہدے پر دیوبندی کو نہیں رکھنا ہے۔خصوصاً تدریس تو بالکل طے تھا۔اسی لیے آج دارالعلوم میں گزشتہ ۳۰ رسال سے کوئی دیوبندی استاذ نہیں ہے۔نعرہ یہ لگایا جاتا ہے کہ دیوبند میں ایسے افراد ہی نہیں جو تدریس کے اہل ہوں۔ حالانکہ یہ بالکل جھوٹ ہے۔موجودہ دَور میں بہت سے باصلاحیت لڑکے وہ ہیں جو دارالعلوم ہی کے فارغ ہیں اور اچھے خاندان کے بھی ہیں؛ لیکن پھر بھی دارالعلوم میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے؛ کیونکہ بگ باس آرڈر دے گئے ہیں، اُس کی خلاف ورزی کی ہمت کسی ابوالقاسم یا عبدالخالق میں نہیں ہے۔چند باصلاحیت لڑکوں کے نام تو ہمیں یاد ہیں جیسے یاسر ندیم الواجدی، احترام الحق عثمانی، عبید انور شاہ، سہیل ہاشمی، انور عزیز عثمانی، عمیر احمد صدیقی، یہ تمام لوگ وہ ہیں جو مدرسے میں پڑھانے کی مکمل اہلیت رکھتے ہیں؛ بلکہ ان میں سے اکثر نے تو پڑھایا بھی ہے؛ لیکن دارالعلوم میں ان کے لیے کوئی درس نہیں ہے۔بستی، گونڈہ، بہرائچ، فیض آباد جیسے علاقوں کے کم نسب اور غیر خاندانی لوگوں کو استاذ اور دیگر شعبہ کے لیے ملازم رکھنے کا مقصد یہی ہوتا ہے۔سر جھکا کے نوکری کرنے کے علاوہ حق بات کہنے کی کسی میں نہ ہمت ہو نہ اہلیت۔جس کی مثال دارالعلوم کا موجودہ دَور ہے۔جہاں کسی ملازم میں حق بات کہنے کی طاقت نہیں ہے۔جس کی زندہ مثال کے طور پر ہم محمد اللہ صاحب فیض آبادی کا نام پیش کر سکتے ہیں، کہ ان ہی کی چاپلوسی کے طفیل ہمیں اتنی محنت کرنی پڑ رہی ہے۔دیکھ لیجیے حضرات! تاریخ کیا ہے اور فاضل مرتب صاحب نے کیا بنا کر پیش کی ہے، سچ بولنے والے اب دارالعلوم میں ہیں ہی نہیں۔ایک بے چارے قاری ابوالحسن اعظمی تھے جو بے خوف حق بیان کر دیتے تھے۔اُن کا بھی استعفیٰ قبول کر کے دارالعلوم نے ان سے نجات حاصل کر لی اور آج تک پوری دنیا سے سبعہ عشرہ کا ایک لائق استاذ بھی دارالعلوم کے لیے تلاش نہ کر سکے۔

تو بات چل رہی تھی مولوی اسعد مدنی اوران کی ریشہ دوانیوں کی دارالعلوم میں دیوبند کے بچوں کا داخلہ نہ لیا جائے یہ سازش بھی مولوی اسعد صاحب کی ہی تھی۔اسی لیے ۱۹۸۲ کے بعد ما دو دے چند دیوبندی ہی دارالعلوم میں تعلیم حاصل کرسکے۔ دیوبندی بچوں کو ہمیشہ نظرانداز کیا جانے لگا۔ان کی حوصلہ شکنی کی جانے لگی۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۳ میں جب مولوی ارشد مدنی ناظم تعلیمات تھےتو ایک دیوبندی لڑکے کے اچھے نمبرات آنے پر مجلس ہی میں ناظم صاحب نے طنزاً فرمایا''تو اب دیوبندی بھی پڑھنے لگے ہیں''۔اسی ذہنیت نے دیوبند کے بچوں کو دارالعلوم میں پڑھنے نہیں دیا۔

یہ سب آرڈر تھے جو بگ باس کی طرف سے جاری کیے گئے تھے۔اب انہیں پہ عمل کرنا دارالعلوم کے ہر فرد کی ذمہ داری تھی۔ بہرحال بات ہو رہی تھی جمعیۃ پہ قبضہ کے بعد مسلم فنڈ کے قیام اور دارالعلوم پہ قبضہ کرنے کی پلاننگ کے بارے میں یہی وہ زمانہ ہے جب دارالعلوم اپنے زوال کی طرف گامزن ہوگیا تھا۔یہیں سے طلبہ کو تعلیم دینے کے بجائے انہیں سیاسی طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا گیا تھا۔اس کی ابتدااس طرح سے کی کہ:

طلبہ کے لیے مسلم فنڈ سے وظائف جاری کیے گئے۔جن کا کوئی حساب کتاب دفتری نہیں ہوتا تھا،اس کے علاوہ مسلم فنڈ طلبہ کو کھانے کے پیسے بھی فراہم کرتا تھا۔اس کے بعد مولوی اسعد صاحب نے طلبہ کے جذبات بھڑکانے کا کام شروع کیا۔جو طلبہ مسلم فنڈ سے وظیفہ اور کھانے کے پیسے لے رہے تھے وہ کسی طور بھی مولوی اسعد صاحب کی بات سے انکار نہیں کرسکتے تھے۔طلبہ کو نظام دارالعلوم کے خلاف بھڑکا کر جمعیۃ الطلبہ کے قیام پر زور دیا گیا۔طلبہ کو کہا گیا کہ یہاں بہتر انتظام کی کمی ہے۔نہ اعلیٰ تعلیم ہے،نہ عمدہ کھانا ہے نہ ہی رہائش کے لیے بہترین کمرے ہیں۔نہ کھیل کا میدان ہے۔اور نہ ہی دیگر سہولتیں طلبہ کو حاصل ہیں۔ یہ چند ایسے نعرے ہیں جو کسی بھی ادارے،اسکول،مدرسے یا یونیورسٹی میں لگائے جائیں تو طلبہ کے جمع ہونے اور بھیڑ اکٹھی ہوجانے کے قوی امکان رہتے ہیں۔ یہ سب نعرے دارالعلوم میں بھی لگائے گئے۔اور اس کام کے لیے مولوی اسعد مدنی صاحب نے مولانا وحیدالزماں کیرانوی کو مہرا بنا کر پیش کیا۔

مولانا وحیدالزماں صاحب جو کہ ایک نہایت نفیس،سلیقہ شعار اور منتظم ذہنیت کی حامل شخصیت تھے۔وہ بغیر سوچے سمجھے مولوی اسعد مدنی صاحب کے دامِ فریب میں آگئے۔احباب جانتے ہیں کہ مولانا وحیدالزماں کیرانوی جہاں بہت سی خوبیوں کے مالک تھے،وہیں ان میں کچھ خامیاں بھی تھیں،جیسا کہ ہر بشر کا خاصہ ہے۔ انسان مکمل کوئی نہیں ہوتا۔مولانا وحیدالزماں صاحب کی بہت بڑی کمی ان کی عجلت پسندی یعنی جلد فیصلہ لینے کی عادت اور نتائج وعواقب سے بے خبری یا نتائج پہ غور وفکر کیے بغیر کسی بھی کام میں ہاتھ ڈالنے کی روش نے انہیں بارہا بعد میں پشیمانی کے جذبات دیے ہیں۔اُس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔مولوی اسعد مدنی صاحب کی باتوں میں آکر

انھوں نے اہتمام کے خلاف خوب تقریریں کیں اور طلبہ کی جمعیۃ الطلبہ کے لیے راستہ ہموار کیا۔ مولانا وحید الزماں نہایت جذباتی آدمی تھے، وہ بغیر سوچے سمجھے اُس آگ میں کود پڑے جو مولوی اسعد مدنی صاحب نے سلگائی تھی۔ نتائج و عواقب سے بالکل بے خبر انھوں نے خوب جوش و خروش کے ساتھ مولوی اسعد مدنی کا ساتھ دیا۔ اس ہمنوائی نے دارالعلوم کو دو جماعتوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ مولانا وحید الزماں کو اُس وقت بالکل احساس نہیں تھا کہ وہ کتنا سنگین کام کر رہے ہیں۔ وقت گزر گیا اور جب مولوی اسعد مدنی صاحب نے قبضے کے بعد مولانا وحید الزماں صاحب کے ساتھ وہی کیا جو وہ ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں، کہ ''مطلب نکل گیا ہے تو پہچانتے نہیں''۔

اقتدار کے چھن جانے کا خوف انسان کو پاگل کیسے رکھتا ہے۔ اسی لیے وہ کسی کو بھی اپنے مقابل کھڑا نہیں رہنے دینا چاہتا۔ جب مولوی اسعد صاحب نے دیکھا کہ مولانا وحید الزماں صاحب کی مقبولیت اور صلاحیت سے طلبہ میں ان کی عزت و اہمیت بڑھ رہی ہے اور دارالعلوم کے نظام میں بھی ان کا دخل بہ حیثیت کارگزار مہتمم کافی بڑھ گیا ہے تو انھوں نے بے کار الزام لگانے شروع کر دیے۔ اور ان کے خلاف شیطانی غول بنا کر افواہوں کی دھول اُڑانا شروع کر دی۔ مولوی اسعد مدنی صاحب نے اپنی سرشت کے مطابق وہی کیا جو ماضی میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور حضرت قاری طیب قاسمی کے ساتھ کر چکے تھے۔ ان حالات کے بعد مولانا وحید الزماں صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا؛ لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

مولانا وحید الزماں صاحب نے مولوی اسعد مدنی صاحب کے بارے میں کتابچے بھی لکھے اور حق کو عوام کے سامنے پیش کرنے کی سعی بھی کی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جہاں مولانا وحید الزماں صاحب میں درج بالا دو خامیاں تھیں تو موصوف میں درج ذیل دو اہم خوبیاں بھی تھیں۔ اوّل: وہ منافق نہیں تھے جو کہنا ہوتا تھا صاف کہتے تھے۔ منافقت ان کی سرشت میں نہیں تھی۔ دوم: جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ اور یہی دو باتیں بگ باس کو پسند نہیں۔ اُنہیں تو چاپلوسی کرنے والے اور ہر بات پر لبیک کہنے والے پسند آتے ہیں۔ ان کی رائے سے اختلاف کرنے والے نہیں۔

مولانا وحید الزماں صاحب کو جب اپنے غلط ہونے کا احساس ہو گیا تو آپ نے ایک مومن کی طرح اپنی خطا کا اعتراف کرتے ہوئے حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ سے معافی بھی مانگی۔ اور ہم نے تو یہ بھی سنا ہے کہ آپ نے اپنی ٹوپی حضرت حکیم الاسلام کے قدموں پر رکھ کر معافی مانگی تھی۔ یہی ایک مومن کی شان ہے کہ جب بھی اس پر حق واضح ہو جائے تب ہی اسے اپنی غلطیوں کی اصلاح کر لینی چاہیے۔

....

یہاں ہم اُس دَور کے حالات کا تفصیلی تذکرہ نہیں کریں گے؛ کیونکہ اس کے لیے بہت صفحات درکار ہیں۔ مولوی اسعد مدنی صاحب کے مظالم کی داستانیں اتنی مختصر نہیں کہ دس بیس صفحات کے اندر سمٹ سکیں۔ یہاں تو ہم مختصر طور پر تاریخ دارالعلوم تحریر کرنے والوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اصل تاریخ یہ ہے، جسے فقط ایک لفظ ''اختلافات'' لکھ کر عوام سے چھپا لیا جاتا ہے۔ موجودہ دَور میں جتنے بھی مدارس کے طلبہ ہیں وہ سب ان تاریخی واقعات سے ناواقف ہیں۔ ان کے ذہنوں کو تاریخ کی صحیح معلومات دینے اور شخصیت پرستی کی قید سے باہر آ کر ملّت خور بزرگ کی حقیقت سے روشناس کرانے کے بجائے جھوٹ لکھ کر غلط تاریخ بیان کی جا رہی ہے۔ اور اس پہ مزید ستم یہ کہ جھوٹی کتاب لکھوا کر طلبہ عزیز کو انعامات میں تقسیم بھی کی جاتی ہے۔

ویسے تو اصل اختلافات ۱۹۸۰ء کے وہ مظالم ہیں جو مولوی اسعد صاحب نے حضرت مولانا قاری طیبؒ پر کیے تھے۔ پھر اس کے بعد قبضہ کر کے دارالعلوم کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کے لیے اپنے سمدھی مولوی مرغوب الرحمٰن صاحب کو مہتمم بنا کر بٹھا دیا گیا اور شوریٰ کو بھی اپنے قبضے میں لے کر جس پر چاہا جیسے چاہا ویسے ظلم کرتے رہے۔ انہیں مظالم سے تنگ آ کر مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی نے جب صدائے حق بلند کی تو ان کے خلاف وہی سب کیا گیا جس کے مولوی اسعد صاحب عادی ہیں جو انہوں نے جمعیۃ علماء ہند پر قبضہ کرنے کے لیے ۱۹۶۵ و ۱۹۶۶ء میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کے ساتھ کیا تھا۔ الزام تراشی، جھوٹ، بہتان، فریب، عیاری و سفاکی کے تمام حربے مولوی اسعد مدنی کے آزمائے ہوئے تھے، جنہیں دوبارہ استعمال کرنے میں انھیں اور مزہ آ رہا تھا۔

آئیے حضرات! ہم اس موضوع پر اپنے قلم سے مزید کچھ اور تحریر نہ کرتے ہوئے اب آپ کے سامنے وہ حقائق پیش کرتے ہیں جو اُس مظلوم شخصیت کے دل کی آواز ہے جس نے قدم قدم پر ان کا ساتھ دیا اور جب خود اس شخصیت پر ظلم ہوئے تو اسے احساس ہوا کہ اقتدار کی طلب رکھنے والے اختلافِ رائے برداشت نہیں کرتے۔

مولانا وحید الزماں صاحب نے اپنے دل کا درد جب کاغذ پر اُتارا تو وہ ایک تاریخ بن گیا۔ ان کا مضمون جو ان کے انتقال کے بعد شائع ہونے والی کتاب ''ترجمان دارالعلوم کا وحید الزماں کیرانوی نمبر'' سے لیا گیا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ کیجیے اور دیکھئے اصل تاریخ کیا ہے۔ ۱۹۸۰ء کے بعد کے جس دَور کو دارالعلوم کے فاضل مرتب ترقی اور خوشحالی کا دَور کہہ رہے ہیں، اُسی دَور میں مولوی اسعد مدنی کے دلخراش مظالم کا ذکر جدید تاریخ دارالعلوم میں نہیں کیا گیا۔ مولانا وحید الزماں جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ اور منافق بھی نہیں تھے؛ اس لیے برملا و بے باک اپنی بات کہتے تھے۔ جیسے کہ درج ذیل مضمون ہے۔ جس میں کھل کر مولوی اسعد صاحب کی کرتوتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

درج ذیل مضمون پڑھیے اس میں ہم نے اپنی طرف سے ایک حرف بھی کم یا زیادہ نہیں کیا ہے۔

جس کا دل چاہے حوالہ ملالے ''صفحہ نمبر ۴۳۸ تا ۴۵۵ ترجمان دارالعلوم کا مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر''

دارالعلوم سے میری سبکدوشی

پس منظر - الزامات - حقائق

(مولانا وحید الزماں کیرانوی)

۱۹۹۰ء میں حضرت مولانا وحید الزماںؒ صاحب کو لنگڑے لولے اسباب کی بنیاد پر دارالعلوم دیوبند سے جبراً سبکدوش کر دیے جانے کے بعد جب اس نامعقول اور تعجب خیز فیصلہ پر ملک و بیرونِ ملک میں سخت ہلچل اور ناراضگی پیدا ہوئی اور ہر طرف سے دارالعلوم کے اربابِ حل وعقد کے خلاف غم وغصہ کا اظہار کیا جانے لگا تو مہتمم دارالعلوم نے مولانا اسعد مدنی کی شہ پر (جو کہ فضلائے دارالعلوم کے غم وغصّہ کا اصل نشانہ تھے) پہلے ۱۸؍جون ۱۹۹۰ء کو دیوبند میں ایک ''نمائندہ'' اجتماع بلایا جس میں اس ناعاقبت اندیشانہ فیصلے کو رنگِ جواز دینے کے لیے مولانا وحید الزماں صاحب پر متعدد الزامات عائد کیے گئے اور پھر ۲۱، جون ۹۰ کو مولانا اسعد اور مہتمم دارالعلوم نے دہلی میں ایک پریس کانفرنس کر کے اس میں بھی اُن الزامات کا اعادہ کیا۔

اخبارات اور دوسرے ذرائع سے ان الزامات کی تفصیل معلوم ہونے پر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کو قدرتی طور پر تشویش ہوئی اور اس کے ناظمِ اعلیٰ نے مولانا وحید الزماں صاحب کو خط لکھ کر ان سے مذکورہ الزامات کے بارے میں وضاحت کرنے کی درخواست کی، تا کہ فضلاء و ہمدردانِ دارالعلوم کی تشویش کا ازالہ اور عوام کو صحیح صورتِ حال سے آگاہی ہو۔ اس خط کے جواب میں مولانا مرحوم نے مندرجہ ذیل مفصل وضاحتی بیان املا کرا کے ارسال فرمایا، جس میں مذکورہ الزامات کی وضاحت کے علاوہ ضمناً بہت سے ایسے پس پردہ واقعات وحقائق کا ذکر خود مولانا مرحوم کے قلم سے آ گیا ہے جو کہ کسی اور ذریعہ سے معلوم نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ مدلل ومؤثر اور انکشافاتی تحریر ایک تاریخی دستاویز ہے جس سے انقلاب دارالعلوم کے بعد کی صورتِ حال بالخصوص مولانا وحید الزماں صاحب کو طرح طرح کی ریشہ دوانیوں کے ذریعہ مسلسل اور منظم و منصوبہ بند طریقہ پر پریشان کیے جانے سے متعلق حالات و واقعات کی صحیح اور مکمل تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ (ادارہ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ألحمد للّٰه ربّ الٰعلمین والصّلاة والسّلام علٰی سیّد الأنبیاء والمرسلین محمّد وعلٰی اٰله وصحبه أجمعین.

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کے دَورِ اہتمام کو ختم ہوئے تقریباً نو سال گزر چکے ہیں۔اجلاس صد سالہ کے بعد دارالعلوم دیوبند میں جو انقلاب رونما ہوا اس کی مکمل تفصیلات تو ان شاء اللہ ایک کتاب کی شکل میں پیش کی جائیں گی۔اس وقت دارالعلوم سے اپنی سبکدوشی (رمضان ۱۴۱۰ھ) اور اس کی بیان کردہ وجوہات نیز اس کے نتیجہ میں رونما ہونے والے واقعات اور کچھ سوالات و اعتراضات کی وضاحت کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مختصراً یہ بتادینا ضروری ہے کہ ۱۹۸۱ء میں جب دارالعلوم پر پولیس ایکشن ہوا اور طلباء نکال دیئے گئے تو ہم چندلوگوں نے کیمپ دارالعلوم قائم کرلیا۔اس وقت مولانا اسعد صاحب ہندوستان سے کہیں باہر تھے؛ مگر جب واپس آئے تو کچھ ہی دنوں کے بعد محسوس ہونے لگا تھا کہ مولانا اسعد صاحب سے میرا نباہ مشکل ہوگا؛ کیونکہ وہ ضروری ہدایات دے کر باہر روانہ ہوجایا کرتے تھے۔ یہاں تقسیم کار کے طور پر مختلف افراد، مختلف کام انجام دیتے تھے، میرے سپرد کیمپ کی نظامتِ علیا تھی، جس میں طلباء کے تمام معاملات، نیز اہلِ شہر سے روابط، باہر سے آنے والے مہمانوں، اخبارنویسوں اور پولیس افسران سے ملاقات اور گفتگو کرنا شامل تھا۔طلباء پر چونکہ مکمل طور پر میرا ہی کنٹرول تھا اور ہمہ وقت مشغولِ کار نظر آنے کی وجہ سے اہلِ شہر بھی مجھی سے زیادہ وابستہ تھے،اس لیے میں مولانا اسعد صاحب کی نظروں میں کھٹکنے لگا تھا۔وہ کھل کر سامنے آنا بھی نہیں چاہتے تھے اور در پردہ اتنا کنٹرول چاہتے تھے کہ ایک پتہ بھی ان کی مرضی کے بغیر حرکت نہ کرے۔میرے اور ان کے درمیان ایک بنیادی فرق یہ بھی تھا کہ میں ہر بات کھل کر کہتا تھا جبکہ وہ ہر بات کو گول مول انداز میں بیان کرتے تھے۔ پھر جب دارالعلوم کھل گیا تو میں نے معاملات میں دیکھا کہ مولانا اسعد صاحب کی پالیسی مفاد پرست سیاسی لوگوں کی طرح تبدیل ہوگئی ہے اور ان کی منشاء ہے کہ اب اہلِ شہر سے وابستگی ختم کی جائے اور انھیں اپنے اوپر زیادہ مؤثر نہ ہونے دیا جائے۔ان کے الفاظ یہ تھے''اس بلا کو اُتار پھینکئے''اسی طرح ان طلباء کے بارے میں جو کیمپ کے دوران تقریباً ایک سال کی اپنی تعلیم قربان کرچکے تھے اور جنھوں نے ہر طرح کی قربانیاں دی تھیں،مولانا کا یہ خیال تھا کہ''ان کو سر پر نہ چڑھایا جائے''۔ بے مروّتی کی یہ دونوں باتیں میرے لیے ناقابل قبول تھیں؛ کیونکہ ایک سیاسی آدمی تو ''کام نکال دھکّا دے'' کے اُصول پر عمل کرسکتا ہے اور ان طلباء اور اہلِ شہر سے منہ موڑ سکتا ہے،جنھوں نے مصیبت کی گھڑی

میں جان پر کھیل کر ہمارا ساتھ دیا تھا؛ لیکن میرے لیے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ میری ہمیشہ ہی منتظمین سے یہ مانگ رہی کہ انھیں طلباء کو ایک حیثیت اور اہمیت دینی چاہئے، لہٰذا اب اس انقلاب کے بعد بھی (جس کی کامیابی میں طلباء کا بہت کچھ دخل تھا) طلباء کے ساتھ وہی سابقہ انتظامیہ کا سا معاملہ کرنا اور ان کو دبا کر رکھنا میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔

بہرحال! اس قسم کے بہت سے معاملات کو دیکھتے ہوئے مجھے واضح طور پر یہ محسوس ہونے لگا کہ اب دارالعلوم کے نئے حالات میں کچھ بنیادی اختلافات پیدا ہوتے چلے جائیں گے، لہٰذا مناسب یہ ہے کہ خوشگواری کے ساتھ دارالعلوم سے رسمی ملازمت کا تعلق ختم کرلیا جائے اور دیگر بہت سے فرزندانِ دارالعلوم کی طرح میں بھی آزاد رہ کر مادرِ علمی کی خدمت انجام دیتا رہوں۔ چنانچہ اسی جذبہ کے تحت میں نے حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کو اپنا استعفیٰ پیش کیا اور یہاں سے بہت دُور، مدرسہ بدرالاسلام شاہ گنج ضلع جونپور میں جا کر مقیم ہوگیا۔ اس دوران طلبۂ دارالعلوم پر کنٹرول کرنے میں سبھی موجود حضرات ناکام رہے اور میرے پاس زبانی اور تحریری پیغامات پہنچے کہ دارالعلوم آ کر اس کو تباہی سے بچاؤ (اس کی تفصیل بھی ان شاء اللہ ایک مستقل کتاب میں آئے گی) اسی زمانے میں مجلسِ شوریٰ کا اجلاس ہوا اور اس میں مجھے ناظم مجلس تعلیمی بنایا گیا، جس کے بعد حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے بذریعۂ تحریر اور مولانا اسعد صاحب نے زبانی پیغامات کے ذریعہ میرے دارالعلوم پہنچنے پر اصرار کیا؛ چنانچہ مدرسہ بدرالاسلام کے اپنے کچھ کرم فرماؤں کے سمجھانے پر اور دارالعلوم کے مفاد اور ان حضرات کے اصرار کو سامنے رکھ کر میں دارالعلوم واپس آگیا اور تعلیمات کا چارج بھی لے لیا۔ تعلیمات کی نظامت کے دَور میں، میں نے جو تعلیمی اصلاحات کیں اور ہر طرح کی خامیوں کو دُور کر کے نظام کو مستحکم اور چاق و چوبند کیا، اور جس طرح اساتذۂ کرام نے ذوق و شوق کے ساتھ اسباق کی پابندی کی اور مقدارِ خواندگی کی تکمیل کرائی، اس کی تفصیلات بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔

اسی دوران دفترِ اہتمام میں حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کو نظامِ کار میں زبردست مشکلات پیش آ رہی تھیں، ان کو اپنے دونائبوں سے کام نہ کرنے کی سخت شکایت تھی اور وہ خود پر بڑا بوجھ محسوس کر رہے تھے، اس لیے انھوں نے اجلاس شوریٰ منعقدہ لکھنؤ میں اپنی مشکلات اور پریشانیوں کا اظہار کرتے ہوئے ایک مضبوط معاون مہتمم مقرر کیے جانے کی درخواست کی۔ مجلسِ شوریٰ نے ان کی تجویز پر مجھے اس پس منظر میں معاون مہتمم کا درجہ دیا کہ مجھے خود دارالعلوم کے تمام کاموں کو مکمل طور پر انجام دینا ہے اور جہاں تک ہو سکے مہتمم صاحب کے سر سے کاموں کا بوجھ کم کرنا ہے۔ میں اس زمانے میں بیمار تھا اور میں، میرے اہلِ خانہ اور محبین اس منصب کو قبول کرنے کے خلاف تھے؛ لیکن حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب اور حضرت مولانا معراج الحق صاحب غریب خانے پر تشریف

لائے اور مجھے مجلسِ شوریٰ کے اس فیصلے سے آگاہ کیا۔ میں نے معذرت کرنی چاہی، تو حضرت مولانا معراج الحق صاحب نے ایک انتہائی تڑپا دینے والا جملہ فرمایا کہ "دارالعلوم کا کباڑا ہوگیا ہے، آپ اللہ کا نام لے کر اُٹھیے اور دارالعلوم کی خدمت کیجیے، ان شاء اللہ شفا ہوگی۔" اگر یہ بات ہے تو جس حال میں بھی ہوں، دارالعلوم کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔

اگلے ہی روز سے دارالعلوم جانا شروع کیا۔ اب میرے ذمہ نظامت مجلسِ تعلیمی بھی تھی اور میں معاون مہتمم بھی تھا۔ میں اپنی بیماریوں اور تکلیفوں کو بھول گیا اور اللہ نے مجھے اتنی طاقت دی کہ روزانہ دس بارہ گھنٹے کام کرنے لگا۔ اس دَور میں جو دفتری نظام کی اصلاحات ہوئیں اس کی تفصیلات بھی کسی دوسرے موقع پر بیان کی جائیں گی۔ تعلیمات اور اہتمام سے متعلقہ تمام کارروائیوں میں جو تیزی اور استحکام پیدا ہوا تھا اس کی گواہی ہر طالبِ علم، ہر مدرس، ہر ملازم اور ہر آنے جانے والا دینے لگا تھا۔ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب میرے تمام اقدامات سے مطمئن اور خوش تھے جیسا کہ میرے بار بار دریافت کرنے پر وہ اظہار کرتے تھے، انھوں نے ایک بار بھی میرے کسی انتظامی اقدام پر ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا (البتہ مولانا اسعد صاحب اور ان کے برادر مولانا ارشد صاحب اور ان کے چند احباب نے اس دَور میں میرے خلاف جو ریشہ دوانیاں کیں اور جس طرح مجھے ستایا، پریشان کیا اور طرح طرح کی مشکلات اور اڑچنیں پیدا کیں اس کی تفصیل بھی ان شاء اللہ کتاب میں آئے گی) اس زمانے کی میری خدمات اور میرے جوش و ولولہ کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ میری شب و روز کی محنت کو دیکھ کر ایک دفعہ حضرت مولانا معراج الحق صاحب نے غایتِ شفقت سے میرے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ "اتنی محنت نہ کیجیے، دارالعلوم کو ابھی آپ کی بہت ضرورت ہے۔" اسی طرح ممبرانِ شوریٰ نے بھی تحریری اور زبانی طور پر اس منصبِ جدید کو سنبھالنے کے بعد میری کارکردگی کو مختلف طریقوں سے سراہا۔ جامعہ طبیہ کا معائنہ کرتے ہوئے جناب مولانا حکیم افہام اللہ صاحب نے فرمایا: "کاش! یہ انتظامی خدمت آپ کے سپرد پہلے ہی کردی جاتی۔" حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدظلہٗ نے فرمایا کہ "ماشاء اللہ! حقیقت یہ ہے کہ اتنا بہتر کام ہوجائے گا، اس کی توقع نہیں تھی۔" حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوری مدظلہٗ اور جناب حاجی علاء الدین صاحب (مرحوم) نے بھی زبانی اور تحریری طور پر میری خدمات کو سراہا۔ حضرت مولانا منظور نعمانی صاحب کے تو بہت سے گرامی نامے بھی میرے پاس موجود ہیں، جن میں انھوں نے ایسے الفاظ میں میری حوصلہ افزائی کی ہے کہ اپنی ذات کی تعریف ہونے کی بنا پر ان کو نقل کرتے ہوئے شرم اور جھجک محسوس ہوتی ہے۔ تاہم اس سلسلہ کی کچھ تفصیلات ان شاء اللہ کتاب میں بیان کروں گا۔

یہ تمام باتیں انتہائی خوشگوار ماحول میں ہورہی تھیں اور دارالعلوم کے تمام انتظامی اُمور بڑی عمدگی کے ساتھ انجام پارہے تھے؛ لیکن یہ صورتِ حال مولانا اسعد صاحب کے مجلسِ شوریٰ کے ممبر ہونے تک ہی قائم رہ سکی۔

انھوں نے ممبر بننے کے بعد شوریٰ کے پہلے ہی اجلاس میں مختلف طریقوں پر میری مخالفت اور طرح طرح سے میری راہ میں رکاوٹیں ڈالنا شروع کر دیں مثلاً ممبرانِ شوریٰ کو مختلف طریقوں اور تدبیروں سے ہموار کر کے دار العلوم کے شعبہ جات مختلف لوگوں میں تقسیم کرا دیے جس کے نتیجہ میں وہ حساس اور اہم ترین شعبے جن کا تعلق طلباء سے تھا، میرے دائرۂ اختیار سے نکال کر حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب کو دے دیے گئے، جبکہ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب ان کے بارے میں ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ وہ کوئی کام نہیں کرتے اور ہر کام اور ہر کاغذ کو مجھ پر ہی ٹال دیتے ہیں۔ یا تو وہ اس قدر بے صلاحیت تھے، یا یکا یک مولانا اسعد صاحب کے ممبر بننے کے بعد ان میں اتنی صلاحیت پیدا ہوگئی کہ تعلیمات، دار الاقامہ اور مطبخ وغیرہ جیسے حساس شعبے جن کا تعلق براہِ راست طلباء سے ہوتا ہے، ان کے حوالے کر دیے گئے۔ اور وہی مہتمم صاحب جو کل تک ان کے بے انتہا شاکی تھے خاموشی کے ساتھ یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ یوں تو حضرت مہتمم صاحب پورے دار العلوم اور جملہ شعبوں کے ذمہ دار ہیں؛ لیکن اس تقسیم کار کے بعد شعبۂ محاسبی، شعبۂ اہتمام اور شعبۂ اوقاف خاص طور پر ان کی نگرانی میں دیئے گئے اور باقی کچھ غیر اہم شعبے جیسے شعبۂ تبلیغ مہمان خانہ اور شعبۂ نشر و اشاعت وغیرہ میرے سپرد کئے گئے۔ مجھے اس سے بڑا قلق ہوا اور میں حیران رہ گیا کہ یا تو چند ماہ پیشتر ممبرانِ شوریٰ اِس بات کو سراہ رہے تھے کہ دار العلوم کے انتظامی اُمور بڑی عمدگی اور سلیقہ مندی کے ساتھ انجام پا رہے ہیں اور مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب بھی ہر طرح مطمئن تھے، یا اب اچانک یہ صورتِ حال پیش آ گئی، جس کا نتیجہ میرے نزدیک یقینی طور پر یہ نکلتا تھا کہ نظامِ کار کی وہ پُھرتی اور تیزی جو بڑی محنتوں کے بعد لائی گئی تھی، اب پھر ختم ہو جائے گی۔ میں نے یہ صورتِ حال دیکھ کر ایک قلبی اذیّت محسوس کی اور یہ یقین کر لیا کہ اب اہتمام میں کام کرنے کے لیے میرا کوئی میدان باقی نہیں رہا۔ مولانا اسعد صاحب کے مزاج سے میں بخوبی واقف تھا کہ اب وہ یہ چاہیں گے کہ دار العلوم کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ کام بھی ان کی اجازت اور مرضی کے بغیر انجام نہ پائے، اور ظاہر یہ کریں گے کہ میں کچھ نہیں ہوں۔ میں تو بس ایک رُکن شوریٰ ہوں۔ چونکہ میں مولانا کا رفیق قدیم رہا ہوں اور انھوں نے برادرانہ طور پر جو خدمت بھی میرے سپرد کی اسے میں نے ہمیشہ انجام دیا؛ لیکن اُس وقت بھی میں نے ان کی بے جا حمایت کبھی نہیں کی نہ ذاتی فائدے ان سے حاصل کیے؛ کیونکہ یہ میرا مزاج ہی نہیں ہے؛ البتہ میں نے خود ان کی ترقیات اور جمعیۃ علمائے ہند کے لیے اہم خدمات انجام دی ہیں، جن کی فہرست طویل ہے جو ان شاء اللہ کتاب میں آئے گی۔

میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ مولانا اسعد صاحب کو میرا معاون مہتمم کا منصب، طلباء کا مجھ ناچیز سے والہانہ تعلق اور میرا اثر و نفوذ اور قوتِ تنفیذ قطعاً گوارا نہیں ہے۔ چونکہ میں اس اصول پر انتظامی امور انجام دیتا تھا کہ میں صرف دار العلوم کے نظام و دستور کا پابند ہوں اور مہتمم کے علاوہ کسی بھی دوسرے فرد سے، خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو،

ہر معاملے میں اجازت لینے یا مشورہ کرنے کا پابند نہیں ہوں (یہ الگ بات ہے کہ میں حسبِ ضرورت مشورہ لیتا رہوں، جیسا کہ لیتا رہا) اس لیے اب دو ہی صورتیں میرے سامنے تھیں، ایک تو یہ کہ میں بالکل بے عمل اور بے اختیار بن کر دفترِ اہتمام میں بیٹھا رہوں، جیسا کہ بہت سے لوگوں نے مجھے مشورہ دیا کہ تم مولانا نصیر احمد خاں بن جاؤ (واضح رہے کہ یہ الفاظ میرے اپنے نہیں ہیں) یعنی کوئی کام نہ کرو؛ لیکن میری طبیعت یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ میں کسی منصب پر رہتے ہوئے اس کے فرائض کی انجام دہی میں جان بوجھ کر کوئی کوتاہی کروں۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کی طرح ہر ہر بات کی اجازت مولانا اسعد صاحب سے لیا کروں، یہ بھی میرے لیے ناممکن تھا؛ اس لیے میں نے یہ دیکھتے ہوئے کہ دارالعلوم کی خدمت کا وہ میدان جو مجلسِ شوریٰ کے مخلص ارکان نے کچھ عرصے تک مجھے مرحمت فرمایا تھا، مولانا اسعد صاحب کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اب ختم کر دیا گیا ہے، اپنے لیے بہتر یہ سمجھا کہ اپنی انتظامی ذمہ داری یعنی معاون مہتمم کے منصب سے سبکدوشی لے کر پھر تدریسی خدمت پر واپس چلا جاؤں، چنانچہ مجلسِ شوریٰ نے میری اس درخواست کو قبول کرتے ہوئے مجھے تدریس پر واپس بھیج دیا۔ چونکہ میرا تقرر عربی زبان وادب کی تدریس اور اس کی نشر واشاعت کے لیے ہوا تھا اور اسی کام میں ہمیشہ مشغول بھی رہا، اس لیے میری کسی طلب یا فرمائش کے بغیر دفترِ تعلیمات کی جانب سے مجھے عربی کے دو گھنٹے پڑھانے کے لیے دیئے گئے (میرے پاس تعلیمات کی تحریریں محفوظ ہیں) ایک تکمیل ادب کی انشاء کا اور دوسرا تکمیل ادب سال دوم کا۔ یاد رہے کہ تکمیل ادب سال دوم کے اسباق یا گھنٹے نہیں ہوتے؛ بلکہ اس میں سالِ اوّل کے دو منتخب طالبِ علم ہوتے ہیں جو استاد کی نگرانی میں مطالعہ کرتے ہیں اور عربی میں کوئی طویل مقالہ لکھتے ہیں یا کسی کتاب کا ترجمہ کرتے ہیں (اصل مقصد عربی زبان میں پختگی پیدا کرنا ہوتا ہے) اس کے لیے یومیہ کسی مقدارِ وقت کا تعین نہیں کیا جا سکتا؛ بلکہ اس میں حسبِ ضرورت وقت صرف کیا جاتا ہے، زیادہ بھی اور کم بھی۔

میں نے منصبِ اہتمام سے اس جذبے کے تحت استعفیٰ دیا تھا کہ جب میرے پاس کوئی عہدہ نہیں رہے گا تو ہمارے باہمی اختلافات ختم ہو جائیں گے اور دارالعلوم کی فضا میں خوشگواری پیدا ہوگی۔ مجھے یقین تھا کہ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب میرے اس ایثار کی قدر کرتے ہوئے مجھے ساتھ لے کر اور سب کے ساتھ ملا کر چلیں گے؛ لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ مجھے دارالعلوم کے چھوٹے بڑے تمام معاملات سے اس طرح دُور رکھا گیا جیسے وحید الزماں نام کا کوئی آدمی دارالعلوم میں ہے ہی نہیں۔ یہ پالیسی غالباً بالقصد اور مشورہ کے بعد اپنائی گئی۔ حتیٰ کہ قادیانیت پر جب کانفرنس ہوئی تو اس کا ایک عمومی دعوت نامہ اگرچہ میرے پاس آیا؛ لیکن اس کے کسی بھی معاملے اور مشورے میں مجھے شریک نہیں کیا گیا، جبکہ جونیئر اساتذہ جو میرے شاگرد بھی ہیں، ہر چیز میں حصہ لیتے رہے، مجھے اس حد تک نظر انداز کیا گیا کہ یہ بات دوسرے لوگوں نے بھی محسوس کر لی۔ مثلاً مولانا مفتی محمد منظور صاحب

کانپوری نے جو آج کل مولانا اسعد صاحب سے بہت قریب بھی ہیں۔ بعض ذمہ داران سے کہا (جیسا کہ مجھے معلوم ہوا) کہ اگر کوئی اختلاف ہے تو اس حد تک نہیں ہونا چاہیے کہ آپ انھیں بالکل نظرانداز کر دیں۔ مولانا منظور صاحب میرے غریب خانے پر بھی تشریف لائے تھے؛ مگر بدقسمتی سے ملاقات نہ ہوسکی، شاید انھیں مجھے دلاسا دینا تھا۔

اس طرح تقریباً ڈھائی تین سال کا عرصہ ایسا گزرا کہ جس میں مسلسل مجھے نظرانداز کیا جاتا رہا اور پالیسی یہ بنائی گئی کہ دارالعلوم کا سبق بھی مجھے ایسا دیا جائے جس میں طلباء کی کم سے کم تعداد مجھ سے وابستہ ہوسکے۔ میں نے اس پر قناعت کی اور اس حد تک احتیاط برتی کہ اس پورے عرصے میں دارالعلوم کے طلباء کی جانب سے منعقد کیے جانے والے ماہانہ اور سالانہ جلسوں میں ان کے اصرار کے باوجود شرکت نہیں کی، حتیٰ کہ النادی الادبی (جس کو ایک زمانے میں، میں نے ہی قائم کیا تھا اور جس سے آج بھی مجھے قلبی لگاؤ ہے) کے جلسوں میں بھی اس کے موجودہ نگراں مولانا قاری محمد عثمان صاحب کے اصرار کے باوجود شریک نہیں ہوا۔ چونکہ دارالعلوم کے اندر ہونے والی بہت سی انتظامی خرابیوں اور بے جا تشدد اور سختیوں کی اطلاعات مجھے مل رہی تھیں اور جتنی خامیاں میں نے دُور کی تھیں وہ سب عود کر آنے لگی تھیں؛ اس لیے مجھے ڈر تھا کہ میں موجودہ انتظامیہ کی کسی خامی پر تنقید نہ کر بیٹھوں؛ کیونکہ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کے عہد اہتمام میں آزادانہ تنقید کرنے کا عادی رہ چکا تھا اور ان تنقیدوں پر مولانا اسعد صاحب اور ان کے حلقہ کی جانب سے مجھے ہمیشہ دادِ شجاعت دی جاتی تھی۔ میں یہ بھی جان چکا تھا کہ حضرت مولانا محمد طیب صاحب اتنے فراخ دل اور وسیع الظرف تھے کہ ہر تنقید کو گوارا کر لیتے تھے؛ لیکن مولانا اسعد صاحب جو اَب دارالعلوم پر بڑی حد تک حاوی اور مسلط ہو چکے ہیں، ہرگز کوئی بات گوارا نہیں کریں گے۔ مجھے چونکہ طلباء کو ساتھ لے کر کوئی اقدام نہیں کرنا تھا؛ اس لیے میں ان کے جلسوں میں کبھی شریک نہیں ہوا اور میں نے خاموشی کے ساتھ اپنے لیے کام کا ایک تصنیفی میدان الگ بنالیا اور ادارہ دارالمؤلفین قائم کر کے اپنے چند نوجوان فضلاء کو ساتھ لے کر علومِ اکابر دیوبند کی اشاعت میں مشغول ہوگیا۔

گزشتہ سال غالباً ماہِ ربیع الاوّل میں دارالعلوم کی تبلیغی جماعت سے وابستہ چند طلباء میرے پاس آئے اور انھوں نے چھتہ کی مسجد میں منعقد ہونے والے اپنے ہفتہ واری تبلیغی جلسے میں شرکت کی دعوت دی۔ میں اُس سے بہت پہلے ان کے دو جلسوں میں شریک ہو چکا تھا۔ ان کے جلسے بہت سادہ اور مخصوص افراد پر مشتمل ہوتے ہیں اور ان میں لاؤڈ اسپیکر کا نظم نہیں ہوتا۔ دو دفعہ انکار کر دینے کے بعد جب تیسری بار آ کر انھوں نے اصرار کیا تو میں نے یہ سمجھ کر کہ ان کا یہ جلسہ بھی معمول کے مطابق ہوگا، شرکت کے لیے حامی بھر لی؛ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جلسہ کا مدار مجھ پر نہیں ہوگا؛ بلکہ میں آپ طلباء کی تبلیغی تقریریں سنوں گا اور بعد میں چند منٹ خود بھی کچھ کہہ دوں گا۔ میں بالکل خالی الذہن بعد نمازِ عشاء چھتہ کی مسجد میں پہنچا تو خلافِ توقع مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، طلباء کی ایک بڑی تعداد سڑک پر

اور مسجد کی چھتوں پر بھی تھی۔ یہ مجمع دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا اور مجھے پس وپیش ہوا کہ میں کیا کروں جو طلباء میرے ساتھ تھے ان سے میں نے ناگواری کے ساتھ یہ بات کہی کہ یہ کیسا مجمع ہے؟ یہ بات تو طے نہیں ہوئی تھی؟

میں مسجد کے اندر پہنچا تو منتظم طالبِ علم نے لاؤڈ اسپیکر پر تقریر شروع کر دی؛ لیکن چہار طرف سے طلباء نے شور مچانا شروع کر دیا کہ ہم مولانا کی تقریر سنیں گے۔ اس طالبِ علم نے مجبور ہو کر اپنی تقریر بند کی اور مجھ سے درخواست کی کہ میں تقریر شروع کر دوں۔ میری عادت ہمیشہ یہ رہی ہے کہ میں وقتی تأثر کے تحت بولتا ہوں۔ چونکہ یہ بات خلافِ معاہدہ اور ذہنی نقشے کے برعکس تھی، اس لیے مجھے ناگواری ہوئی اور میں نے اِسی بات کو لے کر اپنی تقریر کا آغاز کر دیا کہ آپ لوگ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ قول وفعل کا تضاد ہمارے علماء کے معاشرے میں عام ہوتا جارہا ہے، بزدلی بھی پھیلتی جارہی ہے، نفاق کے ہم لوگ عادی بنتے جارہے ہیں۔ آج ہمارا محبوب مشغلہ کمروں میں بیٹھ کر اساتذہ اور منتظمین پر تنقید کرنا ہے۔ لیکن ہمارے اندر وہ جرأت باقی نہیں رہی جو ایک مسلمان اور بالخصوص عالم دین کے اندر ہونی چاہئے۔ کہ ہم غیبت کرنے کے بجائے اپنے استاد یا منتظم کے سامنے ادب کے ساتھ اپنی بات پیش کر دیں۔ اس میں ہم ڈر اور جھجک محسوس کرتے ہیں اور پس پُشت تبصروں میں خوب دلچسپی لیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اللہ نے ایک ہی چیز کو باعثِ اجر وثواب بھی قرار دیا ہے اور اسی کو باعثِ عتاب بھی۔ اگر ہم بہ نیتِ ہمدردی اپنے دل کی بات اپنے منتظم یا استاد کے سامنے کہہ دیں، چاہے ان کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو، تو وہ باعثِ اجر ہوگی اور اگر وہی بات پس پُشت کہی جائے تو غیبت ہوگی، جو حرام ہے۔ حقیقی نماز وہ ہے جس کے اثرات نمازی کے اعمال میں ظاہر ہوں۔ بزدلی کا سرچشمہ نفاق ہے اور شجاعت کا سرچشمہ ایمان ہے۔ نماز ایمان کو تازہ کرتی ہے اور جس کے دل میں ایمان تازہ ہو جاتا ہے اس کے اندر جرأت اور بہادری پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمارے مدارس بہادر اور مخلص وجاں نثار علماء پیدا کرنے کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔ ہمارے اکابرو اسلاف اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ میں نے متعدد بزرگوں جیسے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے بعض واقعات اور ان سے متعلق اپنے کچھ خواب بیان کیے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ جو حضرات بزرگ اور پیر ہیں اگر ان کی زندگی میں سادگی اور خدا ترسی نہیں ہے تو وہ حقیقی بزرگ نہیں ہیں۔ ہمارے اکابر جو اسی صدی میں گزرے ہیں، ان کی زندگیوں کا جائزہ لیجئے، تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے اُسوہ کے مطابق گزاری ہے۔

میں نے کہا کہ آج کے دَور میں ہر جگہ سیاست آتی جارہی ہے، دارالعلوم میں بھی سیاسی اثرات رونما ہونے لگے ہیں۔ مثلاً دکھانے کے لیے منصب پر کسی کو رکھا جاتا ہے اور کام کرنے کے لیے کوئی اور صاحب ہوتے ہیں۔ مولانا ریاست علی صاحب ناظمِ تعلیمات ہیں اور مولانا ارشد صاحب ان کے نائب ہیں؛ لیکن مولانا ارشد صاحب مختارِ کل

بنے ہوئے ہیں وہ سزائیں دینے میں بالکل آزاد ہیں، نہ مجلسِ تعلیمی کے پابند ہیں اور نہ ناظمِ تعلیمات کے۔ اور جب کسی کام کو ٹلانا ہوتا ہے تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ میں تو نائب ہوں، اصل ذمہ دار مولانا ریاست صاحب ہیں اور مجلسِ تعلیمی ہے۔ متعلقہ شخص پریشان ہو کر مولانا ریاست صاحب کے پاس جاتا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ میں ناظم تو ضرور ہوں؛ لیکن عملاً مولانا ارشد صاحب ہی کام کر رہے ہیں؛ اس لیے انھی سے جا کر کہو۔ اس سیاسی صورتِ حال کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو اپنا کام کرانے میں سخت پریشانیاں اُٹھانی پڑتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ صرف سیاسی تکلف ہے۔

میں نے کہا کہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مرحوم کے زمانے میں بھی میرا یہ ذہن رہا کہ طلباء کی شخصیت کی نشو و نما میں ایک حد تک آزادی کی بھی ضرورت ہوتی ہے انھیں دبا کر نہیں رکھنا چاہئے؛ بلکہ آزادی دینی چاہیے اور پھر کنٹرول کرنا چاہئے۔ یہ تربیت کا اہم جزو ہے۔ دبا کر، جذبات کو کچل کر اور زبان بندی کر کے یہ سمجھنا کہ کنٹرول ہو رہا ہے۔ محض خام خیالی ہے۔ حضرت مولانا محمد طیب ؒ صاحب کے زمانے میں جمعیۃ الطلبہ مجلسِ شوریٰ کے قانون کی رو سے ممنوع تھی؛ لیکن اُس وقت مولانا اسعد صاحب نے یہ جانتے ہوئے کہ وہ ممنوع ہے، زور دے کر جمعیۃ الطلبہ بنوائی، اور اس کو حضرت قاری صاحب مرحوم اور مجلسِ شوریٰ کے مقابلے پر کھڑا کر دیا حالانکہ یہ کھلی بغاوت تھی۔ میں فکری طور پر جمعیۃ الطلبہ کے قیام کا مؤید تھا، اس لیے میں نے اس کے قیام کا اعلان کر دیا اور وہ سرگرمِ عمل ہوگئی۔ اُس وقت میں نے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب ؒ قدس سرہٗ کے نظام کے خلاف جو تقریریں کیں اس پر مولانا اسعد صاحب اور ان کی پارٹی نے مجھے سب سے بڑا مجاہد قرار دیا۔ اُس وقت بھی دارالعلوم میں امن و سکون تھا؛ لیکن چونکہ مولانا اسعد صاحب حضرت قاری صاحب کے نظام کو ختم کرنا چاہتے تھے؛ اس لیے انھوں نے دوہری فوج تیار کی۔ باہر علمی مؤتمر کے نام سے فضلائے دارالعلوم کی تنظیم اور اندرونِ دارالعلوم جمعیۃ الطلبہ کا قیام۔ میری اس بغاوت کے باوجود حضرت قاری صاحب مرحوم اور اُس وقت کی مجلسِ شوریٰ کے عالی ظرف ارکان نے میرے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا۔ اُس وقت لڑائی کا سب سے بڑا عنوان جمعیۃ الطلبہ کا مطالبہ تھا۔ آج جبکہ مجلسِ شوریٰ کے قانون کی رُو سے جمعیۃ الطلبہ منظور شدہ ہے اور اس کا دستورِ اساسی بھی منظور شدہ ہے، اگر کوئی شخص اس کے قیام کا مطالبہ تو کجا، اس کا نام بھی لے گا تو مولانا اسعد صاحب کی نظر میں اس سے بڑا کوئی مفسد نہ ہوگا، اسی کو سیاست کہتے ہیں۔"

میں نے دارالعلوم میں اپنے کچھ کاموں کی بھی تفصیل بیان کی اور یہ بھی کہا کہ ہمارے اسلاف اس قسم کی سیاستوں سے پاک تھے۔ پھر کچھ طلباء نے ملّی جمعیۃ علماء کے تعلق سے سوالات کیے کہ آپ کو جمعیۃ علمائے ہند سے کیوں الگ کیا گیا۔ میں نے کہا کہ ہم متعدد افراد کو مولانا اسعد صاحب کی غیر واضح اور مبہم پالیسی سے اختلاف تھا، جو ہمارے اکابر و اسلاف کی روایات کے خلاف تھی، ان کی غلط پالیسی سے تنگ آ کر بہت سے پُرانے ممبر بھی

علیٰحدگی اختیار کر چکے تھے، جیسے حضرت مولانا قاضی سجّاد صاحب اور پروفیسر ضیاء الحسن صاحب فاروقی وغیرہ چند سوالوں کے جوابوں کے بعد میری تقریر ختم ہوگئی۔

یہ تقریر تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی۔ تقریر کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ تک طلباء مصافحہ کرتے رہے۔ حتیٰ کہ بہ مشکل تمام میں باہر نکلا تو دارالعلوم کے صدر دروازے تک مصافحوں کا سلسلہ جاری رہا۔ میں اپنے گھر پہنچا تو وہاں بھی طلباء کی ایک جماعت پہنچی جس کو بمشکل تمام واپس کیا۔ صبح کو دارالعلوم کی تمام درس گاہوں میں حسبِ معمول حاضری ہوئی اور اسباق کا نظام قطعاً متأثر نہیں ہوا، جبکہ آئے دن بیرونِ دیوبند منعقد ہونے والے مشاعروں میں طلباء کی بڑی تعداد میں شرکت سے اسباق متأثر ہوجاتے ہیں اور موجودہ انتظامیہ ان پر کنٹرول کرنے میں ناکام رہتی ہے۔

مجھے اپنی تقریر کی یہ ساری تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ مولانا اسعد صاحب نے دیوبند کے نام نہاد نمائندہ اجتماع میں اسی تقریر کے حوالے سے مجھ پر بالکل بے بنیاد اور بے تکے متعدد الزامات لگائے ہیں۔ جن میں سے ایک الزام یہ ہے کہ میں نے اس تقریر میں سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں اعلانیہ طور پر طلباء سے کہا کہ ''مدرسین، ملازمین اور منتظمین کو مارو۔'' تنہا یہ الزام اس قدر غیر معقول ہے کہ اس سے نہ صرف مولانا اسعد صاحب کی کذب بیانی کی قلعی کھل جاتی ہے؛ بلکہ یہ بھی محسوس ہوجاتا ہے کہ مولانا موصوف جو اپنی تقریر کے دوران مجھ کو سریع الاشتعال ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے، خود کس قدر از خود رفتہ اور حواس باختگی کا شکار تھے کہ انھیں یہ بھی ہوش نہیں رہا کہ میں جو بات کہہ رہا ہوں، کیا اس پر کسی کو بھی یقین آئے گا؟ کیا یہ عقل میں آنے والی بات ہے کہ ایک استاد باہوش وحواس طلباء سے یہ کہے گا کہ اپنے استادوں کو مارو؟ اور کیا طلباء خاموش سنتے رہیں گے اور کچھ نہ کہیں گے؛ بلکہ تقریر کے ختم ہونے کے بعد ایسا کہنے والے سے گرم جوشی کے ساتھ مصافحے کریں گے؟ اگر طلباء نے واقعی ایسا کیا تو یہ ان کے لیے کم اور انتظامیہ کے لیے زیادہ رسوائی کی بات ہے کہ اس کی ناقص تعلیم وتربیت نے طلباء کو اس حد تک بے حس اور بزدل بنادیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ میں بھلا اساتذہ اور ملازمین کو مارنے پر طلباء کو کیوں اُکسانے لگا، کیا ان سے میرا کوئی اختلاف یا جھگڑا ہے؟ ہاں! اگر میں مولانا اسعد صاحب کو مارنے کی بات کہتا تو کسی قدر عقل میں بھی آسکتی تھی، اگرچہ یہ چھچھوری حرکتیں ان کے جیسے سیاسی لوگوں کو زیب دیتی ہیں جن کا مشغلہ ہی رات ودن صرف یہ ہوتا ہے کہ فلاں کو مارو، فلاں کے پَر کتر دو اور فلاں کے اقتدار کا چراغ گل کردو۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا اسعد صاحب نے یہ سفید جھوٹ میری طرف منسوب کر کے اپنے ذہنی افلاس اور اخلاقی پستی کا ثبوت دیا ہے اور میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ مجھے بدنام کرنے کے لیے صریح دروغ گوئی سے بھی کام لے سکتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ میں نے سیکڑوں آدمیوں کے سامنے طلباء سے یہ بات کہی تھی۔ اور میں کہتا ہوں کہ کوئی بھی معتبر شخص جو اس جلسہ میں شریک رہا ہو یہ گواہی نہیں دے سکتا کہ

یں نے یہ بات کہی ہے۔اگر مولانا اسعد صاحب صرف دوثقہ آدمیوں سے بھی حلف اُٹھوا کر گواہی دلوادیں تو میں اس کی ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔

خیر،مولانا اسعد صاحب کے الزامات کا جواب تو میں بعد میں دوں گا،اس وقت مجھے یہ عرض کرنا تھا کہ چھتہ کی مسجد میں میری تقریر کا پروگرام ایک ایسا واقعہ تھا جسے مولانا اسعد صاحب اور ان کے گروپ نے خطرہ کا الارم سمجھا (حالانکہ ایک استاد کا طلباء کے علمی و دینی پروگراموں میں شریک ہونا نہ صرف یہ کہ کوئی بُری یا عجیب بات نہیں ہے؛ بلکہ ایک اچھی بات ہے جس کو سراہا جانا چاہیئے) وہ اپنی دانست میں مجھے دارالعلوم کے منظر سے غائب اور طلباء سے بے تعلق کر چکے تھے۔یہ ان کے لیے اچنبھے کی بات تھی کہ طلباء اب بھی مجھ سے وابستہ اور میرے اس قدر گرویدہ ہیں،انھوں نے جوابی عمل کے طور پر مدراس سے تعلق رکھنے والے ایک مدرس کو (جو میرے شاگرد بھی ہیں اور میں نے ہی ان کو دارالعلوم میں، بڑی کوشش کے بعد ملازمت دلوائی تھیں؛لیکن اب مولانا اسعد صاحب سے بہت قریب ہیں) تیار کیا یا وہ خود تیار ہوئے اور انھوں نے تیسرے دن اپنے دواسباق میں یہ اعتراف کرتے ہوئے کہ میں ان کا استاد اور محسن ہوں،میرے خلاف انتہائی سوقیانہ،زہریلے اور اشتعال انگیز الفاظ میں تقریر کی۔مجھے فاسق،فاجر،یہاں تک کہ بے نمازی غرض کہ جو منہ میں آیا کہتے چلے گئے۔اس کی گواہی طلباء کی ایک بڑی تعداد آج بھی دے سکتی ہے۔انھوں نے یہ تقریر مجھے طلباء کی نظر سے گرانے کی غرض سے کی تھی؛لیکن اس کا اثر اُلٹا ہوا اور طلباء میں اس تقریر سے زبردست بے چینی اور غم وغصہ پیدا ہوا۔طلباء کے ذہن میں یہ سوال اُبھر کر سامنے آیا کہ جب ایک استادِ حدیث اپنے محسن استاد کی شان میں اس طرح گستاخی ہی نہیں الزام تراشی کرسکتا ہے تو ہم شاگردوں کا کیا حال ہوگا اور ہماری سیرت کس سانچے میں ڈھلے گی۔طلباء کی ایک تعداد نے تو اس کے بعد ان کے سبق میں جانا ہی چھوڑ دیا۔اس تقریر کا چرچا دارالعلوم اور بیرونِ دارالعلوم ہر جگہ ہوا اور سب نے اس کی مذمت کی اور کہا کہ دارالعلوم کی پوری تاریخ میں اب سے پہلے کسی استاد نے کسی درس گاہ میں اپنے استاد کو اس طرح مغلظات سنائی ہوں اس کی نظیر نہیں ملتی؛لیکن طرفہ تماشہ یہ کہ دارالعلوم کی تمام روایات کو بے دردی کے ساتھ پامال کیے جانے کے باوجود مولانا ریاست علی صاحب ناظمِ مجلسِ تعلیمی اور مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا،گویا ان کے نزدیک یہ ایک پسندیدہ بات تھی۔قاعدے کے مطابق چھتہ کی مسجد میں ہونے والی میری تقریر اگر قابل مؤاخذہ تھی تو ناظمِ مجلسِ تعلیمی کو مجھ سے فوراً جواب طلب کرنا چاہیئے تھا،اسی طرح مذکورہ مدرس سے بھی باز پرس کرنی چاہیئے تھی؛لیکن افسوس کہ یہ منتظم حضرات جو خود کو دارالعلوم کا سب سے بڑا محافظ امن سمجھتے ہیں۔اس جوابی کارروائی کو دیکھ رہے تھے اور خاموش تھے۔میرا لڑکا جو مذکورہ مدرس کے ایک سبق میں شریک تھا گھر آکر رونے لگا اور دریافت کرنے پر بتایا کہ آج میرے باپ کو میرے ایک استاد نے جتنا سخت وسست

کہا میں اس کو سننے کی تاب نہیں لاسکتا تھا، یا تو میرے کان بہرے ہو جاتے یا زمین مجھے نگل جاتی؛ مگر میں اس لیے ضبط کر کے بیٹھا رہا کہ میرے والد کی مجھے یہ ہدایت ہے کہ میں ہر استاد کا احترام کروں اور ان کا کسی سے کتنا ہی اختلاف ہو، میں اس میں شریک نہ ہوں۔ اس تقریر کی گونج باہر تک پہنچی اور لوگوں نے ملاقاتوں میں اور تحریری طور پر اس کی مذمت کی۔ اگر کسی نے مذمت نہیں کی تو وہ دارالعلوم کی انتظامیہ تھی جو چپ سادھے تماشائی بن کر یہ سب کچھ دیکھتی رہی؛ مگر دارالعلوم کے سبھی مدرسین حضرات نے اس تقریر کو ناپسند کیا۔

مجھے باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا کہ اس کے فوراً بعد مولانا اسعد صاحب دیوبند پہنچے اور مخصوص حضرات کی میٹنگ ہوئی۔ مولانا اسعد صاحب نے مذکورہ مدرس سے کہا کہ آپ کو ایسی تقریر نہیں کرنی چاہئے تھی، اس سے آپ گرفت میں آجائیں گے۔ آپ تو وحید الزماں کو تقریر کرنے کے مواقع دیجئے اور ٹیپ کیجئے تاکہ ان کا معاملہ شوریٰ میں رکھا جاسکے۔ یہ رپورٹ مجھے میرے ایک مخصوص آدمی نے پہنچائی جو ان سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور اس گفتگو کے وقت باہر کھڑے سب کچھ سن رہے تھے۔

اس کے تیسرے دن اچانک مغرب کے بعد دارالعلوم میں یہ افواہ گرم ہوئی کہ آج آٹھ بجے وحید الزماں کی تقریر ہوگی۔ یہ بات ایک سازش کے تحت پھیلائی گئی۔ طلباء کی مختلف ٹولیاں جن میں سے کچھ کو میں پہچان سکا اور بہت سوں کو میں نے نہیں پہچانا، عشاء کی نماز تک میرے پاس آتی رہیں، میں نے ان سب سے اس خبر کی تردید کی اور کہا کہ میری تقریر کا کوئی پروگرام نہیں ہے، نہ میں نے کسی سے کہا ہے اور نہ مجھ سے کسی نے کہا ہے، یہ صرف ایک شرارت ہے۔ میرے پاس میرے محلہ کے قاضی مرغوب احمد اور قاضی منصور احمد صاحبان بیٹھے ہوئے تھے، جو دارالعلوم جامع مسجد سے متعلق ہیں؛ لیکن میرے قدیم ہمدرد اور مخلص ہیں اور دونوں بھائی میرے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار رہتے ہیں، میں جانے کے لیے کچھ آمادہ ہوا تو ان دونوں حضرات نے منع کیا اور کہا کہ ہوسکتا ہے یہ کوئی سازش ہو۔ اب میں اس کش مکش میں پڑ گیا کہ نہ جانا بہتر ہے یا جا کر طلباء سے یہ کہہ دینا مناسب ہے کہ میرا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ آپ لوگ اپنے کمروں میں جائیے۔ اسی دوران تقریباً پچیس تیس طلباء کی ایک جماعت آئی اور انھوں نے کہا کہ طلباء میں کافی خلفشار ہے، وہ اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں، آپ چل کر کم از کم یہی کہہ دیجئے کہ میری تقریر نہیں ہوگی۔ میں ان کے ساتھ تنہا نکلا، جب صدر دروازے پر پہنچا تو کئی سو کی تعداد میں طلباء وہاں اکٹھا ہو گئے۔ میں پھر ٹھٹھکا اور یہ خیال آیا کہ اگر اندر جاؤں گا تو مزید طلباء وہاں جمع ہوں گے؛ اس لیے بہتر یہ ہے کہ یہیں کچھ کہہ دیا جائے۔ چنانچہ میں گیٹ کے پاس کے کمرے کی سیڑھی پر کھڑا ہو گیا۔ طلباء اِدھر اُدھر سے جمع ہونے شروع ہو گئے۔ میں نے کہا کہ میرے عزیزو! میرا تقریر کا کوئی پروگرام نہیں ہے، نہ میں نے کسی سے کہا ہے اور نہ مجھ سے کسی نے کہا ہے۔ یہ ایک سازش ہے جو اس لیے کی جا رہی ہے تاکہ یہ کہہ کر مجھے بدنام کیا جاسکے کہ میں

دارالعلوم میں انتشار پھیلا رہا ہوں۔امتحان کا زمانہ قریب ہے،آپ لوگ جائیے،اپنی پڑھائی میں مشغول رہئے اور اِدھر اُدھر کی باتوں پر قطعاً توجہ نہ دیجئے۔ان چند منٹوں میں طلباء بہت بڑی تعداد میں جمع ہو گئے؛ کیونکہ پہلے سے افواہ پھیلی ہوئی تھی۔میں رُکا تو دو طالبِ علموں نے یہ کہا کہ حضرت! کچھ نصیحت فرما دیجئے۔میں نے کہا کہ آج کی نصیحت صرف یہ ہے کہ ہمارے دارالعلوم کی جہاں بہت سی خصوصیات ہیں، وہیں ایک بڑی خصوصیت اور اعلیٰ روایت احترامِ اساتذہ بھی ہے۔ یہ ہماری تعلیم کا جوہر ہے۔اگر یہ جوہر پیدا نہ ہو تو ہماری تعلیم ناقص ہے۔میں عاصی وگنہگار، بے عمل اور تہی دامن ہوں۔میرے پاس کچھ نہیں ہے؛ لیکن مجھے اپنے اساتذہ کی دعائیں ملی ہیں۔ میرے کوئی استاد مجھ سے ناراض نہیں ہوئے اور اگر ہوئے تو میں نے ان کو راضی کر کے اپنی دنیا و آخرت درست کرنے کی کوشش کی۔میں نے بہ طور مثال کہا کہ ایک دفعہ اسٹرائک کے زمانے میں حضرت مولانا معراج الحق صاحب کو میرے بارے میں بدگمانی تھی اور وہ مجھ سے ناراض تھے؛ لیکن میں ہمیشہ ان کو سلام کرتا تھا اور کوئی لفظ ان کی شان کے خلاف زبان سے نہیں نکالا۔ایک ملازم نے یہ سمجھتے ہوئے کہ میرا ان کا اختلاف ہے۔ایک روز مجھ سے یہ کہا کہ "آج اہتمام میں معراج الحق کی بڑی درگت بنی"۔ میں نے اس پر اس کی سخت سرزنش کی اور کہا کہ میرے سامنے میرے محترم استاد کی شان میں کوئی گستاخی کرے، یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوسکتا۔

اسی اسٹرائک کے زمانے میں حضرت مولانا محمد حسین صاحب بہاری بھی ایک دفعہ دارالعلوم کی مسجد میں مجھ سے ناراض ہو کر مخاطب ہوئے۔میں نے ان کے سامنے سر جھکا دیا اور عرض کیا کہ "حضرت! آپ نے میرے متعلق فلاں بات کہی جو آپ کی شان کے مناسب نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ کو جو کچھ کہنا ہو، میرے سامنے فرمائیں اور اس طرح کہ آپ کا جوتا ہو، میرا سر ہو اور مجمع عام ہو، یہ آپ کا حق ہے، وہ آپ کا منصب نہیں"۔ وہ بہت رحم دل اور رقیق القلب ہیں۔اتنی بات سنتے ہی انھوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔وہ دن ہے اور آج کا دن، وہ مجھے ہمیشہ بیٹا کہہ کر مخاطب کرتے ہیں، ڈانٹتے بھی ہیں اور دعائیں بھی دیتے ہیں۔ نیز میں نے کہا کہ دارالعلوم کے بعض مدرس جو میرے شاگرد بھی ہیں، کہتے ہیں کہ وحید الزماں سے کوئی شخص ملنا پسند نہیں کرتا۔وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ یہ ہزاروں کا مجمع جو اس وقت اپنی محبت کی بنا پر میرے گرد جمع ہے، آخر کیوں جمع ہے؟ صرف اس لیے کہ میں نے اپنے اساتذہ سے دعائیں لی ہیں، اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔اس پر طلباء نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔

اسی دوران کچھ طلباء جن میں سے بعض میرے مکان پر بھی مجھے بلانے کے لیے پہنچے تھے، اوپر چڑھ گئے اور وہاں سے مجمع کو منتشر کرنے کے لیے چند اینٹیں پھینکیں اور ان میں سے کچھ نے مجمع کے قریب آ کر اس طرح شور مچایا کہ مجمع میں انتشار پیدا ہو۔اسی دوران مولانا عبدالرؤف صاحب افغانی اور حضرت مولانا معراج الحق صاحب صدر دروازے پر پہنچے اور طلباء سے اندر جانے کو کہا۔میں نے تقریر بند کر دی اور سیڑھیوں سے نیچے اُتر کر

طلباء کو اندر بھیجنے لگا، تقریباً آدھ گھنٹہ تک میں طالبِ علموں سے اندر جانے کو کہتا رہا۔ شہر کے کچھ لوگ مہمان خانے کے گوشہ پر کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے اور مرغوب ومنصور صاحبان جن کا ذکر اوپر گزرا، میرے پاس کھڑے ہوئے تھے، میں نے ان کو روانہ کر دیا (اسی بات کو مولانا اسعد صاحب اور ان کے حواریوں نے اس طرح پھیلایا کہ میں جامع مسجد (وقف دارالعلوم) کے لوگوں کو ساتھ لے کر دارالعلوم پر قبضہ کرنے آیا تھا) حضرت مولانا معراج الحق صاحب نے اس کی ضرورت نہیں محسوس فرمائی کہ وہ مجھ سے معلوم کرتے کہ کیا معاملہ ہے۔ دارالعلوم کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ میں اپنے مکان واپس آ گیا۔ میرے پیچھے کچھ طلباء اور کچھ دوسرے افراد تھے جن کو میں نہیں پہچانتا، ان کو میں نے واپس کر دیا۔ مولانا اسعد صاحب بھی اس روز اپنے مکان پر موجود تھے، نعروں کی آواز سُن کر وہ بھی شمالی گیٹ سے اندر آ گئے۔ تحتانی ہال میں طلباء کو جمع کیا جانے لگا؛ لیکن طلباء منتشر تھے۔ مولانا ریاست علی صاحب اور مولانا سعید احمد پالنپوری صاحب کو بھی ان کے گھروں سے بلا لیا گیا، یہ لوگ جنوبی دروازے سے داخل ہوئے۔ اب جس قدر حضرات وہاں پر موجود تھے، ان میں سے کسی کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ صدر دروازے پر کیسا اجتماع ہوا؟ میں کیا تقریر کر رہا تھا اور کیوں کر رہا تھا؟ اور کسی نے بھی مجھ سے یا طلباء سے تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ تحتانی ہال میں مولانا ریاست علی صاحب اور مولانا سعید احمد پالنپوری نے تقریریں کیں۔ آخر الذکر نے تو ناصحانہ تقریر کی کہ فتنہ وفساد نہیں ہونا چاہئے؛ لیکن مولانا ریاست صاحب نے جو دارالعلوم کے ناظم تعلیمات تھے، تحقیق حال کیے بغیر میرے خلاف ایک تقریر کر ڈالی جس میں میری مذمت کرتے ہوئے یہ تک کہہ دیا کہ مولانا کی دارالعلوم میں کوئی خدمت نہیں ہے۔ وہ صرف ہر کام کا انتساب اپنی طرف چاہتے ہیں؛ لیکن طلباء اور سامعین میں بے چینی اور اضطراب تھا اور طلباء پر ان کی تقریر کا اچھا اثر نہیں تھا۔ طلباء کی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے مولانا اسعد صاحب نے تقریر کرنے کی جرأت نہیں کی؛ کیونکہ جوں ہی وہ دارالعلوم میں داخل ہوئے تھے، مختلف سمتوں سے سیٹیوں کی آوازیں آنے لگیں، وہ ہوا کا رُخ سمجھ گئے تھے۔

رات ہی کو مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب سے جو بجنور میں تھے، رابطہ قائم کیا گیا اور وہ علی الصباح دارالعلوم پہنچ گئے۔ تمام دن اساتذہ کے ساتھ میٹنگیں ہوتی رہیں۔ بعض میں مولانا اسعد صاحب بھی شریک رہے۔ شام کو ایک ذریعہ سے مجھے اطلاع ملی کہ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب، مولانا معراج الحق صاحب اور مولانا نصیر احمد خاں صاحب مجھے بلا کر بات کریں گے۔ غالباً یہ انتخاب اس لیے کیا گیا کہ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب تو بڑے ہیں ہی، باقی دونوں حضرات بھی میرے استاد ہیں۔ اگلے دن میں حسبِ معمول سبق پڑھانے گیا۔ پڑھا کر درس گاہ سے نکلا تو مہتمم صاحب کا مکتوب ملا کہ تھوڑی دیر کے لیے اہتمام میں آ جائیں، کچھ بات کرنی ہے۔ چنانچہ میں فوراً ہی دفتر اہتمام میں پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی تینوں بزرگ کھڑے ہو گئے۔ حضرت مولانا معراج الحق صاحب اور حضرت مولانا نصیر احمد

خاں صاحب کے چہروں پر اس قدر بشاشت اور آثارِ شفقت تھے کہ میں حیران رہ گیا۔ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب حسبِ معمول تھے، مصافحہ ہوا۔ سب سے آخر میں مولانا معراج الحق صاحب سے مصافحہ ہوا تو انھوں نے انتہائی شفقت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے میرے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں دبائے رکھا اور اسی حالت میں دوسرے کمرے میں لے گئے جہاں گفتگو کرنی تھی۔ مہتمم صاحب نے گفتگو کا آغاز اِس طرح فرمایا کہ ابھی چھتہ کی مسجد میں اور اس کے بعد صدر دروازے پر آپ کی جو تقریر ہوئی تھی، اس کے بارے میں معلوم کرنا تھا کہ وہ کیا تھی اور آپ کا کیا پروگرام ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ بات اگر آپ پہلے ہی دریافت فرمالیتے تو آپ کو اس قدر طویل مشوروں کی ضرورت پیش نہ آتی۔ میں نے کہا کہ میرا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ میں خالی الذہن ہو کر تبلیغی جماعت کے طلباء کے اصرار پر چھتہ کی مسجد میں یہ سمجھ کر آیا تھا کہ وہاں حسبِ معمول مختصر سی جماعت ہوگی؛ لیکن وہاں خلافِ توقع مجمع کثیر تھا۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق آزادانہ تقریر کی۔ میرے نزدیک اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے دارالعلوم میں خلفشار ہو یا جس کا مقصد کوئی انقلاب برپا کرنا ہو۔ میں نے اپنی تقریر کا ماحصل بھی بتایا اور پھر مدارس سے تعلق رکھنے والے مذکورہ مدرس کی اشتعال انگیز اور زہریلی تقریر کا حوالہ دیا جس سے طلباء میں بے انتہا غم وغصہ پیدا ہوا اور دارالعلوم کی اخلاقی روایات پامال ہوئیں۔ نیز اس کے بعد صدر دروازے پر اپنی آمد، اس کا سبب اور اپنی تقریر کا مضمون بھی وضاحت کے ساتھ بتایا اور عرض کیا کہ میرا کسی اقدام کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ میں تو احتیاطاً طلباء کے ہر اجتماع میں شرکت سے گریز کرتا ہوں اور یہ جو کچھ پیش آیا، محض ایک اتفاقی بات تھی۔ ہاں ایک بات ضرور عرض کرنی ہے کہ حضرت مولانا قاری محمد طیب ؒ صاحب کے زمانے میں طلباء کے ساتھ اگر کچھ سختی ہوتی تھی یا انقلاب سے قبل طلباء کا اجتماعی اخراج کر دیا گیا تھا تو ہم سب نے اسے ظالمانہ اقدام قرار دیا تھا۔ میں آج طلباء کے ساتھ مولانا ارشد مدنی صاحب کے پُرتشدد طرزِ عمل کو پسند نہیں کرتا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ حضرت مدنی ؒ کی طرح ان کے صاحبزادگان میں طلباء کے ساتھ بے انتہا ہمدردی اور شفقت ومحبت ہوگی؛ لیکن مولانا ارشد صاحب کے یہاں سختی ہی سختی ہے، محبت و ہمدردی نہیں۔ اساتذہ بھی ان کے طرزِ عمل سے خوش نہیں ہیں؛ بلکہ بے انتہا منقبض ہیں۔ آپ کو میں دعوت دیتا ہوں کہ اپنے طور پر آپ میری بات کی تحقیق کرائیں۔ اگر صحیح ہو تو ان کو توجہ دلائیں اور غلط ہو تو میری سرزنش فرمائیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ مجھے اس سے کوئی بحث نہیں کہ کون ناظم ہو اور کون نائب ناظم۔ آپ جن صاحب کو بھی طلباء کا اور ہمارا افسر مقرر کریں گے ہم اس کی اطاعت کریں گے؛ لیکن اگر وہ ظلم کرے گا تو اس کو ظلم ہی کہیں گے۔ اس پر خاموش نہیں رہیں گے۔

مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب میری تفصیلی گفتگو سن کر مطمئن ہو گئے۔ حضرت مولانا معراج الحق صاحب نے فرمایا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ کا اور مولانا اسعد صاحب کا اختلاف دارالعلوم پر اثرانداز نہ ہو۔ میں نے کہا کہ یہ کیسے ممکن

ہے جبکہ دونوں ہی کا تعلق دارالعلوم سے ہے۔اگر وہ بلاوجہ میری مخالفت بند کر دیں جیسا کہ وہ شوریٰ کے ہر اجلاس میں کچھ نہ کچھ میرا مسئلہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں، تو میں بھی ان کے خلاف بولنا بند کر دوں گا۔ اس پر مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ ہم آپ دونوں کی گفتگو کرائیں گے اور ایسا ہی ہوگا۔ مہتمم صاحب دو روز کے بعد بجنور تشریف لے گئے تو وہاں حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحب کے صاحبزادے مولانا زین الساجدین صاحب قاسمی سے ایک ملاقات میں حالات کی تفصیل بتا کر اپنے اطمینان کا اظہار فرمایا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

یہ واقعہ گزشتہ تعلیمی سال (۱۴۱۰ھ) کے دوران ششماہی امتحان سے کچھ پہلے کا ہے امتحان بخیریت گزرا اور دارالعلوم کی فضا میں کوئی ادنیٰ ہلچل نہ تھی، حتیٰ کہ ماہِ شعبان آیا اور ۲۱-۲۲ر شعبان ۱۴۱۰ھ کو مجلسِ شوریٰ کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں چند فیصلے ہوئے، جن کی شہرت اجلاس کے فوراً بعد ہوگئی۔ مولانا ارشد صاحب کے استعفے اور اس کی منظوری کی خبر بھی عام ہوگئی؛ لیکن میری سبکدوشی کا فیصلہ صیغۂ راز میں رکھا گیا۔ ۱۴ر رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۱ر اپریل ۱۹۹۰ء کی دوپہر کو دفترِ اہتمام کی جانب سے مجھے ایک بند لفافہ موصول ہوا، جسے کھول کر دیکھا تو حسبِ ذیل مضمون کی تحریر ہاتھ سے لکھی ہوئی تھی:

> ”مجلسِ شوریٰ منعقدہ ۲۱-۲۲ر شعبان المعظم ۱۴۱۰ھ نے آپ کے بارے میں جو تجویز منظور کی ہے، وہ ارسالِ خدمت ہے۔
>
> تجویز ۳ ضمن (ح)
>
> حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کی جانب سے بار بار پیش آنے والی صورتِ حال زیرِ بحث آئی۔ مجلسِ شوریٰ ان کی بیماری اور اس کی بنا پر مشتعل اور بے قابو ہو جانے کی معذوری کے پیشِ نظر ان کو تدریسی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر کے مبلغ سات سو روپیہ ماہوار وظیفہ دیا جانا منظور کرتی ہے۔“

یہ فیصلہ میری توقع کے خلاف نہ تھا، چونکہ مولانا اسعد صاحب مسلسل اس کوشش میں تھے کہ کوئی بھی بہانہ ہاتھ آئے تو وہ اپنی آتشِ انتقام کو جو ملّی جمعیۃ علماء کے قیام اور اس کی صدارت قبول کر لینے کے بعد ان کے سینے میں بھڑکی ہوئی تھی، فرو کریں۔ چنانچہ وہ اس دفعہ بڑی کد و کاوش کر کے اور کچھ ممبرانِ شوریٰ سے کنویسنگ کر کے اور غلط اطلاعات پہنچا کر ان کی ذہن سازی کر کے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ مولانا موصوف اس سے قبل بھی مولانا ریاست علی صاحب پر مختلف باتوں کی رپورٹ پیش کرنے پر زور دیتے رہتے تھے۔ لیکن چونکہ کوئی بنیاد نہ تھی اس لیے وہ ایسا نہ کر سکے۔ اس دفعہ بھی میری سبکدوشی کا فیصلہ تعلیمات کی نہیں؛ بلکہ مولانا ریاست صاحب کی تحریر پر ہوا؛ کیونکہ تعلیمات کی رپورٹ وہ کہلاتی ہے جو مجلسِ تعلیمی میں پیش ہو کر منظور ہوتی ہے۔ مجلسِ تعلیمی کے کئی ممبران نے میرے خلاف ایسی رپورٹ پیش کرنے سے اختلاف کیا تھا؛ کیونکہ ان کے نزدیک معاملہ دب گیا تھا اور

ماحول پُر امن تھا، اس لیے ایک نیا مسئلہ اُٹھانے کو وہ دارالعلوم کے امن کے لیے خطرہ محسوس کرتے تھے۔

مجلسِ شوریٰ کا یہ فیصلہ چونکہ میری ذات سے متعلق تھا، اس لیے میں نے اسے غیر منصفانہ اور محض انتقامی کارروائی سمجھنے کے باوجود گوارا کیا اور خاموشی اختیار کرلی۔ میں نے دیوبند میں کسی کو یا باہر اس کی اطلاع بھی نہیں کی بجز اپنے بھائیوں اور بعض مخصوص احباب کے۔ کچھ وقت گزر گیا اور شدہ شدہ یہ خبر پھیلنے لگی۔ میری اس خواہش اور کوشش کے باوجود کہ یہ معاملہ آگے نہ بڑھے، اس پر ردِ عمل کا سلسلہ شروع ہوگیا، اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ دارالعلوم میں اللہ کے فضل سے اٹھائیس سال تک میں نے جو کچھ کیا وہ اظہر من الشمس ہے۔ ہر جگہ میرے شاگرد اور محبین موجود ہیں؛ اس لیے یہ ناممکن تھا کہ میرے متعلق دارالعلوم کے ایسے جابرانہ فیصلے پر کوئی ردِ عمل نہ ہو۔ چنانچہ دہلی میں میرے ہمدردوں نے ازخود جمع ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ ایک وفد دیوبند جا کر مہتمم صاحب سے ملے۔ ۲۴؍مئی ۱۹۹۰ء کو بارہ مؤقر افراد پر مشتمل ایک وفد جس میں اکثر مدارس کے ذمہ دار تھے، دیوبند آیا اور اس نے مہتمم صاحب سے زبانی گفتگو کے ذریعہ اس فیصلہ پر اپنے غم اور دکھ کا اظہار کیا۔ مہتمم صاحب نے فرمایا کہ مجھے بھی اس فیصلے کا رنج ہے، مگر شوریٰ نے ایسا کر دیا ہے۔ انھوں نے وفد سے وعدہ کیا کہ وہ اس کے جذبات اور اس کا پیش کردہ میمورنڈم مجلسِ شوریٰ کے آئندہ اجلاس میں پیش کریں گے۔

اس کے بعد ۴؍جون کو دہلی اور قرب و جوار کے تقریباً ساڑھے تین سو فضلائے دارالعلوم کا ایک خصوصی اجتماع جیون بخش ہال فتحپوری، دہلی میں منعقد ہوا۔ اس میں جیسا کہ مجھے اطلاعات ملیں، ان فضلاء کے علاوہ کوئی غیر شخص شریک نہیں تھا۔ اس اجلاس نے ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کی ایک تنظیم کے قیام کو ضروری سمجھا تاکہ اس کے ذریعہ مادرِ علمی کو آئندہ لاحق ہونے والے خطرات اور جابرانہ، منتقمانہ اور شخصی روایات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جائے اور ابنائے قدیم میں اجتماعیت پیدا کر کے انھیں اپنے ماحول میں مؤثر بنایا جائے۔

مثل مشہور ہے ''چاہ کن راہ چاہ درپیش''۔ دس سال کے بعد تاریخ نے خود کو دُہرانا شروع کر دیا۔ مولانا اسعد صاحب نے اجلاسِ صد سالہ کے موقع پر دارالعلوم کے پُر امن ماحول میں ہلچل پیدا کرنے، اجلاس صد سالہ کی کامیابی کے اثرات کو فنا کرنے اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دل و دماغ کو متأثر و مجروح کرنے کے لیے عالمی مؤتمر کے نام سے تنظیم قائم کی تھی۔ جس کے بڑے بڑے اعراض و مقاصد بیان کیے گئے تھے؛ لیکن اصل مقصد صرف دارالعلوم پر قبضہ کرنا ثابت ہوا؛ چنانچہ قبضہ کے بعد وہ ختم کر دی گئی۔ اب قدرت نے مولانا اسعد صاحب کی مَن مانی کارروائیوں پر قدغن لگانے اور مادرِ علمی کو شخصی اور خاندانی تسلّط سے بچانے کے لیے فضلائے دارالعلوم کے دلوں میں اس تنظیم کے قیام کا جذبہ پیدا کر دیا۔ تنظیم کا صدر حضرت مولانا افضال الحق قاسمی کو منتخب کیا گیا جو مختلف مدارس میں درسِ حدیث کی خدمات انجام دیتے رہے ہیں، اور اس کے جنرل

سکریٹری مولانا ڈاکٹر قاضی زین الساجدین قاسمی، ریڈر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بنائے گئے۔ اس تنظیم نے ہندوستان کے مختلف مقامات پر اس کو مستحکم اور منظم کرنے کا کام بھی شروع کر دیا۔ تنظیم کا پانچ افراد پر مشتمل ایک وفد ۵ / جون ۱۹۹۰ء کو دیوبند آیا۔ مہتمم صاحب سے ملاقات نہ ہوسکی، اس لیے نائب مہتمم مولانا نصیر خاں صاحب ہی سے ملاقات کی۔ اور دو چار تجاویز پیش کیں، جن میں ایک کا تعلق تنظیم ابنائے قدیم کے قیام سے تھا اور ایک کا تعلق میری برطرفی اور اس پر نظر ثانی سے تھا۔ اور اس کے ساتھ مہتمم صاحب کے نام وفد کا ایک خط تھا۔

اس کے چند روز بعد مولانا اسعد صاحب جیسے ہی دیوبند پہنچے اور انھیں ان دو وفدوں کی آمد کی اطلاع ملی تو بالکل حواس باختہ ہو گئے اور انھوں نے فوراً ہی حسبِ عادت اس کے توڑ کی تدابیر شروع کر دیں۔ میرے ہمدردوں نے پُر امن اور مہذب طور پر دیوبند سے دُور دہلی میں بیٹھ کر مشورہ کیا اور قاعدے اور تہذیب کے ساتھ میمورنڈم اور تجاویز پیش کیں۔ جس کی کوئی اطلاع طلباء تک نہیں پہنچائی گئی تاکہ وہ کسی اُلجھن میں مبتلا نہ ہوں۔ مولانا اسعد صاحب کی توڑ والی تدبیر کے نتیجہ میں دارالعلوم اور اس کے باہر ایک ہلچل پیدا ہوگئی۔ نمائندہ اجتماع کے نام سے ایک دعوت نامہ تیار کیا گیا جس پر مہتمم صاحب، نائب مہتمم اور صدر مدرس کے دستخطوں کے علاوہ ایک رکن شوریٰ مولانا اسعد صاحب کے بھی دستخط تھے۔ یہ دعوت نامے ڈاک سے بھیجنے کے بجائے مدرسین کے ذریعہ دستی بھیجے گئے۔ دس روز تک تین کرائے کی گاڑیاں دہلی سے لے کر، مظفر نگر، سہارنپور، مراد آباد اور بریلی تک دوڑتی رہیں۔ چونکہ مولانا اسعد صاحب کو اپنی پوزیشن کا خیال تھا اور یہ یقین تھا کہ دعوت نامے پر لوگ زیادہ تعداد میں نہ آسکیں گے، اس لیے مخصوص مقامات پر اپنے خاص افراد کو جوان کے ساتھ محض اپنے مصالح و مفادات کی بنا پر وابستہ ہیں، اس بات کے لیے تیار کیا گیا کہ وہ اپنے یہاں سے زیادہ سے زیادہ افراد بھیجیں۔ چنانچہ اس اجتماع میں جو لوگ جمع ہوئے ان میں فضلائے دارالعلوم کم تھے اور اکثریت طلبۂ مدارس اور کچھ غیر متعلق لوگوں کی تھی۔ مثلاً ہاپوڑ کے مدرسہ سے ۱۸ آدمی آئے تھے جن میں دس طالبِ علم اور آٹھ مدرس تھے۔ اسی طرح شاہی مدرسہ مراد آباد کے اساتذہ اور دورہ کے طلباء لائے گئے تھے۔ دوسرے مدارس سے آنے والوں کا بھی یہی حال تھا؛ مگر انھی کو نمائندوں کا نام دے دیا گیا۔ اجلاس سے پہلے اور بعد میں بہت سے افراد سے میری ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں اکثریت مولانا اسعد صاحب کے مخالفین کی تھی؛ لیکن وہ اپنے مدارس کی ملازمت یا طالبِ علمانہ نسبت یا بعض دوسری وجوہات کی بنا پر خاموش بیٹھے اور کارروائی سنتے رہنے پر مجبور تھے۔

اس اجلاس کی تیاری کے سلسلہ میں متعدد مدرسین کے اسباق کا نقصان ہوا۔ عام طلباء کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ مسئلہ کیا ہے اور یہ تیاریاں کس اجلاس کے لیے ہو رہی ہیں۔ میری سبکدوشی کی وجہ جس تقریر اور جس پیش آمدہ صورت کو بتایا گیا ہے اُس سے دارالعلوم میں ایک دن کی تعلیم کا بھی نقصان نہیں ہوا تھا؛ لیکن اس اجتماع

کے نتیجہ میں طلباء کی تعلیم کا غیر معمولی نقصان ہوا، اور میں نے جس مسئلہ کو چھپانے کی کوشش کی تھی اسے عام طلباء کے ذہنوں تک پہنچا دیا گیا۔

۱۸ر جون کو یہ نام نہاد نمائندہ اجتماع محمود ہال دیوبند میں منعقد کیا گیا۔ مہتمم صاحب کے بجائے مولانا اسعد صاحب اس اجلاس کے روح رواں رہے۔ ان کو کوالالمپور کی ایک کانفرنس میں شریک ہو کر حج کے لیے جانا تھا؛ مگر وہ اپنا پروگرام تبدیل کر کے محض اس اجتماع میں شرکت کے لیے دیوبند پہنچے تھے۔ سوال یہ ہے کہ اگر میرے خلاف کارروائی مجلسِ شوریٰ نے کی تھی اور مولانا اسعد صاحب کے جذبہ انتقام کو اس میں کوئی دخل نہیں تھا اور نہ ان کی کوشش تھی (جیسا کہ انھوں نے بعض لوگوں سے کہا کہ خود انھیں بھی اس فیصلہ پر ملال ہوا) تو وہ اس اجتماع کے روح رواں کیوں بنے رہے؟ دعوت نامے پر ان کے دستخط کا کیا مطلب ہے؟ یا تو شوریٰ کے تمام ارکان کے دستخط ہوتے یا کسی بھی رکن کا نام نہ ہوتا۔ علاوہ ازیں اگر یہ دار العلوم کا بلایا ہوا اجتماع تھا تو اس کا انعقاد محمود حال میں چہ معنیٰ دارد؟ اسے تو دار العلوم ہی کے کسی ہال میں منعقد ہونا چاہئے تھا؛ لیکن مولانا اسعد صاحب ہمیشہ اسی پالیسی پر عمل کرتے ہیں اور ہر اجلاس کو شتر مرغ بنا دیتے ہیں۔ اس لیے جو کچھ ہوا وہ ان کی وجہ سے ہوا، اس میں مہتمم صاحب وغیرہ کا نام برائے نام شامل کیا گیا۔

مزید یہ کہ دعوت نامے کے بموجب یہ اجتماع دار العلوم کی ترقیات کی تفصیلات پیش کرنے کے لیے بلایا گیا تھا، اس لیے قاعدے کے مطابق انتظامیہ کے ارکان کو دار العلوم کی ترقیات پر بولنا چاہئے تھا؛ لیکن اس کے بجائے مولانا اسعد صاحب نے رکن شوریٰ ہوتے ہوئے اپنے دیگر تمام مناصب کو بالائے طاق رکھ کر اور انتہائی نچلی سطح پر اُتر کر جو غیر ذمہ دارانہ، بے بنیاد، نامعقول، چھچھوری اور گھناؤنی باتیں کہیں، وہ رکن شوریٰ تو کیا، دار العلوم کا ادنیٰ استاذ بھی اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ الزام تو مشتعل اور بے قابو ہونے کا مجھ پر لگایا جا رہا تھا؛ لیکن بزعم خود حضرت امیر الہند عین حیاتی صدر جمعیۃ علمائے ہند، پیر و مرشد اور ممبر راجیہ سبھا و رکن مجلس شوریٰ دار العلوم اس قدر بے قابو اور مشتعل ہو رہے تھے کہ نہ الفاظ پر قابو تھا، نہ مضمون میں کوئی تسلسل، نہ کوئی دعویٰ نہ کوئی دلیل۔ ایسی ایسی اُوٹ پٹانگ اور بے تکی باتیں کہ ان کا نہ کوئی سر ہے نہ پیر۔ جھوٹ بھی اگر ایسا ہو جس کی کوئی تاویل ممکن ہو تو ایک بات ہے؛ لیکن ایسا جھوٹ جس کی تاویل تو کجا کسی ذی عقل کی عقل اس کو قبول کرنے ہی کو تیار نہ ہو، اور ایسی مغالطہ آمیز اور پُر فریب باتیں جن سے سیاق وسباق کو حذف کر کے دیدہ و دانستہ سامعین کو گمراہ کیا جا رہا تھا اگر ایک ایسے شخص کی جانب سے ظہور میں آتی ہیں جو مذکورہ مناصب پر بالجبر قابض ہے تو یقیناً یہ علماء کے لیے ماتم اور دار العلوم کے لیے شرم کا مقام ہے۔ پھر دار العلوم کی ترقیات سامعین نے سُنی ہوں یا نہ سنی ہوں؛ لیکن اس بات کو سب نے دیکھ لیا کہ دار العلوم نے مولانا اسعد ایم پی کے زیر قیادت دروغ گوئی، الزام تراشی، افترا پردازی، غیبت اور

مغالطہ بازی، گندہ ذہنی اور بداخلاقی میں کس قدر ترقی کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ علماء یا ہمدردوں کے اس اجتماع میں ایک عالم دین، ''پیرومرشد'' اور رکن مجلس شوریٰ نے میرے خلاف جو الزام تراشیاں کی ہیں، اگر اس کو مجلس شوریٰ کے ممبران اپنے کانوں سے سن لیں تو شاید وہ اسے مجلس کی زبردست توہین سمجھیں گے؛ کیونکہ دارالعلوم کی شوریٰ کے ارکان مولانا اسعد کے علاوہ بفضلہٖ تعالیٰ ہمیشہ بردبار، متحمل مزاج، معاملہ فہم اور عالی ظرف رہے ہیں۔ مولانا ہی ایک ایسے بے جوڑ ممبر ہیں جنھوں نے صرف اپنی ممبری کے شوق میں دارالعلوم کی تمام روایات کو پس پشت ڈال کر اس کے پورے نظام کو تہ و بالا کر ڈالا اور محض اقتدار کے حصول کے لیے علماء کی کسی رسوائی کی پروا نہیں کی۔ اگر مولانا اسعد صاحب اپنی ممبری کے لیے اس قدر خواہش منداور کوشاں نہ ہوتے تو دارالعلوم کی رسواکن لڑائی نہ لڑی جاتی اور نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔

اس اجتماع میں دہلی میں قائم ہونے والی تنظیم ابنائے قدیم پر بڑا کیچڑ اُچھالا گیا یہاں تک کہا گیا کہ دہلی کے اجتماع میں شریک ہونے والوں کی تعداد دس بیس افراد سے زیادہ نہیں تھی اور بقول مولانا ریاست علی وہ بھی آبرو باختہ قسم کے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ اگر صرف پانچ ہی تھے تو سوال یہ ہے کہ آپ نے اس کا اِس قدر اثر کیوں لیا اور آپ پر اِس قدر بوکھلاہٹ کیوں طاری ہوگئی کہ آپ نے زمین و آسمان ایک کر دیے اور اس کے توڑ کے لیے بقول آپ کے دو ہزار، بقول مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کے پندرہ سو، اور بقول شخصے ۸۰۰ آدمیوں کو بلانے کی کیوں ضرورت پیش آئی۔ اگر خدانخواستہ دہلی میں ایک ہزار آدمی جمع ہوجاتے تو شاید آپ کو پورا ہندوستان جمع کرنا پڑتا اور ایک سال کے لیے دارالعلوم میں چھٹی ہوجاتی۔

اس اجتماع میں مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں دارالعلوم کی گزشتہ آٹھ سالہ خدمات وترقیات کو شمار کرایا؛ لیکن دیانت و امانت کے تقاضے کے باوجود کسی جگہ پر بھی یہ اخلاقی ذمہ داری محسوس نہیں کی کہ احقر نے جو اہم ترین کام انجام دیئے تھے اور جن کا سب لوگوں نے اعتراف بھی کیا تھا، ان کا حوالہ دیدیتے۔ اس کے برخلاف ایک جگہ مجھے دیے جانے والے مناصب کا ایسے انداز میں ذکر کیا گیا گویا مجھے جو ذمہ داریاں سونپی گئیں نہ میں اُن کا اہل تھا اور نہ ہی دارالعلوم کی ضرورت اور مفاد کے پیش نظر مجھے منصب پر لایا گیا تھا، بلکہ وہ میرے لیے ایک انعام تھا۔ اگر یہ انعام ہی تھا تو کس کارنامے کا تھا۔ آخر یہ کہنے میں کیوں خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ مجھے ہر منصب اور ہر ذمہ داری ایسے مخصوص حالات میں دی گئی جب مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب جیسے افراد خود کو بے بس پانے لگے تھے۔

نیز اس خطبہ استقبالیہ میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ میں ان مناصب کو اپنے امراض اور اپنے مزاج کی بنا پر نباہ نہ سکا۔ یہ بالکل غلط اور سراسر مغالطہ آمیزی ہے۔ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب اور دوسرے حضرات کا دل یقیناً

گواہی دے رہا ہوگا کہ یہ بات اتنی خلافِ واقعہ ہے، جیسے دن کو کوئی رات کہنے لگے۔ اس بیمار نے دارالعلوم میں سب کی آنکھوں کے سامنے صحت مندوں اور تندرستوں سے کہیں زیادہ کام کیا ہے۔ جہاں تک مزاج کی بات ہے تو الحمدللہ میری انتظامی سخت گیری کے باوجود تمام طلباء اور مدرسین وملازمین میرے اُس دَور کو یاد کرتے ہیں۔ شک ہو تو تحقیق کر لی جائے۔ میں نے اپنے منصب سے سبکدوشی صرف اس لیے حاصل کی تھی کہ مولانا اسعد صاحب کی پریشان کن سازشیں میرے خلاف سخت ہو چکی تھیں، وہ مجھے ایک پل بھی کسی منصب پر دیکھنا نہیں چاہتے تھے، اور یہ ان کا مشہور مزاج ہے جسے سب لوگ جانتے ہیں کہ وہ کسی بھی شخص کو اپنے برابر کھڑا دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ جہاں تک میری انتظامی کارکردگی اور اصلاحات کا تعلق ہے تو ان کا یہ موقع نہیں۔ اپنی کتاب میں ان شاءاللہ ذکر کروں گا۔ اور پورا ملک ان سے واقف ہے۔ معاون مہتمم کے منصب پر تقرر کے بارے میں ماہنامہ دارالعلوم میں (۱۴۰۵ھ کے کسی شمارے میں) اس کے ایڈیٹر مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی کا اداریہ پڑھا جائے۔ جنھوں نے لکھا ہے کہ اس منصب کے لیے اس سے بہتر انتخاب نہیں ہو سکتا تھا کیمپ کے زمانہ کی کامیاب انتظامی خدمات اس کی شاہد ہیں۔

اس اجلاس میں مہتمم صاحب نے فرمایا کہ ''اساتذہ نے ایک تحریر بھی پیش کی ہے۔'' مجھے مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب سے کم از کم یہ توقع اب بھی نہیں تھی کہ وہ مولانا اسعد صاحب سے اس قدر مرعوب ہو جائیں گے کہ اپنے بیان میں بھی محتاط نہ رہیں گے۔ یہ بالکل مغالطہ ہے کہ اساتذہ نے از خود کوئی تحریر پیش کی۔ یہ ایک جبری تحریر تھی جو اساتذہ سے دستخط کرا کر پیش کرائی گئی۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اجتماع سے چند روز پیشتر دفتر اہتمام میں تمام اساتذہ کو جمع کیا گیا۔ مولانا ریاست علی صاحب نے اپنے قلم سے لکھی ہوئی ایک تحریر پڑھ کر سنائی، جس میں مندرجہ ذیل چار نکات تھے:

(۱) دارالعلوم کے امتحان داخلہ وغیرہ میں کوئی بے ضابطگی نہیں ہوئی۔

(۲) دارالعلوم کا ماحول پُرسکون ہے اور طلباء کی تعلیم و ترقی جاری ہے۔

(۳) مولانا وحید الزماں کے بارے میں مجلسِ شوریٰ نے سبکدوشی کا جو فیصلہ کیا ہے، وہ حق بجانب ہے۔

(۴) دہلی میں ابنائے قدیم کی جو نام نہاد تنظیم قائم ہوئی ہے اس کی کوئی حیثیت نہیں اور ہم اس سے لاتعلق ہیں (الفاظ میں کچھ معمولی فرق ہو سکتا ہے)

یہ تحریر سنا کر مولانا ریاست علی صاحب نے اساتذہ سے دستخط کرنے کی درخواست کی۔ اساتذہ نے اس تحریر پر مِن وعَن دستخط کرنے سے انکار کیا۔ خاص طور سے میری سبکدوشی کے فیصلہ اور تنظیم ابنائے قدیم سے متعلق دو نکات کے بارے میں کہا کہ ان کا تعلق ہم مدرسین سے نہیں ہے۔ مولانا ریاست علی صاحب چونکہ آج کل میری مخالفت اور

مولانا اسعد صاحب کی وفاداری میں کچھ زیادہ پیش پیش رہنے میں مصلحت سمجھتے ہیں، اس لیے انھوں نے ایک دباؤ کے انداز میں بڑے اساتذہ سے فرداً فرداً رائے لی۔ خدا کا شکر ہے کہ اگرچہ ایک رکن شوریٰ اور مہتمم دارالعلوم نے امانت و دیانت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے؛ لیکن اساتذہ کے ضمیر ابھی بالکل مُردہ نہیں ہوئے ہیں۔ انھوں نے اس تجویز سے اختلاف کیا اور بعض اساتذہ نے جو مجلسِ تعلیمی کے رکن بھی ہیں، مولانا ریاست صاحب سے یہاں تک کہہ دیا کہ ”مجلس تعلیمی میں مولانا وحید الزماں کے بارے میں یہ بات سامنے آگئی تھی کہ ان کے متعلق کوئی رپورٹ پیش نہیں کی جائے گی، بس سرسری ذکر کر دیا جائے گا؛ کیونکہ ایک دبے ہوئے معاملہ کو ہوا دینا اور اُبھارنا مناسب نہیں ہے۔“

اس غیر متوقع اور ناگہانی صورتِ حال نے مولانا ریاست علی صاحب کو تحریر بدلنے پر مجبور کر دیا اور دوسری تحریر مرتب کی گئی جس میں میرا نام حذف کر کے اجمالاً یہ کہا گیا کہ ہم مجلس شوریٰ کے فیصلوں کی تائید کرتے ہیں۔ اور پھر اس پر اساتذہ سے دستخط لیے گئے۔ دراصل چند کے علاوہ تمام ہی مدرسین اور ملازمین میں مولانا اسعد صاحب کے جابرانہ اور ڈکٹیٹرانہ مزاج کی بنا پر ایک غیر یقینی فضا پائی جاتی ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ مولانا موصوف حسبِ عادت اب کسی بھی شخص کو اپنی چھری سے ذبح کر سکتے ہیں۔ اساتذہ نے دوسری مبہم تحریر پر جو دستخط کیے وہ بھی انقباض اور بے دلی کے ساتھ کیے ہیں۔ اساتذہ کی پیش کردہ تحریر تو وہ ہوتی جو ان کے دل میں پیدا ہونے والے داعیہ کے تحت لکھی جاتی، کہ وہ خود جمع ہوتے اور اپنے دستخطوں کے ساتھ کوئی ایسی تحریر مرتب کر کے ناظمِ تعلیمات یا ”اہتمام“ کو پیش کرتے۔ کسی افسر کا اپنے ماتحتوں کے سامنے مضمون لکھ کر پیش کرنا اور دستخط کرانا جبر و اکراہ کی ایک قسم نہیں تو اور کیا ہے۔ اور اس تحریر کی نامعقولیت کی یہی دلیل ہے۔

۱۸ / جون ۱۹۹۰ء کے اس اجتماع میں مولانا ریاست صاحب نے بھی ایک تقریر کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بچ بچ کر بول رہے تھے۔ میرے خلاف چند باتیں انھوں نے کہیں۔ سننے والے سمجھ سکتے ہیں کہ ان میں کوئی وزن نہیں۔ مثلاً انھوں نے ایک واقعہ ذکر کیا کہ میں (وحید الزماں) نے چند اساتذہ کو ڈانٹ دیا۔ اوّل تو یہ غلط ہے، لیکن اگر ذرا سخت لہجہ میں کوئی ذمہ دار، نظام کی رو سے اپنے ماتحت رفقائے کار کو فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی پر متنبہ کر دے تو یہ کوئی جرم نہیں ہے؛ بلکہ احساس ذمہ داری کا ثبوت اور انتظامی جرأت ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ جن اساتذہ کرام کے بارے میں مولانا موصوف یہ پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں، ان سے میرے خوشگوار تعلقات ہیں۔ ان میں ایک میرے شاگرد اور ایک میرے رفیق مخلص ہیں اور دونوں ہی کو مجھ سے اپنی اپنی جگہ بے انتہا تعلق اور ہمدردی ہے۔ ایسی باتوں سے مولانا ریاست علی صاحب دراصل اپنے اس حاسدانہ جذبہ کا مظاہرہ کرتے ہیں جس میں وہ احقر کی انتظامی صلاحیت، قوتِ ارادی اور قوتِ تنفیذ (جو اس ناچیز کو خدا کے فضل سے اور بزرگوں کی

دعاؤں کے طفیل میں حاصل ہیں) کو دیکھ کر مبتلا رہے ہیں؛ کیونکہ ان میں یہ صلاحیت نہیں ہے۔ وہ اپنے ماتحتوں کا پیٹھ پیچھے رونا روتے ہیں اور شکوہ کرتے ہیں۔ جیسا کہ وہ میرے متعلق کر رہے ہیں۔ حالانکہ اپنے ماتحتوں کا شکوہ کرنا اور بروقت ان کی کوتاہی پر نوٹس نہ لینا یہ منتظم کی کمزوری اور نااہلی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے دونوں عہدوں پر رہتے ہوئے نہ اُس وقت اور نہ بعد میں کسی ماتحت کی نہ مذمت کی اور نہ شکایت کی۔ البتہ کام میں کوتاہی یا غفلت پر بروقت تنبیہ کرنے اور ضابطہ و رابطہ کی کارروائی کرنے میں ادنیٰ جھجک محسوس نہیں کی۔

مولانا ریاست صاحب نے ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ میں نے کم نمبرات والے طلباء کو ناجائز طور پر داخلہ دیا۔ یہ بھی لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے بات کو سیاق و سباق سے کاٹ کر سامعین کو مغالطہ دینا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ جس زمانے کی یہ بات ہے اس وقت معاون مہتمم اور ناظم مجلس تعلیمی دونوں عہدوں کی ذمہ داریاں میرے سپرد تھیں اور مولانا ریاست صاحب ان دنوں نائب ناظم تھے۔ انقلاب دارالعلوم کے فوراً بعد کا زمانہ تھا اور تالیفِ قلوب کا دَور تھا۔ ہمدردان دارالعلوم کی طرف سے آنے والی سفارشات بے انتہا تھیں اور ان کو ماننا بھی ناگزیر تھا۔ مزید برآں دارالعلوم کی ایک پالیسی یہ تھی کہ کم سے کم طلباء کو متوازی دارالعلوم وقف جامع مسجد میں داخلہ کا موقع دیا جائے۔ اس لیے مجلس تعلیمی نے جیسا کہ اس کے رجسٹر میں لکھا ہوا ہے، داخلوں کی مقررہ تعداد پوری ہو جانے کے بعد سو طالبِ علموں کے رعایتی داخلہ کا ایک کوٹہ مقرر کیا تھا۔ اسی زمانہ میں مولانا رشید الدین صاحب (داماد حضرت مدنیؒ) کے صاحبزادے مولوی اخلد سلّمہٗ داخلہ کے لیے آئے۔ ان کے داخلہ کے لیے مولانا رشید الدین صاحب نے سفارشی خط لکھا اور حضرت مدنیؒ کے دوسرے داماد مولانا قاری محمد عثمان صاحب (حال مدرس دارالعلوم) نے بھی اپنی سفارش تحریر کی اور وہی اخلد میاں کو لے کر میرے پاس آئے۔ میں نے اس زمانے میں یہ طے کیا تھا کہ کسی ایک طالبِ علم کو سفارش کی بنیاد پر داخلہ نہیں دیا جائے گا؛ بلکہ ایک ضابطہ بنا کر اس کے تحت استحقاق رکھنے والے تمام طلباء کو داخلہ دیا جائے گا۔ چنانچہ اسی ضابطے کے تحت تیس ناکام طلباء کی ایک فہرست میں نے تیار کی اور ان کا میں نے ہی امتحان لیا۔ ان طلباء میں سے ایک بھی نہ کوئی میرا عزیز تھا اور نہ میرے کسی دوست یا خویش کا لڑکا تھا، بلکہ یہ ایسے ہمدردان و فضلائے دارالعلوم سے تعلق رکھنے والے تھے جنھوں نے زمانۂ کیمپ میں ہر طرح مدد کی تھی، اس لیے ہم ان سے طوطا چشمی نہیں کر سکتے تھے۔ چونکہ عام طلباء، اہلِ دیوبند اور باہر کے ہمدردوں سے براہِ راست میرا واسطہ رہتا تھا، اس لیے اس مصیبت سے مجھے ہی سابقہ پڑتا تھا۔ مولانا ریاست صاحب ان مشکلات سے دوچار نہیں ہوتے تھے۔ ان کو میرے ساتھ ایک ضد تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس کے باوجود کہ وہ میرے نائب تھے، اور میں ناظم ہونے کے ساتھ ساتھ معاون مہتمم بھی تھا اور اسی زمانے میں قائم مقام مہتمم بھی ہو گیا تھا، مرسلہ فہرست کو خلافِ ضابطہ مسترد کر دیا۔ میں بھوپال میں منعقد ہونے والی

جمعیۃ علمائے ہند کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا۔ واپسی پر معلوم ہوا کہ میری مرسلہ فہرست پر کوئی عمل درآمد نہیں ہوا ہے اور مولانا ریاست صاحب ناراض ہو کر گھر بیٹھ گئے ہیں۔ اس پر حضرت مولانا معراج الحق صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ آپ بڑے ہیں اور آپ کا منصب بھی بڑا ہے۔ اس لیے آپ جا کر ان کو دارالعلوم لے آئیے۔ میں فوراً ہی ان کے مکان پر گیا اور ان کو منا کر اپنے ساتھ لے آیا اور مہتمم صاحب کے سمجھانے پر طلباء کا داخلہ ہوا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ایک طرف مولانا ریاست صاحب ضابطے اور اُصول کی پابندی میں اتنی سختی کا مظاہرہ فرمارہے تھے کہ میری تحریر کو بھی مسترد کر دیا؛ لیکن خود ہی دو روز پیشتر یا بعد بحیثیت قائم مقام مہتمم (وہ ایک دن کے لیے قائم مقام مہتمم بنائے گئے تھے) انھوں نے سفارش کی بنیاد پر دو ایسے طالبِ علموں کا داخلہ ترقی کے ساتھ منظور کر لیا تھا جو ناکام تھے۔ ایک کے لیے مولانا اسعد صاحب نے سفارش کی تھی اور دوسرے کے لیے ان کے دو دوستوں نے۔ وہ بحیثیت قائم مقام مہتمم خود تو اس کے مجاز ہو گئے؛ لیکن میں نے اگر مجلس تعلیمی کے دیئے ہوئے اختیار کے تحت ناظم مجلس تعلیمی اور معاون مہتمم ہونے کی حیثیت سے کسی شخصی شفارش پر نہیں؛ بلکہ مفادِ دارالعلوم کے لیے بنائے گئے ایک ضابطے کے تحت ہمدردانِ دارالعلوم کی سفارش پر ان کے متعلقین کو ترقی دے دی تو بہت بڑا جرم ہو گیا (مولانا ریاست صاحب نے جن دو طالب علموں کو خلافِ ضابطہ ترقی دی، ان کے فارم داشتہ بکار آید کے طور پر میرے پاس محفوظ ہیں، جو صاحب دیکھنا چاہیں دیکھ سکتے ہیں) نام نہاد نمائندہ اجتماع میں اس ڈھٹائی کے ساتھ اعلان کرنے کے باوجود کہ ہمارے یہاں کوئی رعایت بے جا اور بے ضابطگی نہیں ہوتی۔ اس اجتماع کے فوراً بعد ماہ ذی الحجہ (۱۴۱۰ھ) میں کئی ایسے طالبِ علموں کو جو امتحان داخلہ میں ابتداءً ناکام ہو گئے تھے سفارش پر داخلہ دیا گیا ہے۔

مولانا اسعد صاحب نے مذکورہ بالا اجتماع میں جو کچھ فرمایا اس میں اظہارِ غیظ وغضب کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ انھوں نے مجھ پر متعدد الزامات لگائے ہیں؛ مگر وہ میری عدمِ موجودگی میں جو چاہیں کہہ سکتے ہیں۔ بات تو جب تھی کہ وہ مجھے بھی بلا لیتے یا آئندہ کسی موقع پر کسی واقعی نمائندہ اجتماع میں ہم دونوں بیٹھ جائیں اور وہ اپنے الزامات کو دُہرائیں۔ ان شاء اللہ بروقت ان کے ہر الزام کا ایسا مدلل اور شافی جواب دوں گا کہ وہ خود اپنے آپ کو ضمیر کی آواز پر مجرم سمجھیں گے۔ اتفاق سے وہ مجلسِ شوریٰ کے رکن ہیں، مجلسِ شوریٰ کے کسی ممبر کو کسی ملازم پر اِدھر اُدھر کے الزام لگانے کا حق نہیں ہے۔ اگر واقعی کوئی ملازم مجرم وخطا کار ہے اور کسی رکن شوریٰ کے علم میں اس کا جرم وقصور آتا ہے تو اس کا قانونی طریقہ یہ ہے کہ وہ مہتمم کو توجہ دلائے اور مہتمم پہلے اس کے خلاف ضابطہ کی کارروائی کرے، جواب طلب کرے، اور پھر ضرورت ہو تو مجلسِ شوریٰ میں اس کی رپورٹ پیش کرے۔ مجلسِ شوریٰ کا بھی قانون وانصاف کی رُو سے یہ فریضہ ہے کہ وہ صرف پیش کردہ رپورٹ کو منظور نہ کرے؛ بلکہ معاملہ کی نوعیت کے پیشِ نظر اس کی قانونی

تحقیقات کرائے اور اس کے بعد کوئی فیصلہ صادر کرے۔ یہ تو اسلام کا ایک معروف طریقۂ عدالت ہے؛ مگر مولانا نے کوئی پروا نہیں کی۔

میرے بارے میں مولانا اسعد صاحب یا ان کے بعض ہمنوا جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں اس کا تعلق یا تو میری ذات اور میرے مزاج و اخلاق سے ہے یا میری منصبی ذمہ داریوں سے۔ جہاں تک کسی شخص کے مزاج و اخلاق کا تعلق ہے تو عام حالات میں وہ اس کا ایک ذاتی معاملہ ہے، اور اگر منصبی ذمہ داریوں پر اس کا کوئی بُرا اثر نہ پڑتا ہو تو اس پر کسی کو دارو گیر کا حق نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص بد مزاج، بد اخلاق اور مشتعل مزاج ہے تو اس سے حتی الامکان اجتناب کیا جائے اور اس کو اپنے سے قریب نہ کیا جائے۔ جہاں تک انتظامی خامیوں اور کوتاہیوں کا تعلق ہے تو ان کو چوراہوں پر اور جلسوں میں غیر ذمہ دارانہ طریقہ سے بیان نہیں کیا جاتا۔ قاعدے اور قانون کے مطابق جب ہر منصبدار کے اوپر ایک اعلیٰ منصبدار ہے تو اعلیٰ منصبدار کو ہمہ وقت اپنے ماتحت کی کوتاہیوں پر نگاہ رکھنی چاہیے اور بروقت کارروائی کرنی چاہیے۔ اگر کوئی ملازم انتظامی اُمور کی انجام دہی میں جرم، غفلت یا غلط کاری کا مرتکب ہوتا ہے اور اس کا ذمہ دارِ اعلیٰ نہ اس کو متنبہ کرتا ہے نہ اس سے باز پرس کرتا ہے تو وہ بجائے خود ایک نااہل منتظم اور غلط کار افسر ہے۔ کسی بھی منتظم کی شان کے خلاف ہے کہ وہ اپنے ماتحت سے بروقت دارو گیر کرنے کے بجائے عرصہ کے بعد اس کی کوتاہیوں اور غلط کاریوں کو عوام کے سامنے اس طرح پیش کرے۔ سخت افسوس کا مقام ہے کہ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب جو میرے ذمہ دار اعلیٰ تھے، اس اجلاس میں موجود تھے اور میرے اوپر لگائے جانے والے الزامات سن رہے تھے؛ لیکن انھوں نے کسی الزام کی کوئی تردید نہیں کی۔ ان سے میرا سوال ہے کہ اگر یہ الزامات درست ہیں اور واقعی میں نے اپنے تعلیمات کا ناظم اور معاون مہتمم ہونے کے دَور میں بہت سی غلطیاں یا بدانتظامیاں کی تھیں تو انھوں نے بروقت میرے خلاف کارروائی کیوں نہیں کی تھی؛ لیکن اگر یہ الزامات غلط لگائے جارہے تھے تو کیا ان کا فرض نہیں تھا کہ وہ ان کی تردید کرتے، خاموش نہ رہتے۔

مولانا اسعد صاحب کے الزامات کا جواب دینے سے پہلے میرا ایک سوال ہے اور وہ یہ کہ جب میں بقول مولانا اسعد صاحب بدمزاج، سریع الاشتعال، آگ کا کنڈ اور غلط کار تھا اور میں نے جس کام پر بھی ہاتھ لگایا اسے چوپٹ کرکے رکھ دیا، تو پھر اس بدترین کوہِ آتش فشاں کو مولانا موصوف جمعیۃ علماء اور دارالعلوم کی خدمت کے لیے کیوں اُٹھائے اُٹھائے پھرے۔ ایسے شخص کو جمعیۃ علماء کے قریب بھی نہیں آنے دینا چاہیے تھا چہ جائے کہ اس کو ورکنگ کمیٹی کا ممبر بنایا جائے۔ ایسے بداخلاق و بدمزاج انسان کو عرب ممالک جانے والے جمعیۃ علماء کے وفد کا ادنیٰ رکن بھی نہیں بنانا چاہیے تھا چہ جائیکہ اسے سربراہ وفد بنایا جائے۔ ایسے بدانتظام شخص کو عربی اخبار کی ادارت کے لیے مجبور کرنا اور چودہ سال تک اس ذمہ داری پر قائم رہنے کے لیے اصرار کرنا۔ پھر اسی آگ کے کنڈ کو مرکز دعوت

اسلام کا ڈائریکٹر بنا دینا کہاں کی عقلمندی تھی۔ اس ''آگ'' نے مرکزِ دعوتِ اسلام کو جلانے کے بجائے اس سے ستائیس کتابوں کے چراغ روشن کیے ہیں؛ لیکن مولانا اسعد صاحب کی سرد مہری نے ان روشن چراغوں کو گل کر دیا۔ یہ ''بدانتظام اور بدمزاج'' شخص مولانا اسعد صاحب کی ہر علمی اور عربی ضرورت کے وقت ان کے کام آتا رہا۔ جمعیۃ علمائے ہند کے تعارف کے کتابچے اور کتابیں بھی لکھتا رہا۔ عرب ممالک کی کانفرنسوں میں پڑھنے کے لیے مقالے لکھ لکھ کر مولانا موصوف کو دیتا رہا اور اپنے ذہن اور باصلاحیت شاگردوں کی خدمات کو معمولی معاوضوں پر ان کے لیے پیش کرتا رہا، اُس وقت مولانا اسعد صاحب نے اِس ''آگ'' کی تپش کیوں نہیں محسوس کی۔ پھر دس سال پہلے دارالعلوم میں انقلاب برپا کرنے کے لیے مولانا کو اسی آگ کی ضرورت پیش آئی تھی۔ تو اسے ہر محاذ پر کیوں آگے کر دیا گیا تھا اور خود کو انتہائی بزدلی کے ساتھ چھپانے کی کوشش کیوں کرتے رہے تھے پھر اسی بدانتظام اور بدمزاج آدمی کے حوالہ کیمپ کا سارا انتظام کر دیا گیا، پھر کیمپ سے دارالعلوم میں منتقل ہونے اور اس پر قبضہ جما لینے کے بعد اس قبضہ کو باقی رکھنے اور دارالعلوم اور طلباء پر اس دَور میں کنٹرول کرنے کے لیے مولانا موصوف اس بدمزاج انسان یا آگ کے کنڈ سے بے نیاز نہ رہ سکے۔

میں نے مولانا کی سیاست اور بدنیتی کو بھانپ کر ۱۹۸۳ء میں دارالعلوم سے استعفیٰ دے دیا تھا اور دیوبند سے بہت دُور چلا گیا تھا۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ جب میں بداخلاق، مشتعل مزاج اور آگ کا کنڈ تھا تو مولانا میرے ازخود دفع ہو جانے کو غنیمت جانتے اور بھول کر بھی مجھے بلانے کا نام نہ لیتے؛ لیکن نہ معلوم میری کس خصوصیت یا اپنی کس ضرورت کی بنا پر مولانا اسعد صاحب اور مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے اصرار کے ساتھ مجھے دارالعلوم بلایا۔ ان کی تحریروں کے عکس ان شاء اللہ ایک مستقل کتاب میں شائع کیے جائیں گے۔

بقول مولانا اسعد صاحب میں نے تعلیمات میں، تعمیرات میں، مالیات میں اور ہر چیز میں خرابی اور گڑبڑ پیدا کی، انتظام کی مجھ میں کوئی صلاحیت نہیں تھی، بدمزاجی اور اشتعال انگیزی میری فطرت تھی، تو کیا میری یہ ساری خرابیاں کیمپ کے زمانے میں مولانا پر ظاہر نہیں ہوئی تھیں، جبکہ میں اس کا ناظمِ اعلیٰ بنایا گیا تھا۔ اگر ہوگئی تھیں تو کیمپ کے بعد مولانا نے اور مجلسِ شوریٰ نے تعلیمات جیسے اہم شعبہ کی نظامت کی ذمہ داری کیوں میرے سپرد کی۔ اور بقول مولانا اسعد صاحب جبکہ میں نے تعلیمات کا سارا کام خراب کر دیا تو سزا دینے اور برطرف کرنے کے بجائے مجھے ترقی دے کر معاون مہتمم کے منصب پر کیوں لا کر بٹھایا گیا۔ اور جبکہ میں نے معاون مہتمم بن کر تعمیرات میں، مالیات میں اور ہر چیز میں خرابی ہی خرابی پیدا کی تو مجھے مجلسِ شوریٰ میں مستقل شرکت کے لیے خصوصی مدعو کا اعزاز کیوں دیا گیا۔ اور ان تمام خرابیوں کے باوجود میرے خلاف کوئی ایکشن کیوں نہیں لیا گیا؟ کیا میں اتنے جرائم کے بعد اس قابل تھا کہ مجھے دوبارہ مدرس بنایا جائے؟ سچ تو یہ ہے کہ میرا جرم کم ہے، مہتمم صاحب

اور دوسرے اعلیٰ ذمہ داران کا جرم بڑا ہے کہ انھوں نے مفادِ دارالعلوم کا کوئی خیال نہیں کیا اور میرے تعلق سے اپنی ذمہ داریوں سے کوتاہی برتی اور میری ناجائز رعایت کی۔ ایسے حضرات بلاشبہ دارالعلوم کے منتظم رہنے کے اہل نہیں ہیں۔ (یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک مدرس محض جس کی تدریس میں کوئی کوتاہی نہیں نکالی گئی، تین چار سال اور آٹھ سال پہلے کی مفروضہ مزاجی و انتظامی خرابیوں کو بہانہ بنا کر اسے تدریس سے سبکدوش کیا جائے۔ اس کی تفصیل ابھی آنے والی ہے)۔

مولانا اسعد صاحب کا سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ میں ہر کام اپنی مرضی سے اور مشورہ کے بغیر کرتا تھا۔ یہ بالکل غلط ہے۔ میں نے ناظم مجلس تعلیمی کی حیثیت سے اور معاون مہتمم کی حیثیت سے جس قدر خدمات انجام دیں وہ شوریٰ کے فیصلوں کے مطابق قانون کے دائرے میں رہ کر انجام دیں۔ مہتمم صاحب جو ذمہ دار اعلیٰ تھے، ان کے اور میرے درمیان مکمل ربط وضبط تھا، میں نے ہمیشہ ان کی رہنمائی اور مشورے سے کام کیا۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سے جزوی اُمور میں میں نے ان سے مشورہ لینا ضروری نہیں سمجھا اور دارالعلوم کی ضرورت کے تحت بحیثیت قائم مقام مہتمم بروقت فیصلہ کیا۔ اگر میں ہر چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ میں مہتمم صاحب سے رجوع کرتا تو پھر ان پر کاموں کا وہی بار ہوتا جس سے وہ گھبراتے تھے اور جس کو کم کرنے کے لیے مجھے معاون مہتمم بنایا گیا تھا اور جس کی شکایت ان کو اپنے دونوں نائبوں سے تھی۔ اگر ہر جزوی معاملہ میں ان کی اجازت لینی ضروری تھی تو پھر دو نائبوں کے ہوتے ہوئے معاون مہتمم کے منصب پر میرا تقرر فضول تھا۔ میرا تقرر جس پس منظر میں ہوا تھا (حضرت مولانا منظور صاحب نعمانی مدظلہٗ اس کے گواہ ہیں) وہ یہ تھا کہ میں دارالعلوم کے بگڑے ہوئے نظام کو درست کرنے کی کوشش کروں گا۔ اور اس کے لیے مجھے مہتمم صاحب کی طرف سے اختیارات حاصل ہوں گے۔ اس زمانے میں مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کے صاحبزادے (جو بعد میں انتقال فرما گئے) سخت علیل اور صاحب فراش تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ان کے والد ان کے پاس مقیم رہیں۔ انھوں نے چھوٹے بھائی کے ذریعہ میرے پاس پیغام بھی بھجوایا۔ اس لیے مہتمم صاحب کی پریشانی کے پیش نظر میں نے عرض کیا کہ آپ اپنے صاحبزادے کے پاس قیام فرمائیں اور یہاں کے کاموں سے بے فکر رہیں۔ میں اہم اُمور میں مشورہ اور رہنمائی حاصل کرنے کے لیے چوتھے پانچویں دن دہلی حاضر ہوجایا کروں گا یا ٹیلی فون پر وقت ضرورت رابطہ قائم کرلوں گا۔ اس جذبے کے تحت میں نے تمام کاموں کو سمیٹنا شروع کر دیا۔ جب مہتمم صاحب تشریف لاتے تو ان کو تمام کاغذات تعمیل شدہ ملتے۔ اس طرح ان کی سابقہ شکایت ختم ہوگئی تھی کہ میں آتا ہوں تو فائل جوں کے توں میرے سامنے آجاتے ہیں۔

لیکن انھیں دنوں مولانا اسعد صاحب کی جانب سے مہتمم صاحب کو یہ باور کرایا جانے لگا کہ وحید الزماں آپ کی عدمِ موجودگی سے فائدہ اُٹھا کر مختارِ کل بن جائے گا اور آپ کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہے گی۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا

کہ ماہِ رمضان میں مہتمم صاحب نے باوجود اس کے کہ ان کے صاحبزادے بیمار تھے، ۱۷روز دارالعلوم میں قیام فرمایا اور بقیہ ایام صاحبزادے کے پاس۔ جبکہ اس سے پہلے کے رمضان میں جب میں معاون مہتمم نہیں تھا، اور بقولِ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب ان کے دو نائب کوئی کام انجام نہیں دیتے تھے اور ان کے صاحبزادے بھی بیمار نہیں تھے تو وہ تقریباً ۱۸روز اپنے گھر مقیم رہے اور صرف ایک ہفتہ دارالعلوم میں گزارا تھا۔

ٹیپ ریکارڈ

مولانا اسعد صاحب کی مکمل تقریر ٹیپ شدہ میرے پاس موجود ہے وہ انتہائی طیش اور غیظ وغضب میں بول رہے تھے۔ بات اگر چہ پورے طور پر صاف سمجھ میں نہیں آتی۔ تاہم کوشش کر کے ان کے جملہ الزامات کو قلمبند کیا گیا ہے جن کے جوابات ذیل میں تحریر ہیں۔ اگر وہ حسبِ عادت اپنی تقریر کے کسی جزو سے انکار کریں تو میرے پاس ان کی تقریر کا کیسٹ موجود ہے، اس کو سنا جاسکتا ہے۔

بے جا الزام تراشی

ان کے کچھ الزامات تو مشخص ہیں جن کا جواب بہ آسانی دیا جاسکتا ہے؛ لیکن کچھ الزامات ایسے مبہم اور مضحکہ خیز ہیں کہ ان کے بارے میں کچھ کہا ہی نہیں جاسکتا۔ اصل میں تو مولانا اسعد صاحب کے جتنے بھی الزامات ہیں وہ انتظامی اُمور سے متعلق ہیں۔ اگر یہ الزامات صحیح ہیں تو سوال یہ ہے کہ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے ایک ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے ان کا اظہار کسی بھی موقع پر کیوں نہیں کیا۔ ان کا فرض تھا کہ وہ بروقت مجھ سے باز پرس کرتے اور میرے خلاف کارروائی کرتے۔ اور اگر غلط ہیں اور یقیناً غلط ہیں تو کیا مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب (جو اس جلسہ میں موجود تھے) کی یہ ذمہ داری نہیں تھی کہ وہ ان کی تردید کرتے، اور کیا وہ عنداللہ بریَ الذمہ ہوسکتے ہیں؟ دوسرے یہ کہ مولانا اسعد صاحب کو مجھ پر انتظامی معاملات کے تعلق سے الزام لگانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اور اس لحاظ سے میں ان کے الزامات کا جواب دینے کا مکلف نہیں ہوں۔ تاہم ازالۂ غلط فہمی کے لیے چند باتوں کی وضاحت کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

متوازی نظام

مولانا اسعد صاحب کا ایک بڑا الزام یہ ہے کہ میں نے دارالعلوم میں ایک متوازی نظام قائم کرنے کی کوشش کی اور کسی سے مشورہ کیے بغیر اپنی رائے سے جو چاہا تصرف کیا۔ یہ ایک بالکل غلط اور بے بنیاد بات ہے۔ میں نے ضرورت کے مطابق ہر کام مہتمم صاحب کے مشورے اور اجازت سے کیا اور جہاں ان کی اجازت اور مشورے کی ضرورت نہیں ہوئی اور کوئی کام میرے دائرۂ اختیار میں ہوا تو اس کو میں نے ازخود انجام دیا۔ مولانا اسعد صاحب کا دعویٰ بلا دلیل ہے۔ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کو جو ذمہ دار مہتمم ہیں، مجھ سے متوازی نظام

بنانے یا خود رائے ہونے اور غلط تصرفات کرنے کی کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی؛ بلکہ انھوں نے ہر موقع پر اپنے اطمینان کا اظہار فرمایا۔ البتہ مولانا اسعد صاحب جو بات کہنا چاہتے ہیں اور کھل کر نہیں کہہ سکتے وہ یہ ہے کہ میں ہر کام موصوف سے اجازت لے کر نہیں کرتا تھا۔ ان کا یہ خاص مزاج ہے کہ بظاہر یہ مظاہرہ کریں گے کہ وہ کچھ نہیں ہیں؛ لیکن درپردہ یہ چاہیں گے کہ ہر کام ان کی رائے اور مرضی کے مطابق ہو۔ مجھ سے اصل شکایت ان کو یہی ہے کہ میں نے نظام دارالعلوم کا پابند ہو کر انصاف کے ساتھ کیوں کام کیا۔ ان کی خواہش کے مطابق کیوں نہیں کیا۔

ایک خلش

ان کے دل کی ایک زبردست خلش جس کا وہ کھل کر اظہار نہیں کر سکتے یہ ہے کہ میں نے ان کے مقرب خاص اور پرائیوٹ سکریٹری مولوی محمود (مرحوم) کو جبکہ وہ دارالافتاء میں محرر تھے، ان کی ایک دفتری خیانت پر باز پُرس کر کے حسب ضابطہ معطل کر دیا تھا۔ مولانا کو یہ بات انتہائی ناگوار گزری؛ مگر وہ کھل کر اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ یہ معطلی دستورِ دارالعلوم کے عین مطابق ہوئی تھی۔ میرے لیے یہ اقدام اس لیے ضروری تھا تاکہ تمام ملازمین پر یہ اثر قائم ہو کہ قانون کی نظر میں مولانا اسعد صاحب کا خاص آدمی بھی دوسرے ملازمین کے برابر ہے۔ میرے اس اقدام کی توثیق مجلسِ شوریٰ نے بھی کی تھی اور مجھے ہی مرحوم کے بارے میں فیصلہ کرنے کا کلی اختیار دے دیا تھا۔ میں نے اپنے دَور میں اللہ کے فضل سے ایسے تمام ملازمین کو جائز حقوق دلانے کی کوشش کی جن کا کوئی پُرسانِ حال نہ تھا، نیز باصلاحیت افراد کی حوصلہ افزائی کی اور غلط کار لوگوں کی سرزنش کی۔ الحمدللہ میں نے کسی سے اپنا کوئی ذاتی کام لیا نہ اپنے کسی رشتہ دار یا دوست یا خویش کو دارالعلوم کا ملازم بنایا۔ اس کے علاوہ شعبہ جات کی عمدہ کارکردگی، اوقات کی پابندی، ملازمین کی بروقت حاضری، احکام کی فوری بجا آوری، کاغذات پر کارروائیوں کی فوری تکمیل، اُلجھے ہوئے معاملات کا حل، علی الحساب رقوم کے حسابات کی بروقت وصولی، وغیرہ نمایاں انتظامی اُمور ہیں جو میرے دَور میں انجام پائے اور جن کی گواہی دارالعلوم کا ریکارڈ اور ہر خورد وکلاں دے سکتا ہے۔ پھر نہ معلوم مولانا اسعد صاحب کو نظام کی کون سی خرابی نظر آئی جس کو وہ اب تک بیان کر رہے ہیں۔ وہ کسی خرابی کو متعین کیوں نہیں کرتے۔

مبہم الزام

مالیات کے سلسلے میں مولانا اسعد صاحب نے بہت گول مول بات کی ہے۔ یہ بڑا نازک مسئلہ ہے اور اس میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے ورنہ ان پر مقدمہ بھی قائم ہو سکتا ہے۔ میں نے مالیات میں کیا گڑبڑ کی اور کون سی رقم داخل خزانہ نہیں ہوئی، اس کی کوئی وضاحت انھوں نے نہیں کی۔ یہ انتہائی لغو اور پُرفریب الزام ہے۔ تعجب اِس بات پر ہے کہ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب جو دارالعلوم کے ذمہ دار مہتمم ہیں اس پر سکوت اختیار کیے

بیٹھے ہیں۔ اگر مولانا اسعد صاحب کی بات صحیح ہے تو مہتمم صاحب بھی ذمہ داری سے نہیں بچ سکتے کہ انھوں نے مجھ سے دارو گیر کیوں نہیں کی۔ اور اگر غلط ہے، جیسا کہ انھوں نے بعض نامہ نگاروں سے گفتگو کرتے ہوئے صراحت کے ساتھ کہا ہے تو انھوں نے اُس وقت اس کی تردید کیوں نہیں کی۔

تعمیرات

میں نے تعمیرات کے سلسلے میں ہندوستان کے چند علاقوں سے چھ ماہ کے اندر تیرہ لاکھ روپے جمع کیے۔ قاعدے کے مطابق ان کی رسیدیں کاٹی گئیں اور یہ رقم منشی طالب حسین صاحب نائب پیش کار اور قاری فخر الدین صاحب ناظم دفتر تنظیم و ترقی جو وصولیابی میں میرے ساتھ تھے۔ ان کی تحویل میں رہی۔ پھر دارالعلوم پہنچتے ہی دفتر اہتمام میں محاسبی کے ذمہ دار کے حوالہ کر دی گئی اور داخل خزانہ ہوگئی۔ رسیدوں سے ملان بھی کر دیا گیا اور تمام حسابات بالکل درست رہے۔ تعمیرات پر جو رقم خرچ ہوئی وہ حسبِ ضابطہ خرچ ہوئی اور اس کے تمام جزوی و کلّی حسابات محفوظ ہیں، ان کی ڈپلی کیٹ کاپی آج تک میرے پاس بھی محفوظ ہے۔

اس کے برعکس مولانا اسعد صاحب کا کردار یہ ہے کہ انھوں نے میرے معاون مہتمم بننے کے بعد دارالعلوم کے خزانے میں یا اس کی تحویل میں باہر سے لائی جانے والی کوئی رقم جمع نہیں کی، جبکہ افریقہ سے آنے والے دو مہمانوں نے خود مجھ سے یہ بیان کیا کہ گزشتہ سال ہم نے مولانا اسعد صاحب کو سات لاکھ روپیہ چندہ کرایا تھا اور امسال بھی جوہانسبرگ میں فضلاء و ہمدردان دارالعلوم کی میٹنگ میں یہ طے کیا گیا ہے کہ دارالعلوم کے لیے مالی فراہمی کی جائے، اور ہم سے دارالعلوم کی ضروریات کا جائزہ لینے کے لیے کہا گیا ہے۔ میں نے ان کو دارالعلوم کی ضروریات اور اس کے منصوبوں سے آگاہ کیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہم افریقہ میں چندہ کے لیے مولانا اسعد صاحب کو سامنے نہیں رکھنا چاہتے، اس کے لیے دارالعلوم کے کوئی دوسرے دو ذمہ دار وہاں جائیں تو بہتر ہے۔ میں نے کہا کہ ان دو ذمہ داروں کا انتخاب کون کرے گا، تو انھوں نے جواب دیا کہ ہم مولانا اسعد صاحب سے اس سلسلہ میں مشورہ کریں گے۔ مولانا اسعد صاحب اس وقت دیوبند میں موجود نہیں تھے؛ البتہ ان کے بھائی مولانا ارشد صاحب موجود تھے۔ اتنی گفتگو کے بعد مجھے آج تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہاں سے کوئی رقم آئی یا نہیں؛ لیکن میری موجودگی میں باوجود قلت سرمایہ، کوئی رقم وہاں کی نہیں آئی۔

بہر حال مولانا اسعد صاحب نے مجھے پریشان رکھنے کے لیے نہ صرف یہ کہ کوئی مالی تعاون نہیں کیا؛ بلکہ آنے والی رقموں کو بھی باہر سے باہر روک دیا؛ کیونکہ باہر سے آنے والی رقمیں سب انھی کی معرفت آتی ہیں۔ میں مالیات کے باب کو چھیڑنا نہیں چاہتا تھا؛ لیکن انھوں نے چونکہ مجھ پر مبہم اور بے بنیاد الزام لگایا ہے اس لیے مجھ کو کچھ

معمولی ساز کر کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ ورنہ مالیات کا باب بہت وسیع ہے اور اگر خدانخواستہ اس کی تفصیلات بیان کرنے کی نوبت آگئی تو پھر مولانا اسعد صاحب کو شکایت ہوگی کہ یہ مسئلہ چورا ہے پر لایا گیا۔

چندہ کرنا

مولانا اسعد صاحب نے ہندوستان سے میرے چندہ کرنے کے پروگرام کو بھی بری نگاہ سے دیکھا اور بڑی ہوشیاری اور ترکیب سے اس میں بھی اَڑچنیں پیدا کیں۔ مثال کے طور پر مولانا بدرالدین صاحب آسامی فاضل دارالعلوم تاجر عطریات، بمبئی نے دارالعلوم کی ہمہ جہت ترقیات اور میری اَنتھک محنت کو دیکھ کر اس بات کی خواہش ظاہر کی اور دعوت دی کہ میں بمبئی آؤں اور وہاں مالیات کی فراہمی کی جائے۔ میں بمبئی گیا تو وہاں تاجروں کی میٹنگ میں یہ بات طے پائی کہ دارالعلوم کی تعمیرات کے لیے کم از کم ۲۵ لاکھ چندہ فراہم کیا جانا چاہیئے۔ اسی مجلس میں ایک اعظمی منزل (اعظم گڑھ کے لوگوں کی جانب سے) اور ایک آسامی منزل (آسامی تاجروں کی جانب سے) بنانے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ میٹنگ میں مجھ سے کہا گیا کہ اس فراہمی کے لیے آپ کو دس پندرہ دن بمبئی میں رہنا ہوگا۔ مجھے چونکہ پروگرام کے مطابق فوراً ہی راجستھان کا دَورہ کرنا تھا؛ اس لیے طے پایا کہ وہاں سے فارغ ہو کر بمبئی آؤں۔ اسی دوران مولانا اسعد صاحب باہر سے بمبئی پہنچے۔ ان کو میری آمد اور چندہ فراہمی کے پروگرام کا علم ہوا تو وہ پریشان ہو گئے اور انھوں نے فوراً ہی ایک خوبصورت چال یہ چلی کہ لوگوں سے کہا کہ تعمیرات کے لیے چندہ تو اور جگہوں سے بھی ہو جائے گا، بمبئی سے صرف مسجد کے لیے چندہ ہونا چاہئے اور اس کے لیے ارکان شوریٰ کا ایک مؤقر وفد آنا چاہئے۔ مولانا اسعد صاحب کی سیاست کو لوگ نہیں سمجھ سکے اور ان کی یہ تجویز مان لی گئی۔ مولانا اسعد صاحب نے وفد کی تشکیل اس طرح کی کہ اس میں اپنے ساتھ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کو زور دے کر شامل کیا (حالانکہ ان دنوں ان کے صاحبزادے سخت بیمار اور موت وحیات کی کش مکش میں تھے) تیسرے ممبر مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوری رکن شوریٰ کو خاص طور پر اس لیے لیا گیا کہ بمبئی میں ان کا حلقۂ اثر وسیع ہے۔ اور چوتھا ممبر حاجی علاؤالدین صاحب (مرحوم) (رکن شوریٰ) کو بنایا گیا جن کے اثرات اپنی مخصوص تاجرانہ (چلکا) برادری میں تھے۔ مجھے وفد سے کاٹ دیا گیا۔ جب یہ وفد بمبئی پہنچا اور لوگوں نے میرے بارے میں سوال کیا تو مولانا اسعد صاحب نے برجستہ یہ کہہ دیا کہ وہ بیمار ہیں۔ اس طرح دو مرحلوں میں بمبئی سے مسجد کے لیے چندہ کیا گیا جو مجموعی طور پر ۱۸ لاکھ ہوا۔

مجھے دارالعلوم میں تعمیراتی کاموں کی تکمیل میں پریشانیاں پیش آئیں؛ کیونکہ مولانا بدرالدین صاحب کی یقین دہانی پر کئی لاکھ کا اُدھار سامان لے کر تعمیر شروع کرا چکا تھا۔ مسجد کے نام پر حاصل ہونے والی رقم دارالعلوم کی دیگر ضروریات پر خرچ ہوتی رہی؛ کیونکہ دارالعلوم کے پاس روپیہ نہیں تھا۔ مجھے تعمیرات کے سلسلے میں پھر اسفار

کرنے پڑے۔ میں دوبارہ بمبئی گیا اور ذاتی تعلقات کی بنیاد پر محدود حلقہ سے بچا کھچا ایک لاکھ روپیہ جمع کیا۔

میں بمبئی سے مالیگاؤں گیا۔ وہاں فضلائے دارالعلوم نے فراہمی مالیات کے لیے ماحول سازگار کیا اور اُمید تھی کہ دو تین روز میں ڈھائی تین لاکھ روپیہ وصول ہو جائے گا؛ لیکن وہاں مولانا اسعد صاحب اور مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کا مدراس سے خط پہنچا کہ ارکانِ شوریٰ کا وفد فراہمی مالیات کے لیے مالیگاؤں آرہا ہے۔ میں نے یہ سن کر خود چندہ کرنا ملتوی کر دیا۔ اس خیال سے کہ اگر میں نے تین لاکھ رقم بھی وصول کر لی تو مولانا اسعد صاحب مجھ پر الزام لگائیں گے کہ ہم لوگ تو مالیگاؤں سے دس لاک جمع کرتے، وحید الزماں نے صرف تین لاک وصول کئے۔ مولانا عبد القادر صاحب رکن شوریٰ اور حاجی مصطفیٰ صاحب نے میری اس رائے کو پسند کیا؛ لیکن فضلائے دارالعلوم کو اس پر کافی رنج و ملال ہوا اور ان کا اصرار تھا کہ میں رکوں اور چندہ جمع کیا جائے؛ لیکن میں نے ان کی بات نہیں مانی اور بمبئی واپس آگیا۔ ارکانِ شوریٰ کا وفد مالیگاؤں نہیں پہنچ سکا۔ اور نہ کوئی دوسرا شخص وہاں پہنچا، نتیجہ یہ ہوا کہ سخت ضرورت کے باوجود دارالعلوم مالیگاؤں کے اصحابِ خیر کی رقم سے محروم رہا۔ مولانا اسعد صاحب کا مقصد صرف یہ تھا کہ چندہ کرنے کا کریڈٹ کسی طرح مجھ (وحید الزماں) کو حاصل نہ ہو، تاکہ ان کی شخصیت چندہ کے سلسلے میں محتاج الیہ بنی رہے۔ حالانکہ میرا مقصد کریڈٹ حاصل کرنا نہیں تھا؛ بلکہ میں صرف دارالعلوم کا تعمیراتی کام مکمل کرنا چاہتا تھا۔ اگر مولانا اسعد صاحب نیک نیت ہوتے تو وہ میرے ساتھ اس طرح تعاون کر سکتے تھے کہ مجھے پریشان کرنے کے بجائے مالیات کی فراہمی کا ذمہ لیتے اور مجھے یکسو ہو کر دارالعلوم میں کام کرنے کا موقع دیتے۔ اس واقعہ کے بعد میرا دل ٹوٹ گیا اور میں نے چندہ کے لیے سفر کرنا بند کر دیا۔

خام تعمیرات

تعمیرات کے سلسلہ میں مولانا اسعد صاحب نے میرے خلاف ہند و بیرونِ ہند میں بے انتہا پروپیگنڈہ کیا ہے۔ ان کا ایک اعتراض یہ ہے کہ میں نے کچی عمارتیں بنائیں اور یہ کہ وہ سب کسی نقشے اور منصوبے کے بغیر تعمیر ہوئیں، جبکہ یہ دونوں الزام بھی سراسر غلط ہیں۔ میرے معاون مہتمم بننے کے فوراً بعد مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے مجھ سے احاطۂ دفتر میں زینے بنانے کے لیے کہا۔ میں نے اس کام کا آغاز کیا۔ دو زینے اور گیلری توڑ کر ایک بڑا ہال تیار کیا گیا۔ اس کے بعد برقیات کے دفتر سے احاطۂ کتب خانہ میں جانے کا راستہ بنایا گیا اور پھر دارِ جدید میں پہنچنے کے لیے دارِ جدید کے کمرے میں سے راستہ نکالا گیا۔ یہ سب تعمیرات مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کے مشورے اور اجازت سے ہوئیں۔ اس کے بعد رواقِ خالد کی بالائی منزل، جامعہ طبیہ کے میدان پر قبضہ کرنے کے لیے چہار دیواری بنانے کا کام اور دوسرے چھوٹے اور بڑے تعمیراتی کام مولانا موصوف ہی کے مشورے سے ہوئے۔ جامعہ طبیہ

سے ملحق میدان کی نوعیت غیر واضح سی تھی، میں نے مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کی اجازت اور مشورے سے وہاں چہار دیواری بنوائی، تاکہ اس میدان پر دارالعلوم کا قبضہ مکمل ہو جائے؛ چونکہ دارالعلوم کے پاس روپیہ نہیں تھا؛ اس لیے میں نے عارضی احاطہ کے طور پر پرانے ملبے سے، جو اِدھر اُدھر سے اکٹھا کیا گیا تھا کم پیسوں میں یہ کام کرادیا؛ کیونکہ اصل مقصد اس میدان پر دارالعلوم کا قبضہ مکمل کرنا تھا، اس چہار دیواری اور دروازے کی تعمیر کے دوران ملحقہ زمینوں کے، مالکان سے کچھ جھگڑا بھی ہوا، کچھ لوگ میرے مکان پر بھی چڑھ آئے؛ لیکن کسی طور سے معاملہ کو سلجھا کر دارالعلوم کا قبضہ نمایاں کر دیا گیا، سہارنپور روڈ سے ملحق جو دروازہ بنایا گیا، وہ بھی چونکہ تالاب کی جگہ تھی اور وہاں ہمیشہ پانی بھرا رہتا تھا اس لیے اس کی بنیاد کے قریب جو بھراؤ کیا گیا تھا وہ مٹی کے بجائے پڑاوہ کی راکھ سے کر دیا گیا جس کی وجہ سے پانی بنیاد تک پہنچ گیا اور دروازے میں قدرے جھکاؤ پیدا ہو گیا، اس کی روک تھام کے لیے بطور پشتہ دو کوٹھریاں بنادی گئیں۔ یہ کوئی جرم یا کوئی سنگین غلطی نہیں جس کا پروپیگنڈہ کیا جائے۔ بڑے بڑے انجینئروں کی بنائی ہوئی عمارتوں میں دراریں پڑ جاتی ہیں۔ جمنا پر بنے ہوئے ایک نئے پل کے دائیں اور بائیں کناروں کے حصے گر گئے ہیں، اس پر کوئی قیامت برپا نہیں ہوئی۔ دارالعلوم کی حالیہ زیرِ تعمیر مسجد (جس کی تعمیر میں میرا کوئی دخل نہیں رہا ہے اور جو فولاد کی طرح مضبوط بنائی جا رہی ہے) کی جس جگہ محراب ہے وہاں بھی باوجود تمام تر پختگی کے ایک شگاف پیدا ہو گیا تھا جس کو مستری ریاض الدین نے بعجلت تمام پایہ کھڑا کر کے پُر کیا، اس پر بھی کوئی ہنگامہ نہیں مچایا گیا۔ نیز سطور ہٰذا قلم بند کرتے وقت وثوق سے معلوم ہوا کہ ایک دیوار میں ایسی کمزوری پیدا ہو گئی۔ جس کی وجہ سے کافی نقصان ہوا ہے۔ الحمدللہ میری کمزور عمارت تا ایں دم محفوظ ہے۔

گارے کی عمارت

تعمیرات کے سلسلے میں ایک الزام یہ بھی ہے کہ میں نے عمارت گارے کی بنائی، حالانکہ یہ کوئی قابلِ گرفت بات نہیں ہے۔ دارالعلوم کی تمام عمارتیں گارے ہی کی بنی ہوئی ہیں۔ اندر گارا ہے اور باہر لال چونا لگا ہوا ہے، اس کو بتّی کی چنائی کہتے ہیں۔ جس عمارت کو چاہیں کھود کر دیکھ لیں، اس کے اندر گارا ہی ہے۔ قصبات میں عام طور پر تین تین چار چار منزلہ عمارتیں گارے ہی سے بنتی ہیں اور ان کی مضبوطی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ میں نے گارے کی چنائی کے بعد دونوں طرف پلاسٹر بھی کرادیا تھا۔ پھر یہ کہ گارے کی یہ چنائی میں نے چھپ کر نہیں بلکہ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کے علم میں لا کر کرائی اور انھی سے ہر عمارت کا سنگِ بنیاد بھی رکھوایا۔ جامعہ طبیہ سے ملحق میدان میں مدرسین کے مکانات کا سنگِ بنیاد مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب اور مولانا اسعد صاحب سے رکھوایا گیا تھا اور ان کے سامنے بھی گارے ہی کی چنائی ہو رہی تھی۔ اگر گارے کی چنائی ناپسند تھی یا کمزور تھی تو سمنٹ کی کرادی جاتی یا اس سے

بھی زیادہ پختہ کرادی جاتی، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ میں نے اگر گارے کی چنائی کرائی تو اس کی سب سے بڑی وجہ روپئے کی کمی تھی۔ میں کم خرچ پر فوری ضروریات کی تکمیل کرنا چاہتا تھا۔

بے نقشہ کی تعمیر

یہ بھی غلط ہے کہ ان عمارتوں کا کوئی نقشہ نہیں بنوایا گیا۔ ان سب عمارتوں کے نقشے باضابطہ طور پر سہارنپور کے ایک آرکیٹیکٹ نفیس صاحب سے بنوائے گئے جو دفتر اہتمام کی الماری میں محفوظ تھے۔ اسی طرح یہ بات بھی غلط ہے کہ تعمیرات کے لیے کوئی کمیٹی بنائی گئی تھی اور میں نے اس کو توڑ دیا۔ ہاں یہ بات صحیح ہے کہ مولانا اسعد صاحب نے مجلسِ شوریٰ میں تعمیرات کے لیے ایک کمیٹی بنائے جانے کی تجویز پیش کی تھی تو میں نے اس کی مخالفت کی تھی اور یہ کہا تھا کہ جن کاموں کے لیے کمیٹیاں بنتی ہیں عام طور پر ان کی تکمیل میں دیر ہوتی ہے۔ مجلسِ شوریٰ نے اس وقت کمیٹی نہیں بنائی تھی۔

پہلا حملہ

یہ پہلی مجلسِ شوریٰ تھی جس میں مولانا اسعد صاحب بحیثیت ممبر شریک ہوئے تھے اور پہلے ہی اجلاس میں انھوں نے مجھ پر دو حملے کیے تھے۔ ایک میرے کاموں میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے کمیٹی بنانے کی تجویز پیش کرنا اور دوسرے مجلس کے اخیر میں اس عنوان سے کہ مولانا (یعنی میں) بیمار رہتے ہیں، مجھ سے نظامت تعلیمات لے کر مولانا ریاست علی صاحب کو اس کا ذمہ دار بنانا، جس پر میں نے کہا تھا کہ آپ میری بیماری کا عنوان نہ لگائیے۔ میں اہتمام کی ذمہ داریوں کے ساتھ تعلیمات کی ذمہ داریوں کو مولانا ریاست صاحب کے تعاون سے بہ سہولت انجام دے رہا ہوں۔ میں نے اسباق اور تعلیم کے نظام پر بحمداللہ پوری طرح قابو رکھا ہے اور جملہ تعلیمی اُمور بحسن وخوبی انجام پا رہے ہیں۔ تعلیمات میں جو کوتاہیاں ہوتی تھیں الحمدللہ وہ سب دُور کر دی گئی ہیں۔ میری علاحدگی کے بعد مولانا ریاست علی صاحب اس نظام پر پوری طرح قابو نہ پاسکیں گے اور پھر وہی سابقہ اضمحلال پیدا ہو جائے گا؛ لیکن مجلس نے مولانا ریاست صاحب کو ناظم بنا دیا۔

اسی روز شب میں مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب، مولانا اسعد صاحب کے ساتھ دہلی تشریف لے گئے اور انھوں نے مولانا اسعد صاحب سے کہا کہ وحید الزماں آپ کا حامی اور آپ کی ممبرشپ کے لیے کوشاں رہا ہے، مگر آج آپ نے بیٹھتے ہی دو باتیں ایسی کہیں جو آپ کو نہیں کرنی چاہئے تھیں۔ اس پر مولانا اسعد صاحب نے اقرار کیا کہ ہاں مجھے بھی بعد میں اس کا احساس ہوا۔ اور اپنی اس غلطی کی وجہ بتاتے ہوئے کہا کہ میں جب شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کے لیے دیوبند پہنچا تو لوگوں نے (جو مولانا اسعد صاحب کے چند حاشیہ نشین ہو سکتے ہیں) ایسی (غلط) اطلاعات مجھ تک پہنچائیں جن سے میں متاثر ہو گیا۔ یہ واقعہ خود مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے مجھ سے بیان کیا تھا۔ غالباً انھیں اب تک یاد ہوگا۔

غبن

مولانا اسعد صاحب نے انتہائی جسارت سے کام لیتے ہوئے خلافِ حقیقت مجھ پر یہ الزام لگایا ہے کہ میرے زمانے میں ایک لاکھ پینتس ہزار کا غبن ہوا اور متعلقہ محرر نے اس کے نتیجہ میں خودکشی کرلی۔ گویا غبن کا بھی میں ذمہ دار ہوں اور خودکشی کا بھی میں ہی ذمہ دار ہوں۔ مولانا اسعد صاحب کو پہلے یہ طے کرلینا چاہیے کہ مہتمم کی موجودگی میں انتظامی اچھائیوں یا خرابیوں کی نسبت صرف انھی کی طرف ہوگی یا ان کے ماتحت کی طرف بھی۔ اگر جملہ ترقیات کی نسبت بحیثیت ذمہ دار اعلیٰ مہتمم کی طرف ہوگی، تو انتظامی خرابیاں بھی ذمہ دار اعلیٰ ہی کی طرف اور اسی کے دَور سے منسوب ہوں گی۔ ماتحت کا دَور، دَور نہیں کہلاتا۔ اس کے علاوہ سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ غبن کا یہ واقعہ اس وقت ہوا تھا جبکہ شعبہ محاسبی سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مولانا اسعد صاحب نے ممبر شوریٰ بننے کے بعد میرے اثرات کو کم کرنے اور میرے دائرۂ اختیار کو محدود کرنے کے لیے اپنی عادت کے مطابق بڑی ہوشیاری اور بڑے خوبصورت عنوان سے دارالعلوم کے انتظامی شعبہ جات تقسیم کرادیے تھے۔ جس کے بعد طلباء سے متعلق اہم اور حساس شعبے مولانا نصیر احمد خاں صاحب کو دیئے گئے۔ چند غیر اہم شعبے میرے حوالے کیے گئے اور شعبہ محاسبی (اکاؤنٹ سیکشن) شعبہ اوقات اور اہتمام خصوصیت کے ساتھ مہتمم صاحب کی نگرانی میں دیئے گئے۔ حالانکہ سارے ہی شعبے مہتمم صاحب کے ماتحت تھے؛ لیکن اصل مقصد مجھ کو بے دخل کرنا تھا۔ اس تقسیم شعبہ جات کے چند ماہ کے بعد مذکورہ غبن کا واقعہ پیش آیا جبکہ شعبہ محاسبی میں میرا کوئی دخل نہیں تھا، بلکہ وہ براہِ راست مہتمم صاحب کی نگرانی میں تھا۔ اور انھوں نے مجلسِ شوریٰ میں اس کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے استعفیٰ بھی پیش کرنے کو کہا تھا۔ یہ کس قدر دیانت کے خلاف بات ہے کہ اس غبن کو میری طرف منسوب کردیا جائے۔ یہ زبردست اور شرمناک مغالطہ آمیزی اور افترا پردازی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اور افسوس اس کا ہے کہ مہتمم صاحب نے بھی دانستہ اس سے خاموشی برت کر اس میں شرکت کرلی ہے۔

پھر اس کے بعد ۲۱؍جون ۱۹۹۰ء کو دہلی میں کی گئی پریس کانفرنس کے دوران مولانا اسعد صاحب اور مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے انتہائی مغالطہ آمیزی کے ساتھ میرے دَور کے بجائے براہِ راست مجھ پر ہی اس غبن کا الزام لگادیا جس کو ہندوستان کے کئی اہم اخبارات نے جلی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا اور آج تک اس کی کوئی تردید نہیں کی گئی۔ کیا یہ صریح کذب بیانی اور مجھ کو بدنام کرنے کی منصوبہ بند سازش نہیں ہے؟ جبکہ ایک ایجنسی کے نمائندے کے سوال پر (جو دارالعلوم آیا تھا) مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے صاف انکار کیا کہ ہم نے مولانا پر غبن کا کوئی الزام نہیں لگایا ہے۔

تخمینہ

مولانا نے ایک بات یہ کہی ہے کہ میں نے دارالعلوم کی مسجد کے مصارف کا تخمینہ پہلے دس لاکھ بتایا اور دوبارہ بیس لاکھ بتایا۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ بات صحیح بھی مان لی جائے تو اس سے کونسا جرم ثابت ہوتا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم کی مسجد کے سلسلہ میں ہر دفعہ شوریٰ میں بحث ہوتی تھی؛ لیکن کوئی فیصلہ نہیں ہو پاتا تھا، نہ جگہ کا تعین ہوتا تھا نہ اس بات کا کہ کتنی بڑی مسجد بنائی جائے۔ میں نے مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کے مشورے سے اس جگہ پر بورڈ لگوادیا جہاں اب مسجد تعمیر ہو رہی ہے، اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اس سلسلہ میں ردوقدح ختم ہوگئی اور جگہ متعین ہوگئی۔ یہ اب سے پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت دو ہزار نمازیوں کے بقدر مسجد بنانے کا پروگرام تھا اور اس کی لاگت کا تخمینہ چالیس لاکھ روپے تک تھا۔ میں نے دس لاکھ پہلے مرحلے کے لیے اور بیس لاکھ دوسرے مرحلے کے لیے متعین کیے تھے۔ اور یہ ساری بات باہمی مشورے سے طے ہوئی تھی کہ ایک دم بڑی رقم مانگنے سے لوگوں کو وحشت ہوگی اس لیے مرحلہ وار رقم فراہم کی جائے۔ چنانچہ اس سے قبل باہر کے ایک عرب دارالعلوم آئے ان کے سامنے مسجد کا نقشہ پیش کیا گیا اور ایک بڑا تخمینہ سامنے رکھا گیا جو ایک کروڑ کے قریب تھا تو انھوں نے کہا کہ اتنی بڑی رقم تو کوئی سربراہ مملکت ہی دے سکتا ہے، یہ میرے امکان سے باہر ہے۔ اگر اس وقت ایک کروڑ کے بجائے ان سے دس لاکھ کا مطالبہ کیا جاتا تو وہ شاید اسی وقت دے دیتے۔ اس تجربہ کی بنا پر مرحلہ وار چندے کی اپیل کی گئی تھی۔ اس موقع پر جو پمفلٹ شائع کیا گیا تھا اس میں ''پہلے مرحلے'' کی صراحت کی گئی تھی اور وہ شاید دارالعلوم کے ریکارڈ میں اب بھی موجود ہوگا۔ یہ بات میں مولانا اسعد صاحب کو مجلسِ شوریٰ میں زبانی بھی بتا چکا ہوں؛ مگر وہ برابر اس کا پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں۔

مشتعل مزاجی

مولانا اسعد صاحب اپنی تقریر کے دوران کبھی انتظامی اُمور کے تعلق سے الزامات لگاتے ہیں اور کبھی ایک دم ذاتیات اور ''مزاجیات'' پر پہنچ جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تقریر میں میری مشتعل مزاجی کے ثبوت کے طور پر ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے جو مکہ مکرمہ میں ایک دعوت کے دوران میرے رفیق سفر مولانا فصیح الدین دہلوی کے ساتھ پیش آیا تھا، جس میں مولانا اسعد صاحب کے بقول میں ایک ذرا سی بات پر مولانا فصیح الدین صاحب پر برس پڑا تھا اور یہ کہا تھا کہ ''تم نہیں جانتے، میں آگ ہوں آگ''۔ مولانا اسعد صاحب نے اس واقعہ کو مسخ کر کے پیش کیا ہے اور اس کی حکایت میں انتہائی مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے اس کو بڑے بھیانک اور بھونڈے انداز میں پیش کیا ہے۔ میرے رفیق سفر مولانا فصیح الدین صاحب سے اس کی تحقیق کی جاسکتی ہے۔ علاوہ ازیں اگر

میں اپنی بدمزاجی کا اظہار میزبان کے سامنے کرتا تو وہ یقیناً قابل مذمت بات تھی، لیکن اگر میں اپنے رفیق سفر سے کسی بات پر اظہار ناگواری کروں تو یہ میرا ان کا ذاتی معاملہ ہے اور کوئی قابل مذمت بات نہیں ہے۔ اس طرح کے فضول واقعات اور بے بنیاد باتوں کا ذکر کرنا جن سے نہ کوئی جرم ثابت ہوتا ہو اور نہ کوئی حقیقت سامنے آتی ہو، میں قطعاً مناسب نہیں سمجھتا لیکن جبکہ مولانا اسعد صاحب اس نیچی سطح پر اُتر آئے ہیں تو جواباً میں بھی ان کا صرف ایک واقعہ ذکر کر دیتا ہوں جو یقیناً ان کی ''خوش اخلاقی'' کا بھرم کھول دے گا۔ یوں تو میزبانوں کے ساتھ ان کی بداخلاقی کے سیکڑوں واقعات ہیں۔

غالباً ۷۷ء کے آس پاس کی بات ہے کہ میں اور مولانا اسعد صاحب راجستھان کے سردار شہر پہنچے۔ لوگوں نے شہر کے باہر سے مدرسہ تک لے جانے کے لیے استقبالیہ محرابیں سجائی تھیں اور وہ ہمیں اعزاز کے ساتھ ان محرابوں سے گزار کر لے جانے کے خواہشمند تھے۔ مولانا اسعد صاحب جو پیر اور دیوبندی عالم ہونے کے باوجود بڑے شوق اور ترکیبوں سے اخبارات میں اپنی تصویریں چھپواتے اور اپنا پروپیگنڈہ کراتے ہیں۔ کبھی کبھی دکھانے کے لیے بڑی سادگی اور تصوف کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ اس روز بھی انھوں نے میزبانوں کو بُری طرح ڈانٹ دیا۔ وہ سب کے سب دل مسوس کر رہ گئے اور مولانا موصوف چہرہ بگاڑتے ہوئے انتہائی انقباض کے عالم میں دوسرے راستہ سے مدرسہ پہنچے۔ وہاں بیٹھتے ہی کہا: ''پروگرام بتائیے کیا ہے؟'' لوگوں نے پروگرام بتایا۔ پروگرام سے فارغ ہونے کے بعد دسترخوان بچھایا گیا اور ناشتہ کا سامان آنے لگا۔ بڑے غصہ سے کہنے لگے: ''یہ ناشتہ کیسا؟ ناشتہ تو آپ نے پروگرام میں بتایا نہیں؟'' اُٹھ کر جانے لگے کہ میں ناشتہ نہیں کروں گا؛ کیونکہ یہ پروگرام میں شامل نہیں۔ ہر چند لوگوں نے خوشامد کی؛ لیکن وہ نہ مانے اور انتہائی بداخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ بالآخر میں نے بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر ان کو ناشتہ کے لیے آمادہ کیا۔ بتائیے کیا یہ بدمزاجی اور بدخلقی نہیں ہے؟ یہ واقعہ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

اسباق

مولانا اسعد صاحب نے مجھ پر ایک الزام یہ بھی لگایا ہے کہ میں دارالعلوم میں صرف ایک دو سبق پڑھاتا تھا۔ اس کے بارے میں میں پچھلے صفحات میں بیان کر چکا ہوں کہ تعلیمات کی جانب سے مجھے صرف دو سبق دیئے گئے تھے اور میں اس کے مطابق پڑھاتا تھا۔ ان دو اسباق میں ایک تکمیل ادب سال دوم کا تھا جس کا کوئی مستقل گھنٹہ نہیں ہوتا۔ اور میں اس میں حسبِ ضرورت زیادہ وقت بھی لگاتا اور مشق کراتا تھا۔ اس موقع پر ایک واقعہ کا ذکر ضروری ہے۔

گزشتہ سے پیوستہ سال کی بات ہے کہ میں نے خود یہ محسوس کرتے ہوئے کہ میرے پاس صرف دو گھنٹے ہیں اور طلباء مجھ سے انفرادی طور پر عربی پڑھنے کے لیے کہتے رہتے ہیں، اپنے ایک قدیم تعامل کے مطابق بعد نماز مغرب ایک جماعت کو پڑھانے کا اعلان کیا۔ اس کے لیے ساڑھے تین سو درخواستیں موصول ہوئیں۔ ان طلباء کی صف بندی کے لیے میں نے مولانا قاری محمد عثمان صاحب کو (جو اس وقت نائب ناظم تعلیمات تھے) متعین کیا۔ انھوں نے ایک ''صف ثالث'' بنا کر میرے حوالہ کی۔ میں نے تعلیمات کے زیر انتظام سبق پڑھانا شروع کر دیا۔ میری جماعت میں اَسّی طالبِ علم ''موقوف علیہ'' (دورۂ حدیث سے پہلے کا سال) کے تھے۔ میں نے دارالحدیث میں سبق کا آغاز کیا تو تمام دارالحدیث بھر گئی۔ اور ایک ہفتہ تک ۵۰۰، ۶۰۰ طلباء شریک درس ہوتے رہے۔ میں نے ان طلباء کو عربی کے ایسے بنیادی اُصول بتائے کہ اگر وہ ان پر عمل پیرا ہو کر صرف مطالعہ کرتے رہیں تو ان کو عربی زبان سے ایک حد تک واقفیت ہو جائے۔ میرے اس سبق کی مقبولیت کو دیکھ کر منتظمین دارالعلوم خوش ہونے کے بجائے پریشان ہو گئے اور اگلے ہی ہفتہ ''سراجی'' کے سبق کا اعلان کر دیا گیا۔ چونکہ میری جماعت میں اکثر طلباء ''سراجی'' میں شریک ہونے والے تھے، اس لیے قصداً ایسا کیا گیا، ورنہ یہ سبق ہمیشہ سال کی تیسری سہ ماہی میں ہوا کرتا تھا۔ میں نے طلباء کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے مشورہ دیا کہ وہ سراجی کے سبق میں شریک ہوں اور میرا سبق چھوڑ دیں۔ حالانکہ ناظمِ تعلیمات کا یہ فرض تھا کہ جب میرا سبق ضابطہ میں آچکا تھا تو وہ اس ٹکراؤ کو ختم کرتے اور اس کا حل نکالتے؛ لیکن انھوں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اور اس سے بھی زیادہ تعجب خیز اور قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ اسی سال شعبان میں منعقد ہونے والی شوریٰ کے اجلاس میں مولانا اسعد صاحب نے مجھ پر ڈسپلن شکنی کا الزام لگاتے ہوئے میرے اس سبق کو بھی جرم قرار دینے کی کوشش کی۔ قارئین کرام غور فرمائیں کہ یہ مجھے ہر طرف سے پریشان کرنے اور بدنام کرنے کی سوچی سمجھی اسکیم نہیں تو اور کیا ہے؟ میں پڑھانا چاہتا ہوں تو پڑھانے نہیں دیا جاتا، اور خود ہی گھنٹے کم دیتے ہیں تو اس کی بنیاد پر میرے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ اس کا میرے پاس کیا علاج ہے۔

اگر دیانت و امانت نام کی کوئی چیز منتظمین کے یہاں باقی ہے تو وہ میرا سال گزشتہ کا تعلیمی ریکارڈ دیکھیں۔ رجسٹر حاضری اُٹھا کر دیکھیں کہ میں نے کتنی پابندی کے ساتھ اپنا کام انجام دیا ہے۔ طلبۂ تکمیل ادب سے میرے مضمون کے متعلق معلوم کریں کہ ایک گھنٹے میں میں نے ان کو کیا دیا ہے اور دوسروں نے کیا دیا ہے۔ اسی کے ساتھ تکمیل ادب کے بعض دوسرے اساتذہ کے رجسٹر بھی ملاحظہ کیے جائیں اور طلباء سے بھی تحقیق کی جائے کہ انھوں نے سال بھر میں کتنے مہینے تعلیم دی۔

اگر بفرضِ محال میری حاضری پوری نہیں تھی تو میرا مضمون کیسے داخل امتحان کر لیا گیا اور مجھے کس قانون اور کس

رعایت کے تحت تنخواہ دی جاتی رہی۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ دارالعلوم کا موجودہ انتظامی ڈھانچہ بالکل بیکار اور ناکارہ ہو چکا ہے۔ جب میرے ساتھ یہ غیر ذمہ دارانہ معاملہ ہے اور دارالعلوم کے معاملہ میں کھلی مداہنت سے کام لیا جا رہا ہے تو نہ معلوم اور کتنے مدرسین کے ساتھ یہ ڈھیل برتی جاتی ہوگی۔ مجلسِ شوریٰ کا فرض ہے کہ وہ ایسے منتظمین کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کرے جو اپنے ماتحتوں سے فرائض منصبی میں ان کی کوتاہیوں پر داروگیر کرنے کے بجائے چوراہوں پر اور جلسوں میں اُن کی بُرائی اور مذمت کرتے ہیں۔

ناز یبا سلوک

مولانا اسعد صاحب نے انتہائی بھیانک اور وحشت ناک انداز میں بعض ممبرانِ شوریٰ کے ساتھ میرے نازیبا سلوک کا ذکر کیا ہے، حالانکہ اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ جس طرح مشورہ کی مجلسوں میں عام طور پر کسی مسئلہ پر بحث ومباحثہ کے دوران اختلافِ رائے کے واقعات پیش آتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں کچھ تلخ کلامی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح میں نے بھی شوریٰ کے بعض جلسوں میں کسی مسئلہ پر بعض ممبران سے اختلاف کیا۔ یہ نہ تو کوئی انوکھی بات ہے اور نہ ہی کوئی سنگین جرم۔ مجلسِ شوریٰ میں اختلافِ رائے کا پیدا ہونا کوئی بُری بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کی روایت رہی ہے کہ اس میں اظہارِ خیال کی مکمل آزادی ہوتی ہے اور ہر شخص اپنی رائے کھل کر پیش کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مولانا اسعد صاحب کے ممبر شوریٰ بننے کے بعد سے یہ روایت دم توڑتی نظر آرہی ہے اور اب شوریٰ میں مولانا اسعد صاحب کسی اور کی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور اپنی ہی رائے پر اصرار کرتے ہیں اور اسی کو دوسروں سے منوانے کی کوشش کرتے ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ قدیم ممبران گرامی قدر جنھوں نے آزادئ خیال کا دَور دیکھا ہے، شوریٰ کے جلسوں میں شرکت کرنا پسند نہیں کرتے اور اگر شرکت کرتے ہیں تو مولانا اسعد صاحب کی انانیت، خودسری اور ہٹ دھرمی سے ملول اور رنجیدہ ہو کر واپس لوٹتے ہیں۔ اگر مولانا اسعد صاحب کو اختلافِ رائے اس قدر ناپسند ہے تو انھیں مجلسِ شوریٰ کا نام ''تائیدی مجلس'' رکھ لینا چاہیئے اور یہ اعلان کر دینا چاہیئے کہ اس مجلس کا کام دارالعلوم کے مسائل پر بحث ومباحثہ کرنا نہیں ہے؛ بلکہ ان کی مرضی اور ان کی پیش کردہ رائے کی تصدیق وتوثیق کرنا ہے۔

حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحب میرٹھی مدظلہٗ کو بلاشبہ ایک مرتبہ احقر سے ایک مسئلہ پر اختلاف ہوا تھا جس کے نتیجہ میں دونوں طرف سے کچھ نرم وگرم باتیں ہوئی تھیں، لیکن چونکہ قاضی صاحب موصوف ایک عالی ظرف اور کشادہ قلب انسان ہیں او وہ یہ جانتے ہیں کہ اس طرح کے جلسوں میں اختلافِ رائے ایک ناگزیر امر ہے اور یہ کہ آزادئ فکر وخیال مجلسِ شوریٰ کا ایک قیمتی سرمایہ ہے جس کو کسی قیمت پر ضائع نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ اس

لیے حضرت قاضی صاحب نے میری تیز گفتگو کا کوئی اثر نہیں لیا اور اسی مجلس میں مجھ سے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ ''بیٹھو! ہم دونوں ہی بلڈ پریشر کے مریض ہیں۔'' اس کے بعد حضرت قاضی صاحب کے دل میں کوئی بات نہیں رہی اور ان کا مشفقانہ برتاؤ بدستور میرے ساتھ قائم ہے۔

اسی طرح ایک بار مخدومی جناب نواب عبید الرحمٰن خاں شیروانی مدظلہٗ نے بھی احقر سے کسی بات پر اختلاف فرمایا اور اس سلسلہ میں کچھ گرما گرم بحث ہوئی، لیکن نواب صاحب موصوف اس قدر شریف الطبع اور متحمل مزاج انسان ہیں کہ اسی دن شام کو مولانا اسعد صاحب کے مکان پر ممبرانِ شوریٰ کی ایک دعوت کے دوران جب انھوں نے مجھے دیکھا والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس پڑھتے ہوئے مجھے اشارے سے اپنے پاس بلا کر بٹھا لیا۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ اگلے دن صبح کو فجر کی نماز کے بعد وہ تنہا مجھ ناچیز کے غریب خانے پر تشریف لائے، چائے نوش فرمائی اور کہا کہ'' آپ اپنا دل صاف کر لیں، میرے دل میں آپ کی بہت قدر ہے۔'' میں نے ان کی اس نوازش اور عالی ظرفی سے زیر بار ہوتے ہوئے عرض کیا کہ'' آپ میرے بڑے ہیں، مجھ سے جو تکلیف پہنچی ہو اس کو معاف فرمائیں۔'' الحمد للہ اس کے بعد ان سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں اور ان کا دل صاف نظر آیا۔

حیرت اِس بات پر ہے کہ جن حضرات کے ساتھ یہ واقعات پیش آئے تھے انھوں نے تو اپنی فراخدلی اور اعلیٰ اسلامی اخلاق کا ثبوت دیتے ہوئے فوری طور پر سب کچھ بھلا دیا اور کبھی بھولے سے بھی ان واقعات کو زبان پر لانا گوارا نہیں کیا۔ لیکن مولانا اسعد صاحب (جو دوسروں کو بھی کینہ پروری، تنگ نظری اور منتقم مزاجی میں اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں) آج تک ان باتوں کا عوامی محفلوں میں انتہائی مکروہ انداز میں پروپیگنڈا کرتے پھر رہے ہیں۔ کیا اس سے یہ بات واضح طور پر سمجھ میں نہیں آتی کہ مولانا اسعد صاحب کو جب میری کردارکشی کے لیے کوئی واقعی جرم نظر نہیں آیا تو وہ اس طرح کی پرانی باتوں کو بھونڈے اور مغالطہ آمیز شکل میں پیش کر کے مجھ کو بدنام اور شوریٰ کے موقر ممبران کو مجھ سے بدگمان کرنا چاہتے ہیں؟ کس قدر افسوس اور شرم کی بات ہے کہ امیر الہند جیسے مقدس منصب کے دعویدار محض اپنی انتقامی ہوس کو غذا دینے کے لیے ایسے اوچھے اور گھناؤنے ہتھکنڈے بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

تیسرا واقعہ خود مولانا اسعد صاحب کے ساتھ پیش آیا، اور دراصل یہی وہ واقعہ ہے جس کی وجہ سے وہ ممبرانِ شوریٰ کے ساتھ میری بدسلوکی کا پروپیگنڈا کرتے ہیں؛ لیکن خود اپنا حوالہ دینے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ میں نے دیوبند کے رہنے والے ایک فاضل دارالعلوم کا جو جامعہ طبیہ دارالعلوم سے بھی فارغ ہیں۔ جامعہ طبیہ کے شعبۂ معالجہ میں عارضی تقرر کر دیا تھا۔ ان صاحب نے کیمپ دارالعلوم کے دوران بہت کچھ تعاون کیا تھا۔ ان کا تعلق طالبِ علمی کے زمانے میں مجھ سے رہا تھا، اور وہ دیوبند کی ایک بڑی برادری سے تعلق رکھتے

ہیں۔ادھر مولانا اسعد صاحب کے صاجزادے مولوی محمود صاحب سے بھی ان کے خصوصی تعلقات تھے۔مولانا اسعد صاحب کے گھر میں بھی ان کی آمدورفت تھی اور روپے کا بھی لین دین تھا۔ان کی برادری کے لوگوں نے جامعہ طبیہ میں ان کو ملازم رکھنے کے لیے زور دیا۔ابتداءً میں نے انکار کیا؛ پھر کچھ لوگوں کے اصرار کرنے پر مولانا مرغوب الرحمٰن کی اجازت سے ۵۰۰ روپے ماہانہ پر معالجہ کے شعبہ میں ان کا تقرر کر دیا۔اوسطاً شہر کے ڈیڑھ سو مریض روزانہ آنے لگے، فی مریض دو دن میں ایک روپیہ لیا جاتا تھا اور دوائیں مفت دی جاتی تھیں۔اس طرح ان صاحب کے ذریعہ ان کی تنخواہ نکال کر آٹھ سو یا ہزار روپیہ ماہانہ شعبہ معالجہ کے لیے بچت ہو جاتی تھی، دارالعلوم پر کوئی بار نہ تھا۔

مولانا اسعد صاحب کے کچھ مقربین کو ان سے پرخاش تھی، انھوں نے مولانا کا ذہن ان صاحب کے خلاف تیار کیا۔اجلاس شوریٰ کے موقع پر بالکل ابتداء ہی میں کوئی بات اُٹھی جو تقرر سے متعلق تھی۔مولانا اسعد صاحب نے کہا کہ تقررات کے لیے ایک کمیٹی بنائی جانی چاہئے۔حضرت مولانا حکیم زماں صاحب حسینی نے فرمایا کہ ''تقرر کمیٹی تو پہلے سے بنی ہوئی تھی۔اور حال ہی میں اسے اہتمام کی فرمائش پر تحلیل کیا گیا ہے۔اب دوبارہ کیا ضرورت پیش آئی؟ کیا کوئی غلط تقرر ہوا ہے؟۔''مولانا اسعد صاحب نے انتہائی چراغ پا، بے قابو اور مشتعل ہوتے ہوئے ہاتھ اُٹھا کر فرمایا کہ''جی ہاں! فلاں کا تقرر کر دیا گیا ہے اور وہ زنا کار ہے''۔سوال آیا کہ یہ تقرر کس نے کیا ہے تو میں نے کہا کہ یہ تقرر میں نے کیا ہے اور مہتمم صاحب کے مشورے سے کیا ہے۔مولانا اسعد صاحب نے مہتمم صاحب پر آنکھیں نکالتے ہوئے کہا'' کہیے مہتمم صاحب!!''مہتمم صاحب نے جواب دیا کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ ایسا شخص ہے۔میں نے مولانا اسعد صاحب سے کہا کہ''مولانا! آپ کو معلوم ہے کہ آپ کون ہیں اور کیا الزام لگا رہے ہیں؟ زنا کا الزام کوئی معمولی الزام نہیں ہے۔آپ اس پر گواہ نہیں پیش کر سکتے۔پھر آپ ایک عالم دین اور صدر جمعیۃ علمائے ہند ہونے کے ساتھ مجلسِ شوریٰ کے رکن ہیں، مجلسِ شوریٰ دارالعلوم کی عدالتِ عالیہ ہے، اس کے ممبران کا کام فریق بن کر کسی پر الزام لگانا نہیں؛ بلکہ لگائے ہوئے الزامات کی تحقیق کرنا اور فیصلہ کرنا ہے۔جس شخص کو آپ زنا کار کہہ رہے ہیں وہ یہ بتا سکتا ہے کہ آپ کے صاجزادے''کیا کار'' ہیں۔''میں نے ممبران کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ''ان کا مقصد یہ ہے کہ دارالعلوم کا دروبست ان کے حوالہ کر دیا جائے اور یہی مالکِ مختار ہوں۔''یہ کہہ کر میں اُٹھ گیا اور باہر نکل کر میں نے کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالا۔میں سیدھا دفتر اہتمام آیا اور وہاں تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد اپنے گھر چلا گیا۔

دراصل یہی وہ کانٹا ہے جس کی خلش مولانا اسعد صاحب کبھی بھی بھول نہیں سکتے؛ کیونکہ ان کو صرف خوشامدی اور چاپلوسی کرنے والوں سے ہی واسطہ پڑا ہے، ایسا صاف جواب سننے کے وہ عادی نہیں ہیں۔مجھے اِس بات پر

رنج تھا کہ اگر مولانا اسعد صاحب کو میرے رکھے ہوئے ایک آدمی سے اختلاف تھا تو بجائے یہ کہ غیر اخلاقی اور بھونڈا طریقہ اختیار کرتے وہ میرے ساتھ معقول معاملہ کر سکتے تھے اور یہ کہتے کہ فلاں شخص کا کردار مشتبہ ہے اور اسے دارالعلوم سے الگ کر دینا چاہئے۔ لیکن میں سازشوں اور حیلہ بازیوں سے بہت چڑتا ہوں اور پھر اس کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہوں۔ ممبران شوریٰ کے ساتھ بدسلوکی کا پروپیگنڈہ صرف اسی واقعہ کی بنیاد پر ہے، ورنہ اور جن حضرات سے میری تلخ کلامی ہوئی تھی ان سب سے بحمداللہ میرے خوشگوار تعلقات ہیں اور خدا کے فضل سے وہ سب لوگ ہنوز بقید حیات ہیں، ان سے مل کر تحقیق کی جا سکتی ہے۔ مجلسِ شوریٰ میں اختلافِ رائے ہونا اور تلخ کلامی تک نوبت پہنچ جانا کوئی نئی بات نہیں ہے، ہر جگہ مجلس مشورہ میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔

بدسلوکی

مولانا اسعد صاحب اس بات کو بھولے ہوئے ہیں کہ انھوں نے کیسے کیسے بزرگوں کے ساتھ بدسلوکی اور بدتہذیبی کی ہے اور ان کی پگڑیاں اُچھالی ہیں۔ جمعیۃ علمائے یو پی کے ایک انتخابی اجلاس میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ تشریف رکھتے تھے۔ مولانا اسعد صاحب نے انتہائی بداخلاقی کے ساتھ یہ کہہ کر ان کو اُٹھا دیا کہ آپ مرکز سے متعلق ہیں، یہاں صوبائی اجلاس میں آپ کا دخل نہیں ہونا چاہئے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب (مرحوم) رنجیدہ ہو کر بادلِ ناخواستہ اُٹھے اور اپنی گاڑی میں اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ اور کسی سے اشکبار آنکھوں سے فرمایا کہ ''آج اس لونڈے نے میری بڑی بے عزتی کی ہے۔'' (شفیق چپراسی اس بات کا گواہ آج بھی دہلی میں موجود ہے)۔

ایسا ہی ایک واقعہ حال میں حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوری مدظلہٗ رکن شوریٰ کے ساتھ پیش آیا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب مولانا اسعد صاحب نے خود کو نائب امیر الہند قرار دے لیا۔ اپنی امارت کے شرعی جواز اور بیعت کے لیے وجہ جواز تلاش کرنے کے لیے ایک استفتا مرتب کرایا اور اساتذہ دارالعلوم سے جواب لکھوا کر ہندوستان بھر میں تصدیق کے لیے بھیجا گیا تھا؛ مگر مولانا عبدالحلیم صاحب کے مفتیٔ مدرسہ اور اساتذہ نے ان کی امارتِ شرعیہ کے متعلق مختلف علماء اور فقہاء کی طرح فقہی بحثیں شروع کر دیں پھر مولانا جونپوری مدظلہٗ کے مدرسہ ریاض العلوم گورینی سے شائع ہونے والے مجلہ ''ریاض الجنۃ'' میں بھی امارتِ شرعیہ کے خلاف وہ فقہی بحثیں شائع ہو گئیں۔ مولانا اسعد صاحب بھلا یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے۔ وہ ایک اجلاسِ شوریٰ کے موقع پر مجلہ ہاتھ میں لیے ہوئے نہایت برافروختگی کی حالت میں مولانا عبدالحلیم صاحب کے کمرہ میں پہنچے اور کہا کہ ''مولانا! یہ آپ کے رسالہ میں کیا شائع ہو رہا ہے؟'' مولانا عبدالحلیم صاحب نے فرمایا کہ ''ایسے ہی، بچے کچھ لکھ لیتے ہیں''۔ مولانا اسعد صاحب نے آنکھیں نکال کر فرمایا ''میں بچے اور بڑے کچھ نہیں جانتا، آپ کے مجلہ کا ابھی رجسٹریشن بھی نہیں ہوا ہے۔ آپ پر

مقدمہ بھی چل سکتا ہے''۔مولانا عبدالحلیم صاحب کو یہ الفاظ سن کر سخت صدمہ پہنچا۔اس کے بعد وہ آج تک ہزار کوششوں کے باوجود شوریٰ کے کسی اجلاس میں شریک نہیں ہوئے۔مولانا اسعد صاحب کے''اخلاقِ عالیہ'' یا خالص ڈکٹیٹرانہ مزاج کا یہ صرف ایک نمونہ ہے جو صرف جواباً عرض ہے، اقداماً نہیں۔جس وقت سے مولانا اسعد صاحب شوریٰ کے ممبر ہوئے ہیں، سینئر اور مقتدر ممبران نے شوریٰ کے اجلاس میں شریک ہونا تقریباً چھوڑ دیا ہے۔اور بمشکل ہی کورم پورا ہوتا ہے۔مجلسِ عاملہ جس کے جلسے سال میں دستوری طور پر چار ہونے چاہئیں، اکثر کورم پورا نہ ہونے کی بنا پر منعقد ہی نہیں ہوتے۔یہ صرف حضرت ہی کی برکت ہے۔

اگر مولانا اسعد صاحب واقعتاً دارالعلوم کی باتیں دارالعلوم سے باہر نہیں پہنچانا چاہتے تھے اور ان کو مفادِ دارالعلوم عزیز تھا، جیسا کہ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا ہے، تو مجھ کو دارالعلوم سے علٰیحدہ کرنے کے بجائے باہمی میل جول کی بھی راہ نکالی جاسکتی تھی۔کسی کو قتل کر کے یہ سوچنا کہ اس قتل کی خبر کہیں نہ جائے، خام خیالی نہیں تو اور کیا ہے۔حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب (مرحوم) کے خلاف میں نے جو باغیانہ روش اختیار کی تھی کیا وہ اُس وقت کے لحاظ سے مفاد دارالعلوم کے خلاف نہ تھی؟ لیکن اس عظیم انسان نے اپنے تمام ہمنواؤں کے اصرار کے باوجود میری برخواستگی کے مطالبہ پر صاف کہہ دیا تھا کہ''وہ ہمارے کتنے ہی بڑے مخالف ہوں، لیکن پڑھانے میں تو اچھے ہیں اور دارالعلوم کا کام تو اچھا کرتے ہیں۔اس لیے میں ان کو برخواست نہیں کروں گا''۔موجودہ مہتمم صاحب کے لیے سابق مہتمم قدس سرہٗ کی یہ مثال ایک عبرت ہے۔

مولانا اسعد صاحب نے اپنی تمام مذمتوں، الزام تراشیوں اور کذب بیانیوں کے ساتھ ساتھ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ مجھ سے اپنے تعلق کا بھی اظہار کیا ہے۔ان کو اپنے والد مرحوم کی سوانح پڑھنی چاہیئے اور اس سے یہ سیکھنا چاہیئے کہ تعلق کسے کہتے ہیں۔مولانا کی یہ منافقانہ روش تمام علماء کے لیے باعثِ رسوائی ہے۔مجھے نہ میرے اسلاف واکابر نے اس کی تعلیم دی ہے اور نہ میرے والدین نے۔میں صاف اعلان کرتا ہوں کہ میرا ایسے شخص سے جس کے قول وعمل میں تضاد اور جس کی ہر ہر نقل وحرکت میں فساد ہو، کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں، ان کا عید پر ملنے کے لیے آنا اور تعزیت کے لیے آنا اور پھر اس کا پروپیگنڈہ کرنا محض دکھاوا اور پبلسٹی کا ایک ذریعہ ہے۔کاش ان کو معلوم ہوتا کہ ایسی تعزیت پر کوئی ثواب نہیں ملتا، جس کا مقصد ریاکاری اور پروپیگنڈہ ہو۔کیا کوئی شخص میرے ساتھ مولانا اسعد صاحب کے موجودہ طرزِ عمل اور میرے خلاف ان کی بہتان طرازیوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہہ سکتا ہے کہ ان کو مجھ سے کوئی تعلق ہے۔یہ صرف ایک فریب اور جھوٹ ہے اور اس تکلف بارد کی قطعاً ضرورت نہیں۔

مولانا اسعد صاحب نے اپنی تقریر میں دھمکی کے انداز میں کہا ہے کہ''اگر اختلافی باتوں کا پریس اور اخباروں میں آنا ہی مقدر ہے تو پھر آئے گا اور بہت کچھ آئے گا''۔میں ان کی دھمکی کا استقبال کرتا ہوں۔میرے پاس بفضلہٖ تعالیٰ

ان کی ہر بات ہر انداز اور ہر الزام کا جواب موجود ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہی بہانہ بن جائے ان کے اعمال کے تمام ریکارڈ کے عوام کے سامنے آنے کا اور ان کے قد اور ان کی شخصیت کو سمجھنے کا۔ ویسے پہلے ہی ملک کا دیندار طبقہ ہو، اہلِ علم ہوں، خواص ہوں یا عوام، انھیں کتنا بھروسہ رہ گیا ہے مولانا موصوف کی سچائی پر؟ اور چونکہ میرا ضمیر مطمئن ہے اس لیے مجھے نہ کسی کا ڈر ہے اور نہ اس دھمکی کی پروا۔ باب الاخلاقیات اور باب المالیات بہت وسیع ہیں، اگر یہ کھل گئے تو اس کے بہت دُوررَس اثرات ہوں گے۔ اور اس کے مضر نتائج کی ذمہ داری مولانا اسعد صاحب پر ہوگی۔

(ترجمان دارالعلوم مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر)

.....❖.....

قارئین دیکھا آپ نے؟ ''دارالعلوم کی جامع و مختصر تاریخ'' لکھنے والے فاضل مرتب صاحب جس مدنی خاندان کی چاپلوسی میں گرفتار ہیں اُس کے سربراہ کا کردار اور کارکردگی کس قدر ظالمانہ اور سفاکانہ حیثیت رکھتی ہے۔

اس کے علاوہ گزشتہ صفحات میں ہم نے مولوی اسعد مدنی صاحب کو منتقم مزاج لکھا ہے۔ اور بات فقط مولوی اسعد صاحب تک ہی محدود نہیں؛ بلکہ اس خاندان کے اکثر افراد اسی مزاج و خصلت کے مالک ہیں۔ ایک دلیل تو ہم وہاں تحریر کر آئے ہیں۔ اب ایک اور مضبوط دلیل یہاں پیش کرتے ہیں۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی صاحب نے تدریسی خدمات سے سبکدوشی کا فیصلہ موصول ہونے کے بعد مجلسِ شوریٰ کے نام ایک خط لکھا تھا۔ وہ خط ہم آگے نقل کریں گے۔ آپ اس خط کو پڑھیے گا اور دیکھیے گا مولانا اسعد مدنی کس شخصیت کا نام ہے۔ خط کے چھٹے پیرا گراف میں مولانا وحید الزماں صاحب تحریر فرماتے ہیں: ''میرے خلاف کارروائی کرانے میں ان کی سازش اور ان کے منتقمانہ مزاج و جذبے نے بنیادی کردار ادا کیا ہے''

قارئین! کتاب کی ابتدا سے ہم اپنے ایک ایک قول اور تحریر کیے گئے ہر ایک جملے کی تصدیق کے لیے دلیل پیش کرتے آرہے ہیں۔ فقط اسی لیے کہ سچی باتوں پر بھی یقین کرنے کے لیے دلیل مانگنے والے بدگمان لوگ یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہم نے پوری کتاب میں جو بھی لکھا ہے وہ سب سچ ہے۔

اللہ رب العزت کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اُس خالق و مالک نے ہمیں ایک ایسی ماں کے بطن سے پیدا کیا ہے جس کی تربیت نے ہمیں ایسا کردار عطا کیا جو جھوٹ، فریب اور خودنمائی سے بالکل پرہیز کیے ہوئے ہے۔ حق تعالیٰ میری والدہ کو صحت و عافیت کے ساتھ سلامت رکھے کہ یہ ان ہی کی پرورش کا اثر ہے جو ہماری زبان اور قلم سے جھوٹ نکلتا ہی نہیں ہے۔

.....❖.....

بات طویل ہوگئی۔مگر اب بھی ایسا لگ رہا ہے کہ بہت کچھ بتانا باقی ہے۔ دراصل دارالعلوم دیوبند کا موجودہ دَور جسے ۱۹۸۰ سے تاحال بتایا گیا ہے وہ دَورِ دارالعلوم کی تاریخ کا سب سے بدترین دَور ہے، جس میں دارالعلوم کی عظمت اور اہمیت مکمل طور پر اپنا وقار کھو چکی ہے۔ بلاشبہ ہمارا جملہ ذرا سخت ہے؛ مگر صحیح ہے۔اب اس جملہ کی حقانیت کے لیے بھی ہم دلیل پیش کر دیتے ہیں۔بے فکر رہیے ہمارے قلم سے نکلنے والا ہر جملہ عقیدت کی سیاہی سے نہیں؛ بلکہ حق و دیانت کی روشنائی سے لکھا جاتا ہے۔لیجیے! درج بالا قول کی دلیل یہ ہے کہ:

۲۲/مارچ ۲۰۱۷ بروز بدھ جامعہ امام انور دیوبند کے انور ہال میں مولانا ندیم الواجدی صاحب کی ترتیب شدہ کتاب ''بے مثال شخصیت و باکمال استاذ'' کا اجرا تھا، اسی پروگرام میں یاسر ندیم الواجدی صاحب نے تقریر کرتے ہوئے مجمع کو بتایا تھا کہ: طلاق وحلالہ اور مسلم پرسنل لا کے موضوع پر میڈیا میں چل رہے غلط پروپیگنڈے کے تحت میں نے NDTV کے روِش کمار سے ای میل کے ذریعہ بات کی اور انہیں یہ کہہ کر دیوبند آنے کی دعوت دی کہ آپ دیوبند تشریف لائیں، دارالعلوم کے علماء سے ملیں، ان سے بات کریں اور دیکھیں دارالعلوم ایک خالص تعلیمی ادارہ ہے، وہاں کوئی سیاسی سرگرمی نہیں چلتی۔آپ آئیں گے تو آپ کو بہت سے سوالوں کا جواب مل جائے گا۔اس پر روِش کمار نے ایک تلخ؛ مگر حقیقت پر مبنی جواب عنایت کیا۔روِش کمار نے اپنے جوابی میل میں کہا: ''دارالعلوم اب پہلے والا دارالعلوم نہیں ہے۔وہ اپنی عظمت اور قدر کھو چکا ہے اور ہم لوگ کھنڈروں میں آواز لگانے کے عادی نہیں ہیں''۔

روِش کمار کا یہ جواب بالکل حق بہ جانب ہے۔جس ادارے میں حق بات کہنے والے مفقود ہو جائیں اور چاپلوسی و مردہ ضمیری کی روش عام ہو تو اس ادارے کا زوال یقینی ہے؛ کیونکہ دینی ادارے ایمانداری، اخلاص اور ہمیشہ سچ بولنے والے باضمیر اشخاص کی شمولیت سے فلاح پاتے ہیں۔اور یہاں تو عالم یہ ہے کہ ملازمت میں بھی شامل اسی شخص کو کیا جاتا ہے جو سر جھکا کر بس نوکری کرتا رہے۔سچ بات کہنے یا حق کی صدا بلند کرنے کی جرأت تو کجا کوشش بھی نہ کرے۔

درج بالا قول کو ثابت کرنے کے لیے بے شمار دلیلیں ہیں۔ہم یہاں سب کو پیش کریں گے تو ایک کتاب بن جائے گی۔بس دو باتیں دلیل کے طور پر درج کیے دیتے ہیں۔

اوّل یہ کہ قاری ابوالحسن اعظمی نے جب استعفیٰ دیا تو اپنے استعفیٰ میں چند باتوں پر توجہ اور تحقیق کرنے کی اہتمام سے گزارش کی گئی اور اپنے اوپر لگائے گئے الزام کی حقیقت سے روشناس کرایا؛ لیکن دارالعلوم کے جدید مہتمم صاحب نے نہ تو ان کے الزامات کی صفائی پر غور کیا اور نہ ہی ان کی طرف سے کہی باتوں کی تحقیق کرائی گئی، جو کہ

لازمی برحق تھیں؛ کیونکہ مقصد ایک چاپلوسی نہ کرنے والے حق گو کو دارالعلوم سے باہر کرنا تھا۔ اس کا احساس ہی ان نااہل حضرات کو نہیں کہ ان جیسا استاذ دارالعلوم کو میسر کہاں سے کریں گے؟

دوسری دلیل یہ ہے کہ چھتہ مسجد اور مسجد رشید دونوں ہی دارالعلوم کی مسجدیں شمار کی جاتی ہیں۔ مسجد رشید تو تعمیر ہی دارالعلوم کے پیسوں سے ہوئی ہے۔ دارالعلوم کے ماتحت ان دونوں مساجد میں رمضان کا مہینہ آتے ہی مولوی اسعد مدنی کے گھرانے کی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ چھتہ مسجد کو ارشد مدنی صاحب گھیر لیتے ہیں اور مسجد رشید میں محمود مدنی صاحب کا جلوہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور خاص دارالعلوم کی جڑ میں پھر جو دین کا مذاق اُڑایا جاتا ہے، اُس کو روکنے کی ہمت کسی میں نہیں۔

پورے مہینہ کو آپ یٹو اعتکاف کا مینا بازار دونوں مساجد میں لگتا ہے۔ نوافل کی مکروہ جماعت کی جاتی ہے، حالانکہ جس حنفی مسلک کا دارالعلوم ترجمان ہے اُسی حنفی مسلک میں رمضان کے اندر نوافل کی جماعت قطعاً مکروہ ہے؛ لیکن یہاں اب دین کی بقا و حفاظت نہیں ہوتی؛ بلکہ اُس کا مذاق بنا دیا گیا ہے۔ تراویح کے وقت دونوں مساجد میں لائٹ بند کر کے ایسا گھپ اندھیرا کر دیا جاتا ہے کہ نماز کے مکروہ ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔ مسجدیں پُرنور اور پُر رونق لگنے کے بجائے اندھیر نگری معلوم ہوتی ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے؛ لیکن دارالعلوم کے مہتمم میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ ان سب تماشوں کو بند کرا سکیں؛ کیونکہ یہاں اب لوگ خدا سے نہیں؛ بلکہ مدنی خاندان سے ڈرتے ہیں۔ جو بھی زبان کھولے گا وہ انتقام کے لیے تیار رہے۔

اسی لیے روِش کمار نے کہا تھا کہ ہم کھنڈروں میں آواز لگانے کے عادی نہیں۔ حقیقت یہی ہے جو دارالعلوم خود اپنے یہاں ہونے والے دین کے بگاڑ کو نہیں روک سکتا وہ ملک میں چل رہے مسلم پرسنل لا کے خلاف معاملات کو کس طرح دُور کر سکے گا۔

قارئین! یاد رکھئے۔ دارالعلوم ہندوستانی مسلمانوں کی طاقت ہے، ان کا حوصلہ ہے اور اس کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے ایک باحوصلہ، حق گو، دیانت دار، پُرعزم اور باہمت انسان ہی کو مسند اہتمام پر بیٹھنے کا حق ہے۔ مولانا ابوالقاسم یا اس طرح کے دیگر چاپلوس اور غیر صلاحیت مند لوگ دارالعلوم کے مہتمم بننے کے لیے قطعاً موزوں نہیں ہیں۔

ایک بات ہمیشہ یاد رکھئے گا: ''بڑی طاقت کے ساتھ ساتھ بڑی ذمہ داری بھی آتی ہے'' اور جو لوگ ذمہ داری نہیں اُٹھا پاتے جیسے کہ اُٹھانی چاہیے، تو پھر بربادی یقینی ہے، جو کہ ہو رہی ہے۔ آج ہندوستان کا مسلمان اتنی کثیر تعداد میں ہوتے ہوئے بھی اپنے مسلم پرسنل لا کو بچانے میں مکمل طور پر ناکام ہے۔ ابھی دیکھنا وہ تمام قانون جو ہندو بنانے کا اعلان کر رہے ہیں وہ سب بنیں گے۔ اور مسلمان کچھ نہیں کر سکے گا۔ دیکھ لیجیے! مسجدوں سے اسپیکر اُتر گئے۔ تین طلاق ختم کر دی گئی۔ لواطت کو قانونی رضامندی مل گئی۔ مسجدوں کو نماز کے لیے غیر ضروری بتا دیا گیا۔

جلد ہی تعددِ ازدواج اور دو سے زیادہ بچے پیدا کرنے پر بھی پابندی لگ جائے گی اور دارالعلوم کی طرف سے کوئی اثر دار آواز نہیں اُٹھے گی۔

آواز میں اثر ان کی ہوتا ہے جو حق بات کے لیے اپنا منہ کھولتے ہیں، جو خدا کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے، جو مسند چلے جانے کے خوف سے چاپلوسی نہیں کرتے۔ جن میں حق کا ساتھ دینے کی جرأت ہوتی ہے۔ قارئین! یہ بھی یاد رکھیے گا: چاپلوسی، بے ضمیر، خوشامد پسند اور جی حضوری کرنے والے شخصیت پرست لوگوں کی آواز بلند نہیں ہوتی، بااثر نہیں ہوتی، بارعب نہیں ہوتی۔

.....❖.....

دارالعلوم کی جدید تاریخ لکھنے والے فاضل مرتب صاحب نے صفحہ ۹۹ پر پہلی سطر میں لکھا ہے کہ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کو مجلسِ شوریٰ نے مددگار مہتمم بنایا۔ اس کے بعد سطر نمبر ۶ میں درج ہے کہ اہتمام اور مجلسِ شوریٰ کے درمیان اختلافات رونما ہوئے۔ سطر نمبر ۸-۹ میں لکھا ہے کہ شوریٰ کی طرف سے طلبہ کو دارالعلوم کے قریب کیمپ میں قیام کرایا گیا۔

یہاں جس شوریٰ کا بار بار ذکر کیا گیا ہے حقیقت میں اُس وقت وہ شوریٰ دارالعلوم کی قدیم شوریٰ کی طرح ایماندار اور حق گو لوگوں کی مجلس نہیں تھی؛ بلکہ اس زمانے کی شوریٰ پر مولوی اسعد مدنی صاحب کا قبضہ تھا۔ مولانا منظور نعمانی ہوں، مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوری ہوں یا تبلیغی جماعت کے سرکردہ پیر طریقت شیخ ہوں یا دیگر ممبرانِ شوریٰ، سبھی کے قلوب و اذہان مولوی اسعد صاحب کی گرفت میں تھے۔ فیصلے مولوی اسعد صاحب کے چل رہے تھے، شوریٰ کے نہیں۔ اس کی تفصیل آپ مولانا وحید الزماں صاحب کی تحریر میں پیچھے پڑھ ہی آئے ہیں۔

ہمارا مقصد یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ ۱۹۸۰ کے بعد جو دارالعلوم کے حالات ہوئے اور مولوی اسعد مدنی صاحب نے جو جو حرکتیں کی ہیں اس کا ذکر فاضل مرتب نے کتاب میں ایک مرتبہ بھی نہیں کیا۔ کیا اسی طرح تاریخ مرتب کی جاتی ہے؟ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی یزید کی تاریخ لکھے اور اس میں واقعۂ کربلا کا سرے سے ذکر ہی نہ کرے۔ قارئین! آپ خود بتائیے مولانا وحید الزماں صاحب کی تحریر پڑھنے کے بعد کیا ایسا نہیں لگتا کہ یہ تمام واقعات جو ۱۹۸۰ سے ۱۹۹۰ تک کے ہیں ان کا ذکر تو کتاب میں کہیں ہے ہی نہیں۔ فاضل مرتب شخصیت پرستی اور چاپلوسی کی روِش میں اس طرح تاریخ لکھ گئے ہیں کہ دارالعلوم کے دشمنوں کا ذکر ہی کتاب سے خارج کر کے اُلٹا اُنھیں ہیرو بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

....

۱۲۰واں سال کے تحت فاضل مرتب نے جو عبارت لکھی ہے اس کو پڑھنے کے بعد ہمارا دل کانپ گیا، ہم لرز اُٹھے۔ خدایا! رحم۔ کوئی اتنا بھی بے ضمیر کیسے ہوسکتا ہے، آخر علمِ دین حاصل کرنے کے بعد دینی ادارے ہی میں ملازمت کرنے والے لوگ ایمان سے اس قدر خالی کیسے ہوسکتے ہیں۔ کیا ان کو خدا کا بالکل خوف نہیں رہا۔ کیا یہ قطعاً بھول گئے کہ ہمیں مرنا ہے اور اپنے ہر قول و فعل کا حساب دینا ہوگا۔ بلاشبہ جن عالموں سے دوزخ کی ابتدا کی جائے گی وہ یہی بے ضمیر لوگ ہوں گے جو آخرت کو بالکلیہ طور پر بھلائے بیٹھے ہیں۔

الزام لگانا کتنا سخت گناہ ہے یہ ہر خاص و عام جانتا ہے۔ اور جب کوئی خطاوار نہ ہو تو اُس بے قصور پہ بے بنیاد الزام عائد کرنے کا انجام تو یقیناً سخت تر ہی ہوگا۔ فاضل مرتب جناب محمد اللہ صاحب نے حکیم الاسلام قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ جیسی مزکی شخصیت پر جو الزام اپنی عبارت میں تحریر کیا ہے وہ بلاشبہ غلط ہے، جھوٹ ہے۔

فاضل مرتب لکھتے ہیں:

> ”مجلسِ شوریٰ نے حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کو غیر آئینی اقدامات کی وجہ سے مہتمم کے عہدے سے معطل کر دیا“

جن کاوشوں کو فاضل مرتب نے غیر آئینی اقدامات کے بے بنیاد الزام سے تعبیر کیا ہے کیا وہ جانتے ہیں کہ قاری صاحب نے اُس وقت کے سنگین حالات میں کیا کیا تھا۔

ہمیں تو حیرت اِسی بات پر ہے کہ جس عظیم المرتبت شخصیت کے بارے میں کبھی کوئی ایک لفظ بھی مخالفت کا نہ کہہ سکا۔ جس کی صداقت اور اعلیٰ ظرفی کے قائل اس کے مخالف بھی رہے۔ جس کی ایمانداری، تزکیۂ نفس اور تعمیری صلاحیتوں سے ایک جہاں آشنا ہے اس عظیم شخص کے بارے میں یہ لکھنا کہ اس نے غیر آئینی اقدامات کیے، کس قدر بے بنیاد الزام اور سنگین بہتان تراشی ہے۔ کیا فاضل مرتب صاحب نے یہ سمجھ لیا ہے کہ آخرت میں اِن کے پیر مولوی اسعد مدنی صاحب اِن کو عذاب سے بچانے آجائیں گے۔ مولوی محمد اللہ صاحب! اب بھی وقت ہے ابھی آپ زندہ ہیں، اپنی اس غلطی کی معافی اللہ پاک سے مانگ لیجیے، توبہ کر لیجیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ الزام تراشی کا گناہ آپ کے تمام اعمالِ صالحہ کو کھا جائے اور آپ آخرت میں بے یار و مددگار کھڑے رہیں۔

قارئین! آئیے ہم اس قول کی صداقت پیش کرتے ہیں۔ ہوا یوں تھا کہ جب حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ نے یہ دیکھ لیا کہ شوریٰ اب وہ شوریٰ نہیں رہی جس کی رائے اجتماعی ہوا کرتی تھی؛ بلکہ اب شوریٰ فقط ایک شخص کے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلی کی حیثیت اختیار کرگئی ہے، تو آپ نے چند معتبر علماء کرام کے ساتھ مل کے ایک ایڈہاک کمیٹی بنائی، اور اس کو شوریٰ کی طرح اپنی رائے دینے کا مجاز بنایا۔ یہ جو ہم نے شوریٰ کو ایک شخص کا غلام بتایا ہے یہ کوئی بے جا الزام نہیں ہے، آپ نے مولانا وحید الزماں صاحب کا مضمون پڑھ ہی لیا ہے۔ ان کے علاوہ ہم

یہاں دارالعلوم کے ہی ایک فاضل اور معتمد شخص کے مضمون سے چند سطریں بطورِ دلیل پیش کرتے ہیں جس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ شوریٰ کے ممبران پہ ہم نے اپنی دانست سے کوئی الزام نہیں لگایا؛ بلکہ اُس وقت کے زیادہ تر افراد مولوی اسعد مدنی صاحب کے آگے سرنگوں تھے۔ ترجمانِ دارالعلوم کے وحیدالزماں کیرانوی نمبر میں مولانا افضال الحق قاسمی صاحب صفحہ ۳۸۳ پر تحریر فرماتے ہیں:

''مجلسِ شوریٰ میں اکابر کی جگہ ایسے اصاغر بھر لیے گئے جو مولانا اسعد صاحب کی منشا پوری کرنا اپنی سعادت نہیں؛ بلکہ عبادت سمجھتے ہیں، لہٰذا وہ جس کی پگڑی چاہیں گے اُچھال دی جائے گی''۔

مولانا افضال الحق صاحب کا یہ قول ہے تو ۱۹۸۵ء کا، جس وقت مجلسِ شوریٰ مکمل طور پر مولوی اسعد مدنی صاحب کی چاپلوسی پر مبنی تھی؛ لیکن ۱۹۸۱ء کے دَور کی شوریٰ کے بھی زیادہ تر ممبران مولوی اسعد صاحب کے اشاروں پر سرِ تسلیم ختم کرنے والے ہی تھے۔

حضرت حکیم الاسلام نے جب بھی شوریٰ بلائی تو صرف چار پانچ ممبران کے علاوہ کوئی نہیں آتا تھا۔ یہی چار پانچ ممبران بکنے والے ضمیر کے مالک نہیں تھے، جن میں حضرت شاہ ابرارالحق صاحب، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب، مولانا سعید احمد اکبرآبادی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اکثر ممبران مولوی اسعد مدنی کو اپنا آقا تسلیم کر چکے تھے۔

مولوی اسعد مدنی صاحب کی ریشہ دوانیاں زور پکڑتی رہیں اور دارالعلوم میں ہنگامہ آرائیاں ہونے لگیں، حکیم الاسلام قاری طیب صاحب نے جب بھی شوریٰ بلا کر اس مسئلے پر بات کرنا چاہی تو شوریٰ کے زیادہ تر ممبران غیر حاضر رہے۔ اس لیے شوریٰ ہو ہی نہیں پاتی تھی۔ سال ڈیڑھ سال تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ مولوی اسعد مدنی صاحب نے شوریٰ کے ہر ممبر کو اس کے قد کے حساب بے منصب و دولت عطا کر کے اپنے حکم کا تابع بنالیا۔ اس کے بعد حکیم الاسلام نے مجبور ہو کر ایڈہاک کمیٹی بنائی جس میں دیوبند کے معتبر اشخاص کے علاوہ ممبئی و دہلی کے قابل فہم اور صائب الرائے لوگوں کو شامل کیا گیا تھا۔ جب شوریٰ فقط ایک شخص کی اسارت میں آ کر اپنا وقار کھو چکی تھی تو حکیم الاسلام ایسا نہ کرتے تو اور کیا کرتے۔ یہ اقدام غیر آئینی نہیں تھا؛ بلکہ دفاعی تھا۔ اور دارالعلوم کی بقا کے لیے ضروری تھا۔

فاضل مرتب صاحب کو حقیقت جانے بغیر اُس دَور میں شائع ہوئی دارالعلوم کی جھوٹی رپورٹوں کو پڑھ کر ان کے حوالے سے یہ بے بنیاد بات تحریر نہیں کرنی چاہئے تھی۔ جب تاریخ لکھنے کا عظیم اور اہم کام کر رہے تھے تو تحقیق بھی ایمانداری سے کرتے۔ اُس وقت کے چشم دید گواہوں سے ملتے، ان سے صحیح حالات دریافت کرتے، پھر جو حقیقت تھی اسے تحریر کرتے؛ لیکن ان سب کے لیے محنت لگتی ہے، وقت لگتا ہے، تگ و دو کرنی پڑتی ہے اور محنت سے تو آج کل کے قلم کار کوسوں دور ہیں۔

کوئی ہم سے پوچھے کہ یہ جائزہ لکھنے میں ہمیں کتنی محنت کرنی پڑ رہی ہے۔کہاں کہاں سے دلائل تلاش کر کے تحریر کرنے پڑ رہے ہیں۔سچ آسانی سے نہیں ملتا،اس کو بڑی مشقت سے خزانے کی طرح ڈھونڈ کر نکالنا پڑتا ہے۔ جیسے کہ ہم نے گزشتہ صفحات میں پیش کیا ہے۔ایک ایک جملہ ایک ایک سطر بغیر کسی چاپلوسی کے مدلل حوالوں کے ساتھ درج کر کے دلالت و دیانت کا حق ادا کر رہے ہیں۔

....

لیجیے ایک حوالہ اور ملاحظہ فرمالیجیے۔گزشتہ صفحات میں ہم نے کہیں لکھا ہے کہ دارالعلوم میں ایک زمانہ وہ بھی تھا جب دربان سے لے کر شیخ الحدیث تک سب صاحبِ نسبت ہوا کرتے تھے۔اللہ رب العزت کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے۔ہماری بات کی تصدیق کے لیے دلائل خود نظروں کے سامنے آرہے ہیں۔ بلاشبہ اس جائزے کو تحریر کرنے میں اللہ رب العزت کی مرضی شامل ہے۔وہ ربِ کریم بھی چاہتا ہے کہ حق لوگوں کے سامنے آئے۔ حقائق سب پر ظاہر ہوں،اسی لیے تو ہمیں خود بہ خود دارالعلوم کی تاریخ سے متعلق معتبر و مستند مواد فراہم ہو رہا ہے۔وہ بھی بغیر کسی شخص کے بتائے۔ بنا کسی کی مدد کے،یہ خالص اللہ کی مدد نہیں تو اور کیا ہے۔ہم نے کبھی ترجمانِ دارالعلوم کا نام تک نہیں سنا تھا؛لیکن اچانک ایک جگہ موبائل میں اس کتاب کا فوٹو نظر آیا ہم نے تلاش کیا تو کہیں نہیں ملا۔پھر کئی روز بعد خود ایک صاحب نے لا کر دے دیا۔ہمیں گمان بھی نہیں تھا کہ ناپید و نایاب کتاب اس طرح خود چل کر ہمارے پاس آجائے گی۔اور قارئین آپ نے دیکھ ہی لیا مولانا وحید الزماں صاحب کا کس قدر زبردست مضمون ہمیں اس کتاب سے حاصل ہوا ہے۔مولوی اسعد مدنی صاحب کی ریشہ دوانیوں کا ذکر اتنی تفصیل سے کسی اور کتاب میں نہیں مل سکتا۔علاوہ ماہنامہ تجلی کے؛ کیونکہ مولانا عامر عثمانی سے بڑا بے باک،حق گو،حق پسند اور ایماندار قلم کار دارالعلوم کی دنیا میں تو دوسرا کوئی نہیں گزرا۔

بے شک اس وقت دل یہی چاہ رہا ہے کہ ہم اپنے رب کے حضور سجدۂ شکر ادا کریں اور کبھی پھر سجدے سے سر نہ اٹھائیں۔ ؎

بس اتنی اجازت دے سجدہ میں جبیں رکھ دوں
پھر سر نہ اُٹھے میرا یہ جاں بھی وہیں رکھ دوں

بلاشبہ اُسی ربِ کریم کے فضل سے یہ تبصرہ نما جائزہ لکھنے کی توفیق نصیب ہو رہی ہے۔قارئین! آپ اس ربِ کریم کا عظیم سے عظیم تر فضل دیکھیں کہ ہماری ایک بات بھی بلا دلیل یا بلا حوالہ نہ ہو اس لیے وہ آقاء جن و انس ہماری کس کس طرح مدد فرما رہا ہے۔ہم نے جو''دربان سے شیخ الحدیث تک......''والی بات لکھی ہے وہ اپنی یادداشت کے بھروسے پر لکھی تھی۔ بات تو صحیح تھی؛مگر ہمیں یہ یاد نہیں تھا کہ کہاں پڑھی ہے۔اب ہم آج جب اپنی اسی کتاب

کے سلسلے میں مزید تحقیق کے لیے لائبریری میں ورق گردانی کر رہے تھے تو ہمیں اپنے اس قول کا حوالہ مل گیا۔ لیجیے لفظ بہ لفظ حوالہ تحریر کرتے ہیں۔

صاحب معارف القرآن مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ''دارالعلوم دیوبند اور اس کا مزاج و مذاق'' عنوان کے تحت پاکستان سے شائع شدہ الرشید کے دارالعلوم نمبر میں صفحہ ۱۴۵ پر لکھتے ہیں: میرے والد ماجد حضرت مولانا یٰسین صاحب دارالعلوم کے قرونِ اوّل کے طلبہ میں سے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے دارالعلوم کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب اس کے چپراسی سے لے کر صدر مدرس اور مہتمم تک ہر شخص صاحب نسبت اور ولیٔ کامل تھا''۔

ہمیں چپراسی و صدر المدرس کی جگہ دربان و شیخ الحدیث کے لفظ یاد رہے تھے؛ لیکن اس سے مطالب و معنی پر کوئی فرق نہیں پڑتا؛ کیونکہ دونوں الفاظ کے معنیٰ ایک ہی ہیں۔

....

تحدیثِ نعمت کے طور پر لکھی گئیں ان سطور کے بعد آئیے آگے بڑھتے ہیں:

دارالعلوم دیوبند کی جامع و مختصر تاریخ'' صفحہ نمبر ۱۰۰ سطر نمبر تین میں بہ حیثیت استاذ مولانا ارشد مدنی صاحب کے تقرر کا ذکر ہے، اسے پڑھ کر اچانک مولوی اسعد مدنی صاحب کی تقریر کا وہ جملہ یاد آگیا: ''جس میں فرمایا تھا منصب گوشت ہے خنزیر کا'' مولوی اسعد مدنی صاحب نے کہا تھا کہ: میرے گھر کا کوئی فرد، میرا بھائی، بھتیجہ، اگر دارالعلوم میں ملازم ہوا تو وہ ایسا ہے جیسے خنزیر کا گوشت کھایا ہو۔

اسی صفحہ پر اس سے پہلے والی سطر میں حضرت قاری طیب صاحب کے استعفے کو قبول کرنے کا ذکر ہے؛ لیکن اِس بات کی ذرا سی بھی تفصیل نہیں لکھی کہ استعفیٰ دیا کیوں تھا۔ وہ کیسے حالات تھے، جن میں ایک پچاس سال پرانے مہتمم کو استعفیٰ دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ ایک ایسے مہتمم کو جس کے باپ دادا نے دارالعلوم کو اپنے خون سے سینچا تھا۔ خود جس نے اپنے دَورِ اہتمام میں دارالعلوم کو بلاخیز ترقیات سے نوازا، اُسے کیوں اس ادارے سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔

اسی صفحہ پر ۱۲۲ ر رواں سال کے تحت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے انتقال کی خبر دی گئی ہے۔ قارئین! اب ہم کیا کہیں۔ واقعی حد ہوگئی تعصب اور چاپلوسی کی۔ کوئی کہاں تک نظر انداز کرے؟ اب آپ خود دیکھئے: حضرت مفتی صاحب کے انتقال کی خبر کے طور پر یہ جملہ لکھا ہے: ''مجلسِ شوریٰ کے سابق رکن مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کا انتقال ہوا''۔

نہ حضرت نہ مولانا نہ ہی رحمۃ اللہ علیہ نہ ہی صاحب کچھ بھی ادب ولحاظ کا اظہار نہیں ہے۔ یہ تعصب نہیں تو اور کیا ہے؟ اسے بے ادبی نہیں تو اور کیا کہیں گے۔ وہ عظیم شخصیت جسے دنیا مفکر ملت کے نام سے جانتی ہے وہ عالی مرتبت

انسان جس کی علمی وملی خدمات سے ایک جہاں آشنا ہے، وہ صائب الرائے اور صاحب فہم مفتی اعظم جس کے ایک فتوے نے ملک کی آزادی کے وقت انگریزوں کو ہوش باختہ کر دیا تھا۔ اور دارالعلوم دیوبند کا وہ مایۂ ناز فرزند کہ جس کے خاندان کے بے شمار احسانات برصغیر کے مسلمانوں پر ہیں۔ وہ منتظم و باصلاحیت شخص کہ جس نے ندوۃ المصنفین قائم کرکے اُمتِ مسلمہ کو نہ یہ کہ صرف بہترین کتابیں عطا کی ہیں؛ بلکہ اچھے مصنفین سے بھی روشناس کرایا۔ اور جو جمعیۃ علماء ہند کا ورکنگ صدر بھی رہا ہے۔ وہ کہ جسے علامہ انور شاہ کشمیری اور فخر الہند مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کا قرب حاصل رہا ہو۔ ایسے جلیل القدر اور قابل رشک انسان کا تذکرہ اس بے رحمی ولاپرواہی سے کرنے کا مقصد ہم کیا سمجھیں؟

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ہمارے باپ نہیں تھے نہ ہمارے بھائی تھے؛ لیکن ان کا ذکر اس غیر مہذب انداز سے پڑھ کر بہت تکلیف ہوئی۔

فاضل مرتب محمد اللہ صاحب کی پیدائش ہمارے اندازے کے مطابق ۱۹۷۸ء کے قریب ہوگی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مفتی عتیق الرحمٰن کے انتقال کے وقت یہ ایک ۶/سال کے بچے تھے۔ یعنی موصوف نے مفتی صاحب کو کبھی دیکھا تو ہے ہی نہیں؛ لیکن دیکھا تو اُنہوں نے بہت سارے علماء واکابر کو نہیں تو کسی اور کا ذکر اس بے دردی وبے توجہی سے کیوں نہیں کیا۔

ہمارے معترض ہونے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ مفتی صاحب کے نام کے ساتھ حضرت اور مولانا کیوں نہیں لکھا۔ ہمیں اعتراض یہ ہے کہ ایمانداری اور متانت کا لحاظ رکھتے ہوئے سبھی کو ایک نظر سے کیوں نہیں دیکھا گیا۔ ایسا کیوں ہے کہ کسی کو تو بے جا القاب و آداب کے ساتھ بلاوجہ کے توصیفی جملے سے بھی نوازا گیا ہے۔ اور کسی کو حضرت لکھتے ہوئے بھی قلم چلانے میں تکلیف ہوئی۔ یا تو پوری کتاب میں سب کو بس نام کے ساتھ لکھا جاتا یا پھر مولانا فضل الرحمٰن اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کے ساتھ ایسا غیر مہذب طرز اختیار نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ان کے علاوہ فاضل مرتب نے کسی بھی شخص کا نام حضرت اور مولانا کے بغیر نہیں لکھا۔ کتاب کے اُس صفحہ کے سامنے جس پہ مفتی صاحب کے انتقال کا ذکر ہے صفحہ نمبر ۱۰۱ پہ مولانا عثمان صاحب کے انتقال کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ عبارت لکھی ہے: ''نائب مہتمم حضرت مولانا محمد عثمان دیوبندیؒ کا انتقال ہوا'' دیکھ لیجیے قارئین! حضرت بھی لکھ دیا اور مولانا بھی علاوہ ازیں رحمۃ اللہ علیہ کی علامت کے طور پر رح بھی بنا ہوا ہے۔ اور ان تینوں میں سے مفتی صاحب کے ساتھ کچھ بھی تحریر نہیں ہے۔ یہاں مقصد مولانا عثمان کی تضحیک قطعاً نہیں ہے وہ بھی دارالعلوم کے ایک قابل فرد تھے۔ ستم تو اسی صفحہ پر اگلی سطر میں ہوا ہے۔ جب مولوی اسعد مدنی صاحب کی شوریٰ میں شمولیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے: ''حضرت مولانا اسعد مدنیؒ مجلسِ شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے، آپ نے اپنی فعال اور بااثر شخصیت سے دارالعلوم کو بہت فائدہ پہنچایا''۔

کیا دوسرا جملہ اضافی، بے محل اور جھوٹ نہیں ہے؟ کیا اس عبارت ثانی میں چاپلوسی کا رنگ نہیں جھلک رہا ہے۔کیا شوریٰ میں شامل ہونے کی خبر دینے کے بعد اس جملے کو لکھنے کی کوئی ضرورت محسوس ہوتی ہے؟ کیا اگر یہ جملہ نہ لکھا جاتا تو شوریٰ میں شمولیت کی خبر غیر معتبر ہو جاتی؟

قارئین! یہی وہ چاپلوسی ہے جس کا ذکر ہم کتاب کی ابتدا سے کرتے آرہے ہیں۔محمد اللہ صاحب نے دارالعلوم کی تاریخ مرتب نہیں کی ہے؛ بلکہ عوام کو غلط معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی اور ظالم شخص کو ہیرو بنانے کی ناکام کوشش کی ہے۔مولوی اسعد مدنی صاحب کتنے فعال تھے اس کا ذکر آپ مولانا وحید الزماں صاحب کے مضمون میں پڑھ آئے ہیں۔رہی بات دارالعلوم کو فائدہ پہنچانے کی تو اس کی حقیقت سب کے سامنے ہے۔دارالعلوم کو فائدہ نہیں؛ بلکہ جتنا نقصان مولوی اسعد مدنی صاحب نے پہنچایا ہے اس کی مثال بھی نہیں ملتی۔ افریقہ کے سات لاکھ روپیے کی طرح نہ جانے کتنے روپیے اور ہیں جو لوگوں نے مولوی اسعد کو دارالعلوم کے لیے دیے تھے؛ لیکن وہ رقومات کبھی دارالعلوم کے خزانے میں جمع نہیں کی گئیں،کیا اسی کو فائدہ پہنچانا کہتے ہیں۔اگر پہلا جملہ ہی تحریر ہوتا کہ:''حضرت مولانا اسعد مدنی ؒ مجلسِ شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے'' تو کیا اس سے بات مکمل واضح نہیں ہو رہی ہے، بالکل ہو رہی ہے؛ لیکن اُس مزاج کا کیا کریں جو موجودہ دَور میں دارالعلوم کے ہر فرد کا ہوتا جا رہا ہے۔چاپلوسی، شخصیت پرستی اور جی حضوری۔

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کا بے دردی کے ساتھ ذکر کرنے والے جناب محمد اللہ صاحب آپ کا مطالعہ قلیل، فہم کمزور، ذہن تنگ، بصیرت کم، فکر اتنی کجی لیے ہوئے ہے تو کیوں تاریخ جیسے وسیع موضوع پر کام کرکے امت کے سامنے ایک بکواس اور غیر معتبر کتاب کی شکل میں اپنی چاپلوسی کا نمونہ پیش کیا ہے۔اس اہم کام کو کرنے سے پہلے آپ کو خوب مطالعہ کرنا چاہیے تھا۔دارالعلوم کی چند روداد یا رپورٹیں پڑھ کر تاریخ نہیں لکھی جا سکتی۔اس کے لیے کتابوں کا ایک دفتر نظروں سے گزارنا پڑتا ہے۔آپ کو تو یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ جمعیۃ علماءِ ہند کے ورکنگ صدر، ندوۃ المصنفین کے بانی و ناظم اور دارالعلوم کی شوریٰ کے ممبر حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے انتقال کے بعد ماہنامہ برہان کا ایک مفکر ملت نمبر بھی شائع ہوا تھا، جو ایک ضخیم کتاب کی صورت میں آج بھی شائقین علم و فن کے پاس موجود ہے۔مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کیا تھے۔اس کی تھوڑی سی وضاحت کے طور پر ہم یہاں چند بڑے اور معتبر حضرات کی تحریر پیش کر رہے ہیں۔بلاشبہ یہ قارئین کی معلومات میں اضافے کے ساتھ ساتھ تاریخی حیثیت کی حامل بھی ہیں۔پڑھیے حضرات! اور دیکھیے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کیسی عظیم شخصیت تھے۔

مفکرِ ملّت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نوراللہ مرقدہٗ

کے بارے میں معروف اور معتبر علماء کرام کا اظہارِ خیال

آئندہ صفحات میں مفتی عتیق الرحمٰن کی وفات کے بعد شائع ہونے والے چند مضامین پیش کیے جارہے ہیں، تاکہ دارالعلوم کی ناقص اور غیر معتبر تاریخ لکھنے والے فاضل مرتّب صاحب بھی دیکھیں کہ جس شخصیت کو انھوں نے نظرانداز کیا ہے، اس کا مقام کتنا بلند ہے۔

آپ چاہیں تو پہلے ہمارا تبصرہ پڑھ لیجیے، یہ مضامین بعد میں بھی پڑھے جاسکتے ہیں۔ بلاشبہ ہمارے تنقیدی جائزے میں یہ مضامین فی الحال رُکاوٹ ہی محسوس ہورہے ہوں گے؛ لیکن مستقبل کے لیے یہ مضامین ایک تاریخ ہیں جن کا محفوظ ہوجانا یقیناً سودمند رہے گا۔

گوہرِ شب چراغ

ابن الانور مولانا محمد انظر شاہ مسعودی
شیخ الحدیث دارالعلوم (وقف) دیوبند

ہندوستان میں کم ہی ایسے خانوادے گزرے جن میں علم وآگہی، دین و دانش متوارث رہا اور اخلاف نے اپنے اسلاف کی روایات کو بدستور تابناک رکھا ہو۔ ان گنے چنے خوش قسمت خاندانوں میں دیوبند کا عثمانی خانوادہ بھی ہے جس کی خاندانی تاریخ روشن و جاوید اور روایات بے مثال ہیں۔ مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا مہتاب علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا فضل الرحمٰن عثمانی شیخ الحدیث مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، فقیہ الامت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نقشبندی، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، یہ چند نام تو ارتجالاً قلم پر آگئے ورنہ اس خاندان میں بہت سے گوہر شب چراغ اور دُرِّ شاہوار ہیں۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ ایک شخصیت ساز ادارہ کا نام ہے۔ جس طالبِ علم پر آپ کی نظر پڑگئی وہ خاک سے کاخ جا پہنچا۔ بارہویں صدی کے خاتمے اور تیرہویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کے علمی حلقوں میں جتنی کوہِ پیکر شخصیتیں نظر آتی ہیں وہ حضرت مرحوم کے بالواسطہ یا بلاواسطہ تلامذہ ہیں، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی تدبیر و تدبر کے دائرہ میں ایسی منفرد شخصیت لے کر آئے کہ آج بھی دارالعلوم دیوبند کارزین دوران ہی مرحوم کی بے مثال قابلیت اور بے نظیر انتظام کا مرہون منت ہے۔ شخصیت سازی کا وہ جوہر قابل اپنے سینہ میں رکھتے کہ دارالعلوم سے وابستہ علمی پروانوں کو کمالات کی شمعِ فروزاں بنا دیا۔

مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جو مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد تھے۔ زہد و اتقاء کے پیکر، استغناء وللّٰہیت کی تصویر، فنائیت و عبدیت کے ہمالہ، تواضع و فروتنی کے قلزم، نقشبندیت کے امام، تفقہ کی دولتوں سے مالا مال، لیکن بایں ہمہ از صبح تا شام بیوہ عورتوں، یتیم بچوں، بے سہارا انسانوں اور بے کسوں کے لیے غلامِ بے دام تھے، یہ تعبیر دل و دماغ کے لیے شدید ناگوار ہے، مگر کیا عرض کروں کہ صورتِ واقعہ کی ترجمانی کے لیے کوئی اور تعبیر مہیا نہیں، وہ اپنے محلّہ کی نالیاں اپنے ہاتھ سے صاف کرتے، بیوہ عورتوں کے غلّوں کی بوریاں پسوانے کے لیے لے جاتے، تمام محلہ کا سودا سلف بازار سے لاتے۔ اور اِنْ اَجْرِیَ

اِلَّا عَلَی اللّٰہِ کا نعرہ لگا کر دنیا سے تعریف کے دو بول بھی لینے کے روادار نہیں تھے پھر بتائیے ایسے بے نفس کو غلام بے دام کہنے کی گستاخی نہ کروں تو صحیح صورتِ حال آپ کو کیسے سمجھاؤں، رہ گئے علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تو ان کا میمون عہد اس منحوس قحط الرجالی دَور سے اتنا قریب ہے کہ پاکستان میں کروڑوں اور ہندوستان میں لاکھوں ان کو دیکھنے اور سننے والے اب بھی موجود ہیں۔ علامہ خسرِ وعلم، فصاحت و بلاغت کے شہسوار، تقریر و وعظ کے اپنے عہد میں بے تاج بادشاہ تھے، حق پسندی ان کا شعار، حق بیانی ان کا امتیاز تھا۔ جس مجمع میں منکراتِ شرعی پر دارو گیر کی ہمت و حوصلہ بڑے بڑے شیخ الاسلاموں کو نہ ہوتا، وہاں علامہ کی حق پسندی کی آبدار و تابدار تلوار یکا یک نیام سے باہر آجاتی اور پھر اس شمشیر کی کاٹ سے کبھی والیٔ حجاز کا لاشہ تڑپتا نظر آتا، کبھی خوسروئے دکن خونچکاں نظر آتے تو گاہے حافظ ابراہیم سابق وزیر کابینہ غلطاں و پیچاں دکھائی دیتے۔ بڑے بڑے مجمعوں پر چھا جانا حضرت علامہ کا ادنیٰ کرشمہ فصاحت اور حریف کو دو جملوں میں چت کر دینا مرحوم کا کمال فن تھا پھر ان سب اوصافِ جلیل پر عالمانہ معصومیت چھائی ہوئی، سینہ ایسا بے کینہ کہ کسی سے انتقام کی وہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے، قلب و دماغ علوم و کمالات کا وہ خزینہ کہ جب چاہتے موتی رولتے۔ اب تو اپنی یہی سب سے بڑی سعادت نظر آتی ہے کہ ان ہستیوں کو دیکھنے کا موقعہ لم یزل ولایزال نے عنایت فرمایا، ورنہ اس منحوس دَور میں انسان نما بھیڑیوں سے جو قدم قدم پر سابقہ اور دین و دانش کے عیار تاجروں سے جو مرحلہ لاحقہ ہے اس نے تو دنیائے دنی و دوں سے دل ہی اُچاٹ کر دیا۔

خیر یہ تو قلم بے تابانہ و بلا ارادہ عثمانی خاندان کی بعض نادر الوجود ہستیوں کی طرف مُڑ گیا ورنہ تو اصل ذکرو تذکار مولانا مفتی عتیق الرحمٰن کا پیش نظر تھا، قطعاً یاد نہیں آتا کہ مرحوم مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے دید و شنید کا آغاز کب سے ہے، البتہ غالباً ۱۹۴۰ء کا واقعہ ہے یا اس کے آس پاس کا کہ مولانا عبدالحق میاں سملکی امیر انجمن خدام الدین کی معیت میں دہلی کا سفر ہوا، اس زمانہ میں مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنا سارا کاروبار قرول باغ میں جمائے بیٹھے تھے۔ ندوۃ المصنفین کی پُرشکوہ عمارت، عمارت میں سادگی، نظم و انتظام کی چستی، اہلِ علم کا اجتماع، دیدہ ور مصنفین کا حلقہ، ہر ایک زبان حال سے کہہ رہا تھا کہ یہ چمن آرائی مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سلیقے اور قرینے کی مرہون منت ہے۔ میں اس زمانہ میں نہ صرف بے ریش و بروت بلکہ کم سن تھا، لیکن بڑوں کی عظمت کا مظاہرہ ایسے ہی حالات میں ہوتا ہے۔ مرحوم مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک نادان بچے کے لیے صرف استاذ زادہ ہونے کی بنا پر بدل و جان پذیرائی میں لگ گئے۔ بڑا مکلف کھانا تیار کرایا۔ گہرے جذبات محبت و شفقت سے کھلایا، گویا کہ شعور کے عالم میں مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد میرا دہلی میں مستقل قیام تین چار سال رہا۔ ندوۃ المصنفین تو جانا یاد نہیں، البتہ ہر جمعہ کو بعد نماز جمعہ ادارۂ شرقیہ جامع مسجد دہلی کے عقب میں جس کے روح رواں مولانا ادریس صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرٹھی تھے۔ وہاں دارالعلوم کے قدیم و جدید فضلاء کا اجتماع ہوتا مفتی صاحب کی یہاں

بار بار زیارت کی سعادت نصیب ہوئی ۱۹۴۷ء کی قیامت خیزیوں نے مجھے دہلی سے اٹھا کر دیوبند پہنچا دیا، کچھ سال تعلیم میں گزرے اور رسمی فراغت کے بعد یہیں دارالعلوم میں تدریس کا موقعہ مل گیا۔ ملازمت کے دوران مشکلات پیش آئیں تو مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کا ناخن گرہ کشا گرہ کشائی کرتا اس وقت کی مجلس شوریٰ میں مرحوم سکہ رائج الوقت تھے۔ استاذ زادہ ہونے کی بنا پر ان کی شفقتیں وعنایتیں نصیب تھیں۔ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس دور میں بھی تعلقات لیے دیے ہی رہے، مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد اب ہمارے ملجاء وماویٰ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے اور لاریب کہ انہوں نے ایسی بزرگانہ شفقت کا معاملہ فرمایا جس سے ان کی شرافت نسبی، وضعداری، مروت کا دل پر نقش ہے۔

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ شگفتہ ومہذب طنز میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے شگفتہ بیانی کی ملاوٹ اُسے نیش آلود نشتر کے بجائے شکر وانگبیں کا انجکشن بنا دیتی۔

کشمیر میں علامہ انور شاہ سیمینار کے موقعہ پر میر واعظ منزل میں عشائیہ کے پروگرام کے ساتھ نامور شخصیتوں کی تقریر کا پروگرام تھا۔ سعید صاحب کی تقریر ضرورت سے زیادہ طویل ہوگئی۔ سامعین تو نیاز مند تھے کیا بولتے؛ لیکن جب مفتی صاحب کھڑے ہوئے تو طویل تقریر پر چٹکیاں لیتے ہوئے اکبر الہ آبادی کی ایک رُباعی پڑھی جس کا چوتھا مصرعہ ع

تاثیر دکھا تقریر نہ کر

تھا۔ بے چارے سعید صاحب خندہ زیرلب کے ساتھ منقار در پر ہو کر رہ گئے۔

ایک رات جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ، مفتی صاحب مولانا محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ، مولانا نُورالدین بہاری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا سید احمد رضا بجنوری وغیرہ موجود تھے۔ بے تکلف احباب کے اس مجمع کا موضوع شوہروں کا اپنی بیویوں کے ساتھ تعلق اور اس کی نوعیت تھی۔ اچانک مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ اُٹھے اندرونِ خانہ تشریف لے گئے اور معاً واپس آگئے، اس پر مفتی صاحب مرحوم نے اپنے خاص لہجے میں فرمایا۔

جی ہاں! یہ بھی ایک تعلق کی نوعیت ہے یعنی گرد ایک شے کے گھومنا ہے طواف!

یاد رہے کہ یہ حمدِ باری کا ایک مصرعہ ہے جس میں طواف کا ترجمہ کیا گیا ہے اس بھرپور طنز پر مجاہد ملت خاموش ہو کر رہ گئے۔

مفتی صاحب مرحوم کی کس کس ادا کا ذکر کیجئے اور کس کس بات کو یاد کر کے ان کی یاد تازہ کیجئے۔ یہ حقیر تقریباً آٹھ سال دارالعلوم میں ناظم مجلس تعلیمی رہا، یہ عہدہ اپنے اثر واقتدار کے لحاظ سے دارالعلوم میں اہتمام کے بعد دوسرا منصب تھا۔ مجلس شُوریٰ میں مجھے بھی شرکت کا موقعہ ملتا۔ تعلیمات کی رپورٹ میں ہی پیش کرتا۔ اراکین شُوریٰ میں مفتی صاحب کی شخصیت بڑی بھاری بھرکم تھی۔ کسی مسئلہ پر بحث ومباحثہ کے دروازے کھلتے اور یہ عقلائے کل

دُور بینی و دُور اندیشی کے بے بنیاد ہمالے تیار کرتے تو مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دوٹوک رائے پر بحث کا اختتام ہوتا، اگر میں کسی مسئلہ پر بولتا اور میری قیل و قال مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے منشاء کے خلاف ہوتی تو فرماتے:

''حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ) ابن حزم اُندلسی کی تیزیٔ تحریر کی بنیاد طحال کا عارضہ اور حدت جگر بتاتے، ہمارے شاہ صاحب (حقیر) بھی حدتِ جگر کے مریض ہیں اور اسی وجہ سے آپ کی رائے اس مسئلہ میں خاص بیماری کی نشاندہی کر رہی ہے''۔

یہ فرما کر میری گفتگو کو غیر وقیع قرار دیتے، اور اگر کبھی میری کوئی بات مرحوم کے منشا کے مطابق ہوتی تو فرماتے:

''جی ہاں! سنی تو ناظم مجلسِ تعلیمی ہی کی جائے گی بڑا پُر وقار عہدہ ہے اور یہی ذمہ دار ہیں''۔

غرضیکہ چٹکی بجاتے مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُلجھے ہوئے مسائل کو سلجھا لیتے، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے انہیں خصوصی تعلق تھا، بر بناء معاصرت بے تکلفی بھی تھی۔ ایک روز مہتمم صاحب مرحوم دہلی میں مفتی صاحب کی رہائش گاہ پر زبردستی کے مہمان تھے۔ مفتی صاحب کبھی بریانی کی پلیٹ پیش کرتے تو مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے کہ جی ہاں! اسے بھی کھاؤں گا۔ کبھی نرگسی کوفتوں کو بڑھاتے تو مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے: جی ہاں! یہ بھی لوں گا۔ الوان و اقسام کے کھانے مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح پیش کیے اور ہر ایک پر مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ مرحوم کا یہی جواب تھا۔ مفتی صاحب مرحوم کھانے میں بہت محتاط بلکہ لیا دیا ہی کھاتے۔ مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس طرز پر کہاں چوکنے والے تھے بپھر کر بولے:

جی ہاں! سب کھاؤں گا کسی چیز کا انکار نہیں ہے۔

ہم نیاز مند تو سناٹے میں آ گئے لیکن مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ادا شناس تھے اس پر تبسم ریز ہو گئے۔

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں حلم بھی غایت درجہ کا تھا، وہ ناگوار باتوں کو برداشت کرنے میں بے مثال واقع ہوئے تھے۔ دارالعلوم کے حالیہ ہنگاموں (مولوی اسعد مدنی صاحب کی ریشہ دوانیوں اور دارالعلوم پہ قبضہ) میں سعید صاحب اکبر آبادی اور منظور صاحب نعمانی سے بے حد دلگیر تھے، مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے انہیں امتیازی و اختصاصی تعلق تھا، ایک بار میرے سامنے قاری صاحب مرحوم کو رخصت کرنے کے لیے باہر تشریف لائے خود ہی کار کا دروازہ کھول کر مہتمم صاحب کو سوار کیا اور بھرائے ہوئے لہجہ میں فرمایا:

''میری گور کی خاک بھی اُڑ کر آپ کا ساتھ دے گی''۔

لیکن اس کے باوجود آخری دم تک سعید صاحب اکبر آبادی کو نبھاتے رہے، حالانکہ ہم نیاز مند خوب جانتے تھے کہ دارالعلوم کے موجودہ معاملات میں سعید صاحب کی پالیسی نے مفتی صاحب کے قلب پر چوٹ لگائی تھی،

مرحوم ایسے باوفاو بامروت تھے کہ دارالعلوم دیوبند میں والد مرحوم کے بعد ایک دوسری شخصیت (مولانا حسین احمد مدنی) کا آفتاب اقتدار نمودار ہوا تو اس کی خیرہ کن چمک دمک سے والد مرحوم کے اکثر و بیشتر تلامذہ و متعلقین اُدھر ہی کے ہو کر رہ گئے لیکن حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نہ اپنا طرز بدلا نہ اپنی روایت پر آنچ آنے دی نہ اپنے حضرت استاذ مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے بے پایاں تعلق میں ذرا سی کمی آئی، بلکہ خوب جانتا ہوں کہ وہ اس دوسرے آستانے تک کبھی پہنچے تک نہیں۔ اس پوری صورتِ حال پر یہ شعر کس قدر صادق ہے۔

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ قبر سے مردے نکل پڑے
مگر ایک مری جبین نیاز جہاں دھری تھی دھری رہی

مفتی صاحب کی علمی استعداد مضبوط اور سوادِ علمی ممتاز تھی، وہ دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث میں جو تعلیمی آخری سال ہے، امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوئے، دارالعلوم کا وہ خیر القرون تھا جب یہاں مجرد کامیابی بھی بہت دشوار تھی چہ جائیکہ اختصاصی نمبرات سے کامیابی، اس پر ان کے استاذ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری علیہ الرحمہ نے اپنی تصانیف کے ساتھ دو روپے نقد انعام عنایت فرمایا۔ مرحوم اس نقد انعام کو بطورِ تبرک سنبھالے ہوئے تھے۔ اس زمانہ میں درسِ نظامی کی دشوار تر کتاب بیضاوی سورہ بقرہ دورۂ حدیث سے فراغت پر ہوتی۔ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم میں معین المدرس مامور ہوئے تو آپ کو پڑھانے کے لیے دی گئی۔ بیضاوی کے درس میں پنجاب، پشاور، ایران، قازان، بخارا، سمرقند وغیرہ کے ممتاز طلباء شریک تھے۔ مزید برآں علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث کا درس لیے ہوئے فاضل طلباء کو بیضاوی پڑھانا کھیل نہ تھا۔ اس لیے مرحوم کبھی کبھی بطور تحدیثِ نعمت فرماتے:

"حضرت شاہ صاحب جیسے جبل علوم کے یہاں پڑھے ہوئے طلبا کو پڑھانا مولوی صاحب کوئی آسان کام نہ تھا"۔

دیوبند کے ۱۳۴۵ھ والے واقعہ میں مفتی صاحب اپنے استاذ قدس سرہٗ کے جانبدار تھے اور جب یہ علمی قافلہ دیوبند سے بجانب ڈابھیل روانہ ہوا تو آپ بھی اس کے ایک رکن تھے۔ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں افتاء کے شعبہ کو سنبھالنے کے ساتھ حدیث و تفسیر و فقہ کی مہم کتابوں کے اسباق آپ سے متعلق رہے۔ کلکتہ میں تفسیر قرآن بیان کی جس کا حلقہ عام و خاص پر پھیلا ہوا تھا۔ ندوۃ المصنفین کے بعد اگرچہ ان کی تمام تر مصروفیات انتظامی تھیں لیکن اس کے باوجود علمی ذوق جو پختہ ہو چکا تھا بدستور قائم رہا۔ علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سیمینار میں اپنے استاذ پر جو ارتجالاً مقالہ لکھا وہ تمام مقالات میں بیعت الغزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ شعر و شاعری سے مناسبت ان کا خاندانی ورثہ تھا، چونکہ شعر شناس خوب تھے اس لیے پُرمعنیٰ شعر کو سن کر اُچھل جاتے۔ خاص عادت یہ تھی کہ جو شعر پسند آتا اسے فوراً لکھ لیتے۔ چنانچہ ایک بار ایسا ہوا کہ ہوائی سفر کے مرحلوں میں جو پابندیاں موجودہ حکومت نے عائد کیں اور ہتھیار

وغیرہ کی تلاشی کے لیے جوخصوصی تجس ہوتا جاتا ہے، میں نے اس کا ذکر کرتے ہوئے یہ شعر مرحوم کے سامنے پڑھا ۔

زنہار کوئی چابی کمر بند میں نہ باندھے
کہ لوہے سے بہت ڈرتی ہے سرکار ہماری

مفتی صاحب پھڑک اُٹھے اور فرمایا کہ بھائی اِسے لکھوادو۔ تحریر بڑی شگفتہ تھی لیکن اس میں بھی طنز کا پہلو غالب رہتا، ایک مرتبہ برُہان کا اداریہ لکھا تو دارالعلوم کے قدیم وجدید دَور کا موازنہ کرتے ہوئے تحریر کیا کہ:

''دارالعلوم کے قدیم دَور میں دورہ حدیث میں آج کی طرح پلٹنیں نہ ہوتی تھیں بلکہ گنے چنے طلبا ہوتے لیکن کوئی علامہ کشمیری بن کر نکلتا تو کوئی علامہ عثمانی''۔

پلٹنوں کے لفظ کو پڑھیے اور سر دھنیے۔ عام مجالس میں بھی علمی موضوعات اگر چھڑ جاتے تو مفتی صاحب کو اپنے دماغ کے خزانے سے پرُانی اور مستند معلومات نکالنے میں دشواری نہ ہوتی۔ ان کے زیرنگرانی ندوۃ المصنفین کی مطبوعات علمی شاہکار ہیں جنہوں نے ملک وغیر ممالک کے علمی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کیا ہے۔

علالت کا دَور شروع ہوا تو بار بار عیادت کے لیے حاضری ہوئی، اب مفتی صاحب اپنا ضبط کھو چکے تھے۔ دارالعلوم کے حالات سنتے تو بے اختیار آنسوؤں کی لڑی آنکھوں سے بندھ جاتی۔ میں بمبئی سے واپس ہو رہا تھا نئی دلی اسٹیشن پر اُتر کر سیدھا ان کے رہائشی مکان پر پہنچا ناسوتی زندگی میں مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ آخری ملاقات تھی پھر انہیں دیکھنا نصیب نہ ہو سکا۔

یہ ہیچ پوش تحریر بزم عتیق میں شرکت کی ایک کوشش ہے۔ ورنہ ایک آدھ مقالہ مفتی صاحب مرحوم کے عظیم کارناموں کو کبھی نہیں سمیٹ سکتا، آج بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ ندوۃ المصنفین میں اپنی کرسی پر تشریف فرما ہیں، عینک ان کے ہاتھوں میں ہے اور اپنے خصوصی لہجہ میں فرما رہے ہیں ۔

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہو جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

(ماہنامہ برہان کا مفکر ملت نمبر: ص ۱۸۹)

......❖......

حضرت کی یاد آئی تو آتی چلی گئی

پروفیسر رضی الدین احمد ایم۔اے پی ایچ ڈی لٹ

ڈین علوم شرقیہ، سابق صدر شعبہ اُردو فارسی۔ یس وی یونیورسٹی تروپن آندھرا پردیش

''میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی جہاں علمائے دیوبند سے عقیدت اور ان کا احترام جزوِ ایمان بن گیا تھا؛ چنانچہ جب میں نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو اپنے اِرد گرد صحیح بخاری اور مسلم کی موٹی موٹی جلدوں کے ساتھ الامداد، القاسم اور الرشید کے اُردو پرچوں کا ڈھیر بھی پایا۔ یہیں سے میں نے اُردو کے مطالعے کی بسم اللہ کی، اس وقت اتنی سمجھ کہاں تھی کہ ان پرچوں میں علومِ اسلامیہ کے جو بیش قیمت موتی بکھرے ہوئے تھے ان کو پرکھ سکتا۔ ان کے مضامین کو سمجھ سکتا۔ لیکن ان کی ورق گردانی کا یہ فیض بھی کیا کم تھا کہ ان چند لکھنے والوں کے نام میرے حافظے نے بچپن ہی میں محفوظ کر لیے''۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ بہت بعد کو اس کا علم ہوا کہ آخری دونوں بزرگ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن کے عم محترم تھے۔ یہ وہ اکابر تھے جن سے میری عقیدت علم اور عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی۔ یہاں اس دلچسپ واقعہ کا ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ میرے پردادا بابو حامد علی مرحوم متوفی ۱۹۰۴ء کی انگریزی عہد کے آغاز میں کسی انگریز سے دوستی ہوگئی تھی۔ اس دوستی کے طفیل انہیں انگریزی زبان کی شدھ بدھ ہوگئی۔ یہ زمانہ ایسا سخت اور حکومت کی تبدیلی کا سانحہ ایسا شدید تھا کہ مسلمانوں کو نہ صرف انگریزوں سے دشمنی تھی بلک انگریزی زبان سے بھی ایسی سخت نفرت تھی کہ اس کا سیکھنا بھی کرسٹان کہلائے جانے کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا۔ کچھ دنوں تک میرے دادا مرحوم نے اپنی غلطی کو مصلحت کی چادر میں چھپائے رکھا، لیکن بعد کو جب انہیں محکمہ نہر میں ایک سرکاری ملازمت مل گئی تو ایک نہ شد دو شد کے مصداق ان کے دونوں عیب کھل گئے۔ انگریزی پڑھنا اور انگریزی سرکار کی ملازمت کرنا دو ایسے عیب تھے کہ ایک نے دوسرے کا پردہ فاش کر دیا۔ نہ صرف عام مسلمانوں نے ان سے آنکھیں پھیر لیں بلکہ خاندان کے افراد اور ان کے اقربا بھی ان سے ملنے میں کترانے لگے۔ اس دن سے ہمارے خاندان کا نام ہی بابو جی کا خاندان کہلانے لگا۔ کچھ مدت کے بعد شاید پردادا

کو بھی اپنے گناہ کا احساس ہوا، اس احساس کی شدت نے انہیں اس گناہ کے کفارے کی طرف مائل کیا۔ یہ تو ممکن نہ تھا کہ جو زبان سیکھ لی ہے اسے بھلا دیں اور یہ بھی آسان نہ تھا کہ اپنی سرکاری ملازمت ترک کر دیں۔ آخر ایک عالم دین نے ان کی مشکل کو حل کرنے کی ایک ایسی تدبیر سجھائی جو یہ کر گزرے۔ ان کے چار لڑکے تھے عالم دین نے کہا کہ آپ اپنے ایک لڑکے کو دیوبند بھیج کر عالم دین بنا دیں تو آپ کے گناہ کا کفارہ ادا ہو جائے گا۔ انہوں نے اپنے سب سے چھوٹے لڑکے محمد نصیر الدین کو اس غرض سے میرٹھ سے دیوبند بھیج کر دینی تعلیم دلائی۔ انہوں نے دیوبند میں درسِ نظامیہ کی تکمیل کی اور حضرت محدث گنگوہی مولوی رشید احمد سے حدیث کی سند لی۔ پھر بعد کو دہلی جا کر حکیم عبدالمجید خاں سے طب کی تعلیم حاصل کی اور بجائے علمِ دین کے طب کو اپنا پیشہ بنایا۔

دیوبند کی تعلیم اور حضرت گنگوہی کے تعلق کی وجہ سے ہمارے گھرانے سے نہ صرف علمائے دیوبند کا تعارف تھا بلکہ اکابر علمائے دیوبند سے ایسا تعلق پیدا ہوگیا تھا کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ ہمارے یہاں تشریف لاتے، قیام فرماتے اور خاندان کے افراد کو اپنی خدمت کا موقع فراہم کرتے۔ میرے دادا مرحوم مولوی حکیم نصیر الدین نے کوّے کی حلّت کے بارے میں اپنے استاد حضرت گنگوہی کا ایک فتویٰ بھی شائع کیا تھا جس کی تائید اور تہدید میں بہت سے کتابچے شائع ہوئے۔ افسوس کہ ان کا انتقال عین جوانی میں ہوا اور وہ سوائے ایک رسالہ فصل الخطاب کے اور کوئی تصنیف اپنی یادگار نہ چھوڑ سکے۔ میرے دادا کے انتقال پر میرٹھ میں شاید انہی کی یادگار میں مطبع قاسمی قائم ہوا۔ اور ایک عربی مدرسہ خادم العلوم۔

مولوی جلال الدین، قاری محمد اسحاق، مولوی ریاض الدین دادا کے ساتھیوں میں تھے۔ یہی حضرات مدرسہ کے معلم بھی تھے۔ قاری محمد اسحاق مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی کے خلیفہ تھے۔ میرے والد حکیم محمد ظہیر الدین رحمۃ اللہ علیہ سے بڑی شفقت اور بہت اپنائیت کا تعلق رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے مفتی عتیق الرحمٰن صاحب قاری اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کی طرح میرے والد مرحوم کا بھی احترام کرتے تھے۔ میرے عم محترم حکیم محمد بشیر الدین نے دینی تعلیم اسی مدرسہ خادم العلوم میں پائی تھی۔ پھر دہلی کے طبیہ کالج سے طب کی تعلیم حاصل کی۔ یہ حکیم اجمل خاں کے عزیز شاگرد تھے۔

مولوی بدر عالم میرٹھی چچا کے نہایت بے تکلف دوستوں میں تھے۔ مولوی بدر عالم میرٹھی حضرت محدث کشمیری مولانا انور شاہ کے عزیز شاگرد تھے۔ جب حضرت کشمیری نے دارالعلوم کو چھوڑ کر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کا رُخ کیا تو اس شمع انوری کے پروانوں میں مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی عزیز الرحمٰن، مولانا حفظ الرحمٰن، مولوی بدر عالم اور مفتی عتیق الرحمٰن بھی شامل اور شریک تھے۔ عم مرحوم سے مولوی بدر عالم کی بہت بے تکلفی اور گہری دوستی تھی۔ دونوں کی دوستی میں مذہبی عقائد کے اشتراک کے علاوہ ایک قدر مشترک شکار کا شوق بھی تھا۔ چچا جان مرحوم کبھی کبھی کئی کئی دن اپنے مطب سے غائب رہتے تھے۔ یہ بات میرے والد مرحوم کو سخت ناپسند تھی اور وہ اس پر اپنی خفگی کا برملا اظہار

کرتے تھے۔لیکن جب چچاجان مرحوم صفائی میں یہ فرماتے کہ میں مولوی بدرعالم کے ساتھ شکار کو گیا تھا تو والد مرحوم کی خفگی شفقت سے بدل جاتی تھی۔شاید اس دوستی کا ایک تحفہ یہ بھی تھا کہ عم محترم نے اپنے بڑے صاجزادے کا نام بھی مولوی بدرعالم کے نام سے مستعار لیا تھا۔

۱۹۳۵ء میں انڈیا ایکٹ آجانے پر ہندوستان کی سیاسی زندگی میں ایک نئی ہلچل شروع ہو چکی تھی۔انڈیا ایکٹ کی حمایت اور مخالفت میں پوسٹر شائع ہوتے تھے اور وہ اس وقت میرے قد سے بھی بڑے ہوتے تھے۔میں اس وقت اُردو روانی سے پڑھ لیتا تھا محلہ کے ناخواندہ لوگ مجھ سے یہ پوسٹر پڑھوا کر سنتے تھے۔کبھی پوسٹر دیوار پر اتنے اونچے لگائے جاتے تھے کہ پوسٹر پڑھنے کے لیے مجھے کسی کے کاندھے پر چڑھ کر انہیں پڑھنا ممکن تھا، لوگوں کے کاندھے پر چڑھ کر پوسٹر پڑھتے وقت مجھے بچپن ہی سے اپنی بڑائی کا قبل از وقت احساس ہونے لگا تھا۔ میں نہ صرف روانی سے پوسٹر پڑھ کر لوگوں کو سناتا تھا بلکہ بیچ بیچ میں اپنی طرف سے یہ حاشیہ بھی چڑھاتا جاتا تھا کہ یہ بات صحیح ہے یہ بات غلط ہے۔لوگ ہنس ہنس کر مجھے داد دیتے تھے اور میں خوش ہو ہو کر یہ داد وصول کرتا۔اسی زمانے سے مجھے قومی تحریک سے دلچسپی پیدا ہوئی۔یہ میری زندگی کا پہلا کھیل تھا، جسے میں نے اپنے بچپن میں اس طرح کھیلا جس طرح بچے گلی ڈنڈا یا کبڈی کھیلتے ہیں۔آخر اسی شوق نے میری مخمل کی کامدار ٹوپی کو کھدر کی گاندھی ٹوپی سے بدل دیا۔۱۹۳۶ء میں پہلی بار میں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو میرٹھ میں دیکھا جن کا جلوس نکالا جارہا تھا۔جواہر لال کھدر کی وہی ٹوپی پہنے ہوئے تھے جسے عام طور پر کانگریس کے حامی استعمال کرتے تھے۔اس وقت کانگریس اور مسلم لیگ میں اتحاد تھا۔۳۷ء کے انتخاب میں جب دوبارہ جواہر لال نہرو کو میں نے میرٹھ میں دیکھا تو وہ جلسہ گاہ میں اس طرح تشریف لائے تھے کہ ان کے ایک پہلو میں کانگریس کے امیدوار پنڈت پیارے لال شرما تھے اور دوسرے بازو میں مسلم لیگ کے اُمیدوار نواب محمد اسماعیل خاں۔اس وقت انتخاب جداگانہ تھے۔میں نے بھی نواب صاحب کی تائید میں چھوٹے چھوٹے جلسوں میں تقریریں کرنی شروع کر دی تھیں۔اس زمانے میں علمائے دیوبند میں کچھ حضرات قومی تحریک کی حمایت کر رہے تھے اور کچھ علمائے کرام کا یہ عقیدہ تھا کہ ہندوستان میں تاقیام قیامت انگریزوں کی حکومت قائم رہے گی۔اس لیے قومی تحریک سے الگ رہنا ہی بہتر ہے۔

۳۷ء میں میں نے کلام پاک حفظ کر لیا تھا۔اس وقت میری عمر دس برس کی تھی جب کوئی عالم یا رئیس والد کے مطب میں آتے اور میں اندر زنانے مکان میں ہوتا تو والد مجھے اندر سے بلواتے، والد مرحوم اپنے مخاطب سے فرماتے کہ یہ بندہ زادہ ہے۔اس نے قرآن شریف حفظ کر لیا ہے۔پھر مجھے حکم ہوتا کہ ایک رکوع سناؤ۔میں ان کی تعمیل میں ایک رکوع پڑھ کر سناتا اور پھر آخر میں داد و تحسین پاتا۔کبھی کبھی ملکہ وکٹوریہ کا چاندی کا روپیہ بھی انعام میں مل جاتا۔میرٹھ میں اسی سال پہلی مرتبہ میری مفتی عتیق الرحمٰن صاحب سے ملاقات ہوئی۔

مفتی صاحب اس زمانے میں ندوۃ المصنفین کی تاسیس کا منصوبہ بنا چکے تھے۔اپنے خاص احباب سے اعانت اور تائید کے لیے گشت کر رہے تھے۔مولوی بدر عالم اور مولوی حفظ الرحمٰن اس منصوبے میں ان کے رفیق و شریک تھے۔مفتی صاحب مولوی بدر عالم اور بعض ذی علم حضرات کے ساتھ والد کے مطب میں تشریف لائے۔علماء کے اس مبارک اجتماع کو دیکھ کر والد مرحوم نے حسبِ معمول مجھے مکان سے بلایا۔علماء کے اس مبارک مجمع کے سامنے مجھے یہ کہہ کر پیش کیا کہ یہ بندہ زادہ ہے،اس نے قرآن شریف حفظ کرلیا ہے۔پھر مجھ سے ایک رکوع پڑھنے کی فرمائش کی گئی اور میں نے بحسن وخوبی اس فرمائش کی تکمیل بھی کر دی۔اب تک شروع سے یہ ہوتا آرہا تھا کہ اس موقع پر مجھے داد دی جاتی میری تعریف کی جاتی اور میں بھی اس سے خوش ہوتا۔لیکن اس دن ایک ایسی غیر متوقع بات ہوئی کہ بجائے تعریف وتحسین کے مجھے ہدفِ ملامت بننا پڑا۔ہوا یہ کہ جب میں مفتی صاحب اور مولوی بدرعالم کو قرآن شریف کا ایک رکوع سنا چکا تو قرأت ختم ہوجانے کے بعد مولوی بدرِعالم نے میری ٹوپی کی طرف اشارہ کرکے طنزاً والد مرحوم سے کہا: حکیم صاحب یہ آپ کے صاحبزادے کے سر پر کیا ہے؟ والد مرحوم نے میری کھدر کی ٹوپی کو دیکھ کر بڑی سادگی اور سادہ لوحی سے جواب دیا۔حضرت ٹوپی ہے۔یہ جواب سن کر مولوی صاحب کا پہلا وار طنزاً خالی گیا۔مگر وہ بھی خاموش ہونے والے نہیں تھے۔پھر والد صاحب سے فرمایا۔حکیم صاحب آپ کے اور ہمارے بزرگوں نے کبھی یہ ٹوپی اوڑھی ہے؟ والد صاحب یہ سن کر کچھ خاموش سے کچھ محجوب سے ہوئے تو مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے مولوی بدرعالم سے مخاطب ہو کر فرمایا: مولوی بدر عالم یہ گاندھی جی کی ٹوپی نہیں ہے۔گاندھی جی نے حکیم اجمل خاں کو اس ٹوپی میں دیکھا تھا۔اس کو کانگریس کے قومی لباس میں شامل کرلیا۔دراصل یہ حامد کیپ ہے۔

یہ تھا مفتی صاحب سے میرا پہلا تعارف اور ان سے میری اوّلین ملاقات۔مفتی صاحب کی اس تائید اور ترجمانی سے والد مرحوم کی مشکل بھی آسان ہوئی اور میری بھی ہمت بندھی۔پہلا تاثر عموماً بہت گہرا اور گرانمایہ ہوتا ہے۔اس کی گرمی اور گداز اب بھی میرے احساس میں شامل اور شریک ہے۔مجھے یہ اندازہ ہوگیا کہ مفتی صاحب عام علماء سے الگ اپنا ایک مزاج رکھتے ہیں جس میں چھوٹوں سے شفقت، ہم عمروں اور ہم خیالوں سے اپنائیت، بزرگوں سے عقیدت اور اپنے مخالفوں سے خاطر و مدارات،ان کی طبیعت کے اہم اساسی عناصر تھے۔معتبر اور محترم اساسی عناصر۔

۱۹۳۷ء کے پہلے صوبائی انتخابات میں کانگریس کے ساتھ مسلم لیگ کے بھی بہت سے اُمیدوار کامیاب ہوئے۔اس سال جب پہلی بار صوبائی سطح پر کانگریس کی وزارتیں بنیں تو یوپی میں کسی مسلم لیگ کے اُمیدوار کو وزارت میں نہیں لیا گیا۔یہیں سے کانگریس اور مسلم لیگ میں شدید اختلافات کا آغاز ہوا اور کانگریس کی وزارتیں بننے کے بعد اس اختلاف نے بڑی شدت اختیار کرلی اور بہت سے شبہات نے خطرناک راہ پالی۔میری دلچسپیاں شروع ہی سے کانگریس کے ساتھ تھیں اور یہ بھی حُسنِ اتفاق تھا کہ اکثر علمائے دیوبند بھی اس سیاسی مسلک کے پیرو

تھے۔ ۱۹۳۸ء میں ندوۃ المصنفین کے منصوبے نے عملی شکل اختیار کرلی۔ مفتی صاحب اپنی تنظیمی صلاحیتوں اور تعمیری رجحانات کی وجہ سے اس ادارہ کے منتظم اعلیٰ قرار پائے۔ ان کے رفیقوں اور ہمدموں میں مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ، مولوی بدر عالم رحمۃ اللہ علیہ، مولانا سعید احمد اکبر آبادی رحمۃ اللہ علیہ جیسے اکابر اور اعلیٰ ذہن رکھنے والے بزرگ شامل تھے۔ ادارہ کا ترجمان برہان نکلنے لگا جس کے مدیر اعلیٰ مشہور عالم دین مولانا سعید احمد اکبر آبادی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔

ادارہ کا ترجمان کیا بلحاظ صورت اور کیا بلحاظ سیرت میرے خیال میں الامداد، القاسم اور الرشید ہی کی ترقی یافتہ شکل تھا۔ ۳۷ء سے ۴۰ء تک کانگریس اور مسلم لیگ کا اختلاف اتنا شدید ہوگیا تھا کہ ملک کی آزادی کی راہ میں مسلم لیگ ایک بہت بڑی رکاوٹ بن کر ابھر آئی۔ یہ برطانوی حکمتِ عملی کا ایک ایسا حربہ اور حملہ تھا جس نے آخر ملک کی تقسیم کا نعرہ اور نظریہ بن کر ملک کی سیاست کی بساط ہی پلٹ دی۔ مجھے اس زمانہ سے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا احمد سعید، سید شاہ عطاء اللہ بخاری اور استاذی حضرت عبید اللہ سندھی سے بڑی عقیدت اور بڑی قربت ہوگئی تھی۔ میں قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد عربی مدرسہ میں عربی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھ رہا تھا۔ یہ حضرات عربی مدارس کے جلسوں میں تشریف لاتے تھے اور ان کے مواعظ اور تقاریر نے مجھے اس درجے متاثر اور مسحور کردیا تھا کہ میں نے بھی چھوٹے چھوٹے جلسوں میں تقریر کرنے کی مشق شروع کردی تھی جو چند سال میں مہارت بن گئی۔ اب مجھے بھی بڑے بڑے جلسوں میں تقریر کرنے کا خبط سا ہوگیا۔ خبطی اور خطیب ملّت میں بہت جلد مقبول اور مقرب ہوجاتے ہیں۔ میرے ساتھ یہی سانحہ ہوا جسے میں نے سعادت سمجھا۔

مسلم لیگ نے اپنے لاہور کے اجلاس میں جو مارچ ۴۰ء میں ہوا تھا ملک کی تقسیم کا مطالبہ کیا تھا۔ اس سال اپریل میں مطالبہ پاکستان کی مخالفت میں نونہالانِ احرار نے اپنی ایک کانفرنس کی، جس کی صدارت کا شرف اور اعزاز مجھے مل گیا۔ نونہالانِ احرار کانفرنس کی تاریخی اہمیت یہ تھی کہ مارچ ۴۰ء میں لاہور میں قرارداد پاکستان پاس ہونے کے بعد لاہور میں یہ پہلی کانفرنس تھی جس میں صرف نوجوان تھے۔ اس میں ملک کی تقسیم کی مخالفت کی گئی تھی۔ میرا خطبہ صدارت چھپ کر اخبارات میں شائع ہوا۔ تصویریں شائع ہوئیں اور میں قبل از وقت ایک کُل ہند لیڈر بن گیا۔ قومی تحریک سے ملحقہ اور اس کا مسلمہ لیڈر، عربی مدرسوں کے اکثر علماء اور طلباءِ تقسیمِ ملک کے خلاف تھے۔ لیکن عربی مدارس کے مہتمم صاحبان جو عموماً رؤسا تھے، تقسیم ملک کے حامی تھے۔ غریب طلباء کو سیاست میں حصہ لینے کی اجازت نہ تھی۔ مگر ان کے مہتمم صاحبان سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ مجھے عربی مدرسہ سے اس لیے نکال دیا گیا تھا کہ میں نے کھل کر سیاست میں حصہ لینا شروع کردیا تھا۔ والد مرحوم مجھ سے سخت ناراض تھے۔ اب میری تعلیم کا مسئلہ میرے لیے ایک سخت مرحلہ تھا۔ میں اچھا خاصا کل ہند لیڈر تھا لیکن میری

تعلیم ناقص تھی۔علماء کرام سے بڑا قرب حاصل تھا۔بعض حضرات کا مشورہ تھا کہ میں دیوبند جاکر تعلیم کی تکمیل کروں۔بعض حضرات جن میں حضرت سندھی بھی تھے چاہتے تھے کہ میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ میں داخل ہو کر تعلیم حاصل کروں۔لاہور کانفرنس میں حضرت سندھی میری تقریریں سن چکے تھے اور مجھ سے بہت زیادہ متاثر اور مسرور تھے۔آخر خدا خدا کر کے ۴۰ء میں میرا داخلہ جامعہ ملّیہ دہلی کے ابتدائی مدرسہ میں ہوگیا۔یہ بھی حُسنِ اتفاق تھا کہ اس سال حضرت استاذی عبیداللہ سندھی بھی جامعہ میں تشریف لے آئے۔یوں مجھے حضرت سے کچھ پڑھنے اور کچھ پانے کا موقع ملا۔بہت بڑا موقع اور بہت مبارک موقع۔حضرت سندھی ہفتہ میں چھ دن جامعہ میں درس دیتے تھے اور ایک دن یعنی جمعہ کو جامعہ نگر سے دہلی جاکر جامع مسجد کے قریب ادارہ شرقیہ میں تفسیر بیان کرتے تھے۔ ادارہ شرقیہ میں حضرت سندھی کے درسوں میں مفتی عتیق الرحمٰن،مولانا حفظ الرحمٰن،مولانا سعید احمد اکبر آبادی جیسے علماء کرام تشریف لاتے تھے۔اس کم مدت میں بڑی حد تک مفتی صاحب سے متعدد ملاقاتیں اور بہت سی مداراتیں ہو چکی تھیں۔مفتی صاحب کا ادارہ ندوۃالمصنفین قرولباغ میں تھا۔ایک آدھ بار وہاں بھی مجھے حاضری کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔اب میں بڑی حد تک مفتی صاحب کے عقائد اور سیاسی افکار سے واقف ہو چکا تھا اور اب مختلف موضوعات پر ان سے گفتگو کرنے کے مواقع بھی مل چکے تھے۔حضرت مفتی صاحب،مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب نہ صرف ایک دوسرے کے ہمدرد و ہمدم تھے،ملک کے سیاسی عقائد و مذہبی مسلک میں بھی ایک دوسرے کے ہم مسلک و ہم مشرب تھے۔استاذی حضرت عبیداللہ سندھی کے انتقال کے بعد ان کے افکار پر جب ایک مسلک کے علماء نے بے وقت اور بے جا تنقیدیں کیں تو حضرت سندھی کی تائید میں مولانا اکبر آبادی نے قلمی جہاد کیا۔جس میں وہ تنہا نہ تھے،بلکہ ادارہ کے سب ہی اکابر اس مسلک کے قائل تھے۔حضرت سندھی،حضرت شیخ الہند کے ارشد تلامذہ میں تھے۔لیکن دیوبند کے اکابر نے دارالعلوم کے دروازے حضرت سندھی کے لیے بند کر دیے تھے۔حد یہ تھی کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی تک نے اخبارات میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ برطانوی حکومت کی اذیتیں برداشت کرتے کرتے حضرت سندھی کا ذہنی توازن متزلزل ہوگیا۔حضرت شیخ الہند کا یہ جملہ میں نے اپنے خاندان کے بزرگوں سے سنا تھا کہ ان کے صدہا شاگردوں میں سے مولانا شبیر احمد ان کی زبان ہیں،مولانا سندھی ان کا ذہن ہیں اور مولانا حسین احمد ان کا دل ہیں۔ذہن ضمیر اور زبان کے اس اختلاف نے ملّت کے لیے ایک صدمۂ جاں گداز اور سانحۂ عظیم کی شکل اختیار کر لی تھی۔میں نے ان تینوں حضرات کو دیکھا اور سنا ہے ان میں مولانا شبیر احمد عثمانی واقعی سب سے اچھے مقرر اور بہت دلچسپ بزرگ تھے۔حضرت مدنی اور مولانا سندھی کی تقاریر عوام کے لیے شگفتگی اور دلچسپی کے عناصر سے خالی تھیں لیکن علماء کے لیے سرتاسر مغز ہوتی تھیں،لیکن مولانا عثمانی خطابت کے میدان کے شہسوار تھے۔حضرت مفتی صاحب تحریر و تقریر دونوں میں ان

اکابر سے کسی حد تک الگ واقع ہوئے تھے۔ان میں غیر معمولی طور پر تنظیمی صلاحیت تھی۔ان کے معاصر علماء کرام میں جس طرح کی خشک مزاجی اور خشونت طبع تھی۔مفتی صاحب اس کے برخلاف شگفتہ مزاج اور مردم شناس عالم تھے۔ان کی معاملہ فہمی اور موقع شناسی عام علماء سے بہت بلند تھی۔اس کے صدہا واقعات میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔

فخر الدین علی احمد کے دَورِ صدارت میں راشٹر پتی بھون میں دعوت افطار کے موقع پر اکثر مشاہیر معاصر علماء کرام اور راہم عہدیدار مدعو تھے۔ایک بار اس دعوت کے موقع پر وہاں ان کے گھر کی خواتین اور بعض دوسری خواتین دعوتِ افطار کے اہتمام میں مصروف تھیں۔حضرت مفتی صاحب اور دوسرے علماء کرام بھی موجود تھے۔غالباً فخر الدین علی احمد صاحب نے مفتی صاحب سے تقریر کے لیے کہا۔لیکن مفتی صاحب نے اپنے ایک معاصر سے کچھ کہنے کی فرمائش کی اور اس موقع پر حضرت واعظ نے رسم کے برعکس بجائے رمضان یا افطار پر کچھ کہنے کے پردہ کے موضوع پر کچھ ایسے شدید خیالات کا اظہار کیا جس سے سبھی سننے والوں نے بڑی تلخی محسوس کی، خصوصاً خواتین نے جو اس موقع پر انتظامات کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔مفتی صاحب صورتِ حال کو بھانپ گئے اور موقع کی نزاکت کے خیال سے بغیر کسی فرمائش کے افطار اور رمضان کے بارے میں بڑے شگفتہ انداز سے کچھ کلمات ارشاد فرمائے اور آخر میں یہ فرما کر اپنی گفتگو ختم کی کہ رمضان اور اس کے روزوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس بارے میں علماء اور فقہاء میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔روزہ فرض ہے، غریب ہو کہ امیر، مرد ہو کہ عورت، مگر بعض فقہی مسائل میں اختلاف ہے جیسے پردہ کی نوعیت۔بعض منہ ڈھانپنے کو ضروری خیال کرتے ہیں بعض نہیں۔اس لیے ایسے مسائل میں غیر ضروری شدت مناسب نہیں ہے۔اس میں احتیاط لازمی ہے۔مفتی صاحب کے ان چند جملوں نے پہلے واعظ صاحب کی ساری تلخی اور تہدید کی جگہ ماحول کو خوشوار بنا دیا۔گویا فضا کا تکدر دھل سا گیا۔سامعین نے ایک طرح سے بڑے سکون کا سانس لیا۔مفتی صاحب سے عرصے سے تعلق ہونے کی وجہ سے ایک طرح کی اپنائیت ہوگئی تھی اور حضرت مجھ پر اتنی عنایت کرنے لگے تھے کہ بعض مواقع پر مجھے اپنے ساتھ سفر میں بھی شریک کر لیتے تھے۔یوں مجھے غم اور خوشی کے آداب سے واقف کراتے تھے۔ایک بار میں ایک لمبے سفر سے دہلی پہنچا اور قیام ان ہی کے دفتر میں تھا۔اِدھر اُدھر کی بات چیت کے بعد ہی مجھ سے فرمانے لگے آپ کیا پنڈت سندر لال جی سے بھی واقف ہیں؟ میں نے کہا کیوں نہیں۔میں نے ان کی متعدد تقریریں سنی ہیں۔میں موصوف کا بے حد احترام کرتا ہوں وہ بڑے ترقی پسند رہنما اور بہت صاف گو انسان ہیں۔وہ صحیح معنوں میں قومی یکجہتی کا ایک زندہ اور مثالی نمونہ ہیں۔مفتی صاحب میری گفتگو سنتے رہے۔آخر آہ بھر کر کہا آج ان کا انتقال ہوگیا ہے۔مجھے ان کی میت میں جانا ہے۔آپ بھی میرے ساتھ چلیے۔چنانچہ میں پنڈت سندر لال کے آخری دیدار کے لیے ان کے ساتھ گیا۔راستے بھر مفتی صاحب نے ان کے بارے میں بعض ایسی اہم باتیں بتائیں جو بعض خاص حضرات ہی جانتے تھے۔مثلاً

گاندھی جی ملک کی تقسیم کے بعد اپنی رہائش پاکستان میں رکھنا چاہتے تھے۔اس مقصد کے لیے انہوں نے عین قتل و غارتگری کے عہد میں پنڈت سندر لال کو پنجاب بھیجا تا کہ وہ وہاں کی بربریت اور درندگی میں شرافت کا نمونہ پیش کریں اور اس طرح وہاں گاندھی جی کی آمد کی راہ ہموار کریں۔جب دہلی میں ایک ہندو دہشت پسند نے گاندھی جی کو قتل کر دیا۔تو پھر گاندھی کا پاکستان جانے کا خواب پورا نہ ہوا۔

مفتی صاحب بہت کم گو اور کم خور تھے اور ساتھ ہی بہت کم نویس بھی۔ان کی اکثر تقریروں میں میں نے یہ جملہ سُنا کہ موضوع بہت اہم اور تفصیل طلب ہے۔اس وقت چند اشاروں ہی سے کام لوں گا۔کسی اور وقت تفصیل سے اظہارِ خیال کروں گا۔میں نے کبھی کسی موضوع پر انہیں تفصیل سے گفتگو کرتے نہیں سنا اور اس کی حسرت دل ہی کی دل میں رہ گئی۔جامعہ میں میں نے اپنے بعض استادوں سے مولوی کی تعریف سنی تھی کہ اس کا معدہ اور مُنہ ہر وقت مصروف رہتا ہے۔مولوی کے معدے اور مُنہ کو آرام حرام ہے۔مفتی صاحب اس معیار پر بھی پورے نہیں اُترے۔ان کی کم گوئی اور کم خوری اپنی مثال آپ تھی۔

علمائے دیوبند سے ابتدا میں میری عقیدت بڑی حد تک اندھی عقیدت تھی۔حضرت سندھی کی صحبت اور شاگردی میں یہ عقیدت عقلیت سے بدلنے لگی۔آخر کچھ دن بعد یہ عقیدت ہوا ہوگئی۔ابتدا میں میری عقیدت محض میرا خاندانی ورثہ تھا۔یہ عقیدت نقلی تھی،حضرت سندھی کی صحبت سے جو عقیدت پیدا ہوئی وہ عقلی اور اصلی تھی۔یہ واقعی میری اپنی عقیدت تھی۔وہ میری اپنی عقل کا عطیہ تھی۔کسی کی نقل نہیں تھی۔میں زندگی بھر حضرت سندھی کے تربیت کے اس احسان کو فراموش نہیں کرسکتا۔جامعہ کی عام فضا بھی محض عقیدت مندی کی فضا نہیں تھی۔حضرت سندھی نے فضا کو عقلیت اور فکر و تامل سے خوب سے خوب تر کیا۔

مجھے بچپن ہی سے جن حضرات سے بے حد عقیدت تھی،ان میں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب کی ذاتِ گرامی تھی،مفتی صاحب بھی اندھی عقیدت کے قائل نہیں تھے،بلکہ اسے ناپسند کرتے تھے۔لیکن ان کی ناپسندیدگی بھی ایک ہلکے رنگ کی طرح ہوتی تھی جس میں تیزی نام کو نہ تھی۔اندھی عقیدت اور انتہا پسندی سے مفتی صاحب کا دامن کبھی داغدار نہ ہوا۔

حضرت شیخ الاسلام،مولانا حسین احمد مدنی بعض معاملات میں انتہا پسند تھے،مجھے جس زمانے میں حضرت مدنی سے بے انتہا عقیدت تھی اور حضرت کے پیر دبانے میں مجھے اپنے درجات کے بلند ہونے پر ایمانِ محکم تھا۔اس زمانے میں حضرت شاہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مجھے حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ سے ملایا۔شاہ جی کو ایک طرف حضرت شیخ الاسلام سے عقیدت تھی،دوسری طرف حضرت مولانا الیاس سے بھی ارادت تھی۔مجھے بھی شاہ جی نے حضرت مولانا الیاس سے ملایا جو تبلیغی جماعت کے مؤسس تھے،مگر سیاست سے یکسر بے تعلق۔میں

سیاسی افکار میں حضرت مدنی سے بہت متاثر تھا۔ دل میں یہ بات ایمان کی طرح بیٹھ گئی تھی کہ ساری بُرائیوں کی جڑ انگریزی حکومت ہے، جس دن یہ ختم ہو جائے گی ساری بُرائیاں ہوا ہو جائیں گی۔ انگریزوں کے بعد ہندوستان جنت نشان بن جائے گا۔ پیالے سے وہی چھلکتا ہے جس سے یہ بھرا ہوا ہے۔ دل کی یہی بات کسی طرح حضرت جی کی صحبت میں بھی زبان پر آ گئی۔ حضرت جی کے تیور بدل گئے۔ مجھ سے پوچھا ہندوستان کی آبادی کتنی ہے؟ میں نے کہا، چالیس کروڑ۔ پھر فرمایا ہندوستان میں انگریز کتنے ہیں؟ میں نے کہا، زیادہ سے زیادہ چالیس ہزار۔ حضرت جی نے فرمایا کہ چالیس کروڑ آدمی کیا چالیس ہزار کو جذب نہیں کر سکتے۔ میں یہ سن کر خاموش ہو رہا، لیکن یہ خیال مجھے پریشان کرتا رہا کہ انگریزوں سے لڑنا ہی ہمارا اوڑھنا تو نہیں ہے۔ حضرت جی کا خیال تھا کہ اگر مسلمان عملاً سچے مسلمان ہوں تو انگریزوں کو نکالنے کی بجائے انہیں جذب کر سکتے ہیں۔ کسی قوم کی دشمنی اسلام کی دعوت نہیں ہے۔ اسلام دوسروں سے الگ ہونے کی جگہ اُن سے ملنے اور دوستی کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ میرٹھ کے کسی جلسے میں حضرت شیخ تشریف لائے۔ میں حضرت مدنی کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہا۔ حضرت نے ازراہِ شفقت مجھے کھانے میں شریک کر لیا۔ پھر حضرت کی لمبی تقریر سنی جو بہت اُکتا دینے والی تھی۔ پھر حضرت آرام کرنے لگے۔ اب مجھے موقع ملا کہ میں حضرت سے دل کی بات کہوں جو دل میں پھانس بن کر چُبھ رہی تھی۔ میں حضرت کے پیر دبا رہا تھا۔ حضرت آرام فرما رہے تھے کہ دبی زبان سے حضرت جی کا یہ جملہ نکل گیا کہ ''اسلام انگریزوں کو نکالنے کی تعلیم نہیں دیتا''۔ میں ابھی اپنی پوری بات بھی کہہ نہ پایا تھا کہ حضرت مدنی غصہ سے بپھر گئے اور کروٹیں بدلنے لگے۔ اور اپنے پیر سکوڑ لئے۔ پھر غصہ سے اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ فرمانے لگے اس وقت انگریزوں سے لڑنا ہی سب سے بڑی نیکی ہے۔ انسان تو انسان اگر کتے اور سور بھی انگریزوں پر دوڑیں تو ان کا ساتھ میں دوں گا۔ حضرت مدنی کے اس طیش سے میں سہم گیا۔ اپنی گستاخی پر ندامت بھی تھی اور اتنی ندامت کہ معافی چاہنے کی ہمت بھی نہ تھی۔ پھر حضرت لیٹ گئے، تو غصہ بھی لوٹ گیا۔ اب میں پھر ڈرتے ڈرتے پیر دبانے لگا، بات آئی گئی ہوئی۔

ملک کی آزادی کے بعد جب آزادی کا جشن منانے میں میں مدہوش اور مست تھا کہ اچانک دلّی کے مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اس سخت مصیبت میں گاندھی جی کے دل میں خدا نے نیکی ڈال دی، بہت بڑی نیکی، انہوں نے مون برت رکھا اور مسلمانوں کی حمایت میں جان کی بازی لگا دی۔ لیکن گاندھی جی کی نیکی کے جواب میں دہلی میں دہشت پسند ہندوؤں نے ان کو قتل کر کے اپنے دل کا ارمان پورا کر لیا۔ گاندھی کے قتل نے مجھے بے حد متاثر اور بہت متاسف کیا۔ گاندھی جی کے آخری دِنوں میں میں ان کے ساتھ تھا۔ گاندھی کے ہمت دلانے پر مولانا آزاد، رفیع احمد قدوائی اور ان کا پورا خاندان اور مولانا حفظ الرحمٰن دلّی کے خوف زدہ تباہ حال مسلمانوں کی مدد کے لیے جم گئے تھے، ڈٹ گئے تھے۔ جب دہلی میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا تو قرولباغ

میں مفتی صاحب کا ادارہ مکتبہ برہان اور جامعہ کا مکتبہ اور مکتب خانہ آگ کی لپٹوں میں تھا۔ اس تباہی کے بعد مکتبہ برہان قرولباغ سے جامع مسجد کے اُردو بازار کی ایک گلی میں آگیا۔ اس گلی میں مفتی صاحب کا قیام بھی تھا۔ جامعہ کے اساتذہ اور طلبا ابھی دہلی میں مسلمانوں کے زخموں پر مدد کا مرہم رکھ رہے تھے۔ جنگِ آزادی میں حصہ لینے والے علماء کا ایک طبقہ بھی اس صورتِ حال پر انگشت بدنداں تھا اور سخت مایوسی کا شکار تھا کہ کیا سوچا تھا اور ہو گیا کیا۔

حضرت مدنی بھی ایک سخت کشمکش سے گزر رہے تھے۔ وہ اسی زمانے میں دلی میں آئے اور کشمیری دروازے کی ایک مسجد میں قیام تھا۔ وہاں عقیدت مندوں کی ایک بھیڑ تھی۔ آزادی کے بعد میری حضرت مدنی سے ابھی کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میں مفتی صاحب کے یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ مفتی صاحب نے بڑی سنجیدگی سے مجھ سے کہا: حضرت مدنی آئے ہوئے ہیں، کشمیری دروازے کی ایک مسجد میں قیام ہے، آپ جا کر مل لیجئے۔

میں اس سے پہلے حضرت مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید کے دلی جذبات سے واقف تھا۔ آزادی کے بعد اس قیامت کے ہنگامے میں مجھے مولانا احمد سعید کا وہ لطیفہ یاد تھا کہ جب میں نے ان سے پوچھا کہ حضرت یہ کیا ہوا؟ مولانا احمد سعید بڑے شگفتہ مزاج اور زندہ دل بزرگ تھے۔ برجستہ کہا:

''میاں صاحب ہوا کیا، پکائی کھیر تھی قسمت سے ہو گیا دلیہ''

میرا خیال تھا کہ حضرت مدنی سے مل کر بھی یہی بات چیت ہوگی اور آزادی کے بعد ان کے تاثرات معلوم کر سکوں گا۔ حضرت مفتی صاحب کے اُکسانے سے میں بھی حضرت مدنی کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ نوعمری ہی سے حضرت کا عقیدت مند اور ارادت مند تھا۔ سفر حضر میں بھی حضرت کا ساتھ رہ چکا تھا۔ دیوبند میں جب بھی گیا تو مدنی حضرت کے درِ دولت پر ان کے خوان نعمت پر کھانے میں شریک ہونے کا شرف بھی مجھے حاصل ہوا۔ مگر آج کی ملاقات کا رنگ ہی کچھ نرالا تھا۔ میں جوں ہی مسجد میں داخل ہوا تو حضرت کو میرے آنے کی اطلاع دی گئی۔ حضرت کی خدمت میں مجھے حجرے میں بلایا گیا۔ مجھے دیکھتے ہی حضرت پر ایک ایسی سخت کیفیت طاری ہو گئی کہ میں دَنگ رہ گیا۔ فرمایا کہ تمہیں تو رسول کی شکل ہی سے بے تعلقی ہے۔ جس کو رسول سے اجنبیت ہو مجھے اس سے کیا واسطہ، مجھے تم سے کلام وطعام بھی گوارا نہیں۔ میں حضرت کے اس غصے سے سخت پریشان اور نہایت پشیمان تھا۔ میرا وہی حال تھا کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ حضرت کے ساتھ ان کے عقیدت مندوں کا ایک مجمع تھا۔ سب کے چہروں پر ماشاء اللہ اللہ کا نور تھا۔ لیکن دلوں پر خوف وہراس کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا سعید اکبر آبادی جیسے جید عالم نے بھی شیو کرنا شروع کر دیا تھا۔ حضرت مدنی کی اس ناراضگی اور خفگی نے مجھے بھونچکا کر دیا تھا۔ اس مجمع میں حضرت مولانا محمد میاں مراد آبادی بھی تھے وہ مجھ سے بخوبی واقف تھے۔ حضرت مدنی کے اس رویے سے وہ بھی کسی قدر متاثر تھے۔ جب میں حضرت مدنی کے حجرے سے

بے حد پشیمانی اور نہایت پریشانی کے عالم میں باہر نکلا تو مولانا محمد میاں مرحوم بھی میرے ساتھ ہی حجرے سے باہر آ گئے۔ مجھے دلاسا دیا۔ فرمایا: حضرت سے ملے بغیر ہرگز نہ جائیے۔ میں نے تعجب سے کہا، اب ملنے کا کیا سوال؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں حضرت سے جوتے کھاؤں۔ مولانا محمد میاں مسکرائے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ حضرت کا غصہ آپ سے بربنائے محبت ہے۔ ابھی میں حضرت سے کہتا ہوں کہ آپ اصلاح کا وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ آپ سنت کی پیروی کریں گے، تب آپ ان کی دعائیں لے کر جائیے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مولانا محمد میاں مرحوم نے واپس جا کر حضرت سے میری خاص طور پر سفارش کی۔ حضرت مدنی خاموش ہو گئے۔ میں نے بڑے ادب سے مصافحہ کیا۔ پھر میری خیریت معلوم کی۔ لیکن سیاست کے سانحے اور دلّی کی نئی صورتِ حال پر حضرت نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ میں جب اس افتاد کے بعد مفتی صاحب کے یہاں اپنے وعدے کے مطابق حاضر ہوا تو مجھے دیکھتے ہی مسکرائے جیسے ساری صورتِ حال سے بخوبی واقف ہوں۔ پھر فرمایا: کہئے کیسے گزری؟ میں نے کہا حضرت۔

چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

فرمایا نہیں۔ اس میں پشیمانی کا کیا سوال۔ میں نے اپنی ساری اُفتاد سنا ڈالی۔ فرمایا، یہ بھی ایک رنگ ہے۔ اچھا ہوا۔ آپ نے دیکھ لیا۔ پھر کچھ دیر دل جمعی اور تسلّی کی باتیں کرتے رہے، لیکن حضرت مدنی کے بارے میں اس سے زیادہ ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

ملک کی آزادی اور تقسیم کے سانحے کے بعد جہاد آزادی کے سربراہ علماء میں سے اکثر ذہنی پریشانی اور نفسیاتی پشیمانی میں مبتلا تھے۔ ان کا یہ یقین کہ ملک کی ساری خرابیاں اور ملّت کے سارے مسائل کا واحد حل ملک کی آزادی ہے۔ اب چکنا چور ہو چکا تھا۔ اپنی فکری کج روی کا برملا اعتراف بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے، یہی مشکل ان حضرات کے سامنے پہاڑ بن کر آ کھڑی ہوئی تھی۔ لیکن دِلوں کا چور کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی صورت میں ظاہر بھی ہو جاتا تھا، چند اکابر ملّت البتہ ایسے ضرور تھے جو اس وقت اپنے اس مسلک پر سختی سے کاربند تھے کہ جب آگ لگ رہی ہو تو یہ سوال اُٹھانا کہ آگ کس نے لگائی ہے بے وقت کی راگنی ہے، پہلے لگی ہوئی آگ بجھائی جائے پھر اس پر بحث اور گفتگو ہو کہ آگ کس نے لگائی اور کیوں لگائی تھی۔ ان حضرات نے جس ہمت مردانہ اور فکر عارفانہ کا مظاہرہ کیا وہ علمائے ہند کی تاریخ میں قابل فخر باب ہے۔ دہلی میں مولانا حفظ الرحمٰن، مفتی عتیق الرحمٰن اور مولانا احمد سعید انہی علمائے کرام میں سے تھے۔ مفتی صاحب نے اس زمانے میں اپنا یہ معمول بنالیا تھا کہ وہ روزانہ نہایت پابندی کے ساتھ دن چھپے جمعیۃ علماء کے دفتر گلی قاسم جان پہنچ جاتے اور پھر رات کو کافی دیر سے اپنے مکان واپس تشریف لاتے۔ وہ اس نفسا نفسی کے زمانے میں مولانا حفظ الرحمٰن کے خصوصی مشیر اور ہمہ وقتی معاون تھے۔ اس تعاون

مسلک اور اتحاد مزاج نے دونوں کو ایک دوسرے کا سچا رفیق اور مخلص راز دار بنا دیا تھا۔ کوئی بات کتنی ہی معمولی اور چھوٹی سے چھوٹی ہی کیوں نہ ہو۔ مفتی صاحب مولانا حفظ الرحمٰن کے مشورے کے بغیر کچھ نہ کہتے تھے اور اسی طرح مولانا حفظ الرحمٰن ہر معاملے اور ہر مسئلہ میں مفتی صاحب کی ایماء کے بغیر کچھ نہ کرتے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن اور مفتی صاحب کی پہنچ اس زمانے میں براہِ راست مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو تک تھی۔ اس پہنچ کے نتیجے اور پرواز کے انجام میں دلّی کے بہت سے مسلمانوں کی کروڑہا روپیوں کی جائدادیں انہیں کسٹوڈین سے واپس مل گئیں اس کارِ خیر اور کامیابی نے ان حضرات کے حوصلے بلند اور حلقے کو وسیع کر دیا۔ مفتی صاحب اس بڑے محیط کا ایک ایسا چھوٹا سا مرکز تھے جس پر بہت کم کسی کی نظر پڑتی تھی اور جمتی تھی۔ میں اس زمانے میں جامعہ کالج کا طالبِ علم تھا۔ مفتی صاحب کے بڑے صاحبزادے حافظ مجیب الرحمٰن عثمانی بھی جامعہ کالج کے طالبِ علم تھے وہ مجھ سے جونیر تھے لیکن جامعہ کی اقامتی زندگی میں جونیر اور سینیر میں چنداں فرق نہ تھا۔ اس لیے وہ میرے دوست اور بے تکلف ساتھی تھے۔ مفتی صاحب سے پہلے ہی سے ہمارے خاندانی مراسم تھے اور میں خصوصیت سے مفتی صاحب سے خوردی اور بزرگی کے تعلقات رکھتا تھا۔ اب مفتی صاحب کے صاحبزادے کی دوستی کے بہانے مفتی صاحب کی خدمت میں حاضری کے اور بھی نت نئے مواقع پیدا ہو گئے۔ مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن سے اکثر میں اپنے ذاتی معاملات اور جامعہ کے حالات پر گھنٹوں بحث اور گفتگو کیا کرتا تھا۔ جب مفتی صاحب کے صاحبزادے حافظ مجیب الرحمٰن عثمانی جامعہ کے اساتذہ میں شامل ہو گئے تو ان حضرات کی جامعہ سے دلچسپی اور واقفیت میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا۔ ذاکر صاحب کے علی گڑھ چلے جانے کے بعد جامعہ سے ان کی بے تعلقی بہت ہی غیر متوقع تھی۔ میرا خیال تھا کہ اگر ذاکر صاحب آزادی کے بعد جامعہ کے اس تعمیری اور تعلیمی کام میں لگے رہتے جو وہ اس سے پہلے انجام دے رہے تھے تو یہ نہ صرف جامعہ کے لیے بہت اچھا ہوتا بلکہ اس سے ذاکر صاحب کی بلندی بھی مزید بلندیوں کا ذریعہ اور زینہ بن جاتی۔ مگر افراد کی طرح اداروں کی بگڑی قسمت کو کون بنا سکتا ہے۔ جب جامعہ کے اندرونی معاملات اور انتظامی صورتِ حال زیادہ بگڑنے لگی تو حضرت مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن اکابر جامعہ سے حرفِ شکایت زبان پر لائے بغیر نہ رہ سکے۔ بزرگانِ جامعہ نے اس پر چنداں توجہ نہ کی۔ اس سے یہ حضرات کافی دل برداشتہ اور جامعہ کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ حضرت مفتی صاحب اپنے عقائد اور افکار میں دیوبند کے اکابر ہی کی طرح غیر متزلزل تھے۔ مگر معاملات اور انتظامی مسائل میں بہت دُوررَس نرم اور صلح پسند تھے۔ علماء دیوبند میں مفتی صاحب کا یہ امتیاز ان کا خاص اپنا مزاج تھا جس کے متعدد مظاہرے میں نے بھی دیکھے اور ان سے بہت متاثر اور بہت مسرور ہوا۔ تمام علماء کے برخلاف مفتی صاحب اپنے مخالفین سے بھی اپنائیت تواضع اور ملنساری کا سلوک روا رکھتے تھے اور اس معاملے میں ہر طرح کی جانبداری سے بلند تھے جب دارالعلوم کا جشن

منانے کا بڑے پیمانے پر اہتمام ہو رہا تھا تو مفتی صاحب ان سربراہوں میں سے تھے جو انتظامی معاملات میں سب سے زیادہ دخیل تھے۔ علماء دیوبند کو جماعتِ اسلامی کے مسلک سے سخت اختلاف تھا اور حضرت مفتی صاحب بھی جماعتِ اسلامی کے مسلک سے بہت واضح اختلاف رکھتے تھے۔ لیکن جب مسز اندرا گاندی نے ایمرجنسی کا نفاذ کیا تو جماعتِ اسلامی کے بہت ارکان بھی ملک کی دوسری فرقہ پرست جماعتوں کے رہنماؤں کے ساتھ تھوڑی سی مدّت جیل میں رہے، اس قربت اور مدت جماعتِ اسلامی کے بعض اکابر پر یہ راز منکشف ہوا کہ علمائے دیوبند نے سیکولرزم کی حمایت کر کے ایک بڑا اہم اجتہاد کیا ہے اسی وقت سے جمہوریت اور سیکولرزم کے بارے میں جماعتِ اسلامی کے رویّے میں کچھ معمولی تبدیلی آئی، مفتی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ملک کی آزادی کے بعد سے مدتوں تک جو بات ہم جماعت اسلامی کو نہ سمجھا سکے وہ جیل میں چند دنوں میں ہندو فرقہ پرستوں نے ان کو سمجھا دی۔ مجلس مشاورت میں مفتی صاحب کے اسی رویہ نے جماعتِ اسلامی کے بہت سے ارکان کو اپنا ہم نوا بنالیا اور جماعتِ اسلامی کے بہت سے اکابر مسائل اور معاملات میں مفتی صاحب سے صلاح لینے اور مشورہ کرنے میں کوئی جھجک اور تکلف محسوس نہ کرتے تھے اور پوری طرح مشاورت کے قائل ہو گئے۔ دارالعلوم دیوبند کے جشن منانے کے موقع پر وہاں ایک بازار لگانے کی تجویز پاس ہوئی تھی۔ جہاں لوگ عام ضرورت کی چیزیں خرید سکیں۔ اس بازار میں جماعتِ اسلامی کے حضرات بھی اپنی کتابوں کی دکان لگانا چاہتے تھے۔ دیوبند کے کٹر علماء جماعتِ اسلامی کی کتابوں کی دوکان کے خلاف تھے۔ اور یہ حضرات اپنے ہی اکابر کی کتابیں اس نمائش میں رکھنا، دکھانا اور بیچنا چاہتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب نے ان حضرات کو یہ بات سمجھائی کہ اگر کچھ لوگ جماعتِ اسلامی کی کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں تو اچھا یہی ہے کہ وہ اس کے لیے جماعتِ اسلامی کی دکان ہی سے یہ کتابیں خریدیں اور ہم اپنی دکان پر ان کی کتابوں کی ذمہ داری نہ لیں۔ ہم اپنے اکابر کی کتابیں اپنی دکان پر رکھیں تو زیادہ اچھی بات ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ اور معاملہ فہمی سے مدرسہ کے مہتمم قاری محمد طیب صاحب کو بھی اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہاں جماعتِ اسلامی کی ایک دکان کھل جانے سے آپ کے مسلک اور مرتبے پر کوئی آنچ نہ آئے گی۔ جس طرح چائے اور کھانے کی بہت سی دکانیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح اگر کتابوں کی بھی متعدد دکانیں ہوں تو اس پر کون سی اعتراض کی بات ہے۔ چنانچہ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور وہاں جماعتِ اسلامی کی کتابوں کی فراہمی کا ایک مرکز مہیا ہو گیا۔

مفتی صاحب دارالعلوم کے لائق فرزندوں میں تھے۔ ان کے خاندان کے اکابر کو اس ادارے سے جو ربط اور تعلق تھا وہ دیوبند کی تاریخ کا ایک باب ہے۔ لیکن کئی ایسے سخت مرحلے بھی آئے جب حضرت مفتی صاحب اور ان کے خاندان کے بزرگوں کو نہ صرف اس ادارے سے اختلاف کرنا پڑا بلکہ ہجرت کی سنت پر بھی عمل پیرا ہونا پڑا۔

جب حضرت مفتی صاحب کے استاد حضرت کشمیری نے دیوبند سے ڈابھیل کی راہ لی تو اس وقت بھی مفتی صاحب شمع انوری کے پروانوں میں تھے۔

ملک کی تقسیم کے بعد جب دیوبند پر ایک آزمائشی وقت پڑا۔ دارالعلوم کے مہتمم قاری محمد طیب صاحب دیوبند سے بہت دُور اور دیر تک ایک نئی تعلیمی بستی بسانے کی فکر میں کچھ دنوں کے لیے چلے گئے۔ قاری صاحب کی عدم موجودگی میں دیوبند کے اہتمام کا مسئلہ اکابر علماء کے لیے ایک سخت مرحلہ بن گیا۔ بعض حضرات نے قاری صاحب کی عارضی جُدائی کو مستقل قرار دے کر نئے مہتمم صاحب کے انتخاب کی ضرورت محسوس کی اور دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا حسین احمد مدنی کو بھی اس کے لیے آمادہ کرلیا۔ اس سلسلہ میں دہلی سے مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا بشیر احمد کٹھوری، حضرت مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید صاحب ایک کار لے کر دہلی سے میرٹھ پہنچے تا کہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ایک رکن حکیم محمد اسحاق کٹھوری کو اپنے ساتھ دیوبند لے چلیں اور وہاں حضرت شیخ کو اس کے لیے آمادہ کریں کہ وہ مفتی عتیق الرحمٰن کو مدرسہ کا مہتمم بنانے کی تجویز پاس کریں۔ ان میں سے بعض حضرات نے جب یہ تجویز حکیم محمد اسحاق کے سامنے رکھی تو وہ سب کچھ سن کر خاموش رہے اور ٹس سے مَس نہ ہوئے، لیکن حکیم صاحب کے چھوٹے صاحبزادے حکیم محمد ادریس صاحب نے جو اس وقت اس گفتگو کے موقع پر وہاں موجود تھے۔ مولانا احمد سعید کے کان میں کہا کہ آپ ابا سے کہیں کہ مہتمم محمد اسد اللہ خاں بدایونی کو بنوادیں تا کہ جو کام مفتی صاحب چار دن میں کریں وہ مولوی اسد اللہ خاں دو دن میں پورا کردیں (مولوی اسد اللہ خاں حکیم صاحب کے بچوں کے اَتالیق تھے۔ کانگریس کی تحریک میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ایک مخلص کارکن تھے لیکن انتظامی معاملات میں انہیں کوئی تجربہ اور کوئی دخل نہ تھا) مولوی احمد سعید صاحب نے یہ سن کر قہقہہ لگایا اور دیر تک بے اختیار ہنستے رہے۔ دوسرے حضرات نے اس ہنسی پر استفسار کیا تو مولوی احمد سعید صاحب نے یہ راز کی بات سب سے کہہ دی کہ حکیم صاحب کے صاحبزادے میاں محمد ادریس کی تجویز مولوی اسد اللہ کو مہتمم بنانے کی ہے۔ اس پر دوسرے حضرات نے بھی خوب خوب لطف لیا اور مفتی صاحب کے اہتمام کی بات آئی گئی ہوئی۔ جب یہ حضرات کار میں سوار ہو کر دیوبند روانہ ہونے کو تھے تو مولوی احمد سعید صاحب نے بطور مذاق حکیم اسحاق صاحب سے کہا کہ حکیم صاحب آپ پسند کریں تو مولوی اسد اللہ کو بھی ساتھ لے چلیں۔ اس پر حکیم صاحب بھی ہنس پڑے اور کار دیوبند کے لیے روانہ ہوگئی۔ دیوبند پہنچ کر حکیم اسحاق صاحب نے خلافِ توقع حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی سے بڑے تند و تلخ لہجے میں کہا کہ قاری محمد طیب صاحب آپ ہی کی وجہ سے یہاں سے گئے ہیں۔ آپ ہی چاہتے ہیں کہ وہ یہاں نہ آئیں سارے معاملات کی ذمہ داری آپ پر ہے۔ اور آپ چاہیں تو سب کچھ ٹھیک ہوسکتا ہے، آپ قاری صاحب کو مدعو کریں تو وہ واپس آجائیں گے اور میں اس کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ چنانچہ وہاں یہ بات طے

پائی کہ قاری صاحب کو واپس بلوانے کے لیے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی اعانت خصوصی حاصل کی جائے اور قاری صاحب کو واپس بلوالیا جائے، چنانچہ مولانا آزاد کی ذاتی دلچسپی سے یہ کوشش بارآور ہوئی اور حضرت قاری صاحب واپس اہتمام پر آگئے۔

چمن میں پھر سے نسیمِ بہار آپہنچی

تیسرا اور آخری سانحہ جس نے مفتی صاحب کو بہت بددل اور مایوس کردیا وہ دارالعلوم کے جشن کے بعد قاری صاحب کی جانشینی کے مسئلہ کا آخری سین تھا جس نے اس ڈرامے کو ایک سخت اور عظیم المیے پر ختم کردیا۔ اُن دنوں جس طرح کے اختلافات نے سر اُٹھایا اور پھر عالم اسلامی کی اس سب سے بڑی دینی، اخلاقی اور روحانی اقدار کی حامل دانش گاہ نے جو بُرے دن دیکھے وہ اس دانش گاہ کے لیے سب سے بڑی روسیاہی اور رُسوائی کا عظیم المیہ ہے۔ مجھے اس زمانے میں مفتی صاحب کی اس خوبی کا بخوبی مشاہدہ ہوا کہ وہ طوفان سے پہلے طوفان کے آثار سے طوفان کا کتنا صحیح اندازہ لگالیتے ہیں۔ بُرائی کے واقع ہونے سے پہلے اس کی شدت کو اس کی علامتوں سے کس قدر صحیح ناپ لیتے ہیں مفتی صاحب کی فہم وفراست میرے لیے ایک عجوبہ سے کم نہیں تھی۔ میرے لیے محترم مفتی صاحب کے ایک معتمد خاص عالم کو حکومت ہند نے ایک بڑے علمی اعزاز سے نوازا۔ میں اس تقریب میں اپنے محترم استاد ڈاکٹر عابد حسین مرحوم کے ساتھ شریک تھا۔ مفتی صاحب بھی اس خصوصی محفل میں تشریف رکھتے تھے۔ میں نے بڑی گرم جوشی اور نہایت تپاک سے مفتی صاحب کو مبارک باد دی اور مجھے یقین تھا کہ وہ میری اس مخلصانہ تہنیت سے بہت مسرور اور ممنون ہوں گے لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مفتی صاحب نے کسی گرم جوشی یا خوشنودی کے اظہار کے بجائے ایک آہ سرد بھر کر آسمان پر نگاہ ڈالتے ہوئے مجھ سے کہا: خدا دارالعلوم کو ہر بلا سے بچائے۔ اس موقع پر مفتی صاحب کا یہ تاثر میرے لیے ایک عقدۂ لاینحل تھا کہ ایک عالم دین جو دارالعلوم کے فرزند تھے اور حضرت مفتی صاحب سے گہرے مراسم بھی رکھتے تھے۔ حکومت نے ایک علمی اعزاز سے نوازا تھا۔ یہ بات تو خود دارالعلوم کے لیے باعثِ فخر اور مفتی صاحب کے لیے باعثِ مسرت ہونی چاہئے تھی۔ مگر مفتی صاحب کا یہ رویہ انہیں ایک روحانی خانوادے سے متعلق کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا جو میں سمجھ سکتا۔ کچھ دن کے بعد حکومت نے اسی ادارے کے ایک اور فرزند کو ایک ایسے ہی علمی اعزاز سے نوازا اور مفتی صاحب کسی جلسے میں شرکت کے لیے بعض دوسرے علماء کے ساتھ بنگلور تشریف لائے اور مجھے اپنی ملاقات کا شرف عطا کیا۔ ایک خصوصی محفل میں میں نے پھر بڑی گرم جوشی سے اور انتہائی خلوص سے اپنا نذرانۂ تہنیت مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ میں متوقع تھا کہ وہ مسرور ہوں گے اور مطمئن۔ اب پھر مفتی صاحب نے کچھ تامّل سے ٹھنڈی سانس بھری اور مجھ سے فرمانے لگے کہ لوگ علاماتِ قیامت سے قیامت کا اندازہ نہیں لگاتے۔ قیامت کے آنے کے منتظر رہتے ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا

ہے کہ ایک بڑا طوفان برپا ہونے والا ہے۔ خدا خیر کرے اور دیوبند کو نظر بد سے بچائے۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب مفتی صاحب اور بعض دوسرے علماء مسز اندرا گاندھی کے رویّہ سے سخت برہم اور بیزار تھے۔ جشن دارالعلوم کے موقع پر میں وہاں اپنی یونیورسٹی کی جانب سے بطور نمائندہ تھا اور یہ محسوس کر رہا تھا کہ بظاہر یہ چھوٹا سا ادارہ عالم اسلامی میں کتنی اہمیت اور کس قدر وقعت کا حامل ہے وہاں میں نے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اور دوسرے ملکی قائدین کی تشریف آوری پر قدرے تعجب کا اظہار کیا تھا۔ مسز اندرا گاندھی نے اس جشن کے موقع پر دیوبند جا کر اس عظیم اجتماع کی کیفیت کا بچشم خود معائنہ کیا تھا۔ لیکن اپنے تاثرات کو اپنے دل میں اس طرح چھپا لیا تھا کہ کسی ذہن پر اس کا کوئی عکس نہ پڑ سکے۔ اگر میرا قیاس غلط نہیں ہے۔ یہی وہ نقطۂ آغاز تھا جس نے بعد کو دیوبند میں ایک بڑے طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ دلّی سے جو ہندوستان کا دل اور اس کی راجدھانی ہے کچھ دُور دیوبند کا یہ قصبہ اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے ایک بوریہ نشین کے بلاوے پر عالم اسلامی کی اتنی شخصیتوں کا اتنا بڑا اجتماع بھی ممکن ہے۔ ایک عربی مدرسہ کا بوریہ نشین اور عالم اسلامی کی ایسی برگزیدہ اور ممتاز شخصیتوں کا میزبان؟ یہ تھا مفتی صاحب کا وہ خطرہ، وہ اشارہ وہ بھیانک خواب جس کی طرف وہ مجھے بار بار متوجہ کر رہے تھے اور میں نا آشنائے راز اس جشن کی کامیابی اس کی عظمت اور اہمیت پر خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا تھا۔ میں جس قدر مطمئن اور مسرور تھا اور مفتی صاحب اتنے ہی ملول اور متاسف۔ میں وہاں سے لوٹا تو دیوبند اس کی عظمت، اس کی روحانی اہمیت قاری صاحب کے حسنِ انتظام کے مناظر اور مظاہر ان کی مقبولیت اور عظمت کے نقوش میرے دل و دماغ پر بہاروں کی طرح رونق اور رنگینی کا سرمایہ اور سامان فراہم کر رہے تھے۔ لیکن مفتی صاحب کی دُور رَس نگاہیں اس جشن کی تعمیر میں چھپی ہوئی اس تخریب پر جمی ہوئی تھیں جو کسی کے تصور میں نہ تھیں۔ میں نے اس جشن کے موقع پر مفتی صاحب کو جس قدر متاسف اور متحیر دیکھا اتنا کبھی نہ دیکھا۔ آخر کچھ دن کے بعد ایک دھماکہ ہوا ایک ایسا سیاسی زلزلہ آیا جس نے دیوبند کی روحانی اور اخلاقی قدروں کو آناً فاناً ملیامیٹ کر دیا۔ یہ وہی زلزلہ تھا جس کا خطرہ اور خیال رمز و ایما میں مفتی صاحب نے کئی بار ظاہر کیا تھا۔ اس زمانے میں مجھے دہلی اور دیوبند، حیدرآباد اور بمبئی کے بہت سے عمائدین کی بہت سی اَنہونی باتیں اور ہوش رُبا روایتیں بہت سے معتبر اور مستند حضرات سے مجھے اس ادارے کی بلندی اور پستی کی وہ باتیں اور گھاتیں دیکھنی اور سننی پڑیں جن کی علمائے دین سے نسبت بھی ان کی توہین ہے۔ اس بارے میں خود مفتی صاحب سے بھی مجھے کئی بار تبادلہ خیال کی نوبت آئی اور میں نے محسوس کیا کہ شاید ان کے تدبر سے اب یہ گتھی سلجھ جائے اور یہ معاملہ بگڑنے سے بچ جائے۔ ایک روایت جو درایت پر مبنی تھی یہ بھی تھی کہ حضرت مفتی صاحب نے حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کو اہتمام سے دست بردار ہونے کے لیے آمادہ کر لیا ہے اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی کو اہتمام کی ذمہ داری سونپے جانے کی بات پکی کر لی ہے۔ مگر مسلمانوں کے دارالعلوم کی قسمت میں

جو روسیاہی مقدر ہو چکی تھی اسے نہ مفتی صاحب کی کوئی تدبیر روک سکی نہ علمائے کرام کا وقعت و وقار کا پہاڑ ریت کا ٹیلہ بننے سے بچ سکا۔ دین کے تقویٰ اور طہارت کے نمائندوں نے اپنے ہی بزرگوں کی رُسوائی اور اپنے ہی اسلاف کی روسیاہی کا جو ثبوت اور سرمایہ فراہم کیا اس پر کون یہ کہنے سے باز رہ سکتا ہے ؎

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

اس ادارہ ملّی کے نزاع نے حضرت مفتی صاحب کو حد درجہ ملول اور مغموم کر دیا تھا، مگر حضرت قاری طیب کے انتقال پُرملال نے انہیں یک سر امید کی روشنی سے محروم کر کے نا اُمیدی کے اندھیرے میں مبتلا اور مفلوج کر دیا تھا۔ آخری بار ملاقات ہوئی تو اندازہ ہو گیا کہ گو مفتی صاحب بقیدِ حیات ہیں مگر اب اس قید اور حیات دونوں کا دم واپسی ہے۔ یہ چراغ جو کبھی روشنی اور رونق رکھتا تھا اب صرف دھواں ہی دھواں رہ گیا۔ چند منٹ مفتی صاحب کی خدمت میں خاموش بیٹھ کر مجھے احساس ہوا کہ اب ان سے گفتگو کرنا یا کسی سوال کا جواب پانا اب ان کی روحانی اور ذہنی اذیت میں اضافہ کرنا ہے۔ میں خاموشی سے بغیر مصافحہ کیے اُٹھا۔ ابھی مُڑا بھی نہیں تھا کہ نہ معلوم کیسے اور کہاں سے مفتی صاحب کی گم شدہ قوت گویائی عود کر آئی، بے نور آنکھوں میں آخری بار روشنی کی ایک رمق بن کر چمکی، جسم میں ایک جنبش خفی سی ہوئی۔ رُک رُک کر اتنا فرمایا کہ آتے رہئے۔ پھر اپنے آپ کو نہ سنبھال سکے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ میں نے تسلی کے دو چار لفظ کہے۔ مزاج پُرسی کرنے والوں نے ہمت دلائی متعلقین نے دلاسا دیا اور خدمت کرنے والوں نے انہیں آہستہ آہستہ لٹانے کی سعی کی۔ رُک رُک کر یہ کہنے کی کوشش کرتے رہے کہ میرے بعد بھی آتے رہئے۔ میں لوٹ آیا اور پھر ہونے والی بات ہو کر رہی۔

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

(مفکر ملت نمبر: ص ۵۰)

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

اسلاف کی روایات کے امین

(از مولانا محمد حنیف ملّی ۔شیخ الحدیث معہدِ ملّت مالیگاؤں)

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال سے دلّی کے اُن علماء کی بساط خالی ہوگئی، جو حرکت وعمل، دعوت وعزیمت، درد وکرب، ایثار وقربانی اور فکر وخیال کی اپنی طویل اور حسین تاریخ رکھتے تھے وہ میر ملّت اُٹھ گیا، جس نے ملّتِ اسلامیہ کو زندگی کا سبق دیا تھا، وہ پیر میکدہ اُٹھ گیا جس کی ذات سے توحید کے متوالے توحید کے جام ایک جہاں کو تقسیم کرتے تھے۔ ہاں وہ مُجاہد اُٹھ گیا جس نے ۴۷ء کے ہنگاموں سے ہندو پاک جنگ تک نہ صرف پامردی سے غیر مسلم جارحیت کا مقابلہ کیا بلکہ مسلمانوں کو حوصلہ نہ ہارنے کا سبق دیا، مفتی صاحب اسلاف کے دَور کی آخری کڑی تھے، وہ اپنے والدِ بزرگوار کی فقہی بصیرت، تنقیح مسائل، گرہ کُشائی دُوربینی کے سچے وارث تھے، عثمانی خاندان کے وہ گوہر شب چراغ تھے، جس کی ضوفشانی سے دُنیا ایک زمانہ تک کسبِ نُور کرتی رہی، اُنہوں نے اپنے رفقاء کے تعاون سے ایسے لکھنے والوں کی ایک ٹیم تیار کی، جس کی تصنیفات دنیا ایک زمانہ تک یاد رکھے گی، وہ دارالعلوم کے اُن فرزندوں میں شمار ہوتے تھے جن کا نصب العین دارالعلوم کی ترقّی کے سوا کچھ نہ تھا، ملّتِ اسلامیہ انہیں ہندوستان کے معمار، تاریخ ساز، اور عہد آفریں علماء میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے گی۔ مفتی صاحب نہ صرف ایک عالم دین بلکہ برصغیر میں فقہ وافتاء، تصنیف وتالیف، درس گاہ وخانقاہ کے لیے پوری ایک سرگرم اور فعّال نسل کے بانی تھے، اُنہوں نے اگرچہ تحریر وقلم کے میدان میں اپنے معاصرین میں زیادہ نہیں لکھا تاہم معرکے گرمائے، مجلسیں آباد کیں، اپنے فکر وشعور سے اُلجھے ہوئے مسائل کی گُتھیاں سلجھائیں، ہند اور بیرونِ ہند میں پوری دُنیا کو ملّت کی قدروں سے آگاہ کیا، اور قرطاس وقلم کا ذوق رکھنے والوں کے لیے تحقیق وریسرچ اور مضامین کے نت نئے زاویے عطا کئے، اور گائیڈ ریسرچ کی حیثیت سے چھوٹے بڑے سب کو راہ بتائی، جس پر چل کر اُن نَوخیز مصنّفین کو ان کی تصنیفات کے ذریعہ پورے ملک نے پہچانا، اور یہ وہ خدمت ہے جس پر لوگوں کی کم نظر جاتی ہے۔

ندوۃ المصنّفین اُسی زندۂ جاوید تحریک کا نام ہے، جسے مفتی صاحب نے اپنا لہو دے کر گُل رنگ بنادیا ہے، اور آج جو ہندوستان کے ممتاز، معیاری اور ہمہ گیر اداروں میں شمار ہوتا ہے۔

دلّی نے اپنی زندگی میں لاکھوں علماء دیکھے ہوں گے،لیکن ایسے جامع کمالات کے لیے وہ ہمیشہ ترسے گی، جس کی زبان تسنیم وکوثر کی طرح پاک ونفع بخش اور قلم نہایت سادہ، زود اثر اور سحر انگیز اور جس کے فکر وشعور کے سامنے ہمالیہ کی بلندیاں بھی خم ہوں، جس کی اصابتِ رائے اور زُود فہمی نے نازک موڑ پر بھی مسائل چشم زدن میں سلجھائے،حقیقت یہ ہے کہ مفتی صاحب علماء کے اس ہراوَل میں نقیب کی حیثیت رکھتے تھے،وہ جنگِ آزادی کے صفِ اوّل کے مجاہد تھے،اُنہوں نے شعلے بھی برسائے اور شبنم ریزی بھی کی،خاروں کو گلے بھی لگایا،اور مُلک ومِلّت کے لیے اپنوں کی دُوری بھی گوارا کی،ان کی زندگی میں ایک دلیر، بیباک، معاملہ فہم سربکف اور دُور اندیش مجاہد وطن کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے،آزادی کے لیے حضرت شیخ الہند کے ایماء پر جب حضرت مدنی نے جہاد کا اعلان کیا تو دلّی کے علماء میں مفتی صاحب نے سب سے پہلے یہ فتویٰ دیا کہ انگریزوں سے جنگ ناگزیر ہے،اور اب ایک مسلمان خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔حضرت سحبان الہند کے بعد دہلی کے بلبل خوشنوا تھے،جن کے نام پر پورا شہر سمٹ کرگوش برآواز ہوجاتا تھا،وہ اعلیٰ دماغ،روشن ضمیر اور حساس تھے،ان کی نگاہیں اداشناس اور انتہائی متحرک تھیں، زبان انتہائی شیریں، جملے معنیٰ خیز، ترکیبیں ہموار اور اندازِ بیان بڑا شستہ تھا، ان کی تقریریں، تکرار اور مہملہ مضامین سے پاک تھیں۔دو دو گھنٹے کی لمبی لمبی تقریروں میں اُن کی شخصیت بادِ صبا اور موجِ کوثر پیش کرتی تھی۔ مخالفتوں اور شور سے بھرے ہوئے مجمعوں کو اپنی اداشناس نگاہوں، دل رُبا زبان اور معنیٰ خیز غمزوں سے رام کرلینا مفتی صاحب کی زندگی کا انتہائی نمایاں وصف تھا،اُن کے معاصرین میں مولانا محمد طیّب صاحب کے سوا کوئی نہ تھا، افسوس کہ یہ مِلّت اپنے اِن دونوں بزرگوں سے آج محروم ہے۔

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی دارالعلوم کے اُن اوّلین سپوتوں میں ہیں جن پر مادرِ علمی زندگی بھر ناز کرے گی۔فراغت کے بعد اپنے بزرگوں کے اصرار پر انہوں نے برسوں باکمال اُستاد کی طرح دارالعلوم میں درس دیا۔بعد میں حضرت شاہ صاحب کے ساتھ ڈابھیل آگئے،جہاں تدریس کے ساتھ افتاء کی ذمہ داری بھی قبول کرلی، کچھ دنوں کے بعد جب جنگِ آزادی شباب پر ہوئی تو مفتی صاحب بھی اس سرگرم تحریک میں اپنے بزرگوں کے ساتھ شامل ہوگئے،حکومت کے مظالم اور قید وبند کی تکالیف سے بے نیاز مفتی صاحب نے ہر اُس تحریک کو گرمایا جس میں اکابر کا لہو اور پسینہ شامل تھا،اور اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے جب تک انگریز نے ملک نہ چھوڑ دیا۔یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ آج جو لوگ بھی حکومت کی کُرسیوں پر فائز ہیں،مفتی صاحب کی قربانیاں اُن سے کسی طرح کم نہیں ہیں،مگر چونکہ اس مردِ دُرویش نے کبھی عہدوں کو پسند نہیں کیا اس لیے آزادی ملتے ہی تعمیری کاموں اور قومی کاموں میں مصروف ہوگئے۔تا آنکہ زندگی بھی اسی کے لیے قربان کردی۔بلاشبہ علم وادب اور قوم ومِلّت کے میدانوں میں مرحوم نے اتنا زبردست کام کیا ہے جو جماعتوں اور اداروں کی زندگی میں کبھی کبھی

ہوتا ہے، مرحوم حج کمیٹی کے مقبول ترین چیرمین بھی رہ چکے ہیں۔ ان کے دَور کے کارنامے، حجاج کے لیے سہولت آج کے کام کرنے والوں کے لیے ایک نمونہ ہیں، وہ دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کے تاحیات باوقار رُکن رہے۔ شوریٰ میں ان کے مشورہ کو بڑا وزن حاصل رہا۔ اُنہوں نے اس اہم ترین مجلس کی بارہا صدارت بھی فرمائی، اور آگے بڑھ کر عملی طور پر بہت سی ذمہ داریاں بھی قبول فرمائیں، وہ اپنے گہرے دوست مجاہدِ ملّت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فکر و عمل کی طاقت اور اُن کے کارناموں میں دست و بازو اور احساسات کے نقشِ جمیل تھے، دارالعلوم کی عظمت اور ترقی انہیں جان و دل سے زیادہ عزیز تھی، اخیر میں جو وقتِ نازک دارالعلوم پر آیا مرحوم اخیر تک اس کے لیے کوشاں رہے، بلکہ یہی فکر ان کے لیے پیامِ اَجل ثابت ہوئی۔

مفتی صاحب کا دل قوم و ملّت کے درد سے بھرا ہوا تھا، ملک کے گوشے گوشے میں جب فسادات کی لہر چلی اور مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا تو ہندوستان کے معلم علماء نے ساری مسلم تنظیموں کو یکجا کر کے وفاق بنایا اور مسلمانوں کے دلوں سے خوف و ہراس دُور کرنے اور خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے مسلم مجلس مشاورت بنائی، پھر ملک بھر کا دورہ کیا، مولانا بھی اس کے بنیادی بانیوں میں تھے، ابتداء میں نائب صدر پھر عمر بھر اس کے صدر رہے، اس دورہ کی تقریروں کو تو ملک کا سمجھدار طبقہ کبھی نہیں بھولے گا۔ اِسی زمانہ میں مشاورت کا وفد اُستاد محترم مولانا نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کوششوں سے مالے گاؤں بھی آیا۔ جس کا شایانِ شان استقبال ہندو مسلم سبھوں نے کیا، مفتی صاحب بھی وفد میں شریک تھے، رات میں مشاورت چوک میں جلسۂ عام ہوا، اس وقت جن مقررین نے دلوں کو مسحور کیا۔ مفتی صاحب بھی ان میں سرِفہرست ہیں۔ اُن کی وہ باتیں آبِ زَر سے لکھنے کے قابل ہیں اُنہوں نے فرمایا تھا:

''ہم مسلمان ہیں، خوف و ہراس ہماری فطرت نہیں ہے، ہم خدا کی ذات پر اعتماد رکھتے ہیں، اور یہ یقین بھی رکھتے ہیں کہ فرقہ پرستوں کی طرف سے جو حالات پیدا کر دیئے گئے ہیں کہ وہ خدا کا اَٹل فیصلہ اور مسلمانوں کے لیے امتحان ہیں، جس کا بڑا سبب خود ہماری غفلت ہے، لیکن اس کا ایک مؤثر سبب، ملک کی تقسیم ہے، جس کے متوقع اندیشوں کی نشاندہی ہم نے کی تھی۔ ہم نے اُس وقت بھی ملک کی تقسیم کی مخالفت یہ کہہ کر کی تھی کہ ہندوستان ایک مشترکہ ہبہ ہے، جسے (ہبہ مشاع) کہتے ہیں، اور مشترکہ ہبہ کی تقسیم بے سود ہوتی ہے، جیسے کوئی مشترک چارپائی کو حقداروں میں تقسیم کرلے، تو کسی کے حصّہ میں بان، کسی کے حصّے میں ڈنڈے اور کسی کے حصّہ میں پایہ آئے گا، جو کسی کے لیے بھی مجموعی چارپائی کے مقابلے پر مفید نہیں ہے، مگر افسوس کہ برادرانِ وطن کے ساتھ ہمارے رہنماؤں کو بھی یہ بات سمجھ میں نہ آسکی، بہرحال آج ہم اس مسموم فضا کو بدلنے اور فرقہ پرستی کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کا پیغام لے کر اُٹھے ہیں، ہم اگر ایک طرف انتشار پسند طاقتوں کو

وارننگ دے رہے ہیں تو دوسری طرف مسلمانوں کو یاد دلاتے ہیں کہ یہ ملک ان کا بھی ہے، اس کی سالمیت کے ذمہ دار یہ بھی ہیں، اس لیے خوف و ہراس، دل سے نکال کر ملک کو ترقی دینے اور فرقہ پرستوں سے نظر ملانے کی صفت اپنے اندر پیدا کریں، مُشاورت آپ کو یہی پیغام سنانے آئی ہے، ہم نعمانی صاحب کے مشکور ہیں کہ ان کے ذریعہ اپنا دردِ دل آپ کو سُنا رہے ہیں''۔

مفتی صاحب کی اس تقریر سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں صاف گوئی اور بے باکی کے ساتھ کس قدر بے تکلفی تھی، وہ جس بات کو ضروری سمجھتے دوستوں اور بے گانوں میں اس کا ذکر ضروری سمجھتے تھے، اُن کی تقریریں مداہنت اور خوشامدانہ طرزِ گفتگو سے خالی ہوتی تھیں، اسی وصف کی بناء پر حکومت نے علماء میں ان پر اعتماد کیا، اور نازک ترین موقعوں پر حکومت کے اجلاس یا ریڈیو سے اُنہوں نے قوم وملّت کی نمائندگی بڑی خودداری کے ساتھ کی، لیکن نہ اپنی انفرادیت، اور اسلامیت کا سودا کیا اور نہ اس پر کوئی آنچ آنے دی، مولانا کی سیکڑوں ریڈیائی تقریریں خودداری اور مقبولیت کی ناطق عدل ہیں، جسے انتقال سے سال بھر پہلے ندوۃ المصنفین نے ''منارِ صدا'' کے نام سے شائع کیا ہے، اور اس میں کیا شک ہے کہ یہ نشری تقریریں منارِ صدا کے ساتھ صدائے منار بھی ہیں، یہ تقریریں وقت کی پکار، غمِ دوراں کا علاج، سرمایۂ تسکین، تاریک راہوں میں شُعاعِ اُمید، مایوسیوں میں حوصلہ بخش، دیدہ و دل کے لیے فسانۂ عبرت، ہندوستان کے بزرگوں کی دل افروز داستان، مسلمانوں کی قُربانیوں کا سچا تذکرہ، جمہوریت کی سچّی تعبیر، ..... زخموں کے لیے مرہم، پیاسی رُوحوں کے لیے آبِ زُلال، بے چین انسانیت کے لیے سامانِ سرور، اور پورے ملک اور حکومت کے لیے انمٹ لازوال نقوش ہیں، جسے مفتی صاحب نے دردِ دل اور نُورِ ضمیر کی آمیزش سے ملک کے سارے باسیوں کے سامنے پیش کیا ہے، قرطاس وقلم کے ساتھ زبان وخطابت کی دُنیا میں مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وہ دلپذیر اور جامع عطیہ ہے، جس پر اسلامیانِ ہند کا سرفخر وسرور سے ہمیشہ اُونچا رہے گا۔

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی قد آور اور مقبول ترین شخصیت کی عظمت کا دل پر اُس وقت بہت گہرا اثر ہوا جب دو پڑوسی ملک ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے، اِن دنوں میں معہد ملّت کے چند طلبہ کو لے کر انٹرویو کے لیے دلّی گیا ہوا تھا، ہندو پاک مختلف محاذ پر جنگ میں مصروف تھے، مسلمانوں کے لیے زندگی اُجیرن بنی ہوئی تھی، بے چارے مسلمان تقسیم کا طعنہ سن رہے تھے، دلّی افواہوں کی آماجگاہ اور میدان بنا ہوا تھا، دلّی کی سڑکوں پر مسلمانوں کا نکلنا مشکل تھا، خطرہ کا سائرن، اور بلیک آؤٹ کی تان بے چارے وفادار ہندوستانی مسلمانوں پر ٹوٹ رہی تھی، پاکستانی جاسوس کے نام سے مسلمانوں کو نہ صرف جیلوں میں بھرا جارہا تھا، بلکہ بُری طرح مارتے بھی تھے، مسلمان رہنماؤں میں مفتی صاحب ہی تنہا تھے، جو بیک وقت کئی محاذوں پر حکومت کو مطمئن کرنے اور مسلمانوں کو پُرامن رہنے کی تلقین کر رہے تھے، انتہائی مشکوک اور خوں آشام ماحول میں حکومت کے شدید اصرار پر مفتی

صاحب ریڈیو سے مسلمانوں کو پُر اَمن رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔ اُنہیں فکر تھی تو اِس بات کی کہ اس سنگین حالت میں کس طرح مسلمانوں کے خلاف بدگمانی پھیلانے والوں کو بے نقاب کیا جائے، ان آنکھوں نے دیکھا کہ ایک نحیف ونزار معمّر جسم میں عنفوانِ شباب کی تیزی اور ایسی گرمی بھر دی گئی ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد اور ملک کی سالمیت کے لیے سیماب کی طرح بے قرار ہے، ان کی سرگرمی کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جب دلّی جل رہا تھا، مسلم محلّے نشانہ پر تھے، اور گاندھی جی نے بَرت رکھا تھا تو اس تازہ دم جوان عالم دین کا کیا حال رہا ہوگا، اور اپنی مظلوم مِلّت کے لیے جانے کتنی بے قراری رہی ہوگی، سچ ہے آج وہ مَردِ مُجاہد اُٹھ گیا، جو آڑے وقت میں، مسلمانوں کو پامَردی، صبر وسکون کی تلقین کرتا تھا، اور ہر وقت مسلمانوں کی اَشک شوئی بھی کرتا تھا۔ ہندو پاک جنگ کے وقت ہم لوگ مفتی صاحب سے ملنے کے لیے آئے تو وہ حد سے زیادہ پریشان اور آزردہ خاطر تھے مجھے دیکھتے ہی فرمایا کہ دلّی کے حالات بڑی تیزی سے بگڑ رہے ہیں، آپ حضرات کو بہت دُور جانا ہے، جتنی جلد ہو، یہاں سے روانہ ہو جائیں، ورنہ ریلوے لائنوں کے بند ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے۔ مفتی صاحب نے بڑی محبت سے اپنی دُعاؤں کے ساتھ ہمیں رُخصت فرمایا۔

مفتی صاحب مرحوم کم گو مگر فعّال، سنجیدہ مگر سرگرم، اور نبض شناس تھے ان کی پیشانی کی شکنیں ہمہ وقت معنیٰ خیز نتائج کی متلاشی ہوتی تھیں، وہ عمر بھر دارالعلوم کی شوریٰ کے معزز رُکن رہے، اور ہر نازک موقعہ پر دارالعلوم کی عظمت و وقار کے لیے سینہ سپر رہے، ان کی اصابت رائے کا یہ عالم تھا کہ ارکانِ شوریٰ نہ صرف یہ کہ ان کے مشوروں کی قدر کرتے تھے، بلکہ اُسے اختیار بھی کرتے تھے، پچھلے دنوں جب دارالعلوم کا آفتاب گہن میں آیا اور اقتدار کے الاؤ نے اسلاف کی قدروں کو بھی نشانہ بنایا تو وہ مفتی صاحب ہی تھے کہ اخیر تک دارالعلوم کو اس سنگین صورتِ حال سے بچانے میں لگے رہے، لیکن جب پانی سَر سے اُونچا ہو گیا اور اب دارالعلوم کے در و دیوار خوں فشاں ہونے لگے تو مفتی صاحب نے ممبر شوریٰ رہنے کے باوجود علیحدگی اختیار فرمالی، اور دریافت کرنے پر بھی اظہارِ خیال سے گریز کرتے رہے۔

پچھلے دنوں امارتِ شرعیہ بہار و اُڑیسہ کی عمارتوں کے سنگِ بنیاد کے موقع پر مفتی صاحب بھی تشریف لائے تھے، رات کے جلسۂ عام میں لوگوں نے تقریر کے لیے اصرار کیا تو بڑی مشکل سے کرسی پر آئے، اور گلوگیر ہو کر فرمایا آج جبکہ دارالعلوم نرغۂ دار و گیر میں پھنسا ہوا ہے، آخر ہم آپ کے سامنے کیا عرض کریں۔ جب ہم جیسے جُبہ و دستار رکھنے والے علماء خود وقار و انانیت کے لیے دارالعلوم کی عظمت کو تج کر رکھے ہوئے ہیں، اِن حالات میں ہم کس منہ سے آپ حضرات کو نصیحت کریں، مرحوم تھوڑی دیر خاموش رہے پھر امارت، شرعیہ کی خدمات، مولانا سجّاد رحمۃ اللہ علیہ کی قربانیوں، حضرت امیرِ شریعت اور قاضیٔ شریعت کی سرگرمیوں کا بڑے دلنشیں انداز میں تذکرہ فرمایا، اور پھر تقریر ختم کر دی، حقیقت یہ ہے کہ جن بزرگوں نے دارالعلوم کو خونِ جگر دے کر پروان چڑھایا تھا۔ ان میں مفتی

صاحب سرِفہرست ہیں ۔شاید اسی فکر کا اثر تھا کہ اخیر میں فالج جیسے جان لیوا مرض میں مبتلا ہو کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے ۔خدا اُن کے درجات بلند فرمائے ۔(آمین)

مفتی صاحب مرحوم کے مولانا نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بڑے قریبی اور دیرینہ مراسم تھے،وہ بارہا مولانا کے دولت کدہ پر معہد ملّت کے جلسہ تقسیم اسناد اور تقریب ختم بخاری میں بھی تشریف لا چکے ہیں،یہ ان کی خورد نوازی ہے کہ ہم نیاز مندوں پر شفقت کی نظر رکھتے تھے،مولانا نعمانی صاحب کی علمی اور دینی سرگمیوں کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھتے تھے، تعلیمی اُمور میں مفتی صاحب نے معہد ملّت کو مہاراشٹر کا ندوہ بتاتے ہوئے اس کی ترقی کے لیے دعائیں بھی دی ہیں ۔ مولانا نعمانی صاحب نے بھی مفتی صاحب کی شخصیت سے فائدہ اُٹھانے میں کوئی کسر نہیں رکھی،ہندو پاک جنگ کے وقت جب نعمانی صاحب گرفتار ہوئے تو ان سطروں کے راقم نے مفتی صاحب کو بذریعہ تار گرفتاری کی اطلاع دی ۔

مرحوم نے یہ اطلاع پاتے ہی کہ مولانا گرفتار ہو گئے ۔فوراً شاستری حکومت کو یاد دلایا کہ نعمانی صاحب جیسے نیشلسٹ مسلمان کی گرفتاری جمہوریت کی پیشانی پر بدنما داغ ہے ۔مفتی صاحب کی کوششیں رنگ لائیں،اور مولانا نعمانی صاحب سب سے پہلے رِہا ہو گئے ۔رِہائی کے وقت مرحوم نے مجھے جو خط لکھا تھا،اس سے دونوں بزرگوں کے گہرے روابط کا پتہ چلتا ہے،ملاحظہ فرمائیں:

مخلص و مکرم مولانا محمد حنیف صاحب،السّلام علیکم،

''گرامی نامہ ملا،نہایت مسرت ہوئی،ہم لوگ مولانا کی گرفتاری سے کافی پریشان تھے،ممکن کوشش بھی کر رہے تھے،جیسے ہی آپ کا خط پہنچا سعی میں لگ گئے تھے،ہمایوں کبیر صاحب نے بھی اس سے دلچسپی لی تھی،نندہ جی کو بھی لکھا گیا تھا،بہت اچھا ہوا آپ نے بروقت اطلاع کر دی ورنہ شاید کل پرسوں میں نندہ جی سے ملاقات کا پروگرام تھا،یہاں میر مشتاق احمد صاحب نے بھی چند ناموں کی سفارش کی تھی،ان میں ایک نام مولانا کا تھا،بے شک حارث صاحب،فقیہ صاحب اور عابد صاحب نے بھی پوری کوشش کی ہوگی،عابد بھائی خاص طور پر معتمد ہیں ۔مولانا سے سلام کہیے،اور مبارک باد دیجئے،ساتھیوں کا کیا رہا،توقع ہے کہ وہ بھی رِہا ہو گئے ہوں گے، حکام کو بہر حال ایسا غیر محتاط قدم نہیں اُٹھانا چاہئے،اس سے عام مسلمانوں پر سخت ناگوار اثر پڑتا ہے،آپ کے پہلے خط کے جواب میں ضرورت سے زیادہ تاخیر ہوگئی،معذرت خواہ ہوں،یقین ہے کہ آپ سب احباب بخیر و عافیت ہوں گے،کہ ان تینوں طلبہ کو بھی سلام پہنچے''۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

دسمبر ۶۵ء

سنجیدگی کے ساتھ بے باکی اور صاف گوئی مفتی صاحب کا امتیاز تھا، جب پرسنل لاء میں مداخلت کے ارادے سے حکومت کے ذمہ داروں نے بیان دینا شروع کیا تو مفتی صاحب نے مالے گاؤں میں معہد ملت کے جلسۂ تقسیم اسناد میں خطاب کرتے ہوئے حکومت اور حکام کو بڑی سخت وارننگ دی تھی، جس سے اس مردِ مجاہد کی غیرت، دلسوزی اور حق گوئی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اُنہوں نے فرمایا: ''حکومت پرسنل لاء میں مداخلت کے اِرادے سے باز آجائے ورنہ مسلمان اپنی شریعت کی حفاظت کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ دستورِ ہند کا احترام نہ صرف عوام بلکہ حکومت کے لیے بھی ضروری ہے، جس میں ملک کے تمام باسیوں کو مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے۔ حکومت پرسنل لاء میں مداخلت کے لیے نام نہاد اور رنگ نام مسلمانوں کا بار بار نام نہ لے، وہ مسلمانوں کا رہنما نہیں ہے۔ مسلمانوں کے رہنما دارالعلوم دیوبند اور علماء کرام ہیں، حکومت مسلمانوں سے ایسے گھناؤنے مذاق کرکے ان کی دل آزاری کررہی ہے، وہ یہ سن لے کہ مسلم پرسنل لاء خدا کا بنایا ہوا قانون ہے، جس میں کسی تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے''۔

افسوس کہ آج انتہائی بے باکی، جرأت اور صفائی سے مسلمانوں کے کیس کو پیش کرنے والے مخلص وکیلوں کی ضرورت ہے، مفتی صاحب ہمارے گھروں کے آخری سپوت تھے۔ اُن کے وصال سے وہ زرّیں کڑی بھی ختم ہوگئی، جو مسلم مسائل کے لیے مسلمانوں کو جوڑنے کا کام کرتی تھی۔

بلاشبہ اِس دورِ قحط الرّجال میں مرحوم مسلمانوں کے لیے گوہر شب چراغ، خدا کی نشانی، اور شکستہ دلوں کے لیے ڈھارس تھے، ان کے وصال سے بزم اور رزم دونوں سونی رہے گی، بلاشبہ ایسی نادرۂ روزگار ہستیاں ہمیشہ پیدا نہیں ہوتیں، جو اپنا راحت و آرام تج کر مِلّت کے مسائل کو حل کرنے میں دیوانہ اور مصروف ہوں، سچ ہے۔

اَب نہ آئے گا نظر ایسا کمالِ علم و فن
گو بہت آئیں گے دنیا میں رِجالِ علم و فن

مفتی صاحب انتہائی منکسر مزاج ذہین دُور اندیش، اور تعمیری فکر رکھنے والے انسان تھے، ان کی تعمیری اور علمی سرگرمیوں کے بے شمار نقوش ملک میں دیکھے جاسکتے ہیں، قومی اور ملی مسائل سے دلچسپی کے ساتھ ساتھ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ندوۃ المصنفین کا قیام ہے، جس نے ملک کو سنجیدہ اور اچھے لکھنے والے دیئے، جہاں سے ان کی سرپرستی میں سیکڑوں معیاری متوازن اور قابل قدر اور اہم کتابیں بڑے اہتمام سے شائع ہوتی رہی ہیں، اور ماہنامہ ''بُرہان'' تو اُن کے علمی تدبّر اور حُسنِ تدبّر کا شاہکار ہے، جو مسلسل ۶۰ سال سے اُن کے قریب ترین رفیق حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی کی ادارت میں نکل رہا ہے، اور جو برِّصغیر میں اچھے سلجھے تحقیقی علمی مقالات و مضامین کی وجہ سے صفِ اوّل کے رسائل میں شمار ہوتا ہے، ندوۃ المصنفین ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں لُٹ گیا تھا،

لیکن مفتی صاحب نے ہمت نہیں ہاری، اور بڑی پامردی سے انتہائی سنگین حالات میں اسے باقی رکھا، جس کی شہرۂ آفاق تصنیفات کو دیکھ کر ایک مردِ آہن، مستقل مزاج اور سرگرم ترین رند مشرب کی قربانیاں یاد آتی ہیں۔

خدا بخشے مفتی صاحب کو کہ انہوں نے اس اِدارہ کو قائم کرکے فضلاء دیوبند کے نہ صرف بار کو ہلکا فرمایا بلکہ ایک بڑی غلط فہمی جو دلوں میں پیدا ہورہی تھی اُسے دُور کرکے بتادیا کہ زبان وقلم پر کسی کا اجارہ نہیں ہے، بلکہ یہ بزمِ مے ہے جو آگے بڑھے گا جام اس کا ہوگا، اس میں وراثتِ صاحبزادگی کوئی معنیٰ نہیں رکھتی۔ ندوۃ المصنفین کا قیام مفتی صاحب کی وہ زرّیں خدمت ہے جس پر انشاء اللہ اُن کی خدا کے یہاں مغفرت ہوجائے گی۔

میں خوش نصیب ہوں کہ مفتی صاحب سے معہد ملّت کے علاوہ مختلف علمی و تعلیمی تقریبات میں نیاز حاصل ہوتا رہا، ملاقات پر زیادہ دن گزر جانے پر مراسلات سے یہ کمی پوری کرلیتا تھا وہ ہم لوگوں کے محترم بزرگ تھے، اس سال کے اخیر میں معہدِ ملّت کے بعض بچوں کو جب ندوہ داخل کرنے کے لیے لکھنؤ گیا تو واپسی میں عیادت کی غرض سے مفتی صاحب کے درِدولت پر بھی حاضر ہوا۔ اُس وقت مولانا فالج میں مبتلا تھے۔ لیکن ہوش وحواس سب قائم تھے۔ مفتی صاحب کے داماد مولانا اظہر صدیقی نے جب میرے آنے کی اطلاع دی تو مرحوم نے مجھے اور میرے دوست منظور پہلوان کو پیار بھرے لہجہ میں اندر بُلا لیا۔ ہم لوگ پردہ ہونے کی وجہ سے تامّل کررہے تھے، میں نے اُنہیں سلام کیا، اُنہوں نے بیماری کے باوجود مجھے پہچان لیا۔ سَرہانے بیٹھ کر میں نے اُن کی مزاج پُرسی کی، مفتی صاحب نے خود ہی نعمانی صاحب مرحوم کے حادثۂ وفات کا ذکر کیا اور زار و قطار رونے لگے، اور فرمایا کہ:

> ''نعمانی صاحب ہمارے بزرگوں میں بڑے باکمال سادہ اور بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ اُن کی محبت تھی کہ ہم لوگوں نے برسوں وطن سے ہزاروں میل دُور رہ کر جمعیت کے کاز کو آگے بڑھایا، معہدِ ملّت اور آپ حضرات اُن کا بڑا کارنامہ ہے''۔

اور آخر میں جو نصیحت فرمائی وہ دل پر ہمیشہ نقش رہے گی۔

فرمایا:

> ''معہدِ ملّت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی قربانیوں کا پیکر جمیل ہے، جسے مرحوم نے خونِ جگر دے کر پروان چڑھایا ہے، اس کی حفاظت اور آبیاری مولانا قاضی عبدالاحد صاحب ازہری اور آپ کی بنیادی ذمہ داری ہے''۔

میری خوش بختی تھی کہ انتقال سے چند ماہ پہلے مفتی صاحب سے نیاز حاصل ہوا پھر میں آخر میں سلام اور دُعا کی درخواست کے بعد رُخصت ہوگیا۔

کسے معلوم تھا کہ اپنے وقت کا باکمال اور عبقری انسان چند مہینوں کے بعد پوری مِلّت کو سوگوار چھوڑ

جائے گا۔ خدا مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے، جنت میں اُن کے درجات بُلند فرمائے، اور علماء کو ان کے مِشن پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ مسلم یونیورسٹی کی انتظامیہ ہو یا مجلسِ شوریٰ۔ مجلسِ مشاورت ہو یا پرسنل لاء بورڈ، ندوۃ العلماء ہو یا ندوۃ المصنفین سب جگہ مفتی صاحب کے وصال کا شدید احساس رہے گا۔ سچ یہ ہے کہ حفظ الرحمٰن کے مشن، مولانا مدنی ؒ کے کاز، شیخ الہند کے اُصولوں اور مسلکِ دیوبند کا نقیب بن کر اَب ہماری صفوں میں سچی ترجمانی کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا، آخر یہ کس کی جدائی ہے کہ سارا ماحول سنسنی اور فضا خاموش ہے۔ شاعر نے خوب کہا ہے ؎

ملی جاتی ہے دُنیا رنگ محفل میں تغیر ہے
یہ دامن جھاڑ کر کون اُٹھ گیا ہے آج محفل سے

آج بھی مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ چشمِ تصوّر میں سمائے ہوئے ہیں۔ روشن پیشانی ہموار بینی، کتابی چہرہ، ابھری بھوئیں، گوری رنگت، موزوں اندام، سفید ریش متجسّس، نگاہیں، ماتھے کی شکنیں معنیٰ خیز، سَر پر بارُعب مخملی ٹوپی، شیروانی میں ملبوس، خوش پوش، بدن پر ململ کا سادہ اور ڈھیلا ڈھالا کرتا، مشرقی تہذیب اور دلی کی ٹکسالی زبان کے خوگر، وسیع دماغ، ان کی مجلس اسلاف کا نمونہ، پوری ملّت کے غم خوار، سب کا حال جاننے کے لیے بے قرار، گفتگو کے دوران میں اکابر کی سادگی، بلاشبہ ان کے وصال سے دل کی وہ بساط لپیٹ دی گئی۔ جس کے دَم سے قلم و زبان کی آبرو ملّت کے لیے سیماب اثری قائم تھی۔

افسوس مسلکِ دیوبند اور فکرِ ولی اللّٰہی کا مؤثر نقیب اُٹھ گیا۔ شاید ہی مستقبل قریب میں ایسا فرزند ملّت پیدا کر سکے، جو ان نت نئے محاذوں پر پوری مِلت کی انتہائی بے نیازی اور جُرأت و صاف گوئی کے ساتھ وکالت کر سکے۔ جہاں اندیشے اور لالچ پختہ فکر رکھنے والوں کو مات کر دیتی ہے۔

(مفکر ملت نمبر: ص ۹۵)

......❖......

مُفکّرِ مِلّت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

ایک مخلص رہنما اور علم دوست کی حیثیت سے

از: مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی مفتی دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند نے ہر دَور میں بڑے قیمتی لعل وگوہر انسان پیدا کیے، جن کی علمی، دینی اور سیاسی خدمات سے ایک دُنیا پُرشور رہی، جہاں گئے اپنے اخلاص اور جوشِ عمل سے چھا گئے، اور جب وہ ہمارے درمیان نہیں رہے تو ایسا معلوم ہوا کہ ایک دمکتا نُورتھا جو غائب ہوگیا، اور علم وعمل کا ایک آفتاب تھا جو غروب ہوگیا۔

فرزندانِ دارالعلوم دیوبند کے ان ہی روشن چاند وسورج میں مفکر ملّت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی شخصیت تھی، آپ ایک باشعور علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے، اور دیوبند کے مشہور ترین علماء میں آپ کا شمار ہوتا تھا، دیوبند میں ہی پیدا ہوئے، یہیں نشوونما ہوئی، اور شروع سے آخر تک مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند میں ہی تعلیم حاصل کی، پہلے حفظ قرآن کی دولت سے مالا مال ہوئے، پھر فارسی درجات کی تکمیل کی، اور سند حاصل کی اور آخر میں عربی کا پورا نصاب ختم کر کے فاضل دارالعلوم ہوئے۔ حدیث آپ نے اس وقت کے سب سے مشہور عالم دین محدث العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی، جو اپنے زمانہ میں یکتائے روزگار شمار ہوتے تھے، اور چلتے پھرتے کتب خانہ کہے جاتے تھے۔

مفتی صاحب کا پورا خاندان علم وعمل سے سرشار تھا، آپ کے دادا مولانا فضل الرحمٰن عثمانی ان چند افراد میں تھے، جنہوں نے دارالعلوم قائم کیا تھا اور جو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے اوّلین اراکین میں شامل تھے، آپ کے والد ماجد اپنے وقت کے مفتی اعظم اور عارف باللہ تھے، اور وہی دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مفتی ہوئے، یعنی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے حقیقی چچا تھے، مفتی صاحب ان ہی اہلِ علم اور صاحبِ فضل وکمال کی گودوں میں پل کر جوان ہوئے تھے، اور کتاب وسنت کی دولت حاصل کی تھی۔

کوئی شبہ نہیں مفتی صاحب ذہانت و ذکاوت اور بیدار دماغی میں ممتاز تھے اور بڑا بلند مقام رکھتے تھے، پدر بزرگوار کی کیمیا اثر نگاہ نے قلب و دماغ کو مجلّی کر دیا تھا، اور اخلاص اور خدا ترسی سے معمور کر دیا تھا، جس دَور میں

آپ نے دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی تھی، وہ دارالعلوم کا دَورِ شباب تھا، اس کے در و دیوار سے اللہ اللہ کی صدا آتی تھی اور حضرت نانوتوی اور آپ کے تلمیذ رشید شیخ الہند مولانا محمود حسن کے انوار سے اس کا ذرہ ذرہ پُرنور تھا۔

فراغت کے بعد حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مادرِ علمی میں بحیثیت عربی استاذ مسند درس و تدریس پر فائز ہوئے، اور تمرین افتاء میں اپنے والد بزرگوار سے تربیت پائی، نتیجہ یہ ہوا کہ نظر وسیع اور گہری ہوتی چلی گئی، پھر اپنے استاذ محترم حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل تشریف لے گئے اور وہاں عرصہ تک درس و تدریس اور کارِ افتاء انجام دیتے رہے، آپ نے یہ دونوں خدمت پوری محنت اور دلی لگن سے انجام دیں، اور اہلِ علم میں شہرت پائی۔

ہندوستان میں سیاسی انقلاب آیا۔ انگریزی حکومت کے خلاف جدوجہد شروع ہوئی تو کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں آپ نے انگریزی حکومت کے خلاف کوئی فتویٰ دیا، جس کی وجہ سے اربابِ جامعہ نے آپ پر کوئی پابندی عائد کی، تاکہ ان کا مدرسہ حکومت کی زَد میں نہ آسکے، مگر مفتی صاحب کو یہ پابندی بھی علمی خودداری اور کارِ افتاء کی عظمت کے خلاف نظر آئی، اور وہاں سے ملازمت کا تعلق ختم کرلیا۔

اس کے بعد کچھ دنوں کے لیے کلکتہ جاکر درسِ قرآن دینے لگے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈابھیل مدرسہ سے علیحدہ ہونے کے بعد آپ نے عزم کرلیا تھا کہ ملازمت کا طوق گردن سے ہمیشہ کے لیے نکال پھینکنا ہے، کہ اس میں علمی خودداری کا خون ہوتا ہے اور ذہن وفکر کی جولانی پر پہرہ بٹھادیا جاتا ہے، جس سے ایک صاحبِ علم کی نشوونما گھٹ کر رہ جاتی ہے اور وہ احساسِ کمتری کا غیر شعوری طور پر شکار ہوجاتا ہے۔

چنانچہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے چند احباب کے ساتھ مل کر غالباً ۱۹۳۰ء میں ایک تصنیفی ادارہ کی بنام خدا داغ بیل ڈالی، جس کا نام ندوۃ المصنفین دہلی تجویز ہوا، پھر اس تصنیفی ادارہ سے ایک معیاری علمی و دینی ماہنامہ ''برہان'' دہلی کے نام سے جاری فرمایا، جس کی ادارت کا فریضہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی فاضل دیوبند ایم۔ اے کے سپرد ہوا کوئی شبہ نہیں یہ علمی رسالہ بڑی آن بان سے نکلا، اور آج تک اسی پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے۔

اسی کے ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی شروع کردیا گیا، چونکہ یہ حلقہ علماء دیوبند کا پہلا باضابطہ تصنیفی ادارہ تھا، اس لیے اُس وقت کے تقریباً تمام نامور و مشہور علمائے دیوبند معاون بن گئے، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا قاضی زین العابدین سجّاد میرٹھی، مولانا حامد الانصاری، حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم رحمہم اللہ، یہ سارے کے سارے حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے فیض یافتہ اور تلامذہ تھے، ان کی تصانیف نے ندوۃ المصنفین دہلی کو حیاتِ دوام بخش دی، اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ یہ تمام علماء اپنے علم و عمل میں آفتاب و ماہتاب کی حیثیت کے مالک تھے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ندوۃ المصنفین سے پہلے سال جو کتابیں شائع ہوئیں، ان میں حکیم الاسلام کی تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام، مجاہدِ ملّت کی اسلام کا اقتصادی نظام اور مولانا اکبر آبادی کی اسلام میں غلامی کی حقیقت جیسی معیاری کتابیں نظر آتی ہیں۔

مفتی صاحب نے اپنے ذمہ تصنیف و تالیف کے بجائے انتظام کی ذمہ داری رکھی جو سب سے صبر آزما خدمت تھی، اور جس میں خونِ جگر پینا پڑتا ہے، سرمایہ کی فراہمی، کتابوں کی کتابت وطباعت اور ان کی نکاسی، مصنفین سے وقت پر کام کی تکمیل کرانا۔

ندوۃ المصنفین دہلی سے جس وقت یہ کتاب پہلے سال ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی ہے، اس وقت خاکسار ایک ابتدائی عربی متعلم کی حیثیت رکھتا، مگر چونکہ مطالعہ کا ذوق تھا اور نئی کتابیں بہت شوق سے پڑھتا تھا، ۱۹۴۰ء میں یہ کتابیں حاصل کر کے پڑھیں، تو ایسا معلوم ہوا کہ دل و دماغ روشن ہوگیا، اس علمی خدمت کا ملک کے گوشہ گوشہ میں خیر مقدم کیا گیا، اور ہر اہلِ علم نے اس خدمت دینی علمی پر مفتی صاحب کو مبارک باد پیش کی۔

۱۹۴۴ء میں جب خاکسار نے درسیات سے فراغت حاصل کی، تو تصنیف و تالیف کا ذوق اُبھر آیا، اس وقت خاکسار مدرسہ مفتاح العلوم مئو ضلع اعظم گڈھ میں تھا اور دورۂ حدیث محدث جلیل حضرت الاستاذ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی دامت فیوضہم اور مولانا عبد اللطیف نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھ رہا تھا، اور اب تک تحریر سے زیادہ تقریر کا شوق تھا، اولاً حضرت الاستاذ مولانا اعظمی مدظلہ سے درخواست کی کہ مجھے دار المصنفین اعظم گڈھ میں کچھ دنوں کے لیے رکھوا دیں، جس کی سعی حضرت والا نے فرمائی اور اسی زمانہ میں مفتی صاحب کو بھی میں نے خط لکھا، کہ دیکھیں وہاں سے کیا جواب آتا ہے، حالانکہ اس وقت تک نہ دہلی کے دیکھنے کی نوبت آئی تھی اور نہ مفتی صاحب کی صورت دیکھی تھی، نہ مفتی صاحب سے کوئی استاذی شاگردی کا رشتہ تھا، بس دیوانگی تھی، مگر مفتی صاحب نے جواب لکھا، اس وقت وہی خط پیش کرنا ہے، جس سے ندوۃ المصنفین پر روشنی پڑتی ہے، پورا خط ملاحظہ فرمائیں۔

برادر مکرم دام مجدھم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ علیہ و برکاتہ۔ کرم نامہ دو تین ہفتے ہوئے موصول ہوا تھا، جواب میں تاخیر ہوگئی، آپ کے ذوق علمی اور شوق تحریر کا حال معلوم ہو کر دلی مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ آپ کی صلاحیتوں سے ملّت کو استفادہ کا موقع مرحمت فرمائے۔

ایسے ہی ناسازگار حالات ہوتے ہیں، جن سے مسلسل ٹکرانے کے بعد بڑے بڑے ولولے سرد ہو جاتے ہیں، اور اُبھرنے والی اُمنگوں پر پانی پھر جاتا ہے، دلی آرزو ہے اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے مقاصد میں کامیاب فرمائے، اور ان کی تکمیل کی کوئی راہ کھل جائے۔

جہاں تک ندوۃ المصنفین کا تعلق ہے، یہاں سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم چند کارکن ہیں اور ہر ایک اپنے کام میں اس طرح غرق رہتا ہے کہ اس کو سر اُٹھانے کی فرصت نہیں ملتی، پھر کرایہ کا مکان تنگ اور ناکافی جگہ، خود رُفقائے ادارہ کے لیے دفتر میں قیام کی گنجائش نہیں، سب جدا جدا رہتے ہیں، طعام کا بھی کوئی مشترک بندوبست نہیں، جنگ کی ہولنا کیوں سے چھٹکارا ہو، تو بہت سی تجویزیں زیرِ غور ہیں، جو انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد عملی صورت میں سامنے آسکتی ہیں،۔بہت سے فضلائے دیوبند جو تالیف وتصنیف کے کام سے مناسبت رکھتے ہیں، ندوۃ المصنفین میں قیام کے خواہش مند ہیں، لیکن سر دست کوئی انتظام نہیں، خیال ضرور ہے، آپ ازراہِ کرم دو تین مہینے کے بعد پھر یاد دہانی کا ایک خط تحریر فرمائیں۔

ایک لائن مولوی فاضل کی بھی ہے، یہاں فتح پوری میں داخل ہو کر تیاری کی جائے وہیں قیام رہے، اسی کے ساتھ کچھ یہ مشغلہ بھی ہو، لیکن فتح پوری سے جو وظیفہ ملتا ہے وہ برائے نام ہی ہوتا ہے، بہرحال یہ چیز غور طلب ہے۔والسلام

عتیق الرحمٰن عثمانی ندوۃ المصنفین۔قرول باغ

۲؍ستمبر ۱۹۴۴ء۔ ۱۳؍رمضان ۱۳۶۳ھ

اس خط سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب معمولی سے معمولی ذوق والے کے خط کا جواب دیا کرتے تھے، اور اس کی اشک شوئی کی سعی فرماتے تھے، وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دل علمی جذبات سے لبریز تھا اور خود ان حالات سے دل برداشتہ تھے، جو نوجوانوں کو اُبھرنے نہیں دیتے تھے، اور اس کا بھی درد رکھتے تھے کہ نوجوانوں کو کن مشکلات کا سامنا ہے۔

اس خط سے ندوۃ المصنفین کے اس نقشہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے، جو اس سلسلہ میں مفتی صاحب کے ذہن میں تھا، یہ الگ بات ہے کہ اخیر وقت تک مفتی صاحب نوجوانوں کی تربیت کا شعبہ نہیں کھول سکے، مگر کتابیں برابر پابندی سے شائع کرتے رہے، شعبان ۱۳۶۳ھ میں خاکسار نے دورۂ حدیث ختم کر کے سالانہ امتحان دیا تھا، اللہ تعالیٰ نے میرے لیے یہ نظم کیا کہ استاذ محترم حضرت مولانا اعظمی مدظلہٗ نے مئو بلا کر مفتاح العلوم میں ابتدائی عربی مدرس اور مفتی بنا دیا، اور یہی میری ترقی کا علمی زینہ تھا، اس وقت دہلی سے مایوس ہو کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا، باقی ندوۃ المصنفین سے تعلق باقی رہا، نئی کتابیں منگواتا رہا اور پڑھتا رہا۔ پھر وہ زمانہ آیا کہ میں مضمون لکھنے لگا، اور صدق جدید لکھنؤ میں میرے بعض مضامین شائع بھی ہوئے، اسی زمانہ میں ایک لمبا مضمون لکھ کر برہان میں شائع ہونے کے لیے دہلی بھیجا، اور حضرت مفتی صاحب کے ہی نام بھیجا، آپ نے اس خط کا بھی جواب ازراہِ کرم عنایت فرمایا لکھا:

مخلص مکرم   السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

عنایت نامہ مع مضمون ملا۔ برہان کی ترتیب کا تعلق اب تمام تر مولانا سعید احمد ایم۔ اے اکبر آبادی سے ہے، آپ کا مضمون ان کو دے دیا جائے گا اور میں سفارش بھی کردوں گا، مجھے ادارے کے اوپر کے کاموں سے سر اُٹھانے کی فرصت نہیں ہے تاہم مناسب مشورے کے لیے ہر وقت حاضر ہوں، یہ معلوم ہوکر مسرت ہوئی کہ مضمون نویسی سے آپ کو خاص لگاؤ ہے، وقت کی ضرورتوں اور ملّت کے تقاضوں کے لحاظ سے ہمارے فضلاء میں یہ بہت بڑی کمی ہے۔ ندوۃ المصنفین اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہے، جگہ کا بندوبست ہوجائے تو میرا ارادہ جلد ایک ایسا شعبہ قائم کرنے کا ہے جس میں فارغ شدہ علماء کو انگریزی زبان پڑھائی جائے، اور تقریر و تحریر کی مشق کرائی جائے، اور اخذ و استنباط کے جدید طریقے سکھائے جائیں، آپ جیسے بہت سے احباب اپنے حلقے میں موجود ہیں، جن میں کام کرنے کی اُمنگ بھی ہے اور صلاحیت بھی، مگر ان کے لیے کوئی ایسی جگہ نہیں، جہاں وہ اس لائن پر کام کرسکیں، فقط والسلام۔

۱۳/اپریل ۱۹۴۶ء
عتیق الرحمٰن عثمانی۔ ندوۃ المصنفین۔ قرول باغ دہلی

پرانے علماء بیان کرتے ہیں کہ یہ خوبی مفتی صاحب کے چچا سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی میں بدرجہ اتم تھی، اپنے دَورِ اہتمام میں کسی ہونہار فاضل دیوبند کو ضائع نہیں ہونے دیا۔

ایک خط میں مفتی صاحب نے خاکسار کو لکھا:

"تاریخِ مساجد کا کام بھی کر ڈالیے، جو کام آپ کے اختیار کا ہے، وہ تو ہوجائے"

مجھے حیرت ہے ملک انقلاب سے دو چار تھا، دہلی تاراج ہو رہی تھی، اور مفتی صاحب اپنے کام سے اس وقت بھی غافل نہیں ہوئے، ایک طرف مجاہدِ ملّت کے ساتھ مسلمانوں کے تحفظ و بقا اور ان کو بسانے کی فکر میں منہمک تھے اور دوسری طرف ندوۃ المصنفین اور اپنے متعلقین سے بھی بے فکر نہیں تھے۔

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نظر فقہ پر وسیع بھی تھی اور گہری بھی، وہ عرف زمانہ کو کبھی نظر انداز کرکے نہیں سوچتے تھے، ان کا ذہن بند نہیں تھا، کھلا ہوا تھا، مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ میں بارہا خاکسار نے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے دیکھا اور سنا ہے، دارالعلوم معینہ سانحہ کے زمانۂ قیام میں خاکسار نے "جل کر" (پانی میں مچھلی فروخت کرنے کے) متعلق دریافت کیا۔ تو جواب میں تحریر فرمایا:

"استفسار کا مختصر جواب یہ ہے کہ "جل کر" کی وہ صورت جسے فقہاء بیع السمك فی الماء سے تعبیر

کرتے ہیں۔ظاہر ہے اس کے جواز کی کوئی صورت نہیں ہے، البتہ یہ ظاہر ہے کہ بیع فاسد، مفید ملک ہے اور چونکہ یہاں معاملہ مدرسہ کا ہے، کسی کی ذات کا نہیں، اس لیے بیع فاسد سے حاصل شدہ رقم ضروریاتِ مدرسہ پر خرچ کی جاسکتی ہے، یہ رقم اگر کسی شخص کی مِلک میں ہوتی تو اس کا صدقہ دیناضروری ہوتا، یہاں خود مدرسہ تصدّق کا بہت اچھا مصرف موجود ہے، نفس عقد کے جواز کے لیے اصل معاملے میں ترمیم کی ضرورت ہے، مثلاً تالاب کو اِجارے پر دے دینا، اب اِجارہ پر لینے والا خواہ اس سے مچھلیاں حاصل کرے، یا سنگھاڑے کی بیل ڈالے، یا کوئی اور کام کرے، نفس عقد میں تھوڑی ترمیم اور ردّ و بدل کے بعد جواز کی صورت نکل سکتی ہے، لیکن اس کے لیے بالمشافہ گفتگو کی ضرورت ہے، فتویٰ کی حیثیت میں ان کو سامنے نہیں رکھا جاسکتا"۔ (مکتوب ۴ر اکتوبر ۱۹۵۰ء)

اسی طرح ایک خط میں خاکسار نے "قنوتِ نازلہ" کے باب میں مفتی صاحب کی رائے دریافت کی، تو مفتی صاحب نے اپنے جوابی خط میں دیگر چیزوں کے ساتھ قنوتِ نازلہ پر بھی اپنی رائے لکھ بھیجی، تحریر فرمایا:

"قنوتِ نازلہ کے متعلق تفصیلی گفتگو تو زبانی ہی ہوسکتی ہے، خلاصہ بہرحال آپ کے ہی دماغ میں ہے۔

احناف کے سب سے بڑے ترجمان امام "طحاوی رحمۃ اللہ علیہ" اس کے قائل ہیں کہ قنوتِ نازلہ تمام جہری نمازوں میں نہیں، صرف فجر کی نماز میں پڑھی جائے گی اور وہ اس کو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک قرار دیتے ہیں، الفاظ قنوت نازلہ مختلف حدیثوں میں ملتے ہیں، آپ جن الفاظ کو موجودہ حوادث اور اسلام کی عام تعلیمات کے زیادہ قریب خیال کرتے ہیں، منتخب کرلیجیے، جہاں تک میرا تعلق ہے ذہن ادھر ہی جاتا ہے کہ قنوت نازلہ صرف اس وقت پڑھنی چاہیے کہ مسلمانوں کا کوئی طائفہ دشمن کے مقابلہ میں مصروف قتال ہو، اور دشمنوں کے نرغہ میں گھر گیا ہو، ہاتھ باندھنا میرا بھی معمول نہیں ہے، قنوتِ نازلہ میں ہاتھ باندھنا، مجھے تو خلافِ سنت معلوم ہوتا ہے، سمع اللہ لمن حمدہ، ربنا لک الحمد کے ساتھ اگر کچھ مزید دعائیں بھی کسی وجہ سے پڑھی جائیں، تو ان میں ہاتھ باندھنے کا کیا مطلب ہے، اس مسئلہ میں بعض بزرگوں کو یہی غلط فہمی ہوئی ہے، اور انہوں نے اسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور و معروف اختلاف کے سلسلہ میں منسلک کردیا ہے۔حالانکہ قنوت کی دعاؤں سے اس کا کوئی تعلق نہیں، ہاتھ چھوڑ کر پھر قنوت کے لیے ہاتھ باندھنا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ (مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی مدظلہ) کا بھی یہی مسلک تھا"۔ (مکتوب ۸ر مئی ۱۹۵۰ء)

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ حالاتِ زمانہ کو سامنے رکھ کر جب مسائل پر بولتے تھے، تو سننے والوں کے ذہن کی گرہیں کھلتی چلی جاتی تھیں، اور اندازہ ہوتا تھا کہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذہن آفاقی ہے، محدود نہیں ہے، گو وہ دائرہ اور حدود کے اندر رہ کر ہی بات کرتے تھے، مگر تقاضائے وقت پر نگاہ رکھتے تھے۔

مفتی صاحب کے ذاتی کتب خانہ میں منتخب کتابوں کا بڑا عمدہ ذخیرہ ہے میں نے ان کا کتب خانہ دیکھا ہے، ان کے کتب خانہ کی کتابوں کی جلدیں بڑی عمدہ اور نفیس ہیں، الماریوں پر شیشے لگے ہوئے ہیں، ہر چیز قرینہ اور سلیقے کے ساتھ اپنی اپنی جگہ رکھی ہوئی ہے، جب کبھی رات میں وہاں قیام کرنا پڑا، تو اسی کتب خانہ میں آرام کرتا تھا، ان کے علمی و دینی مزاج کا ہی نتیجہ تھا کہ مفتی صاحب اہلِ علم کی بڑی قدر و منزلت فرماتے تھے، علمی منصب و مقام کا ان کے یہاں بڑا لحاظ و پاس تھا، ہمارے استاذ محدّث جلیل مولانا اعظمی کی بڑی تعظیم و تکریم فرماتے تھے، میری کتاب ''اسلام کا نظام عفت و عصمت'' کا مسوّدہ جب مفتی صاحب کی خدمت میں پہونچا، تو بطورِ خود آپ نے استاذ محترم دامت برکاتہم سے تعارف لکھوایا، نظامِ مساجد کے متعلق لکھا کہ:

''مولانا مناظر احسن گیلانی مدظلہم سے مقدمہ ضرور لکھائیے، اس سے برکت بھی ہوگی اور کتاب کی اصلاحی اور افادی حیثیت بھی اُجاگر ہو جائے گی''۔

نظامِ مساجد کے فقہی جزئیات والے حصہ پر نظر ثانی کی جب مفتی صاحب سے درخواست کی گئی، تو تحریر فرمایا:

''فقہی جزئیات پر دیوبند کے مفتی مہدی حسن صاحب بلکہ زیادہ بہتر ہو کہ مولانا محمد اعزاز علی صاحب، سہارنپور کے مفتی سعید احمد صاحب یا شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب نظر ڈال لیں تو اچھا ہے، میں بھی وقتاً فوقتاً نظر ڈال لوں گا، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب سے بھی عرض کروں گا''۔

(مکتوب ۷؍رمضان ۱۳۷۰ء)

اس طرح کے خطوط سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مفتی صاحب کے یہاں علمی کاموں میں احتیاط کا پہلو کس قدر غالب تھا، اور ذی علم سارے علماء ان کی نظر میں کس طرح مستحضر رہا کرتے تھے، اور ان پر پورا کیسا مضبوط اعتماد رکھتے تھے۔

ایک خط میں خاکسار کو بطورِ خاص تاکید فرمائی:

''تاریخ ملّت کے حصوں پر آپ کا مضمون پڑھ کر مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی نے بھی وہ حصص طلب فرمائے ہیں، حلقۂ برہان میں بحمداللہ اب آپ کافی نیک نام ہیں، مضامین کم لکھیے، مگر جو کچھ لکھیے معیار کے مطابق لکھیے، معیار کی بقا بڑی بات ہے''۔ (مکتوب ۱۱؍ستمبر ۱۹۵۱ء)

جب میں نے اپنے ایک خط میں تذکرہ کیا کہ نظامِ مساجد کے بعد اب میں نے ''اسلام کا نظام عفت و عصمت'' اپنے لیے عنوان منتخب کیا ہے، تو مفتی صاحب نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

''آپ نے بہت دل پسند عنوان تلاش کیا ہے، یہ عنوان بہت خوب ہے، جی جما کر لکھیے، قدیم کتابوں کے علاوہ جدید کتابوں سے بھی مدد لینی چاہیے، تفسیروں میں سید رضا مصری کی المنار، وحی

محمدی، نداء للجنس اللطیف مفید ہوگی، محمد رسول اللہ، المثل الکامل، الاسلام دین عام خالد، نظام العالم والامم، الحاضر العالم الاسلامی اور اس طرح کی دوسری کتابیں مفید ہوں گی، الذریعہ الی مکارم الشریعہ، ادب الدنیا والدین غالباً آپ کے پیش نظر ہوگی"۔ (مکتوب ۱۳/نومبر ۱۹۵۱ء)

یہ قلم برداشتہ خطوط کے جواب میں مفتی صاحب کی تحریر کیا غمازی کرتی ہے۔؟ یہی نا کہ مفتی صاحب کا مطالعہ وسیع تھا، جدید و قدیم تصنیفات پر نظر تھی، اور یہ کہ آپ علمی انداز کی کتاب پسند فرماتے تھے، عوامی نقطۂ نظر نہ تھا، عالمانہ محققانہ نظر رکھتے تھے، اور وقت کے تقاضہ سے چشم پوشی پسند نہیں کرتے تھے، نظامِ عفت کی پہلی قسط جب برہان میں چھپی تو اسے پڑھ کر مفتی صاحب نے لکھا:

"جہاں تک اندازہ ہوتا ہے یہ کتاب وقت کی ضرورتوں کے عین مطابق رہے گی اسے جلد سے جلد مکمل کر لیجئے"۔ (مکتوب ۹/مارچ ۱۹۵۲ء)

ایک دوسرے خط میں تحریر فرمایا:

"میری خواہش ہے کہ آپ جیسا عالم دین ضروریات وقت کو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے پر پہچاننے کی کوشش کرے گا"۔

ایک اور خط میں توجہ دلائی اور لکھا:

"نظامِ عفت کی ترتیب کے لیے جن مشوروں کی ضرورت ہے، ان کا تحریر میں آنا دشوار ہے، مجموعی اعتبار سے ترتیب اطمینان کے لائق ہے، بنیادی طور پر یہ چیز پیش نظر رہنی چاہیے کہ کتاب کسی مدرسہ میں بیٹھ کر نہیں لکھی جارہی ہے، اور اس کی مخاطب مسلمانوں کی کوئی خاص جماعت نہیں ہے، اور نہ اس میں کسی خاص فقہی نقطۂ نظر کی ترجمانی کی گئی ہے، بلکہ اسلام کے نظامِ عفت و عصمت کو مذاہبِ اربعہ کی وُسعتوں کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، غیر مسلموں پر اثر ڈالنے والی جزئیات کو زیادہ سے زیادہ اُجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ جیسے معتدل، سنجیدہ اور وسیع النظر عالم دین کو جو وقت کی ضرورتوں اور زمانہ حال کے تقاضوں کو پہچانتا ہے، کچھ زیادہ مشوروں کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ آپ کا والی و ناصر ہو"۔ (مکتوب ۲۹/دسمبر ۱۹۵۲ء)

اندازہ لگائیں تصنیف و تالیف میں یہ مشورے کتنے وقیع، دُور رَس، اور مفید ہیں، نظر میں کیسا توسّع ہے، اور ایک نوجوان کی کس قدر حوصلہ افزائی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مفتی صاحب خود تصنیف و تالیف کے میدان میں نہیں آئے۔ مگر کتنے باذوق عالموں کو انہوں نے اپنے مشوروں اور حوصلہ بڑھانے والے کلمات سے مصنف بنا دیا، اس طرح کے خطوط جب بھی نظر سے گزرتے ہیں، اس

دورِ قحط الرّ جال میں حیرت ہوتی ہے اور خط لکھنے والے کے لیے بے ساختہ دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔

یہ کتاب چھپنے کے بعد مفتی صاحب کو بہت پسند آئی، انہوں نے آج سے دس بارہ سال پہلے چاہا تھا کہ اس کا انگریزی ترجمہ ہو جائے، انہوں نے اس کا ایک نسخہ اپنے ایک انگریزی داں عزیز کے سپرد فرمایا تھا کہ اس کا وہ انگریزی ترجمہ کر دیں، ان صاحب نے مجھ سے کہا بھی تھا کہ بعض اصطلاحات آپ سے سمجھنے ہیں۔ مگر یہ کام ان سے نہیں بن پایا۔

مفتی صاحب کی زندگی میں ہی کویت کے ایک کتب خانے والے نے اس کتاب کا بڑا عمدہ سلیس اور شگفتہ انگریزی ترجمہ کرا کے پوری کتاب عمدہ ٹائپ میں چھپوا کر شائع کر دی ہے، اس کا ایک نسخہ نہ معلوم میرے کس عزیز نے مجھے بہت تاخیر سے بھجوا دیا تھا، مگر افسوس یہ ہے کہ میں مفتی صاحب کو دیکھ نہ سکا، اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ان دنوں مفتی صاحب سخت بیمار تھے۔

میری تین کتابیں مفتی صاحب نے ندوۃ المصنفین سے شائع فرمادیں اور اب تک کبھی میری ملاقات نہیں ہو سکی تھی، مفتی صاحب سے ہی خط سے معلوم ہوا کہ ۱۱ / ۱۲ / ۱۳ / فروری ۱۹۵۵ء کو کلکتہ میں جمعیۃ علماء ہند کا آل انڈیا اجلاس ہے، اس زمانہ میں مفتی صاحب جمعیۃ کے سرگرم کارکن کی حیثیت رکھتے تھے، اور مجاہد ملّت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے دست و بازو بنے ہوئے تھے۔

اتفاق سے ہم چند ساتھیوں نے بھی کلکتہ اجلاس میں شرکت کا ارادہ کرلیا، اور موجودہ امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی مدظلہٗ سجّادہ نشین خانقاہ رحمانی مونگیر کی قیادت میں مونگیر سے کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے، وہاں عزیز محترم مولانا محمد یحییٰ ندوی سلمہٗ نے پتہ لگا کر بتایا کہ مفتی صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں، یہ بھی کہا کہ مفتی صاحب سے وہ مل بھی چکے ہیں، تم سے کبھی کی ملاقات نہیں ہے، میرے ساتھ چلیں تاکہ میں تعارف کرادوں، تذکرہ آپ کے آنے کا کر دیا ہے، چنانچہ ان کے ساتھ جا کر پہلی دفعہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کلکتہ میں ملا، اور ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پہچانا۔ اور اسی اجلاس کے موقع سے مولانا اکبر آبادی مدظلہٗ سے بھی پہلی دفعہ ملاقات کی، اور دیر تک ان کے پاس بیٹھا، اس دن مولانا اکبر آبادی نے جس شفقت و محبت سے گفتگو کی اس کا بڑا اثر ہوا، اور یہ غالباً اس وقت پہلے عالم دین تھے، جن کی باتوں سے محسوس ہوا کہ میرے اندر بھی تھوڑی بہت علمی مناسبت اور صلاحیت ہے۔

اس ملاقات کے بعد حضرت مفتی صاحب سے تعلقات اور استوار ہو گئے، یہ ۱۹۵۵ء کی بات ہے، اس کے سال بھر کے اندر کچھ ایسی صورت حال ہوئی کہ مجھے دارالعلوم معینہ سانحہ ضلع مونگیر سے دارالعلوم دیوبند طلب کر لیا گیا، اور میں وہاں سے دیوبند آ گیا۔

یہ صورت اچانک پیدا ہوئی، حضرت مولانا منت اللہ رحمانی مدظلہٗ نے خانقاہ رحمانی میں کتب خانہ کی ایک نئی عمارت بنوائی تھی، اس کے افتتاح کے لیے دیوبند سے شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور حکیم الاسلام حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مدعو کیا، اور اسی کے ساتھ صوبہ کے تقریباً تمام قابل ذکر علماء کو بھی دعوت دی، اس افتتاحی اجلاس میں خاکسار نے کتب خانہ کی تاریخ اور اس کی افادیت پر ایک مقالہ پڑھا تھا، جو ان دونوں بزرگوں کو پسند آیا، چنانچہ ۳؍صفر ۱۳۷۶ھ سے خاکسار دارالعلوم دیوبند کا ایک معمولی ملازم ہوگیا۔

دیوبند آجانے کے بعد مفتی صاحب سے قدرتاً بہت قریب ہوگیا، مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مجلس شوریٰ دارالعلوم کے رُکن خصوصی بھی تھے اور ان کا آبائی وطن بھی دیوبند ہی تھا، اب سال میں متعدد مرتبہ ضرور ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔

مفتی صاحب اپنی وضع کے بہت پابند اور تعلقات نباہنے کا خاص ملکہ اور سلیقہ رکھتے تھے، دہلی کبھی سال میں ایک آدھ مرتبہ جانا ہوتا، تو بحکم مفتی صاحب ندوۃ المصنفین میں ہی قیام ہوا کرتا تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے ابھی خاکسار نیا نیا ہی تھا کہ مولانا یحییٰ ندوی آئے اور دہلی دیکھنے کا شوق ظاہر کیا، ہم دونوں نے قیام مفتی صاحب کے یہاں کیا، حضرت مفتی صاحب کی مہمان نوازی اور بزرگانہ برتاؤ سے ہم دونوں متمتع ہوئے اور بہت متاثر بھی، ایسی دل دہی بڑوں کی طرف سے عام طور پر ہوا کرتی ہے، اس کے بعد بھی جب کبھی دہلی جانا ہوا، مفتی صاحب نے ہمیشہ اپنے ایک عزیز کی طرح ٹھہرایا، اور آنے جانے والوں سے بڑے وقیع و بلند جملوں کے ساتھ تعارف کرایا، مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مکارمِ اخلاق کے عملاً مجسمہ تھے اور صاف دل اور پاک باطن ایسے کہ رشک ہوتا تھا۔

ان کی نشست گاہ ہر وقت آنے جانے والوں سے بھری ہوتی تھی، سیاسی، غیر سیاسی، زعماء قوم و ملک علماء کرام، مدارس کے اساتذہ، تاجر، مختلف پارٹیوں کے سربراہ، مصیبت زدہ، مختصر یہ کہ ہر طرح کے لوگ آتے اور مفتی صاحب سبھوں کے ساتھ محبت سے ملتے، سبھوں کی باتیں سنتے اور مخلصانہ مشورے دیتے، سفارشیں بھی کیا کرتے تھے، مفتی صاحب کو نہ کسی سے حسد تھا، اور نہ بغض و عداوت، بلکہ سبھوں کے بہی خواہ تھے، وہاں سے کوئی رنجیدہ نہیں اُٹھتا تھا، مزاج میں بڑی سادگی تھی، گو بہت باوضع تھے، مگر مہمانوں کے لیے خود گھر سے کھانا لاتے، ملازم کئی کئی سامنے موجود ہوتے، مگر ان میں سے کسی کو حکم نہیں دیتے، بارہا میں نے دیکھا چائے لا رہے ہیں، خود ہی کھانا لا رہے ہیں، اور پھر خود بیٹھ کر اپنے سامنے کھلا رہے ہیں اور باتیں کر رہے ہیں، جو جس ذوق کا ہوتا، اس سے اسی طرح کی گفتگو فرماتے، یعنی اہلِ علم سے علمی، اصلاحی اور دینی اور سیاسی لوگوں سے سیاسی۔

جب کبھی میں وہاں گیا، کبھی مفتی صاحب کو تنہا بیٹھے ہوئے نہیں دیکھا، بڑا کمال یہ تھا کہ اس ہجوم سے نہ دل برداشتہ ہوتے تھے اور نہ ناگواری ظاہر فرماتے تھے، تحمل و برداشت کا بہت مادہ رکھتے تھے۔

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اگر خالص علمی مزاج نہ رکھتے ہوتے، تو وہ بھی ہندوستان کے ممتاز مرشدوں میں

ہوتے، یا چوٹی کے لیڈروں میں، آپ کے والد محترم حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی کے مسترشدین کا حلقہ بڑا وسیع تھا، وہ چاہتے بھی تھے کہ بڑے صاحب زادے اور ممتاز عالم دین ہونے کی حیثیت سے اپنے والد ماجد کی اس گدّی پر جلوہ افروز ہوں، اور بیعت و ارشاد کی خدمت انجام دیں، مگر مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکے۔ کبھی کبھی فرماتے تھے کہ فلاں خطہ میں جانا ہوا، تو دیکھا سیکڑوں بوتلیں ہیں جن پر مجھے دم کرنا ہے اور سیکڑوں اشخاص ہیں جو گریبان کھولے ہوئے بیٹھے تھے کہ ان کے سینوں پر پھونک ماردی جائے۔

دہلی میں بھی مختلف کمیٹیوں، اسکولوں، انجمنوں اور مدارسِ اسلامیہ بحیثیت عہدہ دار، اور مشیر شریک رہا کرتے تھے، بات کسی کی کاٹتے نہیں تھے، دہلی میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی کفایت اللہ کے بعد آپ کو بڑی مقبولیت عطا کر رکھی تھی، ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''کیا کہوں کاموں کے ہجوم میں گھرا رہتا ہوں اور یہ کام بھی مختلف النوع ہوتے ہیں، جمعیۃ علماء کا کام، الجمعیۃ اخبار کی دیکھ بھال، فتح پوری ہائی اسکول کی صدارت، سنی مجلس اوقاف کے کام، مدرسہ حسین بخش کی نگرانی، بعض دوسرے عربی مدرسوں اور انگریزی اسکولوں کے کام، آنے جانے والوں کے وقتی اور ہنگامی کام، برہان اور ندوۃ المصنفین کی مکمل ذمہ داری، حالات کی ناسازگاریوں اور تلخیوں کا مسلسل مقابلہ خانگی پریشانیاں، اہلیہ کی علالت کا امتداد، صحت کی کمزوری، اور صلاحیت کار کا فقدان، یہ سب چیزیں کچھ اس طرح جمع ہوگئی ہیں کہ جب کبھی خیال کرتا ہوں فلاں خط کا تفصیلی جواب لکھوں گا۔ بس وہ جواب رہ ہی جاتا ہے''۔ (مکتوب ۳۱ر جنوری ۱۹۵۵ء)

مفتی صاحب کا تعلق ایک طرف وزیر اعظم ہند سے بھی تھا اور دوسری طرف معمولی معمولی ہم جیسے مولویوں سے بھی، وہ سیاسی کام بھی انجام دیتے تھے اور علمی و دینی خدمت بھی، ندوۃ المصنفین قائم کر کے انہوں نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہے، سیکڑوں معیاری، دینی، تاریخی، تحقیقی کتابیں چھاپ کر شائع کر دینا معمولی کارنامہ نہیں۔

دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء، مجلس مشاورت، مسلم پرسنل لاء بورڈ سبھی کے مخلص مشیر اور رکن تھے، عرصہ تک جمعیۃ علماء ہند کے فعّال کارکن رہے، کچھ سال اس کے صدر عامل بھی رہے۔ بلاشبہ مفتی صاحب ہمہ جہتی ذہن وفکر کے مالک تھے۔

اسی کے ساتھ مفتی صاحب باجماعت نماز اور اپنے معمولات کے بہت پابند تھے، خود حافظ قرآن تھے؛ چنانچہ تہجد میں قرآن پڑھنے کا معمول تھا، بڑے لڑکے کو حافظ قرآن بھی بنایا تھا، ابتداء تراویح میں اس کا قرآن بھی سنا کرتے تھے۔ اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

”شروع رمضان کے روزے کافی ثواب آور رہے، اب موسم بڑی حد تک خوشگوار ہوگیا ہے، بڑے بچّہ کا قرآن مجید تراویح میں سنتا ہوں، اپنا نوافل میں پڑھتا ہوں“۔ (مکتوب ۸ر رمضان المبارک ۱۷ سنہ ۱۳ھ مطابق ۲ر جون سنہ ۱۹۵۲ء)

مفتی صاحب کے یہاں شو اور نام ونمود کا جذبہ قطعاً نہیں تھا۔ پُرانے طرز کے عالم باعمل تھے اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہی عبادات کا معاملہ رکھتے تھے اور بس۔ ریاء وسُمعہ کو پسند نہیں کرتے تھے، اور یہ واقعہ ہے کہ عبادت اسی طرح ہونی چاہئے۔ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نُوری پر روتی ہے
بری مشکل سے ہوتا ہے، چمن میں دیدہ ور پیدا

(ماہنامہ برہان کا مفکر ملت نمبر: ص ر ۱۳۴)

......❖......

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یادیں

مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی
مہتمم جامعہ رحیمیہ، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند سعید اپنے والد مرحوم و مغفور کا نمبر نکالنے کے لیے بے تاب تھے، ان کی بے تابی کا ثمرہ یہ نمبر قارئین کے سامنے ہے۔

ان کی بے تابی میں اپنے والد کے لیے بڑی محبت اور خلوص پوشیدہ تھا۔ ایک ایک متعلق سے انہوں نے کئی کئی سو بار، اگر مبالغہ نہ ہو، درخواست کی ہے تب کہیں جا کر یہ نمبر تیار ہوا ہے۔

اصل بات یہ تھی کہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر کون قلم اُٹھاتا، یہ ان ہی لوگوں کا حق تھا، جنہوں نے مرحوم کو شروع سے دیکھا اور مرحوم کی رفاقت کا شرف حاصل کیا۔

آج جو لوگ حیات ہیں ان میں زیادہ تر وہ ہیں جنہوں نے حضرت مرحوم کا صرف آخری دَور دیکھا۔

مولانا اکبر آبادی مرحوم جو کچھ لکھ گئے وہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فضل و کمال کا صحیح تعارف ہے، ہم لوگوں نے مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وہ دَور دیکھا جب مفتی صاحب مجاہد ملّت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک رفیق کار کے طور پر ۴۷ء کے قیامت خیز ہنگاموں سے ملّتِ اسلامیہ کی بچی کھچی پونجی کو بچانے کی جدو جہد میں مصروف تھے۔

اس دَور کا کوئی ہنگامہ اور کوئی اجتماع ایسا نہ تھا جس میں مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے تدبر اور پدرانہ شفقت کے اثرات سے ہمارے دل و دماغ کو متاثر نہ کیا ہو۔

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تعلیمی اور تدریسی دَور ایک علمی اور روحانی خانوادہ کے شاہ زادے کا دَور تھا، وہی چلبلا پن، علمی تفاخر، تنقید و نکتہ چینی، ہنگامہ خیزی جو ایک شاہ زادے اور صاحبزادے کے اندر ہونی چاہیئے وہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اندر موجود تھی اور یہ ساری باتیں جب مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس آخری دَور میں صادر ہوتی تھیں تو مرحوم کے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے ان کے رفقاء مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد میاں صاحب ہنس ہنس کر سنتے تھے اور کیف اندوز ہوتے تھے۔

جمعیۃ علماء ہند کے قدیم نظام میں جب انقلاب آیا اور مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید صاحب کی جگہ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالمحاسن سجاد اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو لایا گیا تو مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس انقلاب کے رہنماؤں میں شامل تھے۔ یوپی کے مشہور کانگریسی لیڈر مولانا بشیر بھٹہ صاحب اس انقلاب میں سب سے آگے تھے تو اس دَور کی باتیں سناتے ہوئے مولانا احمد سعید صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کہا کرتے تھے:

''ان چٹکیوں سے ہزاروں فتوے نکل چکے ہیں''

مفتی صاحب کا اشارہ اس انقلاب کی شدت کو کم کرنے کی طرف تھا ایک گروہ کو مفتی اعظم کو صدارت سے ہٹانے پر صدمہ اور خفگی ہوگی لیکن جماعت میں جمہوری سرگرمی پیدا کرنے کے لیے یہ انقلاب اپنی جگہ ضروری تھا۔

اور بلاشبہ ملک میں جو حالات پیدا ہوئے ان میں جمعیۃ علماء ہند کے جدید قائدین نے بہترین صلاحیت کا مظاہرہ کیا، ان میں مفتی عتیق الرحمٰن بھی شامل تھے؛ لیکن یہ ان حضرات کا بڑا پن تھا کہ مفتی اعظم اور سحبان الہند کی عہدوں سے علٰحدگی کے بعد بھی اس نوجوان گروہ نے ان بزرگوں کے احترام و ادب میں کوئی کمی نہیں کی۔

لیکن جب جمعیۃ علماء ہند تیسرے انقلاب سے گزری اور مولانا مدنی اور مولانا حفظ الرحمٰن کے بعد مولانا مدنی کے صاحبزادے صاحب کو ان کی جگہ لانے کی کوشش کی گئی تو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ وہ سلوک نہ کیا گیا جو انہوں نے اپنے پیش رو بزرگوں کے ساتھ کیا تھا۔

یہ تاریخ کی بڑی ستم گری تھی جو مفتی صاحب کے ساتھ پیش آئی۔ وہ دور مفتی صاحب کے لیے بڑا کرب انگیز تھا اور مرحوم دبے لفظوں میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی اس غلطی کو تسلیم کرتے تھے کہ جس طرح جمعیۃ علماء ہند کو متحرک کرنے کے لیے مفتی اعظم کی جگہ مولانا مدنی کو لایا گیا اسی طرح مولانا مدنی کی جگہ دوسرا صدر بنایا جاتا اور جمعیۃ علماء کا نظام بدلتا رہتا۔

جبکہ مولانا مدنی ہر بار صدارت سے علٰحدہ ہونے کی خواہش کرتے تھے۔ لیکن نہ ان کی جگہ پُر کرنے کے لیے جمعیۃ علماء کے پاس کوئی دوسری شخصیت تھی اور نہ ان ہنگامہ خیز حالات میں ان حضرات نے کوئی تبدیلی مناسب سمجھی، اس کا نتیجہ جماعت کے حق میں اچھا نہیں نکلا۔ کیونکہ عرصۂ دراز تک مولانا مدنی کی قیادت کے سبب جماعتی حلقہ پر مولانا کی عقیدت کا اثر قائم ہوگیا اور جمعیۃ علماء کو مولانا مدنی کے عقیدت مندوں کی جماعت سمجھا جانے لگا اور اس کے نتیجہ میں ان کے صاحبزادے مولوی اسعد مدنی صاحب کا جمعیۃ علماء پر تسلط قائم ہونا ایک قدرتی بات تھی۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی علالت کے دوران ہی اس تسلط کے آثار مولانا نے محسوس کرنے شروع کردیے تھے لیکن جس موذی بیماری میں مولانا گرفتار تھے اس میں وہ بے بس تھے، مولانا کے بعد اس تسلط کی اذیت ناکی سے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو پوری طرح گزرنا پڑا۔

اُس دور میں مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے صبر آزما حالات سے گزرے، مولانا محمد میاں صاحب جیسے صاحب اخلاص بزرگ حالات کے دباؤ میں آ کر مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے دُور ہو گئے تھے۔

اس دور میں مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شرافت۔ جو اجتماعی اور جماعتی معاملات میں کمزوری بن جاتی ہے نمایاں رہی اور طرح طرح ذہنی اذیتوں اور بے بنیاد حملوں کو برداشت کر کے مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رفقاء کو جماعت کی تقسیم سے دُور رکھا ورنہ ان حالات میں ایک دوسری جمعیۃ علماء کا قیام ہو چکا ہوتا۔

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ انسان تھے، کمزوری انسان کی فطرت کا حسن ہے ہماری اسی کمزوری پر خدا تعالیٰ کی مصلحت کا نظام قائم ہے۔ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑی سے بڑی غلط بات پر بھی کسی کی دل آزاری کو پسند نہیں کرتے تھے۔

اپنی اس مشہور کمزوری کو وہ روحانی رنگ دے کر اس کی نہایت خوب صورت تاویل کرتے تھے اور فرماتے تھے میں تعدد حق کا قائل ہوں یعنی ایک ہی معاملہ میں مختلف اور متضاد پہلوؤں میں سے ہر پہلو کے حق اور صحیح ہونے کا امکان ہے۔ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ''جی ہاں'' مشہور تھی، ایک لمبی جی ہاں جو ہر شخص کی تسلی کر دیتی تھی اور معاملات کی اُلجھنیں اپنی جگہ قائم رہتی تھیں۔

مفتی صاحب کی یہ فطری صفت ہی تھی جس کی وجہ سے مرحوم مختلف مزاج رکھنے والے کارکنوں سے کام لے لیا کرتے تھے۔

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجلس مشاورت کو جس کمال حسن تدبر کے ساتھ چلایا وہ انہی کا حصہ تھا۔ مسلم لیگی، کانگریسی، جماعتِ اسلامی اور اربابِ مدارس قدیم علماء سب ہی ایک جگہ جمع ہو کر ملت کے مسائل پر آنسو بہاتے تھے۔ اب مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ان کی قدر ہو رہی ہے۔

مرحوم نے کبھی مشاورت کے پلیٹ فارم پر جذباتی فیصلے نہیں ہونے دیے اور اب وقتی اور جذباتی واہ واہ کرانے والے فیصلوں نے مشاورت کے وقار کو سخت صدمہ پہنچا رکھا ہے۔

مفتی صاحب کی طویل علالت ہی میں مولانا محمد مسلم صاحب کہا کرتے تھے کہ اب مجلس مشاورت کو ختم کر دینا چاہیے۔

جمعیۃ علماء ہند کا دفتر ایک پُرانی گلی (ست گھرے) میں واقع تھا اور یہ تین بزرگ اس پرانے دفتر کی رونق تھے۔ اور اس دفتر میں فقیری کے اندر شاہی کا سماں نظر آتا تھا۔

مجاہد ملت کے بعد ایک خیر مقدمی تقریب میں مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس گلشن کے اُجڑنے پر اپنے قلبی تاثرات کا اظہار ایک شعر پڑھ کر کیا۔

مے بھی ہے، مینا بھی ہے، ساغر بھی ہے، ساقی نہیں
جی میں آتا ہے لگا دوں آگ مے خانہ کو بھی

کسے خبر تھی کہ مفتی صاحب کے بعد ان کے لگائے ہوئے گلشن پر بھی کھڑے ہو کر ان کے عاشق ان ہی الفاظ میں اظہارِ غم کیا کریں گے اور میاں عمید الرحمٰن عثمانی انہیں اپنے محبت بھرے الفاظ سے تسلی دینے کی کوشش کریں گے، لیکن ہر غم گسار یہ پڑھتا ہوا چلا جائے گا۔

شیشہ بھی ہے، ساقی بھی ہے، ہے شمع بھی، پر بن تیرے
وہ خوبئ مجلس کہاں، وہ رونقِ محفل کہاں

مفتی صاحب ماضی کی عظیم علمی اور قومی روایات کے امین تھے؛ اس لیے ندوۃ المصنفین کا دفتر بڑی سے بڑی سیاسی اور مذہبی شخصیت کا مرجع تھا اور جمعیۃ بلڈنگ گلی قاسم جان کے اُجڑنے کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ مگر اب ان روایات، وضع داری اور خود داری پر مکمل ماتم کے سوا کچھ نہیں۔

مفتی صاحب میں بڑا پن تھا۔ صرف مرحوم بڑے ہی نہیں تھے، بہت سے لوگ بڑے ہوتے ہیں، مگر ان میں بڑا پن نظر نہیں آتا، یہی وجہ تھی کہ مفتی صاحب شخصی تعلقات کو نبھانے کی بے مثال کوشش کرتے تھے، مفتی صاحب مزاح کے طور پر فرماتے تھے کہ دلّی والے اب بھی مجھے پردیسی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ وہ دلی والوں کے ساتھ تعلقات نبھانے میں پوری شرافت وسیادت کا ثبوت دیتے تھے۔ مرنے جینے، شادی بیاہ اور سماجی تقریبات میں شرکت کا پورا پورا اہتمام کرتے تھے، ملنے جلنے پر ایک ایک گھر والے کو پوچھتے تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا لوگوں کی ضرورتیں پوری کرنے کی جدوجہد کرتے تھے۔

مفتی صاحب حضرت محدث کشمیری کے لائق ترین تلامذہ میں سے تھے۔ تدریسی دَور میں مفتی صاحب کی جو شہرت ہوگی وہ تو ہم سے پہلے کے دَور کی بات ہے، لیکن مختلف مسائل پر مفتی صاحب کے تبصرے ہم نے ضرور سنے ہیں، مختصر تقریریں بھی سنی ہیں، مرحوم اپنے رفقاءِ علمی سے کسی طرح کم نہیں معلوم ہوتے تھے۔ البتہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جو رفقاءِ علمی اور تعلیمی لائن میں مصروف تھے، ان کو علمی شہرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ہوئی اور ہونی بھی تھی۔

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر نہایت علمی اور تحقیقی ہوتی تھی اور اگر ندوۃ المصنفین کے ادارہ کی یہ تنظیمی خدمت ان پر حاوی نہ ہوتی تو مرحوم کی علمی اور تحقیقی کتابیں ایک بڑے کامیاب مصنف سے کسی طرح سے کم نہ ہوتیں۔

مرحوم کی کوششوں نے جماعت دیوبند کے علماء پر لگنے والے اس الزام کو دُور کر دیا کہ علماء دیوبند اہلِ قلم نہیں ہیں اور شبلی اسکول ہی قلم وتحریر کا مالک ہے۔

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اتنا بڑا تصنیفی ادارہ بڑے وقار کے ساتھ چلایا اور چندہ مانگنے کی عام بدنامی سے ادارہ کو محفوظ رکھا، مرحوم مالی معاملات میں دیانت اور امانت کی صفات کا بہترین نمونہ تھے۔

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کافی لوگوں کو بنایا اور بڑھایا، ان حضرات میں مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگرد مولانا قاضی سجاد حسین صاحب ہیں، فارسی کتابوں کی طباعت اور فارسی نصاب کی کتابوں کا احیاء مفتی صاحب ہی کے مشورہ اور رہنمائی سے قاضی صاحب کے ذریعہ ہوا اور بڑی مالی کامیابی کے ساتھ ہوا۔ دلی کے مدرسوں میں قاری محمد سلیمان صاحب میوانی کا مدرسہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی سے اس مقام پر پہنچ گیا کہ آج گجرات اور افریقہ کی بڑی دولت اس مدرسہ پر بارش کی طرح برس رہی ہے اور قاری صاحب میوات کے رئیس اعظم ہیں۔

جمعیۃ علماء کے نوجوان طبقہ سے مفتی صاحب باپ جیسی شفقت و محبت فرماتے تھے، میرا معاملہ عجیب تھا، میں صدارتی اختلاف کے بعد جماعت ہی سے وابستہ رہا، جبکہ دہلی کے علماء میں مفتی ضیاء الحق صاحب حضرت مفتی صاحب کے ساتھ رہے، اس اختلافی دَور میں بڑے بڑے تلخ مرحلے آئے مگر مفتی صاحب کی محبت میں کبھی فرق نہیں آیا، جب آمنا سامنا ہوا تو دو چار فقرے کس دیے اور پھر محبت سے حالات پوچھنے لگے کیسے ہو، خیریت ہے؟

مفتی ضیاء الحق صاحب سے مرحوم کا بہت خاص تعلق رہا۔ ضیاء الحق صاحب بہت زود حس اور جذباتی اعتبار سے بڑے کڑوے واقع ہوئے ہیں، ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے، ہم جیسے فقیر مزاج ساتھیوں کو ہمیشہ اپنے سے بے حیثیت سمجھا۔ اور میں تو واقعی ان کے مقابلہ میں بے حیثیت انسان تھا اور اب بھی ہوں۔ مگر بعض دوسرے ساتھی ان کی اس اَنا سے بہت پریشان رہتے تھے، مفتی صاحب ایک طرف ضیاء الحق صاحب کی اَنا کا پورا پورا خیال رکھتے تھے اور دوسری طرف ہم جیسے فقیر صفت لوگوں کی دل داری کرتے تھے۔ اور یہ بڑا پن مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خاص صفت تھی۔

جامعہ رحیمیہ سے مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خاص تعلق تھا، علی محمد صاحب شیر میوات کا بہت خیال فرماتے تھے، ضیاء الحق صاحب کے بے تعلق ہونے کے بعد مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جامعہ کا بڑا خیال رہا۔

احقر سے بار بار علالت کے دوران جامعہ کا ذکر فرماتے۔ علی محمد صاحب کی خواہش پر جب میں نے جامعہ کے مہتمم کا عہدہ سنبھالا تو مفتی صاحب کو ایک طرف خوشی ہوئی اور دوسری طرف میں نے مرحوم کے اندر قلق اور رنج محسوس کیا اور یہ رنج و افسوس ضیاء الحق صاحب کے جامعہ سے بے تعلق ہونے کا تھا اور ان کی جگہ ایک ایسے شخص کے تقرر کا تھا جس سے ضیاء الحق صاحب کو خاص قسم کی قلبی اُلجھن رہی اور معاصرانہ رَقابت بھی۔

بہرحال جامعہ رحیمیہ کے قیام اور اس کی موجودہ ترقی میں مفتی صاحب کی قلبی توجہات کا بہت دخل رہا۔ خدا خوش رکھے مفتی ضیاء الحق صاحب کو وہ پاکستان چلے گئے اور مفتی صاحب مرحوم نے ان کی جدائی کا بھی صدمہ اُٹھایا۔ مفتی صاحب کی آخری علالت کے دوران ہی ضیاء الحق صاحب مفتی صاحب سے جدا ہو گئے تھے۔

دارالعلوم کی کش مکش کے زمانہ میں مفتی صاحب زندگی کی بڑی کش مکش سے دو چار رہے، ایک طرف

مولانا اسعد پارٹی کے قبضہ اور اس کے نتائج میں انہیں دارالعلوم کی روایات کا زوال نظر آرہا تھا اور دوسری طرف انہیں ایک دیانت دار عالم کی طرح دارالعلوم کے نظام میں پیدا ہونے والی کمزوریوں کا بھی احساس تھا۔ اور اس دوگونہ احساس نے ان کے اندر بڑی گھٹن پیدا کردی تھی اور میرے سامنے مفتی صاحب اس گھٹن کا اظہار کرنے پر مجبور ہوتے تھے اور مرحوم اشاروں اشاروں میں دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈال دیا کرتے تھے۔

تنظیم فضلاء کا ناظم بنانے میں مفتی صاحب اور مولانا منت اللہ صاحب رحمانی دونوں بزرگوں کی رائے شامل تھی؛ لیکن جب میں دارالعلوم کے ہنگاموں سے گھبرا کر دہلی آتا اور مفتی صاحب سے ملتا تو مفتی صاحب کے ملے جلے تاثرات سن کر میں سمجھ لیتا کہ دارالعلوم اس انقلاب سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔

دارالعلوم کے جھگڑے میں اس رات کا منظر میں فراموش نہیں کرسکتا جس رات کو ہڑ باز طلبہ مدنی منزل کی قیادت میں مہمان خانہ پر حملہ آور ہوئے اور شوریٰ کے اکابر وہاں موجود تھے، طلبہ خاص طور پر میرے خلاف نعرہ بازی کررہے تھے اور لوہے کے سریوں اور لاٹھیوں سے مسلح مجھے بھی اپنے حوالہ کرنے کا مطالبہ کررہے تھے اور میں ان بزرگوں کے ساتھ مہمان خانہ کے کمرہ میں تھا۔

اس وقت مفتی صاحب کی پریشانی مجھ سے دیکھی نہیں جارہی تھی ایک طرف وہ حوصلہ کا مظاہرہ کررہے تھے، دوسری طرف میرے بارے میں مولانا منت اللہ صاحب سے چپکے چپکے باتیں کررہے تھے کہ اسے حفاظت میں پہنچایا جائے، کیونکہ مفتی صاحب جانتے تھے کہ اگر مجھے کچھ ہوگیا تو دلی میں اس کا کیا اثر ہوگا، اور مفتی صاحب دلی واپس آکر اس کا کیا جواب دیں گے؟

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ دلی میں ہمارا مرکز تھے، ملک کی قومی قیادت کا معتمد سہارا تھے، مسلم عوام اور حکومت کے درمیان ایک سنجیدہ واسطہ تھے۔

جنتا انقلاب کے بعد میں اور مولانا انیس الحسن صاحب اور مولانا فقیہ الدین صاحب مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مرار جی بھائی کو وزیر اعظم منتخب ہونے پر مبارک باد کا ٹیلی گرام دے دیجئے، اب ان سے واسطہ پڑے گا۔ لیکن مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی سنجیدگی سے انکار کردیا۔

اس دَور میں فرمایا کرتے تھے کہ میرا اندر ہی اندر دم گھٹ رہا ہے۔ ہم ایمرجنسی کے حالات سے متاثر تھے اور اس انقلاب سے خوش تھے مگر مفتی صاحب کی دُور اندیشی حالات کو صحیح روشنی میں دیکھ رہی تھی؛ چنانچہ تھوڑی مدت کے بعد معلوم ہوا کہ اپوزیشن پارٹیاں مسلم معاملات میں دکھاوے کے طور پر بھی ہمدردی کا اظہار کرنا غیر ضروری سمجھتی ہیں اور مفتی صاحب کی گھٹن بالکل صحیح ہے۔

مفتی صاحب مسلمانوں میں الگ سیاسی پلیٹ فارم کو پسند نہیں کرتے تھے، آزادی کے دَور میں بھی مفتی صاحب

نے اتحاد پسندوں کا ساتھ دیا اور قومی تحریکات میں شریک رہے اور مسلم مشاورت کی صدارت کے دور میں بھی مفتی صاحب اپنے سیاسی کردار پر قائم رہے اور مسلم لیگ کی سیاسی حکمت عملی کو مجلس میں داخل ہونے سے روکتے رہے۔

بعض لوگ یہ کہتے تھے کہ جماعتِ اسلامی نے مفتی صاحب کی آڑ میں ملک کے اندر جگہ بنائی لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مفتی صاحب نے جماعتِ اسلامی کی مذہبی شدت پسندی کو کم کرنے میں بھی خاص رول ادا کیا۔

دیوبندی، بریلوی اختلاف ہو یا سنی شیعہ اور حنفی اہلِ حدیث اختلاف مفتی صاحب ان اختلافات میں شدت پیدا کرنے کے خلاف تھے، کیونکہ مرحوم میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے اندر اتفاق و اتحاد قائم کرنے کا سچا جذبہ موجود تھا۔

(مفکر ملت نمبر: ص ۱۷۸)

……❖……

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا محمد منظور نعمانی
مدیر ماہناہ ''الفرقان''،لکھنؤ

۱۰رشعبان (۱۲رمئی) شنبہ کادن تھا، راقم سطور نماز مغرب سے فارغ ہوا تھا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ اور اس کے عربی ماہنامہ البعث الاسلامی کے مدیر مولانا سعید الرحمٰن اعظمی نے فون پر بتلایا کہ دہلی سے ٹیلی فون سے اطلاع ملی ہے کہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب انتقال فرما گئے ۔خبرسن کر قرآن مجید کی تعلیم وتلقین کے مطابق یہی کلمہ زبان پر آیا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (جس کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ ہم سب اللہ ہی کے ہیں، وہی ہمارا خالق و پروردگار اور مالک و حاکم ہے اور ہماری حیات وموت اور سب کچھ اسی کے اختیار میں ہے اور ہم سب یہاں کی زندگی پوری کر کے اسی کی طرف لوٹنے والے اور اسی کے حضور میں حاضر ہونے والے ہیں) اس کلمہ نے اپنی موت بھی آنکھوں کے سامنے کر دی اور سوچنے لگا کہ یہی دن (بظاہر جلدی ہی) میرے لیے بھی آنے والا ہے، اُس وقت میری سب سے بڑی طلب اور حاجت یہ ہوگی کہ ربّ کریم رحم و کرم کا معاملہ فرمائے ۔اس خیال کے آتے ہی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مفتی صاحب کے لیے اور خود اپنے لیے مغفرت و رحمت کی دعا میں مشغولیت نصیب ہوگئی ۔اس عاجز نے اسی کو اُن کے ساتھ دیرینہ تعلق کا حق اور اُس دوسرے عالم میں جہاں وہ پہنچ گئے، اُن کی ممکن خدمت اور راحت رسانی کا وسیلہ سمجھا، اللہ تعالیٰ آئندہ بھی اُن کے حق کے مطابق اس کے اہتمام کی توفیق عطا فرمائے۔رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْنَ.

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تعارف اور تعلق

اب سے اکسٹھ سال پہلے ۱۳۴۳ھ میں جب راقم سطور ایک طالب علم کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا تو پہلی دفعہ اسی وقت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کو دیکھا تھا۔وہ اُس وقت ۲۳-۲۴ سال کے جوان تھے۔ دو سال پہلے ۱۳۴۱ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کر چکے تھے ۔اُس وقت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ عہدہ کے لحاظ سے دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم تھے،لیکن اہتمام کا سارا کام وہی انجام دیتے تھے ۔اس لیے

عملاً گویا وہی مہتمم تھے۔ان کا دستور تھا کہ دارالعلوم کے فضلا و فارغین میں جو بھی استعداد کے لحاظ سے ممتاز ہوتے وہ معین المدرس کی حیثیت سے ان کو دارالعلوم میں لے لیتے اور ابتدائی درجات کی تعلیم و تدریس کا کام ان سے لیتے۔مفتی عتیق الرحمٰن صاحب علمی استعداد کے لحاظ سے بہت ممتاز تھے،تعلیم کے آخری سال یعنی دورۂ حدیث میں انہوں نے اپنی پوری جماعت میں اعلیٰ نمبر حاصل کر کے امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی تھی،اس لیے ان کو معین المدرس کی حیثیت سے دارالعلوم میں لے لیا گیا ان کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اس زمانہ میں دارالعلوم کے مفتی تھے۔مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ان کی نگرانی میں افتاء (فتویٰ نویسی) کا کام بھی کرتے تھے۔اس وجہ سے ان کو نائب مفتی بھی کہا جاتا تھا۔

میرے مزاج میں فطری طور پر کم آمیزی ہے جو دارالعلوم کی طالبِ علمی کے اس زمانہ میں حد سے بڑھی ہوئی تھی،بے ضرورت کسی سے ملنے ملانے کا بالکل معمول نہیں تھا۔میں اپنی طالبِ علمی کے آخری مرحلے میں دیوبند گیا تھا۔اس لیے صرف ان ہی اکابر اساتذہ سے اس زمانہ میں اس عاجز کا تعلق رہا جن کے یہاں میرے اسباق ہوتے تھے۔اُس لیے اس زمانہ میں مفتی عتیق الرحمٰن صاحب سے کوئی خاص تعلق نہیں رہا۔بس اتنا ہی جانتا تھا کہ یہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کے صاحبزادے ہیں۔معین المدرس اور نائب مفتی ہیں۔

شعبان ۱۳۴۵ھ میں دارالعلوم کی میری طالبِ علمی کا دور ختم ہو گیا اور میں دورۂ حدیث کا امتحان دے کر مکان آ گیا۔اپنی جس فطری کم آمیزی کا اوپر ذکر کیا ہے اس کی وجہ سے میں اس بات سے تقریباً بے خبر رہا کہ دارالعلوم میں اوپر کی سطح پر کچھ اختلافات ہیں،یہ میرے مکان پہ آجانے کے بعد جلد ہی اخبارات اور بعض دوسرے ذرائع سے معلوم ہونے لگا کہ ان اختلافات نے سنگین صورت اختیار کر لی اور اس کے نتیجہ میں اس وقت کے صدر المدرسین اور شیخ الحدیث استاذنا حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری،حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اور ان کے ساتھ دیگر متعدد اکابر اساتذہ نے دارالعلوم سے تعلق قطع کر لیا۔ان حضرات کے ساتھ جن نوجوان اساتذہ نے دارالعلوم سے قطع تعلق کیا تھا اُن میں مولانا بدر عالم میرٹھی مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی بھی تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد یہ سب حضرات گجرات ضلع سورت کی بستی ڈابھیل کے مدرسہ تعلیم الدین میں اجتماعی طور پر بلا لیے گئے اور اس کے بعد سے وہ مدرسہ جامعہ اسلامیہ ہو گیا اور اس طرح دارالعلوم کے اختلاف کے اس شر سے یہ خیر پیدا ہوا کہ گجرات میں کم از کم تعلیم کی سطح پر دارالعلوم دیوبند جیسا ہی ایک جامعہ اسلامیہ قائم ہو گیا۔حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اس وقت اس قافلہ کے ساتھ تشریف نہیں لے گئے دیوبند ہی میں اپنے مکان پر اور اپنی مسجد کے حجرہ ہی کو اپنی قیام گاہ بنا لیا،لیکن مفتی عتیق الرحمٰن صاحب قافلہ کے ساتھ تشریف لے گئے اور جامعہ

اسلامیہ ڈابھیل میں تدریس کے علاوہ افتاء کی ذمہ داری بھی اُن کے سپرد رہی، کچھ عرصہ کے بعد آب وہوا کی ناموافقت کی وجہ سے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے مستعفی ہو کر چلے آئے اور پھر چند سال کلکتہ میں قیام فرمایا، یہاں درسِ قرآن اور خطابت وموعظت خاص مشغلہ رہا۔ کلکتہ کے اس قیام ہی کے زمانے میں ایک تصنیفی اشاعتی ادارے کے قیام کا خاکہ بنایا اور پھر اس کام کے لیے مستقل دہلی آگئے اور اپنے قدیم رفقاء مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے اشتراک وتعاون سے یہ ادارہ ندوۃ المصنفین کے نام سے قرول باغ دہلی میں (۱۳۵۷ھ ۱۹۳۸ء) میں قائم کیا اور اس کا ماہنامہ ''برہان'' جاری کیا۔ ادارہ کے انتظام کی ذمہ داری خود سنبھالی۔

الفرقان ۱۳۵۳ھ (۱۹۳۴ء) میں بریلی سے جاری ہو چکا تھا؛ لیکن کئی سال تک اس کی طباعت دہلی میں ہوئی تھی۔ راقم سطور ہر مہینہ اس کی کاپیاں لے کر چھپوانے کے لیے خود دہلی جاتا تھا۔ ندوۃ المصنفین قائم ہو جانے کے بعد سے مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قیام قرول باغ ہی میں رہتا۔ یہ عاجز اُس زمانے میں جب بھی دہلی جاتا، ان حضرات کی ملاقات کے لیے قرول باغ ضرور جاتا اور کبھی کبھی دن کا زیادہ وقت وہیں گزرتا۔

ملک کی تقسیم کے فیصلہ کے بعد ۱۹۴۷ء میں دہلی میں جو فسادات ہوئے اور دہلی کے مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی اس میں ندوۃ المصنفین بھی برباد ہو گیا تھا۔ قرول باغ مسلمانوں سے بالکل خالی ہو گیا تھا اور بظاہر اسباب ندوۃ المصنفین کے بقا کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی؛ لیکن فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اور بظاہر اسباب مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی دانشمندی، عزم وہمت اور مولانا حفظ الرحمٰن کی جدوجہد سے وہ پھر قائم ہوا۔ جامع مسجد کے علاقہ میں اس کے لیے ایک مناسب مکان حاصل کر لیا گیا۔ بفضلہ تعالیٰ وہ اسی میں قائم ہے۔ اس کا ماہنامہ ''برہان'' مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی ادارت میں جاری ہوا تھا، اب تک انہی کی ادارت میں جاری ہے بعد کے اس دَور میں بارہا ایسا ہوا کہ کسی ضرورت سے دہلی جانا ہوا تو ندوۃ المصنفین ہی میں قیام کیا۔

راقم سطور ۱۳۶۳ھ ۱۹۴۴ء میں دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کا رکن منتخب کر لیا گیا اس کے ۴-۵ سال بعد ۱۳۶۸ھ میں مفتی صاحب بھی اس کے رکن منتخب ہو گئے۔ اُس وقت سے دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ اور عاملہ کے جلسوں میں برابر ساتھ شرکت ہوتی رہی۔ ۱۹۶۵ء میں مجلسِ مشاورت قائم ہوئی اس میں بھی اس وقت تک ساتھ رہا جب تک کہ راقم سطور اور اس کے اصل بانی ڈاکٹر سید محمود نے استعفا دے کر بے تعلقی اختیار نہیں کی۔

قریباً نصف صدی کے اس قریبی تعلق میں میں نے مفتی صاحب کے بارے میں جو کچھ جانا اس کو مختصر الفاظ میں اس طرح عرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ نہایت ذہین، فہیم وفطین اور معاملہ فہم عالم دین تھے۔ تقریر اور تحریر پر یکساں قدرت تھی۔ موقع پر ضرورت کے مطابق بات کرنے کی اللہ تعالیٰ نے خاص صلاحیت عطا فرمائی تھی اگر

ندوۃ المصنفین کی انتظامی ذمہ داری نہ سنبھالی ہوتی اور اپنے کو انہوں نے تدریس وتصنیف جیسے علمی کاموں میں مشغول کیا ہوتا تو وہ حدیث وتفسیر وغیرہ علوم دینیہ کے درجۂ اوّل کے اساتذہ اور صفِ اوّل کے مصنفین میں ہوتے؛ لیکن ماشاء اللّٰہ کان وما لم یشاء لم یکن۔

وہ حافظ قرآن بھی تھے اور قرآن مجید بہت ہی اچھا پڑھتے تھے۔ رمضان مبارک میں وہ تراویح تو قریب کی مسجد میں قرآن مجید سنانے والے امام ہی کے پیچھے پڑھتے تھے؛ لیکن نوافل میں اپنا قرآن مجید ختم کرنے کا معمول تھا جو غالباً اُن کی اس علالت تک جاری رہا جس کا انجام اب ان کے سفر آخرت پر ہوا۔

قریباً سوا دو سال ہوئے دار المصنفین اعظم گڑھ میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر عالمی مجلس مذاکرہ تھی۔ مفتی صاحب نے اس میں شرکت فرمائی تھی۔ وہ اس سے فارغ ہو کر باوڑہ، دہرہ دون ایکسپریس سے واپس آرہے تھے۔ دوسرے رفقاء سفر کے علاوہ ان کے خاص رفیق مولانا سعید احمد اکبر آبادی بھی ساتھ تھے۔ بارہ بنکی کا اسٹیشن آنے سے پہلے بات کرتے کرتے مفتی صاحب پر فالج کا حملہ ہوگیا۔ ٹرین جب بارہ بنکی اسٹیشن پہنچی تو مولانا اکبر آبادی نے فون کے ذریعہ لکھنؤ کے اسٹیشن ماسٹر کو مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بتلایا اور کہا کہ ان کو لکھنؤ اُتار کر اسپتال پہنچانا ہوگا۔ اس لیے جب ہماری گاڑی لکھنؤ پہنچے تو اسٹیشن پر ڈاکٹر اور ایمبولنس موجود ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جب گاڑی لکھنؤ۔ اسٹیشن پہنچی تو مفتی صاحب کو اُتار کر ایمبولنس کے ذریعہ یہاں کے بلرامپور اسپتال میں داخل کیا گیا۔ مولانا علی میاں جو اعظم گڑھ سے مفتی صاحب سے پہلے تشریف لا چکے تھے اور دار العلوم ندوہ میں مقیم تھے، ان کو اسی وقت اطلاع ہوگئی وہ اسی وقت اسپتال تشریف لائے اور دار العلوم کے چند سعادت مند طلبہ کی ڈیوٹی مفتی صاحب کی خدمت و تیمارداری کے لیے مقرر کر دی۔ مجھے دیر رات کے بعد دار العلوم ہی سے اس کی اطلاع ملی۔ میں صبح بعد نماز فجر ان کو دیکھنے کے لیے اسپتال گیا۔ اس وقت ان کی حالت بہت ہی نازک اور بظاہر مایوس کن تھی، بول بالکل نہیں سکتے تھے۔ اپنے ارادہ سے جسم کے کسی حصہ کو حرکت بھی نہیں دے سکتے تھے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ انہوں نے مجھ کو پہچان لیا۔ میں نے اس وقت تسلی کی جو بات کہنا مناسب سمجھی وہ کہی اور اندازہ ہوا کہ انہوں نے میری بات سمجھ لی۔ قریباً ایک ہفتہ لکھنؤ کے اس اسپتال میں قیام رہا۔ حالت کچھ بہتر ہوگئی۔ ان کے صاحبزادے اور داماد اطلاع ملنے پر دوسرے ہی دن آگئے تھے۔ یہاں کے ڈاکٹروں کے مشورہ سے طے ہوا کہ مزید علاج کے لیے ان کو دہلی لے جایا جائے؛ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ طویل عرصہ تک دہلی کے ایک اسپتال میں زیر علاج رہے اور حالت تدریجاً بہتر ہوتی رہی، یہاں تک کہ اسپتال سے ان کو گھر لے آیا گیا اور آنے جانے والوں سے معلوم ہوتا رہا کہ نقل وحرکت تو اب بھی مشکل ہے لیکن دماغ صحیح کام کرنے لگا ہے اور بات بھی کرتے ہیں۔

جب وہ لکھنؤ اسپتال میں تھے تو ان کی حالت دیکھ کر شدت کے ساتھ یہ احساس بار بار ہوا کہ قریباً نصف صدی کے اس تعلق کے زمانہ میں مختلف معاملات کے بارے میں رائے کا اختلاف بھی ہوا، اور اس کا کافی امکان ہے کہ میری کسی بات سے ان کو اذیّت پہنچی ہو، یا میں نے ان کی غیبت کی ہو یا سنی ہو، یا دل میں کوئی بدگمانی آئی ہو، اس لیے حتی الوسع زندگی ہی میں آخرت کے لیے اپنے معاملہ کو صاف کر لینا چاہیے۔ لیکن یہ خطرہ ہوا کہ اس طرح کی بات سے اُن کو یہ محسوس نہ ہو کہ ہم لوگوں کو اُن کے بارے میں مایوسی ہے۔ اس لیے اُس وقت دل کے اس داعیہ کو دبایا اور کچھ عرض نہیں کیا۔ پھر جب عرصہ کے بعد یہ معلوم ہو گیا کہ وہ دہلی میں اسپتال سے گھر لے آئے گئے ہیں اور حالت کافی بہتر ہے تو میں نے ان کی خدمت میں اس سلسلہ میں عریضہ لکھا اور آخرت کے لیے معافی کی صفائی اور معافی کی درخواست کی۔ قریباً تین مہینے کے بعد مفتی صاحب کا لکھایا ہوا عنایت نامہ ملا جس میں انہوں نے لکھایا تھا کہ آپ کا خط تو وقت پر پہنچ گیا تھا؛ لیکن گھر والوں نے اب سے پہلے مجھے دینا مناسب نہیں سمجھا، آج ہی میں نے دیکھا ہے۔ آگے مفتی صاحب نے وہ لکھایا جو اُن کے شایانِ شان تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس احسان کی بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے۔

اب سے کچھ دنوں پہلے ان کی طبیعت پھر زیادہ خراب ہوئی۔ معلوم ہوا تھا کہ ضعف بڑھ رہا ہے۔ ۱۰رشعبان ۱۲رمئی کو اچانک وہ اطلاع ملی جو اوپر ذکر کی جا چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ مغفرت ورحمت کا خاص معاملہ فرمائے۔ ناظرین کرام سے بھی اسی کی دعا درخواست ہے۔ اس عاجز پر بھی احسان ہوگا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ.

(مفکر ملت نمبر: ص ۴۸۶)

......❖......

مفکرملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کے اس تعارف کے بعد جائزے کو آگے بڑھاتے ہیں۔

دارالعلوم کی جدید تاریخ کی اس کتاب کے صفحہ نمبر ۱۰۲ کی پہلی سطر یہ ہے:

''مختلف مسائل ومشکلات کی وجہ سے جامعہ طبیہ کو تحلیل کردیا گیا''

جولوگ خدا سے نہیں ڈرتے وہ سچ نہیں بولتے؛ بلکہ گول مول باتیں کرتے ہیں۔حق بیانی اور بے باکی ان کے یہاں نہیں ہوتی۔ایسے لوگوں کی زبان ہوتی توان کے اپنے منہ میں ہی ہے؛لیکن اس پر قبضہ صاحب اقتدار کا ہوتا ہے۔

فاضل مرتب نے جامعہ طبیہ کے ختم ہونے کا سبب جن مشکلات ومسائل کے دلفریب الفاظ میں چھپانے کی کوشش کی ہے اس کی تمام وضاحت ہم گزشتہ صفحات میں آپ کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔

دیکھ لیجیے قارئین! پچھلے ہی صفحہ پر مولوی اسعد مدنی کو فعال شخصیت بتانے والے چاپلوس فاضل مرتب صاحب نے پوری کتاب میں یہ نہیں لکھا کہ جامعہ طبیہ اُنھیں فعال شخصیت نے ختم کیا تھا۔

۱۲۸/سال ۹۰۔۱۹۸۹ صفحہ نمبر ۱۰۳ سطر نمبر آٹھ پہ یہ جملہ درج ہے:

''حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کی دارالعلوم سے علیٰحدگی ہوئی''

مؤرخین عظام اگر محمد اللہ صاحب کی یہ تاریخ پڑھ لیں تو حیران بھی ہوں گے اور افسوس بھی کریں گے۔یہ تاریخ بیان کررہے ہیں یا اشارہ اشارہ کھیل رہے ہیں۔کمال ہے جہاں جہاں بھی مولوی اسعد مدنی صاحب کی ریشہ دوانیوں کا تذکرہ آنا ہوتا ہے وہاں سے فاضل مرتب صاحب چپ چاپ دُم دبا کے نکل جاتے ہیں۔اب مولانا وحید الزماں جیسا فعال اور مردم ساز شخص جو ۱۹۸۴ میں مددگار مہتمم بنایا گیا اور جس نے اپنی انتظامی صلاحیتوں سے دارالعلوم کی تعمیرات میں مثالی اور قابل قدر کام کیا۔ایسا فعال شخص کیوں فقط پانچ سال کے عرصے میں دارالعلوم سے الگ ہوگیا۔یہ کس کی سازش تھی،کس کارچایا ہوا کھیل تھا جو قابل اور لائق وفائق اشخاص کو دارالعلوم سے باہر کر رہا تھا،صرف اس لیے کہ جو قابل ہوتا ہے وہ جی حضوری نہیں کرتا،چاپلوسی نہیں کرتا۔جو ہر ایک جائز ناجائز بات پہ سرتسلیم خم نہیں رکھتا۔ہاں صرف اسی لیے ایسے لوگوں کو دارالعلوم سے باہر کیا جارہا تھا؛کیونکہ مولوی اسعد مدنی صاحب کو اپنی رائے سے اختلاف کرنے والے قطعی پسند نہیں تھے۔فاضل مرتب صاحب نے ایک جملہ لکھ کر تاریخ بیان نہیں کی ہے؛بلکہ بے دیانتی اور غیر ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہوئے تاریخ پر پردہ ڈالنے کا کام کیا ہے۔آئیے ہم آپ کو تاریخ کے دامن میں بکھرے ہوئے موتی چن کر دیتے ہیں۔دارالعلوم سے علیٰحدگی کا تفصیلی ذکر تو آپ گزشتہ صفحات میں مولانا وحید الزماں صاحب کے مضمون میں پڑھ ہی آئے ہیں۔آئیے یہاں ہم آپ کے سامنے وہ خط

تحریر کرتے ہیں جو مولانا وحید الزماں صاحب نے دارالعلوم سے علیحدہ کیے جانے پر شوریٰ کے نام لکھا تھا۔ مولوی اسعد مدنی صاحب کے کہنے پر چند بے بنیاد الزام عائد کر کے بے ضمیر افراد پر مشتمل شوریٰ نے یہ افسوسناک فیصلہ لیا تھا جس کے جواب میں مولانا وحید الزماں صاحب نے شوریٰ سے چند سوالات کیے تھے۔ آپ بھی وہ خط ملاحظہ کیجیے جو ترجمانِ دارالعلوم کے مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر میں شائع کیا گیا تھا۔ یہ خط آج ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیجیے خط حاضر ہے۔

....

فیصلۂ سبکدوشی پر

مولانا وحید الزماںؒ کا ردِ عمل

دارالعلوم دیوبند کی تدریسی خدمات سے سبکدوشی کا فیصلہ موصول ہونے کے بعد مولانا وحید الزماںؒ صاحب نے مہتمم دارالعلوم کے نام متعدد تحریریں ارسال کیں جن میں اس فیصلے کی قانونی حیثیت کو چیلنج کیا اور اس کی خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کر کے اس پر نظر ثانی کی درخواست کی۔ مولانا نے پُر زور دلائل سے ثابت کیا کہ سبکدوشی کا فیصلہ ضابطہ و تعامل کے خلاف اور نظر ثانی کا محتاج ہے۔ ایک تحریر میں جو ۱۳ر محرم ۱۴۱۱ھ کو ارسال کی گئی، مولاناؒ نے متعدد بے ضابطگیوں کا ذکر کرتے ہوئے اس نکتہ پر خصوصیت سے زور دیا کہ دارالعلوم کے ایک اہم استاذ کی سبکدوشی کا یہ فیصلہ مجلسِ شوریٰ کے ایجنڈے میں لائے بغیر اور شوریٰ کے سینیئر اور مقتدر ارکان کی عدم موجودگی میں کیا گیا ہے۔ جبکہ معمولی درجے کے ملازمین کو بھی اس طرح سبکدوش نہیں کیا جاتا۔ مولانا مرحوم کے الفاظ میں:

''دراصل یہ ساری بے ضابطگی اس لیے ہو رہی ہے کہ اصل معاملہ یعنی فیصلۂ سبکدوشی ہی غلط بنیاد پر کیا گیا ہے، اب اسے نبھانے کے لیے ایک غلطی کی جگہ مسلسل غلطیاں ہو رہی ہیں۔ فیصلہ اس لیے غلط بنیاد پر ہے کہ درجۂ عُلیا کے ایک ایسے مدرس کی علیحدگی کا فیصلہ جس کی دارالعلوم میں خاص اہمیت رہی ہو اور انقلابِ دارالعلوم میں اسکا نمایاں کردار رہا ہو۔ خود مجلسِ شوریٰ نے اور آنجناب نے ایک درجن سے زائد تحریروں میں اس کی بیماری کے باوجود دارالعلوم کے لیے اس کی ضرورت و اہمیت کو تسلیم کیا ہو۔ اور اس کی قوتِ کارکردگی اور انتظامی صلاحیت کو کھلے لفظوں میں سراہا ہو۔ جو اہم عہدوں پر فائز رہا ہو اور جو اب پہلے کے مقابلے میں زیادہ بہتر حالت میں ہو اور سالِ گزشتہ جس نے پابندی کے ساتھ مفوضہ تدریسی خدمت انجام دی ہو اور اس کا ہندو بیرونِ ہند میں ایک وسیع حلقۂ تلامذہ بھی ہو۔ اس کی علیحدگی کا مسئلہ ایجنڈے میں لائے بغیر جبکہ مجلسِ تعلیمی کی رپورٹ بھی اس کے خلاف نہ ہو،

محض ناظم مجلسِ تعلیمی کی سرسری غیر قانونی رپورٹ پر یا کسی دوسرے شخص کی ذاتی مخاصمت کی بنیاد پر سبکدوشی کا فیصلہ کرنا کسی بھی طرح منصفانہ فیصلہ نہیں کہا جاسکتا۔ جبکہ معمولی درجے کے ملازمین کو بھی اس طرح سبکدوش نہیں کیا جاتا، اسے بھی ایجنڈے میں لایا جاتا ہے۔"

ایک اور مفصل و مدلّل تحریر جو مولاناؒ نے دفتر اہتمام اور اس کے واسطے سے مجلسِ شوریٰ کو ارسال فرمائی۔ اس کا متن سطور ذیل میں شائع کیا جارہا ہے، اس تحریر میں مولانا مرحوم کی طرف سے اُٹھائے گئے نکات کتنے اہم ہیں، اس کا اندازہ قارئین بآسانی کر سکتے ہیں۔

(ادارہ تنظیم ابنائے قدیم دہلی)

محترم و مکرم حضرت مہتمم صاحب (دارالعلوم دیوبند) دام مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

آپ کے دستخط سے مجلسِ شوریٰ منعقدہ ۲۱-۲۲ رشعبان ۱۴۱۰ھ کی ایک تجویز مجھے ۱۴ر رمضان ۱۴۱۰ھ کو موصول ہوئی تھی، جس میں دارالعلوم کی تدریسی ذمہ داریوں سے مجھے سبکدوش کیے جانے کا ذکر تھا۔ اس میں چونکہ اس فیصلے کی تاریخِ نفاذ کا ذکر نہیں تھا، اس لیے میں بروقت خاموش رہا کہ شاید اس کا تعین ہی بعد میں ہو یا شاید کوئی اور فیصلہ کیا جائے۔

مجھے آپ کے دستخط سے جو تجویز موصول ہوئی تھی اس میں میری سبکدوشی کی وجہ میری "بیماری اور اس کے نتیجے میں اشتعال" میں آجانا تحریر کی گئی ہے۔ مجلسِ شوریٰ دارالعلوم کی مؤقر اور بااختیار کمیٹی ہے جس کے اراکین کا میں ہمیشہ ہی سے احترام کرتا آیا ہوں اور ان کے فیصلوں کو بھی قابل احترام و تسلیم سمجھتا آیا ہوں جن کا اُنھیں حق اور اختیار ہے اور اب بھی اگر مجلس مجھے کسی سبب اور علت کے بغیر سبکدوش کر دیتی تو شاید میں کچھ نہ کہتا۔ لیکن اس کے برعکس مجلس نے چونکہ مجھے سبکدوش کرنے کا فیصلہ ایک خاص سبب کے تحت کیا ہے۔ اس لیے اب یہ سوال قدرتی اور ناگزیر ہے کہ یہ سبب واقعتہً ہے یا نہیں اور یہ کہ اتنے اہم فیصلے کے لیے اس کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

تجویز کے مطابق مجھے سبکدوش کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا گیا تھا کہ میں بیمار رہتا ہوں اور اس کی وجہ سے "مشتعل" ہو جاتا ہوں۔ اوّلاً تو میں اس کو محض ایک الزام سمجھتا ہوں کیونکہ اشتعال میں آنا اور مشتعل ہونا ایک عارضی کیفیت ہوتی ہے جس کا کسی بھی باضمیر اور حساس انسان پر مخصوص حالت میں طاری ہونا ایک فطری امر ہے۔ یہی نہیں بلکہ کسی ایسے وقت میں جب موقع اظہارِ حق کا ہو اور دوسرے کی جانب سے اپنی مصلحت کی بنیاد پر حق کو دبانے کی کوشش کی جارہی ہو تو یہ کیفیت تمام حق پرستوں کی نگاہ میں پسندیدہ ہو جاتی ہے۔

علاوہ ازیں سوال یہ ہے کہ میرا یہ "مشتعل" ہونا مزاجاً طبعاً ہے یا بیماری کے باعث؟ اگر یہ مزاجاً وطبعاً ہے تب تو آج اس کے قابل مواخذہ ہو جانے کی کوئی وجہ نہیں۔ جب کہ میں اپنی اسی طبیعت اور مزاج کے ساتھ گزشتہ ۲۸ سال سے دارالعلوم میں ہمہ جہتی خدمات انجام دیتا آرہا ہوں اور اس طویل مدّت میں کبھی بھی میرے اس مزاج وطبیعت اور ان کی وجہ سے اشتعال میں آجانے کو قابل مواخذہ نہ سمجھا گیا اور نہ ہی عملی طور پر کوئی مواخذہ کیا گیا۔ بالخصوص حالیہ انقلاب میں اس مزاج نے جو نمایاں کردار ادا کیا وہ کسی سے مخفی نہیں اور اگر یہ اشتعال طبعاً اور مزاجاً نہیں؛ بلکہ مرض اور بیماری کی وجہ سے ہے اور یہی آپ حضرات کا خیال بھی ہے۔ جیسا کہ تجویز میں اس کی صراحت ہے تو حیرت ہے کہ اسے کیونکر اتنے بڑے فیصلے کی بنیاد بنایا گیا؟ کیونکہ اس صورت میں یہ ایک عذر ہوگا اور عذر درگزر کے قابل ہوتا ہے، قابل سزا نہیں۔ آخر عذر اور جرم کو یکساں کیوں کر رکھا جاسکتا ہے؟ علاوہ ازیں ایک بنیادی سوال یہ بھی ہے کہ بیماری کی وجہ سے اشتعال میں آجانے کو تدریس سے کیا تعلق ہے؟ اگر اس سے تدریس میں کوئی کمی یا کوتاہی آئے تو اسے قابل گرفت سمجھا بھی جاسکتا ہے؛ لیکن یہاں تو صورتِ حال یہ ہے کہ اس پہلو کو بالکل ہی نظرانداز کردیا گیا ہے اور تدریس کا نہ ذکر ہے اور نہ اس سلسلے میں کسی شکایت کا حوالہ!

آپ کی جانب سے ۱۸ رجون ۱۹۹۰ء کو نمائندہ اجتماع کے عنوان سے ایک جلسہ بلایا گیا تھا جس کا مقصد بہی خواہانِ دارالعلوم کو دارالعلوم کی ترقیات سے آگاہ کرنا بتایا گیا تھا جیسا کہ دعوت نامہ سے ظاہر ہے؛ لیکن عملی طور پر اس جلسہ کا موضوع اور محور صرف میری ذات کو بنا کر رکھ دیا گیا تھا۔ جیسا کہ جلسہ کی کارروائی پر مشتمل کیسٹ سننے سے اندازہ ہوتا ہے۔ اس جلسے کے دعوت نامے پر بہ حیثیت مہتمم دارالعلوم آپ کے دستخط تھے۔ جو بالکل درست اور صحیح ہے۔ لیکن اس کے پہلو بہ پہلو ایک ایسے رکن شوریٰ کے دستخط کا پایا جانا نہایت قابل تعجب ہے جن کے بارے میں میرا یقین ہے کہ مجلسِ شوریٰ سے میرے خلاف کارروائی کرانے میں ان کی سازش اور ان کے منتقمانہ مزاج و جذبے نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ آپ کے دستخط کے پہلو بہ پہلو صرف ایک اور وہ بھی اس خاص رکن شوریٰ کے دستخط کا پایا جانا یقیناً حیرت انگیز ہے اور ساتھ ہی احقر کے معاملے سے اس شخص کی غیر معمولی دلچسپی کی دلیل بھی، جس سے میرے مذکورہ یقین کو اور تقویت ملتی ہے۔

اس جلسہ میں مولانا ریاست علی صاحب ناظمِ تعلیمات دارالعلوم اور مولانا اسعد صاحب مدنی نے مجھ پر انتہائی غیر ضروری اور غیر واقعی طور پر نہایت بے تکے اور رکیک ذاتی حملے کرنے کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کے وقار اور اس کی تاریخی روایات کو نظرانداز کرتے ہوئے نہایت مغالطہ آمیز تقریر کی اور غیظ وغضب کے عالم میں مجھ پر انتہائی غلط الزامات لگائے۔ یہ الزامات جو مختلف النوع ہیں اور ان میں سے اکثر کا تعلق دارالعلوم کے انتظامی معاملات سے ہے۔ مجھ پر اُس زمانے کے حوالے سے لگائے گئے، جب میں دارالعلوم میں ناظمِ تعلیمات اور

معاون مہتمم جیسے عہدوں پر کام کر رہا تھا، ذاتی دشمنی کی وجہ سے کسی کا کسی پر کیچڑ اُچھالنا اور بے تکے اور غلط الزامات لگانا اتنا حیرت انگیز نہیں جتنا کسی ادارے سے متعلق اس کے سربراہ کی موجودگی میں عام مجمع کے سامنے اس کے کسی سابق ذمہ دار اور رکن پر ایک طویل عرصے کے بعد ایسے الزامات عائد کرنا حیرت انگیز ہے، جن کے بارے میں خود سربراہِ ادارہ نے نہ کبھی کچھ کہا ہو اور نہ ہی اُن میں سے کسی کی وجہ سے کبھی کوئی کارروائی کی ہو۔

ظاہر ہے کہ میں ناظمِ تعلیمات تھا یا معاون مہتمم۔ دونوں صورتوں میں کسی نہ کسی بالادست کی ماتحتی ہی میں کام کرتا رہا۔ لہٰذا ان دونوں عہدوں پر رہتے ہوئے اگر میں نے کوئی غیر قانونی قدم اُٹھایا تھا یا کوئی ایسا کام کیا تھا جو مفادِ دارالعلوم کے خلاف تھا تو میرے بالادست سربراہ کا فرض تھا کہ کسی رُو رعایت کے بغیر بروقت مجھے تنبیہ کرتا یا میرے خلاف وہ جو مناسب سمجھتا کارروائی کرتا۔ ایسا نہ کرتا تو یہ دارالعلوم کے مفاد اور ذمہ دارانہ امانت داری کے خلاف تھا۔ یوں بھی دارالعلوم کی انتظامیہ کسی معاملے میں رورعایت سے کام نہیں لیتی، جیسا کہ آپ حضرات کا دعویٰ بھی ہے۔ چنانچہ جب میں ناظمِ تعلیمات تھا تو موجودہ ناظمِ تعلیمات مولانا ریاست علی صاحب کے بقول جو اُس زمانے میں میرے نائب تھے میں نے کچھ خلافِ قانون اقدامات کیے تھے اور مولانا اسعد صاحب کے بہ قول میں نے اس کا حال بالکل خراب کر رکھا تھا۔ تو سوال یہ ہے کہ ان تمام تر خرابیوں اور غیر قانونی اقدامات کے باوجود مجلسِ تعلیمی یا اہتمام نے بروقت مجھے تنبیہ کیوں نہیں کی، میرے خلاف کوئی رپورٹ کیوں نہیں کی گئی؟ مجھ سے مواخذہ کیوں نہیں کیا گیا؟ کیا ان غیر قانونی اقدامات اور تعلیمات کے نظام کو تباہ و برباد ہوتے ہوئے دیکھنے کے باوجود مجلسِ تعلیمی اور سربراہِ ادارہ کا خاموشی اختیار کر لینا مفادِ دارالعلوم اور ذمہ دارانہ احساس و امانت داری کے خلاف نہیں؟

نیز دونوں عہدوں سے الگ ہونے کے بعد میں جب تدریس پر واپس آیا تو اگر میں نے تدریس میں کسی طرح کی کوتاہی کی جیسا کہ کہا جا رہا ہے تو ناظمِ تعلیمات مولانا ریاست علی صاحب نے میرے خلاف کوئی کارروائی کیوں نہیں کی۔ کیا یہ غیر ذمہ داری نہیں؟ اسی طرح جب میں معاون مہتمم تھا اور اس زمانے میں مولانا اسعد صاحب کے بقول میری وجہ سے دارالعلوم کا نظام ہر لحاظ سے درہم برہم ہو گیا تھا اور معاملات اُلجھ گئے تھے تو آپ کو مہتمم کی حیثیت سے اپنے معاون کی تنبیہ اور اس کے خلاف ضابطے کی کارروائی کرنے کا نہ صرف پورا حق اور اختیار تھا؛ بلکہ اگر واقعی مذکورہ صورتِ حال پیش آ گئی تھی تو بروقت کارروائی ضروری بھی تھی۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس زمانے میں میرے اور آپ کے درمیان کبھی بھی ناگواری اور ناخوشگواری کی صورت پیش نہیں آئی۔ میں تمام ضروری معاملات میں آپ سے مشورے لیتا رہا اور آپ میرے کاموں پر برابر اطمینان اور خوشی کا اظہار کرتے رہے۔ بلکہ آج بھی جبکہ میرے خلاف کردارکشی کی شدید مہم جاری ہے اور میں نے حتی المقدور دارالعلوم کی جو

خدمات انجام دی ہیں اور جنھیں اب سے پہلے بلا استثنا سب ہی حضرات سراہتے تھے۔ ان کو بھی میرا جرم قرار دے کر مجھے ہر لحاظ سے مجرم باور کرانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ آپ نے ۱۸ر جون کو نمائندہ اجتماع کے عنوان سے بلائے گئے جلسے تک تقریری یا تحریری طور پر مجھ پر کوئی الزام عائد نہیں کیا۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ بہ حیثیت منتظمِ اعلیٰ آپ کو اس خادم سے کبھی کوئی شکایت نہیں رہی۔ ان تمام چیزوں کے پیش نظر مولانا اسعد صاحب کو جو دارالعلوم کے معاملات میں بے جا دخل اندازیوں کے باوجود خود کو صرف رکن شوریٰ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں، کیا حق ہے کہ ایک طویل عرصے کے بعد عوامی مجمع میں دارالعلوم کے انتظامی معاملات سے متعلق آپ کی موجودگی میں مجھ پر ایسے غلط اور بے بنیاد الزامات لگائیں اور کیا یہ ایک مذموم حرکت ہونے کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز نہیں ہے؟ اُنہوں نے شوریٰ جیسی باوقار مجلس کا رکن ہوتے ہوئے میری دارالعلوم میں ۲۸ سالہ قربانیوں کو پس پُشت ڈال کر ایک عوامی جلسے میں جس بھونڈے انداز سے میری کردارکشی کی کوشش کی اور مجھ پر الزامات لگائے وہ بہرحال ایک رُکن شوریٰ کو قطعاً زیب نہیں دیتا اور نہ ہی دارالعلوم کی طویل تاریخ میں کسی رکن شوریٰ نے آج تک کوئی ایسا نازیبا رویّہ اختیار کیا۔

میری حیثیت دارالعلوم میں صرف ایک مدرس کی نہیں رہی ہے؛ بلکہ بطورِ تحدیثِ نعمت اور بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ دو تین افراد کے بقدر کام کیا ہے اس کی شہادت دارالعلوم کی ایک پوری نسل دے گی جو برِ صغیر اور ایشیا کے علاوہ مشرقِ وسطیٰ اور عالم عرب میں پھیلی ہوئی ہے اور جس کے کچھ افراد نہایت نمایاں حیثیت کے مالک اور یونیورسٹیوں وغیرہ میں پروفیسر تک ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ دارالعلوم دیوبند پر عربی زبان وادب کے سلسلے میں تہی دامنی کا جو دھبّہ لگا ہوا تھا خدا نے مجھے یہ سعادت اور توفیق بخشی کہ اس دھبّے کو مٹانے کی حتی المقدور کوشش کروں اور یہ کہنے میں بھی مجھے فخر ہے کہ قدرت نے اس سلسلے میں بہت حد تک مجھے کامیابی عطا کی۔ میں اس کو پوری طرح دارالعلوم اور اپنے اکابر و اساتذہ کے فیض اور ان کی دعاؤں کا ہی نتیجہ سمجھتا ہوں۔

یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ میں نے ہمیشہ دارالعلوم میں صرف تدریس، افراد سازی اور مختلف النوع علمی وانتظامی کاموں کو ہی اہمیت و اوّلیت دی ہے اور اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے اور بنانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ملک و بیرونِ ملک کی یونیورسٹیوں، اُن کے جلسوں، علمی سیمیناروں اور کانفرنسوں سے شرکت کے لیے بے شمار دعوت نامے آتے رہنے کے باوجود میں نے دارالعلوم کی خدمت اور طلبہ کی تعلیم و تربیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان میں شرکت کو کبھی اہم نہیں سمجھا۔ اگر میں شریک ہوتا رہتا اور اپنی شخصیت کو اُبھارنے کی کچھ بھی کوشش کرتا تو شاید کم از کم مشرقِ وسطیٰ اور برِ صغیر میں آج میری حیثیت کچھ اور ہوتی؛ لیکن مجھے نہ کل اس کی فکر رہی ہے اور نہ ہی آج اس پر کچھ افسوس اور ندامت ہے بلکہ مجھے اس پر خوشی اور فخر ہے کہ میں نے اپنے اساتذہ اور بزرگوں سے جو کچھ سیکھا، طلبہ

دارالعلوم تک اُسے پہنچانے کی حتی المقدور کوشش کی اور بحمد اللہ اس میں بہت کامیابی بھی نصیب ہوئی۔ کیا اس کے باوجود یہ افسوس ناک بات نہیں ہے کہ میری ان تمام قربانیوں اور خدمات کو نظر انداز کرتے ہوئے آج یہ کہا جارہا ہے کہ میں نے دارالعلوم میں کوئی کام نہیں کیا اور اس کو اور اس کے نظام کو بربادی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ نہ صرف یہ کہ یہ سب کچھ کہا جارہا ہے بلکہ علمی، خاندانی، سیاسی اور ملکی و ملّی سطح پر جو مجھے حیثیتِ عرفی حاصل ہے، اُن سب سے قطع نظر کرتے ہوئے میری انتہائی رکیک اور مکروہ انداز میں کردارکشی بھی کی جارہی ہے۔ اور سب سے زیادہ افسوسناک بات تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ ایک عوامی جلسے میں اور آپ کی موجودگی میں کہا گیا۔

لہٰذا آپ کے توسط سے مجلسِ شوریٰ سے میری گزارش ہے کہ ۱۸ر جون ۱۹۹۰ء کے مذکورہ جلسے میں مجھ پر جو مختلف النوع الزامات لگائے گئے اگر وہ غلط ہیں اور یقیناً غلط ہیں جیسا کہ واقعہ ہے تو اس نہایت غیر ذمہ دارانہ اور مذموم حرکت پر الزام لگانے والوں سے باز پرس کی جائے؛ کیونکہ ادارے کے مفاد کو بہر حال شخصیات پر فوقیت حاصل ہے نیز تجویز میں میری سبکدوشی کی جو وجہ بیان کی گئی ہے اور اس کے پس منظر میں جو الزامات کارفرما ہیں، ان سب کی تحقیق کی جائے اور مجھے بھی صفائی کا موقع دیے جانے کے بعد اس فیصلے پر غور کیا جائے۔ اُمید ہے کہ مجلس اپنی ذمہ داری اور انصاف پسندی سے کام لیتی ہوئی میری اس درخواست پر ہمدردانہ غور کرے گی۔ والسلام

خادم

وحید الزماں کیرانوی

۲ر محرم ۱۴۱۱ھ

(ترجمان دارالعلوم مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر)

.....❖.....

۱۳۴ اروال سال ۹۵-۱۹۹۴ کے تحت صفحہ نمبر ۱۰۴ پہ مولانا وحید الزماں کیرانوی صاحبؒ کے انتقال کی خبر ہے۔ فاضل مرتب نے تنگ ذہنی کا نمونہ یہاں بھی دکھایا ہے کہ مولانا کے نام کے بعد رحمۃ اللہ علیہ کی علامت کے طور پر"رح" نہیں لکھا۔ حالانکہ پوری کتاب میں جس کسی کے بھی انتقال کی خبر ہے یا کسی مرحوم کا ذکر ہے ان تمام کے ناموں کے ساتھ رح لگا ہوا ہے۔ سوائے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا وحید الزماں صاحبؒ کے۔ ہائے یہ دَورِ حاضر کے تنگ نظر مؤرخ اور وہ بھی مسلمان مزید ستم یہ کہ عالم دین بھی۔

ایک بات اور یہ کہ اس انتقال کی خبر کو جب کتاب کے آخر میں صفحہ ۷۱۸ پہ درج کیا تو وہاں سن وفات ۱۹۹۸ لکھا ہے۔ اب کتاب پڑھنے والا کس سن کو صحیح مانے اس کا فیصلہ کیوں کر ہوسکتا ہے۔ ہم بے جا الزام تراشی کے قائل نہیں؛ اس لیے یہ ماننے میں ہمیں کوئی عار یا تردد نہیں ہے کہ یہ تصحیح کی غلطی ہے فاضل مرتب نے جان بوجھ کر یہ نہیں لکھا؛ لیکن کیا دارالعلوم جیسے ملک کے سب سے بڑے ادارے کو خود اس ادارے کی تاریخ شائع کرنے سے پہلے اچھی طرح تصحیح نہیں کرا لینی چاہیے تھے۔

۱۳۹ اروال سال ۰۱-۲۰۰۰ کے تحت صفحہ نمبر ۱۰۶ پہ بھی اس طرح کی غلطی ہے۔ مولانا ابوالحسن علی میاں صاحبؒ کے انتقال کی خبر یہاں سن ۲۰۰۰ کے تحت ہے اور صفحہ ۶۷۳ پہ سن 1999 لکھا ہوا ہے۔ یہ ہے دارالعلوم کا شعبۂ نشرواشاعت، جہاں تصحیح کا اہتمام اس درجہ کا ہے۔

اس کے بعد ہم کتاب کے صفحہ ۱۰۸ پر پہنچے تو دیانت، متانت، ایمانداری، حق بیانی اور تحریری شعور کی لہولہان لاشیں تڑپتی ہوئی نظر آرہی تھیں اور ان سب کا قاتل تھا چاپلوسی وشخصیت پرستی کا وہ تیز دھار خنجر جس نے امتِ مسلمہ کو بے باکی، حق گوئی اور خوفِ آخرت سے دُور کر کے مجبوری، لاچاری، جی حضوری اور حبِّ دنیا کی ایسی دلدل میں دھکیل دیا ہے جہاں سے نکلنے کے امکان نظر نہیں آتے، اب جہاد کا جذبہ سرد پڑ چکا ہے۔ صاحبِ اقتدار مسلم لیڈران مصنوعی قومی یک جہتی کا نعرہ لگا کر امت کو کمزور سے کمزور تر اور بزدل سے بزدل تر بناتے جارہے ہیں۔ ایسے ہی ملت خور بزرگوں نے امت کو ایسے مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے کہ جہاں ہم دشمنوں سے بلکہ خفیہ دشمن نہیں کھلے ہوئے دشمنوں سے یلغار اور جہاد کرنے کے بجائے فریاد کرنے پہ مجبور ہو گئے ہیں۔

مظلومیت نہیں ہے یہ بزدلی ہے اُن کی
یلغار کی جگہ جو فریاد کر رہے ہیں

کیسے افسوس کا مقام ہے کہ اونچی اونچی مسندوں پر بیٹھے یہ قوم کے رہنما امتِ مسلمہ کے حقوق کی بازیابی کے لیے غیر مسلم وغیر معتبر اور فقط ہماری مخالف و دشمن عدالت عظمیٰ یعنی سپریم کورٹ میں بے سود و بے وقعت اپیلیں کر رہے ہیں۔ حالانکہ ہمارے حق میں کبھی کوئی فیصلہ نہیں ہوگا۔ لاریب نہیں ہوگا؛ لیکن قوم کے یہ مصنوعی غم خوار رہنما اپنی

قیادت کے چکر میں امت کا قتل عام برداشت کر رہے ہیں۔ حالانکہ ؎

وقت آ ہی گیا اپنے حق کے لیے
بس دعائیں نہیں، اب لہو چاہیے

لیکن بے سود و بے فائدہ قومی یک جہتی کانفرنس کے عنوان پر کیے جانے والے اجلاس میں بے دردی کے ساتھ قوم کا پیسہ برباد کرنے والے نہ جانے کب امت کی فکر کے لیے خود کو بے دار کریں گے۔

بات ذرا دوسرا رُخ لے گئی۔ وجہ اس کی وہ تڑپتا ہوا حساس دل ہے جو امت کی پسپائیت اور لاچاری کے سبب کڑھن محسوس کرتا ہے۔ اور صاحب حیثیت و صاحب مسند قومی رہنماؤں کی خاموشی و سرد مہری کی وجہ سے گھٹن کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب یہ گھٹن اور کڑھن باہر نکلتی ہے تو انسان کراہ اُٹھتا ہے چیخ اُٹھتا ہے۔ یہی چیخ راقم کے درج بالا الفاظ میں محسوس کی جاسکتی ہے۔

علاوہ ذکر اللہ کے دنیا میں ہر چیز کی حد مقرر ہے۔ کوئی بھی چیز اپنی حد سے تجاوز کرتی ہے تو اس پر گرفت کی جاتی ہے، اُسے روکا جاتا ہے اور جب حد سے تجاوز کرنے والا خود کو نہیں روکتا تو اس پر ایکشن لیا جاتا ہے۔

فاضل مرتب محمد اللہ صاحب نے بھی چاپلوسی کی حد پار کر دی ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ انھیں شرم نہیں آئی، اتنا جھوٹ لکھتے ہوئے یا اتنی چاپلوسی کرتے ہوئے۔ آپ کو بھی راقم کے بارے میں ایسا لگے گا کہ یہ تو مولوی اسعد صاحب کے پیچھے ہی پڑ گیا بار بار انھیں کا ذکر لے آتا ہے؛ لیکن میرے بھائی ایسا نہیں ہے، اس وقت یعنی ۲۰۱۸ اور ۲۰۱۹ میں اس کتاب کو پڑھنے والے ۵۰ فیصد بھی وہ لوگ نہیں ہیں جن کی عمر ۷۵ رسال ہو اور جو ۷۰ یا ۶۵ سال کا نہیں ہے اُسے تاریخ کے اُن واقعات کا علم ہی نہیں جو ہم آگے نقل کریں گے۔ مولوی اسعد صاحب جیسے لوگوں کا تذکرہ اس درجہ فرشتہ صفات بنا کر کرنے سے اُن کے پاپ نہیں دُھل جائیں گے۔ والمیکی نے بھی رامائن لکھنے سے پہلے اپنے گناہ چھوڑ دیے تھے اور پھر کبھی کسی کو نہیں لُوٹا تھا؛ لیکن یہاں تو ایک دو سال نہیں؛ بلکہ تمام عمر سیاسی ہتھکنڈوں کے ساتھ اقتدار کی ہوس میں بڑے بڑے نیک اور صالح بزرگوں کو اذیتیں پہنچائی گئی ہیں۔ انھیں رنج و غم میں مبتلا کر کے خون کے آنسو رُلایا گیا ہے۔ دینی مدارس کے بے خطا طلبا کو استعمال کر کے ان کی تعلیمی صلاحیت و لیاقت کو مفلوج کیا گیا ہے۔ محمد اللہ صاحب کی حد سے متجاوز چاپلوسی کے سبب ہم آپ کے سامنے تاریخ کے وہ واقعات پیش کر رہے ہیں جو آپ نے کبھی نہ سنے ہوں گے اور نہ پڑھے ہوں گے۔ یہ واقعات ۱۹۶۵ کے دَور کے ہیں یعنی ایسا ہر شخص جس کی عمر اس وقت ۶۰ ساٹھ سال ہے اسے ان واقعات کا کوئی علم نہیں۔ یعنی پوری ایک نسل اس وقت وہ ہے جو جانتی ہی نہیں کہ جس شخص کو آپ کے سامنے فرشتہ بنا کے پیش کیا جا رہا ہے وہ حقیقت میں کیا ہے اور برائے کرم وہ لوگ ذرا اپنی زبان بند رکھیں جو فوراً یہ کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد کسی بھی انسان

کے محاسن بیان کرو، عیوب نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم عیوب نہیں تاریخ بیان کر رہے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ذرا ان لوگوں سے کہو کہ یزید کے محاسن بیان فرمادیں۔ حالانکہ یزید تو اس بیڑے میں شامل تھا جس کے بارے میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی تھی۔ کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ تاریخ میں ابوسفیان کے ایمان لانے سے پہلے کے واقعات کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ کیا نزولِ قرآن کی تاریخ میں سراقہ کے اُس عمل کا تذکرہ نہیں جو بدگمانی پہ مبنی تھا۔ جس کے بعد سورۂ حجرات کی آیت نازل ہوئی۔ دراصل یہاں ہمارا مقصد اُن واقعات کو بیان کرنا ہے جو وقت کے سینے پر لمحوں نے رقم کیے تھے، وہ واقعات جو تاریخ کی تلخ حقیقت ہیں، وہ واقعات جنھیں قصۂ پارینہ کی طرح فراموش کر دیا گیا، وہ واقعات جنھیں کبھی آپ کے سامنے نہیں لایا گیا، وہ واقعات جن کی یاد مخلی ذہن میں آج بھی خار کی طرح چبھتی ہے۔ بہر حال ہماری مولوی اسعد مدنی صاحبؒ سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے اور نہ ہی ہم ان کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اللہ ان کے گناہوں کو معاف فرمائے۔ انہوں نے امت کے اکابرین کو ستایا بہت ہے۔ ہم تو بس عوام کے سامنے صحیح تاریخ پیش کر رہے ہیں۔ اور بتا رہے ہیں کہ اے سادہ لوح! جس کو تمہارے سامنے فرشتہ بنا کر پیش کیا جا رہا ہے، اس کی حقیقت وہ نہیں ہے جو ظاہر کی جا رہی ہے؛ بلکہ وہ ہے جسے چھپایا جا تا رہا ہے اور وہ ہے جو آپ گزشتہ صفحات میں مولانا وحید الزماں صاحبؒ کی زبانی پڑھ آئے ہیں۔

اور ہاں ایک بات اور مولانا وحید الزماں صاحب کا مضمون ہو یا مولانا افضال الحق قاسمی صاحب کا ہم نے مولوی اسعد صاحب کو اپنے قلم سے کچھ نہیں لکھا۔ ہم فقط ایک ناقل ہیں جو تاریخی واقعات کو قدیم کتابوں سے نقل کر کے آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اسی طرح درج ذیل مضامین ہیں جو ہم نے ہندوستان کے مایہ ناز قلم کار اور بے باک وحق گو عالم دین مدبر اسلام حضرت مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ماہنامہ تجلی سے نقل کیے ہیں۔ ''مولانا عامر عثمانی'' ایک ایسا قلم کار جس نے جو بھی لکھا سچ لکھا، حق لکھا، تاحیات حق کا ساتھ دیا اور کبھی ایک لفظ بھی جھوٹ یا کسی شخصیت کے دباؤ میں آ کر نہیں لکھا۔

وہی سچ ہم آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ ان واقعات کو ہم نے ایک الگ عنوان دے دیا ہے۔ دو صفحات پہلے ہم نے جو دارالعلوم کی جدید تاریخ کتاب کے صفحہ نمبر ۱۰۸ پہ دیانت اور متانت کی لاشوں کا ذکر کیا ہے وہ عبارت ہم نقل کر رہے ہیں۔ پڑھیے اور چاپلوسی کا حد سے گزرنا دیکھئے۔ وہ شخص جس نے دارالعلوم کو ترقی کے بجائے تعلیمی تنزلی عطا کر دی، اس شخص کے انتقال کی خبر کس طرح دی جا رہی ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ۷۵۲ صفحات کی اس تاریخ میں کسی اور کے انتقال کی خبر اس انداز سے نہیں دی ہے، کیا شیخ الہند کیا مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، کیا علامہ ابراہیم بلیاوی اور کیا حکیم الامت وحکیم الاسلام پوری کتاب پڑھ جائیے، اس طرح چار سطروں میں کسی کے بھی انتقال کی خبر فاضل مرتب نے نہیں دی۔ کیا شیخ الہند کا مقام مولوی اسعد صاحب سے بھی گیا گزرا ہے۔ کیا حکیم الامت وحکیم الاسلام

سے بڑھ کر حیثیت مولوی اسعد کی ہے؟ کیا علامہ کشمیری وعلامہ شبیر احمد عثمانی کا درجہ بھی مولوی اسعد سے کم ہے؟

''دارالعلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ''صفحہ ۱۰۸ پہ یہ عبارت درج ہے:

''مجلس شوریٰ کے اہم ترین رکن امیر الہند حضرت مولانا اسعد مدنی ؒ صدر جمعیۃ علماء ہند کا سانحہ انتقال پیش آیا۔ دارالعلوم کی ترقی اوراس کی خدمات کی توسیع میں آپ کااہم حصہ ہے۔ دارالعلوم کے بہت سے نئے شعبہ جات اور سرگرمیوں کی اصل محرک آپ کی ہی شخصیت رہی ہے۔ آپ کی فعال اور مؤثر قیادت سے دارالعلوم کو بڑا فائدہ پہنچا''۔

قارئین! اگر آپ نے''دارالعلوم کی جامع ومختصر تاریخ''نامی کتاب کا مطالعہ کیا ہے تو اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کر خدا کو حاضر وناظر جان کے ایمانداری سے بتائیے کیا یہ دیانت کا قتل نہیں ہے۔ بڑے بڑے اکابر اور علماء کے انتقال کا ذکر اس کتاب میں کیا ہے؛ لیکن کسی ایک کا جی ہاں! کسی ایک کا بھی تو اس طرح نہیں کیا۔ اور یہاں دارالعلوم کی توسیع و ترقی میں ان کا اہم حصہ بتانے والے فاضل مرتب نے ۱۹۸۲ کے ذیل میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ دارالعلوم کے بند ہونے، اس پہ قبضہ کرنے اور اختلاف کی آگ بھڑکانے میں آپ کا اہم حصہ رہا ہے؛ بلکہ سچ تو ۱۹۸۰ کے واقعات ہیں۔ فاضل مرتب کی درج بالا عبارت نہیں۔ یہاں ایک شعر لکھ کے بات ختم کرتے ہیں۔ اِس شعر کے شاعر کا نام تو ہمیں یاد نہیں رہا۔ واٹس ایپ کے ذریعہ یہ شعر ہم تک پہنچا تھا، اتنا یاد ہے کہ ہے کسی دیوبندی شاعر ہی کا... اس موقع پر اپنی یادداشت میں ہمیں اس سے بہتر شعر نہیں ملا۔ یقیناً پڑھنے کے بعد آپ کے منہ سے بھی واہ! ضرور نکلے گا۔

کوئی بھی بات دیانت سے کیوں نہیں لکھتے
ضمیر بیچ کے تم نے قلم خریدا کیا؟

اگلے صفحہ سے آپ مولوی اسعد مدنی صاحب کے ظلم کی وہ داستان پڑھیے جو انھوں نے امت کے علماء اکابر پہ ڈھایا۔ ان تمام باتوں کو تاریخ گوئی کا لحاظ کرتے ہوئے ہم نے ایک الگ عنوان دے دیا ہے۔ برصغیر کے سب سے معتبر وموقر رسالے ماہنامہ''تجلی''سے ماخوذ یہ واقعات وحقائق پڑھنے کے بعد یقیناً آپ کی آنکھوں پر پڑے ہوئے پردے ہٹ جائیں گے؛ بلاشبہ کچھ پردے تو مولانا وحید الزماں کیرانوی صاحبؒ کے مضمون نے ہٹادیے ہوں گے۔ باقی حقیقت اب اور وضاحت کے ساتھ سامنے آجائے گی۔

....

نوٹ

جس طرح ہم نے دارالعلوم کی روداد اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ؒ سے متعلق مضامین سے پہلے یہ نوٹ دیا ہے کہ آپ ان کو بعد میں بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم یہاں یہ عرض کرتے ہیں کہ مولوی اسعدؒ سے متعلق حقائق آپ ابھی پڑھیے۔ ان مضامین کو پڑھتے ہوئے ہی کتاب کو آگے بڑھائیے؛ کیونکہ ان حقائق کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی ہماری تحریر میں پنہاں جامعیت اور صداقت کا حق ادا ہو سکے گا۔ آپ خود اپنے زبان و دل سے یہی کہیں گے کہ ہم نے گزشتہ صفحات میں جو لکھا ہے حرف بہ حرف حق لکھا ہے۔

مولوی اسعد مدنی صاحب کی شخصیت واقعات وحقائق کی روشنی میں

جمعیۃ علمائے ہند

کسی فرد یا گروہ کو جمعیۃ علمائے ہند کی سیاست اور پالیسیوں سے کیسا ہی اختلاف رہا ہو؛ لیکن جب تک اس جماعت کے رفیع الشان صدر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ زندہ رہے یہ پیشین گوئی کوئی نہیں کرسکتا تھا کہ جمعیۃ کا تنظیمی ڈھانچہ عنقریب کسی بھونچال کی نذر ہونے والا ہے۔ حضرت موصوف کی رحلت کے فوراً بعد بھی ایسی پیشین گوئی مشکل تھی؛ کیونکہ جمعیۃ کے ناظمِ اعلیٰ حضرت مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی اعلیٰ صلاحیتوں کا احساس واعتراف ان کے دشمن کو بھی تھا۔ لیکن زیادہ گہری نظر رکھنے والوں نے جب دیکھا کہ مولانا مدنیؒ کے ارادت مندوں نے ایک ڈرامائی تعجیل کے ساتھ ان کے اُس صاحب زادے کو باپ کی خلافت تفویض کردی ہے جسے خود باپ نے آخر دم تک خلافت کا اہل نہیں سمجھا تھا تو انھوں نے اندازہ لگالیا کہ اب یہ جاگیردارانہ ذہنیت اُس جمعیۃ علماء کو بھی اپنی لپیٹ میں ضرور لے گی جس کے ڈھانچے کو مولانا حفظ الرحمٰنؒ اور ان کے بعض مخلص معاونین کی اہلیت وقابلیت نے سنبھال رکھا ہے۔

یہ اندازہ غلط نہیں نکلا۔ مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی حیات تک اگرچہ کوئی طوفانی موج سطح پر نہیں اُبھر سکی لیکن حلقہ بند سجادگی نے اندر ہی اندر طوفان کی داغ بیل ڈالنے میں کسر نہیں چھوڑی۔ مولانا مغفور اگر اسی وقت ڈٹ کر مقابلہ کرتے تو عین ممکن تھا کہ طوفان اپنے دہانے میں ہی فنا ہو جاتا؛ مگر وہ شاید اپنی شرافتِ نفس کی وجہ سے صبر وبرداشت کے کڑوے گھونٹ حلق سے اُتارتے رہے اس اعصاب شکن صبر وبرداشت نے ان کی توانائیوں کو کس طرح نچوڑا ہے اس کا ذکر و بیان اشک وآہ کی زبان ہی کرسکتی ہے۔ آخر کار وہ مایوس ودل گرفتہ اس فریب پیشہ اور بے مہر دنیا سے چلے گئے۔ بس ان کا جانا تھا کہ نہ جانے کہاں کہاں خوشی کے چراغ جلے اور پھر میرٹھ کے نام نہاد اجلاس میں کھل کر یہ بات سامنے آگئی کہ گاڑی اب کس سمت چلے گی۔

کہنے والے جب قسمیں کھا کھا کر بیان کرتے تھے کہ مسندِ صدارت پر ایک خاص بزرگ کو کسی نہ کسی طرح چپکا دینے کا ارادہ رکھنے والے گروہ نے مسلح غنڈوں تک کے اہتمام وانصرام سے گریز نہیں کیا تو ہم جیسے سادہ لوحوں کو یقین نہیں آتا تھا۔ مگر جب کچھ ہی دنوں بعد اس گروہ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قضیے میں بالا بالا رٹ

داخل کی اور پھر اس غلط حرکت پر بعض مخلصین نے بجا طور پر جو شکوہ کیا اس کا جواب جس انداز اور نہج میں اس گروہ نے دیا۔ اس سے یہ بات بڑی حد تک صاف ہوگئی کہ اس گروہ کا مجموعی مذاق و مزاج ہی اس نوع کا ہے جس سے کسی بھی پست حرکت کا صدور بعید نہیں ہے۔

استاذ محترم حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے صاجزادے مولوی اسعد میاں سلمہ اللہ تعالیٰ ذاتی حیثیت میں کن اوصاف کے مالک ہیں یہ کوئی راز نہیں۔ شجاعت اور سخاوت تو ان کی قابل فخر وراثت ہے۔ جہد و عمل ان کے خون کا جزو ہے۔ اندھا ہی ہوگا جو نہ مانے گا کہ وہ ایک جلیل القدر باپ کے شریف و نجیب بیٹے ہیں۔

لیکن المیہ یہ ہے کہ اپنے محترم باپ کی طرح ان کی صلاحیتوں کو ایک فطری اور تدریجی ارتقاء کا موقع نہیں ملا بلکہ کچھ لوگوں نے عظمت کا ایک مصنوعی خول ان پر چڑھا دیا ہے اور وہ از راہِ سادہ لوحی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ یہ خول مصنوعی نہیں حقیقی اور فطری ہے۔ یہ مضحکہ خیز غلط فہمی اچھے خاصے عقل مندوں کو تماشا بنا سکتی ہے چہ جائیکہ اسعد میاں پھر ان کی موروثی شرافت و نجابت بھی رُسوائی کی زد میں ہے؛ کیونکہ جن لوگوں نے ان کی ذات کو مرکز بنا کر اپنے جاہ و اقتدار کا تانا بانا پھیلایا ہے ان کا مجموعی مذاق و مزاج ایسا ہے ہی نہیں جس سے سادات کی عزت اور نیک نامی کی عفت زیادہ عرصہ تک نبھاؤ کر سکے۔ ایسا نظر آتا ہے جیسے مسجد کے صحن میں شرابی جمع ہو گئے ہوں۔ جمعیۃ کی سیاست سے کلی اتفاق نہ رکھنے کے باوجود ہم اس جماعت کے عظیم المرتبۃ اسلاف کو گوناگوں خوبیوں کا حامل اور اوصافِ حسنہ کا امانت دار سمجھتے رہے ہیں اور اسی وجہ سے اس جماعت کے معنوی وجود کے لیے مسجد کی تشبیہ ہمارے لاشعور سے اُبھری ہے۔ آج کی صحبت میں جمعیۃ کے تمام مالہ و ماعلیہ پر گفتگو مقصود نہیں؛ مگر اختصار کے ساتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس گروہ نے سازش، دھاندلی اور ہیر پھیر کے ذریعہ جمعیۃ کی نظامت و صدارت پر قبضہ جمایا ہے اس کا مجموعی ذہن اس کا معیارِ اخلاق اور اس کی افتادِ طبع ایسی مایوس کن ہے کہ اگر ملّت کا درد رکھنے والے مخلصین نے مؤثر اصلاحی اقدامات نہ کیے تو نتائج بہت ہی المناک نکلیں گے۔

جمعیۃ کے ورکنگ صدر مولانا مفتی عتیق الرحمٰن کو اُردن کے شاہ نے پانچ ہزار روپے بطورِ عطیہ جمعیۃ کے لیے دیے تھے۔ اس کی اطلاع اگلے ہی روز اخبار الجمعیۃ میں شائع کرا دی گئی۔ عطیہ دینے کی تقریب یہ تھی کہ صوبہ دلّی کی جمعیۃ کے شعبۂ صنعت نے بیت المال کے تیار کردہ کچھ عربی رومال شاہ کی خدمت میں تحفۃً پیش کیے تھے۔ جس وقت عطیہ حضرت مفتی صاحب کے سپرد کیا گیا یہ توضیح نہیں کی گئی کہ یہ رقم بیت المال ہی کے لیے مخصوص ہے یا جمعیۃ کے دوسرے شعبوں میں بھی خرچ کی جا سکتی ہے۔ مفتی صاحب اسے بطورِ امانت رکھے رہے اور اسعد میاں کے گروہ کی چلائی ہوئی اندرونی اختلافات کی آندھی اسی زمانے میں اس شدت سے تیز تر ہوتی گئی کہ اس امانت کے بارے میں باہمی مشورت کا مناسب موقع ہی نہ نکل سکا پھر خاصی مدت گزر جانے کے بعد جب مفتی صاحب کو غیر آئینی

حرکتوں کے ذریعے "ورکنگ صدارت" سے بے دخل کر دیا گیا تو انھوں نے یہ رقم جمعیۃ کے مرکزی دفتر کو یہ لکھ کر روانہ کر دی کہ اگر چہ صدارت کے معاملے میں ان سے ناانصافی کی گئی ہے لیکن پانچ ہزار کی امانت بہرحال وہ جمعیۃ کے حوالے کر رہے ہیں۔ وصول کر کے رسید دے دی جائے۔ دفتر کی طرف سے جواب ملا کہ اسعد میاں یہاں نہیں ہیں۔ آپ رقم رکھ جائیے باقاعدہ رسید وہی دے سکیں گے۔

ظاہر ہے کہ باقاعدہ رسید کے بغیر اس رقم کو ایسے ہاتھوں میں دے دینا مناسب نہیں تھا جن کی آستین عدل و دیانت کے تازہ تازہ خون سے تر ہو۔ قاصد نے رقم واپس لا کر مفتی صاحب کو دے دی اور مفتی صاحب نے اسے پھر بمدِ امانت رکھ لیا۔ قدرتاً وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اسعد میاں جب بھی مرکز پہنچیں گے رقم منگوالیں گے مگر اسعد میاں نے کیا پارٹ ادا کیا۔ یہ ہے وہ المیہ جس پر شرافت آٹھ آٹھ آنسو روتی ہے اور مہر و اخلاق مارے شرم کے سر جھکا لیتے ہیں۔

دفعتاً ۷؍اکتوبر ۶۵ء کے الجمعیۃ میں صفحہ اوّل پر نہایت نمایاں طور پر مجلسِ عاملہ کا ایک فیصلہ چھاپ دیا گیا جس کا عنوان اور طرزِ نگارش تو ذہنی خنّاس اور کبر و نخوت کا آئینہ دار تھا ہی غضب یہ کہ اس میں پوری طوطا چشمی اور سفّاکی کے ساتھ "خیانت" کا الزام بھی مفتی صاحب پر عائد کر دیا گیا تھا۔ طوطا چشمی اس لیے کہ مفتی صاحب نے مولانا حفظ الرحمٰن کا دست و بازو بن کر ایک عمر جمعیۃ کی بے لوث خدمت میں صَرف کی ہے اور سفاکی اس لیے کہ مفتی صاحب کا بدترین دشمن بھی ان پر ایسے ناروا الزام کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ اسعد میاں کے تو خیر سے ابھی چند روز ہوئے مونچھیں نکلی ہیں۔ سفید ریش عتیق الرحمٰن کو امتِ مسلمہ کے بے شمار افراد ان کی جوانی سے جانتے ہیں۔ وہ ایک کھلی کتاب ہیں۔ ان کے کردار پر کوئی مصنوعی خول نہیں۔ وہ اور جو کچھ بھی ہوں؛ لیکن ان کی دیانت تو عصمتِ مریمؑ کی طرح معروف و مسلّم ہے۔ ان کے بارے میں اس حد تک گر جانے کا تصور کہ محض پانچ ہزار کی بے حیثیت رقم پر رال ٹپکا دیں گے کوئی ایسا ہی آدمی کر سکتا ہے جس کا اپنا ایمان بازار کی جنس ہو۔

چلیے مفتی صاحب کو حسنِ ظن کی ہر رعایت سے محروم کر دیجیے۔ مان لیتے ہیں کہ وہ نہ کوئی نیک نام آدمی ہیں نہ ان کی کوئی ساکھ ہے۔ عین ممکن ہے کہ فقط ایک روپے پر بھی ان کا ایمان متزلزل ہو ہی جائے۔

لیکن اہلِ انصاف غور تو کریں کہ دنیا اور دین کا کونسا قانونِ اخلاق اور آئین عدل اس ناپاک حرکت کو جواز عطا کر سکتا ہے کہ جمعیۃ کی نام نہاد مجلسِ عاملہ مفتی صاحب سے پوچھے بغیر خیانت کا فیصلہ کر کے اسے ہاتھوں ہاتھ نہ صرف الجمعیۃ میں بلکہ بعض انگریزی اخباروں میں چھپوا دے۔ مفتی صاحب لندن نہیں چلے گئے تھے۔ وہ اسی دلّی میں موجود تھے جس میں بیٹھ کر مجلسِ عاملہ کے سفّاک اراکین لیلا رَچا رہے ہیں۔ مرکز کے جن صاحب نے رقم کی باقاعدہ رسید دینے میں اسعد میاں کی عدمِ موجودگی کا عذر کیا تھا ممکن نہیں کہ انہوں نے اس واقعے کا تذکرہ ان

اراکین سے نہ کیا ہو۔ جب ان اراکین کو معلوم ہو چکا کہ رقم بھیجی گئی تھی تو پھر کیا معنیٰ رکھتا ہے یہ بے ہودہ اور رُسوا کن فیصلہ جسے جھٹ پٹ چھاپ دیا گیا ہے۔

اور مان لو نہ بھی معلوم ہوا ہو۔ تو کیا مجلسِ عاملہ کے کسی رکن میں انصاف اور شرافت کا یہ ابتدائی احساس بھی موجود نہیں تھا کہ مجلس جمانے اور فیصلہ صادر کرنے سے قبل آٹھ آنے کی رکشا پر بیٹھ کر مفتی صاحب کے گھر تک ہو آئے اور ان سے پوچھ تو لے کہ حضور وہ پانچ ہزار کہاں ہیں۔ پوچھنے کے بعد اگر مفتی صاحب کوئی شافی جواب نہ دیں تبھی کوئی کارروائی کی جائے۔

اگر چہ ثقہ اور سنجیدہ مزاج کی کوئی جماعت تو اس صورت میں بھی جگ ہنسائی اور تذلیل کا یہ ننگِ شرافت طریقہ پسند نہیں کرے گی، جب کہ اس کے کسی معزم رکن کی خیانت لاریب طور پر پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہو۔ لیکن اتنی ثقاہت و متانت سے جمعیۃ کی نام نہاد مجلس عاملہ اگر تہی دامن تھی تو چلیے اونچے معیار پر لعنت بھیجئے۔ مگر یہ تو صریح ظلم اور کینہ پروری ہوئی کہ جس نیک نام اور ذی حیثیت فرد پر ڈنکے کی چوٹ الزام لگانے چلے ہیں اس سے پوچھنے تک کی زحمت گوارا نہیں کی جاتی کہ تم اپنی پوزیشن کے بارے میں کیا کہتے ہو۔

واقعہ دراصل اس کے سوا کچھ تھا ہی نہیں کہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کو ورکنگ صدارت کے عہدے سے ہٹانے کا جو ڈرامہ کھیلا گیا تھا اس کے رکیک پہلوؤں سے اہلِ نظر کی توجہ ہٹانے کے لیے ڈرامے کے ایکٹروں کو ایک نئے موضوعِ گفتگو کی تلاش تھی اور یہ موضوع اِس سے بہتر کیا ہو سکتا تھا کہ جس ہستی کو جعل و دغا کا نشانہ بنایا گیا اُلٹی اسی کی دیانت بحث و جدل کا ہدف بنا دی جائے۔ کوشش کی گئی کہ امانت وصول کرنے سے قبل ہی برق رفتاری کے ساتھ خیانت کا ڈھول پیٹ جائے۔ منصف مزاج حضرات انصاف فرمائیں کہ اس شیطنت کا نام اگر انصاف ہے تو بے انصافی کسے کہتے ہیں؟

طرفہ تماشا یہ کہ مجلس عاملہ کے اسی ناپاک فیصلے میں ناظم عمومی صاحب کو یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ مفتی صاحب سے جواب طلب کریں۔ واہ رے مسخرو۔ فیصلہ پہلے کر دیا اور جواب طلبی بعد میں ہوگی۔ ایسا اندھیر بھی دنیا نے کم ہی دیکھا ہوگا۔ پھر رذالت کی انتہا ہے کہ جواب طلبی کی خدمت سپرد کی گئی ناظم عمومی جناب اسعد میاں کو حالانکہ اگر اس لایعنی جواب طلبی کے کوئی بُرے بھلے معنیٰ ہی تھے تو یہ خدمت مولانا فخر الدین کے سپرد کی جاسکتی تھی۔ وہ نام ہی کے صدر سہی؛ مگر اپنی کبرسنی اور ریش دراز کی مناسبت سے مفتی صاحب سے جواب طلبی کرتے ہوئے اچھے تو لگتے مگر ایسا نہیں کیا گیا؛ کیونکہ مفتی صاحب کی زیادہ سے زیادہ تذلیل اصل مقصود تھی اور ظاہر ہے کہ یہ مقصود خاطر خواہ طور پر اسی طرح حاصل ہو سکتا تھا کہ شیخ کی داڑھی کوئی چھوکرا کھینچے اور دراز قد ورکنگ صدر کی پیمائش بالشتیوں سے کرائی جائے۔

یہ ایک ہی کارنامہ قابض گروہ کے معیارِ اخلاق اور ذہنی سطح کا اندازہ کرنے کے لیے بہت کافی کہا جاسکتا

ہے مگر لگے ہاتھوں ہم اُس افتراق انگیز فیصلے کا ذکر بھی کریں گے جس میں اس گروہ نے شرکاء جمعیۃ کے لیے ''مجلسِ مشاورت'' کو شجرِ ممنوعہ قرار دیا ہے۔ یہ فیصلہ ایک طرف غیر معمولی انانیت کا مظہر ہے دوسری طرف کانگریسی حکومت کے رُخ پر اس کا انداز ''خان بہادری'' والی ذہنیت کا ہے۔ تیسری طرف اس میں اپنے سوا دوسرے تمام ہم سفیروں پر طنز و افتراء کیا گیا ہے۔

سخت حیرت ہوتی ہے جب ہم الجمعیۃ کے فاضل مدیر جناب عثمان فارقلیط جیسے انصاف پسند اور دیدہ ورکو ۸ رنومبر کے شذرات میں بڑی معصومیت کے ساتھ یہ لکھتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ مجلسِ مشاورت سے کامل انقطاع کا یہ فیصلہ تو جمعیۃ نے دراصل اتحادِ فکر کی خاطر کیا ہے۔ اس کا مقصود ملّی اتحاد کی حفاظت ہے اور

> ''مجلسِ عاملہ نے مجلسِ مشاورت کی خدمات سے کوئی تعرض نہیں کیا اور نہ اس کے ساتھ ملت کے تعلق پر بحث کی صرف اپنے ارکان کی شمولیت پر پابندی لگائی۔ یہ حق بہر حال ایسا ہے جسے سلب نہ ہونا چاہئے''۔

اسے کہتے ہیں عین دو پہر میں سورج کی تردید! اور یہی ہے اس فارسی ضرب المثل کا مصداق کہ ''دروغ گویم بر روئے تو''۔ اس فیصلے میں جمعیۃ کے مٹھی بھر قابض گروہ کے علاوہ مسلمانوں کی باقی قابل ذکر جماعتوں اور سیاسی شخصیتوں کو جس طعن و افتراء کا نشانہ بنایا گیا ہے اس کی تشریح تو خود اسعد میاں اپنے اس مکتوب میں خاصی بے تکلفی کے ساتھ کرتے ہیں جس میں ہمارے کہنہ سال اور تجربہ کار قومی رہنما جناب ڈاکٹر سید محمود کو خطاب کیا گیا ہے۔ اسعد میاں کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> ''میں بڑے دکھ کے ساتھ اپنے اس احساس کو آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں کہ مجلسِ مشاورت کے موجودہ کردار اور طرزِ عمل سے ۴۷ء سے پہلے کی فرقہ وارانہ مسلم سیاست کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے آپ کو یاد ہوگا کہ اُس وقت تقسیم ملک کی حمایت کے لیے جس قسم کے افراد اور جن جماعتوں کا متحدہ محاذ وجود میں لایا گیا تھا آج بھی اُسی قسم کے افراد اور وہی جماعتیں مسلم مجلس مشاورت کے پردے میں ملکی و ملّی سیاست پر غالب آنے کی ترکیبیں کر رہی ہیں۔''

اس سے بڑا اور شر انگیز الزام اسعد میاں مجلسِ مشاورت کے شرکاء پر لگا بھی کیا سکتے تھے۔ چوری، ڈکیتی، رشوت ستانی حتیٰ کہ قتل کا الزام بھی برادرانِ وطن کو اشتعال دلانے میں اتنا کارگر اور سریع الاثر نہیں ہوسکتا جتنا یہ الزام کہ فلاں فلاں مسلم افراد اور جماعتوں نے سیکولرازم، قومی یک جہتی اور نام نہاد جمہوریت کے خلاف گٹھ جوڑ کیا ہے۔

پھر مجلسِ مشاورت کے خلاف یعنی مسلمانوں کی تمام قابل ذکر سیاسی جماعتوں اور قومی شخصیتوں کے خلاف اکثریت کو چڑھ دوڑنے کی شہ دینے کی خدمت اسعد میاں نے ان واشگاف الفاظ میں انجام دی:

"ہندو پاکستان کی جنگ کے دوران آپ نے اگر چہ ذاتی طور پر اپنی خدمات محاذ جنگ کے لیے پیش فرمائیں۔ مگر مجھے تعجب اور حیرت ہے کہ اس سلسلے میں مسلم مجلس مشاورت نے معمولی توجہ دینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی اور اس اہم اور نازک موقع پر مجلس کا کوئی اجلاس بھی طلب نہیں کیا گیا، حالانکہ اس سے پہلے معمولی معمولی باتوں پر اجلاس طلب کیے گئے ہیں۔"

دیکھا آپ نے مجلسِ عاملہ کے متذکرہ فیصلے کی مستند شرح یہ ہے مگر الجمعیۃ کے فاضل مدیر یقین دلانا چاہتے ہیں کہ وہ فیصلہ تو بہت معصومانہ، بے حد سنجیدہ، یکسر تعمیری اور ملّی اتحاد کے مقدس جذبے پر مبنی تھا۔!

اسعدؔ میاں کے توضیحی خط کا مفصل اور تشفی بخش جواب ڈاکٹر سید محمود کی طرف سے پریس میں آچکا ہے۔ اس کے بعد ہمارے کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ فقط ایک نکتہ ہم اہلِ نظر کے آگے رکھ دیتے ہیں کہ جب دورانِ جنگ میں ہمارا قومی ریڈیو اور ہمارے اخبارات شدومد کے ساتھ مسلسل یہ باور کرا رہے تھے کہ ہم جیت رہے ہیں دشمن ہار رہا ہے۔ ہم پیٹ رہے ہیں دشمن پٹ رہا ہے۔ ہم فاتح ہیں دشمن مفتوح۔ ہم غالب ہیں، دشمن مغلوب۔ ہم دشمن کے ہتھیاروں کو روئی کی طرح دُھنک رہے ہیں۔ اس کے سپاہیوں کو مچھر مکھی کی طرح مسل رہے ہیں۔ ہمارا قدم آگے ہی آگے ہے۔ ہمارا ایک جوان دشمن کے بیس بیس جوانوں پر لرزہ طاری کیے ہوئے ہے، لڑائی تمام تر دشمن ہی کے گھر میں لڑی جا رہی ہے اور کچھ بعید نہیں کہ اگلے ہی لمحے ہم دشمن پر آخری فیصلہ کن ضرب لگا کر فتح کامل کا بینڈ بجادیں۔

تو اس اطمینان بخش، مسرت انگیز اور حوصلہ افزا پبلسٹی کے ماحول میں معقول اور مناسب بات یہ کیسے ہوتی کہ مجلسِ مشاورت کے شرکاء خواہ مخواہ حالات کو نازک قرار دے کر اجلاس کرنے بیٹھ جاتے اور بے محل طور پر ایک ایسا ڈرامہ اسٹیج کرتے جسے حب الوطنی کی نمائش اور وفاداری کے ڈھونگ سے زیادہ کوئی عنوان نہ دیا جاسکتا۔ اس ماحول میں تو بالکل طبعی اور مناسب نفسیات کے عین مطابق بات یہی تھی کہ وہ اپنی اپنی جگہ مطمئن بیٹھ کر بس یہ انتظار کرتے رہتے کہ اب آئی دشمن کے ہتھیار ڈالنے کی خوش خبری۔ اب آیا لاہور اور سیال کوٹ کے سقوط کا مژدہ۔ اب کی مسٹر ایوب نے فرطِ یاس میں خودکشی اور اب طلوع ہوئی مسٹر بھٹو کے ہونٹوں پر نزع کی ہچکی۔ یہی انہوں نے کیا بھی!

معلوم ہوتا ہے مولوی اسعد میاں دورانِ جنگ میں پابندی سے پاکستان ریڈیو سُنتے رہے ہیں اور اپنے قومی ریڈیو کی صداقت پر ایمان رکھنے کے عوض دشمن کے غیر قومی ریڈیو نے ان کے دل و دماغ کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے، اسی لیے انہیں حالات کی کسی ایسی مخفی نزاکت و اہمیت کا احساس ہو گیا جس میں بیچاری مجلس مشاورت جیسی نومولود جماعت کا اجلاس بھی کوئی معنیٰ رکھتا اور نہ اپنی بہادر فوجوں کی مسلسل پیش قدمی، شاندار کامیابی اور فیصلہ کن برتری کی گونج میں ایسے کسی لغو و لایعنی اجلاس کا تصور بھی کیونکر پیدا ہوسکتا تھا۔ تصور کا پیدا ہونا پھر اسے مستقل

اعتراض وطعن کی شکل میں پیش کر دینا واضح قرینہ ہے کہ قوم پرستی اور وطن دوستی کے بلند بانگ مدعی اسعد میاں آل انڈیا ریڈیو سے زیادہ پاکستان ریڈیو کو سچا سمجھتے رہے ہیں۔

اور اگر یہ بات نہیں تو پھر طعن نما حیرت اور اعتراض نما تعجب کا مطلب یہ ہوگا کہ اسعد میاں کے نزدیک مجلسِ مشاورت کے شرکاء کو عین اُس وقت بھی حب الوطنی اور قوم پروری کا ڈھونگ رچانا چاہئے تھا جب اس کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔

حقیقت جو کچھ بھی ہو۔ یہ ایک بات بالکل صاف ہے کہ اپنے خط کے منقولہ فقروں میں اسعد میاں نے اکثریت کی جارحانہ قوم پرستی کے لیے ایک تازہ نشانہ تجویز فرمادیا ہے۔

ایک سوال اسعد میاں سے یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ ''مجلسِ مشاورت'' میں سب سے زیادہ نمائندگی تو حضور کی جمعیۃ علماء ہی کو حاصل تھی۔ بچاری جماعتِ اسلامی اور مسلم لیگ کے تو بس دو نمائندے شریک ہیں جمعیۃ کے خیر سے ایک دم سات نمائندے شامل تھے۔ ان ساتوں میں ایک بھی مفتی عتیق الرحمٰن کا نامزد کردہ نہیں، بلکہ جناب ہی نے ان کی فہرست ڈاکٹر محمود صاحب کو دی تھی۔ گویا یہ سب آپ ہی کے منتخب کردہ تھے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان ساتوں نے دورانِ جنگ میں کسی اجلاس کی تحریک کی تھی؟

اگر کی تھی اور مجلسِ مشاورت کے باقی اراکین نے اسے رَد کر دیا تھا تب تو اعتراض اور تحیّر کا موقع نکلتا ہے۔ لیکن اگر نہیں کی تھی۔ اور یقیناً نہیں کی تھی تو اجلاس نہ کرنے اور بے توجہی برتنے کا جو اعتراض اسعد میاں نے کیا ہے اس کا سب سے بڑھ کر نشانہ وخود وہ اور ان کے یہ ساتوں کارندے بنتے ہیں۔ یہ خود سوتے رہے اور الزام دیا جارہا ہے ان جاگنے والوں کو جو اپنے قومی ریڈیو کی خبریں سننے اور ان پر بھروسہ کرنے کے نتیجہ میں جشنِ مسرت منانے کے علاوہ کسی اجلاس کا تصور ہی نہیں کر سکتے تھے۔

سچ یہ ہے کہ چشمِ یار کی شہ پر اسعد میاں کو مجلسِ مشاورت سے ترکِ تعلق بہر حال کرنا تھا۔ اس کا جواز مجلس کو جرائم پیشہ قرار دیئے بغیر کیسے پیدا ہوتا۔ ترکِ تعلق کا ارادہ تو اسی وقت کرلیا گیا تھا جب دہلی میں ایک مقابلے کے کنونشن کی لیلا رَچائی گئی تھی۔ تکمیل اب ہوئی اور تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ جتنے بھی الزامات واعتراضات تصنیف کیے جاسکیں کر دیئے جائیں۔ ورنہ یہ بات تو بالکل سامنے کی ہے کہ دورانِ جنگ میں اجلاس کرنے کی کوئی معقول وجہ اگر موجود ہوتی تو خود اسعد میاں اور ان کے سات ہرکارے اس کی تحریک فرماتے۔

دین وملّت کا کون ہی خواہ ایسا ہوگا جو یہ آرزو نہ کرے گا کہ جمعیۃ کا اندرونی انتشار وخلفشار جلد سے جلد ختم ہو۔ ہم خود قلب وروح کی گہرائیوں کے ساتھ یہی تمنا رکھتے ہیں؛ لیکن یہ تمنا پوری اس لیے ہوتی نظر نہیں آتی کہ خلفشار کی بنیاد کسی غلط فہمی پر نہیں ہے۔ غلط فہمیاں تو بہر حال کسی نہ کسی طرح دُور کی ہی جاسکتی ہیں لیکن جس خلفشار کی بنیاد ایک گروہ کی

اقتدار طلبی اور مطلق العنانی پر ہو اس کا خاتمہ افہام و تفہیم سے نہیں ہوسکتا جب تک کہ دوسرا گروہ خطِ غلامی ہی نہ لکھ دے۔ دوسرا گروہ شاید خاموش بھی ہو بیٹھتا، کیونکہ اس کی باگ ڈور جن سربراہوں کے ہاتھوں میں ہے وہ حبِّ جاہ اور اقتدار پسندی سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ لیکن ان کے سینوں میں دین وملّت کی خیر خواہی اور قوم و ملک کے بارے میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس چونکہ فنا نہیں ہوا ہے اس لیے وہ آسانی سے یہ گوارا نہیں کرسکتے کہ امت کی بھیڑیں ایسے چرواہوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دی جائیں جو اُن بے زبان بھیڑوں کو اپنی ہوس اقتدار کی بھٹی کا ایندھن بنانے میں شمّہ برابر تامل اور ترحم سے کام نہیں لیں گے۔ اسی لیے یہ مجروح ومظلوم گروہ ماہِ رواں (نومبر ۶۵ء) کے اواخر میں بھوپال میں جمع ہو رہا ہے جہاں یہ سر جوڑ کر غور کرے گا کہ موجودہ صورتِ حال سے کیونکر نبٹا جائے اور اصلاحِ احوال کے لیے کونسے قدم اُٹھائے جائیں۔

کرگس کے تصرف میں ہے شاہیں کا نشیمن

یہ بات کسی اَن پڑھ مسلمان سے بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ غیر مسلموں کے لیے دعائے مغفرت نہیں کی جاسکتی۔ حد ہے کہ سب سے بڑے پیغمبر خاتم الانبیاء، شافع محشر ﷺ کو بارگاہِ ربانی سے اپنے والدین کے لیے دعائے مغفرت کی اجازت نہ مل سکی۔

اور یہ بات بھی سبھی مسلمان جانتے ہیں کہ مسلمان ہونے کے لیے دو لازمی شرطیں ہیں: دلی تصدیق اور زبانی اعتراف۔ کوئی شخص قلبی طور پر کچھ بھی اعتقادات رکھتا ہو لیکن جب تک وہ یہ اقرار نہ کرے گا کہ میں مسلمان ہوں اسے مسلمان نہیں مانا جائے گا۔

ان مسلّمات کی روشنی میں ذرا وہ تعزیت نامہ ملاحظہ فرمائیے جو اسعدؔ میاں نے علّامہ پنڈت تربھون ناتھ زارؔ زتشی کی موت پر ان کے صاحبزادے کو ارسال کیا ہے:

> ”حضرت علّامہ پنڈت زارؔ دہلوی یادگار داغ علم وفن کے علیم اور تہذیب ورواداری کی ایک صدی کی روایات کے حامل اور بزرگانِ عہد کے اُسوۂ حسنہ کے مظہر تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ ان کی حمد ونعت گوئی اور توحید پرستی کا ڈنکا بجتا تھا۔ میں بھی دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت کرے اور آپ کو اُن کے ادبی ورثہ کی جانشینی جس کے آپ مستحق ہیں سرگرمی سے کارکردگی کی توفیق عطا فرمائے۔“ (”ندائے اتحاد“ علامہ زارؔ نمبر یکم نومبر ۱۹۶۵ء)

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آنجہانی زارؔ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ انہوں نے نعتیں بھی کہی ہیں اور توحید سے بھی انھیں شغف رہا ہے۔ انھوں نے اُردو، فارسی اور عربی بھی پڑھی ہے۔ ان کے تعلیمی اور نوع بہ نوع سماجی روابط

مسلمانوں سے بڑے گہرے رہے ہیں۔ مگر کیا ایسے ہزار اوصاف بھی کسی شخص کو دعائے مغفرت کا مستحق بنا سکتے ہیں جب تک کہ وہ اپنی ملّت سے انقطاع اور ملّتِ اسلامیہ میں شمولیت کا صاف صاف اعلان و اقرار نہ کرے۔

ہم نے ذہنی طور پر بہت کوشش کی کہ اسعدؔ میاں کے حق میں کوئی تاویل نکل آئے؛ مگر کامیاب نہ ہوسکے۔ اب یہ سوال خود موصوف ہی کے جواب دینے کا ہے کہ قرآن و حدیث کے متفق علیہ، محکم، قطعی اور معلوم و معروف عقیدے کے برعکس انھوں نے آنجہانی زار آتشی کے لیے صریح الفاظ میں دعائے معفرت کس بنیاد پر کی ہے اور یہ جسارت اللہ اور رسولؐ کے بالمقابل مکابرہ اور مجادلہ نہیں کہلائے گی تو اور کیا کہلائے گی؟۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جس درجے اور معیار کی قومی یک جہتی اور سیکولرازم اور وطن پرستی کو انھوں نے منزلِ مقصود بنایا ہے اسی کا ایک نمونہ یہ بھی ہو اور اگلے مرحلے میں وہ کسی غیر مسلم میت کی نمازِ جنازہ بھی پڑھنے میں تکلف نہ فرمائیں۔ ایسا اگر ہے تو پھر ان کے مریدانِ سادہ لوح کو غور کر لینا چاہیے کہ جس جنت تک وہ صاحبزادے کے پیچھے پیچھے پہنچنا چاہتے ہیں وہ کہیں احمقوں کی ''جنت'' تو نہیں۔!

(تجلّی دیوبند دسمبر ۱۹۶۵ء)

....

جمعیۃ علماءِ ہند کا ماضی اور حال

(از: عبدالخالق سہارنپوری)

جمعیۃ علماءِ ہند کی مجلسِ عاملہ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲؍۳؍اکتوبر ۱۹۶۵ء میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ جمعیۃ العلماء کا کوئی ممبر اب سے مسلم مجلس مشاورت اوران میں شریک جماعتوں کا ممبر نہ رہ سکے گا۔

جمعیۃ کے اس فیصلے پر ہر طرف سے تعجب و تأسف کا اظہار کیا جارہا ہے۔ ''قومی آواز'' لکھنؤ کے سوا، جو روز اوّل سے ہی اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح مسلم مجلسِ مشاورت کا شیرازہ منتشر ہو جائے، میرے علم کی حد تک کسی اخبار یا کسی معروف شخصیت نے تادمِ تحریر اس فیصلے کو مستحسن قرار نہیں دیا ہے۔ رہا قومی آواز کا معاملہ تو کون نہیں جانتا کہ معاصر قومی آواز کسی بھی مسلم تنظیم سے خوش نہیں ہے؛ کیونکہ موجودہ ہندوستان میں کوئی مسلم تنظیم ایسی نہیں ہے جس پر فرقہ واریت کا لیبل نہ لگایا جاچکا ہو اور آئندہ بھی کوئی مسلم تنظیم ایسی نہیں ہوسکتی جو اس لیبل سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے۔ معاصر قومی آواز کے نزدیک جس مسلم جماعت یا تنظیم پر کسی طرف سے فرقہ واریت کا لیبل لگ گیا بس اس جماعت کے ملک و ملّت کے لیے مہلک ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ جمعیۃ علماءِ ہند جمہوری کنونشن کرنے اور مسلم مجلسِ مشاورت سے آنکھیں بچانے کے باوجود فرقہ واریت کے لیبل سے نہ بچ سکی اور اب معاصر قومی آواز کی خواہش اور مرضی کے عین مطابق اس لیبل کو اُتار پھینکنے کے لیے مسلم مجلس مشاورت سے علیٰحدگی کا فیصلہ کرلینے کے باوجود معاصر قومی آواز کی مار سے بچ نہ سکی اور میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ اس وقت تک نہ بچ سکے گی جب تک کہ وہ ایسا ہی ایک اور ''جراٴتمندانہ قدم'' نہ اُٹھادے جس کے نتیجہ میں جمعیۃ کانگریس کا ضمیمہ بن کر رہنے کی بجائے پوری طرح کانگریس میں ضم ہو جائے۔

جمعیۃ کی صحیح تصویر

چنانچہ قومی آواز'' کے جس اداریہ کی آخری ۴۳ حصّہ کو الجمعیۃ نے اپنے اس فیصلے کی حمایت میں نقل کیا ہے اس اداریہ کی ابتدائی ۴۱ حصّہ میں جسے الجمعیۃ نے جان بوجھ کر نظرانداز کردیا ہے خاصا عبرت آموز مواد موجود ہے۔

معاصر موصوف رقمطراز ہے:

''حد ہوگئی کہ جمعیۃ نے اپنے سابق ورکنگ صدر پر باقاعدہ الزام لگانا شروع کردیا ہے۔ الزام

کے لیے جن باتوں کو لیا ہے ان میں قطعی اتنی جان نہیں ہے کہ اس پر کسی سنگین الزام کا بوجھ ڈالا جاسکے۔۔۔۔۔اگر رسہ کشی اس حد تک گرگئی تو پھر سمجھ لیجئے کہ جمعیۃ کی عوام پسندی کا خاتمہ ہوگیا؛ کیونکہ ملکی معاملوں میں مسلمانوں کی کوئی خاص رہبری عرصے سے نہیں کر رہی ہے جو کام کرتی ہے وہ ہے احتجاجی بیانات اور مذہبی تعلیم۔ دوسری طرف جمعیۃ کا اخبار بھی صحیح راہوں پر نہیں جارہا ہے۔ ان دونوں باتوں پر پچھلی مقبولیت کو برقرار رکھنا ہی مشکل تھا اور اب جو صورتِ حال پیدا ہو رہی ہے وہ تو ایسی ہے جو رہی سہی مقبولیت کو بھی ختم کرسکتی ہے۔"

معاصر قومی آواز نے اپنے اس اداریئے کے اندر جمعیۃ کی جو تصویر کشی کی ہے اگر چہ وہ سوفی صدی درست ہے؛ مگر جو لوگ معاصر موصوف کے مسلم جماعتوں کے سلسلے میں نقطۂ نظر سے واقف ہیں وہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ معاصر نے یہ صحیح بات صرف اس لیے سپردِ قلم کی ہے کہ آخر جمعیۃ علماء بھی تو ایک ایسی ہی تنظیم ہے جس میں غیر مسلمین کی شرکت ممنوع ہے پھر بھلا یہ کس طرح ایک صحت مند تنظیم باقی رہ سکتی ہے؟

علیحدگی کا فیصلہ ایک عظیم سانحہ

بہر صورت جمعیۃ کا یہ فیصلہ ہم عقیدت مندانِ جمعیۃ کے لیے بھی ایک عظیم سانحہ ہے۔ مگر حیرت واستعجاب کا باعث ہرگز نہیں ہے۔ کیونکہ جمعیۃ آج جس صورتِ حال سے دوچار ہے اس میں اس سے اس کے سوا اور توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی کہ یہ بہت جلد اس سانحہ سے دوچار ہوگی۔ البتہ تعجب کا مقام تو یہ ہے کہ اربابِ جمعیۃ نے مجلس سے علیحدگی کے وہ اسباب ظاہر نہیں کیے جو فی الحقیقت ہیں اس کے برعکس ان کی طرف سے ایسی باتیں کہی گئی ہیں جن سے ہر غیرت مند جمعیتی کا سر ندامت سے جھک جاتا ہے۔

موہوم اندیشے

مثلاً ایک بات یہ کہی گئی ہے کہ مسلم مجلسِ مشاورت کی تشکیل جس وقت عمل میں لائی گئی تھی اس وقت اربابِ جمعیۃ نے یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ کہیں آگے چل کر یہ ایک مستقل تنظیم نہ بن جائے؛ مگر ان کے اندیشے کے جواب میں صدر مجلس نے اطمینان دلایا تھا کہ نہیں ایسا نہیں ہوگا۔

قطع نظر اس کے کہ صدر مجلس نے اس طرح کی کوئی یقین دہانی نہیں کرائی تھی۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ اربابِ جمعیۃ کے لیے اس میں اندیشے کی کیا بات تھی مسلم مجلس مشاورت کے مستقل تنظیم بن جانے پر انھیں خطرہ کیا لاحق ہو جاتا؟ اور مسلمانوں کے ایک مشترکہ پلیٹ فارم کو ہوا میں معلق رکھنے سے ان کا منشاء کیا تھا؟ یہ اُس وقت تو بلاشبہ ایک راز تھا مگر اب اس کا پردہ فاش ہو چکا ہے۔ اسے آئندہ سطور سے بآسانی سمجھا جاسکے گا۔

جماعتِ اسلامی کا معجزہ

دوسری بات یہ کہی گئی کہ مجلس پر ان جماعتوں کا غلبہ ہے جن کا طریقہ فکر اور نظامِ عمل جمعیۃ کے طریقۂ فکر اور نظامِ عمل سے بالکل جدا ہے اور یہ کہ اسی غلبہ نے مجلس کو گمراہ کیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیں یہ خوش گمانی تھی کہ مجلسِ مشاورت کے اندر چونکہ جمعیۃ کی ''حریف'' صرف دو جماعتوں کے فقط دو اور دو چار افراد ہیں باقی سات جمعیۃ کے اور چار کانگریس کے، ان گیارہ کے علاوہ بھی جو ارکان مجلس کے اندر ہیں وہ یا تو جمعیۃ کے حامی ہیں یا کم از کم اربابِ جمعیۃ کو ان سے کسی قسم کی شکایت نہ ہوگی۔ اس لحاظ سے مجلسِ مشاورت بہرصورت اربابِ جمعیۃ ہی کے زیر اثر ہوگی۔ مگر ہم پر آج یہ انکشاف ہوا کہ جماعتِ اسلامی اور مسلم لیگ کے دو اور دو چار ارکان نے پوری مجلس کو ''اپنے ہاتھوں کا کھلونا بنالیا ہے'' اور بالآخر اربابِ جمعیۃ کو یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا کہ ''اب سے جمعیۃ العلماء کا کوئی رکن مسلم مجلس مشاورت کا رکن نہیں رہ سکتا۔'' یہاں یہ سوال بار بار ذہنوں میں اُٹھتا ہے کہ آخر جماعتِ اسلامی کے اندر وہ کونسی طاقت ہے جسے استعمال کر کے اس کے صرف دو ارکان نے پوری مجلسِ مشاورت پر اپنا قبضہ جما لیا ہے؟

جمعیۃ کا حسین نعرہ

حقیقت تو یہ ہے کہ اس امر میں جماعتِ اسلامی یا مسلم لیگ کی کسی معجزانہ طاقت کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ جمعیۃ کو اس شرمناک فیصلہ پر اس کے اس زعم نے مجبور کر دیا کہ ''مسلمانوں کی واحد نمائندہ جمعیۃ علماء ہند ہے۔'' اس معاملے میں وہ خود کو وحدہٗ لاشریک تصور کرتی ہے اسے اچھی طرح اِس بات کا یقین ہوگیا کہ مسلم مجلسِ مشاورت نے بہت ہی مختصر مدت کے اندر مسلمانوں کے تقریباً تمام طبقوں سے زبردست اعتماد حاصل کر لیا ہے اور اب وہ مسلمانانِ ہند کی ایک قابلِ اعتماد قیادت کی شکل میں اُبھر رہی ہے۔ ارکانِ مجلس مطمئن ہیں کہ مجلس کی ترقی ملک کی اور ملک کے جملہ مسلمانوں اور مسلم تنظیموں کی ترقی ہے۔ کیونکہ اسے ہر ایک مسلمان اور مسلم جماعت کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔ اگر کبھی کسی نے دبی زبان سے یہ سوال کیا کہ مجلس مشاورت کا ماضی کیا ہے۔ اس کی تاریخ کتنی ہے، اس کی ملکی و ملّی خدمات کی فہرست کہاں ہے؟ تو ارکانِ مجلس کے اتحاد نے منہ توڑ جواب دیا ہے کہ اس مجلس کا ماضی جسے دیکھنا ہو وہ مجلس کے اندر شریک شخصیتوں اور تنظیموں کا ماضی دیکھ لے وہیں اسے ملکی و ملّی خدمات کی ایک طویل فہرست بھی ملے گی اور وہ سب کچھ مل جائے گا جس کی ضرورت آج محسوس کی جائے گی۔

مجلس جمعیۃ کے لیے خطرے کا الارم

مگر افسوس کہ مسلمانوں کی اس قابلِ اعتماد مجلس اور صحت مند قیادت کو اربابِ جمعیۃ نے اپنی موہوم ''واحد

نمائندگی'' کے لیے خطرے کا ایک الارم تصور کیا اور اپنے تئیں مجلس کو ڈائنامیٹ کر ڈالنے کے لیے اس نازک ترین وقت میں ایک ایسا اقدام کیا جسے ملتِ اسلامیہ کا کوئی بھی خیر خواہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

جمعیۃ کی ناکامی

اربابِ جمعیۃ کے اس عجلت پسندانہ اور غیر دانشمندانہ اقدام سے مسلم مجلس مشاورت پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں اب یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہ گئی ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جمعیۃ مسلم مجلس مشاورت کو تہس نہس کر دینے والی اسکیم میں بری طرح ناکام ہو گئی ہے اور جمعیۃ کی ان قابل اعتماد شخصیتوں نے جو مجلس کی روح رواں ہیں مجلسِ عاملہ کے اس فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اگرچہ اربابِ جمعیۃ کی طرف سے انہیں اپنی اس جرأت مندی اور حق پسندی کے ''جرم'' کا ابھی سے خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے۔

اربابِ جمعیۃ کو بجا طور پر یہ اندیشہ تھا کہ اگر مسلم مجلس مشاورت کو کچھ دنوں تک اور آزادانہ طور پر کام کرنے کا موقع مل گیا تو اربابِ جمعیۃ کی نام نہاد ''نمائندہ قیادت'' کا رنگ پھیکا پڑ جائے گا اور ملکی و ملّی مسائل کے اندر کچھ ایسے لوگ بھی نظر آنے لگیں گے جو اپنی خداداد صلاحیتوں اور قابلیتوں سے اُلجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے میں شانہ بشانہ سرگرم عمل ہوں گے یہ خوش کن صورتِ حال اربابِ جمعیۃ کی نام نہاد ''واحد نمائندگی'' کے لیے ایک عظیم سانحہ تھی۔ حالانکہ مجلسِ مشاورت کی کامیابی درحقیقت خود جمعیۃ علماء ہند کی کامیابی تھی مگر یہ کامیابی اربابِ جمعیۃ کو صرف اس لیے منظور نہ ہوئی کہ اس میں دیگر جماعتوں اور شخصیتوں کا بھی حصّہ ہوتا جبکہ جمعیۃ کے نزدیک یہ ایک ''شرکِ عظیم'' ہے۔ جسے وہ کسی طرح بھی انگیز نہ کر سکتی تھی۔

اب آئیے ہم جمعیۃ کی واحد نمائندگی اور اس کے شاندار ماضی کا بھی جائزہ لیتے ہیں چونکہ اربابِ جمعیۃ اپنے شاندار ماضی کی بنیاد پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی واحد نمائندگی اور قیادت کا حق صرف انھی کو پہنچتا ہے، اس لیے سب سے پہلے ہم اس کے ماضی پر ہی گفتگو کریں گے۔

ہمیں ایک لمحہ کے لیے بھی اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی تامل نہیں ہے کہ ہمارے بزرگوں اور ہماری عظیم شخصیتوں نے دین وملّت کی خدمات اور ملک کو انگریزوں کے پنجۂ جبر و استبداد سے نجات دلانے کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دی تھی۔ انھوں نے حق کی خاطر عظیم ایثار وقربانی کی جو مثال قائم کی ہے اس میں ان کا کوئی ہمسر نہیں ہے بے شک انھوں نے جمعیۃ العلماء کو ایک عظیم نصب العین ایک واضح مقصد اور باوقار طریقۂ عمل سے آراستہ کیا تھا ان کی جمعیۃ علماء ہند فی الحقیقت جملہ مسلمانوں کی ایک قابل اعتماد قیادت کی متحمل تھی۔ مگر ۴۷ء کے بعد کی جمعیۃ العلماء نے اُس نصب العین اور مقصد سے جان بوجھ کر انحراف کیا۔ ۴۷ء سے قبل کی جمعیۃ العلماء

دین اسلام کی داعی اور علمبردار تھی۔ مسلمانانِ ہند کی ان کی زندگی کے تمام گوشوں میں قرآن حکیم اور سنتِ رسول کی روشنی میں رہنمائی کرتی تھی اس کا نصب العین اقامتِ دین تھا ان کی جملہ سعی و جہد کا واحد مقصود بھارت کے اندر دین اسلام کا غلبہ و نفاذ تھا میدانِ سیاست ان کے لیے ممنوعہ علاقہ نہ تھا۔ غیر دیندار شخصیتوں کے لیے ان کی صفِ قیادت میں کوئی جگہ نہ تھی۔ مگر ۴۷ء کے بعد جمعیۃ العلماء اپنی شکل وصورت کے اعتبار سے تو وہی رہی؛ مگر ایک جسم بے روح کے مثل، بے شک آج بھی اس کی سرپرستی ان بزرگوں کے صاحب زادے ہی کر رہے ہیں؛ مگر ان کے نصب العین اور مقصد کو ترک کر کے آج بھی اربابِ جمعیۃ مسلمانوں کی واحد نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہیں مگر قرآن حکیم اور سنتِ رسولؐ کی وشنی میں نہیں بلکہ سیکولرازم کی روشنی میں اُس وقت جمعیۃ علماء ہند اور اس کے قیام کا مقصد درج ذیل تھا:

''مسلمانوں کے لیے ایک دینی نظم قائم کرنے کی غرض سے اوّلاً علماء کی تنظیم کا فیصلہ کیا گیا جو جمعیۃ علماء ہند کی شکل میں بفضلہ تعالیٰ مسلمانانِ ہند کے سامنے ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دینی نظم وہی ہوسکتا ہے جو وارثانِ انبیاء علیہم السلام کی زیر قیادت ہو جن کو شریعت غراء کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔''

اُس وقت جمعیۃ العلماء کا مقصود یہ تھا:

''جمعیۃ العلماء نے جتنے کام کیے ہیں سب اسلامی تعلیمات کے ماتحت ہیں اور ان کاموں کا محور صرف ایک ہے یعنی یہ کہ کلمۃ اللہ سر بلند ہو۔ اسلامی اُصول و قوانین کا احترام قائم ہو۔۔۔۔ جمعیۃ العلماء ہند جو کچھ آج تک کرتی رہی ہے اور آئندہ کرے گی وہ صرف ایک اہم دینی مقصد کے حصول کے لیے یعنی یہ کہ شرعی اُصول کے ماتحت حتی الامکان اس ملک میں اقامتِ دین کا عظیم الشان مقصد پورا ہو اور ایک اہم ترین فریضۂ اسلام ادا ہو؛ کیونکہ جس طرح بحکم اقیموا الصلوٰۃ اللہ اور رسول ﷺ کی تعلیم وتشریح کے بموجب اقامتِ صلوٰۃ فرض ہے ٹھیک اسی طرح ان اقیموا الدین کے ارشاد گرامی کے بموجب اللہ اور رسول ﷺ کی توضیح وتفسیر کے بموجب اقامتِ دین فرض ہے اور یہ فرض اسی وقت ادا ہوسکتا ہے جب کہ اسلام کا وہ اجتماعی نظام صحیح طور پر قائم ہو اور اللہ تعالیٰ و رسول اللہ ﷺ کے بیان فرمودہ تمدنی ومعاشرتی قوانین کا اِجراء ونفاذ ہو۔ اور اس کا احترام ہر طرح پر قائم ہو جائے۔ دین حق میں جہاد فی سبیل اللہ کی مشروعیت اسی اہم مقصد کے لیے ہے اور لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا کا یہی مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلمہ یعنی احکام وقوانین تمام انسانوں کے احکام وقوانین سے بالاتر رہیں اور انھی کا اجراء ونفاذ ہو۔''

''اصل حقیقت یہ ہے کہ اقامتِ دین اور قوانین الٰہیہ کی سربلندی اور نظامِ اسلامی کے قیام کے لیے

جس وقت اور جس زمانہ میں جو طریقہ کار بھی اختیار کیا جائے (بشرطیکہ وہ صریح نصوص اور اُصولِ اسلامی کے خلاف نہ ہو) وہ حقیقۃً جہاد فی سبیل اللہ ہے۔"

آگے چل کر مزید ارشاد ہوتا ہے:

"جمعیۃ علماء ہند اقامتِ دین کی غرض سے جو طریقۂ عمل اور حکمتِ عملی اختیار کرتی ہے وہ جہاد فی سبیل اللہ کی ایک عملی شکل ہوتی ہے اور جو مسلمان جمعیۃ علماء ہند کی جدو جہد میں عملاً حصہ لیتا ہے وہ مجاہد فی سبیل اللہ ہے اور جو لوگ مال و زر سے جمعیۃ علماء ہند کی اعانت و امداد کرتے ہیں وہ مجاہد فی سبیل اللہ کے شریک و معاون ہیں۔ مسجدوں اور کنوؤں کا بنوانا، یتیموں کی دعوت وغیرہ بھی اگر چہ دین کے کام ہیں اور نہایت ضروری ہیں، مگر ان کی حیثیت فروعات کی ہے اسلامی اجتماعی زندگی کی اصل بنیاد یہ ہے کہ قوانین الٰہیہ کے اجراء و احترام کی سعی کی جائے۔ تمام اولوالعزم انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ عظام کی زندگیوں اور ان کی تعلیمات میں ان حقائق کو سمجھنے کے لیے کافی ذخیرہ موجود ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دین کے تمام فروعی کام صحیح طور پر اس وقت انجام پذیر ہو سکتے ہیں جب اسلامی نقطۂ نظر سے سیاسی اقتدار خدا پرستوں کے ہاتھ میں ہو، تاکہ مخلوقِ خدا امن و راحت کی زندگی بسر کر سکے، ملک میں امن و امان اور عدل و انصاف کا دَور دَورہ ہو۔"

"آج اسی ایک سیاسی قوت کے نہ ہونے سے مسلمانوں کا اجتماعی نظام درہم برہم ہے، اسلامی قوانین کی بے حرمتی ہو رہی ہے مسلمانوں کے خاص معاشرتی احکام و نظام کو موجودہ قوانین پائمال کر رہے ہیں غیر اسلامی طریقوں پر عموماً مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت ہو رہی ہے اور یہ اندیشہ بے جا نہیں ہے کہ اگر علماء حق نے اس ملک کی سیاسیات میں عملاً حصہ لے کر اسلامی نظامِ اجتماعی کے قیام و بقاء کی کوئی صورت نہیں نکالی اور اس ملک کے نظامِ حکومت اور قوانین ساز مجالس میں اسلامی تحفظ کی راہ نہیں پیدا کی تو خدانخواستہ ہمارے مدارس و مساجد اور خانقاہوں کی بڑی سے بڑی عمارتیں بھی بے کار پڑی رہیں گی، کیونکہ لادینی اقتدار خواہ وہ نام کو مسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں ہو وہ تمام مراسم اور شعائرِ اسلامی کو ایک ایک کر کے تباہ و برباد کر دے گا دنیا کی تاریخ میں ایسے شواہد موجود ہیں کہ جب گمراہوں اور بے دینوں کے ہاتھ میں اقتدار آیا ہے تو انھوں نے کیا کچھ نہیں کیا ہے۔"

"قرآن حکیم ایک مکمل قانون ہے عرش معلیٰ سے نازل فرمودہ انسانی خطا اور لغزش سے پاک،

اس کا ہر حکم صحیح، ہر جملہ صحیح، ہر فقرہ صحیح، ہر حصے پر ایمان لانا فرض، ہر حکم پر عمل کرنا لازم، اس کے ہر نظریئے کو تسلیم کرنا شرطِ ایمان، قانون حکومت کی طاقت چاہتا ہے۔ حکومت کے بغیر قانون ایک قالب ہے بے جان۔ جسم ہے بے روح۔ علماء ملّت اس حقیقت کو جانتے ہیں۔۔۔۔ اس اہم نصب العین کی خاطر وہ جزئیات کی نہ پروا کرتے ہیں اور نہ شرعاً و عقلاً یہ جائز ہے کہ جزئیات کے لیے اُصول کو قربان کر دیا جائے۔''

مندرجہ بالا طویل اقتباسات سے اگرچہ یہ حقیقت بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ جس ماضی کو آج کے اربابِ جمعیۃ شاندار ماضی کہتے ہیں اور جس کی دُہائی دے کر وہ چاہتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند آج انھیں اپنا واحد نمائندہ تسلیم کرلیں اس ماضی میں جمعیۃ العلماء کا مقصد اور نصب العین اقامتِ دین تھا۔ حکومتِ الٰہیہ کا قیام تھا۔ اسلامی نظام کا غلبہ و نفاذ تھا۔ اور اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان کا تصور یہ تھا کہ:

''احکامِ شریعت کے بموجب نظامِ اجتماعی کے بغیر مسلمانوں کی زندگی گویا اسلام کے تخیل سے بھی خارج ہے۔''

لیجیے لگے ہاتھوں دو اور اقتباسات کا مطالعہ فرمائیے:

''اسمبلیوں کی قانون سازی سے اگرچہ وہ فرض ادا نہیں ہوتا جو مسلم پر بحیثیت مسلم قائد ہوتا ہے؛ کیونکہ اسمبلی کا وضع کردہ قانون اگر کلیۃً شریعت کے مطابق ہو تب بھی وہ اسمبلی کا قانون ہوگا اور مسلمانوں پر فرض یہ ہے کہ وہ خود قرآن کو قانون کی حیثیت سے تسلیم کرے اور بحیثیت قانون اس کے احکام نافذ کرائے۔ جب تک اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ کے بموجب حکم اور قانون صرف اللہ کا نہیں مانا جائے گا مسلمان اپنے فرض سے سبکدوش نہ ہوگا۔''

''ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لیے جمعیۃ علماءِ ہند کے سامنے اوّل یوم سے جو سب سے اہم اور ضروری کام پیشِ نظر ہے وہ مسلمانوں کی اسلامی تنظیم اور نظامِ شرعی کا قیام ہے۔''

(جملہ اقتباسات مولانا محمد میاں صاحب کی تصنیف ''جمعیۃ العلماء کیا ہے؟'' حصہ اوّل سے لیے گئے ہیں مولانا موصوف اس وقت جمعیۃ کے ناظم تھے، تقسیمِ ملک کے بعد مولوی اسعدؔ میاں سے قبل ناظم رہے اور آج بھی موصوف جمعیۃ کے مشیر اور ترجمان ہیں)

مندرجہ بالا اقتباسات کو بار بار پڑھیئے اور دیانتداری سے فیصلہ کیجیے کہ کیا آج کی جمعیۃ العلماء اس نصب العین اور مقصد کی حامل ہے جس کی حامل ۴۷ سے قبل کی جمعیۃ تھی؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر آج کس بنیاد پر اربابِ جمعیۃ مسلمانانِ ہند سے جمعیۃ علماءِ ہند کو ان کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرانے پر مصر ہیں؟ ٹھیک ہے کہ ۴۷ء

سے قبل کی شخصیتوں نے جمعیۃ العلماء کو ایک پاکیزہ روح کے ساتھ قائم کیا تھا اور عرصۂ دراز تک اپنے خون اور پسینے اور اپنی پُرخلوص صلاحیتوں سے اسے صحت مند رکھا اور مسلمانوں نے بجا طور پر اس پر اعتماد کیا؛ مگر اب جبکہ موجودہ اربابِ جمعیۃ نے اس کے مقصد و نصب العین کو یکسر تحریف کر ڈالا تو کیا مسلمانانِ ہند صرف اس بنا پر جمعیۃ العلماء کو واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرلیں کہ یہ استدعاء مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہٗ کے صاحبزادے کر رہے ہیں اور صاحبزادے کی بات صرف اس لیے تسلیم کرلی جائے کہ انھیں گھر سے نکلتے ہی خود جمعیۃ کے نادان دوستوں نے فدائے ملّت کا خطاب دے دیا ہے؟

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ آج جمعیۃ کے مرکزی رہنما جماعتِ اسلامی پر اقامتِ دین اور حکومتِ الٰہیہ کے آوازے کس کر اربابِ اقتدار کو ان کے خلاف بھڑکانے کی شرمناک کوششوں میں مصروف ہیں اور خود کو سیکولرازم کا سب سے بڑا علمبردار اور حکومتِ وقت کا حقیقی وفادار ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں؛ مگر اس بات کے لیے بضد ہیں کہ مسلمان انھیں اپنا دینی رہنما اور جمعیۃ العلماء کو اپنی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کریں۔ ہمارے کہنے کا منشا یہ نہیں ہے کہ وہ سیکولرازم کو اپنا نصب العین نہ بنائیں۔ البتہ ہم یہ ضرور کہیں گے کہ وہ جمعیۃ کے شاندار ماضی کے پردے میں اپنے تاریک تر حال اور (خدانخواستہ) تاریک ترین مستقبل کو چھپانے کی کوشش نہ کریں اور اقامتِ دین کے ان علمبرداروں کے نام پر مسلمانوں کو لادینیت کے قعرِ مذلت میں دھکیلنے کی کوشش نہ کریں جو ۴۷ء سے قبل جمعیۃ کے سرپرست اور روحِ رواں تھے۔

تجلّی

ہمیں فاضل مضمون نگار کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ جمعیۃ علماء نے اپنی سمتِ سفر سَن سینتالیس میں بدلی تھی اور اس کی قلبِ ماہیت کا پہلا سویرا خاورِ آزادی طلوع ہونے کے بعد ہوا تھا۔ ہمیں تو اس سے بھی اتفاق نہیں ہے کہ مولانا محمد میاں صاحب سابق ناظم جمعیۃ العلمائے ہند کے جو ایمان افروز اور ولولہ خیز اقتباسات ان کی کتاب سے نقل کئے گئے ہیں وہ بہت محدود ابتدائی زمانے کو چھوڑ کر کسی بھی وقت جمعیۃ کے مجموعی فکر اس کے تحریکی ذہن اور عملی اسکیم کا محور و مرکز رہے ہوں۔ یہ اقتباسات تو دراصل مولانا صاحب کے ذاتی جذبے اور خواہش اور میلانِ طبع کے حسین مظہر ہیں جو کسی طوفانی موج کی طرح گئے گزرے زمانے میں اُٹھے تھے اور پھر ساحل کی ریت میں جذب ہو گئے۔

ویسے ان کی طاقت اور نمود ”تحریکِ خلافت“ کے پس منظر میں ضرور ہوئی تھی۔ مگر اس کا تعلق مولانا محمود الحسن شیخ الہند اور مولانا محمد علی جوہر اور حکیم اجمل خاں اور مولانا انور شاہ جیسے مردانِ مومن کے اپنے اپنے منفرد اور مصفّیٰ

قلب و ذہن سے تھا جسے جمعیۃ کے جماعتی ڈھانچے میں بس وہی مقام دیا جاسکتا ہے جو نو ساختہ مکان میں چونا قلعی اور رنگ روغن کو حاصل ہوتا ہے۔ اس مکان کی دیواریں جن اینٹوں سے بنی تھیں ان کا خمیر ان مقدس خیالات سے نہیں اُٹھا تھا پھر یہ رنگ روغن ان مردانِ مومن کی موت سے اُتر گیا اور مقدس خیالات کی معصوم روح جامد اور مجہول سیاست کے طلسم زار میں تحلیل ہوتی چلی گئی۔ ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا محمد میاں جس وقت یہ بلند و برتر شاعری فرمارہے تھے ٹھیک اسی وقت جمعیۃ کی سرگرمیاں، سیاسی فکر اور خیالی نشانے ان خیالات کے عملی تقاضوں سے کوئی مضبوط، نتیجہ خیز اور شعوری رابطہ نہیں رکھتے تھے۔ اس دور میں ہم علماء کی فصیح و بلیغ تقریروں، تحریروں اور ایثار و قربانی کے آہنگ میں بس ایک ہی نغمہ سنتے ہیں۔ "انگریزوں نکل جاؤ، غلامی مردہ باد، ہم آزادی چاہتے ہیں۔"

یہ نغمہ یقیناً بڑی جرأت و مردانگی سے گایا گیا۔ تلواروں کی چھاؤں میں گایا گیا، گولیوں کی زد اور پھانسی کے تختوں پر گایا گیا۔ مگر اس نغمہ ریزی میں علماء تنہا نہ تھے یہ تو پورے ملک کا کورس تھا اور مسلمانوں کی طرح برادرانِ وطن بھی اپنے خون سے چراغ جلانے کا کھیل بڑی ہمت سے کھیل رہے تھے۔ پھر کیا اس مشترکہ نغمے میں کوئی ایسا سُر بھی ملتا ہے جس سے عامۃ المسلمین کو یہ اطمینان ہو جاتا کہ آزادی کی جدو جہد میں ابنائے وطن سے اشتراک و اتحاد کے باوجود علمائے جمعیۃ کے ذہنوں میں مستقبل کے نظامِ حکومت و سیاست کے لیے کوئی ایسا مخصوص اور منفرد خاکہ بھی ہے جو ابنائے وطن کے ذہنی خاکوں سے مختلف ہو۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ابنائے وطن حکومتِ الٰہیہ کی تاسیس اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے آزادی نہیں مانگ رہے تھے۔ ان کا مقصود اپنی پسند کی ایک غیر اسلامی حکومت بنانے کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر کیا سن سینتالیس سے پہلے جب پورا ملک مطلوبہ آزادی کا ترانہ گا رہا تھا علمائے جمعیۃ نے کوئی مصرعہ اس میں ایسا بھی شامل کیا تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد وہ کسی ایسی حکومت پر راضی نہ ہوں گے جس میں اسلام کا درجہ بس ایک یتیم کا ہو اور مسلمانوں کی حیثیت ان دریوزہ گروں کی سی ہو جن کے لیل و نہار حقوق کی بھیک مانگنے، ناانصافیوں پر واویلا کرنے، دستور کی دُہائی دینے اور اپنی بے بسی پر ہاتھ پیر پیٹنے میں کٹتے ہیں۔

مولانا آزادؒ کے قلم کی گھن گرج کون بھول سکتا ہے، ایمان و اسلام اور جہاد فی سبیل اللہ کے جو بے مثال لولو و مرجان ان کے خامۂ عنبر شمامہ نے بکھیرے ان کی چمک دمک تو آج بھی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ سیاست کا جو رُخ انھوں نے لیا اور جہاد آزادی کے جس نقشے پر وہ چلے کیا اس میں اور ان کے خطبات و مواعظ میں کوئی منطقی اور تکنیکی ربط بھی تھا۔ کیا وہ جو کچھ کہتے آئے تھے، جو ان کے قلم کی دعوت تھی، جو زبان وہ بول رہے تھے جس لاہوتی منزل کی طرف ان کی شعلہ نوائیاں آواز دے رہی تھیں اس سے ان کی عملی اسکیم، حقیقی

دوڑ دھوپ، سیاسی چال ڈھال اور نقشۂ جنگ کو بھی وہی مناسبت تھی جو ارادے اور عمل کے درمیان ہوتی ہے؟

تاریخ کا ہر ذہین طالبِ علم دیکھ سکتا ہے کہ کہا اور لکھا جو کچھ بھی گیا ہو مگر جنگِ آزادی علمائے جمعیۃ نے جس نقشے پر لڑی ہے وہ ٹھیک ٹھیک وہی تھا جس کے نتیجے میں حکومتِ الٰہیہ اور اقامتِ دین کا کوئی تصور تک پیدا نہیں ہوسکتا تھا، اسی لیے انھیں نعرہ باز مسلم لیگ کے مقابلے میں شکستِ فاش اُٹھانی پڑی۔ ''نعرہ باز'' کا لفظ محض طعن نہیں امرِ واقعہ ہے۔ وہ ایک نعرہ ہی تو تھا کہ پاکستان کا مطلب کیا؟ ''لاالٰہ الاّ اللہ!'' اور لطف یہ ہے کہ اس نعرے کا طلوع اُن فاسق و فاجر مسلمانوں کی زبان سے ہوا جنکا اسلام بظاہر ایک نسلی اسلام کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ جو صورت اور کردار ہر اعتبار سے انگریزوں کا سایہ تھے۔ جن سے ادنیٰ سا بھی حسنِ ظن مذہب پسند عامۃ المسلمین کو نہ تھا لیکن انھیں جیت اسی لیے ہوئی کہ علمائے جمعیۃ کے قول و عمل کے تضاد نے سادہ لوح مسلمانوں کو تحیّر، جھلاّہٹ اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ انھیں مدت سے جو خواب مولانا آزادؒ جیسے سحر طراز خطیب دکھلا رہے تھے وہ تو کچھ اور ہی تھے مگر جو عملی اسکیم اور نقشۂ کاران کے سامنے آیا وہ ان حسین خوابوں سے یکسر مختلف تھا۔ اس تضاد کی ضرب ان کے دل و دماغ پر بھرپور پڑی اور بدگمانی و نفرت کے ایک نفسیاتی لمحے میں وہ تنکے کی طرح مسلم لیگ کے رُخ پر بہہ گئے یہ فریب خوردگی ضرور تھی؛ مگر اس کا سہرا فی الحقیقت مسلم لیگیوں کے کمالِ فریب دہی کے سر نہ تھا، بلکہ اُن علماء کے سر تھا جو زبان تو ابن تیمیہؒ اور مجدد الف ثانیؒ کی بولتے آئے تھے مگر عین مقابلے کے وقت وہ فقط یہ ثابت کرتے نظر آرہے تھے کہ حکومتِ الٰہیہ اور اقامتِ دین اور اعلائے کلمۃ الحق اور جہاد فی سبیل اللہ جیسی تمام ارفع و اعلیٰ اصطلاحوں کا واحد مصداق وہ سیکولر جمہوریت ہے جس میں کامل اقتدار غیر مسلم اکثریت کے ہاتھ میں ہو اور اسلام کو بس ایک محدود سماجی دائرے میں زندہ رہنے کی اجازت مل جائے۔

تمثیل کی زبان میں یوں سمجھئے کہ ایک گروہ زبان و قلم کی پوری طاقت مکھن کی تعریف میں صرف کر دیتا ہے اور تلقین کرتا ہے کہ دودھ سے مکھن نکالنے کا بہت بڑا کارخانہ قائم کرنے کے لیے اس کی برادری وسائل و ذرائع اسے مہیا کرے، ہاتھ بٹائے، تن من دھن سے تعاون دے۔ برادری آمادہ ہوجاتی ہے۔ آگے بڑھ کر تعاون پیش کرتی ہے اور وقت آجاتا ہے کہ داعی گروہ دودھ سے مکھن نکالنے کے کارخانے کا نقشہ بنائے۔

اب کیا حال ہوگا برادری کی جھلاّہٹ اور بیزاری کا اگر وہ یہ دیکھے کہ نقشہ ڈیری فارم کا نہیں تیل صاف کرنے کے کارخانے کا بن رہا ہے اور اسکیم مکھن نکالنے کی نہیں بلکہ پٹرول برآمد کرنے کی چل رہی ہے۔

ٹھیک اسی وقت کچھ لوگ اُٹھتے ہیں جو پکار پکار کر کہتے ہیں کہ اے برادری والو! تمہیں دھوکا دیا گیا۔ مکھن کا کارخانہ تو ہم بنانے جارہے ہیں۔ یہ دیکھو یہ دودھ ہے یہ ڈیری فارم کا نقشہ ہے۔ یہ کل پُرزے ہیں۔ بس زمین ملنے کی دیر ہے۔ وہ ملی اور ڈیری فارم تیار ہوا۔ قدرتی بات ہے کہ سطح بیں اور سادہ لوح برادری والے ادھر دوڑیں گے۔ وہ

پہلے گروہ کے پیدا کردہ اعصابی ہیجان میں اس قابل ہی نہیں رہے ہیں کہ چونا ملے ہوئے پانی اور دودھ میں فرق کرسکیں یا یہ سوچ سکیں کہ جو مسخرے زندگی بھر کوئلہ کھودتے آئے ہیں وہ دودھ سے مکھن نکالنے کا فن کیا جانیں گے۔

پاکستان کبھی نہ بنتا اگر جمعیۃ علمائے ہند سن سینتالیس سے قبل عامۃ المسلمین کو یہ باور کراسکتی کہ وہ واقعۃً وہی ہے جس کا ناک نقشہ مولانا ابوالکلامؒ اور مولانا محمد میاں جیسے عمائد بیان کرتے چلے جارہے ہیں۔ پاکستان بنا ہی اس لیے کہ تقدس مآب علماء کی پچھّے دار تحریروں اور تقریروں کو ان کے اپنے اقدام وعمل کی ٹھوکروں میں پاش پاش ہوتے دن کی روشنی میں دیکھا گیا۔ پھر حق یہ ہے کہ جو کچھ دیکھا گیا وہی امرِ واقعہ بھی تھا۔ ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ مولانا آزادؒ کی وزارتِ تعلیمی کا سارا زمانہ ایک سناٹا، ایک سکوتِ مسلسل اور ایک جمودِ یاس بن کر گزرا۔ حالانکہ اگر ان کے سارے خطبات ومواعظ اور مقدس شہ پارے ان کے اپنے شعور کی زمین میں جڑیں رکھے ہوئے ہوتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کے دَورِ وزارت میں ایسی بہتیری کتابیں تعلیمی نصاب کا جزو بن جاتیں جن کے مضامین پکار پکار کہتے کہ اے الہلال والبلاغ کے عظیم ہیرو! آپ نے جو خواب اپنی قوم کو عرصہ دراز تک دکھلائے تھے ان کی تعبیر ہم دے رہے ہیں! یہ دیکھئے آپ کے ایک خدا کے مقابلے میں درجنوں دیوتاؤں کا میلا! اور یہ دیکھئے اس میلے میں وہ ہزاروں نونہال ہاتھ جوڑ کر دیوتاؤں کے بھجن گارہے ہیں جنھیں آپ جہادِ حق کا سپاہی بنانے کی باتیں کیا کرتے تھے۔!

ماضی کے بعد حال کی طرف آئیے۔ مولانا حفظ الرحمٰن طاب اللہ سراہ بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے، جو لمبی مدّت تک ایک ایسی گاڑی کھینچتے رہے جس کے پہیّے زمین سے ایک بالشت اُوپر اُٹھے ہوئے تھے۔ ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے حکومتِ الٰہیہ اور اقامتِ دین کی باتیں نہیں کیں، بلکہ صاف صاف وہی کہا جو ایک حقیقت پسند کو کہنا چاہیئے تھا۔ انھوں نے شاعری نہیں کی۔ خواب نہیں دکھلائے۔ وہ عملی آدمی تھے اور اسی لیے انھوں نے جمعیۃ کے تن بے روح میں کسی مصنوعی روح کو داخل کرنے کی فضول کوشش کے عوض یہ پسند کیا کہ اپنی گوناگوں قابلیتوں اور اپنے ذہین ومخلص احباب کی اعانتوں سے اس تن بے روح کو حُنوط کرکے گلنے سڑنے سے بچالے جائیں اور بچالے گئے! ناانصافی ہوگی اگر ان کی خدمات کا اعتراف نہ کیا جائے۔ نیز یہ بھی اعتراف ضروری ہوگا کہ مولانا محمد میاں کی نظافت بھی جمعیۃ کے گرتے ہوئے ڈھانچے کے لیے خاصی مضبوط روک بنی رہی ہے۔

مگر اب نظافت ایک نوخیز ''لیڈر'' کے ہاتھ آئی ہے۔ ایسا لیڈر جو ضرورت سے زیادہ خوبیوں کا مالک ہے۔ اس کے کارناموں کی فہرست اوائل کار ہی میں خاصی لمبی ہوتی جارہی ہے۔

پہلا شاندار کارنامہ جرأت اس کا یہ ہے کہ پیر کی طرف سے خلافت عطا کرنے کی جو رسم اہلِ طریقت میں مدّت سے چلی آرہی تھی اس پر اس نے دن کی روشنی میں خطِ استرداد کھینچا اور مسندِ خلافت پر ٹھیک اس طرح قبضہ کرلیا جس طرح زیرِ زمین سازشوں کے ذریعے تخت اور کرسیاں قبضالی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی

رحمۃ اللہ علیہ کو غریق رحمت فرمائے۔ ان کی رائے میں تو صاحب زادے اسعدؔ میاں پیر بن بیٹھنے کے اہل نہ تھے۔ اسی لیے انہوں نے جیتے جی صاجزادے کو مجاز نہیں بنایا؛ لیکن ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی ایسی ہوا چلی کہ نااہلی اہلیت میں تبدیل ہوگئی اور اہلیت بھی اس شان کی کہ بعض مریدانِ خاص کی تحقیق اور کشف کے مطابق باپ بھی اُن بلندیوں تک نہیں پہنچا تھا جہاں بیٹا پہنچ گیا ہے۔ الہم زد فزد

دوسرا کارنامۂ سیاست اس کا یہ ہے کہ جمعیۃ کے جس تختِ صدارت پر اس کا بہادر، جفاکش اور جہاد پیشہ باپ تشریف فرما رہا تھا اس پر ایک زندہ لاش کو لا کر اس نے سجایا۔ سجایا کیا یوں کہیے داؤ پیچ کی کیلیں اور قبضے ٹھونک کر جمایا اور سادہ لوح عوام کو یہ باور کرانے کی مضحکہ خیز کوشش کی کہ طریقت کی طرح سیاست میں بھی "تبرک" ہی کو تفوق حاصل ہے۔

تیسرا: نہایت ممتاز کارنامۂ دیانت اس کا یہ ہے کہ اس نے ادنیٰ جھجک کے بغیر ایک ایسی ہستی پر خیانت کا الزام ڈنکے کی چوٹ عائد کیا جسے خائن سمجھنے کے لیے بھینس جیسا لحیم شحیم دماغ اور ہاتھی جیسا طویل وعریض قلب درکار تھا۔ یہ ہستی نہ صرف یہ کہ مولانا حفظ الرحمٰنؒ کا دستِ راست رہی ہے بلکہ جمعیۃ نے اسے اپنا ورکنگ صدر بھی بنایا تھا۔

چوتھا کارنامۂ بلاغت اس کا یہ ہے کہ صحافت کو یاوہ اور ہلڑ بازی کا ہم معنیٰ بنانے کے لیے اس نے ایسے قلمکاروں کی ٹیم مرتب کی جو یہ پروا بالکل نہ کریں کہ علم و متانت اور شرم و غیرت کی حدیں کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہوتی ہیں۔

پانچواں کارنامۂ شجاعت اس کا یہ ہے کہ چشمِ یار کی ایک ہی شہ میں اس نے مجلس مشاورت کے اراکین کو فرقہ پرستی کے الزام سے نواز دیا اور دعویٰ اس کا یہ ہے کہ سوائے میرے اس دیس میں جو بھی مسلمان رہنما بستے ہیں وہ فقط گھانس کھاتے اور زہر اُگلتے ہیں۔

کہاں تک شمار کرائیے۔ انا ولا غیری کا کوس پورے زور سے بج رہا ہے۔ انتشار کی ماری قوم کے شریانوں میں اتحاد واُخوت کے لہو کی جو چند بوندیں باقی بچ رہی ہیں انھیں بھی کھینچ لینے کی سعی شدومد سے ہو رہی ہے۔ سنا تو ہے کہ اس بگڑتی ہوئی صورتِ حال کی اصلاح کے لیے جمعیۃ ہی کے کچھ دردمند اور مخلص ارباب جدو جہد کرنے جارہے ہیں۔ ان سطور کو لکھتے وقت اطلاع ملی ہے کہ بھوپال میں کوئی اجلاس ہونے والا ہے۔

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین
پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

(تجلی دیوبند دسمبر ۱۹۶۵ء)

درج بالا مضمون ہم نے دو وجوہات سے یہاں نقل کیا ہے، پہلی وجہ: آپ کو یہ بتانا ہے کہ مولانا وحید الزماں صاحب نے مولوی اسعد مدنی کی جن ریشہ دوانیوں اور بدتمیزیوں کا ذکر اپنے مضمون میں کیا ہے وہ زیادہ تر وہی ہیں جو ۱۹۸۰ء اور اس کے بعد کے زمانے کی ہیں؛ لیکن درج بالا مضمون سے واضح ہوتا ہے کہ ریشہ دوانیوں اور سفاکیت کا یہ دور مولوی اسعد مدنی کے جمعیۃ میں داخل ہوتے ہی شروع ہو گیا تھا۔ اپنے والد صاحب کے بعد جب خود ساختگی سے خلافت کا چولا پہنا گیا تو جمعیۃ پر بھی نظریں جمادی گئی تھیں۔ اور ہم نے جو اپنی اس کتاب میں لکھا ہے اور بار بار لکھا ہے کہ مولوی اسعد مدنی ہوں یا مدنی خاندان کے دیگر افراد، سب کی ذہنیت یہی ہے کہ اپنے مقابل کسی دوسری جماعت یا تنظیم کو کھڑا نہ ہونے دیا جائے۔ اسی لیے ابتداء ہی سے مسلم مجلسِ مشاورت کی مخالفت میں مولوی اسعد مدنی نے ذلالت وعیاری کی آخری حد سے گزرنے میں بھی گریز نہیں کیا۔ جھوٹ، الزام تراشی، بہتان، فریب، ہر حربے کا استعمال کیا گیا، فقط اپنی سیاست چمکانے کے لیے۔ ہمارا ایک ایک لفظ مبنی بر حقائق ہے جس کی تفصیل آپ مولانا وحید الزماں صاحب کے مضمون میں پڑھ چکے ہیں۔ اور ذلالت کا آخری نمونہ آپ آئندہ صفحات میں ملاحظہ کریں گے، جہاں دیوبند میں ہونے والے مشاورت کے جلسے کی تفصیل آپ کے سامنے آئے گی۔ عبد الخالق سہارنپوری صاحب کے مضمون میں بھی انھیں ریشہ دوانیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اب خود فیصلہ کیجیے دار العلوم کی جدید تاریخ لکھنے والے مؤرخ صاحب جس شخصیت کا تذکرہ بے وقعت و بے سود القاب و آداب کے ساتھ کر کے انھیں دار العلوم کا ہیرو ثابت کرنا چاہتے ہیں کیا یہ یا وا گوئی حقیقت سے کوئی مطابقت بھی رکھتی ہے؟ سچائی یہی ہے کہ دار العلوم نے تاریخ شائع نہیں کی ہے؛ بلکہ تاریخ کا قتل کیا ہے۔ بتائیے! کیا کتاب کا نام "تاریخ کے قاتل" ہم نے غلط رکھا ہے؟

دوسری وجہ درج بالا مضمون کو نقل کرنے کی یہ ہے کہ مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں، انھیں کروٹ کروٹ جنت کی راحتیں نصیب ہوں، ان کی تحریر پڑھنے کے بعد ہم بہت دیر تک سوچتے رہے کہ خدا کے اس بندے نے پچاس سال پہلے جو بات کہی ہے وہ آج لفظ بہ لفظ ہم سب کے سامنے ظاہر ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کے آزادی، آزادی والے بے سود نعرے سے ہندوستانی مسلمانوں کو کیا حاصل ہوا۔ کفار و مشرکین کی حکومت میں اہلِ ایمان کے حقوق کی پامالی یقینی امر ہے، یہی ہونا تھا اور یہی ہو رہا ہے۔ آخر کیا سوچ کے پاکستان کی مخالفت کی تھی اور اگر مخالفت کی تھی تو اس کے متبادل کی غرض سے ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کی فکر کرنی چاہیے تھی۔ اب ہم کہاں جائیں؟ کس سے فریاد کریں؟ اُبیلا بیماری کا بہانہ بنا کر معصوم بچوں کو بانجھ اور معذور بنانے کے لیے انجکشن لگائے جا رہے ہیں اور جمعیۃ علماء ہند کے لیڈران قوم کے مصنوعی ہمدرد، ملت خور بزرگ کی ٹولی بالکل خاموش ہے۔ بہر حال! ہم یہاں مولانا عامر عثمانی کی چند سطریں دوبارہ نقل کریں گے۔ حقیقت میں تو یہ تحریر بار بار

پڑھنے کے قابل ہے؛ لیکن ہم یہاں یہ چار سطریں مکرر تحریر کرنے سے خود کو نہیں روک سکتے، پڑھیے اور سوچیے کیا یہی سب نہیں ہو رہا ہے جو پچاس سال پہلے علامہ عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کہہ گئے ہیں۔

> ''یہ تو ظاہر ہے کہ ابنائے وطن حکومتِ الٰہیہ کی تاسیس اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے آزادی نہیں مانگ رہے تھے۔ ان کا مقصود اپنی پسند کی ایک غیر اسلامی حکومت بنانے کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر کیا سن سینتالیس سے پہلے جب پورا ملک مطلوبہ آزادی کا ترانہ گا رہا تھا علمائے جمعیۃ نے کوئی مصرعہ اس میں ایسا بھی شامل کیا تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد وہ کسی ایسی حکومت پر راضی نہ ہوں گے جس میں اسلام کا درجہ بس ایک یتیم کا ہو اور مسلمانوں کی حیثیت ان دریوزہ گروں کی سی ہو جن کے لیل ونہار حقوق کی بھیک مانگنے، ناانصافیوں پر واویلا کرنے، دستور کی دُہائی دینے اور اپنی بے بسی پر ہاتھ پیر پیٹنے میں کٹتے ہیں۔''

آج کا مسلمان ہی نہیں؛ بلکہ ۷۰ سالوں سے اس ملک میں مسلمان اپنے حقوق کی بھیک مانگنے، ناانصافیوں پر واویلا کرنے، دستور کی دُہائی دینے اور اپنی بے بسی پر ہاتھ پیر پیٹنے کے علاوہ کر ہی کیا رہا ہے۔ ملک آزاد کرانے کے لیے جدوجہد کرنے والی جمعیۃ علماء ہند مسلمانوں کے حقوق کے لیے آج تک کوئی تعمیری اور ٹھوس اقدام نہیں کر پائی ہے۔ خیر! آئیے آئندہ صفحات میں مولوی اسعد صاحب کی ریشہ دوانیوں کے بارے میں مزید تفصیل ملاحظہ کریں، اور سوچیں کہ دیوبند جیسی مرکزی اور علمی بستی اس قدر پستی کا شکار ہو چکی ہے کہ اس درجہ سفاک وعیار شخص کو کیسے بے سود و بے وقعت امیر الہند اور قائدِ ملت کے خطاب سے یاد کیا جا رہا ہے۔

جمعیۃ علماء ہند

کی صفوں میں پھیلی ہوئی سنگین کش مکش، تعطّل اور انتشار

اور

اس کے افسوسناک عوامل کا ایک واقعاتی جائزہ

(از: حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی ورکنگ پریسیڈینٹ جمعیۃ علماء ہند)

جمعیۃ علماء ہند کی صفوں میں گزشتہ تین سال سے جو انتشار اور کشمکش جاری ہے اور اس کے محرکات و عوامل جس طرح روز بروز قوی سے قوی تر ہوتے جارہے ہیں، وہ جماعت اور ملّت کا درد رکھنے والے ہر شخص کے لیے انتہائی فکر اور تشویش کا باعث ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اندرونی تفریق اور کشمکش پوری ملّت کے مفاد اور معاملات پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ یہ افسوسناک صورت کیوں رونما ہوئی اور اس کا تسلسل کیوں قائم ہے، یہ ایک نازک اور پیچیدہ سوال ہے عوام و خواص میں اس کے چرچے ہیں اور اپنے اپنے اندازوں کے مطابق مختلف رائیں قائم کی گئی ہیں، اخبارات میں بھی اس موضوع پر برابر رائے زنی ہو رہی ہے اس کے تدارک کے لیے کچھ تدبیریں بھی تجویز کی گئی ہیں۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس تفریق اور تصادم کا مدار چند اشخاص و افراد ہیں اور وجہِ اختلاف ذاتیات کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے شخصی اور ذاتی نوعیت کی بحثیں بھی درمیان میں سامنے آئی ہیں اور اصلاح و تدارک کی تجویزوں میں بھی زیادہ تر یہی پہلو ملحوظ رہا ہے کہ فلاں فلاں اشخاص و افراد کو کس طرح باہم مربوط کیا جائے۔

یہ خیال غلط فہمی اور معاملات سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اختلاف اور کشمکش کا حقیقی پس منظر اور اس کے اسباب و عوامل عام طور سے لوگوں کے علم میں نہیں آسکے یا ناقص اور ناکافی معلومات نے ان کو ایک خیال قائم کر لینے پر مجبور کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ آج جماعت کی صفوں میں جو شدید کشمکش پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی بنیاد محض افراد و اشخاص اور ذاتیات ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ نقطہ ہائے نظر کے براہِ راست تصادم اور کشمکش نے یہ صورت پیدا کی ہے۔ اشخاص و

افراد محض اس کا نشانہ بن گئے ہیں اصل ٹکراؤ افراد کا نہیں۔ اُصول کا اور افکار کا ہے پوری جماعت آج دو حصوں یا کیمپوں میں بٹی ہوئی ہے۔ دونوں کے طریقِ فکر میں کھلا ہوا فرق ہے۔ اصل مسئلے پہ توجہ کے بغیر چند افراد کو جوڑ دینے یا جماعت کے عہدے اور ذمہ داریاں ان میں تقسیم کر دینے سے نقطہ ہائے نظر کی خلیج پٹ نہیں سکتی۔

گزشتہ دو ڈھائی سال میں اخبارات اور عوام کی زبانوں پر یہ تمام چرچے اور قیاس آرائیاں دیکھتے اور سنتے ہوئے بھی میں نے اظہارِ رائے سے پہلوتہی کی اور مسلسل مطالبوں اور فرمائشوں کے باوجود اس کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ لیکن آج واضح طور پر یہ محسوس ہو رہا ہے کہ میری جانب سے مسلسل احتیاط اور تحمل، اور عوام کی حقیقتِ حال سے بے خبری اور ناواقفیت نے اس پوری سرگزشت کو ایک غلط رنگ دے دیا ہے اور عام طور پر یہ سمجھ کر کہ وجہ اختلاف چند اشخاص و افراد ہیں۔ بحث و تنقید کا سلسلہ اس طرح قائم کر دیا گیا ہے جس سے چند اشخاص ہی موضوعِ بحث بن کر رہ گئے ہیں۔ اور حقیقی پس منظر نگاہوں سے پوشیدہ ہو گیا ہے۔

اس نازک مرحلے پر جماعت کے ہمدرد اور خیر خواہوں میں غلط فہمی اور غلط اندازِ فکر کا تسلسل اور بھی زیادہ ابتری اور حقیقت سے دُوری کا باعث ہوگا اور جب تک اصل پس منظر ان کے سامنے نہیں آئے گا۔ اصلاحِ حال اور تدارک مافات کی کوئی موثر تدبیر عمل میں نہیں لائی جاسکے گی اس لیے میں اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں کہ جماعتی زندگی کے اس موڑ پر جبکہ جماعت کی قوتِ فکر و عمل دو گروہوں میں تقسیم ہو کر کاروانِ جماعت کو دو مختلف سمتوں کی طرف کھینچ رہی ہے پوری احتیاط کے ساتھ اُس پس منظر کو واضح کر دوں جس نے جمعیۃ علماء ہند کو ایک غیر منتہی اور المناک تصادم و تفریق کے حوالہ کر دیا ہے اور جس کے مؤثر دفاع اور تدارک کے بغیر جماعت کی صفوں میں استواری اور اس کے افراد میں ہم آہنگی کا دور واپس نہیں لایا جاسکتا۔

ضمیر کے اس احساس اور تقاضہ سے مجبور ہو کر جماعت کی خیر خواہی اور بہبود کے پُرخلوص جذبہ کے ساتھ اپنا یہ بیان جاری کرتے ہوئے میری دلی خواہش ہے کہ جمعیۃ کے تمام رفقاء کار اور ہمدرد احباب، خواہ وقتی طور پر وہ کسی بھی گروپ سے تعلق رکھتے ہوں یا دونوں گروپوں سے بے تعلق ہوں۔ اور خاص طور پر اربابِ فکر و صحافت، میرے اس بیان کو حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھیں گے اور اعتدال کے ساتھ کوئی رائے قائم کر کے جماعت کی فلاح اور بہتری کے لیے خود بھی قدم بڑھائیں اور مجھے بھی اپنے مفید مشوروں سے مستفید ہونے کا موقع دیں۔

جمعیۃ علماء ہند کا حقیقی موقف

''جمعیۃ علماءِ ہند'' ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک دستوری اور جمہوری تنظیم ہے۔ اپنے افکار و اعمال میں اس نے ہمیشہ سنجیدگی، وقار، احتیاط اور دیانت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ نیت کا اخلاص اور دلوں کا ربط و اعتماد

اس کی عملی اور تنظیمی زندگی کی مستحکم بنیاد تھی ملک وملت کی بے لوث خدمت اسکا نصب العین تھا دنیوی جاہ واقتدار، حکام رسی اور بلند پروازی کے شوق سے اس کے خدّام ہمیشہ بے پرواہ اور بے نیاز رہے جماعتوں کی تنظیم وتنسیق کے مروجہ طریقے انتخابات ممبر سازی عہدے اور مناصب اس کے دستوری نظام میں ضرور اپنائے گئے ہیں۔لیکن یہ صرف جماعت کی رسمی تشکیل اور تنظیم کے لیے جمعیۃ کے طریق کار اور روایات میں نہ وہ مقصود ومطلوب کا درجہ رکھتے ہیں نہ ان کی کوئی خاص اہمیت ہے۔

پچھلی تاریخ میں اخلاص وایثار کا جذبہ جمعیۃ کے خادموں اور کارپردازوں پر اس قوت کے ساتھ چھایا رہا کہ من وتو کی بحث سے اس کی روایات ہمیشہ بالاتر رہیں اور کارکنوں کی آپس کی کشمکش اور گروہ بندی کبھی ان کے دماغوں میں راہ نہ پاسکی۔ یہ تھا جمعیۃ علماء کا حقیقی موقف اور کردار جس کو حرز جان بنا کر اس نے ہمیشہ ملک کی بےلوث خدمت کی اور مسلم وغیر مسلم عوام وخواص کی نگاہوں میں اپنا اعتماد اور وقار قائم رکھا۔لیکن یہ بڑا سخت ہی سانحہ ہے کہ جمعیۃ علماء ہند جیسی بابرکت تنظیم بھی اپنی تازہ تاریخ میں اس موقف و کردار سے دُور ہٹتی جارہی ہے اور اس کی صفوں میں کچھ ایسے شگاف پڑ گئے ہیں جنہوں نے اس کی شاندار تاریخ و روایات کو اس کی حالیہ سرگزشت سے بہت دُور کر دیا ہے۔یقیناً جمعیۃ کا موجودہ زوال اور صورتِ حال کی تبدیلی دفعتاً نہیں ہوگئی۔اس میں بڑی حد تک دخل ہے وقت کی تبدیلیوں اور زمانہ کی گردشوں کا۔اس ادارے کے مؤسّس اور پرانے بزرگ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور ہوتے جارہے ہیں۔ان کی یہ قیمتی وراثت نوخیز نسل کے کاندھوں پر منتقل ہو رہی ہے۔یقیناً ہمارے وہ بزرگ غیر معمولی کمالات کے حامل تھے۔نئی نسلوں کو ان کی عملی وفکری بصیرت، بے پناہ ایثار واخلاص اور عدیم المثال عالی ظرفی اور نہایت عمیق ولطیف اعتماد واحترام شاید میسر آئے جیسے جیسے وقت کے قدم آگے بڑھتے جارہے ہیں۔قدرتی طور پر وقت کی تبدیلیاں بھی اثر انداز ہیں اور اس کے صبح وشام بھی بدلتے جارہے ہیں۔

گروہ بندی کا آغاز

جمعیۃ کے یومِ تاسیس سے کم وبیش چالیس برس تک مفتیٔ اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحبؒ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ اور حضرت مولانا احمد سعید صاحب یکے بعد دیگرے جماعت کے سربراہ اور صدر قرار پاتے رہے جمعیۃ علماء ہند کے تنظیمی خاکہ میں ان بزرگوں اور دوسرے تمام ہی اکابر کے معتقدین ومتوسلین شریک رہے اور آج تک ہیں۔

۱۹۵۷ء کے آخر میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحبؒ کا وصال ہوا۔اسی وقت سے حضرت موصوف کے ان متوسلین میں جو جمعیۃ میں شریک تھے اور جن کا زیادہ تر اثر ورسوخ، یوپی، بہار کے کچھ حصے اور آسام وغیرہ میں

کارفرما تھا۔ یہ جذبہ اُبھرا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو جو وابستگی رہی ہے اس کا تقاضہ ہے کہ جماعت کی آئندہ قیادت حضرت ہی کے وابستگان اور ورثاء کے ہاتھوں میں رہنی چاہئے۔ چنانچہ حضرت کے بڑے صاحزادے مولوی اسعد میاں صاحب سلمہٗ کو نشان بنا کر اس جذبۂ عقیدت کو ایک منصوبہ کی شکل دے دی گئی۔ سب سے پہلا قدم یہ اُٹھایا گیا کہ مولوی اسعد میاں صاحب سلمہٗ کو قیادت کی صفوں تک پہنچانے کے لیے صوبہ یوپی کے جمعیۃ کا صدر بنادیا گیا۔ جمعیۃ علماء ہند کے قدیم رفیق اور سینیر رکن حضرت مولانا سید محمد شاہد فاخری صاحب کو ہٹا کر ان کی جگہ اور ان کے مقابلہ میں اسعد میاں صاحب کو جو اس وقت بہت ہی نوعمر، ناتجربہ کار اور جمعیۃ کی بساط پر نووارد تھے، یوپی جیسے صوبہ میں جو سربرآوردہ علماء امت کا مرکز ہے جمعیۃ علماء کا صدر بنادینا، دوسرے ارکانِ جمعیۃ کے ساتھ خود مجاہدِ ملّت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحبؒ کو بھی انتہا درجہ ناگوار ہوا اور انہوں نے اس ڈرامائی سرگزشت پر اپنی دلی اذیت کا برملا اظہار فرمایا۔ ادھر تھوڑے ہی دنوں بعد مخصوص حلقہ کی طرف سے یہ اصرار بھی شروع ہوا کہ اسعد میاں سلّمہٗ کو ساتھ ہی مرکزی جمعیۃ کا ناظم بھی بنادیا جائے۔ مجاہدِ ملّت کے لیے یہ بے محل اصرار کسی طرح بھی قابل قبول نہ تھا۔ وہ منصوبہ کی پیشقدمی اور بڑھتے ہوئے قدموں کے نشانہ کو سمجھ گئے۔ محض جماعت کی سالمیت اور آبرو کی خاطر انہوں نے یہ تلخ گھونٹ بھی حلق سے اُتارلیا۔ مگر ان کے قلب و دماغ پر اس صدمہ کی گرفت اتنی شدید ہوئی اور جماعت میں اُبھرتی ہوئی ایک خطرناک تحریک اور اندھی تقلید کے عواقب ونتائج کا غم ان پر اس قدر اثرانداز ہوا کہ اسی وقت سے ان کی صحت کو گھن لگنے لگا اور بالآخر دوسال کے اندر اندر وہ دنیا سے رخصت ہوگئے۔ رحمہ اللہ

غم صرف اس کا تھا کہ جمعیۃ اور بالخصوص مرکزی جمعیۃ کے ذمہ داروں کا چالیس پینتالیس سال سے جو اعلیٰ معیار قائم ہو چکا تھا اور جماعت پر یکجہتی اور ہم آہنگی جس طرح سایہ فگن تھی اس برق رفتار منصوبہ اور تیزگام تحریک نے اس کی بنیادیں متزلزل کر دیں۔ جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔

آنے والے دنوں میں پس پردہ گروہ بندی نے آہستہ آہستہ چہرے سے نقاب اُتارنا شروع کیا اور جب یہ چہرہ زیادہ بےنقاب ہونے لگا تو جماعت کے دوسرے حلقوں میں تشویش کی لہر دوڑی اور بعض متوسلین شیخ کے اس خطرناک رجحان اور اندھے منصوبہ کی مزاحمت شروع ہوگئی۔ جیسا کہ معلوم ہے جمعیۃ علماء ہند، مسلم عوام کی ایک جمہوری تنظیم ہے۔ اس کا ایک دستور اور مخصوص طریق کار ہے اس کی قیادت ملّت کے انتہائی محترم ومعتمد تجربہ کار اور سرد وگرم چشیدہ بزرگوں کے لیے زیبا ہے، یہ رجحان اور یہ کوشش کہ حضرت شیخ کے بعد اس کی قیادت و سربراہی خانوادہ شیخ ہی میں محدود کردی جائے یا اس کو کسی ایک بزرگ کے متوسلین کا ورثہ قرار دیا جائے، جمعیۃ کا دستور اس کی شان جمہوریت، اس کے موقف اور روایات کے قطعی طور پر منافی ہے۔ خود حضرت شیخ بھی آج حیات ہوتے تو اپنے ورثاء اور متوسلین کے اس رجحان سے بیزار ہوتے اور ایک لمحہ کے لیے بھی اس کو بروئے کار نہ آنے

دیتے۔ جمعیۃ کو اشخاص و افراد سے بلند و بالا ہو کر اپنے دستور اپنے نصب العین اور اپنی اعلیٰ روایات کا پابند ہونا چاہیئے، اس کو ایک مخصوص حلقہ کا ہی نہیں بلکہ وحدت کلمہ کی بنیاد پر مسلم عوام کا اعتماد حاصل کرنا چاہیئے۔ یہ جذبات تھے جو اس کے عام کارکنوں میں اُبھرے اور پہلے گروہ کے منصوبوں کے مقابلہ میں ایک تحریک بن کر ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئے۔ اس طرح مقاومت و مدافعت کا یہ جذبہ جمعیۃ کے حلقہ میں پہلے گروہ کی منصوبہ بندیوں نے پیدا کیا اور دہلی، راجستھان، مدھیہ پردیش، گجرات، مہاراشٹر یہاں تک کہ یوپی، بہار، بنگال کے مخلص کارکن بلکہ خود حضرت شیخ کے بیدار دماغ اور باشعور متوسلین بھی اس صف میں کھڑے ہو گئے۔

اس طرح دو مختلف نقطہ ہائے نظر اور طریق فکر جماعت میں پیدا ہوئے۔ دونوں اپنی جگہ ایمانداری سے ایک رائے رکھتے ہیں۔ جمعیۃ کی روایات اور مزاج کے لیے ان طریقوں میں کونسا طریقہ بہتر اور مفید ہے۔ میں اس مرحلے پر اس کے متعلق کچھ عرض نہیں کروں گا۔

۱۹۶۳ء کا صدارتی انتخاب

اسی اثناء میں مجاہدِ ملّت کا وصال ہو گیا۔ جمعیۃ کے سالانہ انتخاب کا وقت بھی آپہنچا تھا۔ پہلا گروہ اپنے منصوبہ کی تکمیل کے لیے زیادہ مضطرب اور بے چین تھا اور اس کی منزلِ مقصود یہ تھی کہ سردست نظامت عمومی کا کلیدی عہدہ اسعد میاں سلّمہٗ کے سپرد ہو اور اس کا محفوظ کامیاب ترین راستہ صرف یہ تھا کہ مرکزی جمعیۃ کا صدر اپنی مجبوریوں اور معذوریوں کے باوجود مولانا فخر الدین صاحب کو بنایا جائے۔ دوسری طرف یہ خیال تھا کہ اسعد میاں ابھی اپنی نوعمری اور قلتِ تجربہ کے باعث نظامت عمومی جیسے اہم اور ذمہ دار منصب کا بار خوش اسلوبی سے اُٹھا نہیں سکیں گے مجاہدِ ملت کے بعد جمعیۃ کے سینیر تجربہ کار اور مزاج شناس بزرگ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب ہی ناظم عمومی رہنے چاہئیں۔ ان کو ہٹا کر اس منصب پر اسعد میاں کو لانا جماعت کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی اور اس کی عظیم روایات کو اس اقدام سے ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔

چنانچہ پہلے گروہ نے حضرت مولانا فخر الدین صاحب کو مرکزی صدر منتخب کرانے کے لیے اپنی تمام قوتِ عمل صرف کر دی اس مہم کو سر کرنے کے لیے جو حربے استعمال کیے گئے ہیں ان کے ذکر سے اس بیان کو زیادہ تلخ بنانا نہیں چاہتا۔ اور دوسرے گروہ نے مرکزی صدارت کے لیے میرا نام اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب حضرت مولانا سید شاہد فاخری صاحب وغیرہ کے نام تجویز کیے۔

یہاں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ یومِ تاسیس سے آج تک جمعیۃ کے ساتھ اپنی مسلسل وابستگی بلکہ شیفتگی رکھتے ہوئے بھی اپنے مزاج، حالات، مشاغل اور رفقائے کار پر بھرپور اعتماد کے پیش نظر میں نے خود کو کبھی بھی

جمعیۃ کے کسی عہدہ کے لیے آمادہ نہیں پایا۔ ایسے وقت بھی آئے ہیں جبکہ میرے لیے کسی بھی عہدہ کو حاصل کرنے کی راہیں بہت آسان تھیں۔ میں نے اس وقت بھی ایک لمحہ کے لیے اپنے اندر کوئی آمادگی نہیں پائی۔ آج میرے متعلق یہ پروپیگنڈہ کرنا کہ مجھے عہدۂ صدارت کی کوئی خاص طلب تھی یا میں نے جمعیۃ کا دوسرا بلاک بنایا ہے۔ حقیقت سے کتنا دُور اور واقعات کی کتنی غلط تعبیر ہے۔ بہرکیف میں نے اس موقع پر بھی معذرت کی اور مرکزی دفتر سے برملا اصرار کیا کہ میرا نام صدارت کے اُمیدواروں میں نہ رکھا جائے لیکن یہ معذرت بروقت قبول نہ ہوئی اور مرکزی صدارت کے لیے ایک طرف سے حضرت مولانا فخرالدین صاحب اور دوسری طرف سے مجھے منتخب کردیا گیا۔ اس انتخابی معرکے نے کافی شدت اور تلخی اختیار کرلی تھی اور اس کی پشت پر اقدام و مدافعت کے وہی جذبات کارفرما تھے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

اجلاسِ میرٹھ

اسی تلخ اور مکدّر فضا میں میرٹھ کا اجلاس منعقد ہوا جس کی بھیانک سرگزشت نے جماعت کی نیک نامی میں نہیں، رُسوائی میں اضافہ کیا۔

کافی رسہ کشی کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ صدارت کی ذمہ داری رسماً مولانا فخرالدین صاحب کے اور عملاً میرے سپرد رہے۔ پہلے گروہ نے یہ فیصلہ بھی اس شرط کے ساتھ قبول کیا کہ ''ناظم عمومی'' کی نامزدگی مولانا فخرالدین صاحب کے ہاتھوں ہوگی۔ ورکنگ کمیٹی کی تشکیل کے لیے مرکزی کونسل نے صاف طور پر طے تو یہ کیا کہ مولانا فخرالدین صاحب میرے مشورے سے کریں گے، مگر اس کی صریح خلاف ورزی بھی میرٹھ سے واپس ہونے سے پہلے ہی عمل میں آگئی اور مجھ سے مشورہ کیے بغیر ورکنگ کمیٹی کے ناموں کا اعلان انتہائی عجلت کے ساتھ کردیا گیا اور چُن چُن کر مخصوص نام اس میں رکھے گئے۔

علماء کی صف میں معاہدہ کی صریح خلاف ورزی اور جماعتی زندگی میں مرکزی کونسل کے فیصلہ سے انحراف کا یہ واقعہ میرے لیے ایک اعجوبہ تھا۔ مگر دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ دعوت نامہ کے مطابق اجلاس میرٹھ ۷/۸/۹ جون کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ مگر پہلے گروہ کے بعض اہم نشانے ان تین دنوں میں پورے نہ ہوسکے تو ۱۰ جون کو (چوتھے روز) جبکہ بہت سے ارکان واپس جاچکے تھے ایک اضافی نشست کرکے بے تحاشا اور عجیب جارحانہ انداز میں باقی ماندہ نشانوں کو پورا کیا گیا۔ ایک خاص سازش کے تحت اس اضافی نشست کا اعلان خود مجھ سے اس انداز میں کرایا گیا کہ کچھ معمولی دفتری اُمور باقی رہ گئے ہیں ان کو مکمل کرنا ہے مگر عملاً ''یہ معمولی دفتری اُمور'' نہیں، نہایت سنگین معاملات تھے۔ چنانچہ اضافی نشست میں سب سے پہلے دستور کی دفعہ ۲۷ کو ختم کرنے کا اعلان کیا گیا۔ جس پر

مدھیہ پردیش کی چاروں صوبائی جمعیتوں، راجستھان، مہاراشٹر اور دوسرے صوبوں کے ارکان کو شدید اعتراض تھا۔ جب ان کی ایک نہ سنی گئی تو سب احتجاجاً واک آؤٹ کر گئے میں خود مولانا شاہد فاخری صاحب رکن ورکنگ کمیٹی، اس وقت جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری مولانا سید محمد میاں صاحب واک آؤٹ کرنے میں شامل تھے۔

یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ جمعیۃ کے معمول اور طریق کار میں اتحاد اور یکجہتی کی حقیقی روح یہ تھی کہ اس کے مسائل ہمیشہ اتفاق رائے سے یا اختلافِ رائے کی صورت میں باہم افہام وتفہیم رواداری اور اعتماد کے ساتھ ایک دوسرے کو مطمئن کر کے طے کئے جاتے تھے، رسمی طور پر ہاتھ اُٹھوا کر عددی اکثریت کے بل پر اہم معاملات کو طے کرنے اور دوسروں پر لادنے کی کوشش سے جمعیۃ کی روایات نا آشنا رہی ہے، مگر میرٹھ میں ۱۰؍جون کو یہ المیہ وقوع میں آیا اور اس جارحانہ طریق عمل نے جماعت کی سالمیت اور ہم آہنگی کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔

دفعہ ۲۷ کا قضیہ

اس کے سوا کچھ نہیں کہ دسمبر ۱۹۶۱ء میں اجلاس اُجین کے موقع پر جمعیۃ کی مرکزی کونسل نے تمام حالات اور جماعتی مصلحتوں کا جائزہ لے کر مدھیہ پردیش کو چار صوبائی جمعیتوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ یہ فیصلہ خود مولانا فخرالدین صاحب کی صدارت میں ہوا اور وہ سب حضرات جو آج دفعہ ۲۷؍ کے تصور سے بھی چیں بجبیں ہیں اس فیصلہ میں شریک تھے غضب بس یہ ہو گیا کہ اس مرتبہ صدارتی انتخاب میں ان چاروں صوبائی جمعیتوں نے میرے حق میں رائے دے دی بس یہی گناہِ عظیم اس سے سرزد ہوا ہے جس کا عتاب مسلسل ان صوبائی جمعیتوں پر قہر بن کر ٹوٹ رہا ہے۔

دوسرے فریق کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ اگر ان چار صوبوں کو ختم کرنا ہی ہے تو جماعت کے حق میں مفید طریق کار اختیار کیا جائے اور اتنی بیتابی نہ دکھائی جائے جس سے زور زبردستی اور انتقام کی بُو آتی ہو۔ لیکن

نہ صبر در دلِ عاشق نہ آب در غربال

(ان واقعات سے اندازہ فرماتے رہیئے کہ جمعیۃ میں گروہ بندی کی بنیاد کیونکر پڑی اور کس طرح اس کو دن بدن توانائی حاصل ہوتی گئی)

معاہدہ ۲۳؍جون ۱۹۶۳ء

بہر حال فریق اوّل کی یہ ضد بازی اور جارحانہ کارروائیاں میرے اور جماعت کے ایک بڑے طبقہ کے لیے قابل تسلیم نہ تھیں۔ مرکزی کونسل نے صدارت کے فرائض دو صدروں میں تقسیم کر کے جماعت میں وحدت ویکجہتی قائم رکھنے کی جو کوشش کی تھی ان اقدامات نے اس کی دھجیاں بکھیر دیں دونوں گروہوں کی کشمکش بڑھی اور صورتِ حال بہتری کی بجائے بدتری کی طرف جانے لگی تو مخدوم ومحترم حافظ محمد ابراہیم صاحب (حال گورنر پنجاب) اور

جناب حیات اللہ انصاری صاحب چیف ایڈیٹر قومی آواز، درمیان میں آئے اور حالات کو سدھارنے کی ایک کوشش فرمائی۔ ۲۳ر جون ۶۳ء یعنی اجلاسِ میرٹھ کے دو ہفتہ بعد دہلی میں ان حضرات نے مجھ سے اور اسعد میاں سے گفتگو کرکے ایک معاہدہ ترتیب دیا جس کی رو سے ورکنگ کمیٹی میں ناموں کی ردو بدل کی گئی اور ساتھ ہی طے کیا گیا کہ ۱۰ر جون کی اضافی ومتنازعہ کارروائی بشمول خاتمہ دفعہ ۲۷ عملاً کالعدم رہے گی۔ اس معاہدہ کو دونوں نے بخوشی منظور کیا اور دستخط بھی کردیئے۔

اس معاہدہ کے پہلے جز پر تو فوراً عمل درامد ہوگیا اور ورکنگ کمیٹی میں جزوی تبدیلیاں کردی گئیں۔ لیکن دفعہ ۲۷ر کے معاملہ میں جو معاہدہ کی جان تھی بعد کو اسعد میاں کی جانب سے عجیب وغریب موشگافیاں شروع کردی گئیں جبکہ صاف بات یہ تھی کہ اگر دفعہ ۲۷ر کے مسئلہ پر سمجھوتہ کرنا اسعد میاں کو منظور نہ تھا یا ان کے بس کی بات نہ تھی تو اس وقت معاہدہ پر دستخط کرنے کے بجائے صفائی سے انکار کردیتے۔ معاہدہ کرلینے کے بعد اس کے صریح تقاضہ سے گریز انحراف اور مسلسل خلاف ورزی، کھلا ہوا عذر ہے۔ جو جمعیۃ علماء کی زندگی میں ناقابل برداشت ہے اور اسی لیے آج مدھیہ پردیش کی چاروں صوبائی جمعیتیں مرکز کے قبضہ گیر گروہ کے طرزِ عمل سے انتہائی برافروختہ ہیں اور اس کو اپنے آئینی حقوق میں ناجائز مداخلت قرار دے رہی ہیں۔ دوسری طرف قبضہ گیری گروہ کی جانب سے ضد اور انتقام کی یہ شدت ہے کہ نہ صرف آج بلکہ بارہ برس سے مدھیہ پردیش میں جمعیۃ کے وجود ہی کا انکار کیا جارہا ہے۔ اس جوش میں یہ بھی یاد نہ رہا کہ خود اجلاس میرٹھ میں مدھیہ پردیش کے چاروں صوبوں سے اراکین مرکزی کو شریک اجلاس بھی کیا گیا تھا اور اس سے قبل جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ کا سب سے عظیم اجلاس اُجین ۶۱ء (زیرِ صدارت مولانا فخرالدین صاحب) رائے پور کانفرنس (زیرِ صدارت سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب) اور جبلپور، ساگر، بھوپال کا وہ تمام ریلیف ورک جو جمعیۃ کی تاریخ کا عظیم کارنامہ ہے وغیرہ وغیرہ سب اسی مدھیہ پردیش میں ہوئے تھے۔ جہاں بارہ سال سے جمعیۃ کے وجود ہی کا انکار کردیا گیا ہے یا للعجب!

بہر حال تمام تدبیروں میں ناکامی کے بعد جب موجودہ ٹرم ممبر سازی اور انتخابات ہوئے تو ان کو نظام جمعیۃ کے دائرے میں نظر انداز کرنے اور مرسلہ رقوم کوٹہ (چندہ ممبر سازی) واپس کردینے سے بھی دریغ نہ کیا گیا۔ مسلسل انتقام اور ضد کی یہ انتہا اگر اپنا رنگ لائے اور دوسروں کو مشتعل کرے اور نتیجہ میں خود جماعت کی بدنامی اور بربادی ہو تو آخر اس کی ذمہ داری کس پر ہے۔

مرکزی دفتر کی سرگرمیاں

اجلاس میرٹھ میں صدارت کا فیصلہ ہوجانے کے بعد جب مرکزی نظامت کے تعین کا وقت آیا تو ورکنگ کمیٹی

کے اجلاس (جولائی ۱۹۶۳ء) میں نہ صرف میں نے بلکہ محترم حافظ ابراہیم صاحب، جنرل شاہنواز صاحب مولانا شاہد فاخری صاحب اور دوسرے اراکین نے اصرار کیا کہ نظامت عمومی کے عہدے پر حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب برقرار رکھے جائیں۔ ہاں مددگار ناظم کے طور پر اسعد میاں کو بھی شریک کیا جائے۔ لیکن مولانا فخر الدین صاحب نے مشورہ کے بعد اسعد میاں کو ناظمِ عمومی بنا ہی دیا۔ مولانا سید محمد میاں صاحب معذرت فرماتے رہے لیکن ایسے نازک موقعوں پر اس طرح کی معذرتوں کا مطلب سمجھنا دشوار نہیں ہوتا۔ آخر جمعیۃ ٹرسٹ کی سکریٹری شپ سے دس ماہ تک بے تعلق رکھنے کے بعد اگر ان کو دوبارہ یہ منصب تفویض کیا جاسکتا ہے تو یقیناً جماعتی وقار اور مصالح کی خاطر اس وقت بھی ان کو نظامتِ عمومی کے لیے آمادہ کیا جاسکتا تھا۔

اُس وقت بھی اور آج بھی میں اپنی اس رائے سے دستبردار نہیں ہوسکتا کہ جمعیۃ کی نظامت علیا کا اہم منصب مولانا محمد میاں صاحب سے لے کر اسعد میاں کے سپرد کردینا جماعت کے حق میں کسی طرح مفید اور موزوں نہیں تھا۔ اسعد میاں سے خدانخواستہ ہرگز کوئی ذاتی اختلاف نہیں میرے لیے وہ میرے عزیز بیٹے کے برابر ہیں۔ لیکن ان کی نوعمری، ناتجربہ کاری اور جماعت کے مزاج و روایات سے ناواقفیت ابھی اس کی متحمل نہیں ہے کہ مولانا سید محمد میاں صاحب پر ان کو ترجیح دی جائے۔

اپنی قطعی رائے کے باوجود جب اسعد میاں ناظمِ عمومی بنا دیے گئے تو پھر جماعتی نظم اور فیصلے کا احترام میرے لیے ضروری تھا۔ میں نے ان سے صفائی اور صدق دلی سے کہا ''میری دلی خواہش ہے کہ ہم اور آپ مل کر پوری یکجہتی کے ساتھ جماعت کی خدمت انجام دیں۔ میرا پورا تعاون آپ کے ساتھ ہو اور آپ میرے لیے وجہ تقویت اور قوت عمل ہوں۔ آپ جوان ہیں۔ جوان صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ جدوجہد سے تھکنے والے نہیں۔ آپ اپنی ذمہ داری کو سنبھالیں اور مجھ سے میرے مناسب کام لیں'' لیکن آج بہت ہی افسوس کے ساتھ یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ ان کی افتادِ مزاج، ان کی خودرائی اور خودپسندی اور ان کے طریق فکر و عمل کا مجھے کوئی خوشگوار تعاون اور تجربہ اس پوری مدت میں حاصل نہ ہوسکا۔ وہ ہر کام صرف اپنی رائے سے کرنا چاہتے ہیں، نہ ان کو عملی صدر کی ضرورت ہے نہ جرأت مند اور بیدار مجلس عاملہ کی، جماعت نے ورکنگ صدر بنا کر صدارت کی عملی ذمہ داریاں میرے سپرد کی تھیں۔ اس کے باوجود انھوں نے اس فیصلہ کو کوئی اہمیت نہ دی (دہلی موجود ہوتے ہوئے) کسی اہم سے اہم جماعتی معاملہ میں بھی مجھ سے مشورہ اور تعاون کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ جمعیۃ علماء، الجمعیۃ، الجمعیۃ بکڈپو کے دفاتر میں انقلابی اور فوجی قسم کے ردوبدل کیے گئے اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کبھی کوئی مشورہ بھی دیا گیا تو اس کو بے تامل نظرانداز کردیا گیا۔ دو سال کی اس مدت میں اس کی بہت سی مثالیں سامنے آئیں، جن کا تعلق فسادزدہ علاقوں کے دوروں سے بھی اور ریلیف فنڈ اور اس کے حسابات سے بھی ہے۔

چند ہی ماہ کے بعد کلکتہ، جمشید پور، رڑکیلا وغیرہ میں ریلیف ورک شروع ہوا تو میں نے ہر چند چاہا کہ وہ اس جماعتی مہم میں کوئی تفریق و امتیاز نہ برتیں؛ لیکن اس وسیع اور اہم جماعتی خدمت کا دائرہ بھی انھوں نے اپنے مخصوص رفقاء تک محدود رکھا۔ جن میں بڑی تعداد ناتجربہ کار مدارس کے طلباء و مدرسین کی تھی۔ نتیجہ یہ کہ نہ ریلیف ورک کی کوئی منظم شکل بن سکی نہ اس کی تفصیلات اور حسابات وکتاب سے عوام اور اراکین جمعیۃ کو مطلع کیا گیا اور نہ ان افواہوں کی تردید کی جاسکی جو اس سلسلہ میں دُور دُور تک پھیلیں اور جماعتی اعتماد پر اثر انداز ہوئیں۔

نہ صرف فنڈ کی گرانمایہ رقوم، بلکہ خود جماعتی فنڈ کا حساب وکتاب بھی مرکزی دفتر کے خفیہ خانوں میں محصور ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کے آمد و صرف کے سالانہ گوشوارے باقاعدہ آڈٹ کرا کے شائع کیے جاتے تھے۔ اب دفتر نے اس رسم قدیم کو بھی بالائے طاق رکھ دیا ہے۔

اجلاسِ میرٹھ کی متفقہ قرارداد کے مطابق میں نے جماعت کے نہایت مخلص اور فداکار و تجربہ کار رفیق مولانا مسعود احمد صاحب صدیقی کو بطور ناظم جمعیۃ علماء ہند نامزد کیا یہ وہی مولانا مسعود احمد صدیقی ہیں جن کی انتظامی قابلیت اور جمعیۃ سے والہانہ شغف کا ناقابل فراموش مظاہرہ ''جمعیۃ علماء ہند کے تاریخی اجلاس اُجین'' کی شکل میں عوام وخواص کے مشاہدہ میں آچکا ہے۔ لیکن ان کے ساتھ شروع دن سے اس قدر بے اعتنائی اور عدمِ تعاون کا سلوک کیا گیا کہ دفتر میں ان کا آنا اور بیٹھنا بھی گوارا نہ ہوسکا۔ ان کے لیے دفتر کی اسٹیشنری تک کے استعمال پر سخت پابندیاں عائد کردی گئیں۔ ان کی ڈاک کو سنسر کیا گیا کہ ان کی غیرت اس کو متحمل نہ ہوسکی اور مجبور ہو کر اُجین واپس چلے گئے۔

دہلی کی ایک قدیم وتاریخی مسجد عبدالنبی جو بڑی جدوجہد کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں محکمہ آثارِ قدیمہ سے بحق جمعیۃ واگزار کرائی گئی تھی۔ اس کی تعمیر و بحالی کے لیے ایک باقاعدہ کمیٹی کام کر رہی تھی، اس کمیٹی سے رجوع کیے بغیر، نہایت خودرائی کے ساتھ جمعیۃ علماء کا دفتر اس مسجد میں منتقل کر دیا گیا۔ آج بھی جمعیۃ کے دفتر قیام گاہ بلکہ انگریزی اخبار تک کی کاروباری سرگرمیاں اس مسجد میں سرانجام دی جارہی ہیں۔ مسجد کے اس غیر محتاط استعمال پر غیر مسلم اخبارات میں بھی چرچے ہو چکے ہیں اور جمعیۃ کو موردِ الزام قرار دیا جاچکا ہے۔

جمہوری کنونشن کا ایک بے محل اور بے سود اقدام جمعیۃ کے نام پر کیا گیا۔ جس کی تجاویز کے سربند لفافے نہ جانے کہاں سے اُترتے تھے اور سینہ بسینہ ہی گھومتے رہے۔ جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی تک کو تجاویز میں دخل دینے کا موقع نہ دیا گیا۔ اس کنونشن کے پُرتکلف اور ٹھاٹھ دار انتظامات پر ہزاروں روپیہ غریب مسلمانوں کی جیب سے صرف ہوا اور وہ بروقت حاضر بھی ہوگئے۔ مگر ایک ہزار ڈھائی سو غیر مسلم مدعوین میں سے سو پچاس نے بھی مڑ کر نہ دیکھا اور زحمتِ سفر گوارا نہ فرمائی۔ پھر اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو مرار جی ڈیسائی کی زہر آلود تقریر اور خود اُلٹا

چور بننے کے سوا کیا حاصل ہوا اور ان کا کونسا مسئلہ حل ہوا۔ کنونشن نے ایک عدد سالیڈ یریٹی کونسل کو ضرور جنم دیا اور الجمعیۃ میں اس کی پبلسٹی بھی خوب خوب کی گئی؛ لیکن گورکھپور، گودھرا، پونہ اور اودے پور کے فسادات ہوں یا مسلم یونیورسٹی کا صبر آزما حادثہ یہ سالیڈیریٹی کونسل کسی بھی معاملہ میں کیا کر سکی؟ ناظرین کرام خود فیصلہ کریں، سیاسی اور دنیادار جماعتیں اس قسم کے اقدامات کر کے اگر چند اشخاص و افراد کی شخصی نمائش اور سربلندی کا سامان کرتی ہوں تو کریں مگر جمعیۃ علماء کا نام اور غریب مسلمانوں کا پسینہ ایسے منصوبوں پر صرف ہو تو کیا ہی افسوس کا مقام ہے۔

اندرونِ ملک اس کنونشن کے بعد ایک عالمی اسلامی کانفرنس ہندوستان میں بلانے کا منصوبہ جس کا اندھا دُھند اعلان جمعیۃ کی طرف سے کر دیا گیا۔ آخر اپنا کیا پس منظر رکھتا ہے۔ اتنے بڑے اقدام کے لیے ملک کے مسلم سربراہوں سے یا خود جمعیۃ کے رفقاء کار، مجلسِ منتظمہ، صوبائی شاخوں اور ذمہ داروں سے کوئی مشورہ بھی لیا گیا۔

ایک طرف تو فکری منصوبوں کی یہ بے محل بلند پروازیاں ہیں اور دوسری طرف خود جماعتی تنظیم کی خستہ حالی تفریق اور تعطل ہے جو حد سے گزرتا جا رہا ہے۔ دو سال میں ایک بار بھی مجلسِ منتظمہ کا نہ اجلاس بلایا گیا۔ صوبائی شاخوں سے سوائے مرکزی صدارت پر ووٹ لینے کے کوئی کام نہ لیا گیا۔ عوامی خدمات اور عوام سے جمعیۃ کا رشتہ منقطع ہوتا جا رہا ہے۔ ہنگامی اور وقتی مشغلوں کے علاوہ کسی مستقل مفید تعمیری اور اصلاحی پروگرام اور خدمت سے جماعت کا دامن خالی ہو چکا ہے۔ دینی تعلیمی فہم جواب سے دو سال پہلے تک کسی درجہ میں باقی تھی بالائے طاق رکھ دی گئی اور دینی مکاتب کا سلسلہ موقوف کر دیا گیا۔ نہ معلوم دینی تعلیمی فنڈ کے لیے کونسا دوسرا مصرف ایجاد کیا گیا۔

صوبوں سے لے کر مرکزی سطح تک جماعت کے بیسیوں دیرینہ اور سرکردہ مخلصین دل برداشتہ اور یکسو ہو چکے ہیں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مستعفی ہو گئے، مولانا سید محمد میاں صاحب گوشۂ گمنامی میں ہیں مفتی محمود احمد صاحب صدیقی شیخ الحدیث حضرت علامہ احمد اللہ صاحب راندیری وغیرہ کی یکسوئی بھی جمعیۃ کے لیے ایک سانحہ ہے۔ مختلف صوبوں میں وہ تمام باضابطہ منتخب شدہ اور دستوری شاخیں اور وہ قدیم کارکن جنھوں نے اپنے خون پسینہ سے جماعت کی شاندار تاریخ مرتب کی ہے۔ مرکزی نظامت کی انتقامی پالیسیوں کی بھینٹ ہو رہے ہیں۔ بنگال ہو یا گجرات، پنجاب ہو یا مدھیہ پردیش، آندھرا ہو یا میسور ہر جگہ دستوری اور قدیم جماعتوں کو نظر انداز کر کے حسبِ منشاء مخصوص افراد تک جماعتی نظام کو محدود کر دیا گیا ہے اور جہاں تہاں انتخابی مقاصد کے لیے متوازی جمعیتوں کے ڈھانچے کھڑے کر کے جماعت کی حقیقی تنظیم اور سالمیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا گیا، جن کی حقیقت حضرت مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی، شیخ الحدیث حضرت علامہ احمد اللہ صاحب راندیری اور دوسرے حضرات بے نقاب کر چکے ہیں۔ اس فرضی اور کاغذی نظام سے وقتی طور پر مرکزی صدارت کے لیے ووٹ تو ضرور لیا جا سکتا ہے لیکن کیا جمعیۃ کی تنظیم اس طرح پنپ سکتی، مسلمانوں کا اعتماد حاصل کر سکتی، اور ان کے کسی کام آ سکتی ہے۔

کیا حالیہ صوبائی اور مرکزی انتخابات میں مرکزی ناظموں کی جانبدارانہ مداخلت اور دستوری جمعیۃ کے تقاضوں کو پامال کرتے ہوئے یکطرفہ فیصلے، جماعت کے جمہوری نظام پر اپنی منشاء کو زبردستی لادنے کی کوشش نہیں ہے جس پر بنگال سے لے کر گجرات اور آندھرا تک جماعت کے مخلص رفقاء سرکردہ علماء اور اراکین میں آج ایک کہرام بپا ہے اور جس کے لیے میں نے اجلاس ورکنگ کمیٹی (۱۸ر جولائی ۶۵ء) کی پہلی نشست میں ایک فریق کی طرف سے یہ مطالبہ کیا کہ حالیہ انتخابات کی تمام سرگزشت اور ریکارڈ ایک غیر جانبدار ٹریبونل کے حوالہ کر کے اس کے فیصلے کا انتظار کیا جائے تو دوسری نشست میں میرے پہنچنے کے قبل ہی ڈرامائی طور پر تمام نتائج کو صحیح قرار دے کر آناً فاناً اجلاس کے خاتمہ کا اعلان کر دیا گیا اور ایک معقول اور اُصولی مطالبہ سے گریز کرتے ہوئے قبل از وقت انتخابات کا آخری فتویٰ شائع کر دیا گیا۔

اخبار الجمعیۃ جو پوری جماعت بلکہ ملت کی امانت ہے اس پر آہنی کنٹرول کی گرفت اتنی شدید ہے کہ وہ ایک گروہ کا جنگی منشور بن کر رہ گیا ہے۔ دوسرے فریق کے نقطۂ نظر یا جماعتی سرگرمیوں کی اشاعت کے لیے اس کے دروازے پوری قوت کے ساتھ بند کر دیے گئے ہیں اور اس معاملہ میں انتہائی تعصب اور تنگدلی کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔ مجبوراً دوسرے فریق کو دوسرے اخبارات ونشریات کا سہارا لینا پڑتا ہے جیسا کہ محترم مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی پانی پتی اپنے مکتوب میں واضح کر چکے ہیں۔

کیا غضب ہے کہ آج جمعیۃ کے ان خدّام اور فداکاروں کو جنھوں نے اپنی عمریں جمعیۃ کے نام پر قربان کر دیں جنھوں نے بے شمار صعوبتیں برداشت کر کے ملک کے چپہ چپہ پر جمعیۃ کے چراغ روشن کیے اور جمعیۃ علماء کو صحیح معنیٰ میں ایک زندہ اور ملک گیر تنظیم بنایا۔ آج ان کو الجمعیۃ کے صفحات میں ''برخود غلط'' شر پسند، اور ''فتنہ انگیز'' خطابات سے پکارا جا رہا ہے۔ محض اس لیے کہ وہ اشخاص و افراد کی رضا جوئی سے اپنے ضمیر و دیانت کا سودا نہیں کر سکتے۔ کیا دنیا کی کسی جمہوری اور دستوری تنظیم میں تعصب اور تنگ نظری کی ایسی بھیانک مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ زیادہ افسوس اس کا ہے کہ یہ سب کچھ حضرت فخر المحدثین کی نگاہوں کے سامنے اور اُن کے عہد صدارت میں ہو رہا ہے۔

غرض یہ کہ... تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم۔ اس تلخ توانائی کو کہاں تک طول دیا جائے۔ حقیقت حال کا کافی اندازہ ان مختصر اشاروں سے ہو سکتا ہے جو بیان میں آ چکے ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ صورتِ حال کی وضاحت میں بعض شخصی بحثوں سے گزرنا پڑا ہے۔ لیکن جب تک واقعات کی یہ ترتیب عوام اور مخلصین جمعیۃ پر واضح نہ ہو، وہ کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے کہ جمعیۃ کی اندرونی خانہ جنگی وتصادم کے واقعی اسباب کیا ہیں۔ گروہ بندی نے کیوں سر اُٹھایا اور اس کا تسلسل کیوں قائم ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں بھی انتہائی ناعاقبت اندیشی کے ساتھ جو اقدام کیا گیا، اپنے نتیجہ کے لحاظ سے کچھ کم افسوسناک حادثہ نہیں ہے ایسے وقت میں کہ اس معاملہ میں ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمان بے مثال فکری و عملی اتحاد کا مظاہرہ کر رہے تھے یکا یک جمعیۃ کی طرف سے ایک خام و ناتمام رٹ پٹیشن دائر کر کے فکر و بحث کے انتشار کے سوا اصل کاز کو کچھ بھی فائدہ پہنچایا جا سکا۔ افسوس کہ اس جلد بازی اور خام اقدام سے مسلم یونیورسٹی کے کیس کو بھی تقویت کے بجائے نقصان پہنچا۔ رٹ بھی واپس لینا پڑا اور آئندہ رٹ دائر کرنے کے مواقع بھی ہاتھ سے کھوئے۔

میرے متعلق اس کشمکش اور تصادم کی فضا میں بہت کچھ پروپیگنڈہ کیا گیا اور برابر کیا جا رہا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ جمعیۃ کی اس افراتفری، تعطل اور رسوائی کی (دوسرے ہزاروں مخلصین جماعت کی طرح) میرے دل پر بھی گہری چوٹ ہے۔ ورکنگ صدر ہوتے ہوئے اور صدارت کے دستوری اختیارات رکھتے ہوئے بھی ان دو برسوں میں جس قدر صبر اور تحمل برداشت اور درگزر سے میں نے کام لیا ہے اس کے ثبوت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا کہ اگر میں بھی وہی طریق اختیار کرتا جو آج اُس طرف سے اپنایا گیا ہے تو جمعیۃ کی صفوں میں تصادم اور کشمکش کی صورتِ حال اور بھی زیادہ بھیانک ہوتی اور ظاہری اور سطحی سکون بھی کہیں نظر نہ آتا۔

بہر حال اس تمام سرگزشت اور تجربہ نے میرے اس خیال کو اور بھی مستحکم کیا ہے کہ جماعت کی فلاح آج بھی اسی میں ہے کہ تجربہ کار، معروف و معتمد بزرگوں کے ہاتھ میں اس کی سربراہی اور باگ ڈور رہے۔ اور ان کے سایۂ شفقت اور نگرانی میں ان حضرات کو کام کرنے کا موقع ضرور دیا جائے جو آج صدر ورکنگ کمیٹی نظامت، اور مجلس منتظمہ کے تمام دستوری اختیارات بے تامل خود ہی استعمال کرتے جا رہے ہیں اور جن کی روش نے جماعت کے مستقبل، اس کی آبرو اور اعتماد کو خطرات کی گود میں سونپ دیا ہے۔

(تجلی دیوبند جنوری ۱۹۶۶ء)

....

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ!

سادہ لوح اور خالی الذہن مسلمان جب ۶ر جون کے الجمعیۃ میں صفحہ اوّل کی یہ موٹی سرخی پڑھیں گے:

''مسلمانوں کے مسائل اور شکایات کے بارے میں وزیراعظم ہند اور صدر کانگریس کو میمورنڈم''۔

اور اس کے ذیل میں چار پانچ سُرخیوں کے ذریعے انھیں اطلاع ملے گی کہ جمعیۃ علماء کا ایک پندرہ نفری وفد فرقہ وارانہ فسادات، ملازمتوں کے تناسب اور ''اُردو'' جیسے مسائل میں مسلمانوں کی طرف سے بارگاہِ حکومت میں فریاد پیش کر کے آیا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ کم سے کم اتنا ضرور سوچیں گے کہ جمعیۃ کے جس دھڑے کو عام طور پر سرکاری جمعیت کے نام سے موسوم کیا جانے لگا ہے وہ بھی مسلمانوں کی خدمت سے بالکل ہی غافل نہیں ہے اور ان کے مسائل کو بہتر طور پر حل کرانے کے لیے کچھ نہ کچھ بھاگ دوڑ برابر کر ہی رہا ہے۔

پروپیگنڈہ نام ہی ہے غلط فہمیاں پیدا کرنے اور حقائق پر پردہ ڈالنے کا۔ کمال تو اس فن میں بیشک ذہین و فطین ہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے؛ مگر جب عوام کا شعور واہموں اور عقیدتوں کے گورکھ دھندوں میں اُلجھا ہوا ہو تو معمولی ذہن کے لوگ بھی اچھی خاصی ہاتھ کی صفائی دکھا ہی جاتے ہیں۔ آئیے ہم بعض حقائق کی روشنی میں غور کریں کہ وفد لے جانے کی یہ کہانی کس حد تک خدمتِ ملک وملّت کی داستان ہے اور کس حد تک خود پروری کی!

نیتوں اور مخفی ارادوں کو سوائے خدا کے کوئی نہیں دیکھ سکتا مگر دلائل وقرائن کے ذریعے نیتوں تک پہنچنے والی بصیرت خدا ہی کی پیدا کردہ ہے۔ آنکھوں سے تو خدا بھی نظر نہیں آتا مگر وہ ہے۔ اسی طرح وفد ترتیب دینے والوں کے باطن میں تو ہم بھی نہیں اُترے مگر شواہد یہی بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کے مسائل کی گرہ کشائی کے ساتھ ساتھ خود اپنے بھی ایک مسئلہ کا حل وفد بنانے والے ''دماغ'' کے پیش نظر تھا۔

روداد یوں شروع ہوتی ہے کہ وفد کی روانگی سے قبل مولانا قاضی سجاد حسین اور حاجی محمد فاروق (آئل کلاتھ مرچنٹ) مفتی عتیق الرحمٰن کی خدمت میں آتے ہیں اور نہایت مخلصانہ انداز میں عرض کرتے ہیں کہ آنجناب کا وفد میں شامل ہونا بہت ضروری ہے۔

حضرت مفتی صاحب ٹھیرے ایک سادہ دل اور زود اعتماد آدمی۔ علم اور ذہانت کا سرمایہ ان کے پاس کتنا ہی وافر ہو مگر عیاری انھیں چھو کر نہیں گئی۔ دعوت بادی النظر میں مخلصانہ ہی تھی بس پگھل گئے اور فرمایا: یہ تو کارِ خیر ہے۔ کارِ خدمت ہے۔ میں ضرور ساتھ جاؤں گا۔

آمادگی کا برملا اظہار کرتے ہوئے موصوف نے یہ پرواہی نہیں کی کہ ایک بہت ہی سمجھدار شاعر پہلے ہی کہہ گیا ہے ۔

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا ہے دَورِ جام
ساقی نے کچھ مِلا نہ دیا ہو شراب میں

مکر، دھاندلی اور بے مہری کے تمام حربے استعمال کر کے جس دھڑے نے موصوف کو نہ صرف صدارت سے بے دخل کیا تھا بلکہ رسوا کرنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی وہی اگر بھیگی بلّی بن کر دفعتاً ایک پیشکش کرتا ہے تو بے جانہ ہوتا اگر موصوف اسے قبول کرنے میں تھوڑا تامل برتتے، مگر جس شخص کے فکری ڈھانچے میں اپنی ذات، اپنے مفاد اور اپنی سیادت وقیادت کی ہوس نے سرے سے کوئی جگہ ہی نہ پائی ہو وہ فریبِ خلوص کھائے بغیر کیسے رہتا۔ المرءُ یقیس علیٰ نفسہٖ۔ آدمی دوسروں کو اپنے ہی پر قیاس کرتا ہے۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ پیشکش بہرحال ایک ایسی پیشکش ہے جس کا تعلق ملک وملّت کی خدمت ہی کے جذبے سے ہوسکتا ہے، لہٰذا ذاتی رنجشوں اور شکایتوں سے بالاتر ہو کر شریک خدمت کیوں نہ ہوا جائے۔

اب انھیں کیا خبر تھی کہ یہ فقط خدمت کا نہیں سیاست کا بھی کھیل ہے۔ اگلے ہی لمحے نقاب سرکا اور حرف مدعا نے اپنے اصلی خدوخال دکھائے۔ آگے کی داستان خود حضرت مفتی صاحب کے الفاظ میں سنئے۔ اسی مجلس کی گفتگو کے بارے میں وہ فرماتے ہیں:

”درمیان میں جمعیۃ کی مجلسِ عاملہ میں میری شمولیت اور رکنیت کی گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو کا منشاء یہ تھا کہ کسی وجہ سے اگر مجھے مجلسِ عاملہ کی موجودہ رُکنیت کی نوعیت پر اعتراض بھی ہو تو یہ چیز وفد کے ساتھ جانے میں مانع نہیں ہوگی۔ اِن حضرات نے جب یہ دیکھا کہ میں مختلف قسم کی پیچیدگیوں کے باوجود وفد میں شامل ہونے کے لیے آمادہ ہوں تو خواہ مخواہ ایک سوال کھڑا کر دیا مولانا سجاد حسین صاحب بولے اسعد میاں کو یہ خیال ہے کہ وزیر اعظم سے بات چیت کے درمیان اگر کسی جماعت اور اُس کے طریق کار کے متعلق کوئی تذکرہ آجائے تو یہ آپ کو ناگوار تو نہیں ہوگا اور اس وقت آپ کی روش کیا رہے گی؟ مجھے اس سوال پر سخت حیرت ہوئی اور ذہنی تکلیف بھی۔ میں نے کہا کہ وفد کا کام جمعیۃ کی طرف سے مسلمانوں کے مسائل پیش کر دینا ہے اور بس۔ اس میں کسی دوسری جماعت کا ذکر کیوں آئے۔ یہ بات یوں بھی جمعیۃ جیسی باوقار جماعت کی روایات کے خلاف ہوگی، تاہم اگر کوئی ایسی بات ہوئی اور مثلاً مجلس مشاورت کی سرگرمیوں کا ذکر کسی ممبر نے مخالفانہ انداز میں کیا تو چونکہ میں ”مجلسِ مشاورت“ کا ذمہ دار ہوں۔ میرے لیے اس مرحلے پر

خاموشی ممکن نہیں ہوگی۔میں ضرور مجلس کی صفائی، اُس کی تشکیل اور اُس کے طریق کار کے متعلق کچھ کہوں گا۔یہ سن کر دونوں حضرات واپس ہو گئے اور میں فون کا انتظار کرتا رہا۔واقعہ یہ ہے کہ اسعد میاں کو مجھے ساتھ لینا نہیں تھا؛ مگر کچھ خارجی اور داخلی مصالح کی وجہ سے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا۔جب مجھے آمادہ پایا تو فوراً ایسی رکاوٹ کھڑی کر دی جس کے بعد وفد میں میری شمولیت ہو ہی نہ سکے۔اب تو حالات ہی دوسرے ہیں، اُس زمانے میں کہ میں ان کے قانون میں بھی ورکنگ صدر تھا۔اسعد میاں اور ان کے حواریوں کی یہ زبردست کوشش رہی کہ مولانا فخرالدین کسی بھی حال میں ہوں اُن کو دیوبند سے کھینچا جائے اور وہ کچھ کرسکیں یا نہ کرسکیں کوئی ان سے واقف ہو یا نہ ہو مگر عبائے قیادت بہر حالت اُن کے زیب بدن کر دی جائے۔ان کے دَور میں کبھی یہ نہیں ہوا کہ ورکنگ صدر کی حیثیت سے کسی وفد یا ڈپلیکیشن کی قیادت میرے سپرد کی گئی ہو حالانکہ معاملے کی قدرتی اور سادہ صورت یہی ہونی چاہئے تھی کہ مولانا فخرالدین صاحب کو دیوبند سے لانے اور کاندھوں پر لادنے کے بجائے یہ خدمت مجھ سے لی جاتی۔بہر حال یہ باتیں بہت تفصیل طلب ہیں اور ان کی تفصیل تکلیف دہ بھی ہے۔ابھی کی تازہ بات یہ ہے کہ مصالحت کی گفتگو چل رہی تھی اور چلنے سے زیادہ اس کو شہرت دی گئی۔ ۶ / ۷ / جون باہمی گفت وشنید کی آخری تاریخ تھی، میں نے دونوں تاریخوں میں مسلسل انتظار کیا کہ کمیٹی کے ارکان کب آتے ہیں یا مجھے بلاتے ہیں مگر کوئی نہیں آیا اور ازخود یک طرفہ کچھ فیصلے کر لیے۔اس کی خاص وجہ یہ ہوئی کہ میں نے یہ بات پوری طرح واضح کر دی تھی کہ مصالحت کی بات جمعیۃ اور اُس کے نظام کار تک محدود رہنی چاہئے۔اِدھر اُدھر کی باتوں سے معاملات اُلجھ جائیں گے مثلاً جماعت اسلامی کے متعلق میری روش یا مجلسِ مشاورت سے میری وابستگی، مگر ان حضرات کو یہ چیز گوارا نہیں ہوئی۔ یعنی یہ کہ یا تو میں اسعد میاں اور ان کے ہم صفیروں کی جیب کی گیند بنا رہا ہوں، جو حکم دیں اُس کی تعمیل کروں، جس راستے پر چلائیں چلوں ورنہ جمعیۃ کے نزاعات پر کوئی بات نہیں ہوگی۔ برادرم کیا کہوں ان لوگوں کی روش کیا ہے اور انھوں نے کس طرح مجھے پریشان کیا ہے۔جمعیۃ کی صدارت سے دست بردار ہوا۔متوازی مرکز قائم نہیں ہونے دیا ساتھیوں اور مخلصوں کو آزردہ کیا مگر ان کی پیشانی کے بل پھر بھی بدستور رہے۔خلاصہ یہ ہے کہ مصالحت کی وہ فضا بھی ختم ہوگئی۔ اب پورے معاملے پر نئے سرے سے غور کرنا ہوگا۔"

اس تحریر میں روحانی جراحتوں کی جو کسک ہر قلبِ حساس محسوس کرسکتا ہے۔اسے تو اپنی جگہ رکھئے۔دیکھنا یہ

ہے کہ وفد لے جانے کا مقصد اگر کلیۃً نیک تھا اور گفتگو خداوندانِ نعمت سے اہلِ وفد کی بس اتنی ہی ہوئی جس کا معصوم سا اجمال روزنامہ جمعیۃ کے خبر نامے میں دیا گیا ہے تو یہ حضرت مفتی صاحب سے پیشگی ضمانت اس بات کی کیوں لی جارہی تھی کہ خداوندانِ نعمت کی بارگاہ میں کسی اور جماعت کا تذکرہ آجائے تو مفتی صاحب کو ناگوار نہ ہو اور وہ وفد ہی کی لے میں لے ضرور ملائیں۔

مفتی صاحب نے اگر اس طرزِ عمل سے یہ نتیجہ اخذ کیا تو غلط نہیں کیا کہ شرکت کی دعوت تو محض ایک دکھاوا تھی۔ ساتھ لے جانا حقیقۃً مقصود ہی نہیں تھا۔

لیکن راقم الحروف اس طرزِ عمل کو ایک اور زاویے سے دیکھتا ہے۔ اپنا خیال یہ نہیں ہے کہ ساتھ نہ لے جانے کا تہیہ کرلیا گیا تھا؛ بلکہ اغلب یہ ہے کہ ساتھ لے جانے کی خواہش ضرور رہی ہوگی؛ مگر اور ہی وجہ سے یہ وجہِ صغریٰ کبریٰ کی ترتیب سے سمجھ میں آسکتی ہے۔

الجمعیۃ کو پندرہ افراد کے وفد میں سے مولانا فخرالدین کے سوا کسی کا نام ظاہر کرنے کی ہمت نہ ہوسکی۔ مولانا فخرالدین بھی جو قدرومنزلت عوام میں رکھتے ہیں محتاجِ بیان نہیں وہ سید بھی ہیں اور شیخ الحدیث بھی۔ مگر تنہا ان اوصاف کی کوئی قیمت اجتماعیات کے میدان میں نہیں اُٹھتی۔ ان کا نہ کوئی سیاسی ماضی ہے۔ نہ خدمت کی تاریخ۔ نہ کوئی کارنامہ۔ وہ استعارے کی زبان میں فقط ایک گاؤ تکیہ ہیں جس سے صاحبزادے اسعد میاں کی لیڈری ٹیک لگاتی ہے۔ ان کے حق میں بے تحاشا پروپیگنڈہ کرنے کے باوجود یہ احساس وفد سازوں کے دل میں بہرحال موجود رہا ہوگا کہ لکڑی کی ٹانگیں لگا کر کسی بونے کو دراز قد نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے یہ خیال ذہن میں پیدا ہوا ہوگا کہ حکومت کو اپنی اہمیت کا احساس دلانے کے لیے کوئی نہ کوئی ایسی شخصیت وفد میں ضرور شامل کی جائے جو اہم ہو۔ جس میں کچھ وزن ہو۔ جو قابلِ لحاظ سمجھی جاسکے۔ نظر مفتی صاحب پر گئی۔ چاند پر خاک اُڑانے والے یہ تو بہرحال جانتے ہی تھے کہ چاند چاند ہی ہے۔ مفتی صاحب مولانا حفظ الرحمٰنؒ کے دستِ راست رہے ہیں۔ ان کی بصیرت وفہم، ان کی بے غرضی، ان کی دیانت اور پرہیزگاری اوپر کے حلقوں میں ایک خاص شہرت اور منزلت رکھتی ہے۔ وہ اُن سنجیدہ اہلِ فکر میں شمار ہوتے ہیں جو بولتے کم اور تدبّر زیادہ کرتے ہیں۔ جو سطحی جذبات کے دھاروں پر نہیں بہتے۔ جو چاپلوسی نہیں کرتے نہ لاف وگزاف سے واسطہ رکھتے ہیں۔

آنے والے الیکشن میں جمعیۃ علماء کو حکومت کے حق میں استعمال تو بہرحال ہونا ہی ہے۔ مگر اس ''استعمال'' کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول ہو اس کا مدار خود حکومت کے اس اطمینان پر ہے کہ وہ جمعیۃ کی وفاداری پر کس درجہ اعتماد کرسکتی ہے۔ جیسا اعتماد ویسی ہی داد ودہش۔ وفد بنایا ہی اس مقصد سے گیا تھا کہ خداوندانِ نعمت کو اپنی بے پناہ وفاداری کا زیادہ سے زیادہ اطمینان دلایا جائے۔ لیکن مجوزہ وفد میں ایک بھی شخصیت ایسی نہیں تھی جس کی

موجودگی حکومت اور کانگریس کو یہ اطمینان دلاسکتی کہ جمعیۃ کی تنظیم میں اب کوئی سنجیدگی باقی رہ گئی ہے۔ مولانا فخرالدین کی سیدانیت یا مدرسی کا رعب تو وزیرِاعظم اور صدر کانگریس پر پڑنے سے رہا تھا۔ سفید داڑھی اور طول عمری بھی کسی درد کا درماں نہیں۔ رہے اسعد میاں، تو ان کے قدوقامت کو بھی یہ دونوں شخصیتیں خوب جانتی ہیں۔ پھر کیونکر گوہر مقصود حاصل کیا جائے۔ اسی پرابلم نے توجہ مفتی صاحب کی طرف پھیری اور دو ایسے بزرگ آگے بڑھا دیے گئے جن کا مفتی صاحب بہت لحاظ کرتے ہیں۔

لیکن مفتی صاحب کو ساتھ لے جانے میں یہ اندیشہ بہر تھا کہ اپنی دیانت کے باعث وہ اظہارِ وفاداری کی اُس تکنیک کا ساتھ نہ دے سکیں جو موجودہ نام نہاد جمعیۃ کے لیے سرمایۂ جاں ہے۔ یعنی جماعتِ اسلامی اور مجلسِ مشاورت جیسی تنظیموں کی نفرت اور بغض کا اعلان بالجہر۔ یہ تو محض ایک اسلوبِ گفتگو تھا کہ اسعد میاں کے ایلچیوں نے وزیرِاعظم کے سامنے کسی جماعت کے ذکر آجانے کا اندیشہ محض امکان کے طور پر ظاہر کیا ورنہ حقیقت اس کے سوا کچھ نہ رہی ہوگی کہ جماعتِ اسلامی اور مجلسِ مشاورت پر تبرّا عدو اوندانِ نعمت کی بارگاہ میں ہر حال میں ہونا ہی ہونا تھا۔ اب اگر مفتی صاحب بھی کسی طرح ہمنوائی پر آمادہ ہوجاتے تو نام نہاد جمعیۃ کو یہ باور کرانے کا زریں موقعہ مل جاتا کہ جماعتِ اسلامی اور مجلسِ مشاورت کے دشمن صرف اطفالِ مکتب یا صرف تیسرے درجے کے مسلمان نہیں ہیں بلکہ مفتی عتیق الرحمٰن جیسا ذی فہم عالم بھی ہے۔

یہ تھا اصل منصوبہ۔ اگر نہیں تھا تو کیا وجہ تھی کہ مفتی صاحب کی آمادگی کے باوجود وفد بالا بالا چلا گیا۔ اگر پہلے سے یہ طے نہ ہوتا کہ نغمۂ وفاداری کی تان جماعتِ اسلامی اور مجلسِ مشاورت کی مذمت پر ٹوٹنی ہے تو ارکانِ وفد بڑی آسانی سے باہم یہ طے کر سکتے تھے کہ بوقتِ ملاقات اگر وزیرِاعظم یا صدر کانگریس نے کسی جماعت کا ذکر چھیڑا تو صاف صاف عرض کر دیا جائے گا کہ ہم اس وقت بلا استثناء تمام مسلمانوں کی طرف سے آئے ہیں اور صرف ایسی ہی شکایات اور مسائل لائے ہیں جن کا ہندوستان میں بسنے والے تمام مسلمانوں سے یکساں تعلق ہے کسی مسلم جماعت کی سیاسی حیثیت سے کچھ بھی بحث نہیں۔ ایسا کہہ دینے کی صورت میں وزیرِاعظم یا صدر کانگریس ہرگز بھی یہ نہ کہتے کہ پہلے جماعتِ اسلامی اور مجلسِ مشاورت کی شان میں ایک ہجو نامہ پڑھو اس کے بعد بات ہوگی۔

اخبار میں خلاصۂ گفتگو جو کچھ آیا ہے وہ تو بس خانہ پُری ہے۔ یہ بات بھلا جمعیۃ والے کیوں بتاتے کہ مذکورہ جماعتوں کے خلاف وہ کیا کیا زہر اُگل کر لوٹے ہیں۔ بچھو اور کاٹنے سے باز آجائے۔ حبِّ جاہ کے متوالے اربابِ اخلاص کی تخریب سے چوک جائیں۔ ناممکن۔ واحد نمائندگی کی بیل منڈھے کیسے چڑھے گی جب تک کوئی اور قابلِ ذکر جماعت زندگی کا سانس لیتی رہے گی۔

وفد کو ملا کیا؟

بظاہر تو یہ بندھا ٹکا جواب کہ ہاں صاحب غور کیا جائے گا۔مگر بہ باطن جو کچھ ملا ہوگا اسے موٹی نگاہ والے عوام کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ہم نہیں کہتے کہ دنیا مت کماؤ۔کماؤ اور ڈٹ کر کماؤ۔مگر اتنے بے درد تو مت بنو کہ انسانی لہو کے بغیر تمہاری پیاس ہی نہ بجھے۔جماعتِ اسلامی اور مجلسِ مشاورت والے شریف لوگ ہیں۔صلح پسند۔نزاع و شورش سے گریزاں۔شعلہ طرازیوں سے بے تعلق۔انھیں کوئی اعتراض نہیں تم کاروں میں گھومو، جہازوں میں اُڑو، چندے کھاؤ، عیش کرو؛ مگر بوالہوس بن کر ان کی آبروریزی کے درپے تو مت ہو۔اگر تم دوسروں کے ساتھ انصاف نہیں کروگے تو دوسرے تمہارے ساتھ انصاف کیوں کریں گے۔

قریب ہے یارو کہ روزِ محشر چھُپے گا کُشتوں کا خون کیونکر
جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

(تجلی دیوبند جون ۱۹۶۶ء)

....

❖

جس خود ساختہ فدائے ملّت کو دارالعلوم دیوبند سے شائع ہونے والی غیر معتبر تاریخ میں ہیرو بنا کر پیش کیا گیا ہے،اس کی سفاکیت اور ریشہ دوانیاں دارالعلوم پر قبضہ کرنے سے پہلے ہی اپنے عروج کو پہنچ گئی تھیں ۔جمعیۃ علماء ہند کے علاوہ کسی دوسری تنظیم و جماعت کو پنپنے نہ دینے کی شاطرانہ ذہنیت نے مسلم مجلس مشاورت کے دیوبند میں ہوئے جلسے کا جو حال کیا تھا اس نے عوام کے قلوب واذہان کو علماء سے بدظن کرنے کا وہ کام کیا جو ہندوستان کی تاریخ میں شاذ و نادر کے زمرے میں بھی نہیں آتا۔ ذیل میں ہم اُس جلسے کی پوری تفصیل پیش کر رہے ہیں۔اللہ جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے مولانا عامر عثمانی کو کہ انھوں نے اپنے تجلّی میں اس ظلم کی پوری داستان پیش کر کے آنے والی نسلوں کو تاریخ فراہم کرنے کا بیش قیمت کام کیا ہے۔ پڑھیے اور دیکھئے کہ مولوی اسعد مدنی کے جبر واستبداد نے کتنے وحشتناک اور حیاسوز کارنامے انجام دیے ہیں۔(ابوعکاشہ رحمٰن)

....

۱۹۶۶ء میں مسلم مجلسِ مشاورت کا جلسہ اور اُس میں کیا گیا ہنگامہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

پرچہ لیٹ ہونا تو کوئی نیا حادثہ نہیں ؛مگر یہ حادثہ ضرور نیا ہے کہ آج بیس دن ہو گئے راقم الحروف اپنے کسی ذاتی خط کا جواب بھی نہیں دے سکا۔ جواب دینا تو درکنار،خطوط پڑھنے تک کی نوبت نہیں آئی تقریباً دو سو ایسے خطوں کا بنڈل میرے سامنے ہے جنھیں پڑھنا اور جواب دینا میرے ذمے ہے۔ان شاء اللہ اگلے ہفتے اس کی نوبت آسکے گی۔ فی الحال تو آپ یہ سنئے کہ یہ مہینہ کیسا کٹا اور کونے میں بیٹھ کر قلم چلانے والے پر ہنگاموں کے کیسے کیسے کارواں گزر گئے۔

اخبار بیں حلقہ جان چکا ہے کہ ۱۴/اکتوبر کو دیوبند میں مجلسِ مشاورت کا ایک بڑا جلسہ ہوا تھا جس کا حشر اتنا ہنگامہ خیز ثابت ہوا کہ آج تک اس کی صدائے بازگشت سے اخبارات گونج رہے ہیں۔اس جلسہ کا داعی (کنوینر) راقم الحروف ہی تھا۔کہنے کو ایک جلسہ کرا دینا کوئی بڑا کام نہیں ؛لیکن جب صورتِ حال یہ ہو کہ یہاں کے عوام کے لیے مجلس مشاورت کا نام بالکل اجنبی ہو اور مقبوضہ جمعیۃ علماء کے سربراہ کسی قیمت پر یہ پسند نہ کرتے ہوں کہ دیوبند جیسی مرکزی جگہ میں اس تنظیم کا تعارف کرایا جائے تو جلسہ کرا دینا ایک معرکۃ الآراء مسئلہ بن جاتا ہے۔جلسہ بھی ایسا جس میں دہلی سے مولانا مفتی عتیق الرحمٰن اور پنڈت سندرلال، مدراس سے این۔ایم۔انورؔ، بہار سے مظہر امام اور سید محمد مجتبیٰ، لکھنؤ سے ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی اور مولانا منظور نعمانی جیسے ممتاز حضرات تشریف لا رہے ہوں۔تشریف تو مولانا علی میاں بھی لاتے اگر بروقت شدید معذوری پیش نہ آجاتی تاہم ان کے نہ آنے کی تلافی ان کی دو تقریروں کے ٹیپ مہیّا کر کے کر لی گئی تھی۔

انتظامات کے لیے اوائل اکتوبر ہی سے بھاگ دوڑ شروع ہوئی۔ کونے میں بیٹھ کر قلم چلانے والا کوئی شخص ایک عظیم القدر جلسے کا داعی (کنوینر) بن بیٹھے تو اس کے مضمرات و ملتزمات کا اندازہ ہر ذی فہم بہ آسانی کر سکتا ہے۔ تمام معمولات بدل گئے۔ خلوتیں جلوتیں بن گئیں۔ سکون حرکت و جنبش میں تبدیل ہو گیا۔

دیوبند میں جلسے کے لیے سب سے بہتر پبلک مقام ڈاکخانہ کے سامنے ہے، لیکن وہاں قریب ہی دسہرے کی طویل تقریبات کا سلسلہ جاری تھا اس لیے اسے نظر انداز کر کے ایک اور مقام تجویز کیا گیا اور پوسٹروں میں یہ چھاپ بھی دیا گیا لیکن چھپنے کے فوراً بعد ہی پتہ چلا کہ مقبوضہ جمعیۃ کے اصاغر و اکابر نے اس مقام کے انتخاب کو اپنے حق میں چیلنج سمجھا ہے۔ یہ اس لیے کہ مجوزہ مقام دارالعلوم کے نزدیک ہی تھا اور دارالعلوم کا یہ گروہ نہ جانے کب سے اپنی اُمنگوں، ارادوں اور ترک تازیوں کی گُھڑ دوڑ کا میدان قرار دیئے ہوئے ہے۔ یہ بات اسے بہت کھلی کہ عین اس کی ناک کے نیچے اُس مجلسِ مشاورت کا ڈنکا بج جائے جس کی مقبولیت کا مطلب اس کی اپنی خواجگی اور خانہ زاد قیادت کا زوال ہے اور جسے دبانا اور کچلنا اس کی خان بہادری کے فرائض میں شامل ہے۔ بڑا غضب یہ تھا کہ جلسہ کا داعی وہ عامر عثمانی بن گیا جس سے اس گروہ کے بہتیرے افراد کی خفگی کا یہ عالم ہے کہ اگر اس کی لاش انھیں مل جائے تو قیمہ کیے بغیر دفن بھی نہ ہونے دیں۔ ان میں کئی تو سند یافتہ جُہال ہیں اور کئی بے تاج کے بادشاہ۔ کریلا جب نیم پر چڑھ جائے تو کڑواہٹ دو آتشہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جوں جوں جلسے کا دن قریب آتا گیا یہ افواہ مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی مانند شہر کی فضا میں سامعہ نوازی کرتی گئی کہ جلسے کو ناکام بنائیں گے۔ گڑبڑ کریں گے، گیا کا بدلہ لیں گے۔

علاوہ اس کے اسی دوران میں اس گروہ نے طلباء کے ذریعہ ایک مہم چلائی جس میں اس مطالبہ پر دستخط لیے جا رہے تھے کہ مولوی اسعد میاں کو مجلسِ شوریٰ کا ممبر بناؤ اور مفتی عتیق الرحمٰن کو نکال باہر کرو۔

اس نوع کی افواہوں نے خود راقم الحروف پر کیا اثر کیا اسے تو جانے دیجیے۔ اپنے سمندِ شوق کے لیے تو مخالفتوں کا خروش ہمیشہ تازیانہ ثابت ہوتا ہے۔

ہوا ہے ذوقِ عمل اور بھی فزوں عامر
خدا کا شکر کہ ہم سے زمانہ برہم ہے

لیکن میرے بعض رفقاء نے چند انتظامی دشواریوں پر توجہ دلائی اور یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا کہ چونکہ مجوزہ مقام پر بجلی کا کنکشن ذرا دُور سے لانا ہوگا اس لیے عین ممکن ہے کہ عین وقت پر کوئی مفسد چپکے سے تار کاٹ دے۔ لہٰذا کوئی اور بہتر جگہ ڈھونڈ لی جائے۔ (مجوزہ مقام محلّہ بڑ ضیاء الحق کا میدان تھا، جہاں آج بھی بہت چوڑی سڑک ہے، اگرچہ اُس وقت تو مکانات بھی اتنے نہیں تھے۔ (ابو عکاشہ رحمٰن))

مشورہ صائب تھا مان لیا گیا۔ پھر ایک ایسی جگہ ڈھونڈی گئی جو مدرسے سے دُور تھی اور بہت بڑے مجمع کو

اپنے اندر سما سکتی تھی۔اس جگہ کے سلسلے میں مدرسہ اصغریہ کے مہتمم مولانا حاجی جلیل حسین صاحب سے ملاقات کی گئی تو انھوں نے بڑے حسنِ اخلاق اور وسیع القلبی سے منظوری عطا فرمائی۔وہ کبھی بھی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتے، دین کی خاموش مگر انتھک خدمت کرنا ان کی مبارک زندگی کا مشن ہے اور الحمدللہ ان کا مدرسہ اصغریہ بڑا اچھا پروگرام چلا رہا ہے۔انہوں نے یہ محسوس کر کے کہ مجلسِ مشاورت کا کاز اور مشن عین ملّتِ اسلامیہ کا مشن ہے ہر ممکن آسانی مہیا کرنے کا وعدہ فرمایا اور پھر اس وعدے کو بحسن وخوبی پورا کیا۔

لیجئے ۱۴/اکتوبر کی شام بھی آجاتی ہے۔روشن، تروتازہ اور شاداب دارالعلوم کے اطراف واکناف کو چھوڑ کر باقی سارے شہر میں شوق اور مسرت کی ایسی لہر دوڑ رہی تھی جیسے بارات دولہا کی منتظر ہو۔جیسے ۲۹/رمضان کا چاند دیکھا جانے والا ہو۔

سب آئے۔جتنے نام لکھ چکا ہوں ان سے زیادہ ہی آئے۔جلسہ شروع ہوا۔کیا رونق تھی۔کیا مجمع تھا۔رات جاگ اُٹھی تھی۔فضا مسکرا رہی تھی۔ہم نے صرف چھ رضا کار تعینات کیے تھے۔دو پانی پلانے کے لیے۔دو راستہ بنانے کے لیے۔دو مجمع کو مناسب طریقے پر بٹھانے کے لیے۔علمِ غیب ہوتا تو انھیں لاٹھی نہ سہی ڈنڈے تو دے ہی دیتے۔مگر ہم احمق اس جنت الحمقاء میں بس رہے تھے کہ اول تو پہلی مجوزہ اور مشتہرہ جگہ بدل دینے کے بعد حریفوں اور حاسدوں کا جوش یوں بھی ہلکا پڑ گیا ہوگا دوسرے وہ گڑبڑ بھی کریں تو بس اتنا ہی کریں گے کہ کالج کے شوخ لڑکوں کی طرح مقرروں اور شاعروں پر گاہے گاہے فقرے کسیں۔اسی تصور کے تحت ہم نے اپنے رضا کاروں کو سمجھا دیا تھا کہ نہایت نرمی اور اخلاق سے کام کرنا۔صبر وضبط کا ثبوت دینا۔محبت سے دل جیتنا۔

اب یہ کیا پتا تھا کہ دارالعلوم کی موجودہ تعلیم وتربیت ناپاک سیاسی سازشوں اور گروہ بندیوں سے اس درجہ مسموم ہو چکی ہے کہ گروہی سیاست کا زہر پینے والے کچھ طلبہ عین چوراہے پر وحشت ودرندگی کا بالکل ننگا ناچ بھی ناچ سکتے ہیں۔ معزز مہمانوں کی جلسہ گاہ میں تشریف آوری پر زندہ باد کے نعرے لگائے گئے تو حضرت مفتی عتیق الرحمٰن کے نام پر یہ نعرے بھی سماعتوں سے ٹکرائے کہ مردہ باد۔ستیاناس۔سب بکواس۔خیر سے مفتی صاحب کے پاس دہلی بھی خط بھیجا گیا تھا کہ خبردار دیوبند مت آنا ورنہ سخت کارروائی کی جائے گی اور جمعیۃ علماء کے خلاف کوئی لفظ کہا تو گولی ماردی جائے گی۔

ہم نے صبر کیا۔صبر کے ساتھ ہماری یہ معصومیت بھی لائق داد ہی سمجھئے کہ ہم اب بھی اسی خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ بات بس زبان کی حدوں میں رہے گی۔لڑائی جھگڑے کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔

جلسہ تلاوتِ قرآن سے شروع ہوا۔یکے بعد دیگرے دو قاریوں نے تلاوت کی۔طلبہ کا جمِّ غفیر نہ صرف آگے تھا بلکہ اسٹیج کے پیچھے بھی تھا۔عین قرأت کے دوران بعض ایسے الفاظ بھی سُنے گئے جن سے عام مسلمانوں کو بڑی حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا؛ لیکن ہمارے آدمیوں نے بڑی خوشامد سے انھیں ضبط کی حدوں میں رکھا۔مجمع بہت

تھا۔سامعین کی آمد مسلسل جاری تھی۔دو نظمیں ہوئیں ایک مختصر سا مقالہ۔ان میں سے کسی کا بھی تعلق گروہی موضوعات سے نہیں تھا۔لیکن ہوٹنگ برابر جاری رہی۔ یہاں تک کہ ڈائس پر پکّے ڈلے بھی آئے۔اب راقم الحروف نے میکروفون پہ گزارش کی کہ حاضرین شائستگی اور تمیز اختیار فرمائیں۔ یہ گزارش فوری طور پر تو مسموع ہوئی لیکن جو پروگرام پہلے سے کسی نے ترتیب دے دیا ہو وہ کہاں ایسی گزارشات کی پروا کرتا ہے۔تجلّی میں ''آج اور کل'' کا کالم لکھنے والے جواں سال جرنلسٹ جناب جمیل مہدی اپنا مقالہ پڑھ رہے تھے کہ مختلف گوشوں سے ہوٹنگ شروع ہوئی۔ یہ مقالہ عالمی سیاست اور ہندوستان میں مسلمانوں کے مسائل پر مشتمل تھا۔گویا کسی گروہی اختلاف سے اس کا بھی کوئی تعلق نہ تھا۔مگر منصوبہ سازوں کو اس سے کیا سروکار۔انھوں نے فقرے بازی کی لے تیز کر دی۔اس پر جمیل صاحب نے سمجھایا تو جواب مزید تلخ ملا۔اب جمیل صاحب نے بھی قدرے جوش کے ساتھ ایسے الفاظ کہے جن کا مطلب یہ تھا کہ جسے سُننا ہو سُنے جسے نہ سننا ہو چلا جائے۔نیز یہ کہ جلسہ ہم نے کسی اور کے سہارے نہیں کیا ہے اپنے عزم کے بل پر کیا ہے بس یہ کہنا تھا کہ غضب ہوگیا۔ بارود پہلے ہی سے جمع تھا یہ جواب چنگاری بن گیا۔میں تسلیم کرسکتا ہوں کہ جمیل صاحب کا لہجہ نیازمندی کی سرحدوں سے آگے چلا گیا ہو۔میں مان سکتا ہوں کہ ان کے الفاظ سے کچھ لوگوں کی کبیدگی جواز کے درجے میں سمجھ لی جائے۔لیکن یہ کون عقل والا مان سکتا ہے کہ نقاب پوش فتنہ پردازوں نے اگر پہلے سے ایک پروگرام طلبہ کو نہ دے دیا ہوتا تو محض اس معمولی تبادلہ الفاظ کے نتیجے میں سیکڑوں طلباء دفعتاً ہم آہنگی کے ساتھ ویسا ہی رقص شروع کر دیتے جیسا بال روموں میں دیکھا جاتا ہے۔وہ مجتمع طور پر کھڑے ہوگئے اور اُچھل کود کرنے لگے۔ان کی زبانوں پر نوع بہ نوع نعرے بھی تھے۔مفتی مردہ باد۔زندہ نہیں چھوڑیں گے۔مجلسِ مشاورت جہنم رسید۔مولانا اسد زندہ باد۔جمعیۃ علماء پائندہ باد۔

ذرا اندازہ کیجئے جمیل صاحب کی فہمائش اور ان نعروں میں کیا منطقی ربط تھا۔اسی وقت متعدد پکے ڈلے ڈائس پر آئے اور ہاتھوں ہاتھ یہ منظر بھی سب نے دیکھا کہ جلسہ گاہ کی نالی ڈھکنے کے لیے جو تختے ہم نے بچھوائے تھے انھیں طلباء نے اُٹھایا اور بندروال توڑنے لگے۔کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ کیا کر رہے ہو تو طلباء نے اس کا جواب تختوں کی بے رحمانہ بوچھار سے دیا۔راقم الحروف خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ بیان دیتا ہے کہ ایک شخص کے کسی طالبِ علم نے بھرپور تختہ رسید کیا جس سے وہ زمین پر اس طرح گرا جیسے مردہ چھپکلی گرتی ہے۔ہمارے رضاکاروں میں بزمِ حیات کے سکریٹری جناب محمد خالد صاحب بھی تھے۔انھوں نے اُس غریب کو اپنے ساتھیوں کی مدد سے ڈنڈا ڈولی کر کے اُٹھوایا اور سرکاری ہسپتال پہنچوایا جو قریب ہی تھا۔وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ مجروح کوئی شہری ہے۔ہیولیٰ اس کا ایسا ہی تھا۔لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تو غریب طالبِ علم ہی تھا اور مارنے والے طالبِ علم نے اسے شہری سمجھ کر تختہ رسید کیا تھا۔(یا ممکن ہے قصداً رسید نہ کیا ہو بلکہ سہواً ہی جا لگا ہو۔بہر حال یہ طے ہے کہ یہ بیچارہ طالبِ علم ایک طالبِ علم ہی کے ہاتھوں زخمی ہوا)

جب طلبہ کا رقص کسی طرح ختم ہی ہونے میں نہ آیا تو ہم لوگوں نے ہندوستان کے مشہور قاری جناب محمد ضیا صاحب کو قرأت کے لیے کھڑا کر دیا کہ شاید طلباء قرآن ہی کا احترام کریں۔ مگر واہ رے سیاست کا نشہ۔ قاری صاحب مسلسل دس منٹ سے بھی زیادہ قرأت کرتے رہے مگر کیا مجال کہ طلباء کے رویہ میں فرق آیا ہو۔ وہ جنگلی بندروں کی طرح اُچھل کود رہے تھے۔

شمس نوید عثمانی۔ جن کا ہر شناسا جانتا ہے کہ وہ کتنے صالح اور زہد مشرب نوجوان ہیں خدا کی قسم کھا کر بیان کرتے ہیں کہ قرأت کے دوران کہیں سے کتے کے بھونکنے کی آواز آئی تھی تو بعض طلباء نے کنایاتی انداز میں اس کا جوڑ قاری صاحب کی قرأت سے ملا کر قہقہہ اُڑایا تھا!

یہ کردار نہ جانے کتنے دلوں کو تڑپا گیا۔ اس تڑپ کے نتیجے میں اگر کسی غیرت مند مسلمان نے کسی طالب علم کے چانٹا جڑ دیا یا ڈلا مار دیا ہو تو ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ کچھ طلبہ یقیناً پٹے ہیں مگر انھیں ہم میں سے کسی نے نہیں مارا بلکہ بعض ان شہریوں نے مارا جو قرآن کی بے حرمتی دیکھ کر طلباء کو سمجھا رہے تھے اور جب طلباء نے فہمائش کا جواب گالی اور دست درازی سے دیا تو انھوں نے دو چار ہاتھ جڑ دیئے۔

ایک طالبِ علم کے چوٹ اس طرح آئی کہ اس نے ہزار والٹ کا بلب تختہ مار کر توڑا جس کے نتیجے میں بندوق جیسا دھماکا ہوا اور بلب کی کرچیں اس کے لگیں۔ کچھ چوٹیں اس لیے آئیں کہ جب وہ اسٹیج کی طرف سنگ باری کر رہے تھے تو چھتوں پر بیٹھے ہوئے ان محلہ داروں نے جو آئے ہوئے مہمانوں کی تقاریر سننے کے لیے بے چین تھے اس سنگ باری کو روکنے کے لیے ڈلے مارے۔ یہ ڈلے کچّے تھے۔ یا بعض نیم پختہ۔ ورنہ پتھر یا اینٹ کی شکل میں ہوتے تو زخمیوں کی صفیں لگ جاتیں۔ اب طلباء غول بیابانی کی طرح بھاگے اور جلسہ دوبارہ پُرسکون ہوا۔ مجمع اب بھی بہت تھا۔ ہم نے پنڈت سندرلال کو میکروفون کے سامنے بٹھایا۔ انھوں نے تقریر شروع کی۔ تقریر تمام تر اس پر تھی کہ جمعیۃ علماء کی قربانیاں سب سے زیادہ ہیں اور میرا پیارا بھتیجا اسد بہت اچھا ہے۔

عین اسی وقت خالد صاحب ہسپتال سے دوڑے آئے اور اسٹیج کے قریب آ کر دبی زبان سے بتایا کہ زخمی کے خون برابر جاری ہے۔ ہوش بالکل نہیں ہے اور ڈاکٹر اب تک گھر سے باہر نہیں نکلے ہیں۔ اس پر میں بے تاب ہو کر ننگے ہی پیروں اُٹھ گیا۔ اپنا بیگ، رومال، جوتا وہیں چھوڑا اور اسٹیج کے کنارے بیٹھے ہوئے ایک نوجوان سے چپل لے کر ہسپتال کی طرف جھپٹا۔ اب یہ بات خالد صاحب کو معلوم ہو چکی تھی کہ مجروح شہری نہیں طالبِ علم ہے۔ لیکن میرے لیے اس اطلاع کی اس وقت کوئی اہمیت نہیں تھی، وہ کوئی بھی ہو بہر حال انسان تھا۔ مظلوم تھا۔ میں نے اپنے ایک رفیق کو تلاش کر کے کچھ روپے دیئے کہ فوراً جاؤ اور ڈاکٹر کو گھر سے نکالو۔ وہ چلے گئے تو دفعتاً ایک صاحب نے بتایا کہ طلباء لاٹھیوں سے مسلح ہو کر پھر حملہ آور ہونے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ اس اطلاع کی بنیاد

دراصل یہ تھی کہ طلباء نے مدرسہ کا گھنٹہ بجا کر تمام ساتھیوں کو اکٹھا کر لیا تھا۔ نماز جنازہ یا کسی اور مقصد کے لیے طلباء کو جمع کرنا ہو تو ایک خاص آہنگ میں گھنٹہ بجانا دارالعلوم کی پرانی ریت ہے۔ اطلاع دینے والے نے نہ صرف گھنٹے کی بات بتائی بلکہ یہ بتایا کہ طلباء نے چار ساتھیوں کے شہید ہونے کی افواہ اُڑادی ہے۔ اس وقت بخاری کا سبق جاری تھا، اسے ختم کر دیا گیا اور ایک استاد صاحب نے طلباء سے یوں خطاب فرمایا کہ ڈوب کر مرجاؤ۔ تمہارے ساتھی شہید ہو گئے اور تم یہاں نظر آرہے ہو۔ یہ خطاب آگ پر تیل ثابت ہوا اور لڑکوں نے نعرے مارے کہ خون کا بدلہ خون سے لیں گے۔ پھر وہ لاٹھیوں سے مسلح ہو کر نکل کھڑے ہوئے۔

یہ اطلاع پا کر میں جلسے کے عقب میں ہسپتال کے قریب بعض شناساؤں سے مشورہ کرنے لگا کہ کیا کرنا چاہیے جلسہ جاری رکھیں یا ختم کر دیں۔ اس پر ایک کرم فرمانے تیز ہو کر فرمایا کہ آپ کیا باتیں کرتے ہیں۔ جلسہ جاری رہے گا، آپ کہیں تو میں دس منٹ کے اندر اندر پچاس ایسے لڑکے مہیا کر سکتا ہوں جو حملہ آوروں کو بچھا کر رکھ دیں گے۔

یہ کہنے والے مرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ یہ بھی میں جانتا تھا کہ ان کا کہنا تعلّی کے قبیل سے نہیں بلکہ سچ مچ وہ ایک لڑاکا گروہ میدان میں لاسکتے ہیں۔ لیکن سچی بات ہے یہ سوچ کر دل لرز گیا کہ دونوں طرف اپنے ہی بھائی ہوں گے اور نہ جانے کتنی جانیں ضائع ہو جائیں گی۔

میں کشمکش و پیچ میں پھنس گیا۔ اسی وقت پیشاب کی ضرورت بھی لاحق ہوئی۔ میں آگے بڑھ کر ایک گلی میں چلا گیا اور پھر استنجاء کر ہی رہا تھا کہ شور قیامت اُٹھا۔ مارو، پکڑو، بھاگو، باوجود فاصلے پر ہونے کے یہ نعرے بھی کانوں میں پڑے کہ مفتی کو مت چھوڑنا۔ عامر کو بھاگنے مت دینا۔ منظور نعمانی پکا بدمعاش۔ مجلسِ مشاورت مردہ باد۔ مولانا اسد زندہ باد۔ جمعیۃ علماء زندہ باد۔ تماشائی بھاگ کھڑے ہوئے تھے اور ان کے ریلے نے مجھے بھی بھاگنے پر مجبور کیا۔ کچھ دور چل کر رُکنا چاہا تو پیچھے سے کسی نے آواز لگائی کہ عامر صاحب رُکنا مت۔ بھاگے چلو۔ اس آواز کے ساتھ فرار آمادہ تماشائیوں کے ریلے نے مجھے اور بھی دھکیلا اور آخر کار چند ایسے حضرات نے جنھیں میں نہیں جانتا مگر وہ مجھے جانتے ہیں تحکمانہ انداز میں مجھ سے کہا کہ چلو سیدھے تھانے چلو۔ وہ لوگ تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔

میں نے حیرت سے کہا: ''تھانے والے مجھے کیوں ڈھونڈیں گے۔''

انھوں نے جھلا کر جواب دیا: ''تھانے والے نہیں، جنونی طلباء، وہ تمہاری تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں۔''

میرے دو احباب بھی اس وقت قریب ہی تھے انھوں نے بھی یہی کہا کہ تمہیں سوائے تھانے کے کہیں نہیں جانا چاہیے۔ پھر بہت سے آدمیوں کی حفاظت میں میں تھانے پہنچ گیا اور اسی دوران یہ بھی کان میں پڑا کہ طلباء کی ایک ٹکڑی دفتر تجلّی میں آگ لگانے چلی ہے تھانے میں اس وقت صرف دو سپاہی تھے۔ باقی اسٹاف یا تو رام لیلا کے جلوس میں لگا تھا یا جلسہ گاہ پہنچ چکا تھا۔

کچھ دیر بعد چند سپاہی ایک طالبِ علم کو پکڑے تھانے میں لائے۔ معلوم ہوا کہ یہ صاحب حملہ آوروں میں پیش پیش تھے۔ اتنے ہی میں میرے بعض ساتھی آگئے جنھوں نے بتایا کہ جلسہ گاہ خالی ہو چکی ہے۔ پولیس وہاں موجود ہے۔ طلباء نے شامیانے دریاں وغیرہ یکجا کر کے ہنڈوں کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی تھی پولیس نہ بجھاتی تو سارا محلہ لپیٹ میں آجاتا۔

اب ہم جلسہ گاہ پہنچے۔ مت پوچھئے کیا نظر آیا۔ ٹوٹے ہوئے تخت۔ چور چور ہنڈے۔ بکھرا ہوا ساز و سامان اور جلے بجھے کپڑوں کا انبار۔ سارے بلب ختم کئے جا چکے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر کی مشین چکنا چور تھی۔ مائک غائب تھا۔ لیکن اس وقت اس منظر سے درسِ عبرت لینے کے عوض دماغ تو متوجہ تھا ان مہمانوں کی طرف جن کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا کہ کہاں گئے اور کیا حشر ہوا۔ شدہ شدہ معلوم ہوا کہ حضرت مفتی عتیق الرحمٰن کو تقریباً پچاس لٹھ بند طالب علموں نے گھیر لیا تھا مگر فلاں فلاں نے سینہ سپر ہو کر انھیں بچایا۔ ان فلاں فلاں میں بعض طلباء بھی تھے اور بعض اہلِ محلہ بھی چند لاٹھیاں مفتی صاحب کے ضرور لگیں مگر وہ زندہ مدرسہ اصغریہ میں پہنچا دیے گئے۔ اب حملہ آوروں نے مدرسے کے دروازوں پر لاٹھیاں برسانی شروع کیں اور مفتی صاحب کے لیے مغلظ گالیاں نشر کرتے ہوئے مطالبے کرنے لگے کہ مفتی کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ تہس نہس کر دیں گے دو ٹولیاں برابر کی گلیوں میں عامر عثمانی کو ڈھونڈتی پھر رہی تھیں۔ خبیث، غنڈہ، یزیدی، دیّوث، یہی پیارے القاب و آداب لوگوں نے قاسمی شریف زادوں کی زبان سے سنے تھے۔ مفتی اور عامر عثمانی ہی کی تلاش میں ان بہادروں نے بعض گھروں تک میں گھسنے کی جسارت کی۔ ان کی درندگی کے نتیجے میں ایک عورت بے ہوش ہوگئی جسے پٹھانپورہ کے ڈاکٹر عطاء الرحمٰن کے زیر معالجہ سولہ گھنٹے بعد ہوش آیا۔ ایک اور خاتون چار گھنٹے بے ہوش رہیں۔ دو طالبِ علم عین اس وقت پٹے ہیں جب وہ ایک بند گھر کا دروازہ لاٹھیوں سے توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر انھیں ہم نے نہیں ان شہریوں نے مارا جو اُن کی دیوانگی آمیز حرکات پر قابو سے باہر ہو گئے تھے۔

خلاصہ یہ کہ مفتی صاحب کو بمشکل تمام زندہ بچا لیا گیا۔ باقی مہمانوں کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ افراتفری کے عالم میں دارالعلوم کے مہمان خانے ہی میں جا گھسے ہیں۔ خدا کی پناہ!

مہمان خانے میں کیا گزری یہ داستان سب سے زیادہ بھیانک اور شرمناک ہے۔ خدا کی قسم وہ لوگ میرے آس پاس موجود ہیں جو اپنی آنکھوں دیکھا یہ ماجرا حلف سے بیان کرتے ہیں کہ کچھ طالبِ علم ہاتھوں میں جوتا لیے مولانا منظور نعمانی کو گھیرے ہوئے تھے اور انتہائی کمینے لہجے میں کہہ رہے تھے کہ بتا مفتی کہاں ہے ورنہ تیری بھی وہی درگت کریں گے۔ تجھے بھی مزا چکھائیں گے۔ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی حیران و پریشان کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ پنڈت سندر لال ہق دق کہ یہ کہاں آ پھنسا! مہمان خانے کے گرد لٹھ بند طلباء کا گھیرا تھا دیوار سے پلنگ اور سیڑھیاں

لگا لگا کر مہمان خانے میں گھس گئے اور پھر وہ تذلیل مہمانوں کی کی ہے کہ اگر ان حضرات کا بیان کردہ تفصیلی ماجرا آپ کے سامنے دُہراؤں تو فرطِ اَلم سے آپ رو پڑیں۔ کمان ان طلباء کی بعض مدرسین کے ہاتھ میں تھی اور مدرسین کی فکری رہنمائی پتہ نہیں کون کر رہا ہوگا۔ ٹھیک ہے کہ بعض مدرسین ہی نے مولانا منظور نعمانی کو قتل سے بچایا لیکن یہ اس لیے نہیں کہ مولانا موصوف سے انھیں کوئی ہمدردی تھی؛ بلکہ اس لیے کہ سازش کی جو ہانڈی انھوں نے چڑھائی تھی اس میں ان کی خواہش سے کچھ زیادہ اُبال آگیا تھا اور اب وہ سہم رہے تھے کہ اگر اس اُبال نے ضرورت سے زیادہ ہلاکت مچادی تو کہیں ہمارا راز عین چوراہے پر فاش نہ ہو جائے اور ہماری گردنیں پھانسی کے پھندے کا منہ نہ دیکھنے پر مجبور ہوں!

کفِ دردہن طلباء چیختے پھر رہے تھے کہ مفتی کدھر ہے۔ ان کا خیال تھا کہ باقی مہمانوں کی طرح مفتی صاحب بھی مدرسے ہی میں کہیں چھپے ہوں گے۔ غسل خانے، پاخانے، تہہ خانے جھانکے جا رہے تھے۔ لپٹی ہوئی چٹائیاں تک کھول کھول کر دیکھی جا رہی تھی۔

جو کچھ گزرا اس کی مکمل تفصیلات اگر بیان کی جائیں تو دس ورق سیاہ ہو جائیں۔ اتنا ہی سمجھ لیجئے کہ جب مفتی صاحب نہ مل سکے تو پچاس آدمیوں سے زیادہ کا دستہ اسٹیشن پر لگایا گیا۔ اسٹیشن سے متصل شوگر مل ہے۔ اس کے کوارٹرس ہیں۔ کوارٹروں کے پیچھے یہ دستہ چھپا رہا۔ دہلی جانے والی ہر گاڑی پر نظر رکھی جاتی ہم لوگوں نے مفتی صاحب کو شام کے پانچ بجے روانہ کیا۔ اب تقدیر کی کرشمہ سازی دیکھئے کہ اس گاڑی پر تین وہ استاذ بھی پہنچے جو اگرچہ حملہ آور طلباء کے سرپرستوں میں شامل تھے اور اسکیم پوری طرح ان کے علم میں تھی لیکن اچانک انھیں یہ خیال گزرا کہ اگر مفتی صاحب مار ڈالے گئے تو نتائج بہت بھیانک نکلیں گے اور پولیس پوری اسکیم کا کھوج نکال لے گی لہٰذا مفتی صاحب کو زندہ ہی چلے جانے دو۔ بس اسی لیے وہ اسٹیشن پہنچے۔

اِدھر کمین گاہ میں چھپے ہوئے طلباء نے یہ خیال کیا کہ آنے والے اساتذہ تو ہمارے ہی ساتھی ہیں ضرور اسکیم کچھ بدل گئی ہوگی ورنہ وہ کیوں اسٹیشن آتے۔ یہ خیال کر کے وہ اپنی جگہ دُبکے رہے اور مفتی صاحب کی گاڑی روانہ ہوگئی۔ پھر یہ بات انھیں بعد میں معلوم ہوئی کہ پوری پارٹی کی اسکیم نہیں بدلی تھی، بلکہ تینوں اساتذہ نے اپنے طور پر فیصلہ کیا تھا کہ فی الحال مفتی صاحب کو زندہ چلے جانے دو۔ یہ پتا چلنے کے بعد داڑھیاں ان استادوں کی بھی نوچی گئیں مگر ظاہر ہے یہ اس کا اعتراف کیوں کرنے لگے۔ اس کی صحت پر مجھے اصرار بھی نہیں مگر جہاں تک باقی اسکیم کا تعلق ہے وہ میرے علم میں ایسے ذرائع سے آئی ہوئی ہے کہ اگر کوئی غیر جانبدار کمیشن بیٹھے تو میں اسے مطمئن کر سکتا ہوں۔ مولانا منظور نعمانی اور ڈاکٹر فریدی کس طرح سہارنپور روانہ کئے جاسکے، یہ بھی ایک کہانی ہے۔ طلباء نے موٹر روکنے کی کوشش کی تھی؛ مگر تقدیر کس کے بس کی ہے۔ دونوں حضرات پٹے ضرور مگر ٹوٹے پھوٹے نہیں۔

مولوی اسد آتے ہیں

اب ذرا ایک ڈرامائی موڑ بھی دیکھئے۔ پندرہ کی عین صبح میں مولوی اسعد صاحب دیوبند پہنچ جاتے ہیں۔ میرے پاس کوئی ایسی شہادت نہیں جسکی بنا پر یہ کہہ سکوں کہ ان کی یہ بروقت آمد پہلے سے طے شدہ اسکیم کا حصہ رہی ہو۔ یہ اتفاق بھی ہوسکتا ہے۔ مگر زریں اتفاق۔ لاجواب اتفاق۔ الہامی اتفاق۔ یہ مجھے بھی وثوق ہے کہ طلباء کو لاٹھیوں سے حملہ آور ہونے کا مشورہ ہرگز مولوی اسعد نے نہیں دیا ہوگا۔ مولوی اسعد بجائے خود زیرک اور مدبّر نہ سہی مگر جو برقعہ پوش گرگہائے باراں دیدہ انھیں ہینڈل کر رہے ہیں۔ بڑھا رہے ہیں۔ جھنڈے پر چڑھا رہے ہیں وہ کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں۔ ان کی اسکیم تو فقط یہ تھی کہ ہڑبونگ مچا کر اور سنگ باری کر کے جلسہ درہم برہم کر دیا جائے۔ لاٹھیوں سے حملہ، لوٹ مار، توڑ پھوڑ، آتش زنی ان کی ہدایات سے آگے کی بات تھی۔ لہٰذا اب فیصلہ یہ کیا کہ سفید جھوٹ پر کمر بستہ ہو کر طلباء کو مظلوم اور مجلسِ مشاورت والوں کو ظالم ثابت کرو۔ چنانچہ اگلے ہی دن اخبار الجمعیۃ میں یہ خبر چھپوادی گئی کہ مسلم لیگ اور جماعتِ اسلامی کے ذمہ داروں نے طلباء کو زدوکوب کیا۔

خیر یہ اخبار تو جانا پہچانا ایمان فروش ہے ہی (خبروں کی حد تک ورنہ شذرات اس کے اب تک ایمان فروشی کی نجاست سے پاک نظر آرہے ہیں) لیکن تعجب تو اس پر ہے کہ مولوی اسعد صاحب کی عین موجودگی ہی میں دارالعلوم کا احاطہ اس سفید جھوٹ کے جہری اعلان سے گونجنے لگا کہ مجلسِ مشاورت والوں نے طالبِ علموں کو مارا۔ چار پانچ دن دیوبند کے جیسے گزرے ہیں بیان نہیں ہوسکتا۔ مدرسے پر طلباء کا قبضہ تھا۔ دن رات جلسے تھے۔ نعرے تھے۔ نام بہ نام گالیاں تھیں۔ دھمکیاں تھیں جن کی گونج شہر بھر میں تھی اور لغوترین مطالبات کی ایک فہرست بھی رکھ دی گئی کہ یا تو اسے مانو ورنہ دارالعلوم کے احاطہ میں کسی کو قدم نہ رکھنے دیں گے۔

ایک مطالبہ تھا کہ اُن آٹھ نو ملازمین مدرسہ کو فوراً معزول کرو جو مجلسِ مشاورت کے جلسے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ دوسرا مطالبہ تھا کہ صدر جمعیۃ الطلباء اور ناظم کو خارج کرو۔ تیسرا مطالبہ تھا کہ مفتی عتیق الرحمٰن اور مولانا منظور نعمانی کو مجلسِ شوریٰ کی ممبری سے ہٹاؤ اور قطب العارفین فخر الکاملین حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ العالی کو ممبر بناؤ۔

پھر جب مہتمم صاحب نے کہا کہ مجلس مشاورت ہو یا کوئی جماعت۔ اس کے جلسے سے دلچسپی لینا یا اس میں شریک ہونا جرم کہاں ہے جس کی بناء پر میں آپ کا مطالبہ مانوں تو کھٹ سے ان طلباء کے مکار ہدایت کاروں نے ایک فہرست تیار کرا دی جس میں ایک خانے میں ''جارح'' کا نام اور ایک میں مجروح کا نام لکھا گیا۔ ظاہر ہے کہ جارح کے خانے میں وہی سب لوگ تھے جن کے معزول کرنے کا مطالبہ تھا اور مجروح کے خانے میں طلباء کا نام درج تھا۔ اب گویا الزام یہ بنا کہ ان سب نے ہمیں مارا ہے لہٰذا انھیں نکالو۔ مہتمم صاحب نے ایک کمیٹی بنادی۔ یہ کمیٹی طلباء

کے زبردست دباؤ کی فضا میں بنی تھی اس لیے قدرتاً اس میں ایسے ہی عناصر کا غلبہ یقینی تھا جن کا فیصلہ طلباء کے حق میں اور ہمارے خلاف جاتا؛ چنانچہ اس کمیٹی نے یہی سفارش کی کہ طلباء کے مطالبات مان لیے جائیں۔

مجلسِ شوریٰ کے کسی ممبر کا عزل یا نئے ممبر کا تقرر چونکہ مہتمم صاحب کے اختیار سے باہر کی چیز تھی؛ اس لیے یہ مطالبہ تو مجبوراً معلّق رکھنا پڑا؛ لیکن باقی مطالبے منوا لیے گئے۔ جلسے بازی کا اختتام اور تعلیم کا آغاز اسی وقت ہوا جب یہ فیصلہ طلباء کو سنا دیا گیا کہ مطالبات منظور۔ یہ الگ بات ہے کہ مفاد پرستوں کے ہاتھوں میں کھیلنے والے انگھڑ طلباء یہ ادراک نہ کر سکے ہوں کہ ان کے مطالبات کی منظوری محض ایک حکمتِ عملی ہے اور وہ وقت دُور نہیں جب ان کے سارے کس بَل نکال دیئے جائیں گے۔

آئیے اب ایک اور کہانی بھی سنئے:

اگلے ہی روز یعنی ۱۵/اکتوبر کو مقبوضہ جمعیۃ علماء کے چند اراکین کی بھیڑ دیوبند پہنچتی ہے۔ چشم بد دُور ان میں ایک صاحب ایم۔ایل۔سی بھی ہیں۔ ایک ایم۔ایل۔اے بھی ہیں اور فضلائے دارالعلوم بھی۔ انھیں بھیڑ کہنا ہے تو جسارت کی بات۔ لیکن میں کیا روں، قرآن نے خدا فراموش اور دنیا پرست لوگوں کو جانور بلکہ جانوروں سے بھی بدتر کہا ہے اس لیے اگر میں ان لوگوں کو جو موسیٰ علیہ السلام کے بالمقابل کھلم کھلا فرعونی کیمپ میں جاڈٹے ہیں اور حساب آخرت سے انھیں کوئی سروکار ہی نہیں "بھیڑ" کہہ دوں تو یہ ایک طرح کی رعایت ہی سمجھئے ورنہ جانوروں کی ڈاریں کہلاتی ہیں یا غول یا گلّے!

بہرحال یہ صاحبان آئے تھے اور ان کی رپورٹ ۲۱/اکتوبر کے الجمعیۃ میں چھپی ہے۔ رپورٹ کیا ہے امراض دماغی کا چارٹ ہے۔ تکبر، جانبداری، زباں درازی اور افسانہ طرازی کا پلندہ۔ آئیے ذرا طائرانہ سا جائزہ لیں۔

فرمایا جاتا ہے:

> "مجلسِ مشاورت نے نہ معلوم کن مصالح کی بناء پر ایسے دَور میں مجلسِ مشاورت کا جلسہ عام دیوبند کی سرزمین پر منعقد کرنا ضروری سمجھا جبکہ صوبے کے ہر شہر میں اور ملک کے گوشے گوشے میں طلباء کا عام ایجی ٹیشن ہو رہا ہے۔"

مصلحت میں عرض کروں۔ مجلسِ مشاورت بھولے بھالے عوام کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتی ہے کہ مقبوضہ جمعیۃ علماء کے کانگریس نواز اور حکومت پرست لوگ آنے والے الیکشن میں ان کی قسموں کا سودا کرنے جا رہے ہیں۔ ان کا گروہ اپنے مفادات کے تحت پھر کانگریس کی ڈگڈگی بجائے گا اور مسلم جماعتوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر کے حکومت سے انعام و اکرام حاصل کرے گا۔

اہلِ عقل غور فرمائیں۔ ملک بھر میں طلباء کا جو ایجیٹیشن ہو رہا ہے کیا اس میں کسی عربی مدرسے کے طلباء بھی

شامل ہوئے ہیں؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو وفد کی گل افشانی ''ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ'' سے زیادہ کیا حیثیت رکھتی ہے۔ دیوبند میں تو کالج اور اسکول کے طلباء نے بھی ایجی ٹیشن نہیں کیا پھر اس لایعنی ارشاد کا محل کیا تھا جسے الزام دینے کے انداز میں بازی گروں نے منہ سے اُگلا ہے۔

تفتیش کی یہ قسم بھی نرالی دیکھی کہ اُس جلسے کے کنوینر سے گفتگو کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی جسے لُوٹا کھسوٹا گیا تھا۔ واہ رے شعبدہ گرو۔ تشریف لائے۔ کھایا پیا اور چل دیئے۔ یہی تمہاری لیڈری، یہی تمہارا انصاف ہے۔

ہانک لگائی جاتی ہے کہ:

> ''یہ بھی معتبر ذریعے سے ہمیں معلوم ہوا اور معتبر لوگوں نے شہادتیں دیں کہ ان جلسے کے بانیوں میں دارالعلوم کے کچھ وہ ملازمین بھی شامل ہیں جو ہمیشہ سے قوم پرورانہ رجحانات کے خلاف رہے ہیں اور دارالعلوم کے طلبا میں جماعتِ اسلامی، مجلسِ مشاورت وغیرہ کی بنیاد ڈالنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں پیشتر سے پروپیگنڈے کے ذریعہ فضا ہموار کرنے کی سعی کرتے رہے ہیں۔ ان لوگوں نے ہی طلباء دارالعلوم پر سنگباری کی اور ان کو زخمی کیا۔ نیز پیشتر سے سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت قرب وجوار کے مکانات کی چھتوں پر ایسے لوگوں کو برقعہ پہنا کر بٹھادیا تھا تاکہ اسکیم کے تحت معترضین پر سنگ باری کرسکیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔''

ظاہر ہے کہ جو لوگ مقبوضہ جمعیۃ علماء کی خواہش اور مفاد کے مطابق شہادتیں دیں گے وہ تو ہر حال میں معتبر ہی مانے جائیں گے چاہے ان کی حیثیت دوکوڑی کی بھی نہ ہو۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود شہادتیں لینے والے حضرات کا اعتبار سوائے مسخروں کے کون کرسکتا ہے جبکہ وہ اسی فریق سے تعلق رکھتے ہیں جس نے سارا فتنہ برپا کیا۔ خیر سچ اور جھوٹ کا قصّہ تو چھوڑ یئے۔ سوال یہ ہے کہ یہ ''قوم پرورانہ رُجحانات'' کس چڑیا کا نام ہیں؟ کیا وفد کا سوانگ اسی لیے رَچایا گیا تھا کہ مسٹر چھاگلا کا چبایا ہوا لقمہ یہ لوگ دیوبند کی مقدس سرزمین میں بھی اُگلتے پھریں۔ نعوذ باللہ من ذلک وفد کا ایک ایک فردسُن لے کہ مقبوضہ جمعیۃ کے چند بے حیثیت گرگوں کے سوا دیوبند میں کوئی قوم پرور نہیں بستا۔ یہاں کسی کو قوم ووطن کے بتوں کی پوجا سے دلچسپی نہیں۔ یہاں وطن کے بہی خواہ ضرور بستے ہیں لیکن وہ بہروپیے نہیں بستے جو قوم پروری''اور وطن پرستی جیسی مغالطہ انگیز اصطلاحتوں کی آڑ میں اپنی خودساختہ قیادت کی دکان چمکانے کی تگڑم لڑاتے پھرتے ہیں۔

چھتوں پر برقعے پہنا کر بٹھانے کی بات بھی خوب ہے۔ دیوانہ گفت، ابلہ باور کرد۔ اگر واقعی کسی بیہودے نے وفد سے ایسی ہی بات کہی ہے تو اسے ہماری طرف سے یہ اطلاع پہنچا دیجئے کہ دیوبند ہجڑوں کی بستی نہیں ہے۔ یہاں مرد بستے ہیں۔ اگر انھیں کسی سے لڑنا ہی ہو تو سینہ تان کر آگے جاتے ہیں برقعے نہیں پہنتے۔ خصوصاً طلباء کی بھیڑ سے نمٹنے

کے لیے تو انھیں سینہ تاننے کی بھی ضرورت نہ ہوتی۔ کیاپدّی اور کیاپدّی کا شوربہ۔ ہم امن پسند اور بے خبر تھے اس لیے وقتی طور پر مار لیے گئے مگر اگلے جلسے کے وقت ہم دیکھیں گے کہ مقبوضہ جمعیہ علماء کی کلائیوں میں کتنی جان ہے۔ کسی کے جلسے میں گڑبڑ وہی لوگ کرتے ہیں جن کے پاس اپنے موقف کے لیے مضبوط دلائل نہیں ہوتے۔ انھیں خوف ہوتا ہے کہ حریف ہماری قلعی کھول دے گا لہٰذا غنڈہ گردی پھیلاتے ہیں۔ ہم غنڈہ گردی کا مقابلہ کریں گے اور بھولے عوام کو کانگریس نواز جمعیۃ علماء کی عیاریوں اور قوم فروشیوں سے آگاہ کر کے دم لیں گے۔

نام نہاد وفد کے پورے بیان کا پوسٹ مارٹم وقت کی بربادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ وہی لغو ولاطائل باتیں جن کا مقصود مظلوموں کو ظالم ٹھیرانا اور اپنی خفیہ اسکیموں پر پردہ ڈالنا ہے فرمایا جاتا ہے کہ "سوائے طلباء کے کوئی ایک شخص بھی مجلس مشاورت کا ہم نوا ایسا نہیں ملا جس کے جسم پر زخم یا چوٹ کا نشان ہو۔"

ارے مسخرو! دیوبند میں مجلسِ مشاورت کے ہم نوا تھے ہی کہاں جو تمہیں ملتے۔ یہ تو آٹھ دس نوجوان تھے جنھوں نے عاجز کی سربراہی میں ایک ایسا جلسہ کرانا چاہا تھا جس میں مجلسِ مشاورت والے اپنی بات شرح و بسط کے ساتھ پیش کر سکیں اور عوام کو یہ فیصلہ کرنے کا موقع ملے کہ وہ صحیح کہتے ہیں یا غلط۔ قوم دشمن ہیں یا قوم دوست۔ اچھے ہیں یا بُرے۔

اب انھی آٹھ دس نوجوانوں کو تو آپ نے جھوٹ کا طومار باندھ کر مجرموں کی فہرست میں درج کر دیا اور تلاش فرما رہے ہیں مجلسِ مشاورت کے خیالی حامیوں کی۔ چوٹیں نہ صرف دیسیوں شہریوں کے لگی ہیں بلکہ کھتولی اور مظفر نگر سے آنے والے سامعین کے بھی لگی ہیں؛ مگر ہمیں کسی کرائے کے وکیل کی طرح کوئی کیس ترتیب نہیں دینا تھا کہ مجروحین کو اِدھر اُدھر سے جمع کر کے آپ کے سامنے لاتے۔ نہ ہم نے کسی مضروب کو ہسپتال بھیج کر رپورٹیں حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہ تو آپ ہی کو مبارک کہ مضروب طلباء کا پروپیگنڈہ کریں اور یہ نہ دیکھیں کہ روشنی کا تمام نظام درہم برہم کر دینے کے بعد حملہ آوروں نے بہتیرے اپنے ہی ساتھیوں کو مار پیٹ دیا تھا۔

مفتی عتیق الرحمٰن کے سر اور کمر میں لاٹھیاں لگیں مگر ہم تو انھیں بھی ہسپتال اور تھانے نہیں لے گئے۔ ہم نے رَپٹ تک نہیں کی۔ ہمیں ذرہ برابر بھی اس کی فکر نہیں تھی کہ جلدی جلدی ایک جھوٹی مسل مرتب کر لیں تا کہ ہمارے ظلم اور مکاری کا پردہ فاش نہ ہو جائے۔ ہم تو مطمئن تھے اور ہیں کہ خدا سب دیکھ رہا ہے۔ وہ ہماری مدد کرے گا۔ جنگ کا میدان خود تم نے تجویز کر لیا ہے۔ چشم ماروشن دلِ ماشاد۔ جھوٹ، اکڑ، انبوہ اور فرعونی طمطراق کے ہتھیار لے کر تم آؤ۔ سچائی، عجز، عزم اور موسوی سادگی لے کر ہم آتے ہیں۔ مقابلہ ہوگا، ڈٹ کر ہوگا، چشم فلک نے بوجہل و بولہب سے لے کر ہٹلر اور اسٹالن تک کے بڑے بڑے لشکر دیکھے ہیں اور پھر ان کا انجام بھی دیکھا ہے۔ تمھیں فرعونیت پر ناز ہے ہمیں حضرت موسیٰ کے دیئے ہوئے پیغامِ حق وصداقت پر۔ تم مکاری کو نسخۂ کیمیا سمجھتے ہو، ہم

صاف گوئی اور جذبۂ سرفروشی کو۔تم دین بیچتے ہو ہم دنیا کے ٹھوکر مارتے ہیں۔تم ایوانِ اقتدار کی پشت پناہی پر اکڑے ہوئے ہو۔ہم خدائے بزرگ و توانا کی قوت کے آگے ہر اقتدار کو مکھی اور مچھر سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔تم قوم و وطن کے پجاری ہو۔ہمارا سجدہ سوائے بارگاہِ یزدانی کے کہیں نہیں ہوتا۔تم دنیا کا عیش چاہتے ہو ہمیں قبر کا سکون چاہئے۔تمہیں حکومت کی کاسہ لیسی سے فرصت نہیں ہمیں اپنا زیادہ وقت اپنے خدا کے آگے ماتھا رگڑنے،رونے اور دعا کرنے میں صرف کرنا ہے۔تم سمجھتے ہو کہ مار پیٹ کر ہم نے دیوبند میں مجلس مشاورت کی قبر بنادی۔ہم سمجھتے ہیں کہ تم نے خود اپنے تابوت میں ایک کیل کا اضافہ کیا اور مجلسِ مشاورت کو وہ زندگی دی جو ہمارے کئی جلسے نہ دیتے۔سن رکھو ہم پھر جلسہ کرنے جارہے ہیں۔اب کی توپ اور بندوق لانا۔اُن کرائے کے غنڈوں کو بھی لانا جنھیں شرابیں پلا پلا کر تم میرٹھ والے اجلاس میں لے گئے تھے۔

مزید سنئے!نام نہاد پہلا وفد ابھی گیا ہی تھا کہ مزید ایک وفد آپہنچا۔اسے بھی خیر سے جمعیۃ علمائے یوپی نے ہی ’’تحقیقاتی کمیشن‘‘ کے نام سے سپرد ریل کیا تھا۔اس کی شانِ نزول پر عش عش کیجئے۔ ۲۴/اکتوبر کے الجمعیۃ کے صفحۂ اوّل پر جمعیۃ علماء یوپی کی مجلسِ عاملہ کا پیشگی فیصلہ درج ہے کہ مجلسِ مشاورت اور جماعتِ اسلامی والے سازشی ہیں۔حملہ آور ہیں۔بدنہاد ہیں اور اسی خانہ زاد فیصلے کے ساتھ یہ مژدہ بھی سنایا جارہا ہے کہ ہم پانچ آدمیوں کا تحقیقاتی کمیشن بھیج رہے ہیں۔عدل و دیانت کے ساتھ ٹھٹول اور تمسخر کی اس سے بدتر مثال کیا ہوگی کہ بے تاج کے بادشاہوں نے ان ممتاز رہنماؤں کے بیانات کو نظر انداز کر کے جو عین موقع پر موجود تھے ایک بے سروپا فیصلہ پہلے ہی کرلیا اور پھر ارشاد ہوتا ہے کہ تحقیقاتی کمیشن بھیج رہے ہیں!

اتفاق کی بات ہے کہ جس دن یہ کمیشن دیوبند پہنچا راقم الحروف سہارنپور گیا ہوا تھا۔شام کو واپسی پر معلوم ہوا کہ میرے بعض رفقاء اسے بیان دے آئے ہیں۔یہ اطلاع میرے لیے تکلیف دہ تھی۔میں ہوتا تو غالباً اس کی نوبت نہ آتی۔بیان کے کیا معنیٰ جب کمیشن کی اُصولی حیثیت اُس چور کی سی ہو جو تعاقب کرنے والوں کے ساتھ ساتھ خود بھی چور چور کا نعرہ مارتا جارہا ہو،تاکہ لوگ اسے چور نہیں،تعاقب کرنے والوں میں سمجھیں۔

اگلے دن اس کمیشن کے ایک رکن اسحاق سنبھلی نے عاجز کے نام عنایت نامہ ارسال کیا تھا۔اس کا مفصل جواب میں نے دے دیا جس میں بالکل صراحت کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر واضح کردیا۔یہ جواب اور خط دونوں اسی ایشوع میں کسی جگہ دیئے جارہے ہیں۔

نکتے کی بات

مقبوضہ جمعیۃ اور کانگریس سرکار کے گن گانے والے اخبار بڑا واویلا مچا رہے ہیں کہ طلباء کے کارنامے کا جوڑ

مولوی اسدؔ صاحب سے کیوں لگاتے ہو۔ راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ یہ جوڑ بعض آثار و قرائن کی بنیاد پر لگایا جار ہا ہے۔ ان آثار و شواہد کو ابھی دلیل قطعی تو نہیں کہا جاسکتا؛ لیکن یہ دلیل قطعی بن جائیں گے اگر اتنے زبردست ہنگامے کے بعد بھی دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ میں کسی نے یہ مسئلہ اُٹھایا کہ مولوی اسدؔ صاحب کو ممبر بنایا جائے۔ تیکھا سوال دراصل یہی ہے کہ موصوف کو ممبر بنانے کی تگ و دو آخر کیوں شدومد سے جاری ہے کیا وجوہ ہیں جن کی بناء پر ان کا نام بار بار آتا ہے؟ طلباء تو خیر اس کے مجاز ہی نہیں کہ مجلسِ شوریٰ کی ممبری پر اظہار خیال کریں وہ جب باقاعدہ دستخطی مہم چلاتے ہیں تو خود بخود ثابت ہو جاتا ہے کہ انھیں آلۂ کار بنایا جار ہا ہے۔ اب تو اگر مجلسِ شورا کا کوئی ممبر بھی مولوی اسد صاحب کی ممبری کو قابل توجہ مسئلہ سمجھتا ہے تو یقین کر لینا چاہئے کہ وہ دارالعلوم کا خیر خواہ نہیں بلکہ جُٹ بندی کا رَسیا ہے ورنہ کوئی بھی مخلص آدمی ایسے مسئلے کے ذکر تک سے توبہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا جس کے نتیجے میں اتنا رُسوا کن اور شرمناک ہنگامہ برپا ہو چکا ہو۔ آنے والی مجلسِ شوریٰ میں اگر تمام ممبر اس پر متفق ہو جائیں کہ مولوی اسد کی ممبری کا سوال ہی کبھی زیر بحث نہیں آئے گا تب تو ہم عوام شاید یہ ماننے کے لیے تیار ہو جائیں کہ ۱۴راکتوبر کا ہنگامہ مولوی اسد کی سیاست کا شاہکار نہیں تھا۔ لیکن بحث پھر چھڑی تو یہ نتیجہ خود بخود نکل آئے گا کہ قیاسات بے بنیاد نہ تھے اور پردۂ زنگاری کے پیچھے ایک معشوق ضرور موجود ہے۔

آخری بات

طلبائے دارالعلوم کی جو تصویر اس ہنگامے کی خبروں نے ملک کے سامنے پیش کی ہے وہ بڑی گھناؤنی ہے لیکن حقیقتاً طلباء اتنے بُرے نہیں ہیں۔ ان کا بیشتر حصہ نہ صرف بے قصور ہے بلکہ کردار و خیالات کے اعتبار سے امتیازی شان رکھتا ہے۔ تھوڑے سے افراد بے شک بدگُہر ہیں لیکن یہ بھی دوسرے معصوم افراد کو اپنی بدعنوانیوں کا شریک نہیں بنا سکتے اگر بعض اساتذہ اور ملازمین ان کی پشت پر کام نہ کر رہے ہوں۔ آفت دراصل سب سے بڑی یہی ہے کہ گروہ بندی کے عادی افراد طلباء میں ہوا بھرتے ہیں۔ پھر یہ متعفن ہوا موقع بہ موقع اپنے خروج کی راہیں بناتی ہے۔ اللہ تعالیٰ دارالعلوم کا انجام بخیر کرے ہمیں سب سے بڑا فکر یہی ہے کہ شخصی عقیدتوں اور نفرتوں کے چکر کہیں اس درس گاہ ہی کو نہ لے ڈوبیں۔ یہ درس گاہ ہندوستانی مسلمانوں کے جسمِ ناتواں کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ یہ برباد ہوئی تو سمجھو سب برباد ہوا۔ ہم سیاسی لڑائیوں سے سخت متنفر ہیں لیکن دارالعلوم کو بربادی سے بچانے اور اس کی امتیازی حیثیت کو محفوظ رکھنے کے لیے ہمیں لڑنا پڑے گا۔ لڑنے کے ہتھیار اب تک تو زبان و قلم تک محدود تھے لیکن اب فریق ثانی لاٹھیاں، چھرے اور پتھر بھی نکال لایا ہے۔ اس کی گھٹیا جارحیت کا مقابلہ ہم جوابی لاٹھیوں سے نہیں کریں گے بلکہ ہمیں اپنے جسموں کو اتنا مضبوط کرنا ہوگا کہ لاٹھیاں ان سے ٹکرا کر ٹوٹ جائیں۔ پھر یہ فریق اپنی موت آپ مرجائے گا۔

ویسے دعا ہماری ہر حال میں اس فریق کے لیے یہی ہے کہ اے اللہ! اسے نیک توفیق دے۔ اس کے دل میں اتحاد و محبت کا جذبہ ڈال اور افتراق و نفرت کا ماءِ حمیم نکال۔ اس کے سینے کو حبّ جاہ و مال سے پاک کر دے اور اسے اخوتِ اسلامی کے جاندار احساس سے مالا مال فرما۔ اسے فرعونیت کی کفش برداری سے بچا اور اسے حضرت موسیٰؑ سے روحانی تعلق عطا فرما۔ ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ ہمارے سینوں کو ایک دوسرے کے لیے شفقت و حمیّت سے بھر دے۔ اگر ہم لڑتے رہے تو دین و دنیا دونوں ہی برباد ہیں۔ نعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا من سیّئات اعمالنا.

(ماہنامہ تجلی نومبر ۱۹۶۶ء)

......❖......

خط اور جوابِ خط

مہمان خانہ دار العلوم دیوبند

۲۵/اکتوبر ۱۹۶۶ء

بجناب محترم عامر عثمانی صاحب جرنلسٹ کنوینر جلسہ مجلسِ مشاورت دیوبند۔

محترم زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ۔ مزاجِ گرامی آں محترم کے علم میں اخبار و دیگر ذرائع سے آچکا ہوگا کہ دیوبند کے حالیہ ہنگامہ کی تحقیقات کے لیے ریاستی جمعیۃ علماء اُتر پردیش کا مقرر کردہ ایک تحقیقاتی وفد دیوبند آیا ہوا ہے اور مہمان خانہ دار العلوم میں مقیم ہے۔

اُمید کی جاتی تھی کہ آں محترم سے ملاقات ہوجائے گی، یہ اطلاع بھی ملی کہ جناب والا وفد کے پاس تشریف آوری کا قصد رکھتے ہیں؛ لیکن افسوس ہے ملاقات نہ ہوسکی۔ ہمارا خود ہی خدمتِ والا میں حاضری کا قصد تھا؛ مگر وفد کے رہنما مولانا محمد قاسم صاحب کی علالت کی وجہ سے یہ بھی ممکن نہ ہوسکا۔

اگر جناب والا تحقیقاتی وفد کو کوئی بیان دینا یا معلومات فراہم کرنا چاہتے ہوں تو براہِ کرم آج مغرب کے وقت (۶ بجے شام) تک کسی بھی وقفہ میں تشریف لاکر ممنون فرمائیے۔

جناب سے ملاقات اور گفتگو باعثِ مسرت اور شکریہ کا باعث ہوگی۔

والسلام اسحاق سنبھلی

سکریٹری وفد

جواب

مکرمی، سلام مسنون۔ عنایت نامہ ملا۔ بہت بہت شکریہ؛ لیکن آپ کو یہ غلط اطلاع دی گئی کہ خاکسار آپ کے وفد کی بارگاہ میں حاضری کا ارادہ رکھتا تھا۔ اپنا بیان میں اخبار کو دے چکا ہوں اور تفصیلی بیان آنے والے تجلّی میں پڑھ لیجیے گا۔ کسی ایسے وفد کو معلومات فراہم کرنے کی مجھے کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی جسے ترتیب ہی اس جماعت نے دیا ہو جس کا صحیح مقام میرے نزدیک مجرموں کا کٹہرہ ہے نہ کہ جج کی کرسی۔ خصوصاً آپ کے وفد کو معلومات فراہم کرنا تو سورج کو چراغ دکھانے کے مرادف ہوگا؛ کیونکہ آپ جس جماعت کی طرف سے تشریف لائے ہیں اس کا سرکاری

آرگن الجمعیۃ تو خود ہی معلومات فراواں کا خزینہ ہے واقعے کے اگلے ہی دن سے اس نے جن الہامی خبروں کی اشاعت شروع کر دی تھی۔ان کا گوناگوں سلسلہ آج تک جاری ہے اور ضرورت پڑے تو وہ یہ سلسلہ مہینوں جاری رکھ سکتا ہے۔ پھر بھلا آپ حضرات نے دیوبند تشریف لا کر اپنا قیمتی وقت کیوں برباد کیا۔عاجز کی رائے تو یہ تھی کہ تحقیقات کا ڈرامہ اسٹیج کرنے کے عوض آپ حضرات اخبار الجمعیۃ کے دفتر سے رجوع کرتے۔ وہاں کئی ایسے باکمال بزرگ موجود ہیں جنھیں دنیا کے کسی بھی واقعے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے کسی خارجی ذریعے اور تحقیق و تفتیش کے کھڑاگ کی ضرورت نہیں ہوتی؛ بلکہ اپنی الہامی صلاحیتوں سے وہ چشم زدن میں سب کچھ معلوم کر لیتے ہیں؛ چنانچہ انھیں دیوبند سے نوے میل دُور بیٹھے بیٹھے عین واقعے کی صبح پتہ چل گیا کہ سارا فساد مسلم لیگ اور جماعتِ اسلامی کے غنڈوں کا برپا کیا ہوا تھا۔

آپ کے اخبار الجمعیۃ کے محترم مدیر آئے دن اس تمسخر پر احتجاج کرتے رہتے ہیں جو ہماری حکومت عدل و رواداری کی قدروں سے کرنے کی عادی ہے؛ مگر گستاخی معاف! اسی اخبار کی ذمہ دار جماعت دن کی روشنی میں اُصول انصاف سے یہ استہزاء کرتے نہیں شرماتی کہ بجائے اپنی صفائی پیش کرنے کے اپنے ہی اراکین کا تحقیقاتی وفد بھیج رہی ہے، کیا دنیا اتنی احمق ہے کہ وہ یہ سامنے کی بات بھی نہ سمجھ سکے کہ مجلسِ مشاورت کے جلسے کو تاراج کرنے والے ہاتھ چاہے طلباء کے ہوں؛ لیکن دماغ اس کے پیچھے ٹھیک اسی جماعت کا ہوسکتا ہے۔جس نے مجلسِ مشاورت کی بیخ کنی اور تردید و مذمت کو اعلانیہ اپنا مشن بنا رکھا ہے۔

میں ضرور آپ سے ملتا اگر مجھے یہ توقع ہوتی کہ اخبار الجمعیۃ کے ذمہ دار حضرات میں آخرت کی جواب دہی اور دروغ و افترا کی کراہت و نجاست کا کچھ بھی احساس باقی رہ گیا ہے؛ لیکن جب میں صریحاً دیکھ رہا ہوں کہ یہ حضرات خوفِ خدا سے بے نیاز ہو کر مَن مانی خبریں گھڑتے ہیں اور ادنیٰ تحقیق سے پہلے ہی واقعات کو اپنے مفادات اور پالیسیوں کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرنا کوئی گناہ نہیں سمجھتے تو پھر میں کیا توقع کرسکتا ہوں کہ آپ حضرات اپنی ذاتی دیانت اور خداترسی کے باوجود اس گروہ کی سوچی سمجھی پالیسی اور ترشی ترشائی سیاست سے انحراف کر کے سچ کو سچ اور ظالم کو ظالم کہنے کا ''گناہ'' مول لے سکیں گے۔آپ مجھے نظرانداز کر کے اپنی ڈیوٹی ادا کریں۔ میں تو اپنا مقدمہ صرف اس عدالت میں رکھوں گا جہاں کوئی کسی کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ پھر میں دیکھوں گا کہ کون ظالم اور سیاسی شعبدہ گر خدا کی گرفت سے بچ سکتا ہے۔

خط کچھ تلخ ہوگیا۔جس کے لیے عفو چاہوں گا۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا کہ تحقیق کے مرحلے سے گزر کر آپ جو بھی رپورٹ دیں یہ پیش نظر رکھ کر دیں کہ یہ دنیا کی زندگی بہت جلد ختم ہونے والی ہے۔ یہاں کے مفادات یکسر حقیر ہیں اور کل ہم سب کو اپنے رب کے حضور ایک ایک پائی کا حساب دینا ہے۔

ویسے آپ حضرات غریب خانے پر تشریف لانا چاہیں تو اہلاً وسہلاً مرحباً۔ محترم مولانا محمد قاسم صاحب کی عیادت میری طرف سے فرمادیں۔ وہ اگر غریب خانے پر تشریف لانے کے لیے کوئی سواری استعمال کریں تو اس کا کرایہ میرے ذمہ ہوگا مدرسے کے مہمان خانے میں حاضری تو میرے بس میں یوں بھی نہیں کہ ۱۴/اکتوبر کی رات سے ۱۵/کی دوپہر تک مولانا منظور نعمانی اور ڈاکٹر فریدی وغیرہ کے ساتھ جولرزہ خیز اور شرمناک سلوک میرے قاسمی بھائیوں نے کیا ہے۔ وہ اسلامی اخلاق کے سینے میں خنجر گھونپ دینے کے مرادف ہے اور اس کا اثر اتنا تو یقیناً پڑنا ہی چاہیے کہ رحمت کے فرشتے اس وقت تک اس میں داخل نہ ہوں جب تک مجرمین کیفرِ کردار کو نہ پہنچیں اور دارالعلوم مظلوموں سے معافی نہ مانگے۔

آپ کا مخلص

عامر عثمانی (فاضل دیوبند)

دو پوسٹر

دیوبند کے ہنگامے کے سلسلے میں جہاں اخبار الجمعیۃ نے سفید جھوٹ، یاوہ گوئی، افترا پردازی اور ہرزہ سرائی کا نیا ریکارڈ قائم کیا وہیں دیوبند کے چند شہریوں نے بھی دروغ بافی اور حق پوشی میں کسر نہیں چھوڑی۔ تمام شہر طلباء کے المناک طرزِ عمل پر غمزدہ تھا؛ لیکن مقبوضہ جمعیۃ علماء کے چند پروانے کوشش کرتے پھر رہے تھے کہ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکیں، تاکہ اُس خفیہ اسکیم کا پردہ فاش ہونے سے رہ جائے جو اس سارے ہنگامے کے عقب میں تھی۔

اسی ناپاک کوشش کے چکر میں ان لوگوں نے ایک اشتہار لکھا اور کانگریسی ٹوپی لگانے والے کچھ ہرکاروں کے ذریعہ سو کے قریب دستخط اس پر شہریوں سے حاصل کیے۔ پھر "اظہارِ حقیقت" کا عنوان دے کر اسے پوسٹر کی شکل میں نہ صرف دیواروں پر چسپاں کرایا؛ بلکہ الجمعیۃ میں بھی چھپوایا۔ خلاصہ اس پوسٹر کا یہ تھا کہ ساری بدمعاشی مجلسِ مشاورت کے چٹوں پٹوں کی ہے اور انھوں نے ہی طلباء کی توہین و تذلیل اور قتل و غارت گری کا پروگرام بنایا تھا۔ ہم اہلِ شہر ان کی اس حرکت سے بے زار ہیں اور خوب سمجھتے ہیں کہ یہ سب کیا دھرا دارالعلوم کے خاندانی دشمنوں کا ہے۔

الجمعیۃ پڑھ پڑھ کر دیوبند کے شہری سڑکوں دکانوں اور ہوٹلوں میں جس قدر گالیاں مقبوضہ جمعیۃ علماء کے دروغ بافوں کو دے رہے تھے، ان میں اس پوسٹر نے اور اضافہ کر دیا؛ کیونکہ واقعات سب ان کے سامنے پیش آئے تھے اور یہ بات نہایت اشتعال انگیز تھی کہ چند ہرزہ سرا دن دہاڑے اُلٹی گنگا بہائیں۔ حالتِ جوش میں بہتیرے شہری ان لوگوں کی طرف دوڑے جن کے نام اس پوسٹر میں دیے گئے تھے اور ان سے پوچھا کہ ظالمو! یہ کیا اندھیر ہے تم نے ایسے جھوٹ کے پلندے پر دستخط کیسے کیے؟ اس پر جس طرح کے جوابات ان دستخط کرنے والوں نے دیے ان کا نمونہ یہ ہے:

"جناب! ہمیں تو یہ بتایا گیا تھا کہ ہنگامہ ختم کرنے کے لیے ایک مصالحتی تحریر لکھی گئی ہے، اس پر دستخط کر دو، ہم نے بغیر پڑھے دستخط کر دیئے"۔

"صاحب! فلاں شخص نے کہا تھا کہ فلاں صاحب نے اس پر دستخط کرنے کو کہا ہے، ہم نے اعتبار کرکے کر دیے ہمیں کیا خبر تھی کہ مضمون کیا ہے"۔

"بھئی! مجھ سے تو فلاں نے یہ کہا تھا کہ پٹواری نے فلاں کاغذ بھجوایا ہے ذرا دستخط کر دو"۔

"کون کہتا ہے میں نے دستخط کیے۔ مجھ سے کہا بے شک گیا تھا؛ مگر میں نے انکار کر دیا۔ اب اس دھاندلی کا کیا علاج ہے کہ پھر بھی میرا نام چھاپ دیا گیا ہے"۔

''اجی دیکھا! تو ہم نے بھی جلسے میں سب کچھ تھا؛ مگر سچی بات ہے فلاں شخص تو اگر ہم سے ہمارے محضرِ قتل پر بھی دستخط کو کہے تو ہم کر دیں گے''۔

ان نمونوں سے حقائق کا اندازہ فرمالیجیے۔ دستخط کرنے والوں میں سے دو صاحبان کو تو اتنا غصہ اس فریب کاری پر آیا کہ انھوں نے جوابی پوسٹر چھاپنے کا عزم کیا اور پھر ان کی طرف سے جو پوسٹر چھپا ہے اس نے فریبی گروہ کی ساری تگ ودو پر اس طرح پانی پھیر دیا کہ اب وہ منھ چھپائے پھر رہا ہے اور مجال نہیں کہ کسی شریف آدمی سے آنکھ ملا سکے۔

اس جوابی پوسٹر کو آپ بھی ملاحظہ فرمالیں تاکہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے!

اظہارِ حقیقت - یا - کورا ناٹک

جب آدمی آخرت کے حساب کتاب سے بے پروا ہو جاتا ہے تو جھوٹ، جعل سازی اور مکّاری اس کے لیے کس قدر آسان ہو جاتی ہے۔ اس کا شرم ناک نمونہ وہ پوسٹر ہے جو''اظہارِ حقیقت'' کے نام سے شائع ہوا ہے، ایک بار کسی گمراہ آدمی نے حضرت علیؓ سے کہا تھا کہ تم کافر ہو اور دلیل میں قرآن کی ایک آیت پڑھی تھی۔ اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ'' آیت تو حق ہے؛ مگر اس کا استعمال باطل ارادے سے کیا گیا ہے''۔ ٹھیک اسی طرح پوسٹر لکھنے والے نے طلباء کے لیے مہمانانِ رسول تو بجا کہا؛ لیکن ان مقدس الفاظ کی آڑ میں اس کا یہ کوشش کرنا کہ طلباء کی مسلح غارت گری اور وحشیانہ لوٹ مار پر جھوٹ کا پردہ پڑا رہے، پرلے سرے کی شیطنت اور دغابازی سے کم نہیں ہے، جعل سازی اور ایمان فروشی کی حد ہوگئی کہ پوسٹر میں تقریباً سو نام بھی اپنی تائید میں دے دیے گئے۔ یہ ہے بے حیائی اور ڈھٹائی کا ننگا ناچ۔ ہم چیلنج کرتے ہیں کہ اہلِ شہر تین نیک آدمیوں کی کمیٹی بٹھائیں تو ہم اس کے سامنے ثابت کر سکتے ہیں کہ ان ناموں میں اسّی فیصد بوگس ہیں۔

لوگو! غور سے سنو! پوسٹر لکھنے والا اگر سچ مچ مسلمان ہے تو سچ اور جھوٹ کے فیصلے کے لیے ہم یہ طریقہ پیش کرتے ہیں کہ حضرت مہتمم صاحب یا علامہ ابراہیم صاحب کے مکان پر علماء اور معززین شہر کی مجلس میں ہم اور وہ ہاتھ پر قرآن رکھ کر اور طلاق مغلظہ کی قسم کھا کر بیان دیں کہ جلسہ میں کیا دیکھا! یہ ہے سیدھا اور سچا اسلامی طریقہ، اگر پوسٹر لکھنے والا بے ایمان نہیں ہے تو اسے منظور کرے، نہیں منظور کرتا تو سمجھ لو کہ پکّا دغاباز اور ابلیس کا شاگرد ہے۔

یہ سوانگ بھی دیکھیے، باہر کے مہمانوں کی بے عزتی پر مگرمچھ کے آنسو بہائے جا رہے ہیں اور اسی کے ساتھ اپنے خاص گرگوں کو یہ غیرت بھی دلائی جا رہی ہے کہ'' دلّی دُور نہیں ہے اور دلّی سے آنے والے بتلا رہے ہیں کہ وہ (مفتی عتیق) معمولات کے مطابق کام کر رہے ہیں''۔ گویا قتل کا جو ناپاک ارادہ ناکام رہ گیا اسے دلّی جا کر پورا کرنے کی عیارانہ تلقین کی جا رہی ہے، اس شیطانی مکّاری کی کوئی حد ہے۔

اے اللہ! تُو دیکھ رہا ہے، ہم اپنا معاملہ تیرے ہی حوالے کرتے ہیں۔ اگر ہم نے ظلم کیا ہو تو تجھے قسم ہے

اپنے قہر وغضب کی کہ ہمیں دنیا میں بھی تباہ و برباد کر اور آخرت میں بھی دوزخی بنا؛ لیکن اگر ہم مظلوم ہیں تو ہماری مدد فرما اور ظالموں کو یہ احساس دے کہ سفید جھوٹ، افترا پردازی، ظلم کی وکالت اور چند روزہ زندگی کے لیے ناپاک سیاست کے فریب آمیز کھیل مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ

اخبار ''الجمعیۃ'' نے واقعے کے اگلے ہی دن سے جھوٹ اور افترا پردازی کا جو طومار باندھ رکھا ہے، اس سے یہ قیاس بھی مضبوط ہوتا ہے کہ طلباء کی ڈور کوئی اور ہلا رہا تھا ورنہ کیا ضرورت پڑی تھی کہ تحقیق و تفتیش کے بغیر ہی اخبار ''الجمعیۃ'' یک رُخا، اوندھا اور سراسر من گھڑت پروپیگنڈہ شروع کر دے۔ اہلِ عقل غور فرمائیں یہ واضح رہے کہ طلباء ہمیں پہلے بھی عزیز تھے اور آج بھی عزیز ہیں۔ شکایت یہ صرف ان طلباء کی ہے کہ جو کسی فتنہ پرور اور اقتدار پرست گروہ کا آلۂ کار بن کر ہنگامہ آرائی کر رہے ہیں اور معصوم طلباء کو انھوں نے اپنے ساتھ لگا لیا ہے۔

(۱) حاجی صغیر احمد نمبردار (۲) حاجی امیر حسن (۳) حکیم عزیز احمد کھڈّے والے (۴) حافظ ظہیر حسن ٹمبر مرچنٹ (۵) جمیل مہدی (جرنلسٹ) (۶) اطہر قدوسی سکریٹری ری پبلکن پارٹی دیوبند (نمبر ۲ و ۳ وہ لوگ ہیں جن سے اظہارِ حقیقت والے پوسٹر پر دھوکہ سے دستخط لیے گئے)

....

یہ پوسٹر صرف مقامی دروغ بافوں کے لیے ہی نہیں؛ بلکہ ملک بھر کے ان تمام قلم کاروں کے لیے سرمۂ بصیرت ہے جو دُور بیٹھے خیالی گھوڑے دوڑا رہے ہیں، انھوں نے ''الجمعیۃ'' اور چند کانگریس نواز اخباروں میں اوندھی سیدھی خبریں پڑھ لیں اور لگے مضمون نویسی کرنے، حالانکہ اگر وہ خود دیوبند موجود ہوتے تو دانتوں میں اُنگلی دے جاتے کہ مقبوضہ جمعیۃ علماء پستیِ کردار اور بے ضمیری کی کس ارذل سطح پر اُتر آئی ہے۔

رہے وہ لوگ جو بے خبری یا غلط فہمی کی بنا پر نہیں؛ بلکہ جانبداری کی ذہنیت سے قلم اور زبان گھس رہے ہیں، انھیں تو یہ پوسٹر کیا وحیِ آسمانی بھی ان کی روش سے نہیں ہٹا سکتی۔

بہر حال! تمام دنیا سن لے کہ اس جوابی پوسٹر کے بعد تمام دروغ بافوں کو سانپ سونگھ گیا ہے اور بجائے چیلنج قبول کرنے کے باتیں ملائی جا رہی ہیں کہ جو کچھ ہوا ہو گیا اب رفع دفع کرو۔

رفع دفع تو خیر دنیا میں ہر چیز ہو ہی جاتی ہے؛ مگر اخبار ''الجمعیۃ'' کی ناک میں بھی نکیل ڈالو جس نے جھوٹ کا ریکارڈ توڑ ڈالنے کی قسم کھالی ہے اور مجلسِ مشاورت کے خلاف زہر اُگلے بغیر جسے چین ہی نہیں آتا، یہ اگر حملوں سے باز نہیں آتا تو ہم سے کیوں توقع کرتے ہو کہ اپنا دفاع نہیں کریں گے، افتراق بین المسلمین کا بیڑا مقبوضہ جمعیۃ علماء نے اُٹھایا ہے نہ کہ ہم نے۔ ہم تو اتحاد و اشتراک کی دعوت دیتے ہیں۔ مجلسِ مشاورت نام ہی ہے اُس اسٹیج کا جس پر مسلمانوں کے تمام اربابِ حل وعقد جمع ہو کر ملک وملّت کی بہبودی کے راستے سوچیں۔

سُن تو سہی......

مسلم مجلس مشاورت کے جلسے میں مولوی اسعد مدنی صاحب کے اشارے پر برپا کیے گئے فساد کی زد میں آنے والے اور وہاں موجود دوسرے لوگوں کے بیانات۔　(ابوعکاشہ)

ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کا بیان

ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی صدر مجلس مشاورت یو، پی نے معاصر ''قائد'' کو ایک خصوصی انٹرویو میں جمعہ کے دن دیوبند کے جلسۂ عام میں ہلڑ بازی اور غنڈہ گردی کے انتہائی مذموم وقوعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ الزام لگایا کہ یہ سارا معاملہ پہلے سے تیار کردہ منصوبہ کے مطابق ہوا ہے جس کا مقصد مجلس کی قیادت کو بدنام کرنا اور رہنماؤں کے کردار کو تباہ کرنا تھا۔ یہ پورا بیان معاصر مذکور کے شکریے سے درج ذیل کیا جارہا ہے۔

ڈاکٹر فریدی نے بتایا کہ ہم لوگ مقررہ پروگرام کے مطابق جمعہ کے دن دیوبند پہنچے۔ دارالعلوم دیوبند کے مہمان خانے میں ہمیں ٹھیرایا گیا۔ وہاں کے منتظمین اور اساتذہ ہم سے ملنے آئے اور سب نے ہمارا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔

نمازِ جمعہ ہم لوگوں نے وہاں کی جامع مسجد میں ادا کی، دونوں وقت کا کھانا بھی وہیں مہمان خانے میں کھلایا گیا اور چائے سے ہماری تواضع کی گئی۔ ہم مہتمم دارالعلوم مولانا محمد طیب صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے، وہ ہم لوگوں کے ساتھ بڑے اخلاق سے پیش آئے، مجلسِ مشاورت کے کاموں کے بارے میں تبادلہ خیال ہوتا رہا۔

رات کے کھانے اور نمازِ عشاء کے بعد ہم لوگ جلسہ گاہ پہنچے جو دارالعلوم سے خاصے فاصلے پر واقع ہے۔ وہاں قریباً ۵،۶ رہزار کا مجمع تھا؛ بلکہ جگہ کی تنگی محسوس ہو رہی تھی۔

جلسہ میں مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، پنڈت سندرلال، مسٹر سید مظہر امام بھی تشریف رکھتے تھے۔ یہ تینوں حضرات تھوڑی دیر پہلے دلّی سے پہنچے تھے، ان کے علاوہ مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا عاقل الہ آبادی بھی موجود تھے۔ جلسہ گاہ میں پورا سکون تھا کسی ہنگامہ کا شبہ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

تلاوتِ قرآن مجید سے جلسہ کی کارروائی شروع کی گئی۔ تلاوت کے بعد ایک صاحب نے نظم پڑھنی شروع کی تو جلسہ کی ایک جانب کھڑے ہوئے کچھ لوگوں نے ہوٹنگ شروع کردی۔ اس وقت اندازہ ہوا کہ کچھ لوگ تسخری کے ارادے لے کر آئے ہیں۔ جب تک نظم ہوتی رہی ہوٹنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ نظم کے بعد ایک صاحب نے اپنا مقالہ شروع

کیا جس میں ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر بڑی مدلل اور سنجیدہ اور موثر گفتگو کی گئی۔ اس مقالے کے دوران میں بھی شور وشغب اور ہنگامے کی کوشش جاری رہی۔ یہ ہنگامے کی کوشش کرنے والی ایک خاص ٹولی تھی، جن کی صورتیں طالب علموں کی سی تھیں۔ یہ ایک طرف کو کھڑے ہوئے تھے اور بار بار کہنے کے باوجود بیٹھتے نہیں تھے۔

جب مقالے کے دوران ان کی خلل اندازی کا سلسلہ جاری رہا تو مقالہ پڑھنے والے صاحب کو کہنا پڑا کہ آپ لوگ یا تو خاموشی کے ساتھ سنیے یا پھر یہاں سے چلے جائیے، اِس پر ان لوگوں نے مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کا نام لے کر ان کے خلاف نعرے لگانا شروع کر دیے اور اسی کے ساتھ خود انھوں نے اور جلسہ کے بعض دوسرے گوشوں پر کھڑے ہوئے ان کے ساتھیوں نے اینٹ پتھر پھینکنے شروع کر دیے اور تھوڑی دیر کے لیے سخت انتشار کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ جلسہ کے صدر بابو محمد حنیف اور بعض دوسرے مقامی صاحبان نے مجمع سے پُرسکون ہو کر بیٹھنے کی اپیل کی۔

چنانچہ جلسے میں پھر سکون پیدا ہوگیا اور سب سے پہلے پنڈت سندر لال جی کی تقریر شروع ہوئی۔ پنڈت جی کی تقریر اثر میں ڈوبی ہوئی تھی اور ان کے بہتے ہوئے آنسوؤں نے اس کو اور زیادہ مؤثر بنا دیا تھا۔ ابھی تقریر صرف آدھ گھنٹہ ہوئی تھی کہ کچھ لوگ سروں پر تولیے لپیٹے اور پاجامے اُوپر چڑھائے لاٹھیوں سے مسلح ہو کر جلسہ پر ٹوٹ پڑے، یہ غالباً اینٹوں کا خاصا ذخیرہ اپنے ساتھ لائے تھے، انھوں نے بے تحاشا اینٹ پتھر برسانے شروع کیے اور ڈائس کو اپنا خاص نشانہ بنایا، قدرتی طور پر مجمع منتشر ہونے لگا جو حضرات ڈائس پر بیٹھے تھے ان میں سے بہت کم ایسے تھے جو اینٹ پتھر کا نشانہ نہ بنے ہوں۔ بے حد دُکھ اس بات کا ہے کہ قوم کے بزرگ پنڈت سندر لال جی بھی نہیں بچے۔ ایک اینٹ مولانا عاقل الٰہ آبادی صاحب کی ران پر لگی۔ مسٹر مظہر امام کا سر زخمی ہوا۔ اور بھی متعدد حضرات زخمی ہوئے۔ یہ رنگ دیکھ کر جلسے کے منتظمین نے ڈائس پر بیٹھے ہوئے حضرات کو ایک گوشے کی طرف ہٹا دیا اور اس دوران میں مفتی عتیق الرحمٰن صاحب پر لاٹھیوں سے حملہ کیا گیا اور ان کے سر میں بہت سخت چوٹ آئی۔ ان ہنگامہ بازوں کا خاص نعرہ یہی تھا "مفتی کو مار ڈالو، یہ جمعیۃ علماء کو توڑنا چاہتا ہے"۔ ان ہنگامہ بازوں اور ان کے طرزِ عمل سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ان کا تعلق جمعیۃ العلماء کے اس گروہ سے ہے جو مفتی عتیق الرحمٰن سے خاص پرَخاش رکھتا ہے۔ ہمیں انتہائی افسوس کے ساتھ حیرت ہوئی کہ جمعیۃ کا یہ عنصر کتنی پستی پر اُتر آیا ہے۔ ہم لوگ جلسہ گاہ سے مہمان خانہ آگئے۔ تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا ہے کہ طلباء کی ایک جماعت نے مہمان خانہ گھیر لیا ہے انھوں نے شور مچانا شروع کر دیا "مفتی عتیق الرحمٰن چھپ گیا ہے، اسے نکالو ہمارے حوالے کرو" قریب قریب رات بھر یہ محاصرہ اور ہنگامہ جاری رہا۔ دارالعلوم کے چند اساتذہ ہمیں ان شر پسند طلباء سے وہاں بچانے کی برابر کوشش کرتے رہے اور ہم لوگوں کو اطمینان دلاتے رہے کہ آپ کی حفاظت کے لیے ہم اپنی جانیں دے دیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ مفتی صاحب مجروح ہونے کے بعد مہمان خانہ واپس نہیں آئے تھے؛ لیکن ان طلباء کو کسی نے باور کرایا تھا کہ وہ مہمان

خانے میں چھپے ہوئے تھے ۔ بالآخر صبح کو کچھ طالب علم ان کو مہمان خانے میں تلاش کرنے آئے اور یہ دیکھ کر واپس چلے گئے کہ وہ یہاں نہیں ہیں ۔ پنڈت سندرلال جی بھی مہمان خانے میں محصور ومقید رہے ۔ جب ان کا محاصرہ ختم ہوا اور وہ دہلی کے ارادے سے اسٹیشن جانے لگے تو انھیں معلوم ہوا کہ مولانا اسعدؔ میاں اس وقت دیوبند میں ہیں، وہ ان کے پاس پہنچے اور ان کو وہ تعلقات یاد دلائے جو پنڈت جی کے ساتھ ان کے والد ماجد مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کے رہے ۔ یہ بھی انھوں نے یاد دلایا کہ میں جیل میں اتنی مدت تک ان کے ساتھ رہا ہوں، مجھے بڑا دکھ ہوا کہ دیوبند میں تمھارے آدمی یہ حرکتیں کریں اور میرے ساتھ یہ برتاؤ کیا جائے ۔ معلوم ہوا کہ اسعد میاں نے اس کے جواب میں کہا کہ میں تو ابھی صبح پانچ بجے دیوبند آیا ہوں، مجھے کچھ خبر نہیں اور میرا ان واقعات سے کوئی تعلق نہیں ۔ پنڈت سُندر لال ان کی اِس بات کو تسلیم نہیں کرسکے اور اپنے پروگرام کے مطابق دہلی روانہ ہوگئے ۔

ہم لوگ دیوبند سے بذریعہ موٹر سہارنپور پہنچے جہاں پہلے سے ۱۵ر اکتوبر کو مجلسِ مشاورت کا جلسہ قرار پاچکا تھا ۔

سید مجتبیٰ صاحب وکیل ہمارے بعد ٹرین سے آئے اور انھی سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جناب مفتی عتیق الرحمٰن صاحب پر حملہ ''قاتلانہ'' کیا گیا؛ لیکن اللہ نے ان کو بچالیا اور ان کے سر میں سخت چوٹ آگئی ہے جس کی وجہ سے وہ آج کے جلسہ میں شرکت نہیں کرسکیں گے ۔ سہارنپور آکر ہمیں معتبر ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دیوبند کے جلسہ میں جو ہنگامہ ہوا تھا اس کے لیے مولانا اسعد میاں کے خاص آدمی کئی دن پہلے سے اس کی تیاری کر رہے ہیں، انھوں نے اس کا پورا منصوبہ بنایا تھا ۔ اور جو کچھ ہوا اس کے مطابق ہوا ۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ طالبِ علموں کا جو گروہ مہمان خانے کا محاصرہ رات میں کر رہا تھا وہ تھوڑی دیر کے بعد اپنے مطالبات کا اعلان بھی کرتا تھا:

(۱) مولانا اسعد میاں کو دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کا ممبر بنایا جائے (۲) مفتی عتیق الرحمٰن کو مجلسِ شوریٰ سے نکالا جائے (۳) ان سب اساتذہ اور مختلف شعبوں کے ملازمین کو الگ کیا جائے جو مفتی عتیق الرحمٰن سے تعلق رکھتے ہیں ۔

یہ بات ظاہر کردینا بھی ہمارے لیے ضروری ہے کہ اس ہنگامے میں دارالعلوم کے تقریباً ڈیڑھ ہزار طلبہ میں سے بہت تھوڑے سے شامل تھے اور لوگوں نے بتایا کہ ان میں زیادہ تر ضلع مظفرنگر کے تھے اور بعضے بہار کے بعض علاقوں کے ۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ اسعد میاں صاحب نے دارالعلوم کے طلبہ کی ایک تعداد کے لیے کچھ امدادی وظیفے مقرر کر رکھے ہیں ۔ غالباً اُس کا مقصد اسی قسم کی خدمات لینا ہے ۔

یہ خبریں سراسر غلط اور بے بنیاد ہیں کہ جلسہ میں عوام میں سے یا طالبِ علموں میں سے مجلسِ مشاورت کے بارے میں یا اُردو کے متعلق یا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے نقطۂ نظر یا طرزِ عمل کے بارے میں کوئی سوال کیا گیا ۔ غالباً یہ باتیں اپنے سنگین جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے گھڑی گئی ہیں ۔ جس طرح جھوٹے مقدمہ باز گھڑا کرتے ہیں اور

گواہوں کو اس کے مطابق بیان رَٹایا کرتے ہیں یہ سارا معاملہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سے تیار کردہ منصوبہ کے مطابق ہوا ہے، جس کا مقصد مجلس کی قیادت کو بدنام کرنا اور رہنماؤں کے کردار کو تباہ کرنا تھا۔

ریاستی وزیر داخلہ کے نام خط

یو پی کے وزیر داخلہ ٹھاکر ہرگوند سنگھ کے نام ایک مراسلے میں ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی صاحب نے لکھا ہے:

''۱۴/اکتوبر کی شام میں مجلسِ مشاورت کا ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں میرے علاوہ پنڈت سندر لال، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، جناب مظہر امام سابق ممبر پارلیمنٹ اور مولانا منظور نعمانی نے شرکت کی، جیسے ہی مسٹر مہدیؔ نے ایک مقالہ پڑھنا شروع کیا طلباء کے ایک گروہ نے اُچھلنا کودنا شروع کردیا۔ وہ یہ آواز بلند کر رہے تھے کہ وہ مسٹر مہدی کا مقالہ سننا پسند نہیں کرتے۔ اس شوروشغب پر قابو پانے کے لیے قرآن پاک کی تلاوت شروع کردی گئی؛ لیکن اس کے باوجود اُچھل کود اور شوروشغب بند نہ ہوا؛ بلکہ اس میں کچھ اضافہ ہی ہوگیا اور اب اسٹیج کی جانب اینٹ پتھر بھی آنے شروع ہوگئے۔ مقامی لوگوں کی مداخلت سے تھوڑی دیر کے بعد یہ ہنگامہ فرو ہوا اور طلباء واپس چلے گئے۔

جلسہ کی کارروائی دوبارہ شروع ہوئی؛ لیکن ابھی پنڈت سندر لال تقریر کر ہی رہے تھے کہ طلباء دوبارہ واپس آگئے۔ اب یہ لاٹھیوں سے مسلح تھے اور ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہو چکا تھا۔ انھوں نے آتے ہی اینٹوں اور پتھروں کی بارش شروع کردی۔ پنڈت سندر لال، جناب مظہر امام اور مولانا محمد عاقل کو چوٹیں آئیں، مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا انھیں سر پر لاٹھی سے گہری چوٹ آئی ہے۔ مشتعل طلباء نے شامیانے میں آگ لگادی اور ڈائس کو تباہ و برباد کردیا۔ جلسہ منتشر ہوگیا اور بڑی دِقتوں کے بعد ہم دارالعلوم کے مہمان خانے پہنچے۔ جلسہ گاہ کے باہر کچھ پولیس کے سپاہی بھی تعینات تھے؛ لیکن وہ اس سارے ہنگامے کے دوران خاموش تماشائی بنے رہے۔ طلباء کو خاص طور سے مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی تلاش تھی اور ان کی جان کے خواہاں نظر آرہے تھے۔ وہ مہمان خانے آئے اور انھوں نے ہم سے مطالبہ کیا کہ ہم مفتی صاحب کو ان کے حوالے کردیں، تاکہ وہ انھیں قتل کردیں یا زندہ نذرِ آتش کردیں۔ خوش قسمتی سے مفتی صاحب نے ایک دوسری جگہ پناہ لے رکھی تھی؛ لیکن انھیں اس وقت تک یقین نہ آسکا۔ جب تک انھوں نے بذاتِ خود مہمان خانہ میں داخل ہو کر اس کی تلاشی نہ لے لی۔ انھوں نے مطالبات کی ایک فہرست بھی پیش کی جن میں دو مطالبے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں:

(۱) مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ سے استعفیٰ دیں۔

(۲) مولانا اسعد مدنی صاحب کو شوریٰ کا رکن نامزد کیا جائے۔

دوسری صبح پنڈت سندرلال صاحب نے مولانا اسعد مدنی سے ملاقات کر کے طلباء کے رویہ پر احتجاج کیا اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے قتل کی اس سازش کا بھی تذکرہ کیا، جو مشہور و معروف شخصیتوں کی ایماء پر تیار کی گئی تھی۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب پر خصوصی اور مجلسِ مشاورت کے دوسرے لوگوں پر عمومی طور سے حملہ کرنے کی سازش جمعیۃ العلماء کے کانگریس نواز گروپ کی طرف سے تیار کی گئی تھی؛ کیونکہ یہ لوگ مفتی صاحب اور مجلسِ مشاورت سے اختلاف رکھتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اس حادثے کی اور ساتھ ہی ساتھ پولیس کے رویّہ کی تحقیقات کرائیں گے؛ کیونکہ پولیس کا یہ عملہ پنڈت سندرلال، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن اور دوسرے لیڈروں کا تحفظ کرنے میں ناکام رہا''۔

مولانا منظور نعمانی کا بیان

قریباً ۲۲ رسال قبل کی بات ہے، میرا قیام بریلی میں تھا اور ''الفرقان'' وہیں سے نکلتا تھا۔ ۱۹۴۶ء کے اُس جنرل الیکشن کی جدوجہد شباب پر تھی جس کے نتیجے میں بالآخر ملک تقسیم ہوا۔

مسلمانوں میں مسلم لیگ کی مقبولیت اپنے آخری نقطۂ عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ کالجوں اور اسکولوں کے مسلم نوجوان طلبہ اس کی فوج کے خاص سپاہی تھے اور جمعیۃ العلماء کے بزرگ ان کا خاص نشانہ تھے۔ یہ ناچیز اس سے کئی سال پہلے عملی سیاسیات سے بالکل کنارہ کش ہو چکا تھا۔

ایک دن معلوم ہوا کہ حضرت حسین احمد صاحب مدنی بریلی تشریف لا رہے ہیں اور رات کو پارک میں ان کی تقریر ہوگی۔ میرا معمول الیکشنی جلسوں میں جانے کا بالکل نہیں تھا؛ لیکن حضرت ؒ سے چونکہ ذاتی دینی تعلق تھا اور یہ بات کان میں پڑ چکی تھی کہ حضرت مولانا ؒ کی آمد پر مخالفانہ مظاہرہ کیا جائے گا اور جلسے کو درہم برہم کرنے کی کوشش بھی کی جائے گی؛ اس لیے میں اسٹیشن پر حضرت مولانا ؒ کو لینے کے لیے بھی گیا اور جلسے میں شرکت کا بھی فیصلہ کیا اور اپنے لیے ایسی جگہ منتخب کی جہاں سے ہر چیز پر نظر رکھنا آسان ہو۔

دیکھا کہ نوجوانوں کے جُتھے کے جتھے گھوم رہے ہیں جن میں زیادہ تر اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ ہیں۔ جلسے کی کارروائی شروع ہونے کے ساتھ ہی انھوں نے نعرہ بازی اور غنڈہ گردی شروع کر دی اور جب ان کارروائیوں سے جلسے میں انتشار پیدا نہیں ہوا تو بالآخر انھوں نے جلسے پر پتھروں کی سخت بارش کی جس کے نتیجے میں جلسہ درہم برہم ہو گیا اور کوئی تقریر نہ ہو سکی۔

اس ناچیز نے اُسی مہینے کے ''الفرقان'' میں پوری تفصیل سے اپنے مشاہدات اور تاثرات لکھے اور یاد ہے کہ خونِ جگر سے لکھے تھے جواب بھی فائل میں محفوظ ہیں۔

اب پچھلے جمعہ ۱۴/اکتوبر کو دیوبند میں مجلسِ مشاورت کا جلسہ تھا۔ دیوبند میں ہونے والے اس جلسے کے منتظمین نے مرکزی مجلس اور صوبائی مجلس کے اہم ارکان کو بھی مدعو کیا تھا میرا ارادہ اپنی خاص مصروفیات کی وجہ سے شرکت کا نہیں تھا اور اسی لیے ڈاکٹر فریدی صاحب سے میں نے ابتداءً معذرت کر دی تھی۔

دیوبند کے منتظمینِ جلسہ کو بھی میری اُمید نہیں تھی۔ اسی لیے اشتہار میں میرا نام بھی نہیں دیا گیا تھا؛ مگر تین چار دن پہلے مجھے خود خیال ہوا کہ دیوبند جو ہمارے نزدیک اور اکبرؔ الٰہ آبادی مرحوم کے بقول ملّتِ اسلامیہ ہندیہ کا قبلہ ہے۔ اس کے جلسے میں مجھے شریک ہونا چاہئے؛ چنانچہ میں نے فیصلہ کرلیا۔

۱۴/اکتوبر کو جمعہ کا دن تھا۔ میں صبح سہارنپور اُتر کر شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب مدظلہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا اور قریب عصر تک وہاں رہ کر دیوبند روانہ ہوا اور مغرب سے کچھ ہی پہلے پہنچا۔ ڈاکٹر فریدی صاحب پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔

میرا خیال تھا کہ ہم لوگوں کے قیام کا انتظام کہیں شہر میں ہوگا؛ لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ جلسے کے منتظمین نے مہتمم صاحب سے درخواست کرکے دارالعلوم کے مہمان خانے میں ٹھیرانے کا انتظام کیا ہے اور ڈاکٹر فریدی صاحب وغیرہ وہیں ہیں؛ چنانچہ میں بھی وہیں پہنچ گیا۔ میرے لیے اگرچہ دارالعلوم اور اس کے مہمان خانے کی حیثیت بالکل اپنے گھر کی تھی؛ مگر پھر بھی منتظمینِ جلسہ کا یہ فیصلہ مجھے بعض وجوہ سے اچھا نہیں معلوم ہوا؛ لیکن اب اس میں کسی تبدیلی کا وقت نہیں رہا تھا۔

بہرحال! کچھ دیر ٹھیر کر بعد نمازِ عشاء جلسے میں جانا ہوا اور پھر ان بدقسمت آنکھوں کے سامنے وہاں ٹھیک وہی منظر آیا جن پر وہ ایک بار بریلی میں خون کے آنسو بہا چکی تھیں۔

سچ یہ ہے کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اس المناک واقعہ کی خبر بھی دنیا کو نہ ہونے دیتا؛ کیونکہ دارالعلوم دیوبند سے میرا جو رشتہ ہے اس کی بناء پر اس کی رُسوائی میری اپنی رُسوائی ہے اور اس کے طلبہ کی رُسوائی میرے اہلِ خانہ کی رُسوائی؛ مگر یہ بات میرے بس کی نہ تھی۔ واقعہ کی خبر تو اخبارات کے ذریعے آناً فاناً پھیلی اور پھر اس کی تفصیلات بھی پریس میں آگئی ہیں۔ جن میں ڈاکٹر فریدی صاحب کا بیان مستند ترین بیان ہے۔ اور اس بیانِ شکایت نے ایک بار پھر میری نظریں ڈاکٹر فریدی اور اُن کے اُن دوسرے مہمان ساتھیوں کے سامنے جھکا دی ہیں جن کے لیے دارالعلوم دیوبند ایک غیر جگہ تھی۔

اس واقعہ کا ہر ہر پہلو رنجیدہ اور شرمندہ کرنے والا ہے۔ دارالعلوم کے جن طلبہ نے اس واقعہ میں حصہ لیا انھوں نے بلاشبہ خود اپنے آپ کو رُسوا کیا۔ دارالعلوم اور اس کے منصب کو داغ لگایا اور ہم منتسبین دارالعلوم کو کسی کے سامنے منہ دکھانے کا نہیں رکھا۔

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے لیے انھوں نے جو رویّہ اختیار کیا وہ خود ہی آخری درجہ کی بات تھی اور کسی دینی دارالعلوم کے طلبہ کی بابت تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی؛ مگر کچھ معزز بیرونی مہمانوں کی موجودگی میں اس رویّہ کو کیا کہا جائے، اس کے لیے الفاظ بھی نہیں ملتے۔

مفتی صاحب کوئی ایسی ذات نہ تھے جو پھر ہاتھ نہ آسکیں، ان کا تو دیوبند ہی وطن ہے اور دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کے رکن ہونے کی وجہ سے یوں بھی سال میں کئی بار ان کا آنا جانا ہوتا ہے۔ اگر ان کے ساتھ طلبہ کسی ایسی حرکت کو جائز بھی سمجھتے تھے جس کی کوشش کی گئی تو یہ اُس کا کوئی واحد موقع نہ تھا کہ کچھ معزز مہمانوں کا پاس بھی انھیں اس رویّہ سے باز نہ رکھ سکے۔ کاش! میرے عزیز طلبہ سوچیں کہ وہ کیسی نادانی کے مرتکب ہوئے ہیں اور اپنی کیا تصویر انھوں نے باہر کی دنیا کو دی ہے!

اگر بات جلسے کے ہنگامے ہی پر ختم ہوجاتی تو کوئی معذرت طلبہ کے لیے ڈھونڈی جاسکتی تھی اور اپنا دل ہلکا کیا جاسکتا تھا کہ نوجوانی کے جوش میں اپنا منصب بھول گئے؛ مگر مہمان خانے پر مفتی صاحب کے لیے رات بھر ہنگامہ آرائی اور پھر یہ مطالبہ کہ مفتی صاحب دارالعلوم کی شوریٰ سے الگ کیے جائیں، نیز یہ کہ اسعد میاں شوریٰ کے ممبر بنائے جائیں۔ ان سب باتوں نے تو کسی تاویل اور معذرت کی گنجائش ہی باقی نہیں چھوڑی۔ ان باتوں سے تو طلبہ نے یہ بتادیا کہ وہ کسی جائز یا ناجائز جذبہ میں آکے جلسے میں آکر مار پیٹ نہیں کر بیٹھتے تھے؛ بلکہ اس کے پیچھے یہ سکھائی پڑھائی باتیں تھیں اور انھوں نے اسعدؔ میاں اور مفتی صاحب کی جماعتی کش مکش نیز مجلسِ شوریٰ دارالعلوم کی رکنیت کے لیے اسعد میاں کی جدو جہد میں ایک ایسا آلۂ کار بننا منظور کرلیا تھا جسے اچھائی برائی اور موقع و بے موقع سے کوئی مطلب نہ ہو۔

بے چارے ان طالبِ علموں کو ممکن ہے کہ معلوم نہ ہو؛ لیکن مجلسِ شوریٰ دارالعلوم کے ارکان اور مولانا اسعد میاں کو معلوم ہے کہ شوریٰ کی رکنیت کے لیے ان کے نام کی تحریک اور کوشش کرنے والوں میں بھی مَیں رہا ہوں؛ لیکن اس تازہ تجربے سے معلوم ہوا کہ شوریٰ کے جن ارکان کو ان کی رکنیت سے اختلاف تھا اور وہ جن اندیشوں کا اظہار کرتے تھے وہ بالکل بے بنیاد نہ تھے۔

اگر ہماری بدقسمتی سے مجلسِ شوریٰ دارالعلوم کی رکنیت کا فیصلہ ان طریقوں سے ہونے لگا تو پھر یہ اُس دارالعلوم کی رکنیت ہوگی جس سے ہر شریف آدمی دُور ہی رہنا پسند کرے گا۔

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن کا بیان

دیوبند میں مسلم مجلسِ مشاورت کے جلسہ کو ناکام بنانے کے لیے جس طرح طلبہ دارالعلوم کو استعمال کیا گیا ہے، اس پر دیوبند کے شہریوں کے علاوہ دہلی کے اہلِ علم حلقوں میں بھی خاصی ناراضگی پائی جاتی ہے۔ دیوبند کے جلسہ

عام میں شرکت کرنے والے اصحاب کا بیان ہے کہ ہلڑ کرنے والوں کی خصوصی طور سے یہ کوشش تھی کہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب پر قاتلانہ حملہ کیا جائے اور مفتی صاحب کے قریبی حلقوں سے پتہ بھی چلا ہے کہ مفتی صاحب کے پاس ایک دن پہلے ایک گمنام خط بھی موصول ہوا تھا جس میں دھمکی دی گئی تھی کہ اگر وہ جلسہ میں شریک ہوئے تو ان کی بے عزتی کی جائے گی۔ جمعیۃ علماء کے خلاف کوئی بات کہی گئی تو انھیں گولی سے اُڑا دیا جائے گا۔

۱۴/اکتوبر کو ہونے والے جلسہ عام کے سلسلہ میں لوگوں نے بتایا کہ یہ جلسہ محلہ قلعہ کے میدان میں کیا گیا تھا؛ کیوں کہ دوسرے میدان میں رام لیلا وغیرہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

جلسہ عشاء کے بعد حسبِ معمول شروع ہوا جس میں تلاوتِ کلام پاک اور نظموں کے بعد جناب جمیل مہدیؔ صاحب نے اپنا مقالہ پڑھا وہ اپنا مقالہ پڑھ ہی رہے تھے کہ مجمع میں سے ایک جانب بیٹھے ہوئے ۴۰، ۵۰ طلبا کے ایک گروہ نے شور مچانا شروع کیا جس پر مقرر اور ان طلبا کے درمیان کچھ تلخ کلامی بھی ہوئی۔ اسی اثنا میں اسٹیج پر کچھ اینٹوں کے ٹکڑے بھی آ کر پڑے جس سے آس پاس کے کچھ لوگ زخمی ہوئے۔

جلسہ عام میں شرکت کرنے والوں نے طلبا کی اس حرکت پر اظہارِ ناپسندیدگی کیا اور یہ کہا کہ اگر وہ سننا نہیں چاہتے تو جلسے سے جا سکتے ہیں؛ چنانچہ یہ لوگ اُٹھ کر چلے گئے اور مجمع تقریر سنتا رہا۔ کہنے والوں کا کہنا ہے کہ دیوبند کی تاریخ میں یہ بہت بڑا جلسہ تھا جس میں مردوں کے علاوہ خواتین کی بھی بڑی تعداد نے شرکت کی تھی۔

کہا جاتا ہے اس جلسے سے نکلنے والے طلباء نے دارالعلوم واپس جا کر گھنٹی بجادی اور یہ اعلان کر دیا کہ کچھ طلباء مشاورت کے جلسے میں مارے گئے ہیں، پس اس پر طالبِ علموں میں ایک جوش برپا ہو گیا اور طلباء کے ہجوم نے جلسہ گاہ پر ہلّہ بول دیا۔

جلسہ کا انتظام کرنے کے لیے اس وقت صرف تین یا چار پولیس کے سپاہی تھے جو مشتعل مجمع کو دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ اینٹوں اور پتھروں سے مسلح تھے اور انھوں نے آتے ہی لوگوں پر ڈنڈا برسانا شروع کر دیا جس کی وجہ سے جلسہ درہم برہم ہو گیا۔ روشنی اور لاؤڈ اسپیکر کے تار کاٹ دیئے اور قناتوں میں آگ لگانے کی کوشش کی۔

بجلی کے تار کاٹنے سے جلسہ گاہ میں تاریکی ہو گئی تھی اور ہلڑ بازوں کی کوشش تھی کہ کسی طرح مفتی عتیق الرحمٰن صاحب پر حملہ کریں۔ ادھر منتظمین کی کوشش تھی کہ مفتی صاحب، پنڈت سندر لال جی، ڈاکٹر فریدی، مولانا منظور نعمانی صاحب اور سید مظہر امام صاحب کو اپنی حفاظت میں لے کر محفوظ مقامات پر پہنچا دیا جائے؛ لیکن یہ حضرات اسٹیج چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ بمشکل منتظمین نے انھیں آمادہ کیا۔ ادھر ہلڑ بازوں کی خصوصی کوشش تھی کہ مفتی صاحب کو اپنا نشانہ بنائیں؛ چنانچہ وہ برابر آوازیں دے دے کر دریافت کر رہے تھے کہ مفتی صاحب کہاں ہیں۔ انھیں سامنے لاؤ۔ اسی عالم میں ان پر ڈنڈے بھی برسائے جس سے مفتی صاحب کے سر اور کمر پر کچھ چوٹیں آئیں جو

لوگ وہاں موجود تھے انھوں نے مفتی صاحب کو یہ کہتے سنا کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اگر ان کے ہاتھوں میری موت لکھی ہے تو مجھے گوارا ہے؛ لیکن اسی مجمع میں سے بعض لوگ مفتی صاحب کی حفاظت کے لیے کھڑے ہو گئے اور انھوں نے کہا کہ مفتی صاحب کو چوٹ نہیں آنے دیں گے؛ چنانچہ انھیں سید اختر حسین صاحب کے مکان پر جو جلسہ گاہ سے تھوڑے فاصلہ پر تھا پہنچا دیا گیا۔

معلوم ہوا ہے کہ ادھر ڈاکٹر فریدی صاحب اور مولانا منظور نعمانی صاحب دار العلوم کے مہمان خانے میں پہنچے تو وہاں بھی اس مجمع نے واپس جا کر ان پر حملہ کی کوشش کی اور ان کے خلاف نعرے لگائے۔ خاص نعرے یہ تھے ''مفتی عتیق الرحمٰن اور مولانا منظور نعمانی کو مجلسِ شوریٰ سے نکالو۔ مولانا اسعد مدنی کو ممبر بناؤ۔'' دار العلوم کے جو ملازم جلسے میں شریک ہوں انھیں نوکری سے علیحدہ کر دو۔ وغیرہ''۔

ڈاکٹر فریدی اور مولانا نعمانی کا اصرار تھا کہ مہمان خانے کے دروازے کھول دیئے جائیں اور لڑکوں کو آنے دیا جائے؛ مگر منتظمین نے یہ خطرہ مول نہیں لیا۔

ہلڑبازوں نے مہمان خانے کے دروازوں کو بھی نقصان پہنچایا کچھ لڑکے پیچھے کی جانب سے کود کر اندر پہنچ بھی گئے۔

صبح دس بجے کے بعد یہ حضرات سہارنپور چلے گئے جہاں دوسرے دن بعد مجلسِ مشاورت کا جلسہ عام ہونے والا ہے۔

جناب مفتی عتیق الرحمٰن صاحب دلّی واپس آ گئے ہیں۔ دعوت کے نامہ نگار نے ان سے جب اس افسوسناک واقعہ پر ان کا تاثر معلوم کرنا چاہا تو انھوں نے کہا کہ ہم اب تک دوسرے غیر مذہبی کالجوں کے لڑکوں کو الزام دیتے چلے آئے ہیں کہ وہ شائستگی اور متانت اور اپنے بڑوں کے احترام سے عاری ہوتے چلے جا رہے ہیں؛ لیکن اپنے مذہبی دار العلوم کے طلباء سے ہمیں یہ توقع ہرگز نہیں تھی۔ یہ مستقبل کے علماء ہیں جن میں سے کسی کو رشد و ہدایت کا منصب سنبھالنا ہے اور کسی کو درس و افتاء کا۔ افسوس ہے کہ وہ اس طرح کی بداخلاقی اور ناشائستگی کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ میری دعا ہے کہ مجھے جو چوٹ پہنچی ہے خدا کرے کہ اس کی کسک دار العلوم کے طلباء اور اساتذہ کے دلوں میں محسوس کی جائے۔ وہ اپنے مہمانوں سے معافی مانگیں اور اس سازش کے پیچھے جن لوگوں کا ہاتھ ہے انھیں بے نقاب کریں تاکہ آئندہ ان کے شر سے محفوظ رہا جا سکے۔

عالمی امن کونسل کے صدر پنڈت سندرلال کا بیان

عالمی امن کونسل کی صدارتی کمیٹی کے ممبر پنڈت سندرلال نے ایک بیان دیتے ہوئے بتایا ہے کہ'' دیوبند کے حال کے افسوسناک واقعہ کی بابت کئی خط میرے پاس آ چکے ہیں۔ ان خطوں میں مجھ سے دریافت کیا گیا ہے کہ

میرے کس قدر چوٹ آئی، وغیرہ۔اور ہمدردی کا اظہار کیا گیا ہے؛ اس لیے میں اپنے سب ہمدردوں کو یہ اطلاع دے دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس حادثہ کے سلسلہ میں مجھے کسی قسم کی چوٹ نہیں لگی۔ جس وقت پہلا پتھراؤ شروع ہوا میں ڈائس پر بیٹھا ہوا تھا دو چھوٹے چھوٹے پتھر میرے پاس آ کر گرے، میں نے انھیں ہاتھ سے اُٹھایا بھی؛ لیکن کوئی پتھر میرے جسم پر نہیں لگا۔

اس سلسلے میں میں ایک دو باتیں کہہ دینا مناسب سمجھتا ہوں اوّل یہ کہ دیوبند کے طالبِ علموں میں دو گروہ صاف نظر آرہے تھے، ایک مجلسِ مشاورت کے قدر دانوں کا گروہ اور دوسرا مجلسِ مشاورت کے مخالفین کا گروہ۔ ظاہر ہے کہ پہلا پتھراؤ جو مشاورت کے جلسے کے اوپر شروع ہوا اور جس میں دو چھوٹے چھوٹے پتھر میرے نزدیک بھی آ کر پڑے، مشاورت کے مخالفین کی طرف سے ہوا تھا۔ اس کی پہلے سے تیاری تھی یا نہیں میں نہیں کہہ سکتا۔ مخالفین کا ایک گروہ ڈائس کے پیچھے اور آس پاس شروع سے موجود تھا۔ جن لوگوں نے شروع میں نظمیں پڑھیں یا مقالے پڑھے انھیں اس گروہ کے افراد نے بیچ بیچ میں ہوٹ بھی کیا۔ یہ خلل اندازی ظاہر ہے مخالفین کی طرف سے ہی ہو سکتی تھی۔ اکثر اس طرح کی ہوٹنگ اور اس طرح کی خلل اندازی عام مشاعروں میں بھی دیکھنے میں آتی ہے۔

میں نے معتبر صاحبان سے یہ بھی سنا کہ پہلے پتھراؤ کے بعد ظاہراً مجلسِ مشاورت کے مخالفین کی طرف سے ہی تھا دوسرے گروہ کے کچھ لوگوں یعنی مجلسِ مشاورت کے کچھ ہمدرد لوگوں نے بھی پتھراؤ کا جواب پتھراؤ سے دیا حتیٰ کہ سنا جاتا ہے کہ کچھ چھجوں اور چھتوں سے بھی پتھر آنے شروع ہو گئے۔ ایسی حالت میں یہ کہہ سکنا کہ کون کس جانب کے پتھر سے زخمی ہوا قطعی ناممکن ہے۔ کئی طالبِ علم زخمی ہوئے۔ جن میں سے کم از کم دو ہسپتال بھی پہنچا دیے گئے ان کی بابت پختہ طور پر یہ کہہ سکنا کہ وہ کس گروہ کے پتھروں سے زخمی ہوئے قطعی ناممکن ہے۔

اس کے بعد دو واقعات حد درجہ شرمناک اور دردناک پیش آئے۔ ایک مفتی عتیق الرحمٰن صاحب پر لاٹھی سے حملہ مفتی صاحب کو نام لے کر تلاش کیا گیا۔ ان پر حملہ ظاہر ہے دیدہ و دانستہ ہوا میں کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس حد درجہ نامناسب حرکت کے لیے مجلسِ مشاورت کے مخالف گروہ کو اور خاص کر ان کے سر برآوردہ صاحبان کو جتنا بھی افسوس۔ شرمندگی اور پشیمانی ہو کم ہے۔

دوسری نہایت افسوس ناک خبر مخالفین کا رات کے وقت مہمان خانہ کو گھیر لینا تھا۔ میں نے ان طالبِ علموں کا یہ نعرہ موقع پر جا کر خود سنا "خون کا بدلہ خون سے لیں گے"۔ میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ ان حالات میں یہ بتا سکنا قطعی ناممکن ہے کہ کون کس کے پتھر سے زخمی ہوا۔

ایسے موقع پر کسی کا بھی اپنے خیال کے کسی شخص کے پتھر سے زخمی ہو جانا ایک معمولی بات ہے اور پھر یہ بھی سخت کوفت ہے کہ مشاورت کے مخالفین کی جانب سے جو کچھ کارروائی ہوئی اس کے ساتھ میرے عزیز دوست مولانا

اسعدؔ مدنی کا نام عام لوگوں کی زبان پر تھا۔ یہ نعرہ بھی مخالف مشاورتکی زبان پر سنا گیا کہ مولانا اسعدؔ مدنی کو مجلسِ شوریٰ دارالعلوم کا ممبر بنایا جائے۔

آخری چیز میں یہ بھی کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ بدقسمتی سے دنیا کی موجودہ سرکاروں کی جو حالت ہے اس میں ہمیں ان سے یہ اُمید کرنا کہ ہمارے آپس کے اتحاد و اتفاق اور تعاون کی راہیں سرکار کے مشوروں سے کچھ کھلیں گی بالکل غلط ہوگا۔ ہمارا سارا بھروسہ اپنے ایمان اور اللہ کے فضل پر ہی رہنا چاہیے۔

نوٹ: جب مجھے مہمان خانہ سے نکال کر دوسری جگہ پہنچایا گیا تو معلوم ہوا کہ بہت سے طلباء نے مہمان خانہ کے پیچھے سے چڑھ کر اور مہمان خانہ میں داخل ہو کر یہ نعرے لگائے کہ مفتی عتیق الرحمٰن کو ہمارے حوالے کرو اس کے ساتھ مفتی صاحب کو تمام کمروں میں تلاش کیا گیا۔ یہاں تک کہ غسل خانہ میں بھی تلاش کیا۔ سب لوگ ہر چند کہتے رہے کہ مفتی صاحب یہاں نہیں ہیں؛ مگر یہ ہنگامہ کرنے والے کسی بات کو نہیں سنتے تھے۔ پوری چھان بین کے بعد جب انھوں نے پورا اطمینان کر لیا تو واپس ہوئے۔

صدر جمعیۃ الطلباء کا بیان

مولوی احسان اللہ بنگلوری صدر جمعیۃ الطلباء دارالعلوم دیوبند نے وہاں کے حالیہ ہنگامے کے سلسلہ میں ذیل کا وضاحتی بیان بغرضِ اشاعت ارسال کیا ہے۔

”مسلم مجلسِ مشاورت کے جلسے (منعقدہ ۱۴/اکتوبر محلہ قلعہ دیوبند) میں جو افسوسناک ہنگامہ برپا ہوا اس کے متعلق بعض اخبارات میں مغالطہ آمیز اور گمراہ کن خبروں کو پڑھ کر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تمام طلباء دارالعلوم کی متحدہ جمعیۃ کے صدر کی حیثیت سے میں ضروری حقائق عوام کے سامنے رکھدوں۔

مجلسِ مشاورت کے جلسے کو درہم برہم کر دینا کوئی اچانک حادثہ نہیں تھا؛ بلکہ اس کے پیچھے دوسری بنیادیں ہیں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ اسعدؔ پارٹی عرصہ دراز سے یہ تہیّہ کیے ہوئے ہے کہ دارالعلوم پر اسے کامل اقتدار حاصل ہو؛ چنانچہ طلباء کو استعمال کرنے کی کوشش برابر جاری ہیں۔ میں طلباء کے ہی خواہ کی حیثیت سے اس کے سخت خلاف تھا اور ہوں، کہ طلباء کے ذہن کو پارٹی بندی میں پھنسا کر تعلیم سے اُچاٹ کیا جائے؛ چنانچہ برابر یہ سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ تم تحصیل علم کے لیے آئے ہوئے ہو، تمہیں ان جھگڑوں سے کیا مطلب کہ اسعد صاحب مجلسِ شوریٰ کے ممبر ہوں یا نہ ہوں تمھیں تو غیر جانبدار رہ کر اپنی تعلیم جاری رکھنی چاہیے۔ میری یہ تلقین اسعدؔ پارٹی کو ناگوار گزرنی ہی تھی؛ چنانچہ میرے خلاف عدمِ اعتماد کی تحریک لائی گئی؛ لیکن وہ زبردست اکثریت کے ساتھ ناکام ہوگئی اور میں بدستور صدر باقی رہا۔ یہ چیز اور بھی میرے خلاف اسعد پارٹی کے غم وغصّہ کا باعث بنی اور اب میرے اور میرے ساتھیوں کے

خلاف تشدد سازش اور زور وزبردستی تجویز کی گئی۔ یہ داستان لمبی ہے کہ میرے اور میرے ہمنواؤں کے لیے کیسے سامان اذیت کیے گئے۔ مختصر یہ کہ اسعدؔ پارٹی دارالعلوم پر اپنے قبضے کی جدو جہد تیز کرتی گئی۔ اب انھیں حالات میں دیوبند والے مجلسِ مشاورت کے جلسے کا اعلان کرتے ہیں اور اسعدؔ پارٹی اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی اسکیم بنا کر طلباء کو منظم طریقہ پر بھڑکاتی ہے کہ یہ جلسہ دراصل اسعدؔ کے خلاف کیا جارہا ہے اسے کسی قیمت پر بھی کامیاب نہیں ہونے دینا چاہیے میں پھر ان کے آڑے آتا ہوں اور طلباء کو سمجھاتا ہوں کہ بھائیوں ہمیں مجلسِ مشاورت سے بحث نہ کسی اور سیاسی پارٹی سے۔ مجلسِ مشاورت کے جلسے تو شہر در شہر ہورہے ہیں۔ یہ کیسے مان لیا جائے کہ دیوبند میں وہ کسی خاص شخصیت کے خلاف ہونے جارہا ہے آپ سب حضرات غیر جانبدار رہیے اور اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھیے۔

اب اسعدؔ پارٹی کا جذبہ انتقام میرے خلاف شباب پر پہنچ جاتا ہے اور کھلے تشدد کی کوشش کی جاتی ہے۔ جلسے والے دن منصوبہ بنایا جاتا ہے کہ جلسہ کسی قیمت پر نہ ہونے دو اور فلاں فلاں کو خاص طور پر شکار بناؤ میں منع کرتا ہوں تو مجھ پر دست درازی کی جاتی ہے جس کی وجہ سے مجھے بھاگنا پڑتا ہے۔

مجلسِ مشاورت کے جلسے میں میں موجود تھا افسوس کہ اسعد پارٹی نے مار دھاڑ آتش زنی اور سفاکی کا ایسا مظاہرہ کیا کہ آج سارا شہر نفرت اور غصے کی آگ میں جل رہا ہے۔ حد ہے کہ پنڈت سندر لال کی جان مشکل سے بچ سکی۔ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کافی مضروب ہوئے۔ مولانا منظور نعمانی صاحب اور ڈاکٹر فریدی صاحب جیسے رہنما بھی ان ظالموں کی زَد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ چوٹیں بعض طلباء کو بھی آئیں؛ مگر اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ مفسدین نے تمام بلب توڑ کر گھپ اندھیرا کر دیا تھا اور اس اندھیر میں انھوں نے اپنے بعض ساتھیوں ہی کو زَد پہنچادی۔ جلسے والے قطعاً خالی الذہن تھے کہ قانون کی موجودگی میں یہ ڈاکہ بھی پڑ سکتا ہے، اسی لیے نہتے تھے؛ چنانچہ بھاگ پڑے اور طلباء نے خوب سامان توڑا پھوڑا آگ لگائی اور وہ سب کچھ کیا جس پر دل خون کے آنسو روتا ہے۔

یہ ہے کل روداد۔ واضح رہے کہ میرے کمرے سے میرا سامان بھی لوٹ لیا گیا۔ ناظم جمعیۃ الطلباء کو مارا گیا اور ان کے چار سو باون (۴۵۲) روپے مع سامان کے غصب کر لیے گئے جس کا زیادہ حصہ جمعیۃ الطلباء کے چندے کا تھا۔

مولانا منظور نعمانی اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحب مدظلہٗ مجلسِ شوریٰ کے ممبر اور ملک کے ممتاز عالموں میں ہیں؛ لیکن ان کے ساتھ جو کچھ کیا گیا وہ اتنا شرمناک ہے کہ میرے پاس الفاظ نہیں جن سے اس کی مذمت کر سکوں۔

’’ندائے ملّت‘‘ کا نوٹ

دیوبند کے مجلسِ مشاورت کے جلسہ میں جو کچھ ہوا، اس میں اتنی بات تو مجلسِ مشاورت کے موافق اور مخالف دونوں طرح کے اخبارات کی رپورٹوں سے قطعی واضح ہے کہ آغاز جس شکل میں بھی ہوا ہو۔ دارالعلوم کے کچھ طلبہ کی

طرف سے ہوا؛ لیکن پھر اس آغاز کو بہت ہی بُرے انجام تک پہنچانے کی ذمہ داری بھی ان طلبہ پر عائد ہوتی ہے یا منتظمین جلسہ اور ان کے حامی اس کے ذمہ دار ہیں؟ اس بات میں اختلاف ہے اور اس لیے دونوں ہی رائیں قائم کرنے کا حق ہم تسلیم کرتے ہیں۔ اگر معاملہ کو انتہا تک بھی کسی منصوبے کے تحت یہ طلبہ ہی لے گئے تو یہ ان کے لحاظ سے بہت شرم ناک بات ہے اور اگر منتظمین جلسہ یا ان کے حامیوں کی ناعاقبت اندیشی سے بات زیادہ بگڑی تو یہ ان کے لحاظ سے افسوسناک ہے۔

لیکن جلسہ گاہ کے ہنگامے کے بعد دارالعلوم کے مہمان خانے میں بیرونی مہمانوں کا لحاظ کیے بغیر جو کچھ ہوا جسے ڈاکٹر فریدی صاحب نے ایک اخباری بیان میں فرمایا ہے۔ اس نے تو دارالعلوم سے ادنیٰ انتساب رکھنے والوں کے منہ پر بھی ایسی کالک لگائی ہے کہ وہ کہیں بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ گئے ہیں۔ ڈاکٹر فریدی صاحب نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ وہ مہمان خانے کے اندر رات بھر غضبناک طلبہ کے محاصرے میں رہے، جو نعرے لگا رہے تھے کہ مفتی عتیق الرحمٰن یہاں چھپا ہوا ہے۔ اسے نکالو اور ہمارے حوالے کردو۔ اور اساتذہ دارالعلوم کو ان بیرونی مہمانوں کو جن میں ڈاکٹر فریدی کے علاوہ پنڈت سندرلال۔ مسٹر مظہر امام ایم۔ پی اور سید محمد مجتبیٰ وکیل (بہار) وغیرہ تھے یقین دلانا پڑ رہا تھا کہ آپ کی حفاظت کے لیے ہم اپنی جانیں دے دیں گے۔ کیا ہندوستان کے عظیم دینی دارالعلوم میں پرورش پانے والے طلباء ڈاکٹر فریدی صاحب کے اس بیان سے کوئی فخر محسوس کرسکیں گے؟

لیکن اس واقعہ کا ایک اور پہلو ہے جس پر ہم خاص طور سے اس وقت لکھنا چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ ڈاکٹر فریدی صاحب کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ طلبہ اس موقع پر کچھ مطالبات کا بھی اعلان کررہے تھے۔ جن کا کوئی تعلق ان مہمانوں سے نہیں تھا اور ان مطالبات میں سرفہرست مطالبہ یہ تھا کہ:

''مولانا اسعد میاں کو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا ممبر بنایا جائے''۔

طلباء کی یہ بات اس موقع پر کتنی بے تکی تھی، یہ الگ بحث ہے، رنج اور ملال کی بات یہ ہے کہ اس مطالبہ نے صاف طور سے اس ہنگامہ آرائی میں مولانا اسعد میاں کو ملوث کردیا تھا اور مہمانوں کا یہ تاثر لینا قطعی تھا کہ یہ سب مولانا اسعد میاں کی ایماء پر ہورہا ہے۔ کیا اس صورتِ حال میں مولانا اسعد میاں کا یہ اخلاقی فرض نہیں تھا کہ وہ شرمندگی محسوس کرتے اور جیسے ہی صبح پانچ بجے دیوبند پہنچے تھے، سب کچھ چھوڑ کر ان مہمانوں کے پاس پہنچتے۔ شرمندگی کا شریفانہ اظہار کرتے، اپنی بیزاری اور بےتعلقی کا یقین دلاتے اور پھر یہ مہمان وہاں سے واقعی تاثر لے کر رخصت ہوتے کہ آدمی اگرچہ اسعد میاں کے تھے؛ مگر ان کی مرضی کا کوئی دخل اس میں نہ تھا۔

لیکن ہوا کیا؟ کہ پنڈت سندرلال کو اس محاصرہ سے رہائی پانے کے بعد خود مولانا اسعد میاں کو شرمندہ کرنے اور ان کی بےتعلقی کا اعلان سننے کے لیے ان کے دولت کدہ پر جانا پڑا۔

مولانا اسعد میاں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے جانشین ہیں، صرف سیاسی نہیں؛ بلکہ روحانی جانشینی کا منصب بھی حضرت مدنیؒ کے تمام خلفاء نے بالاتفاق ان کو سونپا ہے۔ کیا حضرت مدنیؒ سے بھی یہ ممکن تھا کہ وہ ایسے مکروہ حالات میں دیوبند پہنچتے اور پھر اپنے دولت کدہ ہی پر فروکش رہ جاتے۔

کیا ان واقعات سے مجلسِ مشاورت کو کوئی نقصان پہنچا؟ ذرا بھی نہیں! ہاں فائدہ ضرور پہنچے گا اور نقصان تمام تر اسعد میاں اور جمعیۃ علماء کے حصے میں! دارالعلوم کے حصے میں!! اسلاف دیوبند کی تابندہ تر روایات کے حصے میں!!! اسعد میاں کو اپنے نقصان کی پروا نہیں تو نہ ہو۔ جمعیۃ کے نقصان کی پرواہ نہیں تو نہ ہو، یہ ان کا اپنا نفع نقصان ہے؛ مگر دارالعلوم کا وہ کچھ خیال فرماتے اور دارالعلوم سے زیادہ ان بزرگوں کی روایات کا، جن کا آخری مجسّمہ خود ان کے والد ماجد کی ذاتِ اقدس تھی اور جس کی جانشینی ان کا سب سے بڑا فخر ہے۔

ملاپ کے نامہ نگار کا بیان (جو موقع پر موجود تھا)

دیوبند ۱۷ اکتوبر: گزشتہ رات مجلسِ مشاورت کی جانب سے ہونے والے ایک بھاری جلسہ میں دارالعلوم کے طلباء نے جو جمعیۃ العلماء سے تعلق رکھتے تھے سیکڑوں کی تعداد میں پہنچ گئے۔ انھوں نے جلسہ کو درہم برہم کر دیا۔ کوتوال دیوبند نے کنٹرول کرنے کی کوشش کی؛ لیکن دوبارہ طلباء مسلح ہو کر آئے اور گڑبڑ کر دی۔ پنڈال نذرِ آتش کر دیا گیا۔ مردہ باد کے نعروں کے ساتھ ساتھ لاٹھیوں اور پتھروں کا استعمال ہوا۔ جس میں ڈاکٹر فریدی، مفتی عتیق الرحمٰن، پنڈت سندرلال، مولانا منظور نعمانی، ایم انور ممبر پارلیمنٹ وغیرہ کو چوٹیں آئی ہیں اور بھی کئی سرکردہ لیڈر اور شہری زخمی ہوئے۔ دو طلباء کو بھی چوٹیں آئی ہیں، جلسہ کی بجلی لاؤڈ سپیکر، شامیانے، چاندنی، دری، سب تباہ کر دیے گئے اور کوئی لیڈر اپنی تقریر نہ کر سکا۔ مولانا منظور نعمانی، ڈاکٹر فریدی کو بہت پریشان کیا گیا۔ اب طلباء نے دارالعلوم پر قبضہ کر لیا ہے۔ کوئی ٹیچر یا ملازم اندر نہیں جا سکتا۔

ایڈیٹر ”بے باک“ کا بیان

راقم الحروف بھی اپنے عزیز دوست مسٹر محمد سرور خاں میونسپل کمشنر کے ساتھ اس جلسہ میں موجود تھا اور اتفاق سے ہم دونوں اور دارالعلوم کے ایک استاد سامنے کی ایک مسجد کی ایک چھت پر ایسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے جہاں سے تقریریں بھی بآسانی سنی جا سکتی تھیں اور اسٹیج سے لے کر پوری جلسہ گاہ کے حالات کا بھی اچھی طرح مشاہدہ کیا جا سکتا تھا؛ اس لیے درج ذیل واقعات وہ ہیں جو ہمارے مشاہدہ سے گزر چکے ہیں اور یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ جب تک پورا ہنگامہ ختم نہیں ہو گیا۔ اور پورا میدان صاف نہیں ہوا، اس وقت تک ہم اپنی جگہ سے نہیں آئے۔

چونکہ ہم جلسہ سے کافی دیر پہلے شہر میں پہنچ چکے تھے؛ اس لیے جلسہ سے عوامی دلچسپی کا اچھا خاصہ اندازہ کیا گیا۔ اور اس اندازہ کی تصدیق جلسہ گاہ میں عوام خصوصاً مسلمانوں کے بھاری اجتماع سے بھی ہوگئی۔ غالباً دس بجے تلاوتِ قرآنِ پاک کا آغاز ہوا جو پندرہ منٹ تک جاری رہا۔ پھر نظمیں پڑھی گئیں اور اس کے بعد ایک صاحب نے ایک مختصر سا مقالہ پڑھا۔ بعد ازیں جمیل مہدی صاحب مائک پر آئے اور انھوں نے عام حالات پر تبصرہ کے طور پر اپنا طویل مقالہ پڑھنا شروع کیا۔ یہ مقالہ اگرچہ پر از معلومات تھا اور اس میں کسی کی تحسین اور کسی پر تنقید بھی نہیں تھی؛ لیکن تلاوتِ قرآنِ کریم کے بعد نظموں اور مقالہ نے جو اکتاہٹ پیدا کردی تھی اِس مقالہ کی خوبی اُسے زائل نہ کرسکی؛ بلکہ اس میں مزید اضافہ ہی ہوگیا اور خود ہمارے اندر بھی اس اُکتاہٹ کا احساس پایا گیا؛ لیکن یہ محض اُکتاہٹ تھی کوئی نفرت یا بیزاری کی کیفیت نہ تھی۔ اجتماعات میں عموماً ایسے حالات سے بھی گزرنا پڑتا ہے اور بڑی بڑی شخصیتوں کی اچھی؛ مگر خشک اور طویل باتوں سے طبیعتیں اُکتا جایا کرتی ہیں۔ بہر حال! ایک گوشے سے اس اُکتاہٹ کا بیزاری کے رنگ میں اظہار ہوا۔ اور اس کے جواب میں جمیل مہدیؔ صاحب کی طرف سے ذرا سختی کے ساتھ یہ مقالہ پڑھتے رہنے پر اصرار کیا گیا۔ اس پر شور کچھ بڑھ گیا۔ اور یہ سمجھ میں نہیں آسکا کہ معترضین نے جمیل صاحب کو کیا کہا؛ البتہ جمیل صاحب نے جوابی طور پر جو کچھ کہا اور جو کچھ ہمارے کانوں تک آسکا وہ تقریباً یہ تھا کہ اگر سننا نہیں چاہتے تو نہ سنیے یہ جلسہ ہم نے اپنی ذمہ داری پر کیا ہے اور ہمارے انتظامات میں کوئی مداخلت نہیں کرسکتا"۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے ایک عام ہنگامہ کے سوا۔ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ جلسہ گاہ کے چاروں طرف شور تھا۔ اُچھل کود تھی اور ہلّڑ تھی۔ اور ہماری آنکھیں یہ دیکھ دیکھ کر حیرت زدہ تھیں کہ جیسی صورتوں، اور لباسوں کے ہجوم سے اس صورتِ حال کا مشاہدہ ہو رہا ہے ان سے تو کسی بُرے خواب کے عالم میں بھی ایسی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ڈائس پر اگرچہ سب لوگ جمے بیٹھے تھے؛ لیکن ایک چہ کنم کا عالم ہر طرف محسوس کیا جارہا تھا۔ آخر اسٹیج والوں نے دینداروں کی نفسیات کے مطابق ایک تدبیر سوچی اور مائک سے کسی اچھے قاری سے قرآنِ کریم کی تلاوت شروع کرادی گئی۔ غالباً اس تدبیر کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کا مجمع ہے اور قرآنِ کریم کی عظمت و تقدیس کا فہم رکھنے والے دیندار لوگ ہیں قرآنی آیات کو سنتے ہی ادب و احترام کے جذبہ سے دب کر رہ جائیں گے اور اس حسن و تدبیر سے دفعۃً سکوت طاری ہوجائے گا؛ لیکن قرآنِ کریم کی آواز نقار خانے میں طوطی کی صدا سے زیادہ اہمیت حاصل نہ کرسکی۔ اور کود پھاند اور ہنگامہ آرائی میں برابر اضافہ ہی ہوتا چلا گیا صرف یہی نہیں؛ بلکہ اب ہماری آنکھیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ ڈائس سے دُور کہیں کہیں لوگ آپس میں گتھ بھی رہے ہیں۔ ڈائس کے شامیانوں کو گرانے کی کوششیں بھی ہو رہی ہیں اور لکڑی کے وہ تختے جنھیں بچھا کر نالیوں کو پاٹا گیا تھا اُچھالے جارہے ہیں۔ اس ہنگامہ میں مزید اضافہ یہ ہوا کہ ڈائس کی طرف ڈھیلے اور وہ پتھر جو عام طور پر سڑکوں اور ریلوں کی پٹریوں پر کام آتے ہیں آنے شروع ہوگئے اور اسی حالت

میں ایسا بھی نظر آیا کہ ڈائس سے دُور پتھراؤ کا تبادلہ بھی ہو رہا ہے؛ لیکن اس نازک ترین صورتِ حال کے باوجود ڈائس خالی نہیں ہوا اور خدا خدا کر کے حالات سنبھل گئے اور جو ''صورتیں'' اُچھل کود اور ہنگامہ آرائی میں مصروف تھیں وہ دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہوگئیں۔

اب اُکھڑا ہوا مجمع پھر جمنا شروع ہوگیا۔ ڈائس سے پنڈت سندرلال کی تقریر کا اعلان کیا گیا اور جب تیراسی سالہ بوڑھے محبِ وطن کی خالص انسانی اور اخلاقی اسپرٹ میں ڈوبی ہوئی تقریر شروع ہوئی تو وہ مجمع جو دوبارہ پھر مکمل ہوگیا تھا، کلیتہً ہمہ تن گوش تھا۔ تقریر ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کے تقاضے پورے کر رہی تھی اور جلسہ گاہ پر مکمل سکوت طاری تھا کہ اچانک مجمع کے اندر ایک ارتعاش سا پیدا ہوا اور پھر پورا مجمع ایک دم بھگدڑ کی نذر ہوگیا۔ چند ہی سیکنڈ میں دیکھا گیا کہ سروں پر کپڑا لپیٹے ہاتھوں میں لمبی لمبی لاٹھیاں لیے بنیان پہنے ایک فوج کی فوج پتھراؤ کرتی ہوئی ڈائس کی طرف تیزی سے بڑھتی چلی آرہی ہے اور اس بھیانک حملہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ آدھے منٹ سے بھی کم وقفہ میں مجمع بھی صاف ہوگیا۔ اور ڈائس کے لوگ بھی نہ جانے کہاں کہاں تتر بتر ہوگئے کچھ لوگوں کو مدرسہ اصغریہ کے مہتمم مولانا خلیل حسین اور ان کے بھائی مولانا جلیل حسین نے مدرسہ کے اندر پناہ دی۔ اب میدان بالکل اس لٹھ بند فوج کے قبضہ میں تھا۔ مدرسہ اصغریہ کے کواڑوں کو بھی توڑنے کی کوشش کی گئی اور ہمیں دُور بیٹھے ہوئے یہ خطرہ ہوا کہیں اس کے اندر پناہ گزینوں کو ختم ہی نہ کر دیا جائے۔ لاٹھیاں گھماتے ہوئے بعض لوگ ''مفتی کہاں مفتی کہاں ہے''۔ کی آوازیں بھی لگا رہے تھے۔ اسی حالت میں اب پولیس کے پانچ یا چھ سپاہی بھی نظر آئے ان میں دو کے پاس بندوقیں بھی تھیں؛ مگر وہ دور کھڑے ہوئے صرف اپنی لاٹھیوں اور بندوقوں ہی کی نمائش کرتے رہے۔ اس سے آگے نہ ان کا کوئی بس چل سکتا تھا اور نہ انھوں نے کوئی اقدام کیا۔ اب مسلسل ایسی آوازیں آرہی تھیں، جیسے کوئی ڈائس کے ساز و سامان اور اس کے تختوں کو توڑ رہا ہو کافی دیر تک یہ آوازیں آتی رہیں اور اسی دوران دیکھا گیا کہ نہ صرف بجلی کا نظام درہم برہم ہوگیا ہے؛ بلکہ ڈائس کے شامیانے گر بھی گئے اور ڈائس سے آگ کے شعلے بھی بلند ہو رہے ہیں۔ ڈائس پر چادروں، قالینوں اور مائیکروفون اور روشنی کے دیگر ساز و سامان کا کیا ہوا اس کے لیے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ جب جذبات کی تسکین کا کوئی سامان سامنے نہیں رہا تو یہ مجمع چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں گلیوں کی طرف چل نکلا۔ اب ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے تھے کہ مفتی عتیق الرحمٰن کا کیا حشر ہوا۔ ڈاکٹر فریدی، پنڈت سندرلال پر کیا بیتی۔ مولانا منظور نعمانی، مسٹر مظہر امام وغیرہ کن حالات سے گزرے اور اب وہ کہاں ہوں گے۔ جب میدان کلیتہً صاف ہوگیا مدرسہ اصغریہ کا دروازہ کھلا تو ہم بھی نیچے اُترے۔ ایک طالبِ علم نے راقم الحروف سے کہا آپ ابھی باہر نہ جائیے۔ بعض لوگ آپ کو پہچانتے ہیں۔ بہر حال! تھوڑی دیر کے بعد ہم مدرسہ اصغریہ میں داخل ہوئے وہاں دیکھا کہ پنڈت سندرلال، ڈاکٹر فریدی اور مولانا عاقل الہ آبادی موجود ہیں اور وہ پتھر بطور یادگار

انھوں نے اپنے پاس محفوظ کر لیے ہیں جو ان کے لیے کسی بڑی اذیت کا باعث تو نہیں ہو سکے؛ لیکن ضرب کا کام ضرور دے گئے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد یہ تینوں حضرات نہ جانے کیسی کیسی منزلوں سے گزر کر دارالعلوم کے مہمان خانے تک پہنچے راقم الحروف اپنے ساتھی مسرور خاں کی معیت میں اسٹیشن کی طرف اس حالت میں روانہ ہوا۔ کہ الحفیظ والاماں کا وظیفہ وردِ زبان تھا۔

رات بھر کیا ہوتا رہا اور ان مہمانوں کی دارالعلوم کے مہمان خانہ میں کس کس طرح ''میزبانی ہوتی رہی؟ یہ داستانِ اسیری اگلے روز انھیں حضرات سے معلوم ہوئی؛ چونکہ ۱۵/اکتوبر کی شب میں مجلسِ مشاورت کا ایک اجتماع سہارنپور میں بھی ہونے والا تھا؛ اس لیے صبح کو ۸ بجے اس اجتماع کے منتظمین میں سے ظہیر الاسلام ظہیرؔ اسعدی اور منشی افتخار احمد کار لے کر دیوبند پہنچے وہ حدود دارالعلوم میں داخل ہونا چاہتے تھے، ایک غضبناک چھوٹی سی ٹولی ان کی طرف بڑھی۔ صورتِ حال بے حد نازک تھی؛ مگر کسی نہ کسی طرح کار کو مدرسہ سے دُور چھوڑ کر یہ صاحبان مہمان خانہ تک پہنچے اور دارالعلوم کے کچھ اساتذہ کی مدد سے مولانا منظور نعمانی، ڈاکٹر فریدی، مظہر امام وغیرہ انتہائی سراسیمگی کے عالم میں کار تک پہنچے اور پھر سہارنپور آگئے مہمان خانے کے ان ''قیدیوں'' پر صبح تک کیا بیتی؟ محاصرہ اور خوفناک نعروں کا ایک لرزہ خیز ماحول تو تھا ہی۔ کچھ لوگ سیڑھی یا کسی اور ذریعہ سے اوپر پہنچنے میں بھی کامیاب ہو گئے یہ منظر جیسا کچھ ہوگا، اسے قیاس کیا جاسکتا ہے مولانا نعمانی کے لیے تو گالیاں اور قتل کی دھمکیاں ہی کافی رہیں؛ لیکن یہ مطالبہ انتہائی شدید تھا کہ ''مفتی کو ہمارے حوالہ کرو''۔ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب چونکہ افراتفری کے عالم میں لاپتہ ہو گئے تھے اور کسی کو خبر نہ تھی کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہیں؛ اس لیے ان سے کہہ دیا گیا کہ وہ یہاں نہیں ہیں؛ لیکن اس پر اعتبار نہیں کیا گیا اور مہمان خانے کا ایک ایک کمرہ حتیٰ کہ بیت الخلا اور غسل خانوں کا ایک ایک گوشہ چھان مارا۔ اور ''مفتی'' نہ ملنا تھا نہ ملا۔ ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ یہ مشتعل لوگ اس ارادہ سے آگے بڑھنا چاہتے تھے کہ مہمان خانہ کے ''قیدیوں'' کو اچھی طرح ''سبق'' دیدیں؛ لیکن اس موقعہ پر مولانا انظر شاہ بیچ میں اَڑ کر کھڑے ہو گئے اور انھوں نے کہا کہ پہلے مجھے ختم کر دو پھر کچھ کرنا۔

اس سلسلہ کا یہ افسوسناک المیہ اور ہمارے علم میں آیا ہے وہ یہ کہ دارالعلوم کا پورا ماحول جو شور و شغب اور خطرناک نعروں سے گونج ہی رہا تھا۔ اس دوران اندر ایک جلسہ ہوا اور اس جلسہ میں اور تو جو کچھ بھی ہوا ہو۔ اربابِ اہتمام سے ایک مطالبہ یہ بھی کیا کہ ان لوگوں کو فوراً مہمان خانے سے نکال دیا جائے اور یہ سن کر روح پر ایک کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے کہ دارالعلوم کے چار ذمہ دار ترین حضرات (جن کے نام بھی پوری ذمہ داری سے بتائے جاسکتے ہیں) رات کے دو بجے مہمان خانہ میں تشریف فرما ہوئے اور انھوں نے ''ان قیدیوں'' سے کہا کہ چونکہ یہ مطالبہ کیا جارہا ہے؛ اس لیے آپ حضرات مہمان خانہ خالی کر دیں''۔ ہر طرف اشتعال کی آگ بھڑکی ہوئی ہے فضا

حد درجہ مسموم ہے سینکڑوں لٹھ بند افراد مہمان خانہ کا محاصرہ کیے ہوئے ہیں ایسے عالم میں ذمہ دارانہ طور پر ہندوستان کی کچھ ممتاز شخصیتوں سے کیا کہا جا رہا ہے؟ لیکن ان حضرات نے یہ کہہ کر مہمان خانہ چھوڑنے سے انکار کر دیا کہ ہم ایسی نازک پوزیشن میں مہمان خانہ نہیں چھوڑیں گے اور یہیں ختم ہو جائیں گے۔ بہر حال اس نوع کے حالات سے گزر کر یہ حضرات سہارنپور پہنچے اور اب بھی انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ مفتی عتیق الرحمٰن کہاں ہیں اور ان پر کیا گزر چکی ہے، دو تین روز کے بعد معلوم ہوا کہ وہ زخمی حالت میں مولانا اختر حسین صاحب مدرس دارالعلوم کی پناہ میں رہے اور پھر اسی حالت میں کسی نہ کسی طرح دھلی پہنچ گئے۔

بعد کے حالات کیا ہیں؟ معتبر اطلاعات کے مطابق دارالعلوم کا پورا نظام معطل ہے۔ درسگاہیں اور دفاتر بند ہیں اور صرف مطبخ میں دونوں وقت کھانے کی تیاری اور تقسیم کا سلسلہ باقی ہے۔ ایک فہرستِ مطالبات بھی ہمارے علم میں آئی ہے جس کے اہم مطالبات میں مولانا مفتی عتیق الرحمٰن مولانا منظور نعمانی اور مولانا علی میاں کو مجلسِ شوریٰ سے الگ کرنا مجلسِ مشاورت سے تعلق رکھنے والے مدرسین اور ملازمین کی برطرفی اور مدرسہ سے مفتی عتیق الرحمٰن کے عزیز و اقارب کی برخواستگی بھی شامل ہے مزید یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس واقعہ سے کئی روز پہلے ایک ایسا میمورنڈم بھی ترتیب دیا گیا تھا جس میں کئی سو دستخطوں کے ساتھ مطالبہ کیا گیا تھا کہ "فلاں بزرگ" کو مجلسِ شوریٰ کا ممبر بنایا جائے۔

جلسہ کا ہنگامہ مسطورۂ بالا اخبارات کی رپورٹ کے مطابق جمیل مہدیؔ صاحب کے مقالہ کی اُکتاہٹ اور تلخ کلامی سے شروع ہوا اور پھر وہ تھوڑی دیر کے بعد ختم بھی ہو گیا؛ لیکن یہ پندرہ ہی منٹ کے وقفہ میں سیکڑوں افراد کا جلسہ گاہ پر بھیانک حملہ کیسے ہو گیا؟ اور لوگوں کے اندر اتنا خوفناک اشتعال کہاں سے آ گیا؟ اس سلسلہ کی جو اطلاعات ہیں ان کی صداقت کی موجودگی میں اس صورتِ حال کو غیر متوقع بھی نہیں کہا جا سکتا اور مسلح افراد کو بہت حد تک بے قصور بھی قرار دیا جا سکتا۔ جب پہلے ہنگامہ کے بعد مدرسہ سے تعلق رکھنے والے تمام افراد واپس چلے گئے تو مدرسہ کے لاؤڈ سپیکر سے اعلان کیا گیا کہ ہماری دو لاشیں جلسہ گاہ میں پڑی ہیں اور وہی "خون کا بدلہ خون"۔ یہ اعلان کرنے والے کون تھے؟ کچھ نہیں کہا جا سکتا اور اس کا جو ردِ عمل ہوا اسے نوجوانوں کے جذبات کی موجودگی میں آسانی سے جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا ایک بات انتہائی حیرت انگیز یہ ہے کہ جمیل مہدیؔ صاحب جن کے مقالہ کی اکتاد دینے والی طوالت اور تلخ کلامی کو بنائے فساد بتایا جاتا ہے آرام سے اپنے گھر میں رہے نہ ان کے گھر کا محاصرہ ہوا اور نہ کسی طرف سے ان کے حوالہ کرنے کا مطالبہ کیا گیا بخلاف اس کے مطالبہ کیا ہوا؟ "مفتی" کو ہمارے حوالہ کرو۔ مشاورت کے رہنماؤں کو ہمارے مہمان خانہ سے نکالو"۔ اور اب اربابِ اہتمام سے جو مطالبات کیے جا رہے ہیں اور دارالعلوم کا پورا نظام جس طرح معطل ہے اس میں بھی جمیل مہدیؔ صاحب کا کہیں ذکر نہیں ہے آخر یہ کیا ہے اور دراصل کونسی اغراض اور ریشہ دوانیاں، اندر کام کر رہی ہیں؟ اس پر غور کیا جا سکتا ہے۔

اور اس کے نتیجہ میں اگر مفتی عتیق الرحمٰن، مولانا منظور نعمانی مظہر امام، ڈاکٹر فریدی وغیرہ کی ہلاکت کے ساتھ پنڈت سندرلال جیسے دوسرے گاندھی کی موت بھی واقع ہو جاتی تو دیوبند ہی نہیں پورے ہندوستان کے مسلمان دنیا کو کس طرح یقین دلا سکتے تھے کہ ان کے اندر بالافراط ''گوڈسے'' موجود نہیں ہیں''۔

مولوی ہلال صاحب (استاذ دارالعلوم) کا بیان

دیوبند میں مسلم مجلسِ مشاورت کے جلسہ کا چرچا شروع ہوتے ہی نرم گرم خبریں کانوں میں پڑنے لگی تھیں؛ مگر اس طرح کی باتوں کو افواہوں یا ایک گروہ کی ہفوات سے زیادہ وقعت نہیں دی گئی۔ توقع بھی کسے ہو سکتی تھی کہ طالبان دین کا یہ مقدس گروہ اس شان کے ساتھ آمادۂ پیکار ہوگا کہ پوری ملّت کی گردنیں شرم سے جھک جائیں گی۔

اس جلسہ میں، میں بھی دلی ہمدردیوں اور حسبِ توفیق و استعانت عملی تعاون کے ساتھ شریک تھا۔ منتظمین کی سادہ لوحی اور حسن ظن کا اندازہ کیجیے کہ جلسہ سے قبل ایک صاحب نے اس طرح کے خدشہ کا اظہار بھی کیا تو مولانا عامر عثمانی صاحب (کنوینر مسلم مجلسِ مشاورت دیوبند) نے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ میاں کیا باتیں کرتے ہو؟

احتیاط کا عالم یہ کہ جلسہ کا مقام محلہ بڑ ضیاء الحق متصل دارالعلوم سے تبدیل کر کے دارالعلوم سے بہت دور محلہ قلعہ پر کر دیا گیا تھا۔

جلسہ کے آغاز سے قبل جب معزز مہمان جلسہ گاہ میں تشریف لائے تو نعرے لگوائے گئے۔ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اور دیگر حضرات کے ناموں پر زندہ باد کی صداؤں کی گونج میں اِدھر اُدھر کے کچھ گوشوں سے مردہ باد بھی کہا گیا۔ اس بات کی طرف جس نے بھی دھیان دیا سمجھ گیا کہ ایک خاص گروہ ایک خاص ارادہ لے کر جلسہ میں آیا ہے۔

جلسہ میں مجمع اندازے سے زیادہ تھا اور بڑے شکوہ و وقار کے ساتھ کلامِ پاک سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے مولوی عبداللہ سلیم نے اور اس کے بعد قاری ضیاء احمد عثمانی (قاری آل انڈیا ریڈیو) نے تلاوت کی۔ اور ان کی تلاوت سے طوالت کے باوجود لوگ محظوظ ہوئے۔

اس کے بعد میں نے اپنا مختصر سا مضمون پیش کیا۔ لوگ سنتے رہے۔ درمیان میں فارسی کا ایک شعر آیا کہ۔

برادر ایں دام بر مرغ دگر نہ ❖ کہ عنقا را بلند است آشیانہ

طلبا کے اس گروہ نے اس شعر کا سہارا لے کر اسی استہزائیہ انداز میں داد کے پھول بکھیرنے شروع کیے۔

بایں ہمہ یہ مرحلہ کامیابی سے گزر گیا اور مضمون کے اختصار نے زیادہ گڑبڑ کا موقع نہیں دیا۔

اس کے بعد عمر فاروق عاصم عثمانی صاحب نے نظم کا آغاز کیا۔ اور ان کو بھی اسی استہزاء کا سامنا کرنا پڑا؛ بلکہ

اس مرتبہ پہلے سے بھی آگے فاروق صاحب مجبور ہوئے کہ اس خوبصورت نظم کا گلا گھونٹ کر اس کو مختصر کر دیں۔ مجمع اس حرکت سے کبیدہ صبر کے گھونٹ پیتا رہا۔

فاروق صاحب کے بعد جناب جمیل مہدی صاحب کے مقالہ کا نمبر تھا۔ مقالہ شروع ہونے سے پہلے مولانا عامر عثمانی صاحب نے جو اسٹیج سکریٹری کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے۔ بڑی دلسوزی کے ساتھ خاموش رہنے کی گزارش کی۔ بہرحال! جمیل صاحب کا مقالہ شروع ہوا۔ اور یہ مقالہ بہانہ بن گیا ان رکیک جذبات کے اظہار کا جس کا اظہار تھوڑے بہت پیمانہ پر جلسہ کے آغاز سے قبل ہی ہو رہا تھا۔ جمیل صاحب کا مقالہ طویل ضرور تھا؛ اتنا دلچسپ پر زور و پُر جوش تھا کہ یوں کہیے کہ سماں سا بندھ گیا تھا۔ جمیل صاحب پڑھ رہے تھے اور مجمع ہمہ تن گوش تھا۔ جمیل صاحب لکھتے بھی اچھا ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں اور جب یہ دونوں چیزیں ہوں تو دل چاہتا ہے سنتے ہی رہیے۔ اس مقالہ میں کوئی اختلافی قسم کی بات بھی نہ تھی جس سے کسی کے جذبات مشتعل ہو سکتے؛ مگر یہ کئی بار ہوا کہ جمیل صاحب نے ذرا سانس لیا اور اس مخصوص گروہ کی طرف سے وہی استہزائیہ آوازیں شروع ہوئیں۔ جب بات زیادہ آگے بڑھنے لگی اور طلباء کی اس حرکت پر مجمع میں ناگواری کی کیفیت پیدا ہونے لگی تو جمیل صاحب نے خاموشی کے ساتھ سننے کی گزارش کی؛ مگر یہ گروہ خاموش رہنے کے لیے آیا ہی کب تھا جو خاموش رہتا۔ اس گروہ کے تیور تو کچھ اور ہی کہہ رہے تھے آوازیں بلند سے بلند تر ہوتی گئیں۔ جمیل صاحب نے کہا: یہ بات غیر مناسب ہے۔ یہ نہیں چلے گی۔ آوازیں اور بلند ہوگئیں۔ مجمع شور مچانے والوں کو خاموش کرنے کی کوشش کرتا رہا؛ لیکن یہ ساری کوششیں بے سود رہیں۔ اور پھر یہ منظر بھی دیکھا گیا کہ طلبائے دین جی ہاں! طلبائے دین وہ طلبائے دین جن کو آگے چل کر مسندِ رشد و ہدایت سنبھالنا ہے، جن کا کردار و عمل پوری امت کے لیے نمونہ ہوگا۔ ایک دیوانگی کے عالم میں چیخ رہے ہیں، ناچ رہے ہیں۔ اسٹیج پر ہم سب لوگ خاموش تماشائی بنے طلبائے دین کو محوِ رقص دیکھ رہے تھے۔ کچھ طلبا نے نالی پر رکھے ہوئے تختے اُٹھا لیے۔ ان کو گھمانے لگے اور ان سے جلسہ گاہ کی بندروال توڑنے لگے (ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ ایک طالبِ علم ان تختوں سے بھی زخمی ہوا)۔

آخر قاری ضیاء احمد صاحب سے تلاوتِ کلامِ پاک کے لیے کہا گیا۔ وہ تلاوت کرتے رہے اور طلبائے دین قرآن کے ساز پر رقص کرتے رہے اور اپنے عمل سے آیتِ قرآنی اِذَا قُرِءَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا کا مضحکہ اُڑاتے رہے (نعوذ باللہ) جس میں قرأت قرآن کے وقت خاموش رہنے اور اس کی طرف کان لگانے کا ”حکم“ دیا گیا ہے۔

کافی دیر تلاوت کے بعد قاری صاحب بیٹھے ہی تھے کہ سامنے کچھ اینٹیں گریں۔ میں نے اینٹوں کا لفظ استعمال کیا ہے؛ کیونکہ یہ اینٹوں کے دو ادھے ہی تھے جو جلسہ گاہ کے درمیان بہتی ہوئی نالی کے پانی سے دریوں کو محفوظ رکھنے کے لیے ان پر تختے بچھانے کے لیے رکھے گئے تھے۔

اب آپ جلسہ گاہ کی پوزیشن بھی سمجھ لیجیے۔ محلہ قلعہ مدرسہ اصغریہ کے سامنے جہاں یہ جلسہ ہو رہا تھا سڑک ڈھالدار ہے بلندی کی جانب وسیع اسٹیج تھا۔ اور اس طرح مجمع خاصے نشیب میں تھا۔ اِدھر اُدھر سے جو اینٹیں پھینکی گئیں ان میں سے کچھ تو اسٹیج پر پہنچیں اور کچھ غالباً اسٹیج سے نیچے ہی مجمع پر گریں۔ جس سے وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کے سر پھوٹے۔ ان ہی اینٹوں میں کوئی اسٹیج کے بائیں جانب بیٹھے ہوئے ایک طالبِ علم کے بھی لگی۔

اینٹیں پھینک کر جب گروہ جلسہ گاہ سے واک آؤٹ کر گیا اور پنڈت سندرلال جی کی تقریر سے دوبارہ جلسہ شروع کیا گیا تو مجمع ذرا چھٹنے پر وہ طالبِ علم نظر پڑا جو خود اپنے بھائیوں کی اینٹ سے زخمی ہو گیا تھا۔ صدر جلسہ مولوی محمد حنیف صاحب وکیل نے اس کو فوراً اسپتال پہنچوایا۔ سمجھ لیجیے وہ غریب طالبِ علم جن کے چوٹیں آئیں خود اپنے ہی ساتھیوں کی سنگ باری کا نشانہ بنے؛ کیونکہ اس طرف سے تو کسی طرح کی مدافعت بھی نہیں کی گئی جس سے یہ خیال کیا جاسکے کہ چوٹوں کے ذمہ دار ارکانِ جلسہ ہیں جو زیادہ تر اسٹیج پر ہی بیٹھے تھے۔

بہرحال یہ تو پہلے ہلّہ کا حال تھا۔ سندرلال جی کی پُر اثر تقریر میں ہم لوگ کھڑے ہوئے ہی تھے کہ اچانک دوبارہ منظم باقاعدہ مسلح حملہ ہوا۔ اس دوسرے ہلّہ کی یہ بات دیکھنے میں آئی کہ حملہ آوروں نے جلسہ گاہ اور اسٹیج کے بلب توڑ دیئے سامنے رکھے ہوئے گیس ختم کر دیئے۔ تاریکی میں صرف لاٹھیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ مکمل تاریکی جس میں اپنے اپنوں کے خون کے پیاسے بنے ہوئے تھے۔ گہری تاریکی جس میں دارالعلوم کے وقار کا سورج ڈوبتا جا رہا تھا۔ اس تاریکی میں کیا کیا کھیل کھیلا گیا مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن قدس سرہٗ کے بزرگ و برتر صاحبزادے مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے ساتھ کیا کچھ ہوا۔ عظمتِ اسلاف کو کس طرح پارہ پارہ کیا گیا۔ اس کے بیان کے لیے زبان و قلم کہاں سے لائیں۔

(ماہنامہ تجلی نومبر ۱۹۶۶ء)

واقعۂ دیوبند کے سلسلے میں

مولانا محمد طیّب صاحب مہتمم دارالعلوم کا بیان

۱۴اور ۱۵/اکتوبر ۶۶ء کی درمیانی شب میں دیوبند شہر میں دارالعلوم سے دو تین فرلانگ کے فاصلے پر محلہ قلعہ میں ایک شہری جلسے میں جو افسوسناک حادثہ پیش آیا گو اُس کا ادارہ سے کوئی تعلق نہیں، نہ اس جلسے کے نظم و نسق میں دارالعلوم کا کوئی تعاون شامل ہے اور نہ ہی اُس کا کوئی سامان، مثلاً لاؤڈ اسپیکر یا فرش وغیرہ وہاں استعمال ہوا جیسا کہ بعض بیانات میں اس قسم کی باتیں نظر سے گزریں؛ لیکن جبکہ اس المناک سانحے میں دارالعلوم کے کئی طلبہ مجروح ہوئے، کئی شہری حضرات کے چوٹیں آئیں۔ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ممبر شوریٰ دارالعلوم کے لاٹھی سے کمر اور سر میں ضربات آئیں۔ مولانا محمد منظور نعمانی ممبر شوریٰ دارالعلوم اور دوسرے بیرونی مہمانانِ قصبہ، ڈاکٹر فریدی صاحب، پنڈت سندر لال صاحب، مسٹر انور صاحب مدراسی اور مسٹر مظہر امام صاحب وغیرہ حضرات کی ساتھ جو اتفاقاتِ وقت سے مہمان خانہ دارالعلوم میں فروکش ہو گئے تھے ناروا سلوک ہوا تو میرا اخلاقی فریضہ ہے کہ میں ان سب کے سامنے افسوس اور ندامت کا اظہار کروں۔ میں اس سے شرمندہ اور خجل ہوں کہ ان بیرونی حضرات کے سامنے حقیقی دارالعلوم نہ آسکا اور نہ اُنھیں اُس کی اصلی روایات دیکھنے کا موقع مل سکا۔

دیوبند شہر کے باشندوں کا دارالعلوم سے جو مستحکم تاریخی اور مخلصانہ رابطہ ہے وہ کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دارالعلوم سے اُن کی ہمدردیاں رسمی نہیں؛ بلکہ حقیقی ہیں اور وہ عملی طور پر ہزاراں ہزار روپیہ سالانہ کی امداد بصورت طعام طلبہ دارالعلوم کو دے رہے ہیں؛ اس لیے اُن پر کسی چوٹ کا آنا ہمارے دلوں کا زخم ہے۔ طلبہ ہماری اولاد ہیں اگر اولاد کی چوٹ ماں باپ کے جگر کی چوٹ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اُن کے مجروح ہونے کی ٹیس ہمارے دل و دماغ محسوس نہ کرتے۔ شب میں یہ حادثہ ہوا اور صبح ہی کو یہ احقر مع چند اساتذہ دارالعلوم ہسپتال پہنچا، ان زخمی طلبہ کو تسلّی اور دلاسا دیا۔ ہسپتال کے ڈاکٹر صاحب سے مجروحین کے مواجہہ میں پوری پوری توجہ کرنے کے لیے بتاکید عرض کیا۔ اسی وقت ان طلبہ کے لیے دارالعلوم سے مالی امداد پہنچائی تاکہ قیمتاً خریدی جانے والی دوائیں اور پرہیزی غذا کا بندوبست کیا جاسکے، ڈاکٹر صاحب نے بھی اطمینان دلایا کہ دودھ یا پھل وغیرہ کا پورا پورا بندوبست کیا جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ ایسے ہنگاموں میں چند ہی فساد برپا کرتے ہیں سب طلبہ ایک درجہ میں نہیں ہوتے؛ مگر مبتلا سب ہو جاتے ہیں؛ لیکن سب کی اصل دارالعلوم ہے جس سے ان روابط کا قیام و استحکام ہے اُس پر یا اُس کی روایات پر کسی ضرب کا پڑنا جڑ پر تیشہ کے

مرادف ہے جس کی بے قراری سب کو محسوس ہونی چاہیے؛ کیونکہ دارالعلوم نہ خود کوئی پارٹی ہے نہ کسی سیاسی غیر سیاسی جماعت کا جزو ہے اور نہ ہی کسی پارٹی کا مخالف یا رقیب، وہ سارے مسلمانوں کی ایک مشترک تعلیمی متاع ہے، اُس کے معائنہ کے لیے ہر طبقے کے لوگ دعوت بلادعوت تشریف لاتے ہیں اُس میں قیام کرتے ہیں وہ حسبِ حیثیت سب کے اکرام کا شرعی اور اخلاقی فریضہ ادا کرتا ہے اور سب بلاتخصیص فکر و خیال اُس کے ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

اس افسوسناک حادثہ کا رونما ہونا ایک حقیقت واقعہ ہے جو کسی تحقیق کا محتاج نہیں، واقعہ ہوا اور بہت بُرا ہوا اور اُس سے طلبہ اور شہری اور بیرونی مہمان درجہ بدرجہ بُری طرح متأثر ہوئے۔ تحقیقیں اس کی کی جارہی ہیں کہ اُس کے اسباب و موجبات کیا تھے؟ حادثہ کے آغاز کا ذمہ دار کون تھا؟ اس سلسلے میں مختلف اور متضاد بیانات اخبارات میں آرہے ہیں اور بعض بیانات افسوسناک حد تک ناتمام اور غیر متوازن بھی ہیں؛ لیکن اگر حادثے سے دارالعلوم کی روایات پر کوئی ضرب پڑی ہے تو یہ مختلف نقاطِ نظر کی تحقیقات اور اُن سے مستنبط نتائج اُس ضرب کا مداوا ہیں نہ تدارک، میں اس سلسلے میں اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ ادارہ نہ اس حادثہ کا ذمہ دار ہے اور نہ ہی وقوعِ واقعہ سے ایک منٹ قبل تک ذمہ دارانِ دارالعلوم کو اس صورتِ حال کا کوئی تصور یا احساس تھا۔ اس بارے میں نوع بنوع تحقیقات و تدقیقات اور سوالات کا سلسلہ اگر چلایا جائے تو وہ کسی حد پر بھی ختم نہیں ہوسکتا اور نہ اس سے عوامی تشویشات کو تسکین ہوسکتی ہے؛ اس لیے مناسب ہوگا کہ اس سلسلے کو آگے نہ بڑھایا جائے اور دارالعلوم کو سیاسی مباحث کے اسٹینڈ کے طور پر استعمال نہ کیا جائے۔ اگر تحقیق کا مقصد دارالعلوم کے مستقبل کے لیے کسی اصلاحِ حال کی توقع اور ضرورت ہے تو وہ خود دارالعلوم ہی بہتر طریقے پر کرسکتا ہے جس کے لیے وہ اقدام کر چکا ہے۔

اس ذیل میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اخبار''الجمعیۃ'' ۲۸/اکتوبر ۶۶ء میں قومی آواز کے اداریے سے بذیل عنوان ''ایک کے بعد دوسرا'' یہ جملہ نقل کیا گیا ہے کہ ''مولانا اسعد مدنی کے خلاف دارالعلوم دیوبند کے طلباء سے اربابِ اہتمام نے ہندو پاکستان جنگ کے دوران ایک بیان کے سلسلے میں جو مظاہرہ کرایا تھا اُسے بھی سامنے رکھنا چاہیے''۔ یہ کذب خالص اور افتراءِ محض ہے۔ نہ دارالعلوم مظاہروں کے لیے ہے نہ اس کی پوری تاریخ میں اربابِ اہتمام نے کبھی مظاہرے کرائے اور نہ ہی وہ اس کا ذوق رکھتے ہیں۔ یہ جھگڑا جمعیۃ العلماء اور مجلسِ مشاورت کا ہے اُس میں خواہ مخواہ دارالعلوم اور اُس میں بھی بالخصوص اربابِ اہتمام کو لپیٹا جارہا ہے، جن کا اس جھگڑے سے کوئی تعلق نہیں۔ وباللہ التوفیق۔

محمد طیب

۱۶/۷/۱۳۸۶

(مولانا) محمد طیب (صاحب) مہتمم دارالعلوم دیوبند

(ماہنامہ تجلی نومبر ۱۹۶۶ء)

تجلی

یہ بیان اپنے مصداق و مفہوم اور مطالب و معانی کے اعتبار سے کسی تبصرہ کا محتاج نہیں۔ ہر آنکھ والا دیکھ سکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی سب سے ذمہ دار شخصیت کتنے کھلے طور پر اعلان کر رہی ہے کہ فسادی کون ہے اور مظلوم کون۔

دارالعلوم کی نیک نامی حضرت مہتمم صاحب سے زیادہ کسے محبوب و مطلوب ہو سکتی ہے۔ اگر ۱۴/اکتوبر والے ہنگامے میں جس کے تمام مراحل اور نشیب و فراز انھوں نے خود دیوبند موجود ہوتے ہوئے دیکھے ذرا بھی گنجائش یہ گمان کرنے کے لیے نکلتی کہ قصور کچھ مجلسِ مشاورت والوں کا بھی تھا تو قدرتی بات ہے کہ اس کا ذکر ان کی نوکِ قلم پر سب سے پہلے آتا۔ نمایاں ہو کر آتا۔ ظاہر ہے کہ دارالعلوم کی نیک نامی اور رُسوائی کا مدار طلباء کے کردار پر ہے۔ اگر تنہا طلباء ہی اس تمام ہنگامے کے ذمہ دار ثابت ہوں تو رسوائی شدید تر ہو جاتی ہے اور اگر شریک جرم کسی درجہ میں مجلسِ مشاورت والے بھی قرار پائیں تو رسوائی ہلکی پڑ جاتی ہے ایسی حالت میں حضرت مہتمم صاحب کا یہ بیان واضح ثبوت ہے اس امرِ واقعہ کا کہ جارحیت اور فتنہ انگیزی سراسر ایک ہی فریق کی طرف سے ہوئی ہے اور وہ فریق کون ہے اس کا قطعی تعین بیان کے ان الفاظ نے کر دیا ہے کہ:

> ''میں جانتا ہوں کہ ایسے ہنگاموں میں چند ہی فساد برپا کرتے ہیں، سب طلباء ایک درجے میں نہیں ہوتے''۔

یہی ہمارا موقف بھی ہے جسے ہم ''آغازِ سخن'' میں بیان کر آئے ہیں۔ حاشیہ بس اتنا اور دے لیجیے کہ یہ چند فسادی طلبہ بھی حقیقت میں اپنے لیے فساد برپا نہیں کرتے؛ بلکہ یہ بُرا کام ان سے کچھ اساتذہ کراتے ہیں اور یہ اساتذہ بھی دراصل کسی اور کے وفادار ہیں، عین ممکن ہے کہ ہنگامے کی پوری اسکیم ''کسی اور'' نے ترتیب نہ دی ہو؛ لیکن یہ بالکل طے ہے کہ ہنگامے کا مقصد ''کسی اور'' ہی کی خدمت تھا۔

مہتمم صاحب کے اس بیان کی روشنی میں مقبوضہ جمعیۃ علماء کے اس وفد کی رپورٹ پر بھی نظر ڈالیے جس پر ضمنی سا نقد ہم آغازِ سخن میں کر آئے ہیں اس رپورٹ میں مسخروں نے لکھا تھا کہ:

> ''ہم نے طلباء کی مانگوں پر خود بھی تحقیقات کی جن میں سے یہ مانگ صحیح ثابت ہوئی کہ مجلسِ مشاورت کے جلسے میں دارالحدیث کا لاؤڈ اسپیکر سیٹ بھی ملازمین خلافِ ضابطہ دارالعلوم بلا اجازت و اطلاع حضرت مہتمم صاحب و شیخ الحدیث صاحب سے لے گئے اور جلسہ گاہ میں استعمال ہوا؛ لہٰذا ملازمین کے خلاف ضابطہ کی کارروائی کی جائے؛ چنانچہ حضرت مہتمم صاحب نے بتاریخ

۱۶/اکتوبر کو ذمہ دار ملازم کو معطل کر کے جمعیۃ الطلبہ کو اس کی تحریری اطلاع دے دی ہے“۔

مگر آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ حضرت مہتمم صاحب قطعی طور پر اس کی تردید فرمارہے ہیں۔ رہا متعلقہ ملازم کو معطل کر دینا تو بے شک وفد کی مہیا کردہ جھوٹی شہادتوں کی بنا پر یہ تعطلی عمل میں آئی ضرور تھی؛ لیکن دو ہی دن بعد جب مہتمم صاحب کو فیصلہ کن طور پر یہ معلوم ہو گیا کہ شہادتیں جعلی تھیں اور وفد نے بجائے تفتیش کے فتنہ طرازوں کی طرفداری اور جعلسازی کا کارنامہ انجام دیا ہے تو انھوں نے فوراً ایک پروانہ مذکورہ ملازم کے نام اس تعطلی کی منسوخی کا بھیجا اور واضح الفاظ میں لکھا کہ تمھارے خلاف لگائے گئے الزامات بے بنیاد ثابت ہوئے ہیں؛ لہٰذا معطلی منسوخ کی جاتی ہے۔

اسی حقیقت کو انھوں نے اپنے اس بیان میں بھی دہرادیا ہے جس کے بعد نام نہاد وفد کی رپورٹ کا دامن عصمت سرِ بازار چاک چاک ہو گیا ہے۔

لطیفہ اور بھی سنیے۔ وفد نے یہ بھی کہا تھا:

”ہمیں دارالعلوم کے ایک ذمہ دار مدرس نے دورانِ گفتگو روبرو حضرت مہتمم صاحب یہ اطلاع دی کہ طلباء نے ایک شخص مسمّٰی محمد زکریا کو لاٹھیوں سے مارا اور اس کے جسم پر اٹھارہ بیس لاٹھیاں لگی ہیں اور وہ شدید مجروح ہے جس کو ہم نے اس کے گھر روانہ کر دیا ہے؛ مگر مجلس میں ایک دوسرے ذمہ دار مدرس نے بتایا کہ ان سے محمد زکریا کی آج بعد ظہر ملاقات ہوئی ہے اور وہ بالکل ٹھیک ہے اس کے جسم پر کوئی چوٹ نہیں آئی ہے۔“

لطیفہ اس میں یہ ہے کہ جس شخص کو نہایت مجہول انداز میں ”ایک شخص مسمّٰی زکریا“ کہا جارہا ہے وہ جانتے ہیں آپ کون ہے؟ جمعیۃ الطلباء دارالعلوم کا جنرل سکریٹری اور دورے کا طالبِ علم۔ ان دونوں حیثیتوں کو مخفی رکھتے ہوئے ایک مجہول شخص کی حیثیت میں زکریا صاحب کا تذکرہ وفد کی شعبدہ بازی کا ویسا ہی نمونہ ہے جیسا جھوٹی شہادتیں مہیا کر کے ملازم کو معطل کرانے کا نامشکور کارنامہ۔ آپ اسی شمارے میں صدر جمعیۃ الطلباء کا بیان دیکھ ہی چکے۔ اب اگر دنیا کے سامنے یہ بات بھی آجائے کہ صدر ہی کی طرح جمعیۃ الطلباء کا جنرل سکریٹری بھی طلباء کو جارح قرار دیتا ہے اور اسی لیے طلباء نے اسے بھی پیٹا تو پھر یہ دھوکا دینا اور بھی دشوار ہو جاتا ہے کہ ہنگامے کی اسکیم پہلے سے تیار نہیں تھی۔ اسی لیے نام نہاد وفد نے زکریا صاحب کی ہر دو حیثیات گول کر کے مذکورہ گل افشانی کی۔ اسی کا نام ہے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنا۔

حق یہ ہے کہ محمد زکریا صاحب پٹے ہیں اور کافی پٹے ہیں؛ لیکن یہ علیحدہ بات ہے کہ ہاتھ پیر نہیں ٹوٹے یا خونم خان نہیں ہوئے۔ جس مدرس نے ان کے شدید مجروح ہونے کی بات کہی ہوگی وہ بھی ممکن ہے اُنھی مدرسین میں

سے رہا ہو جنھوں نے رات میں تو حملے کی کمان کی؛ مگر صبح دم بھیگی بلی بن گئے۔

نام نہاد وفد کی دیانت کا اندازہ اسی سے فرمالیجیے کہ رپورٹ میں الابلا سب کچھ ہے؛ مگر مولانا مفتی عتیق الرحمٰن جیسی شخصیت کے مضروب ہونے کا ذکر تک نہیں، حالانکہ اس کا چرچا شہر بھر میں تھا۔

ایک چٹکلہ اور!

وفد کی رپورٹ میں یہ رونا بھی رویا گیا ہے کہ:

"ہلال عثمانی کے مقالہ میں کچھ اس قسم کے طنزیہ الفاظ (شوبوائے وغیرہ) تھے جس کا براہِ راست نشانہ جمعیۃ علمائے ہند اور اکابرین دیوبند پر تھا۔"

اسے کہتے ہیں چور کی داڑھی میں تنکا!۔ ہلال صاحب کے مقالہ میں "شوبوائے" کا لفظ بیشک تھا؛ لیکن مقبوضہ جمعیۃ والے اگر پاکدامن ہوتے تو اس لفظ کا اطلاق مسٹر چھاگلہ یا عبدالقیوم انصاری جیسے قوم پرستوں پر کرلینا کچھ بھی مشکل نہ تھا وہ زبردستی اس لفظ کو اپنی ہی شان میں لیے بیٹھے ہیں تو اس کے سوا کیا کہا جائے کہ ان کی ذہنی کیفیت ان مجرمین کی سی ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۂ منافقون میں فرمایا ہے کہ: "یَحْسَبُوْنَ کُلَّ صَیْحَةٍ عَلَیْهِمْ" جہاں ذرا شور وغل ہوا وہ سمجھے کہ ہم پر ہی کوئی بلا آگئی۔ مجرموں کا عالم یہی ہوتا ہے کہ دور سے بھی کسی لال پگڑی والے کو اپنی طرف آتے دیکھا اور دل دھڑکا کہ ہو نہ ہو یہ ہماری ہی مزاج پرسی کو چلا آرہا ہے۔

پھر مان لو کہ نشانہ جمعیۃ ہی رہی ہو؛ مگر یہ کیا تماشہ ہے کہ اس پر مفتی عتیق الرحمٰن تو مطمئن بیٹھے رہیں جبکہ وہ جمعیۃ کے اساطین اور روا کابرمیں ہیں اور مرچیں لگ جائیں ان چھٹ بھیوں کے جن کی حیثیت مفتی صاحب کے مقابلہ میں لونڈوں سے زیادہ نہیں۔

غضب یہ ہے کہ جمعیۃ علماء کے ساتھ "اکابرین دیوبند" بھی ٹانک دیے گئے۔ یعنی ہلال صاحب نے اکابرین دیوبند کو بھی نشانہ بنایا!۔ واہ رے افسانہ طرازو!۔ اکابرین دیوبند کی کوئی عزت اگر تمہارے دلوں میں ہوتی تو یہ منظر چشم فلک کاہے کو دیکھتی کہ دارالعلوم دیوبند کے شہرۂ آفاق مفتی اعظم اور شیخ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن کے صاجزادے مفتی عتیق الرحمٰن کو تمہارے ہی تھیلی کے چٹے بٹے گالیاں دے رہے ہیں، مار رہے ہیں، غل مچارہے ہیں کہ انھیں مجلسِ شوریٰ سے الگ کر کے مولوی اسد کو داخل کرو۔ مولوی اسد بقول تمہارے مدنی ہیں اور بقول کسی اور کے ٹانڈوی۔ دیوبندی بہر حال نہیں ہیں اور "اکابرین" کی فہرست میں بھی انھیں سوائے طفلانِ مکتب کے کوئی نہیں رکھ سکتا؛ لہٰذا اکابرین دیوبند کی توہین کا سوال کہاں سے کھڑا ہوگیا، اگر ہلال صاحب نے شوبوائے مولوی اسد ہی کو کہہ دیا ہو: حق یہ ہے کہ اس لفظ کا اطلاق موجودہ صدر مقبوضہ جمعیۃ علماء مولانا فخر الدین پر کرلو تو زیادہ دلچسپ ہوگا؛ مگر اکابرین دیوبند میں وہ بھی نہیں۔ اللہ تمہیں عقلِ سلیم دے۔

آغازِ سخن

اِس بات کی معقولیت سے کوئی صاحبِ عقل انکار نہیں کرسکتا کہ آپس کا اتحاد و اشتراک خیر و برکت کا منبع ہے، فلاح و کامرانی کی ضمانت ہے۔ ترقی کا سنگِ بنیاد ہے اور آپس کا نزاع خسران و نامرادی کا پیش خیمہ، حرمان و ہلاکت کی تمہید اور بربادی و نقصان کا ضمیمہ۔

لیکن جب صورتِ حال یہ ہو کہ اپنے ہی بعض خیرہ سر اور بے لگام ساتھی یہ تہیّہ کر بیٹھیں کہ ذاتی مفادات کی خاطر وہ اتحاد و تعاون کی راہ میں کانٹے بچھائیں گے۔ غلاظتیں ڈالیں گے۔ دیواریں اُٹھائیں گے اور جھوٹ، افترا، کج بحثی، ڈھٹائی اور مکر و فریب کی ہر ممکن تکنک سادہ لوح افراد کو اتحاد کی راہ سے ہٹانے میں استعمال کریں گے تو آپ خود فیصلہ کیجئے کہ کیا ایسی حالت میں یہ ضروری نہیں ہو جاتا کہ ان کی ناپاک کوششوں کو ناکام بنایا جائے، ان کے فریب کا پردہ چاک کیا جائے، ان کے چہروں سے نقابیں نوچ کر ان کی اصلیت اور حیثیت سامنے لائی جائے تاکہ جو سادہ لوح اور کم فہم لوگ ان کے بہروپ سے دھوکا کھا سکتے ہیں وہ دھوکا کھانے سے بچ جائیں اور اندھی عقیدتوں کے مارے ہوؤں کو پتا چل جائے کہ رشد و ہدایت اور قیادت و سیادت کے ظاہر فریب ملبوسات کے پیچھے ہوس، خود غرضی اور مفاد پرستی کے کیسے کیسے اژدہے پھنکاریں مار رہے ہیں۔

جمعیۃ علمائے ہند سے اختلاف ہمیں پہلے بھی تھا لیکن اس کی نوعیت وہ نہیں تھی جو آج ہے۔ پہلے ہمیں اس سے اختلاف اس لیے تھا کہ ابنائے وطن سے جو اُمیدیں اس نے باندھی تھیں انھیں ہم محض خوش فہمی تصور کرتے تھے اور اس خوش فہمی کی بنیاد پر نیازمندی، اعتماد اور تقلید جامد کی جو پالیسی اس نے سیاست کے میدان میں اختیار کی تھی اس کے نتائج کی طرف سے ہمیں سراسر مایوسی تھی۔ چنانچہ آج اٹھارہ سالہ تجربے کے بعد ساری دنیا نے دیکھ لیا کہ ہماری رائے غلط نہیں تھی اور ابنائے وطن کی ذہنیت سرشت اور افتادِ طبع کو سمجھے بغیر جو روش اپنائی گئی تھی اس نے ملّتِ مسلمہ کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا۔ اسی انجام کے پیشگی احساس و ادراک کے پیش نظر ہمیں جمعیۃ علماء سے اختلاف تھا۔ لیکن اختلاف کے باوجود ہمیں اس میں ذرا بھی شک نہیں تھا کہ ملّت کے بہترین اور ممتاز افراد کی ساختہ پرداختہ یہ جماعت ایک عظیم المرتبہ جماعت ہے جس کے معزز افراد فکر و فہم کی غلطی تو کرسکتے ہیں مگر اخلاص اور ضمیر کا سودا نہیں کرسکتے ملّت فروشی نہیں کرسکتے۔ بک نہیں سکتے۔ ہمیں یقین تھا کہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰنؒ اور

حضرت مولانا مدنی ؒ جیسے جلیل القدر حضرات مخلص ہیں، دین وملّت کے فدائی ہیں، نیک نیت ہیں۔انھوں نے ابنائے وطن کی شرافتِ نفس اور منصف مزاجی پر بھروسہ کرتے ہوئے جو سیاسی راہیں پسند کی ہیں وہ حقیقتِ نفس الامری کے اعتبار سے چاہے کتنی ہی لاحاصل، بدانجام اور مایوس کن ہوں؛ لیکن ان کی نیت نیک ہے۔خلوص بے داغ ہے۔مفاد پرستی اور خودغرضی کی کوئی چھینٹ ان کے دامن پر نہیں۔یہ فریبی نہیں ہیں فریب خوردہ ہیں۔ یہ ایک ایسے سیاسی مجتہد ہیں جن سے اجتہاد میں خطا تو ہوئی ہے مگر حسنِ نیت کا ثواب انھیں پھر بھی مل کر رہے گا۔

مگر آج ہمیں جو اختلاف جمعیۃ علماء سے ہے وہ دوسری نوع کا ہے۔جمعیۃ علماء کا ایک بازو تو وہ ہے جس کی نمائندگی حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کرتے ہیں۔اس سے اختلاف کا سوال اس لیے پیدا نہیں ہوتا کہ حضرت مفتی صاحب نے ایک مخلص اور مقصد پرست انسان کی طرح اپنی سیاسی راہ میں اُس موڑ کو قبول کرلیا ہے جس کی افادیت موجودہ حالات میں کسی بحث کی محتاج نہیں وہ مولانا حفظ الرحمٰن ؒ کے داہنے بازو رہے ہیں اور مدّت دراز تک پورے خلوص کے ساتھ اسی جادۂ سیاست پر چلتے رہے ہیں جس پر پرانی جمعیۃ علماء چل رہی تھی۔ مگر آج جب انھوں نے محسوس کرلیا کہ اس راہ پر آنکھیں بند کر کے چلتے رہنا اب ہر گز مفید نہیں ہوسکتا اور ابنائے وطن کے جس عدل و دیانت پر بھروسہ جمعیۃ علماء کی پرانی پالیسی کی بنیاد تھی وہ عدل و دیانت سراب ثابت ہو چکے ہیں تو ایک ایماندار، اخلاص مند اور حق پسند آدمی کی طرح انھوں نے حقائق کو تسلیم کرلیا اور ایک ایسا موڑ مُڑ گئے جس کی طرف تجربے سے حاصل شدہ نتائج واضح اشارہ کر رہے تھے۔ایسی صورت میں ان سے اختلاف کی کوئی وجہ نہیں۔

ہاں اختلاف ہے تو اُس دوسرے بازو سے جس کی نمائندگی حضرت مولانا حسین احمد مدنی ؒ کے فرزندارجمند مولوی اسدؔ میاں کر رہے ہیں۔یہ بازو فقط لکڑی کا بازو ہے جسے عمل جراحی کے ذریعے جسم میں جوڑ دیا گیا ہے۔اسی لیے ہم اسے مقبوضہ جمعیۃ علماء کا نام دیتے ہیں۔جمعیۃ کے دفتر، املاک اور پریس پر قبضہ کرلینا ہے تو بجا طور پر ایک کارنامہ لیکن کارنامے کی یہ قسم اس کارنامے سے مختلف نہیں جو انگریز نے ہندوستان پر قبضہ جما کر انجام دیا تھا۔کارنامے تو ہٹلر واسٹالن کے بھی بہت مشہور ہیں مگر سوال ہے عدل و دیانت کا۔ایمان کا۔حق اور خداترسی کا۔ مقبوضہ جمعیۃ علماء میں جتنے بھی افراد ہیں ان میں سے ہر ہر کو بددیانت اور فتنہ پرداز ہم نہیں کہہ سکتے۔ان میں بہتیرے اربابِ زہد وتقویٰ بھی ہیں۔دلق پوش بھی ہیں۔نیک نیت بھی ہیں۔لیکن من حیث المجموع جو راستہ مقبوضہ جمعیت نے اختیار کیا ہے وہ نہ تو پچھلی عظیم جمعیۃ علماء کی عظمت ومنزلت سے جوڑ کھاتا ہے نہ وہ مکروفریب مفاد پرستی اور کاسہ لیسی کی اُن غلاظتوں سے پاک ہے جن کی آلودگی کسی بھی نیک نام اور عظیم القدر گروہ کو طالع آزاؤں اور ابن الوقتوں کے غول میں تبدیل کر دیتی ہے۔

ہم مقبوضہ جمعیۃ علماء سے کُھلا اختلاف رکھتے ہیں، اور اختلاف کے ساتھ ساتھ یہ کہنے میں بھی ہمیں کوئی باک نہیں

کہ اب جو روش اس جماعت نے اجتماعی مسائل کی راہ میں اختیار کر رکھی ہے اس کے پیچھے فقط ہٹ دھرمی ہے، مفاد پرستی ہے، حبِ جاہ ہے، مجہولیت اور مغفل پن ہے۔ اس کا قوم وملت کے حقیقی مفاد سے کوئی رابطہ نہیں۔ اس کا حق وصداقت سے کوئی تعلق نہیں۔ جمعیۃ علماء کے بھاری بھرکم نام، اس کی سابقہ عظمت، اس کی تاریخ، اس کی تقدیس اور نیک نامی کے چہرے پر جتنی کالک مقبوضہ جمعیۃ علماء کے مٹھی بھر گروہ نے مَلی ہے کیا کوئی مَلے گا۔

اخبار الجمعیۃ کے فاضل مدیر۔ ڈیوٹی کے طور پر وقتاً فوقتاً جمعیۃ علماء کی تاریخی عظمتوں کے گن گاتے رہتے ہیں۔ وہ کریں بھی کیا۔ ملازم تو ملازم ہی ہوتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ پدرم سلطان بود کا وظیفہ ناخلف اولاد کے جرائم کا نعم البدل تو نہیں ہوسکتا۔ سوال یہ نہیں کہ جمعیۃ علماء کتنی پرانی اور بھاری بھرکم جماعت ہے سوال یہ ہے کہ اب اُس گروہ کا کردار کیا ہے جو اپنے آپ کو جمعیۃ علماء کا ہول سول مالک کہتا ہے۔ اس گروہ کی بدکرداریوں اور احمقانہ ڈپلومیسیوں پر "پدرم سلطان بود" کا پردہ ڈالنا ایسا ہی ہے جیسے ہم آج کے مسلمان اپنی بدکرداریوں کی پردہ پوشی کے لیے قصہ لے بیٹھیں کہ ہمارے دادا ایسے تھے اور پردادا ایسے تھے۔

مقبوضہ جمعیۃ علماء اگر اپنے کام سے کام رکھتی، خاموشی سے زکوٰۃ وصدقات کھاتی، چندے اُڑاتی، پرمٹ اور لائسنس حاصل کرتی تو ہمیں اس سے کچھ سروکار نہ ہوتا۔ اس کے پیری مریدی والے چکر سے بھی ہمیں کوئی لڑائی نہیں تھی۔ مگر جب اس کے اخبار نے ایک طرف تو علماء کو ذلیل ورسوا کرنے کی مہم چلا رکھی ہے دوسری طرف مسلم مجلسِ مشاورت کے خلاف ذلیل قسم کے پروپیگنڈے کو روزمرہ کا معمول بنا لیا ہے۔ تیسری طرف فرعونیت کی مدح سرائی میں پیش پیش ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کی ناشائستہ اور اسلام دشمن حرکات پر اپنے مسلمان بھائیوں کو توجہ نہ دلائیں۔

علماء کو ذلیل ورسوا کرنے کی مہم کا الزام ہم نے یوں ہی نہیں لگا دیا۔ آئیے آپ ثبوت دیکھئے:

۱۸ رمئی ۶۶ء کے الجمعیۃ میں صفحہ ۶ پر ایک تصویردار اشتہار ہے جس کی بالائی سرخی ہے:

"پھول جیسا چہرہ"

اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ "پھول جیسا چہرہ" کسی "دیوی" ہی کا ہوسکتا ہے۔ اور اخبار اُٹھا کر دیکھ ہی جو لیجئے یہ چہرہ ایک فیشن ایبل دیوی ہی کا ہے۔

تصویروں کی اشاعت آج کل اخبارات ورسائل میں عام چیز ہے لیکن سوال یہ ہے کہ مولوی اسعد اور مولوی محمد میاں جیسے علماء جو اخبار الجمعیۃ پر قابض ومتصرف ہیں کیا ان کے نزدیک بھی تصویریں، خصوصاً عورتوں کی تصویریں چھاپنا جائز ہے۔؟

اگر نہیں اور یقیناً نہیں (جس کا جی چاہے ان حضرات سے فتویٰ لے کر پوچھ لے) تو بتایا جائے کہ علماء کے سرکاری آرگن میں "پھول جیسا چہرہ" دیکھ کر عوام الناس کا تاثر اس کے سوا کیا ہوگا کہ آج کے علماء وہ مخلوق ہیں جو

چند ٹکے کی خاطر سرِ بازار حرام کاری کر سکتے ہیں۔ حرام کاری کے سوا اسے کیا کہا جائے گا کہ جن تصویروں کا چھاپنا وہ خود حرام کہتے اور سمجھتے ہیں انھی کی اشاعت اپنے اخبار میں دھڑلے سے کی جارہی ہے۔

فقط تصویروں تک بات نہیں۔ سود کے اشتہارات بھی اسی الجمعیۃ میں چھپتے ہیں اور ابھی اکتوبر ہی کے مہینے میں فلم ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی آنکھیں پہچان کر انعام جیتنے والا اشتہار بھی اس میں ایک سے زائد بار چھپا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس حرام کاری کا آخر عذر کیا ہے؟ مقبوضہ جمعیۃ علماء کے بعض بے سند وکلاء منہ بسور کر فرماتے ہیں کہ صاحب! اشتہاروں کے بغیر اخبار زندہ نہیں رہ سکتا۔ اشتہار چاہے وہ سود کے ہوں، قمار کے ہوں، تصویر والے ہوں ہر حال میں چھاپنے ہی ہوں گے ورنہ اخبار دیوالیہ ہو جائے گا۔

ہم عرض کرتے ہیں کہ یہ عذر گناہ بدتر از گناہ ہے۔ اوّل تو یہ عذر ہے ہی سرے سے غلط۔ آخر "دعوت" بھی تو ایک اخبار ہے جو زیادہ نہیں تو اخبار الجمعیۃ سے تین گُنا تو چھپتا ہی ہے اور اسی تناسب سے اس کے مصارف بھی زیادہ ہیں؛ مگر اس میں کبھی پھول جیسے چہرے نہیں آتے نہ سود اور فلمی مقابلوں کے اعلانیے چھپتے ہیں۔ اسی طرح "تجلّی" بھی ایک پرچہ ہے جو سترہ سالوں سے پھول جیسے چہروں اور فلمی مقابلوں کے بغیر ہی نہ صرف جی رہا ہے بلکہ شان سے جی رہا ہے۔ بغیر حرام کاری کے اخبار کو زندہ نہ رکھ سکنے کا عذر دراصل اُن بے حیا اور کم ہمت لوگوں کا سا عذر ہے جو حلال کی کمائی کے لیے محنت مشقت نہیں کر سکتے تو آبرو بیچ کر روزی کماتے ہیں۔

پھر چلئے مان ہی لیا کہ اخبار کو زندہ رکھنے کے لیے وہ سو دو سو روپئے قطعاً ضروری ہی تھے جو صریح حرام پر مشتمل اشتہارات چھاپ کر وصول ہوئے۔ مگر اس سے عوام الناس پر یہ تو ثابت ہو گیا کہ مقبوضہ جمعیۃ علماء کے معزز علماء سو دو سو روپے کی خاطر عین چوراہے پر ایمان فروشی کر سکتے ہیں۔ حرام کو اپنا سکتے ہیں۔ معاشرے کی گندگی بڑھانے میں تعاون دے سکتے ہیں۔ تُف ہے ان علماء پر جو اپنے بارے میں خلق خدا کو ایسا گھٹیا تصور دیں اور اپنی بدکرداری سے تمام علماء کو رسوا کریں۔

یہ بھی اہلِ عقل غور فرمالیں کہ جو نام نہاد علماء سو دو سو کی خاطر بلا تکلف حرام کاری کر سکتے ہیں وہ ایسے نیلام گھروں میں اپنا دین و ایمان کیوں نہ بیچیں گے جہاں ہزاروں اور لاکھوں ملنے کی اُمید ہو سکتی ہو۔

حکومت سے زیادہ مالدار گاہک کون ہوگا۔ پل میں پو بارے کر دے۔ بس یہی تو بات ہے کہ جس دن مقبوضہ جمعیۃ کے چند ستاروں کو پتا چلا کہ اقتدار کی دیوی مسلم مجلس مشاورت سے خوش نہیں ہے اسی دن یہ چاند ستارے کسی سرکش گھوڑے کی طرح دولتیاں جھاڑ کر مجلسِ مشاورت سے نکل گئے اور اُس دن سے آج تک برابر مجلسِ مشاورت کی تردید و مذمت میں ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے ہیں۔

گستاخی معاف۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ الجمعیۃ کے مدیر عثمان فارقلیط کو چھوڑ کر اب ادارہ الجمعیۃ میں سارا ہی

عملہ مجہول و مغفّل قسم کے کارکنوں کا رہ گیا ہے جن میں بعید نہیں کہ کچھ افراد افیم یا بھنگ بھی استعمال کرتے ہوں۔ یہ کورا تسخر نہیں بلکہ بطورِ نمونہ ثبوت بھی ملاحظہ ہو۔

۶/نومبر ۶۶ء کا الجمعیۃ (سنڈے ایڈیشن) دیکھئے صفحہ ۵ پر ایک مضمون ملے گا جس کا عنوان ہے:

''کون رہبر بن سکے جب خضر بھٹکانے لگیں''

اس میں ایک ایسی مسجد کا ذکر ہے جس میں مضمون نگار نے مَردوں اور عورتوں کو شانہ بشانہ نماز پڑھتے دیکھ لیا ہے۔ یہ نظارہ ان کے مذہبی احساسات کے لیے اس قدر لرزہ خیز ثابت ہوا کہ وہ لکھتے ہیں:

''اس خبر کو پڑھ کر ہوسکتا ہے کہ آپ اُچھل پڑیں تعجب اور رنج سے اُنگلی کتر لیں، کپڑے پھاڑ لیں، سر پھوڑ لیں۔''

پھر آگے اسی چیز کو وہ شریعتِ اسلامی کی دھجیاں بکھیرنا اور احکامِ خدا و رسول کو پس پشت ڈالنا قرار دے کر ایسے شدید درد و غم کا اظہار کرتے ہیں جیسے عورت اور مرد کا یکجا نماز پڑھ لینا آخری درجے کی بے دینی، شیطنت اور اسلام دشمنی ہے۔ ناقابل برداشت ہے۔ قیامتِ صغریٰ ہے۔

نفسِ مسئلہ سے یہاں بحث نہیں، توجہ صرف اس امر پر لادنی ہے کہ الجمعیۃ کے مسخروں نے یہ مضمون ایک اور رسالے سے مع حوالہ نقل کیا ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ مرد و زن کی مخلوط نمازوں کے بارے میں خود ادارۂ الجمعیۃ بھی وہی محسوسات و خیالات رکھتا ہے جن کا اس مضمون میں تذکرہ ہے اور اسی لیے اس نے اپنے اخبار میں اسے نقل کیا۔

لیکن اب اسی صفحے پر وہ دوسرا مضمون دیکھئے جس کا عنوان ہے:

''مصر میں خواتین کی آزادی''

اس مضمون میں مصر کے ایک وفات یافتہ فرزند امین قاسم کی مدح و ثنا کی گئی ہے۔ انھیں مجاہد اور روشن ضمیر جیسے القاب سے نوازا گیا ہے۔ ان کے مشن کو خراجِ تحسین ادا کیا گیا ہے۔

اور ان کا مشن کیا تھا؟ مرد و زن کی مساوات کا وہی نعرہ جس نے یورپ، امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کو شہوانیت، حرام کاری اور بے حیائی کا جوبچہ بنا کر رکھ دیا۔ جس نے قرآنی تصریحات کو منہ چڑایا اور جس نے اسلامی قدروں پر سیاہی پھیر دی۔

جن لوگوں نے امین قاسم کے مشن کو گمراہ کن قرار دیا انھیں اس مضمون میں اہانت انگیز طور پر دقیانوسی اور ترقی دشمن کہا گیا ہے اور امین قاسم کی تحریک کے بعض اجزاء اسی مضمون میں یوں بیان ہوئے ہیں:

''انھوں نے (امین قاسم نے) عورتوں کے لیے نہ صرف مَردوں کے برابر حقوق کا مطالبہ کیا،

بلکہ یہ بھی کہا کہ عورتوں کو شادی کرنے اور طلاق دینے کی کھلی چھوٹ ہونی چاہئے اور انھیں یہ بھی حق ہونا چاہئے کہ وہ پردہ نہ کریں، برقع نہ اوڑھیں۔"

اندازہ فرمالیجئے۔ قرآن وحدیث صرف مرد کو طلاق کا حق دیں، نکاح کو اکثر حالتوں میں اولیاء کی اجازت سے مشروط کریں اور پردے کو صریح نصوص کے ذریعہ لازم قرار دیں لیکن جو این قاسم کھل کر ان کے خلاف تحریک چلا رہا ہو اسے مجاہد، روشن ضمیر، ترقی پسند اور بطل جلیل کے نام سے کون متعارف کرا رہا ہے۔ وہی علماء کا اخبار جو اپنے اسی صفحے پر مرد وزن کو ایک ساتھ نماز پڑھتے دیکھ کر پچھاڑیں کھا رہا تھا۔

اب بتائیے کیا افیم کھانے والوں کے سوا بھی کوئی ادارہ ایسا ہوسکتا ہے جو اپنے اخبار کے ایک ہی صفحہ پر ایسے دو متناقض ومتبارز مضامین چھاپ کر مونچھوں پر تاؤ دے۔

ویسے اگر حقیقت حال پوچھئے تو اصل خیالات اب ادارۂ الجمعیۃ کے وہی ہیں جن کا اظہار مصر والے مضمون میں ہوا ہے۔ جاہل اور دین سے بے تعلق افراد اس ادارے میں گھس آئے ہیں۔ لیکن دوسرا "دقیانوسی" مضمون اس لیے چھاپا گیا کہ اس میں ایک جگہ مفتی عتیق الرحمٰن کو ہدفِ طعن بنانے کا بہانہ مل رہا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر عثمان فارقلیط اس ادارے سے قطع تعلق کرلیں تو الجمعیۃ اب اس قابل نہیں رہا کہ شرافت و نجابت اور اخلاقی پاکیزگی سے تعلق رکھنے والے افراد اسے ہاتھ لگانا تک گوارا کرسکیں۔

آئیے ذرا اس کی فرعون نوازیاں بھی دیکھئے۔

مصر کے صدر جمال عبدالناصر کو جب ہم فرعونِ وقت کہتے ہیں تو کوئی طنز یا افترا نہیں کرتے۔ یہ تو ٹھیک وہی لقب ہے جو موصوف نے خود اپنے لیے پسند فرمایا ہے۔ نحنُ ابناء الفراعنه کا نعرہ خود ان کی زبان پر آیا۔ عہدِ فراعنہ کی تہذیب سے اپنی ترقی کا خاکہ اخذ کرنے کا عزم بالجزم خود انھوں نے اپنے ملکی دستور میں ظاہر کیا۔ اہلِ مصر کو "رعمسیس کے فرزندو" کہہ کر خطاب کرنا خود انھی کی ایجاد ہے۔ صحرائی کھدائیوں سے رعمسیس (فرعون) کا مجسمہ اُٹھا کر وسطِ قاہرہ میں نصب کرانا خود انھی کے دستِ مبارک کا کارنامہ ہے۔ ابوسمبل کے مندروں اور مجسموں کی بنیادوں میں مصری میثاق کے ساتھ انجیل اور قرآن کے دو دو نسخے دفن کرانا خود انھی کی طبع رسا کا شاہکار ہے۔ فرعون سے ان کے قلبی تعلق کا مزید مظاہرہ ان ٹکٹوں سے ہوتا ہے جن پر فرعون کے مجسمے چھاپے گئے۔ ان سکّوں سے ہوتا ہے جن پر عہدِ فرعونی کا خاص نشان ثبت کیا گیا۔ ان پارکوں، سڑکوں اور سینماؤں سے ہوتا ہے جن کے نام فرعون کے نامِ نامی پر رکھے گئے۔

ایسی صورت میں اگر ہم جناب ناصر کو فرعونِ وقت کہیں تو یہ فقط ایک امرِ واقعہ کا سادہ سا اظہار ہوگا نہ کہ طعن وطنز، فتوے کی زبان میں جناب ناصر چاہے مسلمان ہی ہوں اس سے ہمیں بحث نہیں۔ ذہن نشین بس یہ کرانا ہے کہ جو

مسلمان جمال ناصر اور اخوان المسلمون کی کشمکش میں حقائق سے آنکھیں بند کر کے، خدا کے خوف سے بے نیاز ہو کر، اندھوں بہروں کی طرح جمال ناصر کی حمایت اور اخوان المسلمون کی مخالفت کریں گے انھیں فرعونی ہی کہا جائے گا اور قرآن و حدیث کی روشنی میں یہی توقع کی جائے گی کہ قیامت میں یہ لوگ اپنے ممدوح جمال ناصر ہی کے ساتھ اُٹھائے جائیں گے۔ اللہ کی پناہ ہزار بار پناہ۔

اس تمہید کے بعد ۲۲/اکتوبر ۶۶ء کا الجمعیۃ اُٹھا کر دیکھئے۔ پہلے ہی صفحے کی شاہ سرخی ملے گی:

"عرب انقلاب کے ہیرو صدر جمال عبدالناصر کا "ہند کے عظیم دوست" کی حیثیت سے شاندار استقبال"۔

جمال عبدالناصر ہند کے کتنے عظیم دوست ہیں اس پر تو اُس مشترکہ بیان کی روشنی میں غور کیجئے جو اُن کی واپسی کے وقت چھپا ہے۔ مگر یہ سیاسی معاملہ ہے اس لیے ہم اس پر بحث نہیں کرتے۔ ہوں گے وہ ہند کے عظیم دوست لیکن سوال اسلام کی دوستی اور دشمنی کا ہے۔ ہند اور اسلام ایک ہی چیز کے دو نام تو نہیں ہیں!

علاوہ اس کے یہ بھی سوال ایک حقیقت پسند قاری کے دماغ میں ضرور سر اُٹھائے گا کہ عبدالناصر کو عرب انقلاب کا ہیرو کہنا کیا حقائق سے بھی کوئی تعلق رکھتا ہے یا فقط درباری زبان ہے؟ شاعری ہے؟ لفاظی ہے؟

پرائمری کا کوئی بچہ تو شاید یہ مان لے کہ عرب اور مصر ایک ہی شے کے دو نام ہیں لیکن پڑھا لکھا کوئی بھی آدمی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ اگر جمال ناصر نے مصر میں کوئی انقلابی کارنامہ انجام دیا بھی ہو تو اسے "عرب انقلاب" کا نام دینا الفاظ کا صحیح استعمال ہوگا۔ یہ بات بجائے خود بحث طلب ہے کہ جمال ناصر کے ہاتھوں جو انقلاب مصر میں آیا ہے وہ کس حد تک ایک مسلمان کے لیے قابل فخر ہے اور کس حد تک لائق ماتم۔ لیکن انقلاب کی نوعیت، ثمرات، عواقب اور نفع و نقصان کے میزانیے کو یکسر نظر انداز کر کے بھی یہ دعویٰ سوائے خوشامد پیشہ اور بصیرت سے محروم لوگوں کے کوئی نہیں کر سکتا کہ جناب ناصر صاحب صرف مصر کے نہیں کسی "عرب انقلاب" کے ہیرو ہیں۔

اخبار کے اسی صفحہ پر دو صاحبان نے اور بھی گل افشانیاں کی ہیں۔ ایک صاحب کوئی اخلاق حسین قاسمی ہیں جن کے ساتھ مولانا اور کونسلر کے ضمیمے لگے ہوئے ہیں اور دوسرے ہیں (ان کا نام ہم نے اس لیے حذف کر دیا کہ پتا چلا ہے وہ دل سے فرعونی نہیں ہیں بلکہ ان کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر بعض چالاک فرعونیوں نے انھیں لائن میں لگا دیا ہے)..........

...صاحب جو مولانا ہونے کے علاوہ کانگریس پارٹی میں ایک اعزازی عہدہ بھی رکھتے ہیں۔

تعریف میں مبالغہ آرائی پر تو خیر کبھی بھی روک نہیں لگی۔ یہ دونوں صاحب اگر جمال عبدالناصر کو کائنات کا سب سے بڑا مدبر اور اسلام کا سب سے بڑا محسن بھی قرار دیدیتے تو ان کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا لیکن جرأتِ رندانہ بلکہ ڈھٹائی کا کمال دیکھئے کہ جن ناصر صاحب کی نامقبولیت کو دبانے اور چھپانے کے لیے حکومت کو درجنوں گرفتاریاں کرنی پڑیں انھی کے بارے میں یہ دونوں خانہ ساز مبصر بڑے ٹھسّے کے ساتھ لکھتے ہیں کہ:

''آج تمام ہندوستان اپنے محبوب مہمان عرب جمہوریہ مصر کے صدر جمال عبدالناصر کا دلی خیرمقدم کر رہا ہے۔ مسلمانانِ ہند دنیائے عرب کے اس عظیم مدبر اور دشمن عرب استعمار پسند طاقتوں کے طاقتور دشمن اور اسلامی علوم وفنون کے ایک سرپرست کی راہ میں آنکھیں بچھا رہے ہیں اور خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔''

وہ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک سارس چونچ اوپر کیے کھڑا تھا کسی نے پوچھا کہ آسمان کی طرف کیا دیکھ رہے ہو؟ وہ بولا: دیکھ نہیں رہا ہوں؛ بلکہ یہ آسمان میری ہی چونچ پر رُکا ہوا ہے۔ میں نے چونچ نیچی کی اور آسمان گرا۔

کچھ ایسا ہی معاملہ ان دونوں مولاناؤں کا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ پورا ہندوستان ہم دو ہی سے عبارت ہے اور ہندوستان کی ساری ملت مسلمہ ہم دو ہی کے کالبُد میں سما گئی ہے۔

تھوڑی بہت سخن سازی اور لفظی بازیگری تو اخباری بیانوں میں چلئے جائز مان لیجیے۔ لیکن سفید جھوٹ، کوری لفاظی، سوفی صدی غلط گوئی اور سڑی ہوئی خوشامد بھی جن لوگوں کی آنکھوں میں حیا کی رمق پیدا نہ کر سکے ان کے لیے مثال اُس پیشہ ور بیسوا کے سوا کس کی لائی جائے جو یکسر بھول ہی چکی ہو کہ عفت وعصمت، حیا اور پاکدامنی بھی کوئی چیز ہے کیسا کھلا کذب ہے کہ تمام ہندوستان نے عبدالناصر کا خیر مقدم ایک محبوب مہمان کی حیثیت سے کیا۔ کتنی کوری بکواس ہے کہ تمام مسلمانانِ ہند عبدالناصر کو وہ کچھ سمجھتے ہیں جو ان دو فرعونیت زدہ مولاناؤں نے سمجھ رکھا ہے۔

سچ یہ ہے کہ جن مسلمانوں کو ذاتی طور پر مصر کے احوال وکوائف کا کوئی علم نہیں وہ تو دنیا پرست اور کوتاہ فہم مولاناؤں کے بہکائے سکھائے سے جمال ناصر کو جو چاہے سمجھ لیں۔ نیز جو مغرب زدہ طبقہ سوائے خاندانی مسلمان ہونے کے اسلام سے کوئی ذہنی تعلق نہیں رکھتا وہ جیسی چاہے رائے رکھے، لیکن باقی تمام مسلمان کسی قیمت پر اس شخص کے مدح خواں نہیں ہو سکتے جس کی فرعونیت عالم آشکارا ہو چکی ہے۔

گراوٹ کی انتہا ہے کہ اخوان المسلمون کی مظلومیت پر غمزدہ ہونے والے مسلمانوں کے لیے ان دونوں نام نہاد مولاناؤں نے ٹھیک وہی اندازِ طنز وتحقیر استعمال کیا ہے جو امریکہ، اسرائیل اور روس کے یہود ونصاریٰ اور ملحدین کرتے ہیں۔

مزید جوگل افشانیاں اس بیان میں کی گئی ہیں ان پر گفتگو ہم اس لیے نہیں کرتے کہ گفتگو ہوا کرتی ہے سنجیدہ لوگوں سے اور علم ومنطق کی روشنی میں۔ اب اگر کچھ لوگ خوشامدانہ انداز کی مدح سرائی ہی کو وطیرہ بنالیں اور حقائق سے چشم پوشی کر کے شاعروں جیسی مبالغہ آمیز قصیدہ طرازی پر ہی اُتر آئیں تو ان سے گفتگو کرنا بھینس کے آگے بین بجانے کے مرادف ہوگا۔

ہاں ہرزہ سرائی کا ایک اور نمونہ اس دعوے کی شکل میں ضرور دیکھ لیجیے کہ:

”جمعیۃ علماء ہند ہندوستانی مسلمانوں کی واحد مذہبی نمائندہ جماعت ہے جو بین الاقوامی سیاسی گروپ بندی سے ہمیشہ الگ رہی ہے۔اس جماعت پر ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی اور تہذیبی حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری ہے۔“

بتائیے۔ان باتوں کو سوائے ہذیان کے اور کیا نام دیجئے گا واحد نمائندگی کا خواب دیکھتے دیکھتے یہ لوگ تحت الثریٰ میں پہنچ گئے۔ملک میں لاکھ دولاکھ آدمی بھی انھیں گھانس ڈالنے والے مشکل ہی سے بچے ہوں گے۔مسلمانوں کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ جمعیۃ علماء کا نام آتے ہی تھوتھو کرتی ہے۔مگر جنت الحمقاء کی بلندیوں سے راگ ابھی تک یہ مغفّل حضرات یہی گائے جارہے ہیں کہ ہم واحد نمائندے ہیں۔

رہی مسلمانوں کے مذہبی اور تہذیبی حقوق کی حفاظت تو نمونے آپ دیکھ ہی چکے کہ اپنے سرکاری آرگن میں ناپاک اشتہارات لغومضامین، جھوٹی خبریں اور گمراہ کن جائزے چھاپ چھاپ کر ان لوگوں نے علماء کا نام بدنام کردیا۔تنہا ایک وہی مضمون جس کا ذکر ابھی ہم کر آئے ہیں (مصر میں خواتین کی آزادی) اس المناک حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ مقبوضہ جمعیۃ علماء کے ذمہ داروں میں نہ احساسِ ذمہ داری باقی ہے نہ دینی بصیرت نہ علم نہ حمیت وغیرت۔مولوی اسدؔ میاں پیر بنے پھرتے ہیں اور مولانا محمد میاں صاحب جمعیۃ کے مرکزی دفتر میں زہدو اتقا کی دھونی رمائے بیٹھے ہیں۔کیا انھوں نے یہ حدیث نہیں سنی کہ کلّکم راعٍ و کلّکم مسئول۔اگر سنی ہے تو وہ بتائیں کہ کیا آخرت میں وہ اس باز پرس سے بچ جائیں گے کہ جس اخبار پر انھیں کامل تصرف اور اقتدار حاصل تھا اس میں سود، جوئے اور فلمی مقابلوں کے اشتہارات چھپتے رہے،مغرب زدہ متجددین کی تعریفیں چھپتی رہیں، ملّی اتحاد کو ڈائینامیٹ کرنے والے تبصرے چھپتے رہے مگر وہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کا مصداق بنے بیٹھے رہے۔نکیر تو کیا کرتے بڑھاوا دیتے رہے۔ہمت بڑھاتے رہے۔

فرعون نوازی کا ایک بدترین نمونہ اور ملاحظہ فرمائیے۔

۱۲رنومبر ۱۹۶۶ء کے الجمعیۃ (سنڈے ایڈیشن) میں کسی پاکستانی پرچے ”تعمیر“ سے ایک مضمون نقل کیا گیا ہے۔

”اخوان لیڈروں کو سزائے موت اور صدر ناصر“

اگر پوری تحقیق و تفتیش اور غور و فکر کے بعد کسی تعلیم یافتہ آدمی کی رائے یہ بنے کہ اخوان المسلمون کے معاملے میں صدر ناصر کا رویّہ آئینی جواز رکھتا ہے اور صریح انصاف دشمنی کا الزام ان پر لگانا ٹھیک نہیں تو ہم اس شخص کو اس بات کا حقدار سمجھتے ہیں کہ وہ اپنا نقطۂ نظر دلائل و شواہد کے ساتھ علمی انداز میں پیش کرے۔لیکن حقائق سے بے خبر،فہم و تدبر سے محروم،قلم پکڑنے کے سلیقے سے بے بہرہ اور یکسر کندۂ ناتراش لوگ جب عالم اسلام کے ایک عظیم المیے پر بازاری لونڈوں کی طرح ٹھٹول کرنے لگیں تو ان کی مثال اُس فاطر العقل دیہاتی کی سی ہو جاتی ہے جو ارسطو کے

نام کی ٹھیک ہجے بھی نہ کر سکتا ہو لیکن ارسطو کی منطق پر ہفوات کی بوچھار شروع کر دے۔

یہ "تعمیر" سے نقل کردہ مضمون زبان، اسلوب، مواد اور دروبست ہر لحاظ سے ایک ایسا مضمون ہے جسے کسی شوریدہ سر طفل مکتب کے سوا کسی بھی پڑھے لکھے آدمی سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ ضلالت اور سیاہ قلبی کی انتہا ہے کہ اس مضمون میں اخوان کے شہداء کو "آنجہانی" کہا گیا ہے۔ لیکن اخبار الجمعیۃ کے مرتبین کی شرافت اور بصیرت کو داد دیجئے کہ وہ اس مضمون کو بھی بڑے شوق سے نقل کر رہے ہیں۔ انھیں ذرا تمیز نہیں کہ کتے کے بھونکنے اور انسان کے کلام کرنے میں کچھ فرق ہوتا ہے۔ انھیں ذرہ برابر احساس نہیں کہ کل خالق اکبر کے آگے جوابدہی بھی کرنی ہے۔

بدبختو! شہدائے مصر کا ماتم نہیں کر سکتے تو شیطان کی طرح اذیت پسند اور بے حیا تو مت بنو۔ اتنے شقی تو مت بنو کہ تمہاری شقاوت پر ہٹلر و چنگیز کی روحیں بھی کانپ جائیں۔

جن آئے دن کے یک طرفہ "فسادوں" میں اَن گنت مسلمانوں کو جان و مال کا نقصان پہنچتا ہے ان کے فوراً بعد اکثریت کے کتنے ہی مہاپرش پوری بے تکلفی کے ساتھ یہ کہانی لے کر بیٹھ جاتے ہیں کہ اصلی قصور مسلمانوں ہی کا تھا۔ فلاں جگہ مورتی کے جلوس پر پتھر پھینکے گئے۔ فلاں جگہ گائے ذبح کرنے کی کوشش کی گئی۔ فلاں جگہ مسلم لیگ زندہ باد کے نعرے لگائے گئے۔

اب اگر کوئی مسخرہ مسلمانوں کی مظلومیت کو ظلم اور تباہی کو شرارت ثابت کرنے کے لیے انھی کہانیوں کو بطورِ دلیل وشہادت استعمال کرنے لگے تو بتائیے عدل وصداقت اور دیانت ومعقولیت پر کیا بیتے گی؟

ٹھیک اسی طرح جب کوئی اجہل واحمق یہ ہرزہ سرائی کرتا چلا جائے کہ اخوان المسلمون کے:

"لیڈروں کو سازش کی غیر جانبدارانہ تحقیق، عدالتِ عالیہ میں مقدمہ کی باقاعدہ کارروائی اور خود مجرموں کے اعترافِ جرم کے بعد سزائے موت کا فیصلہ سنایا گیا۔"

تو بتائیے ایمان وانصاف کی مسلمہ اقدار پر کیا کچھ نہ گزر جائے گی۔

ستمبر ۶۶ء کے تجلی میں ہم بہت کچھ پیش کر چکے ہیں۔ پھر یہاں ذرا تفصیل سے اُس بین الاقوامی ادارے کا بیان نقل کرتے ہیں جس کا مشہور نام ایمنسٹی انٹرنیشنل ہے جس نے دنیا کے مختلف ممالک میں ہونے والی بے انصافیوں کو روکنے کی جدوجہد کرنے کے سلسلے میں کافی شہرت حاصل کی ہے اور جس کی غیر جانبداری پر آج تک کوئی الزام نہیں آسکا ہے۔

اس کا بیان حسبِ ذیل ہے:

"۲۴ر مارچ ۱۹۶۴ء کو ایک قانون شائع کیا گیا جس کی رو سے متحدہ عرب جمہوریہ کی حکومت نے صدر کو یہ اختیار دیا کہ جن اشخاص پر سیاسی جرائم کا الزام لگایا گیا ہو انھیں وہ مقدمہ چلائے بغیر قید

میں رکھ سکتے ہیں نیز یہ کہ ایسے سیاسی ملزموں پر مقدمہ چلانے کے لیے ایک خاص ٹریبونل قائم کیا جائے گا جس کے ارکان خاص اسی کام کے لیے صدر کی طرف سے نامزد کیے جائیں گے۔ عملاً اس ٹریبونل نے ایک فوجی عدالت کی شکل اختیار کرلی ہے اور اس پر صرف یہ پابندی عائد کر دی گئی ہے کہ اس کے فیصلوں کے نفاذ کے لیے صدر کی توثیق ضرور ہوگی۔

جنوری میں اس ٹریبونل کی کارروائیوں کے دوران ایک مقدمہ میں اور پھر فروری میں دو مزید مقدمات میں ملزموں نے یہ شکایت کی کہ ان سے اقرارِ جرم کرانے کے لیے ان کو سخت عذاب دیا گیا ہے تازہ کارروائی کے دوران یہی شکایت سید قطب نے بھی کی جو سب سے بڑے ملزم ہیں۔ ٹریبونل کے صدر نے فوراً ان کو خاموش کرادیا اور اس شکایت کے حق میں کوئی شہادت سننے سے بھی یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ سب گواہ جھوٹے ہیں۔

(ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اپنے ایک اور تحریری بیان میں کہا ہے کہ ہمارے علم کی حد تک متعدد ملزم ایسی حالت میں پیش ہوئے کہ وہ جسمانی یا ذہنی حیثیت سے مقدمہ کی کارروائی میں حصہ لینے کے قابل نہ تھے)

سید قطب اور اخوان المسلمون کے دوسرے افراد کو اپنی مدافعت کے لیے اپنے حسبِ منشا وکلاء کی خدمات حاصل کرنے کا موقع حاصل نہ تھا۔ فروری میں دو سوڈانی وکلاء چند ملزوں کی پیروی کے لیے ہوائی جہاز پر قاہرہ پہنچے۔ نومبر ۱۹۶۵ء میں عرب وکلاء کی کانگریس یہ ریزولیوشن پاس کر چکی تھی، مصری بار ایسوسی ایشن اس کی تائید کر چکی تھی اور خود مصری قانون میں اس کو تسلیم کرلیا گیا تھا کہ قاہرہ کی عدالتوں میں سوڈانی وکلاء پیش ہونے کا حق رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود ان سوڈانی وکیلوں کو کوئی وجہ بتائے بغیر قاہرہ سے نکال دیا گیا اور انھیں اپنے موکلوں سے ملنے تک نہ دیا گیا۔

جس وقت پہلی مرتبہ تعذیب کی شکایت ٹریبونل کے سامنے پیش کی گئی اس کے بعد فوراً ہی پریس اور پبلک کو عدالتی کارروائی سننے سے روک دیا گیا اور پھر سرکاری کنٹرول کے تحت ایک چھلنی سے چھن چھن کر ہی ٹریبونل کی کارروائی کی خبریں باہر آتی رہیں۔ مسٹر آرچر (ایمنسٹی انٹرنیشنل کے نمائندے) بھی مقدمہ کی کارروائی نہ سن سکے۔ البتہ ہمیں اس مہربانی کا اعتراف کرنا چاہئے کہ مسٹر آرچر کی درخواست پر جس زمانے میں غور کیا جارہا تھا اس زمانے میں ان کو قاہرہ میں ٹھیرنے کی اجازت دے دی گئی۔

ملزموں کے قصوروار یا بے قصور ہونے کے بارے میں کوئی اظہار رائے کیے بغیر ایمنسٹی انٹرنیشنل گہرے افسوس کے ساتھ رائے رکھتی ہے کہ ان مقدمات کی کارروائی جس طرح ہوئی ہے وہ تعذیب کی شکایات کو تقویت ہی پہنچا سکتی ہے اور مصری انصاف کے متعلق جانبداری کا شبہ پیدا کرتی ہے۔
ایمنسٹی انٹرنیشنل مصری حکومت سے اپیل کرتی ہے کہ وہ ملزموں کے بنیادی انسانی حقوق کا احترام کرے اور منصفانہ طریقے سے مقدمہ چلا کر اپنی بین الاقوامی شہرت میں اضافہ کرے۔"

اس بیان سے وہ گدھے تو کیا سبق حاصل کریں گے جنھیں فہم و بصیرت اور علم و متانت چھو کر نہیں گئے۔ جنھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ڈکٹیٹروں کی ترتیب دی ہوئی فوجی عدالتوں کو دنیا کے تمام اونچے قانون داں اور مفکرین قانون کا مذاق اور انصاف کا تمسخر قرار دے چکے ہیں۔ ہاں عقل و متانت رکھنے والے اصحاب اس بیان سے یقیناً کچھ اخذ کر سکتے ہیں۔ اتنا تو کر ہی سکتے ہیں کہ اگر اخوان المسلمون کے ذمے تھوپی ہوئی سازش کوئی بھی حقیقی بنیاد رکھتی تو صدر ناصر کو اس سازش کو پایۂ ثبوت تک پہنچانے کے لیے اپنے یہاں کے کسی سوِل کورٹ کے عوض خود ساختہ فوجی عدالت کا ڈرامہ اسٹیج کرنے کی ضرورت نہ پڑتی اور یہ ڈرامہ بھی اس درجہ بھونڈا نہ ہوتا کہ ایک نیک نام بین الاقوامی ادارۂ انصاف کے لیے اسے برائے بیت بھی سراہنا ممکن نہ ہوتا۔

مقبوضہ جمعیۃ علماء کے فرعون نواز اراکین ارشاد فرمائیں کہ اپنے ملک کے ۱۸ سالہ دَورِ آزادی میں کیا کوئی ایک بھی مقدمہ ان کی نظر سے ایسا گزرا ہے جس میں عدل کی معروف قدروں اور ضابطوں کا اتنا صریح مذاق تو کیا اس سے آدھا تہائی مذاق بھی اُڑایا گیا ہو۔ وہ بتائیں کہ کیا وہ اپنی حکومت کو حق بجانب ٹھیرائیں گے، اگر خدانخواستہ وہ مولوی اسد یا مولانا فخرالدین کو ایسے ہی مراحل انصاف سے گزار کر پھانسی پر چڑھا دے جن کا ہلکا سا نقشہ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے منقولہ بالا بیان میں ملتا ہے؟

دوسروں کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے کرتے ہو۔ اسلام کی اس زریں ہدایت کو خود مدیر الجمعیۃ اکثر دہراتے رہتے ہیں۔ کیا ادارۂ الجمعیۃ ہوش و حواس اور غیرت سے بالکل ہی دست بردار ہو چکا ہے کہ محض اقتدارِ وقت کی خیمہ برداری اور چاپلوسی کے چکر میں ایمان و اسلام تو کیا نفس انسانیت ہی کے تقاضوں کی پاسداری بھی نہیں کر سکتا۔

فرعونیت کے گُن گانے والوں کا ایک جذباتی اپروچ "اسرائیل" کا مسئلہ ہے۔ یہ لوگ صدر ناصر کو اسرائیل کا قوی اور صاحب عزم دشمن بتا کر سادہ لوح مسلمانوں کی جذباتی ہمدردیاں حاصل کرتے ہیں۔ صدر ناصر کی عقیدت دلوں میں اُتارتے ہیں۔ زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔

لیکن حقائق کیا ہیں۔ اس کی انھیں ہوا بھی نہیں لگی۔ ہم طوالت میں جائے بغیر صرف چند دستاویزی حقائق

آپ کے سامنے رکھتے ہیں جن سے آپ اندازہ کرسکیں گے کہ اسرائیل کے بالمقابل جناب ناصر کے عزم و ہمت اور اقدام و عمل کا جغرافیہ ہے۔

حکومت مصر کا یہ اعلان پوری دنیا سُن چکی ہے:

"فلسطین کے مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کہ عرب ممالک کی سوشلسٹ اور انقلاب پسند حکومتیں متحد ہو جائیں۔"

ادارۂ الجمعیۃ کے مغفّل ارکان تو اس اعلان کے مطابق و معانی کا ادراک ہی شاید نہ کرسکیں (مدیر صاحب اس سے مستثنیٰ ہیں) لیکن سمجھدار اور معاملہ فہم لوگ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اس اعلان کا صریح مطلب ہے خوشنما الفاظ کی آڑ لے کر اسرائیل کو زندگی اور بقا کی ضمانت دینا۔ یہ اس طرح کہ اسرائیل اپنے معروف پشت پناہوں کے سایۂ عاطفت میں ایک بڑی طاقت بن چکا ہے۔ اسکا مؤثر مقابلہ اگر کیا جاسکتا ہے تو تمام مسلمان مملکتوں کے اشتراک و تعاون سے۔ لیکن حکومتِ مصر تمام مسلمانوں کا ذکر تو کیا کرتی تمام عرب ممالک کا بھی ذکر نہیں کرتی بلکہ صرف اُن ممالک کی بات کرتی ہے جو اس کی اپنی اصطلاح میں سوشلسٹ اور انقلاب پسند کہے جاسکیں!

اب یہ توضیح تو بے کار ہی ہوگی کہ گنتی کے کتنے عرب ممالک اُن خاص معنوں میں سوشلسٹ اور انقلاب پسند ہیں جن کے لیے صدر ناصر کی حکومت یہ اصطلاحیں استعمال کرتی ہے۔ حاصل اعلان کا سادہ لفظوں میں یہ ہے کہ وہ اسرائیل دشمنی جس کا نام لے کر دنیائے اسلام کو جذباتی جھانسہ دیا جاتا ہے کم سے کم دیارِ مصر میں تو ایک موہوم چیز بن کر رہ گئی ہے جس کے وجود پر کھوکھلے الفاظ تو گواہی دے سکتے ہیں معانی اور عمل نہیں۔

اور سنیئے! فلسطین کی تنظیم آزادی کے ایک اجلاس میں جناب صدر ناصر نے دورانِ تقریر میں فرمایا:

"میں صراحت سے کہوں گا کہ ہمارے پاس اتنی طاقت نہیں ہے کہ ہم اپنا دفاع بھی کرسکیں کجا کہ ہم حملہ کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ دریائے اُردون کا رُخ موڑنے کے مسئلہ کو بھی سر دست ملتوی کر دینا چاہیئے۔"

مصری حکومت کے ایک ذمہ دار افسر عبدالحکیم عامر نے دورۂ فرانسؔ کے دوران پیرسؔ میں تقریر کرتے ہوئے کا کہ:

"جمہوریہ عرب اسرائیل سے جنگ کی نہ خواہش رکھتی ہے اور نہ ارادہ۔"

مصر کے ایک فوجی افسر بریگیڈیر محمد فوزی اپنی کتاب "صیہونیت اور اسرائیل" میں صفحہ ۱۳۱ پر لکھتے ہیں کہ:

"بعض لوگ مسئلہ فلسطین کا حل جنگ قرار دیتے ہیں یہ بالکل غیر معقول بات ہے۔ یہ حل اقوامِ متحدہ کی ان قراردادوں کے منافی ہے جن پر تمام عرب ممالک دستخط کر چکے ہیں۔ نیز یہ حل پُرامن بقائے باہم کے اُصول کے بھی خلاف ہے جس کا مصر علمبردار ہے۔"

یہ کتاب ملٹری ٹریننگ کالج قاہرہ کے کورس میں شامل ہے۔ فرمایا جائے کہ ان چند ہی شواہد کو دکھ کر ایک حقیقت پسند اور معاملہ فہم اس کے سوا کیا رائے قائم کرے گا کہ مصر کے حکمراں طبقے میں اسرائیل دشمنی فقط ایک سیاسی اسٹنٹ، ایک روایت، ایک نعرے کی حیثیت سے باقی رہ گئی ہے۔ اقدام و عمل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ غالباً اسی لیے غزہ کے علاقے پر مصر نے بین الاقوامی ایمرجنسی فورس کا تسلط تسلیم کر لیا۔ یہ علاقہ عرب رضا کاروں کے لیے اسرائیل میں گھس کر گوریلا جنگ لڑنے کے کام آنے والا تھا۔ اب رضا کاروں کے عمل دخل کے لیے تو بین الاقوامی پولیس نے گنجائش ہی نہیں رہنے دی البتہ اسرائیل اپنے اقتصادی منصوبوں کے نوک پلک اس علاقے میں آزادی کے ساتھ درست کر رہا ہے۔

خلیج عقبہ کا معاملہ بھی کم و بیش یہی رہا۔ اس پر بین الاقوامی کنٹرول کو مصر نے تہِ دل سے تسلیم کر لیا جس کے نتیجے میں اسرائیل کی وہ ناکہ بندی محض افسانہ بن گئی جس نے اسرائیل کی اقتصادیات کو شدید متاثر کیا تھا۔ اب تو ایلات کے مقام پر اسرائیل کی عالی شان بندرگاہ ہر شخص کو نظر آسکتی ہے اور یہ بھی نظر آسکتا ہے کہ اسرائیلی جہاز بڑے اطمینان اور آزادی کے ساتھ افریقی ممالک کو آ، جا رہے ہیں۔

حبش کے ہیل سلاسی نے امریکی کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

"میں آئندہ بیس سال میں اُن تمام حبشی مسلمانوں کو عیسائی بنا دوں گا جو میری مملکت میں رہتے ہیں۔"

مگر اس ہیل سلاسی سے مصری حکومت کی کوئی لڑائی نہیں بلکہ گہری دوستی ہے۔ البتہ لڑائی ہے تو اُس سعودی عرب سے جو عالم اسلام کا قلب ہے اور جس کی شمولیت کے بغیر کسی تنظیم کو "متحدہ عرب جمہوریہ" کہنا ایسا ہی ہے جیسے چین اور ہندوستان کو حذف کر کے ایشیا کا نقشہ بنانا۔ قبرص کے ترکوں کا قتل عام کرنے والے مکاریوس سے جو مراسم جناب ناصر کی حکومت کے ہیں وہ محتاج بیان نہیں، ترکی کے بالمقابل ہتھیار تک مکاریوس کو عطا کیے گئے اور حال ہی میں نقوسیا سے یہاں تک اعلان ہوا ہے کہ اگر ترکی نے قبرص پر حملہ کیا تو اس کی جوابی کارروائی کے لیے مصر کے راکٹ مدد کے لیے پہنچیں گے۔

....

ان چیزوں کے تذکرے سے ہمارا مقصود یہ فیصلہ دینا نہیں کہ مصر کی سیاسی پالیسیاں درست ہیں یا نادرست۔ مصر اپنی پالیسیوں کا مالک اور ذمہ دار ہے وہ جو چاہے کرے۔ ہم تو فقط یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جو "علماء" دل و دماغ کی ساری کھڑکیاں بند کر کے جمال ناصر کے گُن گاتے ہیں اُنھیں واقعات و حقائق سے کوئی واسطہ نہیں۔ اُنھیں حالات کا علم ہی نہیں۔ اُنھیں فی الحقیقت اس کی کوئی خواہش بھی نہیں کہ واقعات کی چھان بین کریں اور جو کچھ ان کے منہ سے نکلے وہ دیانت و امانت کا آئینہ دار ہو۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر ہم بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ ان نام نہاد "علماء"

میں کثرت اُن کم فہم حضرات کی ہے جن میں بین الاقوامی سیاسیات کو سمجھنے اور عالمی کوائف کا مطالعہ کرنے کی اہلیت ہی نہیں چہ جائیکہ وہ مضمرات ونتائج کاادراک کرسکیں۔ان کا کاسہَ سرتو اتنا چھوٹااور ظرف اتنا تنگ ہے کہ اخوان المسلمون کی عالم آشکارا مظلومیت پر قہقہے لگانے کے لیے انھیں بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ اس میں اور جماعت اسلامی میں معنوی مشابہت پائی جاتی ہے۔اس علم واحساس کے بعد کسی تحقیق وتفتیش کی ضرورت ہی ان مسخروں کو نہیں رہ جاتی۔

دل خون روتا ہے جب اخلاق حسین قاسمی اپنی کلغی میں مولانائیت کا پَر لگا کر اخوان المسلمون کو اور اس کی مظلومیت پر غمگین ہونے والوں کو ''استعمار پسند اور اسرائیل نوازوں اور عالم اسلام کے ساتھ منافقانہ روِش رکھنے والے اینگلو امریکن ٹولہ کی دلالی کرنے والے مقدسین'' کا نام دیتے ہیں۔ یہ ایسی شقاوتِ قلبی اور جسارتِ شیطانی ہے جس کی مذمت میں ہمیں الفاظ نہیں ملتے۔ بازار سیاست میں چلنے والی گالیوں کو منہ پھاڑ کر دہرا دینے سے کوئی مَن گھڑت الزام حقیقت تو نہیں بن سکتا۔آقائے نامدار نے جو منہ میں آیا کہہ دیا اور کاسہ لیسوں نے اسے ہاتھ باندھ کر دہرا دیا۔ یہ شان تیرہ باطنوں ہی کی ہوسکتی ہے چاہے چہرے ان کے کتنے ہی سفید ہوں۔

جھوٹ کاانبار

پچھلے پرچے میں ''خط اور جوابِ خط'' کے عنوان سے ہم مقبوضہ جمعیۃ علماء کے تحقیقی وفد کے سکریٹری ونر جناب اسحاق سنبھلی کا خط اور اس کا جواب نقل کر چکے ہیں۔اب سنئے کہ اس وفد کی رپورٹ منظور کرتے ہوئے جمعیۃ علماء اتر پردیش کی مجلسِ عاملہ نے جوتجاویز منظور کی ہیں وہ ۹ رنومبر کے الجمعیۃ میں شائع ہوئی ہیں۔

تجاویز کا یہ افسانوی متن ٹھیک ویسا ہی ہے جیسی توقع تھی۔سانپ سے زہر کے علاوہ کیا ملے گا۔وہی پہلے سے سوچی سمجھی دروغ بافی۔لیکن دروغ بافی کا ایک ایسا نمونہ بھی اس کے آغاز ہی میں موجود ہے جس نے بڑے بڑے دروغ بافوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

فرمایا جاتا ہے:

> ''وفد نے مسلسل چار روز قیام کر کے حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند اور پانچ حضرات اساتذہ دارالعلوم جو اس واقعے کے شاہد رہے تھے نیز محمد حنیفؔ صاحب ایڈوکیٹ ڈاکٹر عطاءؔ الرحمٰن صاحب،علیؔ اکبر عثمانی صاحب،توفیقؔ احمد صاحب قریشی،مطیع الرحمٰن صاحب،جمیلؔ مہدی صاحب، اخلاقؔ احمد صاحب جونپوری،جوادؔ حسین صاحب بستوی،منیرؔ احمد صاحب سیتاپوری،محمد اسعدؔ صاحب سنبھلی وغیرہ حامیانِ مجلس مشاورت ان کے علاوہ مجروح طلبہ متعدد شہری مسلمانوں اور چار غیر مسلم برادرانِ وطن کے بیانات حاصل کیے۔''

اوّلاً تو یہی صریح جھوٹ کہ مہتمم صاحب اور پانچ اساتذہ شاہد کے درجے میں ہوں۔ یہ لوگ جلسے میں نہیں گئے اور "اس واقعے" سے مراد ظاہر ہے وہی واقعہ ہوسکتا ہے جو جلسے میں پیش آیا۔ مہتمم صاحب دیوبند میں ضرور موجود تھے اور انھوں نے لٹھ بند طلبہ کا ہجوم بھی دیکھا ہے لیکن جس واقعے کی انکوائری کی جارہی ہے اس کی جائے وقوع پر وہ ایک پل کو بھی نہیں گئے۔ پھر کیسے وہ "شاہد" قرار دیئے جارہے ہیں۔

ثانیاً ان دس حضرات میں جن کا نام یہ وفد لے رہا ہے، تین حضرات تو میرے علم میں ہیں جنھوں نے ہرگز کوئی بیان اس وفد کو نہیں دیا۔ علی اکبر، توفیق احمد اور مطیع الرحمٰن۔ حد ہے کہ علی اکبر تو راقم الحروف کے چھوٹے بھائی ہیں جو ۱۱؍اکتوبر کو سفر میں گئے تھے اور ۲۰ کو لوٹے ہیں۔ ۱۴ میں وہ دیوبند تھے ہی نہیں۔ جب جمیل مہدی وغیرہ اس وفد سے ملنے مہمان خانے میں گئے تو یہ تینوں حضرات ان کے ساتھ مہمان خانے میں گئے ضرور تھے اور بطورِ تعارف ان کے نام جمیل صاحب نے وفد کو بتادیئے تھے۔ لیکن انھوں نے نہ کوئی بیان دیا نہ گفتگو میں حصہ لیا۔ محض تماشائی بنے رہے اب یہ وفد اگر اپنی تفتیش کی وسعت و جامعیت دکھلانے کے لیے ان کے نام بھی ان لوگوں میں شامل کرلیتا ہے جن کے بیانات حاصل کئے گئے تو اسے سفید جھوٹ اور مغالطہ دہی کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے۔

ایک اور مکاری اور فریب مبین یہ کہ اخبار بے باک کو جو رپورٹ اس وفد نے بھیجی ہے اس میں اس نے "عامر عثمانی" کا نام بھی ایسے لوگوں کے ساتھ ٹانک دیا جن سے بقول اس کے "بیانات حاصل کئے گئے" حالانکہ کسی قسم کا بیان دینا تو درکنار عاجز کو تو ان خوش جمالوں میں سے کسی کا مکھڑا تک دیکھنے کی توفیق نہ ہوسکی۔ بلکہ بیان حاصل کرنے کے لیے جو خط مجھے بھیجا گیا اس کا جواب خط ہی کی صورت میں ارسال کردیا گیا۔ اسے آپ پچھلے شمارے میں پڑھ ہی چکے ہیں۔ بتائیے کیا فریب دہی کے سوا بھی اسے کچھ کہیں گے کہ بیان دینے سے انکار کا جو خط بھیجا گیا تھا اسی کو "بیان" فرض کرکے عاجز کا نام بعض ان لوگوں کے ساتھ لکھ دیا گیا جو واقعتہً بیان دے کر آئے تھے۔

ان شائع شدہ تجاویز کے اختتام پر لکھا گیا ہے کہ "وفد کی جس مدلل و مفصل رپورٹ پر ان کی بنیاد ہے وہ رپورٹ شائع نہیں کی جارہی ہے؛ بلکہ اس کی مکمل نقل مہتمم صاحب اور اراکین مجلسِ شوریٰ کو بھیجی جائے گی"۔

آیئے اس رپورٹ پر ایک نگاہِ نقد ڈالیں۔ قدرت نے یہ ہمارے پاس بھجوادی ہے تاکہ اس کا جامۂ فریب چاک کیا جاسکے۔

انکوائری رپورٹ کا جائزہ

یہ چھوٹے ۲۲ صفحات پر طبع کی گئی ہے۔ اس کے بھی آغاز ہی میں وفد نے عاجز کا نام ان لوگوں کے دوش بدوش لکھا ہے جن کے "تحریری بیانات لیے گئے"۔

اہلِ عقل انصاف فرمائیں کہ اس فقرے سے کوئی بھی آدمی کیا اس کے سوا بھی کوئی خیال قائم کر سکتا ہے کہ عامر عثمانی نے بھی اوروں کی طرح اس وفد کے حضور پہنچ کر اپنا تحریری بیان دیا ہوگا؟ پوری رپورٹ میں کہیں اس کا اشارہ بھی نہیں ہے کہ عامر عثمانی کو وفد نے خط لکھا اور اس خط کے جواب میں اس نے حاضر ہونے اور بیان دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس واقعے کا تذکرہ کیے بغیر عامر عثمانی کو ان لوگوں کے خانے میں رکھ دینا جن کے ''تحریری بیانات لیے گئے۔'' اس کے سوا کیا معنیٰ رکھتا ہے کہ دنیا کو صریح دھوکا دیا جارہا ہے۔

آگے چلئے۔ رپورٹ میں ۱۲ تنقیحات قائم کی گئی ہیں۔ ہر تنقیح پر فی الحال ہم مختصراً کلام کریں گے۔

تنقیح (۱)

''دیوبند کی موجودہ فضا کیا تھی اور کیا مجلسِ مشاورت کے لیے وہاں فضا سازگار تھی۔''

اس تنقیح کے ذیل میں ثابت یہ کیا گیا ہے کہ دیوبند میں مجلسِ مشاورت کا جلسہ دراصل جمعیۃ علماء سے سیاسی انتقام کی نیت سے کیا گیا تھا۔

دلیل یہ ہے کہ جب دیوبند میں مجلسِ مشاورت کی کوئی تنظیم موجود نہیں تھی وہاں جلسہ کیا معنیٰ۔ ''اگر نوجوان طلبہ کو مشاورت کا پیغام پہلے سنانا ضروری تھا تو علی گڑھ کو کیوں نہ منتخب کیا گیا جہاں مسلمان طلبہ دارالعلوم دیوبند سے کہیں زیادہ تعداد میں رہتے ہیں۔''

استدلال کی اس نرالی تکنک پر اس کے سوا کیا کہا جائے کہ جھوٹ کی مزاولت نے ان حضرات کی عقلوں پر سیاہی پھیر دی ہے۔ دیوبند میں پہلے سے کسی تنظیم کے نہ ہونے کا لازمی تقاضا یہ تو نہیں کہ اگر عامر عثمانی اور چند دیگر حضرات اس تنظیم کا آغاز کرنا چاہیں تو وہ رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے کوئی جلسہ ہی نہ کریں۔ جلسہ کیا ہی اس لیے گیا تھا کہ مجلسِ مشاورت جیسی نئی تنظیم کا پورا تعارف عوام کے سامنے آجائے اور پھر عوام خود اس سے منسلک ہونے پر مائل ہوں۔ یہ نکتہ نکالنا کہ پہلے سے تنظیم نہ ہونے کی صورت میں جلسے کا انعقاد انتقامی ہی نیت سے ہو سکتا ہے ایک نامعقول نکتہ ہے جس میں نکتہ سنجوں کی اپنی بدباطنی جھلکتی ہے۔

پھر آپ سے آپ یہ بھی فرض کر لیا گیا کہ دیوبند میں جلسہ کرنے کا واحد مقصد نوجوان طلبہ کو پیغام سنانا ہو سکتا ہے۔ یہ مفروضہ بے بنیاد ہے۔ دیوبند میں فقط پندرہ سو طلبہ ہی نہیں بستے پچاس ہزار شہری بھی بستے ہیں۔ اصل مقصود انھی شہریوں کو مجلسِ مشاورت سے متعارف کرانا تھا۔ طلبہ اصل مقصود ہوتے تو جلسے کی جگہ مدرسے سے اتنی دُور کیوں طے پاتی۔ یہ منطق سراسر فاسد ہے کہ جلسہ پہلے علی گڑھ کیوں نہ کیا گیا۔ یوں فاسد ہے کہ عامر عثمانی رہتا تو دیوبند میں ہے۔ وہ اگر دفعتاً یہ محسوس کرتا ہے کہ جمعیۃ علماء کی کانگریس گردی کے فتنے سے اپنے بھائیوں کو بچانے کے لیے دیوبند میں جلسہ ضروری ہے تو وہ اس کا انتظار کیوں کرے گا کہ پہلے علی گڑھ میں جلسہ ہو تب ہم جلسہ کریں۔

اس تنقیح میں اہلِ وفد نے اپنی پرانی عادت کے مطابق جماعتِ اسلامی کو بھی رگیدا ہے۔اس پر یہاں اس لیے ہم کچھ نہیں کہتے کہ بات لمبی ہو جائے گی ورنہ مقبوضہ جمعیۃ علماء کے سند یافتہ جہّال اپنی کاروباری قوم پروری اور منافقانہ وطن دوستی کی نمائش کے لیے جس نوع کا واہی علم کلام جماعت اسلامی کے خلاف استعمال کرتے ہیں اس کی دھجیاں بکھیرنا ہمیں خوب آتی ہیں اور موقع بہ موقع ہم ان کے علم وفہم کا جغرافیہ تجلّی میں بتاتے بھی رہے ہیں۔

تنقیح (۲)

''جلسہ گاہ بار بار کیوں بدلی گئی۔''

اس تنقیح کے ذیل میں ثابت یہ کیا گیا ہے کہ بار بار جگہ بدلنا دراصل اس مقصد سے تھا کہ ایسی جگہ جلسہ ہو جہاں طلباء کو گھیر کر مارا جائے۔رپورٹ کے الفاظ میں جلسہ گاہ کی تبدیلی حقیقۃً ''کمین گاہ کی تلاش'' کے جذبے سے تھی۔

اب اس خباثتِ نفس کا کیا علاج ہے کہ اربابِ وفد اپنی ہی طرح دوسروں کو بھی مکار اور خبیث النفس باور کرانا چاہتے ہیں۔ذرا سوچیے جو لوگ ہزاروں روپے کے خرچ سے دُور دراز کے حضرات کو بلا رہے ہوں کیا وہ اپنے جلسے کی رونق بڑھانے والے طلباء کو عین جلسے میں گھیر کر مارنے پیٹنے اور جلسے کو تباہ کرنے کا تصور تک کر سکتے ہیں؟

یہاں آپ ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) کے مدیر جناب شاہ معین الدین کے چند الفاظ ملاحظہ فرمالیں وہ نومبر کے شذرات میں لکھتے ہیں:

> ''اتنا تو ہر شخص تسلیم کرے گا کہ کوئی جماعت یا پارٹی جو اپنا پیام دوسروں تک پہنچانا چاہتی ہو وہ خود اپنا جلسہ درہم برہم نہیں کر سکتی؛ بلکہ ایسی صورتِ حال کو بچانے کی کوشش کرے گی،جلسہ کو ناکام بنانے کی کوشش ہمیشہ مخالف جماعت کی جانب سے ہو گی۔یہ ہو سکتا ہے کہ جوابی مقابلہ میں دوسرا فریق بھی شریک ہو جائے۔''

واقعہ یہ ہے کہ طلباء کی طرف سے ان کے نقاب پوش کمانڈروں کی ہدایت پر جو حملہ جلسے پر ہوا،اس کے جواب میں ہم بھی دفاع کرتے تو قصور ہمارا پھر بھی کچھ نہ ہوتا؛لیکن لطف یہ ہے کہ ہم غریبوں نے تو دفاع تک نہ کیا جس کا اعتراف اس رپورٹ میں بھی صفحہ ۷ پر باین الفاظ کیا گیا ہے کہ:

> ''ابھی یہ طلبہ جلسہ گاہ میں داخل نہیں ہونے پائے تھے کہ منتظمین جلسہ رہنمایانِ مشاورت اور تمام جلسہ والے جو صرف ۲۰،۲۵ تھے غائب ہو چکے تھے۔''

پھر اسی صفحہ پر یہ اعتراف بھی موجود ہے کہ طلبہ نے:

> ''غصہ و اشتعال میں تختے اُٹھا کر جھنڈیاں توڑیں،بندروال توڑے کچھ سامان کو بھی نقصان

پہنچایا اور جلانے کی کوشش کی؛ مگر زیادہ یا کوئی خاص نقصان نہیں پہنچ سکا۔ (طلباء کی توڑ پھوڑ اور لوٹ مار سے کیا کچھ مالی نقصانات ہوئے اس کی تفصیل آگے کسی جگہ ملاحظہ کیجئے گا) اس موقع پر پولیس آگئی اور اس نے آگ کو بجھایا۔"

اب اہلِ عقل فیصلہ فرمائیں کہ اگر وفد کی ہذیان سرائی کے مطابق جلسے کی جگہ کا تعین ہم نے ایک ''عمدہ کمین گاہ'' کی حیثیت سے کیا ہوتا تو کیا واقعہ یوں ہی پیش آنا چاہئے تھا کہ طلبہ جب حملہ آور ہوں تو ہم بھاگ چکے ہوں اور ہمارا سارا ساز و سامان وہ بہ اطمینان تباہ کرتے چلے جائیں؟

وفد نے پورے مکر سے واقعے کی ترتیب بدلی ہے۔ واقعہ یوں نہیں تھا کہ طلبہ نے جھنڈیاں اور بندروال بعد میں توڑے ہوں، بلکہ واقعہ یوں تھا کہ یہ حرکت پہلے کی گئی اور اسی کے نتیجے میں جلسہ ابتداءً درہم برہم ہوا۔ لاٹھیوں سے مسلح ہو کر طلبہ کا حملہ تو بعد میں اس وقت ہوا جب جلسہ دوبارہ شروع ہو چکا تھا۔

تاہم ترتیب بدلنے سے بھی یہ جھوٹ سچ نہیں بن سکا کہ ہم نے کسی مفروضہ ''کمین گاہ'' کا تصور تک کیا تھا۔

اور سنیے! اسی تنقیح میں لکھا گیا ہے کہ:

"مجلسِ مشاورت کے جلسۂ مذکورہ میں حسبِ عادت شہر کے بہت کم لوگوں نے شرکت کی۔ تقریباً سوا سو ڈیڑھ سو شہری شریک (یہ صریح جھوٹ ہے مجمعہ ہزاروں کا تھا، تاہم اسی جھوٹ کو ہم سچ فرض کرتے ہوئے تجزیہ کرتے ہیں) ہوئے اور طلبہ کے متعلق البتہ چار سو تک کی شرکت کے لیے شہادت ملتی ہے۔"

اب غور کیجئے۔ وفد خود ہی وضاحت کر چکا ہے کہ رہنمایانِ مشاورت اور تمام جلسے والے مل ملا کر صرف ۲۵،۲۰ تھے۔ نیز پہلی تنقیح میں وہ ہم پر سیاسی انتقام کی نیت کا الزام بھی اسی بنیاد پر لگا چکا ہے کہ دیوبند میں مجلسِ مشاورت کی تنظیم تھی ہی نہیں۔ علاوہ اس کے پہلی ہی تنقیح میں وہ یہ بھی دعویٰ کر چکا ہے کہ دیوبند میں تمام تر جمعیۃ علماء ہی کا اثر ہے۔ وہاں کے عوام جماعتِ اسلامی یا مسلم لیگ یا مجلسِ مشاورت کے قطعاً حامی نہیں۔

ان اپنی تصریحات اور اعتراضات کے بعد بھی اگر وہ یہ کہتا ہے کہ مجلسِ مشاورت نے طلباء کو باقاعدہ مارنے پیٹنے کی اسکیم بنائی، پھر اس پر عمل کیا اور طلباء خوب پٹے تو اس کا واحد مطلب یہ ہوگا کہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ مجلس مشاورت والوں نے چار سو طلبہ کو مارنے پیٹنے میں کامیابی حاصل کی اور ایسے ڈیڑھ سو شہریوں کی موجودگی میں حاصل کی جو وفد کے دعوے کے مطابق مجلسِ مشاورت کے نہیں بلکہ جمعیۃ علماء کے حامی و ناصر تھے۔ حد یہ ہے کہ مقابلتہً اتنی کم تعداد میں ہونے کے باوجود مجلسِ مشاورت والوں کے چوٹیں بھی نہیں آئیں جیسا کہ وفد نے اپنی رپورٹ میں بہ اصرار باور کرایا ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ یہی ۲۵ افراد رپورٹ کی تصریح کے مطابق اس قدر بزدل بھی تھے کہ جب طلبہ مسلح ہو کر آئے تو یہ بھاگ چکے تھے۔

واہ رے افسانہ طرازو! حیرت یہ ہے کہ اس وفد میں ایک وکیل صاحب بھی تھے۔ کیا وکیل ایسے ہی ہوتے ہیں جنہیں جھوٹ بولنے کا ڈھنگ بھی نہ آتا ہو!

تنقیح (۴)

''طلبہ ایک بار جلسہ گاہ سے چلے آنے کے بعد پھر جلسہ گاہ میں کیوں گئے اور وہاں کیا کیا۔''

اس کے ذیل میں یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ طلبہ کا دوبارہ مسلح ہو کر جانا اور جلسہ کو تاخت و تاراج کرنا دراصل اس لیے تھا کہ ان کے ساتھی لہولہان کر دیئے گئے تھے۔

اس مبالغہ آمیز توجیہہ پر کچھ عرض کرنے کے عوض ہم رپورٹ ہی کے الفاظ نقل کرتے ہیں جن سے مصرّح ہوتا ہے کہ طلبہ نے جھوٹ بولا۔ الفاظ یہ ہیں:

''متعد طلبہ کو لہولہان دیکھ کر اور ایک طالبِ علم کو مردہ سمجھ کر طلبہ نے مسجد دارالعلوم کے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کیا کہ ہمارے طالبِ علم بھائیوں کو جلسے میں بُری طرح زدوکوب کیا گیا ہے۔ دولاشیں جلسہ گاہ میں پڑی ہیں جن کو کوئی اُٹھانے والا بھی نہیں ہے۔''

خط کشیدہ الفاظ پر نظر رکھئے۔ وفد صراحت کرتا ہے کہ طلبہ نے فقط ایک طالبِ علم کو مردہ سمجھا اور یہ بھی صراحت کرتا ہے کہ لاؤڈ اسپیکر پر اعلان انہوں نے دو لاشوں کا کیا۔ اس طرح وہ خود تسلیم کرتا ہے کہ طلبہ نے پچاس فی صد جھوٹ بول کر اشتعال انگیزی کی اگر ہم حساب کم جانتے ہیں تو کسی ریاضی داں سے پوچھ دیکھئے کہ ایک اور دو میں پچاس فی صدی کی نسبت ہے یا نہیں۔ اب اگر اس جھوٹ کے باوجود طلباء کی معصومیت اور مظلومیت کا وہ نقشہ کھینچنا بجا ہوسکتا ہے جو اس رپورٹ میں کھینچا گیا ہے تو اس کے سوا ہم کیا کہیں کہ جھوٹ بولتے بولتے مقبوضہ جمعیۃ کے مقدسین کا مزاج ہی یہ بن گیا ہے کہ فقط پچاس فیصدی جھوٹ انھیں کوئی عیب نہیں معلوم ہوتا۔

اس تنقیح کے ذیل میں یہ بھی ارشاد ہوتا ہے کہ:

''مولانا مفتی عتیق الرحمٰن بہت بدحواس ہو کر جلسہ گاہ سے بھاگے تھے شہادتیں یہ ہیں کہ اس اثناء میں مفتی صاحب گرے اور ایک دیوار سے ان کا سر ٹکرایا جس سے ان کے ضرور چوٹ لگی ہوگی۔ طلبہ نے ان کی یہ حالت دیکھ کر فوراً ہی ان کو اپنی حفاظت میں لے لیا (بقول مفتی صاحب طلبہ ہی نے مجھ کو مارا اور طلبہ ہی نے میری حفاظت کی)۔''

ملاحظہ فرمائیے۔ مفتی صاحب کا ایک قول بطورِ استناد نقل کیا جاتا ہے؛ مگر اسی قول کا ایک فقرہ مستند ٹھیرتا ہے اور دوسرا غیر مستند۔ یہ وکالت کی نئی تکنک ہے طلبہ ہی نے مفتی صاحب کی حفاظت کی اس کا ثبوت تو منقولہ قول

کے دوسرے فقرے سے مل گیا۔ مگر پہلا فقرہ جو وفد کی گھڑی ہوئی اس داستان کی تردید کر رہا تھا کہ مفتی صاحب کے چوٹ اتفاقاً گر جانے سے آئی ہے مردود قرار پایا ہے۔ اسے کہتے ہیں ننگی ڈھٹائی۔ ہر ہوشمند سوچ لے کہ اگر مفتی صاحب کا قول بریکٹ میں استناد کے لیے نقل کیا گیا تھا تو اس کے تمام اجزاء مستند قرار پانے چاہئیں۔ نہ یہ کہ جو جز وفد کے اختراع کردہ افسانے کی تائید کرے وہ تو قابل اعتماد ٹھیرایا جائے اور جس جز سے تردید ہو رہی ہو اسے نظرانداز کر دیا جائے۔

بکواس ہے کہ مفتی صاحب گرے اور دیوار سے ان کا سر ٹکرایا۔ ان کے سر اور کمر کی چوٹیں بلا ریب وشک اُن لاٹھیوں سے آئی ہیں جنھیں چلا تو طلبہ رہے تھے مگر چلوانے والا کوئی اور تھا (ڈاکٹری رپورٹ اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیے)۔

یہ ستم ظریفی اس رپورٹ میں جگہ جگہ کی گئی ہے کہ اپنے مسلک کی ایک بات کہی اور بطورِ استناد بریکٹ میں جمیل مہدی اور اظہر صابری اور مولوی سالم صاحب وغیرہ کے نام لکھ دیئے۔ یہ ٹھیک وہی حرکت ہے جو ابھی ایک غیر مسلم مضمون نگار نے کی تھی کہ قرآن سے وَاقْتُلُوْاهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ نقل کر دیا اور دنیا کو بتایا کہ قرآن مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ کوئی بھی کافر جہاں جس حالت میں تمہیں ملے اسے فوراً بے دریغ قتل کر دو۔

ظاہر ہے تنہا اس قرآنی فقرے کا تو یہی مطلب ہے۔ مگر کیا کوئی بھی صاحبِ علم اور انصاف پسند آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ تنہا اس فقرے کو نقل کر کے جو تعلیم قرآن کی طرف منسوب کی گئی ہے وہ سراسر جہل یا شرارت پر مبنی نہیں ہے!

قرآن میں لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ آیا ہے (نماز کے قریب مت جاؤ) اب اگر کوئی ستم ظریف ایک مضمون لکھے کہ نماز آغازِ اسلام میں فرض تھی پھر یہ فرض نہیں رہی؛ بلکہ خدا نے اس کی ممانعت فرمادی۔ اور بریکٹ میں حوالہ قرآن کا دے دیا تو بتائیے آپ کیا کہیں گے!

منکرین حدیث کتب حدیث سے ایسے فقرے چھانٹ کر لاتے ہیں جو بظاہر ان کے گمراہ کن نظریات کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن یہی فقرے اگر اپنے سیاق وسباق کے فریم میں رکھ کر دیکھے جائیں تو ان کا مطلب وہ نہیں نکلتا جو نکالا جا رہا ہے۔

اسے اصطلاحِ شرع میں زندقہ کہتے ہیں جو بدترین عمل کفر ہے۔ قرآن میں یہودیوں کے اسی فعل شنیع کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا: يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (النساء) آگے سورہ مائدہ میں دو جگہ یہی مضمون دہرایا گیا۔

ہم اہلِ وفد کو شرعی زندیق تو نہیں کہہ سکتے؛ مگر سیاسی زندیق ضرور کہیں گے؛ کیونکہ انھوں نے اپنی رپورٹ میں جگہ جگہ اپنے مفید مطلب مقدمات ونتائج کے آگے بریکٹ میں جمیل مہدی، اظہر صابری اور محمد حنیف وکیل وغیرہ کے حوالے دیئے ہیں حالانکہ ان لوگوں کے بیانات ہمارے علم میں ہیں اور یہ بیانات مکمل طور پر ان مقدمات ونتائج کی تردید کرتے ہیں جن کی تائید میں انھیں مجمل ومبہم طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ دارالعلوم کی مجلسِ

شوریٰ کو چاہیے کہ اگر یہ رپورٹ اپنی صریح جانب داریوں اور غلط بیانیوں کے باوجود لائق اعتنا سمجھی جائے تو محولہ حضرات کے اصل بیانات وفد سے ضرور طلب کر لیے جائیں۔

تنقیح (۵)

''طلبہ ظالم تھے یا مظلوم اور کیا انھوں نے جلسہ پر منصوبہ بند حملہ کیا تھا۔''

اس تنقیح پر کچھ سننے سے قبل ان اربابِ وفد کی ذہنی جانب داری کا ایک منہ بولتا نمونہ ملاحظہ کر لیجیے۔اس میں دو جگہ عزیزم ارشد عثمانی کا تذکرہ آیا ہے جو خیر سے دیوبند کی جمعیۃ علماء کے ناظم ہیں۔انھیں ''عزیزم'' ہم نے طنزاً نہیں کہا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان سے ہمیں دلی تعلق ہے۔ان سے ہم محبت کرتے ہیں اور ان کے والدِ محترم ہمارے شفیق بزرگوں میں ہیں۔ان کی تعریف اگر کوئی کرے تو اس سے ہمارا دل خوش ہوتا ہے۔مگر سوال ہمارے دل کا نہیں وفد کی ذہنی جانب داری کا ہے۔اس نے دونوں جگہ انھیں ''مولانا ارشد عثمانی'' لکھا ہے۔عام حالات میں یہ لوگ اپنی عادت کے مطابق جسے جو چاہے لکھتے رہیں ہمیں کوئی سروکار نہیں۔لیکن ایک ایسی رپورٹ میں جو غیر جانب داری کا مرقع ہونی چاہیے اگر اُس نونہال کو بھی ''مولانا'' لکھا جاتا ہے جس کا نوعمر ہونا اسی رپورٹ کے صفحہ ۸ سطر ۴ میں تسلیم کیا گیا ہے اور جس کے بارے میں معلوم ہے کہ عربی کی تو کیا فارسی کی سند بھی اس نے حاصل نہیں کی تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا سمجھا جائے گا کہ چونکہ ارشد میاں جمعیۃ علمائے دیوبند کے ناظم ہیں، اس لیے مبالغہ آمیز تعظیم و تکریم بھی ان کی جائز۔اور عامر عثمانی چونکہ اربابِ وفد کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکتا ہے اس لیے اس کی واجبی تکریم بھی ناجائز۔ہم نہیں کہتے کہ ہمیں ''مولانا'' لکھنا چاہیے تھا۔مگر فاضل دیوبند ہونے کی حیثیت سے ''مولوی'' تو بہر حال لکھنا تھا۔ہماری ہی طرح ہلال عثمانی بھی فاضل دیوبند ہیں اور خیر سے دارالعلوم کے مدرس بھی ہیں؛ مگر مولوی اہلِ وفد کی نگاہ میں نہ وہ ٹھیرے نہ راقم الحروف۔ہاں ارشد میاں نہ صرف مولوی بلکہ مولانا بھی قرار پائے۔

شکایت ہرگز نہیں یہ تو فقط حکایت ہے اور حکایت کا مقصد بس یہ دکھانا ہے کہ وفد کی خویش پروری، جانب داری اور ذہنی عدمِ توازن کا کیا عالم ہے۔ویسے وفد سے اگر کوئی عدل و دیانت کی توقع رکھتا ہے تو اسے ہماری طرف سے یہ تاریخی مصرعہ پہنچا دیجیے۔

چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں!

اب آیئے نفس تنقیح کا جائزہ لیں۔

اس تنقیح کے ذیل میں انھوں نے یہ بتایا ہے کہ طلبہ تو بہتیرے زخمی ہوئے مگر شہریوں میں کسی کے چوٹ نہیں آئی۔لہٰذا ثابت ہوا کہ طلبہ نے کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا۔

شہریوں کے چوٹ نہ آنے کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ:

''کچھ صاحبان نے بعض شہریوں کے چوٹ آنے کا ذکر کیا ہے لیکن باوجود ہمارے بار بار تقاضے کے نہ ان کو لایا گیا نہ ہم کو ہی ان کے پاس لے جایا گیا۔''

ہم عرض کرتے ہیں کہ اس کا جواب ہم پچھلے تجلّی کے صفحہ ۱۲ کالم ۲ میں دے چکے ہیں۔اس جواب کے علاوہ مزید جواب یہ ہے کہ جمیل یا اظہر صاحبان اگر آپ کو بیان دے آئے تھے تو یہ ان کی سادہ لوحی تھی۔ناچیز اس وقت دیوبند موجود ہوتا تو یہ بھی آپ تک ہرگز نہ پہنچتے۔یہ بے چارے اس تصور میں رہے کہ ہم سچے واقعات بیان کر کے وفد کو انصاف کرنے میں مدد دیں گے؛ مگر یہ بات انھیں ان کی فراست نے بروقت نہیں بتائی کہ تم سے بھولے پن میں غلطی ہوئی ہے۔جس وفد سے تم انصاف کی توقع رکھتے ہو وہ مجرمین کا ایجنٹ ہے اور اسے جو کچھ فیصلہ دینا ہے وہ پہلے ہی طے پا چکا ہے۔

اگر راقم الحروف سمجھتا کہ واقعتہً تفتیش کی جا رہی ہے تو کم سے کم پندرہ ایسے لوگوں کو لا سکتا تھا جن کے چوٹیں لگی ہیں؛ لیکن تفتیش کا محض ڈھونگ رچایا جا رہا ہو تو کس کی بلا کو غرض پڑی تھی کہ مجروحین کی نمائش لگاتا۔

بڑے مزے کی بات ہے کہ رپورٹ میں جناب قاضی عدیل عباسی ایڈوکیٹ کا یہ فرمودہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ:

''ڈاکٹر فریدی صاحب، عامر عثمانی صاحب و ہلال عثمانی صاحب کا بغیر کسی تحقیق کے طلبہ کو منصوبہ بند حملہ آور بتلانا یہ لازم کرتا ہے کہ وہ ثابت کریں طلبہ یک طرفہ طور پر ہی زخمی کیوں ہوئے۔ہائی کورٹ کے نظائر کے مطابق مستغیث پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ بتلائے کہ ملزم کو اگر چوٹ آئی ہے تو کس طرح آئی اگر مستغیث اس کا جواب نہیں دے سکتا ہے تو مقدمہ خارج کر دیا جائے گا؛ کیونکہ اس سے اصل واقعہ کی حقیقت پر شبہ ہوتا ہے۔''

قاضی صاحب کا ہم بہت احترام کرتے ہیں۔ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ طلبہ کا یک طرفہ طور پر زخمی ہونا محض ایک من گھڑت مفروضہ ہے لہٰذا اس کی وجہ ظاہر کرنے کا مطالبہ ہم سے کیونکر کیا جا سکتا ہے۔دوسری گزارش یہ ہے کہ آپ نے ہائی کورٹ کی نظائر کا حوالہ قطعاً بے محل دیا ہے جس کا منشاء بس اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی قانونی قابلیت کا رعب ہم غریبوں پر پڑ جائے۔

چلئے ہم مرعوب ہو گئے۔مگر ان وفد والوں کی لیاقت تو دیکھئے کہ انھوں نے آپ کا شہ پارہ اس طرح نقل کیا ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کون مستغیث اور کون ملزم ہے۔بس ایک مہمل سی عبارت سامنے آجاتی ہے جس کا کوئی مصداق معین نہیں ہوتا۔

آگے اہلِ وفد نے کچھ مصداق سا معیّن کرنے کی کوشش بدیں الفاظ کی ہے کہ:

''یہ کہنا کہ طلبہ اپنے ساتھیوں ہی کے ہاتھوں زخمی ہوئے محض ایک غیر ذمہ دارانہ استغاثہ باز کے الفاظ تو ہو سکتے ہیں کوئی ذمہ دار اس کو سوچنا بھی گوارا نہیں کر سکتا۔''

اب پتہ چلا کہ وفد کی نگاہ میں مستغیث ہم گناہگار ہیں۔

لیکن یہ بات قاضی صاحب ہی کو بتانی ہوگی کہ ہائی کورٹ کے نظائر کی روشنی میں ''استغاثہ بازی'' کس چڑیا کا نام ہے اور مستغیث کسے کہتے ہیں۔ ہمیں جو معنی ''مستغیث'' کے معلوم ہیں ان کی رو سے تو ہم اپنا مستغیث ہونا تسلیم نہیں کرتے۔ ہم نے کوئی استغاثہ کہیں نہیں کیا۔ نہ سوائے خدا کی عدالت کے ہمیں کسی ایسی عدالت کا علم ہے جہاں ہمارا مقدمہ درپیش ہو پھر مقدمہ خارج ہونے کا کیا سوال۔ رہی خدا کی عدالت تو وہاں کسی بھی واقعے کی حقیقت کا مشتبہ ہونا خارج از بحث ہے وہاں تو سب کچھ آئینہ ہے۔

اچھا چلیے ہم فرض ہی کئے لیتے ہیں کہ ہم مستغیث ہیں۔ لیکن قاضی صاحب اور اہلِ وفد تجلّی کا پچھلا شمارہ اُٹھا کر دیکھ سکتے کہ اس میں ہم نے ''زخمی کیوں ہوئے'' کا جواب دے دیا ہے۔ (صفحہ ۶ و ۷)

مزید جواب سنئیے! ایک طالبِ علم صاحب شامیانے کی رسّی چاقو سے کاٹ رہے تھے۔ اب جو کسی نے ایک دم ڈانٹ دی کہ یہ کیا کر رہے ہو تو اضطراراً ان کے چاقو والے ہاتھ نے ایسی جنبش کی کہ چاقو خود ان کے کسی حصۂ جسم میں جا لگا بس برائے نام سا زخم۔ فرمائیے ہائیکورٹ کی کونسی نظیر اس کو رد کرتی ہے۔

ایک طالبِ علم نے لمبا اور بھاری تختہ نالی سے اُٹھا کر بندروال پر چلایا۔ بندروال ظاہر ہے سر سے اونچے باندھے جاتے ہیں اور وہ فقط معمولی سی سُتلی کے ہوتے ہیں۔ انھیں توڑنے کے لیے جب کوئی شخص پورے جوش و خروش سے اتنا بھاری تختہ ہوا میں چلائے گا تو کونسا بعید از قیاس ہے کہ یہ تختہ پتلی سی سُتلی کو توڑتا ہوا سامنے والے شخص کے سر پر جا لگے۔ نہ صرف بعید از قیاس نہیں بلکہ اغلب اور قدرتی یہی ہے کہ اتنے بڑے اور بھاری تختے کی جھونک سامنے والے کو لے مرے۔

اسٹیج پر سنگ باری کی گئی۔ طلبہ اسٹیج کے قریب بھی تھے لہٰذا پیچھے والے طلبہ کے پھینکے ہوئے پتھر اور اینٹیں اگر کچھ طلبہ ہی کو نشانہ بنا گئے ہوں تو اس میں کیا استحالہ ہے۔

اور پھر قرآن کی صریح توہین، داڑھیوں سمیت رقص اور ایک عمدہ قسم کے جلسے کو نہ ہونے دینے کی خاطر ہلڑ بازی۔ یہ چیزیں تو ایسی تھیں کہ کچھ شہریوں نے جھلا کر کچھ پتھریا ہاتھ رسید ہی کر دئے تو اس میں کیا بات خلافِ قیاس ہو گئی؟

تنقیح (۶)

''کیا بیرونی مہمانوں کو زخمی کیا گیا''۔

اس کے ذیل میں مفتی صاحب کی چوٹ کے لیے تو وہی لگی بندھی قیاس آرائی کی گئی ہے کہ:

"یہ چوٹ بانس یا دیوار سے ٹکرائے جانے سے ممکن ہو سکتی ہے۔"

گویا مفتی صاحب جو خود کہتے ہیں کہ مجھے طالبِ علموں نے مارا وہ بھی جھوٹے۔ اور سچا کون۔ مجرموں کا یہ وفد جو مفتشین کا بہروپ بھر کر آیا ہے۔

دیگر بیرونی مہمان بے شک زخمی نہیں ہوئے؛ لیکن یہ کہنا کہ ان میں سے:

"نہ کسی نے دیوبند اسپتال سے طبی امداد لی نہ کسی دوسرے ڈاکٹر کو دکھلایا۔"

اُس تذلیل و اہانت کو شہ دینا ہے جو طلبہ نے مہمان خانہ میں ٹھیرے ہوئے مہمانوں کی کی ہے۔

اوّل تو پیر یا پیٹھ پر لگے ہوئے دو چار پتھروں کی بند چوٹ ایسی ہوتی نہیں کہ فوراً ہی ڈاکٹر کی طرف دوڑا جائے۔ دوسرے ڈاکٹر فریدی اور مولانا منظور نعمانی چاہتے بھی تو دیوبند میں کوئی طبی امداد کیسے حاصل کر سکتے تھے جب کہ انھیں دیوبند سے سہارنپور جانا بھی جان ہتھیلی پر رکھ کر نصیب ہوا تھا۔

تیسرے چوٹیں صرف جسم ہی پر نہیں آتیں دلوں اور روحوں پر بھی آتی ہیں۔ یہ مونچھوں پر تاؤ دے کر رپورٹ مرتب کرنے والے حضرات اگر آزمائش کرنا چاہیں تو ایک بار دیوبند تشریف لا کر ہم سے دریافت کریں کہ وہ چوٹیں کیسی ہوتی ہیں جنھیں ڈاکٹر اور حکیم تو نہیں دیکھ سکتے مگر وہ قلب و روح کا مستقل ناسور بن جایا کرتی ہیں۔

فرض کیجئے۔ ان کی کمر پر کوئی پانچ جوتے رسید کر دے تو کیا وہ کسی ڈاکٹر سے رپورٹ حاصل کر سکیں گے کہ ان کے جوتے مارے گئے ہیں۔ یہ تفنن نہیں ہے۔ مظاہر العلوم کے شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا مدظلہٗ سے جا کر دریافت کیجئے کہ مولانا منظور نعمانی سے انھوں نے کیا کچھ سنا ہے اور کس طرح صاف اعلان کیا ہے کہ جو طلبہ ان واقعات میں شامل رہے ہیں ان سے میں ہر طرح کا تعلق منقطع کرتا ہوں۔

تنقیح (۷)

"کیا مفتی صاحب پر قاتلانہ حملہ کیا گیا"۔

اس کے ذیل میں بھی قانون دانی کا رعب ڈالنے کی مضحکہ خیز کوشش کی گئی ہے۔ فرمایا جاتا ہے:

"ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۳۰۷ میں کھلے دھار دار آلہ یا ضرب مہلک کے بعد ہی قاتلانہ حملہ مانا جاتا ہے۔"

گویا پچاس لٹھ بند طلبہ کا مفتی صاحب کو گھیر لینا قاتلانہ حملے کے الزام کے لیے کافی نہیں بلکہ یا تو وہ چاقو خنجر لیے ہوئے ہوتے یا پھر لاٹھیوں سے مہلک ضربیں پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے تب کہیں جا کر قاتلانہ حملے کا الزام لگ سکتا۔

عاجز کہتا ہے کہ مقبوضہ جمعیۃ علماء کے نزدیک تو قاتلانہ حملے کا الزام اس وقت بھی نہ لگتا کہ جب خدانخواستہ مفتی

صاحب مار ہی ڈالے جاتے۔ وہ کہہ دیتی کہ یا تو انھیں مجلسِ مشاورت والوں نے مارا ہے یا پھر انھوں نے خود ہی بڑھ کر طلبہ کی لاٹھیوں پر سر رکھ دیا ہے۔ طلبہ غریب نے تو لاٹھیاں نہیں ماریں مگر مفتی صاحب نے خود ہی اپنا سر لاٹھیوں پر مار مار کر چکنا چور کرلیا۔

بار بار دہرایا جاتا ہے کہ مفتی صاحب زخمی نہیں ہوئے۔ یہ لفظی بازی گری کی شاندار مثال ہے۔ یہ ہم بھی مانتے ہیں کہ مفتی صاحب کو زخم نہیں آئے؛ لیکن کیا بند چوٹیں چوٹ نہیں کہلاتیں۔ لاٹھیاں لگی ہیں؛ مگر اُچٹتی ہوئیں جن سے گومڑے تو پڑے ہیں مگر خون نہیں بہا۔ پھر کیوں نہ اس امر واقعہ کا صاف صاف بیان یوں کیا جائے کہ حملہ تو قاتلانہ ہی کیا گیا مگر ناکام رہا۔

تنقیح (۸)

''مہمان خانے کو کیوں گھیرا گیا۔''

اس کے ذیل میں لکھا گیا ہے کہ:

''ایک زخمی طالبِ علم کو مردہ پا کر جلسہ میں اشتعال اور جوش پیدا ہونا قدرتی بات تھی۔''

آپ نے ابھی دیکھا کہ جہاں وفد سے تاویل نہ ہوسکی وہاں قانونی نکات کا رعب ڈالنے کی طفلانہ کوشش کی گئی۔ اچھا تو ہم قانون دانوں سے سوال کرتے ہیں کہ کیا اس عبارت سے صاف طور پر یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ زیر بحث ہنگامے میں ایک طالبِ علم واقعتہً مرا بھی ہے؟ مُردہ پانا اور مُردہ سمجھنا دو الگ الگ باتیں ہیں۔ عبارت میں یہ نہیں کہا گیا کہ ایک زخمی طالبِ علم کو مردہ سمجھ کر بلکہ کہا یہ گیا کہ ''ایک زخمی طالبِ علم کو مردہ پا کر'' تو بتائیے کیا اتنی ہی غلط بیانی ایک عدالت کو اس کا مجاز نہیں بنا دیتی کہ ساری رپورٹ کو زمین پر دے مارے۔

یہ قانونی نکتہ سنجی کا جواب تھا۔ مہمان خانے کو گھیر لینے کی وجہ یہ تشخیص کی گئی ہے کہ چونکہ مفتی صاحب اور مولانا منظور نعمانی نے طلبہ پر حملہ کرنے والوں کو نہ روکا نہ ڈانٹا لہٰذا انھیں ان حضرات پر غصہ تھا اور اسی لیے مہمان خانے کو گھیر لیا گیا۔

اسے کہتے ہیں بناء الفاسد علی الفاسد۔ پہلے مفروضہ گھڑا کہ جلسہ میں طالبِ علموں کو باقاعدہ مارا گیا۔ پھر مفروضہ گھڑا کہ اس یک طرفہ مار پیٹ کا نظارہ مولانا نعمانی اور مفتی صاحب دونوں نے دیکھا۔ پھر ان فرضی مقدمات سے نتیجہ نکالا گیا کہ طلبہ نے اسی غم میں مہمان خانے کو گھیرا۔

اب ہم لوگ اگر مضبوط قرائن کے تحت اس ہنگامے کے سلسہ میں مولوی اسعد کا نام لیتے ہیں تو یہ حضرات بڑے چراغ پا ہوتے ہیں۔ مگر ان کا اپنا یہ حال ہے کہ قرائن نہیں بلکہ من گھڑت باتوں پر استدلال کی عمارت اُٹھاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ساری دنیا بےوقوف بن کر اٰمَنَّا وَ صَدَّقْنَا کہہ ڈالے۔

جانبداری کا شاہکار دیکھئے کہ وفد کو یہ تو تسلیم ہے کہ طلبہ نے مختلف اشتعال آفریں نعروں میں یہ نعرہ بھی لگایا کہ:

''خون کا بدلہ خون سے لیں گے۔''

مگر اس کے متصل بعد ہی طلباء کے جرم کو یہ کہہ کر ہلکا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ:

''یہ نعرہ تو آج کل ملک بھر میں عام طور پر طلباء کے جلسوں میں سننے میں آیا ہے۔''

اور سنئیے:

''جب ایک بے ہوش طالبِ علم کو شہری ہونے کے دھوکے میں منتظمین جلسہ اُٹھا کر ڈائس کے پاس لائے تو یہ معلوم ہو کر یہ بے ہوش طالبِ علم ہے ڈائس پر بیٹھے ہوئے اکابرین ملت نے نفرت کے ساتھ حکم دیا کہ اس کو یہاں نہ لاؤ۔ بقول صدر جلسہ ہسپتال لے جاؤ اور بقول بعض طلبہ (۱۲ طلبہ) اس کو کہیں پھینک دو یہاں نہ لاؤ۔''

ہم پچھلے آغازِ سخن میں اس واقعہ کا تذکرہ کر چکے ہیں اب خود وفد نے مان لیا کہ بے شک ایک ایسا طالبِ علم زخمی ہوا تھا جس پر ہیئت کذائی کے اعتبار سے شہری ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی مان لیا کہ اسے منتظمین جلسہ ہی اُٹھا کر ہسپتال لے گئے تھے۔ اب یہ ماننے میں کیا کسر رہ جاتی ہے کہ اس کو ضربِ شدید طلبہ ہی نے پہنچائی ہو گی کیونکہ اس کا ہیولیٰ شہریوں جیسا تھا۔

رہا وہ مکالمہ جسے اکابرین ملّت کی طرف منسوب کیا گیا ہے تو اس کے بارے میں ہمارا سوال یہ ہے کہ ''نفرت کے ساتھ حکم دینے'' کا علم وفد کو کیسے ہوا۔ صدرِ جلسہ اور بعض طلبہ کے حوالوں سے جو مختلف فقرے نقل کیے گئے ہیں ان میں تو نفرت یا محبت کی صراحت ہے نہیں لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ اضافہ خود وفد کی طرف سے ہے۔ وہ خود زیادہ سے زیادہ یہ کوشش کر رہا ہے کہ مجلسِ مشاورت والوں کی تصویر کو بد سے بدتر کر کے دکھلائے۔ وہ مفتش نہیں فریق ہے۔

ہم سوال کرتے ہیں کہ اگر واقعتاً اکابرین ملّت نے یہ فرمایا تھا کہ ''اس کو کہیں پھینک دو'' تو بارہ طلبہ نے اسے کیسے سن لیا جبکہ وہ اسٹیج پر نہیں بیٹھے تھے۔ ظاہر ہے یہ بات میکروفون پر تو کہی نہ گئی ہو گی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ زخمی چونکہ از راہِ غلط فہمی شہری سمجھا گیا تھا اور اسے اُٹھا کر بھی ہمارے منتظمین ہی لائے تھے اس لیے درجن بھر طلباء اس کے ساتھ ساتھ ڈائس تک نہ آئے ہوں گے۔ پھر اس کے سوا کیا کہا جائے کہ اکابرین ملّت کی طرف اس فقرے کی نسبت من گھڑت ہے۔ وکیل بھی ایک عدد وفد کے ساتھ ہو تو پھر یہ بات مسلّم ہو جاتی ہے کہ رپورٹ کی تیاری میں اربابِ وفد نے اپنی پارٹی بندی کی ذہنیت کے ساتھ ساتھ کذب و افترا کا وہ زہر بھی اس میں خوب خوب بھرا ہے جو پیشۂ وکالت کا طرۂ امتیاز ہے۔

تنقیح (۹الف)

''کیا دارالعلوم کے مہمان خانہ کا استعمال مجلسِ مشاورت کے اراکین کے لیے مناسب اور آئینی تھا۔''

اس ذیل میں دارالعلوم کے اس قانون کا حوالہ دیا گیا ہے کہ ''دارالعلوم کے لیے آنے والے مہمان ہی دارالعلوم کے مہمان متصور ہوں گے۔''

ہم پوچھتے ہیں اس رپورٹ کو مرتب کرنے والے وفد نے دارالعلوم کے مہمان خانے میں کیوں قیام فرمایا۔ اسے کس نے بلایا تھا۔ چار روز قیام کر کے اس نے کس استحقاق پر مدرسے کا کھانا کھایا۔ چائے پی۔ بستر استعمال کئے۔ محض یہ کہہ دینا کہ مہمان خانے میں قیام اس لیے کیا گیا کہ مہمان خانہ جیسی غیر جانبدار اور مرکزی جگہ پر ہر شخص پہنچ سکے ایک ذاتی توجیہہ ہے جس کا محولہ بالا ضابطے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ دلیل بھی نامعقول ہوگی کہ ہم دارالعلوم ہی کے لیے آئے تھے۔ اس لیے نامعقول ہوگی کہ یہ دلیل ہے ہی نہیں صرف دعویٰ ہے جس کی پوست کندہ حقیقت یہ ہے کہ وفد دارالعلوم کے لیے نہیں بلکہ مقبوضہ جمعیۃ علماء کے اشاروں پر کیے گئے ہنگامے کو خاطر خواہ رنگ دینے اور اپنے حریفوں کو انکوائری کی آڑ میں مجرم ثابت کرنے کے لیے آیا تھا۔ اگر یہ بات نہیں تو وہ بتلائے کہ اس نے آنے اور مہمان خانے میں قیام کرنے کی اجازت مہتمم دارالعلوم سے حاصل کی ہو۔ بلا اجازت آپ سے آپ آدھمکنا اور دارالعلوم کی ہمدردی کا سوانگ رَچا کر جھوٹی رپورٹیں مرتب کرنا ایک ایسا جرم ہے جس کی باز پرس اس وفد سے مجلسِ شوریٰ کو ضرور کرنی چاہیئے۔

رہے فریدی صاحب تو وہ باقاعدہ مہتمم صاحب کی تحریری اجازت سے مہمان خانے میں ٹھیرے تھے اور مولانا منظور نعمانی مجلسِ شوریٰ کے ممبر ہیں لہٰذا انھیں بجا طور پر استحقاق تھا کہ وہاں قیام فرمائیں۔ ایسے لوگوں کو ان پر اعتراض کا کیا حق پہنچتا ہے جن کی پوزیشن اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ خود ان سے مدرسے کے مہمان خانے میں قیام کرنے کی وجہِ جواز دریافت کی جائے۔

یہ بھی اس رپورٹ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ ڈاکٹر فریدی وغیرہ کے لیے مہمان خانے میں قیام وطعام کا انتظام کرایا گیا جو غیر آئینی اور نامناسب کارروائی تھی۔

ہم کہتے ہیں اگر یہ درست ہوتا تب بھی غیر آئینی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن طعام کی حد تک یہ درست ہی نہیں ہے۔ طعام ایک وقت کا مدرسہ میں پکوایا گیا تھا اور وہ ہم نے اپنے پیسوں سے پکوایا تھا جس کا ریکارڈ موجود ہے۔ قیام بھی بس ایک ہی وقت کا تھا۔

حقیقت سُننا چاہیں تو ہم سناتے ہیں کہ دراصل مقبوضہ جمعیۃ علماء والے مدرسے کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں اور اسی

وجہ سے انھیں یہ بات بڑی کھلی ہے کہ جس مجلسِ مشاورت کو وہ تہ تیغ کرنے کے درپے ہیں اس کے مہمان دارالعلوم میں کیسے ٹھیرے۔ کھل کر وہ کہہ نہیں سکتے کہ ہماری جاگیر میں یہ غضب کیوں ہوا مگر ذہن ان کا اندر سے یہی ہے اور اسی کا مظاہرہ وہ قانونی موشگافی کے رنگ میں کر رہے ہیں۔

تنقیح (۹) ب

"کیا مشاورت کے جلسے میں دارالعلوم کا سامان استعمال کیا گیا۔"

اس ذیل میں جعلی شہادتوں اور مصنوعی ثبوتوں کے ذریعہ جو موشگافی کی گئی ہے اس کا فیصلہ کن جواب خود مہتمم صاحب کے اُس بیان میں آ گیا جو پچھلے تجلّی میں بھی اور متعدد اخبارات میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس کے یہ الفاظ:

> "نہ اس جلسے کے نظم و نسق میں دارالعلوم کا کوئی تعاون شامل ہے اور نہ ہی اس کا کوئی سامان مثل لاؤڈ اسپیکر یا فرش وغیرہ وہاں استعمال ہوا جیسا کہ بعض بیانات میں اس قسم کی باتیں نظر سے گزریں۔"

مقبوضہ جمعیۃ کے دونوں تحقیقاتی وفود کے رخساروں پر طمانچے کا حکم رکھتے ہیں۔ اربابِ وفد اب ذرا قاضی عدیل عباسی صاحب ایڈوکیٹ کی طرف رجوع فرمائیں کہ ہائی کورٹ کی کوئی نظیر اس معاملہ میں کیا کہتی ہے کہ کسی ادارے کا سب سے بڑا ذمہ دار تو ایک بات کی صریح اور قطعی نفی کر رہا ہے؛ مگر دوسرے غیر متعلق لوگ ہانک رہے ہیں کہ نہیں صاحب یہ بات تو ہوئی ضرور تھی!

تنقیح (۱۰)

> "کیا اس ہنگامے میں مولانا اسعد صاحب کا ہاتھ تھا اور کیا انھوں نے یہ ہنگامہ دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کی رکنیت حاصل کرنے کے لیے منظم کیا تھا۔"

اس ذیل میں وفد نے بڑی تفصیل سے مولوی اسعد صاحب کا سفری پروگرام بتا کر یہ ثابت کیا ہے کہ اسعد صاحب تو دیوبند ۱۵ راکتوبر کی صبح میں پہنچے ہیں اس سے قبل وہ وہاں تھے ہی نہیں۔ لہٰذا وہ لوگ بکواس کرتے ہیں جو اس ہنگامے سے اسعدؔ صاحب کا جوڑ لگاتے ہیں۔

فن کار دوستو! یہ آخر ڈاکٹر فریدی یا عامر عثمانی یا ہلال عثمانی نے کب کہا کہ مولوی اسعد صاحب ہنگامے کے وقت دیوبند میں موجود تھے اور بہ نفس نفیس حملے کی کمان کر رہے تھے۔ ہم میں سے ہر شخص کا بیان پڑھ جائیے ہم نے ایسا کوئی الزام نہیں لگایا لہٰذا جو مواد رپورٹ میں یہ ثابت کرنے کے لیے جمع کیا گیا ہے کہ مولوی اسعد موجود ہی نہیں تھے وہ ابلہ فریبی اور مغالطہ دہی کے قبیل سے ہے۔

معمولی عقل والے بھی جانتے ہیں کہ سرغنہ یا جنرل یا سربراہ یا قائد ہر ”لڑائی“ میں بہ نفس نفیس کمان نہیں کیا کرتا۔ وہ ہزار میل دور بیٹھا ہوتا ہے اور لڑنے والے لڑتے ہیں اسی کے اشاروں پر۔ اسی کی اسکیم کے تحت۔ اسی کے مفاد کی خاطر۔ ہم لوگوں کا کہنا صرف یہ تھا اور ہے کہ جو کچھ کیا گیا وہ مقبوضہ جمعیۃ علماء کے مفاد کی خاطر کیا گیا اور اس جمعیۃ کے محور و مرکز چونکہ اسعدؔ صاحب ہیں اس لیے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اسعد صاحب کے لیے کیا گیا۔

وفد مولوی اسعد کی غیر حاضری تو ثابت کرتا ہے؛ لیکن کیا وہ ان اساتذہ کی غیر حاضری بھی ثابت کرسکتا ہے جو کھلّم کھلا اسعدؔ صاحب کے لیے کام کرتے ہیں۔

جلسے سے کچھ روز قبل اسعد صاحب دیوبند آئے تھے۔ کیا استحالہ ہے اس میں کہ وہ اپنے خدمت گزاروں کو فقط اتنا درس دے گئے ہوں کہ مجلسِ مشاورت کا جلسہ کامیاب نہ ہونے دینا اور خدمت گزاروں نے تفصیلی اسکیم خود وضع کرلی ہو۔

نیز شیخ الحدیث مولانا فخر الدین تو دیوبند میں موجود ہی تھے۔ وہ مولوی اسعدؔ صاحب ہی کے گھر رہتے ہیں، وہیں کھاتے ہیں۔ مقبوضہ جمعیۃ علماء کے صدر بھی ہیں۔ اور ان کی صدارت کا حاصل وصول ظاہر ہے کہ اسعد صاحب ہی کے مفاداتِ خاص کا تحفظ ہے۔ لہٰذا کوئی بعید نہیں کہ ایک ایسی جماعت کے جلسے کو جس کی کامیابی سے اسعد میاں کو نقصان اور صدمہ پہنچتا ہو ناکام بنانے کی کوشش میں انھوں نے بھی کوئی ذہنی رہنمائی خادمانِ خاص کو دی ہو۔

یہ ہمارے قیاسات ہیں دعوے نہیں۔ افتراء پردازی پر خدا کی لعنت ہو۔ مگر جو قیاسات گوناگوں شواہد و دلائل سے مربوط ہوں انھیں افترا کون کہے گا۔

تنقیح (۱۱)

”طلباء کے نعرے کیا تھے۔“

اس ذیل میں باوجود اینچ پینچ کے یہ اعتراف موجود ہے کہ مفتی عتیق الرحمٰن مردہ باد۔ مولانا منظور نعمانی مردہ باد اور مولانا اسعد کو مجلسِ شوریٰ میں شامل کرو کے نعرے لگائے گئے۔

گو آخری نعرے سے بظاہر انکار ہی ہے۔ فرمایا جاتا ہے کہ:

> ”عام طلبہ کے بیان کے مطابق مولانا اسعد مدنی کو مجلسِ شوریٰ میں شامل کرو کا نعرہ نہ تو لاؤڈ اسپیکر سے لگایا گیا نہ مہمان خانے پر کہا گیا۔“

لیکن قاضی عدیل عباسی ایڈوکیٹ سے پوچھئے قانونی اعتبار سے اس عبارت میں مذکورہ نعرے کے صرف محل و مقام سے انکار ہے نہ کہ خود نعرے سے۔ اگر نعرہ نہ لگایا گیا ہوتا تو صاف یوں کہا جاتا کہ ایسا نعرہ بالکل نہیں

لگایا گیا؛ مگر لاؤڈ اسپیکر اور مہمان خانے کی تخصیص کے ساتھ انکار گویا اعتراف ہے اس بات کا کہ یہ نعرہ کہیں نہ کہیں لگا ضرور ہے۔

جب اعتراف کر ہی لیا گیا تو اب اس دروغ بافی سے کیا فائدہ کہ عام طور پر یہ نعرہ نہیں لگایا گیا۔

پھر یہ اعتراف تو رپورٹ میں صریحاً ہی کیا گیا ہے کہ ''نعمانی صاحب اور مفتی صاحب کو شوریٰ سے نکالا جائے کا نعرہ ضرور رہا''، لیکن حسبِ عادت اس نعرے کو بھی جواز دینے اور طلباء کو مظلوم ٹھیرانے کی سعی نامشکور کی گئی ہے۔ ہم پوچھتے ہیں اگر اسعد پارٹی نے طلباء میں بغاوت اور جسارت کا زہر نہیں بھرا تھا تو طلباء کی زبان پر اس طرح کے نعروں کا آنا کیا نفسیاتی جواز رکھتا ہے۔ انھیں کیا بحث کہ کون ممبر رہے اور کون نکلے۔ یہ تو کوری غلط بیانی ہے کہ طلبہ اس لیے مشتعل تھے کہ نعمانی صاحب اور مفتی صاحب انھیں پٹتا دیکھتے رہے اور مارنے والوں کے آڑے نہ آئے۔ اس غلط بیانی کو بنیاد بنا کر جو بھی منطق بگھاری جائے گی لغو ہی ہوگی۔ پھر آخر طلباء کو کیا لڈو مل رہے تھے کہ فلاں فلاں ممبر مجلسِ شوریٰ سے نکالے جائیں۔

تنقیح (۱۲)

''کیا طلبہ کے باہمی اختلاف کو بھی اس ہنگامے میں دخل تھا۔''

اس کے ذیل میں بعض باتیں تو ایسی کہی گئی ہیں جن کے حسن و قبح اور صحت و عدم صحت کو اربابِ دارالعلوم ہی جان سکتے ہیں۔ ہم فقط ایک ایسے جزو پر گفتگو کریں گے جو وفد کی جودتِ طبع اور صلاحیتِ تصنیف کا شاہکار ہے۔

یہ واقعہ متعدد بیانات میں سامنے آچکا ہے کہ ۱۴/اکتوبر سے قبل مدرسے میں باقاعدہ دستخطی مہم چلی کہ اسعد صاحب کو مجلسِ شوریٰ کا ممبر بنایا جائے۔ چنانچہ اس رپورٹ میں بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ اس مطالبے کے محضر پر تقریباً ایک ہزار طلبہ کے دستخط ہو گئے۔

لیکن اس حرکت کا جواز وفد نے کس طرح پیدا کیا ہے یہ ہے سننے کے قابل۔ وہ جمعیۃ الطلباء کے صدر جناب احسان اللہ کی طرح طرح سے تنقیص و مذمّت کرنے کے بعد کہتا ہے کہ:

> ''موصوف نے سادہ کاغذ پر طلبائے دارالعلوم سے تقریباً چارسو دستخط لے کر ان کو استعمال کرنے کی بھی کوشش کی کہ مولانا سید اسعد صاحب کو مجلسِ شوریٰ دارالعلوم کا ممبر نہ بنایا جائے اگر ان کو ممبر منتخب کیا گیا تو طلبہ ہڑتال کر دیں گے (جبکہ یہ دستخط طلبہ سے یہ کہہ کر لیے گئے تھے کہ دارالعلوم میں طلبہ کو ہفتہ میں ایک دن پلاؤ دیئے جانے کا مطالبہ کیا جائے گا (مشترکہ بیان ۱۲ طلبہ) اس کوشش سے طلباء میں سخت برہمی پیدا ہوگئی اور انھوں نے ہنگامے سے چار دن پہلے خود اس غلط

کوشش کے دفاع کے لیے طلباء سے اس مضمون پر کہ مولانا اسعد کو مجلسِ شوریٰ کا ممبر بنایا جائے دستخط لینا شروع کر دیئے۔"

ہم تمام اہلِ ہوش سے پوچھتے ہیں کہ کیا کبھی انھوں نے ایسی دستخطی مہم بھی دیکھی ہے جس میں مطالبہ تو محض زبانی بیان کیا جارہا ہو اور دستخط سادہ کاغذ پر لیے جارہے ہوں۔ دو چار دس پانچ نہیں بلکہ چارسو طلباء اتنے احمق اور فاطرالعقل کیسے ہوگئے کہ احسان اللہ صاحب کے سادہ کاغذ پر تو دستخط کرتے چلے گئے مگر یہ نہیں پوچھا کہ پلاؤ والا مطالبہ کاغذ پر لکھا کیوں نہیں ہے زبانی کس لیے بتایا جارہا ہے۔

یہاں ہمیں پھر قاضی عدیل عباسی کی یاد آئی۔ ذرا ان سے تو کوئی پوچھے کہ ہائیکورٹ کی کوئی نظیر کیا اس کہانی کے حق میں بھی ہے جو نام نہاد وفد نے احسان اللہ صاحب سے منسوب کی ہے۔ کیا دنیا کی کوئی عدالت اسے باور کرسکتی ہے کہ چارسو طلبہ ہفتے میں ایک بار پلاؤ کی فقط زبانی نوید پر اس درجہ مست و بے خود ہوگئے کہ کورے کاغذ پر دستخط کرتے چلے گئے اور یہ نہ پوچھا کہ کاغذ آخر سادہ کس لیے ہے پلاؤ کا نقش اس پر کیوں نہیں بنایا گیا؟

سنئے ہم بتاتے ہیں واقعہ کیا تھا:

پانچ ماہ قبل یعنی صفر کے مہینے میں احسان اللہ صاحب نے ایک درخواست لکھی تھی جس میں ہفتے میں ایک بار پلاؤ کی آرزو کے علاوہ بعض اور "آرزوئیں" بھی بطورِ گزارش درج کی گئی تھیں اور اس پر طلبہ کے دستخط حاصل کیے گئے تھے یہ درخواست اہتمام میں گئی اور ابھی تک وہیں ہے۔ اس کے سلسلہ میں نہ تو سادہ کاغذ پر دستخط کا کوئی سوال تھا نہ یہ تازہ واقعہ تھا۔ پانچ ماہ بعد مولوی اسعد کی ممبری والی دستخطی مہم کا جواز اس درخواست کے حوالے سے لانا ایک ایسی بوکھلاہٹ ہے جو صریح طور پر ثابت کرتی ہے کہ وفد کوئی قابلِ فہم توجیہہ دستخطی مہم کی نہیں کر پارہا ہے اور اسے احساس ہے کہ اگر اس کی توجیہہ نہ کی جاسکی تو منصوبہ بند سازش کا اخفا مشکل ہوجائے گا۔ اسی احساس کے تحت وہ صریح جھوٹ اور بارد تاویلات کا سہارا لے رہا ہے۔

تنقیح (۱۳)

(واضح رہے کہ رپورٹ کے آغاز میں تنقیحات کی فہرست ۱۲ تک ہے اور یہ تیرہویں تنقیح جداگانہ نہیں دی گئی ہے)

"جماعتِ اسلامی کے متعلق علماءِ دیوبند کے خیالات اور مجلسِ مشاورت کا تجزیہ"۔

اس تنقیح کے ذیل میں اہلِ وفد کا حقیقی ذہن اُبھر کر سامنے آگیا ہے۔ فرمایا جاتا ہے کہ:

"یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ مجلسِ مشاورت، جماعتِ اسلامی علیٰحدگی پسند ذہنیت اور رفرقہ پرست و رجعت پسندانہ خیالات رکھنے والوں کا مشترکہ محاذ ہے۔"

بجا فرمایا۔لیکن اہلِ وفد شاید بھول گئے کہ جن سنگھ اور ہندومہاسبھا وغیرہ کے نزدیک تو یہ حقیقت بھی بالکل واضح اور قطعی ہے کہ تمام کے تمام مسلمان فرقہ پرست اور رجعت پسند ہیں۔بلکہ اسلام ہی سراپا فرقہ پرستی، رجعت پسندی اور لغویات کا مجموعہ ہے۔صاف سی بات ہے کہ جو جتنا زیادہ کفر کے قریب ہوگا، اُسے اسی درجہ میں اسلامی تعلیمات اور اسلامی سیاست، رجعت پسندی اور فرقہ پرستی سے لبریز نظر آئے گی۔ اربابِ وفد اگرچہ کافر تو نہیں ہیں لیکن اہلِ کفر کی صحبت اور نیاز مندی نے ان کے ذہنوں میں اپنے بہت سے اثرات و داعیات ضرور جذب کئے ہیں چنانچہ انھی اثرات و داعیات کے تحت ان کا جماعتِ اسلامی کو فرقہ پرست اور رجعت پسند سمجھنا اور کہنا بالکل قدرتی ہے جس پر نہ حیرت کی ضرورت نہ شکایت کا موقع۔ان حضرات کے ذہنی خنّاس کا یہ عالم ہے کہ ہندوستان کے جانے پہچانے قوم پرست شاعر علامہ انورؔ صابری کے صاجزادے اظہرؔ صابری نے جب ان کے سامنے ہنگامے کے صحیح حالات رکھے اور ان غلط گوئیوں کی تردید کی جنھیں یہ لوگ درست منوانے پر تلے ہوئے تھے تو انھوں نے چیں بہ جبیں ہوکر کہا کہ آپ تو مسلم لیگی معلوم ہوتے ہیں۔

گویا جو بھی شخص یا گروہ ان حضرات کے مکر کا شکار نہ ہو یا ان کی مجہول قوم پروری اور ترقی پسندی کے سُر میں سُر نہ ملائے وہ مسلم لیگی، فرقہ پرست، رجعت پسند۔

وفد نے اس تنقیح کے ذیل میں جمعیۃ کا رٹا رٹایا قصیدہ بھی پڑھا ہے۔استعمار، سامراج، سوشلزم اور سیکولرازم کی نام نہاد اصطلاحیں بھی طوطے کی طرح رٹی ہیں۔قاضی عدیل عباسی ہی بتائیں کہ کیا ہائی کورٹ کی کوئی نظیر یا سپریم کورٹ کا کوئی قانون اس کی اجازت دیتا ہے کہ انکوائری کرنے والا کوئی وفد غیر متعلق اور بے محل بحثیں چھیڑ کر اصل واقعے کو غدر بود کرے اور ایک فریق معاملہ کے خلاف ذہنوں کو اُبھارے اور دوسرے فریق کے گُن گائے۔

مزید گل افشانیاں ڈاکٹر فریدی کے بارے میں کی گئی ہیں۔ان سے یہاں بحث نہیں، آخر میں اُس پوسٹر کو بھی پورا کا پورا نقل کیا گیا ہے جس کی حقیقت ہم پچھلے تجلّی میں ''دو پوسٹر'' کے عنوان سے واضح کر چکے ہیں۔آج بھی یہ چیلنج اپنی جگہ برقرار ہے کہ اس پوسٹر کے اسّی فیصدی نام بوگس ہیں اور اس چیلنج میں وہ دو صاحبان بھی شریک ہیں جنھوں نے جوابی پوسٹر میں بتایا تھا کہ ہم سے کس طرح دھوکا دے کر دستخط لیے گئے۔

منھ بولتا جھوٹ

جملہ تنقیحات پر تبصرہ تو ہوگیا۔اب ایک اور لطیفہ سنئے۔اسی رپورٹ میں صفحہ دو پر یہ لکھا گیا ہے کہ اہلِ وفد کی طرف سے:

''بیان لینے سے قبل طلبہ کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ بیان صرف ارکانِ کمیشن یا جمعیۃ کے ذمہ داروں

کے علم میں رہے گا کسی بیان دینے والے طالبِ علم کا نام ظاہر نہ کیا جائے گا تا کہ طلبہ بیان دیتے ہوئے کوئی دقت اور تامل محسوس نہ کریں۔"

مگر عمل یہ ہے کہ الجمعیۃ اور بے باک میں شائع کرائی ہوئی تجاویز کے ساتھ بیان دینے والوں کی فہرست میں چار طالبِ علموں کا نام صریحاً دے دیا گیا ہے۔

ان میں سے ایک طالبِ علم خود راقم الحروف سے کہہ رہا تھا کہ صاحب عجیب لوگ ہیں ہم سے قسم کھا کر یہ وعدہ کیا تھا کہ نام نہیں ظاہر کئے جائیں گے؛ مگر وہ تو اخباروں میں بھی چھپوا دیے گئے۔ راقم الحروف نے جواب دیا کہ بھائی کن مسخروں کا ذکر کرتے ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ فتوے دیتے ہیں سنیما کی حرمت کے؛ مگر اشتہار چھاپتے ہیں فلم اسٹاروں کی، آنکھیں پہچاننے کے جنھیں برسرِ محراب و منبر ڈنکے کی چوٹ حرام کاری میں حیا اور تامل نہ ہو وہ قسموں اور وعدوں کو کس گنتی میں لائیں گے۔

قاضی عدیل عباسی ہی بتا سکتے ہیں کہ کیا ہائیکورٹ کی کوئی نظیر اس بدکرداری کا جواز بھی مہیا کرتی ہے کہ طلبہ سے وعدے تو کئے جائیں اِخفا کے مگر اگلے ہی دن اخباروں کو ان کے نام بھیج دیئے جائیں۔

شرارت در شرارت یہ کہ جن طلبہ نے واقعات کو وفد کی خواہش کے مطابق بیان نہیں کیا انھیں وفد نے بلا تکلف "حامیانِ مشاورت" کے خانے میں درج کر دیا۔ گویا جھوٹ بول کر مشاورت والوں کو ظالم ٹھیراؤ تب تو تم نیک بچے ہو۔ سچ بولے تو پکے مشاورتی اور فرقہ پرست۔ خوب ہے یہ انصاف۔ شاید ایسے ہی احوال سے متأثر ہو کر ڈاکٹر اقبال کو کہنا پڑا تھا کہ ؎

یہی شیخ حرم ہے جو چُرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؒ و چادرِ زہراؓ

(تجلی دسمبر ۱۹۶۶ء)

....

قارئین! آج ۲۰۱۸ء میں ۵۲ سال گزر جانے کے بعد بھی جمعیۃ علماء ہند کا یہی حال ہے جو درج بالا تحریر میں بیان کیا گیا ہے۔ اِن نام نہاد قائدین کی ہاں میں ہاں ملاتے رہو تو تم مسلمان ہو اور اگر ان کے خلاف ہو کر سچائی اور دیانت کا ساتھ دے دیا تو ایمان سے خارج۔ درج بالا حقائق پڑھنے کے بعد کیا ایسا نہیں لگتا کہ جمعیۃ علماء ہند بھی مسلمانوں کی بی جے پی ہے۔ جیسے مودی اور بی جے پی کی طرف داری کرو تو تم دیش بھکت؛ ورنہ دیش دروہی۔ بس یہ سمجھ لیجیے اُس وقت مولوی اسعد مدنی ؒ کا حال بالکل یہی تھا جو اس وقت مودی کا ہے۔

جھوٹ، دھوکا، مکر و فریب اور غصب و ظلم ایسا کوئی عنوان نہیں ہے جو اِس وقت کے مودی اور اُس وقت کے مولوی اسعد میں مطابقت نہ رکھتا ہو۔

جس طرح مودی نے حکومت پہ قبضہ کرنے کے لیے جھوٹ، جبر، ظلم اور عیاری کو وطیرۂ حیات بنایا ہے، اسی طرح مولوی اسعد نے بھی مسند ہتھیانے کے لیے ہر طرح کے غیر اخلاقی ہتھکنڈے اپنائے تھے جس کی تفصیل آپ کے سامنے چمکتے سورج کی طرح آچکی ہے۔ درج بالا وفد کی رپورٹ کا حال آپ نے دیکھ ہی لیا کس قدر جھوٹی رپورٹ مولوی اسعد کے خوشہ چینوں نے بنائی تھی، بالکل اسی طرح دارالعلوم کی جدید تاریخ لکھی گئی ہے۔ اس میں بھی جھوٹ، افترا اور فریب دہی کی وہی روش شامل ہے جو مولوی اسعد صاحب یا مقبوضہ جمعیۃ علماء ہند کے محبّین و معتقدین کا مزاج بن چکی ہے، اسی لیے گزشتہ صفحات میں ہم نے مولوی اسعد کو بلا وجہ ہی سفاک و جابر نہیں لکھ دیا۔

خیر! اللہ غریق رحمت کرے، بڑی تکلیف پہنچائی ہے اُنھوں نے اللہ کے نیک اور قابل قدر بندوں کو۔ آئیے موصوف کی ریشہ دوانیوں کا قصہ ابھی باقی ہے۔

حقائق۔۔۔۔جنھیں جھٹلایا جارہا ہے

(۱)

ڈاکٹر فریدی نے اپنے بیان میں کہا تھا: ''ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ اسعدؔ میاں صاحب نے دارالعلوم کے طلبہ کی ایک تعداد کے لیے کچھ امدادی وظیفے مقرر کر رکھے ہیں۔''

مولوی اسعد صاحب ۲۰ر نومبر کے الجمعیۃ میں جواب دیتے ہیں کہ ''میں نے کوئی امدادی وظیفہ وغیرہ نہیں جاری کر رکھا ہے۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔''

سچائی کیا ہے۔ اسے بھی سنئے۔ ہر سال اسعدؔ صاحب کی طرف سے بہتیرے طلباء کو کھانا جاری کرایا جاتا ہے۔ جن کی تعداد بعض مرتبہ ستر تک ہوئی ہے۔ سالِ رواں میں ۳۲ رہی۔ نام بہ نام پوری فہرست ہمارے سامنے ہے۔ کوئی بھی آدمی دارالعلوم کے متعلقہ شعبے سے تحقیق کر سکتا ہے کہ سالِ رواں میں ۳۲ لڑکوں کو ان کی طرف سے کھانا جاری رہا یا نہیں۔ نظام العمل یہ ہے کہ کھانے کے ضرورت مند طلباء درخواست اسعد صاحب ہی کے یہاں دیتے ہیں اور پھر دارالعلوم کے ایک مدرس جو اسعد صاحب کے معتمدِ خاص ہیں اپنی صوابدید سے منظوری یا نامنظوری فرما کر واجب رقم کی ادائیگی کرتے ہیں۔

اب مولوی اسعد صاحب اگر یہ کہیں کہ تردید تو میں نے وظائف کی کی ہے نہ کہ کھانے کی تو یہ تمسخر ہوگا۔ الزام کا تعلق امداد کی شکل و ہیئت یا لغوی نوعیت سے نہیں ہے؛ بلکہ نفس امداد سے ہے۔ جو افادیت نقد وظیفے کی ہو سکتی ہے وہی طعام کی بھی ہو سکتی ہے اور اگر وہ یہ کہیں کہ کھانا میں اپنی جیب سے نہیں دیتا بلکہ بعض اہلِ خیر اسی مد کے لیے مجھے بالمقطع دیتے ہیں اور میں فقط ایک واسطہ ہوں۔ تو یہ بھی عذرِ لنگ ہوگا۔ طلباء نہیں جانتے کہ اصل معطی کون ہے۔ وہ تو مولوی اسعدؔ ہی کو محسن و معطی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ثوابِ آخرت کہیں بھی جائے ثوابِ دنیا بہر حال مولوی اسعد کے حصے میں آیا یہی مطلب تھا، فریدی صاحب کے قولِ مذکورہ کا۔ پھر بھلا مولوی اسعد صاحب کی تردید کو حقائق کے جھٹلانے کی سعی نامشکور کے سوا کیا کہا جائے گا۔

(۲)

مقبوضہ جمعیۃ علماء کے نام نہاد وفد کی رپورٹ کہتی ہے کہ طلبہ نے:

''غصہ و اشتعال میں تختے اُٹھا کر جھنڈیاں توڑیں، بندروال توڑے، کچھ سامان کو بھی نقصان

پہنچایا اور جلانے کی کوشش کی مگر زیادہ یا کوئی خاص نقصان نہیں پہنچ سکا۔"

مگر صورتِ واقعہ کیا ہے۔ یہ مختصر اُسنئے:

جلسے میں شامیانے اور متعلقہ سامان لانے والے کرم فرمانے"شری عامر عثمانی" کے نام اپنے وکیل سے جونوٹس بھجوایا ہے اس میں نقصان کا مطالبہ مع مبینہ تفصیلات تیرہ سو اِکیانوے روپیے (۱۳۹۱) کا ہے۔

لاؤڈ اسپیکر اور برقی روشنی کا انتظام کرنے والوں نے باقاعدہ نوٹس کے ذریعے مطالبہ اٹھارہ سو سرسٹھ (۱۸۶۷) کا کیا ہے۔

گیس کی لالٹینیں (جو اس لیے مہیا کی گئی تھیں کہ بعض مرتبہ دفعتاً بجلی فیل ہو جاتی ہے تو احتیاطاً لالٹینیں تیار رہیں بھیجنے والے بزرگ نے ۲۷۳ روپے مانگے ہیں۔

اس طرح یہ کل رقم ۳۵۳۱ ہو جاتی ہے جسے شری عامر عثمانی سے بذریعہ عدالت وصول کرنے کے عزائم نوک پلک درست کر رہے ہیں۔

جوتے بھی دس بارہ جوڑی سے کم گم نہ ہوئے ہوں گے ایک بیگ بھی گم ہوا جس میں نقد ساڑھے تین سو تھے اور خود بیگ اپنے مخصوص ساز و سامان سمیت سو روپے سے کم کا نہ ہوگا۔

پھر دہلی، لکھنؤ، بہار اور مدراس تک کے جو مہمان اسی جلسے کے لیے آئے تھے ان کی آمد و رفت پر کیا مصارف آئے ہوں گے ان کا بھی اندازہ کر لیجئے۔ ماتم و فریاد ہرگز نہیں۔ نفع و نقصان تو دنیا میں چلتا ہی ہے۔ مگر چہرہ ان خوش جمالوں کا دیکھئے جو ثالث بالخیر بن کر کہہ رہے ہیں نقصان کوئی خاص نہیں ہوا۔

(۳)

نام نہاد وفد بھی کہتا ہے اور مولوی اسعد بھی کہتے ہیں کہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے چوٹ نہیں لگی۔ انھیں اگر برائے نام سی چوٹ آئی بھی ہوگی تو گرنے سے یا کسی دیوار سے ٹکرا جانے سے آئی ہوگی۔

لیکن دہلی کے معروف ڈاکٹر C.L. SABHA RW AL. D.T.M. Puysician. SURGEON اپنی 15 راکتوبر کی باقاعدہ رپورٹ میں کیا کہتے ہیں۔ اس کی مصدقہ نقل ملاحظہ ہو:

(۱) جمجمہ (کھوپڑی) کے داہنی جانب کنپٹی پر ۲½ × ۱ انچ رض (گومڑ)۔

(۲) پشت پر لاٹھی کی نیلاہٹ مائل سُرخ چوٹ ۴½ × ۱ انچ لمبی اور ایک انچ چوڑی۔ رُخ مستعرض۔

(۳) کمر پر نیلاہٹ ۱½ انچ، ورم جو چوبیس گھنٹے سے ہے۔

تمام جراحتیں غیر دھاردار آلوں سے لگی ہیں۔ ڈنڈا، اسٹک، لاٹھی اور پتھر وغیرہ۔ (انگریزی سے ترجمہ)

(ماہنامہ تجلی دیوبند دسمبر ۱۹۶۶ء)

دارالعلوم دیوبند کا ہنگامہ

مجلسِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند کا فیصلہ

دیوبند ۲۳؍شعبان ۱۳۸۶ھ کو دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کا ششماہی اجلاس منعقد ہوا جس میں ایک بزرگ کے سوا جو اپنی علالت کی وجہ سے شریک نہیں ہوسکے بقیہ تمام اراکین نے جلسہ میں شرکت فرمائی۔ مجلس کے ایجنڈہ میں اہم ترین موضوع، حالیہ افسوسناک ہنگامہ تھا۔ جو ۱۴؍ ۱۵؍اکتوبر کو شہر اور دارالعلوم میں پیش آیا۔ مجلس کا زیادہ وقت اسی ہنگامے کے سلسلے میں تحقیق وتفتیش اور پرس وجو میں صرف ہوا۔ چونکہ یہ ہنگامہ دارالعلوم کی شاندار روایات اور اس کے روایتی ذوق کے خلاف اور ان پر ایک کاری ضرب تھا، اس لیے مجلس نے اسے شدّت سے محسوس کرتے ہوئے اس بارے میں اپنی مفصل تجویز مرتب کی جو ذیل میں بلفظہٖ دی جارہی ہے۔

اُمید ہے کہ بہی خواہانِ دارالعلوم کو اس ہنگامے سے جو بے چینی اور تشویش لاحق ہوئی اور انھوں نے خطوط اور تاروں کے ذریعہ اس کا اظہار فرمایا انھیں مجلسِ شوریٰ کی اس تجویز سے اطمینان ہوجائے اور وہ بدستور اپنے اس علمی، مرکزی اور دینی ادارے کی خدمت میں سرگرمِ عمل اور اعانت میں گرمجوشی کے ساتھ حصہ لیتے رہیں گے۔

(محمد طیب۔ مہتمم دارالعلوم دیوبند)

(الف) دارالعلوم دیوبند خالص تعلیمی اور تربیتی ادارہ ہے جس کا وظیفہ عمل ہر قسم کی عملی اور اختلافی سیاسیات اور جماعتی کش مکش سے علیحدہ رہنا اور اس قسم کے خارجی اثرات سے اپنے کو محفوظ رکھ کر اپنے اکابر اور اسلاف کے طرز پر طلباء کو تعلیم وتربیت دینا ہے تمام مدرسین، منتظمین، طلبا اور ملازمین دارالعلوم دیوبند کا اہم اور اوّلین فریضہ ہے کہ وہ ادارے کے مذکورہ بالا مقصد کو ہمہ وقت پیش نظر رکھیں اور اپنی زندگی کو اسی مقصد کے تحت ڈھالیں اور کوئی قدم بھی اس کے خلاف نہ اُٹھائیں۔

(ب) شوریٰ نے اس امر واقعہ کو اطمینان کے ساتھ نوٹ کیا کہ اس پورے ہنگامے میں طلبہ کی معتدبہ تعداد نے عملاً کوئی حصہ نہیں لیا اور شریک ہونے والے طلبہ میں بڑی تعداد وہ تھی جو غلط اور مبالغہ آمیز خبروں کی بناء پر مشتعل ہوئی اور وقتی طور پر جذبات کی رَو میں شریک ہنگامہ بنی۔ اس کے باوجود چار دنوں کے اس پورے ہنگامہ

میں طلبہ کے ایک گروہ نے ایسا کردار ادا کیا جس نے دارالعلوم کی علمی و دینی روایات اور عظمت و وقار کو بے حد نقصان پہنچایا ہے اور خاص کر چند معزز مہمانوں کی موجودگی میں طلباء نے جو کچھ کیا اور اس سے مہمانوں نے جو بے اطمینانی اور اذیت محسوس کی نیز تعلیمی مقاطعہ، دفاتر کی جبری بندش، اساتذہ اور منتظمین دارالعلوم کی نافرمانی کے جو واقعات پیش آئے وہ نہ صرف یہ کہ ان کی شان اور ان کے منصب کے خلاف تھے بلکہ حد درجہ تکلیف دہ اور لائق نفرت تھے۔ بالخصوص اپنے دو اکابر مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اور مولانا منظور نعمانی جو دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کے معزز رکن بھی ہیں اور ان میں بھی خاص کر حضرت مفتی صاحب کے ساتھ جسمانی اور روحانی اذیت رسانی کا جو سلوک کیا گیا وہ انتہائی تکلیف دہ ہونے کے ساتھ حد درجہ مذموم اور لائق شرم ہے اور اس نارَوا حرکت نے ان طلبہ کو جو اس میں آلودہ ہیں اخلاقی گراوٹ کی آخری منزل پر پہنچا دیا ہے۔شوریٰ معزز ارکان کی توہین و اذیت کو اپنی توہین و اذیّت محسوس کرتی ہے اور ضروری سمجھتی ہے کہ ان طلبہ کو جنھوں نے ارکانِ شوریٰ کو اذیت پہنچائی ہے قرار واقعی سزادی جائے اور حضرت مہتمم صاحب اور حضرت صدر المدرسین مدظلہما کو اختیار دیتی ہے کہ پوری تحقیق کے بعد مناسب تادیبی کارروائی کریں۔

(ج) باقی وہ طلباء جو غلط خبروں سے مشتعل ہو کر ایک بحرانی کیفیت میں یہ غلطی کر بیٹھے شوریٰ ان کے لیے اتنا کافی سمجھتی ہے کہ وہ آنے والے سال کی تعلیم شروع ہونے سے پہلے تحریری اظہارِ افسوس و ندامت کریں اور آئندہ کے لیے اس طرح کی غلط روی سے اجتناب کا اطمینان دلائیں۔

(د) مجلسِ شوریٰ دارالعلوم کو اس کا علم ہوا کہ ۱۶/اکتوبر کو جلسۂ مشاورت کے موقعہ پر کچھ لوگوں کو چوٹیں آئیں اور زخمی ہوئے شوریٰ تمام مجروحین کے ساتھ اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتی ہے اور کسی بھی طرف سے ہونے والی ایسی حرکتوں کو جن سے لوگ مجروح ہوئے حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے بالخصوص مجلسِ شوریٰ کو اس امر واقعہ سے غیر معمولی صدمہ ہوا کہ اس ہنگامہ میں کچھ طلباء بھی مجروح ہوئے اور ان میں چند کو ہسپتال پہنچانا پڑا۔ شوریٰ طلباء کو اپنا عزیز تصور کرتی ہے اور ان کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتی ہے اور اپنی دلی ہمدردی کی یقین دہانی کے ساتھ طلباء سے اپیل کرتی ہے کہ وہ مستقبل میں ہنگامی مواقع سے مکمل اجتناب کریں۔

(ہ) رپورٹوں اور بیانات سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ اس ہنگامہ میں بواسطہ یا بلاواسطہ بعض مدرسین و ملازمین دارالعلوم بھی شریک ہوئے مجلسِ شوریٰ حسبِ ذیل حضرات پر مشتمل سہ نفری کمیٹی بناتی ہے جو مدرسین و ملازمین کی ہنگامہ میں شرکت و عدمِ شرکت کی پوری پوری تحقیق کرے اگر کمیٹی کسی کی شرکت پر مطمئن ہو جائے تو اسے حضرت مہتمم صاحب شوریٰ کے آئندہ اجلاس تک کے لیے معطّل فرماویں اور پھر مجلسِ شوریٰ کمیٹی کی رپورٹ کی روشنی میں اسے قرار واقعی سزا دے۔

(و) مجلسِ شوریٰ مستقبل میں اس طرح کے ہنگاموں کو ختم کرنے کے لیے یہ بھی ضروری سمجھتی ہے کہ طلباء کا کسی مسئلہ کو اجتماعی رنگ دے کر تحریک کی شکل میں اُٹھانا مثلاً تعلیمی مقاطعہ کرنا، دفاتر کو بند کرانا یا اسی قسم کی کوئی دوسری حرکت ممنوع قرار دی جائے۔ لہٰذا مجلسِ شوریٰ اسٹرائک وغیرہ کو ممنوع قرار دیتی ہے جس کے مرتکب کو اخراج تک کی سزا دی جاسکتی ہے۔

(ز) مجلسِ شوریٰ کو تحقیق کے بعد یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ دارالعلوم کے لاؤڈ اسپیکر کو شہری جلسہ میں ناجائز استعمال کے بارے میں بعض ملازمین دارالعلوم پر جو الزام تھا وہ تحقیق کے بعد بالکل غلط ثابت ہوا۔

ارکانِ کمیٹی

مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا فضل اللہ صاحب اور مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب

(ماہنامہ تجلی جنوری ۱۹۶۷ء)

.....❖.....

تو قارئین! یہ تھی حقیقت جو آپ نے ماہنامہ تجلی کے حوالے سے پڑھی۔ دیکھ لیجئے اقتدار کی ہوس، مسند کا شوق اور حاکمیت کا جذبہ انسان کو کس قدر اخلاقی پستی کی طرف لے جاتا ہے۔ سیاست کا وہ کون سا حربہ ہے جو خود ساختہ فدائے ملت نے جمعیۃ اور دارالعلوم پہ قبضہ کرنے کے لیے استعمال نہ کیا ہو، گزشتہ صفحات میں تمام تر حقیقت آپ کے سامنے آئینہ ہوگئی ہے کہ کیسے مولوی اسعد صاحب نے جھوٹ فریب دجل اور الزام تراشی جیسے ہر ایک بُرے سے بُرے عمل کا سہارا لے کر جمعیۃ علماء ہند پہ قبضہ کیا۔

....

درج بالا تمام مضامین کے بعد ہم یہاں دو باتوں پر کلام کرنا ضروری سمجھتے ہیں؛ کیونکہ مجبوری ولاچاری کے علاوہ جس شخصیت پرستی میں ذہنی غلام ہو کر اس وقت امتِ مسلمہ کا ایک بڑا طبقہ زندگی گزار رہا ہے اس میں تو یہی توقع ہے کہ کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں جو سچ بول سکے۔ اور سچ بھی ایسا جو دورِ حاضر کی سب سے بڑی مسلم جماعت کے سربراہ کے چہرے پر پڑی نقاب ہٹانے کا کام کرتا ہو۔ یہ نقاب بھی صرف جدید نسل کے لیے ہے، ورنہ قدیم لوگ تو آج بھی زندہ ہیں جو ملّت خور بزرگ کی ہر ہر ادا سے واقف ہیں، نئی نسل کے سامنے تو ایک سفاک وعیار سیاسی لیڈر کو فرشتہ صفت بنا کر امیر الہند اور فدائے ملّت جیسے بے سود و بے وقعت القاب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ آئیے! ہم اپنی بات پیش کرتے ہیں:

پہلی بات

ہمیں عرض یہ کرنی ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو ایک صاف ستھری اور مرنجا مرنج زندگی گزارنے کی تلقین کی ہے۔ کوئی بھی مسلمان خود کتنا بھی خوش حال رہے، کسی بھی مسند پہ رہے، لیکن اُسے یہ حق بہر حال نہیں ملتا کہ وہ دوسروں کی حق تلفی کرے یا فقط اپنا دبدبہ قائم کرنے کے لیے جبر و تشدد اختیار کر کے دیگر اَمن پسند باشندوں یا جماعتوں کو تکلیف پہنچائے۔

آپ بھی بلاشبہ ہماری اِس بات سے متفق ہوں گے، آج ساری دنیا اسی لیے جنگ کا میدان بنتی جا رہی ہے؛ کیونکہ ہر کوئی سب سے بڑا، سب سے طاقتور بننا چاہتا ہے۔ سُپر پاور بننا چاہتا ہے۔ لیکن ظلم وستم اور بربریت کا سہارا لے کر حاصل کی گئی قیادت وحکومت کیا اسلام کے نزدیک قابلِ تحسین یا قابلِ قبول ہے؟ بے شک نہیں ہے۔

اگر آپ معاشرے میں کسی سرکردہ فعال رکن کی حیثیت سے معروف ہیں تو آپ اپنے معاشرے اور اپنے حلقے میں مزید سے مزید اصلاحات وترقیات کی فکر کرتے ہوئے اسے بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ کوئی بھی انسان تمام کام نہیں کر سکتا۔ اس لیے علاقے کے حساب سے وزیر منتخب کیے جاتے ہیں۔

بات وہاں خراب ہوتی ہے جب ہر وزیر بادشاہ بننے کی فراق میں لگ جاتا ہے۔ ہر ایک کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ بادشاہ فقط ایک ہوتا ہے اور تمام عالم کے ساتھ اس دنیا کی بادشاہت بھی اللہ رب العزت کے ہاتھ میں ہے۔

لیکن انسان ایک ایسی حریص اور عجلت پسند مخلوق ہے جو آخرت کا انتظار کیے بغیر اس فانی دنیا میں ہی سب کچھ حاصل کر لینا چاہتا ہے۔

خرابی تب پیدا ہوتی ہے جب ایسے لوگ حبِّ دنیا اور اقتدار کے لیے جنگ کرتے ہیں جن کو آخرت کی فکر کرنے والا ہونا چاہئے تھا۔ جن کو اللہ کی عطا کردہ قومی رہنما کی مسند کا لحاظ رکھتے ہوئے، امت کی فلاح و بہبودی

کے لیے اقدام کرنے چاہئیں تھے؛لیکن وہ لگ گئے تجوریاں بھرنے اور اپنی آنے والی نسل کا مستقبل سنوارنے میں۔ بڑے منصب کی بڑی ذمہ داریوں کو فراموش کرکے امت کا بےوقوف بنایا جاتا رہا۔ اور امت بے چاری فریب پہ فریب کھاتی رہی۔ آج حالات ہم سب کے سامنے ہیں۔ ملک کی سب سے بڑی مسلم جماعت ''جمعیۃ علماءِ ہند'' جس کو مدنی خاندان نے اپنے گھر کی جاگیر سمجھ رکھا ہے، آج ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے کیا کر رہی ہے۔ چند قیدیوں کو رہا کراکے اور کہیں سیلاب یا زلزلے سے متاثر آبادی میں کچھ امداد تقسیم کرکے کیا مسلمانوں کی ترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے؟

کوئی بتائے کہ گزشتہ پچاس سالوں میں جمعیۃ علماءِ ہند نے کتنے ہسپتال، کتنے کالج، کتنی یونیورسٹیاں قائم کرکے مسلمانوں کے روشن مستقبل کی ضمانت کے طور پر کوئی کارنامہ انجام دیا ہو۔ جمعیۃ کا بنایا ہوا پورے ملک میں ایک بھی ہسپتال نہیں ہے جو مسلمانوں کے لیے اچھی ملازمت کے مواقع فراہم کرتا ہو۔ مرضاء کے لیے سستا اور اچھا علاج مہیا کراتا ہو۔

اُتر پردیش ہندوستان کے سب سے بڑے صوبوں میں شمار ہوتا ہے اور اسی صوبے کے قصبہ دیوبند میں جمعیۃ علماءِ ہند کے صدر و ناظم قیام کرتے ہیں؛لیکن پورے صوبے میں ایک بھی مسلم ہسپتال یا مسلم کالج نہیں ہے۔ یاد رہے کہ قوموں کی ترقی اچھی تعلیم اور مکمل صحت پر ہی منحصر ہے؛لیکن قوم کا مصنوعی دم بھرنے والے جمعیۃ علماءِ ہند کے قابض مسندنشین کو امت کی تعلیم کا خیال ہے نہ ہی صحت کا، ابھی کوئی جاکر ان سے اِس بابت بات کرے تو فوراً چوڑا سا منہ کھول کر اداکاری بھرے لہجے میں کروڑوں روپئے کے منصوبے سامنے رکھ دیں گے اور کہیں گے کہ ہم اس پر غور کر رہے ہیں۔ بہت جلد ایک ہسپتال کا سنگ بنیاد رکھا جائے گا۔ فلاں جگہ ایک یونیورسٹی کھولنے کا ارادہ ہو رہا ہے، ان شاء اللہ جلد ہی ہم امت کے لیے ایک میڈیکل کالج بھی قائم کرنے جا رہے ہیں؛مگر یہ سب باتیں ہوتی ہیں، فقط ''جملے ہوتے ہیں''۔

۱۹۷۰ کے قریب کا زمانہ ہے، جب مولوی اسعد مدنی صاحبؒ نے عوام کو ایک انگلش اخبار نکالنے کے نام پر بےوقوف بنا کے لاکھوں روپیے چندہ جمع کرلیا تھا۔ کہا یہ تھا کہ مسلمانوں کا اپنا انگریزی اخبار ہونا چاہئے، جس سے ہماری آواز پڑھے لکھے طبقے تک آسانی سے پہنچ سکے۔ خواب سنہرا تھا، اس لیے سب نے آنکھیں بند کرکے دیکھنا شروع کر دیا اور چند ہی دنوں میں لاکھوں روپے کا چندہ ملک بھر کی عوام سے وصول ہوگیا۔ (یاد رہے اُس وقت کے لاکھوں آج کے اربوں روپئے ہیں)؛لیکن ہوا کیا.....؟ ع

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم

نہ اخبار نکلا نہ ہی لوگوں کے پیسوں کا کچھ پتہ چلا۔ کیا اسی طرح قوم کی سربراہی کی جاتی ہے۔

جدید ستم

اخبار کی بات تو خیر چالیس سال پرانی ہوگئی، مسلمانوں کی خدمت اور اعانت کا دم بھرنے والے جمعیۃ کے عہدے داران کی بے رحمی اور سنگ دلی تو ۲۰۱۶ کے ستمبر، اکتوبر مہینے میں دیکھنے کو ملی۔ ہر شخص کے دل سے ایک ہی آواز آرہی تھی کہ خدا ایسے رہنما کسی قوم کو نہ دے۔ جن میں نہ بصارت ہو نہ بصیرت۔

ہوا یوں کہ ستمبر ۲۰۱۶ء میں دیوبند و اطراف میں ڈینگو اور ملیریا بخار کا ایسا قہر برپا ہوا کہ کوئی گھر بھی ایسا نہ رہا جس میں اِس وَبا نے حملہ نہ کیا ہو۔ متعدد افراد اِس مرض میں مبتلا ہو کر اللہ کو پیارے ہو گئے، جن میں جوان اور بچوں کی اکثریت تھی۔ اس وقت کے اخبارات میں روزانہ دو چار مرنے والوں کی خبر آنا عام بات ہوگئی تھی۔

ڈاکٹروں کے یہاں قدم رکھنے تک کی جگہ نہیں تھی، مرض میں شدت کے سبب دیوبند میں علاج نہیں ہو پا رہا تھا تو مظفرنگر اور میرٹھ کے ڈاکٹروں کے یہاں مریضوں کو لے جایا گیا۔ کوئی بھی مظفرنگر کے ڈاکٹر سُوریے راج ونشی کے یہاں جا کر معلوم کر لے ۲۰۱۶ء میں دیوبند کے سیکڑوں مریض فقط اِس ایک ڈاکٹر کے یہاں سے شفایاب ہوئے ہیں۔ اتنا پیسہ علاج میں لگا کہ اچھے اچھے لوگ مقروض ہو گئے۔ ایک مریض پر بیس بیس ہزار روپئے تک خرچ آیا تھا اور ہر گھر میں کم سے کم تین چار افراد تو اس مہلک بخار کی زَد میں تھے ہی۔ لوگ بیماری سے اُٹھے تو گھر کے حالات نے پریشان کیے رکھا۔ معاشی کمزوری نے سب کی کمر توڑ دی تھی۔ یہ ایسا وقت تھا جب عوام کو مدد کی سخت ضرورت تھی۔ یہ ایسا وقت تھا جب اللہ کی مخلوق امداد کی طالب بھی تھی اور حقدار بھی۔ یہ ایسا وقت تھا جب لوگوں کے گھروں کے چولہے ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ یہ ایسا وقت تھا جب بچوں کے اسکول کی فیس جمع کرنے کے لیے ماں باپ قرض بھی نہیں لے پا رہے تھے؛ کیونکہ وہ بیماری کے سبب پہلے ہی علاج کے لیے قرض لے چکے تھے۔ یہ ایسا وقت تھا جب ایک ماں کا جواں سال بیٹا اس کا آنگن اور زندگی دونوں سونی کر گیا تھا۔ یہ ایسا وقت تھا جب ایک باپ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو روتا بلکتا بے سہارا اور مقروض چھوڑ گیا تھا، یہ ایسا وقت تھا جب دیوبند کے عمر رسیدہ لوگ بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ ہم نے اپنی تمام زندگی میں ایسی وَبا نہیں دیکھی کہ جس کی چپیٹ میں آنے سے کوئی گھر نہ بچ سکا ہو۔

ایسے بُرے وقت میں جب امت کو سہارے کی ضرورت تھی، ایسے بُرے حالات میں جب اُمت کو مدد کی ضرورت تھی۔ آنکھوں میں نرمی اور باتوں میں شفقت لیے کسی عیادت کرنے والے کی ضرورت تھی۔ تب یہ قوم کے مصنوعی رہنما، یہ قائد ملّت کے نام سے مشہور ہونے والے ملّت خور بزرگ، یہ مسلمانوں کے حقوق کی لڑائی لڑنے کا ڈھونگ کرنے والے سیاسی شعبدہ باز، یہ امت کے جذبات، احساسات اور اعتقادات کے ساتھ کھیلنے والے

مسند نشین بازیگر، اپنی خواب گاہوں اور شبستانوں میں امت کی فکر سے بے زار آسائشوں کے ساتھ عیش پرستی میں مبتلا تھے۔ وہ جمعیۃ علماءِ ہند جس کو دنیا بھر کے صاحبِ زر مسلمان اسی لیے چندہ دیتے ہیں کہ یہ جمعیۃ ہندوستان کے مسلمانوں کی خوش حالی اور غم گساری کے لیے زیادہ سے زیادہ لوگوں کی مدد کرسکے۔ زیادہ سے زیادہ عوام کی خستہ حالی کو دُور کرسکے، مسلمانوں کی تعلیم اور ترقی میں معاونت کرسکے؛ لیکن کیا ایسا ہوتا ہے؟ افسوس تو اِسی بات کا ہے کہ ۲۰۱۶ء کے ستمبر اکتوبر میں جب مسلمان ایک ایک روپیے کے لیے پریشان تھا، اُس وقت کسی مولوی ارشد یا کسی محمود مدنی نے ایک ڈاکٹر کے یہاں جاکر بھی امت کے بیمار اور معذور پڑے ہوئے لوگوں کی مزاج پُرسی نہیں کی۔ ان کی تجوریوں میں پڑا ہوا وہ پیسہ جو امت کے اوپر خرچ کرنے کے لیے دیا جاتا ہے وہ ان بیمار و لاچار مسلمانوں پہ خرچ نہیں ہوا؛ بلکہ اپنی اولاد و احفاد کے لیے زمینیں خریدنے اور تعمیریں کرنے میں جاتا رہا۔ کیا یہ امانت میں خیانت نہیں؟ کیا یہ لوگ ہمیشہ زندہ رہنے کا خواب دیکھ رہے ہیں؟ کیا آخرت کے حساب کو بھلائے بیٹھے، ان سفید پوش سیاسی لیڈروں نے یہی سوچ لیا ہے کہ روزِ محشر ان سے سوال نہیں کیا جائے گا۔

قارئین! کیا ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا کہ: جمعیۃ علماءِ ہند کی طرف سے چند لوگوں کی ایک ٹیم بنا کر تین تین، چار چار افراد کے وفد کی شکل میں دیوبند و مظفرنگر کے ڈاکٹروں کے پاس بھیجی جاتی اور ڈاکٹر سے کہا جاتا کہ آپ کے یہاں جتنے بھی مریض ہیں آپ سب کا بہتر سے بہتر علاج کیجئے اور ہر مریض کا پرچہ، اُس پر خرچ ہونے والی دوائیاں اور بل ایک ساتھ پن کرنے کے بعد ہمیں دے دیجئے گا۔ آپ کی تمام رقم جمعیۃ ادا کرے گی۔ بلاتفریق مذہب و ملّت اس کام میں ہندو اور مسلمان تمام مریضوں کے علاج کی رقم جمعیۃ کو ادا کرنی چاہئے تھی۔ ڈاکٹر سے کہا جاتا کہ آپ ہر جمعہ کو اپنا حساب بنائیں، ہم بِل لے جائیں گے اور اتوار کو آپ کی تمام رقم ایک مشت ادا کردی جائے گی۔ یومیہ بھی یہ حساب کیا جاسکتا تھا، یہ ہوتی اصل خدمتِ خلق۔ بتائیے قارئین! کیا ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا، کیا ہم کچھ غلط کہہ رہے ہیں۔

ہاں! اس کام میں بے شک دو چار کروڑ روپیے خرچ ہوجاتے؛ لیکن امت کے نام پر عوام ہی کے لیے آکر جمع ہوئے اَربوں، کھربوں روپیوں میں سے دو چار کروڑ تو بے چاری عوام پر خرچ ہونے بھی چاہئیں۔ اس کے برعکس یہ بھی تو ہوتا کہ جب یہ بات پھیلتی کہ جمعیۃ نے تمام بیماروں کا علاج کروایا ہے اور پھیلتی کیا؛ بلکہ خود جمعیۃ کی طرف سے اس کی تشہیر کی جاتی، تو جو صاحبِ ثروت ہمیشہ جمعیۃ کو چندہ دیتے ہیں وہ اس کارِ خیر کو سن کر اور بڑھ چڑھ کر روپیہ بھیجتے۔ خرچ ہونے والے تمام پیسے چند روز ہی میں ڈبل ہوکر واپس جمع ہوجاتے۔

لیکن ایسا کچھ نہیں کیا گیا۔ مسلمان مرتے رہے اور عیش پرست سیاسی علماء کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ یہ تو فقط ایک سال ۲۰۱۶ء کا واقعہ نیا نیا ہے؛ اس لیے ذکر کردیا، ورنہ ملک بھر میں اس وقت مسلمان جتنا

پریشان، مجبور اور بے روزگار ہے اس کے لیے بھی یہ جمعیۃ علماء ہند کچھ نہیں کر رہی۔ یہ مصنوعی قائدِ ملت بس ایک دو سال میں جلسہ کرانا جانتے ہیں۔ ۳۲واں اجلاس، ۳۴واں اجلاس، بس یہی پوسٹر لگتے ہیں اور بھیڑ اکٹھا کر کے کروڑوں روپیے چندہ جمع کر لیا جاتا ہے۔ قارئین! جمعیۃ کے ایک اجلاس میں ۳۰ سے ۴۰ لاکھ روپئے خرچ ہوتے ہیں۔ ذرا حساب لگائیے عوام کا پیسہ کس بے دردی کے ساتھ تمبو اور بمبو میں خرچ کر دیا جاتا ہے۔

یہ مجمع لگانے کا شوق نیا نہیں؛ بلکہ پرانا ہے۔ جس کا ایک مقصد تھا اور وہ مقصد ہمیشہ پورا ہوا۔ جب تک ملک میں کانگریس کی حکومت رہی۔

مولوی اسعد مدنی صاحب کا مقصد ہر اجلاس کے پیچھے فقط حکومت کو یہ باور کرانا تھا کہ میرے ساتھ اتنے مسلمان ہیں۔ اسی غرض سے ملک و ملت بچاؤ تحریک شروع کی گئی تھی۔ حالانکہ اہلِ بصیرت جانتے ہیں وہ ملک و ملت بچاؤ نہیں؛ بلکہ اِندرا بچاؤ تحریک تھی۔ ایک اہم نکتہ جو ہندوستان کے مسلمان کے لیے زیرِ غور ہے وہ یہ کہ ۱۹۶۵ء سے ۲۰۱۸ء تک جتنے بھی اجلاس جمعیۃ نے کیے ہیں، ان کا کوئی خاطر خواہ فائدہ ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں نظر نہیں آتا۔ کوئی ایک کام بھی تو یہ اجلاس ایسا نہ کر سکے جس سے اس ملک کے مسلمانوں کے مسائل کا کچھ بھی حل نکل سکا ہو۔

نہ مسلمانوں کو ریزرویشن مل سکا، نہ ہی ملازمتیں، نہ مسلم پرسنل لاء میں ہنود کی دست درازیاں کم ہوئیں نہ ہی بے قصور مسلم نوجوانوں کو بے بنیاد الزامات میں گرفتار کرنے کا سلسلہ تھما نہ ہی بابری مسجد بن سکی اور نہ ہی مسلمانوں کی معیشت میں کوئی ترقی ہوئی۔

ان اجلاس کا مقصد حکومت کو اپنا اثر و رسوخ دکھانا ہوتا تھا، جس میں مولوی اسعد صاحب کامیاب ہوتے تھے۔ اور اسی کی بنا پر حکومت سے مراعات حاصل کر لی جاتی تھی، ساتھ ہی اندرونِ خانہ کچھ اور معاملات بھی طے کر لیے جاتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ راجیہ سبھا کے ممبر بھی بنا دیے گئے تھے۔

ایک اہم اور خاص بات یہ بھی ہے کہ ۱۹۶۵ سے ۱۹۹۲ تک جمعیۃ علماء ہند کے تحت مولوی اسعد مدنی صاحب نے جتنی بھی تحریکات چلائیں وہ مسلمانوں کے کسی فائدے کے لیے نہیں؛ بلکہ مرکز کے اندر کانگریس کی حکومت کو بچانے کے لیے چلائیں۔ ملک و ملت بچاؤ تحریک، جیل بھرو آندولن، فلانہ آندولن وغیرہ یہ تمام کے تمام کانگریس حکومت کی حمایت میں رہے۔ آپ جمعیۃ کو کتنا بھی یہ کہیں کہ یہ غیر سیاسی جماعت ہے؛ مگر یہ مولوی اسعد صاحب کے دَور میں پوری طرح سے کانگریس کی ذیلی جماعت بن گئی تھی۔

ایک مرتبہ مشہور صحافی مولانا اعجاز قاسمی صاحبؒ دیوبندی نے ہم سے کہا تھا کہ میاں! مولوی اسعد مدنی جیسا آدمی تو ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا؛ کیونکہ دہلی میں ان کا معمول یہ ہے کہ صبح کو ناشتہ کرنے کے بعد کانگریس

کے کم سے کم ایک یا دو ایم پی وایم ایل اے سے اُن کی کوٹھی پے جا کے ملاقات کرنا، وہاں ان سے اقلیت کے نام پر مرات حاصل کرنا اور ان سے رقومات کی حصول یابی کرنا۔

اس کے علاوہ بہت سے واقعات و حادثات ہیں۔ جن میں ۱۹۷۵ء کی ایمرجنسی کا واقعہ ہے۔ اس سے قبل نَس بندی کا کیس ہے۔ متعدد فسادات ہیں، نیل گری کا فساد ہے، ایک مراد آباد کا فساد ہے۔ جبل پور کا فساد ہے۔ میرٹھ ملیانہ کا فساد ہے اور ایک مظفر نگر کا فساد ہے، اس کے بعد بابری مسجد کی شہادت ہے۔ ان سب کے اوپر بھی جمعیۃ کانگریس کی حمایت میں کھڑی رہی اور اس نے کبھی ان کے خلاف کوئی احتجاج یا دوسرے کسی بھی قسم کے معاملات قطعی طور پر نہیں کیے۔

۱۹۹۲ء میں مولوی اسعد صاحب راجیہ سبھا کے ممبر تھے اور پورے ہندوستان میں اُس وقت پارلیمنٹ کے اندر واحد ایک سنیل دت ایسا انسان تھا جو استعفیٰ دے کر باہر آیا تھا۔ جس کی اُسے بعد میں بہت بھاری قیمت چکانی پڑی تھی۔ اس کے بیٹے کو جیل ہوئی، اس کا کیریئر تباہ ہوگیا۔ لیکن سنیل دت کی یہ بہت بڑی بات رہی کہ اس نے کبھی کسی کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ بلاشبہ اگر سنیل دت ایک مسلمان ہوتا تو ہم اُس کے لیے دعاءِ مغفرت ضرور کرتے۔ کمال تو یہ ہے کہ مسجد کی شہادت جیسے اَلم ناک حادثے اور تشخص کی پامالی سے ایک کافر تو دل برداشتہ ہو کر ملکی سیاست سے علیحدہ ہوگیا؛ لیکن امت کا غم رکھنے کا ناٹک کرنے والے مولوی اسعد صاحبؒ نے احتجاجاً بھی تو کوئی استعفیٰ نہیں دیا۔

قارئین! ہماری پیدائش ۱۹۵۸ء کی ہے یعنی ۶۰ رسال کی اپنی عمر میں ہمیں ۱۹۷۵ء کے بعد سے ملک کے تمام حالات آج بھی یاد ہیں۔ ہم سنجے گاندھی کی بدتمیزی آج بھی نہیں بھولے ہیں اور مراد آباد کا قتل عام آج بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ کبھی جب ذکر آتا ہے تو دل میں یہی خیال اُبھرتے ہیں کہ آخر مولوی اسعد مدنی صاحبؒ نے اپنی تجوری بھرنے کے علاوہ کیا کیا ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کا نام تو جمعیۃ مدنی خاندان ہو جانا چاہئے۔

ایک بات یہاں قابل ذکر بھی ہے اور قابل غور بھی۔ وہ یہ کہ جمعیۃ علماء ہند کا قیام ۱۹۱۹ء میں ہوا اور اس کے چھ سال بعد غالباً ۱۹۲۵ میں آر ایس ایس وجود میں آئی۔ آج دونوں تنظیموں کی کارکردگی دنیا کے سامنے ہے۔ دوسری مرکز میں بھی ہے اور ملک کی سیاست کے اکثر مناصب پر بھی۔ اور پہلی فقط اجلاس کے پوسٹروں اور سیلاب زدگان کی مدد کرتے ہوئے فوٹو کے ساتھ سوشل میڈیا تک محدود ہے۔

جمعیۃ علماء ہند کے بانیوں میں شامل مولانا ابوالکلام آزادؒ محمد علی جوہرؒ محمد علی شوکتؒ اور شیخ الہند رحمہم اللہ نے مسلمانوں کے روشن مستقبل اور تعلیمی ترقی کے لیے ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ اسی جمعیۃ علماء ہند سے ایک روز نامہ نکالا گیا، جس کا نام ''الجمعیۃ'' تھا، جس کے مدیر مولانا مودودی تھے، سالہا سال

تک وہ اپنے قلم سے مسلمانوں کے اندر روح پھونکتے رہے، پھر حامد الانصاری غازی اور عثمان فارقلیط صاحب اس روزنامہ کے ایڈیٹر رہے۔ بعد میں یہ روزنامہ ہفت روزہ بن گیا اور آج اس کو پڑھنے والے اُنگلیوں پر بھی گننے کے قابل نہیں ہیں۔ نہ وہ باصلاحیت قلم کار جمعیۃ کو میسر ہیں اور نہ ہی وہ علمی تحریریں جو ابتداء میں اس کی جان ہوا کرتی تھیں۔ جمعیۃ علماء ہند ساٹھ سال میں ایک قلم کار تو پیدا کر نہیں سکی۔

بلاشبہ یہ حقیقت بیان نہیں کی جاتی کہ مولانا حسین احمد مدنی صاحبؒ کی صدارت کے بعد جمعیۃ علماء ہند علماء کی نہیں؛ بلکہ کانگریس کی جماعت بن گئی تھی۔ اسی لیے تو ابتداء میں جس نے بھی پاکستان کی حمایت کی اسی کو جمعیۃ علماء ہند نے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ جس کی سب سے بڑی مثال مولانا مودودی ہیں۔ وہ مودودی جو جمعیۃ علماء ہند کے اخبار کی ادارت کر رہا ہو۔ جس کے قلم کا لوہا سارے ملک میں مانا جا رہا ہو۔ جس کی تحریر میں کوئی نقائص اس وقت نظر نہ آرہے ہوں اچانک اس کی تمام تحریریں تکذیب صحابہؓ کا عنوان پا جاتی ہیں۔ وہ ملحد وزندیق ہو جاتا ہے صرف اس لیے کہ اس نے کانگریسی ہندوؤں کے زیر اثر رہنے کے بجائے مسلم مملکت کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کا ارادہ کر لیا۔ صرف اس لیے کہ اس نے مسلمانوں میں اسلامی تعلیم کو عام کرنے کے لیے انھیں سیرت کے مطابق زندگی گزارنے اور خلافت کے طریق پر حکومت کرنے کی ترغیب دینے کے لیے ایک جماعتِ اسلامی قائم کر لی۔ جی ہاں! صرف اسی لیے مودودی کی تحریروں میں چھانٹ چھانٹ کر بے بنیاد اعتراض تلاش کیے گئے۔ اور یہ تحریریں کوئی نئی نہیں تھیں؛ بلکہ دس پندرہ سالوں سے سب انہیں پڑھتے آرہے تھے اور تب کسی کو ان میں کیڑے نظر نہیں آئے تھے۔ واہ رے سیاست!

آپ پاکستان میں شائع شدہ تاریخ کی کتابیں پڑھیے، ان میں صحیح تاریخ معلوم ہوتی ہے۔ یہاں تو تاریخ لکھنے والے ایسے ہی ہیں جیسے یہ دارالعلوم کی جدید تاریخ لکھنے والے۔

ہم یہ اتنا سب کچھ اس لیے لکھ گئے ہیں کہ ہمیں آج کے حالات دیکھ کر رونا آتا ہے، دل کڑھتا ہے کہ جس جماعت کے پاس ۵۰ سال کا عرصہ تھا، وافر مقدار میں روپیہ تھا، حکومت اور عوام کی سپورٹ تھی، تمام وسائل مہیا تھے، تب بھی اس جماعت کے ارکان نے کیوں اُمتِ مسلمہ کے مستقبل کو تاریک کر دیا؟ کیوں اس نے امت کو آج اس پستی کے مقام پہ لا کے کھڑا کر دیا؟ آج آپ کے سامنے جو مسائل درپیش ہیں ان کا حل آسان نہیں ہے۔ جو آج سوچا جا رہا ہے وہ پچاس سال پہلے کیوں نہیں سوچا گیا؟ آپ ابھی اپنے موبائل میں یوٹیوب کھولیے اور مولوی یاسر ندیم الواجدی کی ویڈیو دیکھئے جس کا عنوان ہے ''سرجیکل اسٹرائک نمبر ۴۶'' اس میں یاسر ندیم کے ساتھ مولانا عمرین رحمانی اور مولانا الیاس فلاحی صاحب گفتگو کر رہے ہیں۔ قارئین آپ یہ ویڈیو دیکھئے اور ضرور دیکھئے کیسے امت کی بے چارگی پر افسوس کرتے ہوئے اس کے سدِ باب کی غرض سے اقدامات پر غور کرنے کی بات کی

جاری ہے۔کیا یہ اقدامات جمعیۃ علماء ہند کی ذمہ داری نہیں تھے۔اگر گزشتہ پچاس سال میں جمعیۃ نے مسلم اسکول اور کالج بنائے ہوتے تو یہ حالات پیدا ہی نہیں ہوتے۔اور تو اور اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی اب تک جمعیۃ کی طرف سے کچھ اچھا کرنے کی توقع نہیں ہے؛ کیونکہ اچھا کرنے کے لیے خود محنت کرنا پڑتی ہے اور محنت، مشقت کا کام ہے، جس کے لیے دھوپ کی گرمی میں گرد آلو دسڑکوں پر چلنا پڑتا ہے۔اے سی میں رہنے والے لوگ محنت کرنا بھول جاتے ہیں اس لیے یہ فقط حکم دے کر کام کرانے کے خواہش مند ہیں۔خود محنت کرنے کے نہیں۔ جماعتِ اسلامی کو دن رات گالیاں دینے والے ذرا اُن کی کارگزاریاں بھی دیکھ لیں، امت کے لیے انھوں نے ہسپتال بھی بنائے ہیں اور مسلم اسکول بھی۔

ایک بات اور جمعیۃ و کانگریس کے اشتراک کے لیے عرض کر دیں کہ ہمارا تعلیمی دَور تھا، بات غالباً ۱۹۸۰ء کے بعد کی ہے یعنی دارالعلوم پہ قبضہ کے دوران کی۔ہم نے بھی دارالعلوم کی انہیں ٹاٹ کی دریوں پر بیٹھ کر اپنے اساتذہ سے علم حاصل کیا ہے۔جن دریوں سے ہمیں سچائی کے خاردار راستوں پہ چلنے کا حوصلہ ملا۔اسی دوران ہم نے دیکھا کہ دیوبند میں ایک تھے مولوی شمیم اور ایک مولوی حبیب (واضح رہے یہ مولوی حبیب مسلم فنڈ والے حبیب صدیقی نہیں ہیں) یہ دونوں صاحبان مولوی اسعد صاحب کے خوشہ چینوں میں تھے۔تو الیکشن کے وقت ان دونوں صاحبان کا کام لوگوں کو لے جا کر کانگریس کو ووٹ دلانا رہتا تھا۔مدنی گروپ کی طرف سے آرڈر تھے کہ مسلمانوں بس کانگریس کو ہی ووٹ دو۔اور آج آپ کے سامنے ہے پورے ہندوستان میں بی جے پی یہی کہتی پھرتی ہے کہ کانگریس تو مسلمانوں کی پارٹی رہی ہے۔ یہ سب اسی لیے کہا جا رہا ہے؛ کیونکہ جمعیۃ نے ہر دَور میں ہر حال میں کانگریس کی حمایت کی ہے۔

اصل کام جو جمعیۃ کو کرنا تھا وہ تھا مسلم اسکولوں کا قیام، جیسا کہ آر ایس ایس نے کیا، جہاں انھوں نے بچوں کو بڑے ہونے تک ذہنی طور پر تیار کیا اور آئی ایس، پی سی ایس تک پہنچایا۔اسی لیے ملک میں ایک فیصد بھی مسلم آئی ایس افسر نہیں ہے۔دراصل پری پلان ہو کر محنت کرنی پڑتی ہے، فقط اجلاس کرنے سے قوموں کے حالات نہیں بدلا کرتے۔

آج اگر مدنی میموریل کے تحت چند مدارس و اسکول قائم کیے بھی جا رہے ہیں تو وہ کسی خدمت کے جذبے سے نہیں، مسلمانوں کی ترقی کے خیال سے نہیں، بلکہ نسل نو پیسے کمانے کے لیے کر رہی ہے۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ موجودہ جمعیۃ علماء ہند کا کوئی مینیفسٹو نہیں ہے، کوئی منشور یا لائحہ عمل نہیں ہے۔ یہ سیلاب آتا ہے تو وہاں چلی جاتی ہے، زلزلہ آتا ہے تو وہاں چلی جاتی ہے، کہیں فساد ہوتا ہے تو وہاں چلی جاتی ہے۔ لیکن یہ سب فساد کے بعد ہوتا ہے۔ پہلے سے ایسا کچھ نہیں کیا جاتا کہ فساد ہو ہی نہیں۔

جب کچھ ہوتا ہے تو چندہ لینے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اور پھر مہینوں کے لیے خاموش ہو کے بیٹھ جاتے

ہیں۔ یہ تنظیموں کا طریقہ کار نہیں ہوا کرتا۔ تنظیمیں تو خاموشی کے ساتھ کام کرتی ہیں۔ فعال ہونا ہی تنظیم کی کامیابی ہے۔

قارئین! آپ نے کبھی آر ایس ایس کا کوئی اشتہار نہیں دیکھا ہوگا۔ اتنی طویل مدت میں کبھی بھی آپ کی آنکھوں کے سامنے سے کسی بھی اخبار یا ٹی وی پہ آر ایس ایس کا اشتہار نہیں گزرا ہوگا۔ اس کے برعکس جمعیۃ لاکھوں روپیے اخبارات کے اندر اشتہارات دینے میں خرچ کر دیتی ہے۔

گزشتہ دنوں یعنی ۲۰۱۸ء ہی میں مولانا ندیم الواجدی صاحب نے ایک مضمون لکھا جو واٹس ایپ کے ذریعہ ہم تک پہنچا۔ اس کا عنوان تھا ''شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات'' اس مضمون میں مولانا ندیم الواجدی صاحب نے لکھا ہے کہ اتنے بڑے بڑے بجٹ کے مدارس چل رہے ہیں؛ لیکن ان میں طلبہ کی طبی سہولت کے لیے کوئی معقول انتظام نہیں ہے۔ اس سے پہلے مختلف وقتوں میں دیگر صحافی حضرات بھی اس بابت لکھ چکے ہیں۔ اس مضمون میں مولانا نے لیبیا کے شہزادے کرنل قذافی کے صاحبزادے کی دارالعلوم آمد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ دیوبند میں ایک ہسپتال بنانے کے لیے بڑی رقم دینے کا اعلان کر گئے تھے؛ لیکن یہ پتہ نہیں کہ وہ رقم ملی یا نہیں، اس کے بارے میں کچھ لکھا نہیں جاسکتا۔ اس کے بعد اسی مضمون میں وہ آگے تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا اسعد صاحب نے اسپتال کے بارے میں پوچھنے پر یہ کہا تھا کہ ہم اس ہسپتال کا قیام مظفر نگر میں کریں گے۔

اب یہاں قابلِ غور یہ بات ہے کہ بقول مولانا ندیم الواجدی کہ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ بڑی رقم ملی یا نہیں، اِس بابت کچھ لکھا نہیں جاسکتا تو اگر وہ رقم نہ ملی ہوتی تو مولوی اسعد صاحب کیا، کوئی شخص بھی یہ نہ کہتا کہ وہ ہسپتال دیوبند میں نہیں؛ بلکہ مظفر نگر میں بنائیں گے۔ اگر رقم نہ آئی ہوتی تو ان کا جواب یہ ہوتا: ہسپتال تو تب بنے گا جب ہمارے پاس رقم آجائے گی۔ ابھی کوئی رقم آئی ہی نہیں، تو ہسپتال کہاں سے بنے۔ لیکن ایسا نہیں کہا گیا۔ اگرچہ وہ اعلان لیبیا کا شہزادہ کر گیا تھا، کوئی مودی یا اَمت شاہ نہیں، جن کے اعلان فقط ہوائی جملے ہوا کرتے ہیں۔ عرب آج بھی اپنے قول کے پکے ہوتے ہیں۔ وہ رقم آئی تھی اور لانے والے ابھی زندہ ہیں۔ اس لیے یہ ہوا کہ مولانا ندیم الواجدی صاحب کا مضمون پڑھ کر رقم لا کر دینے والے نے دیوبند کے ایک دو صحافیوں کے علاوہ خود مولانا ندیم الواجدی صاحب کو بھی فون کیا اور کہا کہ آپ نے یہ کیا لکھا ہے کہ رقم ملی یا نہیں اس بارے میں کچھ لکھا نہیں جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب میں نے خود سات کروڑ روپئے ایم بیسی سے لا کر دیے تھے۔

اب کوئی جائے اور مولوی اسعد صاحبؒ کی قبر پہ جا کر ان سے سوال کرے کہ حضرت کہاں گئے وہ اُمت کے لیے آئے ہوئے سات کروڑ۔ شاید مرید کی فریاد پر پیر صاحب خود باہر آ کر جواب دے دیں اور فرشتوں کے کرسی چلانے کی طرح ایک اور کرامت حضرت کے معتقدین کے لیے تیار ہو جائے۔ بلاشبہ یہ سات کروڑ بھی

وہیں گئے جہاں ۱۹۶۵ء میں افریقہ سے لائے گئے سات لاکھ اور ایسے ہی نہ جانے کتنے روپے چلے گئے تھے۔ اسی طرح تو قوم کا پیسہ اپنی تجوری کی زینت بنا ہے۔

شروع زمیں سے ہوئی تھی لیکن! آسماں تک جا پہنچی
چلتے چلتے دیکھو یار بات کہاں تک جا پہنچی

پہلی بات کے آغاز میں ہم نے لکھا ہے کہ فقط اپنا دبدبہ قائم کرنے کے لیے جبر و تشدد اختیار کر کے دیگر امن پسند باشندوں یا جماعتوں کو تکلیف پہنچانا کسی طور صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اِس جملے سے ہماری مراد جمعیۃ علماء ہند کے صدرین کی وہ روِش ہے جو دیگر مسلم تنظیموں کو پست و پامال کرنے میں کارفرما رہی ہے۔ یہ کوئی بے دلیل الزام نہیں ہے؛ بلکہ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر آج تک یہی روش جمعیۃ کی پالیسی کی طرح عمل پیرا ہے۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانہ میں مولانا مودودی کی مخالفت اسی لیے کی تھی تاکہ وہ اس کے ذریعہ جماعتِ اسلامی کو ایک بے دین اور گمراہ جماعت باور کرا کے عوام کو اس سے بدظن کر کے اُس کا دھیان جمعیۃ علماء ہند کی طرف مبذول کرسکیں۔ یہی ہوا بھی، آج ہندوستان میں دیوبندی مکتبِ فکر کے مدارس میں پڑھنے اور پڑھانے والوں کے نزدیک مولانا مودودی کی حیثیت ایک بے دین اور گمراہ انسان کی ہے۔ یہی مقصد تھا مولانا مودودی کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کا؛ کیونکہ سیدھی سی بات ہے جماعتِ اسلامی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور مولانا مودودی کی مسلم لیگ کے ساتھ شرکت نے مولانا مدنیؒ کو یہ سوچنے پہ مجبور کر دیا تھا کہ اگر یہ جماعتِ اسلامی مشہور و کامیاب ہوگئی تو ہماری جمعیۃ علماء ہند کمزور و ناکام ہوجائے گی۔ اسی خوف کے تحت جماعتِ اسلامی کی مخالفت شروع کی گئی اور پھر مولانا مودودی کی تحریروں کے خلاف ایک محاذ کی ابتدا کر دی گئی۔ اگرچہ تمام اعتراضات بدگمانی اور تعصب پر مبنی ہوا کرتے تھے؛ لیکن عوام تو بے چارے سادہ لوح اور جاہل ہوتے ہیں، اُنھیں کب اعتراضات کی وجوہات اور جوابات پہ غور کرنے کا موقع تھا، وہ تو بس حضرت کے کہنے پر مودودی کے دشمن بنتے چلے گئے۔ یہاں ہم مولانا مودودی پر کیے گئے اعتراضات کا جواب نہیں دیں گے؛ کیونکہ یہ کام پہلے بہت سے علماء حضرات کر چکے ہیں۔ یہاں تو ہم فقط اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مولانا مودودی پر کیے گئے اعتراضات کا شافی و کافی جواب پڑھنے کے لیے آپ ماہنامہ تجلی کے ۱۹۵۵ سے ۱۹۶۰ تک کے شمارے پڑھیے جو تجلی کی ویب سائٹ پہ دستیاب ہیں اور ایک کتاب مولانا مودودی پر اعتراضات کا علمی جائزہ بھی دیکھیے، آپ کو اندازہ نہیں؛ بلکہ یقین ہوگا کہ کس طرح بے بنیاد اعتراضات کر کے اچھی خاصی تحریر میں کیڑے نکالے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم نے جو اوپر لکھا ہے کہ اعتراضات، بدگمانی اور تعصب پر مبنی تھے یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ جس کے تصدق کی خاطر آپ ایک کتاب کا

ضرور مطالعہ کرلیجیے وہ ہے ''مولانا ابو اللیث ندوی ؒ کی مولانا حسین احمد مدنی ؒ سے مراسلت'' یہ ایک چالیس، پچاس صفحات کا مختصر کتابچہ ہے۔ جس میں مولانا ابو اللیث صاحب کے وہ خطوط شامل ہیں جو انھوں نے مولانا مدنی ؒ کو لکھے تھے اور جن کا مقصد یہ تھا کہ مولانا مودودی پر آپ کو جو اعتراض ہیں ان کے بارے میں ایک بار بیٹھ کر بات کرلیں، تاکہ ہم آپ کے اعتراضات کا جواب دے کر علماء کے درمیان ہونے والی بدگمانی کو دُور کرسکیں۔ بے شک یہ آپسی گفت وشنید مفید ثابت ہوگی۔ علماء کے اختلاف سے عوام بدظن ہوتی ہے جوکہ بلاشبہ غیر مناسب ہے۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہوتا ہے اور علماء کا کام امت میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنا ہے۔ یہ کتابچہ بہت شاندار ہے اسے ضرور پڑھنا چاہئے۔

مولانا مدنی ؒ نے ابو اللیث صاحب کے ابتدائی کئی خطوں کا جواب ہی نہیں دیا پھر بعد میں دیا بھی تو عجیب لہجہ میں دیا، جس کا اندازہ خط کے الفاظ سے ہوجاتا ہے۔ اور ایک بار رامپور میں ایک جلسہ تھا جس میں مولانا مدنی ؒ اور مولانا ابو اللیث دونوں کی دعوت تھی، جب مسلسل کئی خط لکھنے کے بعد مولانا مدنی ؒ نے مولانا ابو اللیث کو ملنے کا وقت نہیں دیا تو مولانا ابو اللیث نے رامپور میں ہونے والے جلسہ کے حوالے سے ایک خط لکھا کہ محترم آپ رامپور کے جلسہ میں تشریف لے جارہے ہیں اور راقم بھی وہاں مدعو ہے۔ مسلسل اصرار کے بعد آپ ملاقات کا وقت نہیں دے پائے ہیں، یہ جلسہ کا موقع ملنے کے لیے مناسب رہے گا، آپ جلسہ کے بعد یا پہلے تھوڑا وقت نکال لیں، تو ہم ملاقات کرسکتے ہیں۔ قارئین! آپ کو حیرت ہوگی کہ ملاقات نہ کرنے کی وجہ سے مولانا مدنی ؒ نے جلسہ میں شرکت ہی نہیں کی۔ اس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ تمام اعتراضات اخلاص یا اصلاحِ امت پر مبنی نہیں تھے؛ کیونکہ انسان کسی پر الزام لگا کر اس سے بات کرنے سے اُسی وقت کتراتا ہے جب الزام بے بنیاد اور اعتراض بے دم ہوں۔

بہر حال اس تفصیل سے ہمارا مقصد بس یہ واضح کرنا تھا کہ مدنی خاندان کا کام ہمیشہ سے جمعیۃ علماء ہند پہ قبضہ اور ملک کی دیگر جماعتوں سے عوام کو بدظن کرنا رہا ہے۔ بات یہیں تک رُک جاتی تو مولانا مدنی ؒ کو حق بجانب سمجھا بھی جاسکتا تھا؛ لیکن بات دوسری نسل یعنی آپ کے فرزند ارجمند مولوی اسعد صاحب ؒ پہ آتی ہے تو مخالفت کی اس روش میں اور شدت پیدا ہوجاتی ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی ؒ پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں بلاشبہ وہ ایک صاحبِ علم تھے، انھوں نے اعتراضات کو تحریری وتقریری حد تک محدود رکھا اسے ذاتی دشمنی نہیں بنایا اور نہ ہی کبھی جھگڑے کی صورت اختیار کی؛ لیکن ان کے فرزند ارجمند نے تو ملک میں کسی بھی دوسری جماعت کو کامیاب ہونے ہی نہیں دیا۔ مولانا حسین احمد مدنی ؒ کو جب یہ احساس ہونے لگا کہ جماعتِ اسلامی کی مقبولیت سے جمعیۃ علماء ہند پہ فرق پڑ رہا ہے تو انھوں نے فوراً اس کی کھل کر مخالفت نہ کرتے ہوئے مولانا مودودی کو نشانہ بنا کر عوام کو اس جماعت سے متنفر کردیا۔ اسی طرح ۱۹۶۵ء

میں جمعیۃ پہ قبضہ کرنے کے بعد جب مولوی اسعد صاحب نے دیکھا کہ جمعیۃ سے الگ ہو کر مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن صاحبؒ نے مجلسِ مشاورت قائم کر لی ہے اور ملک کے مقتدر علماء و دانشوران اس میں شریک ہو گئے ہیں تو انہوں نے اس کی مخالفت کے لیے کمر کس لی۔ پھر آپ نے گزشتہ صفحات میں پڑھ ہی لیا کیسے اکتوبر ۱۹۶۶ء کے جلسہ میں مولوی اسعد صاحب نے ہنگامہ کروا کے جلسہ ناکام کیا تھا۔ اور قارئین! ایسا ایک بار نہیں ہوا؛ بلکہ اس سے پہلے جون ۱۹۶۵ء میرٹھ میں بھی مجلسِ مشاورت کا جلسہ ہوا تو وہاں بھی یہی کیا گیا اور وہاں تو دہرہ دون سے غنڈے بلوا کر حملہ کیا گیا تھا۔ وہ غنڈے ڈاڑھی اور ٹوپی میں تھے، طلبۂ مدارس کی شکل میں؛ لیکن وہ طلبہ نہیں تھے، شرابی تھے۔

کوئی بتائے کہ آخر مولوی اسعد مدنی صاحب نے مسلم مجلسِ مشاورت کے اجلاس پر ہنگامہ کیوں کروایا؟ کیوں اکتوبر ۱۹۶۶ء کے جلسے میں طلبہ کو بھیج کر پروگرام خراب کروایا؟ کوئی تو بتا دے اس سے کیا حاصل ہوا؟ لوگوں کے چوٹیں آئیں، علماء حضرات زخمی ہوئے، دارالعلوم کی بدنامی ہوئی اور یہ سب کس لیے کیا گیا تھا؟ صرف اجلاس ناکام کرنے کی وجہ سے اور اجلاس ناکام کیوں کرنا تھا؟ بتائیے اس سوال کا کیا جواب ہو سکتا ہے؟

اگر کوئی تنظیم یا جماعت اپنا کوئی اجلاس کر رہی ہے تو اِس سے کسی کو کیا تکلیف ہے، کیا پریشانی ہے؟ اجلاس علماء دیوبند کا تھا۔ وہاں حرافائیں نہیں ناچ رہی تھیں؛ بلکہ تلاوتِ کلام اللہ سے اجلاس کی شروعات ہوئی تھی اور علماء و اکابر کی علمی تقریریں ہونی تھیں۔ اب ہم اور کیا کہیں آپ پوری تفصیل حضرت مولانا عامر عثمانی کے قلم سے پڑھ آئے ہیں۔ درج بالا سوالات کا جواب یہی ہے کہ کسی بھی دوسری جماعت کو اُٹھنے مت دو، اگر لوگوں کا رجحان مجلسِ مشاورت کی طرف ہو جاتا تو جمعیۃ علماء ہند کمزور پڑ جاتی۔ بس یہی فکر اور پالیسی آج تک کارفرما ہے۔ اسی لیے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ کسی بھی دوسری جماعت کو یہ جمعیۃ والے بڑھنے نہیں دیتے۔ نہ ہی کسی کے ساتھ کھڑے ہو کر امت کے لیے فلاح کی بات کرتے ہیں۔

آج بھی ہندوستان میں جمعیۃ علماء ہند کا جتنا ایڈ کیا جاتا ہے اتنا کسی اور جماعت کا نہیں ہوتا اور اپنے سامنے کسی اور کو مقبول نہ ہونے دینے کی روش آج بھی مدنی خاندان میں اُسی طرح موجود ہے۔ اسی لیے آج وہ اسدالدین اُویسی کی حمایت نہیں کرتے؛ بلکہ محمود مدنی نے تو اسدالدین صاحب کو ایک مرتبہ بی جے پی کا ایجنٹ کہہ دیا تھا اور انہیں شرم بھی نہیں آئی تھی۔ حالانکہ پورے ملک میں اس وقت اسدالدین اُویسی ہی واحد قابل شخص ہے جو اسلام دشمن ہنود کے خلاف کھل کر اور آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرتا ہے۔ جو دلائل کے ساتھ اپنی بات رکھتا ہے؛ لیکن اپنی جمعیۃ اور اس کے ذریعہ جمع ہونے والے پیسے کو بچانے کے لیے مدنی گروپ کبھی اسدالدین اُویسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ جبکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ امت کی فکر کا جذبہ اگر واقعی حقیقی ہے تو اسدالدین اُویسی کی جماعت کا ساتھ دے کر اسے مضبوط کرتے اور ملک میں ایک مسلم پارٹی کے وجود کو استحکام بخشنے کا کام کرتے؛ لیکن

مسئلہ تو وہی ہے جو ہم لکھتے آ رہے ہیں، کہ قوم وملت کی کسے فکر ہے، مقصد تو اپنی عیش پرست زندگی اور نسلوں کے لیے دولت کے انبار لگانا ہے۔

پہلی بات ختم ہوئی اور ہمارا مقصد یہ بتانا تھا کہ اگر اخلاص ہے تو پھر کسی دوسری مسلم جماعت یا تنظیم کی مخالفت کیوں کی جاتی رہی ہے۔ بھائی اگر مسلمانوں کی فلاح و بہبود مقصد ہے تو آپ بھی کام کیجیے، دوسری جماعتوں کو بھی کرنے دیجیے۔ یہ کیا غضب ہے کہ جیسے ہی کوئی اپنے وجود کو ظاہر کرنا شروع کر دیتا ہے مدنی خاندان اس کو صاف کرنے پہ لگ جاتا ہے۔ آخری مثال کے طور پر مولانا عبدالحمید نعمانی صاحب کو لے لیجیے مولانا ایک فعال شخص اور اچھے قلم کار ہیں۔ گزشتہ چند برسوں میں ٹی وی اور اخبار میں اپنی اچھی خاصی شناخت بنانے میں کامیاب ہیں۔ سالہاسال سے جمعیۃ کے کارکن تھے وہیں مسجد عبدالنبی دہلی میں رہتے تھے؛ لیکن اب جب ان کی شہرت بڑھنے لگی تو محمود مدنی صاحب نے انھیں بھی جمعیۃ سے باہر کر دیا۔

دوسری بات

ہمیں یہ عرض کرنی ہے کہ مولوی اسعد مدنی صاحب نے دارالعلوم پہ قبضہ کرنے کے لیے جس بات کو بنیاد بنایا تھا وہ یہ تھی کہ حکیم الاسلام کے بعد ان کے بیٹے مولانا سالم مہتمم نہیں بنیں گے؛ کیونکہ دارالعلوم امتِ مسلمہ کا ہے اور اس پر کسی ایک ہی خاندان کی اجارہ داری نہیں چلے گی، اِس بات کو مخالفت کی ہوا کے ساتھ اس طرح پھیلایا گیا جس طرح منافقین نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اقربا پرستی کا الزام لگایا تھا۔ حکیم الاسلام قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ملک بھر میں گرم ہوا چلا کر مولوی اسعد صاحب نے ایک سفاک وعیار سیاستداں کی طرح اپنی ریشہ دوانیوں کے طفیل دارالعلوم پر قبضہ کیا تو نصر من اللہ وفتح قریب پڑھی گئی۔

یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ایک ہی خاندان کی اجارہ داری کے خلاف اس درجہ شدومد کے ساتھ آواز اُٹھانے والے پھر کیوں جمعیۃ علماء ہند پر قبضہ کیے بیٹھے ہیں۔ آخر یہ جمعیۃ علماء ہند ہے یا جمعیۃ مدنی خاندان۔ کیا پورے ملک کے تقریباً چالیس کروڑ مسلمانوں میں کوئی ایک فرد بھی اس لائق نہیں جو جمعیۃ علماء ہند کا صدر بن سکے۔ ہیں، بہت ہیں؛ مگر اس اجارہ داری کے خلاف آواز بلند کرنے والا کوئی ''اسد'' نہیں ہے۔ آخر یہ دولت کا نشہ نہیں تو اور کیا ہے کہ چچا بھتیجا میں شدید اختلاف کے بعد پھر اتحاد کر لیا گیا کہ اگر ہم آپس میں بلیوں کی طرح لڑیں گے تو کوئی بندر روٹی لے جائے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ جمعیۃ کے دو ٹکڑے کرو اور مل بانٹ کر قوم کا پیسہ کھاؤ۔

دیکھ لیجیے! آپ سب کے سامنے ہے۔ اگر ہماری بات غلط ہو تو بتائیے۔ اتنی تفصیل سے ہم گزشتہ صفحات میں

جمعیۃ کی ناکامیوں کا ذکر کر آئے ہیں، اب مزید کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں رہی؛ بلکہ جاتے جاتے ایک فیکٹری کا لفظ اور ذہن میں آ گیا۔ مسلمانوں کے لیے ایک فیکٹری تک تو یہ مسند کے شوقین لگا نہیں سکے، جبکہ فیکٹری کا مطلب کم سے کم ہزاروں مسلمانوں کو اچھا روزگار اور معیشت کی مضبوطی ہوتا ہے، دس فیکٹریاں بھی گزشتہ پچاس سال میں لگا دی جاتیں تو مسلمانوں کے حالات میں کافی سدھار ہوا ہوتا۔

بس بات ختم آپ بھی کہیں گے عجیب مصنف ہے مولوی اسعد کے پیچھے ہی پڑ گیا؛ لیکن میرے محترم تاریخ بار بار رقم نہیں ہوتی۔ اس لیے ہم نے وہ سب جمع کر دیا جو ایک خود ساختہ فدائے ملّت کو ملّت خور بزرگ ثابت کر دیتا ہے۔ اور یہ سب ہم نے اپنے قلم سے لکھ کر ثابت نہیں کیا؛ بلکہ قدیم کتابوں سے نقل کر کے ثابت کیا ہے۔ جا بہ جا بکھرا ہوا مواد اس ایک کتاب میں یکجا ہو گیا ہے۔ یقیناً آنے والی نسلوں کو اس سے حقائق کا وہ اُجالا نصیب ہو گا جس سے ان کی غلو آمیز عقیدت کے اندھیرے دُور ہو سکیں گے۔

......❖......

گزشتہ صفحات میں تحریر کیا ہوا ہمارا ایک ایک لفظ مبنی بر حقائق ہے۔ یہ ہماری خوش فہمی نہیں؛ بلکہ وہ سچائی ہے جسے ہم سے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے بیان کیا ہے۔ جس کی مثال آپ مولانا وحید الزماں کیرانوی اور مولانا عامر عثمانی کی تحریروں میں ملاحظہ کر چکے ہیں۔ ان کے بعد ایک اور نمونہ آپ کی خدمت میں عرض کیے دیتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ یہ نمونہ نثر میں نہیں؛ بلکہ نظم میں ہے۔ صادق صابری صاحب مرحوم کے وہ طنزیہ اشعار جو مولوی اسعد مدنی ؒ کے بارے میں کہے گئے تھے، اِس وقت آپ کی تفریحِ طبع کے لیے مناسب رہیں گے۔

دَورِ حاضر میں اِن اشعار کی حیثیت دُرِ نایاب کی سی ہے؛ لیکن ۱۹۸۳ء میں جب یہ کتابی شکل میں شائع ہوئے تھے تو خوب ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ لوگ خوب مزہ لے لے کر ان اشعار کو سنایا کرتے تھے۔ مولوی اسعد مدنی صاحب ؒ نے ان اشعار کے خالق، صادق صابری صاحب کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کے لیے ملک کے بڑے بڑے وکیلوں سے رابطہ کیا۔ مولوی اسعد مدنی صاحب ؒ کسی بھی حال میں صادق صابری کو جیل بھیج دینا چاہتے تھے؛ لیکن صادق صابری صاحب کی دُور اندیشی کے سبب مدنی صاحب کو ہر گام مایوسی ملی۔ ہر وکیل نے مدنی صاحب ؒ سے ایک ہی بات کہی، کہ مولانا اس کتاب میں کہیں آپ کا نام نہیں لکھا ہے، کسی طرح بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ کتاب آپ کے خلاف ہے۔

بہر حال! ہم آپ کے لیے یہ اشعار پیش کر رہے ہیں، پڑھیے اور دیکھئے ان اشعار کا ایک ایک لفظ ایک ایک طنز ایسا ہی سچا ہے جیسے سورج کی نمود سے صبح کا وجود۔ گزشتہ صفحات میں ہم نے جو حقائق نثر میں بیان کیے ہیں، صادق صابری ؒ کے اشعار اسی کا منظوم ترجمہ ہیں۔

ملّت فروش کا پوسٹ مارٹم

(ازقلم: صادق صابری)

اے امیر ملک وملت اے حریص عزو جاہ ○ اے مسلمانوں کی خوشحالی کے سرکاری گواہ
آپ کا شجرہ اصیل النسل شخصیت ڈبل ○ میڈیم قد مولوی چہرہ وزن دو کوئنٹل
مستقل پیشہ سیاست، شوق تندوری چکن ○ آپ کو معلوم ہے پیری مریدی کا بھی فن
ایک مفلس قوم کے لیڈر کا جو ہوتا ہے حال ○ آپ کا جغرافیہ ہے اس کی اِک نادر مثال
جتنے مرشد اور لیڈر آج ہیں سارے فضول ○ آپ نے تنہا کیے اس آرٹ کے پیسے وصول
صاف ستھرا سیکولر ہے آپ کا تکیہ کلام ○ دیوبند میں اللہ اور دلّی رام رام
تیل مِل، اخبار، کالونی، مدرسہ، ہسپتال ○ آپ ہر عنوان سے روزی کماتے ہیں حلال
ہر مسلماں کی زباں پر آپ ہی کا نام ہے ○ اس قدر سچ بولنا بس آپ ہی کا کام ہے
قوم پر ہیں آپ کے احسان یوں تو بیشمار ○ حالیہ کچھ کارنامے ہیں بہت ہی شاہکار
آپ اگر بغداد جا کر خود نہ کرتے انکشاف ○ جانے کیا نوٹس لیا جاتا حکومت کے خلاف
لاکھ چلاّ تے پھریں آسام کے خانہ بدوش ○ آپ کیوں ہوتے خدا نخواستہ ملّت فروش
قوم فاقے سے مرے یا ہو کہیں بھی قتل عام ○ موت برحق ہے سمجھتے ہی نہیں پاگل عوام
آپ کا یہ قول سچا اور سب بے کار ہیں ○ خود مسلماں اپنی بربادی کے ذمہ دار ہیں
کون کہتا ہے کہ قربانی ہے چھوٹی آپ کی ○ بے گناہوں کے لہو میں تر ہے روٹی آپ کی
اب بتاؤ، الجمعیۃ بھی غلط چھپنے لگا ○ آپ کا فرمان کچھ تھا اور یہ کچھ بکنے لگا
گو حقیقت کچھ سہی، یہ آپ کا ارشاد ہے ○ ایسی بے بنیاد باتوں کی یہی بنیاد ہے
علی گڑھ، میرٹھ، مرادآباد میں ماتم سہی ○ آپ کا منصب سلامت اپنے قاتل ہم سہی
آپ کی تحقیق ہے شک و شبہے سے بالاتر ○ آپ کی تصدیق سے چھپتی ہے سرکاری خبر
وہ بڑودہ اور میرٹھ ہو کہ ہو جمشید پور ○ آپ نے ہر شہر میں پایا مسلماں کا قصور
کتنا بوگس تھا مرادآباد رائیٹ کا جواز ○ ''اک سؤر سے کونسی مخدوش ہوجاتی نماز''

کس لیے بدظن ہیں یہ ننانوے فیصد مرید ○ آپ ہیں سرکار کے، ان کے نہیں ہیں زرخرید

یہ تو دنیا ہے سبھی کی اپنی اپنی رائے ہے ○ آپ کو قبلہ جو کہتا ہے وہ خود ''شبوائے'' ہے

آپ پر تنقید کرنے کا کسی کو کیا مجاز ○ ہے سبھی کی حد مقرر، آپ کی رسّی دراز

تاقیامت آپ کو رکھے خدا اس حال میں ○ نیکیاں ہی نیکیاں ہیں نامۂ اعمال میں

ہو چکی جب حد مسلمانوں کے استحصال کی ○ کٹ چکیں جب ہر طرف فصلیں ''بکاؤ مال'' کی

آپ نے فوراً بلایا بمبئی کنونشن ○ ہائے کیا تقریر تھی، کیا موڈ تھا، کیا ایکشن

کس بلا کا جوش تھا تحریک کے اعلان میں ○ زلزلہ سا آگیا سرکار کے ایوان میں

ملک وملّت آپ کی تحریک کیا طوفان تھا ○ وہ سبھی کچھ مل گیا جس کا ہمیں ارمان تھا

چونکہ مقصد نیک تھا سب لوگ ساتھی ہو گئے ○ سوکھ کر ملّت کے غم میں آپ ہاتھی ہو گئے

ہو نہ ہو کچھ، اس بہانے یہ تو دھندہ ہوگیا ○ قبل از تحریک باون لاکھ چندہ ہوگیا

آج کے لیڈر تو ڈر جاتے ہیں بائیکاٹ سے ○ ہے کوئی جو اس طرح چندہ ہڑپ لے ٹھاٹ سے

باوضو سب منتظر ہیں آپ قبلہ حکم دیں ○ ہم نمازِ شکر میرٹھ یا بڑودہ میں پڑھیں

آپ جیسا سُورما وہ کون ہے مائی کا لال ○ قوم سُولی پر چڑھا کر جو نمک کر دے حلال

ایک آدھا گل کھلایا ہو تو بتلائے کوئی ○ اب ہزاروں کارنامے کیسے گنوائے کوئی

کس ہنر سے آپ نے ہتھیا لیا دارالعلوم۔! ○ آپ کے اس آپریشن کی ہے دنیا بھر میں دھوم

''جشن صد سالہ'' سے تھی اس پر حکومت کی نظر ○ آپ بھی تشکیل فرما ہی چکے تھے ''مؤتمر''

دین کی خدمت کو کچھ غنڈے بلائے آپ نے ○ مادرِ علمی کے سب احساں چکائے آپ نے

مدرسہ یہ وقف ہے تعلیم و مقصد مذہبی ○ آپ اسے ''قومی'' بتائیں یا کہیں ''سوسائٹی''

لیکن حضرت جی مزے میں موت کو مت بھولیے ○ چند سانسیں منصبی لے کر نہ اتنا پھولیے

آپ نے جس دن کیا طلبا سے تخریبی خطاب ○ خیر باد اے زہد وتقویٰ زندہ باد اے انقلاب

الفراق اے علم، استادوں کی اب کیا حیثیت ○ جانتے ہیں آج سب شاگرد اپنی اہمیت

سب کو خوش فہمی ہے یہ دھندہ ہمارے دم سے ہے ○ بلکہ مسلم قوم ہی زندہ ہمارے دم سے ہے

منتظم مصروف ہیں طلبا کے استقبال میں ○ مہتمم، شوریٰ، مدرس، سب ہیں اپنی کھال میں

بے پڑھے اب فیل ہو جانے کی صورت کچھ نہیں ○ امتحان اب ہو نہ ہو اس کی ضرورت کچھ نہیں

دینیات و منطق و تاریخ و تفسیر و کلام ○ فارسی، مسلم، بخاری، ترمذی سب کو سلام

اس کو کہتے ہیں مساوی زندگی کی جھلکیاں ○ مرغ انڈے دے رہے ہیں اور اذانیں مرغیاں
آپ سے پہلے جو صُوفی، مولوی، درویش تھے ○ وہ نہ دانشمند تاجر تھے نہ دُور اندیش تھے
ان کو کیا معلوم تھا بزنس ہے کس چڑیا کا نام ○ سُود جیسی شرطیہ آمد کو کر بیٹھے حرام
وہ تو کہئے آپ نے کھلوا کے ''مسلم فنڈ ٹرسٹ'' ○ سود قانونِ شریعت میں کیا خود ایڈجسٹ
اب کسی مفتی کے فتوے پر کوئی بدظن نہیں ○ ہر ضرورت مند عادی ہو چکا اُلجھن نہیں
بس اسی بنیاد پر قائم ہے سارا کاروبار ○ یہ سیاست یہ ریاست، یہ نمائش یہ بہار
''سود عطیہ ہے''، بہت سوشل ہے یہ ایجاد بھی ○ ''باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی''
یہ مسلماں آپ سے کس منہ سے کرتے ہیں گِلہ ○ مانگتے ہیں کون سے حسنِ سعادت کا صلہ
آپ جو کچھ ہیں حکومت کی نوازش سے بنے ○ اور جمعیۃ کے صدر خود اپنی کاوش سے بنے
کوئی اندراجی سے پوچھے قدر و قیمت آپ کی ○ قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

(مؤرخہ ۱۱ر جون ۱۹۸۳ء)

پوسٹ مارٹم کے بعد صادق صابری صاحب نے مولوی اسعد صاحب پہ چند نظمیں اور کہی تھیں، جو باقاعدہ ''ملّت خور بزرگ'' نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئی تھیں، آئیے ہم آپ کے لیے وہ نظمیں بھی یہاں پیش کر رہے ہیں۔

کچا چٹھا

ہوش میں آؤ ذرا اے پاسبانِ علمِ دیں ○ اب سنبھل جاؤ ذرا اے پاسبانِ علمِ دیں
غور فرماؤ ذرا اے پاسبانِ علمِ دیں ○ یہ تو بتلاؤ ذرا اے پاسبانِ علمِ دیں

یہ تقدّس ہے تو خرمستی کسے کہتے ہیں لوگ؟
یہ ترقّی ہے تو پھر پستی کسے کہتے ہیں لوگ؟

مِلّتِ بیضاء کا قاتل کس قدر معصوم ہے ○ علم سے لاعلم ہے، اخلاق سے محروم ہے
یہ بھی مسلم قوم کا بگڑا ہوا مقسوم ہے ○ لوگ ظالم کو سمجھ بیٹھے کہ وہ مظلوم ہے

رَفتہ رَفتہ دل لگانے کا نتیجہ دیکھنا
ہر کلیدی پوسٹ پر ''بھائی بھتیجہ'' دیکھنا

......❖......

ٹیپ شاہد ہے بھری محفل میں ''اُس تقریر کا'' ○ جس میں فرمایا تھا ''منصب گوشت ہے خنزیر کا''
''صرف مقصد ہے خدا کے دین کی تشہیر کا'' ○ دوسرا رُخ بھی ذرا اَب دیکھئے تصویر کا

مہتمم سمدھی، محدِّث چھوٹا بھائی زندہ باد
''شیخِ اعلیٰ'' خود بنیں گے بے حیائی زندہ باد

جب رعونت ہو تو آجاتا ہے بھیجے میں ''خَلل'' ○ زُعم میں طاقت کے دیکھا ہی نہیں موقعہ محل
ایسی مَت اُلٹی کہ کر بیٹھے ''خدا کو بے دَخل'' ○ وَقف کی اِملاک سب ''سوسائیٹی'' میں دی بدل

اِس جسارت پر بھلا اِنعام کی اُمید کیا؟
''حُسنِ ظن'' یہ ہے تو پھر اسلام کی اُمید کیا؟

......❖......

حِرص کا ہوتا ہے جب غلبہ کسی انسان پر ○ پھر وہ قائم رہ نہیں سکتا کبھی ایمان پر
خانقاہ و مسجد و مکتب، کسی عُنوان پر ○ آخرش اُس کی نظر پڑتی ہے قبرستان پر

اِن ٹھکانوں پر ٹھگا جائے تو غُل مچتا نہیں
اور ''بڑے حضرت کا'' کاٹا تو کبھی بچتا نہیں

کیسے بچ سکتا ہے کوئی شامتِ اعمال سے؟ ○ ڈھونگ سے، بہروپ سے دھوکہ دھڑی کے جال سے؟
چھل کپٹ سے، جھوٹ سے جُل سے دغا سے چال سے؟ ○ بعد سب حربوں کے دسترخوان کے تر مال سے؟

سیکڑوں پھندے ہیں کس کس سے بچے گا آدمی؟
یہ تو پَنڈے ہیں یہاں ہوتی ہے ''شُدھی'' لازمی

ذہن میں مُرشد کے جب آیا وراثت کا خیال ○ ہر طرف پھینکا گیا آل اِنڈیا چندے کا جال
باقی مسلم فنڈ سے حاصل کیا مالِ حلال ○ نام پر بیٹے کے تب جا کر بنا ''محمود حال''

لوگ سمجھے شیخ محمودؔ الحسن کی یادگار
اِس کو کہتے ہیں میاں اِک تیر سے دو دو شکار

دین سے دُنیا کمانا آپ سے سیکھے کوئی ○ مذہبی ''حیلہ'' بہانہ آپ سے سیکھے کوئی
سود جائز کر کے کھانا آپ سے سیکھے کوئی ○ یہ ''تجاہلِ عارفانہ'' آپ سے سیکھے کوئی

کمپنی گھاٹے میں ہے لیکن ''بڑوں کی ساکھ'' ہے
آج بھی چندے کی آمد کم سے کم دَس لاکھ ہے

شرم دُنیا کی، نہ رَغبت دین کی تعلیم سے ○ دس گُنا ہے مُرشدی کی حرص ''ہفت اقلیم'' سے
کوئی یہ پوچھے جمعیۃ کی ''بھکاری ٹیم'' سے ○ قوم کو کیافائدہ ''چندہ بٹور اِسکیم'' سے؟

اصل میں ''چندہ کرنسی'' خود اِنھیں آتی ہے رَاس
لگزری، عِشرت کدے، شاہی غذا، اُجلے لباس

سچ سمجھ، گر پیر کہہ دے ''بیل کے بچّہ ہوا'' ○ آخرت بگڑی عقیدت میں اگر کچّا ہوا
اِرتقا کا خواب جو دیکھا تھا، سَب ''سچّا'' ہوا ○ شعبۂ طِب کی بھی ٹپ ٹِپ بُجھ گئی اچھا ہوا

آج تکمیلِ ادب، دارالصنائع بند ہیں
یعنی روزی کی ٹریننگ کے ذرائع بند ہیں

مُرشدی بیعت جسے کرلیں وہ ''پکا جنّتی'' ○ اور خلافت بھی عطا کردیں تو یہ خُوش قسمتی
خدمتِ اَقدس میں گر رکھ لیں تو دو دن میں ولی ○ تیسرے دن چیختا پھرتا ہے اِنساں ''یاعلی''

جِس کے سَر پر ہاتھ رکھ دیں ''مہتمم بے چارج'' ہو
جس سے خوش ہوجائیں مُسلم فنڈ کا ''اِنچارج'' ہو

ماشاءاللہ شیخ تو اس دَور کے کِنگ کانگ ہیں ○ بَس کہ اُنکے سامنے سب ''مُرغ وزن'' بے بانگ ہیں
''ایم پی'' ہونا نہ ہونا تو سیاسی سانگ ہیں ○ شیخ کے تو کَن کھجورے کی طرح سوٹانگ ہیں

ایک آدھی ٹوٹ بھی جائے تو کیا ماتم کریں
جِن کے مُرغے کی طرح دو ٹانگ ہوں وہ غم کریں

مُرشدی کا اِکتفا ہے دوسروں کے مال پر ○ دین کی دُھن ہے مگر سَرکار کے سُر تال پر
باقی صُوبے چھوڑ رکھے ہیں اُنھیں کے حال پر ○ آج کل نظروں کا فوکس سیٹ ہے بنگال پر

اِن میں کوئی ہم زباں، ہم راز، ہم پیشہ نہیں
''بھوکے بنگالی'' ہیں اِن سے کوئی اندیشہ نہیں

''ہاتھیوں'' سے کیا گِلہ، رِنگ ماسٹر تو آپ ہیں ○ اہتمام و مجلسِ شوریٰ کے ''مائی باپ'' ہیں
دین میں چاہے نہ ہوں دُنیا میں لیکن ٹاپ ہیں ○ یہ کرامت کم نہیں ''بے تول اور بے نَاپ'' ہیں

آپ کا سِگنَل نہ ہو تو کوئی گُل کِھلتا نہیں
آپ جیسا ''پارسا'' اِس دَور میں مِلتا نہیں

شیخ تو مَنصب چلے جانے سے کچھ دُبلے ہوئے ○ اور جہاں پوشاک بدلی ایک دَم اُجلے ہوئے

غیر مُلکی قیمتی میک اَپ کیا، بگلے ہوئے ○ معتقد سمجھے کہ حضرت ''نُور کے پُتلے'' ہوئے

ایسی شخصیت کرشمہ ساز اَب کوئی نہیں
اِس قدر اُونچا ڈرامے باز اَب کوئی نہیں

آپ عہدے پر رہے دس سال ''سرکاری دلال'' ○ ہم مُسلمانوں پہ کیا گزری کبھی آیا خیال؟
اپنی چلتی میں کبھی بخشا کسی کا جان و مال؟ ○ آج منصب چِھن گیا تو اِس قدر حُزن و مَلال

بَس خدا ہی جانتا ہے کس طرح ٹوٹا غُرور
یہ سُنا تھا ''بےحیا سے ہر بلا رہتی ہے دُور''

اُن کو دولت پر مجھے اپنے خدا پر ناز ہے ○ جو زباں سے کہہ رہا ہوں قلب کی آواز ہے
میں نجومی تو نہیں لیکن مِرا انداز ہے ○ خود عُروجِ مستقل اِس بات کا غمّاز ہے

ڈھیل کافی مِل چکی ہے اَب پتنگ کٹنے کو ہے
صبحِ صادق ہو چلی ہے اور پو پھٹنے کو ہے

کرسی سے چٹائی تک

محوِ حیرت تھے ملائک، بُھوت اور جن و بشر ○ جب سُنا ''صدرِ جمعیۃ'' ہوگئے ''کُرسی بَدر''
اَب اُنھیں خیرات کا منصب نہیں ہوگا عطا ○ شیخ کُرسی سے چٹائی پر کریں گے اِکتفا
اِتنا سُنتے ہی بھنبیری ہوگئے ''عزت مآب'' ○ اِس منتر کی خوشامَد، اُس منتر سے خطاب
اِک عجب ہیجان ''قبلہ شیخ چلّی'' میں رہا ○ لکھنؤ میں دِل رہا تو ذہن دِلّی میں رہا
لاکھوں خط لکھے، ہزاروں تار دلوائے گئے ○ مقتدر لوگوں سے ٹیلیفون کروائے گئے
سادھوؤں، سنتوں، سیانوں سے ملے حسبِ مزاج ○ اِن ''بزرگوں'' نے کیا ''حضرت'' کا ''رُوحانی علاج''
جوتشی کو زائچہ، پامسٹ کو دِکھلائے ہاتھ ○ دو ''اکابر'' نے کیا قسمت کا چکینگ ایک ساتھ
منتیں مانیں، کبھی قبروں کا فرمایا طَواف ○ اور بھی جم کر کیا ''کوآپریٹو اعتکاف''
اِس قدر نفلیں پڑھیں، شیطان بھی گھبرا گیا ○ جَب بُتوں نے رنج پہنچایا خدا یاد آگیا
جادو، ٹونے، ٹوٹکے، تعویذ اور گنڈے کیے ○ سِفلی، رحمانی، سیاسی سارے ہتھکنڈے کیے
اِس ''مِشن'' پر خرچ پانی کی طرح پیسہ ہوا ○ جیسی دولت تھی میاں اَسراف بھی ویسا ہوا
جب کُھلے پتے تو قسمت کا لکھا ہو کر رہا ○ اِبتداء میں جس کو کاٹا تھا وہی ''جوکر'' رہا

آخرش یہ فیصلہ ''دربارِ دہلی'' کا ہوا ○ ''دیوبندی'' سیٹ پر قبضہ ''بریلی'' کا ہوا

بلبلا اُٹھے یہ سُنتے ہی ''مُرید باَصفا'' ○ ہوگیا ہر ''معتقد'' راجیو گاندھی سے خَفا

لوگ حیراں تھے کہ کیسے ''نامِ نامی'' کٹ گیا ○ کِس بنا پر ''بیکل اُتساہی'' کا سودا پَٹ گیا

جا بجا اس حادثے پر تبصرے ہونے لگے ○ ''شیخ'' جب ایوان سے نکلے تو سب رونے لگے

کوئی کہتا تھا ''وزارت اَب نہیں چل پائے گی'' ○ کچھ کا دعویٰ تھا ''حکومت جلد ہی گر جائے گی''

سب کو شِکوہ تھا کہ ''حضرت'' کو ہٹایا بے قصور ○ نامُرادوں پر خدا کا قہر ٹوٹے گا ضرور

ایسا ''گیٹ آؤٹ'' کیا جیسے ضرورت ہی نہ تھی ○ اِس کا مطلب یہ ہوا کچھ ''قدر و قیمت'' ہی نہ تھی

اَب سیاست ایک ''نوٹنکی'' ہے ہندوستان میں ○ بھانڈ۔ بھَڑوے اور شاعر بھر لیے ایوان میں

ایک ''بنگالی'' یہاں تک کہہ گیا جذبات میں ○ کھوٹ ہے سارا فقط ''راجیو'' ہی کی ذات میں

چھوڑ دوں ''بھیروں'' اگر، سب کا ''کلیجہ چاٹ لے'' ○ ''بھینٹ کالی مائی'' کی دیدوں تو مُنڈی کاٹ لے

سب کسی ''ہارے جُواری'' کی طرح پُر جوش تھے ○ اور ''حضرت'' ایک ''بیوہ'' کی طرح خاموش تھے

الغرض سب ''اہلِ خدمت'' ماہی بے آب تھے ○ جن سے ''حضرت'' سُرخرو تھے یہ وہی ''سُرخاب'' تھے

''ڈِسکشن'' یہ تھا کہ ناکامی کے کیا اسباب ہیں؟ ○ جن سے خوش ہوجائیں ''حضرت جی'' وہ کیا آداب ہیں؟

''داغِ رسوائی'' کو کس صابن سے دھونا چاہئے؟ ○ احتجاجاً اَب کہاں ''اجلاس'' ہونا چاہئے؟

فکر یہ تھی اِن کا ماضی تھا نہایت ''داغدار'' ○ کاٹھ کی ہنڈیا کبھی چڑھتی نہیں ہے بَار بَار

دفعتاً اک آہ حضرت نے بھَری مانندِ فیل ○ جیسے زخمی سانپ کی پھُنکار ہوتی ہے طویل

پھر یہ فرمایا کہ ''سب خدشات بے بنیاد ہیں'' ○ کیا مسلمانوں کو ''پچھلے غم'' ابھی تک یاد ہیں؟

سوچنا یہ ہے مسلماں کس طرح ''جُل کھائیں گے''؟ ○ آج ہم جذبات کس ''عنوان'' سے بھڑکائیں گے؟

مُتفق سب تھے کوئی تحریک لانی چاہئے ○ ''مُلک و مِلّت'' کی طرح ''پاوَر'' دِکھانی چاہئے

یہ ''ڈرامہ'' حُسن و خوبی سے اگر کھُل جائے گا ○ قوم جائے بھَاڑ میں ہم کو ''صِلہ'' مل جائے گا

اَب مُسلماں قوم کو ''ہشیار'' رہنا چاہیے ○ ''زخمِ نو'' کے واسطے تیار رہنا چاہئے

تجزیہ

علم کا سارا کریڈٹ کر چکے دُنیا میں کیش ○ ایک دم زرّیں قبا، شاہی غذا، مائنڈ فریش

مولوی کو اَب کسی فردوس کی حسرت نہیں ○ قوم کے مالِ غنیمت پر اُڑایا خوب عیش

حُبّ وطن

مولوی کا مُلک سے اخلاص لاثانی مِلا ○ کھادی کی سِلکی قبا میں جوشِ ایمانی مِلا
جیب کترا محوِ حیرت رہ گیا جب جیب سے ○ چائنا کی ڈائری اور پین جاپانی مِلا

گیدڑ بھبھکی

جب ہوئی اخبار میں شائع بغاوت کی خبر ○ محوِ حیرت تھا کہ پھر گرجا ہے کیوں شیرِ ببر؟
قوم پر آفت ہوئی نازل کہ شیطانی بلا؟ ○ پھر کوئی طوفان آیا، یا بھیانک زلزلہ؟
طے شدہ سازش ہے کوئی یا سیاسی مرحلہ؟ ○ کون سی بجلی گری جس پر ہے یہ شکوہ گِلہ؟
ہم مسلمانوں کا استحصال تو برسوں سے ہے ○ آج کیا، جمہوریت پامال تو برسوں سے ہے
آپ کو فرصت کہاں جو دیکھتے مِلّت کا حال ○ سَر پڑی تو آگیا آسام والوں کا خیال
اَب مُسلماں خوب واقف ہو چکے اِس راز سے ○ آپ کو کس درجہ دلچسپی ہے "مسلم کاز" سے
رَنج کا باعث مُسلماں ہیں نہ حق ووٹ ہے ○ جو اُبھر آئی زباں تک اپنے دل کی چوٹ ہے
اَب سُنا ہے کثرتِ رائے سے ہے "منصب کا چانس" ○ چور دروازہ مقفل ہو چکا ہے، ایڈوانس
وہ بنے گا ایم پی جو مُنتخب ہو جائے گا ○ گر یہ پالیسی رہی جاری غضب ہو جائے گا
یہ خبر اہلِ خوشامد کے لیے منحوس ہے ○ آج کمپیوٹر کے ہاتھوں عزت و ناموس ہے
ہم شریفوں تک سے بدظن ہے قیادت دوستو ○ جب یہ صورت ہے تو اعلانِ بغاوت دوستو
جاگ اُٹھا ہے اَب ہمارے دل میں اسلامی وقار ○ ہم کو ہونا چاہیئے حق بات پر جو تم بیزار
مسئلہ آسام کا آنے لگا اَب ہم کو یاد ○ "بائی گوڈ" ایمانداری سے کریں گے ہم جہاد
خود مُرادآباد میں لاشوں کو گن کر آئیں گے ○ موڈ گر آیا تو اِک تقریر بھی فرمائیں گے
بے خطر ہم سے ملیں جو مَر گئے تھے روزِ عید ○ یہ سُنا ہے زندۂ جاوید ہوتے ہیں شہید
آستینوں سے نہ پونچھے اپنی "پی اے سی" لہو ○ اِس کے ہر دَھبے سے کرنی ہے "سیاسی گفتگو"
لاکھ دیر آید دُرست آید ہے میرٹھ کا ملال ○ دیکھنا باسی کڑھی کو کیسے آتا ہے اُبال
گشت کرنا ہے جہاں پر ہو چکے خونی فساد ○ سَب گڑے مُردوں کو دِلوائیں گے ہم حق العباد

وقت ایسا آپڑا سب حادثے یاد آگئے ○ چشم پوشی جن سے کی وہ سانحے یاد آگئے
آج سمجھے ہم بھی ہیں فرقہ پرستی کا شکار ○ ہم سے ملنے تک سے کتراتے ہیں اہلِ اقتدار
اِن کو دِکھلانے پڑیں گے اپنے جوہر کیا کریں؟ ○ ہم سے برگشتہ ہوئے بیٹھے ہیں شوہر کیا کریں؟
اِن شاءاللہ اینٹ کا دینا ہے پتھر سے جواب ○ کیا ہم اس کے اہل ہیں ''واللہ اعلم بالصواب''
ایسی صورت میں بھلا کیوں کر نہ ہوتا اِختلاج ○ ہم کہ تنگ آید بہ جنگ آید کریں گے احتجاج
ہم تو فیمس ہیں اسی اِک خوبیٔ کردار سے ○ ہم کبھی مِلّت سے باغی ہیں کبھی سَرکار سے
اَب جمعیۃ کچھ نہ کچھ جلوہ دِکھائے گی ضرور ○ ''مُلک وملّت'' کی طرح ڈھرّا اچلائے گی ضرور
کُرسی خطرے میں نظر آنے سے ہے فطری خَلِش ○ اِس کی آفر ہو تو سب الزام ''ٹائیں ٹائیں فِش''
آپ خاموشی سے اپنا کام دَھندہ کیجیے ○ قوم کی خدمت کو ہم کافی ہیں ''چندہ دیجیے''

ردِّعمل

کان پکڑی بھیڑ بھی کرنے لگی ہے ''احتجاج'' ○ چھن گئی لاٹھی تو اَندھے کو نظر آنے لگا
یا الٰہی! اِن مُسلمانوں کو دے عقلِ سلیم ○ مولوی صاحب کو پھر مِلّت کا غم کھانے لگا

چمتکار

چندہ ہر ایک کو نہیں ملتا ○ یہ بھی فن مولوی کو آتا ہے
جو کسی کا اُدھار لے کے نہ دے ○ وہ یہاں کیش گِن کے جاتا ہے

مشورہ

مولوی صاحب سیاست آپ کے بَس کی نہیں ○ آپ ''چندہ مارکہ'' تبلیغ فرماتے رہیں
روٹیاں سَرکار کے کوٹے سے مِلتی ہیں تمہیں ○ بوٹیاں مِلّت کی حاضر ہیں انھیں کھاتے رہیں

گارنٹی

مولوی اس دُھن میں ہے فارِن کا باشندہ ملے ○ گانٹھ کا پورا، مُخیّر، عقل کا اندھا ملے
چور ہو، شاطر ہو، اِسمگلر ہو، رشوت خور ہو ○ کوئی ہو، جنت کی گارنٹی، اگر چندہ ملے

تقویٰ

مولوی گفتگو کے غازی ہیں ○ متقی، پارسا، نمازی ہیں
کھے رہے ہیں یہ کشتیٔ اسلام ○ اس لیے تن، بدن جہازی ہیں

فنکاری

اَب یہ اُس کا فن ہے، کس درجہ ڈرادے مولوی ○ بس! بقدرِ خوف چندے کی رقم مل جائے گی
ذکرِ عقبیٰ، فکرِ دُنیا پر اگر حاوی رہا ○ پھر کوئی وعدہ نہ ہوگا ایک دَم مل جائے گی

تجربہ

سال چندے کا سود مند نکلا ○ یہ تو بزنس بڑا بلند نکلا
قوم لُٹتی رہی ''عقیدت'' میں ○ مولوی جی کے ''گھر کا گند'' نکلا

فِطرت

مولوی جی تو وعظ فرما کر ○ ہوگئے خود عمل سے بیگانے
زندگی بھر تو عیش سے گزری ○ عاقبت کی خبر خدا جانے؟

مہارت

کس قدر ماہر ہے ذکرِ آخرت میں مولوی ○ لوگ چندے کی رقم دیتے ہوئے تھکتے نہیں
اور اگر رقت بھی طاری ہو بیاں کے ساتھ ساتھ ○ پھر تو اہلِ خیر کیا، کنجوس بچ سکتے نہیں

دُور اندیشی

موت اچھی ہے گر رزق میں ہو کٹھنائی ○ پَرواز کی اسپیڈ میں رکھ کوتاہی
اے طائرِ لاہوت نہ اقبالؔ کی مان ○ مولانا جو فرمائیں، وہی کر بھائی

تلخ حقیقت

مورخ نکتہ چیں، تاریخ نادم، کیا کہا جائے؟ ○ قیادت کرنے والے بھیک لینے پر اُتر آئے
خدا رکھے تجھے اے مولوی تلوار رکھوادی ○ جہادِ فی سبیل اللہ یہ ہے مانگ کر کھائے

مشاہدہ

وعظ ہو، تدریس ہو، تبلیغ ہو، تقریر ہو ○ مولوی غافل نہیں خیرات کی ترغیب سے
اہلِ دولت کو پٹالینا کوئی آساں نہیں ○ گانٹھ سے پیسہ نکلتا ہے بڑی ''ترکیب'' سے

اِلزام

یہ غلط اِلزام ہے، وَعدہ وَفا کرتے نہیں ○ مولوی صاحب کبھی اپنا کہا کرتے نہیں
''مُرغ وماہی'' ہوتو پھر ان کی بَصیرت دیکھئے ○ یہ نمازیں چھوڑ دیں، دعوت قضا کرتے نہیں

فراڈ کی سینچری

ایسے کرتب ہو رہے ہیں بالعموم ○ جن سے رُسوا ہوگیا ''دارالعلوم''
اک فراڈ ایسا ہوا پچھلے برس ○ بول اُٹھا شیطان بھی اُستاد بس
کُچھ مدرّس رکھے جانے تھے نئے ○ یعنی کچھ ''ہم ظرف'' لانے تھے نئے
یُوں چھپا اخبار میں اک پمفلیٹ ○ ہیں ہمیں درکار ایسے کنڈیڈیٹ
جو ہمارے سے بڑے عالم نہ ہوں ○ فِطرتاً ہوں، ''شکل سے ظالم نہ ہوں''
''جی حضوری'' میں کبھی چُوکیں نہیں ○ تُھوک کر چاٹیں؛ مگر تھوکیں نہیں
دین کی خدمت نہ ہو جن کا شعار ○ خود غرض ہوں کم سے کم ''فائیو سٹار''
جو بہت عیّار اور سفّاک ہوں ○ بے حیا، کم ظرف اور چالاک ہوں
عقل سے پیدل ہوں، پتّھر کی لکیر ○ دیکھتے ہی مان لیں ''حضرت کو پیر''
ہاتھ پر مُرشد کے خود بیعت کریں ○ فُل کرنسی حاضر خدمت کریں
جن میں اِنٹرنیشنل ہوں یہ ڈِیفیکٹ ○ وہ ''چُھپے رستم'' کیے جائیں سَلیکٹ

سَب کی ''پے'' حسبِ خوشامد ہی رہے ○ کان اُوپن ہوں، زباں گونگی رہے
اِک کمیٹی کو ملا یہ اختیار ○ چھانٹ لے، جھوٹے، مُنافق، ہوشیار
اِن میں اک جج ''اکبرآبادی'' بھی تھے ○ کچھ نئے مُجرم، تو کچھ عادی بھی تھے
دوسرا جج شیخ کا ''ہمزاد'' تھا ○ سارے ناٹک کی یہی بُنیاد تھا
آخرش اِک دن ہوا اِنٹرویو ○ باری باری بالمشافہ گفتگو
سارے قابل لوگ آئے تھے مگر ○ اِس کمیٹی نے کیا ''صرفِ نظر''
اِک ''بہاری مولوی عثمان'' تھے ○ جو نہایت نیک دل انسان تھے
یہ بہت ذی علم تھے اور پاکباز ○ بَس یہی تھا اُن کی ''ناکامی کا راز''
ایسی آسامی کہاں درکار تھی ○ قابلیت تو یہاں بے کار تھی
حکم یہ صادر ہوا ''گھر جائیے'' ○ ''کال لیٹر'' جب ملے، تب آئیے
طے ہوئی اسکیم یہ بالاتفاق ○ ایک سازش، اِک بہت بھونڈا مذاق
اس ڈرامے کا ہوا یوں اختتام ○ ہوگئی ساری کمیٹی ''بے لگام''
بھیجنی تھی اور نہ بھیجی اِطلاع ○ حکم مرشد سے ہوا سارا نزاع
اَب کھلا عقدہ تو دی ہر اِک نے داد ○ زندہ باد اے ''بے حیائی'' زندہ باد
آپ بھی یہ سُن کے سَر دُھنیے جناب ○ پار سانگے ہیں، عالم بے نقاب
سارا ہنگامہ ہوا جس کے تھُرو ○ جس کمیٹی نے لیا اِنٹرویو
اُس کے ممبر خود ملازم ہوگئے ○ مرکزی شعبوں کے ناظم ہوگئے

''قومی لیوِل'' پر ہوئی سب دھاندلی
کتنے مخلص ہیں ''جمعیۃ کے وَلی''

(ماخوذ: ملت خور بزرگ، ناشر: شہناز پبلشنگ ہاؤس دیوبند)

......❖......

''دارالعلوم کی جامع ومختصر تاریخ''، صفحہ نمبر ۱۰۹ ر پہ لکھا ہے کہ ''رابطۂ مدارس اسلامیہ کا عظیم الشان اجلاس عام ہوا اور حکومتِ ہند کے مرکزی مدرسہ بورڈ تجویز کی شدید مخالفت کی گئی۔ جس کے بعد حکومت نے اس اقدام سے گریز کیا'' یہ عبارت لکھ کے فاضل مرتب صاحب کیا بتانا چاہ رہے ہیں وہ تو وہی جانیں؛ کیونکہ اس اجلاس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ حکومت بدلتے ہی دارالعلوم کا وقار بھی ختم ہوگیا۔ اور یہ مدرسہ بورڈ تجویز عملی طور پر شروع کر دی گئی جس کے تحت ملک کے مختلف علاقوں میں بہت سے مدارس بند کر دے گئے۔ اور بہت سے مدرسوں کو مدرسہ بورڈ میں شامل کرلیا گیا۔

اور تو اور دارالعلوم میں بھی حکومت کی دست درازیاں زور پکڑنے لگیں، تمام ملازمین کے زبردستی بینک میں اکاؤنٹ کھلوائے گئے اور دارالعلوم حکومت کے سامنے مجبور و لاچار نظر آیا۔ یومِ آزادی و یومِ جمہوریہ پہ صدر دروازے پر جھنڈا لہرایا جانے لگا۔

یہی حال ۲۰۰۸ میں کی گئی ''کل ہند دہشت گردی مخالف کانفرنس'' کا ہوا۔ اس سے بھی ملک کے مسلمانوں کو کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا۔ آج بھی بے قصور مسلمانوں پر ظلم جاری ہے۔ اسی صفحہ پر ۱۴۰۸ ر واں سال کے تحت فتاویٰ دارالعلوم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''ترتیب فتاویٰ دارالعلوم کے نئے سلسلہ کا آغاز ہوا اور حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کے فتاویٰ پر مشتمل تیرہویں جلد شائع ہوئی''۔

کم نسب اور نااہل لوگ جب کسی علمی کام کو کرنے کے لیے بیٹھ جاتے ہیں تو اس کے اندر اخلاص کے ساتھ کام کرنے کے بجائے نام ونمود کی خواہش پہلے پروان چڑھتی ہے۔ یہی یہاں بھی ہوا۔ فتاویٰ دارالعلوم کے بارے میں آپ جانتے ہی ہوں گے۔ دارالعلوم کے اوّل مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی میں دارالعلوم کے مفتی کی حیثیت سے مسندِ افتاء پر جلوہ افروز رہتے ہوئے جتنے بھی فتوے دیے ہیں ان میں سے زیادہ تر سب پرانے رجسٹر میں درج ہیں، انھیں کو جدید ترتیب وعنوان کے ساتھ جمع کر کے شائع کیا جاتا ہے۔ جس کی اب تک ۱۸ ر جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ابتدائی ۱۲ ر جلدیں دارالعلوم کے سابق مفتی مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی صاحب نے ترتیب دی تھیں۔ ۲۰۰۹ کی جس جدید ترتیب کا ذکر فاضل مرتب نے کیا ہے اس کے کام کرنے والوں نے خودنمائی کی اسارت میں رہتے ہوئے جب تیرہویں جلد کے ساتھ ساتھ جلد اول تا دوازدہم (۱۲) بھی شائع کی تو اس کے اوپر سے مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب کا نام غائب کر دیا تھا۔ اصل کام جس نے کیا تھا اسی کا نام کتاب کے ٹائٹل پہ سے صاف کر دیا گیا، کس لیے؟ ظاہر ہے اپنے نام کے لیے تاکہ بس ہمارا ہی نام فتاویٰ کی ترتیب کرنے والوں میں رہے۔ کوئی اس کا شریک نہ ہو؛ لیکن یہ خواہش زیادہ دن تک پوری نہ رہ سکی۔ اور اس بدعملی سے بے زار ہو کر کچھ حساس اور باظرف طلبہ نے ایک شکایتی مضمون اخبار میں شائع کیا، جس

سے دارالعلوم کی انتظامیہ نے اپنی آنکھوں پر بندھی ہوئی بےخبری اورلاپرواہی کی پٹی کھولی اور پھر جب دوبارہ کتاب شائع ہوئی تو مفتی ظفیر الدین کانام قدیم مرتب کی حیثیت سے کتاب پر چھاپا گیا۔

یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ جب مفتی ظفیر الدین صاحب ابتدائی جلدوں پر کام کر کے جا چکے ہیں اور سالہاسال سے وہی جلدیں شائع ہو رہی تھیں تو پھر ان شائع شدہ جلدوں پر کچھ بھی اضافی کام کرنے کی کیا ضرورت تھی ۔جدید مرتب کو تیرہویں جلد سے کام کرنے کا ذمہ دیا گیا تھا، انھیں یہی کرنا تھا؛لیکن خودنمائی کے اُس شوق کا کیا کیا جائے جس کے سبب یہ سوچا گیا کہ جب ۱۳ سے ۱۸ جلدوں تک میرا نام شائع ہوگا تو کیوں نہ اول تا اٹھارہ پورے سیٹ پرمیرا ہی نام شائع ہو۔اسی نام کی خواہش میں ابتدائی جلدوں پربھی ذرا اور اسا غیر ضروری اضافی کام کر کے یہ کیا گیا کہ مفتی ظفیر الدین کا نام ہٹا کر بس جدید مرتب نے اپنا نام چسپاں کردیا وہ تو اللہ بھلا کرے ہوشمند اور صاحبِ بصارت طلبہ کا کہ جنھوں نے وقت رہتے اس ناانصافی کا ادراک کرتے ہوئے اس کے خلاف ایکشن لیا اور اس پر قدغن لگانے میں کامیاب ہوئے۔

چھوٹی چھوٹی سی بہت سی غیر ضروری باتوں کا سال بہ سال ذکر کرنے والے فاضل مرتب صاحب نے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا اور کتاب کو جامع کا عنوان دے بیٹھے ہیں۔ یہ تاریخ نہیں بلکہ فقط مدح وستائش کا پلندہ ہے۔

اخلاقی فرض

ایک بات اور اخلاقی فرض کے تحت ہم عرض کرنا چاہتے ہیں۔آپ نے بھی اکثر سنا ہوگا کہ ''یہ تمہارا اخلاقی فریضہ ہے''۔تو اخلاقی فریضہ اُس کو کہتے ہیں جس میں انسان کے اوپر حسنِ اخلاق کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے ایک ذمہ داری عائد ہوتی ہے،جس کا کرنا بلاشبہ کارِثواب ہے اور نہ کرنے سے کوئی گناہ لازم نہیں آتا۔جیسے کسی سے کام لینے کے بعد اس کا شکریہ ادا کرنا۔شکریہ ادا کرنا بھی اخلاقی فرض ہے؛لیکن اگر آپ شکریہ ادا نہیں کرتے تو آپ کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوں گے؛لیکن حسنِ معاشرت کے سبب ایسا نہ کرنا اچھا نہیں لگتا۔

ایسے ہی ایک اخلاقی فریضہ دارالعلوم کی انتظامیہ پہ بھی عائد ہوتا ہے جس کو یہ کبھی ادا نہیں کرتے۔ دنیا میں کہیں نشرواشاعت کا ادارہ ہو یا کوئی صاحبِ اخلاق مہذب پبلشر جب بھی کسی مصنف کی کتاب شائع کرتا ہے تو کتاب کا ایک نسخہ مصنف کے گھر ضرور بھیجتا ہے۔خاص طور پر اُن مصنفین کے یہاں جو کسی قسم کی رائلٹی طلب نہیں کرتے۔ جب جب کتاب کا ایڈیشن شائع ہوتا ہے ایک نسخہ مصنف کے گھر بھیج دیا جاتا ہے بغیر اِس بات کا خیال کیے کہ ہر سال کتاب شائع ہو رہی ہے اِس حساب سے مصنف کے گھر ہر سال ایک کتاب پہنچ کر بہت سی کتابیں جمع ہو جائیں گی۔ نہیں اِس خیال کو وہ خاطر میں نہیں لاتے،ویسے بھی ہر صاحبِ عقل جانتا ہے کہ مصنف کے گھر جمع ہوئی کتابیں وہ خود

ضرورت مند علمی مزاج شخص کو ہدیہ میں دے دیتا ہے۔ایک بات اور، پبلشر کی طرف سے ایک کتاب ہدیہ کرنے کا یہ عمل تااشاعت چلتا ہے۔

مصنف جب دنیا سے چلا جاتا ہے اس کے بعد بھی ہر نئی اشاعت پہ ایک نسخہ اس کی اولاد و احفاد کو بھیجا جاتا ہے؛لیکن دارالعلوم کی طرف سے آج تک فتاویٰ دارالعلوم کی ایک جلد بھی مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کے گھر نہیں بھیجی گئی۔حالانکہ جب دارالعلوم میں کوئی مہمان آتا ہے تو اس کو بہت سی کتابیں ہدیہ کر دی جاتی ہیں؛لیکن تنگ نظری کی اس سے بڑی علامت اور کیا ہوگی کہ جن مفتی اعظم حضرت عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کے فتاویٰ کو شائع کر کے فتاویٰ دارالعلوم کے نام سے دارالعلوم کی طرف سے ایک معتبر کتاب کی طرح پیش کیا جاتا ہے،اس کتاب کا ایک سیٹ بھی آج تک مفتی صاحب کے گھر نہیں بھیجا گیا۔اگر چہ محلہ شاہ رمزالدین میں مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کا گھر اور ان کے احفاد آج بھی موجود ہیں۔

بتائیے قارئین!کیا دارالعلوم کی انتظامیہ کا یہ اخلاقی فرض نہیں ہے کہ جب بھی فتاویٰ دارالعلوم شائع ہو،اس کا ہر جدید ایڈیشن ایک سیٹ کی شکل میں مفتی صاحب کے گھر ضرور بھیجا جائے۔تقریباً پندرہ لاکھ روپئے کی کتاب میں سے اگر فقط پندرہ سو روپئے کی ایک کتاب ہدیہ بھیج دی جائے تو اس سے دارالعلوم کے وقار میں بھی اضافہ ہوگا اور یقیناً مفتی صاحب کی روح کو بھی خوشی ملے گی۔ایسے ہی فخر الہند مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی کتاب ''اشاعتِ اسلام'' بھی ہر ایڈیشن پہ ضرور ایک عدد بھیجنی چاہئے؛کیونکہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مفتی صاحب کے چھوٹے بھائی تھے۔

اور ہاں!فقط ان دو بھائیوں کی ہی نہیں؛بلکہ تمام مصنفین کی کتابیں جو دارالعلوم نے چھاپی ہیں ان کا ایک ایک نسخہ ہر اشاعت پر اس کے مصنف کے گھر ضرور بھیجنا چاہئے۔بلا شبہ یہ ایک اخلاقی فرض ہے۔

۱۴۹ اروان سال کے تحت صفحہ نمبر ۱۱۰ پہ مولانا غلام وستانوی صاحب کو مہتمم بنانے کے بعد بس ایک سطر لکھی ہے کہ''دارالعلوم میں حالات خراب ہونے کی وجہ سے ربیع الاوّل میں مجلسِ شوریٰ دوبارہ بلائی گئی'' حالات کیا خراب ہوئے؛کیوں ہوئے،اس کی کوئی تفصیل اس تاریخی کتاب میں نہیں ہے۔اس کی تفصیل ہم گزشتہ صفحات میں درج کر آئے ہیں،جو بلا شبہ آپ نے ملاحظہ کر لی ہوگی۔

.....❖.....

اس کے بعد صفحہ ۱۱۳ ارسے''موجودہ دَور کی ترقیات'' کے عنوان سے چھ صفحات پر کچھ جھوٹ اور کچھ سچ کے ساتھ دارالعلوم کے تعلیمی نظام وشعبہ جات اور تعمیرات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔آپ ہمارے درج بالا جملے سے حیران نہ ہوں۔اب تک کی کتاب پڑھنے کے بعد آپ کو یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ہم نے بلا وجہ،بلا تحقیق یا بلا دلیل کوئی بات پوری کتاب میں نہیں لکھی۔اب''کچھ جھوٹ'' لکھ کر ہم الزام نہیں لگا رہے ہیں؛بلکہ حقیقت بیان کر رہے ہیں۔ان چھ

صفحات میں بہت کچھ ایسا ہے جو فقط مدح سرائی ہے حقائق نہیں۔ہم یہاں سب پر تو روشنی نہیں ڈالیں گے کہ اس کی ضرورت بھی نہیں ہے،بس ایک بات مثال کے طور پیش کیے دیتے ہیں۔

صفحہ نمبر ۱۱۶ پہ سطر نمبر ۱۶ اور سترہ میں یہ عبارت لکھی ہے (شیخ الہند اکیڈمی سے)''نوجوان فضلاء کی ایک ٹیم تیار ہوئی ہے جو صحافت اور مضمون نگاری کے میدان میں اہم خدمات انجام دے رہی ہے''۔اس عبارت کو لکھنے کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے فاضل مرتب صاحب بس یہ بتادیں کہ ہندوستان کا وہ کون سا اخبار ہے جس میں دارالعلوم کی اس ٹیم کے طلبہ اپنی صحافتی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ہمیں تو کسی اخبار میں شیخ الہند اکیڈمی کے طلبہ کی اس ٹیم کے افراد اپنے قلم کا جادو چلاتے ہوئے نظر نہیں آتے۔اور مضمون نگاری میں بھی کوئی خاص نمایاں کردار کسی کا سامنے نہیں ہے۔ذرا ایک دو کے نام تو پتہ چلیں کہ آخر دارالعلوم نے جدید دَور میں کون سے قلم کار پیدا کر دیے ہیں۔فاضل مرتب محمد اللہ صاحب خود کو قلم کار سمجھنے کی خوش فہمی میں مبتلا ہیں،تو الگ بات ہے۔ایسے قلم کار تو دارالعلوم ہی کو مبارک،دنیا کو ایسے چاپلوس اور قلم کے ساتھ کھلواڑ کرنے والوں کی ضرورت نہیں ہے۔

......❖......

عمارات دارالعلوم اور اُن کا تعارف

صفحہ نمبر ۱۱۹ سے نئے عنوان کا آغاز ہوتا ہے جس میں دارالعلوم کی عمارات کا ذکر کیا گیا ہے۔عمارت نودرہ کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مرتب صاحب اپنی روِش برقرار رکھتے ہیں اور یہاں پھر تنگ نظری کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔نودرہ دارالعلوم کی پہلی باقاعدہ عمارت ہے۔جس کی بنیاد دارالعلوم کے بانیین اکابر ستہ کے ساتھ ساتھ چند اور قابل رشک اور قابل قدر اکابر و اصاغر نے رکھی تھی،جن کے نام فاضل مرتب نے صفحہ ۱۱۹ پہ لکھے بھی ہیں؛لیکن ان ناموں کو درج کرتے وقت فاضل مرتب نے دیانت کا دامن چھوڑتے ہوئے خیانت سے کام لیا ہے۔خیانت یہ کہ انھوں نے ایک ایسی اہم شخصیت کا نام درج نہیں کیا جو دارالعلوم کے قیام میں روزِ اوّل سے ہر ہر قدم پہ شریک ہے۔اور جو اس دن بوقتِ سنگِ بنیاد بھی وہاں موجود تھی یعنی مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ۔

نہ جانے دارالعلوم کی جدید تاریخ لکھنے والے فاضل مرتب صاحب کو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کس قسم کا بغض یا عناد ہے کہ ان کے نسبی وارثوں کو انہوں نے حقدار ہوتے ہوئے بھی نظر انداز کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔

اسی لیے تو دارالعلوم کے بانی مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کا نام وہ نہیں لکھتے۔فخر الہند مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے ساتھ ناانصافی کا معاملہ کرتے ہیں۔علامہ شبیر احمد عثمانی کی وفات کا ذکر ان کے سن وفات ۱۹۴۹ میں نہیں کرتے۔مفتی عتیق الرحمٰن کا نام ہلکا کر کے لکھ کر ان کی عظمت و شان کو اپنے تئیں کم کرنے کی ناکام کوشش کرتے

ہیں، دارالعلوم کے فارغین میں شعراء کاذکر کرتے ہوئے مولانا زبیر افضل عثمانی کا نام شاعروں کی فہرست میں نہیں لکھتے، حالانکہ اسی کتاب میں ان کی نظم شامل کر لیتے ہیں۔ اور تو اور تنگ نظری کی انتہا تو یہ ہے کہ گزشتہ ستر (۷۰) سال میں دارالعلوم کے سب سے بڑے قلم کار پیکر دانائی، زیرک، فقیہہ، حق وصداقت کی آواز اور بے باک مجاہد قلم مدبر اسلام حضرت مولانا عامر عثمانی کی بے پناہ علمی کاوشوں کو نظرانداز کرتے ہوئے انھیں فقط ایک شاعر کی حیثیت سے شعراء کی فہرست میں شامل کر کے اُن کی عظمت کو کم کرنے کی پھر سے ناکام کوشش کرتے ہیں۔

اس موضوع پر مزید کلام ہم آگے کریں گے، یہاں تو بس یہی دعا کرتے ہیں کہ اللہ رب العزت فاضل مرتب کو بیدار مغز، وسعتِ نظر اور زندہ ضمیر عطا فرمادے اور دارالعلوم ہی کو نہیں؛ بلکہ پوری دنیا کو ایسے چاپلوس اور نااہل تاریخ لکھنے والوں سے محفوظ فرمائے۔ آمین

پھر وہی تنگ نظری

فاضل مرتب کی تنگ نظری کے رویے سے ہم تنگ آگئے ہیں۔ کہاں تک ان کی خیانتیں نظرانداز کریں۔ اب چار صفحات کے بعد صفحہ ۱۲۳ ملاحظہ فرمائیے۔ دارالعلوم کی مسجد قدیم کے سنگ بنیاد اور تعمیر کا ذکر چل رہا ہے۔ ۱۹۰۹ کا زمانہ ہے جب اہتمام کی تمام تر ذمہ داریاں مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی سنبھال رہے تھے۔ جس کی تفصیل ہم گزشتہ صفحات میں پیش کر آئے ہیں۔ علاوہ ازیں دارالعلوم کی روداد میں مسجد کی تعمیر کے چندے کی اپیل اور دارالحدیث کے لیے تعاون کی درخواست مولانا حبیب الرحمٰن کے قلمی جہاد کا نمونہ ہیں۔ آپ ہی نے امتِ مسلمہ سے اس کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی اپیل کی اور مسلسل آپ اس عنوان پر ''روداد'' و ''القاسم'' میں لکھتے رہے، ہمارے اس دعویٰ کے برہان کو جس کا دل چاہے دارالعلوم کی لائبریری میں جا کے دیکھ لے۔

فاضل مرتب نے مسجد کے سنگِ بنیاد کا ذکر کرتے ہوئے جن لوگوں کے نام لکھے ہیں ان میں انہی مولانا حبیب الرحمٰن عثمان کا نام درج نہیں کیا ہے۔ حالانکہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے بھی خود اپنے ہاتھوں سے اینٹیں اُٹھا کر اس مسجد کی تعمیر میں کام کیا تھا؛ لیکن نہ جانے کیوں فاضل مرتب نے بھی طے کر رکھا ہے کہ تاریخ کو مسخ کر کے ہی دم لیں گے۔ فاضل مرتب نے تاریخ مرتب نہیں کی ہے؛ بلکہ فن تاریخ نویسی کا مذاق اُڑایا ہے۔ انھوں نے قلم کے ساتھ وہ سلوک کیا ہے جو آوارہ لڑکے دوسروں کی بہو بیٹیوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ جملہ سخت ہے؛ لیکن برحق ہے۔ اس صداقت کے لیے آپ اگلا عنوان ملاحظہ کیجیے۔

ستم بالائے ستم

فاضل مرتب صاحب فن تاریخ نویسی پر ایک کے بعد ایک ستم کیے جارہے ہیں۔ اور کوئی انھیں روکنے والا

نہیں۔افسوس ہے ایسے مہتمم پر جس کے دَورِ اہتمام میں ایسے ایسے نااہل قلم چلانے لگ جائیں اور نہ یہ کہ قلم چلائیں بلکہ ان کی بکواس وغیر معتبر اور غیر ثقہ تحریریں دارالعلوم جیسے عظیم ادارے سے شائع بھی ہوتی رہیں۔کاش کوئی ان مہتمم صاحب کو بتائے کہ عوام کے جس پیسے کو آپ ایسی واہیات کتاب شائع کرنے میں بے دردی سے خرچ کر رہے ہیں وہ پیسہ بڑی محنت کی کمائی کے ساتھ بہت عقیدت سے دارالعلوم کو بھیجا جاتا ہے۔خدا کے واسطے قوم کا پیسہ بے دردی کے ساتھ ایسی ویسی برباد کتابیں شائع کرنے میں ضائع نہ کریں۔

قارئین! آئیے اب ہم آپ کو ایک اور ستم دکھاتے ہیں۔کتاب کے صفحہ نمبر ۱۲۴ پہ ''دارالحدیث'' کا عنوان دے کر دارالعلوم کی دارالحدیث کے قیام وتعمیر کا ذکر کیا گیا ہے۔

دیوبند کے سب سے علمی خاندان خانوادۂ عثمانی سے فاضل مرتب کو اس درجہ بغض وحسد کیوں ہے، اس کا جواب شاید خود چاپلوس اور نااہل فاضل مرتب صاحب ہی دے سکتے ہیں دارالحدیث کو تعمیر کرنے میں سب سے زیادہ رول جس شخصیت نے ادا کیا ہے۔جس نے مسلسل ومستقل لوگوں سے چندے کی اپیل کر کے تعمیر کے لیے رقم کا انتظام کیا۔جس نے دوران تعمیر اوّل تا آخر تمام تر ذمہ داریوں کو ایک بہترین وکامل منتظم کی حیثیت سے نبھایا، جس کے دَورِ اہتمام کو لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں، اُسی سرکردہ اور عظیم شخصیت کا نام فاضل مرتب نے دو صفحات کی تفصیل میں کہیں نہیں لکھا۔آخر کیا سوچ کہ دارالعلوم کی جدید تاریخ مرتب کی گئی ہے۔وہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی جنہوں نے دارالحدیث کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے جلسہ منعقد کیا۔وہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی جو صبح و شام دارالحدیث کی تعمیر کے لیے تگ ودو کرتے ہیں، وہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی جن کے بلانے سے ملک وغیر ملک سے لوگ اس جلسہ میں شرکت کرنے کے لیے چلے آتے ہیں۔وہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی جو اس جلسہ کے کنوینر ہیں، وہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی جو اس اجتماع میں تقریر بھی کرتے ہیں انھیں مولانا حبیب الرحمٰن کا نام تک فاضل مرتب نے جلسے کا ذکر کرتے ہوئے دو صفحات کے اس مضمون میں نہیں دیا۔

خیانت کی اس سے بڑی مثال شاید تاریخ میں کہیں اور دیکھنے کو نہ ملے۔بات کیا تھی اور اسے کیا بنا کر پیش کیا گیا۔فاضل مرتب کا دو صفحات پر مشتمل مضمون پڑھنے کے بعد کہیں سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوسکتا کہ اس جلسہ کا انعقاد کرنے والے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی تھے جو بذاتِ خود بھی اس جلسہ میں شریک تھے۔ہم یہاں دارالعلوم کی جدید تاریخ سے اس مضمون کو پورا نقل کر رہے ہیں، تاکہ آپ بھی دیکھیں فاضل مرتب نے کس بے دردی سے علمی خیانت کا شیوہ اختیار کیا ہے۔اور بس چار حضرات کے نام لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ ان چار حضرات کے علاوہ وہاں کوئی اور بڑا عالم نہیں تھا، بس باقی طلبہ تھے۔

آپ پہلے فاضل مرتب کا مضمون پڑھیے اس کے بعد ہم دارالعلوم کی روداد سے اصل مضمون بھی پیش

کریں گے۔ بات صرف مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ہی کی نہیں ہے؛ بلکہ اس جلسہ میں علامہ شبیر احمد عثمانی بھی شریک تھے، آپ نے بھی، ایک پُر جوش تقریر کی تھی؛ لیکن فاضل مرتب کو مولوی اسعد مدنی ؒ کے خاندان کی چاپلوسی سے فرصت ملتی تو حقائق تحریر کرنے کی طرف توجہ کرتے۔

لیجیے" دارالعلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ" کے صفحہ ۱۲۴ تا ۱۲۶ کا مضمون پیش ہے۔

"دارالحدیث"

"جس طرح دارالعلوم دیوبند کو یہ شرف و امتیاز حاصل ہے کہ ہندوستان بھر میں یہ پہلی درس گاہ ہے جو عین زوالِ علم کے وقت مسلمانوں کے عام چندے سے قائم ہوئی، اسی طرح اس کو یہ تقدم و فضیلت بھی حاصل ہے کہ دارالعلوم کا دارالحدیث، ہندوستان میں پہلی عمارت ہے، جو اس نام سے عالم وجود میں آئی۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی عہد کے ہندوستان میں جابجا مدارس موجود تھے، اور ایک ایک ذرّہ علم کی روشنی سے منور تھا؛ لیکن مدارس کی اس کثرت و بہتات کے باوجود ہندوستان میں کوئی عمارت دارالحدیث کے نام سے اس سے پیشتر نہیں بنی۔ ہندوستان کی سرزمین پر یہ پہلا موقع تھا کہ دارالحدیث کے نام سے ایک بڑی عمارت بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ نواب سلیم اللہ خان رئیس ڈھاکہ نے دارالحدیث کی تعمیر کے لیے تیرہ ہزار کی رقم پیش کی۔

دارالعلوم میں دارالحدیث کا سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب میں ۲۰ / ربیع الآخر ۱۳۳۰ھ، ۸ / اپریل ۱۹۱۲ء کو ایک عام جلسہ منعقد کیا گیا جس میں ملک کے مختلف مقامات کے لوگوں نے کثرت سے شرکت کی۔ طلبہ نے باصرار مزدوروں کے بجائے نہایت ذوق وشوق کے ساتھ والہانہ انداز میں خود بنیاد کھودی، حضرت تھانوی ؒ، حضرت شیخ الہند ؒ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوری ؒ اور حضرت مولانا عبدالرحیم رائے پوری ؒ نے سنگِ بنیاد رکھا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مجمع سے فرمایا کہ "سب صاحب ایک ایک دو دو اینٹ اپنے ہاتھ سے رکھ دیں نہ معلوم حق تعالیٰ کے یہاں کس کا خلوص قبول ہو جائے" چنانچہ تمام شرکائے جلسہ نے دو دو اینٹیں رکھیں۔

دارالحدیث کے لیے بنیاد تیار کرنے میں طلبہ نے جس مخلصانہ ہمت و محبت اور جوشِ عمل کا مظاہرہ کیا وہ طلبہ کی زندگی کا ایک ایسا واقعہ ہے جسے بھلایا نہیں جاسکتا، اس سال کی روداد میں مذکور ہے کہ "جلسہ دارالحدیث کے دن سنگِ بنیاد تو رکھ دیا گیا تھا؛ مگر بنیاد تعمیر کرنے کے لیے پہلے کنکریٹ کٹوانا ضروری تھا، اس کے علاوہ کسی قدر بنیاد بھی کُھدنی باقی رہ گئی تھی، ابھی کنکریٹ ڈال

کرکوٹنا ہی شروع کیا گیا تھا کہ زوروشور کی ایک طوفانی بارش ہوگئی اور قریبی تالاب پانی سے بھر گیا، حتیٰ کہ دارالحدیث کی بنیادیں تک پانی سے لبریز ہوگئیں، یہ قطعۂ زمین تالاب ہی کا ایک حصہ تھا، جو ۱۳۲۸ھ میں اَٹوایا گیا تھا، مٹی چونکہ ابھی پختہ نہ ہوئی تھی اس لیے گرگئی، اور بنیاد کا حال دَلدَل کا سا ہوگیا، اس کے علاوہ درس گاہوں تک پانی کے پہنچ جانے سے عمارتوں کو بھی خطرہ لاحق ہوگیا، ادھر تو یہ حالت تھی اور ادھر مزدور بالکل نہیں ملتے تھے، بارش کے تواتر سے یہ احتمال بھی نہ تھا کہ پانی دو چار روز میں خشک ہوجائے گا، ڈال لگوا کر پانی نکلوانا شروع کیا؛ مگر سارے دن میں بہت تھوڑا سا پانی نکل سکا، بالآخر نمازِ عصر کے بعد طلبہ نے کمر ہمت باندھی، بالٹیاں لے کر کھڑے ہوگئے اور ایک گھنٹے میں تمام پانی نکال کر تالاب میں ڈال دیا، پانی نکل جانے پر معلوم ہوا کہ ابھی ایک سخت مرحلہ باقی ہے، بنیاد میں نصف قدآدم دلدل ہوگئی تھی، اس موقع پر مدرسین وطلبہ کی محنت وجانفشانی کا منظر قابل دید تھا، کئی سو طلبہ لگے ہوئے تھے اور قطاریں بنا کر آناً فاناً میں گارے کی بالٹیاں بھر بھر کر تالاب میں پہنچا رہے تھے، رجزیہ اشعار پڑھتے جاتے تھے، اور ہر ایک، دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی سعی میں لگا ہوا تھا، اس مقابلے اور مسابقت میں اور بھی لطف تھا، طلبہ نے دو جماعتیں بنا کر کام کو نصف نصف تقسیم کرلیا تھا، جو کام مہینے بھر میں مزدوروں سے ہونا مشکل تھا وہ طلبہ نے دو دن میں کردیا۔ کنکریٹ کی کٹائی میں بھی طلبا نے حصہ لیا، یہ کام بھی تنہا معماروں اور مزدوروں سے شاید ایک ماہ میں بھی ختم نہ ہوتا؛ لیکن طلبہ نے اس جدوجہد سے کنکریٹ، اینٹ اور چونا موقع پر پہنچایا کہ ایک ہفتے میں بنیادیں اوپر آگئیں، الغرض جیسی مقدس اور متبرک تعمیر تھی ویسے ہی مخلص ہاتھوں سے بنیاد تعمیر ہوئی اور طلبہ کی یہ آرزو کہ ''دارالحدیث کی بنیاد ہم کھودیں گے'' اب مع شئے زائد پوری ہوگئی۔''

عالم اسلام میں ماضی میں جو دارالحدیث بنائے گئے ان کے بنانے والے سلاطین اور فرماں روا تھے، اس دارالحدیث کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تعمیر میں غریب عوام کا ہاتھ کارفرما رہا ہے، اور انھیں معمولی معمولی امدادوں سے یہ عظیم الشان عمارت عالم وجود میں آئی ہے۔

دارالحدیث کی تعمیر سے قبل مختلف حضرات نے عالم خواب میں دیکھا کہ موقع تعمیر دارالحدیث پر دارالعلوم کے اکابر مرحومین جمع ہیں اور خود اپنے ہاتھوں سے سامان تعمیر اُٹھا اُٹھا کر لا رہے ہیں اور تعمیر میں مصروف ہیں۔

دارالحدیث کی یہ پُرشکوہ عمارت ۱۳۴۹ھ، ۱۹۳۰ء میں مکمل ہوئی۔ یہ عمارت نودرہ کی عمارت

کے بالکل پیچھے جانب مغرب میں بنائی گئی اور دائیں بائیں دونوں جانب تیرہ کمرے تعمیر ہوئے۔تمام کمروں کی مجموعی لاگت کا تخمینہ ڈیڑھ لاکھ روپے تھا۔

اس عمارت کے وسط میں دارالعلوم کا مرکزی ہال واقع ہے جس میں دارالعلوم کے بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں۔ اس ہال کو بعد میں دارالحدیث تحتانی کا نام دیا گیا اور ایک عرصہ تک دورۂ حدیث کی تعلیم یہیں ہوتی رہی''۔

....

دیکھ لیجیے قارئین! اس مضمون کو آپ چاہے کتنی ہی بار پڑھ لیں آپ کو یہی لگے گا کہ اس جلسہ میں مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ شریک ہی نہیں تھے۔کتاب کی ابتدا سے فاضل مرتب نے خیانت کی یہی روش اختیار کر رکھی ہے پوری کتاب میں اس درجہ جھوٹ لکھا گیا ہے کہ حد اور بس۔ یاد رکھئے تاریخی حقائق کو اگر دلائل وشواہد کی روشنی میں ایمانداری سے قلم بند نہ کیا جائے تو قوم کو مستقبل کی راہ متعین کرنے کے لیے ماضی سے جس رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے اس کا میسر آنا ممکن نہیں ہوتا، نیز بعض نااہل قلم کاروں یا سوانح نگاروں کی ماضی کے حقائق سے لاعلمی یا لاپرواہی یا پھر دیدہ و دانستہ روگردانی کی وجہ سے غلط سلط غیر ثقہ باتیں عوام کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرتی ہیں۔

اسی لیے وقت رہتے اگر غلط بیانیوں اور جھوٹی تاریخ مرتب کرنے والوں کے اوپر ایکشن نہ لیا جائے تو آنے والی نسلیں ایک بالکل بے سود اور غیر معتبر تاریخ کو اپنے سامنے پاتی ہیں، اور اُس وقت کچھ نہیں کیا جاسکتا جب جھوٹ پھیل کر سلیم اور انارکلی کی طرح زبان زد خاص و عام ہو جائے۔سبھی اہلِ علم جانتے ہیں کہ اکبر کے دَور میں کوئی انارکلی تھی ہی نہیں؛ لیکن اس جھوٹ کو اس درجہ کثرت سے پھیلایا گیا ہے کہ تاریخ مسخ ہو کے رہ گئی اور نسل نو بے سر پیر کی اس کہانی کو داستانِ محبت تسلیم کرتے ہیں۔

یہی حال دارالعلوم کی تاریخ کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے؛ لیکن اس مرتبہ تو حد ہی ہوگئی۔خوفِ آخرت سے بالکل بے زار ہو کر اس ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹی تاریخ مرتب کی گئی ہے کہ الامان الحفیظ۔

آئیے اب ہم دارالحدیث کے متعلق حقائق آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں قارئین کمال دیکھئے آپ فاضل مرتب نے جس ۱۳۳۰ھ کی روداد کا حوالہ دے کر ایک پیراگراف نقل کیا ہے اسی روداد میں دو صفحہ قبل ہی اس جلسہ کی پوری تفصیل موجود ہے، جو فاضل مرتب نے دانستہ پیش نہیں کی؛ کیونکہ اگر وہ یہ تفصیل پیش کر دیتے تو اس سے ظاہر ہو جاتا کہ یہ جلسہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحب نے منعقد کیا تھا اور اس میں سب سے زیادہ چندہ موصوف کے بھائی علامہ شبیر احمد عثمانی کی پُر جوش تقریر کے بعد جمع ہوا تھا؛ کیونکہ تاریخِ دارالعلوم میں عثمانی خاندان کی خدمات کا تذکرہ فاضل مرتب کو کرنا ہی نہیں تھا۔اس لیے حوالہ بھی کاٹ چھانٹ کر نقل کر دیا۔

ہم کتاب کے آغاز ہی سے فاضل مرتب کا جہل اور خائن ہونا دلائل وشواہد کے ساتھ ثابت کرتے آرہے ہیں۔ نقل کردہ عبارت میں حذف واضافہ ہو یا حوالوں کی بے ترتیبی فاضل مرتب نے ہر جگہ خوفِ خدا سے عاری ہو کر فقط سربراہوں کو خوش کرنے کے لیے چاپلوسی کا شیوہ اختیار کیا ہوا ہے۔اس عمل سے بے شک ان کی جیب گرم ہونے کے ساتھ ساتھ چند دنیاوی منفعتوں میں اضافہ تو ہو گیا ہوگا؛لیکن آنے والی نسلوں کو ایک گمراہ کن تاریخ فراہم کرنے کے جرم کی سزا انھیں آخرت میں ضرور ملے گی۔

قارئین یاد رکھئے پہلی بار میں غلطی ہوتی ہے دوسری بار وہی غلطی دہرائی جائے تو خطا بن جاتی ہے اور تیسری بار یا بار بار خطا کرنا جرم کہلاتا ہے۔غلطی نظر انداز کی جا سکتی ہے خطا کو معاف کیا جا سکتا ہے؛لیکن جرم پہ سزا لازم ہوتی ہے اور فاضل مرتب نے پوری کتاب میں بار بار خیانت کی روش اختیار کر کے حقائق کو مسخ کرنے کا جرم کیا ہے۔جس کی سزا انہیں ضرور ملے گی دنیا میں نہ سہی تو آخرت میں۔گزشتہ صفحات میں ہم مسلسل فاضل مرتب کا یہ جرم ثابت کرتے آرہے ہیں۔اور ابھی آگے بھی آپ اس کا نمونہ دیکھتے رہیں گے۔ہمیں حیرت ہے کہ دیوبند جیسی علمی بستی میں اس واہیات کتاب کا بائیکاٹ نہیں کیا گیا۔کسی نے اس کے خلاف عوامی سطح پر کچھ نہیں لکھا۔ہم یہاں ہزاروں میل دُور بیٹھ کر دیوبند والوں کا دفاع کر رہے ہیں،جبکہ یہ کام تو خود دیوبند کے قلم کاروں کو کرنا چاہئے تھا۔

ہمیں یہ تو معلوم ہوا تھا کہ مولانا ندیم الواجدی،مولانا عبید اقبال عاصم،مولانا نسیم اختر شاہ قیصر اور کسی فیصل عثمانی نے تحریری طور پر اپنا اعتراض مہتمم دارالعلوم کو بھیجا تھا؛مگر اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔مہتمم صاحب کو واٹس ایپ چلانے سے فرصت ملے تو اہتمام کی ذمہ داری کو سمجھیں۔خیر اللہ رب العزت ہمیں صحت کے ساتھ سلامت رکھے گھٹنے کے درد اور نزلے کی شدت نے پریشان کر رکھا ہے ورنہ یہ جائزہ کب کا پورا کر چکے ہوتے۔اللہ پاک یہ کام خیر وخوبی سے پورا کرا دے کہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک تحقیقی تاریخی دستاویز تو ایسا چھوڑ ہی جائیں گے کہ پڑھنے والے صحیح تاریخ سے واقف ہو سکیں۔ویسے یہ کام ہمارا نہیں؛بلکہ دیوبند والوں ہی کے کرنے کا تھا؛لیکن مادرِ علم میں پڑھنے کا شرف ہمیں بھی حاصل ہے اور ہمارے باپ دادا کو بھی،ہمارے والد صاحب جناب مولانا محمد رفیق کامل پوری ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۹۳۹ء کے فارغ ہیں،بس اسی کا خیال کرتے ہوئے دارالعلوم کی عظمت کو ایسے چاپلوسوں سے بچانے کے لیے ہی ہم نے قلم اُٹھایا ہے۔اور اب لگ رہا ہے کہ صحیح کیا؛کیونکہ ہندوستان میں کوئی اور یہ کام نہ کرتا اگر کرتا تو اب تک سامنے آچکا ہوتا۔دیوبند بھی اب حوصلہ مند و باہمت اور بے باک قلم کاروں سے خالی ہو چکا ہے۔وہاں بھی کوئی نہیں جو بہ بانگِ دہل صدائے حق بلند کر سکے اور اس صدائے حق کو تحریری شکل میں دنیا کے سامنے رکھ سکے۔ ع

"سب مریض دانائی مصلحت کے شیدائی"

مصلحت پسندی اور بزدلی کی انتہا تو یہ ہے کہ مولانا عبید اقبال عاصم کی کتاب "دیوبند تاریخ اور تہذیب کے

آئینہ میں' جب شائع ہو رہی تھی، تو اس میں دارالعلوم پہ قبضہ کے حالات کی تفصیل لکھتے ہوئے مصنف صاحب نے تقریباً ستر صفحات میں حقائق بیان کیے تھے؛ لیکن ان کے مشیر اور مصلحت پسند دوستوں نے خوفِ مدنی گروپ میں آکر وہ تمام حقائق کتاب سے حذف کرا دیے ہیں۔ آپ چاہیں تو اِس بات کی تصدیق عبیداللہ اقبال عاصم صاحب سے کر سکتے ہیں۔

لیجیے قارئین اب آپ دارالعلوم کی روداد ۱۳۳۰ھ کے اُن صفحات کا مطالعہ کیجیے جن میں دارالحدیث کے سنگِ بنیاد رکھنے پر منعقد ہونے والے جلسہ کا ذکر ہے۔ وہی جلسہ جس کا کچھ حصہ فاضل مرتب نے لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ کی طرح پیش کیا ہے، پوری بات ہم آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ یہ جلسہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے منعقد کیا تھا، اُس وقت دارالعلوم کے اہتمام کی تمام تر ذمہ داریاں مولانا حبیب الرحمٰن ہی نبھاتے تھے۔ روداد کے صفحہ نمبر ۲۶ پہ دارالحدیث کا عنوان دے کر لکھا ہے:

دارالحدیث

تعمیر دارالحدیث کی ضرورت

دارالحدیث کی اہمیت اور مقبولیت، مسلمانوں کی اس کی طرف رغبت و میلان کا ذکر ہم گزشتہ روداد میں کر چکے ہیں اب مکرر اعادہ کی ضرورت نہیں ہے؛ البتہ ہم نے جلسہ منعقدہ ۳/ربیع الثانی کے مفصل تذکرہ کا وعدہ کیا تھا۔ اُس کا ایفاء ضروری ہے۔ اس تذکرہ کے بعد دارالحدیث کے متعلق جو قابلِ ذکر اُمور ہیں عرض کیے جائیں گے۔

سال گزشتہ کی روداد میں بیان ہو چکا ہے کہ تعمیر دارالحدیث کے لیے اوّل اوّل نو درہ یعنی درس گاہ کی چھت تجویز ہوئی تھی جس کا سرسری تخمینہ پندرہ ہزار روپیہ کیا گیا تھا۔ اور جلسہ منعقدہ ۹/رجب ۱۳۲۹ھ میں اس کی بنیاد بھی رکھ دی گئی تھی، جس کا ذکر روداد ۱۳۲۹ھ میں آ چکا ہے؛ لیکن جب دارالحدیث کی تعمیر عقب مدرسہ سے زمین لے کر قرار پائی اور تخمینہ ساٹھ ہزار قرار پایا تو اُس کی بنیاد کے لیے مستقل تاریخ مقرر کر کے اہلِ اسلام کو دعوت دی گئی۔ یکم اپریل ۱۹۱۲ء مطابق ۱۳/ربیع الاوّل ۱۳۳۰ھ سے ۵/اپریل تک ممبرانِ مدرسہ کا سالانہ جلسہ تھا۔ اُسی موقع پر سید عاشق حسین صاحب انجینئر خود تشریف لائے اور کئی نقشے اس موقعہ کے ممبران مدرسہ کے سامنے پیش کیے، جن میں سے ایک نقشہ پسند کیا گیا۔ اور اس کے موافق بنیاد کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ طلبہ مدرسہ عالیہ کی درخواست تھی کہ بنیاد دارالحدیث ہم خود کھودیں گے، یہ درخواست ممبرانِ مدرسہ نے نہایت مسرت اور خوشی کے ساتھ منظور فرمائی تھی؛ لیکن اُس میں ایک اشکال ایسا واقع ہو گیا تھا کہ طلبہ اس کام کی سرانجامی نہیں کر سکتے تھے۔ ۵/اپریل کو نقشہ منظور ہو کر داغ بیل لگائی گئی۔

۹؍اپریل کو جلسہ بنیاد تھا، گویا صرف تین یوم باقی تھے؛ لیکن انھیں تواریخ میں میرٹھ کے اندر جلسہ موتمر الانصار تھا۔ جس کی شرکت کے لیے مدرسہ کے اکثر مدرسین وطلبہ میرٹھ چلے گئے تھے۔ اور ہر بنیاد بہت طویل وعریض تھی؛ مگر تاہم طلبہ نے ہمت کر کے جس قدر ہوسکا کیا اور کچھ کام مزدوروں سے لیا گیا۔ بنیاد جس کا عرض ۹؍فٹ تھا تیار کردی گئی۔

۹؍اپریل مطابق ۳۰؍ربیع الثانی تاریخ جلسہ بنیاد مقرر تھی اور اسی تاریخ میں دعوت دی گئی تھی۔ دارالحدیث کی طرف عام رغبت ومیلان اس کا مقتضی تھا کہ مجمع اندازہ اور خیال سے زیادہ ہوگا؛ مگر ۹؍تاریخ کو کوئی تعطیل نہ تھی۔ ملازمان سرکاری کسی طرح شریک نہ ہوسکتے تھے اور اگر قصد کرتے بھی تو ۶، ۷، ۸ کو تعطیل تھی۔ بہت حضرات نے تو اس تعطیل سے استفادہ اُٹھالیا کہ جلسہ موتمر الانصار میرٹھ میں شریک ہوگئے۔ یا جلسہ ندوۃ العلماء لکھنو وحمایت الاسلام لاہور میں کہ وہ بھی انھیں تواریخ میں تھے اور جن صاحبوں نے استفادہ نہیں اُٹھایا وہ بھی مجبور تھے کہ تعطیل سے متصل رخصت نہیں لے سکتے تھے، بہرحال ان وجوہ سے مجمع اُس پیمانہ پر تو نہ ہوا جیسا ہونا چاہئے تھا؛ مگر پھر بھی بہت بارونق جلسہ تھا۔ بہت سے دُور دراز کے حضرات شریک جلسہ تھے۔ سندھ سے جناب مولانا ابوالسراج غلام محمد صاحب و جناب مولانا تاج محمود صاحب معہ اپنے بہت سے رفقاء کے جن میں عالی جناب قاضی مہر دین افسر تعمیرات بہاولپور بھی تھے، تشریف لائے تھے۔ اور کلکتہ سے جناب مولانا مولوی قاری احمد موسیٰ صاحب مصری امام جامع مسجد کلکتہ جو ایک نہایت متقی و باخدا عالم و بزرگ ہیں خاص شرکت جلسہ کے لیے رونق افروز دیوبند ہوئے تھے۔ اسی طرح اور بھی بہت بزرگانِ اسلام نے تکلیف شرکت گوارا فرمائی تھی۔ اور اسی طرح تقریباً ایک ہزار مہمانوں کا اجتماع ہوگیا۔ لوازم مہمانداری ہر قسم کے پہلے سے مہیا تھے۔ ۱۹؍ربیع الثانی کے شام سے دونوں طرف کی گاڑیوں سے لگا تار مہمانوں کی آمد رہی اور اسٹیشن سے مدرسہ تک دلفریب منظر پیش نظر رہا۔ ۲۰؍ربیع الثانی کی صبح ۸؍بجے سے جلسہ شروع ہوا۔ اوّل جناب مولانا مولوی قاری احمد موسیٰ صاحب مصری نے اپنے موثر لہجہ میں تلاوتِ کلام مجید فرمائی۔ بعد ازاں جناب قاری عبدالوحید خاں صاحب مدرس درجہ قراءۃ وتجوید دارالعلوم دیوبند نے اپنے خاص موثر لہجہ میں تلاوتِ کلام مجید فرمائی۔ بعد ازاں مولانا مولوی محمد انور شاہ صاحب مدرس دارالعلوم نے اپنا عربی قصیدہ جو قطبِ عالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہٗ کے مناقب و اوصاف میں تحریر فرمایا تھا، سنا کر سامعین کی روحانی لذت کو دوبالا فرمایا، اس کے بعد بندہ احقر حبیب الرحمٰن عفی عنہ مددگار مہتمم مدرسہ نے ایک مختصر تقریر میں دارالعلوم دیوبند اور اس کے مقدس بانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے جناب مولانا سید احمد حسن صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی رحلت کا حسرت انگیز انداز میں ذکر کیا۔ اور عربی کی ایک خاص نظم پڑھ کر سنائی، سامعین کے قلوب پر تلاوتِ کلام مجید سے ایک خاص کیف طاری تھا۔ مولانا احمد حسن صاحب کی

وفات حسرت آیات کے تذکرہ نے اُن کو بے چین ومضطرب بنا دیا۔حسرت و اندوہ کا ایک سماں بندھ گیا۔اس مختصر تقریر میں دارالعلوم پر جو صدمات مقدس سرپرستوں اور بانیوں کی مفارقت سے پیش آئے اور نہایت پریشانی ویاس کے بعد دارالعلوم کا نشوونما باقی رکھ کر اپنی حالت کو سنبھالے رکھا اور ترقی کرتا رہا، ذکر کر کے سب سے آخر میں مولانا موصوف کی رحلت کے واقعہ کو اس لیے زیادہ موجبِ حسرت بیان کیا کہ وہ مجتمعہ قوۃ جو حضرت قاسم العلوم والخیرات کے بعد موجود تھی اب رفتہ رفتہ اس میں بہت ضعف آگیا ہے۔اس کے بعد مولوی شبیر احمد عثمانی دیوبندی نے کھڑے ہو کر اپنی موثر و جوشیلے انداز میں وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ کا وعظ بیان فرمایا اور اس تقریر میں بہت سے قابل قدر مضمون بیان فرمائے۔مولوی صاحب تقریر ختم کر چکے تو مولانا حافظ عبدالرحمٰن صاحب مرادآبادی جو مولانا احمد حسن صاحب کے غم میں مبتلا اور سابق تقریروں سے نہایت متاثر و غمگین تھے کھڑے ہوئے اور مولانا کے صاحبزادے حافظ قاری سید محمد سلّمہٗ کو بلا کر گلے لگایا اور مولانا کے مرضِ وفات کے حالات اس دلگداز لہجہ میں بیان فرمائے کہ خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رُلایا۔سب سے آخر میں فخر العلماء حضرت مولانا مولوی اشرف علی صاحب دامت برکاتہم کھڑے ہوئے۔دعاء وخطبہ ماورہ کے بعد آیتِ کریمہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ کے متعلق نہایت عالی نکات لطائف وحقائق بیان فرما کر حاضرین کے ہر طبقہ کو علماء سے لے کر عوام تک سب کو علیٰ قدر المراتب حصہ عطا فرمایا۔مولانا کے معجز بیانی کا حال اظہر من الشمس ہے؛ مگر دیوبند کے ساتھ جو مولانا کو خصوصیت تھی اور ادھر دارالحدیث کے مفہوم نے مولانا کے بیان میں خاص کیف پیدا کر دیا تھا۔قریب دو گھنٹہ تک مولانا کا وعظ ہوتا رہا۔ آخر وعظ میں فرمایا کہ صاحبو! اب چندہ کا ذکر ہوتا ہے جس کسی کو کھسکنا ہو کھسک جائے اور اس کی بھی کیا ضرورت ہے،شوق سے بیٹھے رہئے کسی پر دباؤ نہیں، جبر نہیں، جس کا دل چاہے دے جس کا دل نہ چاہے نہ دے۔آپ نے فرمایا کہ چندہ جو جبر و اکراہ سے لیا جائے ممنوع ہے اور اُس کو میں منع کیا کرتا ہوں اور جو بالا کراہ برغبت خاطر ہو اُس کو میں منع نہیں کرتا۔لوگ میرے مدعا کو نہیں سمجھتے فضول اعتراض کرنے لگتے ہیں۔صاحبو! آپ دیکھ رہے ہیں کہ مدرسہ میں بحمداللہ تعالیٰ یہ مسجد تیار ہو چکی ہے۔اب دارالحدیث کی تجویز ہے۔اس کے جلسہ بنیاد میں آپ تشریف لائے ہیں مسجد جس طرح بیت اللہ ہے دارالحدیث بیت الرّسول ہے۔جیسے کہ مسجد مظہر ہے کعبۃ اللہ کی، ایسے ہی دارالحدیث مظہر ہے انوارِ مدینۃ الرسول کے، روضۂ اطہر میں حضور پُرنور کا جسدِ اطہر مدفون ہے اور آپ مصروف اصلاحِ امت ہیں۔دارالحدیث میں آپ کا کلام مبارک جو زندہ کلام ہے ان شاء اللہ تعالیٰ روایت ہوگا۔اور کیا عجب کیف ہوگا کہ ادھر طلبہ مسجد میں جو بیت اللہ ہے نمازیں ادا کریں گے اور ادھر سے فارغ ہو کر دارالحدیث میں جو بیت الرسول ہے حدیث رسول اللہ حاصل کریں گے۔مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک

بزرگ مدینہ میں مقیم تھے ایک مرتبہ جب وہ ہمارے حضرت قبلہ وکعبہ حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں تشریف لائے تو آپ نے ان کو دیکھتے ہی یہ شعر پڑھا ۔

خوشا سعادت آں بندہٗ کہ کرد نزول ❖ گہے یہ بیتِ خدا و گہے یہ بیتِ رسول

مولانا نے یہ تقریر متعلق چندہ کے شروع ہی کی تھی کہ چاروں طرف سے چندہ برسنا شروع ہوگیا؛لیکن مولانا نے تکمیل دارالحدیث اور تحصیل چندہ کے لیے ایک اور صورت ذکر فرمائی ۔فرمایا کہ اگر انجینئر صاحب کا تخمینہ تعمیر دارالحدیث کے لیے ساٹھ ہزار روپیہ کا ہے؛مگر میں پچاس ہزار کے عدد کو اس مناسبت سے کہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نماز پڑھنے کا اجر بھی پچاس ہزار نمازوں کی برابر ہے،اختیار کرتا ہوں،اگر اس قدر روپیہ فراہم ہونے کے بعد دس ہزار کی ضرورت باقی رہ جائے گی تو بعد کو پوری کرلی جائے گی اور پچاس ہزار جمع کرنے کی سہل صورت یہ ہے کہ اگر ایک ہزار حصّے قرار دیئے جائیں تو ایک حصّہ پچاس روپیہ کا ہوتا ہے جو صاحب جس قدر حصّے خود لینا چاہتے ہیں لے لیں اور جو صاحب خود اس قدر نہیں دے سکتے وہ اپنی حالت کا اندازہ کرلیں کہ اپنی سعی سے جس قدر روپیہ فراہم کرسکتے ہیں اس قدر وصول کرنے کی غرض سے اپنے ذمہ لیں ۔میں بھی اپنے ذمہ پچاس روپیہ لیتا ہوں ۔(مولانا اس سے قبل دارالحدیث میں اپنی جانب سے سو روپیہ عطا فرما چکے ہیں) اس تقریر کا سماں دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے ۔مسلمانوں کا جوشِ اخلاص جو اس وقت تھا بیان میں نہیں آسکتا،جس طرح دارالحدیث ہندوستان میں اوّل تعمیر ہے،اسی طرح یہ جلسہ اپنی نوعیت اور مقبولیت کے اعتبار سے اوّل ہی جلسہ تھا ۔مسلمانوں نے چاروں طرف سے حصّے لکھوانے شروع کیے،خود مولانا کے پچاس روپیہ موعودہ پورا کرنے کے لیے مخلصین نے چندہ دینا شروع کیا اور اُسی وقت بجائے پچاس کے اَسّی ہزار روپیہ جمع ہوگئے ۔تب مولانا نے فرمایا کہ اپنے احباب سے جن پچاس روپیہ کے وصول کرنے کا وعدہ کیا تھا وہ تو اب اَسّی ہوگئے؛لیکن ایک حصّہ پچاس روپیہ کا میں اپنی ذات سے ادا کروں گا۔غرض اُس جلسہ میں تقریباً تین ہزار روپیہ نقد وصول ہوگئے اور بارہ تیرہ ہزار کے وعدے حصوں کی صورت میں ہوگئے ۔

ہم ان وعدوں کی فہرست دارالحدیث کے تذکرہ کے ساتھ شائع کردینا مناسب سمجھتے ہیں ۔جس سے یہ بھی معلوم ہوجائے کہ اُس وقت تک منجملہ اُن وعدوں کے کس قدر روپیہ وصول ہوا ہے ۔اور جن صاحبوں نے اپنے وعدوں کو پورا نہیں فرمایا اُن کے لیے یاد دہانی بھی ہوجائے ۔مولانا کا بیان ختم ہوچکا تھا تو بندہ احقر مددگار مہتمم مدرسہ نے قطعہ تاریخ وفات مولانا احمد حسن صاحب قدس سرہٗ جو حضرت فخر المحدثین مولانا محمود حسن صاحب دامت برکاتہم نے تحریر فرمایا تھا۔ پڑھ کر سنایا۔(یہ قطعہ تاریخ گزشتہ سال روداد میں طبع ہوچکا ہے) اور اس کے بعد تمام حاضرین نے دیر تک خشوع وخضوع سے دعا مانگی ۔اور یہاں سے سارا مجمع سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے عقب مدرسہ کی طرف پہونچا۔سب سے اوّل حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب وحضرت مولانا خلیل احمد صاحب وحضرت

مولانا محمود حسن صاحب وحضرت مولانا اشرف علی صاحب دامت برکاتہم نے سنگ بنیاد رکھا۔ اور بعد از اں کل حاضرین نے ایک ایک اینٹ رکھنی شروع کی۔ یہ سماں بھی دیکھنے کے قابل تھا۔ خندق نما عریض وطویل اور عمیق بنیاد میں دونوں طرف سیڑھیاں بنادی گئی تھیں ایک طرف سے لوگ اینٹیں ہاتھوں میں لیے ہوئے یا سروں پر رکھے ہوئے داخل ہوتے تھے اور دوسری طرف سے نکلتے تھے۔ مہمان، مدرسہ کے طلبہ ومتعلقین، اہلِ شہر مل کر کئی ہزار کا مجمع تھا۔ دیر تک پُرلطف نظارہ آنکھوں کے سامنے رہا کہ ایک طرف سے جوق جوق داخل ہوتے تھے اور دوسری طرف سے نکلتے تھے، سب کی یکساں حالت تھی۔ اخلاص و جوش سے قلوب لبریز تھے۔ کلماتِ دعائیہ وردِ زبان چہروں پر تفریح واستکانت کے آثار ظاہر تھے۔ اس کیفیت سے دل پر عجیب وغریب اثر ہوتا تھا، بنیاد رکھنے سے فراغت ہو چکی تو حاضرین نے وہیں کھڑے کھڑے تکمیل دارالحدیث کے لیے باخلاص قلب دعا مانگی۔ اور کارروائی جلسہ کی ختم ہوئی۔ اس کے بعد کھانا کھلایا گیا۔ اور مہمان رخصت ہونے شروع ہو گئے۔ یہ مختصر کیفیت ہے جلسہ دارالحدیث کی۔ پوری حالت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو شریکِ جلسہ تھے کہ ایسا مؤثر اور پُرلطف نظارہ کم کہیں دیکھنے میں آیا ہوگا۔

....

اس کے بعد روداد کے صفحہ ۳۲ تک دارالحدیث کے لیے چندہ دینے والوں کے نام کی فہرست ہے اور پھر وہ پیرا گرف ہے جو فاضل مرتب نے نقل کیا ہے۔ ہم اُس پیرا گراف کو یہاں نقل نہ کرتے؛ کیونکہ مکرر ایک ہی مضمون دینا دانائی کے خلاف ہے؛ مگر کیا کریں فاضل مرتب کو حوالہ پیش کرنے کا نہ سلیقہ ہے نہ ہی شعور۔ وہ اپنی حذف واضافہ کی روش سے باز نہیں آئے۔ یہاں بھی انہوں نے ایک پیرا گراف نقل کرنے میں خیانت ہی سے کام لیا ہے۔ اُن کا یہی فریب ظاہر کرنے کے لیے ہم یہ مضمون یہاں نقل کر رہے ہیں۔ آپ پھر سے روداد میں نقل کردہ عبارت پڑھیے اور دیکھئے کہ فاضل مرتب نے نقل کرنے میں کیسے اصل عبارت میں اپنی عقل سے الفاظ بھی بدلے اور جملے بھی حذف کیے ہیں۔

بنیاد دارالحدیث اور طلبہ کی مخلصانہ محبت وہمت

جلسہ دارالحدیث کے دن سنگ بنیاد تو رکھ دیا گیا تھا؛ مگر بنیاد تعمیر کرنے کے لیے ابھی ایک مرحلہ کنکریٹ کٹوانے کا باقی تھا۔

کنکریٹ ابھی تیار بھی نہیں ہوا۔ اور بنیاد بھی طولاً کسی قدر کھودنی باقی تھی، کنکریٹ توڑنے کوٹنے اور تکمیل بنیاد کا ٹھیکہ سہارنپور کے ایک ٹھیکہ دار کو دیا گیا؛ لیکن ابھی ان کاموں سے فراغت نہیں ہوئی تھی، صرف کنکریٹ ڈال کر کوٹنا

شروع کیا گیا تھا کہ زور شور کی بارش ہوگئی۔ تالاب جو قریب مدرسہ ہے بھر گیا۔ اور پانی بنیاد دارالحدیث تک اس قدر پہونچا کہ بنیاد بھی لبالب ہوگئی چونکہ یہ قطعہ زمین تالاب ہی کا ایک حصہ ہے جو ۱۳۲۸ھ میں اٹوایا گیا تھا۔ مٹی پختہ نہ ہوئی تھی چاروں طرف سے مٹی گر کر بنیاد کا حال قلعہ کی خندق کا سا ہوگیا۔ دیوار مدرسہ کی جڑ تک پانی پہونچنے سے ایک قسم کا خطرہ بھی تھا۔ ادھر تو یہ حالت تھی اُدھر مزدور بالکل نہیں ملتے تھے، اکثر مزدور پیشہ لوگ آموں کی فروخت میں مشغول تھے۔ احاطہ مسجد میں کنویں کے گلانے کا کام ہو رہا تھا جو مزدور موجود تھے وہ اس میں لگے ہوئے تھے۔ بارش کا تواتر تھا۔ یہ بھی احتمال نہ تھا کہ پانی دو چار روز میں خشک ہوجائے گا۔ پانی نکلوانے کے لیے تدبیر کی گئی، ڈال لگوا کر پانی نکلوانا شروع ہوگیا؛ مگر سارے دن میں بہت تھوڑا سا پانی نکل سکا۔ بالآخر نمازِ عصر پڑھ کر مدرسہ عالیہ کے طلبہ نے ہمت کی، بالٹیاں لے کر کھڑے ہوگئے، اور ایک گھنٹہ سے کم میں سب پانی نکال کر تالاب میں ڈال دیا۔ پانی نکال دیا گیا تو معلوم ہوا کہ ابھی بہت سخت مرحلہ باقی ہے۔ بنیاد میں نصف قد آدم دلدل ہوگئی ہے۔ مدرسہ کے تمام طلبہ اور مدرسین کی محنت و جانفشانی قابل دید تھی کئی سو طلبہ لگے ہوئے تھے۔ اور قطاریں بنا کر آناً فاناً میں بالٹیاں گارے کی بھری ہوئی تالاب میں پہونچا رہے تھے، رجزیہ اشعار پڑھتے جاتے تھے اور کام کرتے جاتے تھے۔ طلبہ نے دو جماعتیں ہو کر کام کو نصفا نصف تقسیم کر لیا تھا۔ اس مقابلہ میں اور بھی عجیب لطف تھا۔ اور جو کام مزدوروں سے ایک مہینہ میں بھی نہ ہوتا وہ طلبہ نے دو یوم میں کر دیا۔ جب بنیاد صاف کر دی گئی تب ٹھیکہ دار نے کنکریٹ کا کام شروع کیا۔ اگرچہ یہ کام اُس کی ذمہ داری کا تھا؛ مگر بغرض استحکام بنیاد طلبہ اس میں بھی بطیب خاطر حصہ لیتے رہے۔ چونکہ بارش کا تواتر تھا؛ اس لیے بعد کٹائی کنکریٹ تعمیر کے وقت بھی طلبہ نے کام کیا۔ اگر صرف معماروں پر یہ کام چھوڑ دیا جاتا تو ایسی بنیاد کی تعمیر ایک مہینہ میں بھی ختم نہ ہوتی؛ لیکن طلبہ نے اس جدو جہد سے اینٹیں اور چونہ پہونچایا کہ ایک ہفتہ میں اُس کو اوپر پہونچا دیا۔ الغرض جیسی مقدس اور متبرک تعمیر تھی۔ ویسے ہی مخلص اور محبت والے ہاتھوں سے اس کی بنیاد رکھی گئی اور تعمیر ہوئی۔ طلبہ کی وہ آرزو کہ بنیادِ دارالحدیث ہم کھودیں جو بوجہ تنگی وقت کے پوری نہ ہوئی تھی، اب مع شیءزائد پوری ہوگئی۔

....

دیکھا آپ نے؟ کس طرح تاریخ کو مسخ کیا گیا ہے فاضل مرتب نے اس درجہ اخلاقی پستی کا ثبوت دیتے ہوئے تاریخ مرتب کی ہے کہ ہر حق پسند اور ذی شعور کی عقل حیران ہے کہ آخر کیوں دارالعلوم سے ایسی کتاب شائع کی گئی، جس میں تاریخ بیان کرنے کے بجائے تاریخ کے ساتھ کھلواڑ کیا گیا ہے۔ خدا جانے فاضل مرتب کا یہ کیا مزاج ہے کہ وہ کوئی اقتباس نقل کرنے میں حذف و اضافے کی روش کیوں اختیار کرتے ہیں۔ بلاوجہ اپنی طرف سے الفاظ کا ردّ و بدل اور غیر ضروری جملوں کے اضافے کے ساتھ کسی کی تحریر کو پیش کرنا یقیناً خیانت اور غلط کاری کا عنوان پاتا ہے۔

جس ۱۳۳۰ ہجری کی روداد کا حوالہ دے کر فاضل مرتب ایک پیراگراف حذف واضافہ کے ساتھ نقل کر رہے ہیں اسی روداد میں جلسہ کی وہ تفصیل موجود ہے جس کا پیش کرنا نہایت ضروری تھا، کہ یہی تفصیل تو آج کے قاری کے لیے ماضی کی تاریخ ہے۔ اب یہاں کوئی خودساختہ عقل کل یہ بات نہ کہے کہ فاضل مرتب مختصر تاریخ بیان کر رہے ہیں مفصل نہیں۔ بلاشبہ یہ مختصر تاریخ نہیں ہے؛ کیونکہ صفحہ ۶۷۶ سے ۷۱۲ تک کے ۳۶ صفحات خالص بے جا اضافہ ہیں، جن کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ دارالحدیث کے جلسہ کی چار صفحات پر مشتمل تفصیل بلاشبہ اُن غیر ضروری ۳۶ صفحات سے تو کم ہی ہے۔

سمجھدار کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ اس لیے ہم یہاں درج بالا روداد پر مزید کوئی گفتگو نہیں کریں گے۔ ہم نے اصل اور نقل دونوں آپ کے سامنے پوری دیانت کے ساتھ ظاہر کر دی ہیں، اب آپ خود ہی سمجھ جائیے کہ فاضل مرتب نے کس قدر خیانت سے کام لیا ہے، نہ صرف مولانا حبیب الرحمٰن اور علامہ شبیر عثمانیؒ بلکہ فاضل مرتب نے اس کتاب میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ساتھ بھی اسی طرح بغض وعناد کا وطیرہ اختیار کرتے ہوئے انھیں نظرانداز کیا ہے۔ اسی لیے تو اس جلسہ کے علاوہ سال ۱۹۳۳ کے ذیل میں علامہ انور شاہ کے انتقال کا ذکر تک فاضل مرتب نے نہیں کیا ہے۔ اللہ ایسے خائن قلم کاروں سے دنیا کو محفوظ رکھے۔ آمین

......❖......

کتاب کے جائزے کو آگے بڑھانے سے پہلے آئیے ذرا سی تفصیل دارالحدیث کے بارے میں اور پیش کر دیتے ہیں؛ کیونکہ یہ ہندوستان کی پہلی عمارت ہے جو اس نام سے بنائی گئی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی تعمیری خوبصورتی کے لحاظ سے بھی آج تک یہ دارالحدیث ملک بھر میں بے مثال ہے۔ اس درالحدیث کو یہ عظمت، یہ شان، یہ بے مثالی، یہ مقبولیت ایسے ہی حاصل نہیں ہوئی ہے؛ بلکہ اس میں اکابر دیوبند کا خلوص اور چندہ دہندگان عوام کا وہ جذبہ شامل ہے جو آج کی ریا کار دنیا میں میسر نہیں آسکتا۔

۱۳۲۸ھ میں اس عمارت کو بنانے کی تجویز منظور ہوئی اور اُسی وقت میں مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اس کی تعمیر کے لیے عوام کو متوجہ کرنے کے سبب دارالعلوم کی روداد کے علاوہ ماہانہ شائع ہونے والے رسالے ''القاسم والرشید'' میں زوردار اپیلیں کیں۔ جس کا بہت اچھا اثر ہوا اور ملک و بیرونِ ملک کے مسلمانوں نے اس دارالحدیث کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ہم یہاں ۱۳۲۹ ہجری کی روداد سے دارالحدیث کے عنوان کے تحت لکھی گئی مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی تحریر پیش کر رہے ہیں۔ پڑھیے اور اُس خلوص کو محسوس کیجیے جو اُس وقت کے مہتمم کی شان ہوا کرتا تھا۔

......❖......

تعمیر دارالحدیث

سال گزشتہ کی روداد میں ظاہر کیا تھا کہ درسگاہوں کے متعلق ایک جدید تجویز دارالحدیث کی طے ہوئی اور اُس کی تعمیر کا تخمینہ پندرہ ہزار کیا گیا۔

چونکہ یہ تجویز ۲۹ھ کے متعلق تھی؛ اس لیے ۲۸ھ کی روداد میں مجملاً ذکر کر دینا کافی سمجھا تھا اب ہم اُس کو کسی قدر تفصیل سے عرض کرنا چاہتے ہیں۔

اہلِ علم کے تمام طبقات اور اہلِ اسلام کے اکثر افراد کو معلوم ہے کہ مدرسہ عالیہ دیوبند میں زمانۂ قدیم سے علمِ حدیث کی تعلیم میں خاص اہتمام ہوتا ہے۔ اور یہ بھی اُس کی خصوصیات میں تھا کہ اس مدرسہ کی صدر درسگاہ کو ایسے ہی اساتذہ سے زینت حاصل رہی ہے، جن کو فخر المحدثین والمفسرین کہنا بالکل بجا اور حق بجانب تھا اور ہے۔ حضرت الشیخ الامام اُستاذ العلماء وقدوۃ الاصفیاء حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کے حالات و کمالات سے دنیا واقف ہے۔ آپ کا مسند درس پر متمکن ہونا ہی خود جذب مقناطیسی کا اثر رکھتا تھا۔ علمِ حدیث کے تشنہ لب کھنچے چلے آتے تھے، آج بڑے بڑے جلیل القدر علماء مولانا قدس سرہٗ سے مستفید و مستفیض ہو کر آسمان علم کے آفتاب و ماہتاب بنے ہوئے ہیں۔ عرصہ تقریباً پچیس سال سے اُوسی مسند پر حضرت مسند العالم اور حلۃ الآفاق جناب مولانا محمود حسن صاحب مدظلہم العالی رونق افروز ہیں۔ آپ کی ذات سے علومِ دینیہ اور خصوصاً علمِ حدیث کا فیض جس قدر پھیلا ہے اُس کا اندازہ کچھ دشوار نہیں ہے۔ موجودہ طبقہ کے اکثر مشہور و مستند عالم، محدث و مفسر، فقیہ و اُصولی، آپ ہی کے حلقۂ درس کے خوشہ چیں ہیں۔

ایسے ہی جلیل الشان حضرات کی برکت سے مدرسہ دیوبند محط آمال رجال بنا ہوا تھا۔ اور ابتداء قیام سے آج تک دوسرے مدارس کے منتہی اور فارغ التحصیل طلبہ علم حدیث کے لیے یہاں آتے تھے؛ لیکن جب سے حضرت قطب العالم، خاتمۃ المحدثین، الامام المجتہد، مجدد الاسلام، جامع الشریعۃ والطریقۃ، امام المعرفۃ والحقیقۃ حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز عالم قدس کو تشریف لے گئے۔ رجوع طالبین علمِ حدیث بہت زیادہ بڑھ گیا اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد محسوس ہو گیا کہ موجودہ درسگاہوں میں سے کسی ایک کی وسعت بھی جماعت حدیث کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔

اب خادمانِ مدرسہ کو دو خیال درپیش ہو گئے:

(۱) جدید اور وسیع درسگاہیں مدرسین مدرسہ کے لیے تعمیر کرنا؛ کیونکہ اول تو بوجہ زیاد مدرسین درسگاہوں کی قلت دوسرے طلبہ کی کثرت کی وجہ سے قدیم درسگاہوں میں جگہ کی تنگی۔

(۲) خاص علمِ حدیث کے لیے ایسی وسیع اور کشادہ درسگاہ کا تعمیر کرنا جس میں طلبہ کی بڑی سے بڑی تعداد بھی اطمینان کے ساتھ استفادہ علومِ حدیث کر سکے۔

ان دونوں خیالوں کو عملی صورت میں لانے کے لیے یہ تجویز کیا گیا کہ مدرسہ کی صدر درس گاہ معروف بہ نودرہ جو تین درس گاہوں پر مشتمل ہے، اُس کے اوپر ایک درسگاہ دارالحدیث کے نام سے تعمیر کی جائے اور نودرہ کے جنوب وشمال میں جو دو درسگاہیں واقع ہیں، اُن کے اوپر ایک ایک درسگاہ کشادہ بنا دی جائے اس خیال کی تکمیل کے اسباب اس طرح ظاہر ہوئے کہ جناب حاجی حافظ فصیح الدین صاحب نے منجانب حافظ احسن الدین صاحب مرحوم جانبِ شمال کی درس گاہ تیار کرانے کا خیال ظاہر فرمایا۔ اور اُس کی بنیاد کے لیے ۹ رجب ۲۹ھ تاریخ مقرر ہوگئی۔ جس میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب مدظلہم اور جناب حضرت مولانا قاضی محی الدین صاحب قاضی ریاست عالیہ بھوپال۔ اور جناب مولانا محمد حسن صاحب رکن مجلس علماء بھوپال ممبران مدرسہ عالیہ دیوبند اور بعض اور بھی مقتدر حضرات تشریف لائے۔ اور اچھا باخیر و برکت مجمع ہوگیا۔ اور اُس درسگاہ کی بنیاد رکھ دی گئی۔ درسگاہ کی بنیاد سے فارغ ہو چکے تو حضرت مولانا اشرف علی صاحب مدظلہم نے فرمایا کہ اسی مبارک وقت میں جانب جنوب کی درسگاہ کی بنیاد بھی رکھ دی جائے۔ اور اُس کے چندہ کی فہرست کھول دی جائے، جس میں اپنی ذات سے سو روپیہ عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا۔ سب حضرات نے اس تجویز کو بہت ہی مبارک و مسعود خیال فرما کر اُس کی بنیاد بھی رکھ دی۔ اور اُسی جلسہ میں جناب حافظ فصیح الدین صاحب و حاجی وجیہ الدین صاحب اور بہت سے اہلِ خیر نے چندہ کی فہرست میں معقول رقمیں لکھوائیں۔ جن کی مقدار پانچ سو روپیہ سے کچھ زیادہ ہوگئی۔ اس کی بنیاد سے فراغت ہو چکی تو حضرت مولانا محمود حسن صاحب مدظلہم العالی نے ارشاد فرمایا کہ دارالحدیث کی بنیاد بھی اسی مبارک موقعہ پر رکھ دی جائے حضرت مولانا کے ارشاد کو سب نے نہایت استحسان اور پسندیدگی سے دیکھا۔ اور بالا نودرہ پر دارالحدیث کا سنگ بنیاد بھی اپنے مقدس ہاتھوں سے نصب فرمایا۔ دارالحدیث کی تعمیر کا سرسری تخمینہ پندرہ ہزار کر کے اعلان کر دیا گیا۔ درسگاہ شمالی بہت جلد تیار ہوگئی۔ اور حسنِ اتفاق سے درسگاہ جنوبی کی تعمیر کا تکفل جناب حاجی حافظ اللہ بخش صاحب نے فرمالیا۔ اور وہ چندہ جو خاص اس درسگاہ کے لیے وصول ہوا یا موعود تھا وہ سب کا سب حسبِ رضا معطیان دارالحدیث منتقل کر دیا گیا۔

تمام دنیا میں سب سے اوّل دارالحدیث کی مقدس تعمیر کا ظہور دمشق میں ملک عادل نورالدین کے ہاتھ سے ہوا اس سے قبل محدثین اپنے اپنے طور پر روایتِ حدیث کرتے اور درسِ حدیث دیتے تھے۔ یا مدارس کے اندر دوسرے علوم کے دوش بدوش علم حدیث کی تعلیم و روایت کا سلسلہ بھی جاری تھا، جس طرح اور علوم کے لیے جدا جدا شیخ ہوتے تھے۔ اسی طرح شیخ الحدیث کا عہدہ بھی اپنے وقت کے امام اور مسلم محدث کو دیا جاتا تھا۔ نظامیہ اور مستنصریہ بغداد اور دوسری مشہور درسگاہوں کی یہی شان تھی۔ مگر علمِ حدیث کی قدر و منزلت، رفعتِ شان، علومِ دینیہ اور

احکام شرعیہ کے مدار علیہ ہونے کی حیثیت اس کو بیشک مقتضی تھی کہ اس کے لیے مستقل اور علیحدہ درسگاہ کھولی جائے۔

لیکن یہ حصہ صرف نورالدین کی قسمت میں لکھا ہوا تھا۔ نورالدین نے جہاں اور اپنی بہترین یادگاریں چھوڑیں اور جہاں دارالعدل اور بیمارستان نوری اُس کی یادگاریں تھیں اُن میں سب سے بہتر اور سب سے ارفع و اعظم یادگار بناء دارالحدیث تھی۔ نورالدین کے بعد مصر میں ملک کامل نے اور اُس کے بعد دوسرے ملوک نے اس سنتِ حسنہ کا اقتداء کیا۔ اور متعدد دارالحدیث مصر میں قائم ہوئیں۔ جن کی صدارت امام نووی، حافظ تقی الدین سبکی حافظ ذہبی اور دیگر اجلہ محدثین کے سپرد رہی۔

مگر ہندوستان جیسے وسیع ملک میں باوجود رونق علم، نہ سلاطین اسلام کے زمانہ میں دارالحدیث کے نام سے کوئی درسگاہ قائم ہوئی تھی۔ اور نہ مسلمانوں کے عام چندہ سے۔

مدرسہ عالیہ دیوبند کو جس طرح یہ شرف و امتیاز حاصل ہے کہ ہندوستان بھر میں پہلی درسگاہ ہے جو عین زوالِ علم کے وقت مسلمانوں کے عام چندے سے قائم ہوئی۔ اور اس کے بعد اُس کے منوال پر سیکڑوں ہزاروں درسگاہیں جاری ہوگئیں اسی طرح یہ فضیلت بھی اُوسی کے حصہ میں روزِ ازل سے لکھی ہوئی تھی، کہ ہندوستان میں سب سے اوّل دارالحدیث کی تعمیر اُسی کے احاطہ میں ہو۔

دارالحدیث کی تعمیر کا غلغلہ بلند ہوتا تھا کہ مسلمانوں کے اندر جوش محبت کی لہریں موجزن ہوگئیں، جہاں جہاں اس کی خبر پہونچتی گئی مسلمان اپنی حیثیت کے موافق امدادی رقوم بھیج کر اپنا نام اُس فہرست میں درج کرانے لگے۔ اور یہ اس کی خاص خصوصیت تھی کہ بہت سے حضرات نے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے چندہ بھیجے۔ اور جب سلسلہ چل گیا خلفاء اربعہ، ائمہ اہلِ بیت، صحابہ کرام، ائمہ مجتہدین، مشائخ عظام اور تمام بزرگانِ دین رضوان اللہ علیہم۔ اساتذہ کرام اور اپنے اقرباء اور احباب کی طرف سے چندے آنے شروع ہوگئے۔

دارالحدیث کی مقبولیت کا یہ اثر ہوا کہ بہت سے نیک دل حضرات کو اس کی بدولت حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت رویاء میں نصیب ہوگئی۔ جناب مولوی سید یوسف علی صاحب وکیل سرونج کا مبارک خواب بہ عنوان بشارت رسالہ ''القاسم'' ذی قعدہ ۲۹ھ میں شائع ہو چکا ہے۔

الغرض دارالحدیث کی طرف مسلمانوں کے عام میلان اور شوق نے ثابت کردیا کہ مسلمان اس کی تکمیل کے بصد شوق منتظر ہیں۔ جو حضرات ''القاسم'' کو مسلسل ملاحظہ فرماتے ہیں اُن کو اُس فہرست سے جو چندۂ دارالحدیث کے متعلق برابر طبع ہوتی رہی ہے خود اس ذوق اور گرویدگی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

دارالحدیث میں جن حضرات نے بڑی بڑی اعانتیں فرمائی ہیں اُن کی فہرست ان شاء اللہ تعالیٰ ۳۰ھ کی روداد میں ناظرین کے ملاحظہ سے گزرے گی۔

دارالحدیث کی تعمیر اوّل صرف بالائی نودرہ پرقرار پائی تھی اور اُس کا سرسری تخمینہ پندرہ ہزار تجویز کیا گیا تھا؛ لیکن جب اس بارے میں انجینئروں سے مشورہ کیا گیا اور جناب مولوی سید عاشق حسین صاحب خاص اس غرض کے لیے دیوبند تشریف لائے تو بعد مشورہ یہ تجویز بالکل بدل گئی۔ اور یہ رائے قرار پائی کہ دارالحدیث کے متعدد وسیع کمرے ہونے چاہئیں اور عقب مدرسہ سے زمین لے کر تین کمرے معہ برآمدوں کے تعمیر کیے جائیں۔ اور ایک وسیع کمرہ حسبِ تجویز اوّل بالائی نودرہ تعمیر کیا جائے۔ اس طرح ایک وسیع اور عظیم الشان تعمیر دارالحدیث کے لیے تجویز ہوئی اور مولوی سید عاشق حسین صاحب انجینئر نے اُس کا نقشہ بنایا۔ اور خود ہی اُس کا تخمینہ بقدر ساٹھ ہزار روپیہ کے بنایا جب یہ تجویز بدل گئی تو اب یہ قرار پایا کہ بنیاد دارالحدیث کے لیے خاص ایک جلسہ منعقد کیا جائے، جس میں بیرونی حضرات کو دعوت دی جائے۔ اور اُسی موقعہ پر نقشہ مجوزہ پیش کیا جائے۔

چنانچہ یہ جلسہ ۳۰ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ نہایت شان و شوکت سے منعقد ہوا۔ اور اُسی میں وہ چند نقشے جو جناب سید عاشق حسین صاحب بنا کر لائے تھے پیش ہوئے، جس میں سے ایک نقشہ منتخب کیا گیا۔ اس جلسہ کی مفصل کیفیت روداد ۳۰ھ میں ان شاء اللہ تعالیٰ ملاحظہ سے گزرے گی۔

اِس سال اِس مبارک تعمیر کا کام شروع نہیں ہوا؛ اس لیے اب اس بیان کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ آئندہ ان شاء اللہ تعالیٰ زیادہ تفصیل کے ساتھ عرض کیا جائے گا۔

....

آگے کا حال گزشتہ صفحات میں ۱۳۳۰ھ کی روداد کے تحت آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اس کے بعد دارالحدیث کی تعمیر وہاں سے گزرنے والے نالے کی وجہ سے روک دی گئی، جس کا ذکر ۱۳۳۰ھ کی روداد کے صفحہ نمبر ۳۳ پر اس طرح کیا گیا ہے:

> ”دارالحدیث کی تعمیر کے لیے سرکاری نالہ کا ہٹایا جانا ضروری ہے، جس کے لیے صاحب کلکٹر بہادر اور صاحب جنٹ مجسٹریٹ و چیرمین میونسپل بورڈ دیوبند نے پختہ وعدہ فرمالیا ہے اس کی رپورٹ تیار ہو رہی ہے۔ ان شاء اللہ جلد یہ کام ہو جائے گا۔ اور اسی وقت بنیادیں مکمل ہو کر کام شروع کر دیا جائے گا“۔

مگر ہمیشہ کی طرح سرکاری وعدے کا مقدر التواہی میں پڑے رہنا تھا اور تین سال تک جب سرکار کی طرف سے یہ نالہ نہیں بند کیا گیا تو مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحب نے اپنی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے وہ تیر چھوڑا کہ جس کا نشانہ ہرگز خطا نہ ہوا۔ آپؒ نے نواب عبدالصمد خان صاحب رئیس طالب نگر کے ذریعہ فرماں روائے صوبہ کو دیوبند آمد کے لیے کہا اور وہی ہوا۔ پھر کیا تھا ۱۹۱۵ء میں فرماں روائے صوبہ آنر نواب لفٹنٹ گورنر بہادر سر جان

جیمس جے سی کے ایس آئی (J.C.K.S.I) گورنر ممالک متحدہ نے دارالعلوم دیوبند کا دورہ کیا اور اسی ملاقات میں دارالعلوم کے مہتمم نے نواب لفٹننٹ صاحب سے اُس نالے کو ہٹانے کی گزارش کی، جس کے سبب دارالحدیث کا تعمیری کام رُکا ہوا تھا۔

یکم مارچ ۱۹۱۵ء کو گورنر جیمس دیوبند تشریف لائے اور چند گھنٹے قیام کے بعد ایک بہترین تقریر کر کے واپس لوٹ گئے۔ آپ نے دارالحدیث کے لیے چار ہزار اور دارالعلوم کے لیے ایک لاکھ روپیے دینے کا اعلان کیا۔ آپ کی تقریر اور آمد کی پوری تفصیل ۱۳۳۳ھ کی روداد میں درج ہے۔ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے بادشاہ کے آنے پر تمام شہر صاف کیا جاتا ہے اور وہ جس کا حکم دے جائے اس پر فوراً عمل کیا جاتا ہے اسی طرح وہ نالہ بھی بند کر دیا گیا اور دارالحدیث کا تعمیری کام دوبارہ شروع ہو گیا۔ پھر پندرہ سال کی مسلسل تعمیر کے بعد ۱۹۳۰ میں یہ پُرشکوہ عمارت تیار ہوئی جو آج بھی دارالعلوم کی اصل پہچان ہے، اسی عمارت سے دارالعلوم کی شناخت دنیا بھر میں نمایاں ہوتی ہے۔ یہی وہ عمارت ہے جس کی وجہ سے دارالعلوم اخلاص کا تاج محل کہلاتا ہے۔ یہی وہ عمارت ہے جس کی بنیادوں میں حضرت شیخ الہند مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، مولانا عبدالرحیم رائے پوریؒ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جیسے اکابر دیوبند کے دست مبارک سے لگائی گئی وہ اینٹیں شامل ہیں جن کو فقط مٹی اور چونے نے نہیں؛ بلکہ اُن کے اخلاص اور تقوے نے مضبوط کیا ہوا ہے۔

لیکن یہ سوچ کر ہماری آنکھیں بھر آتی ہیں اور افسوس سے دل بیٹھا جاتا ہے کہ خلوص و للّٰہیت سے تعمیر کی گئی اکابر دارالعلوم کی یہ شاندار یادگار اب کچھ ہی دنوں کی مہمان ہے۔ انکسار کے پیکر، زہد و ورع کے نمونے، دین مصطفیٰؐ کے امین، اسلامی شریعت کے پاسبان اکابر دیوبند کہے جانے والے ان حضرات کے ہاتھوں سے بنایا گیا یہ دارالحدیث دارالعلوم کی موجودہ انتظامیہ کے نشانے پر ہے۔ جس طرح دارالاقامہ کی جدید تعمیر کے ساتھ مدنی گیٹ اور باب الظاہر کو ختم کر کے وہاں بلند قامت نئے دروازے بنانے کا پلان ہے اسی طرح اس دارالحدیث کو توڑ کر نئی دارالحدیث بنانے کا منصوبہ بہت پہلے ہی شوریٰ کے ناعاقبت اندیش اور نااہل ممبران نے پاس کر رکھا ہے۔ بلاشبہ اس دارالحدیث کی بنیادوں میں اللہ والوں کا وہ خلوص شامل ہے جو آنے والے پانچ سو سالوں تک بھی اسے گرنے نہیں دے گا۔ اور اگر اس کی حفاظت کی جائے تو یقیناً ایک ہزار سال تک بھی یہ عمارت نہیں گرے گی۔

کاش کے قوم کے باظرف و باہمت لوگ اس عمارت کو گرنے سے بچا لیں، جو انتظامیہ اس وقت دارالعلوم کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے وہ گھن کی طرح اخلاص کے اس تاج محل کو کھوکھلا کر رہی ہے۔

لٹتی ہوئی اسلام کی عصمت کو بچا لو
اے اہل ہنر! آؤ یہ جاگیر سنبھالو

مسجد ریلوے اسٹیشن

کتاب کے صفحہ ۱۲۶/ پر اِس مسجد کا تذکرہ کیا گیا ہے اور افسوس کی بات ہے کہ یہاں بھی مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ؒ کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ یہ مسجد تو خالص مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی ؒ ہی نے اپنی نگرانی میں بنوائی تھی۔ دہلی کے دو بھائیوں نے اپنی والدہ مرحومہ کو ایصالِ ثواب کرنے کے لیے اس مسجد کے تمام اخراجات ادا کیے تھے، جس کی تفصیل دارالعلوم کی روداد ۱۳۳۳ھ میں خود مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی ؒ نے لکھی ہے۔آپ یہ تفصیل ملاحظہ فرمائیں، تاکہ آپ کو صحیح معلومات ہو سکے۔

دیوبند کے اسٹیشن پر عالی شان مسجد

ریلوے کے اکثر اسٹیشنوں پر چھوٹی یا بڑی مسجدیں موجود ہیں، جن سے مسافروں کو وضو و نماز وغیرہ میں بہت کچھ سہولت حاصل ہوتی ہے اور وہ باطمینان و دلجمعی فرائض خداوندی ادا کر لیتے ہیں۔ اور جن اسٹیشنوں پر مسجدیں نہیں ہیں، وہاں مسلمانوں کو جس قسم کی تکلیف ہوتی ہے اُس کو وہی جانتے ہیں جو احکامِ شرع کے پابند ہیں۔نماز اُس کی وقت پر شرائط کی پابندی سے ادا کرنا چاہتے ہیں۔اسٹیشنوں کے مسافر خانوں یا ریلوے کے پلیٹ فارم پر نماز ادا کرنے میں جو دِقّت ہوتی ہے اُس کا حال مخفی نہیں ہے۔

دیوبند ایک مذہبی دارالعلوم کا مرکز ہے، علاوہ قصبہ کے مسافروں کے زیادہ تر آمد و رفت اہلِ علم کی ہوتی ہے اور یہ سب لوگ نماز کو اُس کی شرائط سے پورا پورا ادا کرنا چاہتے ہیں؛ مگر باوجود اس عرصہ طویل پچاس سال گزر جانے کے وہاں کوئی مسجد نہ تھی۔ احاطۂ ریلوے میں تار کے اندر ایک چبوترہ بنا ہوا تھا۔جس پر نماز پڑھتے تھے؛ مگر وہ مسقف نہ تھا۔ بارش اور سردی میں سخت تکلیف ہوتی تھی۔ چبوترہ بہت چھوٹا تھا جس پر بمشکل آٹھ دس آدمی نماز پڑھ سکتے تھے۔حالانکہ بسا اوقات اسٹیشن دیوبند پر مجمع کثیر جمع ہوتا تھا۔احاطہ نہ ہونے کی وجہ سے جانور بھی اس پر چڑھتے تھے، بکریاں اور مرغیاں پھرتی رہتی تھیں۔ پھر اس چبوترہ کا بقاء بھی حکام ریلوے کی رضاء پر موقوف تھا؛ کیونکہ وہ سرکاری زمین میں واقع تھا۔

یہ امر نہایت تعجب خیز تھا کہ دارالعلوم کے اسٹیشن پر کوئی مسجد نہ ہو اس اشد ضرورت کو محسوس کر کے دیوبند کے بعض حضرات نے مسجد بنوانا چاہا اُس کے لیے موقع بھی تجویز کر لیا گیا۔ سامان تعمیر مثل خشت وغیرہ بھی کچھ فراہم کر لیا؛ مگر بعض موانع و عوائق ایسے پیش آئے کہ یہ ارادہ خیال سے وجود میں نہ آسکا، خدامِ دارالعلوم کو عرصہ سے اس کی فکر تھی۔ الحمدللہ کہ اس سال یہ اشکال رفع ہو گیا۔ دہلی کے بعض اربابِ خیر نے جن کا گہرا تعلق دارالعلوم سے تھا اور

وہ وقتاً فوقتاً دار العلوم میں تشریف لاتے تھے، اِدھر توجہ کی اور بحمد اللہ جلد از جلد یہ مسجد مکمل ہوگئی۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ جناب شیخ محمد ابراہیم صاحب و شیخ محمد یعقوب صاحب و شیخ محمد یٰسین صاحب سوداگرانِ چرم کی والدہ ماجدہ مرحومہ نے کچھ روپیہ اسی غرض کے لیے چھوڑا تھا، ان ہر سہ برادران مذکور الصدر کو مرحومہ کی وصیت پورا کرنے کا خیال چلا جاتا تھا۔ کسی بہتر مقام کی فکر میں تھے۔ جہاں فی الحقیقت مسجد کی ضرورت ہو۔ عالی جناب مہتمم صاحب دار العلوم نے اسٹیشن دیوبند پر مسجد کی ضرورت کو ان حضرات پر ظاہر کیا۔ جس کو سن کر فوراً قبول کرلیا۔ مسجد کے لیے مناسب موقع کی فکر ہوئی۔ تو چبوترہ مذکورہ کے قریب ریلوے احاطہ سے باہر ایک قطعہ اراضی پسند کیا گیا، جس کے مالک ہمارے دوست منشی محمد انور خان صاحب اور اُن کے اعزہ تھے۔ منشی صاحب موصوف سے اس کا ذکر ہوا تو آپ نے اپنے حصہ کی قدر زمین جس میں مسجد بخوبی تیار ہوسکتی تھی بطیب خاطر بلا معاوضہ دینا قبول فرمایا؛ لیکن شیخ محمد ابراہیم صاحب اور اُن کے ہر دو برادران کو اس پر اصرار تھا کہ قیمتِ زمین ضرور دی جائے۔ اس بنا پر ہر چند کہ منشی صاحب موصوف کسی طرح قیمت لینے پر رضامند نہ تھے؛ مگر بمشکل راضی کر کے معاوضہ دیا گیا۔ منشی محمد انور صاحب نے نہایت مستعدی سے بیعنامہ مکمل کرلیا اور دیگر حصہ داروں کو رضامند کر کے اُس حصہ کو علیحدہ کرا کر نشانات قائم کرا دیے، ہر چند کہ یہ قطعہ تعمیر مسجد کے لیے کافی تھا؛ مگر مسجد کے ساتھ اور مکانات مثل دوکانیں وغیرہ کی تعمیر کا خیال بھی تھا؛ اس لیے بعض دوسرے شرکاء کا حصہ بھی خرید کر اس میں شامل کر دیا گیا۔

۱۳۳۳ھ میں اس مسجد کی تعمیر شروع ہوئی اور اسی سن میں بحمد اللہ ختم بھی ہوگئی۔

خیال یہ تھا کہ مسجد اس قدر وسیع ہو کہ ضرورت کے وقت مجمع کثیر اُس میں نماز باجماعت ادا کرسکے اور یہ بھی خیال تھا کہ مسجد کے متعلق چاہ وحمام کے علاوہ ایک مکان ایسا بھی ہو کہ شب کے آنے والے مسافر بالخصوص طلبہ مسافرین جس کو شب کے وقت سواری نہ ملنے یا اور کسی سے واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے قصبہ میں جا کر قیام کرنا دشوار اور سخت تکلیف دہ تھا قیام کرسکیں اور ایک حجرہ ایسا بھی ہو جس میں ایک ایسے طالبِ علم کو رکھا جاسکے جو مسجد میں امامت کرائیں۔ اس کے علاوہ چند دوکانیں بھی تیار کرا دی جائیں جن کے کرایہ سے مسجد کا معمولی خرچ چل سکے۔

ہمارے مکرم حضرات بانیان مسجد نے ان تمام اخراجات کو منظور فرمایا۔ مسجد وسیع معہ سائبان اور چاہ کے تیار ہوگئی، ایک کمرہ ہوادار جس کے آگے سہ دری ہے تیار ہوگیا۔ اور تین دوکانیں بھی بن گئیں، ان دوکانوں کو تیاری کے ساتھ ہی کرایہ پر دے دیا گیا۔

مسجد نہایت خوشنما تعمیر ہوئی۔ صحن وسیع رکھا گیا۔ حضرات مذکورین اثناء تعمیر میں برابر دیوبند تشریف لاکر تعمیر کو ملاحظہ فرماتے رہے۔ اور بعض خاص کاموں کی انجام دہی کے لیے دہلی سے کئی معماروں کو بھی لائے، محراب مسجد

میں اپنے شوق سے کینچ کے ٹکڑے خوشنما طور پر لگوائے۔ مسجد کی روشنی کے لیے دہلی سے ہانڈیاں لا کر لگائیں۔

اختتام تعمیر کے بعد آپ حضرات معہ مستورات کے دیوبند تشریف لائے۔ افتتاحِ مسجد کے دن باشندگان دیوبند اور طلبہ دارالعلوم کا شاندار جلسہ ہوا۔ پردہ کا انتظام کر کے ایک جانب مستورات کو بٹھایا گیا۔ اوّلاً عصر کی نماز ادا کی گئی۔ بعد ازاں وعظ ہوا۔ وعظ کے بعد ان حضرات نے کثیر مقدار شیرینی کی تقسیم فرمائی۔ حاضرین مجلس نے جن کی تعداد کئی ہزار تھی بانیانِ مسجد اور اُن کی والدہ ماجدہ مرحومہ کے لیے دعا فرمائی۔ اس جلسہ پر بحمداللہ مقبولیت کے آثار نمایاں تھے نمازِ مغرب بھی تمام حاضرین نے وہیں ادا کی۔

دارالعلوم کی جانب سے یہ انتظام کر دیا گیا کہ ایک متدین طالب علم کو وہاں رہنے کے لیے منتخب کر دیا جاتا ہے جو پابندی کے ساتھ نماز پڑھائیں۔ جو طالبِ علم وہاں رہتے ہیں ان کو وظیفہ دارالعلوم کے علاوہ مسجد کی جانب سے بھی خدمت کی جاتی ہے۔ اور ریلوے اسٹیشن کے مسلمان بابو و دیگر ملازمین بھی اپنے طور پر نہایت تواضع سے پیش آتے ہیں۔

اس مسجد میں جمعہ بھی ہوتا ہے۔ اسٹیشن کے رہنے والے اور مسافر جو اُس وقت وہاں موجود ہوتے ہیں اس مسجد کی بدولت فریضۂ جمعہ سے بھی محروم نہیں رہتے۔

احاطۂ مسجد میں ابھی بہت سی جگہ باقی ہے۔ خیال ہے کہ ایک چھوٹا سا مکان کسی گوشہ پر ایسا بنا دیا جائے جس میں قریب کی بستیوں کی آنے والی مستورات بھی تھوڑی دیر آرام کر سکیں۔

اس وقت تک مسجد کی تعمیر میں جو کچھ صرف ہوا، جس کی مقدار تقریباً پانچ ہزار (۵۰۰۰) روپیہ ہے۔ انہیں حضرات مذکورین کی طرف سے ہوا، بعض دیگر عمارات جن کے بنانے کا خیال ہے اُمید ہے کہ اُن کے لیے بھی کوئی سامان ہو جائے گا۔

امام کے لیے جس حجرہ کی تعمیر کا خیال ہے وہ بھی ابھی تعمیر نہیں ہوا۔ اُن کا قیام اس وقت تک اُسی کمرہ میں رہتا ہے جو استراحتِ مسافرین کے لیے تیار کرایا گیا ہے۔ مگر ضرورت اس کی ہے کہ حجرہ علیحدہ تعمیر کرا دیا جائے اور یہ کمرہ محض مسافرین کے آرام کے لیے کر دیا جائے۔

خداوند عالم کا شکر ہے کہ اسٹیشن دیوبند پر جس قسم کی مسجد مطلوب تھی ویسی ہی تعمیر ہو گئی۔ جو ضروریات متعلقہ مسجد باقی ہیں وہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ پوری ہو جائیں گی۔ اس وقت تک تین دوکانیں تیار ہوئی ہیں۔ خیال ہے کہ مسجد کی جانب جنوب اور چند دوکانیں تعمیر ہو جائیں؛ کیونکہ یہ تین دوکانیں کافی نہیں ہیں۔

مسجد اسٹیشن کی تعمیر چونکہ براہِ راست زیر اہتمام دارالعلوم ہوئی ہے اور انتظام بھی دارالعلوم کے سپرد ہے؛ اس لیے اُن کو دارالعلوم کا ایک جزو سمجھ کر روداد دارالعلوم میں تذکرہ کیا گیا۔

ہماری دعا ہے کہ حق تعالیٰ شیخ محمد ابراہیم صاحب، شیخ محمد یعقوب صاحب اور شیخ محمد یٰسین صاحب کے اموال میں برکت عطا فرمائے ۔اُن کے مقاصدِ قلبی پورے فرمائے اور ان کو دین و دنیا کی دولت سے مالا مال فرمائے ۔ اُن کی والدہ ماجدہ کی مغفرت فرما کر اعلیٰ علیّین میں جگہ عطا فرمائے ۔(آمین یارب العٰلمین)

......❖......

مسجد کی یہ تفصیل ہم نے دو وجہ سے پیش کی ہے: اوّل یہ کہ جن لوگوں نے اپنی والدہ کی وصیت کے مطابق یہ مسجد بنوائی تھی ان کا پورا تذکرہ مع نام کے فاضل مرتب نے نہیں کیا، حالانکہ دارالعلوم کی روداد میں تمام تفصیل موجود ہے ۔اور جیسا کہ ہم عرض کر آئے ہیں یہی تفصیل تو مطالعہ کرنے والوں کے لیے تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے ۔

دوم یہ کہ فاضل مرتب نے جس طرح دارالحدیث کی تعمیر میں مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ؒ کو نظرانداز کیا تھا اسی طرح یہاں بھی کیا ہے ۔حالانکہ یہ مسجد مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ؒ ہی نے اپنی نگرانی میں بنوائی تھی ۔مانا اُن کا نام یہاں لکھنا ایسا کوئی خاص ضروری بھی نہیں تھا؛ لیکن جب بغیر کچھ بھی تعمیری اور اصلاحی کام کیے فاضل مرتب مولوی اسعد و مولوی مرغوب الرحمٰن صاحب کا نام بڑے فعال شخص کی حیثیت سے لکھتے ہیں تو کم سے کم جو حقیقت میں فعال لوگ تھے اور جنھوں نے واقعی دارالعلوم کو مرکزی حیثیت عطا کی ان کا نام فاضل مرتب صاحب نے خیانت کے سبب چھوڑ دیا ہے تو ہم ہی تحریر کر دیں ۔

جامعہ طبّیہ

صفحہ نمبر ۱۳۱ پہ ۱۹۶۰ء میں جامعہ طبیہ کی وسیع اور شاندار عمارت کے ساتھ چارسالہ طبی کورس کا بھی ذکر کیا گیا ہے یہی وہ جامعہ طبیہ ہے جسے مولوی اسعد مدنی صاحب ؒ نے بند کرادیا تھا، جس کی تفصیل ہم گزشتہ صفحات میں بیان کر آئے ہیں ۔

مسجد رشید

صفحہ نمبر ۱۳۲ تا ۱۳۳ پہ ایک جملہ لکھا ہے، ہمیں بس اسی ایک جملے کو پڑھ کر ہنسی آگئی، آپ بھی مزہ لے لیجیے ۔ مسجد رشید کی تعمیر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ۴/ اپریل ۱۹۸۶ کو جمعہ کی نماز کے بعد، اب وہ جملہ ہے: ''صلاح و تقویٰ ،علم و معرفت اور روحانیت و اخلاص کے ایک پاکیزہ قافلہ نے ..... ایک وسیع و عریض مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا'' ۔

قارئین! جس قافلہ کو پاکیزہ اور نہ جانے کیا کیا لکھا ہے جب اس میں شریک لوگوں کے نام پڑھے تو ہنسی آگئی ۔ بلاشبہ مولوی اسعد صاحب ؒ کی چاپلوسی میں فاضل مرتب اس درجہ ملوث ہیں کہ بہت اچھے اچھے تمثیلی جملے لکھنے کو دل چاہ رہا ہے؛ لیکن ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم قلم روک رہے ہیں ۔

قارئین! آپ خود بتائیں مولوی اسعد مدنی صاحب جیسا سیاسی آدمی جس قافلے میں شریک ہو اس قافلہ کو کوئی بھی صاحب عقل اخلاص کا پاکیزہ قافلہ کیسے کہہ سکتا ہے۔خیر جانے دیجیے فاضل مرتب دارالعلوم کی غیر معتبر تاریخ لکھنے کے ساتھ ساتھ مدنی خاندان کی مدح سرائی میں ملوث ہیں۔

اکابر کے نام پر دارالعلوم کی تعمیرات

مسجد رشید کے بعد صفحہ ۱۳۴ تا ۱۳۵ پہ اکابر کے نام پر بنی ہوئی تعمیرات کا تعارف دیا گیا ہے: ''شیخ الہند منزل، حجۃ الاسلام منزل، شیخ الاسلام منزل، حکیم الامت منزل'' ہمیں عرض یہ کرنا ہے دارالعلوم پہ قبضہ کے بعد جہاں تعمیرات میں شاندار اضافہ ہوا ہے وہیں تعصب میں بھی یک گونہ بڑھوتری ہوئی ہے۔ بلاشبہ یہ تعصب ہی تو ہے کہ اتنا زمانہ گزر گیا؛ لیکن آج تک دارالعلوم میں کوئی ایک گیٹ، کوئی منزل یا کوئی عمارت بھی دارالعلوم کے ان اکابر کے نام سے منسوب نہیں کی گئی جن کی علمی خدمات کے طفیل مسلکِ دیوبند کو حیات ملی ہوئی ہے۔کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، شیخ الادب مولانا اعزاز علی اور حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمہم اللہ کے نام سے دارالعلوم میں کون سی عمارت یا کون سا دروازہ قائم ہے۔اس کے برعکس حقدار کو حق نہ دینے کی روش کے چلتے بہت جلد دیکھ لینا جس دارالعلوم میں آج تک علامہ انور شاہ کی یاد میں شاہ منزل یا خاندان عثمانی کی خدمات کے سبب کوئی عثمانی منزل نہیں بن سکی، اسی دارالعلوم میں فدائے ملّت اور امیر الہند کے نام سے ضرور کوئی نہ کوئی عمارت منسوب کر دی جائے گی؛ کیونکہ چاپلوسی کا شیرا فقط فاضل مرتب کی رگوں ہی میں نہیں؛ بلکہ انتظامیہ اور شوریٰ کے اکثر ممبران کے شریانوں میں بھی رَواں دَواں ہے۔

دارالعلوم کے انتظامی شعبہ جات

جن فعال اور منتظم حضرات کو فاضل مرتب نے نظر انداز کیا ہے آج ان ہی کی وجہ سے دارالعلوم کے بہت سے شعبے قائم ہیں۔ یہاں ہم ان کے نام اسی لیے پیش کر رہے ہیں، تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ دارالعلوم کو مولانا حبیب الرحمٰن اور قاری طیب صاحب رحمہما اللہ نے کیا کیا دیا ہے۔

شعبہ محاسبی

یہ شعبہ دارالعلوم کا سب سے اہم شعبہ مانا جاتا ہے۔اس کی ابتدا دارالعلوم کے بانیوں میں سے ایک مولانا فضل الرحمٰن عثمانی ؒ نے کی تھی؛ کیونکہ آپ ڈپٹی انسپکٹر آف مدارس تھے،اس لیے مدرسوں کے نظام و اہتمام سے

بخوبی واقف تھے، یہی وجہ ہے کہ دارالعلوم کے ابتدائی شعبہ اور طلبا کے لیے حاضری رجسٹر وغیرہ کا سب انتظام مولانا فضل الرحمٰن عثمانی ؒ ہی کی دین ہے۔

محافظ خانہ

یہ شعبہ حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب ؒ نے اپنے دَورِ اہتمام میں قائم کیا تھا۔

کتب خانہ

دارالعلوم دیوبند کا کتب خانہ خالص مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ؒ کی دین ہے۔ یہ ان ہی کی محنتوں اور کاوشوں کا ثمرہ ہے، کہ دارالعلوم کے پاس آج تک ملک کا ایک عظیم ذخیرۂ کتب موجود ہے۔

لیکن ایک بات کتب خانے کے اوقات کو لے کر ہمیشہ ہمارے ذہن میں رہتی ہے، جب ہم پڑھتے تھے اس وقت بھی، اس کا احساس شدت سے ہوتا تھا اور آج تک بھی اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ دارالعلوم کے کتب خانہ کے کھلنے کا وقت بالکل وہی ہے جو درسگاہ میں تعلیم کا وقت ہے یعنی صبح ۱۱ ربجے تک اور پھر عصر تک یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اگر کسی طالبِ علم کو لائبریری میں آنا ہو تو اسے اپنا درس چھوڑنا پڑے گا۔ درس گاہ کی چھٹی کے ساتھ ہی لائبریری بھی بند ہوجاتی ہے، یہی حال شام کا ہے، ذرا کوئی سمجھائے کہ طلبہ کس وقت میں کتب خانہ سے فیض حاصل کر سکتے ہیں۔ مغرب کے بعد بھی درس گاہ میں تکرار ہوتی ہے، ایسا کوئی بھی تو وقت نہیں جس میں طلبہ کتب خانہ کا استعمال اپنی تعلیمی غیر حاضری کے بغیر کرسکیں۔ یہ کتنا غلط نظام ہے؛ کیوں نہ ایسا ہو کہ کتب خانہ صبح درس گاہ کے وقت کے ساتھ نہ کھل کر ۲ گھنٹے بعد کھلے اور دوپہر ایک بجے تک کھلا رہے، تاکہ درس سے فارغ ہو کر کم سے کم ایک بجے تک تو ضرورت مند طلبہ کتب خانہ سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔ ایسے ہی شام کو مغرب کے بعد سے رات کو ۹ یا ۱۰ بجے تک کھلنے کا معمول ہونا چاہیئے۔ ظاہری بات ہے جن طلبہ کے لیے کتب خانہ ہے ان کو مستفید ہونے کے لیے وقت بھی تو ملنا چاہیئے۔ ایسا وقت جو ان کے درس کے اوقات سے تھوڑا الگ ہو۔ اللہ کرے دارالعلوم کی انتظامیہ ہمارے اس مشورے پر غور کرلے۔ اور کتب خانہ کا وقت صبح ۹ سے ۱ ر اور شام کو ۶ ر سے ۱۰ ر بجے تک ہوجائے۔ (ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ تبھی ہمارے ایک عزیز نے ہمیں بتایا کہ اب لائبریری عشاء کے بعد بھی کھلتی ہے، بلاشبہ یہ ایک اچھی خبر ہے، ہم درج بالا تحریر کو ختم کیا کرتے، بس یہ جملہ لکھ کر اپنی تصحیح کر رہے ہیں)

شعبہ تنظیم و ترقی

۱۹۳۶ میں یہ شعبہ بھی قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ نے قائم کیا تھا۔

شعبہ مطبخ

یہ شعبہ بھی مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمہ اللہ کا قائم کردہ ہے۔

شعبہ تعمیرات

اس شعبہ کو بھی مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ہی نے قائم کیا تھا۔اس کے تحت دارالحدیث کی باقاعدہ تعمیر ۱۹۱۵ سے شروع ہوئی تھی، جس کی تفصیل ہم پیچھے پیش کر چکے ہیں۔

شعبہ اوقاف

یہ شعبہ بھی مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمہ اللہ ہی نے قائم کیا تھا۔

شعبہ برقیات

اِس شعبہ کی ابتدا قاری طیب صاحب رحمہ اللہ نے کی تھی۔

شعبہ خریداری

اس شعبہ کے تحت صفحہ نمبر ۱۷۳ پہ ایک جملہ لکھا ہے جو خالص جھوٹ پر مبنی ہے۔فاضل مرتب لکھتے ہیں: ''شعبہ خریداری کا نظام انتہائی صاف وشفاف اور منظم ہے'' یہ بات قطعاً جھوٹ ہے۔خریداری صاف شفاف نہیں ہے۔اس کی تفصیل کے لیے ہم دلیل کے طور پر مولانا مرغوب الرحمٰن کے نام لکھے گئے مولانا حسن الہاشمی صاحب کے وہ کھلے خط آئندہ صفحات میں پیش کریں گے، جس سے معلوم ہوگا کہ ایک اینٹ جو بازار میں ۳ سے ۴ روپے کی ہوتی ہے وہ دارالعلوم میں ۱۰روپے سے زیادہ کی آتی ہے۔کیا اسی کو شفافیت کہتے ہیں؟

دفتر ماہنامہ دارالعلوم

اس عنوان پر ہمیں فاضل مرتب سے کوئی گلہ یا شکایت نہیں ہے؛ بلکہ یہاں ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ دارالعلوم جیسے عظیم علمی ادارے سے جس معیار کا علمی مواد سے مزین رسالہ نکلنا چاہئے ویسا نہیں نکلتا۔فاضل مرتب نے کتاب کے صفحہ ۱۱۶ پہ لکھا ہے کہ ''شیخ الہند اکیڈمی کے ذریعہ فاضل طلبہ کی ایک ایسی ٹیم تیار ہوئی ہے جو مضمون نگاری اور صحافت میں نمایاں خدمات انجام دے رہی ہے''۔کیا اس ٹیم کی خدمات ماہنامہ ادرالعلوم کے لیے حاصل نہیں کی جاسکتیں؟ کیا دارالعلوم نے اچھے قلم کار پیدا کرنے بند کردیے ہیں؟ جو ایک ماہنامہ رسالہ تک صحیح طریقے سے نہیں لکھ سکتے۔یہ کیا طریقہ ہوا کہ چند مختلف لوگوں کے مضامین جمع کیے اور ہوگیا ماہنامہ تیار۔مدیر صاحب فقط دو چار صفحہ کا اداریہ لکھنے کے لیے نہیں ہوا کرتے۔جو شخص دو صفحہ کا اداریہ لکھ کر مختلف موضوعات پر چند لوگوں کے مضامین جمع کرکے رسالہ ترتیب دیتا ہو اُسے مرتّب کہا جاتا ہے، مدیر نہیں۔مدیر کا کام تو الف سے یا تک تمام رسالے پر اپنی

پکڑ بنائے رکھنا ہوتا ہے۔ کیا دارالعلوم جیسے ادارے کا ماہنامہ نکالنے والے مدیر صاحب کا مطالعہ اتنا قلیل ہے کہ وہ دارالعلوم کے قدیم رسالے ''القاسم'' و''الرشید'' یا سید ازہر شاہ قیصر کی ادارت میں نکلنے والے رسالے کو نہیں پڑھتے۔ کبھی دارالعلوم کی لائبریری میں جا کر پُرانے رسائل دیکھئے اور محسوس کیجیے کہ رسالے کا مقصد عوام کو وہ معلومات فراہم کرنا ہے جو آسانی سے دستیاب کتابوں سے میسر نہ آسکے۔

اس وقت ماہنامہ دارالعلوم کے مدیر ایک استاذ ہیں جن کے اوپر تدریس کی ذمہ داریاں بھی ہیں اور اسفار کا زور بھی۔ کیا دارالعلوم پورے ملک سے ایک ایسے اچھے قلم کار کا انتخاب نہیں کرسکتا جو سید ازہر شاہ قیصر، عثمان فارقلیط، سعید احمد اکبر آبادی، مولانا مودودی، شورش کاشمیری، مولانا عامر عثمانی، ماہر القادری جیسے مایاناز قلم کاروں کی طرح پوری توجہ اور لگن کے ساتھ ادارت کی ذمہ داری کو نبھا سکے۔

ماہنامہ دارالعلوم اگر کسی فردِ واحد یا چھوٹی موٹی تنظیم کا کوئی معمولی جریدہ ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی؛ لیکن مسئلہ دارالعلوم کے مقام کا ہے، اس کی عظمت کا ہے، اس کے وقار کا ہے۔ پورے ملک میں دس بیس لوگ بھی ایسے نہیں ہیں جو باقاعدہ ماہنامہ دارالعلوم کے آنے کا انتظار کرتے ہوں۔ کسی کو یہ انتظار نہیں رہتا کہ دیکھیں اس ماہ دارالعلوم اپنے رسالے میں اس موضوع پر کیا لکھتا ہے یہ شرف تو دنیا میں ایک ہی اسلامی جریدے کو حاصل ہوا ہے۔ ہمارا بچپن تھا، ہمیں یاد ہے گاؤں کا ہر پڑھا لکھا آدمی ایک ہی رسالے کا انتظار کرتا تھا اور رسالہ آتے ہی لوگ اس طرح جھپٹتے تھے مانو کوئی خزانہ ہاتھ آگیا ہو۔ آدھی صدی سے زیادہ زندگی گزر گئی ہے، ہم نے تو پھر کوئی دوسرا ایسا اسلامی رسالہ نہیں دیکھا جس کا لوگ باقاعدہ انتظار کرتے ہوں۔ وہ رسالہ تھا ''ماہنامہ تجلی''، عظیم قلم کار، عظیم خاندان کے عظیم فرد، مولانا عامر عثمانی ؒ کے قلم کا جادو ہی ایسا تھا کہ لوگ پورے ماہ یہی انتظار کرتے تھے کہ اس مرتبہ تجلی میں کیا آئے گا۔

اللہ جانتا ہے ہم کوئی طنز یا تنقید کے طور پر نہیں کہہ رہے ہیں؛ بلکہ اخلاص کے ساتھ مشورہ دے رہے ہیں کہ خدارا یہ چند بے کیف لکھنے والے نااہل قلم کاروں کے بے سود مضامین جمع کرنے کے بجائے کچھ علمی مواد سے رسالے کو مزین کیجیے۔ کم سے کم ''القاسم والرشید'' سے ہی قدیم تحریریں لے کر شائع کیجیے کہ وہ تحریریں آج بھی لازوال اور مفید تر ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ دارالعلوم سے نکلنے والا ماہنامہ ایسا ہو جو پورے ملک میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ ہر مسلک کے ایوان میں جس کی صدا بازگشت کرے۔ جس کا لوگ باقاعدہ انتظار کریں۔ جسے لوگ ردّی کی ٹوکری میں ڈالنے کے بجائے دلچسپی کے ساتھ پڑھیں اور محفوظ رکھیں۔

ایسا کرنا قطعاً ناممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے تو ایک اچھے اَنسب و اشرف قلم کار کی، جس کا ملنا بے شک ممکن ہے۔ اگر دارالعلوم کی انتظامیہ تنگ نظری و سرد مہری کا مظاہرہ نہ کرے تو!

ہم ماہنامہ دارالعلوم کو بلاوجہ غیر معیاری نہیں کہہ رہے ہیں۔آپ ابھی اکتوبر ۲۰۱۸ء کا شمارہ دیکھ لیجیے، مدیر صاحب کا بے سود اداریہ ہے جسے پڑھ کر اس احساس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ ہندوستان اب ایک ملک نہیں؛ بلکہ ایسا جنگل ہوگیا ہے جہاں جانوروں کی حکومت ہے اور انسانیت سوز قانون کے ذریعہ وحشیانہ معاشرت کی ترویج کی جارہی ہے۔مدیر صاحب کی تحریر میں ناامیدی ہے، مایوسی ہے اور قوم ہنود کا وہ خوف ہے جس نے مسلمانوں ہی نہیں؛ بلکہ ہر اہلِ حق کی زبان کو ڈر اور دہشت کا قفل لگا دیا ہے۔وہ خوف جس کے چلتے کوئی بھی حق بات کہنے کی ہمت نہیں کرتا، وہ خوف جس نے علماء کو بھی مصلحت پسند بنا دیا ہے، وہ خوف جو خوفِ خدا سے زیادہ لوگوں کے دلوں پر حاوی ہے، اسی لیے تو علماء حضرات نے امت کو جہاد کی تبلیغ و تلقین کرنا ہی بند کردی ہے، وہ خوف جس کو قائم کرنے میں ہنود نے اتحاد کے ساتھ سالہاسال محنت کی ہے اور آج ان کی محنت کامیاب ہے۔ ہر صاحبِ بصیرت اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے کہ مسلمانوں کی حالت شیر کے سامنے ممیائے ہوئے بکری کے بچے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

اداریہ کے بعد ایک مضمون کسی مولوی حنیف قاسمی صاحب کا ہے، جو بالکل بے کیف ہے، جس میں نہ تو ادبی جملے ہیں نہ ہی علمی نکات۔کوئی نئی بات بھی اس مضمون کو پڑھ کر معلوم نہیں ہوتی۔آثارِ قیامت پہ بے شمار کتابیں بازار میں موجود ہیں، جو عام طور سے ہر مطالعہ کا شوق رکھنے والے کی نظر سے گزر ہی چکی ہیں۔ بہر حال اس مضمون سے پہلے ایک نعت بھی ہے۔بلغ العلیٰ جیسے عظیم اشعار کے ساتھ اردو کے بے کیف و بے ترتیب شعروں کو نعت کا عنوان دے کر نہ جانے شاعر صاحب کیا بتانا چاہتے ہیں۔یقین کیجیے قارئین! ان اردو اشعار کو پڑھ کر ذہن بھاری ہوگیا اور شاعری کے نام پر کیا گیا یہ مذاق وجدان پہ باقاعدہ گراں گزرتا ہے۔مدیر صاحب کو چاہئے کہ ایسے بے کیف کلام کو شامل اشاعت کرنے سے اچھا تو یہ ہوتا کہ آپ خود نثر ہی میں بلغ العلیٰ کی تشریح لکھ دیتے۔بہر حال مقصد تحریر یہ ہے کہ رسالے کا معیار بڑھائیے اور دارالعلوم کے نام و وقار کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کی اشاعت کیجیے۔

......❖......

تقریباً سو سے زیادہ صفحات پر دارالعلوم کی تعلیم کے نصاب و نظام اور مختلف فرقوں کے خلاف دارالعلوم کی خدمات کا ذکرِ خیر کرنے کے بعد فاضل مرتب نے صفحہ ۳۱۲ پہ مودودیت یا جماعتِ اسلامی کے عنوان سے وہی سب لکھا ہے جو مدنی خاندان کے خوشہ چیں کو لکھنا چاہئے تھا۔

یہاں ہم ایک بات وضاحت کے ساتھ عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم جماعتِ اسلامی کے رکن نہیں ہیں اور نہ ہی مولانا مودودی کے زبردست مداح ہیں؛ بلکہ ہم تو حنفی دیوبندی ہیں۔اور دیوبندی مکتبِ فکر کے مدرسے ہی میں مشکوٰۃ اور جلالین پڑھاتے ہیں۔ ہاں! یہ بات ضرور ہے کہ مولانا مودودی کے خلاف جو جھوٹ اور

الزام تراشیوں کا سلسلہ مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ نے فقط سیاست کے لیے شروع کیا تھا اس کو ہم صحیح نہیں مانتے اور تحقیق کرنے کے بعد یہ پاتے ہیں کہ مولانا مودودی کی تحریروں میں جان بوجھ کر کتر بیونت کی روش اختیار کر کے غلط سلط باتیں بنا کے عوام کو بدگمان کیا گیا ہے۔آپ مانیں یا نہ مانیں؛ لیکن خدا گواہ ہے کہ ہم جماعتِ اسلامی کے نہ رکن ہیں اور نہ ہی مودودی صاحب کے رشتہ دار، ہماری حیثیت فقط ایک حق گو سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

گزشتہ صفحات میں ہم تفصیل کے ساتھ یہ بات بتا چکے ہیں کہ مولانا مودودی سے مخالفت کسی دینی یا اصلاحی جذبے کے سبب نہیں؛ بلکہ خالص سیاسی تھی۔اسی لیے مولانا حسین احمد مدنیؒ سے پہلے اور بعد بھی ان کے یا ان کے عقیدت مندوں کے علاوہ کسی نے بھی مولانا مودودی کی تحریروں پر اعتراض نہیں کیا۔

مسئلہ بس یہی تھا کہ اگر جماعتِ اسلامی ہٹ ہوگئی تو جمعیۃ علماء ہند پٹ جائے گی۔امت پہ ہمارا دبدبہ کم ہو جائے گا۔ہماری سیاست کمزور پڑ جائے گی، اسی لیے جماعتِ اسلامی اور اس کے بانی کی اس درجہ مخالفت کی کہ حد اور بس۔دارالعلوم کی تاریخ مرتب کرنے والے فاضل مرتب کے الفاظ دیکھئے آپ مولانا مودودی کے بارے میں عقل وخرد کی کس نچلی سطح پر پہنچ کے تحریر کرتے ہیں۔لکھتے ہیں کہ:

> ''۱۹۴۱ میں جماعت کی تشکیل سے قبل جب مودودی صاحب کے نظریات سامنے نہیں آئے تھے، عقیدہ اور نصب العین کی کوئی تعیین نہیں تھی، مودودی صاحب سیدھے سادھے چل رہے تھے؛ بلکہ علماء سے مودودی صاحب کا ربط بھی تھا۔جمعیۃ علماء ہند میں اکابر دیوبند کے زیر سایہ انہوں نے کئی اہم کتابیں تصنیف کیں۔''

دیکھ لیجیے قارئین! یہ دارالعلوم جیسی عظیم یونیورسٹی کے مؤرخ کا قلم ہے جو کس بے سلیقے اور غیر مہذب طریقے سے ایک عظیم مفکر و مصنف کی شخصیت کو پامال کر رہا ہے۔اور یہی فاضل مرتب اپنی اسی دارالعلوم کی تاریخ کے صفحہ ۱۶۰ پر دارالعلوم کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے ''چوتھی خصوصیت'' کا عنوان ڈال کر لکھ رہے ہیں کہ:

> ''دارالعلوم دیوبند کی چوتھی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے اپنے مسلکِ اعتدال کی طرف دعوت اور دوسروں پر تنقید کے سلسلے میں پیغمبرانہ اسلوب تبلیغ اختیار کیا۔جس میں مخالف کو زیر کرنے کے بجائے اس کی دینی خیر خواہی کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہو۔دارالعلوم دیوبند نے حق کے معاملے میں مداہنت کو کبھی گوارہ نہ کیا اور جس بات کو حق سمجھا اس کا برملا اظہار کیا؛ لیکن اس اظہار میں حکمت اور نرمی کا پہلو ہمیشہ مدنظر رکھا گیا۔'' (دارالعلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ: صفحہ ۱۶۰)

اپنے آپ کو دارالعلوم کا فاضل لکھنے والے، دارالعلوم جیسی عظیم درسگاہ کی تاریخ مرتب کرنے والے، دیانت کو

روندتے ہوئے اپنا قلم بے لگام چلانے والے فاضل مرتب صاحب نے کیا دارالعلوم کی اسی چوتھی خصوصیت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس درجہ گھٹیا اور بازاری زبان کا استعمال ایک مفسر قرآن کے لیے کیا ہے۔ کیا اسی کو پیغمبرانہ اسلوب کہتے ہیں۔ کیا یہی وہ حکمت اور نرمی کا پہلو ہے جو فاضل مرتب نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔

''۱۹۴۱ سے پہلے پہلے تو مولانا مودودی سیدھے سادھے چل رہے تھے''

اور اس جھوٹ کا کیا کریں جو فاضل مرتب نے یہ جملہ لکھ کر بولا ہے:

''جمعیۃ علماء ہند میں اکابر دیوبند کے زیر سایہ انھوں نے کئی اہم کتابیں تصنیف کیں۔''

جن اہم کتابوں کا فاضل مرتب ذکر کر رہے ہیں وہ ''الجہاد فی الاسلام''، ''سود'' اور ''پردہ'' ہیں کہ اسلام کے ان تین موضوعات پر اُردو زبان میں اور کوئی تصنیف اس پائے کی آج تک بھی لکھی نہ جا سکی۔ کہاں ہیں وہ جمعیۃ علماء ہند کے اکابر دیوبند جنھوں نے آج تک امت کو مولانا مودودی کی کتابوں سے بہتر کوئی ایک کتاب بھی لکھ کر نہیں دی۔ مولانا مودودی نے جمعیۃ علماء ہند کے اکابر کے زیر سایہ کوئی کتاب تصنیف نہیں کی۔ جمعیۃ علماء ہند کے اکابر دیوبند میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، مفتی کفایت اللہؒ و چند اور حضرات شامل تھے۔ جن میں شیخ الہندؒ کا انتقال کافی پہلے ہو چکا اور مولانا حبیب الرحمٰنؒ دارالعلوم کے اہتمام کی ذمہ داریوں میں اتنے مصروف تھے کہ مولانا مودودی کا ان سے کوئی رہنمائی حاصل کرنے کا امکان نظر نہیں آتا۔ اور مفتی کفایت اللہ صاحبؒ مولانا مودودی کے ہم عصر ہیں، ان کے مربی و استاذ نہیں۔ بہرحال ''الجہاد فی الاسلام'' شدھی کے بانی سوامی شردھانند کے قتل ہو جانے کے بعد ۱۹۲۷ء میں لکھی گئی تھی۔

''سود'' اور ''پردہ'' کے علاوہ ایک کتاب ہے، جس پر مولانا مدنیؒ نے اعتراض ظاہر کرتے ہوئے ایک کتاب ''ایمان و عمل'' لکھ ڈالی تھی، وہ ہے مولانا مودودی کی تقریروں کا مجموعہ، خطبات فاضل مرتب نے کہا ہے کہ ''۱۹۴۱ سے پہلے مولانا مودودی سیدھے سادھے چل رہے تھے'' ان میں جو بگاڑ آیا ہے وہ ۱۹۴۱ کے بعد آیا ہے؛ لیکن جس کتاب ''خطبات'' پر ایمان و عمل کے نام سے اعتراض کیے گئے ہیں وہ کتاب بھی ۱۹۴۱ سے پہلے کی شائع شدہ ہے۔ اس میں وہ تقریریں ہیں جو مولانا مودودی نے ۱۹۳۷-۳۸ میں کی تھیں۔ اب ذرا فاضل مرتب بتائیں کہ جب مولانا مودودی ۱۹۴۱ سے پہلے سیدھے سادھے چل رہے تھے تو ۱۹۳۷ کی تقریروں میں بگاڑ کیسے آ گیا۔ اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ اعتراض علمی اور اصلاحی نہیں؛ بلکہ متعصبانہ اور بدگمان ذہنیت کی پیداوار ہیں۔ جو جماعتِ اسلامی کے قیام کے بعد اس کو زیر کرنے اور مولانا مودودی کو بدنام کرنے کے لیے ان کی تحریروں میں ڈھونڈ ڈھونڈھ کر خیانت کے ذریعہ پیدا کیے گئے۔

یہ بات بھی فاضل مرتب نے بالکل جھوٹ لکھی ہے کہ ''دارالعلوم دیوبند نے حق کے معاملے میں مداہنت کو

کبھی گوارہ نہ کیا اور جس بات کو حق سمجھا اس کا برملا اظہار کیا''، یہ بات ۱۹۶۵ء سے پہلے والے دارالعلوم کے اندر تو تھی؛ لیکن اس کے بعد حق کا ساتھ دینا دارالعلوم نے کب کا چھوڑ دیا ہے۔جس کی دلیل یہ ہے کہ رمضان میں نوافل کی جماعت حنفیہ کے نزدیک قطعاً مکروہ ہے اور دارالعلوم بھی اسی کو حق سمجھتا ہے، چاہے فتاویٰ دارالعلوم دیکھ لیں؛ لیکن حق سمجھنا اور حق کا اظہار کرنا دو الگ الگ باتیں ہیں۔فاضل مرتب نے جھوٹ لکھا کہ دارالعلوم برملا حق کا اظہار کرتا ہے، اگر ایسا ہوتا تو دارالعلوم کی مساجد چھتہ مسجد اور مسجد رشید میں تہجد کے وقت نفلوں کی جماعت نہ ہوتی۔کہاں ہے وہ دارالعلوم جو اس عمل کو مکروہ تو سمجھتا ہے؛ لیکن اس حق کا اظہار کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔کیوں دارالعلوم کی طرف سے اپنی ہی مساجد میں ہو رہے مکروہ عمل پہ پابندی عائد نہیں کی جاتی؟ بات وہی ہے دوسروں کی طرف ایک اُنگلی اُٹھانے والے اپنی جانب گھومی ہوئی تین اُنگلیاں نہیں دیکھتے۔فاضل مرتب نے کہا ہے کہ دارالعلوم نے حق کے معاملے میں مداہنت کو کبھی گوارہ نہیں کیا، کوئی بتلائے کہ نوافل کی جماعت کو مکروہ جانتے اور مانتے ہوئے بھی اس عمل کو روکنے کے لیے قدم نہ اُٹھانا مداہنت نہیں تو اور کیا ہے؟

اب مولانا مودودی پر ہم مزید اور کوئی گفتگو نہ کرتے ہوئے یہی مناسب سمجھتے ہیں کہ شیخ زکریا ؒ کی کتاب ''فتنۂ مودودیت'' کی حقیقت آپ کے سامنے پیش کرنے کے بعد ایک ایسی علمی تحریر پیش کریں کہ جسے پڑھنے کے بعد حق پسند اور صدقِ دل کے ساتھ غور کرنے والوں کے لیے مولانا مودودی پر کیے گئے اعتراض کی ساری قلعی کھل جائے۔کتاب کی ضخامت کا خیال کرتے ہوئے تقریباً ۱۰۰ رصفحات کی تفصیل ہم ہرگز پیش نہ کرتے؛ لیکن پھر خیال آیا کہ ۱۹۵۶ء یعنی ۶۲ رسال پُرانی تحریر یاد رکھنے والا شاید ہی کوئی شخص اس دَور میں زندہ ہو۔بلاشبہ دَورِ حاضر میں اس تحریر کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص پہلی بار ہی اس علمی شمع سے نور حاصل کرے گا۔ایسا نُور جس کے اُجالے سے بدگمانی اور گمراہی کے اندھیرے ضرور دُور ہو جائیں گے۔یہ تحریر ''ماہنامہ تجلی'' سے ماخوذ ہے جسے مدبر اسلام مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا مدنی ؒ کی کتاب ''مودودی دستور اور عقائد کی حقیقت'' کے جواب میں تحریر کیا تھا۔تجلی کے تقریباً ۶۰ صفحات پر مشتمل یہ علمی مذاکرہ ایک تاریخی دستاویز ہے جس کے مطالعے سے مولانا مودودی پر کیے گئے اعتراض کی اصلیت کافی حد تک آئینہ ہو جائے گی۔

اس علمی مذاکرے سے پہلے آئیے ذرا مولوی اسعد مدنی صاحب ؒ کی ایک حرکت ملاحظہ فرمائیں۔مولوی اسعد مدنی ؒ ہوں یا مدنی خاندان کے دیگر افراد، اس خاندان میں علمی و تحریری صلاحیتوں کا فقدان ہمیشہ سے ہے۔اسی لیے اس خاندان کی کوئی بھی تصنیفی خدمات کتابی دنیا میں موجود نہیں ہیں۔دھیان رہے ''علمی اور عمدہ تصنیفی خدمات'' مولوی اسعد مدنی صاحب بھی کوئی علمی شخص تو تھے نہیں جو خود مولانا مودودی پر کوئی لائق مطالعہ کتاب تصنیف کر سکتے؛ اس لیے یہ کیا گیا کہ نئے لکھنے والوں کو ان کی تحریر کتابی شکل میں شائع کرنے اور کچھ معاوضے کا لالچ دے کر

بے سود وغیر معیاری کتابیں مولانا مودودی کے خلاف لکھوائی گئیں اور جہاں پیسے کا زور نہ چل سکا تو وہاں زبردستی عقیدت مندانہ ضد کر کے یہ کام کرایا گیا، اس کی مثال اور دلیل کے لیے ہم یہاں ایک واقعہ نقل کرتے ہیں جو شیخ زکریا رحمۃ اللہ علیہ اور ماہر القادری کا ہے۔ جس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ شیخ زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''فتنۂ مودودیت'' مولانا مودودی کی کتابیں پڑھنے کے بعد کیے گئے اعتراض پر مبنی نہیں؛ بلکہ زبردستی سنی سنائی باتوں پر کیے گئے لعن طعن کا مجموعہ ہے۔

اپریل ۱۹۷۹ء میں ادارہ شہادت حق جامع مسجد دہلی سے شائع شدہ ڈاکٹر سید انور علی کی کتاب ''ردِ فتنۂ مودودیت'' صفحہ نمبر ۱۹۰ پر ماہر القادری صاحب کی تحریر پیش کی گئی ہے۔ ماہر القادری صاحب فرماتے ہیں:

> ''صبح کے ساڑھے آٹھ یا نو بجے ہوں گے، حضرت شیخ الحدیث سے لوگوں کا ملنا جلنا بند تھا، ان کی قیام گاہ کے سامنے موٹر کھڑی تھی، وہ کسی معتقد کے یہاں ناشتے کے لیے جا رہے تھے۔ میرے اطلاع کرانے پر مجھے اندر بلا لیا۔ میں نے ان کی کتاب ''فتنۂ مودودیت'' کا ذکر چھیڑا، تو فرمایا: ''اسعد مدنی میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔''
>
> حضرت شیخ الحدیث سے میں بحث و مناظرہ کیا کرتا۔ اگر وہ نہ چاہتے تو ان کی لکھی ہوئی کتاب ہرگز نہ چھپتی''۔

بتائیے اب کیا کہا جائے، شیخ زکریا جیسا جلیل القدر عالم دین تک جب مولوی اسعد مدنی صاحبؒ کے دامِ فریب میں آ کر ایک مسلمان پر تہمت و الزام تراشی کے گناہ میں ملوث ہو سکتا ہے تو اور کسی کی کیا مجال؛ لیکن کیا شیخ زکریاؒ جیسے بزرگ و عظیم المرتبت عالم کو اس طرح کسی کے پیچھے پڑ جانے سے ایسی کتاب لکھنی چاہئے تھی؟ اسی لیے تو فتنۂ مودودیت میں بھی تفہیم القرآن سے آیات کے درمیان میں سے ٹکڑے اُٹھا اُٹھا کر لاتقرب الصلوٰۃ والی روش اختیار کر کے زبردستی اعتراض کیے گئے ہیں۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

آئیے اب اُس علمی ماحول میں چلتے ہیں جہاں آپ کو حقائق کے سورج سے بصیرت افروز معلومات کی کرنیں اُجالا بکھیرتی ہوئی نظر آئیں گی۔ جن سے جہل و تعصب اور بدگمانی کے اندھیرے دُور ہو جائیں گے۔ پوری تحریر میں آپ مولانا عامر عثمانی کے قلم میں استاذ کا احترام اور بڑوں کا ادب کے ساتھ نہایت نرم گفتاری، مہذب لہجہ کے ہمراہ زبان کی شائستگی کو بھی بہ خوبی محسوس کریں گے۔

....

مودودی عقائد اور دستور کی حیثیت

جماعتِ اسلامی اور علمائے دیوبند کے نام نہاد اختلاء و نزاع کے باب میں آج تک تجلّی میں وقتاً فوقتاً جو کچھ لکھا جاتا رہا ہے ہر چند کہ اس سے بظاہر ایک فریق کی طرف داری اور تائید مترشح ہوتی ہے؛ لیکن اگر آپ خالی الذہن ہو کر غور وفکر فرمائیں تو واضح ہوگا کہ یہ طرف داری اور تائید اس لیے نہیں ہے کہ ہم ایک فریق کا ساتھ دے کر فریق ثانی کو پسپا اور مغلوب کرنے کے خواہش مند ہیں یا ایک فریق کو بحث ونظر کے ہر گوشہ میں سو فیصدی برحق مان کر فریق ثانی کو سرتا پا ناحق اور غلط کار تصور کرتے ہیں؛ بلکہ اس لیے ہے کہ اصل مختلف فیہ مسائل سے قطع نظر اختلاف وتعریض اور ایراد وتردید کا جو طریقہ فریق ثانی نے اختیار کر رکھا ہے وہ اخلاقی تقاضوں، تمدّنی مصلحتوں، تعمیری ضرورتوں اور اصلاحی داعیوں کے خلاف ہے اور اس میں جذبۂ اصلاح اور خواہش اتحاد کی جگہ جارحیت اور تغلّب پسندی جھلکتی ہے۔ ہندو پاک دونوں ہی میں ضرورت اس کی تھی کہ اسلام کے تمام نام لیوا سر جوڑ کر باطل اقدار ونظریات کے خلاف جنگ کرتے۔ اپنے فروعی اختلاف کو اپنی جگہ زندہ و باقی رکھتے ہوئے بھی ایک ٹیم کی طرح برائیوں اور قباحتوں کے خلاف صف آرا ہوتے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ہٹلر کی فوجوں کے مقابلہ میں روس اور امریکہ کے سپاہی دوش بدوش لڑے۔ حالانکہ ان کے عقائد ونظریات عام حالات میں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ کُلّی اور اُصولی طور پر یہ ایک دوسرے کی نقیض اور عکس تھے۔ سیاہی وسفیدی جیسا بیّن فرق ان کے عقائد وخیالات میں تھا؛ لیکن وقت کی ضرورت و مصلحت کے اقتضاء اور حالات کے داعیے کو سمجھ کر انھوں نے سارے اختلافات اپنے اپنے دلوں میں سمیٹے رکھے۔ اور متحد و مشترک ہو کر ہٹلر کی فوجوں سے لڑ گئے۔

ایسا اتحاد و اشتراک اگر دو سخت دشمنوں کے درمیان ہوسکتا ہے تو کیا اُن دو فریقوں کے درمیان نہیں ہوسکتا، جو ایک ہی خدا، ایک ہی رسولؐ، ایک ہی تصورِ حیات کے ماننے والے ہیں، جن کا دین ایک ہے، جن کا قبلہ ایک ہے، جن کی حاجتیں اور ضرورتیں یکساں ہیں، جن کی ذلت وعزت کے بندھن ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں، جن کے اتحاد سے دینی اور دنیوی دونوں منفعتیں ہیں۔

لیکن دیکھا یہ جارہا ہے کہ کسی کلمۂ جامعہ اور سرحدِ اتصال کی تلاش وتمنا کی جگہ ایک فریق کی طرف سے اعتراض و ایراد اور تکفیر وتذلیل کے ایسے غیر ثقہ حربے استعمال کیے جارہے ہیں، جو مفاہمت اور اتحاد و اشتراک کو جارحانہ چیلنج کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں اگر دوسرے فریق کی طرف سے بھی ایسا ہی کوئی غیر ثقہ حربہ استعمال کیا گیا

تو اگر چہ ہم اسے حق بجانب نہیں کہہ سکتے؛ لیکن یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ مدافعت کرنے والے کی مسئولیت اور ذمہ داری حملہ کرنے والے سے ہمیشہ کم ہی ہوتی ہے۔

یہ نفسیاتی حقیقت ہے کہ اگر ہم کسی شخص سے نفرت کرتے ہوئے اسے اپنا دشمن سمجھ لیں تو اس کی ہر ادا اور ہر بات میں ہمیں بُرائی ہی بُرائی نظر آتی ہے۔ حتیٰ کہ جن اداؤں میں فی نفسہٖ بُرائی کا کوئی شائبہ بھی نہیں، اس کی وہ ادائیں بھی سرتاپا قبیح اور شرارت آمیز معلوم دیں گی۔ وہ جماہی لے گا اور ہم سمجھیں گے، مُنہ چڑا رہا ہے۔ وہ کھنکارے گا ہم سمجھیں گے ہم پر طنز کس رہا ہے۔

اس کے برعکس جس سے ہم محبت کرنے لگیں، اس کے عیب بھی ہنر نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ اگر ذرا لنگڑا کے چلتا ہے تو ہم خرامِ ناز سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ حماقت کرتا ہے تو ہم معصومیت کہتے ہیں۔ اس کے برخلاف کوئی زبان کھولتا ہے تو اسے ہم دشمن اور الزام تراش اور شریر ٹھہراتے ہیں، حالانکہ بسااوقات زبان کھولنے والا سچی بات کہتا ہوتا ہے۔

ایسا ہی ہم زیرِ بحث قضیہ میں دیکھ رہے ہیں۔ علمائے دیوبند کا طرزِ مخالفت بلا ریب وشک یہ واضح کر رہا ہے کہ اصلاح پسند، صاحبِ علم وفضل، حق نواز اور عادل و عاقل ہونے کے باوجود ان حضرات کے خلوص پر نفرت و عداوت غالب آگئی ہے۔ یہ جماعتِ اسلامی کے حق میں ہدایت و اصلاح کا وہ طرز اختیار نہیں کر رہے جو ہادیٔ برحق حضور ﷺ نے کفار ومشرکین کے حق میں اختیار فرمایا تھا؛ بلکہ وہ طرز اختیار کر رہے ہیں جو ایک نفرت کرنے والا معاند ومخاصم اختیار کرتا ہے۔

اس کی وجوہات کیا ہیں۔ کیا واقعی جماعتِ اسلامی اس لائق ہے کہ اس کا زن بچہ کولھو میں پیل دیا جائے۔ کیا اس کے نظریات وعقائد میں حقیقتہً ایسی بنیادی خرابیاں پائی جاتی ہیں کہ صُلح ومفاہمت کے عوض اس پر بمباری ہی لازم وضروری ٹھہرے؟

ان سوالات پر یہاں ہمیں بحث نہیں کرنی۔ ہمیں صرف یہ کہنا ہے کہ نفرت وعناد اور مخاصمت کے اگر واقعتہً کچھ اسباب موجود ہیں تو ان میں سب سے قوی سبب وہ مبالغہ پسند اور جذبات زدہ محبت وعقیدت ہے جو ہم مسلمانوں کی اکثریت کو صوفیاء واولیاء سے ہے اور جس کی نفسیات اجمالاً ہم ابھی بیان کر آئے ہیں۔

قصہ یہاں سے شروع ہوا کہ مولانا مودودی نے اپنے مخصوص طریقۂ اصلاح ودعوت کے تحت بعض اولیاء و اتقیاء پر کچھ اس طرح کی تنقیدیں کیں جو اگر چہ سنجیدہ علمی انداز کی تھیں؛ لیکن جن کا انداز مانوس طرزِ ادب اور مروّجہ طریق احترام سے ہٹا ہوا تھا۔ ان سے علماء کے جذبات وخیالات کو ٹھیس لگی اور محبت ونفرت کی نفسیات نے اپنا کام شروع کر دیا۔ محبت نے تو یہ اثر دکھلایا کہ تمام محبوب اسلاف کے اقوال و اعمال کا ہر ہر گوشہ ناقابل بحث سوفی

صدی برحق، تنقید سے بالاتر کامل واکمل نظر آنے لگا۔ اور نفرت نے یہ اثر دکھلایا کہ مولانا مودودی ایک مخلص نقاد کے عوض جس سے غلطی بھی ہوسکتی ہے، فتنہ پرداز مخالف، دشمن اولیاء، معاند اور گستاخ و بے ادب نظر آنے لگے، جس کی ہر بات قابل نفرت، جس کی جماہی بھی مُنہ چڑانا جس کا استدلال بوگس اور جس کی ہر ادا لائق نفرتیں ٹھیری۔ یہ دعویٰ ہمیں نہیں کہ مولانا مودودی نے تصوّف یا صوفیاء پر جو کلام کیا ہے وہ حرف گیری سے بالاتر ہے۔ یا جس طرز کو انھوں نے اختیار کیا ہے وہ علماء کے قیاس کردہ اثرات و نتائج سے بالکل خالی ہے۔ نہ ہم اس کے مدعی ہیں کہ مولانا مودودی کے اجتہادات و قیاسات بے خطا اور اٹل ہیں۔ اور یہ بات بھی نہیں کہ جماعتِ اسلامی کے بعض اور ذمہ داروں نے صوفیا کے اشغال و وظائف اور مرشدین کے طُرُق ارشاد و بیعت پر جو تنقیدیں کی ہیں وہ بہر پہلو حق بجانب ہیں اور ان کا طرزِ بیان قطعاً لائق اعتراض نہیں ہے؛ لیکن یہاں صورت یہ ہے کہ نفرت و محبت کے دوگونہ تأثرات میں ہمارے علماء کرام اور اُن کے ہمنواؤں نے بہت سی ایسی چیزیں بھی جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کی طرف منسوب کرنی شروع کر دیں جو بے بنیاد تھیں۔ افترا تھیں، الزامِ محض تھیں، ان کے اثبات کے لیے عبارتوں کے تراشے لائے گئے اور ریت پر عمارتیں اُٹھائی گئیں۔ تحقیر و تذلیل کی گئی اور فتوے نکالے گئے۔ کیچڑ اُچھالی گئی اور فقرے کسے گئے۔

اخلاص کا جنازہ نکالنے والی نفرت و عداوت کی نشان دہی کے لیے تقریر و تحریر کی دسیوں شہادتیں عوام کے سامنے آچکی ہیں۔ لیکن صرف نشان دہی نہیں؛ بلکہ اس نفرت و عداوت کا ڈھنڈورا بھی اُس فتوے نے پیٹ دیا جس میں قاسم العلوم غزالیِ وقت حضرت العلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو خود مفتیانِ دارالعلوم دیوبند نے نہ صرف اہلِ سنت والجماعت سے خارج کر دیا؛ بلکہ نعوذ باللہ من ذالک کافر ٹھیرا دیا!

کیوں؟ صرف اس لیے کہ مولانا قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت کو وہ جماعتِ اسلامی کے کسی فرد کی عبارت سمجھے اور جماعتِ اسلامی کے کسی فرد پر کیچڑ اُچھالنے اور بمباری کرنے میں انھیں جو لُطف حاصل ہوتا ہے اسے ایک نفرت کرنے والا قلب ہی محسوس کرسکتا ہے۔ حقیقت میں اگر مفتیانِ کرام کے دل و دماغ پر عناد و نفرت کا پورا تسلّط نہ ہوتا تو پہلی ہی نظر میں وہ سمجھ لیتے کہ یہ عبارت، جس پر کفر کا فتویٰ لگا رہے ہیں، جماعتِ اسلامی کے کسی فرد کی ہو ہی نہیں سکتی؛ کیونکہ اس کا اندازِ بیان اور اسلوب بداہتہً اب سے کافی پہلے زمانے کے طرزِ نگارش کا حامل ہے؛ لیکن جس طرح غصہ، نفرت، جوشِ انتقام اور حرص و ہوس میں سے کوئی سا بھی جذبہ جب اپنی شدت وسعت کے ساتھ کسی انسان پر طاری ہوتا ہے تو عقل و ہوش اور احساس و رجحان اور بصیرت و بصارت سب مغلوب و ماؤف ہوجاتے ہیں۔ اور اُس سے وہ حرکات سرزد ہوجاتی ہیں جن کا ارتکاب وہ عام حالت میں ہرگز نہ کرتا۔ اسی طرح مفتیانِ کرام کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی بغض و عناد کی کُہر نے ان کی ساری علمیت اور بصیرت و دانائی کو مغلوب کر کے یہ

وسوسہ ڈالا کہ ہو نہ ہو یہ جماعتِ اسلامی کے کسی فرد کی خامہ فرسائی ہے۔ جب یہ وسوسہ پیدا ہو گیا تو کارگہِ عناد میں فتویٰ کفر کے ڈھلنے میں کیا دیر لگتی تھی۔

تفصیل اس اجمال کی سہ روزہ ''دعوت'' دہلی کی ۱۷؍جنوری ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں ملاحظہ فرمائیے۔ کسی نے حضرت مولانا قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی چند سطریں ان کی کتاب ''تصفیۃ العقائد'' سے نقل کر کے دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کو بھیجیں اور پوچھا کہ ان سطروں کے لکھنے والے کے بارے میں آنجناب کا شرعی فیصلہ کیا ہے؟

خدا جانے کونسی منحوس گھڑی تھی کہ اُن عقیل وفہیم مفتیوں کے دماغ میں جن کے ہزاروں فتوے ملک کے کونے کونے کو علمِ دین کی روشنی پہنچاتے رہے ہیں۔ اور جن کے علم وفضل کی قسمیں تک کھائی گئی ہیں۔ یہ بات آگئی کہ ہو نہ ہو یہ عبارت مودودی کی یا اس کے کسی چیلے کی ہے۔ بس پھر کیا تھا، آؤ دیکھا نہ تاؤ، مندرجہ ذیل فتویٰ صادر فرمایا:

فتویٰ نمبر ۱۴۱۔ الجواب:

''انبیاء علیہ السلام معاصی سے معصوم ہیں۔ ان کو مرتکبِ معاصی سمجھنا (العیاذ باللہ) اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ نہیں۔ اس کی وہ تحریر خطرناک بھی ہے اور عام مسلمانوں کو ایسی تحریرات کا پڑھنا جائز بھی نہیں۔''

فقط واللہ اعلم۔ سید احمد علی سعید۔ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

جواب صحیح ہے۔ ایسے عقیدے والا کافر ہے۔ جب تک وہ تجدیدِ ایمان اور تجدیدِ نکاح نہ کرے اس سے قطع تعلق کریں۔ مسعود احمد عفا اللہ عنہ (مہر دارالافتاء۔ فی دیوبند۔ الہند)

سنا گیا ہے کہ فخرالاماثل محترم ومعظم جناب مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اس فتوے سے متعلق کوئی بہت طویل توضیحی مضمون لکھ کر اشاعت کے لیے اخبارات کو بھیجا ہے۔ یہ ابھی تک ہماری نظروں سے نہیں گزرا۔ بے شک مذکورہ فتوے سے حضرت العلامہ مولانا قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے دامنِ صافی پر جو سیاہی حد درجہ افسوس ناک طور پر ڈالی گئی ہے اس کو دھونا نہ صرف حضرت موصوف کا فرض ہے؛ بلکہ ہر اُس شخص کا فرض ہے جو حضرت مولانا قاسمؒ کی فضیلت وعظمت سے باخبر ہو۔ اور جو بدنامی اس فتوے سے دارالعلوم جیسے معزز ادارے کی ہوئی ہے اس کی مناسب تلافی کرنے کے لیے حضرت مہتمم صاحب سے زیادہ موزوں اور بہتر کون ہوسکتا ہے؟

تاہم یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ حضرت مہتمم صاحب قبلہ صرف یہی تو کرسکتے ہیں کہ فتویِ مذکور کی غلطی اور حضرت مولانا قاسمؒ کی عبارت کی صحت وصداقت کو بیش از بیش دلائل سے واضح فرمادیں؛ لیکن یہ چیز فی الحقیقت مناسب تلافی نہیں کرے گی؛ کیونکہ حضرت مولانا قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خاکم بدہن کافر وگمراہ ہونا تو کجا معمولی غلط نویس

ہونا بھی نہ تو اُس شخص کے نزدیک درست ہے جس نے اپنے مضمون میں مذکورہ فتوے کو نقل کیا ہے نہ ہم ایک منٹ کو بھی یہ تصور کر سکتے ہیں کہ حضرت مولانا قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے ایسی بات نکل سکتی ہے جو قرآن وسنت کے سراسر خلاف ہو۔ مضمون نگار کا اور ہمارا بالیقین یہ خیال اور فیصلہ ہے کہ غلطی فتویٰ دینے والوں کی ہے۔ اور غلطی کے پیچھے بے علمی نہیں عصبیت کارفرما ہے۔ تب مولانا قاسم صاحبؒ کی عبارت کی توثیق وتصویب تحصیل حاصل سے زیادہ کچھ نہیں؛ بلکہ اس سے یہ حقیقت اور بھی زیادہ ثابت وصادق ہو جائے گی کہ زاویہ نظر اور نیت اگر صالح نہ ہو تو صحیح سے صحیح تر چیز بھی غلط سے غلط تر نظر آسکتی ہے۔ نیز یہی مفتی ہیں جن کے قلم سے مودودی اور جماعتِ اسلامی کے بارے میں مخالفانہ فتووں کا صدور ہوتا رہا ہے۔ لہٰذا جتنی جتنی مولانا قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت کی تصویب و تصدیق کی جائے گی اتنی ہی اتنی یہ بات مسلم اور محقق ہوتی چلی جائے گی کہ عبارات کے تراشوں پر دیے ہوئے سابقہ فتوے غلط در غلط تھے۔ جو شخص یا اشخاص سورج کو سیاہی کا گولہ سمجھ کر ایک دم اس کے تاریک تر ہونے کا فتویٰ داغ دیں وہ سورج سے کم روشن چیز کے بارے میں کیونکر عادل وثقہ سمجھے جاسکتے ہیں۔

ہم سمجھتے تھے کہ فتویٰ نویسی کے کم وبیش ایسے ہی ایک گزشتہ واقعہ کے بعد یہ تازہ ہولناک حادثہ ہمارے بزرگوں کو شاید اِس غیبی اشارہ کی طرف مائل کر دے کہ خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں۔ وہ مخالفت وجدل کا سابقہ طرز چھوڑ کر مفاہمت اور اتحاد ومحبت کی طرف مائل ہوں۔ اور ہمدرد وغمخوار بن کر جماعتِ اسلامی کے افراد کو نرمی، دلسوزی، غمخواری اور حسنِ کلام کے ساتھ سمجھائیں کہ بھائی تم نے جو فلاں فلاں کتاب میں فلاں فلاں بات لکھی ہے اس میں یہ نقائص ہیں، یہ شرعی قباحتیں ہیں۔ تم نے فلاں جگہ جو طرزِ انشا اختیار کیا ہے اس سے یہ بُرے اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ تم دین کی خدمت کے جذبے میں حدودِ شریعت سے نہ بڑھو۔

اس فہمائش کے دو ہی جواب ہو سکتے تھے۔ یا تو جماعتِ اسلامی والے اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے تائب ہو جاتے یا اپنے برحق ہونے کی دلیلیں پیش کرتے۔ پہلی صورت میں اتحاد واتفاق اظہر من الشمس تھا۔ اور دوسری صورت میں کسی نہ کسی مرحلے پر اتفاق ومفاہمت کی راہ ضرور پیدا ہو جاتی؛ کیونکہ مشترکہ اجتماعی مقاصد کے لیے مشترکہ جدوجہد کرنے کی خاطر یہ کبھی ضروری نہیں ہوتا کہ جدوجہد کرنے والے تمام افراد ہر موضوع پر یکساں اور مرادف خیالات رکھتے ہوں۔ جزئیات وفروعات میں اپنا اپنا جداگانہ خیال وقیاس قائم رکھتے ہوئے بھی مختلف افراد مشترک مقاصد پر جمع ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ پس کتنا مبارک ہوتا یہ امر کہ فتوے کے حادثۂ فاجعہ کو تنبیہ غیبی سمجھتے ہوئے مصالحت ومؤانست کی راہ نکالی جاتی۔ اور حیران وپریشان بھارتی اُمتِ مسلمہ کے لیے اُفق دیوبند سے ایک نئے سویرے کی پَو پھوٹتی۔

لیکن ہوا یہ ہے کہ تازہ بتازہ ایک اور کتاب مارکیٹ میں چلی آرہی ہے۔ جس کا نام ہے: ''مودودی دستور اور

عقائد کی حیثیت'' اس کے مصنف شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدظلہ العالی ہیں۔ اور مقدمہ حضرتِ ممدوح جناب مہتمم صاحب دارالعلوم کا ہے، ظاہر ہے کہ ایسی دو عظیم المرتبت اور افضل و ارفع ہستیوں کی نگارشات سے جو کتاب مزیّن ہوا سے عامۃ المسلمین کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہونا چاہیئے اور اہلِ علم کو خوشی سے جھوم جانا چاہیئے کہ دَورِ حاضر کے بہترین اربابِ علم و فضل نے باوجود اپنی بے شمار مصروفیات کے عوام کو نوازنے اور راہ دکھانے کا مقدّس کام فراموش نہیں کیا ہے۔ لیکن افسوس کہ کتاب کا نام اور موضوع دیکھتے ہی خوابوں کے محل گر پڑتے ہیں۔ اور دل پکار اُٹھتا ہے کہ یا اللہ! کیا اتحاد بین المسلمین کی اب کوئی صورت باقی نہیں۔ کیا بے شمار چر کے کھانے اور بے انداز پستیوں میں گر جانے کے بعد بھی اُمّتِ مسلمہ کے نصیب میں اپنے رہنماؤں کا پیار اپنے بزرگوں کی شفقت اپنے بکھرے ہوئے دانوں کی شیرازہ بندی اور اپنی دم توڑتی ہوئی توانائیوں کی حیاتِ ثانیہ نہیں کیا لیگ و کانگریس کی انقلاب انگیز جنگ کے بعد اب ایک نئی دینی جنگ مسلسل و پیہم دیکھنی ہوگی۔

ہماری حیثیت اور حقیقت ہی کیا کہ ہم دونوں مذکورہ بزرگوں کی نگارشات کے بارے میں کچھ کہہ سکیں۔ لفظی شیشہ گری نہیں؛ بلکہ ایمان اور خدا کی گواہی کے ساتھ ہم کہتے ہیں کہ علم و عمل دونوں میں ہم اِن ہر دو معزز و محترم حضرات کے مقابلہ میں ایسے ہیں جیسے سورج کے مقابلہ میں تیل کا چراغ۔ ان کے جوتوں کی خاک بھی ہم سے معزز و محترم ہے اور اِن کے مراتبِ اعلیٰ کا ہمیں ویسا ہی یقین ہے جیسا اپنے راندۂ درگاہ ہونے کا۔

لیکن اس اعتراف و احساس کے باوجود ہمیں جو سبق ان بزرگوں سے ملا ہے وہ یہ ہے کہ تقلید اندھے بن جانے کا نام نہیں؛ بلکہ ہم امام اعظم کے جو مقلّد ہیں وہ محض عقل کی اس دلیل کے بَل پر ہیں کہ امام اعظم نے قرآن و سنّت کو نسبتاً عمدہ اور ارفع طور پر سمجھا اور پیش کیا ہے۔ خود امام اعظم مجرد ابوحنیفہ ہونے کی وجہ سے نہیں؛ بلکہ شارحِ قرآن و سنّت اور فقیہِ اسلام ہونے کے باعث معزز و محترم ہیں۔ اس کے آگے ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ عصمت، یعنی گناہ و خطا کے امکان سے بالاتر ہونا تنہا انبیاء و رسل کا حصہ ہے۔ غیر نبی ہرگز ہرگز اس نعمتِ آسمانیہ کا مستحق نہیں ہوسکتا۔ پھر ہمیں ایسی حدیثیں بھی سنائی گئیں جن کا مطلب یہ تھا کہ دین کا معیار و اقتضاء ایک گنوار اور ایک مہذّب عالم کے لیے یکساں نہیں؛ بلکہ ہر شخص اپنے علم و عقل کی حد تک ذمہ دار اور مسئول ہے۔ چنانچہ فقہ کے وہ مسائل بھی ہمیں سمجھائے گئے جن میں محروم العقل دیوانوں کو غیر مکلف اور غیر مسئول ٹھیرایا گیا تھا۔ اور وہ اقوالِ مبارکہ بھی بتائے گئے جن سے پتہ چلتا تھا کہ ایک عالم کی ذرا سی معصیت ایک عامی جاہل کی بڑی سے بڑی خطا سے بھی کئی گنا قبیح و رکیک ہوتی ہے۔

ان سب کا حاصل ہمیں یہ ملا کہ دین میں علم و عقل کی حیثیت حد درجہ اہم ہے۔ اور اندھی تقلید کسی حال میں درست نہیں؛ چنانچہ اسی بنیادی تصور کی روشنی میں ہم ادب و احترام کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مذکورہ

کتاب کے بارے میں کچھ عرض کریں گے۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ آج کی دنیا میں نفاق وتدلیس کی کثرت کے باعث کسی کے خلوص اور نیک نیتی کا اعتماد سخت دشوار ہوگیا ہے۔ اور یہ عام بات ہے کہ اگر کوئی شخص کسی برگزیدہ انسان کے قول وفعل پر زبان کھولے تو خواہ وہ کتنی ہی احتیاط کرے کیسا ہی ادب ملحوظ رکھے؛ لیکن ہستی برگزیدہ کے معتقدین بیک زبان اسے گستاخ، دریدہ دہن اور نہ جانے کیا کیا بناڈالتے ہیں اور بلاتکلف کہہ دیا جاتا ہے کہ کمبخت نے گالیاں دی ہیں۔ یہ کرشمہ ہے عقیدتِ غالیہ اور ارادتِ مفرطہ کا۔ یہ کرشمہ ہے اُس خیالِ ناقص کا کہ مذکورہ ہستی برگزیدہ تمام انسانی لغزشوں سے پاک وصاف یکسر محفوظ عن الخطاء ہے۔ اور اگر خدانخواستہ کوئی ذراسی غلطی، لغزش یا چوک اسکی ثابت ہوگئی تو تقدس کا سارا محل گرجائے گا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سہو وخطا بشریت کا خاصہ ہے۔ اور کسی کے معزز ومحترم ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ سہو وخطا سے بالاتر قطعاً فرشتہ یا نبی ہے۔ سہو وخطا اِس حد تک بشریت کا خاصہ ہے کہ انبیاء تک کی عصمت ان کی بشریت سے نہیں ان کی نبوت ورسالت سے منسوب کی جاتی ہے اور پیش نظر کتاب ہی میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی مدظلہٗ العالی نے اسے واضح فرمادیا ہے۔

اب بھی اگر ہماری معروضات کو گالیوں اور دریدہ دہنیوں پر محمول کیا گیا تو اس کی ذمہ داری محمول کرنے والوں پر ہوگی ہم اپنی جگہ بالکل مطمئن ہیں کہ تعصب اور جانبداری سے قطعاً بے تعلق ہوکر اپنے ناقص علم وفہم کے مطابق قلم اُٹھانے لگے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ ہم کوتاہی علم وفہم کے باعث کچھ غلط باتیں عرض کرجائیں اس صورت میں ناظرین کو ہمیں نالائق اور بے شعور کہنے کا پورا پورا حق ہے اور یہ بھی ان پر فرض ہے کہ ہمیں ہماری غلطی اور خطا سے مطلع فرمادیں تاکہ توبہ کا موقع میسر آسکے۔

اس کتاب میں ثابت کیا گیا ہے کہ مولانا مودودی صاحب سے اہلِ سنّت والجماعت کے اختلافات فروعی نہیں؛ بلکہ اُصولی ہیں۔ اور اس لیے ان سے صلح وصفائی ممکن نہیں۔ حضرت محترم مصنف مدظلہٗ نے مولانا مودودی کی طرف جن عقائد اور خیالات کا انتساب فرمایا ہے وہ اگر واقعۃً مولانا مودودی کے ہوں اور کسی بھی درجہ میں عقلاً یا نقلاً اور قیاساً یا التزاماً مودودی صاحب کا ان کو ماننا ثابت ہوجائے تو کوئی شک نہیں کہ مودودی صاحب اور جماعتِ اسلامی کے مردود ومبغوض ہونے کا فیصلہ سوفی صدی صحیح اور ان کے خلاف ہر فتویٰ درست ومناسب؛ لیکن اگر فی الواقع وہ عقائد وخیالات مودودی صاحب اور جماعتِ اسلامی کے نہ ہوں؛ بلکہ اہلِ فن کی فنکاری نے اور مختلف خارجی عوامل نے ممدوح محترم کی محبتِ دینی اور شیدائیتِ ایمان کو اس حد تک مودودی سے بدگمان کردیا ہوکہ وہ پورے خلوص ودیانت اور نیک نیتی کے ساتھ غلط ترین اور بدترین عقائد کو مودودی کے عقائد سمجھ رہے ہوں تب بات بالکل بدل جاتی ہے۔

لیکن مصنف ممدوح کے ارشاداتِ عالیہ پر اپنی فدویانہ معروضات پیش کرنے سے پہلے ہم حضرت قبلہ مہتمم

صاحب مدظلہ کے مقدمہ پر کچھ عرض کریں گے۔اس کتاب کا موضوع خاص دستور جماعتِ اسلامی کی وہ مشہور دفعہ ہے جس پر بار ہا کلام کیا جا چکا ہے یعنی

"رسولِ خدا کے سوا کسی کو معیارِ حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو۔"

حضرت مہتمم صاحب قبلہ نے حضرت مصنف کی تحریر کو زیادہ واضح اور مصرح کرنے کے لیے مقدمہ میں اس دفعہ میں وارد شدہ الفاظ کی مستقل تشریحات فرمائی ہیں ان تشریحات پر کلام کرنے سے پہلے مناسب ہوگا اگر حضرت مہتمم صاحب کا وہ خط بھی ایک نظر دیکھ لیں جو حضرت نے چند سال پہلے ایک سائل کے جواب میں لکھا تھا۔سائل کا خط اور حضرت کا جواب دونوں سہ روزہ دعوت دہلی مورخہ فروری ۵۶ء میں شائع ہوئے ہیں اور تادمِ تحریر حضرت مہتمم صاحب کی طرف سے اس خط کی تردید کہیں شائع نہیں ہوئی۔

(۲۵/مارچ ۵۶ء کے "دعوت" میں حضرت مہتمم صاحب نے اس خط کو اپنا ہی تسلیم فرمایا ہے جبکہ "الجمعیۃ" کے ایک بیان میں انھوں نے اسے اپنے مسلک کے مُنافی اور برعکس قرار دیا ہے)

سائل کا خط یہ ہے:

"آج کل اس دیار میں یہ چیز وجہِ اختلاف بنی ہوئی ہے کہ معیارِ حق کسے مانا جائے؟ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اللہ، اس کا رسول اور صحابہ کرام اولیاءِ عظام ائمہ مجتہدین یہ سب معیارِ حق ہیں، ان ہی کے ذریعہ سے ہم حق کو جان سکتے ہیں اور صحیح دین پر عمل کی توفیق میسر ہو سکتی ہے؛ کیونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مقامات پر اس کی تشریح فرما دی ہے۔

مثلاً : أَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ بِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُم.

اس کے علاوہ قرآن پاک کی آیات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام بھی معیارِ حق تھے۔ مثلاً : رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ. اس لیے لازماً صحابہ کرام کو ہمیں معیارِ حق ماننا پڑے گا۔ کچھ نئے قسم کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ نہیں معیارِ حق تو اللہ اور اس کے رسول ہی ہو سکتے ہیں؛ کیونکہ اگر صحابہ کرام کو بھی معیارِ حق تسلیم کر لیا جائے تو پھر ہر صحابی کا قول و عمل معیار بن جائے گا۔ اور پھر اختلافات کی خلیج اتنی وسیع ہو جائے گی جس کا پُر کرنا کسی طرح ممکن نہ ہوگا۔

مثلاً صحیح مسلم کی روایت کی بنا پر حضرت معاویہ کا اپنے فرزند یزید کو اپنا خلیفہ بنانا اور اس سے صحابہ کا اختلاف کرنا اور اجل صحابہ کا اس معاملہ میں حضرت حسینؓ سے تعاون کرنا اور ایک بڑے خاندان کا شہید ہونا یہ سب چیزیں خلاف ٹھیریں گی؛ کیونکہ حضرت معاویہؓ معیارِ حق تھے۔ ان کا یزید کو خلیفہ بنانا خود حق تھا۔ ان سب نے حق کے خلاف آواز بلند کی یا خود حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کا معاملہ کہ دونوں حضرات معیارِ حق تھے۔ اور دونوں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے۔ حتیٰ کہ بر بنائے روایت طبقات چوراسی ہزار (۸۴۰۰۰) مسلمانوں کا قتل ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں قرآنِ پاک کی صاف آیت موجود ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ الآية.

اِن آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ معیارِ حق اللہ اور اس کا رسول ہی ہو سکتے ہیں، نہ کہ صحابہ کرام اور اولیائے عظام۔
براہِ کرم آپ مدلّل طور پر اپنی علمی تحقیق سے رہنمائی فرمائیے۔ کہ آخر حق کا معیار کون ہے، اور ایک مسلمان کو اس معاملہ میں کیا عقیدہ رکھنا چاہیے؟"۔

یہ تھا سائل کا خط۔ اس میں صاف دیکھا جا سکتا ہے کہ، سائل نے کسی طرح کی تدلیس اور دغا سے کام لیے بغیر وضاحت کر دی ہے کہ وہ کیا اور کیوں پوچھنا چاہتا ہے۔ "کچھ نئے قسم کے لوگ یہ کہتے ہیں"۔ کہہ کر اس نے بالارادہ بتا دیا ہے کہ روئے سخن کس کی طرف ہے۔

اس کے باوجود حضرت مہتمم صاحب قبلہ کا جواب آپ ملاحظہ فرماویں۔

وَهُوَ هٰذَا:

جواب: "آپ کا خط آیا تھا۔ میں ان دنوں سفروں میں رہا اس وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی۔ اس وقت مختصراً صرف اس قدر عرض ہے کہ **معیارِ حق صرف اللہ و رسول ہیں**۔ حضرات صحابہ کرام چونکہ اس حق کے ناقل ہیں؛ اس لیے واجب الاطاعت (واضح رہے کہ خط میں "واجب العظامت" کے الفاظ شائع ہوئے تھے؛ لیکن بعد کے کسی "دعوت" میں تصحیح شائع کی گئی کہ "واجب الاطاعت" درست ہے) ہیں۔ اگر ان میں اختلاف، یعنی روایات متعارض ہوں تو حسبِ اُصولِ فقہ ترجیح و تطبیق وغیرہ کا فیصلہ ہوگا۔ جیسا کہ خود احادیثِ متعارضہ کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ انبیاء علیہ السلام اجتہادی خطا کر سکتے ہیں؛ لیکن اس خطا پر قائم نہیں رہ سکتے۔ فوراً ہی ان پر بذریعۂ وحی جانبِ ثواب کھول دی جاتی ہے اور بالآخر ان کا اجتہاد منصوص ہو جاتا ہے۔ تفاصیل کے لیے وقت نہیں ہے۔ فرصت کم ہے۔"

(دستخط حضرت مولانا) محمد طیب (مہتمم دارالعلوم دیوبند)

یہ جواب الفاظ و بیان کے اعتبار سے اتنا واضح اور صاف ہے کہ ہمیں اس کی تشریح میں اس کے سوا کچھ کہنے کی حاجت نہیں کہ خدا کی قسم حضرت قبلہ نے بالکل درست فرمایا۔ یہی عقیدہ اسلام کا صحیح تر عقیدہ ہے۔ اور اسی کے قائل مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی ہے۔ یہ محض حسنِ ظن اور قیاس نہیں؛ بلکہ اسے آگے کسی مناسب جگہ پر ہم دلائل و شواہد کے ذریعہ پیش کریں گے۔ فی الحال ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مذکورہ بالا جواب لکھنے والے فاضل بزرگ نے پیشِ نظر کتاب میں آخر کیوں پورا زور اس بات پر صَرف کر دیا کہ جماعتِ اسلامی کی معیارِ حق والی بات غلط اور غلط ہے۔ اور اس سے گمراہی زندقہ اور فسق و کفر لازم آتا ہے۔

اس عُجب اور طرفگی کا واحد جواب ہماری سمجھ میں صرف یہ آتا ہے کہ حضرت قبلہ نے جب اوپر والا جواب تحریر فرمایا اس وقت اُن کے دائرہ خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ تنہا خدا اور رسول کو معیارِ حق کہنے اور ماسواء کو اسی معیارِ حق سے پرکھنے کا قول کرنے میں گمراہی و بے دینی کا کوئی شائبہ تک بھی ہے۔ وہ اپنی جگہ پورے وثوق کے ساتھ سمجھتے تھے کہ اس کا مطلب نہ تو صحابہؓ کی توہین ہے نہ اولیاء وعلماء کی تحقیر۔ نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنے مقامِ اصلی سے نعوذ باللہ گرا دیے گئے۔

اور وثوق ہوتا کیوں نہ جب کہ درایتاً روایتاً قیاساً ہر طرح یہ بات مسلّم ہے کہ کوئی شخص قرآن وسنت پر ایمانِ کامل کا دعویٰ کرتے ہوئے اگر خدا اور رسول ہی کو معیارِ حق بتاتا ہے تو اس کا مطلب یہی اور صرف یہی ہوسکتا ہے کہ خدا اور رسول ہی وہ کسوٹی ہیں جس کے ذریعہ سونے کے سونا ہونے اور تانبے کے تانبا ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

معیار کا مطلب کسوٹی کچھ ہماری اختراع نہیں؛ بلکہ خود حضرت مہتمم صاحب اور حضرت مصنّف قبلہ نے اسی کتاب میں اس مطلب کی تصدیق کی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ سونا خواہ کتنا ہی خالص ہو، لیکن خود کسوٹی نہیں کہلاتا۔ صحابہ کرام کو ہم زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ وہ انبیاء کے سوا تمام انسانوں سے افضل تھے، اکمل تھے، ارفع تھے۔ ان کے اعمال سراپا حق ان کے اقوال یکسر عدالت ان کے معمولات مجسّم ہدایت تھے۔ وہ زرِ خالص تھے، جسے جب بھی قرآن وسنّت کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا شمّہ برابر کھوٹ نہیں نکلے گا۔ اس کے باوجود کیا ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ سونا نہیں خود کسوٹی تھے۔ وہ پیرو رسول نہیں؛ بلکہ خود رسول اور صاحبِ شریعت تھے۔ کیا ہم عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو اس لیے محترم سمجھتے ہیں کہ اللہ نے ان کو پیدائشی طور پر معصوم عن الخطاء اور خاص پیغامبر بنایا تھا یا اس لیے سمجھتے ہیں کہ انھوں نے قرآن کی تعمیل اور سنّت کی اتباع میں کمال کا ثبوت دیا۔ ابوبکر، عثمان، علی رضی اللہ علیہم اجمعین یا دوسرے صحابہ کرام کی عظمت کیا ہمارے دلوں میں اس لیے ہے کہ ان سب کے اقوال و اعمال ذاتی طور پر خطا سے بالاتر اور وحی الٰہی سے منتسب تھے۔ یا اس لیے ہے کہ انھوں نے اپنے ہر ہر قول و عمل کو قرآن وسنّت کی کسوٹی پر خالص اور بے میل اُترنے والا بنایا۔ بالکل ظاہر و اظہر ہے کہ احترام وعظمت کا سبب خود صحابہؓ کی بعثت ونبوت نہیں؛ بلکہ ان کا اتباعِ حق اور تعمیل شریعت اور محبّتِ رسول ہے۔ آپ جیب بینک کی اشرفی امپریل بینک کے سونے امریکہ کے ڈالر وغیرہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ یہی تو ہے کہ فلاں کا سونا اتنا عمدہ ہے فلاں کا اتنا۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ فلاں کا سونا چونکہ بالکل خالص ہے اس لیے وہ خود کسوٹی ہے اور دنیا بھر کے سونے اس پر گھس گھس کے دیکھے جائیں گے۔

بات بالکل ظاہر ومصرّح تھی اس لیے حضرت مہتمم صاحب کو مذکورہ جواب لکھتے وقت کوئی تأمل نہ ہوا؛ لیکن اس کی کیا خبر تھی ایک دن آئے گا جب ان ہی بے ضرر اور مصدقہ الفاظ کو سراپا گمراہی و زندقہ ثابت کرنے کا فرض

ادا کرنا پڑے گا۔ وہ وقت آیا اور خوب آیا۔ حضرت مہتمم صاحب اپنی بے شمار مصروفیات میں غالباً مذکورہ خط کو بھول گئے اور اب اُن کا وہ مقدمہ ہمارے سامنے ہے جس میں انھوں نے اپنے ہی الفاظ کی تردید و تنقیص پر متعدد صفحے صرف کر ڈالے ہیں۔ اب آئیے دیکھیں کہ ان صفحات میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ ہم جیسے کم علموں اور ناقص العقلوں کی نگاہ میں کس درجہ کا ہے۔

سب سے پہلے صفحہ چار کی عبارت لیجیے۔ ذہنی غلامی کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''ذہنی غلامی'' کے لفظ سے غالباً مودودی صاحب نے تقلید کی ترجمانی فرمائی ہے؛ لیکن اس معنیٰ میں یہ اصطلاح غلط اور مغالطہ انگیز ہے۔ غلامی کا حاصل کسی کے آگے جُھکنا ہے اور تقلید کے معنیٰ کسی کی بات ماننا ہے۔ ایک غلام اپنے آقا کے کمالات کے آگے نہیں جھکتا؛ بلکہ اس کی ذات کے سامنے جُھکتا ہے خواہ وہ کندۂ ناتراش اور احمق ہی کیوں نہ ہو؛ لیکن ایک مقلد اپنے امام مجتہد کے سامنے آتا ہے تو صرف اس کے منصب و مقام کی پیروی کرتا ہے جس کو وہ عقل و نقل کا پیکرِ کامل سمجھتا ہے۔ ذات کے آگے نہیں جھکتا، پس غلامی میں آقا کی ذات پیش نظر ہوتی ہے، اس کا کمال پیش نظر نہیں ہوتا اور تقلید میں مجتہد کا کمال سامنے ہوتا ہے۔ ذات سامنے نہیں ہوتی۔ غلامی میں جبر ہوتا ہے کہ نہ غلام اپنی صلاحیتوں کو آقا کے انتخاب میں صرف کرسکتا ہے نہ خود آقا ہی کی صلاحیتوں پر نظر رکھ سکتا ہے۔ ادھر بھی ذات اور ذاتی خوف و طمع، اُدھر بھی ذات اور ذاتی جبر و قہر۔ نہ وہاں شعور و استدلال نہ یہاں۔ پس ذہنی غلامی میں نہ اپنا شعور بیچ میں ہوتا ہے نہ آقا کا کمال۔ اور تقلید میں طوع و رغبت عقلی شعور اور قلبی اعتقاد ہوتا ہے۔ جس میں نہ جبر و دباؤ کا کوئی سوال ہوتا ہے۔ اور نہ امام مجتہد کے کمالات سے بے شعوری۔ غرض غلامی بے عقلی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور تقلید اتباعِ عقل و شعور سے۔ الخ''

سب سے پہلے یہ قابلِ غور ہے کہ ''ذہنی غلامی'' کا کیا مفہوم زبانِ اُردو میں رائج ہے۔ ہمارا جہاں تک علم ہے اُردو میں یہ اصطلاح مستند اور صاحبِ مرتبت لوگوں میں سب سے پہلے حضرت مولانا ابو الکلام آزاد نے ہندوستانی مسلمانوں کے اُس طرزِ فکر کے لیے استعمال فرمائی جو یورپین تہذیب اور مغربی نظریات و اُصول کے بارے میں اُن کا تھا۔ مسلمانوں کا حال یہ تھا (اور معمولی فرق کے ساتھ) اب بھی ہے کہ مغرب کے اقتدار و تسلط اور علم و سائنس کے چمکیلے مظاہر نے ان کے دل و دماغ کو اِس حد تک مرعوب و ماؤف کر دیا کہ اہلِ مغرب کی طرف سے عملاً یا قولاً جو بھی نظریہ، خیال، فیشن سامنے لایا جاتا وہ بلا تأمل اسے قبول کر لیتے۔ یا جن کو ذرا تأمل ہوتا وہ بھی تاویل و تعلیل کے ذریعہ اس تأمل کا استیصال فرما دیتے۔ یہاں تک کہ مغرب سے مرعوبی اور اسلام سے بدظنی کا یہاں تک عالم ہوگیا کہ جو تاریخیں یورپین مؤرخوں نے بغیر کسی سلسلۂ روایت اور بغیر کسی قوی دلیل و برہان کے لکھ دیں ان پر تو وہ اس درجہ ایمان لے آئے کہ گویا وہ سو فیصدی سچ اور صحیح ہیں۔ اس کے برخلاف جو حدیثیں مکمل سلسلۂ روایت روشن استدلال و برہان محقق چھان

بین اور مصدق انتخاب و امتیاز کے ساتھ اُن کے صادق القول زاہد و عابد بزرگوں نے پیش کیں ان پر وہ استہزا اور حقارت کے ساتھ ہنس دیتے۔ یا نہ ہنسے تو ''پچھلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو'' کہہ کر ایک طرف ہو گئے۔

فیشن کے نام پر جو چیز یورپ سے آئی اسے انھوں نے خوانِ یغما کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا اور یہی نہیں کہ یورپین تصورات و اقدار کو وہ محض ظاہری طور پر اچھا سمجھتے رہے؛ بلکہ یورپ کی برتری ان کے دل و دماغ میں اس طرح رَچ بس گئی کہ واقعتہً علیٰ وجہ البصیرت انھوں نے مغرب کی ہر پیشکش کو ارفع و احسن سمجھا اور کسی طریقے کے اچھے اور پسندیدہ ہونے کے لیے یہ بات کافی سمجھ لی گئی کہ وہ مغرب کے مہذب ملکوں میں رائج اور مقبول ہے۔

یہ تھی وہ ذہنیت جسے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے ''ذہنی غلامی'' کے نام سے تعبیر کیا ہے اور اُردو کے بعض غیر مذہبی؛ لیکن بلحاظ زبان و ادب مستند ادیبوں نے بھی اس لفظ کو اسی معنیٰ میں استعمال کیا اور مولانا عبدالحق، مولانا شبلی، قاضی عبدالغفار، کرشن چند اور بہت سے اور اچھے اُردو نویسوں کے مضامین میں یہ لفظ (ذہنی غلامی) ایسی ہی مرعوب و ماؤف ذہنیت کے لیے ملتا ہے۔

خود مہتمم صاحب نے جو تصریحات ''غلامی'' کی اقتباسِ بالا میں فرمائی ہیں وہ خود اس کی مؤید ہیں۔

تب ہم اور ہر خالی الذہن آدمی جماعتِ اسلامی کے دستور میں اس لفظ کو ٹھیک اسی معنیٰ میں سمجھتا رہا ہے اور اس لفظ کو دستور میں خصوصیت سے ذکر کرنے کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں سمجھ میں آتی کہ دھڑے بندی گروہ بازی فرقہ سازی اور نفاق و شقاق کی جو صورت مسلمانوں کی اکثریت نے اپنے اپنے الگ مقتدا اور رہنما بنا کر پیدا کر دی ہے۔ اس کی اصلاح کر کے سب کو قرآن و سُنّت کی مشترکہ و متحدہ بنیاد پر مجتمع اور منظم کیا جائے۔ کیا یہ بات کسی سے چھپی ہوئی ہے کہ صدیوں سے ہم مسلمانوں میں کتنے ہی متخالف گروہ بنے ہوئے ہیں، جو ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے ہیں۔ مناظرے کرتے ہیں۔ اور افتراق پھیلاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان گروہوں میں سے کوئی بھی قرآن و سنت کا منکر ہے۔ اسلام کا دشمن ہے؛ بلکہ وجہ یہ ہے کہ اکثریت بے علموں اور کم علموں کی ہے۔ یہ آخری اور فیصلہ کن دلیل محض اس کو سمجھتے رہے ہیں کہ ہمارے فلاں بزرگ نے یہ کیا اور یہ کہا تو یہ کیونکر غلط ہو سکتا ہے۔ عامر کہتا ہے کہ یہ بات مولانا قاسمؒ نے لکھی۔ لہٰذا کیونکر غلط ہو سکتی ہے۔ حنیف کہتا ہے فلاں بات مولانا احمد رضا خاں صاحب نے فرمائی، لہٰذا کیسے غلط ہونا ممکن ہے۔ خدا بخش کہتا ہے، فلاں بات میرے پیر نے فرمادی، لہٰذا کیسے غلط ہو سکتی ہے؟ اور ان سب کے ذہنوں میں قرآن کا یہ حکم نہیں کہ:

وَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ.

(جب تم میں کسی معاملہ میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اللہ و رسول کے احکام کو سامنے رکھ کر دیکھو کہ تم میں سے کون غلط کہہ رہا ہے اور کون صحیح)۔

اس کے بجائے ان کا معیارِ حق خود ان کے بزرگ اولیاء اور اسلاف ہیں۔ وہ اپنے بزرگوں کی ایسی ہی ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں جیسی مغربی علم و تہذیب کے باب میں مسلمانوں اور دیگر اقوام عالم پر طاری ہوئی۔ یہ کچھ ہمارا ہی کہنا نہیں، بلکہ تمام اربابِ نظر اسے خوب جانتے ہیں۔ اکثر مصلحین نے اپنی تحریروں میں اسے لکھا ہے اور شاہ ولی اللہؒ جیسے عظیم مصلح نے بایں الفاظ اس کی نشاندہی کی ہے کہ:

> ''اگر احبار یہود کی حالت دیکھنی چاہتے ہو تو آج کل کے علماء کو دیکھ لو۔ اور اگر عیسائیوں کے رہبان کا نقشہ کھینچنا چاہتے ہو آج کل کے مشائخ کے سامنے بیٹھ کر کھینچ لو۔'' (فوز الکبیر)

یہ الفاظ اُس زمانہ کے بارے میں ہیں جس میں دسیوں ایسے بزرگ موجود تھے کہ انھیں اکثر مسلمان آج بھی برگزیدہ و مقتدا مانتے ہیں۔ اور ایک معاند شخص جو اعتراض کی نیت رکھتا ہو بلا تکلف شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو صرف اسی عبارت کے سہارے تصوف کا دشمن اولیاء کی تحقیر و توہین کرنے والا اور خدا جانے کیا کیا کہہ سکتا ہے؛ لیکن فی الحال ہم یہ بتانا نہیں چاہ رہے کہ اعتراض کا ارادہ کیا جائے تو کس کس پر اور کس کس انداز سے اعتراضات و الزامات کی بوچھار کی جا سکتی ہے؛ بلکہ ہم نے تو ذہنی غلامی کی حالت کا تذکرہ اس لیے کیا کہ اولیاء پرستی اور اندھی عقیدت کے ہوتے ہوئے چونکہ اتحاد بین المسلمین اور اتفاق علیٰ دعوتِ الاسلام سخت دشوار ہے۔ اور قرآن و سنت کو اصل معیار و منبع اور مرکز و مبنیٰ مانے بغیر دینی اختلافات میں راہِ توازن پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس لیے جماعتِ اسلامی کے دستور سازوں نے ''ذہنی غلامی'' کی تردید میں دفعہ قائم کی۔ اس کا فائدہ یہ مقصود تھا کہ یہ جو بریلوی بدایونی فرنگی محلی دیوبندی اہلِ حدیث شیعہ سُنی اپنی اپنی رَٹ لگائے جاتے ہیں اور قرآن و سنت جیسے متحدہ و متفقہ معیارِ حق کی موجودگی میں اپنے اپنے دھڑوں کے بزرگوں اور ولیوں کی ذہنی غلامی میں اس حد تک مبتلا ہیں کہ خواہ ان کے اقوال و اعمال صریحاً خلافِ قرآن و سنت ہوں؛ لیکن انھیں برحق اور پاک و صاف سمجھنا ہی ان کا ایمان و دین ہے۔ یہ چیز ختم ہو اور ملّتِ اسلامیہ اُس اصل مرکز پر آ جائے، جسے حضور ﷺ نے حجۃ الوداع میں ''کتاب و سنت'' کے نام سے یاد دلایا تھا۔ اور آپ کی چشمِ بصیرت دیکھ رہی تھی کہ آنے والے زمانوں میں لوگوں کا کیا حال ہو جائے گا۔

الحاصل دستور کے الفاظ سے جو بات دلالتاً اور التزاماً سمجھ میں آتی ہے وہ یہی ہے کہ کسی بات کے حق ہونے نہ ہونے کا فیصلہ اس بنیاد پر نہ ہونا چاہئے کہ یہ ہمارے فلاں بزرگ کے نزدیک پسندیدہ ہے؛ بلکہ اس بنیاد پر ہونا چاہئے کہ یہ قرآن و سُنّت کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بزرگوں کی تنقیص و تحقیر پیشِ نظر ہے؛ بلکہ جو بزرگ یا ائمہ یا صحابہ واقعتہً قرآن و سنت کے مکمل پیرو ہیں اور کوئی بات خلافِ قرآن و سنت نہیں کر رہے وہ اِن الفاظ کے اعتبار سے بلا شبہ برحق اور محترم ہی رہیں گے۔ جن ائمہ و اولیا یا محدثین و صحابہ کے بارے میں روایت و درایت کی بے شمار شہادتیں اس بات پر جمع ہو گئیں کہ وہ قرآن و سنت کے بہترین عامل اور مفسر تھے ان کی

عظمت کو ماننا، ان کی تقلید کرنا، ان کو سراہنا اور برگزیدہ سمجھنا ''ذہنی غلامی'' کے تحت آتا ہی نہیں؛ کیونکہ ذہنی غلامی تو نام ہی دلیل و شہادت سے بے پروا ہو کر کسی کی بات کو محض غلوئے عقیدت اور مبالغہ ارادت سے ماننے اور حق جاننے کا ہے۔ ہم پورے وثوق اور بلاخوفِ تردید کہتے ہیں کہ اُردو ادب کی پوری صدی میں کس مستند اور ثقہ زبان دان نے اس لفظ کو ہمارے بیان کردہ معنیٰ کے علاوہ کسی معنیٰ میں نہیں بولا۔ اور خود حضرت مہتمم صاحب کی تصریح مندرجہ بالا اسی مفہوم کو درست بتلاتی ہے۔

اب آیئے ''تقلید'' پر غور کریں کہ یہ لفظ ہمارے درمیان کس مفہوم میں مستعمل ہے۔ لغت کے ''گردن نہادن'' اور ''قلادہ ڈالنا'' جیسے معانی کو چھوڑ دیئے اس پر لامعارضۃ فی الاصطلاح کا عذرِ معقول پیش کردیا جائے گا۔ عرفِ عام میں تقلید کسی امام کی پیروی کے لیے مستعمل ہے اور کسی بھی شخص کے قول و عمل کی پیروی کرنے کے مفہوم میں لیا جاتا ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں یہ تخیل عین اِس کے مفہوم میں داخل ہے کہ کسی شخص کو عقلاً یا روایتاً اچھا جان کر اس کے پیچھے چلنا۔ تنہا لفظِ تقلید بول کر یہ کبھی نہیں سمجھا جاتا کہ مقلد غلام اور جس کی تقلید کی گئی آقا ہے۔ جس طرح کہ تنہا لفظِ بدعت بول کر یہ نہیں سمجھا جاتا کہ اس سے بدعتِ حسنہ مراد ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ تقلید اپنے اصطلاحی آغاز میں قطعاً اچھے اور محمود معانی کے لیے استعمال ہوا اور لفظِ بدعت اپنے اصطلاحی آغاز میں یکسر بُرے اور نامحمود معانی کے لیے بولا گیا۔ تنہا تنہا یہ الفاظ جب بھی بولے جائیں گے ان کا مکمل مفہوم اور اصطلاحی مقصد پیش نظر ہوگا اور کوئی اور معنیٰ اسی وقت لیے جاسکیں گے جبکہ کوئی قرینہ بعید و قریب موجود ہو۔ جیسے کورانہ تقلید یا بدعتِ حسنہ۔ یا مثلاً جب ''مغربی تقلید'' بولا جائے گا تو لفظِ ''مغرب'' خود اِس بات کا قرینہ ہوگا کہ بولنے والا تقلید کو مذموم معنیٰ میں لے رہا ہے۔

تقلید کے مفہوم و معنیٰ کے بارے میں ہماری یہ تصریحات خود مہتمم صاحب قبلہ کے مذکورہ بالا اقتباس میں پوری طرح موجود ہیں۔

اب دیکھئے کہ حضرت قبلہ یہ اظہارِ خیال فرماتے ہیں کہ:

''ذہنی غلامی کے لفظ سے غالباً مودودی صاحب نے تقلید کی ترجمانی فرمائی ہے۔''

''غالباً'' کا لفظ خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ اعتراض و ایراد کا پورا زور اس بات پر صَرف کیا جارہا ہے کہ ''تقلید'' کو مودودی صاحب مردود قرار دیتے ہیں۔ اسی مفروضے پر اختلاف کو آسمان تک لے جایا گیا؛ لیکن حال یہ ہے کہ حضرت قبلہ خود ہی ''غالباً'' کہہ کر اِس بات کا اعتراف کر رہے ہیں کہ اس عقیدت کے انتساب الی المودودی میں شک ہے!

خیر یہ تو ضمنی بات تھی۔ دیکھنا یہ ہے کہ ایک لفظ یعنی ''ذہنی غلامی'' جن معنیٰ میں مستعمل اور معروف ہے ان معنیٰ کو

چھوڑ کر اسے بالکل دوسرے مختلف، غیر متعلق معنیٰ دینا اور ان معنیٰ کو قائل کی طرف منسوب کرنا آخر کس دلیل اور قرینہ پر ہے۔ظاہر ہے کہ گدھے کے معنیٰ گھوڑا تو نہیں ہو سکتے جب تک کہ اس کے لیے معقول وجوہات نہ ہوں۔ نفس دستور میں اس کے لیے قطعاً کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔التزاماً تو کیا اشارۃً بھی کہیں تقلید کا ذکر نہیں آیا۔اب دوسرا قرینہ دستور سازوں کے اپنے اقوال و مضامین ہو سکتے تھے۔ہم نے جہاں تک جماعتِ اسلامی کے لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے کسی بھی جگہ تقلید کے اُس پاکیزہ مفہوم کی تردید و تغلیط نہیں پائی جسے حضرت مہتمم صاحب نے بیان فرمایا ہے۔اور جسے ہم سب مانتے ہیں۔نہ ہمیں کوئی ایسی عبارت ملی جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ ائمہ ہُدیٰ میں سے کسی ایک کی تقلید کرنے والا گمراہ و مردود ہے اور ہر شخص کو براہِ راست قرآن و سنت ہی سے ہر مسئلہ میں استنباط و استخراج کرنا چاہیے۔زیادہ سے زیادہ جو کچھ ہم نے پایا ہے وہ یہ ہے کہ جن مسائل کا تعلق تمدنی یا سیاسی ضروریات سے ہو ان میں ایک متبحر عالم قرآن و سنت کی بنیاد پر ایسا اجتہاد کر سکتا ہے جو اگرچہ کسی امام کی رائے کے خلاف ہو؛ لیکن قرآن و سنت کی واضح تصریحات اور اسلام کے متفقہ عقائد و مسلک کے خلاف نہ ہو۔نیز اُس اجتہاد میں وہ بالکل تنہا نہ ہو؛ بلکہ اسلاف میں سے بھی کوئی مستند عالم اُس کی طرف گیا ہو۔(الا ماشاءاللہ)

ہم سے کئی گُنا زیادہ خود حضرت مہتمم صاحب جانتے ہیں کہ قرآن و حدیث کے ایک اچھے عالم کے لیے مخصوص شرائط کے ساتھ تقریباً تمام ہی اَسلاف نے حق اجتہاد تسلیم کیا ہے اور اجتہاد کا دروازہ اسی وقت بند ہو سکتا ہے۔جبکہ معاشرت تمدن سیاست اور ساری زندگی جامد ہو جائے۔یہی باعث ہے کہ ائمہ کے بہترین شاگردوں نے تقلید امام کو باعثِ افتخار سمجھتے ہوئے بھی اپنے مستقل اجتہادات کیے اور امام سے صراحۃً اختلاف کیا۔

پھر یہ تو جواز و اذن صرف عالم متبحر اور پابندِ شریعت حضرات کے لیے ہے نہ کہ ہر عام و خاص کے لیے۔ حالانکہ مہتمم صاحب کی تصریح سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جماعتِ اسلامی نے ہر اَیرے غَیرے نتھو خیرے کے لیے اجتہاد و تمسک کا دروازہ کھول دیا ہے اور تمام ائمہ ہدیٰ اس کی نظر میں ناقابل تقلید ہیں۔

انصاف کرنا چاہیے کہ ایک خاص لفظ کے، پہلے تو ''غالباً'' کہہ کر ایسے معنیٰ مراد لیے جو لغتاً اور اصطلاحاً درست ہی نہیں ہیں۔اور پھر ان معنیٰ کو دستور سازوں کا مقصودِ ذہنی قرار دے کر فرمایا گیا کہ:

> ''تقلید کی ترجمانی کے لیے ''ذہنی غلامی'' کا تحقیر آمیز لفظ شاید اشتعال انگیزی اور نئی نسل کے دل و دماغ پر چوٹ لگا کر اُنھیں تقلید سے بیزار بنانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔''

یہ بات بڑی وزن دار تھی اگر حضرت قبلہ دستور سازوں میں سے کسی صاحب کی کوئی ایسی عبارت پیش فرما دیتے جن سے اُس معقول و پاکیزہ تقلید کا انکار لازم آتا جس کے خود حضرت قبلہ قائل ہیں۔ہمیں تو ان دستور سازوں کی کتابوں میں صرف اُس اندھی اور بہری تقلید کا انکار ملتا ہے جس کا انکار خود ہم کرتے ہیں۔خود ہمارے

مہتمم صاحب قبلہ کرتے ہیں۔خود محترم اسلاف کرتے ہیں۔آخر جب نبی بخش یہ کہتا ہے کہ میرے پیر اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں صاحب بریلوی تیجہ اور چہلم کرتے تھے۔غوث الاعظم کی نیاز دیتے تھے۔بارہ وفات کے کونڈے کراتے تھے تو ان کی تقلید میں مَیں کیوں ان چیزوں کو اختیار نہ کروں تب ہم اور ہمارے مہتمم صاحب قبلہ یہ کیوں فرماتے ہیں کہ یہ گمراہی ہے۔جہالت ہے۔بدعت ہے۔آخر تقلید اگر حدودِ جائزہ سے متجاوز ہو کر بھی اچھی چیز ہے تو نبی بخش کیونکر گمراہ ٹھیرا۔اور وہ حضرات کیوں قابل طعن ہیں جو کہتے ہیں کہ امام ضامن نے یہ کیا تھا۔پنجتن نے یہ کہا تھا وغیرہ وغیرہ۔

جب جماعتِ اسلامی کے لٹریچر میں محدود و مشروع تقلید کی تردید و تحقیر ہی نہیں تو ''ذہنی غلامی'' جیسے معلوم المراد لفظ کو ''تقلید'' کا جامہ پہنانا اور اس سے اپنی مخصوص تقلیدِ مشروعہ مراد لینا اور دستور سازوں کو اس کا منکر دشمن اور مخالف قرار دینا کہاں تک قرین انصاف ہے۔

ایک بات اور قابل غور ہے کہ زیر بحث عبارت دستور کی عبارت ہے۔دستور و آئین میں ہر صاحبِ ہوش جانتا ہے کہ استعارہ و کنایہ کی زبان نہیں چلتی؛ بلکہ سیدھے اور صاف الفاظ میں بات متعیّن کی جاتی ہے۔حتیٰ کہ اگر کسی استعارہ و تشبیہ کے لیے کافی قرینہ موجود ہو، تب بھی واضح اور حقیقی الفاظ رکھے جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک شخص کا گھوڑا اگر نہایت مریل ہے، کمزور ہے، پستہ قد ہے، تو بطورِ تشبیہ و کنایہ وہ اسے گدھا کہہ سکتا ہے۔اور جب وہ بکر سے کہے گا کہ میرا گدھا بیمار ہے تو بکر از روئے قرینہ صاف سمجھ لے گا کہ مراد وہی گھوڑا ہے۔اس طرح زید کے مَریل گھوڑے کو بلا تکلّف گدھے کے نام سے موسوم کیا جاتا رہے گا۔

لیکن فرض کیجیے اس گھوڑے کو کوئی چُرا کر لے گیا اور زید تھانے میں رَپٹ لکھوانے گیا تو کیا وہ وہاں بھی یہ لکھوا سکتا ہے کہ میرا گدھا چوری ہو گیا؟ یا میونسپلٹی نے اگر قانون نکالا کہ شہر کے ہر گدھے پر اتنا ٹیکس اور گھوڑے پر اتنا۔تو کیا زید سے گدھے کا ٹیکس قبول کر لیا جائے گا؟

ظاہر ہے کہ نہیں اور ہرگز نہیں؛ کیونکہ دستور و قانون دوٹوک ہوتے ہیں۔ان میں الفاظ اپنے وضعی اور مطابقی معنیٰ میں رکھے جاتے ہیں۔ان میں شاعرانہ صنعتیں اور فنّی لگاوٹیں نہیں ملحوظ رکھی جاتیں۔کیا وجہ ہے کہ ''دستور'' میں ''ذہنی غلامی'' کے واضح اور معروف لفظ کو ایسے معنیٰ پر محمول کیا جائے جو لغتاً اور اصطلاحاً اِس لفظ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔بلکہ اگر آپ زیادہ گہرائی سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ''ذہنی غلامی'' اور ''تقلید'' کی انواع ہی جُداگانہ ہیں۔

''ذہنی غلامی'' اُس نوع کی جزئی ہے جس کا تعلق عمل سے نہیں اعتقاد، تصور اور خیالات سے ہے۔اس کے برخلاف تقلید اُس نوع کی جُزئی ہے جس کا تعلق عمل اور مظاہرے سے ہے۔تخیل اور واقعات میں اعتقاد اور عمل میں جو فرق ہے وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں۔

تضاد

چند صفحے آگے چلیے تو ایک عجیب طرح کا تضاد ملتا ہے۔ ابھی آپ نے حضرت کے مذکورہ بالا اقتباس میں ملاحظہ فرمایا کہ لفظِ غلامی ایک مکروہ ترین مفہوم پر مشتمل ہوتا ہے۔ اقتباس کو پھر ایک بار پڑھیے اور دیکھیے کہ "غلامی" کو کس قدر حقیر و ذلیل ثابت کیا گیا ہے اور غلام کو کس صراحت کے ساتھ بے شعور و بے عقل، مجبور و مقہور، خائف و طامع اور کمال سے قطع نظر کر کے صرف جبر و طاقت کے آگے جھکنے والا قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ص ۸ کی مندرجہ ذیل عبارت پڑھیے:

> ''سوال رہ جاتا ہے کہ آیا رسولِ خدا نے کسی کو معیارِ حق بنایا بھی یا نہیں۔ اور آیا کسی کو تنقید سے بالاتر اور مستحق ذہنی غلامی فرمایا بھی ہے یا نہیں۔ سو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے جن کو نام لے کر معیارِ حق و باطل قرار دیا اُن پر جرح و تنقید سے روکا اور ذہنوں کو ان کی غلامی کے لیے مستعد بنایا وہ صحابہ کرامؓ کی مقدس جماعت ہے۔''

یہ سوال تو ہم بعد میں اپنے مناسب محل پر اُٹھائیں گے کہ حدیثِ رسول میں وہ کونسا لفظ ہے جس کے معنیٰ ''معیارِ حق'' کے ہیں عدول و صادق، مزکّی مہدی و مہتدی، مقبولِ ربانی، افضل اُمت اتقیٰ، اکرم یہ سب صفات مقدسہ حدیثِ رسولؐ میں مل جائیں گی؛ لیکن ''معیارِ حق''۔ یعنی صحابہ کا بالذات کسوٹی ہونا اور رسولؐ ہی کی طرح ان کی ہر دینی بات کا وحی ہونا کس ارشادِ رسولؐ میں ہے یہ ہم آگے ''معیارِ حق'' کی بحث میں مؤدبانہ دریافت کریں گے؛ بلکہ ہم یہ بھی پوچھیں گے کہ کم و بیش چودہ سو سالوں میں کسی ایک مستند فقیہ، محدّث، امام، ولی و قطب نے کہیں ایک جگہ بھی یہ بات لکھی ہو کہ صحابہ کرامؓ اسی طرح حق کی کسوٹی تھے جس طرح قرآن و سنت اور یہ کہ آیۃ وَمَا یَنۡطِقُ ان پر بھی اسی طرح صادق آتی ہے جس طرح رسولِ کریم ﷺ فداہ امی و ابی پر تو از راہ بندہ نوازی اس کو شائع فرما کر اُمتِ مسلمہ کو ایک رازِ عظیم سے آگاہ فرمایا جائے۔

یہاں تو صرف اس چیز پر غور کیجیے کہ حضرت ممدوح کے الفاظ میں ''خود رسول اللہ نے امت کے ذہنوں کو صحابہؓ کی غلامی کے لیے مستعد بنایا۔''

غلامی وہی مردود و مذموم شئ ہے جس کی تصریح صفحہ چار پر حضرت قبلہ کر آئے ہیں اور جسے آپ بھی اقتباس میں ملاحظہ فرما چکے کیا صراحۃً اس کا یہ مطلب نہیں کہ نعوذ باللہ من ذالک خود سرورِ کونین ﷺ نے اُمت کو صحابہؓ کی ایسی اطاعت و اقتدار پر مستعد بنایا جس میں بقول ممدوح خوف و طمع ہو۔ بے شعوری و بے عقلی ہو۔ کمال سے صرفِ نظر اور محض غلبہ و قوت کے آگے جُھکنا ہو۔ طوع و رغبت نہ ہو۔ مجبوری و مقہوری ہو۔ قلبی احترام و عزت نہ ہو جبری اطاعت و تعمیل ہو۔

از راہِ کرم آپ ایک بار پھر صفحہ ۴ کی اور صفحہ ۸ کی عبارتوں کو ملاحظہ فرما کر دیکھیں کہ ہم نے کوئی اختراع

تو نہیں کیا، کچھ مَن گھڑت الزام تو نہیں لگایا۔ یہی نہیں ۔حضرتِ مصنف قبلہ مولانا سید حسین احمد مدظلہٗ العالی صفحہ ۴۵ پر آیاتِ قرآنی کا بیان فرما کر لکھتے ہیں کہ:

''جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تمام اُمّت کو ان کی (صحابہؓ کی) تقلید اور ذہنی غلامی اور ان کے ہی ساتھ رہنا واجب ہے۔''

دو اور دو چار کی طرح یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر تقلید اور ذہنی غلامی میں واقعتہً وہ فرق ہے جسے حضرت مہتمم صاحب قبلہ نے صفحہ ۴ پر صاف صاف بلا ابہام و ایہام بیان فرمایا ہے تو ایک ہی مقام پر ان کا اجتماع ناممکن ہے۔اور اگر یہ دونوں چیزیں یکجا ہو سکتی ہوں تو پھر لازماً اُن تصریحات کو غلط ماننا پڑے گا جو حضرت مہتمم صاحب نے کی ہیں۔ دو میں سے ایک بات بہر حال غلط ماننی پڑے گی۔ یا تو یہ کہ صفحہ ۴ کی تصریحات غلط ہیں یا صفحہ ۸ اور صفحہ ۴۵ پر ''غلامی'' کا لفظ غلط استعمال کیا گیا ہے۔

یقین کیجیے کہ اس بدیہی تضاد کو ہم فی الحقیقت کوئی علمی لغزش نہیں سمجھتے نہ اس سے ہمارے نزدیک حضرتِ محترم کا علمی مرتبہ کچھ کم ہوتا ہے؛ بلکہ اس کی اصل تاویل ہمارے نزدیک یہ ہے کہ ہر لفظ اپنے لاحق و سابق سے مل کر کوئی مفہوم پیدا کرتا ہے۔ بارہا ایک لفظ سیاق و سباق کی تبدیلی سے اپنا مفہوم بدل دیتا ہے۔اس حقیقت کو ہمارے بزرگ خوب جانتے ہیں اور صحابہؓ کے باب میں اُمّت کی غلامی کا ذکر کرتے ہوئے ہرگز ہرگز ان کی نیت اُس مفہوم کی نہیں تھی جسے صفحہ ۴ پر رکیک و مذموم ثابت کیا گیا ہے؛ بلکہ وہ ٹھیک ٹھیک وہی مناسب مطلب لے رہے تھے جو اُمت کو صحابہؓ کا غلام کہنے کا ہو سکتا ہے؛ لیکن ساری خرابی اس لیے پڑی کہ مقصدِ تصنیف صرف اور صرف مخالفت ہے۔ یہ ثابت کرنا ہے کہ مودودی اور جماعتِ اسلامی والے اُن کی مزعومہ گمراہیوں اور خام خیالیوں کا شکار ہیں۔ یہ بتانا ہے کہ دستورِ جماعت کا ہر لفظ اپنے بطن میں گمراہی و زندقہ کے وہ ایٹمی جراثیم رکھتا ہے کہ اُمّتِ مسلمہ مدقوق و مسئول ہو کر ہی رہے گی۔اس اثبات و احقاق کی رَو میں جہاں بھی کوئی شوشہ کسی بھی پہلو سے قابل حرف گیری نظر آیا پکڑ لیا گیا۔اور یہ بات نظر انداز کر دی گئی کہ دستوری عبارت کو سر تا سر گمراہ کن قرار دینے کے سلسلہ میں خود ہمارے ہی بعض الفاظ نہ صرف حضرت مصنف قبلہ کے الفاظ کی؛ بلکہ خود ہمارے الفاظ کی تردید و تغلیط کر رہے ہیں۔اگر پہلے سے کسی شخص یا جماعت کے بارے میں اس کی کسی عبارت یا کسی لفظ کی بنا پر یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ گمراہ ہے اور پھر اس کے بے شمار مضامین و تصنیفات سے اس حقیقت کو نہ معلوم کیا جائے کہ عبارت سے جو گمراہ کن معنیٰ سمجھے گئے ہیں وہ فی الحقیقت مغالطہ سے زیادہ کچھ نہیں اور عبارت کا مصنف ہرگز ہرگز اُن گمراہیوں میں مبتلا نہیں تو نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اپنے خیال و گمان کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ہر لفظ کا مُثلہ کیا جاتا ہے۔ ہر جملے کے جوڑ ڈھیلے کئے جاتے ہیں۔ ہر عبارت کو ایران و طوران سے جوڑا جاتا ہے۔

عقیدۂ صحیحہ

صفحہ ۸ پر "معیارِ حق" کے ذیل میں ایک حدیث اور دو آیات بیان کی گئی ہیں ۔کیا شک ہے کہ آیات و حدیث کی صحیح ترجمانی کا حق اکابرین دیوبند سے زیادہ فی الوقت کسی کو نہیں ؛لیکن جھگڑا تو یہ چل رہا ہے کہ جس طرح صرف کانٹا بدل دینے سے گاڑی کہیں کی کہیں پہنچ جاتی ہے ۔اسی طرح دستور کے معاملہ میں ایک خاص نقطۂ نظر اور زاویہ فکر بدل جانے کی وجہ سے بات کہیں سے کہیں پہنچ رہی ہے ۔صحابہؓ کے معیارِ حق نہ ہونے کا مطلب ہمارے محترم بزرگوں نے یہ طے کر دیا کہ گویا دستور بنانے والے ان کے نمونہ حق ہونے سے بھی منکر ہیں ۔نعوذ باللہ دستور سازوں کے خیال میں صحابہ کی وہ فضیلتیں اور بڑائیاں نہیں ہیں، جن کو قرآن و سنت نے بکرات و مرات مبہم و صریح کنایۃً اور بداہتہً بیان کیا ہے ۔نعوذ باللہ وہ ان کی افضلیت اور ان کے مقام و مرتبے کے منکر ہیں!

اگر ایسا ہوتا تو خدا کی قسم ان سے زیادہ مردود و مبغوض کوئی نہیں تھا اور ان پر گمراہی و ضلالت کے فتوے لگانا عین دین تھا ۔لیکن ایسے زبردست اتہام کے لیے کوئی زبردست، واضح، غیر مشکوک شہادت چاہیے ۔کیا آپ نہیں دیکھتے کہ قتل کے الزام میں کوئی شخص اُس وقت تک پھانسی کے قابل نہیں ٹھیرایا جاتا جب تک واضح ترین اور ناقابلِ تردید شہادتیں ظاہر نہ ہو جائیں ۔صحابہؓ کے وہ مراتب نہ ماننا جو قرآن و حدیث میں بیان ہوئے.....قرآن و حدیث کے انکار کی کھلی شکل ہے ۔قرآن و حدیث سے انکار اسلام کی نظر میں قتل سے ہزار گنا بڑا جرم ہے کیا اس جرم کے اثبات کے لیے بس اتنا ہی کافی سمجھا جائے گا کہ چند اہلِ علم ایک صریح المعنیٰ لفظ کو بالکل دوسرے معنیٰ پہنا کر ارتداد و کفر کی منطق نکال دیں ۔

غور کیجیے! ایک شخص کسی کتاب پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے کہ میں اس پر ایمان لایا ۔اس کے ہر ہر لفظ اور ہر ہر حکم کو سچا سمجھتا ہوں اس میں ریب و شک کی ذرا گنجائش تسلیم نہیں کرتا ۔پھر وہ اپنی مسلسل تحریر و تقریر، عمل و قول سے اس ایمان کی تصدیق و توثیق کرتا رہتا ہے اور دنیا کو پکار پکار کر اس کی طرف بُلاتا ہے ۔تو کیا ایسے شخص کے بارے میں کسی ہلکے سے مغالطے یا شک کی بناء پر یہ فیصلہ دیا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کی بہت سی باتوں کا وہ منکر ہے؟

مودودی اور جماعتِ اسلامی سالہا سال سے علی الاعلان کہہ رہے ہیں کہ قرآن و سنّت پر ان کا کامل ایمان ہے ۔قرآن و سنت ہی ان کے نزدیک احق اور اصدق ہیں ۔قرآن و سنّت کا ایک ایک شوشہ سچّا اور اٹل ہے ۔

کیا اس اعلان کے بعد محض بر بنائے شک یہ فیصلہ کر لینا حق بجانب ہے کہ قرآن و سنّت میں صحابہ کے مناقب و فضائل پر جو آیاتِ بیّنات ہیں وہ ان کے منکر ہیں ۔

خود مولانا مودودی نے اس باب میں اپنے عقائد کی جو تصریح و تفصیل شائع کی ہے اسے ہم آگے پیش

کریں گے؛ لیکن ان کی تصریح کے بغیر ہی ہم انصاف پسند لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا مولانا مودودی کی کتابوں میں انھیں کہیں کوئی عبارت ایسی ملی ہے جس میں صحابہؓ کی عظمت وعزت کو اُس مرتبہ سے گرایا گیا ہو جو قرآن وسنّت نے انھیں عطا فرمایا ہے؟ کیا کسی بھی جگہ ان کا قلم اِس ناپاکی کا مرتکب ہوا ہے کہ صحابہؓ کی تحقیر وتضحیک کرے؟ زیادہ سے زیادہ اس باب میں اُس عبارت کو پیش کیا جاسکتا ہے جو حضرت مصنف قبلہ نے تفہیمات صفحہ ۲۹۴ سے پیش فرمائی ہے؛ لیکن یہ عبارت کس حد تک اعتراض والتزام کی مؤید ہے اسے ہم آگے پیش کریں گے۔ فی الحال ہمیں یہی کہنا ہے کہ حضرت مہتمم صاحب نے ''معیارِ حق'' کے تحت جو کچھ فرمایا ہے وہ اُسی صورت میں درست ہوسکتا ہے جب معیارِ حق نہ ہونے کا مطلب یہ مان لیا جائے کہ صحابہؓ نمونہ حق اور تمثیل حق بھی نہ تھے۔ صحابی تو بڑی چیز ہیں وہ ائمہ وفقہاء کی پیروی کرنے والوں کو بھی گمراہ نہیں کہتے؛ بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ کسی بھی امام یا فقیہ یا صحابیؓ کی تقلید کرتے ہوئے اِس بات کو ہمیشہ یاد رکھو کہ یہ حضرات بجائے خود ذاتی حیثیت میں مطاع اور مقتدر نہیں ہیں؛ بلکہ اُس ربط اور واسطے اور نسبت کی وجہ سے مطاع ومقتدا ہیں۔ جو اُن کو قرآن وسنت کے ساتھ ہے۔ ان میں سے کسی کو بھی حق کا معیار نہ سمجھو؛ بلکہ ایک واسطہ اور ذریعہ تصور کرو۔

کیا اس سے ہٹ کر بھی کوئی نظریہ اور اعتقاد قرآن وسنت کے مطابق ہوسکتا ہے؟ کیا خود ہمارے محترم بزرگوں کا یہی نظریہ نہیں ہے؟ کیا ان میں سے کوئی بھی صحابہؓ کی اقتدا کو بجائے خود مقصود ومنتہا تصور کرتا ہے؟ نہیں اور بالکل نہیں۔ تب دستور کی عبارت کو گمراہ کن ثابت کرنے کے لیے قرآن وسنّت سے صحابہؓ کے فضائل ومناقب بیان کرنا کیا فائدہ دے سکتا ہے۔ وہ تو ایسے نجومِ بازغہ تھے کہ بے چارے مسلمان تو کیا انصاف پسند غیر مسلم بھی ان کی بیشتر صفاتِ حسنہ کے قائل ہیں۔ ان کی روشنی کو نہ دیکھنے والا اندھا اور ان کی عظمت کا منکر کافر ہے۔

تنقید کی بحث

صفحہ ۱۲ پر ''بالاتر از تنقید'' کے تحت ارشاد ہوتا ہے:

> ''اور جب خدا کی ساتھ صحابہ رسول پوری اُمّت کے حق وباطل کے پرکھنے کا معیار ثابت ہوئے تو کیا اُمّت کو یہ حق پہنچے گا کہ وہ ان پر تنقید کرے اور گرفتیں کرکے اُن کی خطائیں پکڑے۔''

یہاں بھی وہی بات ہے کہ ایک لفظ کے بالکل مَن مانے معنیٰ لے کر اعتراض کیا جارہا ہے۔ تنقید کا لفظ اُردو میں خوب خوب مستعمل ہے۔ عالمانِ کرام ہم سے بدرجہا زیادہ جانتے ہیں کہ تنقید لغتاً یا اصطلاحاً نکتہ چینی، عیب جوئی، خوردہ گیری کو نہیں کہتے؛ بلکہ صرف پرکھنے اور کیفیتِ شئ مع حقیقتِ شئ بیان کرنے کو کہتے ہیں۔ نکتہ چینی وغیرہ کے لیے زبان میں ''تنقیص'' اور تحقیر وتقلیل جیسے الفاظ مستعمل ہیں۔ یہ فیصلہ تنہا ہمارا نہیں؛ بلکہ تمام زبان دانوں کے

نزدیک مسلّم ومتفقہ ہے۔حضرت مہتمم صاحب قبلہ ہندو پاک میں جن لوگوں کو اُردو زبان واصطلاح کا ماہر سمجھتے ہوں اُن سے معلوم فرمالیں کہ تنقید عیب جوئی کے لیے بولا جاتا ہے یا صرف پرکھنے اور اصلیت بیان کرنے کے لیے۔ اگر اُن کا فیصلہ یہ ہوا کہ تنقید کے وہی معنیٰ ہیں جو مہتمم صاحب نے بیان فرمائے ہیں اور عرفِ عام میں ان کا وہی مطلب لیا جاتا ہے۔یعنی کسی پر لازماً گرفت کرنا اور خطائیں پکڑنا، تو بے شک ہم دستور کے الفاظ کو مردود قرار دیتے ہوئے مودودی اور جماعتِ اسلامی پر کھُلم کھلا لعنت بھیج دیں گے۔کیونکہ ہمارے نزدیک صحابہؓ کی بُرائیاں چُننے والا اور خطائیں ڈھونڈنے والا اسی لائق ہے کہ اس پر اللہ اور اُس کے فرشتے اور اس کے ایمان والے بندے لعنت بھیجیں؛ لیکن اگر تنقید کا مطلب عیب جوئی نہیں ہے؛ بلکہ شئ کی حقیقت ومتعلقات پر نظر ڈالنا ہے تو ہم نہیں جانتے کہ جن صحابہؓ کے بارے میں حضرت ممدوح اور تمام ہی مسلمان پورے یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ ان کی فردِ عمل سرتاسر صفاتِ حسنہ سے معمور اور حقانیت وصداقت سے لبریز اور خیر وسعادت سے مزیّن ہے ان پر اہلِ علم وخیر کو تنقید کا حق دینے سے گریز کیوں ہے؟ آخر کیا ائمہ کرام نے صحابہؓ کے مختلف فیہ اقوال میں نقد ونظر سے انتخاب واستخراج کا کام نہیں کیا۔کیا کسی امام برحق کے بارے میں آپ یہ کہہ سکیں گے اس نے عبداللہ ابن مسعودؓ کے قول کو حضرت عائشہؓ کی رائے پر ترجیح دے کر نعوذ باللہ گمراہی کا ثبوت دیا ہے۔نہیں کہہ سکیں گے اور یوں نہیں کہہ سکیں گے کہ آپ جانتے ہیں صحابہؓ نبی نہیں تھے، کہ ان میں سے ہر ایک کی رائے کو منصوص مان لیا جائے۔اور خدانخواستہ کوئی مانے بھی تو اُس وقت کیا کرے گا جب دو صحابہؓ کی رائے ایک ہی مسئلہ میں متضاد ہو؟

ائمہ وتابعین کا تو ذکر کیا ہمارے یہاں تو بہت بعد کے بزرگوں کو بھی فراخ دلی کے ساتھ حق تنقید دے دیا گیا ہے جس کی ایک دو معمولی سی مثالیں پیش خدمت ہیں۔

حق تنقید

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں:

وثالثها ان یبلغه الحدیث و لکن لا علیٰ وجه الذی یقع به غالب الظن فلم یترك اجتهاده بل طعن فی الحدیث.

”(حدیث میں صحابہؓ کے اپنی رائے سے اجتہاد کرنے کے طریقوں میں سے تیسرا طریقہ یہ ہے کہ) صحابہؓ کو حدیث پہنچی؛ لیکن کچھ اِس طرح کہ انھیں اس کے حدیث ہونے کا ظن غالب نہ ہوا۔ اس لیے صحابیؓ نے اپنے اجتہاد کو ترک نہ کیا اور حدیث میں طعن کیا۔“

اس کے بعد شاہ صاحب نے حضرت عمرؓ کی مثال دی ہے۔تنقید کا نمونہ ملاحظہ فرمانے سے پہلے یہ بھی

غور کر لیجیے کہ اگر ایک شخص خدانخواستہ شاہ صاحب سے بغض اور بدگمانی رکھتے ہوئے اس عبارت پر اعتراض کرنے بیٹھے تو کیا وہ یہ نہ کہہ سکے گا کہ شاہ صاحب نے صحابہؓ کی توہین کی ہے۔ بایں طور کہ حدیث میں طعن کرنے کا مطلب نہایت مذموم سمجھ میں آتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ نعوذ باللہ حضرت عمرؓ حدیثِ رسولؐ میں طعن فرماتے تھے!

بتایا جائے کہ حدیث میں طعن کرنا جائز ہے یا ناجائز۔ مباح ہے یا حرام؟

اگر جواب یہ دیا جائے کہ طعن عربی میں اُن مذموم معنوں میں استعمال ہی نہیں ہوتا جو اُردو بول چال میں اس کے سمجھے جاتے ہیں تو ہم کہیں گے کہ ایسا نہیں ہے۔ محقق ابن ہمام حنفی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ ابن ابی شریف شافعی رحمۃ اللہ علیہ مسایرہ اور اس کی شرح مسامرہ صفحہ ۱۳۰ میں فرماتے ہیں:

واعتقاد أهل السنّة والجماعة تزكتية جميع الصحابة رضي الله عنهم وجوبًا باثبات العدالة لكل مسنهم والكف عن الطعن فيه.

”اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ تمام صحابہؓ کے وجوب تزکیہ کا ہے کہ ان سب کی عدالت مان لی جائے اور ان میں طعن کرنے سے رُکا جائے۔“

کیسا عمدہ موقع تھا یہاں بجائے ”طعن“ کے ”تنقید“ کہنے کا اگر تنقید واقعی جُرم ہوتی؛ لیکن اسے چھوڑ یئے۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ اس عبارت میں یہ بتایا گیا ہے کہ صحابہؓ کو مزکّٰی سمجھنا واجب ہے۔ اور اس کا اقتضاء یہ ہے کہ ان میں طعن نہ کیا جائے۔ گویا کسی چیز میں طعن کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اُس چیز کو مزکّٰی اور پاک وصاف اور بے عیب نہیں سمجھا جا رہا۔ کیا یہ معنیٰ کچھ کم بُرے ہیں۔ کیا یہ عربی ہی کا استعمال نہیں ہے؟ پھر کیا اس کا مطلب یہ نہیں نکلا کہ صحابہؓ جو حدیث میں طعن کرتے تھے تو نعوذ باللہ حدیث کو مزکّٰی نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے وجوب تزکیہ کے قائل نہ تھے؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہو تو جہاں یہ بات واقعات کی شہادت سے بالکلیہ غلط ہوگی، وہیں صحابہؓ کے حق میں عیاذاً باللہ گالی ہوگی۔

تب آخر کیا تاویل شاہ صاحب کی تحریر کی کریں گے؟

ہم خوب جانتے ہیں کہ شاہ صاحب پر مذکورہ اعتراض فی الواقع بالکل غلط ہے؛ لیکن دکھانا تو یہ ہے کہ جو شخص شاہ صاحب کی حقیقت و اصلیت کی طرف سے آنکھیں بند کر لے اور ان کی تمام تحریرات کو نظر انداز کر دے۔ اور اصطلاحات کی نزاکتوں کو بالائے طاق رکھ دے وہ تحریفِ لفظی کیے بغیر ہی کیسے کیسے اعتراض کر سکتا ہے۔

خیر آپ نمونہ تنقید ملاحظہ فرمائیں۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

و مثال الاخرىٰ روىٰ الشيخان أنه كان من مذهب عمرو بن الخطاب أن اليتمم لايجزىٰ للجنب الذي لايجد ماء فروىٰ عنده عمار أنه كان مع رسول

اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم في سفر فاصابته جنابة ولم يجد ماء فتمعك في التراب فذكر ذالك لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم إنما كان يكفيك أن تفعل هٰكذا و في بيديه الأرض فمسح بهما وجهه ويديه فلم يقبل عمر ولم ينحض عنده حجة لقادح خفي رواه فيه حتى استفاض الحديث والطبقة الثانية من طرق كثيرة واضمحل وهم القادح فاخذو به.

''اور دوسری مثال وہ ہے جسے شیخان (بخاری ومسلم) نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کا مذہب یہ تھا کہ جس جُنبی (جس پر غسل فرض ہو) کو پانی نہ ملے اس کے لیے تیمم کافی نہیں ہے، تب ان کے سامنے عمار ابن یاسرؓ نے کہا کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھا اور مجھ کو غسل کی ضرورت ہوئی اور پانی نہ ملا تو میں خاک میں لوٹا اس کے بعد یہ بات حضورؐ کے آگے بیان کی آپ نے فرمایا: ''تم کو ایسا کرنا کافی تھا اور آپ نے زمین پر دونوں ہاتھ مار کر اپنے مُنہ اور ہاتھوں پر مسح کرلیا۔'' لیکن حضرت عمرؓ نے اس حدیث کو تسلیم نہیں کیا اور ایک مخفی اعتراض کی وجہ سے جو حدیث میں ان کو معلوم ہوا انھوں نے اس حدیث کو حجت قرار نہیں دیا؛ لیکن دوسرے طبقہ میں بہت سے طریقوں سے یہ حدیث مشہور ہوگئی اور مخفی اعتراض ضعیف ہوگیا اس واسطے سب نے اس پر عمل کیا۔'' (حجۃ اللہ البالغہ باب اسباب اختلاف الصحابة والتابعين في الفروع)

اسے چھوڑ یئے کہ حضرت عمرؓ کے طرزِ عمل نے درایت اور عقل کو اپنے مذکورہ طرزِ عمل سے کیا درجہ دے دیا ہے۔ اسے بھی چھوڑ یئے کہ شاہ صاحب نے حضرت عمرؓ کے عدمِ تسلیم کو مبنی بر وہم قرار دیا ہے۔ جبکہ وہم کے لفظ پر ایک معاند کئی اعتراض کرسکتا ہے۔ اسے بھی چھوڑ یئے کہ صحابہؓ اگر معیارِ حق تھے تو ہم مسلمان جنبی کے لیے پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کو کافی مانیں یا نہ مانیں۔ مانتے ہیں تو حضرت عمرؓ جیسے عظیم المرتبت صحابیؓ کی تردید ہوتی ہے۔ اور نہیں مانتے تو اُن دوسرے صحابیوںؓ کی تردید ہوتی ہے، جو اسے مانتے تھے۔ اسے بھی چھوڑ یئے کہ ائمہ کرام نے اس مسئلہ پر کیا کیا بحثیں کی ہیں۔ آپ تو یہاں صرف یہ دیکھئے کہ تیمم کے کافی ہونے نہ ہونے کا معاملہ طے کرنے کے لیے کیا تنقید وتحقیق کے سوا بھی کوئی راستہ ہے۔ کیا شاہ صاحب کا اپنا بیان بجائے خود تنقید علی الصحابہؓ کے دائرہ میں نہیں ہے، حجۃ اللہ البالغہ میں اس کی دسیوں مثالیں ملتی ہیں؛ لیکن آپ دوسری جگہ کی مثال دیکھئے تاکہ حق تنقید کی وسعت معلوم ہوسکے۔

حدیث کی کسی ایسی ویسی کتاب میں نہیں؛ بلکہ اصح الکتاب بعد کتاب اللہ بخاری میں روایت ہے:

عن عبداللّٰہ بن كعب قال كعب لما تخلف عن رسول اللّٰہ ﷺ في غزوة

غزاها الاغزوة تبوك. غير اني كنت تخلف في غزوة بدر و لم يعاتب أحد تخلف عنها أنما خرج نبي صلى الله عليه وسلم يريد غير قريش حتى جمع الله بينه و بينهم على غير معادٍ. (بخاری غزوۂ تبوک)

''حضرت کعبؓ (صحابی) کہتے ہیں کہ میں رسول کو چھوڑ کر کسی غزوہ میں پیچھے نہیں رہا سوائے غزوۂ تبوک کے۔ اور ہاں! غزوۂ بدر میں بھی شریک نہیں تھا۔ تاہم جو اس میں (غزوۂ بدر میں) شریک نہیں ہوا اس پر کچھ عتاب نہیں ہوا۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریش کے قافلہ کے لیے نکلے تھے کہ خدا نے دونوں فریق کو اچانک مقابل کر دیا۔''

اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ غزوۂ بدر میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فی الاصل قافلہ پر حملہ کرنے کے لیے نکلے تھے۔ اور بالکل اتفاق سے لشکرِ کفار سے جنگ ہوگئی۔

اب اُن تفصیلات کو بھی چھوڑ دیئے جن میں سیرت نگاروں نے ثابت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لشکر چڑھ آنے کی خبر سن کر ہی بدر کی طرف نکلے تھے۔ اسے بھی چھوڑ دیئے کہ اگر صرف قافلہ پر ہی حملہ مقصود تھا تو ابولبابہ کو مدینہ کا اور عاصم بن عدی کو عالیہ کا حاکم مقرر فرما دینے کا کیا مطلب تھا؟ حضرت انسؓ کی اُس حدیث کو بھی چھوڑ دیئے جس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادِ گرامی کے جواب میں جب انصار نے جنگ کے لیے نکلنے کا وعدہ کرلیا، تب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شرکتِ جنگ کی دعوتِ عام دی (یہ حدیث بخاری و مسلم دونوں میں ہے) اسے بھی چھوڑ دیئے کہ غزوۂ بدر کی جو عظیم الشان اہمیت اور شُرکاءِ بدر کے جو بے نظیر فضائل متفق علیہ ہیں ان پر اس غزوہ کو ''قافلہ پر حملہ'' کا تتمہ قرار دے کر حضرت کعب رضی اللہ عنہ کیا اثر ڈال رہے ہیں؛ لیکن اُس روایت کو کیا کریں گے جسے ابن جریر نے تاریخ میں، امام احمد ابن حنبل نے مسند میں، بیہقی نے دلائل میں اور ابن ابی شیبہ نے مصنف میں بیان کیا ہے۔ نہ صرف بیان کیا ہے؛ بلکہ ''صحیح'' کہا ہے۔ اور اس کے راوی حضرت کعبؓ سے افضل حضرت علی ابن ابی طالبؓ ہیں ملاحظہ ہو:

.....فلمّا بلغنا أن المشركين قد اقبلوا سار رسول الله صلي الله عليه وسلم إلى بدر و بدر بئر فسبقنا المشركين إليها.....

''جب ہمیں خبر ملی کہ مشرکین چڑھے آرہے ہیں تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بدر کو چلے، بدر ایک کنویں کا نام ہے جہاں ہم مشرکین سے پہلے پہنچ گئے۔''

فرمائیے! کیا حضرت کعبؓ کے بقول غزوۂ بدر ایک اتفاقی غزوہ تھا یا حضرت علیؓ کے بقول پہلے سے سمجھا بوجھا طے شدہ۔

ہم اپنی طرف سے کوئی فیصلہ نہیں دیتے، کہ اصل حقیقت کیا تھی، بس یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اصل حقیقت آپ کچھ بھی مانیں؛ لیکن اُس تک پہنچنے کے لیے آپ کے پاس تاریخ کی چھان بین اور صحابہؓ کے اقوال کی تنقید و تعلیل کے سوا کیا صورت ہے؟ اگر آپ دونوں ہی صحابہؓ کے اقوال کی تطبیق کرنی چاہیں گے تب بھی آپ کو لازماً تنقید سے کام لینا پڑے گا۔

ایک مثال اور لیجیے:

بخاری شریف کی ایک طویل روایت ہے، جس کی اصل راوی حضرت عائشہ صدیقہؓ ہیں۔ حدیث کافی طویل ہے، قابل ملاحظہ ٹکڑا یہ ہے:

فلمّا توفيت استنكر علی وجوه الناس فالتمس مصالحة أبي بكر ومبايعته ولم يكن يبايع تلك الأشهر فارسل إلیٰ أبي بكر أن ائتنا.....

''پس جب فاطمہؓ کی وفات ہوگئی تو علیؓ نے محسوس کیا کہ اب لوگوں کے دلوں میں وہ پہلی سی بات نہیں رہی ہے؛ اس لیے انھوں نے حضرت ابوبکرؓ سے صلح کر لینی چاہی اور ان سے بیعت کرنی چاہی اور انھوں نے ان مہینوں میں بیعت نہیں کی تھی؛ چنانچہ علیؓ نے ابوبکرؓ کو گھر بلا بھیجا''۔

(بخاری باب غزوۂ خیبر)

اسے چھوڑ دیئے کہ حضرت علیؓ کے تقریباً چھ مہینے تک بیعتِ امیر نہ کرنے اور بعدہٗ محض اپنے مفاد کی خاطر بیعت کرنے کے واقعہ پر ایک معترض کس کس طرح اعتراض کرسکتا ہے۔ اسے بھی چھوڑ دیئے کہ باغِ فدک کے معاملہ میں حضرت فاطمہؓ کی حضرت ابوبکرؓ سے ناراضگی اور حضرت فاطمہؓ کی زندگی تک حضرت علیؓ کا حضرت ابوبکرؓ سے عملی قطع تعلق اور تکدّر بلا تنقیدِ صحیحہ کے کیونکر دامانِ صحابہؓ کو متوہمین و معترضین کے چھینٹوں سے پاک کرسکتا ہے؛ لیکن آپ اس روایت کو کیا کریں گے جسے حاکم نے مستدرک میں نقل کر کے کہا ہے کہ یہ روایت بخاری و مسلم ہی کی شرط پر ہے اور ''صحیح'' ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں ہی حضرت علیؓ بھی اوروں کی طرح حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر راضی ہو گئے تھے۔

بلکہ اس سے زیادہ واضح روایت حضرت ابوسعید الخدریؓ کی ہے، جسے حاکم ہی نے مستدرک میں بیان کر کے ''صحیح'' بتایا ہے، اس میں صاف ہے کہ حضرت علیؓ نے سقیفہ بنی ساعدہ ہی میں حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی۔ الفاظ یہ ہیں:

فقال أبو بكر ابن عم رسول الله ﷺ وختنه أردت أن تشق عصا المسلمين فقال لاتثريب ياخليفة رسول الله صلی الله عليه وسلم. فبايعه.

''(حضرت علیؓ سے) ابوبکرؓ نے کہا کہ آپ رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی اور داماد ہیں کیا آپ

چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی لاٹھی پھٹ جائے (ان میں پھوٹ پڑ جائے) علیؓ نے کہا اے خلیفۂ رسول ﷺ! ملامت نہ کیجیے۔ پس علیؓ نے ابوبکرؓ کی بیعت کر لی۔"

(المستدرک الحاکم: ج ۳/ص/۷۶)

اسے چھوڑ یئے کہ حضرت عائشہؓ کی بات مطابق واقعہ ہے، یا حضرت ابوسعیدؓ کی۔ دونوں محترم ہستیوں کی نیک نیتی پر کامل ایمان رکھتے ہوئے بھی کیا یہ ممکن ہے کہ دونوں ہی کو معیارِ حق مانا جاسکے یعنی یہ بھی عقیدہ رکھا جائے کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت چھ مہینہ بعد کی۔ اور یہ بھی کہ آغاز ہی میں کر لی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ اس کی بجائے آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ شروع میں بھی بیعت کی تھی اور چھ ماہ بعد بھی۔ چلیے یہ بھی ٹھیک؛ لیکن علم و معرفت کی اس منزل پر کیا بلا نقد و نظر اور بے تنقید و تحقیق پہنچنا ممکن ہے۔

حقیقت یہ ہے ہم سے کہیں زیادہ علم ہمارے بزرگوں کو اس بات کا ہے کہ مختلف فیہ مسائل میں بعض صحابہؓ کے قول کو راجح اور اوفق سمجھنا اور بعض کا قول مرجوح قرار دینا صرف عقلاً ضروری؛ بلکہ عملاً واقع ہے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ دو متضاد باتوں کا بیک وقت عقیدہ رکھا جائے؛ بلکہ لازماً یہ دیکھنا پڑے گا کہ کونسا قول قرآن و سنّت سے قریب تر ہے اور یہی مطلب و منشا فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ کا ہے اور اس پر ائمہ محدثین، فقہا اور مجتہدین کا بالا جماع عمل رہا ہے۔ اُوپر محض چند مثالیں ہم نے پیش کی ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو بے شمار ایسی مثالیں مل جائیں گی جن میں صحابہؓ پر تنقید کرتے ہوئے ہمارے اسلاف نے قرآن و سنّت اور تنہا قرآن و سنّت ہی کو معیارِ حق ٹھیرایا ہے۔

اعتراض کی مثالیں

ناموزوں نہ ہوگا اگر ہم لگے ہاتھوں چند مثالیں ایسی پیش کر دیں کہ اگر اعتراض و تحقیر ہی کی خاطر کسی کے قول و فعل کو دیکھا جائے تو کیسے کیسے حقائق کی صورت مسخ کیجا سکتی ہے۔ ایک مثال تو آپ نے اوپر دیکھی کہ حضرت مولانا قاسمؒ کی عبارت محض اس تصور سے مردود اور کافرانہ بن گئی کہ یہ جماعتِ اسلامی کے کسی فرد کی ہوگی۔ بہت سی مثالیں آپ نے بدعتی حضرات کے اُن ارشادات میں بھی دیکھی ہوں گی جن میں حضرت مولانا محمد قاسم، حضرت مولانا رشید احمد، حضرت مولانا اسماعیل شہید، حضرت شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ اجمعین وغیرہ کو ضال و مضل اور کافر و اکفر ٹھیرایا گیا ہے۔ ان کے بارے میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ تحریف و تنسیخ اور جدل و تفلسف سے کام لیا گیا ہے۔ قطع و بُرید کی گئی ہے۔ الفاظ کے کچھ سے کچھ معنیٰ لیے گئے ہیں؛ لیکن ہم چند ایسی مثالیں پیش کریں گے جن میں قطعاً تحریف و تنسیخ کی ضرورت نہیں جن میں کسی لفظ کے مَن مانے معنیٰ مراد لینے کی حاجت نہیں؛ بلکہ اگر صرف حسنِ ظن اور پاکیزگیٔ نیت کو ذہن سے خارج کر دیا جائے تو یہ عبارتیں اپنے معروف و مسلّم معنیٰ میں ہی ضال و مضل ٹھیر جائیں گی۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں اور یہ بھی سمجھ لیجیے کہ کس سلسلہ میں فرماتے ہیں: ذکر اُن اسباب کا ہے جن سے دین میں تحریف اور بربادی آتی ہے۔ چنانچہ تحریف کے مختلف اسباب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ومنها تقليد غير المعصوم أعني غير النبيّ الذي ثبتت عصمته (باب أحكام الدين من التحريف).

''اوران میں (اسبابِ تحریفِ دین میں سے) ایک سبب غیر معصوم یعنی غیر نبی کی تقلید ہے۔''

ایمان اور انصاف سے کہیئے کہ دستور کے لفظ ''ذہنی غلامی'' کو بقول مہتمم صاحب ''تقلید'' ہی کے معنیٰ میں لے کر بھی کیا تقلید کی ایسی خوفناک مذمت اور قباحت واضح ہوتی ہے جیسی شاہ صاحب کے بیان میں ہے۔ شاہ صاحب تو صاف کہہ رہے ہیں کہ نبی کے سوا کسی کی بھی تقلید دین کے بگڑنے اور برباد ہونے کا ایک سبب ہے۔

ہمارا خیال تھا کہ شاہ صاحب کے اِس ارشاد کو ہم اُس جگہ پیش کریں گے جہاں حضرت مصنف قبلہ نے ص ۴۵ پر قرآنی آیات بیان کر کے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ:

''تمام اُمت کو اُن کی (صحابہؓ کی) تقلید اور ذہنی غلامی اور اُن کے ہی ساتھ رہنا واجب ہے۔''

جو تضاد شاہ صاحب اور حضرت مصنف کے الفاظ میں ہے وہ محتاجِ تشریح نہیں؛ لیکن نفس کتاب پر کلام کرنے کے لیے ہمارے پاس اور بہت کچھ ہے۔ اس لیے ہم نے فی الحال اسے بیان کر دیا اور اس لیے بھی اس کا بیان کرنا مناسب تھا کہ حضرت مہتمم صاحب صفحہ ۴ پر تقلید کے اوصاف بیان کر آئے ہیں۔

اب ہم کہتے ہیں کہ اگر شاہ صاحب کے باب میں حسنِ ظن اور دیانت کو بالائے طاق رکھ دیا جائے تو ان کی مذکورہ عبارت کیا کچھ ہدفِ طعن نہیں بن سکتی! حالانکہ حق یہ ہے کہ انھوں نے بالکل درست فرمایا اور وہی بات کہی جو نہ صرف یہ کہ جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کہتے ہیں؛ بلکہ وہی کہا جو خود ہمارے علمائے دیوبند اور سلفِ صالحین کہتے آئے ہیں۔

دوسری مثال لیجیے: حضرت مولانا الحاج سید اصغر حسین صاحب محدّث دارالعلوم دیوبند رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی مکتبۂ فکر کے ایک مستند معزز اور ثقہ بزرگ ہیں۔ آپ اپنی مختصر سی کتاب ''ناقابل اعتبار روایات'' میں یہ روایت لکھتے ہیں:

''زمین ایک پتھر پر رکھی ہوئی ہے اور وہ پتھر ایک بَیل کے سینگ پر رکھا ہوا ہے، جب وہ بَیل اپنا سر ہلاتا ہے تو صخرہ (پتھر) ہل جاتا ہے اور زمین میں زلزلہ آجاتا ہے۔''

اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

''یہ کہیں ثابت نہیں کہ حضور سرورِ عالم ﷺ نے ایسا ارشاد فرمایا ہے؛ البتہ بعض بہت ہی ضعیف روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے؛ مگر خود حضور پُرنور ﷺ کی طرف اس کو نسبت کرنا ہرگز درست نہیں۔''

بیان کردہ روایت پر حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تبصرہ کتنا صحیح ہے؛ لیکن ذرا آپ ذہن میں یہ جمالیں کہ نعوذ باللہ حاجی صاحبؒ صحابہؓ کی عظیم فضیلتوں کے قائل نہیں تھے، تب آپ آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ ایک مہمل ترین احمقانہ اور واہیات روایت کو موضوع اور غلط کہنے کی بجائے صرف ''ضعیف'' کہنے پر اکتفا کر لینا گویا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ حاجی صاحب صحابہؓ کے مہمل گو اور معاذ اللہ سفیہ ہونے کا امکان جائز رکھتے ہیں۔ اہلِ علم کو خبر ہے کہ اصطلاحِ حدیث میں ''ضعیف'' کا لفظ قطعاً جھوٹی اور جعلی روایت کے لیے نہیں آتا؛ بلکہ ناقابل حجت سمجھے جانے کے باوجود ''ضعیف'' روایات کو ممکن کے درجہ میں رکھا جاتا ہے۔ خود حاجی صاحب کا یہ قول کہ ''مگر خود حضور ﷺ کی طرف اِس کی نسبت کرنا ہرگز درست نہیں'' واضح کرتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی طرف نسبت کسی بھی درجہ میں درست ہوسکتی ہے؛ کیونکہ حرفِ استثناء ''مگر'' کا اور کوئی مطلب ہی نہیں ہوسکتا۔ تب کیا ایک مہمل ترین اور بے وقوفانہ روایت کی نسبت کسی صحابی کی طرف ممکن سمجھنا صحابی کی توہین وتحقیر نہیں۔

تیسری مثال لیجیے: قاسم العلوم حضرت مولانا قاسم رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''تصفیۃ العقائد'' میں فرماتے ہیں:

''اور مشورہ میں رسول اللہ ﷺ ہوں یا اور کوئی، واجب الاتباع نہیں؛ بلکہ خدا کی طرف سے اتباعِ مشورۂ نبوی ﷺ میں امر استحبابی تک نہیں۔''

ایک منٹ کے لیے یہ بات بھول جائیے کہ حضرت مولانا محمد قاسمؒ قرآن وسنت کے ایک بہترین عالم اور زہد وتقویٰ کے حامل اور صاحبِ فہم و بصیرت انسان تھے۔ اس کی جگہ یہ تصور قائم کرلیجیے کہ مولانا موصوف نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ کو صحیح طور پر ماننے والے نہ تھے اور ضرور ان کے اعتقادات میں فساد تھا۔ پھر دیکھیے اُوپر کی عبارت کس آسانی اور وضاحت کے ساتھ آپ کو اپنے غلط تصور کی تائید کرتی نظر آئے گی۔ کس یقین کے ساتھ آپ اعتراض کریں گے کہ صاحب یہ مولانا رسول اللہ ﷺ کا مشورہ قبول کرنے کو ضروری تو کیا مستحب بھی نہیں مانتے۔

چوتھی مثال لیجیے: اسی کتاب میں حضرت ممدوح فرماتے ہیں کہ حضور سرورِ کونین ﷺ کی موت ایسی ہے جیسے ہنڈیا کسی چراغ کو ڈھک لے یعنی جس طرح ہنڈیا ڈھک جانے سے چراغ کی روشنی پھیلنے سے رُک جاتی ہے اور بجائے خود چراغ میں کوئی فرق نہیں آتا، اسی طرح آنحضور ﷺ کی حیاتِ مبارکہ بعینہٖ اپنی حالت پر قائم ہے اور موت اس پر ایک پردہ بن کر طاری ہوگئی ہے۔

آپ ذرا حُسنِ ظن اور عقیدت کو بدظنی سے بدل دیں تو بلاتکلف پوچھ سکتے ہیں کہ اگر محمدِ عربیؐ کی زندگی فی الواقعی اپنی حالت واصل پر قائم ہے تو قرآن کی آیت کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ یا کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ کا کیا مطلب ہوسکتا ہے۔ظاہر ہے کہ محمد عربی کے لیے وفاتِ سابق کے بعد آئندہ کسی وفات اور فنا کا عقیدہ تو کسی مسلمان کا ہے ہی نہیں۔پھر اگر یہ وفات واقعتہً فنا اور ہلاکتِ لغوی نہیں تھی تو قرآن کا یہ دعویٰ کیونکر صحیح ہوا کہ زمین پر پائی جانے والی ہر شَیٔ فانی ہے اور خدا کے سوا ہر شَیٔ کے لیے لازماً ہلاکت ہے۔کیا حضور ﷺ کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا اور کُلُّ شَیْءٍ کے اندر شامل نہیں یا قرآن میں کسی اور جگہ آپ کی فنا کا استثناء کیا گیا ہے؟

مولانا محمد قاسمؒ کی طرف سے تائید

یہ چند مثالیں وہ ہیں جن میں کسی لفظ کی تحریف یا معنیٰ کی تنسیخ درکار نہیں؛ بلکہ صرف زاویۂ خیال اور طرزِ فکر بدل دینے سے بات کہیں کی کہیں پہنچتی ہے۔ایسی ہی ہزار مثالیں آپ بزرگوں کی کتابوں سے چھانٹ سکتے ہیں۔ہم ان سے قطع نظر کرکے ایک ذرا سی بات حضرت مولانا قاسم ہی کی زبانی آپ کو بتائیں گے،فرماتے ہیں:

> ''دوسروں کے قول کو قابل تسلیم سمجھنا شرک فی النبوۃ علی الاطلاق درست نہیں۔یہ بات جب ہے کہ کسی دوسرے کو قطعِ نظر اتباعِ نبوی ﷺ ایسا سمجھے کہ اس کا قول و فعل بہر نہج واجب الاتباع ہے۔'' (تصفیۃ العقائد:ص/۹،مطبوعہ کتب خانہ اعزازیہ دیوبند)(مطبوعہ جدید:مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

یہ عبارت اپنے مفہوم پر بالکل واضح ہے۔اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ نبی کے سوا کسی کے بھی قول کو (خواہ وہ صحابی ہوں) قابل تسلیم سمجھنا شرک فی النبوۃ ہے۔اگر سمجھنے والا اس حقیقت کو نظرانداز کردے کہ اس قول کی سچائی اور خوبی کا دارومدار اصل میں مہبطِ وحیِ صادق و مصدوق حضرت رسول اللہ ﷺ کی تائید و تصدیق پر ہے۔دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص کسی صحابیؓ کو بجائے خود معیارِ حق سمجھ کر اس کا قول قبول کرتا ہے تو شرک فی النبوہ کا مرتکب ہے۔گویا حضرت مولانا قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی معیارِ حق خدا اور رسول ہی ہیں اور صحابہؓ کا اتباع تقلید تعمیل سب کچھ محض اسی تصور اور بنیاد پر ہے کہ صحابہؓ حق کا نمونہ اور قرآن وسنت کے عملی پیکر اور رسول اللہ ﷺ کے فرمانبردار و متبع تھے؛چنانچہ آپ نے حجۃ اللہ البالغہ کی ایک عبارت میں دیکھ ہی لیا کہ حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی جنابت میں تیمم کو کافی نہیں سمجھتے تھے؛لیکن اُمت نے ان کے اس خیال کو قرآن وسنت کی کسوٹی پر اتنا کھرا نہیں پایا جتنا اس کا برعکس خیال،چنانچہ فیصلہ کردیا گیا کہ حضرت عمرؓ کی رائے درست نہیں اور جنابت میں پانی نہ ملنے پر تیمم کفایت کرجاتا ہے۔

جانتے ہیں آپ عمرؓ کون تھے؟وہ جن کے بارے میں سرورِ کونین ﷺ نے فرمایا تھا:

لَوْكَانَ بَعْدِيْ نَبِيٌّ لَكَانَ عُمَرُ رضی اللہ عنہ.

''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو بالیقین وہ عمرؓ ہوتا!''۔

جن کے لیے زبانِ وحی ترجمان سے نکلا تھا:

إن الله جعل الحق علیٰ لسان عمر وقلبه.

''اللہ نے عمرؓ کی زبان اور دل پر حق کو جاری فرمادیا۔''

پھر دیکھا آپ نے اسی عظیم المرتبت صحابیؓ کی مذکورہ رائے کو کن لوگوں نے ترک کیا۔ میں نے یا مجھ جیسے ناکسوں نے نہیں، خود صحابہؓ نے۔ ائمہ نے، صالحین واتقیاء نے۔ تب کیا آپ نے ان پر بھی کبھی توہین صحابہؓ کا الزام لگایا؟ الزام تو کیا لگاتے آپ نے تو حضرت عمرؓ کی رائے کے برعکس اُن کے قول کو اپنے قانونِ دین کا جز بنالیا۔

بات آگے ہی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ مزید متعلقات سے قطع نظر کرتے ہوئے اب ہم نفس کتاب پر چند معروضات پیش کریں گے۔

تصریح القول من جانب القائل

ہر چند کہ اس کتاب میں دستور کی مذکورہ دفعہ ہی کو ہدف بنایا گیا ہے اور اسی کو تمام تر اُصولی اختلافات کا نام دیا گیا ہے۔ اس لیے جو کچھ مقدمہ پر ہم عرض کر آئے وہ کافی تھا؛ لیکن چند ضمنی اور جزئی باتیں ایسی باقی رہ گئی ہیں جن پر گفتگو ضروری ہے۔ اس لیے کچھ دیر اور زحمتِ مطالعہ فرمائیں۔

سب سے پہلے ہم صفحہ ۶۶ کی عبارت پیش کرتے ہیں، الفاظ ہیں:

> ''اس مقام پر بعض حضرات فرماتے ہیں کہ معیارِ حق صرف صاحبِ وحی ہوسکتا ہے؛ کیونکہ وہ ہی معصوم ہے، اس کو غلطیوں سے بچانے والی عصمتِ خداوندی ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی غلطی کبھی صاحبِ وحی (نبی) سے کسی وجہ سے ہو بھی جاتی ہے تو وحی سے اس کا تدارک ہوجاتا ہے۔ اس لیے معصوم یعنی نبی ہی معیارِ حق ہوسکتا ہے، دوسرا نہیں۔ یہی مقصد دستور کی مذکورہ بالا دفعہ ۶ کا ہے؛ مگر یہ توجیہ مولانا مودودی کے خلاف اور توجیہ القول بما لا یرضی بہ قائلہ ہے۔''

ہم بہ تمام ادب حضرتِ شیخ کی خدمت میں عرض کریں گے کہ بخدائے لم یزل یہ اطلاع آپ کو غلط دی گئی کہ یہ توجیہ القول بما لا یرضیٰ بہ قائلہ ہے؛ بلکہ یہی وہ توجیہہ ہے جسکا قائل یا قائلین ارادہ کرتے ہیں۔ آپ کو اپنے کثیر مشاغلِ دین اور عبادات میں اس کا وقت کہاں مل سکتا تھا کہ آپ مولانا مودودی کی اُن تحریروں کو دیکھیں جن میں صحابہؓ کی عظمت کو بالکل اسی طرح تسلیم کرکے جس طرح آپ کے نزدیک درست ہے انھوں نے معیارِ حق

ہونے نہ ہونے کی یہی توجیہہ کی ہے جسے آپ ان کی مرضی کے خلاف تصور فرمارہے ہیں۔ ہم آپ کی خدمت میں پہلے تو مولانا امین احسن اصلاحی کی تحریر سے کچھ اقتباس پیش کریں گے، پھر مولانا مودودی کا وہ پورا جواب پیش کریں گے جو انھوں نے اپنے عقائد کی تصریح میں دیا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ امین احسن صاحب جماعتِ اسلامی کے اعیان واکابر میں سے ہیں، انھوں نے مذکورہ دفعہ کے باب میں ہی یہ تحریر لکھی ہے:

''عبارت مولانا امین احسن اصلاحی''

(۱) صحابہ رضوان اللہ عنہم کے جو فضائل ومناقب قرآن وحدیث میں بیان ہوئے ہیں، وہ سرآنکھوں پر جس شخص کو حضرات صحابہؓ سے عقیدت ومحبت نہیں ہے وہ منافق ہے۔ میں صحابہ کی اقتدا کو حصولِ ہدایت کا ذریعہ سمجھتا ہوں اور اس بات پر ایمان رکھتا ہوں کہ ان کی مختلف جماعتوں سے جس جماعت کی بھی آدمی اقتدا کرے گا، خدا اور رسول کی راہ پاجائے گا۔ أصحابي كالنجوم. (الحديث)

(۲) عقائد اور تصورات کے لیے کسوٹی میں صرف کتاب وسُنّت کو سمجھتا ہوں۔ اس زمانے کے جمہور کو میں کسوٹی نہیں سمجھتا۔ ان کے اندر تو بھانت بھانت کے عقائد وتصورات موجود ہیں، ہمارے اور اُن کے درمیان فیصلہ کن چیز کتاب وسُنّت ہے جو کچھ اس سے ثابت ہے اسے ہم مانتے ہیں۔ اور اسی کو ان سے منوانا چاہتے ہیں۔ اور جو کچھ اس کے خلاف ہے۔ اس کو نہ ہم مانتے ہیں، نہ کسی کی خاطر مان سکتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی لمحہ بھی یہ ثابت کردے کہ ہم نے کوئی تصوّر بھی کتاب اللہ اور سُنّتِ رسولؐ کے سوا کہیں اور سے مستعار لیا ہے تو میں ربِّ ابراہیم اور ربِّ محمدؐ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ایک سیکنڈ کے لیے بھی اس پر قائم رہنا گوارا نہ کروں گا یا تو اس کی اصلاح کروں گا یا جماعت چھوڑ دوں گا۔

ایمان بالرسول اور ایمان بالکتب سے متعلق اگر ہم ان مکفر حضرات سے کچھ مختلف مطالبہ لوگوں کے سامنے رکھتے ہیں تو وہ غالباً یہ ہوسکتا ہے کہ ہم رسول کو صرف رسول مان لینا ہی کافی نہیں سمجھتے؛ بلکہ زندگی کے تمام مراحل میں ان ہی کی اطاعت بھی ہمارے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح قرآن کو صرف یہ مان لینا ہمارے نزدیک کافی نہیں ہے کہ یہ اللہ کی آخری کتاب ہے؛ بلکہ اس کو بحیثیت ایک ضابطۂ زندگی کے تسلیم کرنا اور اگر امکان ہو تو اس کو عملاً نافذ کرنا بھی ایمان بالکتاب کا تقاضا ہے۔ ممکن ہے یہی چیز ان بزرگوں کو کچھ کھٹکتی ہو؛ کیونکہ ان میں سے اکثر حضرات کے نزدیک قرآن صرف بطورِ تبرک تلاوت ہی کے لیے ہے، اس سے آگے اس کا کوئی مصرف نہیں ہے؛ لیکن کیا ہم جو کچھ کہتے ہیں۔ ان میں سے کسی کی جُرأت ہے کہ وہ یہ کہہ سکے کہ یہ ایمان بالکتاب کے تقاضوں میں سے نہیں ہے!

(۳) جماعتِ اسلامی کے ارکان تمام صحابہ کرامؓ، تمام صلحائے اُمت، تمام مجددین اور تمام ائمۂ سلف کا پورا پورا احترام کرتے ہیں۔ اور اُن کی دینی خدمات اور شخصی عظمت کا بھی پورا اعتراف کرتے ہیں۔"

آپ انصاف فرمائیں کیا اس واضح تحریر میں شمہ برابر بھی وہ بدعقیدگی اور خباثت پائی جاتی ہے جس کا آپ کو جماعتِ اسلامی کے بارے میں گمان ہے۔ کیا اس عبارت کے بعد بھی آپ کہیں گے کہ دستور کی کوئی بھی مناسب اور محمود تعبیر و توجیہہ القول بمالا یرضیٰ بہ قائلہ کے قبیل سے ہے۔

خود مودودی صاحب کی عبارت پیش کرنے سے پہلے ایک بات اور عرض کردوں۔ یہ جو مولانا امین احسن نے کہا ہے کہ: "اِس زمانہ کے جمہور کو میں کسوٹی نہیں سمجھتا۔" اس پر خواہ آپ کچھ کہیں یا نہ کہیں؛ لیکن آپ ہی کے مکتبۂ فکر سے اس پر اعتراض وارد کیا جاتا ہے کہ جماعتِ اسلامی والے "اجماعِ اُمت" کے بھی قائل نہیں۔ یہ اعتراض کس کس تحقیری انداز اور لعن وطعن کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اس کی ناگوار تفصیلات سے میں حضور کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا؛ لیکن حجۃ اللہ البالغہ کی ایک عبارت ضرور پیش کرنا چاہتا ہوں۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کیا فرماتے ہیں

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ "باب احکام الدین من التحریف" کے ذیل میں اسبابِ تحریفِ دین بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

ومنها اتباع الاجماعِ وحقيقته أن يتفق قوم من حملة الملة الذين اعتقد العامة فيهم الأصابة غالباً أو دائمًا علىٰ شيءٍ فيظنّ أن ذلك دليل قاطع عن ثبوت الحكم و ذالك فيما ليس له أصل من الكتاب والسنة وهٰذا غير الاجماع الذي اجمعت الأمّة عليه فإنهم اتفقوا على القولِ بالإجماع الذي مستنده الكتاب والسنة أو الاستنباط من أحدهما ولم يجوزوا القول بالإجماع الذي ليس مستنداً إلىٰ إحداهما وهو قوله تعالىٰ وَإِذَاقِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْآ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآاَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا. الآية.

"اور اسبابِ تحریفِ دین میں سے ایک سبب اجماع کی پیروی ہے اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ حاملین دین کا ایک بڑا فرقہ جس کے متعلق لوگوں کا یہ تصور ہو کہ اس فرقے کے افراد کی رائے اکثر یا ہمیشہ درست ہوتی ہے کسی بات پر اتفاق کرلے اور اس اتفاق سے یہ خیال کیا جائے کہ ثبوتِ حکم

کے لیے بہ اتفاق فیصلہ کن دلیل ہے۔ اور یہ اجماع ایسے امر میں ہے جس کی کتاب وسنّت میں کوئی اصل نہیں ہے۔ یہ اجماع اُس اجماع کے علاوہ ہے جس پر امت کا اتفاق ہے؛ کیونکہ سب لوگ ایسے اجماع پر متفق ہیں جس کی سند قرآن وسنت میں ہو یا ان دونوں میں سے کسی نہ کسی سے مستنبط ہو اور لوگوں نے ایسے اجماع کو جائز قرار نہیں دیا جس کی اصل اور سند قرآن وسنت میں کچھ بھی نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ 'اور جب کافروں سے کہا جاتا ہے کہ اُس چیز پر ایمان لاؤ جسے اللہ نے نازل کیا تو وہ جواب دیتے ہیں کہ نہیں ہم تو اُس چیز کی پیروی کریں گے جس پر اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔'' (حجۃ اللہ البالغہ)

ملاحظہ فرمایا جاسکتا ہے کہ مولانا امین احسن نے تو احتیاط کے طور پر لفظِ ''جمہور'' اختیار فرمایا، جبکہ حضرت شاہ صاحب بلاتکلف اصطلاحی لفظ ''اجماع'' اختیار فرماتے ہوئے صاف وصریح الفاظ میں کہہ رہے ہیں کہ کوئی بھی اجماعِ امت ہرگز ہرگز قابل پیروی نہیں، اگر وہ کسی ایسے خیال وعقیدہ پر ہو جس کی سند قرآن وسنت سے نہ ملتی ہو! اوّل تو آج کل اجماعِ اُمت کی وہ شکل کہاں جو اجتماعیتِ صالحہ اور مدنیتِ صافیہ کی روح تھی۔ دوسرے امین احسن صاحب بالوضاحت کہہ رہے ہیں کہ ہر وہ عقیدہ وخیال واجب التسلیم ہے جو قرآن وسُنّت پر مبنی ہو۔ خود شاہ صاحبؒ نے اس کے علاوہ کیا کہا ہے۔ یہ بھی ملحوظ فرمائیں کہ شاہ صاحب نے صحابہ تک کا ذکر نہیں کیا۔ اگر صحابہ معیارِ حق ہوتے تو کیا وجہ تھی کہ شاہ صاحب نے کتاب وسنّت کے ساتھ صحابہؓ کا ذکر نہیں کیا۔ اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ اگر تمام اُمت کسی ایسے عقیدے پر مجتمع ہو جائے جس کی قریب و بعید کوئی شہادت اور سند قرآن وسنّت سے نہ ملتی ہو تو خواہ وہ عقیدہ کیسے ہی ولی، فقیہ، محدث، امام یہاں تک کہ صحابی سے ہی کیوں نہ متخرج اور منتسب ہو؛ لیکن شاہ صاحب کے نزدیک بھی وہ قابل قبول اور رواجب التسلیم نہیں؛ بلکہ اس کو قبول کرنا تخریبِ دین کے مرادف ہے۔

اب خدمتِ عالیہ میں مولانا مودودی کا جواب پیش خدمت ہے۔

(واضح رہے کہ سوال زیر بحث دفعہ ہی سے متعلق تھا۔ اور جواب میں ''مذکورہ بالا عبارت'' کا مطلب یہی دستور کی عبارت ہے)

مولانا مودودی کا جواب

(۱) تاوقتیکہ کسی شخص کو سیدھی بات میں ٹیڑھ نکالنے کی بیماری نہ لگی ہوئی ہو۔ مذکورہ بالا عبارت سے وہ مطلب نہیں نکالا جاسکتا۔ جو سوال میں درج کیا گیا ہے۔ ''رسولِ خداؐ'' کو معیار ماننے اور تنقید سے بالاتر سمجھنے کی

وجہ لامحالہ وصفِ رسالت ہی ہے نہ کہ کچھ اور۔ اور یہ وصفِ رسالت جس میں بھی پایا جائے وہ اسی مرتبہ کا مستحق ہوگا۔ جو فقرہ مذکورہ میں ''رسولِ خدا'' کے لیے ثابت کیا گیا ہے اس میں شک نہیں کہ ہمارے پاس خاتم النبیین ﷺ کے سوا اور کوئی شہادت ایسی موجود نہیں جس کے ذریعہ سے یہ یقین کے ساتھ معلوم کیا جاسکے کہ حضور ﷺ سے پہلے گزرے ہوئے بزرگوں میں سے کون کون نبی تھے؛ لیکن جن کی نبوت پر بھی حضور ﷺ نے اور آپ کے لائے ہوئے قرآن نے شہادت دے دی ہے، وہ آپ سے آپ فرستادۂ الٰہی ہونے کی حیثیت سے اس وصف میں حضور ﷺ کے ساتھ شریک مانے جائیں گے اور جو بات رسولِ خداؐ کے لیے ثابت کی گئی ہے، وہ اُن کے لیے بھی ثابت ہوگی۔

(۲) تنقید کے معنیٰ ''عیب چینی'' ایک جاہل آدمی تو سمجھ سکتا ہے؛ مگر کسی صاحبِ علم آدمی سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس لفظ کا یہ مفہوم سمجھے گا۔ تنقید کے معنیٰ جانچنے اور پرکھنے کے ہیں۔ اور خود دستور کی مذکورہ بالا عبارت میں اس معنیٰ کی تصریح بھی کر دی گئی ہے۔ اس کے بعد ''عیب چینی'' مراد لینے کی گنجائش صرف ایک فتنہ پرداز آدمی ہی اس لفظ سے نکال سکتا ہے۔ مزید برآں اس فقرے میں یہ تصریح بھی کر دی گئی ہے کہ رسولِ خداؐ کو معیار قرار دینے کے بعد جس کا جو مرتبہ بھی اس معیار کے لحاظ سے قرار پائے گا اُسے اُسی درجہ میں رکھا جائے گا۔ اس سے یہ مطلب آخر کیسے نکل آیا کہ ''صحابہ کرام کے جو محامد اور فضائل کتاب اللہ اور احادیثِ نبویہ میں مذکور ہیں، وہ واجب التسلیم نہیں ہیں؟'' کیا ایک صاحب العقل آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ رسولِ خداؐ کو معیارِ حق ماننے والے آدمی کے سامنے جب رسولِ خداؐ ہی کی لائی ہوئی کتابِ پاک اور رسولِ خداؐ ہی کی احادیث سے کسی شخص یا گروہ کے محامد و مناقب ثابت ہوں گے تو وہ انھیں واجب التسلیم ماننے سے انکار کر دے گا؟ یہ عجیب قسم کی نکتہ آفرینی اگر شرارت کی نیت سے کی گئی ہے تو پھر ''بریں عقل و دانش بباید گریست۔''

(۳) انبیاء علیہم السلام اور کتبِ الٰہی کے بارے میں ہی نہیں؛ بلکہ تمام ایمانیات کے معاملہ میں جماعتِ اسلامی کا عقیدہ وہی ہے جو تمام مسلمانوں کا ہے۔ اور جو ہر مسلمان کا ہونا چاہئے اور جو قرآن وسنت سے ثابت ہے؛ مگر میں پوچھتا ہوں کہ یہ سوال آخر پیدا کیسے ہوگیا؟ اوپر دستور جماعت کے ایک سیدھے اور صاف فقرے سے اُلٹے معنیٰ نکالنے کی جو مثال سامنے آئی ہے اس کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ اس طرح کے سوالات محض بدنیتی کے ساتھ اُٹھائے جارہے ہیں۔ جن کا کوئی منشاء لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالنے کے سوا نہیں ہے۔ خدا رحم کرے، اگر عالم دین کہلانے والے لوگ بھی اس طرح کی گھٹیا چالبازیوں پر اُتر آئیں۔

(۴) جماعتِ اسلامی تمام بزرگانِ دین کے احترام اور ان کی عظمت کے اعتراف کو ضروری سمجھتی ہے۔ البتہ انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی کو معصوم نہیں سمجھتی، جماعت کے افراد میں سے کسی نے اگر بزرگانِ سلف میں سے

کسی کی رائے سے اختلاف کیا ہے تو پورے ادب و احترام کے ساتھ کیا ہے۔ اور کسی مسئلہ میں کسی بزرگ کی رائے سے اختلاف کرنا ہمارے نزدیک ہرگز بے ادبی یا توہین نہیں ہے۔ یہ اختلاف اُمت میں پہلے بھی شاگرد اور مرید تک اپنے اُستادوں اور شیوخ سے کرتے رہے ہیں۔ اور کبھی اس کو توہین نہیں سمجھا گیا۔ اور آج بھی اہلِ حدیث علماء امام ابوحنیفہؒ اور اُن کے اصحاب سے اور حنفی علماء امام شافعیؒ وغیرہ ائمۂ مجتہدین سے اعلانیہ اظہارِ اختلاف کرتے ہیں۔ اور اس پر کسی نے بھی توہین سلف کا شور نہیں مچایا۔ مگر ہمارے ساتھ یہ عجیب معاملہ کیا جاتا ہے کہ ہم تمام بزرگانِ سلف کو پورا پورا اخراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے، اگر اُن میں سے کسی کی رائے سے ذرا سا بھی اختلاف ظاہر کرتے ہیں تو اس پر ہمیں بدنام کر دیا جاتا ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ غیر نبی بزرگوں کو معصوم تو خود یہ شور مچانے والے بھی نہیں سمجھتے اور خود بڑے بڑے بزرگوں پر تنقید کر گزرے ہیں؛ مگر ہمارے خلاف شور مچانے کی وجہ محض جذبۂ حسد و عداوت ہے، جو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان حضرات کے دلوں میں کیوں پیدا ہو گیا ہے۔ میرے اس قول کی تصدیق اگر کوئی شخص کرنا چاہے تو کسی عالم دین سے سوال کرے کہ فقہ کے جن سیکڑوں مسائل میں آپ کا مسلک دوسرے ائمۂ مجتہدین مثلاً امام شافعیؒ یا امام مالکؒ سے مختلف ہے ان میں سے آپ ان ائمہ کی رائے کو قبول کرتے ہیں یا رَد؟ اگر رَد کرتے ہیں تو یہ ان بزرگوں کی توہین کیوں نہیں ہے اور جماعتِ اسلامی کا کوئی شخص جب کسی بزرگ کی رائے سے اختلاف کرتا ہے تو یہ کیوں توہین ہے؟

سوال کے دوسرے حصے کا جواب یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی تو اس کے برعکس یہ کہتی ہے کہ ہم دین کے اس وسیع تصوّر کے قائل ہیں جس کے قائل تمام محدّثین و مفسرین اور ائمۂ فقہ تھے۔ اور اِسی وسیع تصوّر کے مطابق ہم پورے دین کو عملاً قائم کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ جماعت نے کبھی یہ نہیں کہا کہ آج تک کسی نے دین کے اس وسیع تصور کو نہیں اپنایا۔ اور یہ تصور صرف ہمارا ہی حصہ ہے، اگر کسی کے پاس ہم پر یہ الزام لگانے کے لیے کوئی بنیاد ہے تو وہ اسے پیش کرے؛ البتہ ہم نے یہ شکایت ضرور کی ہے، اور آج بھی کرتے ہیں کہ دَورِ اخیر میں بالعموم لوگوں نے مذہب کا ایک محدود تصور اختیار کر لیا ہے، جس کی رُو سے دین اور دنیا کے دو الگ دائرے بن گئے ہیں۔

(۵) کیا جماعتِ اسلامی نے یا اس کے کسی ذمہ دار شخص نے کبھی یہ کہا ہے کہ صرف ہماری جماعت ہی حق پر ہے اور باقی سب باطل پر ہیں؟ اگر کسی کے پاس کوئی ثبوت ہے تو پیش کرے۔ اور اگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ یہ سوال آخر پیدا کہاں سے ہو گیا؟

(٦) جماعتِ اسلامی نہ اپنے اہلِ قلم کو معصوم سمجھتی ہے اور نہ کسی دوسری جماعت یا مدرسہ کے اہلِ قلم کو۔ اسی طرح نہ مکتبہ جماعت کی شائع کردہ کوئی کتاب ناقابلِ ترمیم ہے نہ دوسرے گروہوں کی شائع کردہ کسی کتاب کو

(بجز کتاب اللہ کے) یہ مرتبہ حاصل ہے؛ مگر ہم اس کو ایک نہایت بے ہودہ حرکت سمجھتے ہیں کہ جہاں کسی کی بات پر ناراض ہوئے فوراً اس کی کتابیں لے کر بیٹھ گئے۔ کوئی فقرہ یہاں سے نکالا، کوئی دوسرا فقرہ کہیں اور سے نکال لیا۔ اور اس پر الزام تراشی کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ یہ بے ہودگی نہ آج تک ہم نے کسی کے ساتھ کی ہے، نہ ہم کسی ایسے شخص کو ذرہ برابر وقعت دینے کے لیے تیار ہیں، جو کسی کے ساتھ اس کا ارتکاب کرے میں صاف طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اس بے ہودہ طریقہ سے اگر کوئی شخص جماعت کی شائع کردہ کسی چیز کے ایک نقطہ میں بھی ترمیم کرانا چاہے تو وہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ البتہ اہلِ علم کے طریقے پر ہماری جس غلطی کی بھی دلائل کے ساتھ نشاندہی کی جائے گی، ہم بلا تامل اس کی اصلاح کریں گے۔

(۷) نبی کریم ﷺ کی بے ادبی کرنے والا تو مسلمان ہی نہیں ہے، چہ جائیکہ وہ جماعتِ اسلامی کا رکن بن سکے یا رہ سکے۔ رہے دوسرے بزرگانِ دین تو جو شخص ان کے حق میں بے ادب ہو یا ان کی تنقیص کے درپے ہو یا اپنے علم وتقویٰ کے باب میں اس درجہ متکبر ہو کہ اپنے آپ کو ان پر ترجیح دینے لگے، اس کے لیے جماعتِ اسلامی میں کوئی جگہ نہیں ہے؛ مگر یہاں پھر میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ سوال پیدا کیسے ہوا؟ کیا جماعتِ اسلامی میں شامل کسی شخص پر یہ الزام ثابت کیا جاسکتا ہے؟ اگر نہیں تو آخر کیا وجہ ہے کہ ہم نے یہ سوال آج تک کسی مسلم جماعت کے متعلق نہیں اُٹھایا۔ اور ہمارے متعلق یہ سوال اُٹھایا گیا؟ کیا جذبہ عناد اور ارادۂ وسوسہ اندازی کے سوا اس کی کوئی اور وجہ بنائی جاسکتی ہے؟ (ابوالاعلیٰ مودودی)

....

یہ جواب کیا اُس بدگمانی کے رفع کرنے کے لیے کافی نہیں ہے جو مودودی اور جماعتِ اسلامی کے باب میں کَندہ ومنقوش کر لی گئی ہے؟ ایک ذرا سی بات یہ بھی کہتا چلوں کہ یہ جو مولانا مودودی نے فرمایا کہ:

> ''ہمارے پاس خاتم النبیین ﷺ کے سوا اور کوئی شہادت ایسی موجود نہیں جس کے ذریعہ سے یقین کے ساتھ معلوم کیا جاسکے کہ حضور ﷺ سے پہلے گزرے ہوئے بزرگوں میں سے کون کون نبی تھے.....''۔

اس پر آپ ہی کے مکتبۂ فکر کی طرف سے کچھ اس طرح کے اعتراضات کیے جاتے ہیں کہ صاحب مودودی نے تو تقریباً سارے ہی نبیوں کو مجہول الحال (؟) قرار دے دیا! ساری ہی سابق شریعتوں کی توہین کر دی، حالانکہ وہ سب حق تھیں وغیرہ وغیرہ۔

ایسے معترضین شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیں:

حتّٰی ینسی معظم العلم والتھاون من سادۃ القوم و کبرائھم اضرّ بھم و اکثر افساداً و بھٰذا السبب ضاعت ملۃ نوح و إبراھیم علیھما السّلام فلم یکد یوجد منھم من یعرفھا علٰی وجھھا و مبدأ التّھاون امورٌ.

''یہاں تک کہ علم کا بڑا حصّہ بھلا دیا جاتا ہے رئیسوں اور بڑے لوگوں کی کاہلی لوگوں کے حق میں زیادہ نقصان دہ اور وجہِ فساد ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہم السلام کا مذہب نیست و نابود ہوگیا اور اب انسانوں میں سے کوئی بھی ان مذاہب کی اصلی حالت کو جاننے والا نہ رہا اور غفلت و کاہلی کے سرچشمے چند اُمور ہیں''۔

اس کے آگے شاہ صاحب نے اِن اُمور کو بیان فرمایا ہے۔ اب فرمائیں معترضین کہ شاہ صاحب نے تو دو اکبر و اجل نبیوں کا نام تک صاف صاف لے کر کہہ ڈالا کہ ان کے مذاہب معدوم ہوگئے؛ بلکہ شاہ صاحب کی فضیلت اور اپنی ایمانداری کو بالائے طاق رکھ دیا جائے تو معترض کہہ سکتا ہے کہ صاحب! ملتِ ابراہیمی تو اسلام ہی ہے جس کی گواہی قرآن و سنت دیتے ہیں۔ پھر یہ کیسے کہا کہ ملّتِ ابراہیمی ضائع ہوگئی۔ اور یہ ''ضاعت'' کا لفظ بھی بڑا ناموزوں ہے؛ کیونکہ ضائع ہونا کسی چیز کے محض مفقود ہونے کو نہیں کہتے؛ بلکہ بیکار جانے کو کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نوحؑ و ابراہیمؑ کا دین خود اُن کے زمانوں میں بھی کارآمد نہ ہوا؟

فرمایئے ان اعتراضات میں کیا منطقی نقص ہے جبکہ دیانت و امانت کو بالائے طاق اور سلامتی فکر و نظر کو درصندق رکھ دیا جائے۔

حیرت و شرمندگی ہوتی ہے یہ کہتے ہوئے کہ حضرت مہتمم صاحب قبلہ کی طرح حضرت مصنف نے بھی بلاتکلف ''تنقید'' کے معنیٰ نکتہ چینی، عیب گیری، تحقیر و تنقیص اور نہ جانے کیا کیا لے کر اعتراض و ایراد کی پوری عمارت کھڑی کردی۔ ہم سو فی صدی یہ بات مانتے ہیں کہ جن عقائد کی گمراہی اور قباحت و شناعت حضرت مصنّف نے ثابت فرمائی ہے، بلاریب و شک وہ سخت قبیح و شنیع ہیں؛ لیکن ایک فی صدی بھی یہ ماننے کو تیار نہیں کہ ان عقائدِ خبیثہ کی نسبت مودودی اور جماعتِ اسلامی کی طرف صحیح تو کیا ممکن بھی ہے۔ جو کچھ ہم ماسبق میں عرض کر آئے وہ اس خیال کے اثبات میں بالکل کافی ہے اور حضرت اگر یہ خیال فرمائیں کہ صرف اتنا کافی نہیں ہے؛ بلکہ مزید ثبوت چاہئے تو ہم جماعتِ اسلامی کے لٹریچر میں سے ایک دو نہیں پانچ دس عبارتیں ایسی پیش کریں گے جنھیں فی الحال بخوفِ طوالت اور بخیالِ تحصیل حاصل نقل نہیں کر رہے اور جن سے قطعیت کے ساتھ واضح ہوتا ہے کہ مودودی اور جماعتِ اسلامی کے عقائد انبیاء و صحابہ کے باب میں مِن و عَن اور ہو بہو وہی ہیں جو ہمارے مزکّٰی و مصفّٰی اسلاف کے ہیں۔

توہینِ صحابہؓ

کچھ معروضات صفحہ ۴۶ پر بھی سنیے۔ حضرت مصنف قبلہ مودودی صاحب کی تفہیمات میں سے یہ عبارت دیتے ہیں (دارالعلوم دیوبند سے شائع شدہ اس کتاب کے جدید ایڈیشن میں یہ عبارت (ص ۴۴) پر ہے):

''ان سب سے عجیب بات یہ ہے کہ بسااوقات صحابہ رضوان اللہ علیہم پر بھی بشری کمزوریوں کا غلبہ ہو جاتا تھا اور وہ ایک دوسرے پر چوٹیں کر جاتے تھے۔ ابن عمرؓ نے سُنا کہ ابو ہریرہؓ وتر کو ضروری نہیں سمجھتے۔ فرمانے لگے ابو ہریرہؓ جھوٹے ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے ایک موقع پر انسؓ اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما کے متعلق فرمایا کہ وہ حدیثِ رسول اللہ کو کیا جانیں وہ تو اس زمانہ میں بچے تھے۔ حضرت حسن علیؓ سے ایک مرتبہ وَشَاهِدٍ وَّ مَشْهُوْدٍ کے معنیٰ پوچھے گئے، انھوں نے اس کی تفسیر بیان کی۔ عرض کیا گیا کہ ابن عمرؓ اور ابن زبیرؓ تو ایسا اور ایسا کہتے ہیں، فرمایا دونوں جھوٹے ہیں۔ حضرت علیؓ نے ایک موقع پر مغیرہ بن شعبہؓ کو جھوٹا قرار دیا۔ عبادہ بن صامتؓ نے ایک مسئلہ بیان کرتے ہوئے مسعود بن اوس انصاریؓ پر جھوٹ کا الزام لگا دیا۔ حالانکہ وہ بدری صحابہؓ میں سے ہیں۔''

واقعی بظاہر یہ عبارت ایسی ہے کہ جذبات اس پر بھڑک سکتے ہیں اور لاریب ہمارے حضرت نے صحابہؓ سے شدّتِ عقیدت ومحبت ہی کی بناء پر اسے ہدف بنایا ہے۔ لیکن ہم بڑے ادب سے سوال کرتے ہیں کہ کسی کی خطا اور لغزش کا ذکر کیا ہمیشہ اُس شخص کو رُسوا کرنے ہی کی غرض سے ہوتا ہے۔ کیا کسی شرمناک بات یا ناپسندیدہ قول کے پیچھے ہمیشہ عناد وتحقیر اور بدنیتی ہی کارفرما ہونی ضروری ہے؟ اگر ہے تو اُن آیاتِ قرآنی کا کیا جواب ہوگا جن میں سرورِ کائنات ﷺ کی کسی خطا اور لغزش کی نشاندہی کی گئی ہے؟ کیا اللہ جل شانہٗ کا مقصد نعوذ باللہ آنحضور ﷺ کو رُسوا کرنا تھا؟

یا فقہ کی اُن کتابوں کو آپ کیا مقام دیں گے جن میں اُن تمام اعضا اور افعال کا کھلا کھلا ذکر ہے جن کے چرچے اور تذکرے کو اسلام نے بے حیائی اور فحاشی ٹھیرایا ہے۔ کیا آپ خدانخواستہ یہ کہہ سکیں گے کہ اِن کتاب نگاروں کا مقصد خدانخواستہ تلذّذ اور تعیش تھا؟

ظاہر ہے کہ ایک ہی فعل نیت ومقصد کی تبدیلی سے اپنی حیثیت بدل دیتا ہے۔ قتل ایک ہی فعل ہے؛ لیکن ازراہِ شرارت ہو تو اسے آپ شیطنت قرار دیتے ہیں اور ازراہِ جہاد فی سبیل اللہ اور ازراہِ تعزیرِ اسلامی ہو تو عین سعادت ورحمت فرماتے ہیں! آخر صرف نیت اور مقصد ہی تو بدلا ہوا ہے۔

یہی بات ہم یہاں کہیں گے کہ قیاس اور عقل ونقل کی کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جس کی شہادت پر مودودی صاحب کو اس حد تک بُرا سمجھ لیا جائے کہ وہ شیطنت اور زندیقی کی راہ سے صحابہ کے عیب اُچھالنا پسند کرتے ہیں۔ مان لیا کہ صورۃً ان کی عبارت وسوسے اور مغالطے پیدا کرنے والی ہے۔ لیکن صفحہ ۳۰ پر آپ خود فرما آئے ہیں کہ جو افعال انبیاء کے صورۃً معاصی سمجھے گئے وہ حقیقۃً معاصی نہیں ہیں، جس کی دلیل یہ حدیث ہے کہ: ''إنما الأعمال بالنیّات و إنما لکل امرءٍ ما نویٰ'' (الحدیث) یعنی اعمال کا مدار نیت پر ہے۔ اور ہر شخص پر اس کی نیت کے مطابق ہی خدا کا فیصلہ جاری ہوگا۔

صدق اللّٰہ مولانا العظیم. یہی دلیل ہے جس سے ہم حضرت علیؓ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں کو اپنی اپنی جگہ حق پر مانتے ہیں اور صحابہؓ وائمہ کو مختلف فیہ مسائل میں بہرطور گناہ سے بالاتر سمجھتے ہیں؛ کیونکہ ان کی نیتیں پاک وصاف تھیں، جنسی مسائل اور جنسی اعضاء کا آپریشن کرنے والے فقیہوں کو بے خطا تصور کرتے ہیں؛ کیونکہ ان کا مقصد نیک اور پاکیزہ تھا۔

تب آخر مولانا مودودی ہی میں وہ کیا سُرخاب کے پر ہیں کہ ان کے معاملہ میں ایک قاعدہ کُلیہ لازماً بدل جائے گا۔ مذکورہ عبارت پر ہزار ہزار تنبیہ کرنے کے ساتھ ساتھ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ اُن سے اس گل افشانی کا مقصد و منشا پوچھا جاتا اور جب وہ مقصد ومنشا بیان کرتے تو کہا جاتا کہ تمہارا مقصد ومنشا جتنی منفعت رکھتا ہے اس سے زیادہ مضرت اس عبارت میں ہے۔

پوچھنا تو درکنار، اگر وہ خود بھی اپنا مقصد بیان کرتے ہیں تو اس پر سرِ توجہ نہیں کیجاتی۔ ذرا ناظرین بھی سُنیں کہ اُن کا مقصد کیا ہے:

سب سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ جماعتِ اسلامی کا مقصدِ وجود محض اتنا نہیں کہ ہر مسلمان صرف نماز روزے کا پابند ہو جائے؛ بلکہ اس کا واحد مقصد یہ ہے کہ اللہ کا دین تمام کا تمام عملی دنیا میں نافذ و رائج ہو۔ اس مقصد کے لیے ہماری ہی طرح اس کے نزدیک بھی قرآن وسنت کا اتباع اور سلفِ صالحین کی مشروع پیروی واحد اور مکمل ذریعہ ہے؛ لیکن یہ ذریعہ جبھی مفیدِ مطلب ہوسکتا ہے جب اپنے اسلاف کے بارے میں ہماری عقیدت اور محبت جذباتی مغالطوں اور مبالغوں سے خالی ہو۔ ہم صحابہ اور اولیاء کے گُن گاتے گاتے اُنھیں فرشتہ اور مافوق الفطرت اور آسمانی مخلوق نہ سمجھ بیٹھیں۔ اگر ہم نے ایسا سمجھ لیا تو مدح ومنقبت کے چاہے کیسے ہی قصیدے ہم ان کی شان میں تصنیف کر دیں؛ لیکن عملی پیروی کی ہمت وجرأت نہ کرسکیں گے؛ کیونکہ انسان انسان ہی کی پیروی کرسکتا ہے۔ فرشتوں اور دیوتاؤں کی نہیں۔ اسے آپ مفروضہ نہ سمجھئے۔ اُن حضرات کو دیکھئے جو قرونِ اولیٰ کے تاریخی ناول پڑھ پڑھ کر صحابہؓ کو ایک سرتاسر مافوق الفطرت مخلوق تصور کرتے ہیں۔ یا ان لوگوں کو دیکھئے جو صحابہؓ

کی منقبت میں اس حد تک ڈوب گئے ہیں کہ اگر ان سے کہیے کہ صحابہؓ کی پیروی کرو تو کہتے ہیں کہ میاں وہ کہاں ہم کہاں! گویا صحابہؓ کی فضیلت کو وہ اپنی بے عملی کا بہانہ بناتے ہیں۔ اور صحابہؓ کو ایک ایسی مخلوق سمجھتے ہیں جس کے نقشِ قدم پر چلنا آج کے انسانوں کے لیے ممکن ہی نہیں۔

مودودی چاہتے تھے کہ صحابہؓ کی فضیلتوں کے جذباتی قصیدے ذرا عملی زندگی میں بھی تو رو بہ کار آئیں۔ پس انھوں نے مسلمانوں کے دماغوں اور دلوں میں یہ بات ڈالنی چاہی کہ دیکھو صحابہؓ کی پیروی کوئی استحالہ اور عجوبہ نہیں ہے۔ ان کی فضیلتیں اور دین داریاں کچھ مافوق الانسان نہیں ہیں۔ نہ سمجھو کہ وہ جذبات وخواہشات کی اُس دنیا میں نہیں رہتے تھے جس میں تم رہتے ہو۔ نہ سمجھو کہ روزمرّہ کی زندگی میں ان کے احساس ورجحان اور خواہش ومیلان میں کوئی ایسا زیر و بم نہیں تھا جیسا تمہاری زندگی میں ہے۔ وہ بھی اسی رنگ و بُو کی دنیا میں رہتے تھے۔ ان میں بھی فطری جذبے تھے، غصہ اور جوش تھا، غیرت اور ذکاوت تھی اور وہ سب کچھ تھا جو من حیث البشر تم میں ہے۔ نفس ان کے پاس بھی تھا، تم انھیں مافوق الفطرت سمجھ کر اپنے کو پیروی سے معذور نہ سمجھ بیٹھو؛ بلکہ تم بھی آج آسانی سے ان کے نقشِ قدم پر چل سکتے ہو۔

اسی حقیقت کو ان کی غالی عقیدتوں اور بے نتیجہ نیاز مندیوں کی اصلاح کے لیے مودودی نے بایں طور مشرح کیا کہ صحابہؓ کی روزمرّہ زندگی کے کچھ ایسے واقعات بیان کیے جو اُن کے عظیم تقدس وحرمت کے اُفق پر بشریت کا نظارہ پیش کرسکیں اور عوام کو واقعات کی شہادت سے یہ معلوم ہوجائے کہ سچ مچ صحابہؓ انسان ہی تھے اور انسانی عوارض کی گُلکاریاں ان میں بھی کسی نہ کسی حد تک موجود تھیں۔ یہ بالکل الگ بات ہے کہ مودودی صاحب کا یہ طرز فی الواقع وہی منفعت اور ثمرہ دینے والا تھا جو انھوں نے سوچا تھا، یا اس میں ان کی بھول اور اجتہادی غلطی تھی۔ سوال صرف نیت کا درپیش ہے اس پر جو اعتراض وارد کیا گیا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔

عجیب اعتراض

صفحہ ۳۰ پر ہے:

> ”مودودی صاحب کا یہ ارشاد تا کہ لوگ انبیاء کو خدا نہ سمجھیں اور جان لیں کہ یہ بھی بشر ہیں۔ نہایت عجیب فلسفہ ہے۔ بشریت کے پہچاننے کے واسطے بھوک پیاس، بیماریاں، نوم وغیرہ ظاہری لوازماتِ بشریت کافی ہیں۔“

یہ اعتراض جب انبیاء کے بارے میں ہے تو صحابہؓ کے بارے میں بدرجہ اولیٰ ہوگا؛ لیکن ہم نہیں جانتے کہ تاریخِ عالم کا جاننے والا کوئی بھی شخص اسے وزن دے سکتا ہے۔ تاریخِ عالم تو چھوڑیئے۔ آج کے مہذب ترین روشن

علمی زمانے ہی کو لے لیجیے، کیا اسی دَورِ مہذب میں اِسی زمین پر جانوروں اور درختوں اور دریاؤں کے پوجنے والوں کی کچھ کمی ہے۔ کیا آج بھی لاکھوں اشخاص اُن انسانوں کو دیوتا اور معبود نہیں بنائے ہوئے جو کھاتے بھی تھے، پیتے بھی تھے، بیمار بھی ہوتے تھے، سوتے بھی تھے۔ غیر مسلمین کو چھوڑ دیئے، کیا خود مسلمانوں میں ایسے لوگ بڑی تعداد میں موجود نہیں جو انبیاء تو کیا اولیاء واتقیاء کو بھی حاضر و ناظر مانتے ہیں اور ضرورت کے وقت انھیں اسی طرح مدد کو پکارتے ہیں جس طرح ہم اور آپ خدا کو۔ کیا بزرگوں کے بارے میں مافوق الفطرت تخیّلات رکھنے کی سنجیدہ حماقت کسی تعارف اور دلیل کی محتاج ہے۔ اسلاف تو دُور گئے۔ آج کے زندہ لوگوں میں آپ ایسے کتنے ہی بزرگ دیکھ لیجئے جنھیں ایکدو نہیں سو پچاس نہیں ہزاروں مسلمان بشریت سے بلند تر صاحب قوائے باطنی آمر مطلق حاکم ناطق اور وہ سب کچھ مانتے ہیں جو بشریت سے بالاتر ہے۔ ''کن فیکون'' تک کا عقیدۂ ضالّہ ان کے متعلق رکھتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کیا خود قرآن نے نہیں بتایا کہ اُممِ سابقہ نے اپنے بزرگوں کو معبود اور مسجود بنالیا تھا۔ کیا حضرت مسیح کے کھانے پینے، سونے اور بیمار ہونے سے کوئی عیسائی منکر ہے؟ لیکن کیا پھر بھی وہ نہیں کہتا کہ وہ اللہ کے بیٹے تھے۔ اللہ کی روح تھے، مافوق البشر تھے وغیرہ۔

ہمیں بتایا جائے کہ اگر مذکورہ اعتراض ٹھیک ہے تو قرآن میں کئی جگہ بطورِ غائب بھی اور بطورِ متکلم بھی آنحضور ﷺ کے بشر ہونے کا اعلان واظہار کیوں ہے؟ کلمۂ شہادت میں وَاَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ کس لیے ہے؟ آخر کیا بات ہے کہ اللہ نے آنحضور ﷺ کی بعض اجتہادی خطاؤں کو قرآن ہی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ثابت و قائم کر دیا۔ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ ان غلطیوں کی اصلاح وحیِ غیر متلو کے ذریعہ کی جاتی۔ آخر سبھی اہلِ علم مسلمان جانتے ہیں کہ آنحضور ﷺ پر قرآن کے علاوہ بھی نزولِ وحی ہوتا تھا، جس پر قرآن کی آیت وَمَا يَنْطِقُ شاہدِ عادل ہے۔ پھر کیا حرج تھا، اگر ایسی ہی وحی کے ذریعہ اصلاح وتنبیہ فرمادی جاتی۔ کیوں تمام اُمّت کے سامنے قرآن کا جز بنا کر یہ بات رکھ دی گئی کہ تمہارے سب سے افضل و برتر رسول سے بھی اجتہادی خطائیں ہوئی ہیں۔ کیوں واقعۂ اِفک میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی برأت تقریباً ایک ماہ بعد اللہ نے اپنے قولِ فیصل سے کی؛ کیوں الزام تراشی کے دن ہی یا ایک دو روز بعد ہی آیات نازل نہ فرمائیں؛ کیونکہ اپنے رسول کو ایک ماہ تک ایسی کیفیت میں مبتلا رکھا جو بشریت ہی کے لیے مخصوص ہے۔

ان امور کی مصلحتیں آپ خواہ کچھ ہی بیان فرمادیں؛ لیکن یہ بھی اپنی جگہ دل لگتی اور قریبِ نفسیات ہے کہ اِن سب اُمور میں اللہ جل شانہٗ نے غلامانِ رسول کو افراطِ عقیدت اور مبالغہ وغلو سے بچنے کا سامان فراہم کیا ہے۔ انصاف کیجیے جو صحابہ محمد عربی ﷺ کے تھوک تک کو زمین پر نہ گرنے دیتے تھے۔ جنھوں نے اپنی جانیں اور مال وعیال تو کیا اپنے نفس کے جذبے اور میلانات تک حضور کے قدموں پر نچھاور کر دیئے جنھوں نے محبتِ رسول میں

نیزوں اور تلواروں کی نوکوں پر سینے رکھ دیئے۔ جنھوں نے اپنی آنکھوں سے مافوق الطبعی معجزات دیکھے، درخت کو روتے سنا، کنکریوں کو تسبیح کرتے پایا، کیا از روئے نفسیات یہ کچھ بعید تھا کہ فرطِ عقیدت ومحبت میں وہ رسول کے ساتھ کسی اُلوہی تصور کو بھی وابستہ کر لیتے۔ خصوصاً اس دَور میں جبکہ بت پرستی اوڑھنا بچھونا تھی۔ نہ صرف صحابہ؛ بلکہ بعد کے لوگوں سے بھی یہ غلطی ممکن تھی، اگر اللہ جل شانہٗ بار بار یہ یاد نہ دلاتے رہتے کہ خبردار! محمدؐ کی بشریت کو نہ بھول جانا۔ وہ بشر اور بندے کے سوا کچھ نہیں۔ اور جو معجزے تم اس کے دیکھتے ہو وہ میری ہی قوت وقدرت کے چند مظاہر ہیں۔

حیرت کیجیے کہ اس کے باوجود بے شمار لوگوں نے رسول میں اُلوہیت کو داخل کر دیا۔ کھلم کھلا خدا کہنے کی گنجائش نہ ملی تو حاضر وناظر، سمیع وبصیر، غفور الرحیم اور اسی طرح کے دوسرے لفظوں سے دل کا شوق پورا کیا اور آج بھی دنیائے اسلام میں ہزاروں نہیں لاکھوں ایسے مسلمان زندہ ہیں جو کھانے پینے، سونے اور بیمار ہونے والے رسول کو حاظر و ناظر، معین و ناصر، وہّاب وغفار اور نہ جانے کیا کیا تصوّر کرتے ہیں۔ رسول تو پھر رسول ہیں۔ شاہ عبد القادر اور شاہ نظام الدین اور خواجہ کلیری تک کو صفاتِ الٰہیہ میں سے کئی صفات کا حامل مانتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انسانی نفسیات ہی کچھ اس طرح پر واقع ہوئی ہے کہ عقیدت واحترام کے ساتھ انسان کچھ مبالغے اور افراط کی طرف دوڑتا ہے۔ اللہ جل شانہٗ سے بڑھ کر نفسیاتِ انسانی کا جاننے والا کون ہوگا۔ اس نے اسی لیے محمدؐ کی بشریت کا مکرّر سہ کرّر اعلان کر کے اور واقعات کی شہادت قائم کر کے نفس پر حجت تمام کر دی۔ اب بلا سے کوئی مانے یا جہنم میں جائے۔

مودودی صاحب کی غلطی

مودودی کی مذکورہ عبارت پر حضرت نے ایک اعتراض بہت عمدہ کیا ہے جسے ہم قطعاً درست سمجھتے ہیں۔ یہ کہ ''بسا اوقات'' کا لفظ درست نہیں ہے۔ بے شک مودودی صاحب کے قلم سے لغزش ہوئی ہے کہ بجائے بسا اوقات کے ''بعض اوقات'' یا ''کبھی کبھی'' کہنا چاہیئے تھا۔ اگرچہ ''بسا اوقات'' کے معنیٰ اکثریت کے نہیں ہوتے؛ بلکہ ''بارہا'' کے ہوتے ہیں تاہم ایک طرح کی کثرت تو اس سے متبادر ہے ہی۔

کتاب العلم کا قضیہ

آگے ایک علمی اعتراض ہے جس کی تفصیل خود مصنف کی زبانی سنئے۔

''بعض مودودیانِ کرام نے اس عبارت (تفہیمات) کا امام ابن عبد البر کی کتاب العلم کا حوالہ ذکر کیا ہے۔ مگر کتاب العلم میں ان اُمور کی کوئی سند نہیں ہے جبکہ ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ سے متقدم لوگوں کا قول بلا سند مقبول نہیں ہوتا، تو ان کا قول کس طرح مقبول ہو سکتا ہے۔ خصوصاً جبکہ ابن عبد البر اور زمانہ صحابہ میں کئی صدیوں کا فرق

ہے اور کسی صحابیؓ اور تابعیؒ سے ان کی لقاء کی نوبت نہیں آئی ہے۔ وہ ۳۶۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۴۶۳ھ میں وفات پائی۔ نیز ان کی کتاب العلم اتنی مشہور و معروف نہیں ہے جتنی کہ کتاب الاستیعاب ہے۔ ہم نے استیعاب سے متعدد عبارتیں نقل کر دی ہیں جو کہ سراسر اس عبارت کتاب العلم کے خلاف ہیں۔ اس لیے یہ عبارت کتاب العلم یا تو ابن عبدالبر کی ہی نہیں ہے؛ بلکہ کسی خارجی یا شیعی یا مبتدع کی داخل کی ہوئی عبارت ہے یا وہ ایسے معنیٰ پر محمول ہے جس سے صحابہ کرام کی عدالت پر کوئی دھبہ نہیں پڑ سکتا.....''۔

علمی جرح و تنقید میں بھلا ہماری کیا حیثیت کہ بیچ میں بولیں۔ بے شک حضرت نے بجا فرمایا کہ مودودی کو تفہیمات میں اس کا حوالہ ضرور دینا چاہیے تھا۔ اب جو بعض مودودیوں نے کتاب العلم کا حوالہ ظاہر کیا تو اس حوالہ کی کمزوری حضرت نے ظاہر فرما دی۔

بات ختم ہوگئی تھی اگر حضرت نے قطعی فیصلہ فرمایا ہوتا؛ لیکن صفحہ ۷۴ کے یہ الفاظ:

''اوّلاً تو ایسی بے سروپا باتیں جو کہ شاذ و نادر اِکاّ دُکاّ ہوئی ہیں ذکر کرنی ہی نہیں چاہئیں تھیں''۔

بتاتے ہیں کہ مودودی کے بیان کردہ احوال کو حضرت بھی سرتاپا بے بنیاد اور کلیۃً خلافِ واقعہ نہیں سمجھتے؛ بلکہ اعتراض یہ ہے کہ بسا اوقات کیوں کہا گیا جبکہ بہت ہی کم ایسے احوال پیش آتے ہیں، بسا اوقات کی غلطی ہم مان چکے؛ لیکن حیرت اس پر ہے کہ اِس طرح کے اِکاّ دُکاّ واقعات کو تسلیم کرتے ہوئے بھی حضرت نے انھیں ''بے سروپا'' جیسے تحقیر انگیز لفظ سے یاد کیا۔ اُردو میں ''بے سروپا'' حد درجہ لغو و مہمل بات کو کہتے ہیں۔ اگر مودودی کے بیان کردہ احوال میں سے کسی ایک صحابیؓ کا واقعہ بھی صحیح ہے جیسا کہ خود حضرت نے تسلیم فرمایا تو کیا کسی صحابیؓ کے قول و عمل پر ''بے سروپا'' کا اطلاق مناسب و موزوں ہے۔ مودودی نے محض بشری کمزوریوں کی مثالیں دی ہیں اور صحابہ یا کسی ایک بھی صحابی کے بارے میں یہ نہیں کہا کہ اس نے ''بے سروپا'' قول یا عمل کا ارتکاب کیا۔ بشری کمزوری کو آپ بھی صحابہؓ کے حق میں ناممکن نہیں مانتے اور رسول تک سے اجتہادی خطا کے قائل ہیں، تب آخر یہ بات کیسے درست ہو سکتی ہے کہ صرف بشری کمزوریوں کا ذکر کر کے مودودی نے نعوذ باللہ صحابہؓ کو گناہگار اور غلط کار ٹھیرا دیا۔ کتاب العلم میں یہ باتیں خواہ کسی خارجی نے داخل کی ہوں یا شیعی نے؛ لیکن یہ اپنی جگہ پر اُن عبارتوں کی مخالفت نہیں ہیں، جو آنجناب نے ''استیعاب'' سے صحابہ کے فضائل و مناقب اور حقانیت و تقدس کے لیے بیان کی ہیں۔ نہ ابن عبدالبر یہ مانتے ہیں کہ محض بشری کمزوریاں اور اجتہادی غلطیاں معصیت ہوتی ہیں کہ اُن سے فضیلت میں فرق آسکے نہ آپ اور تمام علمائے حق بشری کمزوریوں کو گناہ و معصیت کہتے ہیں۔ پھر اگر ابن عبدالبر صحابہؓ کے ہزار محامد و درجات بیان کرنے کے باوجود بعض ایسے تاریخی واقعات بھی بیان کر دیں جن سے صحابہؓ کی معصوم انسانی کمزوریوں کی نشاندہی ہو تو کیا تناقض اور استحالہ ہے۔ کم سے کم درایتاً تو اس میں کوئی خرابی نہیں۔

ہاں! روایتاً یہ عبارات قابل اعتماد نہ ہوں تو دوسری بات ہے۔ لیکن انھیں فتنہ پردازوں کی داخل کردہ مان کر بھی مودودی کو عاصی اور مُذنب ٹھیرانا محل نظر ہے؛ کیونکہ ایسی بے شمار حدیثیں ہیں جن کے تمام راوی ثقہ ہیں، صرف ایک راوی غیر ثقہ یا کاذب یا مجہول الحال داخل ہوجانے کے باعث انھیں ناقابل اعتماد ٹھیرادیا گیا ہے تو کیا سلسلۂ روایت کے تمام ثقہ راویوں کو اس وجہ سے گناہگار ٹھیرایا جاسکے گا۔ کہ انھوں نے کیوں ایک غیر ثقہ یا کاذب یا مجہول شخص کی روایت کو چلایا یا کم از کم اُس شخص کو تو گناہگار کہنا ہی پڑے گا جس نے بلاواسطہ مذکورہ راوی سے روایت لی ہے۔

حالانکہ کسی ایک بھی محدّث اور فقیہ نے اس کا قول نہیں کیا۔ بلکہ صرف ترکِ روایت پر اکتفا کرلیا۔ یہی بات بعینہٖ یہاں بھی ہے۔ کتاب العلم میں اگر واقعتہً کسی شریر نے اپنی طرف سے اضافہ کردیا ہے اور مولانا مودودی اس شرارت سے ناواقفیت کے باعث اس اضافہ کو ابن عبدالبر ہی کی عبارت سمجھ کر نقل کر بیٹھے ہیں تو زیادہ سے زیادہ آپ ان کی روایات کو متروک اور ناقابل حجت قرار دے دیجئے۔ یہ تو نہ کیجئے کہ ان کو افترا علی الصحابہ اور اختراع و ایجاد کا مرتکب سمجھنے لگیں۔ یہ بہرحال آپ بھی دیکھ چکے ہیں کہ مودودی کی بیان کردہ باتیں ابن عبدالبر کی کتاب میں بے اسناد ہی سہی موجود ضرور ہیں اور ابن عبدالبر کوئی ایسے شخص نہیں ہیں جنھیں اہلِ علم مفتری، مخترع اور ضال و مضل کہہ سکیں۔ ان سے خود آپ نے استشہاد فرمایا ہے اور دیگر اہلِ علم اکثر استشہاد فرماتے رہتے ہیں۔ تب ایک شخص اگر ان سے نقل کرے تو کیونکر مجرم اور افترا پرداز گردانا جاسکتا ہے۔

افسوس ابن عبدالبر کی کتاب العلم ہمارے پاس نہیں ہے۔ نہ ہمارے پاس اتنا علم ہے کہ حضرت مصنف کے مقابلہ میں روایات کی تحقیق و تنقید کرسکیں؛ لیکن عقل اور ضمیر کے تقاضے سے مجبور ہوکر یہ ضرور کہیں گے کہ حضرت مصنف کی یہ تاویل کہ زیرِ تذکرہ عبارت کتاب العلم میں کسی خارجی یا شیعی یا مبتدع کی داخل کی ہوئی کافی بحث طلب ہے!

اوّلاً یہ دیکھئے کہ اگر ایسا ہوا تو دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا تو یہ عبارت ''کتاب العلم'' کے مسودے میں اشاعت سے پہلے داخل کی گئی یا بعد میں۔ اگر پہلے داخل کی گئی تو لازماً ایسا ہوا ہوگا کہ داخل کرنے والے نے بعینہٖ ویسے ہی کاغذ پر جیسا مسودہ کا ہوگا ہو بہو ابن عبدالبر کے خط میں اس عبارت کو لکھا ہوگا اور اس کا یہ جعل اس قدر مکمل ہوگا کہ جس اللہ کے بندے نے پہلی بار کتاب العلم کو شائع کیا اسے بالکل شبہ نہ گزرا ہوگا کہ اس کتاب میں کچھ عبارت ایسی بھی ہے جس کا قلم ابن عبدالبر کا قلم نہیں اور جو کسی اور کی بڑھائی ہوئی ہے۔ ایسا کامیاب جعل دستخط میں یا چند الفاظ میں آسان ہو تو ہو؛ لیکن سیکڑوں الفاظ کی عبارت میں اتنا آسان نہیں کہ بلادلیل مان لیا جائے۔

یا عبارت کا اضافہ مسودہ کی اشاعت کے بعد ہوا ہوگا۔ اس صورت میں کیا اضافہ سے قبل کی اشاعت یا

اشاعتوں میں سے کتاب کا ایک نسخہ بھی صفحۂ ہستی کے کسی عالم کے پاس موجود نہ ہوگا جو یہ دیکھ کر شور مچاتا کہ فلاں عبارت تازہ اشاعت میں کہاں سے آئی پچھلی اشاعت میں تو موجود نہیں؟ عقل اور قیاس اسے نہیں مانتے۔ پھر یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ اگر عبارت داخل کرنے والا واقعی اتنا کامیاب جعل ساز تھا تو اس کے لیے کیا مشکل تھا کہ بطورِ سند چند ثقہ اور معتبر راویوں کے نام بھی بیان کر دیتا۔ مثلاً ابن عبدالبر ہی کے ہم عصر کسی معتبر و مستند راوی سے شروع کر کے تبع تابعی پھر تابعی پھر صحابیؓ سے روایت کا سرا ملا دیتا۔ اس میں اُس شخص کے لیے کیا مشکل تھی جو ایک مفصل عبارت کے اختراع اور وضع کا گناہِ عظیم اپنے سر لے رہا ہے اور اتنا عمدہ نقال اور جعل ساز ہے کہ اس کی تحریر اور ابن عبدالبر کی تحریر میں کچھ فرق ہی نہیں۔

دوئم یہ دیکھئے کہ اگر مان بھی لیں کہ عبارت واقعی کسی اور کی داخل کردہ ہے تو یہ بات کتنی عجیب ہے کہ تقریباً گزشتہ نو سو سالوں میں کسی بھی محدث، مجتہد، فقیہ اور نقاد نے اس اضافہ کو نہیں پکڑا نہ یہ کہا کہ کتاب العلم کی یہ عبارت جھوٹی ہے۔ ناقدین حدیث پر جن میں ابن جوزی اور ابن حجر علامہ سیوطی اور امام نووی رحمہم اللہ اجمعین جیسے باریک بیں ناقدین و محققین شامل ہیں یہ کیسا ناقابل فہم الزام ہے۔ ہمارے ناقص علم کی حد تک موضوعات کی جتنی کتابیں ہیں کسی میں بھی تو یہ نہیں ملتا کہ کتاب العلم کی مذکورہ عبارت موضوع یا مُختَرع یا جعلی ہے۔ اگر یہ ہمارے علم کی کوتاہی ہے تو لازم ہے کہ اس کے موضوع ہونے کا ثبوت کسی مشہور و مستند ناقدِ حدیث کے قول سے دیا جائے۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ اگر کسی کتاب کی بعض عبارات کے لیے حضرت مصنف کی مذکورہ تاویل بے دلیل مانی جا سکتی ہے تو کوئی بھی شخص بلا تکلف کہہ سکتا ہے کہ ترمذی یا ابن ماجہ یا ابوداؤد کی فلاں روایت کسی شریر کی داخل کردہ ہے۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہی تو کہہ سکتے ہیں کہ روایت کے تمام راوی معتبر ہیں۔ لہٰذا روایت معتبر ہے؛ لیکن وہ کہے گا کہ راوی بے شک سب معتبر؛ لیکن داخل کرنے والے نے جعل یہ کیا ہے کہ بہت سے معتبر راویوں کے نام یکجا کر کے آخر کے راوی کو اصل مصنف کتاب سے جوڑ دیا ہے اور روایت خود گھڑ کے لکھ دی ہے۔ آخر اس میں کیا استحالہ ہے کہ زید کتبِ احادیث میں سے چند معتبر راویوں کے نام ایسے لے لے جن میں کا آخر راوی ابوداؤد کا ہم عصر ہو اور ابوداؤدؒ کی طرف سے کتاب ابوداؤد میں اسی منتخبہ سلسلۂ روایت کے ساتھ اپنی گھڑی ہوئی روایت جوڑ دے؟ یا اس سے بھی آسان یہ ہے کہ ابوداؤد یا ترمذی یا ابن ماجہ کی کسی بھی روایت کے راویوں کو ان کی جگہ قائم رکھتے ہوئے محض روایت بدل ڈالے! جب اضافہ و تداخل کو بے دلیل ممکن مان لیا گیا تو کیا کچھ ممکن نہیں ہو سکتا۔

دوسری تاویل حضرت مصنف کی یہ ہے کہ:

"یا (یعنی اگر کسی کی داخل کردہ نہیں) وہ (عبارت) ایسے معنیٰ پر محمول ہے جس سے صحابہ کرام کی عدالت پر کوئی دھبہ نہیں پڑ سکتا۔"

صَدَقَ اُستاذُ المحترم ۔ بے شک بجا فرمایا۔ یہی بات سب سے عمدہ اور انسب ہے، مگر پھر مودودی صاحب پر کیا الزام رہا؟۔ انھوں نے بھی تو تفہیمات میں یہ نہیں کہہ ڈالا کہ اس عبارت سے صحابہؓ کی عدالت مشتبہ ہوگئی ہے۔ انھوں نے بھی تو کوئی ایسی تصریح نہیں کی جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ صحابہ کی توہین و تقلیل کے لیے یہ عبارت سامنے لائے ہیں۔ وہ بھی تو یہی کہتے ہیں۔ اور برملا کہتے ہیں کہ معمولی بشری کمزوریوں سے کوئی شخص غیر عادل و غیر محترم نہیں ہو جاتا۔ خود انبیاء تک کے مرتبہ و مقام کو جب ان کی چند اجتہادی خطاؤں اور بھول چوک نے شمہ برابر نقصان نہیں پہنچایا تو صحابہؓ کی معصیت سے بالاتر بشری لغزشوں سے ان کی عظمت و عدالت اور فضیلت و ثقاہت کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے؟

صفحہ ۴۷ پر حضرت مصنف نے فرمایا ہے:

''متقدمین کے عرف میں لفظِ کذب خطا کے معنیٰ میں مستعمل ہوتا ہے۔ جس کو متعدد شراحِ حدیث نے ذکر فرمایا ہے۔ کذب بہ معنیٰ دروغ گوئی جو کہ منافی عدالت ہے مستعمل نہیں ہوتا۔''

شارحین حدیث اور متقدمین کے عرف میں ظاہر ہے کہ حضرت مصنف کے مقابلہ میں ہم جیسا جاہل و ذلیل کیا کہہ سکتا ہے؛ لیکن اتنا عرض کرنا ناگزیر ہے کہ اُس قرآن میں جو زمانہ نزول کے عربی محاورات اور عرف کے مطابق ہی نازل ہوا ہے کذب کا لفظ اسم اور فعل کی مشترکہ شکلوں میں سوا سو سے زائد جگہ آیا ہے۔ تمام آیات اور ان کے ترجمے یہاں نقل کرنا ظاہر ہے کہ سخت دشوار ہے۔ اہلِ علم خود ہی قرآن دیکھ کر یہ فیصلہ کریں کہ اتنے بہت سے مقامات میں سے کتنے مقامات ایسے ہیں جن میں دروغ مطابق عدالت کی توجیہہ ممکن ہوسکتی ہے۔ اگر سیاق و سباق سے بعض جگہ یہ ثابت بھی ہو جائے کہ ''کذب'' کے معنیٰ ''خطا'' کے لیے گئے ہیں۔ ایسی خطا جو ''منافی عدالت'' نہ ہو تو اکثر جگہ ثابت ہوتا ہے کہ کذب کے معنیٰ بالیقین جھوٹ منافی عدالت اور دروغ بینی پر معصیت کے لیے گئے ہیں۔ ایسی صورت میں عُرفِ عام کیا وہی ثابت ہوتا ہے جس کا دعویٰ کیا گیا؟

پھر اُن حدیثوں کے بارے میں کیا کہا جائے گا جن میں کذب کی بُرائی اور قباحت بیان کی گئی ہے؟ خود آنحضور علیہ التحیۃ والسلام کا یہ ارشاد کہ: ''ليس الكذب الّذي يصلح بين النّاس أو كما قال النبي ﷺ'' (وہ کذب نہیں ہے جو لوگوں کی اصلاح کے لیے بولا جائے) بتاتا ہے کہ دَورِ مبارک میں کذب بُرے ہی معنیٰ میں مستعمل تھا۔ آخر جب زید یوں کہے کہ:

''غریبوں کی خاطر سنگدل سرمایہ داروں سے کسی بھی طرح روپیہ اَینٹھ لینا دھوکہ بازی اور ظلم نہیں ہے۔''

تو کیا اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ دھوکہ بازی اور ظلم خود زید کے نزدیک بھی معیوب و مذموم ہیں؟ جبھی تو وہ سرمایہ داروں سے روپیہ اَینٹھ لینے کو دھوکہ بازی اور ظلم کا نام دینا پسند نہیں کرتا۔ اگر یہ دونوں چیزیں معیوب نہ

ہوتیں تو زید کو کیا پڑی تھی کہ اپنے نظریہ وخیال کو ان سے بری اور بالاتر اور مستثنیٰ ثابت کرتا۔ حضور ﷺ کے دَورِ مبارک میں اگر کذب کے مذموم اور معیوب معنیٰ مستعمل نہیں تھے تو اصلاح بین الناس کی خاطر بولے جانے والے خلافِ واقعہ قول کو کذب سے بَری اور جُدگانہ بتانے کی کیا مصلحت تھی؟

حقیقت یہ ہے کہ کذب تو ہمیشہ جھوٹ ہی کے معنیٰ میں بولا گیا ہے۔ اور صحابہؓ کے حق میں کذب کو معصیت اور منافیٔ عدالت نہ ٹھیرانے کی دلیل یہ نہیں ہے کہ کذب کے الگ الگ معنیٰ ہیں؛ بلکہ یہ ہے کہ ان کی نیتیں پاک، ارادے مقدس اور قلوب مصفّٰی تھے۔ ان سے جو بھی اجتہادی خطا یا بھول یا غلطی کسی معاملہ میں ہوئی وہ بہ تقاضائے بشریت اور بہ تقاضائے عدمِ عصمت تھی نہ کہ بر بنائے فتنہ وشر۔ وہ جان بوجھ کر کبھی غلط نہ کہتے تھے۔ ارادہ کرکے کبھی خلافِ واقعہ بیان نہ دیتے تھے۔

پھر یہ بتائیے کہ جب اُردو فارسی کے پاس کذب کے ترجمے کے لیے جھوٹ اور دروغ کے سوا کوئی مفرد لفظ ہی نہیں تو مودودی کذب کا ترجمہ اور کیا کرتے۔ ترجمہ کرنے میں انھوں نے لغت اور اصطلاح کسی کی تحریف نہیں کی؛ بلکہ اسی بات کو ثابت کرنے کے لیے جو حضرت مصنف نے فرمائی ہے کہ صحابہؓ کی اجتہادی غلطیاں یا معمولی بھول چوک معصیت نہیں ہیں۔ روایات بیان کرنے سے پہلے ہی کہہ دیا کہ ہم جو کچھ بیان کرنے والے ہیں اس کا تعلّق گناہ ومعصیت سے نہیں ہے۔ ''بشری کمزوریوں'' سے ہے۔ گناہ اور معصیت کے لیے زبان وعُرف میں ''بشری کمزوری'' کبھی بولا ہی نہیں گیا؛ اس لیے آگے کی روایات میں بیان ہونے والی باتوں کو پڑھنے والے کا ذہن معصیت تصور کر ہی نہیں سکتا۔ بشرطیکہ وہ بدگمانی اور نفرت کا شکار نہ ہو۔

ایک اور پہلو یہ ہے کہ جو روایات مودودی نے بیان کی ہیں ان میں یہ ہرگز نہیں کہا گیا کہ فلاں صحابی نے جھوٹ بولا تھا اور فلاں کا دروغ ثابت ہے؛ بلکہ کہا یہ گیا ہے کہ فلاں صحابی نے فلاں صحابی کو جھوٹا کہا۔ ایک صحابی کا دوسرے صحابی کو جھوٹا کہہ دینا بالکل الگ بات ہے اور کسی غیر صحابی کا کسی صحابی کو جھوٹا ثابت کرنا بالکل الگ۔ مودودی نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ حضرت علیؓ نے جو مغیرہ بن شعبہؓ کو جھوٹا قرار دیا تو واقعی مغیرہؓ جھوٹے تھے۔ یا حضرت عبادہؓ کا الزام مسعود بن اوسؓ پر سچا تھا۔ وہ تو صرف نفسِ قول اور طرزِ قول کا ذکر کر رہے ہیں۔

معیارِ حق

بات کافی طویل ہوگئی۔ پھر بھی اُس اعتراض پر ایک نظر ڈالنی ضروری ہے۔ جو ''رسولِ خدا'' کے الفاظ پر کیا گیا ہے۔ اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ:

''رسولِ خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے۔''

سے ثابت ہوتا ہے کہ دستور ساز سوائے محمد عربی ﷺ کے کسی نبی کو معیارِ حق نہیں مانتے۔ گویا اُن سب کی نبوت کے منکر ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ.

جب انسان کسی سے متنفر اور بدگمان ہوجاتا ہے تو اس کی فکرونظر کے زاویے کتنے عجیب ہوجاتے ہیں۔ حضرت محترم نے کئی دلیلوں سے یہ ثابت فرمایا ہے کہ ''رسولِ خدا'' کا مطلب یہاں حضرت رسول اللہ ﷺ ہی ہیں۔ بے شک درست ثابت فرمایا؛ لیکن کیا کوئی شخص اطمینانِ قلب کے ساتھ یہ مان سکتا ہے کہ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ جیسی دسیوں آیات والی کتاب پر نہ صرف ایمان رکھنے والا بلکہ اس کتاب کے لائے ہوئے پیغام کو نافذ و جاری کرنے کی جدوجہد میں عمر صَرف کردینے والا انسان خواب میں بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ محمد عربی کے سوا ہر نبی کی نبوت و رسالت کا منکر ہے۔ اور کتاب اللہ نے جو ہر نبی کے برحق اور واجب الایمان ہونے کا بار بار اعلان کیا ہے اسے غلط تصور کرتا ہے۔

ہم ایک دو نہیں دس بیس عبارتیں دستور سازوں کی تحریروں سے ایسی پیش کرسکتے ہیں کہ جن میں ہر نبی پر ایمان رکھنے کا بداہۃً اور التزاماً ذکر ہے؛ لیکن ہمیں لغو نظر آتی ہے یہ بات کہ جو امر عقلاً و نقلاً ممکن ہی نہ ہو اس کے ابطال میں عبارتوں کے انبار لگائے جائیں صرف ایک دو عبارتیں بطور ''مشتے نمونہ از خروارے'' پیش خدمت ہے۔

''اسلامی تہذیب اور اس کے اُصول و مبادی'' میں ''اسلام کے ایمانیات'' کے ضمن میں مولانا مودودی لکھتے ہیں:

''قرآن کا ناطق فیصلہ یہ ہے کہ جتنے اُمور اس نے ایمانیات کے طور پر پیش کیے ہیں ان سب کو ماننا ضروری ہے۔ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ سب مل کر ایک ناقابل تجزیہ کُل بناتے ہیں جس کو من حیث المجموع تسلیم کرنا چاہیے۔ اگر ان میں سے ایک کا بھی انکار کیا گیا تو وہ باقی سب کے اقرار کو باطل کردے گا۔'' (ص/۱۸۸)

اس کے بعد ایمانیات کے تعیّن کے لیے وہ مختلف آیاتِ قرآنیہ نقل کرکے جن میں اللہ نے واجب الایمان چیزوں کا بیان کیا ہے اور جن میں ایمان بالرسل بھی شامل ہے۔ لکھتے ہیں:

''ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ اسلام کے ایمانیات پانچ ہیں: (۱) خدا (۲) ملائکہ (۳) کتب الٰہی جن میں قرآن بھی شامل ہے (۴) انبیاء جن میں رسولِ عربی محمد ﷺ بھی شامل ہیں (۵) یومِ آخر یعنی قیامت۔'' (ص/۱۲۱)

کیا اس تحریر کے رقم کنندہ کے بارے میں اس بدگمانی کا کوئی شائبہ باقی رہ جاتا ہے کہ وہ خاتم الانبیاء کے سوا کسی نبی پر ایمان نہیں رکھتا؟ سوائے محمد عربی ﷺ کے سب نبیوں کا منکر ہے؟

آگے ص ۱۸۰ پر مزید وضاحت ملاحظہ فرمائیے۔ رقم طراز ہیں:

''قرآن مجید کہتا ہے کہ تمام انبیاء ایک ہی گروہ ہیں، سب کی تعلیم ایک ہے۔ سب کا دین ایک ہے۔ سب ایک صراطِ مستقیم کی طرف بلانے والے ہیں اور مومن کے لیے سب پر ایمان لانا

ضروری ہے جو شخص انبیاء میں سے کسی ایک کی بھی تکذیب کرے گا وہ گویا تمام انبیاء کی تکذیب کا مُجرم ہوگا اور اس کے دل میں ایمان باقی نہ رہے گا۔"

فرمائیے! کیا ان سطور کے راقم پر جملہ انبیاء کی تکذیب کا الزام لگانا سورج پر تاریکی کے الزام سے کچھ کم ہے؟ اس طرح کی کتنی ہی صریح شہادتیں ہم پیش کر سکتے ہیں؛ لیکن اس کا فائدہ اسی وقت ہے جب واقعی افہام وتفہیم اور رفع شک مقصود ہو۔ مجموعی طور طریق سے ہم یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ مقصود یہ نہیں ہے؛ بلکہ اپنے قیاسات اور بدگمانیوں کو سو فیصدی درست مان کر الزام کو درست ثابت کرنا اور دستورِ جماعت کو مردود و مذموم ٹھیرانا ہے۔ اس لیے فی الوقت اس طرح کے مزید اقتباسات پیش کر کے ہم بات کو طول نہیں دیتے۔ پھر بھی ایک نکتہ انتہائی ادب کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ جس پر ہمارے جملہ ناظرین اور حضرت مصنف قبلہ کو توجہ فرمانی چاہیئے۔

دیکھئے دستور کے الفاظ ہیں:

"رسولِ خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے"

"بنانا" اور "ماننا" دو ایسے جداگانہ الفاظ ہیں جن کے فرق کو ہر اُردو داں جانتا ہے۔ "بنانا" عمل وحرکت سے متعلق ہے اور "ماننا" عقیدہ وایمان سے۔ کیا یہ حقیقت محتاجِ بیان ہے کہ "عمل" اور "عقیدہ" دو الگ چیزیں ہیں۔ عمل نام ہے اعضاء کی حرکت وجنبش کا اور "عقیدہ" نام ہے ذہن وقلب کے اعتراف اور اقرار وتسلیم کا۔

دستور سازوں کے پیش نظر اگر رسولوں کے بارے میں کسی عقیدے کا ذکر ہوتا تو وہ "نہ بنائے" کی جگہ یقیناً "نہ مانے" کہتے۔ یعنی:

"رسولِ خدا کے سوا کسی کو معیارِ حق نہ مانے!"

لیکن "نہ بنائے" کے الفاظ صاف صاف بتا رہے ہیں کہ دستور سازوں کا مقصد محض کسی عقیدے اور ذہنی اقرار کا بیان نہیں؛ بلکہ عملی سلسلہ کی ایک بات بیان کرنی مقصود ہے۔ عقیدے کا جہاں تک تعلق ہے تو دستور ساز اور تمام ہی مسلمان خوب جانتے ہیں کہ قرآن کے ماننے والوں سے یہ کہنا کہ "تمام انبیاء پر ایمان رکھنا ضروری ہے"۔ محض ایک مذاق اور تحصیل حاصل کے سوا کچھ نہیں۔ یہ عقیدہ تو قرآن میں اتنی جگہ بہ صراحت بیان ہوا ہے کہ اس سے انکار وانحراف کا کوئی امکان ہی مسلمان کے لیے نہیں ہے خود آنحضور ﷺ کو معیارِ حق ماننے نہ ماننے کا سوال بھی دستور سازوں کے سامنے اِس عبارت کے لکھتے وقت نہیں تھا؛ کیونکہ آنحضور ﷺ کو معیارِ حق ماننا تو اسلام کی ایسی مسلّمہ اٹل اور ناقابل اختلاف حقیقت ہے کہ خصوصیت سے اس کا تذکرہ کرنا ہی بالکل ایسا ہے جیسے کوئی شخص سورج کے روشن ہونے کو خصوصیت سے ذکر کرے۔ آخر دستور سازوں کو کیا پڑی تھی کہ سو فیصدی متفق علیہ حقیقتِ ثابتہ کو دستور میں بطورِ شرط وقید بیان کرتے۔

ان کا مقصد اور واحد مقصد اس عبارت سے عامۃ المسلمین کی اس عملی خامی کا تذکرہ تھا جسے ہر آنکھ والا خوب دیکھ رہا ہے۔ یعنی مسلمان مانتے تو سب ہیں کہ قرآن وسنّت خدا اور رسول ہی معیارِ حق واجب التعمیل، ہادی و مرشد اور حرفِ آخر ہیں؛ لیکن عملاً خدا اور رسول کو معیارِ حق بنانے والے آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ عمل تو یہ ہے کہ قرآن وسنت کی زبانی تعریف وثنا اور اعترافِ ایمان کے باوجود قرآن وسنّت کے اہم ترین احکامات اور لازم ترین عبادات تک کو نظرانداز کیے ہوئے ہیں اور گناہ وفسق کی لہروں پر بہہ رہے ہیں۔ دستور سازوں نے اسی موجودہ صورتِ حال کے پیش نظر یہ کہا کہ اقامتِ دین اور اعلائے کلمۃ الحق کی جو عملی تحریک ہم لے کر اُٹھے ہیں اس میں ہمارے ساتھ شرکت کرنے کے لیے صرف اتنا کافی نہیں کہ عقیدے اور خیال کی حد تک خدا اور رسول کو مقدس اور واجب الاطاعت مانا جائے اور محض زبانی جمع خرچ اور کھوکلے اعتراف کے ساتھ خدا اور رسول کے قصیدے پڑھے جائیں؛ بلکہ عمل سے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ آپ اپنی زندگی کے احوال و واقعات میں اللہ کے آخری رسول کو معیارِ حق اور حرفِ آخر بناتے ہیں! آپ کو عمل سے یہ بتانا ہوگا کہ رسول اللہ کے احکام آپ کے اعمال کا مبنیٰ اور مدار ہیں۔ آپ کی زندگی میں جب کسی موقع پر آپ کی خواہش نفس اور رسول اللہ کے حکم میں ٹکر ہو رہی ہوگی اس وقت آپ کو عمل سے یہ بتانا ہوگا کہ آپ کا معیار خواہش نفس نہیں حکمِ رسول اللہ ہے۔ یہ نہیں کہ آپ معیارِ حق مانیں تو رسول اللہ ﷺ کو اور بنائیں نفس کو! عقیدہ تو حقانیتِ رسول کا رکھیں اور عمل کریں خلافِ رسول!

جہاں تک عقیدے یعنی ''ماننے'' کا تعلّق ہے بے شک ہر نبی اور رسول اپنے اپنے زمانے میں معیارِ حق تھا اور اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں کیا آج بھی کوئی مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا موسیٰ علیہ السلام یا کسی اور نبی کو معیارِ حق بنا سکتا ہے؟ اگر بنا سکتا ہے تو ایک عیسائی اور یہودی سے مسلمان کا کیا امتیاز ہے؟ آخر عیسائی بھی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کو معیارِ حق بنائے ہوئے ہیں۔ آخر یہودی بھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کو آج کا معیارِ حق مانتے ہیں۔ آپ کہیں گے عیسیٰ اور موسیٰ علیہما السلام اور دیگر انبیاءِ سابق کی تعلیمات کو مسخ کر دیا گیا اور دین اسلام کو تمام سابقہ شریعتوں کا ناسخ قرار دیا گیا۔ لہٰذا آج سوائے اسلام کے کوئی چارہ نہیں۔ تب ہم کہیں گے کہ یہی بات تو دستور میں کہی گئی ہے۔ آخر جب پہلے کسی نبی کی تعلیمات اپنی صحیح حالت میں جوں کی توں موجود ہی نہیں ہیں تو ان انبیاء پر ایمانِ اجمالی کے سوا یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کی تعلیمات کو آج کی دنیا میں حق و باطل کی کسوٹی اور قول وعمل کی ترازو مانا جا سکے۔ اور اگر ممکن ہو تو آپ خود ایسا کرنے والوں کو دائرۂ اسلام سے خارج کر کے نصرانی اور یہودی ٹھہرا دیتے ہیں۔

غور کیجیے! انجیل وتورات وغیرہ کے بارے میں آپ اس کے سوا کیا کہتے ہیں کہ ان کی جو تعلیمات قرآن و سنت کے مطابق ہیں وہ بسر وچشم تسلیم؛ لیکن جو مخالف اور متضاد ہیں وہ متروک ومردود؛ کیونکہ وہ اصل میں اِن

کتابوں کی تعلیمات نہیں ہیں؛ بلکہ یہود و نصاریٰ نے انھیں تصنیف کیا ہے۔اس کا کُھلا مطلب یہ ہے کہ انبیاء سابق کی تعلیمات کے لیے بھی آپ قرآن وسنّت ہی کو کسوٹی مان رہے ہیں اور اُسوۂ محمدیؐ ہی آپ کے نزدیک آج قابل پیروی ہے،تب دستور سازوں نے آخر اس کے سوا اور کیا بات کہہ دی ہے،سب جانتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی کُل کے کُل اسلام کی عملی پیروی اور نفاذ و اجرا کی علم بردار ہے،عملی خطوط پر چلنے والوں کے لیے ایسے تمام عقائد جن کا تعلق محض ماننے سے ہو،آج کی عملی زندگی سے نہ ہو صرف اتنے ہی التفات کے لائق ہوتے ہیں جتنا مجرد اعتقاد کے لیے ضروری ہے۔مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کا عقیدہ۔ان کے آسمان پر اُٹھالیے جانے کا عقیدہ،ظہورِ مہدی کا عقیدہ،انبیاء سابق کے برحق ہونے کا عقیدہ وغیرہم۔ایسے عقائد کی اہمیت اُن عقائد کے مقابلہ میں جن کا تعلّق آج کی عملی زندگی سے ہو یقیناً ثانوی ہوتی ہے۔اور جس وقت ایک ایسا دستور بنایا جارہا ہو جس کی روشنی میں آج کی عملی زندگی کو آگے بڑھانا ہے تو عملی زندگی سے غیر متعلق اور غیر مؤثر اعتقادات کے ذکر و بیان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔چنانچہ دستور میں کسی کو معیارِ حق ماننے نہ ماننے سے بحث نہیں کی گئی۔بلکہ اس کا فیصلہ کیا گیا کہ آج کی دنیا میں اقامتِ دین اور احیائے کلمۃ الحق اور اقتدارِ اسلام کی جدو جہد کرنے کے سلسلہ میں وہ کونسی ہستی ہے جسے معیار اور کسوٹی اور حَکَم اور مرکز و مبنیٰ اور مرجع بنانا چاہیے۔ہم کہتے ہیں کیا اس کے سوا بھی کوئی بات احکام الٰہیہ سے اقرب ہے؟ کیا ہر صحابی اور امام اور محدّث اور ولی وقطب کا یہی فیصلہ اور مسلک اور ایمان نہیں ہے۔کیا کوئی مسلمان یہ مان کر مسلمان رہ سکتا ہے کہ آج بھی انجیل و تورات معیارِ حق اور مشعل ہدایت ہیں۔آج بھی جس کا جی چاہے محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سوا کسی اور نبی کو معیارِ حق بنا کر اس کی کتاب کا پیرو اور مطیع ہو جائے؟

بات کافی واضح ہو چکی۔پھر بھی ناظرین اور ایک بار دیکھ لیں کہ ماننے اور بنانے میں کتنا عظیم فرق ہے۔قرآن کو ہر مسلمان معیارِ حق اور واجب التعمیل اور مشعل عین و دنیا مانتا ہے۔لیکن کتنے مسلمان ہیں جو عملاً اسے معیارِ حق اور عمل کی کسوٹی بنائے ہوئے ہیں؟ ماننے والے کروڑوں اور بنانے والے مشکل سے ہزاروں۔اگر ماننا اور بنانا ایک بات ہوتی تو پھر سبھی ولی اور قطب تھے! مجبوراً کہنا پڑے گا کہ ماننا صرف عقیدے کا نام ہے اور بنانا عمل کا۔آپ بے شک مانیں گے تو یہی کہ انبیاء گزشتہ کا بیت المقدس کی طرف منہ کر کے عبادت کرنا اور کرانا یقیناً حق اور درست تھا؛ لیکن کیا ان انبیاء کو معیارِ حق بناتے ہوئے آج بھی بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لیں گے؟ نبی برحق حضرت آدم علیہ السلام کے دَور میں بھائی بہن اور خالہ بھتیجے اور ماموں بھانجی کا نکاح جائز رہا، کیا آج بھی آپ اس جواز کو حق سمجھتے ہوئے اس کی اجازت دیں گے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں سود حرام نہیں ہوا۔کیا آج بھی آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معیارِ حق بناتے ہوئے سود جائز کہیں گے؟ وقِس علیٰ ھٰذا۔ اور تو اور بیت المقدس کی طرف مُنہ کر کے خود آپ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مہینوں نماز پڑھی ہے؛ لیکن اسے بھی آپ آج

معیارِ حق نہیں بنا سکتے، آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ چونکہ مہینوں ہمارے حضور ﷺ نے بیت المقدس کو قبلہ بنایا، لہٰذا ہم بھی کبھی کبھار اسے قبلہ بنا سکتے ہیں۔ ہاں اسے معیارِ حق ماننا ضروری ہوگا۔ یعنی آپ کو یہ عقیدہ رکھنا لازم ہوگا کہ آں حضرت ﷺ نے جب تک بیت المقدس کو قبلہ ماناا سی کا قبلہ ہونا برحق تھا۔ اور جب حکمِ الٰہی سے بیت اللہ کی طرف مُڑ گئے تو بیت اللہ ہی قبلہ ہے۔ اور اب کوئی شخص بیت اللہ کے سوا کسی گھر کو قبلہ اور سمتِ قبلہ بنا کر مسلمان نہیں رہ سکتا!

دستوری پہلو

کیسے ہی منطقی نقطۂ نظر سے آپ دیکھیں دستور کی عبارت قابلِ رد نہیں ہے۔ دیکھئے دستور کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ اس کا ہر لفظ جانچ تول کر رکھا جاتا ہے۔ اور مرادف الفاظ میں سے بھی وہ لفظ چھانٹ کر رکھا جاتا ہے جو قانون کے مقصد کو زیادہ عمدگی سے پورا کر سکے اور خلافِ مقصد مفہومات کی روک تھام کرے۔ دوسرے لفظوں میں ''جامع مانع'' ہو۔ جماعتِ اسلامی کے دستور میں ''رسولِ خدا'' کی جگہ محمد عربیؐ، سرورِ کونین، صاحبِ قرآن، ابن عبداللہ، شافع محشر، شہنشاہِ اسلام اور اس طرح کے سیکڑوں الفاظ میں سے کوئی سا بھی لفظ لایا جا سکتا تھا؛ لیکن خاص طور پر ''رسولِ خدا'' کا لفظ بتا رہا ہے کہ دستور سازوں کے پیشِ نظر محمد عربی ﷺ کی وہ خاص حیثیت ہے جو منصبِ رسالت سے متعلق ہے۔ حضور علیہ التحیۃ والسلام ایک رسول بھی تھے، ایک انسان بھی، ایک باپ بھی، ایک شوہر بھی، ایک سپہ سالار بھی، ایک جج بھی۔ ان سب حیثیات کا فرق ہر صاحبِ عقل و ہوش جانتا ہے۔ اگر رسالت اور بشریت کی امتیازی حدوں کو نہ سمجھا جائے تو آیت: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى کی توجیہہ ہو ہی نہیں سکتی۔ عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی کا فاعل وہ محمدؐ نہیں ہے جو رسول تھا وہ محمدؐ ہے جو بشر تھا۔ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ کا مخاطب وہ محمدؐ نہیں تھا جس کے فیصلے من حیث الرسول مبنی بر خطا ہو ہی نہیں سکتے؛ بلکہ وہ محمدؐ تھا جس کا ذکر ''اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ'' میں ہے۔ وہ محمد تھا جو رسالت سے غیر متعلقہ اُمور میں اجتہادی خطا بھی کر سکتا ہے۔ یہ حقیقت دو راویوں کی گنجائش نہیں رکھتی کہ انسان کی ہر حیثیت اپنی اپنی جگہ جداگانہ تقاضے اور التزامات رکھتی ہے۔ دستور سازوں نے معیارِ حق بنانے کے لیے محمد عربی کی صرف حیثیتِ رسول کو پیشِ نظر رکھا جیسا کہ خود قرآن اطاعتِ محمد کے باب میں ہر جگہ ''اَطِيعُوا الرَّسُوْلَ'' ہی کہتا ہے ''اَطِيْعُو الْمُحَمَّدَ الْبَشَرَ'' نہیں کہتا اور حضرت محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام خود فرماتے ہیں کہ: ''وَاَنْتُمْ اَعْلَمُ فِيْٓ اُمُوْرِ دُنْيَاكُمْ'' (اپنے دنیاوی معاملات میں تم خود بہتر سمجھ سکتے ہو) او کما قال۔

ایک حیثیت محمدؐ کی وہ تھی جس کے بارے میں قرآن کا واضح فیصلہ ہے:

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾ (النساء، رکوع:۸، پارہ:۵)

وَ مَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَی اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ (الاحزاب، رکوع:۴، پارہ:۲۲)

''قسم ہے تیرے رب کی وہ مؤمن نہ ہوں گے جب تک کہ اپنے جھگڑوں میں تجھی کو منصف نہ ٹھیرائیں اور تیرے فیصلہ سے ان کے دل کو ناگواری اور تکدّر بھی نہ ہو اور خوشی سے قبول کریں۔''

''اور کسی مؤمن یا مؤمنہ کو اپنے بارے میں کچھ اختیار باقی نہیں رہ جاتا، جب اللہ اور اُس کا رسول فیصلہ کر دیں۔''

اور ایک حیثیت وہ تھی جسے خود زبانِ وحی ترجمان کے یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں:

ان کان ینفعکم ذالك فلیصنعوه فإني إنما ظننتُ ظناً فلاتواخذوني بالظن ولٰکن حدثتکم عن اللّٰه شیئًا فخذوا به.

''اگر یہ کام لوگوں کے لیے نفع بخش ہے تو چاہئے کہ وہ اسے کریں۔ میں نے تو ظن کی بناء پر ایک بات کہی تھی تم ظن پر مجھ سے مواخذہ مت کرو۔ ہاں جب میں اللہ کی طرف سے کچھ کہوں تو اسے ضرور لے لو۔''

اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ دستورسازوں کی نظر میں بجاطور پر ''رسالت'' ہی وہ صفت ہے جو کسی انسان کو معیارِ حق اور حرفِ آخر اور مطاعِ مطلق بنا سکتی ہے۔ پس لازماً یہ بات معلوم ہوئی کہ جہاں کہیں یہ صفت پائی جائے گی معیاریتِ حق آپ سے آپ پائی جائے گی۔ مودودی صاحب کے اپنے محولہ بالا بیان میں یہی بات مجملاً کہی گئی ہے اور بلا ریب و شک یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ دستورسازوں کی نظروں میں ہر صاحبِ رسالت اپنے اپنے دَور میں معیارِ حق اور حرفِ آخر اور مطاعِ مطلق تھا۔ اور سابقہ رسولوں کو عملاً معیارِ حق بنانے کا واحد طریقہ آج یہی ہے کہ خاتم النبیین ﷺ کو معیارِ حق بنایا جائے؛ کیونکہ سابقہ انبیاء کی جو واقعی تعلیمات تھیں وہ خاتم النبیین ﷺ کی تعلیمات کے خلاف نہیں تھیں اور جو بعض تعلیمات واقعی ہونے کے باوجود تعلیماتِ اسلام میں شامل نہیں رکھی گئیں وہ وقتی اور ہنگامی تھیں جنھیں اللہ جل شانہ نے ہر ہر زمانے کی مخصوص ضرورتوں اور مصلحتوں کے مطابق نازل کیا تھا اور نزولِ اسلام کے بعد ان کی ضرورت ختم ہوگئی۔ انبیاء سابق کی کتابوں میں کی گئی تحریفات کا سُراغ لگانے اور ان سے پرہیز کرنے کا بھی واحد طریقہ یہی ہے کہ ہر حکم کو اَبدی معیارِ حق قرآن و سنت پر پَرکھ کے دیکھ لیا جائے اور ہر اُس حکم کو محرّف سمجھا جائے جو قرآن و سنت کی آیاتِ بیّنات کے خلاف ہو یا اُصولِ دین اور روحِ شریعت کو مجروح و پامال کرنے والا ہو۔

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ.

''اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دین کو مرغوب جانے اس کا دین قبول نہیں کیا جائے گا۔''

اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسلام کے سوا تمام سابقہ ادیانِ حقہ نامقبول ٹھیرے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا موسیٰ علیہ السلام یا اور کسی نبی کے لائے ہوئے دین پر جو بھی لوگ خود اُن کے زمانوں میں ایمان لائے قابل رَد ٹھیرے! حالانکہ ایسا نہیں ہے اور آیاتِ قرآنیہ میں لازماً یہ تفصیل محذوف ماننی پڑے گی کہ تذکرہ بعثتِ محمدی کے بعد کا ہے اور حکم نزولِ قرآن سے قبل پر صادق نہیں آتا۔

فرض کیجئے۔ ایک شخص حصر کے ساتھ کہتا ہے کہ خلافتِ راشدہ ہی حکومتِ حقہ کا معیار اور امارتِ محمودہ کا مثالی نمونہ ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہو سکے گا کہ حضرت سلیمانؑ اور حضرت یوسف علیٰ نبیّنا علیہما السلام کی وہ حکومتیں جن کا ذکر قرآن نے کیا ہے، حکومتِ غیر حقہ اور امارتِ نامحمودہ تھیں۔ یا حضرت عمر ابن عبدالعزیز علیہ الرحمۃ والسلام کا مختصر دَورِ حکومت غیر محمود اور ناحق تھا۔

ایک شہنشاہ اپنے کسی مفتوحہ ملک میں گورنروں کو بھیجتا رہتا ہے۔ فرض کیجیے اس نے زید کو گورنر بنا کر بھیجا اور یہ اعلان کیا کہ زید جو احکام جاری کرے گا ان کی تعمیل رعایا کا فرض ہے۔ اور زید سے پہلے جو گورنر بھیجے گئے ان کے احکامات کے عوض اب وہ احکامات واجب التسلیم ہوں گے جو ہم ایک نئی کتابِ قانون کی شکل میں زید کے ہاتھ بھیج رہے ہیں اور اس کتاب کے ہر قانون کی وہی تعبیر و مُراد مقبول ہوگی جو زید بیان کرے گا اور خود زید کا ہر حکم اور ہر ضابطہ ہمارا ہی قانون سمجھا جائے گا۔

اِس اعلانِ عام کے بعد بکر عوام الناس سے کہتا ہے کہ بھائیو! اب زید ہی تاج کا واحد نمائندہ ہے۔ اسی کی تعمیل شہنشاہ کی تعمیل ہے۔ وہی معیارِ حق اور واجب الاتباع اور حَکم ہے۔ اس کے سوا کوئی مستند اور مستدَل نہیں۔ اسی کی تعمیل وفاداری اور نافرمانی بغاوت ہے۔ اسی کے احکام و ارشادات کو مشعل راہ بناؤ۔

کیا اس کا مطلب یہ لیا جا سکتا ہے کہ بکر زید سے پہلے کے تمام شاہی گورنروں کو غیر معتبر اور غیر معیاری اور غیر ثقہ ٹھیرا رہا ہے، ان کی توہین کر رہا ہے، ان کی عزت و عظمت میں فی نکال رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ نہیں اور ہرگز نہیں۔ یہ وسوسہ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ مذکورہ اعلانِ شاہی کے بعد زید کی عظمت و بالادستی اور معیاریت و حاکمیت کا اعتراف و حصر سابقہ شاہی گورنروں کی تقلیل و تحقیر ہے، تب دستور کی بدنصیب عبارت سے یہ تقلیل و تحقیر کیسے نکل آئے گی۔

عصمت لوازمِ ذات میں ہے یا نہیں؟

ایک اور اعتراض منطقی پہلو سے حضرت مصنف قبلہ نے کیا ہے۔ وہ یہ کہ ''مودودی صاحب عصمت کو انبیاء کے لوازمِ ذات سے نہیں مانتے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے نزدیک کوئی بھی نبی غیر معصوم اور معیارِ حق نہیں؛

کیونکہ جب عصمت لوازمِ ذات سے نہیں تو اس کا جُدا ہونا ممکن ہوگا اور جدا ہونا ممکن ہوا تو کسی بھی حکم کے بارے میں یہ فیصلہ نہ کیا جاسکے گا کہ یہ حالتِ معصومیت کا ہے یا اُس وقت کا جب عصمت اُٹھ گئی!''

ذرا تفہیمات کی وہ عبارت بھی ملاحظہ کر لیجیے جس پر اس اعتراض کی بنیاد رکھی گئی ہے مودودی صاحب کہتے ہیں:

''عصمت انبیاء کے لوازمِ ذات سے نہیں ہے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو منصبِ نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لیے مصلحتہً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے۔''

منطق سے قطع نظر کر کے غیر جانب داری کے ساتھ فیصلہ کیجیے کہ کیا اس عبارت سے کسی بھی عنوان یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا لکھنے والا انبیاء کے احکام کو مشکوک و مشتبہ بتاتے ہوئے غیر واجب التعمیل ثابت کرنا چاہتا ہے؟ یقیناً آپ کہیں گے کہ نہیں۔ پھر منطقی پہلو کو لیجیے۔ حضرت مصنف یہ کہہ رہے ہیں کہ مودودی نے عصمت کو انبیاء کے لوازمِ ذات سے نہیں مانا؛ اس لیے انبیاء کا معیارِ حق ہونا مشکوک ٹھیرا۔ ہم کہتے ہیں کہ اوّل تو مودودی کی عبارت میں ''بلکہ'' کے بعد کی عبارت خود اس شک کی قادح اور قاطع ہے، دوسرے یہ دعویٰ کہ عصمت کو لوازمِ ذات سے مانو جبھی انبیاء معیارِ حق ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ملزوم ذاتی کبھی ذات سے جُدا نہیں ہوتا محلِ نظر ہے۔ دینیات میں اس کی مثال یہ لیجیے کہ شراب اور مُردار کی حرمت کسی عارض کی وجہ سے نہیں؛ بلکہ فی حدِّ ذاتہٖ ہے۔ شراب و مُردار بحدِّ ذاتہٖ خراب اور حرام ہیں؛ لیکن اضطرار (شرعی مجبوری) کے وقت حرمت ان سے جدا ہو جاتی ہے۔ دنیاوی اُمور میں اس کی مثال یہ لیجیے کہ اولاد کی محبت والدین کے لیے قطعاً اُمورِ ذاتیہ میں سے ہے۔ اس حد تک کہ ان کے رَگ و ریشے میں سرایت کیے رہتی ہے؛ لیکن بارہا ایسا ہوتا ہے کہ والدین یا ان میں سے کوئی ایک شقاوت و بے رحمی کا ثبوت دیتے ہیں۔ کتنی ہی مثالیں مل سکتی ہیں جن میں ایک بیٹے نے اپنے باپ کو ذبح کر دیا۔ حالانکہ بیٹے کے اندر باپ کی محبت قطعاً ذاتی ہوتی ہے۔ عارضی اور الحاقی نہیں۔

اس طرح کی مثالیں بتاتی ہیں کہ عصمتِ انبیاء کو اگر صفتِ ذاتیہ بھی مان لیا جائے جب بھی منطقی ریب و شک اور امکانِ خطا کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ تب کیا حاصل اس کا کہ مودودی صفتِ ذاتیہ نہیں مانتے۔ اور ہم صفتِ ذاتیہ مانتے ہیں! ہاں حاصل جب تھا کہ جب مودودی یہ نہ کہتے کہ ''اللہ نے انبیاء کو خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرما دیا ہے۔''

ایک مثال علیٰ تقدیر المودودی لیجیے:

قرآن ایک کتابِ الٰہی ہے اس کے بارے میں ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قیامت تک اس میں لفظی تحریف اور تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ تحریف اور تبدیلی سے بالاتر ہونے کی صفت کے بارے میں غور فرمائیے کہ یہ کتابِ الٰہی کی ذاتی صفت ہے یا عرضی۔ آپ کو ماننا پڑے گا کہ یہ عرضی صفت ہے؛ کیونکہ اگر یہ ذاتی ہوتی تو بہ قاعدہ مذکورہ اسے کسی حال میں کتبِ آسمانی سے علیحدہ نہ ہونا چاہئے تھا؛ لیکن آپ کے سامنے ہے کہ قرآن کے سوا تمام کتبِ الٰہیہ میں

تحریف وتبدیلی ہوگئی۔ پس تحریف سے بالاتر ہونے کی صفت کا قرآن کے لیے عرضی ہونا ثابت ہوا تو جس صغریٰ کبریٰ سے مودودی پر اعتراض کیا گیا ہے بعینہٖ اسی صغریٰ کبریٰ سے یہاں بھی اعتراض لازم آئے گا۔

یعنی جب تحریف سے بالاتر ہونا قرآن کی صفتِ ذاتی نہیں عرضی ہوئی تو اس صفت پر ہمیشہ کیسے اعتماد ہوسکتا ہے اور یہ احتمال کیسے دُور ہوسکتا ہے کہ یہ صفتِ عارضی کسی بھی وقت جدا ہوسکتی ہے؟

کیا اس احتمال کو اسلام گوارا کرے گا؟ ظاہر ہے کہ نہیں اور کبھی نہیں۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ اس صفتِ عرضی کو اللہ جل شانہٗ نے خود سندِ دوام اور حیاتِ جاوید عطا فرمادی ہے تو آخر مودودی بھی تو یہی کہہ رہے ہیں کہ عصمت ہزار صفتِ عرضی ہو؛ لیکن:

"اللہ تعالیٰ نے ان (انبیاء) کو منصبِ نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لیے مصلحتہً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے۔"

جب اللہ ہی نے محفوظ فرمادیا تو عدمِ اعتماد اور شک کا کیا موقع رہا۔ پس اللہ ہی کے اختیار میں ہے کہ وہ جب چاہیں جس مصلحت سے چاہیں نبی سے کوئی اجتہادی غلطی کرادیں اور پھر خود ہی اعلانیہ اس غلطی کا ذکر مع اصلاح کرکے اُمت پر بطورِ امرِ واقعہ یہ واضح کردیں کہ اے نبی پر ایمان لانے والو اور اس کے بے حد و بے حساب مراتب و کمالات کا علم رکھنے والو! نہ سمجھنا کہ تمہارا نبی اللہ جل شانہٗ کی طرح خطا و لغزش سے پاک اور بشری تقاضوں سے بالاتر ہے؛ بلکہ یہ تو ہماری قدرتِ کاملہ کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے کہ جب چاہیں اس کے گمان اور اجتہاد کو غلط کرادیں۔ ہمارے حفظ و امان کے بغیر کون ہے جو لغزش سے بچ سکے۔ دوسری مثال لیجیے۔ روپیہ پیسہ، سونا چاندی زید کی ملکیت ہے۔ کیا سونا چاندی کی صفتِ مملوکیت کو آپ صفتِ ذاتی قرار دے سکتے ہیں؟ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ مِلک ہونا سونے چاندی کی سرشت اور فطرت اور خمیر میں داخل ہے؟ نہیں کہہ سکتے؛ کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ بے شمار سونا چاندی کی کانیں سینۂ ارض میں ایسی پڑی رہتی ہیں جن کا کوئی بھی مالک نہیں ہوتا۔ اور مالک کیسے ہو جبکہ ابھی اُن کا پتہ ہی نہیں چلا۔ تو ظاہر ہوا کہ مملوکیت ایک عارضی صفت ہے جو سونے چاندی پر الگ سے لاحق ہوتی ہے۔

اب زید کو دیکھئے کہ اگر وہ خود نہ چاہے تو کبھی بھی اس کے مملوکہ سونے چاندی کی مملوکیت ختم نہیں ہوسکتی۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ پچاس سال مسلسل ایک صندوق میں بند رہنے سے مملوکیت کی صفتِ عرضی خواہ مخواہ سونے چاندی سے جُدا ہوجائے۔

اسی طرح تمام مخلوق اور ملائکہ و انبیاء اللہ جل شانہ کے مملوک ہیں۔ ان کی ہر صفت اور ہر چیز پر اللہ ہی کا قبضہ ہے۔ انبیاء کی صفتِ عصمت بھی اللہ ہی کی مملوکہ و مقبوضہ ہے۔ اگر خود اللہ جل شانہٗ ہی نہ چاہیں تو خواہ یہ صفتِ عرضی ہی ہو؛ لیکن کیونکر انبیاء سے اپنے آپ جُدا ہوسکتی ہے۔

آپ کہیں گے کہ زید کے سونے چاندی کو اگر کوئی چُرا لے، چھین لے تب تو زید کی خواہش و مرضی کے بغیر بھی مملوکیت ختم ہوگئی۔ ہم کہیں گے کہ اوّل تو چوری ہو جانے یا چھن جانے سے اللہ کے نزدیک ہرگز کسی کا حق مالکانہ ختم نہیں ہو جاتا۔ نہ چور اور لُٹیرا اُس شئے کا مالک بن جاتا ہے۔ دوسرے اللہ جل شانہٗ نعوذ باللہ زید تو نہیں کہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی لُوٹ مچاسکے، ان کی چیز چُرا سکے جب یہ مان لیا گیا کہ ''اللہ نے انبیاء کو صفتِ عصمت عطا فرمائی'' تو کیا گنجائش ہے اس بات کی کہ محض اس لیے ریب وشک کیا جائے کہ عصمت صفتِ عرضی ہے ذاتی نہیں!

مثالوں کو چھوڑ یئے۔ آخر یہ کس دلیل سے ثابت کیا جائے گا کہ عصمت انبیاء کی صفتِ ذاتی ہے؟ انبیاء بالذات بشر تھے۔ یا نہیں تھے۔ انسان تھے یا نہیں تھے؟ کھانے پینے، سونے بیمار ہونے کے عوارضِ انسانیہ میں مبتلا تھے یا نہیں تھے؟ ضرور ہے کہ تھے! وہ بلاشبہ ویسے ہی گوشت پوست کے انسان تھے جیسے اور انسان ہیں۔ پھر کیا عصمت اور اکمل ترین معصومیت سب انسانوں میں پائی جاتی ہے؟ عقیدہ تو یہ ہے کہ انبیاء کے سوا کوئی معصوم نہیں۔ گویا صفتِ عصمت اربہاارب انسانوں کے لیے صفتِ ذاتی تو کیا صفتِ عرضی بھی نہیں۔ سب اس سے کورے اور صاف ہیں۔ تب یہ کیسی صفتِ ذاتی ہوئی کہ صرف گنے چُنے انسانوں میں موجود اور ہر جگہ سے غائب!

عصمت اگر ابن آدم کی صفتِ ذاتی ہو سکتی تو سب سے پہلا انسان ہی شیطان کے دھوکہ میں آ کر جنت سے نہ نکالا جاتا۔ قرآن نے خود حضرت آدم علیہ السلام کی داستانِ جُرم بیان کر کے یہ واضح کر دیا کہ بنی نوعِ آدم کے خمیر اور عین ذات میں ہی لغزش وخطا کا عنصر شامل کر دیا گیا ہے۔ ورنہ شیطان کی کیا مجال تھی کہ حضرت آدم علیہ السلام کو بہکا سکتا۔

ہمیں دھوکہ ہوتا ہے کہ شاید ہم صفتِ ذاتی وعرضی کی صحیح تعریف اپنی جہالت کے باعث نہ سمجھتے ہوئے یہ محض بکواس ہی کر رہے ہوں؛ لیکن اگر ایسا ہے تو یقین کرنا چاہئے کہ یہ تعریفِ صحیہ زیرِ بحث کتاب کے قارئین میں سے شاید اور بھی کوئی نہ سمجھ پائے۔

معصیت یا لغزش؟

صفحہ ۳۰ پر ہے:

''جن اُمور کو مودودی صاحب لغزشیں شمار کرتے ہوئے عصمت کا اُٹھ جانا سمجھتے ہیں یہ اُن کی غلطی ہے۔ یہ اُمورِ معصیت ہیں ہی نہیں صرف صورتِ معصیت ہیں۔''

یہ عبارت اِس بات کی واضح ترین مثال ہے کہ جب کسی شخص کے بارے میں خاطی وگمراہ ہونے کا یقین کرلیا جائے تو اس کی ہر بات خواہ مخواہ ہی بدزیب اور ناقص نظر آنے لگتی ہے۔ غور فرمائیے: ''یہ ان کی غلطی ہے'' کے بعد کی عبارت ثابت کرتی ہے کہ حضرت مصنف کے نزدیک مودودی صاحب نے انبیاء کی لغزشوں کو ''معصیت''

کہا ہے۔ جبھی تو اُن کی غلطی بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: ''یہ اُمور معصیت ہیں ہی نہیں، صرف صورتِ معصیت ہیں۔''

فریاد ہے کہ بدنصیب مودودی نے ''معصیت'' کا اثبات کیا ہی کہاں ہے؟ کیا ''لغزش'' کے معنیٰ دنیا میں کوئی بھی صاحبِ علم ''معصیت'' کے مان سکتا ہے۔ حضرتِ مصنف نے تو خود اُنھیں (یعنی انبیاء کے افعالِ زیرِ بحث کو) اسی صفحہ پر صورۃً معاصی کہہ بھی دیا؛ لیکن مودودی نے آج تک کبھی ان افعال کو سیرۃً اور صورۃً کسی طرح بھی ''معاصی'' نہیں کہا۔

یہ بات اہلِ ہوش سے چھپی ہوئی نہیں کہ ہر اصطلاح اپنے مفہوم و معنیٰ میں کچھ ایسے مضمرات رکھتی ہے جو اس اصطلاح کے سُنتے ہی سامع کے ذہن میں آجاتے ہیں۔ جیسے دین کی اصطلاح میں جب ''سنت'' کا لفظ بولیں گے تو یہ تشریح ضروری نہ ہوگی کہ کس کی سنت اور کیسی سنت؛ بلکہ آپ سے آپ اس کا پورا مفہوم سمجھ لیا جائے گا۔ اسی طرح جب یوں کہیں گے کہ فلاں شخص گناہگار ہے تو اس کا مطلب بلاتشریح کے سمجھ لیا جائے گا کہ یہ شخص کسی خلافِ شرع کام کا مرتکب ہوا ہے۔ اس کے برخلاف جب ہم یوں بولیں گے کہ فلاں شخص مجرم ہے تو بلاتشریح یہ سمجھ لیا جائے گا کہ اس شخص نے حکومتِ دنیاوی کا کوئی قانون توڑا ہے۔ حالانکہ جُرم اور گناہ دو ایسے لفظ ہیں جن کو بے تکلّف ایک دوسرے کی جگہ بولا جاسکتا ہے؛ لیکن اپنے پس منظر اور مصطلحہ معانی کے اعتبار سے ان میں بُعدِ عظیم ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص گناہگار ہو؛ لیکن مجرم نہ ہو۔ جیسے سود خوار، شرابی وغیرہ۔ یا ایک شخص مجرم ہو؛ مگر گناہ گار نہ ہو۔ جیسے ظالم حکومت کے خلاف کلمۂ حق کہنے والا یا خلافِ شرع قانون کو نہ ماننے والا۔ سب جانتے ہیں کہ فرض و واجب کے الفاظ احکامِ شرعیہ کے لیے بولے جاتے ہیں۔ اور ضروری و لازم کے اُمورِ دُنیاوی کے لیے۔ حرام و حلال دین کی اصطلاح ہے اور ''غیر قانونی'' یا ''قانونی'' دنیا کی۔

پس ''لغزش'' کے لفظ کا حقیقت میں ''معصیت'' سے کوئی تعلق ہی نہیں؛ کیونکہ ''معصیت'' ایک شرعی اصطلاح ہے اور ''لغزش'' اُمورِ دنیا میں بولتے ہیں۔ زید جب کہتا ہے کہ میری ذرا سی لغزش سے بنا بنایا کام بگڑ گیا تو اس کا یہ مطلب کون لے سکتا ہے کہ زید ''گناہگار'' ہوا۔ ''لغزش'' کے لفظ کا استعمال ہی صاف بتا رہا ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک انبیاء کے وہ بعض افعال جن کی اصلاح اللہ تعالیٰ نے بروقت فرمادی گناہ اور معصیت سے کوئی واسطہ ہی نہیں رکھتے تھے۔ اور اگر ''لغزش'' کا لفظ بھی توہین انگیز ہے تو پھر ہم نہیں جانتے کہ دنیا کا اور کونسا لفظ انبیاء کی خطاءِ اجتہادی کے لیے موزوں ہوسکتا ہے۔

زَلّت

گستاخی معاف حضرت مصنف نے خود ہی لفظ یعنی ''لغزش'' اسی صفحہ میں انبیاء کے حق میں استعمال فرمایا ہے۔ سنئے:

''جو افعال ان (انبیاء) سے معاصی سمجھے گئے ہیں وہ حقیقۃً معاصی نہیں ہیں، وہ صرف صورۃً ہی معاصی اور خطاء اجتہادی اور زلت ہیں۔''

اسے تو چھوڑ دیئے کہ کس بد بخت نے ان افعال کو معاصی کہا یا سمجھا۔ یہ دیکھئے کہ حضرت مصنف نے زلت کا لفظ ارشاد فرمایا ہے۔گویا حضرت کے نزدیک بھی انبیاء کے ان افعال کے لیے زلت کا استعمال درست ہے۔اب دیکھئے زلت کے کیا معنیٰ ہیں۔کسی بھی لغت کو اُٹھا کر دیکھ لیجیے زَلَّ (جس کا حاصل مصدر زلت ہے) کے معنیٰ ڈگمگانے اور لغزش کرنے کے ملیں گے۔فارسی کی لغات میں تو سیدھا ''لغزیدن'' ہی مل جائے گا جس کا حاصل مصدر ''لغزش'' ہے۔حضرت مولانا محمود الحسن شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فَاِنْ زَلَلْتُمْ (البقرہ، رکوع:۸) کے معنیٰ پھر ''اگر تم بچلنے لگو'' کیے ہیں۔اگر چہ ''بچلنا'' بھی ہر اُردو داں کو معلوم ہے کہ لغزش کرنے ہی کو کہتے ہیں؛لیکن حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ نے تو صاف ''پھر اگر تم لغزش کرنے لگو'' ہی لکھا ہے۔اسی طرح فَتَزِلَّ قَدَمٌ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا (النحل، رکوع:۱۸) کا ترجمہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہ لکھا ہے کہ ''ڈگ نہ جائے کسی کا پاؤں جمنے کے پیچھے''۔اگر چہ ''پاؤں کا ڈگنا'' لغزش کرنے ہی کو کہتے ہیں۔لیکن حکیم الامت نے تو صاف لکھا ہے کہ ''کبھی کسی اور کا قدم جمنے کے بعد نہ پھسل جاوے''۔پھسلنے کا فارسی ترجمہ ''لغزدین'' آمدنامے سے لے کر فردوسی کے شاہنامے تک بہ آسانی دیکھا جاسکتا ہے۔قرآن میں دونوں جگہ یہی مصدر یعنی زلت (باب ضرب) سے استعمال ہوا ہے اور لاریب اس کے معنیٰ ''لغزش'' کے ہیں۔

جب حضرت مصنف خود زیرِ تذکرہ افعالِ انبیاء کو صراحۃً زلت فرما رہے ہیں تو مودودی کے ''لغزشیں'' کہہ دینے سے یہ کیسے سمجھ لیا گیا کہ وہ لغزش کے معنیٰ معصیت سمجھتے ہیں۔اور نعوذ باللہ انبیاء کو آلودہ بہ معصیت تصور کرتے ہیں۔

حالانکہ اگر ایک شخص انصاف و دیانت کو بالائے طاق رکھ کر اُلٹا حضرت مصنف ہی پر اعتراض کرنے کی حماقت و سفاہت میں مبتلا ہو جائے تو کہہ سکتا ہے کہ انبیاء کے افعال کو زلت کہہ کر آپ نے انبیاء کی توہین کر دی۔ دلیل یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (البقرہ، رکوع:۲۴، پارہ:۲)

''اے ایمان والو! اسلام میں پورے داخل ہو جاؤ اور مت چلو شیطان کے قدم بہ قدم یقیناً وہ (شیطان) تمہارا صریح دشمن ہے۔پس اگر تم بچلنے لگے بعد اس کے کہ پہنچ چکے ہیں تمہارے پاس کھلے ہوئے احکامات تو سمجھ لو کہ یقیناً اللہ زبردست ہے حکمت والا۔''

یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ زلّت کو اللہ تعالیٰ نے اُن ہلکے معنیٰ میں استعمال نہیں فرمایا جن کی تعبیر اُردو فارسی میں ''لغزش'' سے کی جاتی ہے؛ بلکہ یہاں تو صراحۃً ''گمراہی'' اور ''عصیاں'' کے مفہوم میں لیا ہے۔ علّامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی تفسیر ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:

''یعنی شریعتِ محمدی کے صاف صاف احکام معلوم ہونے کے بعد بھی اگر کوئی اس پر قائم نہ ہو؛ بلکہ دوسری طرف نظر رکھے تو خوب سمجھ لو کہ اللہ سب پر غالب ہے۔ جس کو چاہے سزا دے، کوئی اس کے عذاب کو روک نہیں سکتا۔''

اس تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ زلّت کا مطلب یہاں کوئی معمولی سی معصیت نہیں ہے؛ بلکہ شرک وکفر جیسی معصیت ہے۔ شریعتِ محمدی کے علاوہ کسی اور مذہب کے بھی بعض اعتقادات کو ماننے والا محض گناہگار ہی نہیں؛ بلکہ بسبب خامی اعتقاد کفر وشرک کے قریب ہوگا۔ اور بعید نہ ہوگا کہ عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو۔

حکیم الاُمت نے اگرچہ اس کی تفسیر میں لفظِ لغزش ہی استعمال کیا ہے؛ لیکن تنہا نہیں۔ بلکہ ''صراطِ مستقیم'' کے ساتھ یعنی ''پھر صراطِ مستقیم سے پھسلنے لگو۔'' عرفِ عام میں محض عملی گناہ کو صراطِ مستقیم سے پھسلنا نہیں کہتے؛ بلکہ ''اسلام'' سے کفر کی طرف چلنے کو کہتے ہیں۔ ''صراطِ مستقیم'' اسلام کے معنیٰ میں لیا جاتا ہے۔ خود آیت کے تمام الفاظ اسی کی تائید کر رہے ہیں۔ اور خُطُوَاتِ الشَّيَاطِيْنِ کے بعد کوئی گنجائش اس بات کی نہیں رہتی کہ زلّت سے مراد کوئی معمولی قسم کی غلطی یا ہلکی سی لغزش سمجھی جائے۔

تب کیا قرآن ہی کے اسلوبِ کلام کی روشنی میں یہ بات قابل اعتراض نہیں ہے کہ زلّت کو انبیاء سے منسوب کر دیا جائے؟

کہا جاسکتا ہے کہ لغزش کا لفظ خود مودودی نے استعمال کیا ہے جب زلّت اور لغزش ایک ہی مفہوم کے الفاظ ہوئے تو یہی اعتراض ان پر بھی وارد ہوا۔

ہم کہیں گے کہ ان پر اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ عربی ایک الگ زبان ہے۔ اس کے محاورات اسی کے دائرے میں لیے جائیں گے، قرآن کی عبارت سے جب ثابت ہوگیا کہ زَلّت سخت ترین گناہ کے لیے بھی استعمال ہوسکتا ہے تو یہ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ یہ لفظ بہر پہلو ہلکا اور شفّاف ہے۔ اس کے برخلاف ''لغزش'' کا لفظ اُردو محاورہ میں کبھی کسی بڑی خطا پر نہیں بولا جاتا۔ کبھی نہیں کہا جاتا کہ فلاں شخص نے زید کو قتل کر کے بڑی لغزش کی! کوئی نہیں بولتا کہ بکر چوریاں کرتا ہے تو یہ اس کی لغزش ہے۔ فی الحقیقت اس لفظ کا روزمرّہ استعمال بہت معمولی بھول چوک سہو ونسیان اور ڈگمگا جانے یا بچل جانے کے لیے ہوتا ہے۔

اِس اعتراض سے ہم خدا گواہ ہے کہ یہ ثابت کرنا نہیں چاہ رہے کہ حضرت مصنف نے انبیاء کی توہین کی ہے۔

بلکہ ہمارا مقصود صرف یہ دکھانا ہے کہ ذرا ذرا سی لفظی گرفتوں ہی پر اگر نوبت آجائے تو الفاظ کا پکھو مڑ نکال کر عبارت کی چولیں ڈھیلی کر دینا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ ناظرین فیصلہ کریں کہ ہم نے جو اعتراض مع دلائل کیا ہے وہ اُن اعتراضات سے کیا بہت زیادہ ہوائی ہے جو دستورِ جماعتِ اسلامی پر کیے جا رہے ہیں؟

تنقید یا تنقیص؟

صفحہ ۳۱ پر حضرت مصنف نے ابوزرعہ رازی کا ارشاد نقل فرمایا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم دیکھو کہ کوئی شخص صحابۂ کرام میں سے کسی صحابہ کے نقص نکال کر رہا ہے تو سمجھ لو وہ زندیق ہے۔

سچ فرمایا ابوزرعہ نے؛ لیکن الفاظ دیکھئے:

إذا رأيت الرجل ينتقص أحداً من أصحاب الخ اِس عبارت سے استشہاد جب صحیح تھا جب ابوزرعہ ''ينتقص'' کی بجائے ''ينتقدُ'' کہتے۔ بحث تنقید کی ہے تنقیص کی نہیں۔ تنقیصِ صحابہ تو ابوزرعہ اور ابن عبدالبر اور ابن حجر اور کسی بھی بڑے عالم کے حوالہ کے بغیر ہی بالیقین زندقہ وفسق ہے۔ مستند سلفِ صالحین کی صدہا دینی کتابوں میں سے کسی ایک میں بھی یہ مضمون دکھلا دیا جائے کہ ''تنقید علی الصحابہ'' حرام ہے تب بیشک مودودی عاصی وخاطی۔

اہلِ علم اسلاف کی طرف سے تنقید علی الصحابہ کی مخالفت کیونکر دکھائی جا سکتی ہے جبکہ انھوں نے خود صحابہؓ کے اقوال اور قوتِ اجتہاد اور صلاحیت قیاس وفکر پر مکمل تنقیدیں کر کے بعض صحابہ کے فتووں اور فیصلوں کو اپنی فقہ اور مسلک کے لیے خصوصیت سے بنیاد ٹھیرالیا اور بعض صحابہ کو مرجوح سمجھا۔ یعنی اگر کسی مسئلہ میں اختلاف پایا گیا تو جن صحابہ کے فکر واجتہاد کو وہ تنقید کے بعد زیادہ وزنی اور قریبِ صحت تصور کرتے تھے، ان کی پیروی کی اور مخالف رائے رکھنے والے صحابہ کی رائے نہیں مانی یہی بنیاد اختلافِ ائمہ کی ہے۔ اور تنقید کے سلسلہ میں حضرت امام شافعیؒ تو یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ: قول الصحابي ليس بحجة (صحابی کا قول حجت نہیں ہے) ہے کوئی جس نے امام شافعی پر توہین صحابہ اور زندقہ وخارجیت کا فتویٰ لگایا ہو۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ ''اگر شرفِ صحابیت کا سوال نہ ہوتا تو میں کہتا کہ علقمہ عبداللہ ابن عمرؓ سے بڑے فقیہ ہیں۔'' کہاں علقمہ غیر صحابی کہاں عبداللہ ابن عمر علیہ الرضوان صحابیِ رسول؛ لیکن کوئی اللہ کا بندہ نہیں جس نے امام اعظم پر توہین صحابی کا الزام رکھا ہو۔ کیا امام صاحب کو وحی یا کشف کے ذریعہ صحابیِ رسول عبداللہ ابن عمرؓ پر علقمہ کی فقیہانہ برتری کا علم ہوا تھا یا آپ نے تنقید وتحقیق کے ذریعہ یہ رائے قائم کی تھی؟

امام مالکؒ کا قول

امام مالکؒ فرماتے ہیں:

وما من أحد إلا هو ماخوذ من كلامه و مردود عليه إلا رسول الله ﷺ.

''کوئی شخص ایسا نہیں جس کے کلام میں قابلِ قبول اور قابلِ رَد دونوں طرح کی باتیں نہ پائی جاتی ہوں''۔

ناظرین! امام مالکؒ وہ بزرگ ہیں جن کی کتاب ''مؤطا امام مالک'' کو بالاتفاق اصح الکتاب بعد کتاب اللہ مانا گیا تھا۔ جو مرتبہ بعد کی کتاب بخاری کو اکثر اہلِ علم نے دیا ہے وہی ان کی کتاب کو حاصل تھا؛ لیکن انھوں نے کتنی صفائی سے فرمادیا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سوا کسی کا کلام یہاں تک کہ صحابی کا کلام بھی قابلِ رَد باتوں سے خالی نہیں ہے۔ مناسب ہوگا اگر ایک بار پھر دستور کی عبارت پر نظر ڈال لی جائے:

''رسولِ خدا کے سوا کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے!''

اگر اس عبارت میں صحابہ داخل ہیں اور یہ داخلہ توہین کے مرادف ہے تو خدارا ایماناً فیصلہ کیجیے کہ امام مالک کے قول میں صحابہ کیوں داخل نہیں اور یہ داخلہ توہین کے مرادف کیوں نہیں؟ بالکل ایک ہی بات دونوں کہہ رہے ہیں۔ اندازِ بیان تک ایک ہے۔ وہاں بھی سالبہ کلیہ یہاں بھی سالبہ کلیہ۔ وہاں بھی رسولِ خدا کا استثناء یہاں بھی رسولِ خدا کا استثناء۔ مطلب بھی قطعاً ایک۔ دستور کہتا ہے کہ رسولِ خدا کے سوا ہر انسان ممکن التنقید ہے۔ امام بھی کہتے ہیں کہ رسولِ خدا کے سوا ہر انسان کے اقوال میں قابلِ رَد قول بھی پائے جانے ضروری ہیں۔ تنقید یعنی چھان بین اور جانچ پرکھ حرام ہو تو کیا قابلِ رَد اور لائق قبول کا فرق و امتیاز کشف و الہام کے ذریعہ ہوگا؟ منصفانہ غور کیا جائے تو اعتراض کی نام نہاد منطق دستور سے زیادہ امام موصوف کی عبارت پر چسپاں ہوتی ہے۔ کیونکہ امام صاحب نے ''مردود'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ''مردود'' کے لفظ میں ذم اور شدت کا جو پہلو پایا جاتا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ گویا اعتراض کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ امام موصوف نے صحابہ تک کو ان لوگوں میں شامل کرلیا جن کی بعض باتیں ''مردود'' ہوتی ہیں! فافھم و تدبّر!

رہا یہ کہنا کہ صحابہؓ کی بشری کمزوریوں پر مشتمل مودودی کی مندرجہ بالا عبارت دائرۂ تنقیص میں داخل ہے تو یہ جبھی صحیح ہوسکتا ہے کہ جب مودودی کی ہزاروں صفحات پر مشتمل تحریروں میں تنقیصِ صحابہ توصیفِ صحابہ سے زیادہ ہو، یا زیادہ نہ سہی برابر ہو، برابر نہ سہی قریب قریب ہو؛ لیکن حال یہ ہے کہ قریب تو کیا اتنی بھی نہیں کہ کمیت یا کیفیت کسی بھی لحاظ سے آٹے میں نمک کے برابر کہی جاسکے۔ ایک دو جگہ کے سوا کہ جہاں سیاق و سباق صاف بتا رہا ہے کہ مقصد صحابہ کا مرتبہ گرانا نہیں؛ بلکہ یہ دکھانا ہے کہ وہ ماں کے پیٹ سے فرشتہ پیدا نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ ہم آپ جیسے جذبات اور نفس رکھنے والے بشر تھے۔ جنھوں نے باوجودِ بشریت کے وہ کچھ کرکے دکھادیا جسے آپ مافوق الفطرت اور عجیب و غریب اور افسانہ خیال کیے بیٹھے ہیں۔ کہیں نہیں ملتا کہ صحابہ کی تعریف و توصیف، مدح و منقبت اور تعظیم و تکریم کے عیب چھانٹنا اور مفہوم مخالف کی دلالت سے یہ بھی اس میں لازم ہے کہ محاسن کو چھپایا جائے۔ کون ایسا احمق ہوگا کہ جن دشمنوں کو وہ حقیر و ناقص ثابت کرنا چاہ رہا ہے ان کے نقص تو بیس پچیس سالوں میں کبھی ایک دو مرتبہ بیان

کردے اور تعریف کے قصیدے ہزاروں دفعہ گائے۔ پھر نقص بھی کیسے۔محض وہ جنھیں حد سے حد ”بشری کمزوری“ کہا جاسکتا ہے۔کوئی ایسا لفظ بالکل نہ لکھے جو کسی بھی درجہ میں گناہ اور معصیت کی طرف مشیر ہو اور ان کی اُس عظمتِ مقدسہ پر حرف لانے والا ہو جس کا تعلق صرف دینی برتری سے ہے۔عقل و تدبّر سے نہیں۔

خاتمۂ کلام

۶۸ صفحے کی زیرِ بحث کتاب پر ابھی بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے۔لیکن جگہ کی کمی اجازت نہیں دیتی۔علاوہ ازیں جتنا کچھ کہہ دیا گیا وہی اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے بالکل کافی ہے کہ انبیاء وصحابہ کے باب میں عقائد وخیالات جماعتِ اسلامی اور علمائے حق دونوں کے فی الاصل ایک ہی ہیں۔نزاع صرف لفظی ہے اور اسی نزاع کی آگ کو جذبات اور مغالطوں کی ہَوا بھڑکا رہی ہے۔ناظرین یہ نہ سمجھیں کہ مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کی طرف سے ہمارا مدافعت کرنا یہ مطلب رکھتا ہے کہ مولانا مودودی کے ہر اجتہاد کو ہم خطا سے بالاتر سمجھتے ہیں۔یا جماعتِ اسلامی کو ہر عنوان مصفّٰی مانتے ہیں۔اگرچہ دَورِ حاضر کی تعلیم تو یہی ہے کہ اپنے مکتبۂ فکر اور حلقے کے بزرگوں کو سوفی صد مبرّیٰ عن الخطاء اور عملاً معصوم سمجھو۔کبھی ان کی غلطی کو غلطی مت مانو اور ایک وکیل کی طرح صرف یہ سوچو کہ کیونکر اپنے مؤکل کو بےقصور اور بَری الذمہ ثابت کیا جائے۔لیکن بدقسمتی سے ہمارا نفس لعین ابھی تک غیر معقول عقیدتوں کا نشانہ نہیں بن سکا۔اور ہمارا ضمیر گروہی سیاست وفطانت کی لذتوں سے آشنا نہیں ہو سکا۔اس لیے مودودی کو ایک ایماندار مسلمان سمجھتے ہوئے بھی ہم ان کی ہر اس غلطی کو غلطی مانیں گے جسے علم وعقل کی وزنی دلیلوں سے غلطی ثابت کر دیا جائے اور صرف مانیں ہی گے نہیں؛ بلکہ ان ہی صفحات میں اس کی تردید وتغلیط کریں گے۔ہم اعلانِ عام کرتے ہیں کہ جس کا جی چاہے سنجیدہ علمی انداز میں مودودی یا جماعتِ اسلامی کی کسی بھی دینی غلطی اور اجتہادی گمراہی یا بدعقیدگی پر مضمون لکھ کر تجلّی کو بھیجے ان شاء اللہ نہ صرف شائع کیا جائے گا؛ بلکہ اپنی بے کم وکاست رائے بھی ہم بے تکلف لکھیں گے بس اتنی ہی گزارش ہر بھائی سے ہے کہ حکمِ الٰہی:

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ کے بموجب ہمارے جج اور حَکَم قرآن وسنّت ہوں گے اور قرآن وسنت کو ہم تک بہترین طریقہ پہنچانے والے اسلافِ مقدّسہ رحمہم اللہ اجمعین کا کوئی بھی حوالہ ہم اس لیے نہیں دیں گے کہ اُن کا فرمودہ وحی الٰہی ہے؛ بلکہ اس لیے دیں گے کہ اس سے قرآن وسنت کا بہترین اثبات اور اظہار ہوتا ہے۔

ناظرین کرام کو ہم خدائے لایزال کی قسم دے کر کہتے ہیں کہ ہماری پیش کردہ معروضات کو وہ اختلاف و نفرت کے ہر تصوّر سے الگ ہو کر دیانتداری کے ساتھ ملاحظہ کریں اور یہ پیشِ نظر رکھیں کہ حق اور دین کے

معاملہ میں گروہی عصبیت جانبداری اور جذباتی غلو ایسے جُرم ہیں جنھیں آخرت میں نہ مودودی معاف کرا سکتے ہیں نہ علمائے کرام۔ مودودی کی گمراہی یا علماء کی حقانیت قیامت میں کسی کو فائدہ نہ دے گی جب تک کہ اِس کی فردِ عمل خود لائق انعام نہ ہو۔ ایماندار وہ ہے جو حق کے معاملہ میں قرآن وسنّت کے خلاف کسی بڑے سے بڑے اقتدار اور لشکر کا اثر قبول نہ کرے۔ جو عقل وضمیر کی آنکھوں پر عصبیت کی عینک نہ چڑھائے۔ ہمارے ناظرین بعد مطالعہ ہمیں ضرور مطلع کریں کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ محض بکواس اور خرافات ہے یا واقعی عقل وضمیر کو اپیل کرنے والا ہے۔

تنبیہ

دستور کی اِس عبارت:

''کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے!''

کا یہ مطلب بتانا کہ ہر کس و ناکس کے لیے ائمہ وصحابہ پر نقد ونظر کا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔ اور ہر جماعتِ اسلامی والا صبح سے شام تک صحابہ وائمہ کی توہین کرتا ہے۔ اس طرح کی اشتعال انگیزی اور فن کاری ہے جیسے الیکشن کے زمانہ میں متقابل جماعتیں ایک دوسرے کے حق میں کیا کرتی ہیں؟ فی الواقع اس کا یہ مطلب ہرگز ہرگز نہیں ہے واقعات کی دلیل ڈھونڈیں تو آپ کو جماعتِ اسلامی کے وسیع لٹریچر میں کہیں صحابہ وائمہ پر لے دے نظر نہ آئے گی۔ کہیں نہیں ملے گا کہ زید، عمر، بکر تنقید علی الصحابہ کا فریضہ انجام دیئے چلے جار ہے ہیں۔ دستور کو بنے کافی دن ہو گئے۔ اگر عبارت کا مطلب یہی ہوتا جو سمجھایا جاتا ہے تو آخر اس کی تعمیل بھی تو ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ کچھ کہا جا سکتا ہے تو یہ کہ تصوف احسان پیری مریدی اشغال وذکر وغیرہ کے باب میں بعض ارکانِ جماعت نے قلم اُٹھایا ہے اور سلف صالحین کے بعض اعمال واقوال پر تنقید کی ہے تو اسے توہین و بے ادبی اس وقت کہا جا سکتا تھا کہ قرآن و سُنّت کی دلیلوں کے بغیر از راہِ تمسخر قلم چلایا گیا ہو؛ لیکن جب قرآن وسنّت اور عقل وقیاس کی دلیلوں کے ساتھ بات کہی گئی ہو تو حد سے حد یہی کہا جا سکتا ہے کہ دلائل کمزور ہیں۔ نظریہ غلط ہے۔ دعویٰ ثابت نہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ خطائے بزرگاں گرفتن است سے حدیثِ رسول ''لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق'' منسوخ ہوگئی۔

اور زبان واصطلاح کی دلیل ڈھونڈیں تو آپ دیکھیں گے کہ ''بالاتر ہونے'' کا مطلب ''ممکن ہونا'' ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ''زید کا ایک ہی وقت میں دہلی اور لندن دونوں جگہ ہونا عقل سے بالاتر ہے'' تو مطلب ہوتا ہے کہ ''ممکن نہیں ہے''۔ اور جب ہم کہتے ہیں کہ بکر کا کوٹھے سے گر کر زندہ رہ جانا عقل سے بالاتر نہیں ہے تو مطلب ہوتا ہے کہ ممکن ہے!

پھر کسی چیز کے ممکن ہونے کا لازماً یہ مطلب بھی نہیں ہوتا کہ وہ چیز کثرت سے واقع ہوتی ہو۔ انتہائی نادرالوقوع چیزوں پر بھی امکان کا اطلاق ہوتا ہے۔ جیسے کہ ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی پر چڑھنا نادرالوقوع ہے؛ لیکن امکان سے بالاتر نہیں ہے؛ بلکہ امکان کا اطلاق تو اُن چیزوں پر بھی ہوتا ہے جو اب تک کبھی واقع نہ ہوئی ہوں؛ مگر واقع ہوسکتی ہوں جیسے ہم یوں کہیں کہ چاند کا سفر عقل سے بالاتر نہیں ہے۔ یا ہوا میں ہوائی اڈے قائم ہونا امکان سے بالاتر نہیں ہے۔ یہ دونوں چیزیں آج تک وقوع پذیر نہیں ہوئیں؛ لیکن پھر بھی انھیں امکان سے بالاتر نہیں کہا جاسکتا۔ سائنس نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن ایجاد کیے۔ پہلے دنیا میں ان کا وجود کہیں نہیں تھا؛ لیکن عقل و امکان سے بالاتر یہ کبھی نہیں ہوئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بالاتر ہونے نہ ہونے کا محاورہ محض ممکن ہونے نہ ہونے کے لیے استعمال ہوتا ہے کثرتِ وقوع اور لزوم کے لیے نہیں۔ ہر شخص چاند پر نہیں چڑھ سکتا۔ ہر شخص ہوا میں اڈے نہیں بنا سکتا۔

تب دستور کی عبارت سے یہ مطلب لینا کہ جماعتِ اسلامی کے ہر فرد کو عملاً صحابہ وائمہ پر تنقید کا پابند کیا گیا ہے مذاق کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ اصلی مطلب بداہتہً یہ ہے کہ ہر مسلمان کو یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ خدا اور رسول کے سوا کوئی ایسا نہیں جس کے قول و فعل کو قرآن وسنت کی روشنی میں غلط قرار دینا ناممکن ہو۔ اور یہ عقیدہ جس وجہ سے ضروری ہے اس پر بھی دیانت داری کے ساتھ غور فرمالیا جائے۔

جماعتِ اسلامی اقامتِ دین کے لیے وجود میں آئی تھی، اقامتِ دین کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو تا بہ حدِ امکان ختم کرایا جائے۔ اختلافات کا زبردست سرچشمہ یقیناً یہی ہے کہ امت کے اکثر و بیشتر افراد نے قرآن وسُنّت کو تو برائے تبرک مانا اور اصل معیارِ حق بعد کے بزرگوں اور اُمتیوں کو ٹھیرالیا۔ کسی بدعتی سے پوچھئے کہ فلاں کا ماتم کیوں کرتے ہو، جبکہ اسلام میں اس کی مخالفت ہے۔ وہ کہے گا واہ صاحب! ممانعت کہاں۔ ہمارے فلاں حضرت علاّمہ نے یوں لکھا ہے اور فلاں بزرگ نے یوں کہا ہے۔ فلاں بزرگ اتنے کونڈے کرتے تھے۔ فلاں مجدّد اتنے عرس کراتے تھے وغیرہ۔ اسی طرح کسی بھی گروہ سے پوچھ دیکھئے۔ دلائل میں مات کھا جانے پر اس کی آخری دلیل یہی ہوگی کہ فلاں بزرگ جب اس کے قائل ہیں تو کیا وہ قرآن وسنت سے بے خبر تھے؟ صرف اتنا ہی نہیں کہ یہ طرزِ فکر اُصولی اختلافات رکھنے والوں کے درمیان پایا گیا؛ بلکہ فروعات میں اختلافات رکھنے والے ایک ہی مکتبہ فکر کے افراد میں بھی یہی طرز چلتا ہے چشتیوں، نقشبندیوں اور سہروردیوں وغیرہ میں ہر ایک اپنے مخصوص بزرگوں کے قول و فعل کی دلیل لائے گا اور عملاً یہ ثابت کرے گا کہ قرآن وسُنّت تو محض تبرک ہیں اصل معیار اور مقتدا تو اس کے بزرگ ہی ہیں۔

اس نفاق انگیز اور گمراہ کن طرزِ فکر کی بیخ کنی ہی کے لیے جماعتِ اسلامی نے اپنے دستور میں زیرِ بحث الفاظ

رکھے، اس کا مقصد ومنشا اسلاف کی توہین اور بزرگوں کی تذلیل نہیں ؛ بلکہ یہ تھا کہ بزرگوں کی واجبی اور مناسب تعظیم وتکریم کے باوجود انھیں حرفِ آخر اور معیارِ حق اور تنقید سے بالاتر سمجھ لینا اُمت کے مختلف گروہوں کو اتحاد و اشتراک کے اسٹیج پر جمع کرنے میں سخت مانع ہے۔ اور اصلاً غلط اور قرآن وسنّت کے منافی ہے۔ اولیاء و اتقیا نبی نہیں۔ محض بزرگ ہیں۔ اور ان سے اجتہاد و استنباط کی غلطی ممکن ہے!

یہ تھا جماعت کا بنیادی خیال۔ حقیقتاً اس کے سامنے صحابہ کی تنقید اور عدمِ تنقید کا تصور تو تھا ہی نہیں ؛ کیونکہ صحابہ رضوان اللہ اجمعین کے اُسوۂ مقدسہ میں بظاہر کوئی ایسی بات تھی ہی نہیں کہ آج کے کشتی لڑنے والے اور مناظرے کرنے والے گروہوں کا دینی اختلاف ومجادلہ اس پر مبنی ہو اور تنقید علی الصحابہ کے ذریعہ اسے ختم کیا جائے۔ صحابہ کی زندگیاں سب کے نزدیک ایسا نمونہ تھیں جو حرف گیری سے بالاتر اور گمراہی آمیز عقائد کے لیے مستدل بن ہی نہیں سکتی تھیں۔

اس کے باوجود عصمت کو صرف انبیاء ہی کا حق سمجھتے ہوئے صحابہ تک کو تنقید سے بالاتر کہنا اور معیارِ حق نہ ماننا ضروری ہوا؛ کیونکہ صحابہؓ کی عظمت وتقدس قرآن وسُنّت ہی کے دم سے تھی اور رسول اللہ ﷺ سے قطع نظر کر کے صحابیت کوئی مستقل بالذات چیز نہیں تھی۔ پھر شیعت کی طرف مائل ہونے والوں کو بھی یہ جواب دینا تھا کہ حضرت علیؓ یا حضرت عباسؓ معیارِ حق نہیں تھے۔ مطیعِ حق اور پیروِ حق تھے۔ ان کا ہر قول اور ہر اجتہاد اور ہر عمل رسول اللہ کی طرح ناممکن الخطا اور عینِ حق اور تنقید سے بالاتر نہیں تھا۔

اور یہ بھی سوچئے کہ اگر ایک فلسفی کی کوئی زبردست کتاب چھپتی ہے اور کوئی شخص یوں کہتا ہے کہ ''یہ کتاب اور اس کا مصنّف تنقید سے بالاتر نہیں ہیں'' تو کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کہنے والے کے نزدیک ہر مولا بخش اور پریم ناتھ اور گل خیرو کو اجازت ہے کہ کتاب کے انجر پنجر ڈھیلے کرنے بیٹھ جائے؟ نہیں اس کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ جو لوگ فلسفہ پر عبور رکھتے ہیں اور فلسفہ پر کلام کرنے کے اہل سمجھے جاسکتے ہیں انھیں تنقید کا حق حاصل ہے۔ وہ اگر سنجیدگی معقولیت اور دیگر شرائطِ تنقید کے ساتھ یہ کام کریں تو اُنھیں اس کا حق ہے اور کتاب کا مصنف نبی نہیں ہے کہ اس کی کوئی بات غلط ثابت ہی نہ کی جاسکے۔

ٹھیک یہی مطلب دستور کی عبارت کا ہے۔ جو لوگ قرآن وسنت اور علومِ دینیہ کا ایسا علم رکھتے ہوں کہ علم وعقل کی عدالت انھیں واقعتہً عالم و باخبر اور ماہر و متبحر مان سکے انھیں یہ حق حاصل ہے کہ دین کے جس مسئلہ میں وہ کسی قیاس کو قرآن وسُنّت سے زیادہ قریب سمجھیں اسے مان لیں اور جسے نسبتاً دُور سمجھیں نہ مانیں خواہ یہ دوسرا قیاس کسی امام یا صحابی ہی کا کیوں نہ ہو اسی حق کی بنیاد پر ائمہ کے مذاہب قائم ہیں اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے محیطِ دین و دانش نے اسی حق کی بنیاد پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جیسی معظم العظماء صحابیہ کی رائے پر عبد اللہ ابن مسعودؓ کی

رائے اور خیال کو بعض مسائل میں ترجیح دے دی۔ آخر تنقید علی الصحابہ (تنقیص نہیں) کے بغیر ائمہ کے مذاہبِ مختلفہ کا وجود کیونکر ممکن ہوسکتا ہے؟ یوں بات کا بتنگڑ بنانے کے لیے ہم قائلین تقلید سے یہ بھی پوچھ سکتے ہیں کہ کیوں صاحب آپ جو صحابہ کو معیارِ حق اور واجب التقلید بتاتے ہیں تو آپ خود کس صحابی کے مقلد ہیں۔ صحابہ کو تو آپ نے محض نسلی رشتوں کے ثبوت میں استعمال کرنا کافی سمجھ رکھا ہے۔ یعنی میں عثمانی ہوں، تُو علوی ہے۔ فلاں صدیقی ہے۔ فلاں فاروقی ہے وغیرہ۔ تقلید کے سلسلہ میں آپ کبھی کسی صحابی کا نام نہیں لیتے؛ بلکہ ائمہ سے رشتہ جوڑتے ہیں۔ حنفی اور شافعی بنتے ہیں۔ مالکی اور حنبلی کہلاتے ہیں۔ دستور کی عبارت توہین صحابہ ہے تو آپ کا یہ عمل توہین صحابہ کیوں نہیں؟

ہم جانتے ہیں کہ اس طرح کے اعتراضات ہوائی ہیں؛ لیکن جب ہوا بندی اور زبردستی ہی مقصد ٹھیرے تو کون کسی کی زبان بند کرسکتا ہے۔ بریلویوں کو دیکھ لیجیے کہ ''تحذیر الناس'' کے مصنف کو کافر ہی کہے جاتے ہیں۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ.

حرفِ آخر

لیجیے اتنی کچھ موشگافیاں کرنے کے بعد ایک ایسی چیز سامنے آگئی جسے پڑھ کر بڑے سے بڑا ضدی اور ڈھیٹ شخص بھی چورنگ ہو کے رہ جائے گا کہ اب کیا ہو۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنی مدظلہ کی ایک کتاب ہے ''مکتوبات شیخ الاسلام'' اس میں ایک شخص نے آپ سے سوال کیا:

سوال: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ فعل کیا غیر مستحسن نہیں ہے کہ انھوں نے یزید جیسے فاسق و فاجر کو خلافت کے لیے نامزد فرمایا؟

اس کا جواب حضرت نے جو کچھ دیا صفحہ ۲۶۸ پر ملاحظہ ہو:

فرماتے ہیں:

> ''بالفرض اگر یہ اُمور تسلیم بھی کر لیے جائیں تو غایت مافی الباب ایک خطا کا ارتکاب معلوم ہوتا ہے جو کہ انسانی کمزوریوں میں سے ایک کمزوری ہے۔ جس سے کوئی مقرب یا ولی خالی نہیں ہوسکتا۔ نہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ان سے معصوم ہیں۔''

(بحوالہ دعوت دہلی مورخہ ۱۷ رمارچ ۵۶ء)

کہیے! کیا یہی ''انسانی کمزوری'' نہیں ہے جس کی نسبت صحابہ کی طرف کر دینے پر مودودی صاحب دشمن دین و ایمان قرار دیئے گئے تھے؟ جواب کی اب دو ہی شکلیں ہیں۔ یا تو اس عبارت کے بارے میں کہیے کہ کسی

شریر نے ''مکتوبات'' میں اپنی طرف سے بڑھادی یا یوں کہیئے کہ مودودی نے ''بشری کمزوریاں'' کہا تھا اور ''انسان'' اور ''بشر'' میں کافی فرق ہے!

آگے دیکھئے! اسی کتاب کے صفحہ ۳۳۸ پر صحابہ اور اولیاء وائمہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''ان پر تنقید ان ہی جیسے پایہ علم و اتقاء والا کرسکتا ہے۔'' (دعوت)

یہاں تو اب آپ کی ''بشر'' اور ''انسان'' والی بات بھی نہیں چل سکتی۔ نقطہ بہ نقطہ وہی لفظِ تنقید یہاں موجود ہے جس پر اعتراض واختلاف کی انتہا کردی گئی ہے۔ فرمائیں صحابہ کو تنقید سے بالاتر کہنے والے اور بالاتر نہ سمجھنے والوں کو ضال ومضل قرار دینے والے کہ یہ کونسی ''تنقید'' ہے جس کی مولانا مدنی صحابہ کے حق میں اجازت دے رہے ہیں؟ کیا مولانا کی اس صریح المعنیٰ عبارت کا ہو بہو اور نقطہ بہ نقطہ وہی مطلب نہیں ہے جو دستور کے راندۂ درگاہ جملہ کا ہے یعنی سوائے خدا اور رسول کے کوئی تنقید سے بالاتر نہیں! صحابہ بھی نہیں!!

ہٹ دھرم معاند شاید اب یہ کہہ دے کہ صاحب مولانا نے شرطِ تنقید بھی تو کتنی سخت رکھی ہے کہ ''ان ہی جیسے پایہ علم و اتقاء والا کرسکتا ہے۔'' عرض کیا جائے گا کہ حضور شرط کچھ بھی سہی پر امکانِ تنقید تو مسلم!۔ اور جہاں تک شرط کا تعلق ہے تو حضور مولانا نے یہ بھی نہیں فرمایا کہ صحابی پر صحابی ہی تنقید کرسکتا ہے۔ اگر یہ مقصود ہوتا تو پایہ علم و اتقاء کے ساتھ شرطِ صحابیت بھی لگائی جاتی۔ یہ شرط مولانا نے نہیں لگائی تو معلوم ہوا کہ شرطِ تنقید شرفِ صحابیت میں برابری نہیں؛ بلکہ علم و اتقا میں برابری ہے۔ اور ہر صاحب علم جانتا ہے کہ صحابہ کے بعد اُمت محمدیؐ میں کتنے ہی ایسے بزرگ گزرے ہیں جو اگرچہ مرتبہ و مقام میں کسی صحابی کے جوتے کی خاک کے برابر بھی نہیں ہوسکتے؛ لیکن علم و اتقا میں بہت سے صحابیوں سے بڑھے ہوئے اور بہت سوں کے برابر تھے۔ تب گویا مولانا ہی کے نزدیک کسی غیر صحابی کے لیے بھی بشرطِ خاص حق تنقید علی الصحابہ موجود و محفوظ ہے۔

فبایّ جهةٍ تجرح علی المودودی الآن.

بازگفت

آپ اُکتا نہ گئے ہوں تو دو ایک باتیں اور سُنئے۔ ''فطری حکومت'' فخر الاماثل مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی ایک تصنیف ہے جو ان کے عالی مقام صاحب زادے محمد سالم صاحب نے اگست ۱۹۴۹ء میں شائع فرمائی ہے۔ گویا صرف چھ برس پہلے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ مولانا مودودی کی تفہیمات اور جماعتِ اسلامی کا دستور دونوں چیزیں اس سے کہیں پُرانی ہیں۔ آج مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کے ضال و مضل ہونے کا صریح اعلان کرنے والے حضرت مہتمم صاحب ''فطری حکومت'' کے صفحہ ۴ پر تحریر فرماتے ہیں:

"آسمانی بادشاہت یا حکومتِ الٰہیہ کے عنوانات آج کانوں کے لیے نئے یا اُوپرے نہیں رہے جن سے کوئی آشنا نہ ہو۔ اس عنوان کو سب سے پہلے میرے برادرِ معظم حضرت مولانا محمد میاں عرف مولانا منصور انصاری مرحوم مہاجر افغانستان اور رفیق خاص حضرت اقدس سیدنا شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ نے اختیار فرمایا۔ اور اس عنوان سے ایک مختصر اور جامع رسالہ بزمانہ قیام افغانستان سپردِ قلم فرما کر شائع کیا۔ مگر ممدوح کو ہندوستان سے بجبر باہر رہنے اور اس ملک میں نہ آسکنے کی بنا پر ان کے نام سے اس عنوان کا تعارف ملک کے عوام میں نہیں ہوسکا، تاہم خواص نے ان کے پیش کردہ حقائق کو سمجھا اور کافی رہنمائی حاصل کی۔ اس کے بعد محترم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے مستقلاً اسی عنوان سے اپنی تحریک شروع کی اور اُسی کی اساس پر جماعتِ اسلامی کے نام سے ایک ادارہ کی تشکیل کی۔ اس تحریک اور تشکیل نے اجتماعیات اسلامی کی حد تک قوم کو کافی فائدہ پہنچایا اور ان کے معقول اور متین طرزِ بیان اور طرزِ استدلال نے ملک کے پڑھے لکھے طبقے کو عموماً متاثر کیا، بالخصوص انگریزی تعلیم یافتہ حلقہ جس کے سامنے اسلامی اجتماعیات کا کوئی منضبط تصور ہی نہ تھا۔ اسلام کی اجتماعی زندگی اور خالص دینی سیاست کے بہت زیادہ قریب ہوگیا۔ جس کے لیے پوری قوم کو ان کا مرہونِ منت ہونا چاہئے۔ بہرحال ان دونوں محرکوں کی تحریک اور ان سے متعلقہ لٹریچر نے اس عنوان کا ملک میں کافی تعارف کرادیا۔"

چونکئے مت یہ ہم نے اختراع کی شعبدہ بازی نہیں کی ہے؛ بلکہ کتاب اُٹھا کر دیکھئے ایک ایک حرف اور شوشہ اُن ہی فاضل محترم کا ہے جو آج دستورِ جماعت اور مولانا مودودی کی بات بات میں کیڑے ڈال رہے ہیں۔

اسے جانے دیجئے کہ حکومتِ الٰہی کے عنوان کے تعارف کا پہلا سہرا واقعی حضرت مہتمم صاحب کے برادرِ معظم کے سر ہے یا اس میں کلام کی گنجائش ہے۔ آپ تو یہ دیکھئے کہ تضادِ فکر ونظر کا کیسا عجیب مرقع آپ کے سامنے ہے۔ اگر سچ مچ دستور کی عبارتوں کے وہی کافرانہ معنیٰ ہو سکتے ہیں جو فی الحال لیے جا رہے ہیں یعنی جماعتِ اسلامی والے سوائے آنحضور کے کسی نبی پر ایمان نہیں رکھتے اور صحابہ کی فضیلتوں سے منکر ہیں تو ۴۹ء میں کیا خاص بات تھی کہ حضرت مہتمم صاحب نے ان کی گمراہی و زندیقی کا اعلان کرنے کی بجائے نہ صرف انھیں سراہا بلکہ حکومتِ الٰہیہ کے سابقون الأوّلون میں بہ تمام احترام شامل فرمایا اور قوم سے یہ نہیں کہا کہ ان پر لعنت بھیجو؛ بلکہ یہ کہا کہ "پوری قوم کو ان کا مرہونِ منت ہونا چاہئے!"

بعض ایسے ہی موقعوں پر بڑی بے تکلفی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ صاحب ہم نے ان کا لٹریچر دیکھا ہی نہیں کون فضول وقت ضائع کرے۔ کیا حضرت مہتمم صاحب کو بھی یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ فطری حکومت لکھتے وقت انھوں نے جماعتِ اسلامی کا دستور نہیں دیکھا تھا؟ اگر وہ ایسا کہہ سکیں تو مودودی اور جماعتِ اسلامی کے لٹریچر اور طرزِ بیان

وغیرہ کی جو مدح مذکورہ بالا اقتباس میں موجود ہے اس کا کیا مطلب ہوگا؟ کیا وہ محض تفریحاً ہے۔ کسی جزئی مسئلہ یا غیر مشہور کتاب کے بارے میں تو یہ عذر چل سکتا ہے کہ ہم نے اسے نہیں دیکھا؛ لیکن کسی جماعت کے لٹریچر کی توصیف کرنے کے بعد بوقتِ ضرورت یہ کہہ دینا کہ ہم نے اس کا دستورِ اساسی ہی نہیں دیکھا تھا ایسی بات ہوگی جیسے کوئی روسی لٹریچر اور فکرونظر کی مدح خوانی کے بعد اچانک یوں کہہ دے کہ میں نے لینن و اسٹالن کے ملحدانہ نظریات تو دیکھے ہی نہیں! عقلاً اور قیاساً اور عادۃً یہ بات محال ہے کہ سنہ ۴۹ء میں جس جماعتِ اسلامی اور مودودی کی تعریف حضرت قبلہ فرما گئے ہیں اس کے دستور اور کتاب تفہیمات سے وہ قطعی بے خبر ہوں گے۔

پھر اگر اس بے خبری کو فرض بھی کر لیا جائے تو کیا دنیا میں کوئی بھی منصف مزاج ایسے شخص کی بات کو وزن دے گا جو کسی جماعت کے بنیادی خیالات اور دستور تک سے ناواقف ہو؛ مگر برسرِ عام اعلان کرے کہ اس کے لٹریچر نے بڑا اہم کارنامہ انجام دیا اور قوم کو اس کا مرہونِ منت ہونا چاہئے!

باطن کے اسرار اللہ ہی جانتا ہے؛ لیکن درایت اور قیاس سے ہم نے تضاد و تبایُن کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ ''فطری حکومت'' تصنیف کرتے وقت اور وہ خط لکھتے وقت جس کا شروع میں ہم نے ذکر کیا ہے حضرت مہتمم صاحب ایک غیر متعصب غیر جانب دار انصاف پسند اور کشادہ دل انسان تھے جو خارجی اثرات و عوامل سے بے تعلق ہو کر ٹھیک ٹھیک وہی لکھ رہے تھے جو اُن کے نزدیک حق اور درست تھا؛ لیکن بعد میں جب خارجی عوامل و اثرات اور نازک تر حقائق نے آپ کو ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا جہاں دو گروہوں میں ایک کے خلاف اور ایک کے موافق آپ کو وکالت کرنی ضروری ہوئی تو آپ مجبور ہو گئے کہ کُرید کُرید کر فریق مخالف کے عیب چھانٹیں۔ وکالت ہر شخص جانتا ہے کہ ''حق دوستی'' کا نام نہیں ''مؤکل دوستی'' کا نام ہے۔ ایک وکیل اپنے علم و عقل کا سارا زور اپنے مؤکل کو برحق اور بے خطا ثابت کرنے اور فریق ثانی کو ناحق اور خطاوار ٹھیرانے میں صرف کرتا ہے۔ وہ اس کی بالکل پروا نہیں کرتا کہ کل کسی خاص موقع پر اس نے کن خیالات کا اظہار کیا ہے اور آج جو خیالات وہ اپنے مؤکل کی طرفداری میں ظاہر کر رہا ہے وہ کل کے خیالات کی نقیض اور عکس ہیں۔ اس کا تو واحد مقصد اپنے مؤکل کو جتانا اور سُرخرو کرنا ہوتا ہے۔

اگر ہمارا یہ قیاس غلط ہے تو خدا کی قسم ہم بالکل نہیں سمجھ سکے کہ اور کیا تاویل کریں۔ اگر کوئی گہرا راز اور مشکل رمز اس میں ہے تو خدارا کوئی ظاہر فرمائے۔ ہم ایمان کو درمیان رکھ کر کہتے ہیں کہ بلاتعصب ہر اُس بات کو قبول کریں گے جو معقول اور مشروع ہو۔

عبرت ناک

دستور پر اعتراض کرنے والے بزرگوں سے ہم پوچھیں گے کہ کیا آپ نے دستور کی ذیلی دفعہ ۶ پر بدگمانیوں

کے محل تعمیر کرتے ہوئے دستور کی دیگر دفعات کو نہیں دیکھا؟ اگر نہیں دیکھا یا دیکھنے کے بعد فراموش کر دیا تو ہم ادب کے ساتھ آپ کو ان کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔آپ بھی اور جملہ ناظرین بھی ملاحظہ فرمائیں۔

دستور بنانے والے عقیدے کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(۱) انسان ہر اُس تعلیم اور ہر اُس ہدایت کو بے چون و چرا قبول کرے جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہو۔

(۲) اس کو کسی حکم کی تعمیل پر آمادہ کرنے کے لیے اور کسی عقیدے کی پیروی سے روک دینے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہو کہ اس چیز کا حکم یا اس چیز کی ممانعت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے اور اس کے سوا کسی دوسری دلیل پر اس کی اطاعت موقوف نہ ہو۔

(۳) رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کسی کی مستقل بالذات پیشوائی اور رہنمائی تسلیم نہ کرے۔دوسرے انسانوں کی پیروی کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ کے تحت ہو نہ کہ اُن سے آزاد۔

(۴) اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت کو حجت اور سند ماننے اور مرجع قرار دے۔جو خیال یا عقیدہ یا طریقہ کتاب وسُنّت کے مطابق ہو اُسے اختیار کرے جو اس کے خلاف ہو اسے ترک کر دے اور جو مسئلہ بھی حل طلب ہو اُسے حل کرنے کے لیے اسی سرچشمۂ ہدایت کی طرف رجوع کرے۔"

ناظرین خدا کو حاضر و ناظر جانتے ہوئے فیصلہ کریں کہ مذکورہ بالا تصریحات کے بعد بھی کیا دستور سازوں کو ضال ومضل ٹھیرانا حد درجہ عبرت انگیز اور حیرت افزا نہیں ہے۔

"رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" کے معیارِ حق ہونے کے سلسلہ میں جو دُور از کار اتہام انبیائے سابق کی توہین کا لگایا جاتا ہے اس کی حقیقت بھی آپ دستور کے ان الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں کہ:

"محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد پیدا ہونے والے کسی دوسرے انسان کا یہ منصب تسلیم نہ کرے کہ اس کو ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کے کفر و ایمان کا فیصلہ ہو۔" (دستور جماعتِ اسلامی: ص ر ۱۳-۱۴)

اس عبارت میں خود دستور سازوں نے واضح کر دیا کہ محمدؐ سے پہلے نبیوں کا تو ذکر ہی کچھ نہیں آپ کے بعد کا ذکر ہے۔پھر بتائیے کیا کسی بھی امام، کسی بھی فقیہ کا عقیدہ اس کے سوا کچھ ہے جو دستور سازوں نے ظاہر کیا ہے۔

اگر معترضین جان بوجھ کر عوام کو وسوسے اور مغالطے میں ڈالنا چاہتے ہیں تو انھیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ أن النبي ﷺ نهى عن الاغلوطات (رسول اللہ ﷺ نے مغالطے بازی سے منع فرمایا ہے)۔(ابوداؤد)

اور اگر صدق نیت سے وہ دستور کو مردود و مضل قرار دے رہے ہیں تو انھیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ محض صدقِ نیت کسی اٹل سچائی کو جھوٹ کہنے کے لیے کافی نہیں ہے۔آخر کیا عیسائی اور یہودی اور قادیانی وغیرہم پورے صدقِ نیت سے اپنے اُن باطل عقائد میں گرفتار نہیں ہیں جنھیں آپ کفر وطغیان کا طمغہ عطا کرتے ہیں۔

عقیدۂ سلف

بے محل نہ ہوگا اگر بطورِ نمونہ چند اقوالِ سلف ملاحظہ فرما لیے جائیں:
شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں:

وقد صح اجماع الصحابة كلّهم أولهم عن أخرهم و اجماع التابعين أوّلهم عن أخرهم و اجماع تابعي التابعين أولهم عن أخرهم على الامتناع والمنع من أن يقصد منهم أحد إلى قول إنسان منهم أو ممن قبلهم فيأخذه كله.

''پورے کے پورے صحابہ اور تابعین کے تمام تابعین اور کُل کے کُل تبع تابعین اس عقیدے پر متفق ہیں کہ گزشتہ یا آج کے کسی بھی انسان کو یہ حیثیت ہرگز نہ دینی چاہیے کہ اس کی ہر بات لوگوں کا مقصد اور مرجع اور واجب الاطاعت بن جائے، نہ صرف یہ کہ ہر آدمی خود اس گمراہی سے باز رہے؛ بلکہ دوسروں کو بھی روکنا چاہیے۔''

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا عقیدہ یہ ہے:

ماجاء عن رسول الله ﷺ بابی هو و امی فعلى الراس والعين وما جاء عن الصحابة تخيرنا.

''جو بات رسول اللہ فداہ امی و ابی کی طرف سے آئے وہ سر آنکھوں پر اور جو بات صحابہ کی طرف سے آئے اس میں ہمیں اختیار ہے (چھانٹنے، قبول کرنے اور رَد کرنے کا)''

امام مالکؒ کا مسلک آپ اوپر کہیں دیکھ چکے۔ پھر ایک بار دیکھیے:

ما من أحد إلا وهو ماخوذ من كلامه و مردود عليه إلا رسول الله ﷺ.

''سوائے رسول اللہ ﷺ کے کوئی شخص ایسا نہیں جس کے کلام میں قابلِ قبول اور قابلِ رَد دونوں طرح کی باتیں نہ پائی جاتی ہوں''۔

کیا معترضین کرام امام مالکؒ کے بارے میں بھی کہیں گے کہ انھوں نے محمدؐ کے علاوہ تمام انبیاء کے کلام میں قابلِ رَد کلام کی شمولیت کا فیصلہ کیا ہے؟ ہر سابق نبی کو نا قابلِ اطاعت ٹھیرایا ہے؟ ہدفِ تنقید بنایا ہے؟

عقد الجید میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد نقل کرتے ہیں:

لاحجة في قول أحدٍ دون رسول الله ﷺ وان كثروا ولافي قياس ولا في شيء وماثم الإطاعة ألله ورسوله بالستليم. (ص/۹۷-۹۸)

''سوائے رسول اللہ کے کسی کا بھی قول بجائے خود حجت نہیں ہے چاہے اس قول کے قائل کتنے ہی کثیر ہوں۔ نہ سوائے رسول اللہ ﷺ کے کسی کا قیاس و اجتہاد بے دلیل اطاعت کے لائق ہے۔''

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ليس لأحدٍ مع الله و رسوله كلام.

''اللہ اور رسول کے آگے کس کی بات چل سکتی ہے۔''

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ صاف کہتے ہیں:

لم نؤمن بفقيهٍ أيًّا كان أنه أوحى الله إليه الفقه و في من علينا إطاعته وأنه معصوم.

''ہم کسی بھی فقیہ (خواہ امام ہو یا صحابی) کے بارے میں یہ نہیں مانتے کہ اس کی فقہ وحی ہے۔ نہ یہ مانتے ہیں کہ اس کی اطاعت ہم پر فرض ہے۔ نہ یہ کہ وہ معصوم ہے''۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اجعل الكتاب والسّنة أمامك وانظر فيهما بتأمّل و تدبر واعمل بهما و لاتغتر بالقال والقيل. (فتوح الغیب)

''قرآن و سنت ہی کو اپنا امام بناؤ اور ان میں غور و فکر کرتے ہوئے عمل کرو اور کسی اور کی قال و قیل سے دھوکہ میں نہ پڑھو۔''

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

لاواجب إلّا ماأوجبه الله ورسوله على أحد من الناس ولا أن تذهب بمذهب رجل من الأمة في دينه دون غيره. (اعلام الموقعین)

''واجب صرف وہ ہے جسے اللہ اور اس کے رسول نے واجب کیا کسی کے لیے درست نہیں کہ سوائے اللہ اور رسول کے کسی بھی اُمتی کا مذہب اختیار کرے اور دین میں اس کا مطیع ہو جائے۔''

ہزار ہزار رحمتیں ہوں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر۔ کیا عمدہ فرما گئے ہیں:

إن الله اصطفى محمداً صلّى الله عليه وسلم على العٰلمين وعصمهٗ من الآفات وإنما أنا متبع و لست بمبتدع فإن استقمتُ فتابعوني وإن زغتُ فقوموني.

''اللہ تعالیٰ نے جناب محمد ﷺ کو تمام جہانوں میں برگزیدہ بنایا اور تمام آفتوں سے محفوظ فرمایا۔ میں تو صرف ان کی پیروی کرنے والا ہوں نہ کہ خود اپنا نیا راستہ بنانے والا۔ پس اگر میں سیدھی راہ چلوں تو میری پیروی کرو اور اگر غلط راہ چلوں تو مجھے سیدھا کر دو۔''

جی چاہتا ہے کہ انبیاءِ سابق پر ایمان نہ رکھنے والے مودودی صاحب کی ایک مختصر عبارت تفہیم القرآن سے نقل کر دوں:

''خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر بھی آئے سب کے سب ایک ہی صداقت اور ایک ہی راہِ راست کی طرف بلانے آئے ہیں۔ لہٰذا جو شخص صحیح معنیٰ میں حق پرست ہے اس کے لیے تمام پیغمبروں کو برحق تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ جو لوگ کسی پیغمبر کو مانتے اور کسی کا انکار کرتے ہیں وہ حقیقت میں اس پیغمبر کے بھی پیرو نہیں ہیں''۔ (ج ر۱ص ر۱۱۶، حاشیہ:۱۳۶)

مولانا عبدالماجد دریابادی جن کے بارے میں سب باخبر جانتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی کے طرفدار نہیں ہیں۔ بلکہ بعض وقت کھُلی مخالفت کر جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''ہر مسلمان کا یہی عقیدہ ہونا چاہیئے۔ رسولِ خداؐ کو معیارِ حق بنانے کے معنیٰ یہ ہیں کہ سارے انبیاء کی تصدیق اس میں آگئی۔ معترض کو شاید تنقید اور توہین و تنقیص کے درمیان فرق نہیں معلوم۔ محدثین نے کس غضب کی تنقید رواۃ (راویانِ حدیث) پر کی ہے۔ کیا وہ سب توہین و تنقیص کے مرتکب ہوئے؟ علیٰ ہٰذا معترض کو پیروی اور ذہنی غلامی کے درمیان بھی فرق نہیں معلوم۔ پیروی تو اپنے اُستاد کی، باپ کی، ہر صالح و بزرگ کی، کی جا سکتی ہے، ذہنی غلامی یعنی بے چون و چرا و انقیادِ کامل کا حق صرف رسولِ معصوم کا ہے!''

جامع بیان العلم

گزشتہ سطروں میں ہم کہہ آئے ہیں کہ ابن عبدالبر کی کتاب ''بیان العلم'' ہمارے پاس نہیں۔ جو معروضات ہم نے کیں اگرچہ وہی اپنی جگہ کافی ہیں؛ لیکن یہ مضمون کتابت ہو چکا تھا کہ بیان العلم ہمیں میسّر آگئی اور اب آپ ملاحظہ فرمائیے کہ حقیقتِ حال کیا ہے۔

حضرت مولانا مدظلہ نے فرمایا تھا کہ مولانا مودودی نے بیان العلم سے جو روایتیں لی ہیں ان کی کوئی سند بیان العلم میں نہیں ہو سکتا ہے کہ کسی خارجی یا شیعی وغیرہ نے یہ روایتیں بیان العلم میں بڑھا دی ہوں۔ اور اگر یہ بات نہیں تو ابن عبدالبر نے ان کا وہ مطلب نہیں لیا جو مولانا مودودی ہمیں سمجھا رہے ہیں۔

ہم افسوس کے ساتھ عرض کریں گے کہ یہ سارے پہلو غلط نظر آتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نے بیان العلم کو سامنے رکھ کر یہ پہلو نکالے۔ مصر کی چھپی ہوئی جامع بیان العلم وفضلہ (لابن عبدالبر) مطبوعہ سنہ ۱۳۲۰ھ ہمارے سامنے ہے۔ صفحہ ۱۹۴ ر پر ابن عبدالبر نے باب قائم کیا ہے:

''باب حكم قول العلماء بعضهم في بعض''

مولانا مودودی نے تفہیمات میں جو روایتیں نقل کیں اور جن کو بیان العلم میں بے سند ٹھیرایا گیا انھیں ملاحظہ فرمائیں، بے سند ہیں یا سند کے ساتھ۔

علامہ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وروی علی بن مسهر عن هشام بن عروه عن أبيه قال قالت عائشة ماعلم أنس بن مالك و أبوسعيد الخدري بحديث رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم إنما كانا غلامين صغيرين. (ص/ ۱۹۷)

''اور روایت کی علی بن مسہر نے ہشام بن عروہ سے انھوں نے اپنے والد سے انھوں نے کہا کہ فرمایا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہ کیا جانیں انس بن مالک اور ابوسعید خدری حدیثِ رسول اللہ کے بارے میں جبکہ وہ حیاتِ رسول کے وقت چھوٹے لڑکے تھے۔''

اس کے آگے ایک اور روایت بھی دیکھتے چلیے جسے مودودی صاحب نے زیر بحث عبارت میں نہیں بیان کیا ہے:

ذكر حديث سمرة أنه قال كانت النبى صلّى اللّٰه عليه وسلم سكتتان (يعنى فى الصلٰوة عند قراءته) فبلغ ذالك عمران بن حصين فقال كذب سمرة. (ص/ ۱۹۷)

''ذکر کی گئی روایت سمرہ کی کہ انھوں نے کہا رسول اللہ کی نماز میں دو سکتے تھے (یعنی نماز میں قرأۃ کے وقت) پس اس کی خبر عمران بن حصین کو پہنچی تو انھوں نے کہا سمرہ نے جھوٹ کہا۔''

اسی کے بعد ہے:

و مثله ماروىٰ عن طاؤس قال كنت جالسًا عند ابن عمر فاتاه رجل فقال إنّ أباهريرة يقول إن الوتر ليس بحتم فخذوا منه و دعوا فقال ابن عمر كذب أبوهريرة. (ص/ ۱۹۷)

''اور اسی کے مانند (مذکورہ بالا روایت کے مانند) طاؤس سے روایت ہے کہ کہا میں ابن عمر کے پاس بیٹھا تھا اتنے میں ایک آدمی آیا اور کہا کہ ابوہریرہ کہتے ہیں وتر ضروری نہیں ہیں، انھیں پڑھ بھی سکتے ہو اور چھوڑ بھی سکتے ہو۔ پس کہا ابن عمر نے ابوہریرہ نے جھوٹ کہا۔''

مولانا مودودی کی لی ہوئی تیسری روایت دیکھیے:

و عن الحسن ابن على أنّه سئل عن قول اللّٰه جلّ وعزّ ''وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ'' فأجاب فيه فقيل له أن ابن عمر وابن الزبير قالا كذا وكذا خلاف قوله فقال كذبا. (ص/ ۱۹۸)

''اور حسن ابن علی سے روایت ہے کہ ان سے اللہ کے قول ''وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ'' کا مطلب پوچھا گیا تو انھوں نے مطلب بیان کیا پس کہا گیا کہ ابن عمر اور ابن زبیر تو آپ کے برخلاف یہ یہ مطلب بیان کرتے ہیں۔ پس کہا حسن ابن علی نے وہ دونوں جھوٹ کہتے ہیں۔''

آگے دیکھئے:

و عن علي ابن أبي طالب أنهٗ قال كذب مغيرة بن شعبة و عن عبادة بن الصامة أنهٗ قال كذب أبومحمد يعني في وجوب الوتر وأبومحمد هٰذا إسمه مسعود بن أوس أنصاري بدري. قدذكرناه في الصحابة و نسبناه و تكذيب عبادة له من روايت مالك وغيره في قصة الوتر. (ص/۱۹۸)

''اور حضرت علی ابن ابی طالب نے کہا کہ مغیرہ بن شعبہ جھوٹے ہیں اور عبادہ ابن صامت نے کہا ابو محمد جھوٹے ہیں (یعنی وجوبِ وتر کے باب میں انھوں نے غلط کہا ہے) اور ابو محمد مسعود بن اوس انصاری بدری کا نام ہے جن کا تذکرہ ہم نے صحابہ میں کیا ہے اور امتیازات بیان کیے ہیں اور عبادہ کا ان کو جھوٹا کہنا قصّہ وتر کے متعلق مالک وغیرہم کی روایت میں بیان ہوا ہے۔''

یہ ہیں وہ روایتیں جن کا ترجمہ مولانا مودودی نے کیا ہے۔ اور ملاحظہ فرمایا جائے کہ کیا یہ بے سند ہیں؟ بے شک ان میں بعض کی سند اس طرح بیان نہیں ہوئی، جس طرح کتبِ صحاح میں ہر حدیث کی بیان ہوئی ہے؛ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ راویوں سے بیگانگی کے باعث ابن عبدالبر نے منقطع یا مرسل روایتیں بیان کیں؛ بلکہ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان روایات کے بیان سے کسی اعتقادی تخلیق یا مسئلۂ شرعی کی تاسیس مقصود نہیں؛ بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اس طرح کے واقعات اگرچہ موجود ہیں؛ لیکن کسی کو زیبا نہیں کہ ان کے باعث کسی صحابی، کسی تابعی یا امام و عالم کی تنقیص کرے۔ جیسا کہ ہم آگے ثابت کریں گے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ روایتیں حدیث نہیں آثار ہیں، جن میں روایتِ حدیث کی پابندیاں ملحوظ نہیں رکھی جاتیں۔

اگر بیان العلم کے اس باب کو آپ دیکھیں تو اس میں یہاں تک ملے گا کہ یحییٰ ابن معین نے حضرت شافعی کے بارے میں کہا:

أنّهٗ ليس بثقةٍ. (ص/۲۰۱) ''وہ ثقہ نہیں ہیں''

یہاں تک ملے گا کہ:

لاتكذب عليّ كما كذب عكرمه على ابن عباس. (ص/۱۹۸)

''مجھ پر اِس طرح جھوٹ مت بول جس طرح عکرمہ نے ابن عباس پر جھوٹ بولا''۔

یہاں تک ملے گا کہ:

فذالك (أي إبراهيم النخعي) الأعور الذي يستفتيني بالليل و يجلس يفتي الناس بالنهار. (ص/۱۹۶)

''وہی بھینگا (ابراہیم نخعی امام ابوحنیفہ کے اُستاد) جو رات کو ہم سے فتوے پوچھ جاتا ہے اور دن میں مفتی بن کر لوگوں کو فتوے دیتا ہے!''۔

یہاں تک ملے گا:

فقال (أي إبراہیم النخعي) ذاك (أي الشعبي) الكذاب لم يسمع من مسروق شيئًا.

''پس کہا ابراہیم نخعی نے یہ (شعبی) کذاب ہے اس نے مسروق سے کچھ نہیں سُنا''

یہاں تک ملے گا کہ:

وقيل لعروة بن الزبير أن ابن عباس يقول أن رسول الله صلى الله عليه وسلم بعث بمكة بعد أن بعث ثلاث عشرة سنة فقال كذب انما اخذ عن قول الشاعر. (ص/۱۹۸)

''عروہ بن زید سے کسی نے کہا کہ ابن عباس فرماتے ہیں بعثت کے بعد آنحضور ﷺ تیرہ سال مکہ میں رہے عروہ نے جواب دیا ابن عباس جھوٹ کہتے ہیں انھوں نے یہ بات ایک شاعر سے سن لی ہے۔''

اور یہ شاعر کون تھا؟ ابوقیسؓ صرمہ بن انس انصاری صحابیِ جلیل۔ اور یہ شعر اس نظم میں کا تھا جو ابوقیسؓ نے آنحضور ﷺ کے مدینہ تشریف لانے پر کہی تھی۔

یہ مشتے نمونہ ازخروارے ہے۔ یہ باب ہی علامہ ابن عبدالبر نے اس طرح کے واقعات کے تذکرے میں قائم کیا ہے۔ اگر اس کا مطلب کوئی یہ سمجھ کر کہ اس سے تو اسلاف کی توہین ہوتی ہے ابن عبدالبر کی اسناد میں غلطی نکال کر خود انھیں غیر ثقہ قرار دے تو اس کی مرضی؛ لیکن اب تک تو کسی ناقدِ حدیث نے ابن عبدالبر کو غیر ثقہ اور غلط گو نہیں لکھا نہ ان کی ان روایتوں کو ایجاد و اختراع بتایا۔ بلکہ امام مالک کے ماننے والوں میں سے بھی کسی نے نہیں کہا کہ عبادہ بن صامت والی روایت امام صاحب کی طرف غلط منسوب کی گئی ہے۔ ابن عبدالبر کا بے تکلف اور برملا طرزِ بیان خود بتا رہا ہے کہ یہ روایتیں ان کے زمانہ میں اس درجہ معلوم و معروف تھیں کہ ان کے بیان میں حد درجہ مکمل ثبوت کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اگر یہ معروف و معلوم نہ ہوتیں تو کیسے ممکن تھا کہ اس طرح کی باتیں کہہ کر ابن عبدالبر اہلِ علم کی یلغار سے بچ جاتے۔

اہلِ انصاف فیصلہ کریں کہ کیا فن روایت کے ماہرین نے کبھی مرسل یا منقطع روایت کو ''بے سند'' کہا ہے جیسا کہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی مدظلہ العالی نے فرمایا۔ اور یہ بھی انصاف کریں کہ اگر ابن عبد البر جیسے مجتہد کی روایت حضرت حسن بن علی جیسے امام الاولیاء کی سند سے قابل قبول نہیں اور کسی بھی تاریخی واقعہ پر اعتبار کرنے کے لیے وہی شرائط لابدی ہیں جنھیں احادیث میں ملحوظ رکھا جاتا ہے، تو دنیا کی کونسی تاریخ ہے جس پر اعتبار کرنا ممکن ہوگا۔ دیگر اقوام کی بات تو الگ رہی، خود مسلمانوں کی تمام تاریخ پر خطِ تنسیخ کھینچ دینا پڑے گا اور تفصیلی واقعات تو درکنار اکثر حالات میں یہ بھی ثابت کرنا ناممکن ہو جائے گا کہ فلاں نام کا کوئی بادشاہ یا جنرل یا وزیر گزرا بھی ہے یا نہیں۔

یہ امکان کہ بیان العلم میں یہ عبارتیں کسی خارجی یا شیعی نے بڑھا دی ہوں گی۔ گزشتہ صفحات میں بہ دلائل عقلیہ ثابت کیا جا چکا۔ اب خود ابن عبد البر کی عبارتوں سے اس کا بطلان دیکھئے۔

ظاہر ہے کہ اگر کوئی خارجی یا شیعی ان عبارتوں کا مصنف ہوتا تو اس کا مقصد صحابہ کی تکفیر اور اہلِ علم کی تخفیف اور اہلِ ایمان کے عقائد میں فساد ڈالنا ہی ہوسکتا تھا؛ لیکن یہاں عبارتوں کے بیچ بیچ میں ذیل کے ٹکڑے ملتے ہیں:

والصحيح في هٰذا الباب أن من صحة عدالته و ثبّت في العلم أمانتهُ وبانت ثقته وعنايته بالعلم لم يلتفت فيه إلى قول أحد إلّا أنّ ياتي في جرحته بيّنة عادلة تصح بها جرحة علىٰ طريق الشهادات.

''اِس باب میں درست یہ ہے کہ جس شخص کی انصاف پسندی مسلّم ہوئی اور جس کی امانت داری علم میں ثابت ہوئی اور جس کی ثقاہت و ابستگی علم کے ساتھ ظاہر ہوئی اس کے ایسے کسی قول کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا جو سوائے اس کے کہ منصفانہ استدلال کے ذریعہ جرح پر مبنی ہو۔''

یہاں یہ بھی ملاحظہ فرمالیا جائے کہ خود ابن عبد البر صحابہ و ائمہ کے اقوال پر منصفانہ جرح اور امانتدارانہ تنقید کی کھلی اجازت دے رہے ہیں۔ آگے چلیے صفحہ ۱۹۵ پر یہ الفاظ ہیں:

لايلزم تقليدهم في شيئ منه دون برهان و حجة.

''نہیں لازم ہے تقلید ان کی (صحابہ ائمہ اور مجتہدین کی) اس طرح کی باتوں میں کسی بات میں سوائے اس کے کہ دلیل اور حجت مل جائے۔''

فرمائیے کیا دلیل و حجّت کا ملنا بغیر تنقید و تحقیق کے ممکن ہے۔ آگے چلئے:

(قال أبو عمر) معاذالله أن يكون الشعبي كذابًا بل هو امام جليل والنخعي مثله جلالةً و علمًا. (ص/١٩٦)

''(ابن عبدالبر فرماتے ہیں) معاذ اللہ شعبی کذاب کیوں ہوتے؛ بلکہ وہ تو بلند مرتبہ امام ہیں اور نخعی بھی انھیں کی طرح مرتبہ وعلم میں امام ہیں۔''

یہ عبارت اُس روایت کے بعد ہے جسے ہم بیان کر آئے، کہ شعبی اور نخعی نے ایک دوسرے کے بارے میں کیا کہا:

ابن عبدالبر تقریباً تمام ہی روایات کے بعد برابر واضح کرتے چلے گئے ہیں کہ صحابہ یا ائمہ نے ایک دوسرے کے بارے میں جو کچھ اس طرح کی باتیں کہیں وہ ہرگز بدنیتی پر مبنی نہیں تھیں؛ بلکہ محض بشری کمزوریاں تھیں۔ جیسا کہ عنقریب شق (ج) کے تحت ہم دکھائیں گے۔ فی الحال اُس عبارت پر نظر ڈالئے جو ابن عبدالبر خاتمۂ باب پر بہ حوالہ اسناد لکھتے ہیں:

رحم الله مالگا كان إمامًا. رحم الله الشافعي كان إمامًا. رحم الله أباحنيفة كان إمامًا.

''اللہ تعالیٰ مالک پر رحم فرمائے وہ امام تھے، اللہ تعالیٰ شافعی پر رحم فرمائے وہ امام تھے، اللہ تعالیٰ ابوحنیفہ پر رحم فرمائے وہ امام تھے''۔

فرمائیے! اگر بیان العلم میں کسی خارجی یا شیعی کی کارفرمائی ہوتی وہ قدم قدم پر صحابہؓ اور ائمہ کی تصویب و برأت کرتا، یا انھیں غلط در غلط ٹھیراتا۔ وہ ان کی لغزشوں سے صرفِ نظر کا مشورہ دیتا یا گرفت و اعتراض کا سبق پڑھاتا۔ وہ ائمۂ کرام کو امام تسلیم کراتا یا ناقابل تقلید بتاتا؟

ظاہر ہے کہ یہ بالبداہت ابن عبدالبر ہی کی عبارتیں اور روایتیں ہیں اور ان کے داخل کردہ اور اضافہ شدہ ہونے کا امکان کتاب دیکھے بغیر نکال دیا گیا ہے۔

ابن عبدالبر کا ذہن ان روایات کے بارے میں کیا تھا اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ انھوں نے پیشِ نظر باب کو اس حدیث سے شروع کیا ہے (ذکر اسناد کے بعد):

أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال دبَّ إليكم داء الأمم الحسد و البغضاء البغضاء هيل الحالقة لاأقول محلق الشعر ولكن محلق الدين (إلخ)

(ص/۱۹۴)

''فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم میں پچھلی اُمتوں کی بیماری دوڑ گئی ہے یعنی حسد اور بغض۔ بغض میں مونڈنے کی خاصیت ہے۔ میں نہیں کہتا کہ بالوں کو مونڈتی ہے؛ بلکہ دین کو مونڈتی ہے۔''

یہ حدیث غالباً بخاری میں بھی ہے۔ غور کیجیے ایک شخص کچھ ایسے واقعات جمع کرتا ہے جن میں بعض لوگوں نے ایک دوسرے پر چوٹیں کی ہیں، ایک دوسرے کو سخت لفظوں سے یاد کیا ہے۔ ان واقعات کے سرنامہ میں

وہ حدیث بالا درج کرتا ہے تو کیا پھر بھی اس میں کچھ شک ہوسکتا ہے کہ اس شخص کے نزدیک پیشِ نظر واقعات میں کسی نہ کسی حد تک جذبہ حسد کی کارفرمائی ضرور ہے۔ اور یہ کہ یہ شخص ان واقعات کو کسی نہ کسی درجہ میں ایسے نامحمود جذبے پر محمول کرتا ہے جس کی مذمت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ نے فرمائی ہے۔

مزید ثبوت کے لیے یہ دیکھئے۔ حدیثِ مذکور کے آگے ہی ابن عباسؓ کا مقولہ لکھتے ہیں:

فوالذي نفسي بيده لهم أشد تغايراً من التيوس في زربها. (ص/۱۹۴)

"قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، ان علماء میں ایک دوسرے سے اتنی مغایرت (شقاق و کشمکش) ہوتی ہے جتنی بکروں میں اپنے باڑے کے اندر۔"

(میں نے از راہِ ادب لفظی ترجمہ کیا ہے ورنہ اصطلاحاً یہ پیرایہ بیان "سخت جلن اور حسد" کے لیے ہوتا ہے)

مزید شہادت دیکھئے:

ان السلف رضوان الله عليهم قد سبق من بعضهم في بعض كلام كثير منه في حال الغضب و منه ماحمل عليه الحسد كما قال ابن عباس و مالك بن دينار و ابو حازم. (ص/۱۹۵)

"سلف رضوان اللہ علیہم میں بارہا باہمی ردّ وقدح ہو چکی ہے۔ کبھی غصہ میں، کبھی حسد میں جیسا کہ کہا ابن عباس اور مالک بن دینار اور ابو حازم نے۔"

یہ شہادتیں صریحاً ثابت کرتی ہیں کہ ابن عبدالبر کے نزدیک بھی اسلاف میں ایک دوسرے کے خلاف غصے اور حسد کا جذبہ پیدا ہوجاتا تھا۔ اور نہ صرف پیدا؛ بلکہ الفاظ کی شکل میں ظاہر بھی ہوجاتا تھا۔ تب فرمائیے کیا اعتدال سے متجاوز غصہ اور جذبہ حسد "بشری کمزوری" ہے یا خوبی؟ کیا "بشری کمزوری" سے ہلکا کوئی لفظ ہے جو حسد اور غصۂ مفرط کے بارے میں بولا جاسکے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر مودودی موردِ طعن و دشنام کیوں؟ ابن عبدالبر کیوں نہیں؟ انصاف سے دیکھا جائے تو ناخداترسی کے ساتھ اعتراض کا زیادہ موقع ابن عبدالبر پر ہے؛ کیونکہ انھوں نے ایک سخت حدیث اور سخت اثر سرنامہ میں دیا ہے۔

حق یہ ہے کہ ابن عبدالبر کا بھی مطلب اِس طرح کے واقعات لکھنے سے صرف یہ ہے کہ صحابہؓ اور ائمہؒ بشر تھے۔ بشری حیثیت سے جو بعض کمزوریاں ان کے اندر پائی گئیں وہ نہ تو گناہ و معصیت تھیں اور نہ اُن سے ان کی فضیلت و عظمت اور عدل وثقاہت پر کوئی حرف آتا ہے نہ اُن کے ایسے اقوال واحوال پر دینی شہادات وبیّنات کے بغیر جرح کی جاسکتی ہے۔

اور مودودی صاحب کا مطلب بھی بعینہٖ یہی ہے جسے ان کی دوسری تحریروں سے ہر غیر جانب دار قاری بلا تکلف

جان اور مان چکا ہے۔اب کوئی بلادلیل یہ کہے جائے کہ مودودی صحابہ کے مسلّمہ فضائل ومناقب کے قائل نہیں تو اِس کی دلیل اُس کے ذمہ ہے، اور جو عقیدتمندانِ کرام بغیر تحقیق اِس بات پر آمنّا وصدقنا کہہ بیٹھیں تو انھیں یاد رکھنا چاہئے کہ ایک دن انسان کے ہر قول وعمل اور خیالات وعقائد کا مکمل حساب اُس حاکمِ حقیقی کے سامنے ہونا ہے جس کے آگے کج بحثیاں اور افترا پردازیاں نہیں چل سکتیں۔جس کے آگے یہ عذر نہیں قبول ہوسکتا کہ ہم نے تو فلاں صاحب کے کہنے سے فلاں کو کافر سمجھ لیا۔اور ہمیں فرصت نہیں تھی کہ سچائی کی تحقیق کرسکیں۔

وماعلینا إلّا البلاغ والالتماس والتنبیہ

ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں

چشمِ بدُ ور مظاہر علوم سہارنپور سے بھی ایک کتابچہ اسی موضوع پر شائع ہوا ہے؛ کیوں نہ ہوتا۔قصبہ بولا تو ضلع کیوں نہ بولے؟ آخر مظاہر علوم والے بھی تو نائبِ رسول اور خادمِ دین ہیں۔کتابچے کا نام ہے:''مودودی جماعت کے عقیدۂ تنقید پر تبصرہ''۔مصنف ہیں مفتی مظفرحسین صاحب۔مقصدِ تصنیف ہے ادخال المودودي في الجهنم.

اعتراض الزام اور استدلال تمام وہی ہے جس پر ہم کلام کرتے چلے آرہے ہیں۔اقبالؔ نے کہا تھا ع

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

مرحوم اگر زندہ ہوتے تو ہم ان سے کہتے کہ حضرت آپ تو محض شاخ نازک پہ آشیانہ لیے پھرتے ہیں، یہاں اعاظمِ علم وعقل ریت پر بلکہ ہوا میں محل بناتے ہیں اور بندگانِ دردولت ان محلوں کو اپنے کاندھوں کا سہارا دے کر قیامت تک سلامت رکھنے کے دعویدار ہیں۔

بناء الفاسد علی الفاسد کی بہت مثالیں نظر سے گزری ہیں۔لیکن جماعتِ اسلامی کے باب میں علمائے کرام کی عنایتیں اس سے بھی آگے بناء الباطل علی الباطل کا نمونہ بن گئی ہیں۔فساد میں وجودِ شئ تو ہوتا ہے باطل میں وجود ہی ندارد۔زید نے کہا مکّے اور مدینے والوں کا ہر قول وفعل حجّتِ شرعی نہیں ہے۔بکر نے فوراً ایک کتاب تصنیف فرمادی کہ زید مکّہ اور مدینہ کو مقدّس نہیں مانتا اور مکّہ ومدینہ کی تقدیس وافضلیت کے اثبات میں عبارات کے ڈھیر لگادیئے۔

یہی حال مخالفین مودودی کا ہے۔انھوں نے طے کرلیا کہ مودودی چاہے کچھ ہی کہے جائے؛ لیکن اس کی ذو جہات تحریروں کے لازماً وہی معنیٰ لو اور دوسروں کو سمجھاؤ جن پر زندقہ والحاد کا فتویٰ آسانی سے لگایا جاسکتا ہو۔چنانچہ پیشِ نظر کتابچے میں بھی یہی کرشمہ نظر آتا ہے۔مفتی صاحب نے طے فرمادیا کہ مودودی سوائے خاتم النبیّین کے کسی نبی پر ایمان نہیں رکھتا اور صحابہ کے عیب چھانٹنا نہ صرف اپنے لیے ضروری سمجھتا ہے؛ بلکہ جماعتِ اسلامی

میں داخلے کی شرط ہی یہ قرار دیتا ہے کہ جو بھی آئے صحابہ کے عیب چھانٹتا آئے، ورنہ جماعت سے نکل جائے۔ یہ طے فرما دینے کے بعد ظاہر ہے کہ وہ آیات و احادیث اور اقوالِ سلف کے جتنے چاہے انبار لگا دیں، کس کی مجال ہے جو اعتراض کر سکے۔

ہم حیران ہیں کہ آخر ہمارے بزرگوار "معیارِ حق" کے معنیٰ کیا سمجھتے ہیں۔ اس لفظ سے نکالے ہوئے تمام نتائج ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ "معیارِ حق" کے ایک ایسے معنیٰ متعین کرتے ہیں جو جماعتِ اسلامی والوں کے وہم میں بھی نہیں آئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار وہ آیات و احادیث پیش کرتے ہیں جن میں صحابہؓ کی افضلیت و عظمت کا بیان ہے۔ جماعتِ اسلامی کے افراد سے ہمیں ذاتی واقفیت کچھ نہیں۔ صرف ان کے لٹریچر سے ہم نے یہ یقین کیا ہے کہ جو شخص "معیارِ حق" کے وہ معنیٰ لیتا ہے جن سے صحابہ کے اسلامی مرتبہ میں فرق آتا ہو وہ انصاف نہیں کرتا؛ بلکہ جماعت پر ایک من گھڑت الزام لگاتا ہے۔ جماعت کے لٹریچر میں ایسی بعض چیزیں ضرور ملتی ہیں جو ظاہری شکل اور اندازِ بیان کے اعتبار سے موہم یا کرخت یا غلط یا حد سے متجاوز کہی جا سکتی ہیں؛ لیکن ان کی مقدارِ نقص و خطا کو آپ اُس ترازو سے تولتے ہیں جس میں ایک طرف عصبیت اور عناد کے پاسنگ رکھے ہوئے ہیں۔ آپ ایسی خوردبین سے انھیں دیکھتے ہیں جو ایک بالشت کی چیز کو گز بھر کر کے دکھاتی ہے۔ تشریح اس کی یہ ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بج رہی، نقص اگر مودودی کی بعض عبارتوں میں موجود ہے تو ٹمپریچر آپ کا بھی درست نہیں ہے، آپ حقیقت میں آنکھوں سے دیکھنے کی بجائے بھینگی آنکھوں سے دیکھتے ہیں جو ایک ایک کے دو دو دکھاتی ہیں۔ آپ کے چھوٹے چھوٹے لوگ مودودی پر اعتراض کرتے ہوئے ایسے انداز میں باتیں کرتے ہیں جیسے کوئی پروفیسر آٹھویں کلاس کے طالبِ علم سے مخاطب ہو۔ آپ کے ہمنواؤں کی سنجیدگی یہاں تک پہنچی ہوئی ہے کہ مودودی سے پوچھتے ہیں تم نے کس مدرسہ میں پڑھا ہے۔ کون سے دارالعلوم کی سند حاصل کی ہے؟ حالانکہ ان سعادت مندوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کو امام و علامہ تسلیم کرنے سے پہلے اُن سے کبھی نہیں پوچھا کہ حضور کے سرِ مبارک پر کس مدرسہ کی دستارِ فضیلت بندھی ہے۔ اگر پوچھتے تو معلوم ہوتا.....

مگر وہ پوچھتے ہی کیوں۔ حضرت ابوالکلام آزاد کی تفسیر کی بعض عبارتیں کسی نے مولانا اشرف علی علیہ الرحمۃ کی خدمت میں بھیجیں اور لکھا کہ دیکھئے ان سے یہ یہ مطلب برآمد ہوتا ہے۔ آپ کا کیا فتویٰ ہے؟ مولانا مغفور نے جواب دیا کہ ان عبارتوں کا لکھنے والا ابھی زندہ ہے اس سے دریافت کرو کہ کیا اس نے یہی مطلب لیا ہے، جو آپ لے رہے ہیں؟ اگر وہ کہے گا کہ ہاں تب میں فتویٰ دوں گا اور اگر اس نے کچھ اور مطلب بیان کیا تو خواہ مخواہ میں کیوں آپ کے بیان کردہ مطلب کو درست مانوں اور حکم لگاؤں۔

اس کے برخلاف آپ لوگوں کا یہ حال ہے کہ مودودی صاحب کی عبارتوں کا حد درجہ مکروہ مطلب متعین کرتے

ہیں اور خود ان سے تو کیا پوچھتے اگر وہ خود ہی کچھ اور بہتر مطلب بیان کرتے ہیں تب بھی آپ رَٹ لگائے جاتے ہیں کہ نہیں وہی مطلب ٹھیک ہے جو ہم نے لیا۔

زیر بحث کتابچہ کے اختتام پر جناب ناظم صاحب مدرسہ مظاہر علوم بڑی للّٰہیت سے لکھتے ہیں:

''میں نے مولانا، مولوی، حافظ، قاری، مفتی مظفر حسین صاحب کا تحریر فرمودہ مضمون غور سے دیکھا ماشاءاللہ بہت تحقیق و تفتیش سے لکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ شائع کر دیا جائے تو ان شاء اللہ انصاف پسند طبائع کو اس مسئلہ میں کوئی اُلجھن باقی نہ رہے گی۔''

اللہ اکبر! کیا ناظم صاحب واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ سب مسلمان بالکل احمق و جاہل ہیں جو اب تک صحابہؓ کی فضیلت اور انبیاء کی معصومیت کے مسئلہ میں اُلجھن میں گرفتار تھے؟ ع

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیئے

دیانت کی لاجواب قسم

اس کتابچہ کے آخری صفحہ پر اشتہار ہے ''رَدِّ مودودیت میں حسب ذیل کتابیں ملاحظہ فرمائیے۔''

اس کے بعد جو کتابیں درج ہیں ان میں مولانا محمد طیّب صاحب مہتمم دارالعلوم کی ''نظریہ دو قرآن پر ایک نظر'' بھی ہے۔

حیران ہو جیئے کہ یہ کتاب ''دو اسلام'' اور ''دو قرآن'' کے مصنف برقؔ صاحب کی تردید میں ہے اور برق صاحب جس مکتبۂ فکر سے تعلّق رکھتے ہیں اس کی صریح و واضح کفریات کے جامۂ حریر کی ایک ایک بخیہ خود جماعتِ اسلامی کے اہلِ قلم نے اس طرح اُدھیڑی ہے کہ جسمِ نازنین کبھی کا سربازار ننگا ہو چکا ہے اس پر ہمارے سہارنپوری بزرگوں کی دیانت و دانش مندی ملاحظہ ہو کہ وہ مہتمم صاحب کی مذکورہ کتاب کو ''رَدِّ مودودیت'' کے ذیل میں دے رہے ہیں۔ ایسی کھلی بے ایمانی اللہ والے تو کیا وہ دنیادار بھی نہیں کرتے جو کاروباری اخلاق اور تجارتی راست بیانی کی اَبجد سے واقف ہوتے ہیں۔ ع

کیا نہ پیچوگے جو مل جائیں صنم پتھر کے؟

ہم بالیقین کہتے ہیں کہ اگر آپ قرآن کی کسی آیت کے ترجمہ کو مولانا مودودی کی عبارت سمجھ بیٹھیں تو اس پر بھی فتویٰ گمراہی جھاڑنے سے دریغ نہ فرمائیں گے۔ جیسا کہ مفتیانِ دارالعلوم دیوبند کے تجدید نکاح والے فتوے نے ثابت کر دیا اور جیسا کہ بہت دن ہوئے اسی دارالعلوم کے معزز مفتیوں نے علّامہ شبلی اور علامہ حمید الدین فراہی پر ایسا ہی دلبرانہ فتویٰ صادر فرما کر واضح کیا تھا کہ ہم جسے چاہیں دوزخ بھیجیں جسے چاہیں جنت۔

آئندہ

کل کا حال کوئی نہیں جانتا۔ اگر زندگی اور عافیت رہی تو ان شاءاللہ ثم ان شاءاللہ آئندہ ہم مندرجہ ذیل اُمور پر کلام کریں گے:

(۱) حضرت مولانا نانوتویؒ پر دارالعلوم کے کافرساز مفتیوں نے جو فتویٰ کفر داغا ہے وہ ناظرین ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اگرچہ ہم نہیں جانتے کہ اسلام کی اس سب سے بڑی گالی سے حضرت مولانا مغفور کی روحِ مقدس پر کیا کچھ گزر گئی ہوگی۔ اب سے پہلے بھی حضرت ہی کے ایک شعر پر ٹھیک اسی طرح ایک فتویٰ زریں داغا جا چکا ہے اور ہم اس باب میں مفتیانِ شعلہ نوا کو معصوم حد تک غیر مکلف اور ناقابل التفات سمجھ چکے ہیں۔ تاہم خیال تھا کہ حقیقتِ حال منکشف ہو جانے پر دارالعلوم کے ذمہ دار حضرات پوری اخلاقی جرأت کے ساتھ غلطی کا اعتراف کرلیں گے؛ لیکن بجائے اعتراف کے حضرت مولانا طیّب صاحب مہتمم دارالعلوم کا ایک جوابی مضمون الجمعیۃ دہلی کی تین اشاعتوں میں شائع ہوا ہے اور اس کی ایک قسط مارچ کے ماہنامہ دارالعلوم میں بھی جنابِ مدیر کے نوٹ کے ساتھ آئی ہے۔ جنابِ مدیر کی قلم طرازیوں کے بارے میں ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ وہ اپنی ''ملازمتی'' ذمہ داریوں کی زنجیر میں اسیر و ''دست بستہ'' ہیں؛ لیکن حضرت مہتمم صاحب کی تحریر پر ہم مفصل کلام کریں گے اور بتائیں گے کہ انصاف کا ترازو کہاں تک جھک گیا ہے۔

(۲) حوا علیہا السلام کے بارے میں مودودی ہی کی مزاج پرسی کے طور پر ایک مضمون دارالعلوم نومبر ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اور بعدہٗ جنابِ مدیر نے فروری ۵۶ء میں کچھ اور لکھا۔ ہمیں اس پر بھی کلام کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ مودودی کو دوزخ میں زبردستی گرا دینے کے شوق میں ہمارے مدیر دارالعلوم حدیثوں تک میں اضافہ کی کاریگری فرما لیتے ہیں۔ اللھم حفظنا۔ نیز یہ بتانا ہے کہ بربنائے خیانت یا بربنائے جہل وہ کتابوں کا حوالہ تک جھوٹا دیتے ہیں۔ نیز یہ بتانا ہے کہ وہ ترجمہ میں صحت اور ایمانداری کی پروا نہیں کرتے۔ گویا ہم تین جرم ان کے ثابت کریں گے۔ خیانت فی الحدیث، خیانت فی الحوالہ اور خیانت فی الترجمہ۔ خدا جانتا ہے کہ ہمیں کسی کی تحقیر و تذلیل میں حظِ نفس حاصل نہیں ہوتا؛ لیکن قلم اُٹھانے پر ہم اس لیے مجبور ہوئے ہیں کہ دیوبند کے علماء کی جو عزت اور ساکھ اہلِ علم میں قائم تھی اسے تعصبِ جاہلی کے ذریعہ برباد کیا جا رہا ہے۔ اور شیش محل میں بیٹھ کر راہگیروں پر پتھر پھینکے جا رہے ہیں۔ علم سے عاری اور کینہ و بغض سے آلودہ لوگ جب جبہ و دستار پہن کر مسندِ رہنمائی پر بیٹھ جائیں اور خدا کے دین کے کھیل کھیلیں تو کسی صاحبِ ضمیر کے لیے یہ جائز نہیں کہ تا بحدِ استطاعت ان کی قلعی نہ کھولے اور اُمت کو گمراہی سے نہ بچائے۔

(۳) مارچ ۵۶ھ کے ماہنامہ دار العلوم میں مولانا سید محمد انظر شاہ صاحب کا مضمون "مسئلۂ ظہور مہدی حدیث کی روشنی میں"۔ شائع ہوا ہے۔ اس پر بھی ہمیں گفتگو کرنی ہیں اور یہ بھی دکھلانا ہے کہ جنابِ موصوف مودودی صاحب کو دوزخیوں کی فہرست میں داخل کرنے کی تمنائے معصوم میں دروغ وافترا تک سے دریغ نہیں کرتے اور جماعتِ اسلامی کو ذبح کرنے کی خاطر اُن بریلویوں تک سے تعاون فرماتے ہیں جو آج تک مولانا نانوتوی، مولانا تھانوی، حضرت اسماعیل شہید اور مولانا خلیل احمد وغیرہم رحمہم اللہ کو خاطی وگمراہ ہی کہے چلے جارہے ہیں۔ ع

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!

خریداروں سے

آپ حضرات جانتے ہیں کہ "دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر" رکھنے والا کسی بھی وقت موت کے دہانے میں جاسکتا ہے۔ یہ بھی آپ دیکھ چکے کہ آج کی دنیا میں حق گوئی کی سزا مارشل لا سے جیل اور پھانسی تک بہ آسانی دی جاسکتی ہے۔ لہٰذا اگر اگلا پرچہ آپ کو اپنے متعینہ وقت پر نہ ملے تو سمجھ لیجئے گا کہ آپ کا ناتواں عامر امتحان وابتلا کے کسی اسٹیج پر جاچکا ہے۔ تب آپ صبر سے کام لیجئے گا اور یقین رکھئے گا کہ جب بھی یہ امتحان ختم ہوگا خاکسار آپ کے سالانہ چندوں کی ماوجب رقم ان شاء اللہ یقیناً ادا کرے گا۔

لیکن اگر یہ امتحان زندگی کی آخری سرحد کو پار کر جائے تو پھر اس عاجز کے پاس اس گزارش کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ آپ حضرات اپنے بقایا پیسے از راہِ احسان معاف فرما کر مجھے حسابِ آخرت سے بچالیں۔ میرے پاس اپنے تجلّی کے سوا کوئی جائداد ایسی نہیں ہے جس سے میرے بعد میرا قرضہ اُتر سکے۔

آپ کے احسان وکرم اور دعا کا متمنّی خاکپائے علماء

عامر عثمانی

(تجلی اپریل ۱۹۵۶ء)

واللہ مستعان وبہ نتوکّل، و نعوذ من شر الوسواس الخنّاس الذي يوسوس في صدور النّاس من الجنّة والنّاس.

....

یہاں ہم ’’دارالعلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ‘‘ کے جائزہ کو آگے بڑھاتے ہوئے اگلے عنوان پر کلام کرنے ہی والے تھے کہ مئی ۱۹۵۶ء کے تجلی پر نظر پڑگئی گزشتہ صفحات میں اپریل ۱۹۵۶ء کے تجلی سے جو صفحات ہم نے نقل کیے ہیں ان میں مولانا قاسم کی تحریر پر دارالعلوم دیوبند سے دیے گئے کفر کے فتوے کا ذکر ہے۔ بلاشبہ بات اَدھوری ہے اور ہوسکتا ہے قارئین کو یہ اشتیاق رہے کہ نہ جانے کیا معاملہ ہوا ہوگا جو ایسا فتویٰ دارالعلوم سے دیا گیا۔

قارئین کے اسی اشتیاق کو دُور کرنے اور تشفی وتسکین فراہم کرنے کی غرض سے ہم نے سوچا کہ مئی ۱۹۵۶ء کے وہ چند صفحات بھی یہاں پیش کردیں تاکہ بات پوری طرح واضح ہوجائے اور آپ لوگ دیکھ سکیں کہ کس بے دردی کے ساتھ مولانا مودودی کی تحریروں میں کاٹ چھانٹ کرکے ان پر بلاوجہ اعتراض کرتے ہوئے انھیں کیسے بدنام کیا گیا ہے۔

لیجیے مئی ۱۹۵۶ء کا تجلی ملاحظہ فرمائیے ؎

نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گل چیں
تری قسمت سے رَزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

حضرت مہتمم صاحب کا مضمون

گزشتہ اشاعت میں تین اُمور پر کلام کرنے کا ہم نے وعدہ کیا تھا، ان میں سے پہلا حضرت مہتمم صاحب کے مضمون کا قضیہ ہے۔

مودودی اور جماعتِ اسلامی کے خلاف دیوبند اور بیرونِ دیوبند سے اب تک دسیوں اشتہار اور کتابچے شائع ہوتے رہے ہیں۔ خدا جانتا ہے کہ بارہا ہم نے انھیں انتہائی خلوص اور طلبِ حق کے جذبہ سے صرف اس لیے پڑھا کہ مخالفین کا موقف اور جماعتِ اسلامی کی گمراہی ہم پر معقول اور متعیّن طور پر واضح ہوجائے اور ہم بھی اس گمراہی کی مدافعت میں اپنے بزرگوں کا ساتھ دیں۔ لیکن قسم ہے وحدہٗ لاشریک کی ہم نے ان میں تحریف وتلبیس اتہام وافترا اور عناد ونامعقولیت کے ایسے ایسے نمونے پائے کہ ہمارا ضمیر درد سے کراہ اُٹھا۔ اور ہمیں ماننا پڑا کہ، ان اشتہاروں اور کتابچوں کے مصنف (بشرطیکہ افترا اور سب وشتم پر تصنیف کا اطلاق ہوسکے) یا تو آخرت کے حساب کتاب اور اللہ کے علیم وخبیر ہونے پر صدق دل سے ایمان نہیں رکھتے یا پھر عناد وعصبیت نے انھیں اس قدر مغلوب ومفلوج کردیا ہے کہ مودودی اور جماعتِ اسلامی کو بدنام ورُسوا کرنے کی قیمت پر وہ دوزخ کی آگ تک کو گوارا کرنے

کے لیے تیار ہیں۔ ان کی فتوے بازی اور الزام تراشی میں جہاں حد درجہ گھٹیا طرزِ فکر نظر آیا وہیں یہ بھی نظر آیا کہ وہ سنجیدگی و معقولیت تو کیا اختیار کرتے شریفوں کی سی زبان تک انھیں میسر نہیں۔

معدودے چند مضامین بے شک ایسے بھی نظر پڑے جن میں متعین طور پر مودودی صاحب کی کسی رائے سے اختلاف کیا گیا تھا۔ اختلاف کرنا یقیناً کچھ بُری چیز نہیں ہے اور یہ بھی ہمیں تسلیم کہ معترضین کے بعض اعتراض وزندار بھی رہے۔ لیکن جس طرح شربت کے بھرے گلاس کو ایک قطرۂ زہر فاسد کر دیتا ہے اسی طرح ہم نے ان مضامین کو عناد وتعصب کے زہر سے مسموم پایا اور دیکھا کہ مودودی صاحب کی ہر غلطی کو معترضین اُس خوردبین سے دیکھ رہے ہیں جو گز بھر کی چیز کو دس گز کر کے دکھاتی ہے اور ادنیٰ ادنیٰ جُرموں پر وہ وہ سزائیں تجویز کر رہے ہیں جو بڑے بڑے جرموں پر بھی بمشکل دی جاتی ہیں۔

خیر ہم نے انھیں نظر انداز کیے رکھا کہ ہماری نظر میں وہ کسی سنجیدہ التفات اور توجہ کے مستحق نہیں تھے۔ لیکن آج ہمیں مجبوراً زبان کھولنی پڑ رہی ہے؛ کیونکہ فخر الاماثل حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کا جوابی مضمون مفتیان دارالعلوم کی صفائی اور طرف داری میں شائع ہوا ہے وہ اُن توقعات کے بالکل خلاف ہے جو اُن جیسے بزرگ اور باعلم انسان سے کوئی انصاف پسند رکھ سکتا ہے۔ اس مضمون میں فکر ونظر کے کچھ ایسے زاویے پائے جاتے ہیں جن کی اُمید حضرت جیسے عالم و دانا کے عوض کسی ایسے ہی شخص سے ہو سکتی تھی جو آخرت کی جواب دہی کا قائل نہ ہو۔ یا تو ہم ہی اندھے اور دیوانے ہو گئے ہیں یا پھر اس صورتِ حال کے پیچھے کوئی ایسا پوشیدہ نکتہ ہے جسے اللہ علیم و دانا ہی جان سکتا ہے۔

حضرت کا یہ مضمون الجمعیۃ دہلی میں قسط وار شائع ہوا ہے۔ اور ماہنامہ دارالعلوم میں بھی ایک قسط ادارتی نوٹ کے ساتھ آچکی ہے۔

دارالعلوم کا ایک عنوان یہ ہے:

''جماعتِ اسلامی کی تحریری تلبیس کا ایک افسوسناک نمونہ''

الجمعیۃ کی سرخی یہ ہے:

''علمائے کرام کی طرف منسوب کی ہوئی جعلی عبارتیں اور مودودی صاحب کی تصریحات''۔

ذیلی سرخیوں میں ''ایک جعلی استفتاء'' کے الفاظ ہیں۔

اِس بات سے قطع نظر کہ یہ اخباری ٹائپ کی سُرخیاں علمی ثقاہت وسنجیدگی کے کہاں تک مطابق ہیں یہ ملاحظہ فرمانے کی ضرورت ہے کہ ان سرخیوں کو پڑھنے والوں کا ذہن ایک دم بلاتکلف کس طرف جاتا ہے۔ بالیقین ان کو پڑھ کر یہ چند باتیں ذہن میں آتی ہیں کہ کسی بدبخت یا بدبختوں نے جعلی (اپنی تمام تر مذموم وقبیح تعبیرات کے ساتھ)

عبارتیں علمائے کرام کی طرف منسوب کر دی ہیں۔ اور کوئی جعلی استفتاء پیش کیا ہے اور تلبیس وتحریف کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اور خود مودودی صاحب بھی اس جرم میں شریک ومعاون ہیں۔

یہ کم سے کم تفصیل ہے جس کی طرف ذہن ان عنوانات سے جاتا ہے۔

اب ذرا اصل حقیقت کو ملاحظہ فرمایا جائے کہ واقعہ کیا اور کس طرح ہے۔

واقعہ صرف یہ ہے کہ ایک شخص نے مولانا نانوتوی کی کتاب تصفیۃ العقائد سے دو عبارتیں دو مختلف صفحوں سے بغیر کسی تغیر وتبدل کے لیں اور مفتیانِ دارالعلوم کی خدمت میں بغیر مصنف کا نام لکھے بھیج دیں۔ مفتیانِ دارالعلوم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ کھٹ سے فتویٰ جڑ دیا کہ ان عبارتوں کا مصنف گمراہ وکافر ہے اور اس کا نکاح فاسد ہوا دوبارہ نکاح کرے۔ گویا دوبارہ نکاح نہ کیا تو آگے کا سلسلۂ نسب فاسد! (وَ إِنَّمَا أَنَا بَرِيءٌ مِّنْهُ)

اس فتویٰ کو ایک صاحب نے اپنے مضمون میں شائع کیا۔ اور علمائے کرام سے مؤدبانہ گزارش کی کہ دیکھئے آپ لوگ جو مودودی کی عبارتوں کو ان کی اپنی جگہ سے الگ کر کے اور کتر بیونت کر کے فتویٰ بازی کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ وہی کھیل اگر کوئی اور آپ کے ساتھ کھیلے تو مولانا نانوتوی کی فلاں فلاں عبارت پر کیسے کیسے اعتراض نہیں کیے جا سکتے۔ خود آپ کے مفتیوں نے آپ ہی کے مقتدائے اعظم حضرت نانوتویؒ کی عبارتوں پر کفر کا فتویٰ رسید کر دیا۔

یہ ہے کُل واقعہ۔ اس میں کس حد تک جعل سازی ہے۔ کتنے عالموں کی طرف غلط عبارتیں منسوب کی گئی ہیں۔ کیا دخل اس میں مودودی صاحب کا ہے اس کا فیصلہ ناظرین خود فرمائیں۔ صرف ایک بات ہماری تصریح کے قابل رہ جاتی ہے کہ مستفتی نے جو دو عبارتیں دو صفحوں سے لے کر فتویٰ پوچھا تو کیا یہ جعل سازی ہے یا نہیں؟ اس کی تصریح یہ ہے کہ اوّل تو دو ایسی عبارتوں کو یک جا کر دینا جن میں سے ہر ایک بلا کسی ادنیٰ تبدیلی کے نقل کی گئی ہو محض ایک ''جعلی عبارت'' تیار کرنا ہے نہ کہ ''جعلی عبارتیں''۔ اور معاملہ صرف ایک عالم (مولانا نانوتویؒ) کا ہے نہ کہ ''علماء'' کا۔ دوسرے اس مبالغہ والباس سے قطع نظر ہم مہتمم صاحب کے ارشاد کو بالکل تسلیم کر لیتے اگر صورت یہ ہوتی کہ فتویٰ لینے والے نے دو عبارتوں کے جوڑ سے ایک ایسی مغالطہ آمیز عبارت تیار کر دی ہوتی جو مولانا نانوتوی کے بارے میں کسی غلط اور خلافِ منشاء عقیدے کو ظاہر کرتی۔ جیسا کہ مودودی کے خلاف بریلویوں اور منکرین حدیث اور بدعتیوں وغیرہم کا طرزِ عمل ہے۔ لیکن واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ایک بار استفتاء کی عبارت کو پھر ملاحظہ فرمالیں:

> ''دروغ بھی کئی طرح پر ہوتا ہے جن میں سے ہر ایک کا حکم یکساں نہیں۔ ہر قسم سے نبی کو معصوم ہونا ضروری نہیں۔''

یہ تصفیۃ العقائد (مطبوعہ کتب خانہ اعزازیہ دیوبند) صفحہ ۲۳، سطر ۵ کی عبارت ہے۔ جس میں کسی شوشے یا نقطے کی تبدیلی نہیں۔

اس کے بعد:

”بالجملہ علی العموم کذب کو منافی شانِ نبوت بایں سمجھنا کہ یہ معصیت ہے اور انبیاء علیہم السلام معاصی سے معصوم ہیں خالی غلطی سے نہیں۔“

یہ صفحہ ۲۵، سطر ۱۴ کی عبارت ہے۔

ان دو عبارتوں کو یکجا کرنے پر مہتمم صاحب نے ایک بڑی ابلہ فریب اور مغالطہ انگیز مثال پیش فرمائی ہے۔ یہ کہ: مستفتی کی یہ حرکت ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص قرآن سے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لے کر قرآن ہی کے کسی دوسرے صفحہ سے اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا جوڑ دے یہ مثال جہلاء کے لیے تو دلفریب ہوسکتی ہے۔ لیکن ہم اہلِ علم سے پوچھتے ہیں کہ کیا واقعی یہ مثال ہے؟

غور فرمائیے۔ کوئی شخص استفتاء میں پوری کتاب تو نقل نہیں کرسکتا۔ وہ کسی خاص مسئلہ میں مصنف کی رائے اور خیال کو واضح کرنے کے لیے ایک دو جگہ سے ایسی عبارتیں لے لیتا ہے جن سے مصنف کا خیال و عقیدہ پوری طرح واضح ہو کر سامنے آجائے۔ گویا اس نے دو جگہ سے عبارتیں لے کر یہ نہیں کیا کہ جو کچھ مصنف کا عقیدہ اس کتاب میں درج ہے اس کے برعکس عقیدہ سامنے آگیا ہو، اور اِس برعکس عقیدے پر مفتیوں نے کفر کا فتویٰ داغ دیا ہو؛ بلکہ اس نے ٹھیک ایسی عبارتیں لیں جو مصنف کے عقیدہ وخیال کو نمایاں طور پر ظاہر کرنے والی ہوں۔

اس کے برخلاف جو شخص اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے بعد اَصْحٰبُ النَّارِ جوڑ دیتا ہے وہ تو دو ایسی عبارتیں جمع کرتا ہے جن کے معنیٰ قرآن کے سو فی صدی برعکس ہیں۔ جن کا مفہوم پورے قرآن پر خطِ تنسیخ کھینچ دیتا ہے۔ کیا کوئی انصاف پسند شخص مذکورہ دونوں شخصوں کو ایک حکم میں رکھ سکتا ہے۔ کیا ان دونوں کی حرکتیں ایک دوسرے کے لیے مثال کہی جاسکتی ہیں؟

خدا کے لیے ہر شخص ایمانداری سے غور کرے کہ مستفتی کی پیش کردہ ”جعلی عبارت“ سے اس کے سوا کیا سمجھ میں آتا ہے کہ مولانا نانوتوی ”جھوٹ“ کی کئی قسمیں فرما کر ان کے الگ الگ حکم بیان فرما رہے ہیں اور بعض قسمیں ان کے نزدیک ایسی ہیں جن سے نبی بھی متصف ہوسکتا ہے۔ نیز یہ کہ ہر ہر جھوٹ کو گناہ تصور کرنا اور نبی چونکہ معصوم ہوتے ہیں اس لیے ہر ہر جھوٹ کو ان کی شان کے خلاف سمجھنا درست نہیں ہے۔

بتائیے کیا اس کے علاوہ بھی کچھ مطلب ان عبارتوں کا ہے؟ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے بعد اَصْحٰبُ النَّارِ جوڑنے والے نے جس طرح آیت بلکہ پورے قرآن کا مطلب اُلٹا کر دیا۔ کیا یہاں بھی دوسری صفحہ ۲۵ کی عبارت نے صفحہ ۲۳ کی عبارت اور پورے مضمونِ کتاب کو اُلٹا کر دیا؟ آپ تصفیۃ العقائد اُٹھا کر دیکھ لیں یہ بات بالکل نہیں بلکہ دوسری عبارت نے پہلی عبارت سے مل کر حضرت نانوتوی کے مافی الضمیر ہی کو واضح کیا ہے جس کا

ثبوت ہم سے نہیں خود مہتمم صاحب قبلہ سے ان کے اسی مضمون میں سنئے۔ لکھتے ہیں:

''پہلی عبارت کا حاصل تو یہ ہے کہ دروغ کئی قسم کا ہوتا ہے ہر ایک کا حکم یکساں نہیں۔ نبی کا ہر قسم سے معصوم ہونا ضروری نہیں۔''

اس سے بھی زیادہ وضاحت سے دیکھئے۔ حضرت نانوتویؒ کے عقیدہ کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حاصل یہ ہے کہ جہاں شریعت نے جھوٹ سے روکا، اور اسے کبیرہ گناہ کہا ہے وہیں بعض کذبات کی اجازت بھی دی ہے حتیٰ کہ بعض جھوٹ کو واجب بھی بتلایا ہے۔''

یہ ہمارے نہیں مہتمم صاحب کے الفاظ ہیں۔ ان کے بعد تصفیۃ العقائد دیکھنے کی بھی کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ اب غور فرمائیں کہ بدنصیب مستفتی نے جن دو عبارتوں کو یکجا پیش کیا ہے کیا ان سے اس عقیدے کے سوا کوئی بات ظاہر ہوتی ہے؟ کیا ان سے مولانا نانوتوی کی طرف کسی ایسے خیال کی نسبت ہوتی ہے جو اُن کے اپنے مصدقہ خیال کے برعکس ہو۔ اگر نہیں۔ اور یقیناً نہیں تو پھر سوچا جائے کہ کیا یہ تلبیس ہوئی، تحریف ہوئی توڑ مروڑ ہوئی جعل ہوا! مستفتی کا یہ جرم ہم نے مان لیا کہ اس نے دو صفحوں سے عبارتیں لی ہیں؛ لیکن اس حرکت سے اس نے مولانا نانوتوی کے خلافِ عقیدہ بات پیش نہیں کی ہے؛ بلکہ وہی پیش کیا ہے جو مولانا کا خیال و عقیدہ ہے اور جس کی تصدیق خود مہتمم صاحب نے فرمائی ہے۔ پھر اس پر کفر اور تجدید نکاح کا فتویٰ لگانا مفتیوں کی خطا ہے، یا مستفتی کی؟ اور ذرا مفتی صاحبان واضح تو فرمائیں کہ مولانا نانوتویؒ کے اس عقیدۂ مذکور پر اگر انھوں نے فتویٔ کفر نہیں لگایا تو آخر مستفتی کی پیش کی ہوئی عبارتوں سے وہ کونسا عجیب ایٹمی عقیدہ نکلتا نظر آرہا تھا جس پر فتویٰ لگایا گیا؟ ہم بالیقین کہتے ہیں۔ اور ہر صاحبِ عقل قیاس کرسکتا ہے کہ مفتیوں نے عبارتوں کا ٹھیک وہی مطلب سمجھا جو اُن کا ہے۔ جس کی تصدیق مہتمم صاحب فرما رہے ہیں اور اس مطلب کی حقیقت انگیز نزاکتوں کو نہ سمجھتے ہوئے اسی پر کفر کا فتویٰ لگایا، اور اگر بعد میں یہ ثابت نہ ہو جاتا کہ یہ عبارتیں اور یہ عقیدہ خود اپنے ہی گھر کا ہے تو ہزار برس بھی اس فتوے کو غلط نہیں کہا جاتا۔ ہزار برس بھی اس عقیدے کو صحیح نہ مانا جاتا۔

خیر۔ ہم دارالعلوم کے فاضل مدیر سے جنھوں نے اپنے نوٹ میں مستفتی کو پوری سعادت مندی کے ساتھ ''شوخ چشم'' اور ''تیرہ باطن'' قرار دے کر اپنی سنجیدگی و غیب دانی کا اعلانِ بلیغ کیا ہے اور مودودی کے معاملہ میں بزرگانِ محترم کے اندازِ ادب و انشاء کی قابلِ قدر پیروی کی ہے پوچھتے ہیں کہ جناب جو اپنے نوٹ میں یہ زور باندھ رہے ہیں کہ:

''انبیاء علیہم السلام کے متعلق ایسے غلط عقیدے کا ظہور اور وہ بھی حضرت نانوتویؒ کے قلم سے؟ اگر سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکل سکتا ہے، اگر کفر و ضلالت سے نورِ باطل اور نجاتِ آخرت

ممکن ہے، اور دنیا کی وہ ساری چیزیں جن کی ماہیت و خاصیت نہ بدلتی ہے نہ بدل سکتی ہے اپنی خصوصیات سے دست بردار ہو سکتی ہیں تو شاید یہ بھی ممکن ہو کہ حضرت نانوتویؒ کے قلم سے ایسے عقیدے کا اظہار ہو؟''

اِس سے کیا مقصد ہے۔ کیسے عقیدے کو آپ کہہ رہے ہیں؟ کونسا عقیدہ ہے جس پر یہ چاند ماری ہے؟ مستفتی کی عبارت اور دعوت کے مضمون نگار غلام نبی جالندھری نے تو کسی فاسد و باطل عقیدے کی نسبت مولانا نانوتویؒ کی طرف کی نہیں۔ نہ مذکورہ تصدیق شدہ عقیدے کے سوا کہیں کسی عقیدے کا ذکر ہے، پھر یہ آپ کونسے عقیدے کا ذکر کر رہے ہیں؟ کہیں ''چور کی داڑھی میں تنکا'' والی بات تو نہیں؟۔ ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی کی طرف سے کبھی مولانا نانوتویؒ کی طرف انبیاء کے باب میں کسی باطل عقیدے کی نسبت نہیں کی گئی اور کیسے کی جاتی جبکہ مولانا نانوتویؒ کی طرح وہ بھی جذبات پر عقل کو غالب رکھنے کے عادی ہیں۔ وہ بھی جانتے ہیں کہ مولانا نانوتویؒ کے عقیدے کے مطابق انبیاء بشر بھی تھے اور معصوم بھی۔

مہتمم صاحب نے اپنے طویل مضمون میں زیادہ تر جو کچھ لکھا ہے وہ وہی ہے جس کے بارے میں ہم گزشتہ اشاعت میں کافی کہہ آئے ہیں۔ اس لیے اس کے باب میں ہر شخص ہمارے اور ان کے مضامین پڑھ کر فیصلہ کرے اور جسے چاہے برحق سمجھ لے۔ فی الحال تو آپ یہ ملاحظہ کیجئے کہ مولانا نانوتویؒ پر کفر اور تجدید نکاح کا فتویٰ لگانے والے جری مفتیوں کے حق میں مہتمم صاحب قبلہ نے کس شفقت و ترحم اور حسنِ ظن سے کام لیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''اگر صرف وہی عبارتیں بھی سامنے رکھ لی جائیں جو مستفتی نے کتر بیونت (؟) کر کے نقل کی ہیں تب بھی ان پر نہ کفر کا حکم لگ سکتا ہے نہ مخالف اہلِ سنت ہونے کا اتہام اس لیے میرے خیال میں حضرات مفتیانِ کرام سے اس افتاء میں تسامح (صرف تسامح۔ع) ہوا ہے اور انھوں نے عبارتوں کو سرسری دیکھ کر جن کا عنوان اپنے سیاق و سباق سے کٹ کر ذرا وحشت ناک سا (؟) تھا یہ مذکورہ حکم لگا دیا۔''

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ یہ اُن بزرگ کے الفاظ ہیں جن کی تاریخِ ملت اس طرح کے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ انصاف کے شیدائیوں نے انصاف کی خاطر دوست عزیز اور اولاد تک کی پروا نہیں کی۔ جن کے بزرگوں نے بیٹے تک پر حدِ شرعی جاری کر دی۔ جن کے قاضی نے ایک یہودی تک کو حضرت علیؓ جیسے بزرگ کے مقابلہ میں قانون کا سہارا دے کر حضرت علیؓ کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ جن کے نزدیک قانون ہر جذبے اور ہر رعایت سے بالاتر رہا ہے۔

حضرت مہتمم صاحب اس پر تو مجبور ہیں کہ مولانا نانوتویؒ کی تکفیر کو غلط ثابت کرتے ہوئے لازماً مفتیوں کی غلطی

تسلیم کریں؛لیکن تسلیم کے لیے جولفظ (تسامح) اختیار فرمایا جارہا ہے وہ انصاف کے تقاضے کو دس فی صدی بھی پورا نہیں کرتا۔ایک جج اگر قاتل کو مہینے بھر کی یا چور کو ایک دن کی قید کردے تو کیا واقعتاً اس نے انصاف کیا؟ کیا یہی وہ دیانت وعدل ہے جس کی اُمید ایک فاضل اجل اور ہستی محترم سے رکھنی چاہئے۔

پھر آگے یہ مہینہ بھر کی یا ایک دن کی قید بھی انعام وخلعت سے بدل دی جاتی ہے۔ملاحظہ ہو،فرماتے ہیں:

''گو میں ذوقاً یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اس حکم کا منشاء عصمتِ نبوی اور عظمتِ نبوۃ کا مفتیوں کے قلوب پر بے پناہ استیلاء ہوا ہے کہ اس میں محصور اور اُس سے مغلوب ہو کر یہ غور نہ کرسکے کہ ان عبارتوں کا ردکار (من وعن۔ع) جیسا وحشت ناک نظر آرہا ہے ان کے مدلول میں قطعاً وہ وحشت نہیں؛مگر غلبۂ عظمت نبوی میں سرسری دیکھ کر یہ حکم لکھ دیا گیا!''

سمجھے آپ۔یہ اُس قلم اعجاز رقم سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں جو مولانا مودودی کی عبارتوں میں سوسوکوس سے کفرو زندقہ کھینچ کرلاتا ہے۔اور مفتیانِ دارالعلوم طال اللہ قلمہ کی صریح گالی اور متعین فتویٰ بھی اس کے نزدیک غلبۂ حبِّ رسول اور محبتِ الٰہیہ کا مظہر ہے!۔آپ نے سنا ہوگا ایک بزرگ منصور گزرے ہیں۔''اناالحق'' کا نعرہ لگانے والے۔ ان بزرگ کے بارے میں اکثر علماء وصلحاء کی رائے یہ تھی اور ہے کہ واقعی بڑے پائے کے بزرگ تھے۔لیکن قانون نے انھیں سولی پر چڑھادیا۔

افسوس یہ قانون بڑا ظالم تھا۔اس نے نہیں سوچا کہ منصور شدّتِ حبّ الٰہی اور فنائیت فی ذاتِ باری میں یہ ''تسامح'' فرمارہے ہیں۔

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے!

ذرا ایک نظر پھر اس مثال پر ڈال لیجیے جو مہتمم صاحب نے دی تھی یعنی مستفتی نے مختلف جگہ کی عبارتیں اس طرح جوڑ دی ہیں جیسے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے بعد کوئی اَصْحٰبُ النَّارِ جوڑے۔فیصلہ کیجئے۔ایک شخص کہتا ہے۔ جو لوگ ایمان لائے وہ دوزخی ہوئے!کیا یہ قول حکمِ کفر کے لیے کافی نہیں۔کیا اس میں ذرا بھی جواز کی گنجائش ہے؟ ظاہر ہے کہ کوئی گنجائش نہیں۔حالانکہ مستفتی کی پیش کردہ عبارتوں کے بارے میں مہتمم صاحب خود فرمارہے ہیں کہ ''نہ ان پر کفر کا حکم لگ سکتا ہے نہ مخالفِ اہلِ سنت ہونے کا اتہام''۔

فرمائیے کیا یہی مطابقت مثال اور ممثل لہٗ میں ہوتی ہے؟۔

حضرت مہتمم صاحب نے بہت سی مثالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہر شخص کے قول کا مطلب مجموعی زندگی کو سامنے رکھ کر لیا جاتا ہے!۔بے شک حق فرمایا۔ہم اور جماعتِ اسلامی کا کوئی ذمہ دار فرد کبھی نہیں کہتا کہ مولانا نانوتوی ؒ نعوذ باللہ عقائدِ باطلہ کا شکار تھے۔نہ ان کی پاکیزہ زندگی اور اعمال کے بارے میں ہم ایک حرفِ اعتراض

کے روادار ہوسکتے ہیں ۔لیکن بات تو جب وزن دار تھی جب مہتمم صاحب مولانا مودودی کی زندگی پر بہ دلیل روشنی ڈالتے ہوئے یہ ثابت فرماتے کہ وہ نسلاً فاسق و فاجر ہیں اور عقیدۃً گمراہ و عاصی ۔اگر "مجموعی زندگی" کئی لاکھ الفاظ میں سے چند الفاظ کا نام نہیں تو قبلہ بتائیں کہ اُن چند عبارتوں کے علاوہ جنھیں بالجبر ضال ومضل قرار دیا جارہا ہے اور کتنی عبارتیں مودودی نے فسق و فجور اور الحاد و زندقہ کی لکھی ہیں یا کتنے اعمال ان کے بدکاری و معصیت کیشی پر مبنی ہیں ۔آپ بمشکل تمام چند عبارتیں لاتے ہیں ۔جن کا مطلب آپ کے نزدیک بڑا خراب ہے ۔اگر اسی کا نام آپ کے نزدیک "مجموعہ" ہے تو گویا اپنے دعوے ہی کو آپ دلیل کہہ رہے ہیں ۔اور اگر نہیں تو پھر ان چند عبارتوں کو خراب محمل پر فٹ کرنے کے لیے مودودی کی مجموعی زندگی سامنے لائیے ۔عوام بیچاروں کے سامنے اس کی مجموعی زندگی تو یہ ہے کہ بیسیوں برس سے اسلام اسلام کی رَٹ لگائے جارہا ہے اور جیسا کہ آپ نے "فطری حکومت" میں لکھا ہے تحریکِ حکومتِ الٰہیہ کا محرک نمبر دو ہے اور قوم کو اس کا مرہونِ منت ہونا چاہئے ۔اور اس کی جو بھی کتاب عوام اُٹھا کے دیکھتے ہیں قرآن و حدیث ہی سے بھری پاتے ہیں ۔ پاکستانی حکمرانوں نے اسے پھانسی پر چڑھانے کا فیصلہ کیا پھر عمر قید کر دی اور آخر کار کہا کہ معافی مانگ لو ۔اس نے انکار کر دیا اور.....اور عوام یہی جانتے ہیں کہ اس کا جُرم صرف یہ تھا کہ وہ محمد عربی ﷺ کو آخری نبی ماننے کا دعویٰ دار تھا اور کہتا تھا کہ جو لوگ مرزا غلام احمد کو نبی مانتے ہیں انھیں ملتِ اسلامیہ سے جُدا کر کے دوسری ملّت قرار دو ۔اس کی ہر تحریر و تقریر میں عوام اسلام ہی کے نغمے پیغامات اور نعرے سُنتے ہیں اس کی ایک ایک کتاب کو اُٹھا کر عوام کمیونسٹوں، سرمایہ داروں، بدعتیوں اور مغرب پرستوں سے، دو بدو لڑتے ہیں، اس نے جو جو کچھ جس جس انداز میں لکھا ہے اس پر آپ کہیں کہیں غلط ہونے اور حد سے گزر جانے کا الزام تو لگا سکتے ہیں ؛لیکن یہ الزام کہ اس کی بعض عبارتوں کا مُحمل زندقہ اور کفر ہے دلیل چاہتا ہے ۔دلیل جو اتنی وزن دار ہو کہ اتنے بڑے الزام کے شایانِ شان سمجھی جاسکے ۔یہ کیا کہ آپ ایک شخص پر قتل اور زنا جیسا زبردست الزام لگادیں اور شہادت مانگی جائے تو کہیں کہ یہ ہمارا قیاس ہے ۔ہم ایسا ہی سمجھتے ہیں !لفظوں سے کھیلیں اور خود ہی مدعی خود ہی جج بن جائیں ۔

ہم نے انبیاء کے باب میں مودودی صاحب کی بعض عبارتیں گزشتہ اشاعت میں پیش کی ہیں ۔آپ فرمائیں تو اس باب میں بھی اور صحابہؓ کی عظمت و برتری کے باب میں بھی مزید دو چار دس بیس عبارتیں پیش کر دیں ؛لیکن اس کے ساتھ آپ کا بھی فرض ہے کہ مودودی کی ایک دو عبارتیں ایسی پیش فرمائیں جو آپ کے بیان فرمودہ عقائدِ باطلہ پر صراحۃً یا التزاماً دلالت کرتی ہوں اور چار غیر جانبدار لوگ مان لیں کہ ہاں واقعی ان عبارتوں کا یہی مطلب ہے ۔

رہا وہ طریق جارحانہ جسے آپ نے اختیار فرمایا ہے تو وہ ایسا ہی ہے جیسے بریلوی اور بدایونی حضرات مولانا

قاسم، مولانا رشید احمد، مولانا اسماعیل رحمہم اللہ وغیرہم کے متعلق اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ لو صاحب مولوی رشید تو کہتے ہیں ہم بھی عبادت کر کے رسول اللہ ﷺ کی برابر ہو سکتے ہیں۔ لو صاحب مولوی قاسم تو کہتے ہیں نبی جی بھی جھوٹ بولتے تھے، لو صاحب مولوی اسماعیل تو کہتے ہیں کہ نماز میں رسول اللہ کے تصور سے بہتر گائے بھینس کا تصور ہے وغیرہ۔ (ولِلّٰہ شرّ القائل)

محترما! آپ نے غصہ میں آ کر یہ تو کہہ دیا کہ آپ کے مفتیوں کا فتویٰ اصل میں خود مستفتی پر چسپاں ہوا ہے۔ کیونکہ اس نے جعلی عبارت بنا کر پیش کی ہے۔ لیکن کیا آپ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ ہندو پاک میں سب عقل کے اندھے اور اُلو کے پٹھے بستے ہیں جو آپ کی ہر بات کو آنکھیں بند کر کے بلا دلیل تسلیم کر لیں گے۔ آپ ابن عبدالبر پر فتویٰ لگانے کی بجائے اُس مودودی پر فتویٰ لگاتے ہیں جس نے ابن عبدالبر کی لکھی ہوئی کتاب سے لفظ بہ لفظ ترجمہ کیا اور ٹھوس علمی اختلاف کے درمیان اس عامیانہ سطح پر اُتر آتے ہیں کہ ہمارے بزرگ مولانا نانوتویؒ ایسے تھے ویسے تھے۔ اس لیے انکی ہر بات سو فیصدی درست اور مودودی ایسا ہے اور ویسا ہے اس لیے اس کی یہ بات ضال و مضل آخر کیا آپ کو نہیں معلوم کہ اگر مولانا نانوتوی کی بڑائی ثابت کرنے کے لیے حضرت کی تصانیف اور آپ کی شائع کردہ سوانح قاسمی موجود ہے تو مودودی صاحب کا مقام و مرتبہ واضح کرنے والی خود ان کی سیکڑوں تصانیف موجود ہیں اور سوانح قاسمی جیسی کوئی کتاب ان کے معتقدین بھی شائع کر سکتے تھے۔ اگر روایت و تاریخ اور سوانح و تذکرہ کے باب میں وہ ایسے ہی فراخ دل روادار معصوم اور نیک ہوتے جتنے سوانح قاسمی کے مصنف مولانا مناظر احسن گیلانی مدظلہٗ ہیں۔ مانا کہ مودودی صاحب کی زندگی سے ان کا ایماندار تذکرہ نویس کسی جہاد بالسیف کسی کرامت و کشف کسی معجزانہ زہد و ورع اور خرقِ عادت کو منسوب نہ کر سکتا۔ لیکن یہ تو لازماً اسے لکھنا پڑتا کہ مودودی صاحب کی زندگی قولاً اور عملاً امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں اس طرح گزری ہے کہ دیوبند کے علمائے حق سے لے کر دنیا بھر کے قادیانی بدعتی اہلِ قرآن وغیرہ وغیرہ تک چاروں طرف سے ان پر چڑھ دوڑے، تیز اور تُند ہر طرح کے ہتھیار چلائے۔ کافر بنایا، زندیق ٹھیرایا، گالیاں دیں، خبیث کہا، جاہل فرمایا، ہادمِ دین قرار دیا اور دعاء و دغا کے مشترکہ سے پھانسی کے تختے تک پہنچایا؛ لیکن وہ شخص وہی ملحد و زندیق ایک دن کو اپنے موقوف اپنی دعوت اپنے مشن سے نہیں ہٹا۔ اس نے خبیث کے بدلہ میں خبیث نہیں کہا۔ گالی کے بدلہ میں گالی نہیں دی، وہ یہی کہتا رہا اور آج بھی کہہ رہا ہے کہ خدا کا خوف اور آخرت کی جواب دہی کا احساس رکھ کر اعتراض کرو اور جواب لو۔ قرآن وسنت سے میری غلطیاں واضح کرو۔ اور میرا سر جھکا دو۔

گستاخی معاف! آپ نے کالم کے کالم یہ ثابت کرنے میں صرف کر دیئے ہیں کہ دعوت کے مضمون نگار نے مولانا نانوتویؒ کی عبارت سے جن مغالطہ انگیز معانی کا امکان دکھلایا ہے وہ مولانا کی عبارتوں سے ثابت ہی نہیں

ہوتے۔میں کہتا ہوں یہ عبارتیں اگر اتنی ہی صریح الدلالۃ اور واضح المفہوم تھیں تو آپ کے مفتیوں کو کیا ہوگیا تھا کہ اُرے پرے بھی نہیں رُکے اِک دم تجدیدِ نکاح تک جا پہنچے بقول شخصے تسمہ لگا نہ چھوڑا۔کوئی بھی آنکھ والا مغالطہ میں آکر بلّی کو لومڑی تو کہہ سکتا ہے؛ مگر اونٹ تو نہیں کہہ سکتا۔

پھر میں کہتا ہوں مفتیوں کی افلاطونی بھی نظرانداز کیجیے؛ لیکن یہ دعوت کے مضمون نگار یا مستفتی نے کب کہا کہ مولانا نانوتویؒ کی عبارتوں کے وہ بدنما معانی ہیں جن کی تردید کی زحمت آپ فرمارہے ہیں۔وہ تو صرف اتنا کہتا ہے کہ نیش زنی مخالفت اور تکفیر کا جو طریقہ آپ کے کیمپ سے جاری ہوا ہے،اسی طریقہ کو اگر دوسرے اختیار کرلیں تو مولانا نانوتویؒ اور شاہ ولی اللہؒ اور مولانا گنگوہیؒ بلکہ میں کہتا ہوں کہ ائمہ ومجتہدین اور علمائے اجل بھی ہدف ہونے سے نہ بچیں گے۔آپ کی سب سے بڑی دلیل مولانا نانوتویؒ کے ''تجدیدِ نکاح'' والے قصہ میں یہ ہے کہ مولانا کی زندگی چونکہ سراپا ولایت وحقانیت ہے اس لیے ان کی ہر بات کا وہی مطلب لیا جائے گا جو اعتراض وخطا سے بالا ہو۔میں اور مجھ جیسے ہزار پانچ سو آدمی تو آپ کی اس دلیل پر سرِتسلیم خم کردیں گے؛لیکن کیا بریلوی اور فرنگی محلی اور شیعی اور خارجی اور سارے ہی فرقے اور گروہ اپنے اپنے بزرگوں کے بارے میں وہی خیال نہیں رکھتے جو آپ اپنے بزرگوں کے بارے میں بطورِ دلیل ظاہر فرمارہے ہیں تب کیا اِن تمام فرقوں کا اپنے بزرگوں سے استدلال اور استنادِ شرعی مانا جائے گا؟ کیا ان فرقوں نے اپنے اپنے بزرگوں کے کمالاتِ دینی اور کرامت وکشف کی روداد یں قلم بند نہیں کررکھیں جن کے بل پر وہ کہیں گے کہ اور کہیں گے کیا کہہ رہے ہیں کہ ہمارے بزرگ بڑے خدارسیدہ تھے۔اس لیے ان کی ہر بات کا مطلب ٹھیک قرآن وحدیث کا مطلب ہے!

خدا ہی جانتا ہے کہ آپ نے مولانا مودودی کی سب نہیں تو چند ہی کتابیں پوری پڑھیں یا نہیں پڑھیں۔کم سے کم ہم نے آج تک جس معترضِ محترم سے پوچھا کہ بھائی تم مودودی کے جس عقیدے پر لعن طعن کررہے ہو وہ تم نے کہاں دیکھا ہے۔بعض نے تو کہا کہ ہمیں کیا مصیبت پڑی ہے جو ایک گمراہ شخص کی کتابیں پڑھیں اور بعض جو ذرا عقل مند تھے بولے کہ فلاں کتاب میں یہ عقیدہ درج ہے۔عرض کیا گیا کہ آپ نے خود یہ کتاب پڑھی ہے؟ تو اس طرح کے بے تکے جواب ملے جن سے ظاہر ہوا کہ پڑھنا تو درکنار کتاب کی صورت بھی نہیں دیکھی گئی۔بتائیے دنیا کا کوئی قانونِ اخلاق اس ظلم کو جائز کہہ سکتا ہے کہ کسی مصنف کی صدہا کتابوں میں سے پڑھی تو ایک نہ جائے اور اِدھر اُدھر سے سُن سُنا کر فتوے کفروزندیقی کے جڑدیئے جائیں۔اگر یہ کافرساز لوگ آخرت اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں تو کیا انھیں اس کا شعور نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے اس ظلم کا محاسبہ کرے گا؟ کیا وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ان کی طرح اللہ تعالیٰ کو بھی مودودی سے بغض ہے اور مودودی پر تراشے ہوئے ہر الزام کے جواب میں علماء کو حور وغلمان عطا کیے جائیں گے حاشا ثم حاشا۔میرے دوستو اور بزرگو! دنیا کی ناپائداری اور اللہ کی انصاف پسندی کو مجھ سے کہیں زیادہ

تم جانتے ہو۔میرے علم سے کہیں زیادہ تمہارا دینی علم ہے۔مجھ سے ہزار گنا تم صالح اور نکوکار ہو۔اگر واقعی تم صدق دل سے یہ سمجھتے ہو کہ مودودی کی زیادہ سے زیادہ مخالفت اور جماعتِ اسلامی سے تابحدِ امکان مخاصمت تمہارے اعمال ناموں کا وزن بڑھادے گی۔اور اللہ کے یہاں تمہارا شمار مجاہدین حق میں ہوگا تو بے شک تم جی بھر کے مخالفت کرو، کیچڑ اُچھالو،فتوے لگاؤ؛لیکن اگر خدانخواستہ تم بغیرِعلمِ صحیح اور دلیل روشن کے یوں ہی اَٹکل پچّو یہ کارنامہ انجام دیتے رہے تو دنیا میں تو ممکن ہے ہم جیسے ہزار پانچ سو کمزوروں پر عرصۂ حیات تنگ کردو اور دو چار ہزار کو دعوتِ اسلامی سے روک دولیکن قیامت کے دن اُس شخص کے لیے عافیت کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی جسے اللہ کی جناب سے منّاع للخیر (بھلائی سے روکنے والا) کا خطاب مل جائے۔کیا تم اللہ سے عہدہ برآ ہونے کی بھی کوئی کرامت رکھتے ہو؟۔

تم ہنسو گے،غصّہ کرو گے کہ ایک فاسق و فاجر ایک جاہل و نااہل ایک بے زور ناہیچ تمہیں وعظ سنانے کی گستاخی کررہا ہے۔بے شک میں اس قابل نہیں ہوں؛لیکن یہ میری اپنی آواز نہیں،میرا اپنا وعظ نہیں،یہ دین فطرت کی آواز ہے،ضمیر بیدار کا خطبہ ہے،دلِ دردمند کی فریاد ہے۔تم میرے حقیر وجود کو سرِ بازار کچل دو۔مجھے جو چاہو سزا دو؛لیکن خدا کے لیے دین فطرت کی روحِ بیتاب کا وہ نالۂ نیم شبی تو سُن لو جو شقاق بین المسلمین اور نفاق بین المؤمنین کی قیامتِ صغریٰ پر بلند ہوکر گونج رہا ہے۔خدا کے لیے دین حنیف کی اُس کراہ پر تو توجہ کرلو جو باطل کے وزنی انباروں کی داب سے نکل رہی ہے۔تم خود تو باطل کے آگے ہتھیار ڈال کر اس بات پر رضامند ہوگئے کہ زمین کے سارے خزانوں پر شیطان کا قبضہ رہے جائے اور ایک محدود تر دائرے میں اسلام کی کٹ پتلی حکومت قائم رہے جس کی ظاہری باگ ڈور تمہارے اپنے ہاتھوں میں ہو اور تم سیدھے سادے مسلمانوں سے کہہ سکو کہ اسلام آزاد ہے ہم آزاد ہیں؛لیکن اگر کچھ دیوانے اس طرزِ زندگی پر راضی نہیں ہیں۔اور اسلام کی ہمہ گیر دعوت لے کر سر بکف اُٹھے ہیں تو آخر تم ان کے آڑے کیوں آتے ہو۔تم کیوں یہ چاہتے ہو کہ کفر کے تاریک آسمانِ اقتدار پر اسلام کا ایک تارہ بھی کہیں چمکنے نہ پائے۔

میں ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں کہ ایک بار صدق دل سے اتحاد و مصالحت کی راہ نکالنے پر التفات کرو۔مودودی اور جماعتِ اسلامی ایک چیز کا نام نہیں ہے۔یہ تمہاری بدیہی عصبیت ہے جو تم نے نامِ مودودی کو نشانہ اور کھلونا بنا رکھا ہے۔تمہارے اسی طرزِ عمل نے ایک علمی مسئلہ کو شخصیات کی طرف موڑ دیا ہے۔میں کہتا ہوں مودودی کو تم دل سے نکال دو۔وہ اگر تمہارے لفظوں میں خبیث ہادمِ دین جاہل (نعوذ باللہ من ذٰلک) ہے تو اس کا خیال دل سے نکالنا اور بھی ضروری ہے۔آخر ہندوستان میں تم اُس کے نامِ قبیح کی رَٹ کیوں لگاتے ہو۔یہاں کی جماعتِ اسلامی سے مودودی کا کیا واسطہ۔تم اگر مودودی کے کابوس کو دُور کر کے جماعتِ اسلامی سے مخلصانہ چند باتیں کرلو تو یقینی

اور ننانوے فی صدی یقینی ہے کہ نفاق کی محض ہوائی خلیج پٹ جائے گی اور جماعتِ اسلامی کی مفروضہ زندیقی و گمراہی ہوا میں حل ہو کے رہ جائے گی۔

اور اگر جماعتِ اسلامی سے مفاہمت و مصالحت تمہارے سیاسی نقطۂ نظر، دنیاوی مفاد اور حکمت و پالیسی کے لیے مضر ہے تو کم سے کم غیر جانبدار رہنا تو ناممکن نہیں ہے۔ یہ آخر کس قرآن، کس حدیث، کس امام، کس ڈاکٹر و حکیم نے بتایا ہے کہ دیس پار بسنے والے مودودی کی مخالفت کرو اور ضرور کرو۔ اور جماعتِ اسلامی والوں کا راستہ روکو اور ضرور روکو۔ ہم نہیں جانتے وہ کیسا ایمان ہے جو محض بے بنیاد اختلاف کے باعث اپنے ہی ہم مذہبوں کی ذلت و رسوائی اور کلفت و مصیبت سے تسکین پاتا ہے۔

بکی شبحوہ الاسلام من علمائہ

فما اکثر ثوا لما رأ و من بُکائہ

(رو رہا ہے اسلام اپنے علماء کے ہاتھوں؛ لیکن علماء کو اس کے بہتے ہوئے اشکوں کی کچھ پروا نہیں)۔

فاکثرھم مستقبحٌ لصواب مَن

یخالفہ مستحسن لخطائہ

(اکثر عالم اپنے مخالف کے حق میں بُرائی کرتے ہیں اور اپنی خطا کو سراہتے اور صواب ٹھیراتے رہتے ہیں)۔

فالیم المرجوّ فینا لدینہ

والیمّ الموثوق فیمنا برائہ

(پس یہ حال ہے تو ہم کس سے دین داری کی توقع رکھیں اور کس کی رائے پر بھروسہ کریں)۔

(ابو القاہیہ جامع بیان العلم وفضلہ لابن عبد البر صفحہ ۲۰۳ مصری)

بے محل نہ ہوگا اگر ابن عبد البر ہی کی زبانی ایک دو روایتیں ایسی پیش کر دوں جن سے معلوم ہو کہ ہمارے عالم و فاضل اسلاف فتویٰ دینے میں کتنی احتیاط برتتے اور کتنا خوفِ الٰہی محسوس فرماتے تھے۔

عبد الرحمٰن ابن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ایک سو بیس صحابی دیکھے ہیں۔ مسجد میں جمع ہوتے تھے؛ لیکن ان میں سے ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ میں نہیں کوئی اور فتویٰ دے یا حدیث سنائے ہر صحابی اس سے گھبراتا تھا۔

ابو اسحاق کہتے ہیں زمانہ گزشتہ کا یہ حال میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جب کوئی شخص کوئی مسئلہ پوچھنے آتا تو لوگ اسے مجلس مجلس لئے پھرتے۔ علماء فتویٰ دینے سے ڈرتے تھے۔ آخر ش اسے سعید بن المسیب کے

پاس پہنچا دیا جاتا۔سعید کو اس دَور کے علماء ’’جری‘‘ کے لقب سے یاد کرتے تھے۔کیونکہ فتویٰ دینے میں وہ مقابلتہً کم جھجکتے تھے۔

سحنون بن سعید فرمایا کرتے تھے کہ فتویٰ دینے کی سب سے زیادہ جرأت اسی میں ہوتی ہے جس کے پاس سب سے کم علم ہوتا ہے۔یہ کیسی نادانی ہے کہ آدمی کے پاس علم تو تھوڑا سا ہوتا ہے اور سمجھنے یہ لگتا ہے کہ تمام وکمال حق اس کے قابو میں آگیا۔

حضرت حذیفہؓ نے فرمایا۔تین ہی قسم کے آدمی فتویٰ دیتے ہیں ناسخ ومنسوخ کے عالم۔اُمت کے حکام۔اور تیسری قسم احمقوں کی ہے۔

یاد رکھئے یہ روایات صرف اُن عام فقہی مسائل کے باب میں وارد ہوئی ہیں جو فروعات میں سے تھے۔اور جن میں مفتی کے غلطی کر جانے سے کوئی بڑی انفرادی یا اجتماعی بربادی ظہور میں نہیں آتی تھی۔اگر اُس مشغلۂ تکفیر کو دیکھا جائے جسے مودودی صاحب کے خلاف بطورِ ناشتہ معمول بنالیا گیا ہے تو بخدا سلف (واضح رہے کہ ابن تیمیہؒ جیسے ارفع واعلیٰ مصلحین پر کفر کے فتوے لگانے والے بزرگوں کو میں ’سلفِ صالحین‘‘ میں شمار نہیں کرتا) صالحین تو اس کا تصور اور وہم بھی نہ کرسکتے۔اور کیسے کرتے جب کہ انھیں معلوم تھا کہ کفر واسلام اور حسابِ آخرت کسی مذاق کا نام نہیں ہے وہ جانتے تھے کہ خالد بن ولیدؓ جیسے صحابیِ جلیل نے جب بعض ایسے لوگوں کو قتل کردیا تھا جنھوں نے بظاہر جان کے خوف سے اپنے مسلمان ہونے کا نعرہ لگایا تھا تو عقلی اور قیاسی طور پر ننانوے فیصدی مقتولین کے کاذب ہونے کے باوجود رسول اللہ ﷺ خالدؓ پر خفا ہوئے تھے اور محض ایک فیصدی امکانِ صدق کو قابل قبول سمجھتے ہوئے فیصلہ صادر کیا تھا کہ اعلانِ اسلام کے بعد انھیں کافر سمجھتے ہوئے قتل کرنا تمھیں زیبا نہ تھا۔

دنیا کی عدالتیں شاہد ہیں کہ دلیل تو کیا محض شک کا فائدہ بھی قاتل کو ملتا ہے اور ہزار واضح شہادتوں کے باوجود محض شک کی بنا پر قاتل پھانسی سے بچ جاتا ہے۔تو کیا مودودی صاحب کے معاملہ میں یہ نظریہ انصاف اتنا پلٹ جانا چاہئے کہ ان کے مومن ہونے کی سیکڑوں قطعی شہادتوں کے باوجود محض شک اور وہم وقیاس کی بنا پر انھیں کافر اور ابدی جہنمی ٹھیرا دیا جائے؟

ایسے موقع پر لاجواب ہوکر بعض کرم فرما کہتے ہیں کہ ہم نے کافر کب کہا؟ یہ جواب بالکل جھوٹا ہے۔فتویِ کفر جھاڑنے میں مفتیانِ کرام کس قدر شوقِ فراواں کے مالک ہیں اس کا اندازہ آپ نے ’’تجدید نکاح‘‘ کے فتوے سے کرلیا۔دسیوں کتابچوں اور اشتہاروں میں ہم نے صراحتہً اور دلالتہً زندقہ وخارجیت اور الحاد وکفر کے عطیات دیکھے ہیں اور یہی کیا کم تکفیر ہے کہ مودودی کو تمام انبیاء سابقین کا منکر اور صحابہؓ کے مناقب وفضائل کو نہ تسلیم کرنے والا کہا اور ثابت کیا جارہا ہے۔کیا اس کے بعد بھی ایمان کا کوئی حبہ باقی رہ جاتا ہے؟ کیا ایسا کہنے والے اگر یہ کہیں

کہ ہم کافر نہیں ٹھیرا رہے تو ان کی مثال اُس شخص کی سی نہ ہوگی جو یوں کہے کہ زید کو کچھ نظر نہیں آتا اور اس پر کوئی کہے کہ تو نے زید کو اندھا کہا ہے تو یہ معصومیت سے جواب دے ہر گز نہیں میں نے اندھا نہیں کہا؟

گزشتہ اشاعت میں حضرت مہتمم صاحب کے جس خط (مطبوعہ دعوت) کا تذکرہ کیا گیا ہے اس کے بارے میں الجمیعۃ ۲۵ر فروری ۵۶ء میں مہتمم صاحب نے تحریری بیان شائع کیا۔ جس کے چند الفاظ یہ ہیں:

''اخبار دعوت دہلی مؤرخہ ۹ر فروری ۵۶ء میں میری طرف منسوب کر کے ایک خط شائع کیا گیا ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ صحابہؓ معیارِ حق نہیں ہو سکتے۔ یہ مضمون میرے مسلک کے بالکل خلاف اور منافی ہے.....''

اب دعوت ۲۵ر مارچ ۵۶ء میں مہتمم صاحب نے تحریری اقرار فرمایا ہے کہ:

''یہ خط میرا ہے جو آپ نے شائع فرمایا ہے۔''

پوری تفصیل کے خواہش مند مذکورہ دعوت ملاحظہ فرمائیں۔ ہم تو صرف اس قدر کہیں گے کہ الجمیعۃ میں شائع کردہ تحریر سے مہتمم صاحب نے جماعتِ اسلامی کے بارے میں جعلسازی اور دغابازی کا ایک ایسا تصور ناظرین کو ودیعت فرما دیا تھا کہ اگر وہ اپنی سچائی کے ثبوت میں مہتمم صاحب کے مذکورہ خط کا فوٹو شائع کرنے کا ارادہ نہ کرتے اور اس کے علم پر حضرت مہتمم صاحب پیشگی اعتراف پر مجبور نہ ہو جاتے تو جماعتِ اسلامی والوں پر ایک ایسے جُرم کا اثبات ہو جاتا جس کا تصور ان کا بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں کر سکتا۔

مہتمم صاحب نے ''اعتراف'' کے ساتھ اگرچہ بہت کچھ تاویل وتطویل فرمائی ہے؛ لیکن اس طرح کی تاویلیں کیا وقعت رکھتی ہیں، اس کا اندازہ خود ناظرین فرمالیں۔ جس خط کو وہ خود اپنے قلم سے اپنے مسلک کے خلاف اور منافی لکھ چکے، پھر اسی کو اپنا مان کر مطابق مسلک اور موافق عقیدہ ٹھیرانا تاریخِ صحافت و دیانت میں آپ اپنی مثال ہے۔

(تجلی مئی ۱۹۵۶ء)

....

مسئلہ پیدائش حوّا رضی اللہ عنہا

ماہنامہ دار العلوم دیوبند نومبر ۱۹۵۵ء میں مولانا ابوالقاسم صاحب دلاوری کا ایک مضمون شائع ہوا تھا:
''کھلی چٹھی بنام جناب ماہر القادری مدیر فاران۔''
جن حضرات کے پاس یہ پرچہ ہو وہ براہِ کرم اس مضمون کو سامنے رکھ لیں۔ اس مضمون میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) وارثانِ علومِ نبوّت (یعنی مودودی کے مخالف علماء) جو کچھ فرماتے ہیں بے کم وکاست درست ہے۔ ص ۳۶ کالم ۱ سطر ۶ و ۷۔

(۲) یہود ونصاریٰ اور اہلِ اسلام اس حقیقت پر متفق ہیں کہ اُم البشر حضرت حوا، جناب آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کی گئیں تھیں۔ یہ امر تورات، قرآن اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے؛ لیکن مودودی صاحب کو.... عالم کی اس مسلمہ حقیقت سے بھی انکار ہے۔ص ۳۶ کالم ۱ سطر ۲۰ تا ۲۵۔

(۳) حق تعالیٰ نے وَخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا فرما کر مجملاً نہیں بلکہ صراحتاً بتادیا کہ حضرت حواء جناب صفی اللہ ہی کے جسدِ مبارک سے متولّد ہوئی تھیں۔ص ۳۷ کالم ۲ سطر ۱۲ تا ۱۴۔

(۴) اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ حضرت حواء کو پسلی سے پیدا شدہ نہ ماننے میں مودودی صاحب کی مطلق العنانی اور نص میں ان کی تحریف کاری الحاد و زندقہ ہے یا نہیں۔ص ۳۸ کالم ۱

(اس کے آگے کئی لائنوں میں مزید زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ مودودی صاحب کا حوا کو حضرت آدم کی پسلی سے پیدا شدہ نہ ماننا تحریف فی القرآن اور الحاد اور زندیقی ہے اور اسی طرح کی کفریات ان کے قلم سے اکثر ٹپکتی رہتی ہیں)۔

ان گلفشانیوں کے بعد دلاوری صاحب نے ٹھیک درباری انداز میں مولانا مدنی کی قصیدہ خوانی فرمائی۔ اور مودودی صاحب کو مزید گالیاں عطا فرمائی ہیں۔ اس طرح کی ذلیل باتوں پر ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے؛ کیونکہ جن لوگوں کا طرۂ امتیاز ہی گالی بازی اور نعرہ سازی ہوا نھیں کوئی شریف آدمی کہاں تک جواب دے۔

اب فروری ۵۶ء کے دار العلوم میں ازہر شاہ صاحب کا مضمون ''حضرت حوا کی پیدائش کا واقعہ'' اسی سابقہ مضمون کی تائید میں شائع ہوا ہے۔ جس میں انھوں نے دلاوری صاحب کے فرمودات کو بالکل برحق ٹھیراتے

ہوئے فرمایا ہے کہ قرآن و حدیث سے کسی شک و شبہ کے بغیر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت حواء حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کی گئیں۔گویا مودودی صاحب کا اس سے انکار نصّ صریح سے انکار ہے۔اور نصّ صریح کے منکر کو کافر کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے؟

ان ہر دو حضرات نے جو کچھ دلائل دیئے ہیں ان کی حقیقت کھولنے سے پہلے ہم اتنا آپ کو بتا دیں کہ ان لوگوں کی مثال اُس طفلکِ ناداں جیسی ہے جس نے ستاروں کی اُونچائی دیکھ کر کہا تھا کہ ان سے آگے کچھ نہیں ہوسکتا۔اور جب اقبال نے سمجھایا کہ عزیزم ع

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہے

تو اس طفلکِ ناداں نے کہا کہ تم کافر ہو!

ان عقل مندوں کو اتنا ہوش نہیں کہ جس چار دیواری میں یہ رہتے ہیں اس کے باہر بھی دنیا بستی ہے۔ان کا طریقہ یہ ہے کہ جن چند کتابوں کو انھوں نے پڑھ لیا بس سمجھے کہ اب کوئی کتاب دنیا میں باقی نہیں۔اور جو مفہوم انھوں نے سمجھ لیا اس مفہوم کے سوا تمام مفہومات غلط اور باطل ہیں۔ذرا دیکھئے یہ دین و مذہب کے ٹھیکیدار کیسے کیسے برملا ملحد و زندیق کہہ رہے ہیں۔علامہ شبیر کو،مولانا ابوالکلام آزاد کو،حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سکریٹری جمعیۃ العلماء کو،علامہ شیخ محمد عبدہ کو، جناب محمد رشید رضا کو،شارح بخاری امام قسطلانی کو،شارح بخاری امام بدرالدین عینی کو رحمہم اللہ۔اور نہ جانے کس کس کو۔پورا پتہ آپ کو آگے چلے گا جب ہم ان کے دلائل کو کھنگالیں گے اور اپنے دلائل پیش کریں گے۔اس سے پہلے آپ یہ ملاحظہ فرمالیں کہ ازہر شاہ صاحب نے اپنے اس چار صفحے کے مختصر مضمون میں کن کن عالمانہ فن کاریوں کا ثبوت دیا ہے۔

خیانت فی الحدیث

دارالعلوم فروری ۵۶ء ص ۳۵ کالم ۲ پر ازہر شاہ نے اپنے مضمون میں بخاری و مسلم کی حدیث پیش فرمائی ہے۔حیرت ہوگی آپ کو یہ سن کر کہ اس میں ایک مستقل لفظ ''آدم'' آپ نے اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے تاکہ اپنے غلط دعووں کا ثبوت مضبوط کرلیں جس کا جی چاہے بخاری و مسلم اُٹھا کر دیکھ لے۔حدیث یوں ملے گی: خُلِقَت من ضلعٍ یوں نہیں ملے گی خلقت من ضلع آدم۔ شاہ صاحب یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکتے کہ یہ کاتب کا قصور ہے؛ کیونکہ ترجمہ میں بھی ''آدم'' موجود ملتا ہے۔گویا بطورِ خیانت یا بطورِ جہالت شاہ صاحب حدیث شیخین کی تصحیح فرما گئے ہیں۔عیاذاً باللہ۔ ہر جاہل و عالم مسلمان خوب جانتا ہے کہ حدیث و قرآن میں ایک لفظ یا نقطے تک کا اضافہ کس قدر بددینی ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فمن کذب علیّ متعمداً فلیتبوّء مقعدہ من النّار (یعنی جس نے جان بوجھ کر محمد پر جھوٹ تراشا وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنالے)۔

آنحضورﷺ نے ایک صحابی کو سونے کے وقت کی دعا بتائی۔ اور کہا کہ اچھا بتاؤ میں نے کیا کہا۔ صحابی نے دعا کے یہ الفاظ دُہرائے:

آمنت بكتابك الذي أنزلت ونبيك الذي أرسلت.

''اے اللہ! میں ایمان لایا اس کتاب پر جو تو نے نازل فرمائی اور اُس نبی پر جسے تو نے بھیجا۔''

اس میں صحابیؓ سے صرف اس قدر چوک ہوئی تھی کہ انھوں نے نبیك کے لفظ کو رسولك کے لفظ سے بدل دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس سے معنیٰ میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ نہ اضافہ یا کمی ہوئی۔ لیکن آنحضورﷺ نے فرمایا: نہیں میں نے یہ نہیں کہا! وہی کہو جو میں نے کہا گویا حدیث میں کسی لفظ کو اس کے ہم معنیٰ لفظ سے بدلنا بھی تحریف کے زُمرہ میں شامل سمجھا گیا۔

لیکن ہمارے از ہر شاہ صاحب کا یہ حال ہے کہ ایک مستقل لفظ کا اضافہ فرماتے ہیں اور یہ لفظ بھی وہ ہے کہ اگر یہ واقعۃً حدیث میں موجود ہوتا تو ساری بحث ہی ختم تھی۔ عوام بے چارے کیا جانیں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ وہ جب دیکھیں گے کہ بخاری و مسلم کی حدیث میں صاف طور پر آدم کی پسلی سے حوا کی پیدائش کا ذکر ہے تو مودودی کو کافر سمجھنے میں کیا شک کریں گے۔

خیانت فی الحوالہ

ص ۳۶ تا ۳۷ پر ایک عبارت نقل کی گئی ہے اور تفسیر بیضاوی ص ۱۳۵ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ذرا ناظرین کرام مجتبائی کی تفسیر بیضاوی جز ۲ ص ۴۲ یا مصری مطبع عثمانیہ کی جلد اوّل ص ۲۵۵ اُٹھا کر دیکھیں کہ ''اے خلقت حوا من ضلع آدم'' کا پورا جملہ اس میں موجود ہی نہیں ہے۔ پھر ص ۱۳۵ بھی دیکھیں کہ اس میں پیدائش کا کوئی ذکر ہے یا نہیں اور از ہر شاہ صاحب سے پوچھیں کہ کون سے مطبع کی تفسیر بیضاوی ایسی ہو سکتی ہے جس میں ص ۱۳۵ پر سورۂ نساء آتی ہو۔

خیانت فی الترجمہ

ص ۳۷ کالم ۲ پر جلالین شریف کی یہ عبارت نقل کی گئی ہے (مع ترجمہ)

خلق منها زوجها حواء بالمد من من ضلع من اضلاعه اليسرىٰ.

''حوا آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا ہوئی ہیں''۔

شاہ صاحب سے پوچھئے کہ: ''بالمد من'' کا ترجمہ کہاں گیا۔

ص ۳۸ کالم ۱ پر روح المعانی کی عبارت نقل کرتے ہوئے 'كما رویٰ ذلك ابن عمر رضی اللہ عنہ کا ترجمہ کہاں گیا ہے''۔ بتایا جائے ''اکثر مفسرین'' کس لفظ کا ترجمہ ہے؟

اصل اختلاف

اس سے پہلے کہ ناظرین آگے کی بحث دیکھیں۔ یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ پیدائش حوا کے بارے میں اصل اختلاف کیا ہے۔ یہ بے شک ہم مانتے ہیں کہ زیادہ تر مفسرین حوا کی پیدائش آدم ہی کی پسلی سے مانتے ہیں؛ لیکن ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ یہ عقیدہ نص نہیں اور جو شخص اس کے خلاف عقیدہ رکھے اسے مفسرین ملحد اور زندیق نہیں کہتے؛ بلکہ وہ خود اس کے خلاف عقیدے کو جائز و مباح تسلیم کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سے قابل ذکر علماء اس کے خلاف عقیدہ رکھتے ہیں تنہا مودودی ہی اس کے گنہگار نہیں۔

اس کے برعکس دلاوری صاحبان (دلاوری صاحبان ہم نے طنزاً نہیں کہا؛ بلکہ چونکہ دلاوری اور راز ہر شاہ کی اپنی اہمیت کچھ نہیں؛ بلکہ وہ ایک جماعت اور کیمپ کے ترجمان اور نمائندے ہیں؛ اس لیے یہ الفاظ مناسب معلوم ہوئے) کا دعویٰ یہ ہے کہ جو شخص حوا کو آدم کی پسلی سے پیدا شدہ نہ مانے وہ ملحد و زندیق۔ ان کے نزدیک حوا کا آدم کی پسلی سے پیدا ہونا قرآن و سنّت سے بلاشک وشبہ ثابت ہے اور اس میں اختلاف کرنا کج بحثی، ہٹ دھرمی، الحاد، اعتزال اور رضد ہے۔

اب ذرا پہلے خود راز ہر شاہ کے مضمون سے ہی ان کی تردید دیکھئے۔

ص ۳۷/ امام رازی کی عبارت نقل کرتے ہیں:

ثم قال القاضی الامام والمؤل الاوّل ای قول تخلیق حوا من ضلع اٰدم اقویٰ. (تفسیر کبیر)

''اور قاضی نے بھی قولِ اوّل ہی کو اقویٰ ترین رائے بیان کی ہے۔''

اوّل تو یہ غور فرمائیے ''اقویٰ'' کا ترجمہ ''اقویٰ ترین'' کیا گیا ہے حالانکہ صحیح ترجمہ ''قوی تر'' ہے۔ دوسرے یہ ملاحظہ فرمائیے کہ کسی قول کو ''قوی تر'' کب بولتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر دو قولوں میں ایک قول الحاد و زندقہ پر مبنی ہو تو اس کے مقابلہ کو کبھی ''اقویٰ'' نہیں کہا جاتا۔ کسی قول کو اقویٰ اور راجح اسی وقت بولتے ہیں جب مقابلہ کا دوسرا قول کم قوی اور مرجوح ہو۔ چنانچہ کبھی آپ نے نہ سنا ہوگا کہ کسی منکرِ زکوٰۃ کے مقابلہ میں یہ کہا گیا ہو کہ ''زکوٰۃ کی فرضیت کا قول اقویٰ ہے۔'' اقویٰ اور راجح ہمیشہ ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے جب دوسرا قول قطعاً باطل نہ ہو؛ بلکہ ممکن و مباح کے درجہ میں ہو۔ امام رازی کے اپنے قول وھو الّذی علیه الاکثرون اور دیگر اقوالِ کثیرہ سے بداہتہً یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں اجماع نہیں؛ بلکہ کچھ تعداد ایسی ہمیشہ موجود رہی ہے جو پیدائش حوا کے مشہور عقیدے کو نہیں مانتی قابل غور ہے کہ اگر بقول دلاوری صاحبان یہ عقیدہ نص صریح ہوتا تو اس کے خلاف قول کرنے والوں کو ہمارے اسلاف گمراہ اور کافر کیوں نہ کہتے۔ تمام مفسرین اس پر متفق کیوں نہ ہوتے۔ درآنحالیکہ معاملہ اس کے قطعاً برعکس ہے جیسا کہ ہم آگے ظاہر کریں گے۔

ص ۳۷ کالم ۲ کی آخری سطر یہ ہے:

''مجاہد کا بھی یہی خیال ہے اور ابن عباس بھی اسی کو راجح کہتے ہیں۔'' (تفسیر مظہری)

انصاف کیجئے۔ یہ عبارت کیا خود اس کے لیے کافی نہیں کہ پیدائش حوا کا مذکورہ عقیدہ نص نہیں؛ بلکہ محض اس درجہ کا ہے کہ اسے ''راجح'' کہا جاسکتا ہے اور اس کے منکر کو گالی نہیں دی جاسکتی۔

اب ذرا مولانا مودودی کی وہ عبارت بھی سامنے رکھ لیں جس پر ساری چاند ماری ہے:

''اُسی جان سے اس کا جوڑا بنایا۔ اس کی تفصیلی کیفیت ہمارے علم میں نہیں ہے۔ عام طور پر جو بات اہلِ تفسیر بیان کرتے ہیں اور جو بائبل میں بھی بیان کی گئی ہے کہ آدم کی پسلی سے حوا کو پیدا کیا گیا؛ لیکن کتاب اللہ اس کے بارے میں خاموش ہے۔ اور جو حدیث اس کی تائید میں پیش کی جاتی ہے اس کا مفہوم وہ نہیں ہے جو لوگوں نے سمجھا ہے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ بات کو اسی طرح مجمل رہنے دیا جائے جس طرح اللہ نے اسے مجمل رکھا ہے اور اس کی تفصیلی کیفیت متعین کرنے میں وقت ضائع نہ کیا جائے''۔ (تفہیم القرآن: ج ۱/ ص ۳۱۹/ ص ۳۲۰)

حق یہ ہے کہ مولانا مودودی نے اس جگہ قابل اعتراض حد تک اختصار سے کام لیا ہے۔ انھیں سمجھنا چاہئے تھا کہ کثیر مفسرین جس عقیدے کے قائل ہیں اور احادیث کا ظاہری متن بادی النظر میں جس عقیدے کی تصدیق کرتا ہے اس کے خلاف قول کرنے میں مضبوط دلائل کی پیش کش ضروری تھی۔

لیکن ان کی اس غلطی کے ساتھ یہ بھی ہم جانتے ہیں تجدیدِ دین اور احیائے ملّت کا جو علمی کام وہ کر رہے ہیں اس کی رو سے اس طرح کی غیر ضروری باتوں میں پڑنا بالکل فضول ہے اور یہ جو دلاوری صاحب ان پر ''خواہشاتِ نفسانی'' (ص ۳۸ کالم ۱) کا الزام رکھ رہے ہیں تو یہ محض شوقِ گالی بازی کے سوا کچھ نہیں۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ مودودی کی کونسی خواہش نفس عقیدۂ مذکورہ کے انکار سے پوری ہوئی ہے۔

خیر اب آپ دارالعلوم فروری ۵۶ء کالم ۱ پر نظر ڈالیں۔ بقول ازہر صاحب کسی مودودی اخبار نے دلاوری صاحب کے مضمون کا جواب شائع کیا تھا۔ اسی کے متعلق کہتے ہیں:

''اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ مفسرین نے عام طور پر اس رجحان کا اظہار کیا ہے کہ حدیث نبوی میں حضرت حوا کے، حضرت آدم کی پسلی سے پیدا ہونے کا ذکر بطورِ بیان واقعہ نہیں؛ بلکہ محض تشبیہ کے طور پر ہے، اس ضمن میں انھوں نے صرف علّامہ قرطبی کا ایک قول نقل کیا ہے اور قرطبی کے الفاظ سے یہ مفہوم پیدا کرنے کی کوشش کی ہے گویا وہ اس خیال کی تائید کرتے ہیں۔''

اس عبارت سے کیا ازہر صاحب نے ناظرین کو یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ قرطبی فی الحقیقت وہ قول نہیں کرتے جسے مضمون نگار ظاہر کر رہا ہے؛ بلکہ مضمون نگار زبردستی ان پر یہ عقیدہ چپکا رہا ہے۔ میں آپ کے سامنے وضاحت سے قرطبی کا قول پیش کرتا؛ لیکن میرے بجائے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی زبانی سنئے:

مولانا حفظ الرحمٰن کیا فرماتے ہیں

واضح رہے کہ حضرت موصوف اُس جمعیۃ العلماء کے جنرل سکریٹری ہیں جس کی صدارت کا فخر مولانا مدنی کو حاصل ہے۔ (مولانا موصوف مدرسہ دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے رکن بھی ہیں) ان کی مشہور کتاب قصص القرآن دسیوں سال سے شائع شدہ ہے۔ ذرا حصۂ اوّل طبع چہارم کا صفحہ ۲۸ کھول کر ذیل کی عبارت پر نظر ڈالئے:

''حوا کی پیدائش کس طرح ہوئی؟ قرآن عزیز میں اس کے متعلق صرف اسی قدر مذکور ہے:
وَخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا اور اس (نفس) سے اس کے جوڑے کو پیدا کیا۔ یہ نظمِ قرآنی حوا کی پیدائش کی حقیقت کی تفصیل نہیں بتاتی۔ اس لیے دونوں احتمال ہوسکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ حوا حضرت آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی ہوں جیسا کہ مشہور ہے اور بائبل میں بھی اسی طرح مذکور ہے۔
دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کو اس طرح پیدا کیا کہ مرد کے ساتھ اسی کی جنس سے ایک دوسری مخلوق بھی بنائی جس کو عورت کہا جاتا ہے اور جو مرد کی رفیقۂ حیات بنتی ہے۔
آیت کی تفسیر میں محققین کی رائے اس دوسری تفسیر کی جانب مائل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ قرآن عزیز صرف حضرت حوا کی تخلیق کا ذکر نہیں کر رہا ہے۔ بلکہ ''عورت'' کی تخلیق کے متعلق اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ وہ بھی مرد ہی کی جنس سے ہے اور اسی طرح مخلوق ہوئی ہے البتہ بخاری ومسلم کی روایتوں میں یہ ضرور آتا ہے کہ عورت پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

استودوا بالنساء فإن المرأة خلقت من ضلع. (الحديث)

''عورتوں کے ساتھ نرمی اور خیر خواہی سے پیش آؤ، اس لیے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔''
اس کا مطلب ابن اسحاق نے تو یہ روایت کیا ہے کہ حوا آدم کی بائیں پسلی سے پیدا کی گئیں؛ مگر ابن اسحاق سے زیادہ محقق اور نقاد ''علامہ قرطبی'' نے اس کے معنیٰ یہ بیان کیے ہیں کہ دراصل عورت کو پسلی سے تشبیہ دی گئی ہے...''

لیجیے مولانا حفظ الرحمٰن تو ملحد وزندیق ہوئے۔ اور یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ قرطبی کے الفاظ سے بقول ازہر صاحب بے چارے مضمون نگار نے زبردستی تشبیہ کے معنیٰ لینے کی کوشش کی ہے یا واقعی قرطبی یہی معنیٰ بیان کرتے ہیں۔

مولانا ابو الکلام آزاد کیا فرماتے ہیں؟

اب ذرا مولانا ابو الکلام کا الحاد و زندقہ بھی ملاحظہ فرمالیں۔ اپنی تفسیر ترجمان القرآن جلد اوّل ص ۳۲۸ تفسیر سورۂ نساء میں اسی آیتِ زیرِ بحث کا ترجمہ یوں فرماتے ہیں:

''اے افرادِ انسانی! اپنے پروردگار کی نافرمانی کے نتائج سے ڈرو۔ وہ پروردگار جس نے تمہیں اکیلی جان سے پیدا کیا (یعنی باپ سے پیدا کیا) اور اس سے اس کا جوڑا بھی پیدا کیا (یعنی جس طرح مرد کی نسل سے لڑکا پیدا ہوتا ہے اسی طرح لڑکی بھی پیدا ہوتی ہے) پھر ان دونوں کی نسل سے مَردوں اور عورتوں کی بڑی تعداد دنیا میں پھیلا دی۔''

حاشیہ پر مولانا نے تفسیر مشہور یعنی پیدائش حوا از آدم کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن فرمایا ہے کہ ہم اپنی اسی تفسیر کو راجح سمجھتے ہیں۔ اور اس کی دلیل بعینہٖ وہی دی ہے جو تفسیر ''المنار'' میں دی گئی ہے۔ اور جسے آپ عنقریب ملاحظہ فرمالیں گے۔

دو مصری عالم کیا فرماتے ہیں

تفسیر المنار مصر کے مشہور عالم سید محمد رشید رضا کی تالیف ہے جس میں انھوں نے علامۂ شہیر شیخ محمد عبدہ کے تفسیری نوٹ پیش کیے ہیں۔ یہ تفسیر سورۂ یونس تک رہ گئی پھر بھی گیارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ جلد ۴ ص ۳۲۲ سے ص ۳۲۳ تک اسی آیتِ زیرِ بحث کی تفسیر و تحقیق ہے۔ ذرا صفحہ ۳۲۳ کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

والقرينة علٰى أنه ليس المراد هنا بالنفس الواحدة أدم قوله ''وبثّ منهما رجالًا كثيراً و نساء'' بالتّنكير وكان المناسب علٰى هٰذا الوجه أن يقول ''وبث منهما جميع الرجال والنساء''.

''اور اس بات کا قرینہ کہ یہاں (خلقكم من نفس واحدة) میں نفس واحد کی مراد ''آدم'' نہیں ہے یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا ''اور پھیلا دیئے ہم نے زوجین سے کثیر مرد اور عورتیں۔'' حالانکہ اگر مراد آدم و حوا ہوتے تو مناسب تھا کہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتے کہ ''پھیلا دیئے ہم نے ان سے تمام مرد اور عورتیں۔''

جائے غور ہے۔ ''وخلق منها زوجها'' کے متصل بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ''وبث منهما رجالًا كثيراً و نساء'' اگر نفس واحدہ سے مراد آدم اور زوج سے مراد حوا ہوتی تو ''كثير'' کی بجائے ''تمام'' مرد اور عورتوں کا ذکر کرنا چاہئے تھا؛ کیونکہ محض کثیر نہیں؛ بلکہ سبھی انسان جملہ مرد و عورت انھیں کی اولاد ہیں (یہی دلیل مولانا آزاد نے دی ہے)۔

ص۲۲۳ قال استاذ الامام لیس المراد بالنفس الواحدۃ آدم بالنص ولا بالظاھر۔
''کہا استاد الامام نے یہاں نفس واحدہ سے آدم مراد نہیں ہے، نہ بالنفس، نہ بالظاہر''۔

ص۲۲۱ لیس المراد بالتثنیۃ فی قولہ ''منھما'' آدم و حوّاء بل کل زوجین۔
''اللہ کے قول ''منھما'' سے مراد آدم وحوا نہیں ہیں؛ بلکہ ہر انسانی جوڑا ہے''۔

یعنی شیخ محمد عبدہ کے نزدیک آیتِ زیر بحث کا مطلب وہی ہے جو مولانا ابو الکلام آزاد نے بیان کیا، جس کے مولانا حفظ الرحمٰن قائل ہیں اس طرح دلاوری صاحبان کی طرف سے انھیں ملحد و زندیق نمبر تین لکھ دیجئے۔ محمد رشید رضا خود بھی چونکہ اسی کے قائل ہیں۔ لہٰذا ملحد و زندیق نمبر چار وہ ہوئے۔ اللّٰھم زد فزد

علامہ کازرونی کا ارشاد

ذرا تفسیر انوار التنزیل (از قاضی ناصر الدین بیضاوی) کے حاشیہ پر علامہ کازرونی کا یہ قول بھی ملاحظہ کرتے چلئے:

وظنی أن ما ذکروہ قاصرٌ عن التوضیح المراد والمعنٰی واللّٰہ اعلم۔

(انوار التنزیل: ج۲، ص ر ۲۴)

''میرا خیال ہے کہ جو کچھ ذکر کیا گیا (یعنی حوا کا آدم کی پسلی سے پیدا ہونا) وہ توضیح مراد کے لیے کافی نہیں ہے اور صحیح بات اللہ ہی کو معلوم ہے''۔

اب ذرا مناسب ہوگا کہ تفسیروں کی بحث سے پہلے آپ بخاری مسلم اور مشکوٰۃ کو دیکھتے چلیں۔ قرآن کی زیر بحث آیت میں آدم وحوا کا پیوند یہیں سے مضبوط ہوا ہے۔

بخاری کی حدیث

بخاری، کتاب النکاح میں باب ہے ''باب المداراۃ مع النساء'' (باب عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کے بیان میں) حدیث یہ بیان ہوئی ہے:

اَلْمَرأۃُ کَالضِّلَعِ إِنْ اَقَمْتَهَا کَسَرْتَهَا وَ اِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا اسْتَمْتَعْتَ بِهَا وَفِیْهَا عِوَجٌ۔

''(رسول اللہ ﷺ نے فرمایا) عورت مانند پسلی کے ہے۔ اگر تو اسے سیدھا کرنا چاہے گا تو توڑ دے گا اور اگر فائدہ اُٹھانا چاہے گا تو اُٹھالے گا اور اس میں (عورت میں) کجی (ٹیڑھ) ہے''۔

اس کے بعد باب ہے ''باب الوصاۃ بالنساء'' (باب عورتوں کے ساتھ خیر خواہی کے بیان میں) اس میں جو حدیث بیان ہوئی ہے اس میں پہلے تو پڑوسی کے ساتھ اچھے سلوک کی تعلیم ہے۔ پھر کہا گیا ہے:

واستوصوا بالنساء خیراً فإنھن خلقن من ضلع و إن أعوج شیء في الضلع

اعلاہ فإن ذھبت تقیمہ کسرتھا وإن ترکتہ لم یزل اعوج.
''اور عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ پس وہ عورتیں پسلی سے پیدا کی گئی ہیں اور سب سے زیادہ ٹیڑھا پسلی کے اوپر کا حصّہ ہوتا ہے پس اگر تو اسے سیدھا کرنا چاہے گا تو توڑ دے گا اور اگر چھوڑ دے گا تو وہ ہمیشہ ٹیڑھی رہے گی۔''

یہ ہے وہ حدیث جس کے ظاہر الفاظ سے دلاوری صاحبان چار ملحد بنا چکے ہیں اور ابھی دیکھئے کتنے بنائیں گے۔

میں سب سے پہلے تو اہلِ علم سے یہ پوچھتا ہوں کہ کیا بخاری کے ''ترجمۃ الباب'' کی کوئی اہمیت آپ کی نظر میں نہیں ہے۔کیا اگر واقعی بخاری نے بھی اس حدیث کا مطلب وہی سمجھا تھا جو اکثر لوگ سمجھ رہے ہیں تو حوا کی پسلی سے پیدا ہونے کا واقعہ اپنی ندرت اور انفرادیت کے باعث کیا اس لائق نہ تھا کہ بخاری اس کے بیان میں مستقل باب قائم کرتے، جبکہ انھوں نے بعض ابواب صرف ایک یا دو حدیث کے لیے بھی قائم کئے ہیں۔ جیسا کہ خود باب المداراۃ مع النساء ہے یہ نہ کرتے تو کیا کتاب بدء الخلق (کتاب آغاز پیدائش کے بیان میں) میں بھی اس کا بیان موزوں نہ تھا جبکہ انسان خالق اکبر کی صنعت کا شاہکار اور اشرف المخلوقات ہے اور اس لائق ہے کہ اس کے پہلے ماں باپ کی نادر وفرد خلقت کا تذکرہ اہتمام سے کیا جائے۔لیکن آپ بخاری جلد اوّل ص ۴۵۳ (اصح المطابع) اُٹھا کر دیکھیں اس میں کوئی ذکر حوا کی پسلی سے پیدائش کا نہ ملے گا۔ پھر اسی جلد کا ص ۴۶۸ دیکھیں کتاب الانبیاء میں باب خلق آدم و ذرّیتہ میں یہ حدیث واحد کے صیغوں میں ملتی ہے؛ لیکن بخاری نے اس کا اپنا مستقل باب قائم نہیں کیا۔ ورنہ تاریخِ انسانی کا یہ فرد واقعہ لازماً اس لائق تھا کہ بخاری خلق حوّا یا اس کا ہم معنیٰ کوئی باب قائم کر کے حدیثِ مذکورہ بیان کرتے۔

اور تو اور جو بخاری کتاب التفسیر میں بعض بعض آیتوں کے ضمن میں کئی کئی حدیثیں پیش فرماتے ہیں، وہ زیر بحث آیت کو ایک سرے سے نظرانداز کر کے وَإِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتَامٰى سے سورۂ نساء کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر ان کے خیال میں بھی پیدائش حوا آدم کی پسلی سے تھی۔ اور حدیث مذکورہ کو وہ بجائے تشبیہ کے اصل واقعہ پر محمول کرتے تھے تو لازماً انھیں وَخَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا کی تفسیر میں پیش کرنا تھا نہ کرنا بتاتا ہے کہ وہ خود اس حدیث کو تاریخی بیان پر محمول نہیں کرتے تھے۔ بلکہ محض تشبیہ سمجھتے تھے اور اسی لیے انھوں ے اسے کتاب النکاح میں جگہ دی۔

کوئی اگر کہے کہ چونکہ اس حدیث میں پڑوسی اور عورت کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کی گئی ہے اس لیے بخاری نے اسے کتاب النکاح میں لیا۔ اور چونکہ پسلی سے پیدا ہونا حوا کو آدم کی ذرّیت بنا دیتا ہے۔ اس لیے باب خلق آدم و ذرّیتہ میں لیا۔ ہم کہیں گے کہ اگر واقعی یہ حدیث محض استعارہ نہیں بلکہ بقول دلاوری صاحبان قرآن کی آیت

کی تفسیر ہے تو آخر بخاری نے اسے خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ کی تفسیر میں کیوں نہ بیان کیا یا اس کے لیے مستقل باب کیوں نہ قائم کیا۔ جبکہ حدیث کے مکرر لانے کو وہ اپنا معمول بنائے ہوئے ہیں۔ کیا مشکل تھا کہ آیتِ مذکورہ کے ذیل میں وہ حدیث کا یہ ٹکڑا ''فإنهن خلقن من ضلع'' یا ''خلقت من ضلع'' بیان فرما دیتے۔

ابی بکر ہیثمی نے مجمع الزوائد کی دس جلدوں میں اگرچہ سب کچھ رطب و یابس جمع کر دیا ہے؛ لیکن سورۂ نساء کی تفسیر وہ بھی اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ سے شروع کرتے ہیں اور زیر بحث آیت اور حدیث کو نظر انداز کر جاتے ہیں!

ذرا بخاری کی پہلی حدیث یعنی المرأة كالضلع (عورت مانند پسلی کے ہے) کی تقدیم کو نظر میں رکھئے پھر سوچئے کہ دوسری حدیث میں بخاری نے الفاظ کیا نقل کئے ہیں۔ فانهن خُلِقْنَ من ضلعٍ (وہ عورتیں پسلی سے پیدا کی گئی ہیں) اگر واقعی من ضلع کا مطلب یہی ہے کہ عورت پسلی سے پیدا ہوئی تو یہاں قولِ رسول میں صرف ایک عورت حوا کا ذکر نہیں بلکہ جمع کی ضمیر اور جمع کا صیغہ ہے تو کیا سب عورتیں پسلی سے پیدا ہو رہی ہیں؟

اگر منصفانہ غور کیا جائے تو بخاری کی حدیث کا مطلب جبھی درست ہو سکتا ہے جب اسے محض تشبیہ پر محمول کیا جائے۔ گویا جس جبلّی کجی اور فطری ٹیڑھ کا بیان کیا جا رہا ہے وہ سبھی عورتوں میں علی العموم موجود ہے۔ ورنہ اگر بجائے تشبیہ کے پیدائش ہی مراد لی جائے تو پھر سب عورتوں کے بارے میں یہ کہنا کہ پسلی سے پیدا ہو رہی ہیں کیسی دلچسپ بات ہوگی!

عقل و واقعات کی روشنی میں دیکھئے۔ ظاہر ہے کہ پسلی کا ٹیڑھا ہونا فی الحقیقت نقص نہیں ہے۔ ایک مشین میں ٹیڑھے سیدھے گول مخروطی سبھی طرح کے پُرزے ہوتے ہیں۔ ہر پُرزے کی ساخت اس کی ضرورت کے مطابق ہوتی ہے اور اپنی ساخت ہی کے اعتبار سے وہ صحیح کام انجام دیتا ہے۔ انسان ہی کے جسم میں سب طرح کے پُرزے ہیں اور ان کی ساخت یا شکل پر ان کی اچھائی اور بُرائی موقوف نہیں۔

دوسری طرف حدیث میں عورت کی جس کجی کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ وہ جسمانی اور صورتی کجی نہیں؛ بلکہ جبلّی اور فطری ہے اس لیے پسلی کی ظاہری کجی سے عورت کی جبلّی کجی کو تشبیہ دینا تو صحیح ہو سکتا ہے لیکن عورت کی کجی پر پسلی کے ٹیڑھے ہونے کو بطورِ دلیل اور بطورِ امرِ واقعہ پیش کرنا بحث طلب ہے۔ جبکہ پسلی کی کجی فی الواقع کوئی عیب نہیں ہے۔

اور پہلو سے دیکھئے۔ سب انسان رحمِ مادر سے پیدا ہوتے ہیں۔ رحم کی ساخت اور ظاہری شکل ہر ماں میں ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کچھ لوگ سنگدل ہوتے ہیں کچھ نرم دل۔ کچھ احمق ہوتے ہیں، کچھ دانش مند۔ کچھ سلیم الطبع ہوتے ہیں، کچھ بدمزاج۔ ایک ہی ساخت کے مولد سے بے شمار جبلّی اختلافات رکھنے والوں کی پیدائش ہوتی ہے جس سے معلوم ہوا کہ جبلّت اور فطرت کا تعلق رحم اور شکم کی ساخت سے کچھ نہیں۔ بلکہ اللہ جلّ شانہٗ ہر انسان کے خمیر میں طرح طرح کی خصوصیات ودیعت کرتے ہیں۔ لہٰذا عورت کی جبلّت میں کجی اور ٹیڑھا پن رکھنے کے

لیے اسے ایک ایسے عضو سے پیدا کرنا جو باعتبارِ ساخت ٹیڑھا ہو۔ یعنی پسلی سے کچھ معقول منطق نہیں معلوم ہوتی۔
اور پہلو سے دیکھئے۔ درخت کے ایک ناہموار اور ٹیڑھے میڑھے تنے سے آپ چیر کر عمدہ مسطح اور ہموار تختے نکالتے ہیں۔ کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ چونکہ یہ تختے تنے سے نکالے گئے ہیں اور تنا تھوڑا بہت ٹیڑھا ضرور ہوتا ہے اس لیے ان میں بھی لازماً ٹیڑھ باقی رہے گی۔

عجیب تاویل

ازہر شاہ نے فتح البیان کی عبارت نقل فرمائی ہے جس میں اس شبہ کا ازالہ کیا گیا ہے کہ جب حوا آدم کی اولاد ہوئیں تو ان سے "مباشرت" کیسے جائز ہوئی۔ صاحبِ فتح البیان کا کہنا یہ ہے کہ:

"اس صورت میں حوا کا آدم کی بیٹی ہونا یا بہن ہونا لازم نہیں آتا؛ کیونکہ ان کی تخلیق نسل انسان کے متعارف طریقۂ توالد کے خلاف تھی۔"

یہ دلیل ہم نے بعض اُن تفاسیر میں بھی پڑھی ہے جن کا ہم آگے ذکر کریں گے۔ ہمیں حیرت ہے کہ اس طرح کی طفلانہ باتیں محض روایت کے چکر میں بڑے بڑے اہلِ علم لکھ جاتے ہیں۔ ان سے میں پوچھتا ہوں کہ آپ جو حوا کے آدم کی بیٹی یا بہن نہ ہونے کا ثبوت پیش فرما رہے ہیں تو آدم و حوا کے بعد آپ سلسلۂ عالم کیسے چلائیں گے۔ کیا آدم و حوا ہی کے ایک بیٹے اور ایک بیٹی نے یعنی دو حقیقی بھائی بہنوں نے مباشرت کر کے اگلی نسل کا سلسلہ شروع نہیں کیا ہوگا؟ کیا آگے بھی آپ پسلی وغیرہ سے پیدا ہونے کا کوئی سلسلہ مانتے ہیں۔ یا اور کوئی صورت مزید خلق و ولادت کی ممکن ہے؟ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہی کہ بقول حضرت عبداللہ ابن مسعود و بعض دیگر صحابہ کا طریقہ یہ تھا کہ حضرت حوا کے پیٹ سے توام پیدا ہونے والے لڑکے اور لڑکی کی شادی اگلی بار پیدا ہونے والے بچوں سے کر دی جاتی تھی۔ اوّل تو عقلاً یہی روایت قابلِ نظر ہے۔ پھر اسے درست مان لیں تب بھی کیا فرق پڑتا ہے۔ قابیل نے جس حسین عورت کی خاطر اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا، کیا وہ خود قابیل کی بہن نہ تھی؟ ہابیل اُس سے حسبِ دستور شادی کر لیتا تب بھی وہ بہن تھی، نہ کر سکا تب بھی!

حقیقت یہ ہے کہ حرام و حلال کا مدار محض اجازتِ الٰہی پر ہے۔ پروردگار نے بھائی بہن کا نکاح حرام کر دیا حرام ہو گیا نہ کرتے حرام نہ ہوتا۔ لہٰذا اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ حوا آدم کی بہن یا بیٹی تھیں تو ان کی مباشرت کے لیے خواہ مخواہ تاویلیں نکالنا لاحاصل ہے؛ لیکن جو لوگ پسلی سے پیدا ہونے کو درست نہیں سمجھتے وہ تو سرے سے یہ مانتے ہی نہیں کہ حوا آدم کے بدن کا جز ہیں؛ بلکہ وہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ جس طرح آدم کو بغیر ماں باپ کے پیدا کیا گیا اسی طرح حوا کو بھی پیدا کیا گیا۔ اب آپ کہیں کہ وَخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا کا لازماً مطلب یہ ہے کہ زوج یعنی حوا نفس واحدہ

یعنی آدم کے بدن سے ہی پیدا ہوئی ہیں، تو ذرا مندرجہ ذیل آیتوں کو دیکھئے:

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا.

''اور اللہ نے تمہارے لیے تمہارے نفسوں میں سے جوڑا پیدا کر دیا۔''

کیا اس کا مطلب آپ یہ لیں گے کہ شوہروں کے بدن سے بیویاں پیدا کی گئیں؟

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ.

''تحقیق آیا تمہارے پاس تمہارے ہی نفسوں میں سے رسول۔''

کیا اس کے معنیٰ یہ بیان فرمائیں گے کہ رسول مخاطبین کے بدنوں سے نکلا ہے؟

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ.

''وہ اللہ جس نے تمہیں ضعف سے پیدا کیا۔''

کیا ''ضعف'' کو آپ کوئی جسم تسلیم کریں گے جس سے انسان نکلا؟

اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ.

''جبکہ بھیجا ان میں رسول انھیں میں سے۔''

کیا یہاں بھی سلسلۂ ولادت بیان فرمائیں گے؟

خُلِقن من ضلعٍ (پسلی سے پیدا کی گئیں) بالکل ایسا ہے جیسے:

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ. ''انسان عجل، جلد بازی سے پیدا کیا گیا'' (انبیاء، پارہ ۱۷)

یا جیسے: اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ. (سورۂ روم، پارہ ۲۱)

آئیے ذرا بخاری کی کچھ شرحیں بھی دیکھیں:

فتح الباری

فتح الباری شرح بخاری جلد ۹ صفحہ ۲۰۷ (مصری) پر حافظ ابن حجر عسقلانی (ہیثمی نہیں) حدیثِ وصات کے بارے میں فرماتے ہیں:

هذا لایخالف الحدیث الماضی تشبه المرأة بالضلع بل یستفاد من هذا نکتة التشبیه.

''یہ حدیث اس گزشتہ حدیث کے مخالف نہیں ہے جس میں عورت کو پسلی سے تشبیہ دی گئی ہے؛ بلکہ نکتۂ تشبیہ کو ہی اس سے فائدہ پہنچتا ہے۔''

ہم یہ نہیں کہتے کہ حافظ ابن حجر پسلی سے پیدائش کے منکر ہیں۔ بلکہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ حدیث بخاری کو تشبیہ پر محمول کرنے والے ان کے نزدیک بھی زندیق وملحد نہیں ہیں۔ اور وہ خود اس حدیث کی شرح میں تشبیہ کا سہارا لینے پر مجبور ہوئے ہیں۔ چنانچہ آگے وان اعوج شیيء في الضلع أعلاهٗ کے بارے میں فرماتے ہیں:

ویحتمل أن یکون ضرب ذالك مثلًا لِاعلیٰ المرأة لأن أعلاها رأسها و فیه لسانها وهو الذي یحصل منه الاذیٰ.

''اور احتمال رکھتی ہے یہ عبارتِ حدیث کہ بطورِ مثال کے بولی گئی ہو عورت کے بالائی حصے کے واسطے؛ کیونکہ بالائی حصہ اس کا سر ہے اور سر میں زبان ہوتی ہے اور زبان وہ چیز ہے کہ اس سے تکلیف پہنچتی ہے۔''

اس سے زیادہ صراحت فتح الباری ہی میں کتاب الانبیاء ص ۲۶۲ جلد ۶ پر دیکھئے۔ ابن حجر اُسی امکان و احتمال کا ذکر فرماتے ہیں جس پر یہاں بحث ہو رہی ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

أو الإشارة إلی أنها لاتقبل التقویم كما ان الضلع لایقبله.

''یا (حدیث میں) اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ عورت تقویم (سیدھے کئے جانے) کو اسی طرح قبول نہیں کرتی جس طرح پسلی تقویم قبول نہیں کرتی۔''

گویا وہی خیال جسے دلاوری صاحبان نے الحاد و زندقہ قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر کے نزدیک نہ صرف ممکن؛ بلکہ قابل ذکر اور بالاتر از گمراہی ہے۔

ارشاد السّاری

امام قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ارشاد الساری شرح بخاری جلد ۸ ص ۸۷ (مصری) ملاحظہ ہو۔ (خلقهن من ضلع) کے بارے میں فرماتے ہیں:

والضلع استعیر للمعوج ای خلقن خلقاً فیه اعوجاج وكانّهنّ خلقن من اصل معوج وقیل اراد به ان اولی النساء حواء خلقت من ضلع آدم.

''اور ''ضلع'' بطورِ استعارے کے ایسی چیز کے لیے استعمال کیا گیا ہے جس میں کجی ہو یعنی عورتیں ایسی تخلیق ہیں کہ اس میں پیدائشی طور پر کجی ہے اور گویا کہ وہ ایک ٹیڑھی پسلی سے پیدا شدہ ہیں۔ اور کہا گیا ہے کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ سب سے پہلی عورت حوا آدم کی پسلی سے پیدا کی گئی۔''

امام قسطلانی کی اپنی رائے بالکل ظاہر ہے۔ وہ پسلی سے پیدا ہونے کو محض استعارہ سمجھتے ہیں امرِ واقعہ نہیں۔

وقیلَ کہنے سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ ان کے نزدیک پسلی سے پیدائش کو امر واقعی سمجھنا مرجوح اور ضعیف ہے۔
اس طرح کے استعارے کی مثالیں آپ کو خود اُردو زبان میں کتنی ہی مل جائیں گی۔آپ مثلاً کسی سنگدل اور بے رحم آدمی کے متعلق کہتے ہیں۔"وہ بالکل پتھر ہے"! جس طرح ضلع (پسلی) کی صفتِ ظاہری "ٹیڑھے پَن" سے عورت کی جبلّی کجی کو تشبیہ دی گئی، ٹھیک اسی طرح آپ نے پتھر کی ظاہری صفت سختی اور صلابت سے اُس شخص کی جبلّی سختی اور صلابت کو تشبیہ دی۔ یا مثلاً ایک نازک مزاج اور زود رنج شخص کے لیے آپ کہتے ہیں۔وہ بالکل چھوئی موئی ہے! یہاں بھی ٹھیک پسلی والا ہی استعارہ ہے۔
یا مثلاً آپ زید کی حماقت کا مختصر تعارف اِن لفظوں میں کراتے ہیں۔زید تو بالکل گدھے کا بچہ ہے! کیا "بچہ" کا مطلب یہاں کوئی یہ لے سکتا ہے کہ زید کی ولادت گدھے سے ہوئی ہے؟ کسی بدسیرت آدمی کو آپ بلاتکلف "اِبلیس زادہ" کہہ ڈالتے ہیں کیا کوئی بعید تصور بھی اس میں سلسلہ توالد وتناسل کا ہوتا ہے؟

عمدۃ القاری

علامہ بدرالدین عینی کی عمدۃ القاری شرح بخاری دیکھئے جلد ۹ صفحہ ۴۶۳ (مصری) پر فرماتے ہیں:

"فإنهن خلقن من ضلع" استعير الضلع للعوج ای خلقن خلقاً فیه اعوجاج فکانهن خلقن من أصل معوج فلایتهیاء الانتفاع بهن الّابمداراتهن والصبر علیٰ اعوجاجهن.

"(حدیث انهن خلقن من ضلع میں) پسلی سے کجی کے لیے استعارہ کیا گیا ہے یعنی عورتوں کی خلقت ہی ویسی ہے کہ اس میں کجی ہے۔پس گویا کہ وہ ایک ٹیڑھی اصل سے پیدا ہیں۔پس ان سے فائدہ اُٹھانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ حسنِ سلوک اختیار کیا جائے اور ان کی کجی پر صبر سے کام لیا جائے۔"

فرمائیے عینی کس نمبر کے زندیق ہوئے؟ غالباً پانچ نمبر؛ کیونکہ چوتھا قسطلانی کا ہے۔
اب چھٹے نمبر پر میں ایسا نام پیش کروں گا جس سے ناظرین کانپ جائیں گے۔اور دلاوری صاحبان کو اگر ذرا بھی خوفِ آخرت ہوگا تو شرم سے پانی پانی ہوجائیں گے۔
ملاحظہ ہو علامہ عینی کی شرح بخاری (عمدۃ القاری) جلد ۷ صفحہ ۳۱۵ کتاب الانبیاء مصر۔فرماتے ہیں:

قال الربیع ابن انس خلقت حواء من طینة آدم واحتجّ بقوله تعالیٰ هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ طِیۡنٍ.

''کہا ربیع ابن انس نے پیدا کی گئی حوا آدم کی مٹی سے۔اور استدلال کیا اللہ تعالیٰ کے قول هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ سے (وہ اللہ جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا)۔

ابھی آپ پوری طرح بات نہیں سمجھے ہوں گے۔ دیکھئے: ذرا مکرر غور سے عینی کی عبارت پڑھ کر دیکھیں کہ جو قول پیدائش حوا کے بارے میں مودودی نے کیا تھا وہی ربیع ابن انس بھی کر رہے ہیں۔ یا نہیں؟ اگر کر رہے ہیں تو دلاوری صاحبان کے نزدیک وہ بھی یعنی ربیع ابن انس بھی ملحد و زندیق ٹھیرے۔ونعوذ باللہ من ذالک

اب سنئے! ربیع ابن انس کون ہیں۔ جلیل القدر تابعی۔ خیر القرون ہی کے ایک قرن میں پیدا ہونے والے محترم بزرگ، حافظ ابن حجر عسقلانی ہیثمی نہیں! کی زبانی ان کا تعارف سنئے۔ حافظ موصوف اپنی مشہور کتاب ''تہذیب التہذیب'' میں جلد ۳ صفحہ ۲۳۸ (مطبوعہ حیدر آباد۔ بخطِ مصری) فرماتے ہیں:

ربيع ابن انس البكرى روىٰ عن انس بن مالك و ابى العالية والحسن البصرى وغيرهم .... و عنه ابو جعفر الرازى والاعمش و سليمان التيمى وابن المبارك وغيرهم قال العجلى البصرى هو صدوق وقال النسائي ليس به بأس قال ابن سعد مات فى خلافة ابى جعفر المنصور ذكره ابن حبّان فى الثقات.

''ربیع ابن انس البکری روایت کرتے ہیں انس بن مالک اور ابو العالیہ اور حسن بصری وغیرہم سے اور خود ربیع ابن انس سے ابوجعفر الرازی اور اعمش اور سلیمان التیمی اور ابن مبارک وغیرہم روایت کرتے ہیں کہا عجلی البصری نے ربیع انس بہت سچے ہیں اور کہا نسائی نے ربیع بن انس سے روایت لینے میں کوئی خوف و مضائقہ نہیں ہے۔ کہا ابن سعد نے ان کی موت ابوجعفر المنصور کے دَورِ خلافت میں ہوئی۔ ابن حیان نے ربیع بن انس کا ذکر ثقات (بالکل قابل اعتماد) لوگوں میں کیا ہے۔''

ناظرین یہ بھی جان لیں کہ محدثین کے یہاں سلسلہ روایت میں کسی شخص کو بغیر مکمل اعتماد و اطمینان کے ''ثقہ'' نہیں کہا جاتا اور ان کے نزدیک جو شخص ''ثقہ'' ہو سمجھ لیجیے کہ سچائی، زہد و تقویٰ، معتدل مزاجی، احتیاط اور دین داری میں اس کا پایہ کافی بلند ہے۔

اب اندازہ فرمائیے کہ دلاوری صاحبان کا وہ تیر جو مودودی صاحب کو شکار کرنے کے لیے چلایا گیا تھا اُس بلند مرتبہ تابعی تک کا سینہ چھید گیا ہے جس کی ''ثقاہت'' پر محدثین گواہی دیتے ہیں۔ کیا یہ بات ایک مومن کو کپکپا دینے کے لیے کافی نہیں؟

کیا اس کے بعد بھی مودودی کے دشمن نہیں سوچیں گے کہ ایک ناک کی خاطر وہ کتنی ناکیں کاٹے لے رہے ہیں؟

فیض الباری

از ہر شاہ صاحب کے والدِ محترم علامہ انور شاہ صاحبؒ کا حال فیض الباری شرح بخاری میں دیکھئے۔ وہ کتاب النکاح میں ایک سرے سے اس بحث کو لیتے ہی نہیں کہ عورتیں پسلی سے پیدا ہوئی ہیں، بلکہ دونوں حدیثوں کے ضمن میں صرف مندرجہ ذیل بہترین اُصول بیان کر کے بات ختم کر دیتے ہیں۔ (حدیثِ مدارات ووصات):

ویستنبط منه انّ نظامًا إذ احتویٰ علیٰ خللٍ و کان فی اصلاحه خشیة النقض راسًا ناسب ترك التعرض عنه والاستمتاع به. فإن تعذر فترکه اولیٰ.

(فیض الباری: ج ۴، ص ۱۰۳ مصری)

''اس حدیث سے یہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی نظام کسی نقص وخلل پر استوار کیا گیا ہو اور اس خلل کو دُور کرنے میں ایک سرے سے نظام ہی کی شکست وریخت کا اندیشہ ہو تو مناسب یہ ہے کہ اُس خلل کو دُور کیے بغیر ہی اس سے ممکنہ فائدہ اُٹھالیا جائے پس اگر فائدہ اُٹھانا ممکن نہ ہو تو ترک بہتر ہے۔''

خیال فرمائیے! اگر علامہ انور شاہ صاحبؒ واقعۃً حدیث بخاری کو تخلیق حوا کے بے مثال و منفرد واقعۂ مشہورہ پر محمول فرماتے تو کیا اس کا ذکر تک پسند نہ کرتے۔ جو اُصول آپ نے مستنبط فرمایا ہے وہ بجائے خود یہ سمجھا رہا ہے کہ حضرت حدیثِ زیر بحث کو تشبیہ واستعارے پر ہی محمول فرماتے تھے۔

اس سے زیادہ وضاحت اسی فیض الباری میں جلد ۴ کتاب الانبیاء میں ملاحظہ فرمائیے۔ زیر بحث حدیث کے متصل بعد یہ الفاظ ہیں: (والمشهور أنها خلقت من ضلع الیسر (اور مشہور یہ ہے کہ وہ (عورت) بائیں پسلی سے پیدا کی گئی ہے) خیال فرمائیے کہ کیا کسی ایسے عقیدہ کو جو قرآن سے صراحۃً ثابت اور حدیث سے بداہۃً صادر ہوا ''اور مشہور یہ ہے'' کہہ کر بیان کیا جاسکتا ہے؟ حدیث کے مبنی بر تمثیل ہونے کے احتمال کا مزید واضح تر بیان اسی جگہ ''فیض الباری'' ہی میں ملاحظہ فرمالیجیے۔

انّ اٰدم علیه السلام انتبه مرة من منامه فإذا حوا جالسة علیٰ یساره. و هٰذا معنٰی مخلوقة عن ضلعٍ ای رآها مخلوقة نحو یساره (آدم علیہ السلام ایک مرتبہ نیند سے ہوشیار ہوئے تو اچانک دیکھتے ہیں کہ حوّا ان کے بائیں طرف بیٹھی ہیں۔ اور یہی معنیٰ ہیں پسلی سے پیدا ہونے کے۔ یعنی آدم نے حوا کو بایں طور دیکھا کہ گویا وہ بائیں طرف سے پیدا ہوگئی ہیں) کیا اس کے بعد بھی احتمالِ مذکور پر ملحد سازی کی گنجائش ہے؟ مولانا بدرِ عالم صاحب (فیض الباری کے مرتّب) نے یہاں ڈارون کے نظریئے اور مغرب زادوں کے تصورات پر بھی ایراد کیا ہے۔ یعنی یہ کہ مادّہ پرست ذہن یہ تو آسانی سے مان لیتے ہیں کہ آدمی بندر کی اولاد ہے یا

سیاروں میں آبادیاں ہیں وغیرہ؛ لیکن یہ ماننا اس کے لیے مشکل ہوتا ہے کہ حوا بغیر کسی سلسلۂ توالد و تناسل کے محض حکمِ خداوندی سے پیدا ہو گئیں۔ وما اجهلهم.

تیسیر القاری

مولانا نورالحق محدّث دہلوی اپنی فارسی شرح بخاری ''تیسیر القاری'' (مطبوعہ مطبع علوی لکھنؤ) میں جلد پنجم ص ۶۸ پر لکھتے ہیں:

''فانهن خلقن من ضلع'' پس بہ تحقیق ایں زناں پیدا کردہ انداز کجی یعنی سرشت اینہا ایں چنیں است ومخلوق بہ کجی شدہ و دفع آں متصور نیست۔

''پس بہ تحقیق یہ عورتیں کجی سے پیدا کی ہوئی ہیں یعنی ان کی فطرت و جبلّت اس طرح کی ہے اور ٹیڑھے پن سے بنی ہے۔ اور مٹنا اس ٹیڑھے پن کا ممکن نہیں ہے۔''

فرمائیے: کیا مولانا نورالحق محدّث دہلوی ملحد و زندیق نمبر ۶ نہیں ٹھیرے؟

مسلم کی حدیث

آیئے ذرا مسلم کو بھی دیکھیں۔ یہ بھی اس حدیث کو کتاب النکاح میں رکھتے ہیں۔ عنوان ان کا بھی ''بدء الخلق'' یا ''خلقتِ حوا'' وغیرہ نہیں۔ بلکہ باب الوصية بالنساء ہے۔ الفاظِ حدیث یہ ہیں:

إن المرأة خلقت من ضلع.

''تحقیق عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔''

یہاں بے شک صیغۂ واحد ہے؛ لیکن کیا اہلِ علم و زبان نہیں جانتے کہ اس طرح کے مواقع پر ہمیشہ جنس مراد ہوتی ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: ''عورت ناقص العقل ہے۔'' جنس عورت مراد ہوتی ہے نہ کہ کوئی خاص عورت۔ یا مثلاً کہتے ہیں: ''گورے کو کالے پر، عربی کو عجمی پر، کوئی فضیلت نہیں۔'' ہر گورا اور ہر عربی مراد ہوتا ہے نہ کہ کوئی خاص شخص۔ ایسی کتنی ہی مثالیں آپ روزمرّہ کی بول چال اور تحریر میں دیکھ لیں۔ اگر واقعی حضور ﷺ کی مراد ''المرأة'' سے حوا ہوتی تو ''ان المرأة'' کی جگہ ''انّ حوّاء'' کا موقع تھا۔ آخر غور تو کیجیے انبیاءِ گزشتہ کے خاص واقعات، عالمِ غیب کی خاص خبریں۔ حوض، پل صراط، کوثر اور اس طرح کی دسیوں چیزوں کا حال رسول اللہ ﷺ نے بیان کیا تو اہمیت اور استقلال کے ساتھ لیکن حواء کی پیدائش اگر پسلی سے ہی ہوئی تھی تو کیا یہ واحد و نادر واقعہ اس لائق نہ تھا کہ حضور بالکل ضمنی طور پر بیان کرنے کے عوض مستقلاً بیان فرماتے۔ مسلم کی پیشِ نظر حدیث میں آگے جو تفصیل ہے وہ کلیتاً عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کے بارے میں ہے اور بخاری کی حدیث میں پہلی یہ ہے:

من كان يؤمن بالله واليوم الأخر فلا يؤذي جاره واستوصوا بالنساء خيراً.
''جو شخص اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہئے کہ ہمسایہ کو تکلیف نہ پہنچائے اور حسنِ سلوک کرے عورتوں کے ساتھ...''

اس کے بعد ''فإنهن خلقن من ضلع'' ہے اور اس کے بعد مزید ایسی عبارت ہے جو پسلی سے پیدا ہونے کی ندرت کے قطعاً مطابق نہیں؛ بلکہ عورتوں کی جبلت کے بارے میں ہے۔ تو آخر یہ کیا معاملہ ہے کہ حضور خبر پیدائش کو قطعاً ذیلی اور ضمنی بنا رہے ہیں؟ بخاری کی باب المدارات والی حدیث خود اس بات کا ثبوت ہے کہ المرأة سے مراد حوا نہیں، بلکہ جنس عورت ہے۔ یہی جنس مسلم کی حدیث میں ہے۔

اکمال المعلم

اکمال المعلم شرح مسلم ملاحظہ فرمائیے۔ امام ابی عبداللہ جلد ۴ ص ۱۰۰ پر حدیث مذکور کی شرح میں فرماتے ہیں:

ويحتمل أنه تمثيلٌ اى مثل ضلع فهى كالضلع ويشهد لهٗ قوله لن تستقيم لك علىٰ طريقة (الحديث).
''اور احتمال ہے کہ یہ محض تمثیل ہو یعنی عورت مانندِ پسلی کے ہے اور اس احتمال کی دلیل روایتِ مسلم کے یہ الفاظ ہیں ''لن تستقيم لك علىٰ طريقةٍ الخ''.

واضح رہے کہ ''يحتمل'' سے یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ اُردو محاورے کے مطابق عربی میں بھی اسے محض امکان اور بعید احتمال کے لیے بولا جاتا ہے۔ بلکہ عربی میں اس کا استعمال بار ہا اغلب و راجح کے لیے بھی ہوتا ہے۔ جس کی مثال حافظ ابن حجر کا یہ قول ہے:

ويحتمل أن يكون المراد بكسره الطلاق. (فتح الباری: ج۹ / ص ۲۰۷)
''اور احتمال ہے کہ ''بِكَسْرِه'' سے مراد طلاق ہو۔''

مسلم کی روایت میں صراحۃً موجود ہے کہ وكسرها الطلاق (یعنی اگر تو عورت کی کجی کو سیدھا کرنا چاہے گا تو اسے توڑ دے گا۔ اس توڑنے کا مطلب ''طلاق'' ہے) اس طرح ''کسرہا'' کی مراد صراحۃً اور یقیناً طلاق ہی ہوئی۔ مگر حافظ ابن حجر نے اس کے بیان میں بھی ''يحتمل'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

شرح اکمال المعلم

علامہ سنیوسیؒ شرح اکمال المعلم میں جلد ۴ ص ۹۹ پر یہی ابی عبداللہ والی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اختلف متٰی خلقت من ضلع اُدم قیل قبل دخول الجنّة وقیل فی الجنة.

"اس میں اختلاف ہے کہ حوا کب پسلی سے پیدا ہوئیں۔آدم کے دخولِ جنت سے پہلے یا جنت میں؟"

گویا سنیوسی نے امام ابی عبداللہ کے بیان کردہ احتمال کو تسلیم کرنے کے بعد مذکورہ الفاظ اُن لوگوں کے اظہارِ مدعا میں لکھے ہیں جو پیدائش کو پسلی سے مانتے ہیں۔افسوس علّامہ شبیر احمد عثمانیؒ فتح الملہم میں اس مقام تک نہ پہنچ سکے۔ورنہ ان کی تصریحات اس موضوع پر بڑی معرکۃ الآرا ہوتیں۔

مرقاۃ المفاتیح

آئیے مشکوٰۃ کو بھی دیکھتے چلیں۔اگرچہ اس کی کوئی ذاتی اور مستقل حیثیت نہیں؛ بلکہ اس کے مؤلف تو محض ناقل ہیں؛لیکن مزید تنقیح کے لیے ہلکی سی نظر ڈال لیجئے۔

ملّا علی قاری اپنی شرح مشکوٰۃ مرقاۃ المفاتیح میں جلد ۳ ص ۴۶۰ (مصری) پر لکھتے ہیں:

(فإنهن خلقن من ضلع) بكسر الضاد وفتح الام واحد الاضلاع وهو عظم معوج استعير للمعوج صورةً او معنًى اى خلقن خلقاً فيه اعوجاج فكانهن خلقن من اصل معوج.

"(ضلع) ضاد کے زیر اور لام کے زیر کے ساتھ اضلاع کا واحد۔وہ ایک ٹیڑھی ہڈی ہے۔استعارہ کیا گیا ہے صوری یا معنوی کجی کے لیے یعنی عورتوں کی جبلّت ہی میں کجی ہے پس گویا کہ وہ ٹیڑھی اصل سے پیدا کی گئی ہیں۔"

فرمائیے!کیا ملّا علی قاری بھی محض استعارہ وتشبیہ کا قول نہیں کر رہے؟ پھر ان کا نمبر کیا ہوا.....یعنی زندیق و ملحد نمبر؟ آگے چلئے۔حدیث مسلم کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔(یہی صفحہ)

عن أبي هريرة (قال قال رسول الله صلي الله عليه وسلم إن المرأة) أي اصلها وجنسها أو امها (خلقت من ضلع) اى من اضلاع اُدم او من عوج ونظيره قوله تعالٰى خلق الانسان من عجل.

"ان المرأة یعنی عورت کی اصل اور جنس یا ماں پیدا کی گئی پسلی سے یعنی آدم کی پسلیوں میں سے ایک پسلی سے یا پیدا کی گئی کجی سے۔اور کجی سے پیدا کی جانے کی نظیر اللہ کا یہ قول ہے خلق الانسان من عجل"۔

ملاحظہ فرمائیے: روایت مسلم کی المرأة کی مقدم تشریح ملا علی قاری اصل اور جنس سے کر رہے ہیں اور ماں

یعنی حوا کی تشریح ''یا'' کہہ کر مؤخر کر رہے ہیں۔ بعدۂ ضلع کو عوج کے معنیٰ میں لے کر یعنی پسلی کو کجی کے معنیٰ میں لے کر کتاب اللہ سے دلیل بھی اسی کے مطابق لا رہے ہیں۔

کہئے کیا یہی ہے وہ نص اور مسلّمہ حقیقت جس پر دلاوری صاحبان کی موشگافیاں مبنی ہیں؟

تفسیر ابن جریر

آیئے ذرا قدیم تفسیروں کو بھی دیکھیں۔لیکن اس سے پہلے یہ ایک بار آپ اور یاد کر لیں کہ ہمارا اختلاف کیا ہے۔ہم یہ نہیں ثابت کرنا چاہ رہے کہ حوا کو آدم کی پسلی سے پیدا ماننا غلط یا زندقہ ہے۔ہم تو صرف اتنا بتانا چاہ رہے ہیں کہ حوا کی پسلی سے پیدائش قرآن کی نص یا حدیث کا عقیدۂ صریحہ نہیں اور اس سے انکار یا اس میں تذبذب کے لیے اتنی معقول اور کثیر وجوہات موجود ہیں کہ دلاوری صاحبان کا فتویٔ الحاد و زندقہ محض ان کی جہالت اور کور چشمی کے سوا کچھ نہیں۔

از ہر شاہ دار العلوم فروری ۵۶ء صفحہ ۳۷ کالم ۲ پر فرماتے ہیں:

''سدی سعید مجاہد قتادہ بھی کہتے ہیں کہ حوا کی تخلیق آدم کی ضلع سے ہوئی۔دیکھئے تفسیر ابن جریر طبری''۔

از ہر شاہ یہ تو بتا گئے؛ لیکن یہ نہ بتایا کہ ابن جریر نے پسلی سے پیدا ہونے کی روایتوں سے پہلے الفاظ کیا کہے ہیں۔ابن جریر لکھتے ہیں: قال اهل التاويل امرأتها حوا۔ اس کے بعد انھوں نے روایاتِ مذکورہ بیان کی ہیں۔کیا ''قال أهل التاويل'' کے الفاظ اس حقیقت کے گواہ نہیں کہ ''عورت'' سے مراد ''حوا'' لینا محض تاویل ہے نص نہیں، مجاہد و قتادہ وغیرہ کی روایتوں سے کوئی حکمِ منصوص ثابت نہیں ہوتا۔ذرا یہ لطف سن لیجیے کہ:

ان حواء خلقت من ضلع آدم الاقصر الايسر وهو نائم.

''حوا آدم کی بائیں چھوٹی پسلی سے پیدا کی گئیں جبکہ آدم سوئے ہوئے تھے۔''

یہ روایت ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہے۔جیسا کہ ابن حجر نے بھی فتح الباری میں لکھا ہے۔اب تفسیر ابن عباسؓ اُٹھا کے دیکھیں۔ابن عباس آیت خَلَقَكُمْ کی تفسیر میں نفس واحدہ سے آدم اور زوجھا سے مراد اگرچہ حوا ہی لیتے ہیں؛ لیکن پسلی سے پیدا ہونے کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔حالانکہ اگر بخاری و مسلم میں وارد حدیثیں واقعۃً ان کے نزدیک تاریخی واقعے اور تکوینی امر کی حامل تھیں تو آیۂ مذکورہ کی تفسیر سے بہتر کون سی جگہ تھی، پسلی سے پیدا ہونے کا ذکر کرنے کی؟

روح المعانی

شہاب الدین آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی جز ۳ ص ۱۶۱ پر لکھتے ہیں:

وانكر ابو مسلم خلقتها من الضلع لأنه سبحانهٗ قادر علىٰ خلقها من التراب فأيّ فائدة في خلقها من ذٰلك.

''ابومسلم نے حوا کے پسلی سے پیدا ہونے کا انکار کیا ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے مٹی سے پیدا کرنے پر قادر ہے تو کیا فائدہ پسلی سے پیدا کرنے میں؟''

ازہر صاحب کہتے ہیں کہ ابومسلم اصفہانی معتزلی ہیں۔ چلئے مان لیا؛ لیکن کیا صاحب روح المعانی نے بھی انھیں ان کے انکار پر ملحد وزندیق ٹھیرایا؟ کیا کوئی بات محض اس لیے غلط ہونی لازمی ہے کہ وہ کسی معتزلی نے کہہ دی ہے؟ ذرا توجہ فرمائیے۔ نفس واحدہ سے ''اکیلی جان'' اور ''زوج'' سے جنس عورت مراد لینا تو ایک طرف رہا۔ اس سے بھی عجیب ومختلف تفسیریں موجود ہیں۔ ملاحظہ ہو بحرالمحیط (لابن حیان اندلسی) جز ۳ ص ۱۵۵:

ومن غريب التفسير أنه عنى بالنفس الروح المذكورة فيما قيل أنه قال عليه الصلٰوة والسلام ان الله خلق الارواح قبل الأجسام بكذا وكذا سنة و عنى بزوجه البدن و عنى بالخلق التركيب.

''ایک کمیاب تفسیر یہ بھی ہے کہ ''نفس واحدہ'' سے وہ روح مراد لی جائے جس کا ذکر رسول اللہ ﷺ کے اُس قول میں ہے کہ اللہ نے روحوں کو جسموں سے اتنے اتنے پہلے پیدا کیا۔ اور ''زوج'' سے مراد بدن لیا جائے۔ اور ''خلق'' سے مراد روح وبدن کی ترکیب۔''

ابن حیان نے اس نادر تفسیر کرنے والوں کو بھی ملحد وزندیق نہیں کہا؛ بلکہ صرف اتنا کہا:

هٰذا مخالف لكلام المتقدمين. ''یہ سلف کے کلام کے خلاف ہے۔''

بحرالمحیط

اور خود ابن حیان کی جو رائے ہے وہ بھی دیکھئے:

يحتمل ان يكون ذالك علىٰ جهة التمثيل لاضطراب اخلاقهن وكونهن لايثبتن علىٰ حالته واحدة اى صعبات المراس فهى كالضلع العوجاء كما جاء خلق الانسان من عجل وليؤيّد هٰذا التّاويل قوله ان المرأة فاتىٰ بالجنس ولم يقل ان حواء. (بحرالمحیط جز ۳، ص ۱۵۳)

''احتمال ہے کہ (حدیث میں پسلی سے پیدائش کا ذکر) بطورِ تمثیل کے ہو بسبب عورتوں کے غیر قائم اخلاق کے اور بسبب ان کے ایک حالت پر قائم نہ رہنے کے یعنی قوی المزاج نہ ہونے کے۔ پس وہ مانند پسلی کے ہیں کجی میں جیسا کہ اللہ کا قول خلق الانسان من عجل. اور اسی کی تائید (روایات مسلم کے الفاظ) انّ المرأة سے ہوتی ہے؛ کیونکہ یہ لفظ بطورِ جنس استعمال ہوا

ہے۔اور یہ نہیں کہا گیا کہ ان حوّا (خلقت من ضلعٍ).
جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں یحتمل کے معنیٰ محض امکان کے نہیں۔خود وہاں بھی ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ ابن حیان روایتِ مسلم کے تمثیلی ہونے پر دلائل قائم فرما رہے ہیں۔گویا اغلب اور راجح واقویٰ ان کے نزدیک تمثیل ہی ہے نہ کہ واقعۃً پسلی سے پیدائش۔

درِ منثور

ازہر شاہ نے ''درمنثور'' کا بھی حوالہ دیا ہے۔لیکن ذرا ''درِمنثور'' میں بیان شدہ ذیل کی روایات پر بھی نظر ڈالیے:

واخرج عبد بن حمید وابن المنذر عن ابن عمر وقال خلقت حواء من خلف اٰدم الایسر وخلقت امرأۃ ابلیس من خلفه الایسر. واخرج ابن ابی حاتم عن الضحاك و خلق منها زوجها قال خلق حوّا من اٰدم من ضلع الخلف وهو اسفن الاضلاع. (درمنثور جز ۲ ص ۱۱۶ مصری)

''تخریج کی عبد بن حمید اور ابن المنذر نے ابن عمرؓ سے کہ انھوں نے کہا حوا آدم کے خلف (؟) سے بائیں طرف سے پیدا کی گئی ہیں اور ابلیس کی عورت (؟) ابلیس کے خلف الایسر (؟) سے اور تخریج کی ابن ابی حاتم نے ضحاک سے کہ انھوں نے کہا حوا آدم کی ضلع الخلف سے پیدا کی گئیں جو سب سے نچلی پسلی ہے۔''

ذرا اندازہ کیجیے بات پسلی سے بڑھ کر ''خلف'' تک پہنچ گئی۔''خلف'' سے کیا مراد ہے اسے رواۃ جانیں۔ہم تو صرف اتنا کہیں گے کہ جس طرح ظہورِ مہدی کے سلسلہ میں روایات ''عترتِ رسول'' سے بڑھ کر ''اولادِ فاطمہ'' تک پہنچ جاتی ہیں اسی طرح پسلی کے معاملہ میں بھی تعینات بڑھ رہے ہیں۔اور ابلیس کی عورت (؟) کی پیدائش پسلی سے گویا پسلی کی پیدائش نمبر دو ہے!

روایات کا ایسا ہی رطب و یابس سلسلہ تو ہے جو قرآن وسنت کی تصریحات کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔ روایات پیدائش میں دائیں پسلی تک کی روایت موجود ہے۔

تفسیر کبیر

امام رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں بھی ابو مسلم اصفہانی کا ''انکار'' نقل کیا ہے۔لیکن نہ ملحد کہا، نہ زندیق؛ بلکہ محض اتنا کہا:

قال القاضی والقول الأوّل اقویٰ. (جز ۳، ص ۱۳ مصری)

''کہا ہے قاضی نے پہلا قول زیادہ مضبوط ہے۔''

اور اس سے قبل کہا:

وھو الذی علیہ الأکثرون. ''اس قولِ اوّل پر اکثریت ہے۔''

اس سے بھی ظاہر ہے کہ اختلاف الحاد و زندقہ کا نہیں، قلت و کثرت کا ہے۔

تفسیر الجواہر

علامہ طنطاوی اپنی تفسیر ''الجواہر'' میں جز ۳ ص ۵ پر فرماتے ہیں:

واعلم ان خلق اٰدم و حواء لیس ھناک دلیل قطعی علیٰ کیفیتہٖ القراٰن اتیٰ بہ مجملاً علیٰ مقتضیٰ.

''جان لو کہ آدم و حوا کی پیدائش اور کیفیت پیدائش کے لیے یہ آیت (خَلَقْنٰکُمْ) دلیلِ قطعی نہیں ہے۔ قرآن اپنے مقتضیٰ کے لیے یہاں بالکل مجمل ہے۔

از ہرشاہ کے اس دعوے سے کہ ''حوا کی پیدائش آدم کی پسلی سے'' قرآن سے بلا شک و شبہ ثابت ہے طنطاوی کی مذکورہ عبارت کا مقابلہ کر کے دیکھیے!

از ہرشاہ ص ۳۸ کالم ۲ پر رقم طراز ہیں:

''اور قرطبیؒ نے بھی نہ کسی شدت کے ساتھ یہ رائے ظاہر کی ہے اور نہ انھوں نے اپنی رائے کے ساتھ کچھ دلائل دیے ہیں۔''

قرطبی کی جو رائے ہے وہ آپ مولانا حفظ الرحمٰن کی عبارت میں دیکھ چکے۔ اب یہ دیکھیے کہ جن تفسیروں کا از ہرشاہ ذکر کرتے ہیں ان میں بھی اکثر بلا دلیل ہی بات کہی گئی ہے۔ شوکانی کی فتح القدیر میں نہ تو پسلی کا کوئی ذکر ہے نہ (خلقت حوا من اٰدم) پر کوئی دلیل ہے۔ اسی طرح تفسیر ابن عباس میں قطعاً دلیل نہیں۔ نیل الاوطار بھی دلیل سے خالی ہے۔ سنن کبریٰ کی خبر نہیں کہ اس میں سے وہی جز غائب ہے جس میں یہ بحث ہونی چاہیے۔ تعلیق الصبیح (شرح مشکوٰۃ) میں بھی کوئی دلیل مذکور نہیں۔

علامہ طنطاوی تفسیر جوہری جز ۳ صفحہ ۵ پر فرماتے ہیں کہ:

''آسمانی کتابوں نے صرف یہ بتایا ہے کہ ہمارے ماں باپ کون تھے اور اس سے زیادہ چھان بین سے ہمیں نجات دے دی ہے۔ اب اس کے بارے میں بحثیں عقلی گرما گرمی تو پیدا کر سکتی ہیں؛ لیکن جو کچھ بھی اس کے بارے میں آدمی فیصلہ کرے گا اس کا مطابق حقیقت اور امرِ واقعہ ہونا مشکوک ہے۔''

اگر ہم نے طنطاوی کی مراد بیان کرنے میں کچھ تحریف کی ہے تو کتاب ملاحظہ فرمالی جائے حوالہ اوپر موجود ہے۔غور کیجئے دلاوری صاحبان کا یہ دعویٰ کتنا بودا رہا کہ "پیدائش حوا از ضلع آدم" نص اور بے ریب وشک ہے۔

فتدبّر!

ایک بار پھر غور کیجئے۔ایک طرف تو اللہ کی سنتِ جاریہ یہ ہے کہ انسان کو ولادت کے متعین طریقہ پر پیدا کرتا ہے۔اس میں کوئی استثناء سوائے آدم وحوا کے نہیں۔دوسری سنتِ جاریہ یہ ہے کہ ہر چیز بہت چھوٹی شکل میں پیدا کرتا ہے پھر اسے تدریجاً بڑھاتا ہے۔یہ نہیں ہوتا کہ رحمِ مادر سے اِک دم جوان آدمی نکل پڑے یا بیج سے ایک دم پورا درخت پھوٹ جائے۔سلسلہ پیدائش کو دنیا کی کسی بھی نوع اور جنس میں دیکھ لیجئے۔یہی قانونِ قدرت ملے گا۔اب یا تو یوں کہیے کہ جس طرح بالفاظِ قرآن وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (اور یقیناً ہم نے خمیر اُٹھائے ہوئے گارے سے انسان کو پیدا کیا جو خشک ہو کر کھڑکھڑانے لگتا ہے) حضرت آدم پوری قدوقامت کے ساتھ تخلیق کئے گئے اسی طرح حوا بھی پوری قدوقامت کے ساتھ تخلیق کی گئیں،ورنہ پسلی سے پیدا ہونا اور جوان العمر پیدا ہونا ایسا دعویٰ ہے جو اللہ کے دوائل اور جاوداں قانونوں کو توڑتا ہے۔اسے تسلیم کرانے کے لیے حد درجہ قوی اور صریح دلیلوں کی ضرورت ہے۔حضرت مریم کے پیٹ سے ایک شخص بغیر باپ کے پیدا ہوتا ہے۔اگر قرآن اور رسول اللہ ﷺ صریح وواضح الفاظ میں نہ بتاتے کہ مریم اللہ کی برگزیدہ بندی تھیں۔اور ان کے پیٹ سے پیدا ہونے والا بے باپ کا انسان اللہ کے حکمِ خاص سے پیدا شدہ بلند مرتبہ نبی تھا تو دنیا کا کوئی معقول آدمی کبھی نہ مانتا کہ ایسا ہوا ہے۔ہم جانتے ہیں کہ بے باپ کے پیدا کرنا یا کسی بھی اور طریقہ سے پیدا کرنا اللہ کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں۔وہ اور اس کا رسول اگر ہمیں صاف صاف بتادیتے کہ حوا آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی ہیں تو کون کافر تھا جو انکار کرتا؛لیکن جس صورت میں کہ صراحت وبداہت سے قرآن وسنت دونوں خالی ہیں؛ کیونکر ایک ایسے عقیدے کو مدارِ ہدایت وگمراہی ٹھیرایا جاسکتا ہے جس سے اللہ جل شانہ کے دوائل مسلّم جاوداں اور استثنا سے بالاتر قوانین کی تکذیب وتغلیط ہوتی ہو۔

حاشیۂ بخاری

مارکیٹ میں فی زمانہ اصح المطابع کی چھاپی ہوئی بخاری ملتی ہے یہی ایڈیشن دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ سے دورۂ حدیث کے اکثر طلباء کو دیا جاتا ہے۔اگر ازہر شاہ اسے ملاحظہ فرماسکتے تو شاید وہ دلاوری صاحبان کے فتویِ الحاد وزندقہ کی تصویب وتائید اس بے جگری سے نہ کرسکتے۔ملاحظہ کیجئے اسی ایڈیشن کی بخاری جلد اول کتاب الانبیاء ص ۴۶۹ پر حدیث زیر بحث کے لفظ استوصوا پر حاشیہ نمبر ۸ یہ ہے:

قال البیضاوی الاستیصاء قبولُ الوصیةِ ای اُوْصِیْکُمْ بِهِنَّ خَیْرًا فاقبلوا وصیّتی فیهنّ لانّهنّ خُلِقْنَ خلقاً فِیْهِنَّ اِعوجَاجٌ فکانّهنّ خُلِقْنَ مِنْ اَصْلٍ معوّجٍ کَالضّلعِ مثلاً فلایتهیّأ انتفاع بهنَّ اِلّا بالصَّبرِ علٰی اعوجاجِهنَّ و قیل اراد ان اول النّسآء وهی حوّاء خُلِقَتْ مِنْ ضلعٍ من اضلاعِ اٰدم.

''کہا بیضاوی نے الاستیصاء کے معنیٰ ہیں قبولِ وصیت۔ یعنی میں (رسول اللہ) تمہیں عورتوں کے حق میں بھلائی کی وصیت کرتا ہوں پس میری وصیت قبول کرو؛ کیونکہ وہ عورتیں ایسی جبلّت وسرشت پر پیدا کی گئی ہیں جس میں کجی ہے۔ پس گویا کہ وہ ایک ایسی اصل سے پیدا ہیں جس میں کجی ہے جیسے کہ مثلاً پسلی، پس نہیں ممکن ہے ان سے نفع اُٹھانا بغیر صبر کئے ہوئے ان کی کجی پر۔ اور کہا گیا کہ اس قول میں ارادہ کیا گیا اس بات کا کہ سب سے پہلی عورت یعنی حوا آدم کی پسلیوں میں سے ایک پسلی سے پیدا کی گئی۔''

ذرا غور سے پڑھئے۔ بیضاوی صراحۃً حدیث کو تشبیہ پر ہی محمول کر رہے ہیں۔ فکَانهنّ (پس گویا کہ وہ عورتیں) اور مثلاً کے الفاظ اس کے لیے ثبوتِ قطعی ہیں تشبیہی معنیٰ کو مقدم بیان کرنا اور تفسیر مشہورہ یعنی پسلی سے پیدائش کو وقیل کہہ کر بعد میں بیان کرنا مزید ثبوت ہے۔ اب بتائیے کیا ازہر شاہ اسے ملاحظہ فرمالیتے تو تب بھی دلاوری صاحب کی تائید کرتے؟

ایک لطیفہ

''خیانت فی الحوالہ'' کے ذیل میں ہم آپ کو بتا چکے کہ ازہر شاہ نے بیضاوی کا حوالہ غلط دیا ہے۔ ذرا مزید تماشہ ملاحظہ فرمائیے کہ شاہ صاحب نے تفسیر کبیر سے امام رازی کا جو قول نقل کیا ہے (ماہنامہ دارالعلوم فروری ۵۶ئہ ص ۷۳ کالم ۱) اس میں قال القاضی کے الفاظ ہیں۔ ان الفاظ کے متعلق شاہ صاحب اسی کے ذیل میں (سطر ۱۱ و ۱۲) لکھتے ہیں کہ:

''امام (رازی) کی اس عبارت میں قاضی سے مراد قاضی بیضاوی ہیں جن کی عبارت اوپر گزر چکی ہے۔''

گویا شاہ صاحب یہ کہہ رہے ہیں کہ قاضی بیضاوی کا جو قول تفسیر مشہورہ کی تائید میں ہم نقل کر آئے ہیں اسی قول کی طرف امام رازی کا اشارہ ہے۔ اب اس پرلطف دعوی کی حقیقت ملاحظہ کیجئے۔

امام فخرالدین رازی کی تفسیر کبیر کا سن تصنیف تو ہمیں معلوم نہیں۔ یہ ضرور معلوم ہے کہ امام صاحب کا انتقال ۶۰۶ھ میں ہوا ہے۔ اور قاضی بیضاوی کا سن ولادت اور تفسیر بیضاوی کا سن تصنیف بھی ہمیں نہیں معلوم۔ لیکن یہ معلوم

ہے کہ ان کی وفات ۶۸۲ھ یا ۶۸۵ھ میں ہوئی۔ تاریخ المفسرین (قلمی نسخہ۔ از ابن سعید ص ۱۰۳) میں تو یقین کے ساتھ ۶۸۵ھ ہی لکھا ہے۔ لیکن چلئے ہم ۶۸۲ھ مانے لیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہم قاضی بیضاوی کی عمر اسّی سال کی بھی فرض کرلیں تو امام رازی کے وقتِ انتقال پر وہ چار سال کے ہوں گے۔ امام رازی نے تفسیر کبیر غالباً سالِ وفات میں تو لکھی نہ ہوگی۔ اگر قیاساً یہ مان لیں کہ مرنے سے پانچ سال پہلے لکھی تو گویا تفسیر کبیر کی تصنیف کے وقت قاضی بیضاوی کی پیدائش میں ایک سال باقی تھا۔ اس صورت میں امام رازی کے قال القاضی سے بقول شاہ صاحب قاضی بیضاوی مراد ہونا لطیفہ نہیں تو اور کیا ہے؟ غایت مافی الباب یہ کہا جاسکتا ہے کہ امام رازی نے اپنی تفسیر کبیر عین مرنے کے دن تصنیف کی، تب بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا؛ کیونکہ اس وقت قاضی بیضاوی پانچ سال کے تھے اور ظاہر ہے کہ انھوں نے تفسیر بیضاوی ماں کا دودھ چھوڑتے ہی تو لکھ نہیں دی تھی۔ اگر قاضی بیضاوی کا سن وفات ۶۸۵ھ مان لیا جائے تو امام رازی کی موت کے وقت وہ محض ایک ہی برس کے تھے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں ناظرین غور فرمائیں کہ لطیفہ کتنا بے مثال بن جاتا ہے۔

اگر ناظرین میں سے کسی صاحب کو براہِ راست تحقیق کا شوق ہو تو انھیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ذکراُن امام رازی کا ہے جن کا نام فخرالدین تھا اور جن کی تفسیر کبیر کے حاشیہ پر مصر کے مطبعۃ الحسینیہ نے ۱۳۲۷ھ میں تفسیر علامہ ابوالسعود عمادی چھاپی ہے۔

اور ذکراُن قاضی بیضاوی کا ہے جن کا نام عبداللہ ابن عمر لقب ناصرالدین، کنیت ابوسعید اور ابوالخیر ہے۔ جو شیراز کے ایک گاؤں بیضاء میں پیدا ہوئے اور شیراز کے قاضی بنے۔

یہ تفصیل اس لیے لکھ دی کہ کہیں ناظرین کو بھی شاہ صاحب جیسا دھوکہ نہ ہوجائے اور وہ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ ہر قاضی ''قاضی بیضاوی'' اور ہر رازی ''فخرالدین رازی'' ہوتا ہے۔

یہاں ایک مصرعہ یاد آیا ع

تن ہمہ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

اس کا اُردو ترجمہ بھی لگے ہاتھوں شعر ہی میں سن لیجیے:

تمام جسم پہ زخموں کی لالہ کاری ہے ❖ کوئی بتائے کہ رکھیں کہاں کہاں مرہم؟

تنبیہ

شاہ صاحب اور دلاوری صاحب یقیناً ہم سے خفا ہوں گے کہ ہم نے ضرورت سے زیادہ دلائل ان کی تردید میں جمع کردیئے؛ لیکن ہم انھیں باللہ العظیم یقین دلاتے ہیں کہ براہِ راست ان کی تردید و تجہیل سے ہمیں قطعاً دلچسپی

نہیں ۔ وہ کچھ بھی کہتے اور کرتے ہمیں کوئی سروکار نہ ہوتا۔لیکن کیا کریں کہ سوال ذاتیات کا نہیں مکتبۂ فکر اور حلقۂ خیال کا ہے ۔شاہ صاحب اور دلاوری صاحب کا تعصب یا جہل محض اُن کا اپنا نہیں ؛ بلکہ تمام اُن اکابرین تک اس کی آلودگی پہنچتی ہے جو رسالہ دارالعلوم کے نگراں اور ذمہ دار ہیں ۔فخر الاماثل مولانا محمد طیّب صاحب مدظلہٗ کو رسالہ کے نگراں کی حیثیت سے ایڈیٹر اور مضمون نگار صاحبان پر نگاہِ احتساب رکھنی چاہئے تھی، ان کی نگرانی میں شائع ہونے والے ماہنامہ ''دارالعلوم'' میں اگر حد سے زیادہ غیر ذمہ دارانہ تحریریں شائع ہوجائیں تو اس کی ذمہ داری سے وہ نہ عندالناس بری ہوسکتے ہیں نہ عنداللہ ۔

ایک نکتہ

ایک نظر اِس آیت پر ڈالئے :

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ. (بقرہ، رکوع ۴)

''پس بہکادیا آدم وحوا کو شیطان نے اس درخت کے بارے میں، پس نکال دیا انھیں اُس حالت سے جس میں وہ دونوں تھے اور کہا ہم نے نیچے اُترو! بعض تم میں سے بعض کا دشمن ہوگا۔''

دیکھئے! اس آیت سے پہلے آدم وحوا کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ نے تثنیہ کے صیغے استعمال فرمائے ہیں ۔مثلاً وَكُلَا. شِئْتُمَا. تَقْرَبَا. فَتَكُوْنَا. مذکورہ آیات میں بھی فَاَزَلَّهُمَا اور اَخْرَجَهُمَا اور كَانَا تثنیہ ہی ہیں ۔لیکن متصل بعد اِهْبِطُوْا جمع کا صیغہ آیا ہے اور بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ کے الفاظ بھی جمع ہی پر دال ہیں ؛ کیونکہ اگر یہ بات صرف آدم وحوا ہی کے بارے میں اللہ کو کہنی تھی تو بعض کا لفظ مناسب نہ تھا۔بلکہ یوں کہنا تھا کہ ''تم دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہوگے'' ظاہر ہے کہ اللہ جل شانہٗ کا یہ مقصد نہ تھا اور تاریخ سے بھی صراحۃً ظاہر ہے کہ آدم وحوا ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہوئے ؛ بلکہ ان کی اولاد سے یہ سلسلہ شروع ہوا۔اب غور فرمایا جائے کہ بداہۃً آدم وحوا سے خطاب کرنے اور برابر تثنیہ کے صیغے استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ ایک دم جمع کے صیغے سے کیوں خطاب فرمایا گیا؟

اس کے سوا کوئی جواب آپ کو نہ ملے گا کہ خطاب آدم وحوا سے ہونے کے باوجود روئے سخن ذُریّت آدم اور نوعِ بشر کی طرف پھر گیا ہے ۔گویا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ سے اللہ جل شانہٗ نے جملہ نوعِ بشر کی ایک جبلّی اور پیدائشی کمزوری اور خرابی کی صراحت فرمائی ۔اور تاریخ شاہد ہے کہ آدم وحوا کے بیٹوں ہی سے اس خرابی کا مظاہرہ شروع ہوگیا۔قابیل نے ہابیل کو قتل کرڈالا۔

اب میں انصاف پسندوں سے پوچھتا ہوں کہ جب اللہ جل شانہٗ کھلے طور پر آدم وحوا سے مراد نوعِ بشر اور

ذرّیتِ آدم لے سکتے ہیں تو کیا مشکل ہے کہ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃ سے وہ مٹی مراد لیں جس کے لیے قرآن میں صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ کے الفاظ آتے ہیں۔ یعنی خمیر اُٹھے ہوئے گارے کی ٹھنٹھناتی ہوئی مٹی" آدم وحوا" سے مراد نوعِ بشر ہوسکتی ہے تو "نفس واحدہ" سے مراد "نوعِ بشر کا خمیر" کیوں نہیں ہوسکتا۔

بھول نہ جائیے گا نہیں کہ یہ باتیں میں اس لیے نہیں کر رہا کہ آپ پسلی سے پیدائش کو غلط مان لیں۔ آپ شوق سے اسے صحیح مانیں۔ اور ضروری مانیں؛ لیکن میں تو اس قدر گزارش کر رہا ہوں کہ جو لوگ اسے نہیں مانتے انھیں زندیق و ملحد اور گمراہ و فاسق نہ کہیں الحاد کے معنیٰ شاید آپ کو پوری طرح معلوم نہیں۔ اللہ کا رسول تو کہتا ہے کہ: مَنْ قَالَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ (جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا، پس یقیناً جنت میں جائے گا) حتیٰ کہ وَاِنْ زَنَا وَاِنْ سَرِقَ (اگر زنا کرے یا چوری کرے) کے بعد بھی جنت اس پر حرام نہیں ہوتی۔ مگر آپ ہیں کہ اللہ کے بندوں کو ذرا ذرا سی بات پر ملحد اور زندیق بنائے چلے جارہے ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

آغاز میں جو ہم نے دلاوری صاحب کے فرمودات کی شق 1 بیان کی ہے اب اسکا مختصر جواب سنئے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ: "وارثانِ علومِ نبوت جو کچھ فرماتے ہیں بے کم و کاست درست ہے۔"

کیا ہمارے پیش کردہ مذکورہ بالا شواہد کے بعد بھی آپ یہی کہیں گے؟ کیا "بے کم و کاست" کا لفظ ایسے ہی محل پر استعمال ہوتا ہے؟

پھر یہ بھی آپ بتائیے کہ "علومِ نبوت" کیا دیوبند یا لاہور یا کسی بھی شہر و دیار کے رہنے والوں کا آبائی ورثہ ہیں، جن پر صرف اُنھیں کا حق ہے؟ "علومِ نبوت" کیا کوئی ایسی جائداد ہیں جن پر کسی مخصوص خاندان یا گروہ یا قبیلے کے سوا دوسروں کا کوئی حق نہ ہو؟۔ آپ زبان سے تو ظاہر ہے اس کی تائید نہ کرسکیں گے؛ لیکن ذہنیت آپ کی یہ ہوگئی ہے کہ وارثِ علمِ نبی اور عالم و علامہ خواہ ہر زید عمر بکر کو مان لیا جائے۔ مگر مودودی صاحب اور ان کے رفقاء کو مستثنیٰ رکھا جائے۔ حالانکہ خدا اگر آپ کو توفیق دیتا اور آپ ایمانداری سے علم جانچنے کے اُس پیمانے سے کام لیتے جو واقعی پیمانہ ہے تو آپ کو نظر آتا کہ جن حضرات کو آپ "وارثینِ علمِ نبوت" سمجھے ہوئے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ ان کا یہ منصب ان کی خاندانی شہرت اور آپ کی خوش عقیدگی کے سوا کوئی شہادت نہیں رکھتا۔ انھوں نے عملاً اپنے کو "وارثِ علمِ نبوت" ثابت کرنے کے عوض محض "گدی نشین" اور "سجادہ" ثابت کیا ہے۔ اس کے برخلاف مولانا مودودی نے اپنی مسلسل مفصل اور مدلّل تحریروں سے عملاً یہ ثابت کیا ہے کہ وہ محض رسمی اور روایتی مولوی نہیں؛ بلکہ واقعتہً "علمِ دین" ان کا اوڑھنا بچھونا۔ ان کا سرمایہ زندگی، ان کا محبوب اور دلداران کا مرکزِ فکر و عمل، ان کا سب کچھ ہے۔ اور فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ کی تعمیل میں انھوں نے اپنی تمام تر خداداد صلاحیتوں کو اور فکری قوتوں کو دینِ حنیف کے قدموں پر ڈال دیا ہے۔ المجتھدُ یخطی و یصیب (اجتہاد کرنے والا غلطی بھی کرتا

ہے اور صحیح قدم بھی اُٹھاتا ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ لاکھوں سطور پر مشتمل ان کی پچاسوں تصانیف میں کتنی کچھ خطائیں ہیں اور کہاں کہاں ان کے قلم نے ٹھوکر کھائی ہے؛ لیکن اگر روزِ حساب اللہ جل شانہٗ کے فیصلے میرے اور آپ کے "حسنِ خیال" اور "حُسنِ عقیدت" کی بنیاد پر نہیں، بلکہ نامۂ اعمال کی بنیاد پر ہونے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ مودودی صاحب کی دینی تحریروں کا سارا انبار ان کی بعض اجتہادی غلطیوں اور فکری لغزشوں کی وجہ سے نذرِ آتش نہیں کر دیا جائے گا؛ بلکہ ان کے پورے حسن وقبح کو انصاف کی میزان میں تولا جائے گا اور آپ کے تمام "وارثانِ علومِ نبوت" کے کارنامے بھی یہاں پر کھے جائیں گے۔ اور خدا مجھ سے یا آپ سے مشورہ نہیں لے گا کہ مودودی کو ملحد ٹھیراؤں یا مومن۔ دوزخ بھیجوں یا جنت۔

اللہ کے بندو! کچھ تو خدا کا خوف کھاؤ۔ کچھ تو حسابِ آخرت سے ڈرو۔ تم مودودی صاحب کے متعلق لکھتے ہو کہ انھوں نے "عاقبت کی جواب دہی سے بے خوف ہو کر ورثۃ الانبیاء کی تخفیف وتضحیک کو اپنا شعار بنالیا ہے۔" "دارالعلوم نومبر ۱۹۵۵ء کالم ا سطر ۱۰ و ۱۱) اور خود تمہارا یہ حال ہے کہ تمہیں شمہ برابر خوفِ خدا نہیں۔ تمہارے قلوب اور اذہان غالی عقیدتوں اور اندھی نیازمندیوں کی چوکھٹ پر سجدے میں پڑے ہیں۔ تم لات ومنات سے بھی بڑے بتوں کو پوجتے ہو؛ بلکہ لات ومنات کے پجاری تم سے زیادہ اخلاقی جرأت کے مالک تھے کہ جو کچھ عقیدہ رکھتے تھے چھپاتے نہیں تھے۔ اور تم اپنی بت پرستی کو اسلام کی آڑ میں چھپاتے ہو۔ تم اگر ایمانداری سے محسوس کر و تو اس سے انکار نہ کرسکو گے کہ مولانا مودودی کا وجود ٹھیک اس طرح تمہارے دل ودماغ پر چھا گیا ہے جس طرح موجودہ انسان کے دل ودماغ پر ایٹم بم کا وجود! تم ریگستان کے بگلے کی طرح لاکھ ریت میں مُنہ چھپاؤ؛ لیکن حقائق اپنی جگہ حقائق ہی رہیں گے اور مولانا مودودی نے دین کے جس پودے میں اپنے دل وجگر کا خون ڈالا ہے وہ ان شاءاللہ ثم ان شاءاللہ پھولتا پھلتا ہی رہے گا۔

اعتذار

وعدہ کے مطابق اب چاہیے تھا کہ "ظہورِ مہدی" کا مسئلہ چھیڑا جائے۔ لیکن صفحے اتنے گھر گئے کہ مسئلہ نہیں چھیڑا جاسکتا۔ بات چونکہ مفصل مع دلائل کرنی ہے اس لیے اگر زندگی وعافیت رہی تو ان شاءاللہ اگلی اشاعت میں اس پر کلام کریں گے۔

شکرِ نعمت

چھ سالہ تجلّی کے ناظرین جانتے ہیں کہ خودستائی کبھی ہمارا شیوہ نہیں رہا۔ علم دوست حضرات کی طرف سے وقتاً فوقتاً تعریف وستائش اور دادوتحسین کے جو خطوط ملک کے گوشے گوشے سے آتے رہے، ان کا ایک لفظ بھی کبھی ہم نے

نہیں چھاپا۔ تجلّی نے سنجیدہ علمی حلقے میں اپنا جو منفرد مقام بنایا اس کا تذکرہ بھی ہم نے نہیں کیا۔ آج ہم بطورِ فخر نہیں؛ بلکہ بطورِ تحدیثِ نعمت اتنا کہیں گے کہ اپریل ۵۶ء کا شمارہ اللہ کے فضل وکرم سے ہندو پاک دونوں میں بہت مقبول ہوا اور اس کی اشاعت اپنی معمولی اشاعت سے تقریباً ڈھائی گنا زیادہ ہوئی۔ زیادتی اشاعت بجائے خود کوئی خوبی نہیں ہے؛ لیکن جائے شکر یہ ہے کہ عاجز کی تنقید کو اہلِ علم اور عوام وخواص نے غیر معمولی حد تک پسند کیا اور بہت سے وہ لوگ جو مدت سے ریب وتذبذب کا شکار تھے۔ ایک اچھے فیصلے کی طرف رجوع ہو گئے۔ علاوہ ازیں سخت سے خت معاند کو بھی تادمِ تحریر ہماری تنقید میں کوئی ایسا گوشہ نہ مل سکا جس پر گرفت واعتراض کی دیوار اُٹھائی جاسکے۔ کتابت کی بہت سی غلطیاں بیشک رہ گئیں اور ان میں بعض ایسی ہیں کہ عیب جوز بانیں انھیں عاجز کی جہالت کے ثبوت میں پیش کرسکتی ہیں؛ لیکن شکر ہے کہ کوئی ایسی غلطی نہ رہی جس سے مطلب خبط ہوتا ہو۔ اگر مطلب خبط نہ ہو اور بیان کردہ حقائق لوگوں کے دلوں میں اُتر جائیں تو مجھے اپنی جہالت کے اثبات بلکہ اعتراف میں بھی کوئی عار نہیں۔ میری جہالت کا حاصل زیادہ سے زیادہ یہی ہوسکتا ہے کہ آپ میری تعریف نہ کریں، مجھے لائق عزت نہ سمجھیں۔ میرے سامنے ادب سے سر جھکا کے نہ بیٹھیں۔ مگر اُن ناقابل تردید دلائل وشواہد کا آپ کیا کریں گے جنھیں اللہ قادر وتوانا نے میرے قلم سے نکلوا دیا ہے۔ اللہ جب چاہتا ہے تو ایک تنکے سے طوفان کا رُخ مُڑوا دیتا ہے۔

آخری عاجزانہ گزارش میں ناظرین سے یہ کروں گا کہ اگر آپ میری تنقید کو مضبوط اور کامیاب تصور فرماتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس پر خوشی سے پھولے نہ سمائیں یہ کوئی الیکشن یا مناظرہ نہیں ہے کہ جیتنے والے بغلیں بجائیں اور فریق ثانی کی شکست پر خوش ہوں۔ یہ اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنے والوں کی محض ایک مفاہمت و مشاورت ہے جو جیت ہار کے لیے نہیں؛ بلکہ منزل کی سیدھی راہ متعین کرنے اور گمراہی سے بچنے کے لیے ہے۔ علمائے کرام کو اگر بیجا یا بجا طور پر اپنے ہم سفروں اور نیازمندوں کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں ہوگئی ہیں اور مجھ جیسا ناکارہ انھیں دُور کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو اس میں جیت ہار اور عزت وذلت کا کوئی سوال نہیں۔ علماء کا جو وقار ومرتبہ ایمان والوں کے دلوں میں ہے اور رہنا چاہئے، اسے اپنی جگہ باقی رکھئے اور اللہ کے آگے باچشم نم دعا کیجئے کہ:

اے اللہ! تو اپنی قدرتِ کاملہ سے علماء کے قلوب میں یہ بات ڈال دے کہ وہ اُمت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو مرتب کرنے کی طرف متوجہ ہوں۔ ان کے ذہنوں پر یہ حقیقت کھول دے کہ خرابیوں اور بداعتقادیوں کی اصلاح اعتراض وطنز اور تکفیر وتفسیق اور طعنہ ودشنام سے کبھی نہیں ہوتی؛ بلکہ حسنِ توجّہ اور نرمی اور شفقت ومحبّت سے ہوتی ہے۔ نفرت اور عداوت دودھاری تلواریں ہیں کہ جس شئے پر گریں گی اسے کاٹ دیں گی۔ اور جو چیز ان پر گرے گی وہ بھی کٹ جائے گی۔

اے اللہ! علماء کو خود پسندی اور "غرورِ عجز" اور نخوتِ علم سے بچا اور یہ سمجھنے کی توفیق دے کہ اُن کی طرح دوسرے مسلمان بھی آخرت کی فلاح کے متمنّی اور ترقیِ اسلام کے دلدادہ ہیں۔ اُن کی طرح دوسرے ایمان والے بھی اللہ اور رسول کے دشمن نہیں۔ ان کی طرح دوسرے کلمہ گو بھی عقل وعلم اور بصارت وبصیرت رکھ سکتے ہیں!

اس کے بعد میں جماعتِ اسلامی والوں سے بھی کہوں گا کہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ علماءِ دیوبند آپ کی مخالفت میں سوفیصدی غلطی پر ہیں، ان کے تمام اعتراضات بے بنیاد ہیں اور وہ بدنیتی سے سب کچھ کررہے ہیں، نہیں۔ بعض شیشہ گرانِ دین کے بارے میں تو میں یقین کے ساتھ کہوں گا کہ اُن کی نیتوں میں فتور ہے؛ لیکن جہاں تک استاذ المحترم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی مدظلہ العالی کا تعلق ہے خوب سمجھ لیجئے کہ مخدوم محترم جو کچھ کررہے ہیں وہ پورے اخلاص کے ساتھ یہ یقین رکھتے ہوئے کررہے ہیں کہ یہ اُن کا دینی فرض ہے۔ انھیں دنیاسازوں نے نت نئے طریقوں سے جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کے ضال ومضل ہونے کا یقین دلادیا ہے اور اگرچہ اس یقین دہانی میں کافی تحریف ودغا سے کام لیا گیا ہے؛ لیکن یہ بھی اغلب ہے کہ جماعت کے لٹریچر میں کچھ چیزیں واقعۃً قابل رَد اور قابل حذف اور لائق ترمیم وتنسیخ ہوں۔ اگر مصالحت ومفاہمت کا کوئی مبارک وقت آئے تو جماعتِ اسلامی والوں کو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ وہ سرتاپا محفوظ عن الخطاء اور برحق ہیں۔ نیز اپنی غلطیوں کو ماننے اور قابل تبدیلی عقائد وبیانات کو بدلنے میں انھیں اُس لچک کا ثبوت دینا چاہئے جو اسلام کی؛ بلکہ اسلام ہی کی بے مثال خصوصیات میں سے ہے۔

فخر الاماثل حضرت مولانا قاری محمد طیّب صاحب مدظلہٗ کے بارے میں ہم یقین رکھتے ہیں کہ وہ ذاتی فکر ونظر کی حد تک ہرگز ہرگز اُس رائے پر نہیں ہیں جو اُن کی چند تازہ تحریروں اور بیانوں سے ظاہر ہورہی ہے۔ ان کے تازہ افکار محض نتیجہ ہیں اِس حُسنِ خیال کا کہ جب مولانا مدنی جیسا بلند مرتبہ بزرگ ایک جماعت کو گمراہ سمجھ رہا ہے تو ضرور وہ گمراہ ہوگی! رہے دلاوری صاحب اور راز ہر شاہ صاحب اور دیگر ضمنی حضرات تو ان کی کوئی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ ناتواں تنکے ہیں جو ہوا کے رُخ پر اُڑنے اور طوفان کے رُخ پر بہنے کے لیے مجبور ومامور ہیں۔

فرمایا سرورِ کونین صادق ومصدوق شافع محشر محبوبِ سبحانی رسولِ اکرم ﷺ فداہ امی وابی وعیالی ونفسی نے:

دبّ إليكم داء الأمم الحسد والبغضاء البغضاء هي الحالقة لاأقول محلق الشعر ولكن محلق الدين.

"تم میں پچھلی اُمتوں کی بیماری دوڑ گئی ہے یعنی حسد اور بغض۔ بغض مونڈنے والا ہے۔ میں نہیں کہتا کہ بالوں کو مونڈنے والا ہے؛ بلکہ دین کو مونڈنے والا ہے۔"

(خاک پائے علماء عامر عثمانی ۸/اپریل ۱۹۵۶ء)

(تجلی مئی ۱۹۵۶ء)

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر اَدا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ گزشتہ مہینہ کی تنقید میں بھی اور تازہ بحث میں بھی ہم بغیر حوالے اور بغیر دلیل کے کلام نہیں کر رہے اور اپنے بزرگوں کے لیے ادب و احترام کے تمام تقاضے ملحوظ رکھ رہے ہیں۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ مولانا مودودی کی دشمنی میں اُن کے مخالفین اندھے اور بہرے بن کر مسلسل و پیہم اپنی ہی ہانکے جاتے ہیں اور ذرا نہیں سنتے کہ اُن کے اعتراضات و الزامات کے ابطال میں کوئی کیا کہہ رہا ہے۔ اُن کا حال ہٹ دھرمی اور خود پرستی میں ان اہلِ بدعت اور اہلِ تشیع سے بھی بدتر ہے جو علمائے دیوبند کو کافر بناتے اور اصحابِ رسول کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ وہ فی الحقیقت اُسی مغلوب الغضب تنگ نظر مستِ پندار اور خودنگر گروہ کی نسل سے ہیں جس نے شاہ ولی اللہ کو کافر بنایا تھا جس نے ابن تیمیہ کو جہنمی قرار دیا تھا جس نے مجدد الف ثانی کو جیل بھجوایا تھا اور جس نے ابن قیم کی زندیقیت کا ڈھنڈورا پیٹا تھا۔ جس نے ہمیشہ ہر اُس شخص کو بدنام و رُسوا کرنا چاہا جو بگڑے ہوئے نظامِ ملّت اور دین کی تجدید و احیاء کے عزائم لے کر اُٹھا۔

ذرا تازہ رسالہ دارالعلوم بابت ماہ اپریل ۵۶ء دیکھئے۔ اس میں ''مقام جامع صحیح بخاری'' کے عنوان سے مولوی عبدالرؤف رحمانی کا مضمون شائع ہوا ہے۔ عنوان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحیح بخاری کا مقام و مرتبہ بیان کرنا مقصود ہے۔ لیکن مضمون پڑھئے تو شانِ نزول یہ معلوم ہوگی کہ وہی ''تردید مودودی'' اور ''تذلیل مودودی'' کا سودا سر پر سوار ہے۔ اور شرارت و دناءت کا یہ حال ہے کہ مولانا مودودی کو منکر حدیث دکھلانے کے لیے ابتداءً منکرین حدیث کا تذکرہ چھیڑا گیا ہے اور ان کے لٹریچر سے اقتباسات دیئے گئے ہیں۔ اور اس کے بعد آمدم برسرِ مطلب۔

> ''مولانا مودودی صاحب کے نزدیک بھی صحاح ستہ بلکہ جامع صحیح بخاری کی صحت بھی مستند و قابل اعتبار نہیں۔'' (ص ۱۶، کالم ۲)

اس خود ساختہ اور طبع زاد الزام کی بنیاد مولوی صاحب نے مولانا مودودی کی ایک تقریر کے بعض الفاظ پر رکھی ہے جسے اخبار ''الاعتصام'' سے نقل کیا گیا ہے۔

ناظرین انصاف فرمائیں کہ سیکڑوں میل دُور کی گئی ایک تقریر کو کسی اخبار سے لے کر اس کے بعض جملوں پر مقرر کے بارے میں فیصلہ کن اور دوٹوک فتوے دینا کیا کسی دیانت دار مولوی اور شریف عالم کا کام ہوسکتا ہے۔

تقریر کی لفظ بہ لفظ صحیح نقل تو اُس صورت میں بھی مشکوک ہوتی ہے جب مقرر ہی کا کوئی متعین کردہ آدمی اسے نوٹ کرتا جائے۔ یہاں حال یہ ہے کہ ہر جانب مودودی کے مخالفین و اعدا موجود اور جس کا جو جی چاہے، جس طرح چاہے لکھ کے لے جائے۔ اور کہہ دے کہ مودودی نے یہ کہا اور یہ کہا۔ اخبار ''الاعتصام'' کے بارے میں ہماری معلومات ٹھوس نہیں ہیں؛ لیکن اتنا ہم ضرور جانتے ہیں کہ اس میں مودودی صاحب کے خلاف مضامین شائع ہوئے ہیں۔ اگر یہ بات غلط بھی ہو تو محض ''الاعتصام'' کے لکھ دینے سے یہ بات سوائے جہلا اور اشرار کے کسی کے نزدیک یقینی نہیں ہو جاتی کہ اس میں چھپی ہوئی تقریر جوں کی توں صحیح ہے۔ اس تقریر کے کسی جملہ پر مشق تعصب کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ تقریر کے محلِ نظر الفاظ مقرّر کو لکھ کر بھیجے جاتے اور پوچھا جاتا کہ یہ کیا واقعی آپ نے کہے ہیں؟ اور کیا اِن کا مطلب وہی لیا ہے جو شائع شدہ تقریر سے بظاہر مترشح ہوتا ہے؟

لیکن مولوی رحمانی صاحب ایسا کیوں کرتے۔ انھوں نے تو یہ بھی نہیں کیا کہ مودودی صاحب کی اس تقریر پر جو بعض بحثیں پاکستانی اخبارات میں چلی ہیں انھیں کو دیکھ لیں۔ وہ کیوں کریں۔ انھوں نے تو اشہدُ ان لاالٰہ الااللہ کے بعد و اشہدُ انّ مودودی کافرٌ کو کلمۂ شہادت بنالیا ہے۔ انھوں نے تو یہ طے کرلیا ہے کہ اپنی تمام بداعمالیوں اور دنیاسازیوں کا کفّارہ مودودی کو کافر بنا کر دیں گے۔ اپنی شکستوں اور ذلّتوں کا انتقام مودودی کو گالیاں دے کر لیں گے۔ ھیھات الف الف مرّۃٍ ھیھات!

بہت بڑا دجل ان مولوی صاحب کا یہ ہے کہ انھوں نے تقریر میں وارد شدہ لفظ ''صحیح'' کو پوری بددیانتی کے ساتھ اُن معنوں میں لیا ہے جو ''غلط'' کے بالمقابل ہوتے ہیں۔ اسے ''دجل'' میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں یہ بات کسی طرح باور نہیں کرسکتا کہ مولوی رحمانی مولوی ہو کر بھی یہ ابتدائی بات نہ جانتے ہوں گے کہ حدیث کے موضوع میں ''صحیح'' غلط کے مقابلہ میں نہیں بولا جاتا۔ بلکہ اس کے ایک خاص اصطلاحی معنیٰ ہوتے ہیں ''صحیح بخاری'' جب بولتے ہیں تو یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ایک ''غلط بخاری'' بھی ہے۔ ''صحاحِ ستہ'' جب کہتے ہیں تو یہ منشاء نہیں ہوتا کہ چھ کتابوں کے علاوہ حدیث کی سب کتابیں ''غلط'' ہیں۔

جو خطابات و اکرامات اس چھ صفحے کے مضمون میں مودودی صاحب کو دیئے گئے ہیں وہ پوری طرح ثابت کرتے ہیں کہ مولوی رحمانی جیسے لوگ شریف و متین ماحول میں نہیں پلے اور تانگے والوں کا اندازِ دشنام طرازی ہی ان کی نگہ میں سنجیدہ و شریفانہ ہے۔ ابھی یہ مضمون محض قسطِ اوّل ہے۔ ''باقی باقی'' ہے۔ پورا ہو جائے تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں کم سے کم ''ایک سو ایک'' مولویانہ گالیاں ناظرین کو ملیں گی۔ نمونہ از خروارے ملاحظہ ہو۔

(۱) فتین اعظم ص ۱۵ کالم ۱ سطر ۲۰ (۲) متکبر (۳) بخاری کی تخفیف کرنے والا (۴) غیر سنجیدہ (۵) مشکک و متشکک (۶) ہرزہ سرا۔ وغیرہ۔

مولوی رحمانی کی اپنی سطحیت اور جمہور و تعطل کا یہ عالم ہے کہ "حیاتِ انور" سے بہ تمام حسنِ عقیدت یہ عبارت نقل فرماتے ہیں:

"کہ اگر میں اس بات پر حلف اُٹھاؤں کہ یہ شخص (مولانا انور شاہ) علم میں ابوحنیفہؒ سے بڑھ کر ہے تو میرا حلف قطعاً جھوٹا نہ ہوگا۔"

غور کیجئے۔ اپنے مرغوب علماء کے باب میں تو مولوی رحمانی جیسے لوگوں کا یہ عالم ہے کہ اُن کی تعریف میں کوئی کیسا ہی مبالغہ آمیز جذباتی اور درباری قصیدہ گائے وہ سبحان اللہ اور "سچ فرمایا" کے سوا کچھ نہیں کہیں گے۔ وہ اتنا بھی نہیں سوچیں گے کہ علماء کا مقام و مرتبہ متعین کرنے میں قسمیں کھانے اور حلف اُٹھانے والا شخص "سنجیدہ" کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ بھی پروا نہیں کریں گے کہ جو شخص حلف اُٹھا کر انور شاہ صاحبؒ کو امام ابوحنیفہؒ سے اعلم کہہ رہا ہے وہ شافعی ہے یا اہلِ حدیث۔ یہ بھی تحقیق نہیں کریں گے کہ یہ کہنے والا آیا اتنا زبردست عالم ہے بھی کہ انور شاہ صاحب اور امام ابوحنیفہؒ کے پورے علم و خیر کا نقد اور تجزیہ اور موازنہ کر سکا ہو۔ وہ تو بڑے اطمینان سے آمنّا و صدقنا کہیں گے۔

حیرت ہوتی ہے کہ ایک مصنف تعریف میں کسی مصری عالم کا وہ قول نقل کرتا ہے جو ٹھیک شاہانِ سلف کے درباری مقتیوں کے اقوال سے مشابہ ہے اور مودودی کی تحریروں میں خوردبینی و نکتہ کاری کی تمام سائنس ختم کر دینے والے بزرگ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ اس قول سے کتنے بڑے شخص، کتنے عظیم عالم دین، کیسے مشہور امام۔ کیسے محیطِ علم و تفقہ۔ کس درجہ مقبول امام۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تقلیل و تخفیف، تحقیر اور توہین ہوتی ہے۔ اگر ایسی ہی کوئی بات؛ بلکہ اس سے بہت ہلکی مودودی حضرات کی طرف سے کہہ دی جاتی تو ہمارے علمائے دین تکفیر و تفسیق کے قطب مینار اور امریکہ کی ایک سو ایک منزل والی عمارت بنا ڈالتے۔ لیکن یہاں بجائے اعتراض کے پوری ڈھٹائی کے ساتھ یہ گایا جا رہا ہے۔ ع

من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو

اور قولِ مذکور کو بطورِ دلیل و شہادت پیش کیا جا رہا ہے۔

خدا بہتر جانتا ہے کہ علامہ انور شاہ صاحبؒ کی عظمتِ علمی کا نقش ہمارے دل پر خود کندہ ہے۔ لیکن علماء کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں بڑھانے اور گرانے کا کھیل ہمارے نزدیک لغویت اور شرارت کے سوا کچھ نہیں۔ ضرورت کے وقت صرف اتنا تقابل درست ہے کہ مختلف علماء کے دلائل نقل کر کے آدمی کسی کی دلیل پسند کر لے اور کسی کو چھوڑ دے۔ اگر اس مصری عالم کو امامِ ابوحنیفہ کی تخفیف کرتے ہوئے یہ خیال نہ آیا کہ میں فرطِ جذبات میں کیا کر رہا ہوں تو کم سے کم مولوی رحمانی کو تو حیا آنی چاہئے تھی کہ وہ کیسا قول نقل کر رہے ہیں؛ مگر توبہ، مودودی کا تصور آجانے کے بعد ہمارے مولویوں کا دل و دماغ قابو ہی میں کب رہتا ہے۔ وہ تو ایک ایسا دیوانہ ساز تصور ہے کہ موت کے سوا اس سے نجات ممکن نہیں۔

ناظرین! آپ کہیں گے کہ عامر کو کیا ہو گیا جو تھرڈ کلاس جذباتی باتیں کرنے لگا ہے۔ عاجز عرض کرے گا کہ آخر آپ ہی بتائیے جب مسئلہ ہی کوئی قابل بحث نہ ہو اور مولوی لوگ ایکشنی سورماؤں کا انداز اختیار کر لیں تو بحث کیا کی جائے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ جب بھی دارالعلوم والوں نے کوئی واقعی مسئلہ چھیڑا تو خادم بشرطِ زندگی و عافیت اُسی علمی استدلال کے ساتھ جس کا ملاحظ آپ گزشتہ تنقید اور موجودہ ''پیدائش حوا'' کی بحث میں فرما چکے ہیں زبان کھولے گا۔ مولوی مانیں یا نہ مانیں خادم کو عوام پر یہ کھول دینا ہے کہ سارے دیوبندی مولوی تعقب کا چشمہ نہیں لگاتے اور علم کا چشمہ خاندانِ عثمانی میں بالکل سوکھ نہیں گیا۔

اتفاق

اتفاق دیکھئے۔ خاکسار مقدمہ ابن خلدون دیکھ رہا تھا کہ منصبِ امامت کی بحث میں ابن خلدون کی یہ عبارت سامنے آئی۔

مَذْهب الصّحابي ليس بِحُجّة. ''صحابی کا مذہب حُجت نہیں ہے''

(مقدمہ ابن خلدون۔ الفصل السادس والعشرون۔ فی اختلاف الامت فی حکم ہذا لمنصب وشروطہ ص ۱۹۴)

یہ جانتے ہیں آپ کس صحابی کی طرف روئے سخن ہے؟ فارقِ بین الحق والباطل امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف! آپؓ نے فرمایا تھا:

لوكان سالم مولىٰ حذيفة حيًّا لولّيتُهٗ.

''اگر سالم مولیٰ حذیفہ زندہ ہوتے تو میں انھیں ولی بناتا''۔

یہ بحث یہاں نہیں کہ فرمودۂ عمر کا کیا مطلب تھا اور ابن خلدون کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہیں۔ بتانا صرف یہ ہے کہ صحابہ کے ''معیارِ حق'' ہونے کی بحث میں ابن خلدون کے مذکورہ بالا الفاظ کو بھی شامل فرمالیجئے۔ ابن خلدون کون ہیں؟ شاید فی الحال انھیں مولوی صاحبان تبرکاً کافر کہہ دیں۔ لیکن آج سے پہلے تک بڑے بڑے علماء و ناقدین نے ابن خلدون کو علم و تبحر کا بڑا اونچا مقام دیا ہے۔ اور باوجود زبردست تاریخ شناس اور علاّمہ ہونے کے ان کی دین شناسی کا یہ عالم تھا کہ ان کے فرنچ اور انگریز ناقدوں نے انھیں بقراط و ارسطو سے افضل و اعلم اور زبردست تاریخ شناس و ماہرِ اجتماعیات ماننے کے باوجود یہ رونا رویا ہے کہ اُن پر اسلامیت کا غلبہ تھا اور اپنے فلسفہ و سائنس میں انھوں نے اسلامیت کو بہت زیادہ ملحوظ رکھا، کتنی صفائی سے یہ کہہ رہے ہیں کہ مذہبِ صحابی سرے سے حجت ہی نہیں ہے۔ فافهم و تدبّر!

(تجلی مئی ۱۹۶۶ء)

......❖......

مسلسل اتنی لمبی علمی و تحقیقی گفتگو کے بعد بلاشبہ آپ تھک گئے ہوں گے اور اس خالص عالمانہ و مدبرانہ بحث کے دوران یہ بھی یاد نہ رہا ہوگا کہ ہم اصل کتاب ''دارالعلوم کی جامع و مختصر تاریخ'' کا تنقیدی جائزہ پڑھ رہے ہیں۔ درحقیقت یہ دلائل پیش کرنا ضروری تھے؛ کیونکہ اتنا زمانہ گزر گیا؛ لیکن آج بھی طلبہ مدارس اور غلو پسند عقیدت مندوں کے سامنے یہ دلائل نہ آنے کی وجہ سے مودودی کی مخالفت خالص غیر اصولی اور اکابر پرستی پر مبنی ہے؛ اس لیے ہم نے صفحات کے بڑھ جانے کی فکر کیے بغیر یہ تفصیل پیش کر دی ہے، بلاشبہ ابھی ظہورِ مہدی کی تفصیل باقی ہے جو جون ۱۹۵۶ء کے تجلی میں پیش کی گئی ہے، جس کا دل چاہے وہ تجلی کی ویب سائٹ پر اس کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ فی الحال اس کتاب کے لیے اتنی تفصیل کافی ہے بلاشبہ درج بالا تفصیل بھی حق کو تسلیم کرنے کے لیے کم نہیں ہے۔

اتنی لمبی علمی بحث پڑھنے کے بعد آپ کو جو ذہنی تھکن محسوس ہو رہی ہے، اس کو فرحت میں تبدیل کرنے کے لیے کیوں نہ اس وقت ہم مئی ۱۹۵۶ء کا ''مسجد سے مے خانے'' تک پیش کر دیں۔ جو اسی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ ملا ابن العرب مکی کے چلبلے الفاظ اور طنزیہ جملے پڑھیے، پھر اس کے بعد علماء دیوبند اور جماعتِ اسلامی کے اختلاف پر مولانا عامر عثمانی ؒ کی مزید تحقیقی گفتگو کے ساتھ مولانا مدنی کی کتاب ''ایمان و عمل'' کا جائزہ بھی ملاحظہ کیجیے گا۔

....

مسجد سے مے خانے تک

(از: مُلّا ابن العرب مکی)

تاریخ نوشت ۱۲/اپریل ۱۹۵۶ء:

بعض لوگوں کو خود اپنی جان سے خدا واسطے کا بیر ہوتا ہے اور ان میں سے ایک ہمارے ایڈیٹر تجلی مولانا عامرؔ عثمانی بھی ہیں لاکھ سمجھایا کہ قبلہ ''حق گوئی'' کے جراثیم سے دُور رہیے ''ضمیر و قلب'' کے جنون پر خاک ڈالیے اور سیدھے سادھے نیاز مندوں کی طرح زندگی گزاریئے؛ لیکن توبہ، انھوں نے ''علمائے کرام'' کی تصنیف پر تنقید لکھ ہی ماری، اور تنقید بھی ایسی کہ اس سے بہتر تھا خودکشی کر لیتے، یعنی اگر تنقید گول اور مختصر لکھتے، یا ہلکی قسم کی لکھتے تو فریق ثانی کو بھی کچھ کہہ سن کر اپنے دل کا بخار نکالنے کا موقع مل جاتا؛ مگر اتنی مفصل تنقید کے بعد فریق ثانی کو کچھ کہنے اور تاویل نکالنے کا موقع ہی نہ رہا تو اب غیظ و غضب بغض و انتقام اور جوش و خروش کا لاوا آخر کس طرف سے نکلے گا، ظاہر ہے کہ دلیل کے بعد ڈنڈے کا نمبر ہے اور خاکسار ابھی سے طرح طرح کی روایتیں سُن رہا ہے۔

ایک ''حزب اللہ'' کا کہنا یہ ہے کہ'' عامر کو جماعتِ اسلامی سے پانچ سات سو روپے تنخواہ ملتی ہے؛ مگر دیکھتے جاؤ ہم کیسی کسر نکالیں گے''۔

ایک ''جمعیۃ المومنین'' کا پروگرام یہ ہے کہ ذرا رمضان بعد طلباء مدرسہ میں آجائیں تب خبر لی جائے گی!

ایک ''گروہِ اتقیاء'' کی اسکیم یہ ہے کہ کیوں نہ عامر کی بکواس کا جواب ''سیاست العالیہ'' یعنی ''ملین پالیسی'' سے دیا جائے، آخر رامپور کے ''مودودیئے'' مہینوں جیل کاٹ سکتے ہیں تو عامر دو چار مہینے کیوں نہیں کاٹ سکتا۔

دبی زبان سے یہ تو سبھی بزرگ فرمارہے ہیں کہ کم بخت نے گالیاں دی ہیں، بہت سوں کو یہ چڑ ہے کہ افوہ ہمارے بھارت میں رہ کر ہمارے ہی خلاف یاوہ گوئی!۔

آخر ان سب باتوں کا کیا نتیجہ ہونا ہے، یہی نا کہ یا تو مدیر تجلی چپکے سے پاکستان سدھار جائیں ورنہ سر اور کمر کا بیمہ کرالیں، میں سمجھتا ہوں کہ سرِ راہ پٹ جانے سے بہتر خودکشی کر لینا ہے۔

قیامت پر قیامت یہ کہ اس پیشِ نظر اشاعت میں بھی حضرت کا ہیضۂ حق گوئی شباب پر ہے، معاف کیجیے گا میں حق گوئی کو ہیضہ اپنے ایک دوست ابوالمجاہد زاہد کی فہمائش پر لکھ گیا، ورنہ میرے نزدیک حضرت کی حق گوئی ایک امریکن مرض سے زیادہ کچھ نہیں۔ امریکن یوں کہ جماعتِ اسلامی والوں کو اس کے جانی دشمن جو چمکیلے ڈالر امریکہ سے دلواتے رہے ہیں ان میں سے حضرت کو بھی کچھ حصہ مل گیا ہوگا اور اسی کی پاسداری اور مزید لالچ میں تنقیدیں جھاڑی جارہی ہوں گی، آخر ان کے چچا مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کو بھی یار لوگوں نے مسلم لیگ سے بے شمار روپیہ دلوایا تھا!۔

ایک اور مزیدار بات ''گروہِ اولیاء'' کی طرف سے کہی جارہی ہے، یہ کہ عامر نے یہ تنقید ضرور کسی سے لکھوا کر منگائی ہے، وہ بے چارہ کیا لکھتا!

یہ راز کی بات کئی سال پہلے بھی انداز بدل کر ''تجلی کی ڈاک'' کے بارے میں کہی گئی تھی کہ ''ارے بھائی! عامر بے چارہ فتوے کیا لکھتا ہے تو۔

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

بعض پکے عقیدت مندوں نے اپنے بزرگوں کی یہ ''بشارت'' سن کر بہت دنوں ''دفتر تجلی'' اور مولانا عامر صاحب کے ''غریب خانے'' کے دروازوں کی چوکسی کی کہ دیکھیں کوئی معشوق اندر باہر آتا جاتا ہے یا نہیں؛ لیکن جب مدتوں تک معشوق کیا۔ اچھی صورت والا بھی کوئی نظر نہ آیا تو یہ لوگ اپنے ''ائمہ'' کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا:

''حضرت الوالائے محترم المعظم! آپ نے فرمایا تھا کہ کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں! ہم نے دفتر تجلی اور مکانِ تجلی کی بہت چوکسی کی تاکہ معشوق نظر آئے تو ٹانگ توڑ دیں؛ مگر ہیہات کہ ہماری نظریں جلوۂ معشوق سے محروم رہیں اور فتوے برابر تجلی میں چھپتے چلے جارہے ہیں!''

جواب دیا گیا:

''دفع کرو تجلّی کو۔فتوے لکھنا کچھ مشکل کام تھوڑی ہے اوّل تو مولانا صوفی حشمت اللہ فرما رہے تھے کہ عامرؔ اکثر میری خوشامد کرتا ہے اور میں ترس کھا کے کچھ لکھ دیتا ہوں، دوسرے فتوے دینا کوئی علمیت کی نشانی تھوڑی ہے، کتابیں دیکھیں اور فتوے لکھ دیئے پھر کتنے غلط فتوے تجلّی میں چھپتے ہیں، اوٹ پٹانگ سر نہ پیر، قوم کی بربادی کی یہی علامتیں ہیں!''

بات آئی گئی ہوئی، خود میں نے یعنی مُلّا ابن العرب مکّی نے بارہا مولانا عامرؔ عثمانی کے نہاں خانے میں جھانک کر دیکھا کہ شاید کوئی معشوق۔ یا ہمزاد فتوے لکھتا نظر آجائے مگر اللہ جانے کیا جادو یا مسمریزم اس شخص نے کر رکھا ہے کہ معشوق کی بجائے محض کتابیں اور گھٹیا درجے کے قلم اور ایک طرف چھپے ہوئے ردّی کاغذ دکھائی دیتے ہیں، خیر پہلے تو ہفتہ میں ایک ہی دو دو بار یہ مناظر دیکھنے میں آتے تھے؛ مگر اب ایک مہینے سے کتابیں دیکھ کر فتوے اور مضامین لکھنے کا جنون کافی ترقی پر ہے، شاید انھوں نے کتابوں کی کوئی کھیتی بھی گھر کے کسی پوشیدہ کونے میں کر رکھی ہے، جبھی تو ہر مہینے کتابوں میں اضافہ ہے اور اس مرتبہ تو اس طرح کی کتابیں ان کے پاس دیکھنے میں آئی ہیں کہ میرا یقین ہے ضرور دارالعلوم کے کتب خانے سے چوری کی گئی ہوں گی اور دارالعلوم والوں کو چاہیے فوراً اپنا ذخیرۂ کتب فہرست سے ملا کر دیکھیں اور کچھ کتابیں غائب ملیں تو رپٹ لکھوادیں، آخر تجلّی جیسے غریب پرچے کے مفلس ایڈیٹر کے پاس فتح الباری اور بحر المحیط اور عینی جیسی کتابیں کہاں سے آگئیں جن کا نام ہی لینے سے ڈر لگتا ہے، اور جن کی جلدیں کسی دن حضرت کے سر پر گرگئیں تو دم ہی نکل جائے گا، اگر دارالعلوم سے چوری نہیں کی گئی تو پھر ضرور امریکہ نے بھجوائی ہیں۔

میں حضرت سے دست بستہ عرض کر رہا ہوں کہ خدارا یہ لمبے لمبے حدیث و قرآن والے مضمون لکھنے بند کیجیے اور اپنے ساتھ ہماری بھی روزی اور عافیت خطرے میں نہ ڈالیے، امّاں حوّاؑ پسلی سے پیدا ہوئیں تب کیا اور نہ پیدا ہوئیں تب کیا، امام مہدی ڈھنڈورے سمیت تشریف لائے تب کیا اور چپ چپاتے آئے تب کیا، اور اگر مضمون لکھنے ہی ہیں تو کوئی ایسا گوشہ تو چھوڑ دیا کیجیے کہ فریق ثانی کچھ لکھ کر تاویل کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرے جو بہ شکل موجودہ ''ڈنڈے'' اور ''سیاست'' کی راہ سے نکالنے کے منصوبے ہیں، آپ کا سر سلامت نہ رہا تو اپنے کو دارالعلوم کی دربانی تک نہ مل سکے گی۔

(طنزیہ لہجہ میں چُھپے مذاق کے لطیف احساس کا ادراک نہ کر پانے والے کند ذہن و کم فہم لوگ اس مضمون کو پڑھ کر ہنسنے کے بجائے صوفی حشمت اللہ کے بارے میں سوچ رہے ہوں گے اور یہ فکر بھی انہیں ہو رہی ہوگی کہ معشوق و ہمزاد فتوے کیسے لکھتے ہیں؟)

••••••❖••••••

علمائے دیوبند اور جماعتِ اسلامی کے اختلاف کا قضیہ

اس سے پہلے کہ آپ میری معروضات ملاحظہ فرمائیں مناسب ہوگا کہ صدق نیت سے مندرجہ ذیل دعا پڑھیں۔
صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ سرورِ کونین ﷺ جب تہجد میں بیدار ہوتے تو یہ دعا پڑھتے:

اَللّٰھُمَّ رَبَّ جِبْرِیْلَ وَ مِیْکَائِیْلَ وَاِسْرَافِیْلَ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ اَنْتَ تَحْکُمُ بَیْنَ عِبَادِکَ فِیْمَا کَانُوْا فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ○ اِھْدِنِیْ لِمَا اخْتُلِفَ فِیْہِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِکَ اِنَّکَ تَھْدِیْ مَنْ تَشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔

”اے جبرئیل، میکائیل اور اسرافیل کے پروردگار! آسمانوں اور زمین کی تخلیق کرنے والے! غیب و حاضر کے جاننے والے! تُو ہی اپنے بندوں کے باہمی اختلافات کا فیصلہ کرے گا۔ جس حق کے بارے میں اختلاف کیا جارہا ہے اس کے لیے اپنے حکم سے میری ہدایت فرما۔ تُو ہی تو ہے جو اپنی مرضی کے مطابق جسے چاہے سیدھی راہ کی طرف ہدایت دیتا ہے۔“

میرا موقف اور علمائے موجود کی غلط روش

بعض دوستوں کو مجھ سے شکایت ہے کہ تو نے تجلّی کو جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کا اشتہار بنا کر رکھ دیا ہے اور خود فاضل دیوبند ہوتے ہوئے مستقلاً علمائے دیوبند کا حریف بنا ہوا ہے۔ تیرے رسالے سے علمائے دیوبند کے معتقدین دُور بھاگنے لگے ہیں اور ہمارے خیال میں موجودہ طرزِ عمل کسی بھی لحاظ سے تیرے لیے مفید نہیں ہے۔

ظاہر میں بات دل لگتی ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ کاروباری لحاظ سے میرا طرزِ عمل تجلّی کے لیے مفید اور نفع بخش ثابت نہیں ہورہا ہے؛ لیکن عموماً دیکھا گیا ہے کہ آخرت کا اجر و انعام حاصل کرنے کے لیے دنیاوی نقصان ہی اُٹھانا پڑتا ہے اور حق کی طرف بے لاگ دعوت دینے والوں کو آزمائش و ابتلا ہی سے سابقہ پیش آتا ہے۔ لہٰذا میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ حقیر تر منافع و مصالح کی خاطر اُس قلم کو توڑ دوں جسے اللہ نے اپنی عنایت خاص سے احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے میرے ناتواں ہاتھوں میں دیا ہے اور جس کو میں اپنی مرضی سے نہیں اللہ کے حکم اور توفیق سے جنبش دیئے چلا جارہا ہوں جب تک وہ چاہے گا یہ جنبش کرتا رہے گا اور جب چاہے گا ٹوٹ جائے گا۔

صورتِ حال کو اگر آپ غور سے دیکھیں تو دو باتیں آپ پر واضح ہوں گی۔ ایک تو یہ کہ میں حقیقت میں علمائے دیوبند کی مخالفت نہیں کررہا؛ بلکہ ان کی مدد کر رہا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ: تمھیں چاہئے اپنے بھائی کی مدد

کرو۔ سوال کیا گیا کہ کیا بھائی ظالم ہو تب بھی؟ جواب ملا کہ ہاں تب بھی! اور ظالم کی مدد یہ ہے کہ اسے ظلم سے باز رکھنے کی کوشش کرو۔ اسی حدیث پر میرا عمل ہے۔ جو علماء دعوتِ حق، تحریکِ دین اور مولانا مودودی پر ظلم صریح کے مرتکب ہو رہے ہیں میں اپنی بساط بھر کوشش کر رہا ہوں کہ وہ ظلم سے باز آجائیں۔ اور اگر میری کوشش کامیاب نہ ہوئی تو بھی کم سے کم اتنا تو ضرور ہوگا کہ عامۃ المسلمین میں ان کے ظلم سے پھیلنے والا افساد کسی نہ کسی درجہ میں کم ہو جائے گا اور میں اپنے اللہ سے کہہ سکوں گا کہ جو علم وفہم تو نے مجھے عطا فرمایا تھا اس کا حق میں حتی الوسع ادا کر سکا۔ ابلاغ وتبلیغ میرا کام تھا اثر پیدا کرنا تیرا!

دوسری بات یہ کہ ''علمائے دیوبند'' فی الحقیقت جس گروہ کا نام ہے وہ نہ تو مولانا مودودی کی دعوتِ خیر وفلاح کا مخالف ہے اور نہ اس کا بنایا ہوا مکتبِ فکر جماعتِ اسلامی کے مکتبِ فکر سے کوئی بنیادی اختلاف رکھتا ہے؛ بلکہ اس کے برعکس صورتِ حال یہ ہے کہ دَورِ موجودہ میں جن لوگوں کو علمائے دیوبند کہلانے کا شرف حاصل ہوگیا ہے وہ صرف اس معنیٰ میں تو ''علمائے دیوبند'' ہیں کہ دیوبند کی سرزمین پر واقع مدرسہ دارالعلوم کی مسندِ اقتدار ان کے ہاتھوں میں آگئی ہے اور عوام الناس انھیں باعتبار ظاہر ''علمائے دیوبند'' سمجھتے ہیں؛ لیکن حقیقتاً وہ اُن ''علمائے دیوبند'' کے مخالف اور حریف ہیں جنھوں نے مدتوں کی کاوش وکاہش کے بعد دیوبندی مکتبِ فکر تخلیق کیا تھا۔ جن کا سلسلۃ الذہب شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر مولانا محمد قاسم، مولانا تھانوی، مولانا گنگوہی، مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہم رحمہم اللہ تک ہے اور جن کی تصانیف فتوے اور مواعظ آج بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ مولانا مودودی کی دعوت اور فکر اور بنیادی تحریک بالکل وہی ہے جو ہمارے ''اصلی علمائے دیوبند'' کی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ مولانا مودودی نے اپنے فکر کو زمانہ رواں کے خاص انداز میں عملی تحریک کی حیثیت سے پیش کیا اور علمائے دیوبند نے اسی چیز کو اپنے زمانوں کے اسالیب میں علمی حیثیت سے پیش فرمایا تھا۔ وہ زمین تیار فرما گئے اور مولانا مودودی نے تعمیر کھڑی کی۔ وہ نقشہ بنا گئے تھے مولانا مودودی نے زمانہ اور حالات کی مناسبت سے اس نقشہ پر ایوان کے بام ودَر اُٹھائے ''علمائے موجود'' کی صحیح پوزیشن ایک مثال سے سمجھئے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ آج کل جمہوریت کے نام پر طرح طرح کی دھاندلے بازیوں سے بے شمار روپیہ صرف کر کے لوگ عوام کے ووٹوں سے امارت ووزارت کے عہدوں پر جاتے ہیں اور عہدے حاصل ہو جانے کے بعد اکثر وہ عوام کی خواہش اور منفعت کا بالکل لحاظ نہیں رکھتے؛ لیکن اس کے باوجود انھیں عوامی نمائندہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح حالات اور قسمت نے ہمارے اصلی علمائے دیوبند کی مسندوں پر جن لوگوں کو تسلط عطا کر دیا ہے وہ ضابطہ کی حد تک علمائے دیوبند ہی کہے جاتے ہیں اور انھیں دیوبندی مکتبِ فکر ہی کا نمائندہ خیال کیا جاتا ہے؛ لیکن جس طرح موجودہ جمہوریت کا ہر ممبر پارلیمنٹ حقیقت میں عوامی نمائندہ نہیں ہوتا، اور بسا اوقات وہ عوام کی نمائندگی کے

بجائے اپنے خیالات وخواہشات کی نمائندگی کرتا ہے۔اسی طرح ہمارے ''علمائے موجود فی الحقیقت علمائے دیوبند کی صحیح نمائندگی نہیں کررہے؛ بلکہ بعض معاملات میں اصلی علمائے دیوبند کے اُسوے اورعقائداورطوروطرز کے بالکل برخلاف اپنے ذاتی افکاروخیالات کی نمائندگی کررہے ہیں۔اوران کے افکاروآراء دیوبندی مکتب فکر کی بالکل ضد ہیں۔اس کی موٹی سی مثال یہ دیکھئے کہ ہمارے دیوبندی اسلاف نے کھلم کھلا کبھی کسی معصیت کو معمولی نفع دنیا کی خاطر اختیار نہیں فرمایا۔بلکہ اس کے برعکس زہدوتقویٰ کی خاطر بڑے سے بڑے نفع دنیا پر لات ماری۔ نیز انھوں نے بدعت کے خلاف مسلسل جنگ لڑی۔عُرس وقوالی وغیرہ کو حرام وممنوع قرار دیا۔قبروں کے میلوں پر سخت نکیر کی۔ایک دو نہیں پچاسوں کتابیں آپ کو ان اسلاف کی دیوبند کے کتب خانوں سے مل جائیں گی جن میں انھوں نے قرآن وسنت کی دلیلوں سے بدعات کی تردید کی ہے اور بدعت کے عامل اور معاون کو مردود وگمراہ قرار دیا ہے۔دیوبندی مکتبِ فکر کا سب سے نمایاں امتیاز ہی یہ رہا ہے کہ وہ بدعات کا سخت مخالف رہا۔لیکن اب آپ علمائے موجود کے سرکاری آرگن الجمعیۃ کو اُٹھا کر دیکھئے۔مولانا حسین احمد مدنی مدظلہ جمعیۃ العلماء کے صدر ہیں اور ''الجمعیۃ'' جمعیۃ العلماء کا واحد ذمہ دار اخبار ہے۔اس میں آپ کو تصویر دار اشتہار بھی ملیں گے۔معموں کے اعلانات اور حل بھی ملیں گے اور عرس کے شاندار اشتہارات بھی ملیں گے۔اوّل الذکر دونوں چیزیں تو آئے دن کی اشاعتوں میں عام ہیں اور آخرالذکر خاص موسم میں نظر آتی ہیں۔مثلاً ۱۴رجنوری ۱۹۵۷ء کا الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن دیکھئے۔صفحہ ۷ر پر عرسِ اجمیر کا،عنوان اور جلی عبارات کے علاوہ ۳۹ سطور پر مشتمل اشتہار ہے۔اس اشتہار کو پڑھئے تو معلوم ہوگا حج بیت اللہ بھی غالباً اِس اہتمام واکرام کا مستحق نہیں ہے جس کا یہ عرس مستحق ہے۔اگر آج مولانا قاسم، مولانا گنگوہی،مولانا شیخ الہند رحمہم اللہ وغیرہ زندہ ہوجاتے تو کیا یہ صورت حال انھیں حیران نہ کردیتی۔کیا وہ اپنے فکرودعوت کی اس ''صالح نمائندگی'' کا ماتم نہ کرتے۔خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی مدظلہ العالی جمعیۃ کا صدر رہتے ہوئے اللہ کے یہاں کیا عذر لائیں گے۔؟

بنیادی بات

بہرحال یہ میں نے ایک پیش پا افتادہ سی مثال غلط نمائندگی کی دی ہے؛ بلکہ اسے بلا شبہ علمائے موجود کی سابق علمائے دیوبند سے بغاوت اور قرآن وسنت سے کُھلے انحراف کا نام دیا جاسکتا ہے۔اور بہت سی مثالیں آگے آئیں گی۔لیکن اس سے پہلے میں عوام کو یہ حقیقی صورتِ حال بھی بتادوں کہ جماعتِ اسلامی کی جس مخالفت کو عوام علمائے دیوبند کی مخالفت سمجھے ہوئے ہیں وہ فی الحقیقت موجودہ علمائے دیوبند میں سے صرف ایک عالم کی مخالفت ہے اور وہ ہیں حضرت مولانا حسین احمد مدنی مدظلہ العالی۔مولانا میرے بخاری کے استاد ہیں اور

عبادت، زہد اور طاعتِ خداوندی میں بڑا اونچا پایہ رکھتے ہیں۔کون اندھا ہے جو اُن کے نیک اعمال اور عظمت وعزت سے انکار کرسکے؛ لیکن بدقسمتی سے ان کے قلب میں مدّت ہوئی مولانا مودودی کے بارے میں سوئے ظن بیٹھ گیا، اور سوئے ظن کے بارے میں ہر شخص جانتا ہے کہ اس کے اثرات ونتائج کیا ہوتے ہیں۔سوئے ظن پیدا ہونے کی متعدد وجوہات ہیں جن سب کی تشریح میں یہاں اس لیے نہیں کرنا چاہتا کہ اس کے لیے مجھے چار و ناچار صاف گوئی اور تجزیے سے کام لینا پڑے گا جسے بعض لوگ جسارت اور بے ادبی پر محمول فرمالیں گے۔

صرف ایک بنیادی چیز کا ذکر کروں گا اور وہ یہ ہے کہ مولانا مودودی کے بارے میں مولانا مدنی نے ان کی پوری دعوت اور تحریک کا مفصّل مطالعہ کرنے کے بعد رائے قائم نہیں کی ہے۔خود مولانا مدنی اپنی بعض تحریروں میں لکھ چکے ہیں کہ ہمارے پاس مولانا مودودی کی مفصل تحریریں دیکھنے کا وقت نہیں۔نیز یہ بھی ان کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن بعض عبارتوں پر انھوں نے اعتراضات فرمائے ہیں وہ عبارتیں یا تو انھیں تراشوں کی شکل میں ملی ہیں یا انھیں کتاب ہی میں حسبِ ضرورت نکال کر دیکھا گیا ہے۔ایسا نہیں ہوا کہ مولانا نے وہ پوری کتاب پہلے پڑھ لی ہو اور دورانِ مطالعہ میں عبارتِ مذکورہ پر قدرتاً اعتراض پیدا ہوا ہو۔ہوسکتا ہے کہ بعد میں بہ تقاضائے مصلحت مولانا نے مولانا مودودی کی چند تصانیف مطالعہ فرمالی ہوں؛ لیکن بہرحال ابتداءً رائے قائم کرتے وقت ان کا مدار یا تو سنی سنائی پر تھا یا ان بعض عبارات پر جو اعتراض ہی کی غرض سے ان کے سامنے لائی گئی تھیں۔انصاف پسند حضرات جانتے ہیں کہ کسی داعی کے اقوال کا صحیح مقصد ومنشا اُسی وقت سمجھا جاسکتا ہے جب یہ دیکھ لیا جائے کہ اس کی پوری دعوت کیا ہے، اور اِن اقوال کا اُس دعوت میں کیا مقام اور محل ہے۔کسی ایک یا چند اقوال کو اگر دعوت سے جُدا کرکے دیکھا جائے تو بارہا غلط فہمیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک شخص فقہِ حنفی یا فقہِ شافعی کے بنیادی اُصول ونظریات اور طریق استدلال اور اندازِ تفقہ کو نظر انداز کرکے محض ایک یا چند مسائل پر سطحی بحث ونظر کے بعد امام اعظم یا امام شافعی کے بارے میں عظیم فیصلے صادر کرنے لگے۔ یا مثلاً ایک شخص اسلام کے پورے ''قانونِ جنگ'' کا مفصّل مطالعہ کیے بغیر یہ کہنے لگے کہ اسلام غلام بنانے اور باندیوں سے وطی کرنے کو جائز رکھتا ہے اس لیے یقیناً گندہ مذہب ہے تو فرمائیے اس طرح کے فیصلوں کا کیا درجہ ہوگا؟

سنی سنائی باتوں پر بے تحقیق رائے قائم کرلینا کتنا غلط ہوتا ہے۔ یہ ہر صاحبِ ہوش جانتا ہے۔صرف نمونۃً ایک مثال پیش کرتا ہوں۔سلف کے ایک مشہور عالم عبداللہ ابن مبارک اپنے زمانہ کے عظیم المرتبت عالم امام اوزاعی سے ملنے شام گئے۔بیروت میں ملاقات ہوئی۔امام اوزاعی نے دورانِ گفتگو میں ان سے پوچھا:

ارے یہ کوفہ میں کون بدعتی پیدا ہوا ہے؟

اس سوال میں امام اوزاعی کا روئے سخن امام ابوحنیفہؒ کی طرف تھا۔صورت وہی تھی کہ امام اوزاعی نے سنی سنائی باتوں سے امام اعظم کے بارے میں ابتداءً ایک غلط ترین رائے قائم کرلی تھی۔

''سنی سنائی'' کے بعد اب میں ایک مثال اس کی دیتا ہوں کہ کسی شخص کا کوئی ایک قول یا چند اقوال اگر اس کے صحیح محل اور پس منظر سے جُدا کر کے دیکھے جائیں تو کتنے مغالطہ انگیز ہو سکتے ہیں۔امام اعظم ابوحنیفہؒ کا ارشاد ہے کہ الإیمان لایزید ولاینقص (ایمان نہ بڑھتا ہے نہ گھٹتا)اس قول کی مفصل بحث تو میں آگے مناسب جگہ لاؤں گا۔فی الحال صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ اس قول کو جب اس کے محل اور پس منظر اور متعلقات و مضمرات سے جدا کر کے علماء نے دیکھا تو بعض بڑے بڑے فضلاء و اتقیا کیسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔بخاری نے اپنی صحیح کے شروع ہی میں کتاب الایمان کا جو پہلا باب قائم کیا تو وہ اسی کی تردید میں تھا۔دوسری جگہ انھوں نے بڑی شدومد سے اس کی تردید کی اور کہا کہ میرے ہزاروں شیوخ میں سے ہر ایک اس کا قائل ہے کہ ایمان گھٹتا بڑھتا ہے۔

ابن کثیر جیسے عالم و فاضل نے امام اعظم کو فرقۂ مرجیہ میں شمار کیا۔مرجیہ وہ فرقہ تھا جو کہتا تھا کہ ایمان کے بعد کسی عمل کی ضرورت نہیں اور عمل کو ایمان سے کوئی تعلق نہیں۔ظاہر ہے کہ یہ فرقہ اسی طرح گمراہ اور باطل تھا جس طرح کہ اس کا متقابل فرقہ خارجیہ کہ جو کہتا ہے گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے۔اندازہ فرمائیے ابن کثیر نے تو مرجیہ ٹھیرایا ہی تھا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جیسے عظیم شیخ بھی امام اعظم کو اپنی 'غنیۃ الطالبین' میں مرجیہ ہی لکھتے ہیں۔ابن تیمیہ پچاسوں صحابہ سے یہ قول نقل کر کے کہ الإیمانُ قولٌ وعملٌ امام اعظمؒ کی اس طرح تردید فرماتے ہیں گویا نعوذ باللہ وہ واقعی مرجیہ فرقے کی طرح غلط اندیش تھے۔کتنے ہی اصحابِ حدیث ہیں جنھوں نے امام صاحب کے مذکورہ قول کو مرجیہ کے قول جیسا خیال کرلیا ہے۔

پھر اسی ایک بات پر بس نہیں۔امام بخاری جیسا عظیم المرتبت عالم اور زاہد اپنی تاریخ صغیر میں (ص/۱۵۸) ایک شخص حمیدی کا وہ قول نقل کرتا ہے جو صراحۃً امام اعظم کی توہین پر مشتمل ہے اور جس میں امام اعظمؒ پر خاکم بدہن حدیث سے بے خبری کا الزام لگایا گیا ہے۔اسی طرح ابواسحاق شیرازی نے''طبقات الفقہاء'' میں بعض لوگوں کا ذکر کیا ہے جو بجائے خود بڑے عالم و فاضل تھے؛لیکن کسی ایک امام سے غلو آمیز عقیدت رکھتے ہوئے دوسرے ائمہ پر طنز و طعن کرتے تھے اور ان کے بعض اقوال و ارشادات کو سطحیت کے ساتھ موردِ اعتراض بناتے تھے۔غضب خدا کا ''الدیباج المذھب'' میں صفحہ ۲۲۹ پر احمد بن عبداللہ العجلی کا یہ قول ملتا ہے کہ امام شافعی ثقہ اور صاحب رائے تو ضرور تھے؛مگر ان کے پاس ''حدیث'' نہیں تھی!''طبقات الحنابلۃ'' میں صفحہ ۲۰۴ پر ابوحاتم الرازی کا یہ ارشاد ملتا ہے کہ امام شافعی فقیہ تو تھے مگر انھیں حدیث کی معرفت نہ تھی!

یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مولانا مدنی نے مولانا مودودی کے بارے میں ابتداءً جو رائے قائم کی وہ علیٰ وجہ التحقیق اور علیٰ وجہ البصیرت نہیں تھی۔ وہ یا تو سنی سنائی پر مشتمل تھی یا بعض تحریروں کو ان کے اصلی مقام اور پس منظر سے ہٹا کر دیکھنے پر یا بعض فروعات کو اُصول سے اور جزئیات کو کلیات سے الگ کر کے ملاحظہ فرمانے پر۔ بعد میں اگر آپ نے ان کی بعض کتابوں کو دیکھا بھی تو اس لیے نہیں کہ اصل حقیقت دریافت فرمائیں؛ بلکہ اس لیے کہ جو بدگمانی دل میں گھر کر چکی ہے اس کی تائید اور تقویت کن عبارات سے ہوتی ہے، لہٰذا جیسا کہ ہر شخص دیکھتا ہے اہلِ بدعت اور منکرین حدیث اور قادیانیوں تک کو قرآن و حدیث میں اپنے واہی اور مکروہ عقائد کی تائید کے لیے کچھ ایسی چیزیں مل رہتی ہیں جنھیں وہ غلط ترجمانی اور غلط تفسیر و تاویل سے اپنے حسبِ دلخواہ ڈھال لیتے ہیں اسی طرح مولانا مدنی کو بھی متعدد عبارتیں مل گئیں جو فی الحقیقت تو گمراہ کن نہ تھیں، لیکن مولانا موصوف کی اپنی بدگمانی اور فکری جانبداری نے انھیں ''گمراہ کن'' بنا ڈالا۔

مولانا مدنی مدظلہٗ کی کیفیتِ مزاج

سوءِ ظن اور بدگمانی پر جمے رہنے کی علت سمجھنے کے لیے برادرانِ اسلام کو حضرت مولانا مدنی مدظلہٗ کی خاص کیفیتِ مزاج اور افتادِ طبع کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔ یہ خدانخواستہ کوئی طنز یا تنقیص نہیں ہے؛ بلکہ مزاج و طبع کے امتیازات تو مسلّمہ حقیقت ہیں۔ کہیں نرمی ہے کہیں گرمی کہیں تیزی ہے کہیں سکینت۔ کوئی صدیقؓ ہے کوئی فاروقؓ۔ کوئی عثمانؓ ہے کوئی علیؓ۔ ابن تیمیہ کو دیکھئے باوجود زبردست عالم و فاضل اور صاحب زہد وورع ہونے کے جگہ جگہ سخت غضبناک ہو جاتے ہیں۔ ابن حزم ان سے بھی زیادہ شدید اور سخت گو ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ، وشافعیؒ اہلِ ضلالت سے مناظرہ میں پیش پیش نظر آتے ہیں اور امام احمد ابن حنبلؒ اس میدان سے کوسوں دُور ہیں تو کہنا یہ ہے کہ مولانا مدنی مدظلہٗ کا مزاج انتہا پسند اور شدت آمیز ہے۔ وہ جب جنگِ آزادی لڑ رہے تھے تو کہا کرتے تھے کہ انگریز کے خلاف اگر مجھے کتوں اور خنزیروں سے بھی تعاون حاصل کرنا پڑے تو کروں گا۔ حالانکہ انگریز کی نفرت اور پسپائی بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہو سکتی؛ لیکن حضرت کی افتادِ طبع نے اسے ہی مقصدِ اصلی قرار دے دیا۔ علاوہ ازیں تحریکِ آزادی میں آپ نے ولائتی مال کے بائیکاٹ کے سلسلہ میں یہ اُصول اپنے لیے بنایا تھا کہ جس میت کا کفن کھدر کا نہ ہوگا اس کی نمازِ جنازہ نہ پڑھاؤں گا۔ نمازِ جنازہ جیسے خالص اُخروی معاملہ میں اُن کا یہ طرزِ فکر جس قدر شدت پسندانہ تھا وہ تو تھا ہی؛ لیکن آزادی کے بعد بھی اسی پر جمے رہنا جب کہ لٹھا خود ہندوستان میں بہتیرا بن رہا ہے ان کی انتہا پسندی کا شاہکار ہے۔

قاری محمد طیب صاحب کے حقیقی بھائی مولوی محمد طاہر صاحب کا چند سال ہوئے انتقال ہوا تو بھی مولانا مدنی

نے نمازِ جنازہ پڑھانے کی یہی شرط رکھی کہ کھدر کا کفن ہو۔اس پر قاری محمد طیّب صاحب نے شدید ناگواری محسوس کی اور دیوبند میں جو سب سے بہتر لٹھا مل سکا اس کا کفن بھائی کو دیا اور مولانا مدنی سے نمازِ جنازہ نہیں پڑھوائی۔

اسی طرح مولانا مدنی نے یہ اُصول بنا رکھا ہے کہ جو شخص مہر فاطمہ نہیں باندھے گا اُس کا نکاح نہیں پڑھاؤں گا۔اس اُصول کی جو شرعی حیثیت ہے اسے ہر صاحبِ علم خود سمجھ لے۔میں یہ چیزیں حضرت پر اعتراض یا طنز کرنے کے لیے نہیں بیان کر رہا، بلکہ مجھے یہ بتانا ہے کہ مولانا مدظلہٗ فطرتاً انتہا پسند واقع ہوئے ہیں اور اس انتہا پسندی کا ظہور موافقت ومخالفت دونوں میں ہوتا ہے اور ان کے لیے ایک بار کوئی رائے قائم کر کے اس سے ہٹنا بہت دشوار ہے۔(مذکورہ دونوں اُصولوں کے بارے میں جس کا جی چاہے خود مولانا مدنی مدظلہٗ سے تصدیق کر سکتا ہے)۔

بہر حال عرض یہ کرنا تھا کہ موجودہ علمائے دیوبند میں جماعتِ اسلامی کے مخالف تنہا مولانا حسین احمد مدظلہٗ ہیں اور یہ جو مختلف ناموں سے مختلف کتابیں اور فتوے وغیرہ آپ کو نظر آتے ہیں ان کی حقیقت کچھ اور ہے۔صورتِ حال یوں سمجھئے کہ مدرسہ دارالعلوم دیوبند پر مولانا مدنی مدظلہٗ کا مکمل اقتدار ہے اور حق یہ ہے کہ وہ اپنے عظیم زہد وورع اور علم وفضل کے اعتبار سے اقتدار ہی کے مستحق بھی ہیں۔کسی کو حتیٰ کہ مہتمم صاحب قبلہ کو بھی ان کی مرضی اور خواہش کے خلاف کرنے کی ہرگز جرأت نہیں ہے۔ٹھیک جس طرح ایک ملک کا وزیر اعظم یا صدر کوئی پالیسی بنا کر حکومت کی ساری مشینری کو اس کا تابع بنا لیتا ہے اور کسی عہدے دار کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ اس پالیسی کے خلاف کوئی مؤثر کارروائی کر سکے حتیٰ کہ جو لوگ اس پالیسی سے شدید اختلاف رکھتے ہیں وہ بھی یا تو سکوت اختیار کرتے ہیں، یا مفاد کی خاطر ضمیر کے خلاف اس کی ہمنوائی کرتے ہیں۔اور خواہی نخواہی اسی کی تقویت وتائید میں سرگرمی دکھاتے ہیں اسی طرح مولانا مدنی مدظلہٗ نے یہ پالیسی بنا دی کہ دارالعلوم جماعتِ اسلامی کی مخالفت کرے گا۔اب کسی ملازم، کسی طالبِ علم، کسی استاد، حتیٰ کہ مہتمم صاحب قبلہ تک کو مجال نہیں ہو سکتی کہ اس پالیسی کے خلاف جا سکیں۔پالیسی کی اطاعت کا یہ حال ہے کہ ہر ملازم دارالعلوم کی تنخواہ میں سے ایک پیسہ فی روپیہ کے حساب سے ''رَدِّ مودودیت'' کے نام پر ہر ماہ لازماً کٹ جاتا ہے۔حالانکہ ملازمین میں اَن پڑھ دربان بھی ہیں، نیم خواندہ کلرک بھی، مطبخ کے منتظم بھی، اور وہ سند والے علماء بھی جنھیں نہ تو کبھی مولانا مودودی کی کسی کتاب کی زیارت نصیب ہوئی ہے نہ انھیں یہ معلوم ہے کہ اسلام مدرسہ میں سبق پڑھا کر تنخواہ لے لینے اور ایک خاص انداز کا لباس پہننے اور منصب ملازمت کی رعایت سے نماز وروزہ کی پابندی کے سوا بھی کسی چیز کا نام ہے۔حق یہ ہے کہ اگر ملازمین دارالعلوم کو خیال ورائے کی پوری آزادی ہوتی اور مودودیت کے رجحان پر طلباء کو اخراج کا خوف نہ ہوتا تو دنیا دیکھتی کہ یہاں ملازمین اور طلباء کی اکثریت جماعتِ اسلامی کی دعوت وتحریک کی ہرگز ہرگز مخالف نہیں ہے۔

علماء کی صفیں

موجودہ علمائے دیوبند کو ہم چند صفوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ صفِ اوّل وہ ہے جس میں مولانا مدنی مدظلہٗ تن تنہا بطورِ امام ایستادہ ہیں۔ یہ نیت و ارادے کے اعتبار سے مخلص ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح امام بخاری اور بعض دیگر علمائے سلف امام ابوحنیفہ اور فقہِ حنفی کی مخالفت میں مخلص تھے۔ یہ علمِ دین سے متصف اور اسلاف کی تصنیفات سے باخبر ہیں؛ لیکن مولانا مودودی کی بعض ایسی عبارتوں تک پر اعتراض کر دیتے ہیں جو بعینہٖ شاہ ولی اللہ یا ابن حزم یا کسی اور متبحر عالم نے زبان کے فرق کے ساتھ لکھی ہیں۔ لیکن بوقتِ مخالفت انھیں اس کا استحضار نہیں ہوا (مثالیں اور دلیلیں آگے آئیں گی)

دوسری صف میں وہ بعض لوگ ہیں جو اَب سے کچھ پہلے یا تو مولانا مودودی کے ثناخواں تھے یا غیر جانبدار۔ ان میں سے ایک کا اسمِ گرامی بطورِ مثال پیش کرتا ہوں۔ یعنی حضرت قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ یہ کچھ دن پہلے ثناخوانوں میں تھے۔ چنانچہ دیوبند کے کتنے ہی لوگ اس کے گواہ ہیں اور آپ کی چند سال پہلے لکھی ہوئی کتاب ''فطری حکومت'' دیکھئے اس میں بھی بڑی وضاحت کے ساتھ مولانا مودودی کی تعریف ملے گی۔ (جسے ہم اپریل ۱۹۵۶ء کے تجلّی میں نقل کر چکے ہیں) جب مولانا مدنی نے بحیثیت مقتدرِ اعلیٰ نئی پالیسی متعیّن کر دی تو اب مہتمم صاحب کے لیے دو ہی صورتیں تھیں۔ یا تو ٹکر لیں یا مطابعت کریں۔ مہتمم صاحب نے جو نرم اور لچکدار طبیعت پائی ہے وہ ٹکر لینے کی پوزیشن میں کہاں۔ چنانچہ دیکھ لیجیے سیرۃ النبی اور میلاد کے جلسوں میں بھی آپ انھیں شرکت کرتا ہوا پائیں گے۔ حالانکہ اصلی علمائے دیوبند نے قولاً اور عملاً اس کی سخت مخالفت کی ہے اور جس کا جی چاہے مولانا گنگوہی اور مولانا اشرف علی اور دیگر علمائے سلف کی کتابیں اُٹھا کر دیکھ لے۔ جب مصلحت اور مقبولیتِ عام کی خاطر بدعت جیسی مکروہ چیز کے باب میں انھوں نے اسلافِ دیوبند سے خروج و بغاوت کی پروا کیے بغیر مصالحت و مفاہمت کی طرف قدم بڑھایا تو مولانا مدنی کی سخت گیر پالیسی سے ٹکر لینے کا تو سوال ہی کیا پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ آپ نے مولانا مدنی کی نوتراشیدہ پالیسی سے اتفاقِ کامل کا اظہار مناسب سمجھتے ہوئے وہ تمام قلمی کارنامے انجام دیئے جن کا تعارف اخبارات سے آپ حضرات کو ہوتا رہا ہے اور جن پر اور تو کوئی کیا خود موصوف ہی کا قلب وضمیر فخر نہیں کر رہا ہے۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس صفِ ثانی کے حضرات نے شاہ ولی اللہ اور اکابرین دیوبند کی تصانیف نہیں پڑھی ہیں؛ لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں اور خدا کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے مولانا مودودی کے لکھے ہوئے دس فی صدی صفحات بھی نہیں پڑھے ہیں اور جو تھوڑے سے پڑھے ہیں وہ بھی اُس شخص کی حیثیت سے جو پڑھنے سے پہلے ایک خیال قائم کر لیتا ہے اور پھر اسی کے مطابق دلیلیں ڈھونڈتا ہے۔

تیسری صف وہ ہے جس میں ایسے علمائے دیوبند ہیں کہ نہ تو انھوں نے مولانا مودودی کی کتابیں پڑھی ہیں نہ شاہ ولی اللہ اور دیگر اکابرین دیوبند کی۔ نہ انھیں یہ معلوم ہے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کارنامے کیا ہیں، نہ انھیں یہ خبر ہے کہ مولانا مودودی کی دعوت کس چڑیا کا نام ہے وہ تو بس اُن کتابوں کے عالم ہیں جنھیں پڑھا کر انھیں تنخواہ لینی ہے۔ وہ شاہ ولی اللہ یا اسماعیل شہید یا مولانا گنگوہی وغیرہ کو صرف اس لیے بزرگ اور قابل تعظیم مانتے ہیں کہ باپ دادوں سے یہی سنا ہے اور مولانا مودودی کو اس لیے گمراہ خیال کرتے ہیں کہ استاد الاساتذہ مولانا مدنی مدظلہٗ ایسا خیال کرتے ہیں۔ پس ان پر لازم ہوا کہ ڈھونڈھ ڈھانڈ کے کوئی کتاب مولانا مودودی کی لائیں اور اس میں سے ایسی عبارتیں نکالیں جن پر اعتراضات کرنے ممکن ہوں، تاکہ ایک طرف انھیں بھی ملک میں متعارف و مقبول ہونے کا موقع ملے دوسری طرف مقتدرِ اعلیٰ مولانا مدنی مدظلہٗ کی خوشنودی حاصل ہو۔ چنانچہ اس اندھی سعادت مندی کا نتیجہ آپ نے دیکھا کہ مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت کو مولانا مودودی کی سمجھ کر ان لوگوں نے نہ صرف کفر کا فتویٰ دے دیا، بلکہ دل کا کینہ ظاہر کرتے ہوئے نعوذ باللہ مرحوم و مغفور کا نکاح بھی فاسد کر دیا۔ یہ واضح طور پر اس کا ثبوت ہے کہ یہ لوگ خود اپنے قریبی اسلاف تک کی تحریروں سے باخبر نہیں اور اصلی علمائے دیوبند کی مسندوں پر قبضہ کر کے دیوبندی فکر کی قطعاً مہمل نمائندگی کر رہے ہیں۔

چوتھی صف ان بعض علماء کی ہے جو اگرچہ دارالعلوم دیوبند سے ملازمت کا رشتہ نہیں رکھتے۔ لیکن بعض اعتبارات سے سمجھے جاتے ہیں علمائے دیوبند ہی۔ یہ گاہے گاہے مخالفت کرتے ہیں، لیکن یہ مخالفت سنجیدہ دلائل اور علمی استدلال کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ اس کا انداز الیکشنی تقریروں جیسا ہوتا ہے۔ بلکہ بعض وقت یہ بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے یہ لوگ محض نمائش اور دکھاوے کی خاطر اس پر عمل پیرا ہوں۔ تو اس کی لِم اس کے سوا کیا ہے کہ یہ حضرات کسی نہ کسی حیثیت سے موجودہ سیکولر اسٹیٹ اور عوامی سیاست سے اٹکے ہوئے ہیں۔ یہ جانتے ہیں کہ حکومت وقت اور اقتدارِ اعلیٰ کی خوشنودی اور کفر پسند جنتا کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس جماعتِ اسلامی پر تبرّا کریں جو لادینی نظام کا کل پُرزہ بننے کو جائز قرار نہیں دیتی اور موجودہ غلیظ و کثیف سیاست کے چوبچے کو مومن کے لیے شرمناک ٹھیراتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ حضرات سب کے سب بدنیت یا علمِ شریعت سے جاہل ہیں؛ مگر جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ رشوت، دھوکہ بازی اور زنا کی قباحت پوری طرح جانتے ہوئے بھی کثیر لوگ ان مکروہات میں گرفتار رہتے ہیں اور نماز روزے کی اہمیت کا علم رکھنے کے باوجود کتنے ہی مسلمان ان کے قریب نہیں پھٹکتے۔ اسی طرح یہ حضرات بھی اہواء و اغراض اور مفاد و مصلحت اور تن آسانی و راحت کوشی کے پھندوں میں اس طرح گرفتار ہیں کہ شریعتِ اسلامی اور دعوتِ حق کا علم رکھنے کے باوجود سمتِ مخالف میں چلے جا رہے ہیں۔ پھر کبھی ضمیر سرزنش کرتا ہے تو عقل فتنہ کار دلائل تراش لاتی ہے۔ آخر دلیلوں کی دنیا میں کیا کمی ہے۔

....

دو متصادم نظریئے

مذکورہ سطور سے آپ کے سامنے علمائے موجودہ کی پوزیشن اور ذہنی وقلبی حالت منکشف ہوئی۔ اب یہ بھی سن لیجیے کہ متعدد جزئیات مثلاً پیدائش حوّا یا کیفیتِ ظہور مہدی یا معیاریتِ صحابہ وغیرہ پر جو اختلافات علماء کی طرف سے بڑے شدّ ومد کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں وہ درحقیقت بنیادِ اختلاف نہیں ہیں۔ بلکہ کدورتِ قلبی نکالنے کا محض بہانہ اور قطعاً بے تہہ چیزیں ہیں۔ ہر شخص جان سکتا ہے کہ جماعتِ اسلامی کی دعوت وتحریک سے ان فروعی مسائل کا کوئی بعید تعلّق بھی نہیں اور اس طرح کے جزئی اختلافات ہرگز کسی عملی دعوت کی مخالفت وموافقت کا مدار نہیں بن سکتے۔ اصل بنیادی شے اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ علمائے موجود کے نزدیک اسلامی تعلیمات اور وعظ وتبلیغ وغیرہ کا دائرہ صرف افراد اور انفرادیت تک رہنا ضروری ہے اور متعدد وجوہات سے وہ نہیں چاہتے کہ بے ضرر عبادات و اخلاقیات کے علاوہ اسلامی تبلیغ وتعلیم کو اجتماع اصلاح اور عمرانی غلبہ وتفوق کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس کے برخلاف جماعتِ اسلامی کی دعوت یہ ہے کہ مسلمان کی ذمہ داری جہاں یہ ہے کہ انفرادی اصلاح کرے وہیں یہ بھی ہے کہ اجتماعیات کے دائروں میں اسلام کی آواز پہنچائے اور ہر اُس نظام کی مدد سے انکار کردے جو خدا کے انکار اور فواحشات اور طاغوت پر مشتمل ہو۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ ہمارے علمائے موجود مذہب وسیاست کی تفریق پر عامل ہیں اور جماعتِ اسلامی اس تفریق کو نہیں مانتی علماء کے عملی موقف کا حاصل یہ ہے کہ اسلام کتابوں کے صفحات میں اور علمی دنیاؤں کے خلاؤں میں خواہ کیسا ہی کامل واکمل اور مقدس وبرتر ہو؛ لیکن حقائق کی اسٹیج اور واقعات کی دنیا میں اس کا نام تک نہ آنے پائے اور تقاضائے وقت کے مطابق وہ طاغوت کی چاکری اور خیمہ برداری پر شاکر وصابر رہے۔ اس کے برخلاف جماعتِ اسلامی کے موقف کا ثمرہ یہ ہے کہ دنیائے نو کے علم وسیاست کی بارگاہ میں خواہ مسلمان کتنے ہی پس ماندہ ودرماندہ سمجھے جائیں اور اقتدار واختیار کی مسندیں چاہے ان سے کتنی ہی دُور رہیں؛ لیکن انھیں باطل نظریات واُصول کے آگے ہتھیار نہیں ڈال دینے چاہئیں۔ انھیں قرآن وسنّت کا دامن نہیں چھوڑ دینا چاہیے۔ انھیں دنیاوی مفادات کی خاطر طاغوت کی چاکری اور ولایت قبول کرکے اسلام کو ذلیل ورسوا نہیں کرنا چاہیے۔

یہ ہیں دو متبائن نظریات جو اختلاف کی جڑ ہیں۔ اب مشکل یہ ہے کہ قرآن وسنت چونکہ آخرالذکر نظریہ کی تائید کرتے ہیں اور علمائے کرام خوب جانتے ہیں کہ دین وسیاست کی تفریق اور طاغوت کی چاکری اسلام سے جوڑ نہیں کھاتی اس لیے وہ کھل کر اپنے نظریہ کو پیش نہیں کرتے بلکہ متقابل نظریہ کو عمل کی دنیا میں شکست دے کر اپنے نظریہ کو بروئے کار لانے کے لیے وہ مختلف بہانوں اور حجابوں کی آڑ لیتے ہیں۔ جماعتِ اسلامی کے داعی اوّل کو ہدف

بناتے ہیں۔ پیدائش حوا پر جھگڑا کرتے ہیں۔ تقلید و عدمِ تقلید کے قصّے اُٹھاتے ہیں۔ ایک کے بعد ایک اعتراض تصنیف کر کے لاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے الزامات و اعتراضات کی علمی و دینی حیثیت آپ اپریل، مئی اور جون ۵۶ء کے تجلیوں میں ملاحظہ فرما چکے۔ کچھ اب ملاحظہ فرمائیے گا۔

یہی باعث ہے کہ علمی مسائل کی بحث آپ کو بہت کم نظر آئے گی۔ اور مولانا مودودی پر لعن طعن، تبرّا اور جارحانہ حملے زیادہ۔ حالانکہ مولانا موصوف پاکستان میں ہیں اور ہندوستان کی جماعت کے امیر مولانا ابواللیث ہیں۔ کسی طرح کا انتظامی تعلق دونوں ملکوں کی جماعت میں نہیں اور ہندوستان کی جماعت امن وقانون کی پوری وفاداری کے ساتھ اپنی وہ دعوتِ خدا پرستی پیش کیے جارہی ہے جس سے کسی مومن کو حقیقتاً اختلاف کی گنجائش ہی نہیں ہوسکتی؛ مگر مشکل تو وہی ہے کہ علمائے موجود اپنے غیر اسلامی نظریۂ سیاست اور قابلِ اصلاح عمرانی و اجتماعی افعال کو مطابقِ اسلام ثابت کرنے کے لیے جماعتِ اسلامی کو زندہ دیکھنا پسند نہیں کرتے اور اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے دعوتِ حق کے مقدّس ترین کام کو پیروں سے کچل دینا چاہتے ہیں۔ مجھ بدنصیب کی مشکل یہ ہے کہ ایک طرف تو مجھے اپنے اسلاف سے عقیدت ہے؛ کیونکہ میں نے اپنی بساط کی حد تک تحقیق کرنے کے بعد یہ پایا ہے کہ میرے اسلاف قرآن وسنت کے شیدائی تھے دوسرے مجھے دعوتِ حق سے محبت ہے؛ کیونکہ میرے نزدیک معاشرے میں پھیلی ہوئی بے شمار اخلاقی خرابیوں اور ظلم وطغیان کا واحد حل اسلام اور صرف اسلام ہے۔ نیز میں نے قرآن وسنت میں یہ سبق پایا ہے کہ مسلمانوں کے لیے فقر و فاقے کے ساتھ سربلندیٔ اسلام کی کوشش کرتے کرتے مرجانا اس سے بہتر ہے کہ وہ طاغوت کی چاکری اور باطل کی کفش برداری کر کے عیشِ دنیا حاصل کریں۔ یہی دونوں وجہ ہیں کہ میں مسلسل و پیہم چیخے چلائے جارہا ہوں۔ میں کیسے برداشت کرلوں کہ اسلاف کی مسندوں پر بیٹھے ہوئے علماء اپنی مَن مانی کیے جائیں اور دعویٰ کریں نمائندگیٔ دیوبند کا۔ نیز یہ کیسے سہہ جاؤں کہ اسلام کی جو علمی تحریک مدّت کے بعد برپا ہوئی ہے اس کی بیخ کنی وہی لوگ کریں جنھیں اس تحریک کی صفِ اوّل میں ہونا چاہیئے تھا۔ میں ایک بے حد حقیر و ناچیز بندۂ رب ہوں۔ جانتا ہوں کہ میری چیخ و پکار کوئی بڑا انقلاب نہیں لاسکتی۔ لیکن میرے اللہ اور میرے پیارے نبی محمد ﷺ نے مجھے بتایا ہے کہ تم سے صرف تمہاری قوت و استطاعت کی حد تک ہی سوال ہوگا۔ تمہیں صرف اتنا ہی حکم ہے کہ اپنی تمام قوتوں کو حتی المقدور اللہ کی راہ میں لگائے رکھو۔ نتائج اللہ کے اختیار میں ہیں۔ میں بظاہر مولانا مودودی کی طرفداری میں چیخ رہا ہوں؛ کیونکہ علمائے موجود اور ان کے پیچھے اندھا دھند چلنے والے حضرات بھی زیادہ تر اسی مجاہدِ حق کے نام پر لے دے کر رہے ہیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ معاملہ کسی مولانا مودودی یا مولانا مدنی کا نہیں۔ جائدادیں اور مسندیں نہیں بَٹ رہی ہیں کہ اشخاص کی بحث بیچ میں آئے؛ بلکہ سوال تو اصل دو نظریوں کا ہے۔ حق اور باطل کا ہے۔ ظلم اور انصاف کا ہے۔

......❖......

ایمان وعمل

اس نام سے کچھ دن ہوئے مولانا مدنی مدظلہٗ کی ایک مختصر کتاب شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب اپنے مضامین اور ذاتی حیثیت میں ہرگز اس درجہ کی نہیں ہے کہ اس پر نقد ونظر کی زحمت اُٹھائی جائے؛ کیونکہ اس میں مولانا مودودی پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں وہ سراسر مصنوعی، کافی پُرتکلف اور نامحکم ہیں۔علاوہ ازیں دینی فہم اور تھوڑا سا علم رکھنے والا ہر قاری ذرا سے غور سے دیکھ سکتا ہے کہ ان اعتراضات کے شافی جوابات خود اسی کتاب میں موجود ہیں؛ لیکن مشکل یہ ہے کہ اول تو دینی فہم وبصیرت رکھنے والوں کی بہت کمی ہے اور دوسرے مولانا مدنی کی شخصیت اور عظمت وشہرت سے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی اس قدر مرعوب ہوجاتے ہیں کہ پہاڑ جیسی اٹل حقیقتوں کو نظرانداز کرکے رعب وعقیدت کی رَو میں بہہ جاتے ہیں؛ چنانچہ ضروری خیال کیا گیا کہ ''ایمان وعمل'' کے بارے میں کچھ عرض کیا جائے۔ اگرچہ مولانا ابومحمد امام الدین نے محققانہ اور مدلل تنقید کے ذریعہ اس کتاب کی عجیب وغریب نوعیت وحقیقت واضح فرمادی ہے اور اسی شمارے میں ان کا مضمون شامل ہے؛ لیکن میرا بھی جی چاہا کہ بعض گوشوں پر کچھ گزارش کروں۔ وباللہ التوفیق۔

ایک پیشن گوئی

سب سے پہلے آپ تجلی دسمبر ۵۳ء صفحہ ۲۰ ملاحظہ فرمائیں، فدوی نے جواب نمبر ۱۲ کے آخر میں یہ الفاظ لکھے تھے:

> ''اب ہم آپ کو یہ بتادیں کہ ماہنامہ ''دارالعلوم'' کے قلم کاروں کو اگر جنید وغزالی یا امام ابوحنیفہ کی بھی کسی عبارت کے متعلق غلطی سے یقین ہوجائے کہ مولانا مودودی کی ہے تو اس کے مفہوم اور تعبیرات کو وہ الحاد وزندقہ اور خروج واعتزال کی حدوں سے ملانے کی سعی کریں گے اور خوش ہوں گے کہ قوم کی بڑی خدمت انجام دی ہے!''

اب ذرا اُس فتوے پر خیال فرمائیے جو مولانا محمد قاسمؒ کی ایک عبارت کو مولانا مودودی کی تحریر سمجھ کر دوسال بعد مفتیانِ دارالعلوم دیوبند نے دیا اور اس کی پوری تفصیل نہ صرف تجلی اپریل ۵۶ء میں چھپی؛ بلکہ دعوت دہلی اور بہت سے اور اخباروں میں چھپی اور مہتمم دارالعلوم کو ماننا پڑا کہ ہاں یہ فتویٰ ہمارے ہی مفتیوں نے

دیا ہے۔ ذرا ایک بار پھر اس فتوے کے الفاظِ مقدسہ ملاحظہ فرما لیے جائیں:

"ایسے عقیدے والا کافر ہے، جب تک وہ تجدید ایمان اور تجدید نکاح نہ کرے اس سے قطع تعلق کریں"

یہ توپ مفتیانِ کرام نے بزعمِ خود مولانا مودودی کی طرف چھوڑی تھی؛ لیکن انکشاف کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت مولانا محمد قاسمؒ نشانہ بن گئے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ.

میری پیشین گوئی جس عمدگی سے دو سال بعد پوری ہوئی اس کے بارے میں اگر میرے کچھ مرید و معتقدین ہوتے تو کہہ سکتے تھے کہ یہ کرامت ہے کشف ہے؛ لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ یہ کشف و کرامت نہیں؛ بلکہ کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنے کا وہ شعور اور وجدان اور فہم ہے جو اللہ اپنی راہ میں سچے دل سے جہاد کرنے والوں کو عطا فرماتا ہے۔ میں اللہ کا ایک انتہائی ناسپاس اور گنہگار بندہ ہوں۔ بے علم، ضعیف، ناہیچ؛ لیکن اطاعت و نیازمندی کی تڑپ لیے میں مدت سے اس کشمکش خیال میں گرفتار تھا کہ یا اللہ! تیرے دین کو بلند و غالب کرنے کے لیے جو چند ضعیف بندے سر بکف کھڑے ہوئے ہیں آخر ان کی مخالفت خود وہی لوگ کس لیے کر رہے ہیں جنھیں اس راہ کا امام اور سرخیل ہونا چاہیے تھا۔ کیا دعوتِ حق دینے والوں میں کوئی بڑا کھوٹ ہے، فتنہ ہے، گمراہی ہے۔ اسی سوال کا حل پانے کے لیے میں نے غیر جانبداری اور خلوص کے ساتھ دونوں طرف کی تحریریں خوب خوب پڑھیں اور اپنے ماحول میں مخالفین و معترضین کے فعل و عمل کو بھی جانچا۔ آخر کار مجھے میرے اللہ نے اس نتیجہ پر پہنچایا کہ مخالفت اللہ کے لیے نہیں نفس کی پیروی میں کی جا رہی ہے اور دعوتِ حق کی راہ میں حائل ہونے کی شیطانی سنّت کا ظہور اسی متعصبانہ و عامیانہ مخالفت کی شکل میں ہو رہا ہے۔ اس نتیجہ پر پہنچانے والے کچھ تو وہ رنگ رنگ کے پمفلٹ اشتہارات اور فتاویٰ تھے جو آپ سے بھی اکثر کی نظر سے گزرے ہوں گے اور جن میں حد درجہ سطحیت؛ بلکہ جہالت کے مظاہرے کیے گئے ہیں اور کچھ وہ تحریریں تھیں جو بعض اصحابِ علم و زہد کی طرف سے وجود میں آنے کے باوجود دیانت و معقولیت سے یکسر خالی تھیں۔ تعصب، جانبداری اور انانیت ان میں بھری پڑی تھی۔ اپنے مطالعہ کی پوری تفصیل تو یہاں نہیں پیش کی جا سکتی؛ لیکن یہ بتانے کے لیے کہ اس طرح کی باتیں میں اپنی ہمہ دانی کے غرور یا مخالفت کے تعصب میں بلا دلیل نہیں کہہ رہا؛ بلکہ ناقابل تردید دلائل بھی میرے پاس ہیں، کچھ مثالیں ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔

ظلم و تعصب کی مثالیں

عام طور پر یہ اُڑ رہا تھا کہ مولانا مودودی تصوف کے منکر ہیں اور تزکیہ و احسان ان کے نزدیک کوئی چیز نہیں ہے۔ میں نے اپنی بساط بھر کوشش کی کہ مولانا موصوف کے عقیدے کو ان کی تحریروں میں ڈھونڈوں؛ لیکن

باوجود سعی بسیار کے مجھے ان کے یہاں کوئی ایسا عقیدہ نہ ملا جو دین کے خلاف ہو یا جسے میرے اکابرین نے مردود قرار دیا ہو۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے مروّجہ تصوّف پر بعض جگہ بڑی سخت تنقیدیں کی ہیں؛ لیکن یہ تو ابن حزم اور ابن تیمیہ اور ابن قیم وغیرہ بھی کر چکے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ بھی اس کے مجرم ہیں۔ اور ہر وہ مصلح اس کا مرتکب ہو گا جو اسلام کو غیر اسلامی عقائد و اعمال سے پاک وصاف دیکھنا چاہے گا۔ مجھے ان کے یہاں تصوف کے موضوع پر جو کچھ ملا وہ نہ صرف یہ کہ قرآن و سنت کے ہو بہو موافق تھا؛ بلکہ اسلامی اور غیر اسلامی تصوف پر بے لاگ اور بے عیب محاکمہ کا درجہ رکھتا تھا۔ میں یہاں ان کی تحریروں کے کچھ اقتباسات پیش کرتا؛ لیکن طوالت کے خوف سے نظرانداز کرتا ہوں جس کا جی چاہے مولانا کا رسالہ ''دینیات'' اُٹھا کر دیکھ لے۔ نیز اسی اشاعت میں شامل مضمون ''مولانا مودودی اور تصوف'' بھی اس باب میں کافی موضح ہو گا۔

اب ذرا مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی وہ عبارت بھی دیکھیے جو میں نے ''ارواحِ ثلاثہ'' میں پڑھی۔ آپ جانتے ہوں گے کہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ دیوبند کے مستند اور ثقہ علماء میں سے ہیں وہ نہ صرف علامہ سمجھے جاتے ہیں؛ بلکہ زاہد و عابد بھی شمار کیے جاتے ہیں۔ اور مولانا مدنی مدظلہ العالی کے پیر بھی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ابتداء سے اس وقت تک جس قدر ضرر دین کو صوفیا سے پہنچا ہے اتنا کسی اور فرقے سے نہیں پہنچا۔ ان سے روایات کے ذریعہ بھی دین کو ضرر رہوا اور عقائد کے لحاظ سے بھی اور خیالات کے لحاظ سے بھی''۔

ملاحظہ فرمائیے، بلا کسی تخصیص کے بغیر کسی استثناء کے مولانا موصوف تمام ہی ''صوفیا'' کے بارے میں کیا فرمارہے ہیں؟

آگے لکھتے ہیں:

> ''صحابہ میں بہ فیضِ نبوی جو قوت تھی جب وہ قوت بعد کے لوگوں میں نہ رہی تو اس کی کمی کی تلافی کے لیے بزرگوں نے ریاضت و مجاہدات ایجاد کیے۔ ایک زمانہ تک تو وسائل غیر مقصودہ کے درجہ میں ان پر عمل ہوتا رہا؛ مگر جوں جوں خیر القرون کو بُعد ہوتا گیا ان میں مقصودیت کی شان پیدا ہوتی رہی اور وقتاً فوقتاً ان میں اضافہ ہوتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین میں بے حد بدعات علمی، عملی و اعتقادی داخل ہو گئیں۔ محققین صوفیا نے ان خرابیوں کی اصلاحیں بھی کیں؛ مگر نتیجہ صرف اتنا ہوا کہ ان بدعات میں کچھ کمی ہو گئی؛ لیکن بالکل ازالہ نہ ہوا شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ شہاب الدین سہروردی، مجدد الف ثانی اور سید احمد قدست اسرارہم پر حق تعالیٰ نے طریق سنت منکشف فرمایا تھا اور الحمدللہ مجھ پر بھی وہی طریق سنت منکشف فرمایا ہے۔ طریق سنت میں بڑی برکت

ہے شیطان کو اس میں رہزنی کا بہت کم موقع ملتا ہے؛ چنانچہ کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ جن اُمور کا آنحضرت ﷺ نے اہتمام فرمایا ہے جیسے نماز باجماعت وغیرہ۔ اگر کوئی سختی کے ساتھ ان کی پابندی کرے اور فرائض وواجبات وسنن مؤکدہ کا پورا اہتمام کرے تو نہ خود اس کو وسوسہ ہوتا ہے کہ میں کامل اور بزرگ ہوگیا اور نہ دوسرے اسے ولی اور بزرگ سمجھتے ہیں؛ لیکن اگر چاشت، اشراق، صلوٰۃ اوابین وغیرہ اُمور کا پابند ہو تو وہ خود بھی سمجھتا ہے کہ اب میں بزرگ ہوگیا اور دوسرے بھی سمجھتے ہیں کہ یہ بزرگ ہے۔ شارع علیہ السلام نے احسان کو مطلوب قرار دیا تھا؛ مگر صوفیا نے بجائے اس کے استغراق کو مقصود بنالیا''۔

اس اقتباس کو غور سے کئی بار پڑھیے اور خط کشیدہ عبارات پر خصوصی توجہ دیجیے۔ یہی نہیں کہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے تاریخ اُمت کے بے شمار صوفیا ومشائخ میں سے ایک کو بھی مستثنیٰ کیے بغیر پوری صفائی اور قطعیت کے ساتھ امت کے تمام ہی صوفیا کو دین کے لیے ضرر رساں بتایا ہے۔ یہی نہیں کہ انھوں نے بلا رعایت کل صوفیائے اُمت کو اعتراض کی زَد میں لے لیا ہے۔ یہی نہیں کہ صوفیا کے نکالے ہوئے نئے طریقوں اور مجاہدوں اور مراقبوں کو انھوں نے ''بدعت'' کے مردود نام سے موسوم کیا ہے۔ یہی نہیں کہ انھوں نے تصوف کو قرآن وسنت میں محدود کر کے ٹھیک وہی بات کہی ہے جسے مولانا مودودی سالوں سے بانداز مختلف کہے جارہے ہیں؛ بلکہ انھوں نے ہمارے اُن نکتہ سنج حضرات کے منہ پر بھی چپت مارا ہے جو صوفیا کے ایجاد کردہ غیر منصوص اور نئے نئے طریقوں کے جواز پر یہ دلیل لاتے ہیں کہ یہ صرف وسائل ہیں مقصود نہیں۔ لہٰذا ان کو اختیار کر لینا نہ صرف جائز بلکہ تزکیہ وتصوف کے لیے ضروری ہے۔ مولانا گنگوہیؒ تو صاف فرما رہے ہیں کہ شروع میں تو یہ طریقے بے شک وسیلے اور ذریعے کی حیثیت سے اختیار کیے گئے؛ لیکن رفتہ رفتہ ان میں مقصودیت کی شان پیدا ہوگئی ہے۔ لہٰذا قابل ترک اور داخل بدعت ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا گنگوہیؒ نے زمانے کے مزاج اور عام نفسیات کا حقیقت پسندانہ مطالعہ کر کے اشراق اور چاشت اور صلوٰۃ اوابین جیسی ثابت بالرّوایۃ عبادات تک کی پابندی سے بانداز لطیف روکا ہے اور اُس ''استغراق'' کو جو تصوف رائجہ ومشہورہ کی تمام تر پونجی ہے مرجوح ونامحمود قرار دے کر مولانا مودودی سے زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ فرمایا ہے؛ اس لیے کہ مولانا مودودی نے تو اپنی تصانیف میں بڑی احتیاط اور ذمہ داری سے اس بات کو واضح کیا ہے کہ ہم کس تصوف کے مخالف ہیں کس کے موافق کس کو ہم بُرا کہتے ہیں اور کس کو اچھا، اور یہ کہیں نہیں لکھا کہ کوئی ثابت بالرّوایت عبادت بھی فساد عام اور انقلاب زمانہ کے باعث قابل ترک ہوسکتی ہے؛ لیکن مولانا گنگوہی نے بلا استثناء تمام ہی صوفیاء کو دین کے لیے ضرر رساں قرار دے دیا اور اشراق وچاشت تک کی پابندی سے روکا۔

میں اس مضمون کو پڑھ کر اپنے بعض بزرگوں اور استاذوں کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا کہ مولانا گنگوہی کس پائے کے انسان تھے تو مجھے ہر جگہ یہی جواب ملا کہ زبردست عالم، بہت پرہیز گار، بڑے اللہ والے، نہایت دیندار اور بالغ نظر تھے۔ اس جواب کے بعد مجھے فیصلہ کر لینا پڑا کہ علمائے موجودہ تصوف کے باب میں مولانا مودودی کی جو مخالفت کرتے ہیں وہ تعصب پر مبنی ہے ورنہ خود ان کے محترم بزرگ تصوف کی تنقید میں بلحاظِ شدت مولانا موصوف سے آگے ہیں اور کبھی اِن علماء نے ان کے معتقدات و بیانات پر اعتراض نہیں کیا۔

دوسری مثال

میں نے سنا کہ مولانا مودودی قرآن وسنت کے سوا کسی کو معیارِ حق نہیں مانتے۔ یہی بات میں نے دارالعلوم میں دورانِ تعلیم میں اپنے استادوں سے سنی تھی۔ اسی بات کی تائید مولانا قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں میں دیکھی، اسی کو شاہ ولی اللہؒ کی تصانیف میں نمایاں پایا۔ یہی مذہب امام ابوحنیفہؒ، شافعیؒ، مالکؒ، احمدؒ اور دیگر اسلافِ جلیل رحمہم اللہ علیہم اجمعین کا متحقق ہوا؛ لیکن علمائے موجودہ نے اسی عقیدۂ صحیحہ کے خلاف مولانا مودودی کے بالمقابل وہ چاندماری شروع کی کہ الامان والحفیظ۔ مجبوراً مجھے یقین کرنا پڑا کہ یہ عناد و تعصب کی کرشمہ سازیاں ہیں۔

تیسری مثال

میں نے دیکھا کہ شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے ''تقویۃ الایمان'' میں ''فصل اوّل في الاجتناب عن الاشراك'' کے ذیل میں لکھا ہے:

''ہر مخلوق بڑا ہو یا چھوٹا وہ اللہ کی شان کے آگے چمار سے بھی زیادہ ذلیل ہے''۔

اس عبارت پر غور فرمائیے۔ میرے نزدیک یہ سوفی صدی صحیح ہے؛ لیکن کیا اس کا صاف اور بدیہی مطلب یہ نہیں ہے کہ اولیاء وصحابہ تو ایک طرف رہے تمام انبیاء ورُسل اور خاتم النبیین ﷺ بھی اللہ کی شان کے آگے چمار سے زیادہ ذلیل ہیں؟ کیسا خطرناک اندازِ بیان ہے، کتنے لرزا دینے والے الفاظ ہیں- اور یہ نہ سمجھیے کہ شاہ صاحب کے الفاظ کی یہ تعبیر کچھ میں اپنی طرف سے پیش کر رہا ہوں۔ نہیں یہ تعبیر تو اسی زمانہ میں کی گئی اور تذکیر الاخوان اُٹھا کر دیکھ لیجیے کہ بعض خطوط کتنے غصّے کے آئے؛ لیکن خود شاہ صاحب نے بھی اِن الفاظ کو درست و برحق ثابت کیا اور ''علمائے موجود'' بھی ان الفاظ کو بے عیب اور برمحل ٹھیراتے ہیں۔

اب اس کے مقابلہ میں اِس چیز پر غور فرمائیے کہ مولانا مودودی نے اپنی کتاب ''تجدید واحیائے دین'' میں تصوفِ رائجہ کو ''چنیا بیگم'' (افیم) کے نام سے تعبیر کیا تو ہمارے علمائے موجود اس طرح چیخ اُٹھے گویا آسمان پھٹ پڑا، ہنگامہ برپا کر دیا۔ فتووں کی مشین گن چالو کر دی۔ میں مانوں گا کہ چونکہ تصوف کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس کا

دوسرا نام احسان ہے اور جو قرآن وسنت کا مطلوب ہے؛ اس لیے ’’چنیا بیگم‘‘ کا لفظ ذرا سخت اور وحشت آفریں ہے؛ لیکن ’’الاکثر حکم الکل‘‘ کا اُصول تو ہمارے ’’علمائے موجود‘‘ میں بالکل عام ہے۔ جبکہ صحیح اسلامی تصوف تقریباً ناپید ہوگیا اور حد درجہ غلط اور غیر اسلامی رسوم ورواج اور اشکال وصُوَر نے ’’تصوف‘‘ کا نام اختیار کرلیا اور عام طور پر یہی نہیں خاص طور پر بھی یہ سمجھا جانے لگا کہ بعض خود ایجاد اور من گھڑت عبادات اور ایک خاص طرح کی شکل و ہیئت بھی تصوف کے لازمی اجزا ہیں تو ’’تصوف‘‘ پر ’’چنیا بیگم‘‘ کی تشبیہ کچھ ایسی نادرست بھی نہیں۔ چلیے نادرست ہی مان لیجیے؛ لیکن کیا یہ لفظی اعتبار سے شاہ اسماعیل شہیدؒ کے لفظ ’’چمار‘‘ سے زیادہ وحشت آفریں ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں اور ہرگز نہیں۔ پھر شور وشغب کیوں؟ واویلا کیسا؟ اعتراض تھا تو دلائل سے ثابت کرتے کہ مروجہ تصوف ’’افیم‘‘ نہیں ہے۔ یا اتنی سکت نہیں تھی تو اِس وحشت آفریں لفظ کو مولانا مودودی کی ایک لفظی غلطی مان کر اُس دعوت کے دشمن تو نہ بن جاتے جو مولانا دے رہے ہیں۔ جو سراپا حق ہے۔ رہی یہ بات کہ مودودی نے ائمہ ومجددین کی بے شمار تعریفات کرنے کے ساتھ ساتھ بعض اُمور میں اختلاف کیوں کیا، بعض چیزوں کو غلط کیوں ٹھیرایا تو ان کے معاملہ میں تو علمائے موجود بڑے چراغ پا ہوگئے؛ لیکن یہ بالکل بُھلا دیا کہ ’’مدارج السالکین‘‘ میں علامہ ابن قیم نے تصوف اور گروہِ صوفیا پر کتنی بے جھجک تنقیدیں کی ہیں اور اپنے شیخ ’’شیخ الاسلام ہرویؒ‘‘ تک کی رعایت نہیں کی ہے۔ یہ قطعاً فراموش کردیا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات جہاں اولیاء ومشائخ کی توصیف وتعریف سے بھرے پڑے ہیں وہیں ان میں شیخ الطائفہ محی الدین ابن عربی اور بایزید بسطامی اور رابعہ بصریہ جیسی جلیل القدر ہستیوں پر بے لاگ تنقید موجود ہے۔ یہ یکسر نظر انداز کردیا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور علامہ ابن حزم جیسے زبردست علماء نے تنقیدِ تصوف وصوفیا میں کتنا کتنا سخت لب ولہجہ اختیار کیا ہے۔

چوتھی مثال

میں نے دیکھا کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی تصانیف میں جا بجا ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں کہ ان کے مقام اور ان کے علم وفضل سے بے خبر انسان بلاتکلف ان پر خودستائی اور غرور اور خود پرستی کا الزام لگا سکتا ہے۔ مثلاً انھوں نے ’’تفہیمات الالٰہیہ‘‘ میں لکھا ہے: ’’مجھے اس دَور کا ناطق‘‘، ’’حکیم‘‘ اور ’’قائد وزعیم‘‘ بنایا گیا ہے‘‘۔

اور لکھا: ’’میرے ذہن میں ڈالا گیا کہ میں لوگوں تک یہ حقیقت پہنچادوں کہ یہ زمانہ تیرا زمانہ ہے اور یہ وقت تیرا وقت ہے۔ افسوس اس پر جو تیرے جھنڈے کے نیچے نہ ہو‘‘۔

اور لکھا: ’’مجھ کو رب نے یہ سمجھایا ہے کہ ہم نے تم کو اس طریقہ کا امام بنایا اور حقیقتِ قرب تک پہنچنے کے تمام راستے بند کر کے صرف ایک راستہ کھلا رکھا ہے اور وہ تمہاری محبت اور اطاعت کا راستہ ہے۔ جو شخص تمہارا دشمن ہے

اس کے لیے آسمان، آسمان نہیں اور زمین، زمین نہیں، پس تمام اہلِ مشرق و مغرب تمہاری رعیت ہے اور تم ان کے بادشاہ اس سے غرض نہیں کہ یہ لوگ جانتے ہیں یا نہیں اگر جانتے ہیں تو کامیاب ہوں گے ورنہ نقصان اُٹھائیں گے"۔

اور لکھا: میں نے خواب میں دیکھا کہ میں "قائم الزماں" ہوں یعنی اللہ تعالیٰ جب خیر کے کسی نظام کا ارادہ فرماتا ہے تو اپنے اس ارادے کی تکمیل کے لیے وہ مجھے اوزار یا آلۂ کار کی طرح بنالیتا ہے"۔ (فیوض الحرمین)

اور لکھا: "جب میرا دورۂ حکمت یعنی علم اسرار دین پورا ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے خلعتِ مجددیت پہنائی، پس میں نے مسائل اختلافی میں جمع (وتطبیق) کو معلوم کرلیا"۔ (تفہیمات الالٰہیہ)

یہ چند نمونے ہیں، ان کی کتابوں میں اِس طرح کی بہت باتیں ملتی ہیں؛ لیکن کبھی نہیں سنا کہ علمائے کرام نے شاہ صاحب پر کسی ادّعا یا زعم وغرور کا الزام لگایا ہو؛ لیکن اس کے مقابلہ میں میں نے سنا اور پڑھا کہ مولانا مودودی دعویٔ مہدیت کرنے والے ہیں۔خود کو مہدی موعود خیال کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔خیال ہوا کہ شاید مولانا موصوف نے اس طرح کا دعویٰ کہیں اپنی تحریروں میں کیا ہوگا۔ چنانچہ کتابیں کی کتابیں چھان ماریں؛ لیکن خدا گواہ کہ اس طرح کے الزام کی تصدیق کرنے والی تو درکنار اس کا وہم تک پیدا کرنے والی کوئی عبارت نہ ملی اور معترضین سے زبانی پوچھا تو انھوں نے اُن عبارات کی طرف اشارہ کیا جن میں مولانا موصوف نے انتہائی معقولیت اور سنجیدگی کے ساتھ نقد ونظر کے ذریعہ اسلام اور غیر اسلام کو الگ الگ کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ یاللعجب، دل پکار اُٹھا کہ یہ معترضین حد درجہ متعصب، متکبر اور خوفِ آخرت سے بے نیاز ہیں۔

پانچویں مثال

میں نے دیکھا کہ علمائے سلف نے تقلید جامد کو اہلِ علم کے لیے جرم قرار دیا ہے اور ابن حزم کا حرمت تقلید پر بڑی شد ومد اور دلائل کے ساتھ کیا ہوا دعویٰ جب شاہ ولی اللہؒ کے سامنے آیا تو اُنھوں نے بھی اُسے اُن مفہومات میں تسلیم کیا جن میں وہ کیا گیا تھا؛ چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں آپ نے نہ صرف یہ فرمایا کہ اہلِ علم کے لیے بے شک تقلید جامد درست نہیں ہے؛ بلکہ یہاں تک فرمایا کہ ابن حزم کا دعویٰ بے شک اُس شخص کے حق میں ٹھیک ہے جس میں اجتہاد کی کسی قدر قوت وصلاحیت ہو، خواہ وہ ایک ہی مسئلہ میں کیوں نہ ہو! اور یہاں تک فرمایا کہ جزئی مسائل اور فقہاء کی تخریجات حقیقت میں "مذہب" نہیں ہیں اور ہدایہ، یا مبسوط تبیین وغیرہ کتابیں جزو مذہب نہیں ہیں نہ دین کی تکمیل اِن "محاوراتِ جدلیہ" پر موقوف ہے۔

اب چاروں طرف سے آواز آتی ہے۔مولانا مودودی غیر مقلد ہیں؛ لہٰذا گمراہ ہیں۔اس جاہلانہ اور سفیہانہ،

آوازے کی بنیاد محض اس بات پر تھی کہ مولانا مودودی بعض مسائل میں ائمہ وعلماء کے دلائل بیان فرما کر یہ رائے ظاہر کر دیتے تھے کہ میرے نزدیک فلاں دلیل مضبوط ہے۔ ایک ایسے شخص کے لیے جس کی تحریروں کے ہزاروں صفحے اس کی واقفیتِ دین، وسعتِ مطالعہ، علم وفہم، بصیرت و درایت اور قرآن وسنت سے نہ صرف باخبری؛ بلکہ عشق کا اعلان کر رہے ہوں، یہ طریقہ نہ صرف مستحسن ہے؛ بلکہ ایسے شخص کے لیے امام ابوحنیفہ سے لے کر آج تک کے تمام بالغ نظر علماء نے تقلید جامد کو حرام بتایا ہے؛ لیکن ہمارے علمائے کرام نے اسے مستقل جرم و گمراہی کا نام دے کر شور مچانا شروع کر دیا۔ حالانکہ ان کے ہاتھوں میں آئے دن آنے والی کتاب ''شامی'' ہی میں فخر الائمہ صاحب معراج الدرایہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ:

''فقہاء کے مختلف اقوال میں سے کسی قول پر مسلمانوں کی آسانی کے لیے ضرورۃً فتویٰ دیا جائے تو یہ اچھی بات ہوگی''۔

اور خود شامی نے اسے سراہا ہے۔ پھر فتاویٰ تتارخانیہ میں بھی بالغ نظر علماء کے اختلاف کو انسانوں کے لیے وجہِ آسانی لکھا گیا ہے اور شاہ ولی اللہ کی الانصاف بھی اور عقد الجید بھی مولانا مودودی کی صد فیصد تائید کرتی ہے۔

چھٹی مثال

نقشبندیہ سلسلۂ تصوف میں ''تصورِ شیخ'' راہِ سلوک کا ایک جزو لازم ہے۔ میں نے دیکھا حکیم عبدالرشید صاحب گنگوہی نے ''جو جماعتِ اسلامی کے مخالفین میں سے ہیں'' ترجمان القرآن اور رسالہ دارالعلوم میں جماعتِ اسلامی کے رَد کے طور پر ''تصورِ شیخ'' کا مسئلہ بایں طور پیش فرمایا کہ چونکہ لوگ عموماً پیکرِ محسوس کے خوگر ہیں اور بے کیف وکم خدا کے تصور کی صلاحیت نہیں رکھتے؛ اس لیے بعض اکابر نے ''تصورِ شیخ'' کو واسطہ بنایا جو اگرچہ خطرناک ہے؛ لیکن اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اور ہوائی سفر کے بجائے چھکڑے (یہ اُنھی کے الفاظ ہیں۔ عامرؔ) ہی کے ذریعہ اگر قطع مسافت ممکن ہو تو یوں ہی سہی!

اس پر مولانا امین احسن اصلاحی نے مدلّل گرفت کی جس کا حاصل یہ تھا کہ اگر ''تصورِ شیخ'' کی تعبیر یہی ہے تو آخر ہندوؤں کی بت پرستی اور مظاہر پرستی میں کیا فرق ہے؟ ہندو بھی یہ تھوڑی سمجھتے ہیں کہ ان کے اپنے تراشے ہوئے پتھر کے بُت بالذات طور پر خدائی طاقتوں کے مالک ہیں؛ بلکہ وہ بھی تقریباً یہی توجیہ کرتے ہیں جو آپ نے تصورِ شیخ کی فرمائی ہے۔

اس پر مولانا اشرف علیؒ کے خلیفہ مولانا ظفر عثمانی نے تحریر فرمایا (ترجمان جلد ۲۶، عدد ۵،۶) کہ ''افسوس مخدوم زادۂ بزرگ (حکیم عبدالرشید) نے تصورِ شیخ کا جو مطلب سمجھا ہے اسی کی وجہ سے تو محققین نے اس کی تعلیم

موقوف کی اور اس کو مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْ اَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُوْنَ (کیا ہیں یہ مورتیاں جن کے آگے تم جھکے ہوئے ہو) کا مصداق بتایا ہے۔ اس مسئلہ میں جو کچھ آپ کے رسالے (ترجمان القرآن) میں لکھا گیا ہے میں اس کی تائید کرتا ہوں''۔

اب کیا دیکھتا ہوں کہ ''الفرقان'' صفر و ربیع الاول ۱۳۷۱ھ میں مولانا منظور نعمانی صاحب، مولانا اصلاحی کے نام ایک مفصل خط لکھتے ہیں، مولانا نعمانی پہلے جماعت اسلامی میں تھے پھر خدا جانے خود نکلے یا کیا؟ بہر حال! اب مخالفین میں ہیں۔ اس خط میں جہاں آپ نے یہ لکھا کہ جماعتِ اسلامی کے خلاف فتوے دینے والے لوگ بھی اگرچہ نفسانیت کی بیماری میں مبتلا ہیں؛ لیکن آپ لوگ (جماعتِ اسلامی والے) تو بہت ہی گمراہ ہو گئے، آپ نے اُس تصورِ شیخ کو جو اہلِ سلوک کا معمول ہے مشابہ بالشرک قرار دے کر سارے نقشبندیہ کو شرک کے گھاٹ اُتار دیا اور گویا بڑے بڑے اکابر کو مشرک ٹھیرایا۔ مولانا منظور نعمانی کا یہ خط کافی طویل ہے اور سخت سُست پر مشتمل ہے۔

مجھے اس خط نے متعدد وجوہ سے حیران کر دیا۔ ایک تو یہ کہ مولانا امین احسن اصلاحی نے تصورِ شیخ کی جس تعبیر کو مشرکانہ لکھا تھا وہ تو بالیقین مشرکانہ ہے ہی اور مولانا ظفر احمد عثمانی نے بھی مولانا امین احسن کی کھلی تائید کی ہے دوسرے یہ کہ کسی فعل کے مشابہ بالشرک ہونے کا مطلب یہ لے لینا کہ اس کے مرتکب و فاعل کو آئینی الفاظ میں مشرک ٹھیرا دیا گیا۔ کم سے کم کسی باہوش عالم کا کام تو نہیں ہوسکتا۔ نہ صرف یہ کہ مولانا شہید نے ''ایضاح الحق الصریح'' میں بڑی تفصیل سے یہ بات ثابت کی ہے کہ کسی شخص کے کسی فعل کو مشرکانہ یا مبتدعانہ قرار دینے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ اُسے مشرک اور مبتدع ٹھیرایا جا رہا ہے؛ بلکہ متعدد حدیثیں وضاحت کے ساتھ اس حقیقت پر دال ہیں اور مولانا نعمانی نہ شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات سے بے خبر ہوں گے نہ حدیثوں سے۔

تیسرے یوں کہ مولانا منظور نعمانی نے الفرقان ذی قعدہ ۱۳۷۰ھ میں شاہ اسماعیل شہید کی تصنیف ''صراطِ مستقیم'' کی بہت تعریف لکھی تھی اور اسے تصوف کی بلند درجہ کتاب مانا تھا۔ واضح رہے کہ ''صراطِ مستقیم'' اصل میں حضرت سید احمد شہید کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے حضرت اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحیٔ نے باہمی تعاون سے مرتب کیا ہے اس کتاب میں کیا دیکھتا ہوں کہ تصورِ شیخ کے موضوع پر مستقل بحث ہے اور مولانا امین احسن اصلاحی سے کہیں زیادہ شدت اور صراحت اور اصرار کے ساتھ تصورِ شیخ کی قباحت بیان ہوئی ہے اور اس کے فاعل اور معلم کو آثم و گناہ گار ٹھیرایا گیا ہے، جس کا جی چاہے آج بھی اس کتاب کو دیکھ سکتا ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہا گیا ہے کہ ''تصورِ شیخ'' بدعت اور قبیح و شنیع ہے؛ بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو اپنی قوم سے کہا تھا کہ: مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْ اَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُوْنَ تو مورتیوں اور تصویروں کے آگے جھکنے

سے بھی زیادہ خراب اور بُرائی کی تاثیر رکھنے والا ''تصور شیخ'' ہے تصاویر کی پوجا کی طرح اسے بھی یقیناً حرام ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہا گیا کہ ''جو کوئی پیغمبر ﷺ کی سیرت سے بخوبی آگاہی رکھتا ہے وہ جان لے گا کہ اگر اُس متبرک زمانہ میں اس امر کا (تصور شیخ کا) فتویٰ لیا جاتا تو آپ ﷺ لازماً اس سے منع فرما دیتے اور اس کی حرمت ظاہر ہو جاتی''۔

یہ ارشادات گویا شہیدینؒ کے ہیں۔جس کتاب میں ہیں اس کی تعریف بھی مولانا منظور نعمانی فرماتے ہیں اور کیسے نہیں فرمائیں گے۔کون صحیح العقیدہ مسلمان ہے جو شہیدین کی عظمت و ولایت کا منکر ہو؛ لیکن تصور شیخ کے بارے میں اس میں جو کچھ لکھا گیا وہ مولانا امین احسن کی تحریر سے کئی گنا سخت اور صریح ہونے کے باوجود مولانا منظور کے نزدیک برحق ٹھیرا اور مولانا امین احسن گمراہ و گستاخ ہوئے، حالانکہ صراحت و شدت کے علاوہ ایک بیّن فرق یہ بھی تھا کہ شہیدین نے تو ایک سرے سے ''تصور شیخ'' ہی کو بہر عنوان ممنوع و حرام اور مشرکانہ قرار دیا ہے اور مولانا امین احسن نے علی الاطلاق ایسا نہیں کیا؛ بلکہ جو تعبیرات و توجیہات مولانا عبد الرشید گنگوہیؒ نے پیش کیں، صرف اُن کا رد کیا۔

مولانا مودودی نے اس بحث میں کتنا معتدل طرز اختیار کیا اسے بھی مختصراً سن لیجیے۔مولانا ظفر تھانویؒ کے جس خط کا اوپر ذکر ہو چکا ہے اسی میں انھوں نے عبد الرشید صاحب کی تعبیر کو گمراہ کن قرار دے کر یہ تعبیر بیان فرمائی کہ اصل میں تصور شیخ اس لیے اختیار کیا گیا کہ انسان کے اندر جو مختلف قسم کی محبتیں زر، جاہ، اولاد وغیرہ کی پائی جاتی ہیں ان کو ایک ایک کر کے نکالنا ذرا دشوار ہے، لہٰذا شیخ تمام محبتوں کو ''محبت شیخ'' میں مرکوز کر لیتا ہے۔اور اس کے بعد محبتِ شیخ نکال کر اللہ کی محبت جاگزیں کرتا ہے۔

یہ توجیہ بھی مجھ عاجز کے نزدیک قباحت سے خالی نہیں اور مولانا امین احسن اصلاحی بھی اسے پہلی توجیہ سے کم غلط نہیں مانتے؛ لیکن مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ:

> ''تصور شیخ کی جو تعبیر آپ نے پیش فرمائی ہے اس پر کسی اعتراض کی گنجائش نہیں، تدبیر کی حد تک اسے مباح مانا جائے گا، اگر آدمی اس نیت سے اس تدبیر کو اختیار کرے جو آپ نے بیان فرمائی ہے''۔ (ترجمان: ج ۲۶، عدد ۵-۶)

اسے چھوڑیے کہ مولانا مودودی نے صلح پسندی اور حق پرستی کے جذبے میں نرمی اختیار فرمالی ورنہ ان کا معجز بیان قلم اس ظاہر فریب تعبیر کی دھجیاں بکھیر سکتا تھا۔حیرت تو اس پر ہے کہ مولانا منظور نعمانی ''صراطِ مستقیم'' کو بلند درجہ کتاب مانتے ہیں، گویا اسے پڑھ چکے ہیں۔اسی میں ''تصور شیخ'' کو شدت اور صراحت کے ساتھ بت پرستی سے بدتر، قبیح، ممنوع قابل ترک بدعت قرار دیا گیا تو انھیں ذرا بُرا نہیں لگا۔علاوہ ازیں ابن کثیر سورۂ کہف کی آخری

آیت کے ذیل میں لکھ چکے ہیں کہ بعض علماء نے ''تصورِ شیخ'' کو مشرکانہ فعل قرار دیا ہے اور ان کے دلائل بہت جلی اور مضبوط ہیں اس پر بھی غیض وغضب نہیں فرمایا گیا؛ لیکن جماعتِ اسلامی کے اکابر نے واضح دلائل کے ساتھ اس پر محتاط اور سنجیدہ ونرم بحث کی تو اولیاء وصوفیا کی عظمت واحترام کا پہاڑ مولانا نعمانی کے حق پرست دل ودماغ پر ٹوٹ پڑا اور لطف یہ کہ تصورِ شیخ کی طرفداری میں دلیل ایک بھی نہیں دیتے۔ محض یہ فرماتے ہیں کہ فلاں بزرگ اس کے قائل تھے فلاں ولی اس پر عامل تھے وغیرہ گویا بات جو کفارِ عرب کہا کرتے تھے کہ مَاوَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا۔ مولانا مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی تو بہت بڑے عالم و دانشور ہیں۔ میں راقم الحروف ناہیچ و بے علم خود کو حضرت اسماعیلؒ اور حضرت سید احمد کے وکیل کے طور پر تصورِ شیخ کے معاملہ میں برسرِعام پیش کرتا ہوں اور یہ اعلان کرتا ہوں کہ عصرِ حاضر کے تمام اساطین علم وتقویٰ اور جبالِ دین و دانش قرآن وسنت کو بنیاد تسلیم کرکے یہ مقدمہ لڑلیں، ان شاءاللہ ثم ان شاءاللہ ایک ہی دو پیشیوں میں ان کی زبانیں گنگ اور قلم شکستہ ہوجائیں گے۔ اس دعوے میں کوئی تکبر نہیں ہے؛ بلکہ اس کی محکمی تو اصل میں قرآن وسنت کی محکمی پر ہے اور قرآن وسنت خدا کا شکر ہے کسی کی جائداد نہیں ہیں۔

کہاں تک بیان کروں مثالیں بہت ہیں؛ مگر بہ نظرِ اختصار اتنے ہی پر بس کرتے ہوئے اب آپ کو یہ بتاؤں کہ میں نے صرف تحریروں تک اپنی کوشش محدود نہیں رکھی؛ بلکہ عاجز آکر بعض معترض علماء کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ سب میرے اساتذہ میں سے ہیں اور انھیں کے سایۂ عاطفت میں میں نے دارالعلوم کی سند حاصل کی ہے۔ بڑے خلوص اور ادب سے دریافت کیا کہ مجھے متعین کرکے وضاحت سے بتایا جائے کہ مولانا مودودی کے کن دعووں اور نظریوں کو آپ ہمارے اسلاف کے اُصول ونظریات کے خلاف بتاتے ہیں اور کن بنیادوں پر گمراہی کے فتوے دیتے ہیں۔ ایک ایک صحبت کی تفصیل میں تو بات لمبی ہوجائے گی مختصر یہ ہے کہ جواب اس نوعیت کے ملے۔

''مودودی مہدی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا کرنے والا ہے''، ''مودودی صحابہ کو کچھ نہیں سمجھتا''، ''مودودی خوارج کی طرح مرتکب کبیرہ کو کافر ٹھیراتا ہے''، ''مودودی احسان وتصوف کا منکر ہے''۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ ان شدید الزامات کے لیے جب دلائل مانگے تو سوائے مہملیات کے اور کچھ نہ ملا؛ بلکہ یہاں تک معلوم ہوا کہ ان میں سے کسی اللہ کے بندے نے نہ تو مولانا مودودی کی چند تصانیف پڑھی ہیں نہ اُنھیں پتا ہے کہ ان کی دعوت کیا ہے۔ نہ یہ اپنی خرافات کے جواب میں کسی کی کچھ سننے کو تیار ہیں۔ حالت بالکل ایسی ہے جیسے بعض خاندانوں میں کسی خاص معاملہ پر باہم دشمنی بندھ جاتی ہے اور پھر یہ دشمنی نسلاً بعد نسل چلتی ہے حتیٰ کہ بعد کی نسلوں کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا کہ ہم کیوں فلاں خاندان سے دشمنی رکھ رہے ہیں، بس ایک روش ہے جو روایتاً چل رہی ہے۔ عقل وانصاف سے بے پروا- انسانیت سے بے گانہ- علمی ثقاہت سے معرّا- شرافت ونجابت سے خالی۔

یہ تھی میری اُس پیشین گوئی کی بنیاد جو آخر کار پوری ہوئی۔ میں نے پوری بصیرت اور آزمائش کے بعد جو اندازہ کیا تھا وہ صحیح نکلا۔ اب میں صرف یہ کہہ کر اس تمہید کو ختم کر دوں گا کہ علماء ے موجود میں جو گنتی کے چند لوگ واقعی خلوص کے ساتھ مخالفت کر رہے ہیں ان کی مخالفت جہاں اس بات پر مبنی ہے کہ انھوں نے ملکی سیاست میں ایک ایسی راہ کو اپنایا ہے جسے جماعتِ اسلامی قرآن وسنت کی مضبوط دلیلوں سے باطل قرار دیتی ہے وہیں مختلف اسباب کی بنا پر ان کے قلوب میں جماعت اور مولانا مودودی کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں جاگزیں ہوگئی ہیں۔ انھوں نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ ان غلط فہمیوں کے تجزیہ پر اپنا قیمتی وقت صرف کریں۔ غلط فہمی ایک تخم کی حیثیت رکھتی ہے جو اگر پانی اور گرمی پاتا رہے تو درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ہر بڑے آدمی کی طرح اِن بزرگوں کے بھی کچھ حواری اور معتقدین ہیں جو برابر پانی اور گرمی کا انتظام فرماتے رہے اور یہ تخم درخت بن گیا۔ علاوہ ازیں عبادت وعلم کے باوجود ان بزرگوں میں یہ احساس شعوری یا غیر شعوری طور پر پایا جاتا ہے کہ ہم کاملین میں سے ہیں اور ہم سے فکر ونظر یا علم وعمل کی غلطی صادر نہیں ہوسکتی۔ اس احساس کو ظاہر ہے کہ یہ زبان سے تو ظاہر نہیں کرتے؛ لیکن ان کا اُسوہ اور طریقہ متعدد شہادتیں اس احساس کی موجودگی پر فراہم کرتا ہے۔ ''انا'' بہت بُری چیز ہے۔ اس انا نے یہ غضب ڈھایا کہ اگر کہنے سُننے پر ان حضرات نے مولانا مودودی کی کوئی تصنیف دیکھی بھی تو ایک طرف یہ خود کو کاملیت اور افضلیت کی اُس بلندی پر متمکن خیال کرتے رہے جہاں یہ فی الحقیقت نہیں تھے، دوسری طرف انھوں نے مولانا مودودی کو اُس سطح سے بہت نیچے گمان کیا جس سے کہیں زیادہ بلند وہ فی الحقیقت ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ منصفانہ فیصلہ پر وہ پہنچ ہی نہیں سکتے تھے۔ حیرت کی انتہا ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا مودودی کی بعض ان عبارات تک پر انھوں نے بے طرح اعتراضات کیے جو بس الفاظ کی حد تک مولانا کی تھیں اور ان کے معانی تمام تر شاہ ولی اللہ یا ابن تیمیہ یا امام احمد ابن حنبل یا مجدد الف ثانی یا امام ابو حنیفہ یا ابراہیم نخعی رحمہم اللہ کے تھے۔ کیا ہم یہ کہیں کہ ہمارے یہ صفِ اوّل کے بزرگ اسلاف کے خیالات وملفوظات سے بے خبر تھے۔ نہیں یہ بات نہیں؛ بلکہ یا تو کبھی ان کی غلط فہمیوں کے گھنے درخت نے ان کی نگاہ سے اسلاف کے ملفوظات کو ہنگامی طور پر چھپا دیا۔ یا پھر انھوں نے چونکہ مولانا مودودی کو اپنے خیال میں بڑی نیچی سطح پر رکھا تھا؛ اس لیے اُن کے قلم سے انھیں وہ باتیں پسندیدہ نہیں معلوم ہوئیں جو بلند سطح والے اسلاف پیش فرما چکے تھے۔ اس کے علاوہ چونکہ ''انا'' کے نتیجہ میں انسان کے اندر ایک جھوٹی وضع داری اور جمود پیدا ہو جاتا ہے؛ اس لیے اپنی کسی رائے سے ہٹنے اور مقابل کی کوئی بات تسلیم کرنے میں وقار کا سوال آڑے آیا۔ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا.

مولانا مدنیؒ کے معمولات

جو لوگ مولانا مدنی کی بزرگی کے بہت معتقد ہیں اور کسی دلیل سے ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا ایک غلط بات پر اَڑے رہ سکتے ہیں، انہیں ٹھنڈے دل سے مولانا مدنی کی زندگی اور معمولات پر غور کرنا چاہیے، ہر قریب سے دیکھنے والا جانتا ہے کہ مولانا کے شب و روز کس قدر مصروفیت میں گزرتے ہیں۔ ایک طرف درسِ بخاری کا یہ عالم کہ اوقاتِ مدرسہ کے علاوہ فجر کے متصل بعد بھی ہے اور رات کو عشاء کے بعد بھی بارہ بجے تک اور اکثر عصر کے بعد بھی درس دیتے ہیں۔ علاوہ اس کے بے حد مہمان نواز ہیں۔ ہمیشہ آپ کے یہاں مہمانوں کی کثرت رہتی ہے۔ مدرسہ سے گھر آئے تو مہمان نوازی کے فرائض وقت کو گھیر لیتے ہیں۔ پھر عبادات کا یہ عالم کہ اوقاتِ خمسہ میں تو نماز پورے سکون و طمانیت سے اپنی شانِ بزرگانہ کے مطابق ادا فرماتے ہی ہیں۔ اشراق، صلوٰۃ اوّابین اور تہجد بھی شامل معمولات ہیں۔ اور تلاوتِ قرآن اور تسبیحات و اذکار، اس کے علاوہ ہیں۔ جس کا جی چاہے آکر دیکھ لے۔ ان کے اوقات کا ایک لمحہ بھی مصروفیت سے خالی نہیں۔ ایسی حالت میں اگر مفاد پرست حواریین اور ناخدا ترس خدّام موقع بموقع سو فیصد غلط باتوں سے کان بھرتے رہیں کہ حضرت! مودودی صاحب نے تو بخاری کی صحت سے انکار کر دیا، ظہور مہدی کو جھوٹ قرار دے دیا، متعہ کو جائز بتلا دیا، مردار کو حلال کہہ دیا وغیر ذالک۔ تو بتائیے، مولانا کے دل و دماغ کیوں کر غلط اثر قبول نہ کریں۔ انھیں اتنی کہاں فرصت کہ ہر بات کی تصدیق کے لیے مولانا مودودی کی اصل تصانیف دیکھیں۔ یا اگر کبھی دیکھنا ضروری بھی سمجھا تو پہلے سے نصب شدہ بدگمانی اور سوءِ ظن کے ہوتے ہوئے کہاں آسان تھا کہ یہ جزوی مطالعہ عادلانہ و غیر جانبدارانہ فیصلے پر پہنچا سکتا۔ یہی وجہ ہوئی کہ وہ جماعتِ اسلامی کی مخالفت میں شدید ہوتے گئے اور مولانا مودودی کی بعض صحیح ترین عبارتوں کا مطلب بھی اتنا غلط لیا کہ شاید ہی کسی اور پڑھنے والے کے دماغ میں بھولے سے اس کا وہم بھی گزرا ہو۔ اب معتقدین ایمانداری کے ساتھ فیصلہ فرمائیں کہ فتنہ پرداز حواریین نے کس طرح ان کی عمدہ ترین صلاحیتوں کو اپنی قبیح ترین غرض مندیوں کے جال میں پھنسا کر فتنہ پیدا کیا ہے اور ایک مخلص مجاہدِ حق کو فریب کا شکار کر کے غلط راستے پر ڈالا ہے۔ حقیقت میں مولانا مدنی اس سے بہت بلند ہیں کہ کسی بات کو خلافِ حق سمجھنے کے بعد بھی اس پر جمے رہیں؛ لیکن اسے کیا کیجیے کہ افترا پرداز لوگوں اور ماحول و احوال کے مشترکہ عوامل نے انھیں غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط سمجھنے پر بلا ارادہ آمادہ کر دیا ہے۔

(یہاں مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے استاذ کے احترام میں حد درجہ نرمی و خوش گمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ باتیں لکھی ہیں؛ لیکن نسلاً بعد نسل چلی آرہی مخالفت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مولانا مدنی کی مخالفت خالص بدگمانی پر مبنی نہیں تھی؛ بلکہ اس میں کافی حصہ سیاست کا بھی تھا جس کا ذکر ہم نے زیر مطالعہ کتاب میں بار ہا کیا ہے۔ (ابو عکاشہ رحمٰن))

عبرت ناک

ہمارے علماء زبان وقلم سے دعویٰ کرتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی کی مخالفت وہ نہایت خلوص سے صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ ان کے خیال میں اسلامی جماعت مسلمانوں کو گمراہ کر رہی ہے اور بحیثیت خادمِ دین کے اُن کا فرض ہے کہ مسلمانوں کو گمراہی سے بچانے کی کوشش کریں۔ یہ دعویٰ کس قدر ہوائی اور مضحکہ خیز ہے اس کا اندازہ اوّل تو ہر شخص جماعتِ اسلامی کو قریب سے دیکھ کر کر سکتا ہے کہ اس کے افراد اپنے کردار و اخلاق اور عبادت وتقویٰ کے لحاظ سے کتنے ممتاز ہیں دوسرے معاشرے میں پھیلی ہوئی بے شمار خرابیوں اور بے دینیوں کی طرف سے علمائے موجود کا سکوت؛ بلکہ بعض حالتوں میں گمراہیوں کی ہمت افزائی ظاہر کرتی ہے کہ باطل کی نفرت اور حق کی محبت ان کے قلوب میں بس برائے نام بطورِ روایت ہی رہ گئی ہے۔ سچ مچ اگر انھیں امتِ مسلمہ کی کچھ دینی فکر ہوتی تو تنہا جماعتِ اسلامی ہی سے جنگ کرنے پر بس نہ کرتے؛ بلکہ قدم قدم پر مختلف خیمہ ہائے باطل نصب ہیں۔ ان کی طرف بھی توجہ فرماتے۔ کم سے کم اپنے سرکاری آرگن الجمعیۃ کو تو معموں اور تصویروں اور عرسوں کے اشتہارات سے ناپاک نہ ہونے دیتے۔ اندازہ فرمائیے اِس جرأت علی المعصیت کا، بے خوفی کا، بے حسی کا، علماء کی شان تو یہ تھی کہ وہ اُس راستے سے بھی نہ گزریں جس سے گزرنے میں ان کی جانب کسی معمولی سی معصیت کا بھی شبہ ہوسکتا ہے۔ تقویٰ کی ابتدا ہی ہر چھوٹی بڑی معصیت سے کامل اجتناب کے بعد ہوتی ہے؛ لیکن یہاں جسارت اور اصرارِ گناہ اور تمکین علی المعصیت کا یہ عالم ہے کہ چند ٹکوں کی خاطر کھلے بندوں معموں اور تصویروں اور عرسوں کے اشتہار شائع کیے جاتے ہیں۔ گویا جن مسلمانوں میں ان چیزوں کی قباحت وشناعت کا کچھ احساس باقی رہ گیا ہے ان کو بھی دعوت دی جارہی ہے کہ جس چیز سے پیسہ ملے وہ دھڑلے سے کرو۔ بلاخوفِ دنیا و آخرت کرو۔ اگر اب کوئی اور مسلمان اپنے اخبار یا رسالے میں ننگی تصویریں شائع کرنے لگے اور یہ عذر کرے کہ اس ذریعہ سے میرا رسالہ چلتا ہے تو علمائے موجود کے نزدیک وہ حق بجانب ہوگا۔

حق کی محبت اور باطل کی نفرت جس چیز کا نام ہے اس کے باب میں تو ہمارے علمائے موجود کا حال آپ پر اب تک کی تحریر سے کافی واضح ہو گیا ہوگا؛ لیکن میں متعین مثالیں اور دیتا ہوں جن سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے وہ علمائے موجود جو خود کو ''علمائے دیوبند'' کہہ کر اصلی علمائے دیوبند رحمۃ اللہ علیہم کو سرِ بازار رُسوا کر رہے ہیں حق کے معاملہ میں کس قدر بے پروا ہو چکے ہیں اور جماعتِ اسلامی کی مخالفت یا درس گاہوں کی مدرسی کے علاوہ ان کے نزدیک اجتماعیات میں حق و باطل کا کوئی وجود ہی نہیں رہا ہے۔

دیوبند میں بدعات

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ جو دیوبند ردِّ بدعت میں مشہور ہے اور جس کا نام ہی قبر پرستی، میلاد اور قوالی

وغیرہ کی حرمت و قباحت پر دال سمجھا جاتا ہے اُسی دیوبند میں اب ربیع الاوّل کے مہینہ میں آپ جگہ جگہ میلاد کی محفلیں دیکھیں گے۔ اور بہت سی قبروں پر جمعرات کو چراغ اور اجتماعی معتقدین کا نظارہ فرمائیں گے اب سے دس سال پہلے یہ حال تھا کہ دیوبند بھر میں صرف ایک مزار ایسا تھا جس پر کچھ معمولی سی رسمیں کبھی کبھی نظر پڑ جاتی تھیں اور وہ بھی ڈھکے چھپے؛ لیکن اب یہ حال ہے کہ کتنی ہی پُرانی قبروں کو یارلوگوں نے مرمت کر کے زیارت گاہ بنالیا ہے اور جمعرات کو چراغ جلتے ہیں، زائرین نذر و نیاز لاتے ہیں، گاہے گاہے قوالیاں بھی ہوتی ہیں اور چادریں بھی چڑھتی ہیں؛ نیز کلیری خواجہ کے سالانہ عرس میں دیوبند سے جانے والوں کی تعداد ہر سال بڑھتی جارہی ہے۔

کیوں؟ صرف اس لیے کہ ہمارے علمائے دیوبند معاشرے کے معاملہ میں اپنی دینی ذمہ داریوں کو فراموش کر چکے ہیں۔ وہ صرف اُنھیں اُمور کو ضروری سمجھتے ہیں جن کا تعلق ان کی اپنی ذات سے ہے۔ یا جن کو اختیار کرنا اپنی ظاہری پوزیشن اور منصب کے اعتبار سے ضروری ہے، بس۔ اس کے بعد یا تو ان کی جدوجہد کا سمندِ ناز سیاسی میدانوں میں دوڑتا ہے یا جب کوئی سکنڈ کلاس کا کرایہ دے کر بُلا لیتا ہے تب وعظ و تبلیغ کرنے چلے جاتے ہیں۔ دیوبند کی جامع مسجد میں اگر وہ سال میں ایک دو بار بھی محض اللہ کے لیے تکلیفِ وعظ فرمالیا کرتے اور حاضرین کو بتاتے کہ بھائی قبر پرستی اور میلاد خوانی جیسی پہلے ممنوع تھی ویسی ہی اب بھی ہے تو یقیناً یہ موجودہ صورتِ حال پیدا نہ ہوتی؛ کیونکہ اہلِ دیوبند بریلیوں کی طرح کسی رضا احمد خاں کے متبع نہیں ہیں، کہ دیوبندی علماء کی بات نہ مانتے؛ بلکہ وہ تو آج بھی شیخ الہندؒ اور مولانا محمد قاسمؒ اور مولانا اشرف علیؒ کے ناموں پر فدا ہیں؛ لیکن دسیوں سال پہلے سُنے ہوئے وعظ ان کے حافظوں میں نہیں رہے اور اتنا علم بھی انھیں نہیں ہے کہ کتابیں دیکھ کر حق و باطل کو پہچانیں؛ لہٰذا وہ تو بدعات و معصیات کی طرف نہایت صدق دلی سے کارِ خیر سمجھ کر جارہے ہیں اور چونکہ انھیں علماء کی طرف سے ٹوکا نہیں جارہا؛ اس لیے اور بھی زیادہ اپنی روِش کو صحیح تصور کرتے ہیں۔

دیوبند کی جامع مسجد

دوسری مثال علمائے موجود کے جمود اور بے حسی کی یہ ہے کہ دیوبند کی جامع مسجد میں تقریباً تین سال ہوئے کچھ مرمّت کا کام شروع ہوا تھا۔ مسجد چونکہ غریب ہے؛ اس لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ بازار کے مسلمان دوکانداروں سے تھوڑا تھوڑا چندہ لیا جائے۔ اس کے لیے سوراخ دار صندوقچیاں بنوائی گئیں اور بہت سے سعادت منداس پر تیار ہوگئے کہ روزانہ دوکانداروں سے اس میں ان کے حسبِ گنجائش آنہ دوآنہ ڈلواتے رہا کریں۔ ضروری مرمّت بہت معمولی سی تھی خیال تھا کہ چند ہفتوں میں پوری ہوجائے گی؛ لیکن خدا جانے کن لوگوں نے مرمت کے علاوہ مسجد کی تزئین وزیبائش کالمبا چوڑا پروگرام بنایا اور اس پروگرام کے تحت دونوں بڑے میناروں پر ہمیشہ کی طرح صرف چونا

کرانے پر بس نہیں کیا گیا؛ بلکہ باریک کام کے بے شمار لہریئے اور پھول پتّی بننے شروع ہوئے۔ یہ خلافِ شرع عمل متعدد قباحتوں پر منتج ہوا۔ ایک تو یہ کہ روپیہ وافر نہ ہونے کی وجہ سے ایک ہی دو کاریگر کام کر سکے اور مینار کافی بلند ہیں جس کی وجہ سے کتنے ہی مسلمان گھروں میں عرصۂ دراز تک عورتوں کا صحن میں نکلنا مشکل ہو گیا اور مستقلاً پردہ ایک عذاب بن گیا۔ دوسرے یہ کہ دوکاندار چندہ دیتے دیتے عاجز آ گئے اور واضح طور پر یہ صورت نظر آنے لگی کہ اب چندہ اللہ کے لیے نہیں؛ بلکہ ظاہری لحاظ و مروّت کے لیے بادلِ ناخواستہ دیا جا رہا ہے۔ ہمارے علمائے دیوبند اگر معاشرے کے متعلق اپنی ذمہ داریوں کا احساس رکھتے تو بڑی آسانی سے وہ پہلے ہی دن اہلِ دیوبند کو بتا سکتے تھے کہ یہ غیر ضروری آرائش و زیبائش جہاں عوام الناس کے لیے متعدد پریشانیوں کا باعث ہے وہاں شرعاً بھی جائز نہیں ہے۔ اس فہمائش کو اہلِ دیوبند ضرور مانتے اور انھیں ماننا ہی پڑتا؛ کیونکہ مسجد کسی کی ذاتی ملکیت نہیں تھی۔ اس کی ولایت اور انتظام کا سب سے زیادہ حق علماء ہی کو تھا؛ مگر علمائے کرام ذرا بھی متوجہ نہ ہوئے اور مینا کاری کا معاملہ آگے بڑھتا رہا۔ میناروں کے بعد در و بام کا نمبر آیا اور دیوبند کی سرزمین پاک کی جامع مسجد میں علماء کی آنکھوں کے سامنے مسلمان اور ہندو دونوں طرح کے کاریگر محرابوں، دروں اور دیواروں پر امام باڑوں اور درگاہوں اور آرٹ گیلریوں جیسی رنگین گل کاریاں کرتے رہے۔ نہ صرف کرتے رہے؛ بلکہ آج بھی کر رہے ہیں۔ جس کا جی چاہے دیوبند آ کر دیکھ لے۔ ”مرنے کو جی چاہے کفن کا ٹوٹا“ کے مصداق گلکاریوں کے لیے فالتو پیسہ تو ہے نہیں ایک آدھ کاریگر اونگھتا ہوا مل جائے گا اور وہ بھی دن بھر میں بہ مشکل جمع ہونے والے چند روپوں کے سہارے پر۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک محراب جب ”بیلدار“ ہو پاتی ہے تو پارسال اور تیسرے سال کی ہوئی نقش کاری پرانی اور ماند ہو چکتی ہے۔

عبرت فرمائیے۔ کیا ہمارے علماء اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ مسجدوں کو امام باڑہ بنانا اور ان میں غیر ضروری زیب و زینت کرنا ایک دو نہیں دسیوں حدیثوں کی رو سے منع ہے اور قرآن نے اسراف کرنے والوں کو شیطان کا بھائی بتایا ہے۔ نہیں، ہمارے علماء بے خبر نہیں تھے۔ اور حضرت مولانا مدنی یا حضرت مولانا طیب صاحب یا دیگر اساتذۂ دارالعلوم اگر جامع مسجد میں ایک دو بار معقولیت اور دلیل کے ساتھ لوگوں کو حکمِ شرعی بتا دیتے تو مجال نہیں تھی کہ بے شعور و بے علم لوگوں کا بنایا ہوا منصوبۂ زیبائش روبہ عمل آتا؛ مگر وہ کیوں زحمت کرتے، ان کی بلا سے، دنیا میں کچھ ہوتا رہے۔ وہ صرف اُن معاملات میں بولیں گے جن سے ان کی موجودہ پُرسکون زندگی اور معمولات میں خلل واقع ہوتا ہو یا جن سے انھیں شہرت و عزت کا کوئی نفع حاصل ہوتا ہو یا جن سے ان کے کسی جذبۂ نفس کی تسکین ہوتی ہو۔ شاہ اسماعیل شہید یا مولانا انور شاہ یا مولانا محمد قاسم رحمہم اللہ کی طرح وہ اس کھٹ راگ میں نہیں پھنستے، کہ لوگوں کی مخالفت مول لیں اور باطل کے آگے پہاڑ کی طرح ڈٹ جائیں۔ مولانا مدنیؒ بے شک ایک بے خوف بہادر اور حق کوش سپاہی رہے ہیں؛ لیکن محسوس ہوتا ہے کہ اب ان کا ولولہ سرد

پڑ چکا ہے اور میدانِ عمل کی ساری صلاحیتیں مخالفتِ مودودیت پر سمٹ کر رہ گئی ہیں ورنہ آخر یہ کیا ہے کہ صدرِ جمعیۃ ہو کر وہ اخبار''الجمعیۃ''کو علی الاعلان ارتکابِ معاصی سے بھی نہیں روک سکتے۔امام دیوبند ہو کر وہ قبر پرستی اور میلاد خوانی کا خود دیوبند ہی میں قلع قمع نہیں کر سکتے۔وَاِنَّ ھٰذَا لَشَیْئٌ عُجَاب.

دیوبند کی عیدگاہ

تیسری مثال یوں سمجھیے کہ دیوبند کی عیدگاہ ایک اتنے چھوٹے چبوترے کا نام ہے جس پر نمازِ عید پڑھنے والوں میں سے آدھے افراد بھی مشکل سے آتے ہیں،اس کے صرف سامنے کے رُخ پر دیوار ہے باقی تینوں رُخ احاطے سے بیگانہ ہیں۔آس پاس کچی زمینیں اور کھیت وغیرہ ہیں انھی پر باقی نمازی صفیں قائم کرتے ہیں۔اب آپ کسی نمازِ عید میں شریک ہو کر دیکھیں تو آپ کو یہ ملے گا کہ نہ تو بالعموم صفیں درست ہیں،نہ لاؤڈ اسپیکر ہے(حالانکہ دارالعلوم کی مسجد میں برابر لاؤڈ اسپیکر پر اذان ہوتی ہے)نہ مکبّرین کا انتظام ہے۔امام کی آواز چند صفوں کے بعد کہیں نہیں پہنچ رہی۔پڑھنے والے آگے دیکھ کر تکبیر اور رکوع وسجود کی نقل کر رہے ہیں۔کسی کی ایک تکبیر ہوتی ہے کسی کی دو،کوئی رکوع میں ہے تو کوئی سجدے میں۔اللہ ہی جانتا ہے کتنوں کی نماز صحیح ہوتی ہوگی،علمائے کرام ہر سال میں دو مرتبہ یہ سب حال اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں؛لیکن کیا مجال ہے کہ کبھی اس ابتری کا خیال آیا ہو۔اگر خیال آجاتا تو یہ کچھ مشکل نہ تھا کہ عیدین سے ایک دو روز پہلے جامع مسجد میں جلسۂ عام کر کے عید کی نماز کا طریقہ اور احکام اور خطبہ سُننے کی فضیلت بیان فرما دیں اور چند لوگوں کو مکبّری کی خدمت سونپ دیں اور چند لوگوں کو اس پر متعین کر دیں کہ وہ آغازِ صلوٰۃ سے قبل صفوف درست کرایا کریں۔اس سے کم سے کم نماز کی شکل وصورت تو مسخ ہونے سے بچ جائے گی۔اور یہ تو محسوس ہوگا کہ یہ بھیڑوں کا گلہ نہیں،نمازیوں کا پابند شرائط مجمع ہے۔مگر توبہ،کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔حضراتِ علماء کو تو بس اس سے دل چسپی ہے کہ مولانا مدنی کی خدمت میں پہنچ کر جماعتِ اسلامی کا رونا روئیں اور نئے نئے اعتراضات گھڑیں۔انھیں بہکائیں اور خود بھی بہکیں۔اُن کے نیاز مند ہونے کا ثبوت بہم پہنچائیں اور اس ذریعہ سے مفاداتِ مخصوصہ حاصل کریں۔ (واضح رہے یہ حالات ساٹھ سال پہلے کے ہیں اور مولانا عامر عثمانی کے اس مضمون کے بعد ہی امام کے ذریعہ نماز سے پہلے نماز کا طریقہ بتانے کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔بلاشبہ اس کا ثواب ہمیشہ مولانا عامر عثمانی کو پہنچتا رہے گا۔(ابوعکاشہ رحمٰن))

آمدم برسرِ مطلب:

ایمان وعمل

اس کتاب کی بہت کچھ حقیقت آپ کو اسی شمارے میں شامل مضمون''ایمان وعمل پر تفصیلی نظر''سے معلوم

ہوگی۔ معمولی سابنیادی تعارف میں کراتا ہوں۔ مولانا مودودی نے دسیوں سال ہوئے عوام کو نیک عملی کی طرف مائل کرنے کے لیے کچھ وعظ دیے تھے۔ جنھیں بعد میں کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا۔ ان میں ''حقیقتِ حج'' کے تحت ایک عبارت ہے جس پر مولانا مدنی مدظلہٗ نے مولانا مودودی کو بہت بڑی شرعی گالی دی ہے، یعنی ''خارجی'' ٹھیرایا ہے۔ وہ عبارت یہ ہے:

''رہے وہ لوگ جن کو عمر بھر کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ حج بھی کوئی فرض اُن کے ذمہ ہے۔ دنیا بھر کے سفر کرتے پھرتے ہیں کچھ یورپ کو آتے جاتے حجاز کے ساحل سے بھی گزر جاتے ہیں جہاں سے مکہ معظمہ صرف چند گھنٹوں کی مسافت پر ہے اور پھر بھی حج کا ارادہ تک ان کے دل میں نہیں گزرتا تو وہ قطعاً مسلمان نہیں ہیں، جھوٹ کہتے ہیں اگر اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور قرآن سے جاہل ہے جو انھیں مسلمان سمجھتا ہے''۔

اس عبارت سے مولانا یہ مطلب نکالتے ہیں کہ مولانا مودودی کے نزدیک گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر ہوتا ہے۔ یہ مسلک چونکہ خوارج کا ہے؛ اس لیے مولانا مودودی ''خارجی'' ہوئے۔ اسی پر بس نہیں؛ بلکہ مولانا لکھتے ہیں:

''آج ہندوستان بھر میں مودودی صاحب اور ان کی جماعت بھی یہی عقیدہ رکھتی ہے اور اسی کی تعلیم و تلقین کرتی ہے''۔

اب میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا؛ بلکہ مخالفین سے پوچھتا ہوں کہ جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کے ہزاروں نہیں، لاکھوں صفحات پر پھیلی ہوئی تحریروں میں کہیں ایک جگہ بھی انھوں نے عقیدے کی تلقین و تبلیغ تو کیا ذکر تک پڑھا ہے؟۔ اگر پڑھا ہے تو حوالہ دیا جائے اور نہیں پڑھا ہے تو بتایا جائے کہ مولانا مدنی کے مذکورہ الفاظ سو فی صدی غلط اور افترائے محض کیوں نہیں ہیں؟ پر کا کبوتر تو لوگ بناتے تھے؛ مگر یہاں تو بے پَر کا شتر مرغ بنا دیا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا.

(الحجرات، ع۲)

''اے ایمان والو! گمان بازی کی کثرت سے بچتے رہو، کوئی شبہ نہیں ہے کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور لوگوں کے بھید نہ ٹٹولو''۔

سید الکونین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں:

إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ. (الحديث)

''خبردار! بدگمانی نہ کرو، پس بدگمانی بدترین جھوٹ ہے''۔

گزشتہ پونے چودہ سو سالوں میں علمائے حق کے درمیان ایک بھی ایسی ظن بازی اور تجسس کی مثال نہیں ملتی

جیسی مولانا مدظلہٗ ایمان و عمل میں پیش فرمارہے ہیں۔ظن اور تجسس سے بھی بڑھ کر یہاں تو نری بہتان طرازی اور افترا پردازی ہے۔ظلم و جبر ہے۔خصوصاً اس صورتِ حال پر غور کیجیے کہ مولانا مودودی نے افترا کے جواب میں صاف صاف کہا کہ حضرت میں نے تو بے عمل مسلمانوں کو نیک عملی پر مائل کرنے کے لیے وعظ کہا تھا میرا یہ عقیدہ ہر گز نہیں ہے کہ معصیتِ کبیرہ سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔مولانا مودودی کے جواب کی تفصیل ''ایمان و عمل پر تفصیلی نظر'' میں دیکھ لیجیے۔ان کے صریح و صاف الفاظ یہ ہیں:

''معصیت خواہ کتنی ہی بڑی ہو آدمی کو کافر نہیں بناتی''۔

اس کے باوجود مولانا مدنی اس پر مصر ہیں کہ نہیں تمہارا عقیدہ تو ضرور یہی ہے کہ معصیتِ کبیرہ سے آدمی کافر ہو جاتا ہے؛ بلکہ اس سے بھی زیادہ غلو کے ساتھ وہ فرماتے ہیں کہ ساری جماعتِ اسلامی ہی کا یہی عقیدہ ہے اور اسی عقیدہ کی وہ تعلیم و تلقین کرتی ہے! یرحمہ اللہ حق یہ ہے کہ مولانا مدنی نے مولانا مودودی کی تحریروں کے ساتھ ٹھیک وہی معاملہ کیا ہے جو خوارج و معتزلہ حدیثِ رسول اور کلامِ الٰہی کے ساتھ کرتے تھے؛ بلکہ وہ خوارج و معتزلہ سے بھی زیادہ غلو اور شدت پر عامل ہوئے ہیں، جیسا کہ آگے میں ثابت کروں گا۔

چار مذاہب

فی الحال آپ بطور مقدمہ کلام یہ سمجھ لیں کہ ایمان و عمل کے باب میں بنیادی طور پر چار مشہور مذاہب ہیں:

ایک خوارج کا: وہ کہتے ہیں کہ اعمال جزوِ ایمان ہیں اور جز بھی ایسا کہ صرف ایک ہی جز منتفی ہو جائے تو ایمان منتفی ہو جاتا ہے۔مثلاً نماز چھوڑ دی یا زنا کیا تو کافر ہوا۔یعنی ایک معصیتِ کبیرہ کا ارتکاب کیا تو مومن ملتِ اسلامی سے خارج ہوا۔

دوسرا معتزلہ کا: وہ کہتے ہیں کہ معصیتِ کبیرہ سے ایمان تو بے شک نکل جاتا ہے؛ لیکن کفر میں داخل نہیں ہوتا اور آدمی خُنثیٰ مشکل کی طرح ایمان و کفر کے بیچ میں لٹکا رہتا ہے۔

تیسرا مرجیہ کا: وہ کہتے ہیں کہ ایمان کے بعد عمل کچھ ضروری نہیں عمل کو ایمان سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

چوتھا اہلِ سنت کا: وہ نہ تو معصیتِ کبیرہ کے مرتکب کو ایمان سے نکالتے ہیں نہ مرجیہ کی طرح عمل کو غیر ضروری قرار دیتے ہیں۔اہلِ سنت کے مذہب کی تعبیر میں پھر محدثین و ائمہ کے درمیان دو جماعتیں بن گئیں۔ایک میں امام احمد، مالک، شافعی اور بخاری وغیرہ شامل ہیں۔دوسری میں امام ابوحنیفہ اور دیگر متکلمین۔میں یہاں مسئلہ ایمان و عمل کی بحث لے کر نہیں بیٹھا؛ اس لیے طویل شرح و بیان سے ہٹ کر صرف یہ آپ کو بتاتا ہوں کہ خوارج و معتزلہ کی کوئی کتاب اگرچہ مجھے ایسی نہیں ملی جس میں انھوں نے اپنے عقائد کی

تفصیل بیان کی ہو۔ اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان کی کتابیں ہی دنیا سے مٹ گئیں؛ لیکن علمائے اہلِ سنت نے جو بیشتر کتابیں ان کے رَد میں لکھی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ سیکڑوں واہی عقائد میں گرفتار تھے۔ مثلاً وہ کہتے تھے کہ حضرت علی نعوذ باللہ کافر ہو گئے۔ سَوَّدَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ کے ناپاک الفاظ بھی حضرت علیؓ کے بارے میں انھی کے نکالے ہوئے تھے جس کے مقابلہ میں اہلِ سنت نے کَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ کہنا شروع کیا۔ وہ لوگ کتنے ہی صحابہ کو عیاذاً باللہ کافر کہتے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ انسان اپنے افعال کا خود خالق ہے اور ایسے ہی سیکڑوں غلط در غلط عقائد انھوں نے اختیار کر رکھے تھے جن کے رَد میں امام ابوحنیفہؒ نے اُن سے زبردست مناظرے کیے اور امام شافعیؒ نے انھیں آڑے ہاتھوں لیا اور دیگر علمائے حق نے ان کے بخیے اُدھیڑے جس کے نتیجہ میں تیسری صدی ہجری کے خاتمے تک ان کا زور ٹوٹ گیا اور فتنہ دب گیا۔ کتب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، اور مولانا مدنی کو بھی یہ معلوم ہوگا کہ علمائے حق نے ایسا نہیں کیا تھا کہ خوارج و معتزلہ کے کسی قول یا تحریر سے زبردستی کوئی غلط عقیدہ اخذ کر کے چاند ماری کی ہو؛ بلکہ صورتِ حال یہ تھی کہ خوارج و معتزلہ اپنی تقریر و تحریر میں برملا صراحۃً تکرار کے ساتھ اپنے واہی عقائد کا بیان کرتے تھے اور ان پر دلائل لاتے تھے۔ ان کی صحت پر اصرار کرتے تھے۔ وہ صراحت اور دلائل کے ساتھ کہتے تھے کہ معصیتِ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے۔ یا ایمان سے خارج ہے اور اس عقیدے کے نتیجہ میں جو احکام نکلنے چاہئیں ان کے مطابق فتاویٰ دیتے تھے۔ اُن کا رَد ہی علمائے حق نے اس لیے شروع کیا تھا کہ وہ اپنے باطل عقائد کو کھلے بندوں بیان کرتے، ان کی ترغیب دیتے، ان کا سبق پڑھاتے اور ان کے اثبات میں کتابیں لکھتے تھے۔ یہ میں اپنی طرف سے تخمیناً نہیں کہہ رہا؛ بلکہ میرے بیان پر بے شمار کتابیں شاہد ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

''امام رازی کی ''المحصل''، امام عبدالقادر بغدادیؒ کی ''الفرقُ بین الفِرَق''، ابن عساکر کی ''تاریخ دمشق''، طاش کبریٰ زادہ کی ''مفتاح العادہ''، مقریزی کی ''خطط''، جرجی زیدان کی ''المتمدن الاسلامی''، ابن حزم کی ''المحلّٰی''، تفتازانی کی ''شرح مقاصد''، شہرستانی کی ''المِللُ النّحل''، سید شریف الجرجانی کی ''شرح مواقف''، امام اشعری کی ''الابانہ'' اور ''کتاب کبیر'' اور ''مقالات الاسلامیین''، امام بخاری کی ''تاریخ'' وغیرہم۔

یہ اسمائے کتب میں نے اپنی وسعتِ مطالعہ کا ثبوت دینے کے لیے نہیں لکھے؛ بلکہ ناظرین کو یہ بتانا مقصود ہے کہ میں دینی و علمی اُمور میں صرف تخمین و قیاس سے باتیں نہیں بناتا؛ بلکہ پوری چھان بین سے تحقیق حق کی کوشش کرتا ہوں۔ ہمارے اہلِ حق اسلاف نے کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی کے سر زبردستی باطل عقائد تھوپے ہوں؛ بلکہ مسلمان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ حسنِ ظن اختیار فرمایا جس کی کچھ مثالیں میں آگے دوں گا۔ اور گمراہ و خاطی اُسی وقت ٹھیرایا جب کسی شخص نے وضاحت کے ساتھ اپنا کوئی غلط عقیدہ پیش کیا اور اس پر بضد ہوا۔ مولانا مدنی

اس کے بالکل برعکس مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کے سر ایک سخت مذموم عقیدہ تھوپ رہے ہیں اور اس کے باوجود تھوپ رہے ہیں کہ جماعت کا لاکھوں صفحات پر مشتمل لٹریچر اس عقیدے کی گندگی سے پاک ہے۔ اور مولانا مودودی صریحاً کہہ رہے ہیں کہ ہمارا یہ عقیدہ نہیں ہے۔

خوارج و معتزلہ کا طریقہ یہ تھا کہ آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبوی کو ان کے بالکل ظاہری الفاظ پر محمول کر کے عقیدے گھڑتے تھے۔ ان کے جملہ عقائد پر روشنی ڈالنا تو اس وقت مقصود نہیں صرف زیر بحث مسئلہ میں ان کے طرزِ استدلال کا ذکر کرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو نیک اعمال کی طرف راغب کرنے اور بُرے اعمال سے بچانے کی خاطر ترغیب و ترہیب اور انذار و تہدید کے طور پر (نہ کہ قانونی انداز میں) بہت کچھ فرمایا، مثلاً:

(۱) لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالَّذِيْ يَشْبَعُ وَجَارُهٗ جَائِعٌ إِلٰى جَنْبِهٖ.
''وہ شخص ایمان والا نہیں جو خود تو پیٹ بھرے اور پہلو میں اس کا ہمسایہ بھوکا بیٹھا ہو''

(۲) لَا إِيْمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ.
''اُس شخص میں ایمان نہیں جس میں دیانت نہیں اور اس شخص میں دین نہیں جس میں پاسِ عہد نہیں''۔

(۳) اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ.
''مسلمان وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے عامۃ المسلمین محفوظ و سلامت رہیں''

(۴) لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ نَمَّامٌ.
''چغل خور جنت میں داخل نہیں ہوگا''

(۵) لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا بِاللَّعَّانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا الْبَذِيِّ.
''جو مومن ہوتا ہے وہ نہ تو لوگوں کو طعنے دیتا ہے نہ لعنت بھیجتا ہے نہ فواحشات میں مبتلا ہوتا ہے نہ بدزبانی کرتا ہے''۔

(۶) مَنْ مَشٰى مَعَ ظَالِمٍ لِيُقَوِّيَهٗ وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهٗ ظَالِمٌ فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْإِسْلَامِ.
''جو شخص کسی ظالم کے ساتھ ہوا تاکہ اسے مدد پہنچائے، حالانکہ وہ اس شخص کا ظالم ہونا جانتا ہے تو وہ اسلام سے نکل گیا''

(۷) وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ.
''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم میں سے کوئی بھی ہرگز اُس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کی خواہشات اُس شریعت کی تابع نہ ہوجائیں جسے میں لایا ہوں''

(۸) يَطْبَعُ الْمُؤْمِنُ عَلَى الْخِصَالِ كُلِّهَا إِلَّا الْخِيَانَةَ وَالْكِذْبَ.

''مومن سے ہر خصلت کا جوڑ کھا سکتا ہے؛ مگر خیانت اور جھوٹ کا نہیں۔

(۹) وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ الَّذِيْ لَا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقَهُ.

''قسم اللہ کی نہیں مومن ہوتا، قسم اللہ کی نہیں مومن ہوتا وہ شخص کہ جس کا ہمسایہ اس کی بدی سے مامون ومحفوظ نہ ہو''

(۱۰) لَا يَزْنِي الزَّانِيْ حِيْنَ يَزْنِيْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَسْرَقُ السَّارِقُ حِيْنَ يَسْرَقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِيْنَ يَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ.

''زنا کرتے وقت آدمی مومن نہیں رہتا اور نہ چوری کرتے وقت مومن رہتا ہے اور نہ شراب پیتے وقت مومن رہتا ہے''۔

یہ چند حدیثیں میں نے نقل کر دی ہیں۔ اگر کتب سے انتخاب کیا جائے تو سو سے بھی زیادہ حدیثیں ایسی ملیں گی جن کو اگر ترغیب وترہیب کی بجائے اسلامی قوانین کی تشریح اور افتاء پر محمول کر لیا جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ گناہِ کبیرہ مومن کو ایمان سے نکال دیتا ہے؛ چنانچہ خوارج ومعتزلہ نے ان حدیثوں کے ظاہر الفاظ پر اپنے غلط عقیدے کی بنیاد رکھی۔ اور اُن حدیثوں کو نظر انداز کر دیا جو نجات کے لیے نفسِ ایمان کو کافی ثابت کرنے والی تھیں۔

یہی طریقہ بعینہٖ مولانا مدنی نے مولانا مودودی کی مذکورہ عبارت کے ساتھ برتا ہے۔ ظاہر الفاظ کا اعتبار کر کے ایک عقیدہ بنایا اور اسے جماعتِ اسلامی کے سر مَڑھ دیا؛ بلکہ مولانا مدنی کا طرزِ عمل خوارج ومعتزلہ سے زیادہ غلو آمیز ہے۔ خوارج ومعتزلہ کو اپنے عقیدۂ ضالہ کے لیے ایک دو نہیں سو سے زیادہ احادیثِ نبویہ ملتی تھیں اور خود صاحبِ حدیث صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بقیدِ حیات نہیں تھے کہ انھیں اپنی زبانِ مبارک سے یہ بتا سکتے کہ نادانو! یہ میرے اقوال قانونی اور عدالتی نہیں ہیں۔ ترغیب وترہیب کے لیے ہیں اور میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ گناہِ کبیرہ ایمان کی نفی کر دیتا ہے۔ اس کے برخلاف مولانا مدنی کو اپنے الزام وافترا کے لیے مولانا مودودی کے صرف ایک وعظ سے چند جملے مل سکے ہیں اور خود صاحبِ وعظ برملا کہہ رہا ہے کہ میرا وہ عقیدہ ہرگز نہیں جو آپ ظاہر فرما رہے ہیں! فَاعْتَبِرُوْا يَا أُولِي الْأَبْصَارُ.

حد یہ ہے کہ مولانا مدنی کا طرزِ فکر تو یہاں فرقۂ جہمیہ کے اُن گمراہ ترین لوگوں سے مل گیا ہے جو کہا کرتے تھے کہ ایمان صرف زبان سے آدھا کلمہ ادا کر دینے کا نام ہے خواہ دل میں کچھ ہو۔ ان کی دلیل یہ حدیث تھی کہ:

مَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ مَاتَ عَلٰى ذَالِكَ إِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ.

''جس شخص نے لا الٰہ الا اللہ کہا پھر اسی پر اس کی موت آئی تو وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا''۔

یہ حدیث بخاری ومسلم دونوں میں مذکور ہے۔ اسناد اس کی نہایت صحیح ہیں۔ جملہ محدثین وائمہ اس کی صحت پر متفق

ہیں۔ واقعی اس میں صرف نصف کلمہ ہے اور شہادتِ رسالت کا تذکرہ نہیں۔ نیز قَالَ کہا گیا ہے جس کے معنیٰ صریحاً زبان سے کہنے کے ہیں دل کے یقین کا کوئی اشارہ موجود نہیں؛ لہٰذا دخولِ جنت کی بشارت ثبوتِ ایمان کے لیے کافی معلوم ہوتی ہے، پس مذکورہ افرادِ جہمیہ نے کچھ اور حدیثیں بھی ایسی تلاش کیں جو اس حدیث کی مؤید نظر آتی تھیں اور مستقل عقیدہ بنالیا کہ داخلۂ جنت کے لیے جس ایمان کی ضرورت ہے وہ صرف لا الٰہ الا اللہ زبان سے کہہ دینے پر متحقق ہوجاتا ہے، اب لاکھ سمجھاؤ کہ بھائی تمھیں دھوکا ہوا ارشادِ رسول ٹھیک اپنے لفظی معنیٰ پر مشتمل نہیں ہے؛ بلکہ اور متعدد اقوالِ رسول ہیں جو ایمان کے لیے یقینِ قلبی کو لازمی ٹھیراتے ہیں اور شہادتِ رسالت بھی ایمان کا ایسا جزوِلازم ہے کہ وہ نہ ہوتو ایمان کا وجود ہی نہیں ہوگا؛ مگر توبہ! یہ کیوں ماننے، کہے چلے گئے کہ نہیں صاحب! ہم تو الفاظِ حدیث ہی کی پیروی کریں گے؛ بلکہ اُلٹا صحیحین پر اعتراض جڑ دیا کہ تم لوگ مذکورہ حدیثِ رسول کو ناقص وغلط ٹھیرا رہے ہو۔

اسی طرح مولانا مدنی خطبات کے وعظ ہی کے ظاہری الفاظ پر فتویٰ صادر کرنے کا اصرار کیے جاتے ہیں خواہ مولانا مودودی صراحۃً عقیدۂ زیرِ بحث سے انکار کیے جائیں اور ان کی دیگر سیکڑوں کتابیں اس عقیدے کا رَد کرتی ہوں۔

اور دیکھیے! مولانا مودودی نے جب یہ فرمایا کہ ''میری کتاب خطبات کوئی فقہ اور علمِ کلام کی کتاب نہیں ہے، نہ فتویٰ کی زبان میں لکھی گئی ہے؛ بلکہ یہ ایک وعظ ونصیحت کی کتاب ہے جس سے مقصود بندگانِ خدا کو فرماں برداری پر اُکسانا اور نافرمانی سے روکنا ہے''۔

تو مولانا مدنی اسے تلبیس قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

> ''فتویٰ اور فقہ کی تحریر سے ہمیشہ مقصود لوگوں کو حکمِ خداوندی بتلانا ہوتا ہے اس کے لیے نہ کوئی زبان مخصوص ہے نہ کوئی لہجہ۔ فرماں برداری پر اُکسانا اور نافرمانی سے روکنا۔ یعنی ترغیب وترہیب کے لیے بھی کسی زبان اور طرزِ ادا کی خصوصیت نہیں ہے''۔ (ص/۳۸-۳۹)

جوشِ مخالفت میں مولانا نے یہ ایسی کمزور بات لکھی ہے کہ اس کا رَد کرنا مجھے فہم ناظرین کی توہین معلوم ہوتا ہے۔ کسی معمولی پڑھے لکھے سے بھی پوچھ دیکھئے کہ قانون اور وعظ اور منطق وغیرہ کے نہ صرف لب و لہجے اور اندازِ بیان میں نمایاں فرق ہوتا ہے؛ بلکہ اصطلاحیں تک ہر ایک کی جداگانہ ہوتی ہیں۔ صدہا نظیریں اس کی بآسانی مل سکتی ہیں۔ میں قرآن سے صرف دو نظیریں پیش کروں گا۔

قرآن فتوے اور فقہ کی زبان میں کہتا ہے:

> اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِأَۃَ جَلْدَۃٍ. (سورۂ نور، آیت نمبر ۲، پارہ ۱۸)
>
> ''زنا کرنے والی عورت اور مرد میں سے ہر ایک کے سو کوڑے مارے جائیں''۔

یہ ٹھیک فتوے کی زبان میں ہے۔ کیا کسی دیندار کے لیے ممکن ہے کہ اس میں تاویل کرے یا یوں کہے کہ یہ

محض ڈرانے کے لیے کہا گیا ہے۔ ورنہ سو کوڑے مارنے ضروری نہیں۔ یا سو محض زیادتی کے لیے اِس طرح کہا گیا ہے جس طرح عربی میں بہتّر یا تہتّر کا لفظ کثرتِ تعداد کے لیے بولا جاتا ہے اور گن کر سو مارنے ضروری نہیں؟ ظاہر ہے کہ یہاں ٹھیک ٹھیک وہی مطلب لیا جائے گا جو الفاظ بتا رہے ہیں اور سو کوڑے گن کر مارنا لازم ٹھیرے گا۔

اب دوسری آیت زبانِ فقہ سے ہٹ کر دیکھئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا.

(سورۂ نور، آیت ۳۳، پارہ ۱۸)

"اور مت مجبور کرو اپنی چھوکریوں کو بدکاری پر اگر وہ پاکباز رہنے کا ارادہ رکھتی ہوں، تا کہ کماؤ اسبابِ حیاتِ دنیاوی کے"۔

ظاہر الفاظ اور فقہی اندازِ بیان کا مطلب تو یہاں یہ نکلتا ہے کہ کوئی شخص اگر پیسہ کمانے کے لیے اپنی چھوکریوں سے بدکاری کرانے کا ارادہ کرے تو اسے پہلے ان چھوکریوں سے دریافت کر لینا چاہیے کہ تم طوائف بننا پسند کرتی ہو یا نہیں؟ اگر وہ کہہ دیں کہ نہیں ہم تو بدکاری سے بچے رہنے کا ارادہ رکھتی ہیں تب تو اللہ کا حکم یہ ہے کہ انھیں بدکاری پر مجبور نہ کرو؛ لیکن اگر وہ نیکی کا ارادہ نہ رکھتی ہوں؛ بلکہ بدکاری پر راضی ہوں تو اجازت ہے کہ ان سے پیشہ کمایا جائے!

فرمائیے کیا الفاظِ قرآنی کلامی اور قانونی نکتہ سنجی کی حد تک اسی مفہوم پر دال نہیں ہیں۔ اگر اس آیت کو بھی آیت الزّانیۃ والزّانی کی طرح لفظ بہ لفظ فتوی اور حکم مان لیا جائے تو ساری فقہ کا بیڑا ہی غرق ہو جائے گا۔ تمام علمائے سلف وخلف اور خود مولانا مدنی بھی اسے مانتے ہیں کہ اس آیت میں توجیہ کی جائے گی اور یہ قانونی وفقہی نہیں ہے ترہیب وتنکیر کا ایک جداگانہ انداز ہے اور چھوکریوں کو طوائف کسی حال میں بھی نہیں بنایا جا سکتا۔

دوسری نظیر دیکھئے۔ قرآن کہتا ہے:

اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا. (سورۂ مائدہ، آیت ۳۸، پارہ ۶)

"مرد چور اور عورت چور ہر ایک کے ہاتھ کاٹ دو"۔

یہ ٹھیک فتوے کی زبان ہے۔ اس میں "ہاتھ" کا مفہوم کوئی ایسا نہیں لیا جا سکے گا، جیسا کہ يَدُ اللّٰهِ اور وَجْهُ اللّٰهِ میں اللہ کے ہاتھ اور چہرے کا لیا جاتا ہے۔ نہ اسے اُس محاورہ پر محمول کیا جائے گا جس میں "ہاتھ کاٹ دینے" کا مطلب بے سہارا اور مجبور کر دینا ہوتا ہے؛ بلکہ بلا تاویل چور کے یہی ہاتھ ہتھیار سے کاٹے جائیںگے جو جسم کا جُز ہیں۔

اب یہ آیت دیکھئے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۞ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۞ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ. (سورۂ تین، پارہ ۳۰)

''یقیناً ہم نے انسان کو بہترین انداز ے سے پیدا کیا پھر اسے نیچوں سے نیچے لوٹا دیا؛ لیکن وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمالِ صالحہ سے متصف ہوئے''۔

یہ آیات ایمان وعمل کی اہمیت وعظمت بیان کرنے کے لیے واعظانہ انداز کی آیات ہیں۔ اگر ان کو مولانا مدنی کے دعوے کے مطابق فقہ وقانون اور وعظ وخطابت کے امتیازات نظرانداز کر کے دیکھا جائے تو صراحۃً یہ مطلب نکلتا ہے کہ جو لوگ ایمان لانے کے بعد عمل صالح کے پابند نہ ہوں اور گناہوں میں مبتلا رہیں وہ کافر ہوئے؛ کیونکہ سب سے اسفل سافلین درجہ اہلِ کفر ہی کا ہے اور جن میں ایمان وعمل صالح کی دونوں صفات ایک ساتھ موجود نہ ہوں انھیں قرآن اسفل سافلین ہی میں رکھ رہا ہے۔ تو کیا یہ خوارج ومعتزلہ کا عقیدہ قرآن کی رو سے درست مانا جائے گا؟

تعجب ہے ہمارے علمائے سلف اور مولانا مدنی بھی بے شمار حدیثوں کو ترغیب وترہیب اور زجروتوبیخ کے پس منظر میں لے کر ان کے ظاہری معانی میں توجیہ یا تقیید یا تاویل یا تخصیص وتعمیم فرماتے ہیں؛ لیکن مولانا مودودی کی واعظانہ عبارتوں میں وسعتِ نظر سے کام نہیں لیتے؛ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے تو خود اپنی زبانِ مبارک سے یہ نہیں فرمایا کہ میرے فلاں فلاں اقوال ظاہر الفاظ پر مبنی نہیں ہیں اور انھیں تم ترغیب وترہیب کے ذیل میں لے کر توجیہ و تاویل کرنا۔ نہ اُن اقوال کے بارے میں تاریخی شہادتیں ایسی موجود ہیں کہ وہ ٹھیک اُنھی اوقات میں زبانِ مبارک سے صادر ہوئے جب مسئلہ شرعی بیان کرنا مقصود نہ تھا؛ بلکہ ترغیب وترہیب پیشِ نظر تھی۔ اس کے برخلاف زیرِ بحث خطبہ کے باب میں ناقابلِ تردید شہادت موجود ہے کہ وہ بطورِ وعظ کے دیا گیا اور خود خطیب کہہ رہا ہے کہ میرا منشا صرف ترغیب وترہیب تھا مسئلہ شرعی بیان کرنا نہ تھا۔ تب بھی مولانا مدنی بدگمانی رفع کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

وعظ اور فتوے کی واضح تر مثال یہ دیکھئے کہ اگر ایک واعظ دورانِ وعظ میں یوں کہتا ہے کہ:

مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللّٰهِ فَقَدْ اَشْرَكَ. (الحدیث)

''جس نے اللہ کے سوا کسی کی قسم کھائی اس نے یقیناً شرک کیا''

اور یوں کہتا ہے کہ جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی اُس نے شرک کیا۔ جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا اس نے شرک کیا وغیرہ تو حالانکہ یہ احادیثِ صحیحہ کا بیان ہے اور شرک کرنے والے کو لغوی وکلامی اعتبار سے مشرک ہی کہہ سکتے ہیں؛ لیکن کوئی بھی پڑھا لکھا آدمی یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ واعظ نے ہر اس شخص کو مشرک قرار دے دیا ہے جس نے ایک مرتبہ بھی اللہ کے سوا کسی کی قسم کھائی یا دکھاوے کی نماز پڑھی یا دکھاوے کا روزہ رکھا اور یہ کہ واعظ صاحب کے ارشاد کے مطابق ایسے تمام اشخاص پر وہی احکام منطبق ہو گئے جو مشرک پر ہوتے ہیں۔ یعنی اس کی بیوی نکاح سے نکل گئی اور وہ واجب القتل ہو گیا اگر توبہ نہ کرے۔

کیوں؟- اس لیے کہ ہر شخص جانتا ہے وعظ اور فتوے میں فرق ہے؛ چنانچہ اگر یہی بات کوئی شرعی قاضی یا

مفتی کسی مسلمان کے ایک فعل کو شرک قرار دے کر لکھ دے کہ "وہ مشرک ہوگیا" تو مرتد کے احکام اس پر منطبق ہو جائیں گے۔ اور اسلامی قانون رائج ہو تو ان احکام کو عملی جامہ بھی پہنایا جائے گا۔

فتوے کی زبان میں اکثر وہ بعض خاص اور ضروری احکام بھی ساتھ ہی بیان کر دیے جاتے ہیں جو کسی جرم کے نتیجہ میں شرعاً مجرم پر وارد ہونے والے ہیں۔ مثلاً خوارج و معتزلہ کہتے تھے کہ جس نے ایک حبّہ کی بھی چوری کی اس کی بیوی پر طلاق پڑ گئی اور اگر اس نے حج کر رکھا تھا تو وہ رائیگاں گیا۔ یا مثلاً جیسے کہ مفتیانِ دارالعلوم نے مولانا محمد قاسمؒ کی ایک عبارت کو دھوکہ سے مولانا مودودی کی سمجھ کر فتوے کی خاص زبان بایں طور استعمال کی کہ:

"ایسے عقیدے والا کافر ہے، جب تک وہ تجدید نکاح نہ کرے اس سے قطع تعلق کریں"۔

اس میں کفر و ارتداد پر لازماً مرتب ہونے والا حکم شرعی یعنی "فسادِ نکاح" بیان کر دیا گیا۔

اگر واقعی مولانا مودودی کا عقیدہ بزعم حضرت مولانا مدنی یہی ہوتا کہ معصیتِ کبیرہ کر کے مسلمان کافر ہو جاتا ہے تو اس عقیدے کے لازمی نتائج و ثمرات بھی تو کہیں ظاہر ہوتے۔ خوارج و معتزلہ بات بات میں مومنین کا نکاح توڑتے تھے۔ ان کی سابقہ عبادتیں برباد کرتے تھے اور واجب القتل قرار دیتے تھے۔ حتیٰ کہ حضرت علیؓ جیسے صحابیٔ جلیل کو نعوذ باللہ کافر کہہ ڈالتے تھے تو مولانا مودودی کے بارے میں بھی کبھی یہ سننے میں آنا چاہیے تھا کہ انھوں نے کسی مرتکبِ کبیرہ کو کافر قرار دے دیا ہے۔ اور اگر ان کے ملک میں تعزیراتِ اسلامی نافذ نہ ہونے کے باعث قتل مرتد ممکن نہ تھا، تو کم سے کم یہ تو ممکن تھا کہ ان کی جماعت کا کوئی آدمی گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہو تو وہ اس سے کہیں کہ تیری بیوی مطلقہ ہوئی، توبہ کر کے پھر سے نکاح کر! اور اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیں اور دیگر افرادِ جماعت کو اس سے انقطاعِ تعلق کا حکم دیں۔ اگر انھوں نے ایسا کبھی نہیں کہا تو دو ہی صورتیں ممکن ہو سکتی ہیں: یا تو ان کی جماعت میں کبھی کوئی شخص گناہِ کبیرہ کرتا ہی نہیں جو اس کی نوبت آتی۔

اگر ایسا ہے تو پھر مولانا مودودی بڑی سے بڑی تعریف کے مستحق ہیں کہ انھوں نے گناہ و طغیان کے اس دَور میں لاکھوں افراد پر مشتمل ایسی صالح جماعت پیدا کر دی ہے جس کا کوئی فرد گناہِ کبیرہ کا مرتکب نہیں ہوتا ہے یا پھر جماعتِ اسلامی کے بعض افراد گناہِ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں تو مولانا مودودی خوارج کی طرح یہ عقیدہ رکھنے کے باوجود کہ معصیتِ کبیرہ کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے اور کافر ہوتے ہی نکاح فاسد ہو جاتا ہے، کسی مصلحت یا خوف کی وجہ سے خاموش رہتے ہیں۔ اس طرح کی گندی بدگمانی اُس شخص کے بارے میں کوئی فاتر العقل ہی کر سکتا ہے جس کا یہ حال ہو کہ آئے دن اپنی تحریر و تقریر سے افرادِ جماعت کو زہد و تقویٰ کے اعلیٰ معیار اور قرآن و سنت کی مکمل پیروی کا سبق دیتا رہتا ہو اور اپنے عقائد و افکار کو برملا ظاہر کرنے میں اس قدر جری ہو کہ بڑے سے بڑے اختلاف کی پروا نہ کرے اور اہلِ بدعت، اہلِ قرآن، غیر مقلدین، قادیانی وغیرہ تمام باطل فرقوں سے کھلی ٹکر لیتا رہے۔

کیا شاہ عبد القادر جیلانیؒ بھی خارجی تھے؟

خیر! بحث کو دوسرا رُخ دینے کے لیے ہم مانے لیتے ہیں کہ مولانا مدنی کا طریق اعتراض برحق ہے۔ گویا اگر کوئی خطیب اپنے وعظ و نصیحت کے دوران میں یوں کہے کہ فلاں فلاں فرائض شرعیہ سے سراسر غافل رہنے والا مسلمان مسلمان نہیں رہتا تو مولانا موصوف کے نزدیک ایسا کہنا اس کے ''خارجی'' ہونے کا پکا ثبوت ہے۔ آئیے میں آپ کو دکھاؤں اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

شاہ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو تو آپ جانتے ہوں گے۔ چھٹی صدی ہجری کے وہ جلیل القدر امام الاولیاء جن کی عظمت و تقدس کے آگے ہم سب اہلِ ایمان کی گردن خم ہے اور جن کے احسانات سے امتِ اسلامیہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ وہ ۵ رشوال ۵۴۵ھ یوم سہ شنبہ کو مدرسہ معمورہ میں وعظ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''عزیز من! تو دنیا میں ہمیشہ کے لیے رہنے اور مزے اُڑانے کے واسطے پیدا نہیں کیا گیا ہے۔ حق تعالیٰ کی ناراضگیوں کی جس گندگیوں میں تو ملوث ہے اس کو بدل، تو نے اللہ کی اطاعت میں لاإلهَ إلّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه کہنے پر قناعت کر لی ہے، حالانکہ جب تک اس کے ساتھ دوسری چیز یعنی عمل کا اضافہ نہ کرے گا کلمہ پڑھ لینا تجھ کو نافع نہ ہوگا۔ ایمان تو قول اور عمل کے مجموعے کا نام ہے۔ پس ایمان نہ مقبول ہوگا اور نہ مفید جب کہ تو معصیتوں اور لغزشوں اور حق تعالیٰ کی مخالفت کا مرتکب اور اس پر اَڑا رہا اور نماز، روزہ اور صدقہ اور نیک کاموں کو چھوڑے رکھا۔ بھلا وحدانیت و رسالت کی محض گواہی کیا نفع دے گی۔ جب تو نے لا الہ الا اللہ کہا تو گویا تو نے ایک دعویٰ کیا؛ لہٰذا کہا جائے گا کہ تیرے اس دعوے پر کوئی گواہ بھی ہے؟ - وہ گواہ کون؟ حکم کا ماننا - ممنوعات سے باز رہنا - مصیبتوں پر صبر کرنا اور تقدیر کے سامنے سر جھکا دینا۔ یہ سب اس دعوے کے گواہ ہیں؛ کیونکہ کوئی عمل بھی تیرا بغیر اس کے کہ حق تعالیٰ کے لیے خالص بنائے، ہرگز مقبول نہ ہوگا؛ کیونکہ نہ کوئی قول قبول ہوتا ہے بلا عمل کے اور نہ کوئی عمل مقبول ہوتا ہے بغیر اخلاص اور سنّت کی موافقت کے''۔ (اسرار سبحانی دوسری مجلس)

اس کے ایک ایک لفظ کو غور سے پڑھیے۔ خصوصاً خط کشیدہ جملوں کو۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایمان کے مقبول نہ ہونے یا توبہ کے مقبول نہ ہونے کا مطلب صرف اور صرف یہی ہوتا ہے کہ ایمان اور توبہ نہ ہونے کے درجہ میں ہیں۔ قرآن و سنت کی روشنی میں آپ کا عقیدہ ہے کہ آخری وقت کی توبہ یا ایمان مقبول نہیں ہوتا۔ اس کا یہی تو مطلب ہے نا کہ اگر کوئی کافر عالم نزع میں ایمان لائے تو آپ اسے مومن نہیں مانیں گے۔ اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھیں گے۔ اس کا ورثہ

مسلمانوں کے قاعدے سے تقسیم نہیں فرمائیں گے۔گویا آخروقت میں اس کا ایمان لانا نہ لانے کے برابر ہے۔آپ خوب جانتے ہیں کہ فرعون نے اٰمَنْتُ اور اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ کہا تھا؛لیکن یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ وہ مومن نہیں شمار ہوا کافر ہی رہا؛ کیونکہ اللہ نے اس کا ایمان قبول نہیں فرمایا۔اسی طرح ایمان کے نافع نہ ہونے کا مطلب بھی آپ کو معلوم ہے کہ کفر کے سوا کچھ نہیں۔ایمان کا نفع یہی تو ہے کہ مومن جنت میں داخل ہوگا۔اگر شاہ صاحب یہ فرمارہے ہیں کہ ایمان نافع نہ ہوگا تو اس کا صرف اور صرف یہی مطلب ہوسکتا ہے کہ وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا اور جنت میں کبھی نہ داخل ہونا چونکہ کافرین ومشرکین کے لیے ہی مخصوص ہے؛اس لیے وہ یقیناً کافرومشرک ہوگا۔

ان تصریحات کی روشنی میں پھر شاہ صاحب کی تقریر پڑھیے کیا وہ پوری صفائی کے ساتھ یہ نہیں کہہ رہے کہ جو شخص گناہوں پر ڈٹا رہا اور نماز روزہ صدقہ وغیرہ سے دُور رہا وہ ہزار کلمہ طیبہ پڑھتا رہے اور وحدانیت ورسالت کی گواہی دیتا رہے کافر کا کافر رہا مومن ومسلم نہ ہوا۔کیا وہ بلا ابہام نہیں فرمارہے کہ خالی خولی اقرار اور دعوے سے کچھ نہیں بنتا جب تک کہ اعمالِ مفروضہ کے ذریعہ اس کی شہادت نہ دو۔کیا اُنھیں اس پر اصرار نہیں ہے کہ ایمان کے نافع اور مقبول ہونے یعنی تسلیم کیے جانے اور وجہِ نجات بننے کے لے اعمالِ صالحہ شرطِ لازم ہیں۔یہ شرط نہ پائی جائے گی تو ایمان مردود وغیر نافع رہے گا۔اور جنت کبھی نصیب نہ ہوگی۔

کیا اس کے بعد بھی کوئی گنجائش ہے کہ مولانا مدنی کے نقطۂ نظر سے شاہ عبدالقادر جیلانی خاکم بدہن ''خارجی'' نہ کہلائیں؟ کیا اس وعظ سے اُن کا عقیدہ خوارج ومعتزلہ کے موافق اور اہلِ سنت والجماعت کے خلاف نہیں بنتا؟ اہلِ سنت والجماعت کا مسلک تو یہ ہے ہی کہ مسلمان چاہے کتنا ہی بےعمل ہو؛لیکن اگر دل سے ایمان رکھتا ہے تو سزا بھگتنے کے بعد کبھی نہ کبھی جنت میں ضرور پہنچے گا۔اتفاق سے ''ایمان وعمل'' ہی میں مولانا مدنی نے صفحہ ۱۸ پر تارکِ شریعت اور عاملِ معصیت لوگوں کے بارے میں اس عقیدے کا بایں الفاظ ذکر کیا ہے کہ:

''کلمۂ لا الٰہ الا اللہ اور ایمان ضرور بالضرور اُن کو نفع پہنچائے گا اگرچہ بداعمالیوں کی سزا کے بعد ہی''۔

ذرا مقابلہ کرکے دیکھئے شاہ عبدالقادر جیلانی تو فرمارہے ہیں بلا اعمالِ صالحہ کے کلمہ پڑھ لینا ایمان لے آنا نفع نہ پہنچائے گا اور مولانا مدنی کہہ رہے ہیں کہ ضرور بالضرور نفع پہنچائے گا۔فرمائیے ان ضدین ونقیضین میں کیا صورتِ تطبیق ہو؟۔ہم بدنصیب تو بڑی آسانی سے تطبیق دے سکتے تھے کہ صاحب شاہ عبدالقادر جیلانی'' تو زبانِ وعظ میں ترغیب وتنذیر کے طور پر کلام کررہے ہیں عقیدۂ شرعیہ نہیں بیان کررہے اور مولانا مدنی زبانِ فقہ میں عقیدہ شرعیہ بیان فرمارہے ہیں؛ لہٰذا وہ بھی ٹھیک اور یہ بھی ٹھیک؛مگر مولانا مدنی تو وعظ وفتویٰ اور خطبہ وفقہ کے فرق کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔لہٰذا ان کے نزدیک یا تو خود ان کا اور تمام اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ غلط ہے یا شاہ صاحب رحمہ اللہ علیہ خاکم بدہن خارجی اور فاسد العقیدہ تھے!

بتائیے! کیا آپ یہ اچھا سمجھیں گے کہ مولانا مودودی کو ''خارجی'' بنانے کے شوق میں شاہ عبدالقادرؒ کو بھی خارجی اور گمراہ (نعوذ باللہ) مان لیا جائے یا یہ اچھا سمجھیں گے کہ وعظ اور فقہ وکلام کی زبان و انداز کا فرق تسلیم کر کے مولانا مودودی کے سر سے الزام اُٹھالیں۔

کیا امام احمد ابن حنبلؒ بھی خارجی تھے؟

امام احمد ابن حنبلؒ کو آپ جانتے ہیں؟ بقول امام شافعیؒ: امام في الحديث، امام في الفقه، امام في اللغة، امام في القرآن، امام في الفقر، امام في الزهد، امام في الورع، امام في السنة. اس تعارف پر اتنا اضافہ اور فرما لیجیے کہ یہی وہ مجاہدِ حق تھا جس نے کلام اللہ کے مخلوق تسلیم نہ کرنے کے جرم میں بے شمار کوڑے کھائے تھے۔

وہ فرماتے ہیں:

''جس نے نماز چھوڑ دی اس نے کفر کا ارتکاب کیا اور اس کا قتل جائز ہے''۔

(المناقب لابن جوزی بواسطہ امام احمد ابن حنبل لمحمد ابوزہرہ: ص ر ۲۲۰)

اور یہ نہیں کہ یوں ہی سرسری کہہ گئے ہیں؛ بلکہ شرح کبیر اور شرح الخمسین وغیرہ میں ان کے دلائل بھی ملتے ہیں۔ خود اپنی کتاب، کتابُ الصلٰوۃ ومایلزم فیھا میں یہ دلیل دیتے ہیں کہ حدیث میں آیا ہے، بے نمازی کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے؛ نیز آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے: ''نماز اسلام کا ستون ہے'' اور یہ معلوم ہے کہ ستون گرنے سے خیمہ گر کر بے کار ہو جاتا ہے۔ پس تارکِ نماز کافر ہوا اور اس کا قتل جائز ہے! (امام احمد ابن حنبل)

فرمائیے اب کیا رائے ہے؟ مولانا مودودی نے تو صرف یہی کہا تھا کہ جن کو عمر بھر کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ حج بھی کوئی فرض ان کے ذمے ہے اور جن کے دل میں حجاز کے قریب سے گزرتے ہوئے حج کا ارادہ تک نہ پیدا ہو وہ مسلمان نہیں ہیں۔ اس کے آگے انھوں نے کوئی ایسا لفظ نہیں کہا جس سے یہ ثابت ہو کہ ان کا ارشاد فتوے اور قانون کی حیثیت رکھتا ہے؛ لیکن امام صاحب تو ''قتل جائز'' کہہ کر بداہۃً کہہ رہے ہیں کہ تارکِ نماز از روئے فتویٰ کافر ہے اور اس پر تمام احکاماتِ مرتد کا نفاذ ہو گا!

تو کہہ دیجیے انھیں بھی ''خارجی!''۔ لکھ دیجیے ان کے نام بھی دوزخ کا حکمنامہ! (العیاذ أباللہ) یہ بھی خیال رکھیے گا کہ امام صاحب نے یہ نہیں فرمایا کہ جس شخص کے دل میں عمر بھر خیال بھی نہ گزرتا ہو کہ نماز اس کے ذمہ کوئی فرض ہے اور مسجد کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کے دل میں نماز کا ارادہ تک نہ پیدا ہوتا ہو؛ بلکہ محض ''تارکِ صلوٰۃ'' فرمایا۔ گویا حکم کفر کے لیے اتنی شدید لاپروائی کی بھی شرط نہیں جتنی مولانا مودودی نے تارکِ حج کے بارے میں رکھی

تھی؛ بلکہ محض عملاً ''ترکِ صلوٰۃ'' ایمان واسلام سے خارج کر کے مستحق گردن زدنی بنا دیتا ہے۔ فَافْهَمْ وَتَدَبَّرْ!

(دوسری صدی ہجری کے بلند مرتبہ فقیہ ومحدث اور زاہد وعابد عبداللہ ابن مبارکؒ کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ تارکِ صلوٰۃ کافر ہے (رحیق بحوالہ طبقاتِ کبریٰ (صوفیہ) للشعرانی: ص ر ۵۲) گویا امام احمد اور ابن مبارک دونوں اولیائے کرام مولانا مدنی مدظلۂ کے طرزِ فکر سے ''خارجی'' ٹھیرے)۔ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا

اور معاملہ یہیں تک نہیں ہے۔ یہی امام صاحب فرماتے ہیں:

''ایمان عبارت ہے قول وعمل سے وہ کم بھی ہوسکتا ہے اور زیادہ بھی ہوسکتا ہے۔ زیادتی اس وقت ہوتی ہے جب کوئی نیک کام کیا جائے اور کمی اس وقت ہوتی ہے جب کسی کارِ بد کا ارتکاب کیا جائے۔ ایسی صورت میں انسان ایمان سے خارج ہو کر صرف اسلام پر قائم رہتا ہے، پس اگر وہ توبہ کرلے تو ایمان کی طرف اس کی بازگشت ہو جائے گی''۔

(المناقب لابن جوزی بواسطہ امام احمد ابن حنبل لابوزہرہ)

خط کشیدہ الفاظ پر خصوصیت سے نظر رکھیے۔ کیا اس عبارت سے بدیہی طور پر امام احمدؒ کا یہ عقیدہ ثابت نہیں کہ جب مومن کارِ بد کرتا ہے تو ایمان سے نکل جاتا ہے اور توبہ کرے تب ایمان اس میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ امام صاحب نے یہی بات وضاحت سے فرمائی ہے۔ اب ذرا مولانا مدنی کے الفاظ صفحہ: ۸۴-۸۵ پر ملاحظہ ہوں۔ مولانا مودودی کی ایک بالکل ایسی ہی عبارت پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہی تو بعینہٖ خوارج کا مذہب ہے کہ ارتکابِ معصیت سے ایمان نکل جاتا ہے اور جب تک توبہ نہ کی جائے نکلا ہوا رہتا ہے''۔

گویا مولانا مدنی کے نزدیک امام احمد بھی مولانا مودودی کی طرح ''خارجی'' ہوئے۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ نہ مولانا مودودی خارجی ہیں نہ امام احمد؛ لیکن جب مولانا مدنی کا اُصول تسلیم کرلیا جائے کہ کسی شخص کی ایک تقریر یا وعظ سے منطقی وکلامی طور پر جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ اس کا عقیدہ مانا جاتا ہے اور چاہے وہ کتنی ہی تردید کرے چاہے اس کی دیگر تحریریں کتنی ہی اس عقیدے کی مخالف ہوں؛ مگر اس پر اسی عقیدے کے مطابق حکم لگایا جاتا ہے تو مجبوراً امام احمد کو بھی ''خارجی'' تسلیم کرنا پڑے گا۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ

کیا صحابہ وائمہ تک نعوذ باللہ گمراہ تھے؟

مولانا مدنیؒ نے جو سخت گیرانہ رویہ اختیار فرمایا ہے وہ تو بہت ہی خوفناک ہے ذرا سنیے! کم سے کم چالیس صحابہ رضوان اللہ علیہم سے یہ قول منقول ہے کہ: اَلْاِيْمَانُ قَوْلٌ وَعَمَلٌ ایمان قول اور عمل کے مجموعہ کا نام ہے۔

امام بخاری نے کتاب الایمان کے شروع ہی میں اس پر خوب زور دیا ہے۔ بے شمار علمائے حق مثلاً ابوعلی ثقفی، ابوالعباس قلانسی، ابوعبداللہ بن مجاہد، امام مالک وغیرہم یہی کہتے ہیں کہ ایمان نام ہے معرفت بالقلب، اقرار باللسان اور عمل بالارکان کے مجموعے کا۔ امام شافعیؒ بھی اسی کے قائل ہیں۔ کثیر تابعین کی بھی یہی رائے ہے۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ جو شخص بعض فرائض مثلاً نماز، زکوٰۃ، حج کا قطعاً تارک ہے کیا وہ ایمان کے بعض اجزا کا تارک نہیں؟ ظاہر ہے کہ ہے۔ اب دو ہی صورتیں ہیں: یا تو آپ یوں کہیں کہ اجزا کم ہو جانے سے کُل فوت نہیں ہوتا یا ہو جاتا ہے۔ اگر فوت ہو جاتا ہے تو یہ بعینہٖ خوارج کا مسلک ہے؛ کیونکہ ترکِ فرائض سے ایمان کا فوت ہو جانا ہی ان کا مذہب ہے اور اگر نہیں فوت ہوتا جیسا کہ حق ہے اور جیسا کہ مولانا مدنی بھی فرماتے ہیں تو یہ بہر حال ماننا پڑے گا کہ اجزا کم ہو جانے سے کُل ناقص ہو جاتا ہے۔ یعنی بعض اعمالِ ضروریہ کے ترک سے ایمان ناقص ہو جاتا ہے۔ مولانا مدنی اپنی کتاب میں یہی تو فرماتے ہیں کہ اعمال ایمان کا ایسا جز ہیں جن کے فوت ہونے سے ایمان فوت نہیں ہوتا؛ بلکہ ناقص رہ جاتا ہے؛ لیکن میں کہوں گا کہ یہ مولانا کھلی تلبیس فرما رہے ہیں۔ اُنھیں حنفی ہونے کا دعویٰ ہے اور امام ابوحنیفہ کا مسلّمہ طور پر یہ قول ہے کہ "ایمان نہ کم ہوتا ہے اور نہ زیادہ" (اس کی مفصل بحث آگے آئے گی) لہٰذا وہ کیوں کر کہہ سکتے ہیں کہ اعمال کے ترک سے ایمان ناقص رہ گیا۔ نقص تو کمی ہی کا نام ہے جب ایمان میں کمی زیادتی ممکن نہیں تو ناقص ایمان کیسا؟

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ جن صحابہ و ائمہ نے یہ فرمایا کہ ایمان قول و عمل کے مجموعہ کا نام ہے وہ مولانا مدنی کے طرزِ استدلال سے نعوذ باللہ سب "خارجی" ہوئے؛ کیونکہ مجموعہ کا اگر ایک یا چند اجزا کم ہو جائیں تو دو ہی صورتیں ہیں: یا تو یہ مان لیا جائے کہ اجزا کم ہونے سے کُل ناقص رہ گیا۔ یا یہ مانا جائے کہ کُل ختم ہوا۔ پہلی صورت مولانا مان نہیں سکتے؛ کیونکہ ایمان میں نقص یا زیادتی امام ابوحنیفہ شمہ برابر تسلیم نہیں کرتے؛ لہٰذا دوسری صورت رہ گئی۔ گویا مولانا کے نزدیک مذکورہ صحابہ و ائمہ کا وہی خوارج والا عقیدہ ہوا کہ ترکِ اعمال سے ایمان فوت ہو جاتا ہے!

امام ابوحنیفہؒ تک پر اعتراض!

عبرت کا مقام ہے کہ مولانا کے طرزِ فکر سے تو امام اعظمؒ بھی مجروح ہوئے جاتے ہیں۔

علماء کی کتبِ کثیرہ گواہ ہیں کہ امام اعظم کا یہ قول تھا کہ:

اَلْإِيْمَانُ لَايَزِيْدُ وَلَايَنْقُصُ. (ایمان نہ زیادہ ہوتا ہے نہ کم)

اسی کی مزید تقویت میں ان کا یہ ارشاد بھی منقول ہے کہ:

اَلْإِيْمَانُ مَعْرِفَةٌ وَإِقْرَارُهٗ. (ایمان معرفت اور اس کے اقرار کا نام ہے)

یعنی بیشتر صحابہ وائمہ کی طرح امام اعظم عمل بالارکان کو جزوِ ایمان نہیں مانتے؛ بلکہ اُن کے برخلاف یوں کہتے ہیں کہ ایمان صرف معرفت اور اقرار کا نام ہے۔

علامہ ابن حزم نے بڑی شد ومد سے دلائل کلامیہ کے ساتھ امام صاحب کی تائید کی ہے اور شیخ اکبر محی الدین عربی نے بھی ''فتوحات'' میں یہی لکھا ہے کہ ایمان ایک حالت پر رہتا ہے کم اور زیادہ نہیں ہوتا۔ امام اعظمؒ اپنے دعوے کی تصویب میں یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ ابوبکر صدیق کا ایمان ویسا ہی ہے جیسا کہ تمام مسلمانوں کا۔ انھیں مسلمانوں پر جو فضیلت حاصل ہے وہ نفس ایمان کی وجہ سے نہیں؛ بلکہ عمل کی بناء پر ہے اور اس بناء پر ہے کہ حضور ﷺ نے منجملہ دس لوگوں کے آپ کو جنت کی بشارت دی تھی۔

اب مولانا مدنی کے طرزِ فکر کے مطابق اگر یہ حقیقت نظر انداز کردی جائے کہ امام اعظمؒ نے ایسا دعویٰ کیوں کیا، کس غرض کے لیے کیا، کس پس منظر میں کیا، کیا فائدہ پیش نظر تھا، کس کی تردید اور کس کی تائید منظور تھی تو نہ صرف یہ کہ اُن تمام صحابہ ائمہ اور علماء واتقیا کے مخالف ٹھیرتے ہیں جو ایمان میں زیادتی اور نقص کے قائل تھے؛ بلکہ صریحاً قرآن کے بھی مخالف ٹھیرتے ہیں۔ قرآن میں ایک دو جگہ نہیں دسیوں جگہ ایمان میں زیادتی ہونے کا ذکر ہے جس شیٔ میں زیادتی ہوسکتی ہے لازماً کمی بھی ہوسکتی ہے، لہٰذا امام صاحب کا پورا دعویٰ غلط ٹھیرا۔ یا کم سے کم زیادتی کا انکار تو نصوصِ قرآنیہ صریحہ کا انکار ماننا ہی پڑے گا۔ قرآن سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں: ''فَزَادَتْھُمْ اِیْمَانًا'' اور ''لِیَزْدَادُوْا اِیْمَانًا'' اور ''فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْھُمْ اِیْمَانًا'' اور ''وَیَزْدَادَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِیْمَانًا'' اور ''وَمَازَادَھُمْ اِلَّا اِیْمَانًا'' اِن آیات میں بلا ریب وابہام ایمان میں زیادتی متحقق ہونے کا ذکر ہے۔ ہم جیسے سادہ فہم لوگ تو مطمئن ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کا نظریہ اور قول بظاہر آیاتِ قرآنیہ کی ضد ہوتے ہوئے بھی اصل میں ٹھیک ہے اور جس پس منظر میں جس مقصد سے جن مفاہیم میں آپ نے اس کا اثبات فرمایا تھا وہ اعتراض کو رفع کرنے کے لیے کافی ہیں؛ لیکن مولانا مدنی کسی پس منظر، کسی مناسبتِ محل، کسی مقصدِ خاص، کسی اسلوبِ ترغیب وترہیب کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں اور کہتے ہیں کہ فقہ، کلام، وعظ، خطبہ سب ایک ہیں تو ان کے طرزِ فکر کے بموجب امام اعظم پر تو خاکم بدہن کفر کا فتویٰ لگنا چاہیے؛ کیونکہ وہ کھلم کھلا متعدد آیاتِ قرآنی کے قطعاً برعکس قول کررہے ہیں! خصوصاً ان کا یہ قول کہ ''ابوبکرؓ کا اور تمام مسلمانوں کا ایمان یکساں ہے''۔ تو ایسا ہے کہ اس طرح کی کوئی بات اگر مولانا مودودی کے قلم سے کبھی نکل جائے تو ہندو پاک کفر کے فتووں اور تبرا کے ہنگاموں سے گونج اُٹھیں گے۔

ٹھنڈے دل سے سوچیے! مولانا مودودی پر تو علمائے کرام نے صرف اتنی سی بات پر توہین صحابہؓ کا فتویٰ لگادیا کہ انھوں نے دَورِ اوّل کے مستند عالم ابن عبدالبر کی کتاب سے کچھ مشاجراتِ صحابہ ترجمہ کردیے تھے؛ لیکن

امام اعظمؒ کو کچھ نہ کہا کہ وہ عوام کے اور افضل البشر بعد الانبیاء جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایمان کو برابر کہہ گئے ہیں۔ کیا ہمارے علماء کو اس کی خبر نہیں؟ ہے اور ضرور ہے؛ مگر امام اعظمؒ سے عناد نہیں ہے اور مولانا مودودی سے عناد ہے۔

میں پہلے ایک دو جگہ لکھ آیا ہوں کہ "اس کی مفصل بحث آگے آئے گی" میرا خیال تھا کہ امام اعظم کے نظریہ و ارشاد پر کھل کر بحث کروں گا اور بتاؤں کہ ان کا نظریہ غلط نہیں ہے نہ قرآن کے مخالف ہے نہ صحابہ وائمہ کے، برعکس ہے، بلکہ وہ بھی اسی طرح حق پر ہیں جس طرح جملہ صحابہ وائمہ؛ لیکن اب میں اس باب میں اس لیے خاموش ہوا جاتا ہوں کہ ناظرین مولانا مدنی اور علمائے موجودہ ہی سے دریافت فرمائیں کہ یہ کیا معمہ ہے؟ جب علماء اس کا یہ جواب دیں کہ امام اعظم کا قول فتوے کی زبان میں نہیں علم کلام کی زبان میں ہے اور انھوں نے معتزلہ وخوارج کی بیخ کنی اور استیصال کی خاطر اسے اختیار کیا تھا تب آپ ان سے یہ فرمائیں کہ مولانا مودودی کی کتاب "خطبات" بھی فتوے کی زبان میں نہیں وعظ خطابت کی زبان میں ہے اور انھوں نے بدعمل فاسق و فاجر مسلمانوں کو نیک عملی پر اُبھارنے کے لیے خطبے دیے تھے۔

علیٰ تقدیم التسلیم

غایت مافی الباب میں فرض کیے لیتا ہوں کہ مولانا مودودی کی زیر بحث عبارت میں بقول مولانا مدنی ایک عقیدۂ فقہی کا ہی بیان ہوا ہے تب بھی میں دعویٰ کرتا ہوں کہ یہ عقیدہ ہرگز خوارج ومعتزلہ کے بالکل مثل نہیں؛ بلکہ ٹھیک اہلِ سنت والجماعت کی رائے کے مطابق ہے اور مولانا مدنی نے اسے گمراہی و بے دینی ٹھیراتے ہوئے قطعاً اس کی حقیقت اور نوعیت کا لحاظ نہیں کیا ہے۔

ایک بار پھر مولانا مودودی کی معترض فیہ عبارت پڑھ لیجیے جسے ہم پیچھے لکھ آئے:

خوارج ومعتزلہ کا عقیدہ یہ تھا کہ جس نے کسی گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کیا فوراً ایمان سے نکل گیا۔ یہ کوئی شرط نہیں تھی کہ وہ دیگر فرائض کا تارک بھی ہو یا عموماً گناہ کرتا ہو۔

مولانا مودودی ایسا نہیں کہہ رہے؛ بلکہ وہ اُن لوگوں کے خارج از اسلام ہونے کا فتویٰ دے رہے ہیں جن کا اصرار علی المعصیت اور تمکن علی الفواحش اور فرائض وواجبات سے گریز وفرار اس درجہ میں پہنچا ہوا ہو کہ حج جیسے اہم فریضہ کی فرضیت کا احساس بھی دل و دماغ سے مٹا چکے ہوں اور حجاز کے قریب سے گزرتے ہوئے حج کا محض ارادہ تک ان کے قلب میں نہ گزرتا ہو۔

میں آپ سے پوچھتا کیا اصطلاح کے اعتبار سے انسانوں کی دو ہی قسمیں ہیں، مسلم اور کافر یا "منافق" بھی کسی قسم

کا نام ہے؟ مولانا مدنی اور علمائے موجود چاہے اس قسم کو بھلا چکے ہوں؛ لیکن زندہ قرآن کا غیر جانبدار پڑھنے والا تو ہرگز اسے نہیں بھلا سکتا۔ قرآن میں ایک دو جگہ نہیں پوری پچیس جگہ منافقات، منافقون اور منافقین کا ذکر آیا ہے۔ اور اللہ جل شانہ نے رنگ رنگ سے ان کے پول کھولے ہیں۔ ان کا ابطال کیا ہے۔ انھیں کافر و اکفر قرار دیا ہے۔ یہ قرآن ہی میں تو ہے کہ:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ۔ (النساء)
''یقیناً منافقین آگ کے سب سے نیچے درجے میں ہیں''۔

اور قرآن ہی میں تو ہے کہ:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا (التوبہ، پارہ ۱۰)

''یقیناً منافقین نافرمان و سرکش ہیں۔ منافقین مردوں اور عورتوں اور کافروں کے لیے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ جہنم کی آگ میں رکھے جائیں گے''۔

زیادہ مثالیں میں اس لیے نہیں دیتا کہ تمام امت اس پر متفق ہے کہ منافق کافر؛ بلکہ بدترین کافر کے حکم میں ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کس طرح جانا جائے کہ کون منافق ہے؟ کیا علامات و دلائل ہیں جو کسی شخص کو منافق ثابت کر سکتے ہیں؟ اگر یہ کہا جائے کہ ایمان اور نفاق کا تعلق دل سے ہے اور دل کا حال چونکہ سوائے خدا کے کوئی نہیں جان سکتا؛ اس لیے کسی بھی کلمہ گو کے بارے میں حکمِ نفاق نہیں لگایا جا سکتا تو جہاں قرآن کی منافقین سے متعلق تمام آیات نعوذ باللہ بے سود ٹھیریں گی وہیں بیشتر وہ حدیثیں بھی عبث ہو جائیں گی، جن میں علاماتِ نفاق بیان ہوئی ہیں۔ اس لیے لازماً ماننا پڑے گا کہ بعض صورتیں ایسی ضرور ہیں جب ایک زبانی دعویٔ ایمان کرنے والے کے بارے میں حکمِ نفاق لگایا جا سکے گا۔

یورپ کا سفر کرنے والے جن لیڈر قسم کے مسلمین کا مجمل ذکر مولانا مودودی نے اپنی عبارت میں فرمایا ہے ان کے حال وقال اور گفتار و کردار کا کم و بیش اندازہ تقریباً سبھی کو ہے۔ یہ لوگ پیدا تو ہوئے بے شک مسلمان گھرانے میں اور کہتے اپنے آپ کو مسلمان ہی ہیں جیسے کہ دَورِ مبارک کے منافقین خود کو مسلمان کہتے تھے۔ اور منافق کہتے ہی اُسے ہیں جو دل سے مسلمان نہ ہو؛ مگر زبان سے خود کو مسلمان کہے۔ ورنہ زبان سے بھی اقرارِ کفر کر لیا تو کافر کہلائے گا منافق نہیں۔

لیکن ان میں سے اکثر کی زندگی یہ رہی کہ پرورش پائی ایسے ماحول میں جہاں ہر چیز کافر تہذیب کا آئینہ تھی۔ ہر ادب وسلیقہ انھیں تہذیب کفر ہی کا سکھایا گیا۔ اور اُن اسکولوں میں داخل کر دیا گیا جہاں دل و دماغ پر

کفر و الحاد کی تہیں چڑھائی جاتی ہیں۔ پھر جب سن شعور کو پہنچے تو انھوں نے اپنے ماحول، اپنی تہذیب، اپنی تعلیم، اپنے رہن سہن، اپنے لباس، اپنے کلچر ہر چیز میں وہی کچھ دیکھا اور پایا جو سراسر غیر اسلامی اور گمراہ کن تھا۔ کس کا عقیدۂ توحید و رسالت اور کیسا ایمان و دین۔ جوں جوں عمر بڑھتی گئی تعلیم بڑھتی گئی کفر کا ملمع دل و دماغ پر گہرا ہوتا گیا۔ ''تعلیم الاسلام'' یا ''پارۂ عم'' یا ''نور نامہ'' وغیرہ جو بچپن میں بطورِ تبرک پڑھا دیا گیا تھا اس کا نقش شعور تو کیا تحت الشعور سے بھی مٹ گیا اور اگر عید، بقر عید یا جمعہ کو ان کے والدین نے بطور وضعداری یا بطورِ رسم نماز بھی پڑھوالی تو اس کی حیثیت اُٹھک بیٹھک سے ذرا بھی زیادہ نہ ہوئی۔ وہ کُلّیۃً اِن احساسات سے عاری اور ان خیالات سے خالی رہے کہ توحید و رسالت کس چیز کا نام ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں اور اسلام کسے کہتے ہیں اور مسلمان کے کم سے کم کیا فرائض ہیں۔ انھوں نے داڑھیاں مونڈیں اور اس لیے مونڈیں کہ یہی ان کے نزدیک فعل صحیح تھا؛ چنانچہ داڑھی رکھنے والوں کا مذاق اُڑایا اور بفرض مذاق بھی نہ اُڑایا تو دل میں کبھی داڑھی رکھنے کی محمودیت کا احساس پیدا نہ ہوا۔ انھوں نے نمازیں چھوڑیں روزے چھوڑے۔ رشوتیں لیں، زنا کیے، شرابیں پیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ احکامِ الٰہی کو رجعت پسندانہ سمجھا اور اس کے مقابلہ میں تہذیبِ کافرانہ اور سیاستِ باطل کے احکام و اقدار اور نظریات و اُصول کو قابلِ فخر گردانا۔ وہ محض تارکِ اعمال اور عاملِ معصیات ہی نہیں رہے؛ بلکہ دل و دماغ کی پوری گہرائی کے ساتھ کفر و باطل کے احکام و اُصول اور تہذیب و کلچر کے فدا کار و وارفتہ رہے۔ عقیدہ و تخیل ہی کے اعتبار سے ان کے دل و دماغ کفر کا گہوارہ رہے۔ ایمان انھیں چھو کر نہیں گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج جب وہ پاکستان کی مسندِ اقتدار پر قابض ہو گئے ہیں تو کھلم کھلا وہی کر رہے ہیں جو بمصداقِ قرآن منافقین کیا کرتے تھے۔

> اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ﴿۱﴾ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲﴾ (المنافقون، پارہ ۲۸)
>
> ''(اے محمد) جب تیرے پاس منافق آ کر کہیں کہ تو اللہ کا رسول ہے۔ تو بے شک اللہ جانتا ہے کہ تو اللہ کا رسول ہے؛ لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین جھوٹے ہیں! انھوں نے اپنی قسموں کو سپر بنا رکھا ہے۔ پھر (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ یہ لوگ بہت بُرے کام کر رہے ہیں''۔

غور فرمائیے! منافقین کی تکذیب اللہ کس اہتمام سے کر رہا ہے۔ جس طرح یہ دَورِ رسالت کے منافقین زبان سے گواہی دیتے تھے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک رسول ہیں؛ لیکن اللہ فرماتا ہے کہ یہ کمبخت جھوٹ بول رہے ہیں یعنی فی الحقیقت یہ دل سے محمد ﷺ کو رسول اللہ نہیں مانتے اور جب پول کھلنے لگتی ہے

تو اپنے مومن ہونے کی قسمیں کھا کھا کر جان بچاتے ہیں اور پھر جب موقع ملتا ہے تو لوگوں کو راہِ حق سے روکتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح نام نہادِ یورپ پرست لیڈرانِ کرام کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ جو خود کو مسلمان بتاتے اور اسلام کو مذہبِ حق تسلیم کرتے ہیں تو بے شک اسلام مذہبِ حق ہے؛ لیکن ان کا اقرار اور گواہی قطعاً جھوٹی ہے۔ اور یہ لوگوں کو خدا کی راہ سے روکنے اور شیطان کی راہ پر لگانے میں بہت پیش پیش ہیں؛ بلکہ میں تو کہوں گا کہ دَورِ رسالت کے اکثر منافقین اتنے دریدہ دہن، گستاخ، جری اور حد سے متجاوز نہ تھے جتنے آج کے منافقین ہیں۔

آج کے منافقین کا اُسوۂ شیطانی جاننے کے لیے اُن بے شمار خفی اور نیم خفی حرکاتِ جرم وگناہ کی تلاش کی ضرورت نہیں جن سے ان کی فردِ عمل معمور ہے۔ اخباراتِ حاضرہ کی صرف چند اشاعتیں اُٹھا کر دیکھ لیجیے معلوم ہو جائے گا کہ یہی لیڈرانِ کرام جن کی بخشش ونجات کی وکالت مولانا مدنی نے اپنی کتاب میں کی ہے اور مولانا مودودی نے جنھیں اسلام سے دُور قرار دیا ہے تردید اسلام اور تذلیل دین اور تحقیر قرآن و حدیث میں کس درجہ جری ہیں۔ اسلامی نظامِ زندگی کو روکنے اور نظامِ کفر کو باقی وقائم رکھنے کے لیے انھوں نے ڈھکے چھپے یا آڑ لے کر جو حرکات کیں وہ تو اپنی جگہ رہیں، آخر کار آیاتِ قرآنیہ کی کھلم کھلا تحقیر وتردید پر بھی اُتر آئے۔ اور بلا تکلف منبرِ عام پر کہا کہ:

”لوگو! مُلّا تمھیں ایسی حکومت کی دعوت دیتا ہے جس میں تمہارے ہاتھ کاٹے جائیں گے، تمہارے کوڑے لگائے جائیں گے، تمھیں پتھروں سے ہلاک کیا جائے گا! تمہارے لیے تمام ترقی یافتہ دلچسپیوں اور تفریحوں کے دروازے بند کر دیے جائیں گے!“

سنا آپ نے کیا کہا گیا؟ یہ کہ قرآن جو چور کے ہاتھ کاٹنے اور زانی کو کوڑے لگانے اور رسول اللہ ﷺ جو شادی شدہ زانی کو سنگسار کرنے کا حکم دیتے ہیں اور اللہ جو فواحشات ومنکرات کے رواج واشاعت کو منع کرتا ہے تو یہ سب گھٹیا درجہ کی غیر مہذب قابلِ نفرت باتیں ہیں۔ اور لب ولہجہ دیکھئے قائلین کے دل و دماغ میں آیاتِ الٰہی کا غیر مہذب غیر ترقی پسندانہ غیر محمود ہونا اس درجہ رَچ بس گیا ہے کہ وہ اسے مسلّمات کی حیثیت سے پیش فرماتے ہیں اور اُمید رکھتے ہیں کہ سُننے والے بلا تامل اس کی بُرائی پر صاد کر دیں گے؛ کیونکہ چور کے ہاتھ کاٹنے اور زانی کے کوڑے مارنے کو وہ بزعمِ خود طے شدہ رجعت و بربریت خیال کرتے ہیں! نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ هٰذَا الْكُفْرِيَّاتِ

مردوزن کی مخلوط بے حجاب آزادانہ زندگی اور شراب وسود کا رواج اور ناچ رنگ کا باقاعدہ اہتمام تو ایک طرف رہا یہ لوگ ”ثقافتِ اسلامی“ اور اسی طرح کے دیگر ظاہر فریب عنوانوں سے ایسے ادارے قائم کرتے ہیں جو دن رات حدیث کی حجیت کو ختم اور رسول اللہ ﷺ کے واجب الاتباع ہونے کو غلط ثابت کرنے میں لگے رہیں جو نماز روزے اور زکوٰۃ تک کو محرّف ومنسوخ فرما دیں۔ جو ہر ترقی پسندانہ معصیت کا جواز پیدا کریں۔ اور اسلامی حکم کا کچومر نکال دیں۔ (اس گروہِ منافقین کے ذہن و دماغ کی نمائندگی کرنے والے ایک صاحب سنتِ نبوی کو ہی بربادی وگمراہی کی جڑ بتاتے

ہوئے لکھتے ہیں کہ: "یہ سنت ہی تھی جس کی وجہ سے مذہبی تحریک کا اپنے پورے زور و شور اور شیطنت کے ساتھ آغاز ہوگیا۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔"...... گویا ان "مومنین" کے نزدیک اسلام میں فساد کی جڑ نعوذ باللہ رسول اللہ کی احادیث ہی ہیں)

میں پوچھتا ہوں اگر یہ سب کچھ کہتے اور کرتے ہوئے بھی مسلمان مسلمان ہی رہتا ہے تو خدا کے لیے مولانا مدنی اور علمائے موجود فرمائیں کہ منافق کس چڑیا کا نام ہے۔ نفاق کس عنقا کو کہتے ہیں۔ آخر وہ کونسی ایکسرے مشین ہے جس کے ذریعہ کسی شخص کا نفاق معلوم کیا جاسکتا ہے؟ دورِ رسالت کے منافقین تو کبھی کبھار حج بھی کر لیتے تھے نماز بھی پڑھ۔ لیتے تھے زکوٰۃ بھی دے دیتے تھے۔ قرآن بتاتا ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَ اِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَ لَا یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۱۴۲﴾ (النساء، پارہ ۵)

"یہ منافقین اللہ سے دغابازی کرتے ہیں اور اللہ ہی ان کو دغا دے گا اور یہ جب نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو نہایت بے دلی سے لوگوں کو دکھانے کے لیے اور اللہ کو بہت کم یاد کرتے ہیں"۔

لیکن دورِ حاضر کے مغرب زدہ اور یورپ پرست لیڈر تو دکھاوے تک کو مفروضاتِ دینیہ کے قریب نہیں پھٹکتے (الا ماشاء اللہ) انھیں دنیا پرستانہ اعتبار سے اس کی ضرورت بھی بہت کم ہے؛ کیونکہ دورِ مبارک میں تو اقتدار مومنین کے ہاتھ میں تھا منافق بغیر دکھاوے کے مفادات حاصل نہ کر سکتے تھے؛ لیکن آج اقتدار ان کے ہاتھ میں ہے کسی کی باز پُرس کا ڈر نہیں اور صرف اُن اوقات میں یہ کوئی دکھاوا کرنے کی زحمت گوارا فرما لیتے ہیں جب عوام کے ووٹ اور اگلے الیکشن کا کابوس سر پر سوار ہوتا ہے۔ حق یہ ہے کہ پاکستان کی مسندِ اقتدار ان کے قبضہ میں آجانے کے بعد ان کا نفاق بالکل اظہر من الشمس ہوگیا ہے۔ اب یہ کھل کر طاقت کے ذریعہ اسلام کا راستہ روکتے اور باطل کی ترویج و تنصیب کرتے ہیں۔ دکھاوے کے لیے اُن احکامِ دینیہ اور اُمورِ شرعیہ کے قیام و انصرام پر تو تیار ہو رہتے ہیں جن سے ان کے اپنے عیش و نشاط اور اہواء و خواہشات پر زد نہ پڑتی ہو؛ لیکن جن احکام سے ان کی اپنی باطل پرستی اور فرعونیت اور عیاشی و ظلمرانی میں فرق آنے کا بعید تر اندیشہ بھی ہو انھیں زبردستی نوکِ شمشیر سے پسپا کر دیتے ہیں۔

بہر حال مذکورہ آیات سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ اگر کسی شخص میں بدلائل قویہ منافقت کا ثبوت مل جائے تو اس کی کبھی کبھی کی نمازیں اور خدا کو یاد کرنا بھی اس بات کی دلیل نہ مانی جائے گی کہ وہ شخص منافق نہیں رہا۔

آئیے ذرا دیکھیں۔ ہمارے رسول ﷺ فداہ امی و ابی نفاق کی کیا علامات بیان فرماتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"منافق کی تین علامتیں ہیں۔ جب بات کرے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے ایفا نہ کرے، جب امانت سونپی جائے خیانت کر جائے"۔

یہ حدیث بخاری کی ہے۔صحیح مسلم میں ان الفاظ کا اضافہ بھی ہے کہ اگر چہ روزہ رکھے اور نماز پڑھے اور یہ دعویٰ کرے کہ میں مسلمان ہوں۔الفاظ یہ ہیں:

اٰياتُ المنافق ثلثٌ: وان صام وصلّٰی وزعم أنّه مسلمٌ إذا حدَّثَ كَذَبَ وإذا وعد اَخْلَفَ وإذَا اؤْتُمِنَ خَانَ. (مسلم)

"منافق کی نشانیاں تین ہیں: اگر چہ روزہ رکھتا ہو نماز پڑھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلم جتلاتا ہو، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو ایفانہ کرے، جب امانت سونپی جائے تو خیانت کر جائے"۔

ایک اور روایت بخاری ومسلم بالاتفاق یہ بیان کرتے ہیں:

عن عبدالله ابن عمر قال قال رسول الله صلّى الله عليه وسلم أربعٌ من كنّ فيه كان منافقًا خالصاً ومن كانت فيه خصلة مِنْهُنَّ كانت فيه خصلةٌ من النفاق حتّٰى يدعها إذا اؤْتُمِنَ خَانَ وإذا حدّث كَذَبَ وإذَا عَاهَدَ غَدَرَ وإذا خَاصَمَ فَجَرَ.

''عبداللہ ابن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چار باتیں ہیں جو اگر کسی میں ہوں تو وہ پورا پورا منافق ہے اور جس میں ان باتوں میں سے کوئی ایک بات ہو تو گویا اس میں نفاق کی ایک خصلت موجود ہے۔ یہاں تک کہ اسے چھوڑ دے (وہ چار باتیں یہ ہیں) جب امانت سونپی جائے تو خیانت کرے اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے اور جب عہد کرے تو توڑ دے اور جب جھگڑے تو فحش، بدزبانی کرے"۔

ان صریح وصحیح احادیث کی ضرورت اگر چہ اُن لوگوں کے حق میں نہیں رہتی جو کھلّم کھلاّ آیاتِ قرآنیہ سے استہزا اور تمسخر کر رہے ہوں جو برملا احکام کفر کو بہتر اور احکام قرآن وسنت کو کمتر ادنیٰ تر بلکہ غیر منصفانہ غیر مہذب اور قابل نفرت قرار دے رہے ہوں تاہم اِن حدیثوں کی روشنی میں بھی ان کے کردار کا مطالعہ فرمالیا جائے۔

خیانت اور جھوٹ اور بدعہدی اور بدکلامی وفحش بینی وغیرہ ان لوگوں کے یہاں اس کثرت وشدت سے پائی جاتی ہیں کہ گویا یہ چیزیں ان کی نگاہ میں عیب وگناہ ہی نہیں ہیں؛ چنانچہ انفرادی معاملات میں تو کیا اجتماعی معاملات میں بھی کھلے بندوں یہ ان سب کے مرتکب ہوتے ہیں اور بلاخوف وتامل ہوتے ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر اپنی ان بداعمالیوں کو محمود وحسن ثابت کرنے کی سعی نامحمود کرتے ہیں۔

تب کہیے مولانا مودودی نے کیا بیجا کہا کہ ایسے لوگ مسلمان نہیں ہیں۔جھوٹ کہتے ہیں وہ اگر خود کو مسلمان کہتے ہیں۔بات اگر کچھ تشنہ رہ گئی ہو تو لیجیے اور سنیے:

امام الاتقیاشاہ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں:

''تیرا عمل تیرے عقائد کی دلیل ہے اور تیرا ظاہر تیرے باطن کی علامت ہے''۔ (انوارِ سبحانی)
عمل کے بغیر شہادتِ ایمان اور اقرارِ توحید و رسالت کے لاحاصل ہونے کو آپ شاہ صاحب ہی کے سابق نقل کردہ وعظ میں بھی ملاحظہ فرما چکے ہیں۔
ابی اسحاق شاطبی ''الموافقات فی اصول الشریعۃ'' میں فرماتے ہیں:

قال الحسن اعتبروا الناس بأعمالهم ودعوا اقوالهم فإن الله لم يدع قولًا إلّا جُعِلَ عليه دليلًا من عمل يصدقهٗ أو يكذبه. (ج۱/ص۶۵)

''حسن نے کہا ہے کہ لوگوں کا تشخص ان کے اعمال کے مطابق کیا جاتا ہے اور ان کے اقوال کو چھوڑ دیا جاتا ہے، پس اللہ نہیں اعتبار فرماتا قول کا؛ لیکن یہ کہ اس پر عمل کے ذریعہ ایسی دلیل قائم کی جائے کہ یا تو اس قول کی تصدیق کردے یا تکذیب۔
اور صحابیٔ جلیل ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:

إنّ الناسَ احسنوا لقول كلّهم فمن وافق فعلُه قولَهٗ اصاب حظّه ومن خالف فعلُهٗ قولُه فإنما يولح نفسهٗ. (حوالہ بالا)

''زبان کی حد تک تو سبھی لوگ اچھی باتیں کرتے ہیں، پس جس شخص کا فعل اس کے قول کے موافق ہوا اسے تو اس کا حصہ مل رہے گا اور جس شخص کا فعل اس کے قول کے خلاف ہوا تو سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ اپنے آپ کو دھوکے اور غلط فہمی میں مبتلا کیے ہوئے ہے''۔
یہ تو فعل و عمل کا معاملہ ہوا۔ میں آپ کو یہ دکھا چکا ہوں کہ مولانا مودودی جن لوگوں کو غیر مسلم گردان رہے ہیں وہ نہ صرف افعالِ قبیحہ میں بری طرح گرفتار اور اعمالِ صالحہ سے قطعاً بیگانہ ہیں؛ بلکہ عقائد کے لحاظ سے بھی مومن نہیں ہیں اور قرآنی آیاتِ صریحہ تک کا تمسخر کرتے اور مذاق بناتے ہیں۔ حالانکہ آیاتِ قرآنی تو بڑی چیز ہیں اگر کوئی شخص کسی ثابت اور متفق علیہ امرِ مسنون کی مسنونیت سے انکار کرے تو کافر ہو جاتا ہے؛ کیونکہ حضور علیہ السلام جس چیز کو دین میں پسندیدہ ٹھیرادیں، اور آپ کی پسندیدگی کا علم احادیثِ متواترہ سے ہو جائے تو اس کو ناپسندیدہ سمجھنے والا رسالت کی حقیقت سے ناآشنا اور فی الاصل منکرِ رسول ہے۔

عقل کا فیصلہ

علمی و شرعی بحث کو بالائے طاق رکھ کر ذرا عقل کی بارگاہ میں بھی اس مسئلہ کو پیش کیجیے۔
ایک شخص زید زبان سے یہ کہتا ہے کہ میں طلحہ سے محبت رکھتا ہوں اور اُسے اپنا لائق احترام بزرگ تسلیم کرتا

ہوں؛ لیکن عمل اس کا یہ ہے کہ طلحہ نے بزرگانہ اور مشفقانہ حیثیت سے جو متعدد احکام اسے دیے اور جن متعدد کاموں کو انجام دیتے رہنے کی مکرر سہ کرر تاکید کی انھیں وہ قطعاً ترک کیے ہوئے ہے اور یہ ترک غفلت و بے حسی کی اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ اب یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میرے ذمہ کچھ کاموں کی ادائیگی بھی ہے۔ دوسری طرف جن متعدد کاموں سے طلحہ نے شدت و اصرار کے ساتھ روکا تھا انھیں زید برابر کیے جارہا ہے اور یہ احساس تک جاتا رہا کہ ان کاموں کو منع کیا گیا ہے۔ مستزاد یہ کہ اس کے اختیار و دسترس کی حدوں میں اگر کوئی معاملہ اس طرح کا پایا جاتا ہے کہ اس سے طلحہ کو کچھ فائدہ پہنچتا ہو تو یہ اپنی پوری طاقت وصلاحیت اس معاملہ کو ایسی شکل دے دینے میں لگا دیتا ہے جس سے طلحہ کو بجائے نفع کے زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچے۔ بالارادہ ایسی حالتیں پیدا کرتا ہے کہ طلحہ کو زندگی کا سانس لینا تک مشکل ہو جائے اور ہر اُس طاقت سے گٹھ جوڑ کرتا ہے جو طلحہ کی دشمن اور اسے برباد کرنے کے درپے ہو۔

تو فرمائیے کیا طلحہ سے محبت رکھنے اور اسے لائق احترام سمجھنے کے زبانی دعوے کو عقل درست مانے گی یا یہ کہہ کر رَد کر دے گی کہ زید جھوٹا ہے، منافق ہے، غلط گو ہے؟ میں سمجھتا ہوں، اور آپ بھی اسے مانیں گے کہ عقل کا فیصلہ ہرگز زید کے حق میں نہیں ہوسکتا۔ تب طلحہ کو آپ ''اسلام'' کی جگہ سمجھ لیجیے اور زید کو اُن لیڈرانِ کرام کی جگہ جن پر مولانا مودودی نے محاکمہ کیا ہے اور جن کی وکالت مولانا مدنی نے فرمائی ہے۔ یہ لیڈر ضرور اپنے دعوۂ اسلام میں جھوٹے اور منافق مانے جائیں گے۔

یہاں یہ نہ بھول جائیے گا کہ میرا روئے سخن صرف اُن لیڈروں کی طرف ہے جن کے بارے میں مولانا مودودی نے کلام کیا ہے یعنی جو بدعملی و بدکرداری میں اس قدر غرق ہو گئے ہیں کہ فرائضِ اسلامیہ اور عباداتِ شرعیہ کی فرضیت کا احساس بھی ان کے اندر فنا ہو چکا ہے اور وہ برملا اسلام اور قرآن وسنّت کے خلاف قولاً وعملاً آواز اُٹھا رہے ہیں، طاقت لگا رہے ہیں اور کفر وفسق کے قیام ونصب پر اصرار کر رہے ہیں۔ ورنہ جو لیڈر اس درجہ میں نہیں پہنچے؛ بلکہ انھیں کسی درجہ میں خوفِ خدا اور پاسِ اسلام باقی ہے، انھیں میں نہیں کہہ رہا۔

دوسری مثال یہ دیکھئے کہ ایک شخص کہتا ہے کہ پلاؤ کو ہر کھانے سے اچھا سمجھتا ہوں۔ اس کی خوبیاں دنیا کے ہر کھانے سے زیادہ ہیں، جو شخص اسے کھائے پوری طرح تندرست ہو جاتا ہے اور زبردست فائدے اسے پہنچتے ہیں۔

اس زبانی دعوے اور اظہارِ خیال کے ساتھ اس کی عملی حالت یہ ہے کہ نہ تو اپنے گھر کبھی پلاؤ پکواتا ہے نہ اپنے اہل وعیال کو اس کے کھانے کی ترغیب دیتا ہے؛ بلکہ ایسی صورتیں پیدا کرتا ہے کہ پلاؤ کی صورت بھی کبھی گھر میں نظر نہ آئے؛ چنانچہ اپنے بچوں کو ایسی درسگاہوں میں بھیجتا ہے جہاں بعض اور کھانوں کی خوبیاں اور فوائد پلاؤ سے کہیں بڑھ چڑھ کر بیان ہوتے ہیں اور پلاؤ کا ذکر ہی نہیں آتا۔ یا آتا ہے تو یوں ہی ضمناً اور بطورِ تحقیر وتقلیل۔ پھر یہ شخص دعوتوں میں جاتا ہے تو پلاؤ کی رقاب کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا؛ بلکہ دوسرے کھانے کھاتا ہے اور میزبان اگر کہے

کہ پلاؤ تناول فرمائیے تو حیلوں بہانوں سے ٹال جاتا ہے اور اگر کچھ لوگ اصرار کریں پلاؤ ضرور کھائیے یا یوں کہیں کہ ہم چاہتے ہیں آپ کے سب بھائی پلاؤ جیسی عمدہ اور نفع بخش چیز کھاسکیں اس کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنے میں آپ ہماری مدد کیجیے تو بجائے اقرار اور تعاون کے یہ ان لوگوں کی جان کے درپے ہو جائے اور طرح طرح کے ظلم وفریب سے انھیں مجبور کرے کہ پلاؤ کھانے کھلانے کا ذکر مت کرو۔ تب بتائیے کیا کوئی ہوشمند مانے گا کہ اس شخص کے دل میں پلاؤ کی اچھائی اور خوبی اور نفع بخشی کے تصور کی کوئی رمق بھی ہے؟

آپ حضرات جانتے ہیں کہ اسلام جسم ہے اور ایمان روح، جس طرح جسم بغیر روح کے مٹی کا ڈھیر ہے۔ اسی طرح روح بھی بغیر کسی جسم کے ہمارے لیے مشاہد و معلوم نہیں ہو سکتی۔ ایمان ٹھیک روح کی طرح مشاہدۂ عینی سے ماورا ہے یعنی ہم اسے آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ اس کا جسم اللہ جل شانہٗ نے اسلام کو بنایا ہے اسلام اعمال و عبادات کا مجموعہ ہے۔ اگر کوئی اسلامی اعمال وعبادات کو روبہ عمل لاتا ہے تو ہم جان لیتے ہیں کہ روح ایمان موجود ہے۔ پابندی سے تمام عبادات نہیں کرتا؛ بلکہ ناغے کر کے کرتا ہے اور بعض کو چھوڑے بھی رکھتا ہے تو ہم پھر بھی اس کے ایمان سے انکار نہیں کرتے جیسے کہ ایک آدمی کی پانچ اُنگلیاں کٹ گئی ہوں یا آنکھیں پھوٹ گئی ہوں یا پیر قلم ہو گیا ہو تب بھی ہم یہ نہیں کہتے کہ اس کی روح نکل گئی؛ لیکن اگر ایک آدمی کے دونوں ہاتھ دونوں پیر کٹ گئے ہوں سر قلم کر دیا گیا ہو صرف حلق سے ناف تک کا حصہ جسم چھپکلی کی اُس دُم کی طرح تڑپ رہا ہو جو کاٹ دیے جانے کے بعد کچھ دیر متحرک رہتی ہے تو بتائیے کون ہوش مند آدمی اسے زندہ مانے گا، کون اسے ذی روح کہے گا، کون اِس مضغۂ گوشت کو ذی حیات انسانوں میں شمار کرے گا۔

یہی حال بعینہٖ اُن لیڈرانِ کرام کا ہے جن کے زبانی دعوۂ اسلام کو شہادت عمل کے بغیر مولانا مدنی قابل لحاظ اور مقبول ٹھیرا رہے ہیں۔ مولانا موصوف کو خوب معلوم ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ جب حضور ﷺ کا ارشاد: مَنْ قَالَ لَاإِلٰهَ إِلَّااللّٰهُ فَقَدْ دَخَلَ الْجَنَّةَ (جس نے لاالٰہ الااللہ کہا سمجھ لو کہ جنت میں داخل ہوا) دیگر صحابہؓ کو سنانے جارہے تھے تو حضرت عمر فاروقؓ نے سینہ پر دو ہتڑ مار کر واپس لوٹا دیا تھا اور جب حضور ﷺ سے انھوں نے عرض کیا کہ اس اعلان و اظہار سے لوگ عمل کی طرف سے غافل ہو جائیں گے تو حضور ﷺ نے اس کی تردید نہیں کی تھی گویا فن حدیث کے قاعدۂ مشہورہ ''ترکِ انکار'' کے تحت حضرت عمرؓ کا خیال وقیاس بارگاہِ رسالت سے مقبولیت و صحت کی سند پا گیا۔ جس کا کھلا مطلب یہ ہے کہ کوئی بات خواہ کتنی ہی صحیح ہو؛ لیکن اس کے اعلان و اشاعت سے اگر دینی ضرر پیدا ہوتا ہو تو بلا شدید ضرورت کے اسے چھپا کے رکھنا ہی اچھا ہے؛ چنانچہ ابن تیمیہؒ نے باوجود یہ تسلیم کرنے کے کہ امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول اگرچہ اعتقاداً درست ہے کہ ایمان نام ہے صرف معرفت اور اقرار کا اعمال اس کا جز نہیں ہیں؛ مگر اس کی وجہ سے فساد پیدا ہوا ہے اور اس کے نتیجہ میں لوگوں کے دلوں سے اعمال کی وقعت

نکل جاتی ہے۔فدوی عرض کرتا ہے کہ امام اعظمؒ نے تو شدید ضرورت میں یہ قول اختیار کیا تھا۔جس فساد کا ابن تیمیہ نے ذکر کیا ہے اس سے کہیں زیادہ فساد عقائد میں بھی اور معاشرے میں بھی خوارج و معتزلہ کے ہاتھوں پھیل جاتا اگر امام اعظم اس قول کی تلوار سے ان کے علمِ کلام کو زخمی نہ کر دیتے۔خوارج و معتزلہ کا شر محض فتووں سے رفع ہونے والا نہ تھا ان کے ہاتھ میں علمِ کلام کی باگیں تھیں، ان کے پاس تیز عقلیں اور طرّار زبانیں تھیں۔زبان عقل اور علمِ کلام ہی کے ذریعہ ان کا توڑ ہوسکتا تھا۔پس امام اعظم نے دین اور ملّت کو بہت بڑے فساد سے بچانے اور معاشرے کو بدامنی و تباہی سے محفوظ رکھنے کے لیے مجبوراً ہلکی خرابی کو گوارہ کرلیا کہ یہی عقلمندوں کا شیوہ ہے؛لیکن خدا جانے بدعمل و اسلام دشمن لیڈروں اور اعمالِ صالحہ سے سرتاسر غافل عوام الناس کو مولانا مودودی کے بزبانِ وعظ غیر مسلم کہہ دینے سے کون سا عظیم فساد دینی و عملی پیدا ہوگیا تھا کہ مولانا مدنی نے ٹھیک وہی بات ڈنکے کی چوٹ اصرار و تاکید کے ساتھ چھاپ دی جس کو عوام میں شائع کرنے کے ارادے پر حضرت ابوہریرہؓ نے فاروقِ اعظمؓ کا دوہتّڑ کھایا تھا۔کیا آج بھی خوارج و معتزلہ کا کہیں نمود ہے یا ہے تو ان سے محفلِ مناظرہ سجی ہے؟

حدیثِ جبرئیل

مولانا مدنی ہر سال بخاری پڑھاتے ہیں، ہم جیسے بے علموں سے بہت زیادہ انھیں خبر ہے کہ بخاری کتاب الایمان میں ایک حدیث ہے جو حدیثِ جبرئیل کہلاتی ہے۔اس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت جبرئیلؑ نے پوچھا کہ اسلام کیا ہے؟حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَاتُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَتُقِيْمَ الصَّلٰوةَ وَتُؤَدِّيَ الزَّكٰوةَ الْمَفْرُوْضَةَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ.

”اسلام یہ ہے کہ عبادت کرو اللہ کی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو، جو کہ مقرر کی گئی اور رمضان کے روزے رکھو۔“

ظاہر ہے کہ مسلمان اسی کو کہتے ہیں جو”اسلام“رکھتا ہو اور”اسلام“عبادتِ الٰہی اور اعمالِ مفروضہ ہی کا نام بتایا گیا تو جو لوگ عبادت اور اعمالِ مفروضہ سے اس حد تک بے نیاز ہوچکے ہوں کہ بھولے سے بھی ان کے پاس نہ پھٹکیں اور دل و دماغ سے اس خیال ہی کو خارج کردیں کہ اعمالِ مفروضہ شرعیہ بھی کوئی فرض ان کے ذمے ہیں تو ایسے لوگوں کو غیر مسلمان تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمارہے ہیں مولانا مودودی نے کیا خطا کردی اگر کہہ دیا کہ وہ مسلمان نہیں ہیں!

مولانا مودودی کی جو عبارت اعتراض کا ہدف تھی اس کی تنقیح تو کافی وافی ہوچکی۔اب مولانا مدنی نے یہ بھی کیا ہے کہ

"خطبات"، ہی میں سے اور چھوٹی چھوٹی عبارتیں اسی مفہوم کی لے کر جس پر یہ مذکورہ عبارت مشتمل تھی وہی اعتراض کیے ہیں جن کا تجزیہ کیا جا چکا۔ تو اب میں ہر ٹکڑے پر مزید بحث لاحاصل سمجھتا ہوں۔ مثلاً مولانا مودودی کے یہ الفاظ ہیں:

"اِن دو ارکان (نماز روزہ) سے جو لوگ روگردانی کریں ان کا دعوائے ایمان ہی جھوٹا ہے"۔

ان پر مولانا مدنی نے اعتراض فرمایا ہے کہ لیجیے ہندو پاک کے سربرآوردہ لیڈروں کو کافر بنا دیا گیا۔ میں نہیں جانتا کہ واقعی مولانا قبلہ "روگردانی" کا صحیح مفہوم نہیں جانتے یا پھر قصداً اُس کا غلط مفہوم لے رہے ہیں۔ بہر حال "روگردانی"، "سرکشی" کا مرادف ومماثل ہے۔ از روئے سرکشی رکن اسلام کا ترک کرنا جملہ علمائے حق کے نزدیک بالاجماع سبب کفر ہوتا ہے۔ امام احمد ابن حنبلؒ فرماتے ہیں:

"آدمی اسلام سے صرف اس وقت خارج ہوتا ہے جب وہ خدا سے بزرگ و برتر کے ساتھ کسی اور کو شریک کرے یا خدا کے فرض کیے ہوئے فرائض میں سے کس فریضہ کی بجا آوری کو از روئے سرکشی بروئے عمل نہ لائے"۔ (المناقب بواسطہ امام احمد ابن حنبل: ص ۲۱۷)

ترکِ نماز کا معاملہ ان کے نزدیک جُداگانہ ہے۔ اس کے ترک کیے رہنے پر تو وہ کفر کا اطلاق کرتے ہیں خواہ از روئے سرکشی نہ ہو ازراہِ غفلت و کاہلی ہو۔ بتائیے مولانا مودودی نے ان سے زیادہ اور کون سی قیامت ڈھا دی ہے۔

دوسری عبارت ہے:

"قرآن کی رو سے کلمۂ طیبہ کا اقرار ہی بے معنیٰ ہے اگر آدمی اس کے ثبوت میں نماز اور زکوٰۃ کا پابند نہ ہو"۔

اسے شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ کے وعظِ منقولہ اور قولِ گزشتہ سے ملا کر دیکھیے اور جو بھی حکم مولانا مودودی پر لگائیں ان پر بھی لگائیے۔

علاوہ ازیں بخاری اُٹھا کر دیکھیے خود رسولِ اکرم ﷺ نے ہی کبھی ایمان کو عمل ہی تعبیر فرمایا اور عمل ہی کے ذیل میں لیا ہے۔ آپ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ! کونسا عمل سب سے بہتر ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ایمان!

بخاری نے اس حدیث کو اُسی ذہن کی ترجمانی میں بیان کیا ہے جو خطبات کے مواعظ میں مولانا مودودی کے ظاہری الفاظ سے مترشح ہوتا ہے اور جس پر خروج واعتراض کے فتوے دیے جا رہے ہیں۔ بخاری کے عنوانِ باب میں الفاظ ہیں کہ: "مَنْ قَالَ إِنَّ الْإِيْمَانَ هُوَ الْعَمَلُ" پھر بخاری نے اس کے ثبوت میں قرآن کی دو آیات قرآنیہ بھی نقل کی ہیں، خصوصاً دوسری آیت کے باب میں تو یہ بھی واضح کیا ہے کہ علماء کی ایک جماعت نے عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ میں عمل کا مطلب ایمان ہی لیا ہے؛ نیز ایک اور آیت "فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُوْنَ" کا مطلب بھی بعض علماءِ سلف فَلْيُؤْمِنُ الْمُؤْمِنُوْنَ لکھتے ہیں۔

اور دیکھئے! بخاری ذرا آگے یہ بھی فرماتے ہیں کہ قرآن کی آیت: ''وَمَاكَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ'' میں ایمان کا مطلب نماز ہے اور بطورِ دلیل حدیث زیرِ باب کے راوی زُہیر کا یہ قول بیان کرتے ہیں کہ ہم سے ابو اسحاق نے براء کی روایت سے یہ بیان کیا کہ تحویل قبلہ سے قبل کچھ لوگ قبلۂ اوّل بیت المقدس کی طرف نماز پڑھ کر مرگئے تھے، ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ان کے متعلق کیا گمان کریں۔ آیا ان کی نمازیں مقبول ہوئیں یا نامقبول۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی سَيَقُوْلُ کی ابتدائی آیات بھی اس کی تائید کرتی ہیں کہ ایمان سے مراد اس آیت میں نماز ہی ہے۔ نظم کلام اور سیاق وسباق پوری طرح اس پر دال ہے۔

کیا اس کے بعد بھی مولانا مودودی کا یہ جرم، جرم ہی رہتا ہے کہ انھوں نے خطبات کے وعظ میں دو چار جگہ نماز وزکوٰۃ کو لفظِ ایمان سے تعبیر فرمالیا؟

اہلِ سنت والجماعت کا اصل مذہب

جاننا چاہیے کہ علمائے حق کا مذہب یہ ہے کہ جس شخص کے اندر ایمان ہوگا وہ بداعمالیوں کی سزا بھگت کر آخر کار جنت میں ضرور جائے گا۔ اس مذہب سے نہ جماعتِ اسلامی کو اختلاف ہے نہ مولانا مودودی کو۔ نہ کسی متقی اور بالغ نظر عالم کو ہوسکتا ہے۔

مگر بحث اس کی رہ جاتی ہے کہ کس طرح جانا جائے کہ کسی شخص کے قلب میں ایمان ہے یا نہیں۔ اگر مجرد یہ دلیل کافی ہو کہ وہ شخص خود کو مسلمان کہتا ہے اور مسلمانوں جیسا نام رکھتا ہے یا کبھی کبھار عید بقر عید کی نماز بھی پڑھ لیتا ہے تو منافق کوئی بھی نہ ہوسکے گا اور قرآنی آیات معطّل ہوجائیں گی اور علاماتِ نفاق پر مشتمل حدیثیں عبث ٹھیریں گی۔ ماننا پڑے گا کہ کچھ علامات ایسی ضرور ہیں جن کی موجودگی میں کسی دعوۂ اسلام کرنے والے کو منافق کہا اور سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ علامتیں اس سے زیادہ اور کیا ہوں گی کہ ایک شخص ارکانِ اسلام مستقلاً ترک کردے، رہن سہن اور مشاغل کو خلافِ اسلام بنالے۔ ممنوعاتِ شرعیہ کو عملاً دائرۂ معروفات میں شامل کرلے۔ مکروہ وحرام اُمور کو فخریہ اختیار کرے۔ باعمل نیک مسلمانوں کو نگاہِ حقارت سے دیکھے اور اگر کچھ لوگ نظامِ اسلامی کی خواہش کریں تو ساری ممکن ومہیا قوتیں ان کی خواہش کو رَد کرنے اور نظامِ طاغوت کو ثابت وقائم رکھنے میں صرف کردے اور اسلام کا راستہ روکنے میں ظلم وجبر اور دھاندلے بازی اور فریب ودغا کو کھلم کھلا بے تکلف استعمال کرے، یہ علامات و صفات بداہۃً ایک مدعیٔ اسلام کو اس کے دعوے میں جھوٹا ثابت کرکے منافق ٹھیراتی ہیں۔

لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ایمان کی بالفاظِ انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دو قسمیں ہیں سیاسی اور شرعی۔ ویسے تو بعض علماء نے زیادہ بھی قسمیں کی ہیں؛ لیکن بہرحال یہ دونوں قسمیں کافی جامع ہیں اور تمام ائمہ وعلماء نے ان کا لحاظ

فرمایا ہے۔ اس تقسیم کا مطلب یہ ہے کہ ریاستِ مسلمہ کی عدالتِ شرعی میں جب کسی شخص کے مومن و مسلم ہونے نہ ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا تو شرائط اور ہوں گے اور اولیاء و صلحاء میں جب خالص دینی معیار سے کسی شخص پر مومن و مسلم ہونے یا نہ ہونے کا حکم لگایا جائے گا تو شرائط اور ہوں گے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی شخص زید کو زنا کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور وہ شخص خود شرعی عدالت کا قاضی بھی ہو تو اگرچہ وہ ذاتی طور پر زید کے زانی ہونے کی قسم تک کھالے گا اور یقین رکھے گا کہ اللہ کے یہاں یہ سزائے زنا کا مستحق ہوا؛ لیکن عدالت کی مسند پر بیٹھ کر اس پر حدِ شرعی جاری نہ کر سکے گا؛ کیونکہ سیاستِ شرعیہ میں چار گواہوں کے بغیر الزامِ زنا ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح متعدد علاماتِ نفاق کو دیکھ کر ایک واعظ و خطیب اور عالم و زاہد کسی شخص کو منافق اور بے ایمان ٹھیرا سکتا ہے؛ لیکن عدالتِ شرعیہ اسلامیہ میں اتنی آسانی سے اس شخص پر حدِ ارتداد جاری نہیں ہو جائے گی؛ بلکہ بہت مضبوط اور قطعی قسم کی شہادتوں سے ارتداد و نفاق کا فیصلہ ہو گا اور توبہ کا مجاز پھر بھی باقی رہے گا؛ لہٰذا اگر مولانا مدنی کی تحریروں سے کچھ لوگ یہ یقین کر چکے ہیں کہ مولانا مودودی بے عمل او بد عمل لوگوں کو مسلمان ماننے پر تیار نہیں ہیں، تو اگرچہ اس طرح کا غلو آمیز عقیدہ ان کی طرف منسوب کرنا خالص دھاندلے بازی ہے؛ لیکن اس سے بڑی دھاندلے بازی بلکہ جہالت و سفاہت یہ ہوگی کہ وہ اس صغریٰ کے ساتھ یہ کبریٰ بھی جوڑ دیں کہ مرتد کی سزا قتل ہے، لہٰذا مولانا مودودی اگر شرعی قاضی بنا دیے جائیں تو ان سب کے قتل کا فیصلہ لکھ دیں گے۔ ایسا بے علم یا سخت متعصب لوگ تو سوچ سکتے ہیں، عالم اور انصاف پسند نہیں۔

اور دو مثالیں

کسی قول کو اس کے پس منظر اور سیاق و سباق اور مقصد سے جدا کر کے دیکھنے سے کس درجہ غلط اور مکروہ نتائج پیدا ہوتے ہیں اس کو میں متعدد مثالوں سے واضح کر آیا ہوں۔ یہاں پھر دو مثالیں ذہن میں آ گئی ہیں انھیں بھی پیش کر دوں۔

دیکھئے بخاری و مسلم کی بلا اختلاف حدیثِ صحیح ہے کہ:

إِذَا أَمَّنَ الْإِمَامُ فَأَمِّنُوا. (جب امام آمین کہے تو آمین کہو)

کیا اس حدیث صریح کے بعد اس کی گنجائش ہے کہ کوئی شخص یوں کہے امام پر آمین ضروری نہیں ہے؟

لیکن امام مالکؒ کو دیکھیے وہ فرماتے ہیں کہ امام کو آمین نہیں کہنی چاہیے! اس مسلک میں باقی تینوں اماموں میں سے کوئی بھی ان کا ہمنوا نہیں ہے۔ اور حدیثِ صحیح صریحاً اس کو غلط بتا رہی ہے پھر بھی امام مالکؒ جیسا مومن باصفا اور امام الاتقیاء ایسا قول کرتا ہے اور مولانا مدنی مدظلہ کے طرزِ اعتراض کو حق بجانب خیال کرنے

والے بلاتکلف کہہ سکتے ہیں کہ (خاکم بدہن) امام مالک منکرِ حدیث تھے! خود رائے تھے۔ مبتدع تھے! میں تو خوب جانتا ہوں کہ امام مالکؒ نے ایسا کس دلیل سے کہا؛ لیکن پوچھنا معترضین سے ہے کہ وہ کیا عذر لاتے ہیں؟

دوسری مثال اس سے زیادہ خوفناک ہے۔

امام طحاوی کو آپ جانتے ہوں گے، مشہور حنفی محدث وفقیہ، انھیں امام اعظم کا مذہب صرف دو واسطوں سے پہنچا ہے۔ انھوں نے بیان فرمایا ہے کہ تبع تابعی ابراہیم بن الاوسد سے پوچھا گیا کہ جو شخص سجدے میں جاتے ہوئے پہلے ہاتھ ٹیک دے پھر گھٹنے ٹیکے وہ کیسا ہے؟

ابراہیم نے جواب دیا: ایسا سوائے احمق اور مجنون کے کون کرسکتا ہے؟

یہ جواب عوام کے لیے تو کوئی خصوصیت نہیں رکھتا؛ لیکن اگر اُس ذہنیت سے کام لیا جائے جو ''ایمان وعمل'' میں کارفرما ہے تو ابراہیم بن الاسود کو واجب القتل اور زندیق وملحد بنانے میں ذرا دیر نہیں لگے گی؛ کیونکہ احادیثِ صحیحہ کے ذریعہ یہ ثابت ہے کہ حضور سرورِ کونین ﷺ نے بھی متعدد بار پہلے ہاتھ اور پھر گھٹنے ٹیکے ہیں!

ابراہیم کے جواب پر ایک بار اور غور کرلیجیے۔ وہ ہاتھ پہلے ٹیک دینے والوں کو بلاتکلف ''احمق اور مجنون'' فرمارہے ہیں۔ اب جو لوگ پہلے ہاتھ ٹیکنے کے قائل ہیں انھیں تو چھوڑیے، یہاں خود رسول اللہ ﷺ کی نعوذ باللہ سخت توہین نظر آرہی ہے۔ کیا معترضین کرام ابراہیم بن الاسود کو کافر و زندیق بنائے بغیر معاف کرسکتے تھے، اگر اتفاق سے وہ ''مودودی'' ہوتے؟ نہیں کرسکتے تھے۔ جن لوگوں نے اِس صحیح ترین بات کو کہ بخاری ومسلم کی ہر حدیث معنیً ''صحیح'' نہیں ہے مولانا مودودی کی طرف منسوب پاکر انکارِ حدیث اور توہین حدیث اور الحاد وزندقہ کا الزام لگایا، جن لوگوں نے مولانا موصوف کے سیدھے سچے الفاظ کو گمراہی وزندقہ کا ایٹم بم ٹھیرا دیا وہ کہاں چوکنے والے تھے۔ خصوصاً مولانا احمد علی لاہوری تو ابراہیم بن الاسود کے مودودی ہونے کی صورت میں ان کے مذکورہ جواب پر زمین وآسمان ایک کردیتے، قیامت اُٹھا دیتے، جب کہ وہ جوشِ مخالفت میں افترا اور تلبیس وتدلیس اور تحریف وایجاد تک سے گریز نہیں فرماتے ہیں۔

خدا کے لیے سوچیے!

حقیقت یہ ہے کہ عوام تو خطبات کو پڑھ کر اس کے سوا کچھ نہ سوچ سکتے تھے کہ واقعی نماز روزہ وغیرہ بڑی ضروری چیزیں ہیں اور ہمیں عمل کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ خروج واعتزال کے جو نکتے معترضین کرام دیدہ ریزی ومحنت سے نکال کرلائے ہیں ان تک تو ان کا وہم بھی نہ پہنچ سکتا تھا اور نہ پہنچنے کی وجہ سے کوئی فتنہ نہیں برپا ہوا جارہا تھا؛ لیکن یہ جھگڑا کھڑا ہی کردیا ہے تو چلو بطورِ سعادت مندی فرض کیے لیتے ہیں کہ اچھا صاحب! مولانا مودودی کا عقیدہ

بدعمل مسلمانوں کے سلسلہ میں کچھ گڑبڑ؛ بلکہ بالکل غلط ہے؛لیکن میں خدااور آخرت کے حساب پرایمان رکھنے والے انصاف پسندوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا مولانا مودودی کی برپا کردہ جماعتِ اسلامی کسی مدرسہ کا نام ہے جس میں بلا کردہ سب سے کہہ رہے ہیں کہ مجھ سے اعتقاداتِ ایمانیہ و اسلامیہ کا سبق پڑھواور میرے ہر عقیدے کی ہو بہو پابندی کرو یا حد درجہ بدعمل لیڈروں کے مسلم یا غیر مسلم ہونے کا مسئلہ ایسا بھی ہے جس کا انھوں نے چرچا تو کیاذ کر تک چند بار کیا ہو؟

وہ تو آپ کو صرف اُن احکام واُصول کی عملی پابندی کی دعوت دے رہے ہیں جن پر پہلے ہی سے خود آپ کا ایمان ہے۔وہ آپ کو اُس دین کی اقامت پر بلا رہے ہیں جسے خود آپ مانتے ہیں۔ان کی جماعت و دعوت کے قواعد و مقاصد اُٹھا کر دیکھ لیجیے،ان میں ایسا کوئی ذکر ہی نہیں ملے گا جس سے مسائل جزئیہ اور فروعاتِ فقہیہ کا تعلق ہو۔وہ تو کھلم کھلا بہ تکرار و اصرار کہتے ہیں کہ ہر شخص اپنے فقہی مسالک اور فروعی آراء ساتھ لیے ہوئے جماعت میں آئے اور صرف اُن اساسات پر اتفاق کرلے جو قرآن وسنت کی روشنی میں متفق علیہ اور اختلاف سے بالاتر ہیں۔ مولانا مودودی یا مولانا امین احسن یا مولانا ابواللیث یا اور کوئی رکن جماعت فقہی جزئیات میں خواہ کچھ بھی مسلک رکھتا ہو کسی کو اُس سے کچھ لینا نہیں۔

اب اس کے بعد بھی اگر کچھ لوگ یہ باتیں نکالتے ہیں کہ صاحب مولانا مودودی امّا حوا کو حضرت آدم کی پسلی سے پیدا نہیں مانتے یا آنے والے مہدی علیہ السلام کے چوغے اور امامے کے قائل نہیں یا کسی ایک امام کی مو بہ مو اتباع نہیں کرتے وغیرہ تو دل پہ ہاتھ رکھ کے بتائیے کیا یہ لوگ منصف ومعقول تسلیم کیسے جاسکتے ہیں؟

کیا یہ ٹھیک اُن عیسائی بزرگوں جیسی حرکت نہیں کر رہے جن کے ملک پر دشمن چڑھ آیا تھا؛مگر وہ اسی بحث میں لگے ہوئے تھے کہ حضرت عیسیٰ پر جو روٹی آسمان سے اُتری تھی وہ خمیری تھی یا فطری؟ مرغن تھی یا خشک؟

صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں نے دین کا تمام تر حاصل صرف مکتبوں کی مدرّسی اور فقہی وکلامی بحثوں کی بجا آوری سمجھ رکھا ہے اور انفرادی اعمال وعبادات ہی ان کی نظر میں اسلام کا لُبِّ لُباب ہیں۔امت اور معاشرے کے بارے میں ان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے اور طاغوت کی عملداری اور ہمہ گیر کفر وطغیان پر وہ راضی ہو چکے ہیں۔اسی لیے جب کوئی انھیں اللہ کی راہ میں عملی جدّ وجہد،معاشرے کی اصلاح وتعمیر،طاغوت سے دو بدو جنگ،باطل سے پنجہ کشی،اور ٹھوس حقائق کی سنگلاخ وادی کی طرف بلاتا ہے تو ان کی آرام پسند طبیعت اور حال پر مطمئن جبلّت فقہی وکلامی راگنیاں چھیڑ دیتی ہے اور یہ دعوت دینے والے کو اُلٹا مطعون کرڈالتے ہیں۔

کیا ان کے طرزِ اختلاف کا ٹھیک یہ حاصل نہیں کہ ایک حنفی جب چاہے اُٹھے اور امام شافعی،امام مالک اور امام احمد ابن حنبل کو خاکم بدہن ضال ومضل قرار دیتا چلا جائے یا اسی طرح کسی بھی امام کا مقلد دوسرے جملہ

اماموں کو گمراہ ٹھیرادے؛ کیونکہ ہمارے علماء جس طرح کے کلامی وفقہی اختلافات کا ہوّا بنا کر کھڑا کرتے ہیں ایسے اختلافات تو جملہ ائمہ اور اہلِ علم میں بے شمار ہیں۔

میں پوچھتا ہوں کیا یہاں کوئی شاہی دربار لگا ہے جس میں قرونِ وسطیٰ کے مسلمان درباروں کی طرح علماء و فقہاء میں فقہی اور کلامی عقائد کی بحث چھڑی ہے، عقائدِ فروعیہ پر مناظرہ ہو رہا ہے۔ خلعت و جاگیر بَٹ رہی ہے؟؟؟ کیا یہاں کوئی اکھاڑہ جما ہے جس میں پیدائش حوا ظہورِ مہدی بندوق کے شکار اور اسی طرح کے مسائل فروعی پر علماء کی کشتی ہونی ہے کیا یہاں کوئی عدالت قائم ہوئی ہے جس میں دین کے باغی مسلمانوں کے مومن و مسلم ہونے نہ ہونے کا فیصلہ دے کر انھیں سزائیں دینا یا بَری کرنا ہے؟

میں پوچھتا ہوں برباد و پامال امتِ مسلمہ کی اصلاح و تربیت اور دین حق کی سربلندی و علو کی دعوت کے جواب میں غیر ضروری اور عمل و حرکت سے غیر متعلق بحثیں اُن لوگوں کے سوا کون چھیڑ سکتا ہے جنھیں میدانِ عمل اور محاذِ ابتلا سے جی چُرا کر اپنی مسندِ گفتار و لسان پر بیٹھے رہنا ہو۔ متعدد بار یہ قولِ مبارک سننے میں آیا ہے کہ صاحب امیر کے عقائد و آراء کا اثر اہلِ کارواں پر ضرور پڑتا ہے۔ جو جماعتِ اسلامی میں گیا بس سمجھ لو مولانا مودودی کے ہر عقیدہ و رائے میں گرفتار ہو گیا۔ اس قول کا جوڑ ''اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ'' سے بھی لگایا جاتا ہے۔ بے شک بعض اعتبارات سے یہ قول قابلِ اعتنا بھی ہوتا ہے؛ لیکن جماعتِ اسلامی کے معاملہ میں اسے مشعلِ راہ بنانے والے نہ صرف تعصب و غلو میں گرفتار ہیں؛ بلکہ دانستہ تلبیس و مکر کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

پہلی اہم تر بات تو یہ ہے کہ تقسیم کے بعد اہلِ ہند کے لیے مولانا مودودی کی امارت کا کوئی سوال ہی نہیں رہا۔ ہند کی جماعت کے امیر مولانا ابواللیث ہیں اور ان کی امارت پاکستانی جماعت کے امیر سے جدا مستقل بالذات امارت ہے۔ امیر کی حیثیت سے ہندی مسلمان کا روئے سخن مولانا ابواللیث کی طرف ہونا چاہیے، نہ کہ امیرِ جماعتِ پاکستان کی طرف۔

دوسری بات یہ ہے کہ امیر کا مقام و منصب زیر بحث معاملہ میں ہرگز وہ نہیں ہے جو ''اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ'' میں ''مُلُوْکْ'' کا ہے۔ یہاں بادشاہتیں اور وزارتیں نہیں بَٹ رہی ہیں محض نظم و ضبط اور انتظام و انصرام کی خاطر ایک امیر نامزد کر لیا گیا ہے جسے ایسا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے جس سے وہ افرادِ جماعت کو بگاڑنے اور ان کے عقائدِ فقیہ پر اثر انداز ہونے کا فائدہ اُٹھا سکے۔

تیسری بات یہ ہے کہ امیر اور اقتدارِ اعلیٰ کی جو خصوصیات عوام الناس پر اثر ڈالتی ہیں وہ فروعی و جزئی عقائد سے متعلق کبھی نہیں ہوتیں؛ بلکہ وہ ہوتی ہیں جو امیر کے کردار میں نمایاں اور غالب ہوں، جو اس کے طریقۂ امر و نہی میں عامل اور رہنما کی حیثیت رکھتی ہوں۔ جو اس کے مجموعی مزاج اور فکر و تخیل پر چھائی ہوئی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ

جماعتِ اسلامی کے افراد حسنِ اخلاق، صاف گوئی، پابندیِ فرائض، اجتناب عن المعصیت اور جھدلا قامۃ الدین میں تو واقعی بہت نمایاں ہو گئے کہ یہی صفات مولانا مودودی اور مولانا ابواللیث کے کردار میں نمایاں اور طرزِ فکر میں غالب اور مجموعی مزاج میں عامل و رہنما تھیں؛ لیکن فقہی جزئیات وعقائد میں وہیں رہے جہاں تھے جو شافعی تھا شافعی رہا، جو حنفی تھا حنفی رہا۔ جو اہلِ حدیث تھا اہلِ حدیث رہا۔

اس باب میں جب یہ کہا جاتا ہے کہ علمائے کرام تو کھلم کھلا کانگریس کی اَمارت وقیادت میں چلے جا رہے ہیں، گاندھی جی کو راہنما اور پنڈت نہرو کو قائد اور دستورِ کانگریس کو حجت تسلیم فرمائے ہوئے ہیں اور سوشلزم کو کمالِ عمرانیت وجمہوریت مان رہے ہیں۔ تو جواب میں تاویل وتوجیہ اور تخصیص واستثنا کے قلابے ملائے جاتے ہیں۔ ''ایمان و عمل'' ہی کے مقدمہ میں اس کا خاصا تذکرہ ہے۔ میں اس پر یہاں کلام نہیں کرتا؛ کیونکہ مقدمہ نگار عزیز قاسمی صاحب مولانا مدنی کے مریدِ خاص ہیں انھیں تو رَدِّ مودودیت میں ''بے سجّادہ رنگین کن'' پر عامل ہونا ہی چاہیے تھا اور وہ جو کچھ بھی لکھ گئے ہیں اس کا حساب وہ اللہ کے حضور بایں طور پیش کریں گے کہ یا اللہ! میری حیثیت مجبورِ محض کی تھی جو کچھ لکھا ہے اس کی ذمہ داری حضرتِ شیخ پر ہے۔

لہٰذا فدوی ان سے کیا اُلجھے۔ علاوہ ازیں اُن کا مقام ومنصب ایسا نہیں ہے کہ جو کچھ منطق وہ بگھار دیں، وہ بڑے پیمانے پر گمراہی کا باعث بن سکے اور مجھ پر ازالہ ومدافعت کا فریضہ لازم آئے۔ میں یہاں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ بسلسلۂ کانگریس علمائے کرام زیادہ سے زیادہ جو عذر وتاویل پیش کر سکتے ہیں، اس کا لبِّ لباب یہی ہو سکتا ہے کہ ہمیں گاندھی ونہرو کے ذاتی عقائد وخیالات سے کچھ لینا نہیں ہم تو کانگریس کے دستورِ ملکی اور نظریاتِ جمہوری کے گرویدہ ہیں، تو اگرچہ یہ توجیہ بھی شرعاً بڑی مشتبہ اور موردِ اعتراض ہے؛ لیکن خیر اسے قبول کیے لیتے ہیں؛ مگر جماعتِ اسلامی کے باب میں بھی تو اس توجیہ کو ملحوظ رکھیے۔ وہ بھی تو افراد واشخاص کے ذاتی عقائد وخیالات کے اتباع اور تسلیم کی دعوت نہیں دیتی؛ بلکہ ایک دینی وشرعی متفق علیہ دستور اور نظامِ پاکیزہ کی طرف بلاتی ہے۔ اس کے باب میں یہ آپ کیسے کہہ دیتے ہیں کہ اس کے امیر کے ذاتی عقائد وخیالات ہمیں ناگ بن کر ڈس لیں گے۔ اس کا امیر اگر حضرت حوا کو حضرت آدم کی پسلی سے پیدا نہیں مانتا تو ہمیں بھی مجبوراً یہی عقیدہ ماننا پڑے گا۔ اس کا امیر اگر بندوق سے مارے ہوئے شکار کو حلال سمجھتا ہے تو ہمیں بھی مجبوراً اسے حلال سمجھنا؛ بلکہ کھانا پڑے گا۔ اس کا امیر اگر حد درجہ بدعمل وبدعقیدہ لیڈروں کو ذاتی حیثیت میں مسلمان نہیں سمجھتا تو مجبوراً ہمیں بھی ان پیدائشی جنّتی حضرات کی فردِ کفر پر دستخط کرنے پڑیں گے۔

اہلِ علم وفضل کے اختلاف کی کچھ حدیں ہوا کرتی ہیں؛ لیکن ہمارے علمائے موجود نے تو اختلاف کو بازیچۂ اطفال اور مذاق بنا کر رکھ دیا ہے۔ ذرا غور تو فرمائیے کیا ان علماء کے طرزِ فکر کا یہ مطلب نہیں نکلتا کہ مسلمان کبھی کسی کو اپنا امیر ہی نہ بنائیں؛ کیونکہ سورج کی طرح ظاہر ہے کہ فروعات وجزئیات میں آراء وعقائد کا اختلاف عین فطری

قانون ہے۔ دو بڑے عالم اور امام بھی ایسے نہ ملیں گے جو باہم ہر فقہی جزئی اور فرع پر کامل اتحادِ رائے رکھتے ہوں۔ جن ائمہ کو ہم سب برحق مانتے ہیں انھی کو دیکھ لیجیے کہ مسائل کے ہر شعبہ میں نہ صرف جزئیات میں باہم مختلف ہیں؛ بلکہ اُصول و اساسات تک میں وہ نزاع فرمارہے ہیں جن مسائل میں وہ متحد ہیں ان کی تعداد و مقدار اُن مسائل سے بہت کم ہے جن میں وہ مختلف ہیں تب یہ شرط کیسے چل سکتی ہے کہ امیر وہی ہو جو تمام اُصول وفرع میں تمام افراد و جماعت کے عقائد و خیالات سے ہمنوا ہو۔ یہ بداہتہً ناممکن ہے اور ایسی شرط قائم کرنے والا گویا جماعتی نظام اور تعیّن امیر ہی کو ناممکن بتارہا ہے۔ حالانکہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ''لَا إِسْلَامُ إِلَّا بِالْجَمَاعَةِ'' اسلام بغیر جماعت کے کچھ ہے ہی نہیں۔

مثال سے سمجھیے: جمعیۃ علماء میں مختلف مکاتبِ فکر کے علماء شامل ہیں۔ اہلِ حدیث بھی ہیں، اہلِ بدعت بھی ہیں، وہ علماء بھی ہیں جو بطورِ عنوان کے اگرچہ دیوبندی یا کسی اور مکتبۂ فکر میں شامل سمجھے جاتے ہوں؛ لیکن باہم ان میں متعدد مسائل و معاملات میں چھوٹے بڑے اختلافات ہیں۔ صدر و امیر جناب مولانا مدظلہٗ ہیں۔ کیا کسی نے دیکھا کہ جناب امیر کے فقہی معتقدات نے جملہ شرکاء جماعت کے معتقدات کو بدل کر ہم رنگِ امیر کر دیا ہو؟ کیا کوئی بدعتی دیوبندی بن گیا؟ کیا کوئی اہلِ حدیث دائرۂ مقلدین میں شامل ہو گیا؟ کیا جمعیۃ العلماء میں شریک تمام علمائے دیوبند جنابِ امیر کے فقہی معتقدات پر جمع ہو گئے؟

واحد جواب ہوگا کہ نہیں! جو جہاں تھا وہیں رہا اور اس طرح کا انقلابِ عقائد تصور و وہم کی حد تک بھی ظہور میں نہیں آیا۔ حالانکہ دیکھ لیجیے اہلِ حدیث اور مولانا مدنی امیر جمعیۃ میں شدید اُصولی اختلاف ہے، اہلِ حدیث تقلید ائمہ کے سرے سے قائل ہی نہیں اور جناب امیر یہاں تک قائل ہیں کہ جو تقلید نہ کرے گمراہ اور مردود ہوا۔ اسی طرح اہلِ بدعت اور جنابِ امیر میں شدید اُصولی اختلاف ہے کہ اہلِ بدعت قبروں کے میلوں اور قوالیوں کو جانِ مذہب، شانِ مذہب، کانِ مذہب سمجھتے ہیں اور جنابِ امیر ایسا سمجھنے والوں کو بدلیل حدیث مردود و مبغوض ٹھیراتے ہیں۔ جماعتِ اسلامی اور علمائے دیوبند کے مابین تو ایسا شدید اور حقیقی اختلاف فی الواقع کوئی ہے بھی نہیں واحد قابل لحاظ اختلاف اگر کچھ ہو سکتا تھا تو وہ تھا جسے ''توہین صحابہؓ'' کے اشتعال انگیز عنوان سے حضرت مولانا مدنی اور مولانا محمد طیب صاحب نے اُٹھایا تھا، لیکن اپریل ۵۶ء کے تجلّی میں فدوی آپ کو دکھا چکا کہ اس بحث میں بھی حق جماعت اسلامی ہی کی طرف تھا اور خدا کا شکر ہے کہ نہ صرف ہزاروں ناظرین تجلّی اسے مان چکے ہیں؛ بلکہ خود مولانا محمد طیّب صاحب بھی ایک صحبت میں فرما چکے ہیں کہ وہ محض نزاعِ لفظی تھا اور بعدِ تحقیق ثابت ہوا کہ عملاً ہم اور جماعتِ اسلامی والے ایک ہی صف میں ہیں!

تو میں کہتا ہوں کہ تعصب و ناانصافی کی یہ فصلِ بہار کب تک؟ موت ہر لحظہ قریب آرہی ہے اور حسابِ آخرت کے دن کیا کوئی ظلم اس بنیاد پر معاف ہو جائے گا کہ اس کے مرتکبین دنیا میں عزت دار اور ذی وجاہت تھے؟

احساسِ کمتری کی انتہا

آخری اہم ترین بات یہ ہے کہ اگر واقعی ہمارے علمائے موجود نیک نیتی سے یہ سمجھتے کہ جماعتِ اسلامی کے بعض افراد غلط فقہی عقائد کا شکار ہیں اور اُن کا اثر و اقتدار جماعت میں اس حد تک ہے کہ عام شرکاء جماعت بھی ان کے غلط عقائد سے کافی حد تک متاثر ہو سکتے ہیں تو تعمیری طریقہ یہ نہیں تھا کہ جو اختیار کیا گیا؛ بلکہ یہ تھا کہ علمائے دیوبند جماعت میں شریک ہوتے اور اپنے علم و فضل، اپنی شخصیات، اپنی دانائی و خطابت سے غلط عقائد کی تنسیخ اور صحیح عقائد کی ترویج فرماتے۔ اپنی بلند صلاحیتوں سے افرادِ جماعت کو اس درجہ متاثر و مغلوب کرتے کہ وہ اُن کے صحیح معتقدات کی پیروی کریں اور کوئی تعجب نہ تھا کہ ایسی صورت میں امیرِ کارواں ہی بنا لیے جاتے یا اگر ضابطہ میں نہ بھی بنائے جاتے تب بھی اثر اُنھیں کا نافذ و راسخ رہتا۔ ''زندگی'' (ماہنامہ زندگی۔ رامپور۔ یوپی) کے فائل شاہد ہیں کہ جماعتِ اسلامی ہند کے ذمہ داروں نے مولانا مدنی کو اپنی راہنمائی اور امداد کے لیے زحمتِ تشریف آوری دینے کی وہ انتہائی کوشش کر دیکھی ہے جو شریف و نجیب دل و دماغ رکھنے والے کر سکتے ہیں؛ لیکن مولانا مدنی نے نہایت سختی اور بے اعتنائی سے دعوت کو رَد کر دیا اور مفاہمت کی معقول ترین پیشکش کو دیا سلائی دکھادی۔ (مزید تفصیل کے لیے قارئین ''مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابو اللیث صاحب کی مراسلت'' نامی کتاب کا مطالعہ ضرور کریں۔ اس کا حوالہ ہم نے اپنی ابتدائی تحریر میں بھی دیا ہے (ابو عکاشہ رحمٰن))

اِس صورتِ حال کا تجزیہ اگر کوئی ماہرِ نفسیات کرے تو یقیناً اس کے سوا کچھ نہ کہے گا کہ ہمارے علمائے موجود جماعتِ اسلامی کے مقابلہ میں سخت احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں۔ انھوں نے خود ہی اسے ہوّا بنایا ہے، خود ہی یہ اس کی فکری برتری اور علمی و عقلی بلندی کے معلن و ناشر بنے ہوئے ہیں۔ وہ اگر بعض خیالات میں اس سے اختلاف رکھتے ہیں تو اُنھیں ذرا اعتماد نہیں ہے کہ ہم افہام و تفہیم اور گفت و شنید میں اپنے خیالات کی صحت پر مضبوط اور روشن دلیلیں لا سکیں گے۔ وہ آپ سے آپ پسپا ہو چکے ہیں۔ انھوں نے گردشِ دوراں سے مکمل شکست مان لی ہے۔ وہ فکری جمود و تعطّل اور یاس و قنوطیت میں گرفتار ہیں۔ وہ اسلام کی سربلندی کے جہاد سے کنارہ کش ہو کر اغیار و طاغوت کی بخشش اور عطا پر زندگی گزار دینا چاہتے ہیں۔ وہ اصل میں شاہِ اقتدار کو اطاعت و سپردگی کا جزیہ دے رہے ہیں اور اس کے بدلہ میں صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے جان و مال محفوظ رہیں، ہمیں مسجد جانے کی اجازت ملی رہے اور ہمارے بے ضرر اعمال و اشغال پر کوئی قدغن نہ ہو۔

نعوذ باللہ اللہ بھی خارجی ٹھیرے!

مجھے اعتراف ہے کہ میری زیرِ قلم تنقید میں ترتیب کی خامیاں پیدا ہوگئی ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ میرا ارادہ

بحث کو زیادہ طول دینے کا نہیں تھا؛ لیکن دورانِ تحریر میں اللہ جو کچھ دل میں ڈالتا رہا لکھتا رہا اور ساتھ ہی کتابت بھی ہوتی گئی؛ چنانچہ یہ ممکن نہ رہا کہ بعد میں اگر کوئی ایسی چیز ضبطِ تحریر میں آگئی ہے، جسے کسی گزشتہ سلسلۂ عبارت سے ملحق اور منسلک ہونا چاہیے تھا تو اسے وہاں رکھ دیا جائے۔

تاہم اس نقصِ ترتیب کے ڈر سے میں ایک اور ایسی بات کہنے سے نہ رُکوں گا جسے کچھ پہلے کہنا چاہیے تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر مولانا مودودی کی زیرِ بحث عبارات سے واقعی یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی ایک یا چند معاصی کبیرہ کے مرتکب کو وہ کافر کہہ گئے ہیں تو قرآن کی مندرجہ ذیل آیات سے بھی لازماً ثابت ہوتا ہے کہ سود لینے والے کافر ہیں!

سورۂ بقرہ میں اللہ فرماتے ہیں:

وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ۝

(سورۂ بقرہ، پارہ: ۳)

"اور اللہ نے حلال کیا بیع کو اور حرام کیا سود کو۔ پس جس کو پہنچی نصیحت اپنے رب کی طرف سے اور وہ باز آگیا تو اس کے واسطے ہے جو پہلے ہو چکا (یعنی جو سود وہ پہلے لے چکا ہے اسے لوٹانا ضروری نہیں) اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے۔ اور جو کوئی سود لیوے تو وہی لوگ ہیں دوزخی جو اُس دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے"۔

خود دیکھ لیجیے کہ اس آیت میں عقیدے کا ذکر نہیں صرف عمل کا ہے یعنی جس طرح استاد المکرم مولانا مدنی فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جن لوگوں کو مرتد قرار دے کر ان سے جنگ کی تھی وہ زکوٰۃ دینے ہی کا نہیں؛ بلکہ زکوٰۃ کی فرضیت ہی کا انکار کر رہے تھے۔ (حالانکہ یہ دعویٰ بے دلیل ہے تاہم) اس طرح یہاں ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دائمی جہنمی ٹھیرا رہا ہے جو سود کی حرمت پر اعتقاد نہ رکھتے ہوں؛ بلکہ یہاں تو صریحاً ان لوگوں کو دوزخی ٹھیرایا جا رہا ہے جو سود کی حرمت نازل ہونے کے بعد بھی عملاً سود لیتے ہوں!

بالفاظِ قرآنی "ہمیشہ دوزخ میں رہنے والے" ظاہر ہے کہ کافر ہی ہو سکتے ہیں۔ اگر استاد المکرم انھیں کافر نہیں مانتے مسلمان ہی کہے جاتے ہیں تو اُن کا وہ دعویٰ غلط ٹھیرے گا کہ مسلمان خواہ کیسا ہی بدعمل ہو سزا بھگت کر جنت میں پہنچ جائے گا۔ یہاں سود لینے والے اگر مسلمان ٹھیریں تو اللہ ان کے ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہنے کی خبر دے رہے ہیں اور اللہ سے زیادہ کون سچی خبر دے سکتا ہے۔

دوسری آیت دیکھئے، سورۂ بقرہ ہی میں ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۝

فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ ۚ (سورۂ بقرہ، پارہ ۳)

''اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور جو سود باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ و۔ اگر تم ایمان والے ہو، پس اگر نہیں چھوڑتے تو تیار ہو جاؤ لڑنے کو اللہ سے اور اس کے رسول سے''۔

اوّل تو اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ کے الفاظ ہی بتا رہے تھے کہ اگر تم نے سود لینا نہ چھوڑا تو تمہارا دعوۂ ایمان نا قابل قبول ٹھیرے گا۔ پھر آگے کا اندازِ بیان تو ایسا شدید ہے کہ بقولِ امامِ اعظمؒ قرآن میں اس سے بڑھ کر تہدیدی و تنذیری آیت کوئی نہیں۔ اللہ جسے اپنا اور اپنے پیارے رسول کا حریف، مدِ مقابل، دشمن ٹھیرا دیں اس کے مومن اور جنتی ہونے کا عقیدہ استاد المکرم کا ہو تو ہو قرآن کی مذکورہ بالا دونوں آیات اس کی تردید کرتی ہیں۔

اور دیکھئے، آلِ عمران میں ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضۡعَافًا مُّضٰعَفَةً ۖ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ۚ﴿۱۳۰﴾ وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِىۡۤ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ ۚ﴿۱۳۱﴾ (سورۂ آل عمران، پارہ ۴)

''اے ایمان والو! سود مت کھاؤ، دونے پر دونا (سود در سود) اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح پاؤ اور ڈرو اس آگ سے جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے''۔

یہ آیت بھی پچھلی آیات کی تائید کر رہی ہے یعنی سود لینے والوں کو محض یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ سود کا گناہ کر کے دیگر گناہگار مسلمانوں کی طرح تھوڑے دنوں دوزخ میں جل کر جنت میں لوٹ آئیں گے؛ بلکہ اللہ اُنھیں اُس آگ سے ڈرا رہا ہے جو صرف کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے اور جو ہمیشہ کے لیے انھیں اپنے آغوش میں لینے والی ہے۔

فرمائیے کیا صرف مولانا مودودی ہی خارجی ہیں یا نعوذ باللہ من ذالک اللہ میاں بھی خارجی ٹھیرے کہ معصیتِ کبیرہ کے مرتکب کو کافر بنائے دے رہے ہیں؟

ناظرین کرام! میں صفائی سے عرض کرتا ہوں کہ سود لینے والے کو کافر سمجھنا میرا عقیدہ نہیں ہے جس کے لیے میرے پاس قرآن و سنت ہی کے مضبوط دلائل ہیں؛ لیکن استاد المکرم کے اندازِ بحث سے تو قرآنی عقیدہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ سود خوار کافر ہوا؛ کیونکہ وہ نہ تو زبانِ وعظ و فتوے کا فرق تسلیم کرتے ہیں نہ پس منظر اور قیاس و سباق اور شانِ نزول کو مانتے ہیں نہ صاحب قول کی تشریح و توضیح کا اعتبار کرتے ہیں۔

میں شروع میں کہیں وعدہ کر آیا ہوں کہ بزرگوں کے حسنِ ظن کی کچھ مثالیں دوں گا؛ لیکن بات لمبی ہوگئی؛ اس لیے اسے پھر پہ اُٹھا رکھتا ہوں اور فی الحال براہِ راست استاد المکرم کی خدمت میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

حضرت مولانا مدنی مدظلہٗ کی خدمت میں

میں آپ کا ایک نہایت ہی نالائق شاگرد ہوں اور آپ کے علم وفضل اور زہد وتقویٰ سے مجھے وہ نسبت بھی نہیں جو کشتی کو جہاز سے ہوتی ہے؛ لیکن یقین فرمائیے کہ اگر میں آپ کی خود نوشت سوانح ''نقشِ حیات'' میں معاندانہ ذہن کے ساتھ عیب چینی کرنے بیٹھ جاؤں تو آں حضور کو اور آں حضور کے متبعین کو اُس وقت ٹھیک اندازہ ہو سکے گا کہ عیب ڈھونڈنے والا ذہن کتنا فتنہ پرداز ہوتا ہے اور کس آسانی سے ایک اچھی خاصی تحریر کے بخیے اُدھیڑے جاسکتے ہیں۔ آپ کے بعض مرفوع القلم متبعین تو یہاں تک پست ہو گئے ہیں کہ اگر مولانا مودودی کی ''تفہیم القرآن'' میں ''فَمَنْ يَّكْفُرْ'' کا ''وَمَنْ يَّكْفُرْ'' چھپ گیا تو انھوں نے کتابت کی اس غلطی ہی کو مولانا موصوف کا مستقل جرم قرار دے دیا یا مولانا موصوف نے ''عُرْوَة'' کا ترجمہ ''حلقہ'' کے بجائے ''رسّی'' کر دیا تو انھوں نے اس پر ہی نہایت متکبرانہ انداز میں تبرا کیا۔ حالانکہ مفہوم ومعنیٰ میں شمّہ برابر فرق واقع نہ ہو رہا تھا اور حالانکہ شاہ عبد القادر محدث دہلوی جیسے بزرگ ''بصر'' کا ترجمہ ''تیور'' لکھ گئے ہیں!؛ لیکن فدوی کو اس چھچھورے پن کی ضرورت نہ پڑے گی؛ بلکہ اس طرح اعتراض کی عمارت اُٹھائے گا کہ آپ بھی اُسے غیر علمی نہ کہہ سکیں گے۔ مثلاً آں جناب ''نقشِ حیات'' حصہ دوم، صفحہ ۲۰۴-۲۰۵ پر تعریضی کلام کے جواز میں مندرجہ ذیل روایت پیش فرماتے ہیں:

> ''حضرت ابراہیم علیہ السلام جبکہ اپنی زوجہ محترمہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہجرت کرتے ہوئے فلسطین کو تشریف لے جارہے تھے تو ایک کافر جبار کا ملک راستہ میں پڑا جس کا طریقہ یہ تھا کہ اگر کوئی مرد کسی خوبصورت عورت کے ساتھ اس کی سرحد میں سے گزرتا تھا تو عورت کو چھین لیتا تھا اور اگر وہ مرد عورت کا شوہر ہوتا تھا تو اس کو قتل کر دیتا تھا۔ اور اگر بھائی ہوتا تھا چھوڑ دیتا تھا؛ مگر عورت ہر حال میں اپنے قبضہ میں کرلیتا تھا۔ اس کے سی آئی ڈی (جاسوسوں) نے حضرت سارہ اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کی خبر بادشاہ کو پہنچائی اس نے فوراً سپاہیوں کو بھیجا تو آپ نے حضرت سارہ سے کہا کہ تم یہ نہ کہنا کہ یہ میرا شوہر ہے؛ بلکہ کہنا کہ یہ (ابراہیم علیہ السلام) میرا بھائی ہے۔ اِس سرزمین پہ ہر کوئی ایمان والا سوائے میرے اور تمہارے نہیں ہے (یعنی میں تمہارا دینی بھائی ہوں) یہی جواب بادشاہ کے لوگوں کو دیا کہ یہ میری بہن ہے؛ اس لیے انھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قتل نہیں کیا''۔

میں اس وقت اعتراض کو پوری تفصیل اور صغریٰ کبریٰ کے ساتھ پیش کرنا نہیں چاہتا کہ منشاء حضور پر اعتراض ہے ہی نہیں؛ لیکن نمونۃً بہ اختصار عرض کرتا ہوں کہ یہ روایت جو بھی عام آدمی آپ کی کتاب میں پڑھے گا وہ

قدرتاً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ دنیا کے عظیم پیغمبر ابراہیم علیہ السلام کی زوجۂ محترمہ حضرت سارہ ایک کافر جبار بادشاہ کی ہوس رانی کا شکار ہوگئیں؛ کیونکہ یہ کھلی بات ہے کہ خوبصورت عورتوں کو پکڑنا محض زیارت کے لیے نہیں، ہوس رانی کے لیے ہوتا تھا اور مذکورہ روایت صاف بتا رہی ہے کہ حضرت سارہؓ اِس زانی بادشاہ کے خلوت کدے میں لے جائی گئیں (اس کی تصدیق بخاری ومسلم اور دیگر کتبِ حدیث بھی کرتی ہیں) اور آں جناب نے اس حدیث کا وہ ٹکڑا نہیں نقل فرمایا ہے جس سے واضح ہوتا تھا کہ بدکاری کے ارادے پر تین مرتبہ اُس بادشاہ کے ہاتھ شل ہوئے۔ (یا اور کچھ مرض پڑا) اور وہ بدکاری نہ کرسکا؛ بلکہ قبطی خاتون حضرت ہاجرہ کو ان کے حوالے کرکے پاکدامن رخصت کیا۔ ظاہر ہے کہ اُردو کتابوں کے پڑھنے والے بہت کم احادیث کی واقفیت رکھتے ہیں، ان کی ناواقفیت اور زوجۂ پیغمبر حضرت سارہؓ کی عظمت وتقدس کے لحاظ سے کیا حضور کے لیے مناسب نہ تھا کہ حدیث کا مابقی ضروری ٹکڑہ بھی اسی مقام پر نقل فرمادیتے۔ تاکہ کوئی عامی اِس سوءِظن میں مبتلا نہ ہوسکتا کہ خدا نے اپنے پیغمبر کی زوجہ کی عصمت بھی لُٹ جانے دی!

یہ عرض داشت تو میں نے اس روایت کو صحیح مانتے ہوئے کی۔ اس کے بعد عرض کروں گا کہ کیا ازروئے ''درایت'' اس روایت میں کوئی سقم نہیں ہے؟ کیا متعدد عقلی دلائل اس بات کے لیے موجود نہیں ہیں کہ اس روایت کو اگر غلط ہی نہ مانا جائے تو کم سے کم اس سے استشہاد اور استدلال کا کام نہ لیا جائے؟ فدوی پوچھتا ہے کہ بخاری ومسلم میں جن ثلاث کذبات (تین جھوٹوں) کا ذکر ہے کیا آپ جیسا شیخ الحدیث یہ یقین رکھتا ہے کہ بعض اُن باتوں کو جنھیں دنیا کوئی قانونِ عقلی ونقلی اور کوئی علمِ منطقی ''کذب'' کے لفظ سے موسوم نہیں کرسکتا۔ رسول اللہ ﷺ کی زبان وحی ترجمان ''کذب'' سے موسوم کردے گی؟ حالانکہ قرآن نے ان ''ثلاث کذبات'' میں سے دو کا ذکر کیا ہے اور ہرگز انھیں ''کذب'' سے موسوم نہیں کیا۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ قرآن دو کا تو ذکر کرتا ہے اور اُس تیسرے واقعہ کو اشارۃً بھی بیان نہیں کرتا جس میں کافر بادشاہ کے مقابلہ میں اوز روئے روایت حضرت سارہؓ کا معجزہ ظہور پذیر ہوتا ہے اور جسے ملا کر ثلاث کذبات کی مثلث بنتی ہے۔ نیز یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہی قصہ نہایت غیر محتاط الفاظ میں دو طریقوں پر بائبل میں بھی مذکور ہے، ایک آیت تو مصر وفرعون سے متعلق ہے جس میں حضرت سارہؓ کی عمر ۶۵ سال بتائی گئی ہے اور دوسری روایت اسی بائبل میں جنوبی فلسطین سے متعلق جرار کے بادشاہ ابی۔۔۔ کی ہے کہ اس نے سارہ کو بلوایا اور اس وقت ان کی عمر نوے سال تھی۔ درایت نہیں مانتی کہ یہ مختلف البیان واقعہ اس حد تک درست ہوگا کہ زبانِ وحی ترجمان اس کی تصدیق فرمائے گی، جبکہ اس کی تصدیق کا عملاً کوئی فائدہ بھی نہیں؛ بلکہ اُلٹا نقصان ہی معلوم ہوتا ہے۔

آپ خفا نہ ہوں۔ درایت اور تفقہ خود ہمارے امام اعظم کا طرۂ امتیاز ہے۔ حضور جانتے ہیں کہ امام اعظم کے

نزدیک اور غالباً آپ کے نزدیک بھی ''مسِّ ذکر'' سے وضو نہیں ٹوٹتا، حالانکہ صحابیہَ رسول بُسرۃ بنت صفوانؓ سے حدیث منقول ہے کہ:

مَنْ مَسَّ ذَكَرَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ. (جس نے اپنے ذکر کو چھوا پس چاہیے کہ وضو کرے)

اس حدیث کی تخریج اصحابِ سُنن نے کی ہے اور امام احمد وغیرہ نے اسے ''صحیح'' بتایا ہے۔ گویا از روئے روایت یہ قابلِ اعتبار ہے؛ لیکن کیا امام اعظم اور ان کے پیرووں نے مسِّ ذکر سے وضو کا لزوم مانا؟ یا محض درایۃً اسے رَد کر دیا۔ کیا مشہور حنفی عالم صاحبِ مبسوط علامہ سرخسیؒ نے اس کی ''صحت'' کے حلقوم پر درایت کی چھری نہیں پھیری؟

حضور کو خوب معلوم ہے کہ صحیحین میں آجانے کی وجہ سے حضرت سارہؑ والی زیرِ بحث روایت اگرچہ شہرت کو پہنچی ہوئی ہے؛ لیکن اُصولِ حدیث کے اعتبار سے اس کا درجہ خبرِ واحد کا ہے اور کوئی خبرِ واحد علمِ یقینی کا فائدہ نہیں دیتی۔ نہ اُس کے انکار پر کفر کا فتویٰ لگتا ہے؛ بلکہ ہمارے امام ابوحنیفہ اور ان کے عالی قدر پیرو اسے درایت کی میزان میں تولنے ہی کو تفقہ فی الدین خیال کرتے ہیں۔ نیز یہ بھی حضور جانتے ہیں کہ بخاری کے ستّر سے کچھ اوپر اور مسلم کے ڈیڑھ سو سے کچھ اوپر راوی ایسے ہیں جن کی ثقاہت میں علمائے ماہرین نے کلام کیا ہے۔ اور یہ بھی حضور جانتے ہیں کہ اگرچہ بخاری اصح الکتاب بعد کتاب اللہ ہے؛ لیکن غالباً سب محدثین اس پر متفق ہیں کہ اس کی حدیثِ جسری عن عبدالله ابن أبي نمرة میں بلحاظِ ترتیب کچھ گڑبڑ ہے اور یہ بھی حضور جانتے ہیں کہ بخاری و مسلم ایسی روایتوں سے بالکل خالی نہیں ہیں جن پر بعض مسلّم علمائے متبحّرین نے کافی جرحیں کی ہیں۔

اور اعتراض کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ حضور روایتِ زیرِ بحث کو قابلِ قبول مانتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کا انّي اخوك (میں تیرا بھائی ہوں) کہنا جھوٹ نہیں ہے۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ بخاری کی ''حدیثِ شفاعت'' میں (جو مختلف ابواب میں بکھری ہوئی ہے) حضرت ابراہیم کو قیامت کے دن اپنے تین جھوٹوں سے شرمندہ دکھلایا گیا ہے۔ اگر یہ جھوٹ نہیں تھے تو شرمندگی کیسی اور شفاعت سے گریز کیوں؟ کیا وہ نبی ہو کر بھی اُس حقیقت کو نہ پاسکے تھے جسے استاد المکرم نے پالیا ہے۔ اور اگر وہ جھوٹ تھے تو استاد المکرم کا فیصلہ غلط ٹھیرتا ہے!

انصاف کیجیے کہ اگر میں مذکورہ بالا اجمالی معارضات کو عقلی و نقلی دلائل سے مہذب کر کے اُسی طرح تفصیل و بسیط کے ساتھ جمع کرلاؤں جس طرح مولانا مودودی کے معترضین کرتے ہیں اور ساتھ میں قرآن کی وہ آیات بھی لکھوں جن میں ابراہیم علیہ السلام کو صدّیق اور قانت اور شاکر اور مجتبیٰ اور راشد جیسے بلند مرتبہ امتیازات سے نوازا گیا ہے تو کیا ''نقشِ حیات'' کی چند ہی سطروں پر ''ایمان و عمل'' سے ضخیم کتاب تیار نہیں ہو جائے گی؟ کیا میں بہت سے لوگوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب نہیں ہو جاؤں گا کہ خاکم بدہن حضرت مولانا مدنی سے روایت زیرِ بحث کے

معاملہ میں سہو ہوگیا ہے اور کیا اسی ''سہو'' پر معاند و جری ذہنیتیں ''زوجۂ پیغمبر کی بے آبروئی'' اور ''توہین ابراہیم'' وغیرہ کا لیبل نہ لگا دیں گی؟

اور یہ معاملہ تو علم الحدیث کے باب میں ہے کہ جس کے آپ امام و شیخ ہیں اور فدوی بالکل تہی دامن۔ اگر بات ''نقشِ حیات'' کے عمرانی سیاسی اور اقتصادی گوشوں پر چھڑ جائے تب حضور اندازہ فرمائیں کہ نکتہ چیں اور عیب جو، قلم کی جولانی کیا کیا گل نہیں کتر سکتی۔ نعوذ باللہ یہ کوئی دھمکی نہیں ہے۔ ایک سیدھی نیاز مندانہ بات ہے جس کے وزن کو آپ جب چاہیں ''اذنِ تنقید'' دے کر آزما سکتے ہیں؛ مگر میں نہایت ہی عجز و ادب کے ساتھ گزارش کروں گا کہ ہم آج جس دَور سے گزر رہے ہیں وہ اس طرح کی لاحاصل بحثوں کے لیے موزوں نہیں۔ آج ہمارے لیے صرف اور صرف ایک ہی راستہ سلامتی کا ہے اور وہ یہ کہ باہمی کدورتوں، عنادوں اور آویزشوں کو مٹا کر اعلاء کلمۃ الحق کی جدوجہد میں لگے رہیں اور حاکمیتِ الٰہ کا بنیادی تصور اگر کسی بھی درجہ میں قابل قبول نہیں رہا ہے تو کم سے کم اُس امّت کو توسُدھارنے کی کوشش کریں جو اسلام کی مدعی ہونے کے باوجود اپنے اعمالِ شرک و بدعت اور طغیان و معصیت سے اسلام کی رُسوائی میں روز افزوں اضافہ کیے چلی جارہی ہے۔ آپ اکابرین اب تک اس سلسلہ میں جو کچھ کرتے رہے ہیں اسے میں حقیر و بے سود نہیں ٹھیرا رہا؛ بلکہ میرا منشاء یہ ہے کہ جو وقت اور اِنرجی اور پیسہ مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کے خلاف خواہ مخواہ کی بحثیں چھیڑ کر آپ صرف کر رہے ہیں اُسے بھی نیک اور مفید کاموں میں صرف ہونا چاہیے۔ اور آپ اپنے اُن متبعین کو بھی نصیحت فرمائیے جو بہت ہی گھٹیا اور بچکانہ قسم کے مخالفانہ کتابچے لکھ کر علماء کی رُسوائی و بدنامی کا باعث بن رہے ہیں۔ ان میں بعض تو اتنے سعادت مند ہیں کہ خود کو آپ سے بھی زیادہ قابل تصور کرتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ آپ کی کتاب پر ایڈیٹر تجلّی نے اپریل ۵۶ء میں آسانی سے تنقید کردی؛ مگر ہماری کتاب پر نہیں کی۔ جس سے معلوم ہوا کہ ہماری کتاب زیادہ ''مضبوط'' ہے۔ اندازہ فرمالیجیے ان لوگوں کی تنگیٔ فہم و ذہن کا، میں بہت آسانی سے ان خوش فہموں کو حقیقت کا آئینہ دکھا سکتا تھا؛ لیکن میرے پیشِ نظر نہ جذباتی مجادلہ ہے نہ شہرت و ستائش نہ واہ واہ۔ میں جانتا ہوں کہ چند بچوں کے گرد اُڑانے سے سورج کی کرنیں دُھندلی نہیں پڑسکتیں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ برخود غلط حضرات عامۃ المسلمین میں کوئی مقام نہیں رکھتے نہ ان کی تحریروں میں سلیقہ اور استدلال میں جاذبیت و مضبوطی ہے جو پڑھنے والوں پر اِن کا کچھ اثر پڑسکے۔ نہ میرا وقت اور پیسہ اتنا فالتو ہے جو اِن جیسے غیر مکلّفین کے سطحی اور بچپانے شور و غوغا کی مدافعت و بیخ کنی میں صرف ہو۔

لیکن آپ کا معاملہ بالکل جُدا ہے۔ آپ بہت بڑے عالم، بہت بڑے زاہد و عابد اور صاحب عزّت و عظمت ہیں۔ آپ پر کثیر انسانوں کو بھروسہ ہے، اگر آپ ہی غیر ضروری اور مبالغہ آمیز مخالفت سے دامنکش نہ ہوں گے تو مجبوراً مجھے بھی نقد و نظر کی جسارت جاری رکھنی پڑے گی خواہ اس کی قیمت میں سر ہی کیوں نہ دینا پڑے۔ استاد کے

مقالات پر تنقید کرنا اگرچہ معیوب سمجھا جاتا ہے؛ لیکن حشر کے دن اگر مجھے پَل بھر کے لیے بھی آپ کے قرب کی سعادت میسّر ہوگئی تو ان شاء اللہ دل چیر کر دکھاؤں گا کہ اس دل میں آپ کے لیے بے ادبی، گستاخی، عناد اور نشوز و بغاوت کا شائبہ تک نہ تھا؛ بلکہ تمام تر عرض گزاری صرف اور صرف اللہ کے لیے تھی۔ اور اللہ ہی وہ ہے جس کے حضور نہ میرے ساتھ ناانصافی ہوسکتی ہے نہ آپ کے۔ وہ انبیاء و اولیاء کے معاملات میں منصف ہے تو ہم جیسے گناہگاروں اور بےکسوں کے حق میں بھی یقیناً منصف ہے اور مولانا مودودی یا جماعتِ اسلامی کے ساتھ بھی وہ تعصب نہیں فرمائے گا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ.

(عامر عثمانی)

(خاص نمبر) ماہنامہ تجلی فروری، مارچ ۱۹۵۷ء

آہِ صبح گاہی

(از: عامر عثمانی)

مجاہدو اِس کو یاد رکھنا، یہ ایک نکتہ ہے عارفانا ❖ جہادِ حق کارگر نہ ہوگا اگر نہیں گریۂ شبانا

ہزار جدّت طرازیوں کے لباس بدلا کرے زمانا ❖ مگر یقیناً رہے گا عامرؔ مزاجِ باطل وہی پُرانا

نوائے حق کو اگر یہ دنیا قرار دیتی ہے باغیانا ❖ میں تہمتِ بزدلی نہ لوں گا، مجھے گوارا ہے سر کٹانا

عروج سے بہرہ ور نہ ہوگی کبھی حیاتِ منافقانا ❖ زباں پہ اسلام کا وظیفہ مگر خیالات کافرانا

ہماری غفلت کی انتہا کیا ہماری پستی کا کیا ٹھکانا ❖ گناہ تو پھر گناہ ٹھیرا، عبادتیں بھی ہیں مجرمانا

وفا کے میداں میں صرف زورِ بیاں دکھانے سے کچھ نہ ہوگا ❖ بغیر سینے پہ چوٹ کھائے محال ہے دو قدم بڑھانا

تراش کر کوہِ سنگ و آہن نکالنی ہوگی راہِ منزل ❖ بغیر شعلوں کا کھیل کھیلے، نہ راہ دے گا کبھی زمانا

اُکھڑ کے جنگاہِ زندگی سے وہ خانقاہوں میں جا چھپے ہیں ❖ گراں تھا جن پر جہادِ ہستی، مزاج تھا جن کا راہبانا

بہت ہے حمد و ثنا زبانی، بہت ہے میلاد و نعت خوانی ❖ مگر عمل صاف کہہ رہا ہے یہ مشغلے ہیں منافقانا

مجھے خبر ہے، میں جانتا ہوں، یہ دَور ہے آگ کا سمندر ❖ مگر غمِ عشق کا سفینہ اسی کی موجوں پہ ہے چلانا

بلا سے کروٹ نہ لیں اندھیرے، بلا سے پروا کریں نہ رہرو ❖ مگر مرا فرضِ منصبی ہے چراغ پیہم جلائے جانا

وہ دَورِ نقصان و ابتلا ہو کہ عہدِ اقبال و کامرانی ❖ وفا کے بندے، رضا کے پیکر، گزار دیں گے مجاہدانا

وہ سادہ و صاف دینِ فطرت، وہ بے خم و پیچ راہِ طاعت ❖ اُسے غلط کوش صوفیوں نے بنا دیا ہے طلسم خانا

وہی یہ بوجہل و بولہب ہیں بدل کے قالب جو آ رہے ہیں ❖ نئے زمانے کے رہبروں سے کبھی نہ ہرگز فریب کھانا

وہ کوئی درگاہ ہو کہ مسجد، اگر وہاں از رہِ عبادت ❖ نیازمندی ہو ماسوا کی تو اُس سے بہتر شراب خانا

قدم قدم پر طرح طرح کی عبادتیں وضع کرنے والو! ❖ بتاؤ کیا تم نے دینِ حق کو حقیر اور نا تمام جانا؟

ستیزہ گاہِ عمل سے عامرؔ جو کُنجِ عُزلت میں لا بٹھائے
وہ زہد ہے یاس و بزدلی کو جواز دینے کا ایک بہانا

''ایمان وعمل'' کے باب میں مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ کی رائے

''ایمان وعمل'' کی بحث میں ''خاص نمبر'' میں جو مواد پیش ناظرین کیا جاچکا ہے وہ بفضلہٖ تعالیٰ حق کی تائید اور باطل کی تردید میں اہلِ انصاف و دیانت کے لیے بالکل کافی ہے؛ لیکن آج پھر میں ایک چھوٹی سی چیز اس سلسلہ کی پیش کر رہا ہوں تاکہ مخلصین کو عبرت اور متعصبین کو ندامت ہو۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''تصفیۃ العقائد'' کا نام تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ نہ سنا ہو تو اب سن لیجیے کہ یہ ۳۲ صفحے کا ایک رسالہ ہے اور اسی کی ایک عبارت پر مفتیانِ دارالعلوم نے ۱۹۵۶ء میں مولانا مودودی کے دھوکے میں زناٹے دار فتویٔ کفر جڑا تھا۔ پھر جب اخبار و رسائل سے حقیقت کھلی تو حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اس کی تردید و تائید کا عجیب وغریب بین بین راستہ اختیار کرکے اسے مفتیوں کی حد درجہ حُبِّ رسول اور فنائیتِ ایمان اور عزقابیٔ زہد و ورع پر محمول فرمایا تھا۔ خیر یہ قصّہ تو پُرانا ہوچکا۔ فی الوقت راقم الحروف نے ''تصفیۃ العقائد'' کو ایک خاص غرض سے پڑھنا شروع کیا اور وہ یہ کہ میں دیکھ رہا ہوں دارالعلوم نے اپنے ملازمین کی تنخواہیں کاٹ کاٹ کر ردِّ مودودیت میں ایک مستقل شعبۂ نشر و اشاعت قائم کر رکھا ہے پہلے تو بے اہمیت اور بے بہرہ قسم کے کچھ لوگوں کی چھوٹی چھوٹی کتابیں اس سے چھپیں جن میں کھلی طفلانہ نکتہ آرائیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ انھیں میں نے لائق التفات نہ سمجھا؛ لیکن اس کے بعد استاد المکرم مولانا سید حسین احمد مدنی مدظلہٗ کی کتاب ''مودودی مذہب اور اس کی حقیقت'' نظر سے گزری، نیز دارالعلوم کے سرکاری آرگن میں پیدائش حوا اور ظہورِ مہدی کے موضوع پر دو سخت اختلافی مضمون آئے۔ علمی اختلاف کوئی بڑی چیز نہیں؛ مگر یہ مضامین نہ تو سرے سے علمی تھے نہ ان میں اختلاف کی کوئی شریفانہ حد تھی۔ بس تعصب، تبرّا اور فحش نگاری۔ مجبوراً میں نے اپریل ۵۶ء میں استاد المکرم کی کتاب پر اور مئی جون ۵۶ء میں ان دونوں مضمونوں پر دلیل و شہادت کے ساتھ تنقید کی۔ یہ تنقید ہندو پاک کے گوشہ گوشہ میں گونجی، دوست و دشمن سب نے اس کی منصفانہ پوزیشن کو مانا اور معترضین یا ان کا کوئی ہمنوا ایک حرف اس کے خلاف کہنے کی جرأت نہ کرسکا۔ اس کے بعد تجلی خاص نمبر میں میں نے استاد المکرم کی کتاب ''ایمان وعمل'' پر تنقید کی۔ یہ بھی موافق ومخالف حلقوں میں حرفِ آخر ثابت ہوئی۔ اب گزشتہ مہینے میں ظفیر الدین صاحب کی کتاب کا ذکر کرچکا ہوں اور ایک اور کوئی صاحب ہیں عبدالصمد رحمانی ان کی بھی ایک کتاب کے مسلسل حصّے ''شعبۂ نشر و اشاعت دارالعلوم'' سے چھپ رہے ہیں۔ میں ان شاء اللہ زندگی و عافیت رہی تو ظفیر الدین صاحب کے بعد انھیں بھی دیکھوں گا؛ لیکن اس ساری تفصیل سے بتانا یہ مقصود

ہے کہ مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی پر اعتراض کرنے والوں کو اس سے بحث ہی نہیں رہی کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا؟ حق کسے کہتے ہیں اور باطل کسے؟ وہ تو یہ سوچے سمجھے بغیر کہ ہم کس غلط کام میں اپنے اوقات اور قابلیتیں برباد کر رہے ہیں اس کام کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر چکے ہیں کہ مولانا مودودی کی ہزاروں صفحات پر مشتمل کتابوں سے عبارتیں چھانٹیں اور عوام فریب؛ بلکہ ابلہ فریب دلائل کے اینٹ گارے سے اعتراض کے اُونچے محل چُنیں۔ ضرورت ہو تو عبارتوں میں مَن مانی تحریف کریں، افترا اُٹھائیں، فتوے گھڑیں، اُنھیں نہ اس کی پروا ہے کہ دن رات مودودی مودودی کی رَٹ لگانے سے عملی زندگی میں حاصل کیا ہے؟ فقہی اور اجتہادی نکتہ چینیوں سے دینِ مظلوم اور ملّتِ مفلوج کی کیا خدمت ہوتی ہے؟ نہ اس کا احساس ہے کہ بحالاتِ موجودہ باہمی اتحاد و اتفاق کی کتنی شدید ضرورت ہے۔ نہ اس کا تصور ہے کہ اجتماعی دنیا میں اسلام کا ایک ایک عضو زخمی ہو چکا ہے اور اس کے لیے مرہم کی تلاش چاہیے۔ نہ اس کی شرم ہے کہ ہمارے جن اعتراضات کے قاطع اور مُسکِت جواب دیے جا چکے ہیں اُنھی کو ہم بار بار ایک ہی لے میں دُہراتے رہے تو دنیا آخر ہمارے متعلق کیا رائے قائم کرے گی۔

ایسے لوگوں کو میں اعتراضات کے جوابات دینے کے علاوہ ایک اور سبق بھی دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ جو تفریحی مشغلہ آپ نے راہ چلتوں پر سنگ باری وخشت زنی کا اختیار فرما رکھا ہے وہی مشغلہ اگر آپ کی طرح دس بیس نہیں؛ بلکہ تنہا یہ بندۂ ضعیف شروع کر دے تو آپ کے زعم و خود پرستی کے شیش محل کی شاید ایک دیوار بھی چکنا چور ہوئے بغیر نہ رہے گی۔

اسی خیال سے میں نے "تصفیۃ العقائد" کو اُٹھایا کہ اس کے مصنف مولانا محمد قاسمؒ ہم تمام اہلِ دیوبند کے متفقہ شیخ و امام ہیں۔ میں اس ۳۲ صفحے کے رسالہ کی بعض عبارات پر اُسی انداز میں اعتراض کروں گا جس انداز میں معترضین کرام مولانا مودودی پر کرتے ہیں۔ اُس وقت خود معترضین کو بھی اور بھولے بھولے عوام کو بھی ٹھیک ٹھیک طور پر اندازہ ہو گا کہ خواہ مخواہ عیب جوئی کر کے کس طرح ہر تصنیف میں کیڑے ڈالے جا سکتے ہیں، کس طرح مصنف کو ضال و مضل بنایا جا سکتا ہے؛ چنانچہ ظفیر الدین صاحب کے جواب میں میں ایک طرف ان کے جمع کردہ اعتراضات کی علمی پوزیشن واضح کروں گا، دوسری طرف علمائے موجود اور ان کے مسلّمہ بزرگوں کی بعض کتب پر بطورِ نمونہ چند اعتراض کروں گا اور آپ ان شاء اللہ دیکھیں گے کہ میرے اعتراضات شعبۂ نشر و اشاعت کے اعتراضات سے کئی گنا مضبوط ہوں گے۔

لیکن فی الحال تو یہ ملاحظہ فرمائیے کہ "خطبات" کے جن جملوں پر استاذ المکرم مولانا مدنی نے مولانا مودودی کو خارجی جیسی شرعی گالی دی تھی تقریباً وہی؛ بلکہ اس سے بھی سخت جملے مولانا محمد قاسمؒ فرما رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ جس عقیدے کو مولانا مودودی سے منسوب کر کے خارجیت کا فتویٰ صادر کیا گیا تھا وہی عقیدہ مولانا محمد قاسمؒ کا بھی ہے۔

صورت یہ ہے کہ ایک صاحب سید احمد نے خط کے ذریعہ اپنے پندرہ بنیادی عقیدے واضح فرمائے ان کا تجزیہ مولانا محمد قاسمؒ نے جوابِ خط میں کیا۔ یہی دونوں خط "تصفیۃ العقائد" کے نام سے چھاپ دیے گئے۔

یاد کیجیے! ایمان و عمل کی بحث یہی تو تھی کہ مولانا مودودی نے اپنے وعظ میں بعض ایسے لوگوں کو جو دعوۂ اسلام کرنے کے باوجود تمام زندگی کافرانہ طور وطریق، غیر اسلامی معمولات اور ملحدانہ جہد وعمل میں گزارتے ہوئے اس حد تک بے دین ہو چکے ہوں کہ حج اور نماز وزکوٰۃ جیسے اہم فرائض کی فرضیت تک کا احساس انھیں نہ رہا ہو یہ کہہ دیا تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔ان کا دعوۂ اسلام جھوٹا ہے۔اس پر مولانا مدنی مدظلہٗ نے انھیں خارجی بنایا اور دعویٰ کیا کہ دعوۂ اسلام کرنے والا چاہے کتنا ہی بے عمل اور بدعمل ہو، سزا بھگت کر ضرور ضرور جنت میں جائے گا۔

اب دیکھیے! مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے پندرھویں جواب کے خاتمہ پر ثابت کیا ہے کہ جس طرح ایک کتے یا گدھے کے جسم میں انسانی روح ڈال دی جائے تو وہ کُتوں اور گدھوں ہی میں شمار ہوگا اور تمام یا اکثر معاملات اس سے ایسے ہی کیے جائیں گے جیسے حیوانات کے ساتھ کیے جاتے ہیں......

"اگرچہ یہ جانتے ہوں کہ اس جسم کے پردے میں روحِ انسانی مستور ہے، ایسے ہی اُس اسلام وایمان کے ساتھ جو پیرایۂ کفر رکھتا ہو خداوند بے نیاز وجمیل کو بمقتضائے وَاللّٰهُ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ ایمان کی بُری صورتوں کو پسند نہیں کرتا، نفرت ہو جائے گی اور تمام یا اکثر معاملات وہی کیے جائیں گے جو کفرِ حقیقی کے ساتھ کیے جاتے ہیں"۔ (تصفیۃ العقائد: ص ۲۸-۲۹)

اب اہلِ نظر انصاف کریں "کفر" ظاہر ہے کہ کسی سینگ یا دُم یا رنگ ونسل یا کسی ٹھوس اور مجسم شے کا نام تو نہیں۔ وہ تو غیر اسلامی اعمال واطوار ہی کا نام ہے۔تب مولانا محمد قاسمؒ کی مذکورہ بالا عبارت اور تمثیل کا مطلب کیا یہی نہیں ہوا کہ اگرچہ کوئی شخص محض دعوۂ اسلام کرتا رہے اور قلبی ایمان کا مدعی ہو؛ لیکن یہ غیر محسوس اسلام وایمان اگر پیرایۂ کفر میں ظاہر ہو رہا ہے یعنی تمام یا اکثر اعمالِ غیر اسلامی کافرانہ ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ تمام یا اکثر وہی معاملات کریں گے جو کافرِ حقیقی کے ساتھ کیے جاتے ہیں؟ خوب غور کیجیے کیا یہ مطلب میں غلط تو نہیں لے رہا۔کیا ہر دو حضرات کا مفہوم ومنشا یکساں نہیں ہے؟

بلکہ ذرا گہرائی سے غور کریں تو اعتراض کا موقعہ تصفیۃ العقائد کی عبارت پر نسبتاً زیادہ ہے۔یوں کہ مولانا مودودی کا دعویٰ تو زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ جو لوگ سرتاپا اعمالِ غیر اسلامی میں غرق اور اطوارِ کافرانہ میں محو ہوں اُن کے باطن میں ایمان کا وجود ہی نہیں، لہٰذا ان کا دعوۂ اسلام غلط۔گویا وہ ایمان کا وجود تسلیم کرتے ہوئے فیصلۂ کفر نہیں دے رہے؛ بلکہ ایمان کو مفقود مان کر انکارِ اسلام کر رہے ہیں۔اس کے برخلاف مولانا محمد قاسمؒ ایمان کا وجود تسلیم کر لینے کے باوجود فرما رہے ہیں کہ اعمالِ غیر اسلامی وکافرانہ ہونے کے باعث یہ ایمان مفیدِ نجات نہ ہوگا؛ بلکہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ معاملہ کفرِ حقیقی کا ہی کریں گے۔اور اچھی طرح سمجھنے کے لیے ایک مثال ملاحظہ فرمائیں۔ایک شخص بے حس وحرکت پڑا ہے۔نبضیں ساکت ہیں، سانس بند ہے، کوئی علامت زندگی کی موجود نہیں۔اب تین شخص زید، بکر اور طلحہ اس کے

بارے میں بحث کرتے ہیں۔ زید کہتا ہے کہ مَرا نہیں ہے؛ بلکہ زندہ ہے؛ کیونکہ اس کا جسم بالکل زندوں کی طرح ہے۔ جب تک یہ گل سڑ نہ جائے اُس وقت تک اسے دفن نہیں کرنا چاہئے۔ بکر کہتا ہے اسے زندہ مت کہو، یہ ہزار زندوں جیسا جسم رکھتا ہو؛ لیکن جب تمام علامتیں اسکی گواہ ہیں کہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہے تو اسے مُردہ ماننا چاہیے۔ طلحہ کہتا ہے، یہ بے شک مردہ ہے، اگر روح نہیں بھی نکلی اور یہ فرض بھی کرلیں کہ اس کے اندر زندگی موجود ہے تب بھی ایسی زندگی اور روح موت کے درجہ میں ہے اس کے ساتھ مُردوں ہی جیسا معاملہ کیا جائے گا۔

زید کی جگہ معترضین کو رکھیے کہ یہی لوگ اُس اسلام کو زندہ مانتے ہیں جس کی زندگی پر فعل وعمل کی کوئی ادنیٰ گواہی موجود نہیں ہے۔ بکر کی جگہ مولانا مودودی کو رکھیے کہ وہ اس اسلام کو روح و زندگی سے بالکل خالی مان کر موت کا حکم لگا رہے ہیں۔ طلحہ کی جگہ مولانا محمد قاسمؒ کو رکھیے کہ وہ روح کی موجودگی ممکن مان کر بھی بے حس وحرکت لایعنی زندگی کو تسلیم نہیں کرتے اور موت کا فیصلہ دیتے ہیں۔ اب اگر زید بکر کو اس لیے گمراہ کہتا ہے کہ وہ جنبش وحرکت اور تنفس سے عاری جسم کو روح سے خالی سمجھ کر ''مُردہ'' ٹھیرا رہا ہے تو طلحہ کو اور بھی زیادہ گمراہ ماننا پڑے گا؛ کیونکہ بکر کی گمراہی تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوسکتی ہے کہ اس نے تشخیص میں غلطی کی؛ لیکن طلحہ کی گمراہی فکری اور اُصولی ہے کہ وہ روح کی موجودگی کے باوجود موت کا حکم لگا رہا ہے۔ اِس طرح استاد المکرم مولانا مدنی کا فتوۂ گمراہی مولانا مودودی سے زیادہ مولانا محمد قاسمؒ پر جا پڑتا ہے۔

اگر میرے بعض بھائیوں کی سمجھ میں یہ باریک بات نہ آئے تب بھی یہ تو بہر حال بالکل ظاہر ہے ہی کہ بے حس وحرکت لاشے کو مولانا مودودی اور مولانا محمد قاسمؒ دونوں ''مردہ'' ہی مان رہے ہیں دونوں ہی نے اُس اسلام کو مردہ ٹھیرایا ہے جو پیرایۂ کفر رکھتا ہو۔ جس پر عمل کی کوئی گواہی نہ ہو؛ بلکہ بدعملی وفسق کی مخالف شہادت موجود ہو۔

یہ میں نے اس مفروضہ کی بنیاد پر عرض کیا ہے کہ مولانا مدنی جس عقیدے کو زبردستی مولانا مودودی کی طرف منسوب فرماتے ہیں اُسے واقعی تسلیم کرلیا جائے؛ لیکن حق یہ ہے کہ جیسا ''خاص نمبر'' میں بدلائل قاطعہ ثابت کیا جا چکا ہے مولانا مودودی اس عقیدے کے حامل ہیں ہی نہیں اور اپنے وعظ میں جو کچھ انھوں نے کہا وہ اصلاح بین الناس اور ترغیب وترہیب کے طور پر تھا۔ زیادہ سے زیادہ اُن کے معترض اسے ''جھوٹ'' کا نام دے سکتے ہیں یعنی وہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر عقیدہ وہ نہیں تھا جو اُن کے الفاظ سے مترشح ہوا تو گویا انھوں نے جھوٹ بولا تو ''اس'' جھوٹ کا حسن واستحسان پہلے تو اسی ''تصفیۃ العقائد'' سے دیکھئے۔

مولانا محمد قاسمؒ جواب پندرہ کے ذیل میں صفحہ ۲۴ پر کذب (جھوٹ) پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کذب یعنی گفتار مخالفِ واقع، بذاتِ خود قبیح نہیں؛ البتہ دھوکہ دینے اور گمراہ کرنے کے لیے ہو تو قبیح ہو جاتا ہے۔ جس کذب میں دوسروں کے لیے کوئی مضرت نہ ہو وہ کذب قباحت سے خالی ہے اور:

''جس میں بعد خلو از مضرت کوئی نفع بھی لاحق ہو جائے یہ کذب داخل حسنات ہوگا۔ اس میں اگر چہ

عاقل کو کچھ شبہ نہیں ہوسکتا؛ لیکن بہر تسکین مثال بھی معروض ہے رسول اللہ ﷺ کا بطورِ ترغیب یہ ارشاد للیس الکذاب الذي یصلح بین النّاس أو کما قال خود اِس بات پر شاہد ہے کہ کذب محمود ہے''۔

پھر آگے صفحہ ۲۵ پر فرماتے ہیں:

''جس جگہ دفعہ فساد خود کذب پر ہی موقوف ہو جیسا کہ اصلاح بین الناس میں ہوتا ہے تو پھر یہ تأمل بے جا ہے''۔

''یہ تأمل'' سے مراد یہ ہے کہ اس کذب کو اختیار کرنے میں تأمّل بے جا ہوگا۔ اب اہلِ انصاف غور فرمائیں کہ خطبات و مواعظ کے وہ جملے جن پر قیامت بر پا کی جارہی ہے کیا اصلاح بین الناس کے سوا بھی کوئی اور مقصد اپنے اندر رکھتے تھے۔ کیا مولانا مودودی کا منشا اس کے سوا بھی کچھ متصور ہوسکتا تھا کہ عامۃ المسلمین نماز روزے، حج زکوٰۃ کی طرف مائل ہوں، بے عملی و بدعملی سے دست کش ہوں، عملاً مسلمان بنیں؛ لیکن بُرا ہو تعصب اور عناد کا کہ اس پر خارجیت کا طوفان کھڑا کر دیا گیا۔

جو حضرات ''تصفیۃ العقائد'' خود دیکھ کر یہ اطمینان کرنا چاہتے ہوں کہ میں نے نقل و اقتباس میں کوئی دجل تو نہیں کیا ہے وہ آٹھ آنے بھیج کر مکتبۂ تجلّی یا کسی اور مکتبہ سے یہ کتاب طلب فرما سکتے ہیں۔

بے محل نہ ہوگا اگر استاذ المکرم مولانا مدنی کی کتاب ''نقشِ حیات'' سے چند جملے نقل کر دوں۔ جلد دوم صفحہ ۲۰۵ پر فرماتے ہیں:

''عام لوگ سمجھتے ہیں کہ جھوٹ ہر حالت میں بُرا اور حرام ہے، حالانکہ جھوٹ بعض اوقات میں فرض اور واجب ہو جاتا ہے اور بعض اوقات میں مستحب اور بعض اوقات میں مباح اور بعض اوقات میں حرام اور مکروہ ہوتا ہے۔ اگر کسی بے گناہ غیر مستحق کو کوئی ظالم قتل کرتا ہو اور جھوٹ بول کر اس کو بچانا ممکن ہو تو اس وقت جھوٹ بولنا واجب ہوگا۔ اور اگر جھوٹ کے ذریعہ کوئی بھلائی پیدا ہوتی ہو (جیسے دو لڑنے والوں میں صلح کرا دینا) تو اس وقت جھوٹ بولنا مستحب ہو جاتا ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: لَیۡسَ الۡکَذَّابُ الَّذِيۡ یَصۡلُحُ بَیۡنَ النَّاسِ (جو شخص جھوٹ بول کر صلح کرا دے وہ جھوٹا نہیں ہے) حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز'' (اصلاح والا جھوٹ فتنہ والی سچائی سے بہتر ہے) اسی طرح اپنی بیوی سے ایسا جھوٹ بولنا جس سے محبت میں اضافہ ہو مباح یا مستحب ہے''۔

(تجلی مئی ۱۹۵۷ء)

دیکھ لیا قارئین آپ نے! جو جو اعتراضات مولانا مودودی پر کیے گئے ہیں ان کا مکمل اور مفصل جواب مولانا عامر عثمانی نے کس قدر باریک بینی اور مثبت انداز میں دیا ہے۔ آپ تجلی کے ان صفحات کو بار بار پڑھیے اور محسوس کیجیے کہ مولانا عامر عثمانی نے کس قدر نرم گفتاری اور مہذب لہجہ میں تمام تر اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ ایک لفظ بھی اپنے معیار سے ہلکا نہیں لکھا، استاذ کی عظمت کا احترام ہر ہر سطر سے جھلک رہا ہے۔ صدفی صد احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی غرض سے لکھی گئی یہ اخلاص سے لبریز تحریر پڑھنے کے بعد بھی اگر کسی ذہن کے اندھیرے میں قبولِ حق کا چراغ روشن نہ ہو سکے تو پھر کوئی اور علاج اس اندھی عقیدت کا نہیں۔

یاد رکھئے! جھوٹ کی کوئی حد نہیں ہوتی اور ضد کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ حق ظاہر ہوجانے کے بعد بھی اسے قبول نہ کرنا اور اپنے بے سود و بوگس اعتراض پر مصر رہتے ہوئے قلوب و اذہان کو تاریک رکھنا یقیناً ضد ہے۔ اسی ضد کی وجہ سے محمد ﷺ کی نبوت کے شواہد و براہان کے عرفان کے بعد بھی کفارِ مکہ ایمان نہیں لائے تھے۔

اس موضوع پر ہمیں مزید کلام نہیں کرنا ہے۔ سچائی آپ کے سامنے آگئی ہے ماننا نہ ماننا آپ کا کام ہے۔ جو سمجھدار ہیں وہ سمجھ گئے ہوں گے اور جو نہ سمجھیں ان سے بھی ہمیں کوئی شکایت نہیں۔ کہ دنیا اسی کا نام ہے۔ آخر میں ہم ایک بات کی وضاحت کر دیں۔ ہوسکتا ہے کوئی یہاں ہم پر یہ اعتراض کرے کہ تم نے شیعت، بریلویت، عیسائیت اور غیر مقلدیت کے بارے میں تو کچھ نہیں لکھا، دارالعلوم کی تاریخ لکھنے والے فاضل مرتب نے تو دیگر فرقوں کے بارے میں بھی لب کشائی کی ہے۔ تم نے فقط مودودی کی حمایت میں اتنے صفحات کیوں سیاہ کر ڈالے؟ تو اس بابت ہم عرض کر دیں کہ شیعت، بریلویت، عیسائیت اور غیر مقلدیت پر ہمارا عقیدہ وہی ہے جو ہمارے بڑوں یعنی اکابر دیوبند کا ہے۔ بلاشبہ ان فرقوں نے اسلام کی حقیقی تصویر کو مسخ کیا ہے۔ اور فقط اکابر دیوبند ہی نے نہیں؛ بلکہ دنیا بھر میں مختلف علماء نے ان فرقوں کے خلاف احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا فریضہ انجام دیتے ہوئے قلم اُٹھایا ہے۔ لیکن مولانا مودودی کی تحریرات پر نہ تو اکابر دیوبند نے اعتراض کیا اور نہ ہی دنیا میں کہیں اور کوئی علماء کی مجلس ان کے خلاف قلمی جہاد کرتی نظر آتی ہے۔ علاوہ ازیں سعودی حکومت سے پہلا شاہ فیصل ایوارڈ پورے عالم اسلام میں سب سے پہلے مولانا مودودی کو دیا جاتا ہے۔ اسلام کے حق میں مولانا مودودی کا قلمی جہاد غیر معروف نہیں ہے۔ اور سعودی حکومت کے علماء بھی کوئی احمق نہیں تھے کہ انہوں نے بس ایسے ہی از راہِ عقیدت ساری دنیا میں سے ایک مولانا مودودی کا انتخاب کرلیا۔ وہ مولانا مودودی جسے دیوبند کے ایک عالم دین اپنی سیاست بچانے کے لیے زندیق و خارجی ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اسی مولانا مودودی نے اسلام کی خدمت کرتے ہوئے اپنے قلم سے تفسیر، حدیث، سیرت وفقہ میں اتنا کام کیا ہے کہ جس کی نظیر معترض مولانا مدنی کی نسلوں میں بھی نہیں ملتی۔ مولانا مدنی پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں۔ ایک متقی و پابند شریعت عالم دین تھے، بلاشبہ ہم ان کے پاؤں کی

جوتیوں کے نیچے آنے والی دھول کے برابر بھی نہیں ہو سکتے؛ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آپ ایک اچھے استاذ اور سیاست پر گہری نظر رکھنے والے عالم تھے۔ وہی سیاسی مزاج آپ کی نسلوں میں آج تک چلا آرہا ہے۔ آپ اکابر دیوبند کی طرح علمی و تصنیفی شغف نہیں رکھتے، تفسیر ہو، حدیث ہو یا دیگر اسلامی فنون، آپ نے کسی موضوع پر بھی کوئی قابل قدر تصنیفی یا تقریری کام نہیں کیا۔ آپ کی تقریریں بھی سیاسی ہوتی تھیں اور آپ کے مکتوبات بھی۔ یہی سیاست آج تک مدنی خاندان میں کارفرما ہے۔ اسی لیے اس خاندان سے آج تک کوئی ایسا عالم نہیں نکلا جس نے امت کو کوئی تفسیر یا حدیث کے علمی ذخائر سے بھرپور ایک کتاب بھی لکھ کر دی ہو۔

سیاست کا عالم یہ ہے کہ مکتوبات شیخ الاسلام کے نام سے دو جلدوں پر تقریباً دو ہزار صفحات کی ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کی اشاعت میں قطعاً ایمانداری سے کام نہیں کیا گیا۔ بلکہ خیانت اور سیاست کا شیوا اختیار کرتے ہوئے اُن خطوط کو شامل کتاب ہی نہیں کیا جو کسی بھی درجہ میں مولانا کی مخالفت کے مترادف تھے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی سے مولانا مدنی کی مسلسل خط وکتابت رہی ہے، جو دارالعلوم کراچی سے شائع شدہ کتاب حیاتِ عثمانی میں درج ہے؛ لیکن ان خطوط میں سے ایک بھی خط مکتوبات شیخ الاسلام نام کی ضخیم کتاب میں شامل نہیں ہے۔ اسی طرح مولانا ابواللیث صاحب کے ساتھ مولانا مدنی کی مراسلت رہی ہے، جس کا ذکر ہم گزشتہ صفحات میں کر آئے ہیں؛ لیکن مولانا ابواللیث والے تمام خط بھی مکتوبات شیخ الاسلام میں شائع نہیں کئے۔ ہے نا کمال کی بات۔ موٹی موٹی دو جلدوں میں مولانا مدنی کے تمام مکتوبات شائع کر دیے؛ مگر علامہ عثمانی اور مولانا ابواللیث والے مکتوبات جو آسانی سے کتابی شکل میں میسر ہیں وہ تمام اس کتاب میں شامل نہیں کیے۔ اسی کو کہتے ہیں سیاست سے کام لینا۔ خیانت سے کام لینا۔ جب کتاب چھاپ ہی رہے تھے تو ایمانداری سے تمام مکتوبات شائع کرنے تھے۔ بہرحال اللہ رب العزت مسلمانوں کی حفاظت فرمائے اور ہندوستانی مسلمانوں کو ایک صحیح اور سچا رہنما نصیب فرمائے۔ آمین۔ آئیے اب دارالعلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ کے جائزے کو آگے بڑھاتے ہیں۔

....

❖

زیرِ تبصرہ کتاب کے صفحہ ۳۱۷ پہ یہ عنوان درج ہے: "دارالعلوم دیوبند کی اصلاحی اور تبلیغی خدمات" اس کے تحت صفحہ ۳۱۸ تا ۳۱۹ پہ دارالعلوم سے ربط رکھنے والے ان علماء کا تذکرہ کیا گیا ہے جنھوں نے تصوف و سلوک اور بیعت و تربیت کے ذریعہ بے شمار لوگوں کی راہنمائی فرمائی۔ افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ فاضل مرتب کی متعصبانہ روش اور چاپلوسی کی عادت یہاں بھی برقرار ہے۔ دیوبند کے سب سے علمی خاندان خانوادۂ عثمانی سے تعصب پوری کتاب میں اپنے شباب پر ہے۔ جس کا نمونہ اس عنوان کے اندر بھی موجود ہے۔ جی ہاں! ۳۱ ناموں کی اس فہرست میں فاضل مرتب نے الشیخ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام نہیں لکھا ہے۔ جبکہ آپ بھی سلسلۂ نقشبندیہ چشتیہ، قادریہ اور سہروردیہ کے امین ہیں۔ ہم نے گزشتہ صفحات میں بھی کہیں لکھا ہے کہ تاریخ لکھنے والے کا مطالعہ عمیق، ضمیر زندہ اور نظر وسیع ہونا لازمی ہے اگر فاضل مرتب کا مطالعہ گہرا ہوتا تو انھیں دارالعلوم کے اوّل مفتی اعظم کی حیات کے اہم پہلوؤں سے آگاہی ضرور ہوتی، اگر فاضل مرتب کی نظر میں وسعت ہوتی تو قاسمی قبرستان دیوبند میں واقع مفتی صاحب کے قبر کا کتبہ انھیں ضرور یاد رہتا جس پر ان کے نام کے ساتھ ان کا سلسلۂ مشائخ بھی لکھا ہوا ہے۔ اگر فاضل مرتب کا ضمیر مدنی خاندان کی چاپلوسی سے آزاد ہو کر زندہ ہونے کی علامت رکھتا تو وہ بازار میں موجود ۱۹۹۱ کی شائع شدہ مفتی صاحب کی سوانح "مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی" اور "حیاتِ عزیز" کا مطالعہ ضرور کرتے۔

ہم یہاں مفتی صاحب کے مشائخ کا پورا سلسلہ بیان کر کے مزید صفحات نہیں بھریں گے، جس کو دیکھنا ہو وہ درج بالا دونوں کتب کا مطالعہ کر سکتا ہے۔

فاضل مرتب نے فقط مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی ہی کا نام نہیں چھوڑا بلکہ دارالعلوم کے مہتمم مولانا شاہ رفیع الدین عثمانی صاحب کا نام بھی ۳۱ ناموں میں شامل نہیں کیا، حالانکہ مولانا شاہ رفیع الدین عثمانی صاحب تو نہایت ہی صاحبِ کشف بزرگ تھے؛ لیکن جب کسی شخص پر خیانت اور چاپلوسی کا جذبہ غالب آجائے تو وہ کبھی دیانت اور حق پرستی کے ساتھ کچھ بھی تحریر نہیں کر سکتا۔

چاپلوسی کا مظاہرہ ۳۱ ناموں کی اس فہرست میں آخر کے ۳۰ ویں نام سے ہوتا ہے نمبر ۳۰ پہ مولوی اسعد مدنی صاحب کا نام نامی درج ہے۔ صوفیاء اور شیوخ کی اس فہرست میں یہ نام کیوں درج ہے، یہ تو بس فاضل مرتب ہی بتا سکیں گے۔ مولوی اسعد مدنی صاحب خالص سیاسی لیڈر تھے، دجل فریب سفاکی اور عیاری آپ کی سرشت میں تھی، آپ کا تصوف سے کیا میل پھر دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ آپ کو ولایت و خلافت کب نصیب ہوئی۔ والد صاحب حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے تو آخری سانس تک بھی آپ کو خلافت کے اہل نہیں سمجھا۔ اسی

لیے آخری دم تک بھی آپ کو خلافت دے کر نہیں گئے۔ پھر اس کے بعد جس ڈرامائی انداز سے اپنے خوشہ چینوں اور چاپلوس مقتدیوں سے آپ نے خلافت کا اعلان کروایا وہ منظر بھی ابھی تک کچھ لوگوں کو یاد ہے۔

بہر حال مولوی اسعد مدنی کا نام صوفیاء کی اس فہرست میں قطعاً غیر موزوں ہے۔ اب فاضل مرتب کی اس فن کاری کو ہم چاپلوسی کا نام نہ دیں تو کیا کہیں؟ ایک بات ہم یہاں اور بتا دیں کہ فاضل مرتب اس درجہ نااہل ہیں کہ پوری کتاب میں کہیں بھی ترتیب کا سلیقہ نظر نہیں آتا۔ نہ جانے کس خوش فہمی میں کتاب کے ٹائٹل پر انھوں نے مرتب کا عنوان دے کر اپنا نام ثبت کیا ہے۔

مشائخ وصوفیاء کی اس فہرست میں حسنِ ترتیب کا فقدان ہے۔ یاد رکھئے کہیں بھی اشخاص کی فہرست مرتب کرنا ہو تو سن پیدائش کے حساب سے نام درج کرنا چاہیئے اس سے بہتر کوئی ترتیب نہیں ہوتی۔ ایسا نہیں کہ جہاں جو نام یاد آیا بس وہیں لکھ دیا یہ طریقہ باسلیقہ مرتب کا نہیں ہوتا۔ اسے پھوڑ پن کہا جاتا ہے جو کہ دارالعلوم کی تاریخ مرتب کرنے والے فاضل مرتب نے ظاہر کیا ہے۔

....

صفحہ ۳۲۵ پہ "علماء دیوبند کی قرآنی وعلوم قرآن کی خدمات" کا عنوان دے کر فاضل مرتب نے جو تحقیق اور معلومات تحریر کی ہے اس کا حوالہ پاکستان کے کسی جناب پروفیسر ڈاکٹر صلاح الدین یوسف کے نام منسوب ہے۔ اس موضوع پر ہم بس اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یہ تحقیقی معلومات حاصل کرنے کے لیے کہ علماء دیوبند نے اب تک قرآنی علوم پہ کتنا کام کیا ہے، کسی دارالعلوم کے فارغ کی محنت کام نہیں آئی اس کے لیے بھی پاکستان کے ہی ایک پروفیسر صاحب کی تحقیق کا سہارا لینا پڑا اُسی پاکستان کے پروفیسر جس پاکستان کے خلاف فاضل مرتب کے پیر مولانا حسین احمد مدنی تازندگی رہے۔ اور دوسرا پہلو اِس بات کا ایک یہ بھی ہے کہ کیا دارالعلوم پہ قبضہ یعنی ۱۹۸۲ء کے بعد کوئی ایک بھی ایسا فاضل نہیں نکلا جو اس طرح کا تحقیقی کام کر سکے۔ بلا شبہ یہ حقیقت ہے کہ پورے ہندوستان میں کسی فاضل دارالعلوم نے بھی اس طرح کا علمی وتحقیقی کام نہیں کیا ہے۔ یہاں تو درسِ نظامی کی بے سود شرح لکھی جاتی ہیں یا پھر شخصیت پرستی میں مبتلا ہو کر چاپلوس قلم سوانحی خاکے تحریر کرتا ہے۔ بہر حال علمی کام تو اب دارالعلوم سے فارغ ہونے والوں کے ذریعہ خال خال بھی نظر نہیں آتے۔

ہائے رے یہ چاپلوسی

صفحہ نمبر ۳۲۶ پہ تراجمِ قرآن کا عنوان دے کر دارالعلوم دیوبند سے وابستہ اُن حضرات کے نام دیے گئے ہیں جنھوں نے قرآن کے ترجمے کیے ہیں۔ اسی فہرست میں (۷) نمبر پہ ترجمہ شیخ الہند کی ہندی اشاعت کا ذکر کرتے

ہوئے فاضل مرتب نے مترجم کی حیثیت سے دو نام لکھے ہیں۔مولانا سید ارشد مدنی صاحب و جناب محمد سلیمان صاحب۔ اب کوئی ہمیں بتائے کہ مولانا ارشد مدنی پہ ہندی اتنی کہاں آتی ہے کہ وہ کسی اُردو کتاب کا ہندی میں ترجمہ کرسکیں۔

مولانا ارشد مدنی صاحب نے کبھی اسکول میں تعلیم حاصل نہیں کی اور مدارسِ دینیہ میں ہندی کی اعلیٰ تعلیم کا کوئی نظم کہیں نہیں ہے۔ بتائیے اسے چاپلوسی نہ کہیں گے تو اور کیا کہیں گے کہ کیسے بھی کر کے مدنی صاحب کا نام ایک علمی کام کی فہرست میں شامل کر دو۔ چاہے وہ کام انھوں نے کیا بھی نہ ہو۔

یہ بات صحیح ہے کہ شیخ الہند کے ترجمہ کو ہندی میں منتقل کرنے کا کام بے شک مولانا ارشد مدنی صاحب کے کہنے پر ہی کیا گیا تھا۔اور بعد میں یہ ترجمہ شائع بھی جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے ہی کیا گیا۔لیکن کسی کام کو کرنے کا حکم دینے سے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ کام کیا بھی حاکم نے ہی ہے۔ چہ جائے کہ وہ اس کے اہل بھی نہیں۔ ویسے بھی مولانا ارشد مدنی بہت زیادہ مصروف انسان ہیں، ان کے پاس اتنا وقت ہی کہاں ہے کہ وہ کوئی علمی یا تصنیفی و تالیفی کام کرسکیں۔ ہاں یہ تو ہوا ہے کہ ابتداء میں بعد نماز عشاء پروفیسر سلیمان صاحب کو مولانا ارشد مدنی نے بلا کر یہ سمجھایا کہ ترجمہ کس طرح کرنا ہے؛ لیکن ترجمہ کیا پروفیسر سلیمان صاحب ہی نے ہے۔فاضل مرتب بے چارے مدنی خاندان سے اس درجہ مرعوب ہیں کہ چاہے نہ چاہے کہیں بھی ان کا نام فِٹ کرنا لازمی سمجھتے ہیں۔

....

متعلقات قرآنِ کریم میں علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ان تفسیری مضامین کا ذکر ہی نہیں ہے جو انھوں نے ماہنامہ القاسم میں معارف القرآن کے نام سے لکھے ہیں اور مسلسل لکھے ہیں۔ یہاں بھی فاضل مرتب کا بغض عثمانی جگ ظاہر ہے۔

....

اتنا ہی نہیں صفحہ ۳۳۸ پہ فاضل مرتب کے قلیل مطالعہ اور تنگ نظری کا ایک اور ثبوت ملتا ہے۔بخاری کی مکمل یا کچھ ابواب کی شروحات کی فہرست مع شارح پیش کرتے ہوئے فاضل مرتب نے مدبر اسلام مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام ہی نہیں دیا ہے۔اگر چہ تفہیم الحدیث کے نام سے بخاری کتاب الوحی کی مکمل اور عمدہ شرح ماہنامہ تجلی میں شائع ہو چکی ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ صفحہ ۳۳۹ پہ صحیح مسلم کی شرح کرنے والوں کی فہرست میں بھی مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام نہیں ہے اور تفہیم الحدیث کے نام سے صحیح مسلم کتاب الایمان کی لاجواب شرح بھی بہت پہلے اہلِ علم کے سامنے آچکی ہے؛ بلکہ ہم نے سنا ہے کہ شاید پاکستان میں یہ دونوں شروحات کتابی شکل میں بھی شائع کی گئی ہیں۔اب کوئی صاحبِ عقل یہ بیان نہ کرے کہ مولانا عامر عثمانی نے فقط ایک ہی باب کی شرح کی ہے مکمل کتاب کی نہیں؛ کیونکہ مکمل شرح تو کسی نے بھی نہیں کی علاوہ معدودے چند کے۔مولانا نعمت اللہ اعظمی صاحب نے بھی مسلم

کے ایک دو باب ہی کی شرح کر رکھی ہے اور تو اور شہرہ آفاق شرح "فتح الملہم" بھی مکمل نہیں تھی۔ بہر حال فاضل مرتب کے قلیل مطالعے ہی کا یہ ثمرہ ہے کہ انہیں یہ معلوم ہی نہیں، دارالعلوم دیوبند کے فارغین نے کیا کیا علمی کام کر رکھے ہیں۔ اپنی ناقص معلومات کو تاریخ کا نام دے کر قوم کو گمراہ کرنا دانشمندی نہیں، دیانت نہیں، صداقت نہیں۔

افسوس اِس بات کا ہے کہ جس شخص کا مطالعہ اتنا کم ہو اور جس کے اندر کوئی بات لکھنے سے پہلے تحقیق کرنے کا جذبہ نہ ہو، جس کے قلم میں غیر جانب داری اور حق گوئی کی صلاحیت نہ ہو تو آخر کیوں دارالعلوم کے مہتمم اور ممبرانِ شوریٰ نے ایسے نااہل کو تاریخ مرتب کرنے جیسا اہم کام سونپ دیا۔

اور دیکھئے

فاضل مرتب اس درجہ بغض و عناد کا شکار ہیں کہ شیطان بھی ان کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ صحیح مسلم کی شرح کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے مولانا نعمت اللہ صاحب کی اُس نعمت المنعم کا ذکر تو کر دیا جس کی فقط ایک یا دو ہی جلد شائع ہوئی؛ لیکن اُس تفہیم المسلم کا نام تک لکھنا گوارہ نہ کیا جو گزشتہ ۲۰ سالوں سے مسلم کی اُردو شرح کے طور پر چھوٹے بڑے ہر مدرسے کے طالبِ علم کو فیض پہنچاتی آ رہی ہے۔ خود فاضل مرتب نے بھی اپنے تعلیمی دَور میں یقیناً اس سے استفادہ کیا ہوگا لیکن بغض عثمانی کے سبب یہاں اس کتاب کا نام تک بھی نہ لکھا؛ کیونکہ تفہیم المسلم کے شارح مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی و مولانا مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی صاحب ہیں۔ جن کا جرم یہ ہے کہ یہ دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں سے ایک مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کے پڑپوتے اور دارالعلوم کے اوّل مفتی اعظم مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی کے پوتے ہیں۔

کوئی بتائے! کیا اسی طرح تاریخ مرتب کی جاتی ہے۔ کیا فاضل مرتب خوف آخرت سے اس درجہ بے زار ہو چکے ہیں کہ انھوں نے سوچ لیا جھوٹ سچ کچھ بھی لکھ دیں گے اور اللہ رب العزت ان سے حساب نہیں لے گا۔

بے ترتیبی

صفحہ نمبر ۳۱۸ سے ۳۷۴ تک مختلف عنوان کے تحت کتابوں اور مشاہیر کے ناموں کی فہرستیں ہیں۔ لیکن کمال ہے! فاضل مرتب کی تجاہل عارفانہ پہ جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ کسی ایک فہرست میں بھی تو کوئی ترتیب نہیں ہے۔ نہ تو کتابوں کے نام حروف تہجی سے درج ہیں نہ ہی سن اشاعت کے اعتبار سے، ایسے ہی شخصیتوں کے ناموں کا حال ہے نہ ہی سن پیدائش کے لحاظ سے ترتیب بنائی اور نہ ہی حروفِ تہجی کا خیال رکھا۔ یہ بے سلیقہ پن دیکھ کر بہت تکلیف ہوئی اور بار بار بس یہی خیال آتا رہا کہ یہ تاریخ مرتب کی ہے یا مورخین کی روحوں کو زخم دینے کا کام انجام دیا ہے۔

جناب محمد اللہ صاحب! تاریخ ایسے مرتب نہیں کی جاتی، اس کے لیے محنت لگتی ہے، ذہانت لگتی ہے، تدبر درکار ہوتا ہے، سلیقہ وشعور کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ تمام چیزیں کتابوں سے نہیں ملتیں؛ بلکہ انسب و اشراف علمی مزاج لوگوں کی صحبت سے حاصل ہوتی ہیں۔ ساٹھ روپئے والی پلاسٹک کی چپل پہننے والے سند یافتہ عالم قلم پکڑنے کے حقدار بھی نہیں ہوتے، اسے چلانا اور حق گوئی کے لیے استعمال کرنا تو دُور کی بات ہے۔ (واضح رہے یہ کسی کی غربت پہ طنز نہیں ہے؛ کیوں کہ غریب آدمی بھی اگر سلیقہ شعار اور مہذب ہے تو وہ پچاس روپئے کی ہوائی چپل تو پہن سکتا ہے؛ لیکن گھٹیا پلاسٹک کی نہیں)۔

فاضل مرتب کے عناد کا ایک اور نمونہ

اب تک خاندانِ عثمانی سے بغض وعناد کے متعدد نمونے ہم پیش کر چکے ہیں۔ جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ دیکھئے صفحہ ۳۵۸ پہ مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی صاحب کے نام کے ساتھ عثمانی نہیں لکھا اور ستم دیکھئے مفتیانِ کرام کی اس فہرست میں پاکستان کے مفتی تقی عثمانی صاحب کا نام تو شامل ہے؛ لیکن دارالعلوم کے ایک جید اور بے باک مفتی حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کا نام فاضل مرتب نے اس فہرست میں نہیں لکھا۔ کیا یہ بغض نہیں؟ عناد نہیں؟ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب جیسی عظیم شخصیت کو کوئی بھی ایماندار تاریخ مرتب کرنے والا بھول ہی نہیں سکتا تھا۔ ہم الزام نہیں لگا رہے ہیں؛ بلکہ حقیقت یہی ہے کہ یہ فاضل مرتب کا بغض وعناد ہے، دجل وفریب ہے۔ یہ سہو نہیں ہے، سہو ایک بار ہوتا ہے بار بار نہیں۔ اور ہاں! اس فہرست میں مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحب کا نام بھی درج نہیں ہے کہ اس وقت آپ وقف دارالعلوم کے مفتی اعظم ہیں۔ یہاں کوئی فاضل مرتب کی حمایت میں یہ نہ کہے کہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی دارالعلوم کے دارالافتاء میں ملازم نہیں تھے، وہ تو دہلی میں رہتے تھے، اگر یہ بات ہے تو پھر مفتی تقی عثمانی کا نام کس بنا پر لکھا ہے۔ مفتی تقی تو دارالعلوم کیا ہندوستان ہی میں نہیں رہتے اور نہ دارالعلوم سے فارغ ہیں نہ ہی یہاں سے افتاء کیا ہے، اس کے برعکس مفتی عتیق الرحمٰن نہ یہ کہ صرف دارالعلوم سے فارغ ہیں، نہ یہ کہ افتاء بھی یہیں سے کیا؛ بلکہ اپنے والد صاحب مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ دارالافتاء میں فتویٰ نویسی کی خدمات بھی انجام دیں۔ پھر بھی دارالعلوم کی تاریخ مرتب کرنے والے فاضل مرتب نے ان کا نام مفتیانِ کرام کی فہرست میں شامل نہ کیا۔ کیا اس عمل کو بغض وعناد کے سوا اور بھی کچھ کہا جا سکتا ہے۔

ہم پر ایک اعتراض

ہوسکتا ہے کتاب پڑھتے پڑھتے کوئی صاحب یہاں ہم پر یہ اعتراض کریں کہ تم عثمانی خاندان کے افراد کی نشاندہی کچھ زیادہ ہی کر رہے ہو۔

فاضل مرتب نے کہیں کہیں تو علامہ شبیر احمد عثمانی و دیگر اکابر کا ذکر کیا ہی ہے۔اس بابت ہم بس اتنا ہی عرض کریں گے کہ آپ کہیں کہیں ذکر کرنے کی بات کر رہے ہیں اور ہمارا کہنا ہے جہاں جہاں ہم نے تصحیح کی ہے کیا وہاں وہاں ذکر کیا ہے فاضل مرتب نے؟ آپ صدق دل سے ایک بار ان تمام مقامات کو دیکھئے ہم نے وہیں نقد کیا جہاں فاضل مرتب نے اپنے بغض وعناد کا مظاہرہ کیا ہے۔اب ہم یہاں گزشتہ صفحات کی تفصیل دہرانے سے تو رہے۔مثال کے طور پر درج بالا پیراگراف میں ہی دیکھ لیجئے مشاہیر مفتیانِ کرام کا ذکر کرتے ہوئے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی و مفتی فضیل الرحمٰن عثمانی کا نام فاضل مرتب نے نہیں لکھا، حالانکہ مفتی عتیق الرحمٰن دارالعلوم کے جید مفتیان میں شمار کیے جاتے ہیں اور تاعمر دارالعلوم کی شوریٰ کے رکن رہے ہیں۔ایسے ہی مفتی فضیل الرحمٰن عثمانی صاحب ہیں جو دارالعلوم میں استاذ بھی رہے اور پھر پنجاب میں مفتی پنجاب کے عہدے پر سالہا سال تک فائز رہے۔آج بھی دارالعلوم وقف کے مفتی اعظم کی مسند آپ کے نام ہے۔

بتائیے قارئین! ہم نے کہاں بے جا ایراد کیا ہے۔رہی بات کہیں کہیں ذکر کرنے کی تو فاضل مرتب اگر اتنا بھی نہ کرتے تو اہلِ علم کا طبقہ اس کتاب کو ہاتھ میں لینا بھی گوارہ نہ کرتا؛ بلکہ اسے چوراہے پر رکھ کر آگ لگا دی جاتی؛ کیونکہ علامہ شبیر احمد عثمانی ہوں یا ان کے برادر اکبر مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی و مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی اور ان کے والد مولانا فضل الرحمٰن عثمانی یہ تمام وہ لوگ ہیں کہ جن کا ذکر کیے بغیر دارالعلوم کی کوئی تاریخ لکھی ہی نہیں جاسکتی۔ جیسے اگر کوئی ہندوستان میں مغلیہ حکومت کی تاریخ لکھے گا تو وہ اکبر، شاہجہاں، ہمایوں اور اورنگ زیب کا ذکر کیے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔

اسی طرح صحابہ حضرات کی سوانح نگاری کا کام ہو اور ان میں خلفاء راشدین کا ذکر نہ کیا جائے تو کیا اسے مکمل تاریخ کہا جاسکے گا؟ ہرگز نہیں۔اسی طرح دارالعلوم کی تاریخ میں عثمانی خاندان کے افراد کا ذکر اتنا ہی ضروری ہے جتنا تاریخِ اسلام میں صحابہ کا تذکرہ! کہ ان کے بغیر بھی اسلام کی کوئی تاریخ مرتب نہیں کی جاسکتی۔اگر کوئی ان صحابہ کا ذکر کیے بغیر حضور ﷺ کی سیرت یا اسلام کی تاریخ مرتب کرتا ہے تو اس پر بھی اسی طرح نقد کیا جائے گا جیسے راقم نے فاضل مرتب محمد اللہ صاحب کی گرفت کی ہے۔کیونکہ اس طرح کی تاریخ گوئی یقیناً بغض وعناد اور خیانت پر مبنی ہوتی ہے۔اسی لیے ہم نے جہاں جہاں خیانت کی جلوہ نمائی دیکھی وہیں وہیں اس کا رَد کر کے حق ظاہر کیا ہے۔اب فاضل مرتب نے ہی خیانت، چاپلوسی، بے ایمانی، جھوٹ اور غیر ذمہ داری کی تمام حدیں پار کر رکھی ہوں تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔پوری کتاب اوّل تا آخر پڑھ جائیے ہمارا ایک بھی اعتراض ایک بھی نقد بے جا نہیں ملے گا، بے سبب نہیں ملے گا، بے سود نہیں ملے گا۔

آپ یہیں دیکھ لیجئے کتاب کے صفحہ نمبر ۳۷۳ پہ علماء دیوبند کی اُردو شاعری کے حوالے سے اُن شاعروں

کے نام درج ہیں جو دارالعلوم کے فاضل ہیں ان میں ایک اہم نام مولانا زبیر افضل عثمانی کا نہیں ہے، حالانکہ اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۷۲۴ پہ ان کی نظم فاضل مرتب نے شامل کتاب کر رکھی ہے۔ مولانا زبیر افضل عثمانی علامہ شبیر احمد عثمانی کے بڑے بھائی مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی کے فرزند اور مولانا عامر عثمانی کے بڑے بھائی ہیں۔ اب بتائیے اس کو کیا کہا جائے۔ چلیے ہم یہاں فاضل مرتب کے اس عمل کو خیانت سے تعبیر نہیں کرتے؛ لیکن غیر ذمہ داری اور نااہلی کا عنوان تو بہرحال اس عمل پر ثبت ہوتا ہی ہے۔

اب ہماری اس گرفت اور نشاندہی کو آپ بے جا تنقید کہہ کر ناانصافی کا مظاہرہ تو نہیں کرسکتے۔ ایمانداری سے خود فیصلہ کیجیے جس شاعر کی نظم آپ کتاب میں شامل کر رہے ہیں، شاعروں کی فہرست میں اسی کا نام شامل نہیں کرتے، تو یہ کہاں کا انصاف ہے۔ یہ کیسی ذمہ داری کا اظہار ہے۔

ایک ستم اور دیکھئے

صفحہ نمبر ۳۷۴ پہ فضلائے دیوبند کی صحافتی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ماہنامہ جرائد اور ان کے مدیر کے نام درج کیے گئے ہیں۔ ہمیں حیرانی ہوئی فاضل مرتب کی خیانت اور عادت فریب پر کہ موصوف نے ہندوستان کے سب سے مشہور و معروف اور مقبول ترین ماہنامہ رسالے کا نام ہی اس فہرست سے اُڑا دیا۔ وہ رسالہ جس کی نظیر آج تک بھی کوئی پیش نہ کرسکا، وہ رسالہ جس کی کثیر الاشاعت کا مقابلہ کبھی کسی اردو کے اسلامی جریدے نے نہیں کیا، وہ رسالہ جس کو پڑھنے کے لیے لوگ باقاعدہ انتظار کیا کرتے تھے، وہ رسالہ جس کا نشہ لوگوں کے سر چڑھ کر بولتا تھا، وہ رسالہ جو آج بھی اپنی اہمیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ کہ کسی کو آج بھی کہیں سے اگر ایک شمارہ بھی اس رسالے کا مل جاتا ہے تو وہ بڑے جذبے کے ساتھ اس کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ رسالہ جسے پڑھنے کے بعد اہلِ علم نے قلم چلانا سیکھا، وہ رسالہ جس نے اہلِ علم کو اُردو ادب کی چاشنی اور زبان کی حلاوت فراہم کی، وہ رسالہ جس نے ہر ایک گام پر باطل کے ایوانوں میں نقارۂ حق بجایا، وہ رسالہ جسے لوگ ماہنامہ تجلی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ درج بالا توصیفی جملے فقط تعریف نہیں ہیں؛ بلکہ حقیقت کا اظہار ہے۔ ذرا ہمیں کوئی ایک تو ایسا اسلامی و مذہبی رسالہ دکھا دو جو اُس زمانے میں جب آبادی کم تھی، تشہیر کے ذرائع کم تھے ۱۹۷۰ء سنہ ۱۹۷۵ء میں پچیس ہزار کی تعداد میں شائع ہوتا ہو۔ یہ تعداد اتنی بڑی ہے کہ ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا میں اُردو زبان کا کوئی بھی مذہبی رسالہ اتنی تعداد میں شائع نہیں ہوا اور نہ آج ہوتا ہے۔ ہے نہ کمال کی بات کہ دیوبند سے نکلنے والے ملک کے سب سے مشہور ترین رسالے کا نام فاضل مرتب نے نہیں لکھا۔ کسی بھی حال میں فاضل مرتب کے اس جرم کو خطا یا سہو نہیں مانا جاسکتا؛ کیونکہ ایسا ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی شخص مغلیہ بادشاہوں کی تعمیرات کا ذکر کرے اور تاج محل کو نظرانداز کر جائے۔ یہ کسی طور بھی تسلیم نہیں

کیا جا سکتا کہ کوئی ازواجِ مطہرات کی سیرت لکھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نام تک تحریر نہ کرے۔ یہ کیسے مان لیں کہ کوئی ہندوستان کی کرکٹ ٹیم پر تاریخ رقم کرے اور سچن تندولکر کا نام لکھنا بھول جائے۔ یہ کیسے قبول کیا جا سکتا ہے کہ کوئی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ لکھے اور سرسید کا ذکر بھی نہ کرے۔ ایسے جاہل، احمق اور نااہل مورخ کے ہاتھوں سے قلم لے کر اس کی تحقیق و تالیف کو آگ لگا دینی چاہئے۔ یہ سب ہم شدتِ جذبات میں نہیں لکھ رہے ہیں؛ بلکہ حقیقت یہی ہے۔ ماہنامہ تجلی جیسا علمی و ادبی رسالہ پوری دنیا میں دوسرا نہیں ہے۔ ۱۹۴۹ سے 1975 مسلسل پچیس سال تک دیوبند سے نکلنے والا یہ رسالہ فاضل مرتب نے بالکل فراموش کر دیا۔ حالانکہ پچھلے صفحہ نمبر ۳۷۳ پہ ہی مرتب نے تجلی کے مدیر کا نام شاعروں کی فہرست میں دیا ہے۔ محمد اللہ صاحب نے سوچا کہ وہ مدبر اسلام، مجاہدِ حق، نقاد اعظم، شہنشاہِ قلم مولانا عامر عثمانی کا نام بحیثیت شاعر لکھ کر پلّا جھاڑ لیں گے اور دنیا اس بات کو تسلیم کر لے گی۔ محمد اللہ صاحب! دنیا کے تمام مسلمان آپ کی طرح اندھی عقیدت کے دسترخوان پر چاپلوسی کی روٹیاں نہیں توڑتے ہیں۔ آپ کا قلم اور آپ کا حلق دونوں چند سکوں کے لیے گروی رکھے جا سکتے ہیں؛ مگر اہلِ زبان اور حق گو ابھی زندہ ہیں، جو آپ کے اس تجاہلِ عارفانہ پر صدائے حق بھی بلند کر رہے ہیں اور قلم سے بھی اس کا جواب دے رہے ہیں۔

قارئین! جن رسالوں کا نام مرتب صاحب نے صفحہ نمبر ۳۷۴ پہ درج کیا ہے ان میں ماہنامہ برہان کے علاوہ دوسرا ایک بھی کوئی رسالہ نہیں جو علمی وقعت رکھتا ہو۔ سب کا بس ایک ہی طرز ہے، مختلف لوگوں کے بے کیف مضامین شامل کیے اور ہو گیا رسالہ تیار۔ مدیر کی حیثیت فقط مرتب کی سی ہے جو عرض مرتب کی طرح دو صفحہ کا اداریہ لکھ دیتا ہے۔ مرتب صاحب کی تحریر شدہ اس فہرست کو لے کر شہر در شہر، گاؤں در گاؤں چلے جائیے ان رسالوں اور جریدوں کا نام لینے یا سننے والا کوئی نہیں ملے گا۔ اس کے برعکس ماہنامہ تجلی کا نام پکاریں گے تو صحرا میں بھی کوئی نہ کوئی ضرور مل جائے گا جو تجلی شناس ہوگا۔ آج بھی ملک و بیرونِ ملک میں ماہنامہ تجلی کے عشاق کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ یقین نہ آئے تو تجربہ کر لیجیے۔ کسی بھی اہلِ علم کی مجلس میں تجلی کا ذکر کر دیجئے اور پھر دیکھئے جلوہ مولانا عامر عثمانی کے قلم کا۔ کاذب اور جھوٹ پسند لوگ مولانا عامر عثمانی کو برا کہتے ہوئے ملیں گے اور سچے و حق پسند اشخاص تجلی کو تاریکی میں ایک چراغ کا عنوان دے کر گھنٹوں مولانا عامر عثمانی کی باتیں کرتے ہوئے نظر آجائیں گے۔ یعنی دشمن ہوں یا دوست سبھی کی زبانوں پر تجلی کا نام ضرور آئے گا۔

.....❖.....

کوئی بھی کتاب ہو اس کے لکھنے کے لیے سب سے ضروری چیز مصنف کا حق پرست اور مخلص ہونا لازمی ہے ۔جھوٹ و افترا ،غلو و چاپلوسی اور یک طرفہ ذہنیت سے جو بھی کتاب وجود میں آئے گی وہ ہرگز قابل تحسین اور لائق پذیرائی نہیں ہوگی ۔نہ تو عوام ایسے مصنف کو پسند کرتی ہے نہ ہی وقت کبھی ایسے چاپلوس قلم کار کو معاف کرتا ہے ۔حق گوئی کے معیار سے گر کر جو لوگ کتابیں مرتب کرتے ہیں ان کو کبھی قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا ۔نہ ہی ان کی ترتیب شدہ کاوش کو کبھی کوئی اہمیت حاصل ہوتی ہے ۔ یہ چند سطور ہم نے فاضل مرتب کی حرکتوں کے سبب تحریر کی ہیں ۔کہ دارالعلوم کی تاریخ مرتب کرنے والے فاضل مرتب محمداللہ صاحب بھی ایسے ہی یک طرفہ ذہنیت اور غلو پسند چاپلوس قسم کے قلم کار ہیں ۔اس کی متعدد مثالیں آپ ہماری اس کتاب میں ملاحظہ فرما چکے ہیں ۔اب تو ہمیں شرم آنے لگی ہے کہ آخر کہاں تک اور کب تک ان کی غلط بیانیوں اور خیانتوں کا تذکرہ کریں ۔ لیکن کیا بھی کیا جاسکتا ہے ۔جب کتاب کا جائزہ لکھنے کے لیے قلم اُٹھایا ہے تو اس کام کو اُدھورا بھی تو نہیں چھوڑ سکتے ۔اس وقت جو خیانت ہمارے سامنے آئی ہے اس کو دیکھ کر دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ بس بند کرو ۔آخر اس بکواس کتاب کا جائزہ کہاں تک تحریر کریں ۔اس میں تو ہر ہر صفحہ پر بدگمانی ،فریب ،اور خیانت کے ایسے ایسے نمونے ہیں کہ الامان والحفیظ ۔

دارالعلوم کی تاریخ مرتب کرنے والے فاضل مرتب صاحب مولانا مدنی کی چاپلوسی میں اس قدر گرفتار ہیں کہ انھیں کچھ اور نظر نہیں آتا ۔خیانت اور چاپلوسی کا ایک اور نمونہ ملاحظہ فرمائیے ۔

جمعیۃ علماءِ ہند اور جدوجہد آزادی

اس عنوان کے تحت صفحہ نمبر ۳۸۵ پہ فاضل مرتب نومبر ۱۹۲۰ میں ہوئے جمعیۃ علماءِ ہند کے دوسرے سالانہ اجلاس کا ذکر کرتے ہیں اور پورے اجلاس میں جو سب سے اہم چیز تھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے ۔یعنی علامہ شبیر احمد عثمانی کا خطبۂ صدارت جو شیخ الہند کے حکم سے علامہ عثمانی نے تحریر کیا تھا ۔اور پھر اجلاس میں پڑھا بھی ۔ پورے اجلاس میں سب سے اہم خطبہ یہی تھا ،جس نے وہاں موجود لوگوں کو انگریزوں سے ترکِ موالات پر فقہی بصیرت کا ایسا معلومات افزا مواد فراہم کیا کہ سبھی کے ذہنوں میں ملک کی آزادی کی شمع روشن ہوگئی ۔

خیانت کا دوسرا نمونہ

اسی صفحہ ۳۸۵ پر فاضل مرتب نے جمعیۃ کے دوسرے اجلاس کے ساتھ ۱۹۲۱ کی کانفرنس کا ذکر کرنے کے بعد سیدھے ۱۹۲۴ میں ہوئے پانچویں اجلاس کا تذکرہ کیا ہے ۱۹۲۲ اور ۱۹۲۳ کے تیسرے اور چوتھے اجلاس کا ذکر کیوں چھوڑ دیا گیا ۔ یا تو کسی ایک بھی اجلاس کا ذکر نہ کرتے یا اگر کرنا ہی تھا تو کم سے کم مسلسل پانچوں کا ذکر

کرتے۔ یہ کیا کہ بیچ کے دو اہم اجلاس کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں۔جمعیۃ کا تیسرا اجلاس نومبر ۱۹۲۱ کو لاہور میں ہوا۔جس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزادؒ نے کی۔ ۱۹۲۲ کا اجلاس جو دسمبر کے مہینے میں گیا (بہار) میں منعقد ہوا تھا، بہت اہم تھا۔اس اجلاس کی صدارت فخرالہند مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے کی تھی اور ایک فصیح وبلیغ خطبۂ صدارت پیش کیا تھا۔

فخرالہند صاحب کا خطبۂ صدارت اتنا اہم اور فکرانگیز تھا کہ اس کو باقاعدہ کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔جو آج بھی دارالعلوم کی لائبریری میں خطبۂ صدارت اجلاس سالانہ جمعیۃ علماء ہند دسمبر ۱۹۲۲ کے نام سے موجود ہے۔اس اجلاس میں ملک کے اہم ترین دانشوران وعلماء کرام نے شرکت کی تھی؛ لیکن فاضل مرتب بغض عثمانی میں اس درجہ مبتلاء ہیں کہ انھوں نے اس اجلاس کا ذکر کیا ہی نہیں۔اگر ذکر کرتے تو اجلاس کے صدر کا نام بھی تحریر کرنا پڑتا اور کسی پروگرام کی صدارت اگر دیوبند کے عثمانی خاندان کا فرد کررہا ہو تو اس کا ذکر فاضل مرتب کیسے کرسکتے ہیں۔کہ اندھیرے کبھی چراغوں کا ذکر نہیں کرتے۔

خالص جھوٹ

یہاں ہم دارالعلوم کی جامع ومختصر تاریخ کتاب کے صفحہ نمبر ۳۸۸ کا آخری پیراگراف نقل کرکے آپ کو جھوٹ کا نمونہ دکھاتے ہیں۔فاضل مرتب صاحب لکھتے ہیں:

> ’’دوسری طرف علماء نے تقسیمِ ہندوستان اور نظریۂ پاکستان کی زبردست مخالفت کی، حالانکہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہوپائے۔اور انگریز اپنی تفرقہ انگیزی کی سیاست میں کامیاب ہوئے۔لیکن علماء متحدہ قومیت کی حمایت کا سب سے اہم فائدہ یہ ہوا کہ ہندوستان ایک سیکولر اور جمہوری ملک بنا اور اس کے دستور نے ہندوستانی مسلمانوں کو برابر کا حق دیا خدانہ خواستہ اگر ملک کا سیاسی ڈھانچہ غیر سیکولر اور غیر جمہوری ہوتا تو مسلمانوں کا اس ملک میں کیا حال ہوتا، اس کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ہندوستان کے آئین میں مسلمانوں کو باعزت برابری کا حق انھیں علماء کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔جنھوں نے ہر طرح کی فرقہ واریت اور مذہبی لکیروں سے ہٹ کر اس کثیر المذاہب اور متنوع الثقافۃ ملک کے لیے سیکولر آئین بنوایا تاکہ یہاں ہر مذہبی طبقہ اپنے مذہب پر آزادی کے ساتھ قائم رہ سکے۔اور اپنے مذہب کی بقا و اشاعت کے لیے خودمختار ادارے قائم کرسکے۔‘‘ (دارالعلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ صفحہ نمبر ۳۸۸)

سمجھدار کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔درج بالا اقتباس کا پہلا ہی جملہ دیکھئے لکھتے ہیں کہ:’’علماء نے تقسیمِ ہند اور نظریۂ

پاکستان کی مخالفت کی''۔یعنی کہ پاکستان کے حامی کوئی علماء نہیں تھے،اصل علماء نے تو اس کی مخالفت کی؛ حالاں کہ یہ خالص فریب پر مبنی عبارت ہے،نظریہ پاکستان کی حمایت کرنے والوں میں یہاں سے زیادہ علماء حضرات شامل تھے،سب سے بڑے حکیم الامت حضرت تھانوی ؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانی ؒ پھر مفتی محمد شفیع صاحب ؒ،مولانا ادریس کاندھلوی ؒ،علامہ یوسف بنوری اور بھی بہت سے علماء دیوبند نظریہ پاکستان اور مسلمانوں کے اپنے الگ ملک کے حامی تھے۔فاضل مرتب فقط مولانا حسین احمد مدنی ؒ اور چند علماء کے سبب تمام علماء کو نظریہ پاکستان کا مخالف لکھ رہے ہیں،یہ کہاں کا انصاف ہے۔اب تین سطریں چھوڑ کر آخر تک پڑھیے اور بار بار پڑھیے۔جس سیکولر اور جمہوری ملک کا ذکر فاضل مرتب کر رہے ہیں کیا موجودہ ہندوستان وہی جمہوری ملک ہے؟ کیا واقعی یہاں کے قانون میں دیے گئے حق کا لحاظ رکھا جا رہا ہے؟ کیا واقعی ہندوستان کے آئین سے ملنے والی عزت اور برابری کا حق آج مسلمانوں کے لیے ہے؟ دَورِ حاضر کے مشاہدات اور تجربات سب کے سامنے ہیں۔ہندوستان میں مسلمانوں پر کیے جانے والے ظلم کا ذکر کرنے کا مطلب ہے ہزاروں صفحات سیاہ کرنا۔بھارتی مسلمانوں پر مظالم کی داستانیں اتنی زیادہ ہیں کہ ایک ہزار صفحات سے بھی زیادہ کی کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

حیرت تو اِسی بات پہ ہے کہ فاضل مرتب اس ڈھٹائی سے جھوٹ بول رہے ہیں کہ شیطان بھی شرما جائے۔ بات فقط دَورِ حاضر کی نہیں،ہندوستان میں مسلمانوں کو سن سینتالیس کے بعد ہی سے تعصب اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔تاریخ شاہد ہے گزشتہ ۷۰ سالوں سے پورے ملک میں مختلف مقامات پر مسلمانوں کی جان و مال کو ہمیشہ تباہ و برباد کیا ہے۔اس کے برعکس امن پسند مسلمانوں نے کبھی بھی ہاں کبھی ایک بار بھی اس ملک میں فساد برپا نہیں کیا۔اس موضوع پر ہم مزید تفصیل میں جانا نہیں چاہتے؛ کیونکہ یہ کتاب اس مقصد کے لیے نہیں ہے۔اور یہ تفصیل اتنی مفصل ہے کہ اس کے لیے بے شمار صفحات چاہئیں یہ چند صفحات ہم پر ہوئے مظالم کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

افسوس تو اس بات پر ہے کہ جس عزت اور برابری کے حق کو فاضل مرتب ان علماء کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ بتا رہے ہیں وہ حق اور عزت ہے کہاں؟ مقامِ افسوس ہے کہ جن علماء کو فاضل مرتب قوم کا سربراہ و رہنما ثابت کر رہے ہیں حقیقت میں کیا واقعی انھوں نے امت کی رہنمائی کی ہے؟ کیا ایسا نہیں تھا کہ اپنی سیاست چمکانے کے لیے پاکستان کی مخالفت کرتے ہوئے اہلِ اسلام کے خلاف کانگریس وکفار کا ساتھ دینے والے یہ سیاسی علماء ۹ کروڑ مسلمانوں کے مستقبل کو تاریک بنا رہے تھے۔آخر ان سیاسی علماء کے پاس آزادی کے بعد مسلمانوں کے لیے کیا لائحہ عمل تھا۔ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کی کیا پالیسی تھی اور کہاں ہے وہ پالیسی،کہاں ہیں مسلمانوں کی فلاح وترقی کے منصوبے کہیں نہیں،کچھ تھا ہی نہیں بس انگریزوں سے آزادی مقصد تھا اور کچھ نہیں مشرکین کے ماتحت

مسلمان محکوم ہو کے رہے یہ تو ان سیاسی علماء کو منظور ہوا؛ لیکن دنیا کے نقشے پر ایک مسلم ملک کا اضافہ اور مسلمان کی حکومت کا خیال ان کو فاسد اور غلط لگتا رہا۔ اُس وقت کی گئی ان کی غلطی آج ہندوستان کے ۳۵ رکروڑ مسلمان بھگت رہے ہیں۔ جس کی مثال ہم سب کے سامنے ہے۔ ہندوستان کا مسلمان اپنے ہی ملک میں بے بس و لاچار ہے۔ مائک پر اذان نہیں دے سکتے، گوشت نہیں کھا سکتے، قربانی نہیں کر سکتے، طلاق نہیں دے سکتے، ایک سے زیادہ شادی نہیں کر سکتے، سرکاری ملازمت نہیں کر سکتے، اپنے بچوں کو جن گن من جیسے بے مطلب اور بکواس ترانے سے محفوظ نہیں رکھ سکتے، ڈاڑھی نہیں رکھ سکتے، بس اور ٹرین میں سفر کرتے ہوئے ڈر لگنے لگا۔ ہندو اکثریت علاقے میں رہ نہیں سکتے حتیٰ کہ آزادی اور اطمینان کے ساتھ دینی مدارس بھی نہیں چلا سکتے۔ کل ملا کر کچھ نہیں کر سکتے! تو کیا متحدہ کوششیں کرنے والے ان کانگریسی علماء کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ ۳۰ کروڑ ہندوؤں کے زیر اثر ۹ کروڑ مسلمان کیسے محفوظ اور سکون سے رہ سکیں گے۔ یہ آبادی مستقبل میں بڑھ کر اور زیادہ فساد پیدا کرے گی۔ اور یہی ہوا آج اَسّی کروڑ ہندو اور ۳۵ رکروڑ مسلمانوں والا یہ ملک دنیا کی بدترین بدامنی والی جگہ بن چکا ہے۔ سچائی یہ ہے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع دیوبندی، محمد علی جناح و دیگر دانشورانِ قوم کی مخالفت کرنے والے کانگریسی علماء نے ہندوستانی مسلمانوں کو کفار و مشرکین کے آدم خور پنجوں میں سونپ دیا جس کا نمونہ آپ سب کے سامنے روزانہ مرتے ہوئے بے گناہ و معصوم مسلمان اور ان کے بچے ہیں۔

ہر کام میں منصوبہ بندی اور مسلسل کوششوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو کام گزشتہ ۷۰ سالوں میں جمعیۃ علماء ہند نے نہیں کیا وہ اپنی جدوجہد اور منصوبہ بندی کے طفیل آر ایس ایس نے بہ خوبی انجام دیا ہے۔ آج ملک میں وہی ہوتا ہے جو وہ چاہتے ہیں۔ اب آپ یہاں یہ مت کہیئے گا کہ وہ تشدد اور جبر کی راہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ بات تشدد کی نہیں بات خود کو اس درجہ طاقتور بنانے کی ہے کہ وہ تشدد کرنے کے لائق بن سکے۔ جمعیۃ کے سیاسی علماء نے کیا کیا ہے امت کے لیے؟ قومی یک جہتی کے بے سود اور کھوکلے نعرے لگا کر مسلمانوں کے اندر سے جہاد کا جذبہ نکال دینے والے ان کانگریسی علماء نے آج مسلمانوں کو کمزور، پست، بزدل، ناتواں اور ڈرپوک بنا دیا ہے۔

فاضل مرتب اقتباس کی آخری سطر میں لکھتے ہیں کہ ’’ان علماء نے ملک کے لیے سیکولر آئین بنوایا تاکہ یہاں ہر مذہبی طبقہ اپنے مذہب پر آزادی کے ساتھ قائم رہ سکے‘‘ قارئین! بتائیے کہاں ہے وہ آزادی، جس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ مسلم پرسنل لاء میں ہنود کی مداخلت ہنوز جاری ہے۔ اور آپ دیکھ لینا یہ تشدد پسند اکثریت مسلمانوں کی زندگی کے تمام شرعی شعبوں میں حسبِ منشا قانونی تبدیلی لا کر رہے گی اور قوم کے ٹھیکیدار بنے جمعیۃ کے لیڈر بس یہی کہتے رہیں گے کہ ہم مسلم پرسنل لاء میں مداخلت برداشت نہیں کریں گے۔ وہاں مداخلت تو دُور باقاعدہ قانون نافذ ہو جائیں گے۔ جیسے کہ تین طلاق کے موضوع پر ہو چکا ہے اور یہ بے چارے جمعیۃ کے مالک پھر کسی

نئے اجلاس کی تیاری میں مصروف ہیں۔ان ہی سب باتوں کی وجہ سے ہم نے کہا کہ فاضل مرتب نے جھوٹ لکھا ہے۔اب آپ خود ہی بتائیے کیا یہ فاضل مرتب کی بے جا چاپلوسی نہیں ہے وہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے یہ بتا رہے ہیں کہ ہم محفوظ ہیں۔اسی چاپلوسی نے امت کے بڑے طبقے کو برباد کیا ہے۔ایسی جھوٹی کتابوں نے ہی نوجوانوں کے اندر شخصیت پرستی کے وہ جراثیم پیدا کیے ہیں جنھوں نے شجاعت و جوانمردی کے جذبوں کو سڑا گلا کر معذور کر دیا ہے۔

اسی شخصیت پرستی کے سبب ہماری حقیقت پر مبنی تحریر کو تلخ کلامی کا عنوان دے کر اس پہ غور کرنے کے بجائے اور اپنی خامیاں دُور کر کے مسلمانوں کے مستقبل کی فکر کرنے کے برعکس ہمیں گالیاں دی جائیں گی۔بہت سے مرید و خوشہ چیں اور چاپلوس قسم کے شخصیت پرست تو ہماری اس کتاب کو پڑھتے ہوئے ہمیں علماء کی توہین کرنے والا اور مُکذِّبِ اکابر کا لقب دے کر نہ جانے کیسی کیسی بددعائیں بھی دے رہے ہوں گے۔لیکن اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ہمیں ایسی گالیوں اور بے سبب بددعاؤں کی فکر نہیں اخلاص کے ساتھ عمل کیے بغیر فقط بددعائیں دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔اگر بددعائیں یوں ہی اثر پذیر ہو جایا کرتیں تو اب تک دنیا سے اسرائیل مٹ چکا ہوتا۔امریکہ برباد ہو چکا ہوتا اور مسلمانوں کی حالت بادشاہِ وقت کی ہوگئی ہوتی۔لیکن حالات کسی کو بددعا دینے سے نہیں؛ بلکہ ایمانداری اور اخلاص کے ساتھ عملی کاوشوں سے بدلتے ہیں۔منصوبہ بند جہد مسلسل سے قوموں کا مستقبل سنورتا ہے۔ جلسوں میں فقط تقریریں کرنے سے نہیں۔

حقیقت میں زیرتبصرہ کتاب سرے سے تاریخ ہے ہی نہیں۔یہ تو شخصیت پرستی کے جذبے میں لکھی گئی مداح سرائی کا نمونہ ہے، جس میں کوئی علمی بات یا تاریخ بیان نہیں کی گئی ہے؛ بلکہ دارالعلوم کا تعارف کراتے ہوئے مدنی خاندان اور ان کے خوشہ چینوں کی مدح سرائی کا کارنامہ انجام دیا گیا ہے۔

....

ایک اور خیانت

صفحہ نمبر ۳۸۹ پہ ''جمعیۃ علماء ہند اور اس کی ملّی وسماجی خدمات'' کا عنوان دے کر فاضل مرتب نے جمعیۃ کے صدرین کا ذکر کیا ہے اور یہاں بھی ان صاحب نے بغض وخیانت کی سابقہ روش کو باقی رکھتے ہوئے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کا نام نہیں لکھا۔حالانکہ مولوی اسعد مدنی صاحب کے قبضہ کرنے سے پہلے یعنی ۱۹۶۵ تک مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی بھی جمعیۃ علماء ہند کے ورکنگ صدر تھے۔

روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں؟

اس کے بعد فاضل مرتب نے چاپلوسی کے جذبے میں سرشار ہوکر امیر شہر کے چمچے کی طرح نمک خواری کا حق ادا کرتے ہوئے الجمعیۃ کے جمعیۃ علماء ہند نمبر کے حوالے سے ۳ صفحات میں جمعیۃ علماء ہند کے اُن کارناموں کی فہرست پیش کی ہے جو حقیقت میں کارنامے نہیں؛ بلکہ ناکامیاں ہیں، شکست ہیں، ہار ہیں، پراجے ہیں۔ وقت اور صفحات بچاتے ہوئے ہم یہاں اختصار سے کام لے رہے ہیں ورنہ تو صفحہ نمبر ۳۹۰ سے ۳۹۶ تک کے تمام صفحات نقل کرکے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرکے آپ کے سامنے رکھ دیتے۔ صفحہ نمبر ۳۹۰ کے چوتھے پیراگراف کی پہلی اور آخری سطریں ملاحظہ فرمائیں:

”جمعیۃ علماء ہند نے ملک کے دستور اور اس کے سیکولر تانے بانے سے چھیڑ چھاڑ کرنے والی ہر کوشش اور سازش کے خلاف آواز اُٹھائی۔ جمعیۃ علماء ہند کی انہیں کوششوں کی وجہ سے دستور اور سیکولرازم میں یقین نہ رکھنے والے افراد اور جماعتوں کی ناپاک سازشیں کامیابی سے ہم کنار نہ ہوسکیں۔“

اس کے بعد صفحہ ۳۹۱ / آخری پیراگراف میں بابری مسجد کے معاملے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

”جمعیۃ نے قانونی انصاف کے حصول کے لیے ۱۹۴۹ ہی میں عدالتی کارروائی کا آغاز کردیا تھا۔“

پھر اسی پیراگراف میں جمعیۃ کی پالیسی کی تعریف کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں کہ:

”جمعیۃ کی یہ پالیسی نہ صرف مسجد کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے ضروری تھی؛ بلکہ ملکی اتحاد اور قومی یکجہتی کے لیے بھی ضروری تھی۔“

قارئین! اگر واقعی آپ کے سینے میں ایک ایماندار دل ہے اور واقعی آپ یومِ آخرت پہ یقین رکھتے ہیں، آپ کو حقیقت وسچائی کے پرکھنے کا ہنر معلوم ہے تو اللہ کے واسطے بتائیے کیا درج بالا اقتباس میں بتائی گئی باتیں کامیابی اور کامرانی ہیں؟ کیا ملک کے دستور اور سیکولرازم کے خلاف اُٹھنے والی آوازیں خاموش ہوگئیں؟ بلکہ اب تو ان آوازوں نے عملی شکل اختیار کرلی ہے۔ یہ لوگ قومی یکجہتی کا رونا روتے ہوئے کانفرنس کرتے رہے اور اُنھوں نے ملک کے دستور وآئین کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنا شروع کردیا۔ گائے کے نام پر بے گناہ مسلم مارے جارہے ہیں، جمعیۃ کہاں ہے۔ مسجدوں سے مائک ہٹادیے گئے، ہریانہ میں مساجد بند کردی گئیں۔ چنڈی گڑھ میں بڑے کا گوشت مکمل بند ہے، ملک کے بہت سے علاقے قربانی سے محروم ہیں، تین طلاق جرم ٹھہرادی گئی اور بھی وہ سب ہوگیا جس کے لیے جمعیۃ نے اجلاس کرکر کے اپنی مخالفت درج کرائی؛ لیکن اس بھیڑ کی مخالفت سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ کہاں ہے جمعیۃ؟ گزشتہ صفحات میں ہم نے کہیں لکھا ہے کہ جمعیۃ کی تحریکات اور اجلاس سے ہندوستانی مسلمانوں کو کوئی خاطر خواہ فائدہ کبھی نہیں ہوا۔ ہمارا یہ لکھنا بلاشبہ حق بہ جانب اور حقیقت ہے۔

بابری مسجد کا ذکر کرتے ہوئے جس قومی یکجہتی کا نعرہ لگایا گیا ہے کیا حاصل ہوا اُس سے۔کیا جمعیۃ نے بابری مسجد کو شہید ہونے سے بچالیا۔کیا وہ یہ کیس جیت گئی؟ نہیں! کوئی ایک کام بھی تو مدنی خاندان کی اس جمعیۃ نے ایسا نہیں کیا جس سے ہندوستانی مسلمانوں کا سر دنیا بھر میں فخر سے اونچا ہوگیا ہو۔ ہم یقین سے کہتے ہیں کہ یہ کیس جمعیۃ ہارے گی اور بہت جلد وہاں مندر بن جائے گا؛ بلکہ کیس تو یہ ہار ہی چکی ہے۔مندر تو وہاں ہے ہی، پوجا بھی ہوتی ہے بس ایک بڑی اور پُرشکوہ عمارت نہیں ہے۔وہ سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد بن ہی جائے گی۔کمال تو اِس بات کا ہے کہ عدالت کا فیصلہ، عدالت کا فیصلہ چلّانے والوں کی عقلوں پر وہ کون سے پتھر پڑ گئے ہیں، جس کے سبب انھیں یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ آخر عدالتِ عظمیٰ ہے کیا چیز؟ چند ہنود کی اجتماعی مجلس ہی تو ہے۔اور سورج مغرب سے نکل سکتا ہے؛ لیکن یہ ہمارے حق میں فیصلہ نہیں کرسکتے۔کیا سیاسی علماء کا یہ طبقہ سورۂ مائدہ کی اُن آیات کو فراموش کرچکا ہے جن میں نصاریٰ کو ان مشرکین کے مقابلے بہتر بتایا گیا ہے۔مشرکین سے مراد یہ ہنود ہی ہیں۔ بلاشبہ اِن کے دلوں میں اسلام اور اہلِ اسلام کے لیے نفرت ہے اور نفرت کرنے والے کبھی حمایت نہیں کرتے۔ اس لیے یہ کسی طور ممکن نہیں ہوگا کہ بابری مسجد کا فیصلہ مسلمانوں کی حمایت میں ہوجائے۔کیونکہ حق اور باطل کا فیصلہ خوفِ خدا اور یومِ آخرت کے فیصلے پر منحصر ہوتا ہے۔جو لوگ خدا اور آخرت ہی کے منکر ہوں تو ان کے لیے حق کیا اور باطل کیا؟ اہلِ دنیا کے لیے تو حبِّ دنیا ہی متاعِ ہستی ہے اور دنیا ہی کو سب کچھ سمجھنے والے آخرت کی فکر و پرواہ نہیں کرتے، اس لیے یاد رکھئے گا جو آخرت ہی کی پرواہ نہیں کرتے تو وہ حق و انصاف کا خیال کیونکر کرسکیں گے۔

ہم یہاں فاضل مرتب سے درخواست کریں گے کہ خدارا ایسی جھوٹی اور غلو آمیز چاپلوس تحریریں لکھنے کے بجائے حق و صداقت کی آواز بلند کیجئے، تا کہ دنیا ملے نہ ملے؛ مگر آپ کا ضمیر زندہ رہے گا اور آپ تاحیات آئینے کے سامنے شرمندہ نہیں ہوں گے۔پھر حیات کے بعد آخرت میں اللہ و رسول کے سامنے بھی آپ کو شرمندگی نہیں ہوگی۔سچ لکھنے اور بولنے کے سبب آپ کے درجات بلند کیے جاسکتے ہیں اور آپ شہداء و صدیقین کی صفوں میں شامل ہوسکتے ہیں؛ لیکن جھوٹ اور بزدلی کی باتیں لکھنے والوں کو بلند مقام عطا نہیں ہوتے نہ ہی آخرت میں اور نہ ہی اس دنیا میں۔

ہاں ایک کام تو جمعیۃ نے کیا ہے اور کر رہی ہے، جس کو ہم قابلِ قدر اور قابلِ تحسین سمجھتے ہیں۔چند بے قصور مسلمانوں کو پولیس کی قید سے رِہا کرانے کا کام۔بلاشبہ یہ ایک اچھا عمل ہے؛ لیکن دس پندرہ لڑکوں کو رِہا کرا کر اس کا احسان تیس کروڑ مسلمانوں کے سر پر تو نہیں رکھا جاسکتا۔بے شک رہا ہونے والے لوگوں کے گھروں میں خوشیاں لوٹ آئی ہیں۔بے شک ان کی زندگی قید و بند کی اذیتوں سے راحت پاگئی ہے؛ لیکن اس سے پوری امت کو تو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔یہ جمعیۃ علماء ہند ہے یعنی پورے ہند کی جماعت اور پورے ہند میں تیس کروڑ سے زیادہ مسلمان رہتے ہیں۔جب پوری قوم کے ٹھیکیدار بننے کا شوق مولانا ارشد و مولوی محمود مدنی کو ہے تو پھر پوری قوم کی فلاح

وبہبودی والے کام بھی کرنے چاہئیں ۔ بات حقیقت میں یہی ہے کہ اس خاندان کے افراد کو حاکم بننے کا شوق ہے؛ لیکن حکومت کرنے یا امت کے لیے فلاحی کام کرنے کا نہ ان میں جذبہ ہے نہ صلاحیت اور نہ ہی یہ اس کے اہل ہیں ۔ اسی لیے بس بھیڑ اکٹھا کر کے چندہ وصول کرنا اور اپنی اولاد و احفاد کے لیے مکانات تعمیر کر کے پراپرٹی بڑھانے کے علاوہ اس مدنی گروپ نے آج تک ہندوستانی مسلمانوں کے لیے کچھ نہیں کیا۔ اگر کچھ اچھے اور تعمیری کام کیے ہوں تو برائے کرم ہمیں ای میل کر کے ضرور بتایا جائے تاکہ ہم اپنی اس غلط فہمی کو دُور کر سکیں ۔ اور ہاں ! بے قصور مسلمانوں کو جیل سے رِہا کرانے کا کام فقط جمعیۃ علماء ہند ہی نہیں کر رہی ہے؛ بلکہ جماعتِ اسلامی نے ان سے زیادہ قیدیوں کو پولیس کی حراست سے رِہا کرایا ہے ۔

ایک اور جھوٹ:

صفحہ نمبر ۳۹۲ پہ تیسرے پیراگراف کی دوسری سطر میں فاضل مرتب لکھتے ہیں کہ: ”جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اقلیتی کردار کے تحفظ اور بہت سے اہم مسائل میں ملک وملت کی قیادت کی“ فاضل مرتب جس جمعیۃ علماء ہند کی بات کر رہے ہیں وہ وہ جمعیۃ علماء ہند نہیں جس میں حضرت شیخ الہند، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہم اللہ جیسے جید علماء ہند شامل تھے ۔ جنھوں نے واقعی امتِ مسلمہ کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ۔ فاضل مرتب تو ۱۹۴۷ کے بعد سے چلنے والی جمعیۃ مدنی خاندان کا ذکر کر رہے ہیں ۔ اور جھوٹ کہہ رہے ہیں کہ انھوں نے جامعہ ملّیہ کے تحفظ اور اہم مسائل کا حل کیا ہے ۔ اس جھوٹ کی ایک اہم دلیل ملاحظہ فرمائیے ۔ ۱۹۶۷ کے اواخر یعنی اکتوبر نومبر میں بلراج مدھوک (آر ایس ایس کارکن) نے جامعہ ملّیہ اسلامیہ میں مداخلت کرتے ہوئے دو کام کیے: اوّل جمعہ کی جگہ اتوار کی چھٹی کرادی اور دوم جامعہ کی تقریبات کا افتتاح قرآن سے نہ کرنے کا اعلان کیا۔ مقامِ افسوس ہے کہ اُس وقت پوری طرح اسعد مدنی کے قبضے میں آچکی جمعیۃ علماء ہند نے اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا۔ اللہ جنت نصیب کرے مولانا عثمان فارقلیط کو کہ آپ ایک حساس، دردمند، صائب فکر اور زندہ ضمیر انسان تھے ۔ بلراج مدھوک کے ان ظالمانہ مطالبوں کے خلاف آپ نے روزنامہ الجمعیۃ میں ایک شذرہ قلم بند کیا۔ اس تحریر کا نتیجہ تو کچھ نہ نکلا؛ لیکن مولانا عثمان فارقلیطؒ نے اپنا احتجاج درج کرادیا تھا، اس کے بعد اگر کچھ کرنے کا کام تھا تو وہ جمعیۃ کے خود ساختہ صدر مولوی اسعد مدنی کے کرنے کا تھا؛ لیکن انھوں نے بھی کچھ نہیں کیا اور جامعہ ملّیہ اسلامیہ میں جو ذرا اور اسی اسلامی کلچر، اسلامی تہذیب وتمدن کی رمق باقی رہ گئی تھی وہ بھی ختم ہوگئی ۔ اسی لیے تو ہم مسلسل کہہ رہے ہیں کہ ۱۹۶۵ کے بعد سے ذرا کوئی بتادے کہ جمعیۃ مدنی خاندان نے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے کیا کیا ہے؟

ساتواں باب

صفحہ نمبر ۴۲۷ پہ ''دارالعلوم دیوبند'' کے نام سے ایک نظم ہے، جس کے شاعر ہیں زبیر افضل عثمانی۔ یہ محترم مولانا فضل الرحمٰن عثمانی یکے از بانیانِ دارالعلوم دیوبند کے پوتے اور مولانا عامر عثمانی کے بڑے بھائی ہیں۔ نہایت زود گو اور بہترین شاعر تھے۔ دارالعلوم کے ممتاز فاضلین میں سے تھے۔ فاضل مرتب نے ان کی نظم تو یہاں دے دی؛ لیکن ''علماء دیوبند کی اُردو شاعری'' کے تحت صفحہ نمبر ۳۷۳ پہ ان کا نام نہیں لکھا۔ یہ کس طرح کی تاریخ مرتب کی ہے جناب نے۔ کمال ہے!

اگر فاضل مرتب یہاں یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ ہم نے مولانا زبیر صاحب کی نظم کتاب میں شامل کر کے یہی تو ثابت کیا ہے کہ وہ بھی دارالعلوم کے فاضل شاعر ہیں تو بلا شبہ یہ جواز مہمل اور بے سود ہوگا۔ اس کی دو وجہ ہیں: پہلی یہ کہ دارالعلوم کے فاضلین شعراء کا تذکرہ کرنے کی خاطر مرتب نے اپنی کتاب کے صفحہ نمبر ۳۷۳ پہ علماء دارالعلوم کی شعرگوئی کے نام سے فاضل شعراء کا ذکر کرنے کے لیے ایک الگ عنوان قائم کیا ہے؛ اس لیے اصلاً اُسی عنوان کے تحت مولانا زبیر افضل عثمانی کا ذکر کرنا تھا جو کہ نہیں کیا گیا۔ اس وجہ سے فاضل مرتب کا بغض عثمانی میں شدت کے ساتھ مبتلا ہونا ہی ظاہر ہوتا ہے۔ دوسری وجہ جواز کے مہمل ہونے کی یہ ہے کہ کتاب میں ایسا نہیں کہ جن شعراء کی نظمیں شامل ہیں وہ تمام فاضل دارالعلوم ہیں، اگر ایسا ہوتا کہ فقط دارالعلوم کے فارغین شعراء ہی کی نظموں کو کتاب میں شامل کیا جاتا تب تو یہ جواز نکل سکتا تھا؛ لیکن عثمان شاکر اور دیگر شاعروں کی نظموں کے ہونے سے یہ جواز کلیۃً ختم ہو جاتا ہے؛ کیوں کہ یہ شعراء دارالعلوم کے فارغ تو کیا کسی بھی مدرسے کے سند یافتہ نہیں؛ اس لیے اب آپ ہی بتائیں کہ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ فاضل مرتب نے جان بوجھ کر مولانا زبیر افضل عثمانی کا نام شعراء کی فہرست میں نہیں لکھا ہے تو کیا غلط کہتے ہیں؟

آٹھواں باب

اللہ رب العزت کا ہزار ہزار شکر ہے کہ کتاب کا جائزہ فہرست کے آخری پائیدان پر آپہنچا۔ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے اور خیر سے ہم اب آخری باب ہی کا جائزہ لیں گے۔

فاضل مرتب نے اس باب کو شخصیات کے ذکر سے مزین کیا ہے۔اور یہی باب کتاب میں سب سے زیادہ اصلاح طلب ہے۔ہم تفصیل سے اس پر کلام کریں گے۔ یہ باب کتاب کے صفحہ نمبر ۴۳۰ سے شروع ہوتا ہے اور پہلے ہی صفحہ پر فاضل مرتب کا تعصب اور بغض اپنی جہالت کے ساتھ پورے شباب پر ہے۔

کتاب کی ابتدا سے ہم دو باتوں کا ذکر بار بار کرتے آرہے ہیں اوّل یہ کہ دارالعلوم کی جدید تاریخ مرتب کرنے والے فاضل مرتب نے کتاب میں حسنِ ترتیب کا کوئی خیال نہیں رکھا۔جس سلیقے سے کوئی بھی کتاب ترتیب دی جاتی ہے وہ سلیقہ فاضل مرتب میں ذرہ برابر بھی نہیں ہے۔خصوصاً شخصیات کا ذکر کرتے ہوئے جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اس کا بنیادی علم بھی فاضل مرتب کو نہیں۔ دوسری بات ہم نے یہ کہی ہے کہ فاضل مرتب نے تاریخ مرتب کرتے وقت خیانت اور بغض وعناد سے کام لیا ہے۔ درج بالا دونوں باتوں کو ہم نے بڑی تفصیل اور دلائل کے ساتھ آپ کے سامنے اس کتاب میں پیش کیا ہے۔کاش کوئی دارالعلوم کے موجودہ مہتمم اوران کے حکم پر تاریخ مرتب کرنے والے فاضل مرتب کو یہ بات سمجھائے کہ میاں معلومات کی کمی اور مطالعہ کی قلت رکھنے والے لوگ تاریخ نہیں لکھا کرتے۔کاش شخصیت پرستی میں مبتلا خودنمائی کے ان اسیروں کو کوئی بتلائے کہ تاریخ مرتب کرنا دیانتدار، وسیع القلب، صاف گو، بالغ نظر، باظرف، باضمیر، حق پسند، حوصلہ منداور عمیق مطالعہ رکھنے والے ایسے شخص کا کام ہے جسے لکھنے کا سلیقہ آتا ہو۔ جو ترتیب کے حسن سے واقف ہو، جس کے دل میں حق وصداقت کا چراغ روشن ہو۔ چاپلوسی، تنگ نظری، شخصیت پرستی، قلتِ مطالعہ اور تاریخ سے عدمِ واقفیت کے سبب خیانت اور مصلحت پسندی کے اندھیروں میں قلم چلانے والے کبھی حق گوئی اور حقائق کے اُجالوں سے ہم کنار نہیں ہوتے۔ ایسے لوگ معاشرے میں جھوٹ پھیلانے والے کی طرح بے حیثیت و بے وقعت ہو کر خود ایک بدنما تاریخ بن جاتے ہیں۔

آئیے اب آخری باب کے اندر برتی گئی مرتب کی لاپرواہی وخیانت کو آپ کے سامنے ظاہر کر کے اپنا فرض پورا کرتے ہیں۔

ترتیب کا حسن

افسوس ہے ایسے لوگوں پر جو کتاب کے اوپر مرتب کا عنوان ڈال کر اپنا نام وہاں لکھ دیتے ہیں اور مرتب کا مطلب تک انہیں معلوم نہیں ہوتا۔قارئین! مرتب کا مطلب ہوتا ہے ترتیب سے لگانے والا۔بکھری ہوئی چیزوں یا بکھرے ہوئے علمی مواد کو ترتیب کے ساتھ لگانے یا جمع کرنے والے کو مرتب کہا جاتا ہے۔

ترتیب کی ضرورت دنیا میں ہر جگہ پڑتی ہے۔قرآن پاک بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی نے ترتیب سے جمع کروایا تھا۔اس سے پہلے یہ ۳۰ پاروں پہ مرتب اِس شکل میں نہیں تھا۔بہرحال حسنِ ترتیب کے بغیر زندگی کا

ہر شعبہ اَدھورا ہے، ہر شعبہ، ہر فن کے لیے حسنِ ترتیب کے الگ الگ ضابطے اور قاعدے موجود ہیں، اسلامی شعار میں تو کپڑے پہننے تک میں ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ پہلے کرتا پہننا ہے یا پائجامہ۔ اسی طرح تصنیف و تالیف کے فن میں بھی ترتیب بہت اہم ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے گزشتہ صفحات میں بھی لکھا ہے کہ شخصیات کے موضوع پر کوئی مضمون یا کتاب لکھنے کے لیے سب سے اچھی ترتیب کے دو طریقے ہیں۔ پہلا یہ کہ سن پیدائش کے حساب سے متذکرہ شخصیات کی فہرست بنالی جائے اور دوسرا یہ کہ شخصیات کے نام حروفِ تہجی کی ترتیب سے لکھے جائیں۔ باشعور اور سلیقہ مند قلم کاروں کے یہاں اسی ترتیب کے لحاظ سے شخصیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

لیکن اب دارالعلوم دیوبند کی تاریخ مرتب کرنے والوں کا کیا جائے جن میں نہ شعور ہے نہ سلیقہ۔ پوری کتاب میں کہیں بھی حسنِ ترتیب نہیں ہے۔

کتاب کے آٹھویں باب میں جن شخصیات کا ذکر ہے، ان سبھی کے سن وفات اور سن پیدائش بھی فاضل مرتب نے درج کیے ہیں؛ لیکن بے شعور اور بے سلیقہ مرتب کے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا کہ اس فہرست کو سن پیدائش کے لحاظ سے ترتیب دے لیں۔ اسی وجہ سے مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا نام اوّل نمبر پہ لکھنے کے بجائے تیسرے نمبر پہ تحریر کیا ہے۔

دَورِاوّل کے علماء اور حسبِ رَوِش فاضل مرتب کا عناد

فاضل مرتب نے دَورِاوّل کے علماء کا عنوان ثبت کرتے ہوئے ۱۰/افراد پر مشتمل ایک فہرست کتاب کے صفحہ نمبر ۴۳۰ پہ دے کر ان کے حالات پیش کیے ہیں۔ یہ فہرست ترتیب کے لحاظ سے تو غلط ہے ہی شخصیات کے انتخاب میں بھی اس میں دانشمندی سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ پوری کتاب میں خاندانِ عثمانی سے بغض و عناد کی جو روِش فاضل مرتب نے اختیار کی ہے وہ یہاں بھی اپنے عروج کے ساتھ قائم ہے۔ ترتیب کی خرابی آپ درج بالا سطور "حسنِ ترتیب" کے عنوان پہ پڑھ ہی آئے ہیں۔ رہی بات شخصیات کے انتخاب کی تو فاضل مرتب نے دارالعلوم کے اَساسی رکن مولانا مہتاب علی صاحب کا نام اس فہرست میں شامل نہیں کیا۔ خاندانِ عثمانی سے بغض رکھنے والے فاضل مرتب نے دَورِاوّل کے علماء کی اس فہرست میں دو اہم نام ایسے چھوڑ دیئے ہیں جن کے بغیر دارالعلوم کی تاریخ لکھی ہی نہیں جاسکتی۔ دارالعلوم کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والا ہر ہوش مند جانتا ہے کہ دارالعلوم کے قیام میں کن اکابرستہ کے نام شامل ہیں، ان ہی اکابرستہ میں سے دو اہم نام فاضل مرتب نے یہاں نہیں لکھے ہیں۔ (۱) مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (۲) مولانا ذوالفقار علی عثمانی رحمۃ اللہ علیہ۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کون سی نفرت ہے جو فاضل مرتب کو دیوبند کے سب سے علمی خانوادے خاندانِ عثمانی سے بغض و عناد پر

آمادہ کیسے ہوئے ہے۔مولانا فضل الرحمٰن عثمانی جیسی باکمال شخصیت کا نام تک دَورِاوّل کے علماء میں درج نہ کرنے والے فاضل مرتب کو شاید یہ نہیں معلوم کہ دارالعلوم انہی دیوبندیوں کی محنتوں اور کاوشوں کا ثمرہ ہے جن سے دَورِحاضر کے کم ظرف وکم نسب مسند نشین بغض وحسد کا جذبہ رکھتے ہیں۔

مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کیا تھے اس کی تفصیل کے لیے ہم نے کتاب کے ابتداہی میں مفصل مضمون نقل کردیا ہے، جو بلاشبہ آپ نے پڑھ لیا ہوگا۔یہاں ان کے بارے میں اور کوئی بھی تفصیل مکررات کا عنوان پاجائے گی۔

کمال تو یہ دیکھئے قارئین! فاضل مرتب اس درجہ خیانت پر اُترے ہوئے ہیں کہ اگر کتاب کی ابتدا میں مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کا نام نہیں لکھا تھا تو یہاں دَورِاوّل کے علماء کی فہرست میں بھی ان کا نام شامل نہیں کیا۔اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ کوئی سہو یا غلطی نہیں ہے؛ بلکہ جان بوجھ کرایسا کیا گیا ہے۔

دانستہ فاضل مرتب نے مولانا فضل الرحمٰن عثمانی، مولانا ذوالفقار علی عثمانی اور مولانا مہتاب علی عثمانی رحمہم اللہ کا ذکر دَورِاوّل کے علماء میں نہ کرتے ہوئے بعد میں مشاہیر دارالعلوم کا عنوان قائم کرکے عمومیت کے ساتھ متعدد افراد کے ہمراہ کردیا ہے۔جس سے بلاشبہ ان حضرات کی اہمیت کو کم کرنا مقصود ہے۔ظاہر سی بات ہے سو دوسولوگوں کی بھیڑ کو وہ اہمیت اور وقعت نہیں دی جاتی جو ۱۰ریا گیارہ لوگوں کے وفد کو دی جاتی ہے۔

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ جب درج بالا تینوں حضرات دارالعلوم کے قیام میں شریک ہیں، مولانا قاسم نانوتوی اور حاجی عابد حسین رحمہما اللہ کے دست و بازو ہیں، ہم عصر و ہم عمر ہیں، ہمدرس و ہم نشیں ہیں پھر ان کا نام ایک ساتھ نہ لکھ کر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ چھ رفیق کار میں سے تین ایسے افراد کا ذکر چھوڑ دیا جائے جن کا نسبی تعلق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔

دَورِثانی کے علماء

صفحہ نمبر ۷۴۴ر پہ دَورِثانی کے علماء کی فہرست پیش کی گئی ہے اور کیا غضب انداز سے یہ فہرست ترتیب دی ہے ماشاءاللہ ۹رافراد پر مشتمل اس فہرست کی ترتیب اس درجہ واہیات ہے کہ فہرست دیکھ کر سر چکرا گیا اور بےساختہ دل سے یہ صدا آئی: اے خدا یہ کیسے کیسے اجہل مطلق تاریخ مرتب کرنے لگ گئے۔جنھیں اتنا بھی شعور نہیں ہے کہ شخصیات کی فہرست کس طرح مرتب کرنی چاہیے؟

ہائے رے بدنصیبی! ایسے لوگوں کی واہیات کتابیں دیکھنے کے لیے ہی ہمیں زندہ رہنا تھا! قارئین! بلاشبہ ہمارے جملے سخت ہیں ہمارے طنز نکیلے ہیں؛ لیکن جس شخص میں بھی ذراسا شعور وسلیقہ اور حسنِ ترتیب کا فہم ہوگا وہ اس فہرست کو دیکھ کر اسی طرح جھنجھلائے گا جیسے ہم۔

۹ رلوگوں کی اس فہرست میں سب سے زیادہ پرانے اور سب سے بڑے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمہ اللہ ہیں، جن کا نام سب سے پہلے آنا چاہیئے تھا لیکن فاضل مرتب کی ترتیبی لیاقت وصلاحیت دیکھیے ان کا نام ان کے چھوٹے بھائی علامہ شبیر احمد عثمانی کے بھی بعد ساتویں نمبر پر دے رہے ہیں۔ اب ہم کہاں تک پوری فہرست پہ کلام کریں۔ اس لیے فاضل مرتب کی ترتیب شدہ فہرست کے سامنے صحیح ترتیب کے ساتھ ہم مع سن پیدائش نام درج کر رہے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ میں پیش کی گئی دَورِ ثانی کے علماء کی فہرست	ترتیب کے ساتھ صحیح ڈھنگ سے یہ فہرست اس طرح ہونی چاہیے تھی
۱- حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب (مہتمم دارالعلوم)	۱- حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی ؒ ۱۸۵۸ء (صدر مفتی)
۲- حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ؒ (مہتمم دارالعلوم)	۲- حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ؒ ۱۸۶۱ء (مہتمم دارالعلوم)
۳ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ (سرپرست دارالعلوم)	۳- حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب ۱۸۶۲ء (مہتمم دارالعلوم)
۴- حضرت علامہ انور شاہ کشمیری ؒ (صدر المدرسین وشیخ الحدیث)	۴- حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ ۱۸۶۳ء (سرپرست دارالعلوم)
۵- حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی ؒ (صدر المدرسین وشیخ الحدیث)	۵- حضرت علامہ انور شاہ کشمیری ؒ ۱۸۷۵ء (صدر المدرسین وشیخ الحدیث)
۶- حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ (صدر مہتمم)	۶- حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی ؒ ۱۸۷۹ء (صدر المدرسین وشیخ الحدیث)
۷- حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی ؒ (صدر مفتی)	۷- حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی ؒ ۱۸۸۲ء (صدر مفتی)
۸- حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی ؒ (صدر مفتی)	۸- حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ ۱۸۸۷ء (صدر مہتمم)
۹- حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ؒ (صدر مفتی)	۹- حضرت مولانا ابراہیم بلیاوی صاحب ؒ ۱۸۸۷ء (صدر المدرسین)
	۱۰- حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ؒ ۱۸۹۶ء (صدر مفتی)

درج بالا فہرست میں نویں نمبر پر جو نام ہے وہ حقیقت میں دورِ ثانی کے علماء واکابر کی فہرست ہی میں ہونا چاہیئے تھا۔ جہاں ہم نے لکھا ہے؛ لیکن فاضل مرتب نے اپنی جہالت اور لاشعوری کا ثبوت پیش کرتے ہوئے علامہ ابراہیم بلیاوی ؒ کو دَورِ ثالث کی فہرست میں رکھا ہے، جو کسی بھی طور صحیح نہیں ہے۔ نہ ہی سن پیدائش کے حساب سے اور نہ ہی مقام ومرتبہ کے لحاظ سے۔ قاری طیب رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے بس حضرت علامہ بلیاوی ؒ ہی اکابر دیوبند کی آخری نشانی ہیں۔ اس کے بعد اکابر دیوبند کا سلسلہ حضرت قاری طیب رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر ختم ہو جاتا ہے۔

اکابر دیوبند یا علماء دیوبند سے مراد کون لوگ ہیں، موقع ہوا تو اس کی تفصیل بھی ہم ان شاء اللہ آگے پیش

کریں گے۔ تاکہ ہرا َیرا غیرہ نتھو خیرہ کو علماء دیوبند کی صفوں میں شمار کرنے والے جان سکیں کہ یہ قافلہ کن علماء اور دانشوران کے ناموں سے منسوب ہے۔ فی الحال زیرِ تبصرہ کتاب کے جائزے کو آگے بڑھاتے ہیں۔

فاضل مرتب نے صفحہ نمبر ۵۱۷ پہ دَورِ ثالث کے علماء کی فہرست پیش کرتے ہوئے فقط ۶ نام درج کیے ہیں۔ اگرچہ اس فہرست میں اور بھی بہت سے نام شامل ہونے چاہئیں تھے۔ نہ جانے فاضل مرتب نے شخصیات کا ذکر کرتے ہوئے کیا معیار قائم کیا ہے، جس کے تحت موصوف کا انتخاب اس قدر ناقص اور غیر موزوں ہے ہم تو یہی سوچ رہے ہیں کہ فاضل مرتب کو اپنی کم عقلی اور جہالت کو جگ ظاہر کرنے کے لیے ایسی بے ترتیب اور غیر معیاری کتاب لکھ کر دارالعلوم کا پیسہ خرچ کرانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہمارا یہ قول صد فی صد حق ہے، جس کی دلیل کے لیے ہم آپ کو بتادیں کہ دارالعلوم کی طرف سے فاضل مرتب کو اس کتاب میں برتی گئی لاپرواہی کی نشان دہی کرتے ہوئے تصحیح کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور معتبر ذرائع سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ فاضل مرتب نے کافی حد تک اس کتاب میں تغیر و تبدل کرکے شائع شدہ نسخہ کو منسوخ کرتے ہوئے دوسری اشاعت کے لیے نئے سرے سے الگ کتاب تیار کرلی ہے۔ جس پر ابھی نظرِ ثانی کا کام چل رہا ہے، اگر ہمارا درج بالا قول غلط ہوتا تو پھر اس کتاب کا دوسرا تصحیح و ترمیم شدہ ایڈیشن لانے کی ضرورت نہ ہوتی، غلطیاں تھیں؛ اسی لیے تو ان کی اصلاح کی گئی، لاپرواہی برتی گئی تھی تبھی تو اس کو سدھارا گیا۔ ویسے تو ہمیں اُمید یہ ہے کہ ہماری اس کتاب کے آنے کے بعد شاید دارالعلوم سے فاضل مرتب کی اُس کتاب کو دوبارہ شائع ہی نہیں کیا جائے گا۔ اللہ رب العزت دارالعلوم کی موجودہ انتظامیہ کو ہوش وخرد کی دولت عطا فرمائے کہ وہ اِس طرح کے غیر علمی و غیر معتبر واہی کام کے بجائے کچھ علمی اور اہم کام کرانے کی طرف توجہ کریں۔

بات چل رہی تھی دَورِ ثالث کے علماء کی فہرست کے بارے میں ہم پہلے بھی یہ بات لکھ چکے ہیں کہ نہ جانے فاضل مرتب نے کیا سوچ کر یہ فہرست بنائی ہے۔ اس انتخاب کے لیے کون سا معیار قائم کیا گیا ہے، اس کا جواب ہم جیسے نااہل اور کم فہم کی دسترس سے باہر ہے۔

قارئین! دنیا میں کوئی بھی فہرست بنائی جائے، اس کی ترتیب کے لیے کوئی نہ کوئی پیمانہ یا معیار قائم کرنا پڑتا ہے، اسی کے تحت فہرست مرتب کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ کو دنیا کے مسلم ممالک کی فہرست بنانی ہو تو آپ اس کے لیے ان ملکوں کا انتخاب کریں گے جہاں مسلم آبادی کی کثرت ہو، مسلم آبادی کی کثرت ہی اس فہرست کا معیار ہوگا۔ اسی طرح اگر ملک بھر میں کتنے انجینئرنگ کالج ہیں اس کا پتہ لگانا ہو تو ظاہر سی بات ہے، ان کالج کا شمار کیا جائے گا، جن میں انجینئرنگ پڑھائی جاتی ہو۔ ملک میں کتنے ڈاکٹر ہیں، اس سوال کے لیے فقط ڈاکٹر ہونا معیار نہیں ہوگا؛ بلکہ ڈاکٹر کی فہرست مرتب کرنے کے لیے پہلے ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ کس قسم کے ڈاکٹر کی فہرست بنانی ہے؛ کیونکہ ڈاکٹر تو الگ الگ مرض اور تعلیم کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں؛ اس لیے ہمیں ڈاکٹروں

کی فہرست بنانے کے لیے ان کی تعلیمی اور فنی لیاقت کو معیار بناتے ہوئے یہ کرنا ہوگا کہ سرجن الگ، ایم ڈی الگ، ایم بی بی ایس الگ اور ڈینٹسٹ الگ کر کے مختلف عنوان سے شمار کرتے ہوئے الگ الگ فہرست بنانی ہوگی۔ تبھی ایک صحیح اور کارآمد فہرست بن سکے گی۔ ایسا نہیں کہ بس لفظ ڈاکٹر کو معیار بنا کر ہومیوپیتھک وایلوپیتھک، ڈینٹسٹ اور سرجن سب ہی کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔ اس طریقے سے انتخاب کرنا ایک کارِ بے سود ہوگا۔ جیسا کہ فاضل مرتب نے کیا ہے۔ فاضل مرتب نے دَورِ ثالث کے تحت فقط ۶ رنام کی فہرست دے کر بہت سے ایسے علماء کرام کو غیر اہم قرار دیا ہے، جو حقیقتاً اور دیانتاً کہیں زیادہ اہمیت کے متقاضی ہیں۔

فاضل مرتب کو چاہئے تھا کہ سن پیدائش کا لحاظ رکھتے ہوئے صلاحیت ولیاقت کے ساتھ ساتھ قلمی و دینی خدمات کو معیار بنا کر فہرست ترتیب دیتے؛ لیکن اس کا شعور ایک دانشمند اور اشرف انسان کو ہوتا ہے، فاضل مرتب جیسے لوگوں کو نہیں۔ جن اہم شخصیات کو فاضل مرتب نے مشاہیر کے عنوان میں ڈال دیا ہے، ان کو دَورِ ثالث کی فہرست میں شامل کر کے بات وہیں ختم کر دیتے؛ کیونکہ ان کے بعد پھر کوئی اس لائق نہیں ہے کہ اس کا ذکر باقاعدہ علماءِ دیوبند کے نام سے کتاب کی زینت بنایا جاتا۔ ہاں! ''دَورِ حاضر میں دارالعلوم کے اساتذہ'' کا عنوان دے کر ان کے نام پیش کرنے تھے، علماءِ دیوبند واکابر کے عنوان سے نہیں۔

فاضل مرتب نے شخصیات کے لیے جو اَدوار منتخب کیے ہیں اس کی بھی کوئی وضاحت یا علامت نہیں ملتی کہ دَورِ اوّل، دَورِ ثانی اور دَورِ ثالث کو کس معیار و پیمانے کے لحاظ سے ترتیب دیا ہے۔ بس اپنی مرضی سے یوں ہی دَورِ اوّل، دَورِ ثانی اور دَورِ ثالث کا عنوان ڈال دیا۔

اصل ترتیب یوں ہونی چاہئے تھی:

دَورِ اوّل کو بانیانِ دارالعلوم اور حضرت رشید احمد گنگوہی و دیگر ہم عصر علماء کے ساتھ حضرت شیخ الہند واُن کے رفقاءِ درس تک محدود کرنا تھا۔

دَورِ ثانی میں شیخ الہند کے تلامذہ اور سن ۱۹۰۰ء تک پیدا ہونے والے علماءِ دیوبند کی فہرست بنانی تھی۔

دَورِ ثالث میں ۱۹۰۱ء سے لے کر ۱۹۵۰ تک پیدا ہونے والے علماءِ کرام کو شمار کیا جاتا۔

درج بالا ترتیب کے ساتھ اگر فہرست بنائی جاتی تو ایک صحیح اور قابلِ نگاہ فہرست بنتی؛ لیکن فاضل مرتب نے شخصیات کی فہرست میں کسی بھی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا؛ اس لیے ایک بے ڈھنگی اور بے ترتیب فہرست باذوق، شریف الطبع اور نفاست پسند قاری کو اذیت پہنچانے کے لیے پیش کر دی گئی ہے۔

آئیے ہم یہاں صحیح ترتیب کے ساتھ تینوں اَدوار کے علماء کی فہرست پیش کرتے ہیں۔ تاکہ فاضل مرتب اور دارالعلوم کی موجودہ انتظامیہ بھی اس بات کا ادراک کر سکے کہ ترتیب کا سلیقہ اور تاریخ مرتب کرنے کا شعور کیا ہوتا ہے۔

لیجیے ملاحظہ کیجیے۔ دَورِاوّل کے علماء واکابر دارالعلوم کی فہرست اس ترتیب سے ہونی چاہئے تھی۔

۱-حضرت مولانا مہتاب علی دیوبندیؒ ۱۸۱۹ء
۲-حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ ۱۸۲۲ء
۳-حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ۱۸۲۷ء
۴-حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ ۱۸۳۱ء
۵-حضرت شیخ نہال احمد دیوبندیؒ
۶-حضرت مولانا منیر صاحب نانوتویؒ ۱۸۳۱ء
۷-حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ ۱۸۳۳ء
۸-حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ ۱۸۳۳ء
۹-حضرت حاجی عابد حسینؒ ۱۸۳۴ء
۱۰-حضرت مولانا رفیع الدینؒ ۱۸۳۶ء
۱۱-حضرت حاجی سید فضل حقؒ
۱۲-حضرت مولانا مُلّا محمود دیوبندیؒ
۱۳-حضرت مولانا سید احمد صاحب دہلویؒ
۱۴-حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ ۱۸۵۱ء
۱۵-حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ ۱۸۵۲ء
۱۶-حضرت مولانا عبدالرحیم رائے پوریؒ ۱۸۵۵ء
۱۷-حضرت مولانا حکیم محمد حسن دیوبندیؒ ۱۸۵۴ء

درج بالا تمام حضرات کے حالات اُسی کتاب میں درج ہیں۔ ضرورت تھی تو بس سلیقے کے ساتھ سب کو صحیح ترتیب سے پیش کرنے کی۔

آئیے! اب دَورِ ثانی کے علماء واکابر کی فہرست صحیح ترتیب کے ساتھ ملاحظہ کیجیے۔

فاضل مرتب نے دَورِ ثانی کی جس فہرست کو فقط ۹ر افراد پر مشتمل کر کے اُسی دَور کے جید علماء واکابر کو اس فہرست سے باہر کر مشاہیر کے عنوان میں ڈالنے کا جو احمقانہ اور غیر دانشمندانہ بے ترتیب کام کیا ہے، اس کی مثال شاید ہی کہیں دیکھنے کو ملے۔ حقیقت میں یہی فہرست سب سے اہم ہے کہ اسی میں دارالعلوم کے ان علماء واکابر کا نام آنا ہے، جن کی علمی خدمات سے امت آج تک فیضیاب ہو رہی ہے۔ اسی فہرست میں دارالعلوم کے فقیہ اعظم، مفسر کبیر، محدث عظام، مؤرخ وقت اور دیگر علوم وفنون کے ماہرین کا ذکر ہونا تھا؛ لیکن فاضل مرتب نے اپنی نااہلی اور کم عقلی کے سبب اس فہرست کو فقط ۹ر افراد تک ہی محدود کر دیا، حالانکہ اسی دَور کے علماء کا ذکر مشاہیر کے عنوان میں کر رکھا ہے، ایسا نہیں ہے کہ ان حضرات کا تعارف تلاش کرنے کے لیے بہت زیادہ محنت کرنا پڑتی؛ لیکن جس انسان میں سلیقہ وشعور نہ ہو تو اس سے اچھے کام کی اُمید بھی نہیں کی جاسکتی، یہاں تلاش بسیار کی محنت درکار نہیں تھی؛ بلکہ سلیقے کی ضرورت تھی، جس کے طفیل فہرست کو جامع اور مرتب بنایا جاتا۔

''جامع'' سے یاد آیا ابتدائی صفحات میں ہم نے کتاب کے نام پہ کلام کرتے ہوئے جو بات لکھی تھی، وہ آغاز سے انجام تک صحیح ثابت ہوتی آرہی ہے۔ یہ کتاب نہ مختصر ہے نہ جامع۔ چند شخصیات کی حسنِ ترتیب کے ساتھ ایک فہرست تو اس کتاب میں مرتب نہیں کی جاسکی ہے اور تو کیا کہا جائے۔ آپ سب کچھ پڑھ آئے ہیں، ہم نے پوری

کتاب کا ایماندارانہ تبصرہ آپ کے سامنے کر ہی دیا ہے۔

آئیے! ہم بتاتے ہیں دَورِ ثانی کے علماء اکابر کی فہرست کیسی ہونی چاہیے تھی۔ ملاحظہ کیجیے:

۱-حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ ۱۸۵۸ء
۲-حضرت مولانا عبدالقدیر دیوبندیؒ ۱۸۶۰ء
۳-حضرت مولانا ناظر حسن دیوبندیؒ ۱۸۶۰ء
۴-حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ ۱۸۶۱ء
۵-حضرت مولانا حافظ محمد احمدؒ ۱۸۶۲ء
۶-حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ۱۸۶۳ء
۷-حضرت مولانا عبدالمومن دیوبندیؒ ۱۸۶۳ء
۸-حضرت مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوریؒ ۱۸۶۸ء
۹-حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ ۱۸۷۲ء
۱۰-حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ ۱۸۷۵ء
۱۱-حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ ۱۸۷۵ء
۱۲-حضرت مولانا سید اصغر حسین میاںؒ ۱۸۷۷ء
۱۳-حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ ۱۸۷۸ء
۱۴-حضرت مولانا عبدالسمیع دیوبندی ۱۸۷۸ء
۱۵-حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ ۱۸۷۹ء
۱۶-حضرت مولانا نبیہ حسن دیوبندیؒ ۱۸۷۹ء
۱۷-حضرت مولانا اعزاز علیؒ ۱۸۸۲ء
۱۸-حضرت مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانیؒ ۱۸۸۳ء
۱۹-حضرت مولانا مفتی مہدی حسنؒ ۱۸۸۴ء
۲۰-حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ ۱۸۸۴ء
۲۱-حضرت مولانا الیاس کاندھلویؒ ۱۸۸۵ء
۲۲-حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ ۱۸۸۷ء
۲۳-حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ ۱۸۸۷ء
۲۴-حضرت مولانا سید فخرالدین احمدؒ ۱۸۸۹ء
۲۵-حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ ۱۸۹۲ء
۲۶-حضرت مولانا شائق احمد عثمانیؒ ۱۸۹۳ء
۲۷-حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ ۱۸۹۵ء
۲۸-حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ ۱۸۹۶ء
۲۹-حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ ۱۸۹۷ء
۳۰-حضرت مولانا قاضی مسعود احمد دیوبندیؒ ۱۸۹۷ء
۳۱-حضرت مولانا سید اختر حسین میاںؒ ۱۸۹۸ء
۳۲-حضرت مولانا شیخ زکریاؒ ۱۸۹۸ء
۳۳-حضرت مولانا بدر عالم میرٹھیؒ ۱۸۹۸ء
۳۴-حضرت مولانا عبدالشکور دیوبندیؒ ۱۸۹۹ء
۳۵-حضرت مولانا ادریس کاندھلویؒ ۱۹۰۰ء
۳۶-حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ ۱۹۰۰ء

....

تقریباً چالیس سال پر محیط یہ فہرست دارالعلوم کے دَورِ ثانی کی صحیح فہرست کہلانے کا حق رکھتی ہے، ہم نے اس میں شیخ الہندؒ کے بعد کے علماء حضرات سے شخصیات کا انتخاب کیا ہے اور ان شخصیات میں زیادہ تر وہی لوگ شامل ہیں جنھوں نے اپنی تقریر یا تحریر سے علمِ دین کی وہ خدمات انجام دی ہیں جن سے امت آج تک اکتسابِ فیض کر رہی ہے۔

قارئین! آپ چاہیں تو اس فہرست کو ۱۸۵۰ء سے ۱۹۰۰ء تک بھی بنا سکتے ہیں۔ ایسا کرنے پہ اس کی ابتدا دارالعلوم کے پہلے طالبِ علم حضرت شیخ الہندؒ سے ہوگی، جن کا سن پیدائش ۱۸۵۱ء ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہی بہتر ہے کہ دَورِ اوّل میں وہ علماء شامل رہیں جنھوں نے دارالعلوم قائم کیا اور یہاں پڑھایا اور دَورِ ثانی میں حضرت شیخ الہندؒ سے لے کر سن ۱۹۰۰ء تک کے فعال فاضلین دارالعلوم کو شامل کیا جائے، پھر دَورِ ثالث میں سن ۱۹۰۰ء سے لے کر ۱۹۵۰ء تک پیدا ہونے والے ان علماء کا شمار کیا جائے جنھوں نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کرنے کے بعد تصنیفی و تالیفی میدان میں علمِ دین کو عام کرنے کی غرض سے کارہائے نمایاں انجام دیے ہوں۔ یہی طریقہ ایک تاریخ کی کتاب مرتب کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہیے، اسی کو حسنِ ترتیب کہتے ہیں۔

ہم نے کوئی زبردست تحقیقی کام اس فہرست میں نہیں کیا ہے؛ بلکہ یہ تمام نام مع سن پیدائش فاضل مرتب نے تاریخِ دارالعلوم جلد دوم سے اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں؛ لیکن جس طرح محبوب رضوی صاحب نے تاریخ دارالعلوم جلد دوم میں یہ نام درج کیے تھے فاضل مرتب نے بھی جوں کے توں اُسی ترتیب سے نقل کر دیے۔ انھیں یہ خیال تک نہ آیا کہ اس فہرست کو صحیح ترتیب سے پیش کر دیا جائے۔ اگر محبوب رضوی صاحب اپنی کتاب میں کوئی غلطی کر گئے ہیں تو کیا ضروری ہے اس غلطی کو اسی طرح دہرایا بھی جائے۔ وہ کہتے ہیں نا! ''نقل کے لیے بھی عقل چاہیے'' وہی یہاں ہوا ہے۔ فاضل مرتب کو عقل و شعور کی جتنی مقدار میسر ہے اس میں سلیقہ و شعور کا اتنا حصہ نہیں ہے جتنا ایک تاریخ کی کتاب مرتب کرنے کے لیے درکار ہوتا ہے، اسی لیے بے چارے فاضل مرتب صاحب نے تحقیق و ترتیب کی محنت کیے بغیر تاریخ دارالعلوم جلد دوم اُٹھائی اور مشاہیر کی فہرست جوں کی توں ٹیپ دی۔

ہم نے کوئی الگ سے فہرست نہیں بنائی ہے، بس اللہ رب العزت کے بخشے ہوئے شعور اور سلیقے کا استعمال کر کے اُسی فہرست کو حسنِ ترتیب سے آراستہ کر دیا ہے، کہ یہی آرائش اس فہرست کے لیے زیبائش کا کام کر رہی ہے۔

درج بالا فہرست میں ہم نے ایک نام کا اضافہ کیا ہے جسے فاضل مرتب نے قلتِ مطالعہ، ازراہِ جہالت یا بوجہ تعصب نظرانداز کر دیا تھا اور وہ نام ہے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے بڑے بھائی خلیفۂ شیخ الہند حضرت مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ۔ ان کا ذکر پوری کتاب میں کہیں نہیں کیا گیا، حالانکہ موصوف شیخ الہند کے خلیفہ ہونے کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کے ممتاز طلبہ میں سے تھے اور تحریک ریشمی رومال میں شیخ الہند کے شانہ بہ شانہ ملک کی آزادی کی خاطر سینہ سپر رہے۔ ۱۸۸۳ میں پیدا ہوئے دارالعلوم سے فراغت کے بعد انجینئر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ بعد میں اپنے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کے کہنے پر انگریزوں کی ملازمت ترک کر کے تحریک ریشمی رومال میں سرگرداں رہے، اس کے بعد گوشہ نشینی کی زندگی گزارتے ہوئے زہد و ورع میں مشغول ہو گئے۔ آپ کے دست

مبارک پر بہت سے مریدین و معتقدین نے بیعت لی، ملک کی آزادی کے بعد ۱۹۴۸ میں اپنے بھائی علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے کہنے پر پاکستان چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔

جون ۱۹۶۰ء کراچی میں انتقال ہوا۔ آپ کے چھ بیٹے ہوئے، مولانا زبیر افضل عثمانی اور مولانا عامر عثمانیؒ آپ ہی کی اولاد ہیں۔

آئیے اب دَورِ ثالث کی فہرست پیش کرتے ہیں، جس کو سن ۱۹۰۱ سے ۱۹۵۰ تک کے علماء و اکابر شامل کر کے سن پیدائش کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ کہ یہی طریقہ ہے جو فاضل مرتب کو اختیار کرنا چاہئے تھا۔ بہر حال! دَورِ ثالث کی جس فہرست کو فاضل مرتب نے چھ افراد کے انتخاب پر ختم کر دیا ہے وہ فہرست اصل میں کیسی ہونی چاہئے تھی، ملاحظہ کیجیے:

۱- حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ — سنہ ۱۹۰۱ء
۲- حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ — سنہ ۱۹۰۱ء
۳- حضرت مولا یعقوب الرحمٰن عثمانیؒ — سنہ ۱۹۰۱ء
۴- حضرت مولانا سید محمد میاںؒ — سنہ ۱۹۰۳ء
۵- حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ — سنہ ۱۹۰۵ء
۶- حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ — سنہ ۱۹۰۷ء
۷- حضرت مولانا قاری جلیل الرحمٰن عثمانیؒ — سنہ ۱۹۰۷ء
۸- حضرت مولانا مفتی محمد یوسف بنوریؒ — سنہ ۱۹۰۸ء
۹- حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ — سنہ ۱۹۰۸ء
۱۰- حضرت مولانا حامد الانصاری غازیؒ — سنہ ۱۹۰۹ء
۱۱- حضرت مولانا زین العابدین سجاد میرٹھیؒ — سنہ ۱۹۱۰ء
۱۲- حضرت مولانا مفتی نظام الدین اعظمیؒ — سنہ ۱۹۱۰ء
۱۳- حضرت مولانا عبد الحفیظ بلیاویؒ — سنہ ۱۹۱۰ء
۱۴- حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ — سنہ ۱۹۱۴ء
۱۵- حضرت مولانا سرفراز خاں صفدرؒ — سنہ ۱۹۱۴ء
۱۶- حضرت مولانا ابو الحسن علی ندویؒ — سنہ ۱۹۱۴ء
۱۷- حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ — سنہ ۱۹۱۶ء
۱۸- حضرت مولانا عامر عثمانیؒ — سنہ ۱۹۲۰ء
۱۹- حضرت مولانا عبد الشکور ترمذیؒ — سنہ ۱۹۲۳ء
۲۰- حضرت مولانا قاری صدیق احمد باندویؒ — سنہ ۱۹۲۳ء
۲۱- حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ — سنہ ۱۹۲۶ء
۲۲- حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ — سنہ ۱۹۲۶ء
۲۳- حضرت مولانا شمس نوید عثمانیؒ — سنہ ۱۹۲۷ء
۲۴- حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ — سنہ ۱۹۳۰ء
۲۵- حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام — سنہ ۱۹۳۶ء
۲۶- حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہ — سنہ ۱۹۳۷ء
۲۷- حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوریؒ مدظلہ — سنہ ۱۹۴۰ء

یہ تھی دَورِ ثالث کی فہرست اس کے بعد کسی اور فہرست کی ضرورت نہیں ہے؛ کیونکہ یہ دار العلوم کا آخری دَور ہے۔ یہ دَور وہ ہے کہ جس کے بعد پھر کوئی بھی ان جیسا عالم دین دار العلوم سے نہیں نکلا۔ درج بالا تمام حضرات نے اپنی تحریر و تقریر سے علمِ دین کی وہ قابل قدر خدمات انجام دی ہیں، کہ جن کی مثال نہیں دی جا سکتی، درج بالا بھی

افراد ہمارے لیے قابلِ تعظیم اور قابلِ قدر شخصیات کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہاں ان کے بارے میں تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں، آپ دیگر سوانحی کتابوں میں ان لوگوں کے بارے میں پڑھیں گے تو معلوم ہوگا کہ ہر ایک فرد ایک مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔

ان کے علاوہ جو نام ہم نے اس فہرست میں شامل نہیں کیے ہیں، ان کو مشاہیر کے عنوان ہی میں رکھنا مناسب ہے، جو باب فاضل مرتب نے کتاب کے آخر میں قائم کیا ہے۔ اس کے علاوہ صفحہ ۶۷۶ سے ۷۱۳ تک فاضل مرتب نے جن اشخاص کا تعارف مشاہیر کے عنوان میں کیا ہے ان میں زیادہ تر لوگ وہ ہیں جو فقط چاپلوسی کے طفیل مذکور ہوئے ہیں۔ یقیناً یہ لوگ نہ مشاہیر ہیں اور نہ ہی اکابر۔ جیسے ممبرانِ شوریٰ کے نام اس عنوان کے تحت قطعاً بلاوجہ دیے گئے ہیں اس وقت دارالعلوم کی شوریٰ میں کوئی بھی تو ایسا نہیں جسے اکابر دیوبند کا پرتو کہا جاسکے۔ خیر جانے دیجیے۔ ان تمام کی علمی حیثیت اور صائب الرائے ہونے کے بارے میں ذی ہوش اور اہلِ خرد خوب جانتے ہیں۔

....

دَورِ ثالث کی فہرست میں چند نام ہم نے ایسے شامل کیے ہیں جنھیں فاضل مرتب نے ازراہِ جہالت یا ازراہِ تعصب نظرانداز کردیا تھا۔ آئیے ہم مختصر طور پر آپ کو ان شخصیات سے متعارف کرائیں، تاکہ آپ بھی دیکھیں کہ فاضل مرتب نے مولوی انوارالرحمٰن بجنوری، مولوی اسعد مدنی، مولوی مرغوب الرحمٰن، مولوی مجیب اللہ گونڈوی، مفتی امین پالن پوری، مولوی بدرالدین اجمل، جیسے کتنے نااہل اور غیر اہم لوگوں کا ذکر تو کردیا؛ لیکن علمِ دین کی خدمت کرنے والے قلم کے مجاہد اور عظیم المرتبت شخصیات کا نام تک اس فہرست میں شامل نہیں کیا، اسی کو چاپلوسی اور خیانت کہا جاتا ہے۔ آئیے ان چند اہم شخصیات کے نام مع تعارف پیش کرتے ہیں۔

مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانی

حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی یکے از بانیانِ دارالعلوم دیوبند کے پوتے ہیں ۱۹۰۱ میں پیدا ہوئے، دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن میں عربی و اُردو کے پروفیسر ہوئے، آپ کے والد کا نام مولانا محبوب الرحمٰن عثمانی ہے، آپ اپنے چچا علامہ شبیر احمد عثمانی ؒ و علامہ انور شاہ کشمیری ؒ کے خاص تلامذہ میں سے تھے۔ مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانی ؒ کو عربی، اُردو و فارسی تینوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ ان کی ایک کتاب ''قومی زبان''، جو ۱۹۳۵ میں شائع ہوئی، اُردو کو قومی زبان کا درجہ دلانے کے لیے لکھی گئی تھی۔ جس میں بڑے جامع مدلّل اور دلکش انداز سے اُردو زبان کی خوبیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ اس وقت یہ کتاب بازار میں دستیاب نہیں؛ لیکن دارالعلوم کی لائبریری میں اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔

مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانیؒ کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی تفسیر ہے جو''فیض الرحمٰن'' کے نام سے انہوں نے اپنے ہی قائم کردہ ادارہ ''مکتبہ فیض القرآن'' سے شائع کی تھی۔ یہ مختصر تفسیر''اعوذ باللہ، بسم اللہ اور معوذ تین''کی تشریح پر مشتمل ہے۔ تشریح کیا بس قرآن پاک کو دل میں اُتار دینے کا عمل کہئے۔ اتنی دلکش ہے کہ جب ہم نے یہ تفسیر پڑھی تو دل میں یہی خیال آیا کہ کاش! یہ قرآن پاک کی مکمل تفسیر ہوتی۔ زیر تبصرہ کتاب'' دارالعلوم کی جامع ومختصر تاریخ'' کے صفحہ نمبر ۳۳۰ پہ بھی اس کا ذکر موجود ہے۔

مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانیؒ کی کل تصانیف سات (۷) ہیں، جن کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) اسلام کا نظامِ سیاست وعدالت (۲) فیض الرحمٰن (۳) قومی زبان (۴) پیغمبر انسانیت (۵) تصوف اور شریعت (۶) مسلمانوں کی دوعیدیں (۷) اسلام اور سیاست

اس کے علاوہ ماہنامہ تجلی اور دیگر رسائل وجرائد میں بھی مولانا کے کئی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔
''پیغمبر انسانیت''ایک مختصر اور دلچسپ رسالہ ہے جو سیرت کی کتابوں میں اپنی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

حیدرآباد سے آنے کے بعد دیوبند کے محلہ ابوالمعالی میں واقع اپنے مکان میں سکونت اختیار کی اور یہیں کی مسجد''علی'' میں بیانِ تفسیر کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ اس تفسیری بیان کی اتنی شہرت ومقبولیت ہوئی کہ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا، تو مسجد ہی میں ایک قنات لگا کر کپڑے کی دیوار کے پس پردہ ان کے بیٹھنے کا نظم کیا جاتا؛ لیکن افسوس کمزوری اور بیماری کے سبب یہ سلسلہ عرصۂ دراز تک جاری نہ رہ سکا اور فروری ۱۹۵۲ء میں مولانا اس دارِفانی کو خیرباد کہہ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

(ماخوذ: مسلمانوں کے علمی اور سائنسی کارنامے: ص/۱۵-۱۶)

حضرت مولانا قاری جلیل الرحمٰن عثمانیؒ

آپؒ دارالعلوم کے پہلے مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کے صاحبزادے اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ نہایت مذکیٰ اور زاہد وعابد شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب نسبت اور صاحب کشف بزرگ تھے۔ ۱۹۰۷ میں دیوبند ہی میں پیدا ہوئے، دارالعلوم سے فراغت کے بعد دارالعلوم میں تجوید وقراءت کے استاذ کی حیثیت سے تازندگی تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، آپ کا اندازِ تلاوت اپنے والد بزرگوار حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کی طرح نہایت دلنشیں اور پُرسوز تھا۔ آپ نے جس دَور میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی وہ دارالعلوم کا سب سے سنہرا دَور کہا جاتا ہے، آپ کے اساتذہ میں مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، علامہ انورشاہ کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جیسے نابغہ روزگار اکابر دیوبند شامل ہیں۔

آپ نے ۵۳ سال دارالعلوم میں قرآن مجید کا درس دیا۔اس دوران تقریباً دس ہزار حفاظ تیار کیے، دین کی یہ عظیم خدمت بلاشبہ ان کے درجات بلند کرنے میں معاون ثابت ہوگی، ان شاء اللہ۔ موصوف کی مفصل سوانح پڑھنے کے لیے آپ ''وہ بندۂ مولا صفات'' نامی کتاب کا مطالعہ کر سکتے ہیں، حضرت قاری صاحب کا انتقال ۱۹۹۵ میں ہوا۔

حضرت مولانا عامر عثمانیؒ

یہ وہ نام ہے جس کی عظمت قدردانِ علمِ دین کے دلوں میں اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔''مولانا عامر عثمانی'' علم و ہنر کا وہ کوہِ گراں ہے جس کے پھیلاؤ کے سامنے ان کے تمام ہم عصر بونے دکھائی دیتے ہیں۔تحریر و قلم کا جادو کیا ہوتا ہے یہ ہر وہ شخص جانتا ہے جس نے بھی ماہنامہ ''تجلی'' کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ ۱۹۲۰ کے بعد پیدا ہونے والوں میں دارالعلوم دیوبند کا کوئی ایسا ایک بھی سپوت نہیں ہے، جس نے علمِ دین کی آبرو کے لیے اپنے قلم کو مجاہدِ حق کی وہ تلوار بنایا ہو، جس نے قلمی جہاد کے ذریعہ باطل کے ایوانوں میں زلزلہ برپا کردیا ہو۔ مولانا عامر عثمانیؒ نے اپنے بے باک اور حق شناس قلم کے ذریعہ وہ وہ علمی معرکے سر کیے ہیں، جن کی مثال دینے سے تاریخ قاصر ہے۔ درج بالا تمام جملے لفاظی یا بے جا ستائش نہیں ہیں؛ بلکہ ایسی اَٹل حقیقت ہے جس کے لیے تجلی کے صفحات آج بھی دلیل و برہان کے طور پر محفوظ ہیں۔بیسویں صدی میں علمِ دین اور اسلام کی بقا کے لیے اپنے قلم کے ذریعہ اہلِ باطل سے جہاد کرنے والا دارالعلوم دیوبند کا یہ فاضل اصلاً تو اس لائق ہے کہ اس کی ایک مفصل سوانح حیات شائع کرکے ہر طالبِ علم کو دینی چاہیے اور انھیں بتایا جائے کہ جس دارالعلوم میں تم تعلیم حاصل کررہے ہو اسی دارالعلوم سے یہ عامر عثمانیؒ بھی نکلا ہے، جس نے حق کو حق کہنے میں کسی بھی بڑی سے بڑی شخصیت یا طاقت کا رعب قبول نہیں کیا۔ اللہ اور رسولؐ کے لیے ہر بڑے سے بڑے کے سامنے کھل کر حق کا اظہار کیا۔ جس نے قادیانیت کے فتنہ پر لکھا تو تحقیق کے ایسے اُجالے بکھیرے کہ اہلِ باطل کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ طلاقِ ثلاثہ کا مسئلہ چلا تو عامر عثمانیؒ کا قلم تجلی میں برق کی مانند کوندپڑا اور مخالفین کو سرنگوں ہونے کے سوائے چارہ نہ رہا۔ اسی عامر عثمانیؒ نے جب ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی قلعی کھول کر رکھ دی تو بے شمار لوگوں نے اپنے عقیدے کی اصلاح کی اور یہی عامر عثمانیؒ ہے جس نے خلافت و ملوکیت نمبر نکال کر لوگوں کو علم و تحقیق کی ایسی روشنی سے ہمکنار کیا جس نے کج فکری اور کم علمی کے اندھیروں سے نکلنے میں اہلِ حق کی رہنمائی کی۔ خلافت و ملوکیت نمبر جیسی تحقیق آج کل کے پچاس علماء مل کر بھی نہیں کرسکتے۔ آپ ستمبر تا دسمبر ۱۹۷۱ کا ماہنامہ تجلی پڑھیے اور دیکھئے علماء دیوبند کہے جانے والے دارالعلوم کے فاضل حقیقت میں اسی طرح باطل کی بیخ کنی کرتے ہیں۔

مولانا عامر عثمانی کے بارے میں کیا کہا جائے اور کیسے کہا جائے۔ ہمارا قلم اس قابل نہیں کہ اس عظیم المرتبت شخص کے لیے ایسے الفاظ تحریر کر سکے، جو اس شخصیت کے تعارف کا حق ادا کرنے کے لیے موزوں ثابت ہو جائیں۔ ہم صدقِ دل سے اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ مولانا عامر عثمانیؒ جس عظیم ہستی کا نام ہے ہم اس ہستی کے لیے کچھ بھی تعارف کے طور پر لکھنے کے اہل نہیں ہیں۔

مولانا عامر عثمانیؒ اس لیے بے مثال ہیں کہ انہوں نے ہر موضوع پر لکھا ہے اور با کمال لکھا ہے، لازوال لکھا ہے۔ ہندوستان ہی نہیں؛ بلکہ دنیا بھر میں ایسا ایک بھی عالم دین نہیں، جس نے اتنے سارے عنوان پر قلم چلایا ہو۔ ہر فنکار کا اپنا ایک موضوع ہوتا ہے، جس پر خامہ فرسائی کا اسے ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ کوئی فن حدیث میں مہارت رکھتا ہے، کسی کو تفسیری کلام میں دسترس حاصل ہے، کوئی فقہ میں ماہر ہے، تو کوئی ادبیات کا شہسوار ہے۔ کوئی طنز و مزاح کے فن میں کمال کو پہنچا ہوا ہے، تو کوئی شعر و شاعری میں۔ حتیٰ کہ ہر قلم کار کا کوئی نہ کوئی ایک میدان ہوتا ہے، جس میں شہسواری کا اسے حق حاصل ہوتا ہے؛ لیکن مولانا عامر عثمانیؒ کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ ہر فن میں ماہر ہیں، تجلی کی ڈاک میں دیے گئے سوالوں کے جواب ان کو ایک بے دار مغز فقیہ ثابت کرتے ہیں۔ تفہیم الحدیث کے عنوان سے کی گئی احادیث کی تشریح میں ان کا مقام ایک محدث کا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی تفسیر ماجدی پر تبصرہ کرتے ہوئے مذاکرۂ علمیہ میں جب انھیں دیکھا جائے تو وہ ایک مفسر معلوم ہوتے ہیں، ''مسجد سے مے خانے تک'' کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ شخص طنز و مزاح کا ایک با کمال ادیب ہے۔ یہ حقیقت ہے دیوبند جیسی زرخیز اور علمی سرزمین میں مولانا عامر عثمانی کے علاوہ کوئی ایک بھی اس پائے کا نثری مزاح نگار پیدا نہیں ہوا۔ شاعری کا تو کہنا ہی کیا شاعری میں مولانا عامر عثمانیؒ کا مقام بہت بلند ہے، اتنا بلند کہ پوری دنیا میں حفیظ جالندھریؒ کے بعد مولانا عامر عثمانیؒ واحد شخص ہیں، جنھوں نے اُردو میں ''شاہنامۂ اسلام'' لکھا ہے اور کیا خوب لکھا ہے۔ واہ! واہ! کھرے کھوٹے کا عنوان دے کر ماہنامہ تجلی میں کتابوں پر کیے گئے، ان کے تبصرے پڑھو تو معلوم ہوتا ہے کہ تبصرہ نگاری میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں میں دو خصوصیات ایسی پائی جاتی ہیں جو کسی اور کے یہاں ایک جگہ جمع نہیں ملتیں۔ اول تحقیق اور دوم ادبی لطافت کی چاشنی۔ مولانا عامر عثمانیؒ سے بڑا کوئی محقق دارالعلوم دیوبند نے ان کے بعد دنیا کو نہیں دیا۔ آپ ان کی تحریریں پڑھیے پھر دیکھئے گا تحقیق کسے کہتے ہیں۔ اسی کتاب کے گزشتہ صفحات میں آپ نے تحقیق کا ایک نمونہ ملاحظہ فرما ہی لیا ہے۔ اور زبان و بیان کا تو کہنا ہی کیا۔ ادب اور سلیقۂ تحریر اس خاندان کا خاص وصف ہے، جس کے فرزند مولانا عامر عثمانیؒ رحمۃ اللہ علیہ تھے، یہاں مولانا کی مفصل سوانح حیات پیش کرنے کا موقع نہیں ہے؛ اس لیے ہم مزید اور کچھ لکھنا ضروری نہیں سمجھتے۔ ضروری بات جو ہمیں عرض کرنی ہے

وہ یہ ہے کہ دارالعلوم کی جدید اور ناقص تاریخ مرتب کرنے والے فاضل مرتب نے آخر کس تعصب میں مولانا عامر عثمانیؒ جیسے عظیم انسان کا ذکر فراموش کیا ہے۔ایک محدث، مفسر، مفکر، محقق اور مجاہد قلم کو فقط ایک شاعر کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند کے اُردو شعراء میں شمار کر کے تحقیق و ترتیب کا حق ادا کرتے ہوئے فاضل مرتب کو ذرا بھی شرم نہ آئی۔اور مولانا عامر عثمانی کے جس ماہنامہ ''تجلی'' کا نام تک فاضل مرتب نے اُردو صحافت کے عنوان پر کتاب کے صفحہ نمبر ۳۷۴ پہ نہیں لکھا۔اس بابت ہم پیچھے کلام کر آئے ہیں۔ایسے متعصب اور چاپلوس شخص سے ایک صحیح تاریخ مرتب کرنے کی اُمید بھی کیونکر کی جاسکتی ہے۔اگر ہم غلط کہہ رہے ہیں تو ہندوستان ہی نہیں برصغیر بھی نہیں؛ بلکہ تمام عالم میں کوئی ایک فقط ایک تو ایسا ماہنامہ، رسالہ دکھادو جو خالص مذہبی اور دینی ہو اور اُس زمانے میں پچیس ہزار شائع ہوتا ہو۔یا لوگ باقاعدہ ہر مہینے کے آغاز میں جس کی آمد کے لیے منتظر رہتے ہوں۔

اے طلبۂ مدارس! ہم آپ سے عرض کرتے ہیں کہ اپنی کم علمی کے اندھیروں کو دُور کرنے کے لیے ''تجلی'' کا نور حاصل کیجیے،اس ویب سائٹ پہ اکثر شمارے موجود ہیں، ڈاؤن لوڈ کریے اور پڑھیے ویب سائٹ ہے:

www.tajalli.in

ابھی ابھی ہمیں ایک کتاب ''عکس و نقش'' کے نام سے موصول ہوئی ہے۔جس کے مصنف ''نایاب حسن'' ہیں، یہ نایاب حسن صاحب ۲۰۱۱ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہیں۔مطالعہ کا اچھا ذوق رکھنے کے ساتھ ساتھ تحریر کا شوق بھی رکھتے ہیں۔ان کی اسی کتاب میں صفحہ نمبر ۸۵ پہ ایک مضمون مولانا عامر عثمانی اور تجلی کے متعلق ہے۔سو چا حضرت کے تعارف کی غرض سے یہ مضمون آپ کی خدمت میں بھی پیش کر دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔مضمون ملاحظہ کیجیے:

مولانا عامر عثمانیؒ کا نثری جہان

ماہنامہ ''تجلی'' کے حوالے سے

مولانا امین الرحمٰن عامر عثمانیؒ ۱۹۲۰-۱۹۷۵ بیسویں صدی کے اُن ممتاز اہلِ علم وفضل میں سے ہیں، جنھیں مذہبیات پر دسترس کے ساتھ ادب وشعر اور نقد ونظر کے منصفانہ رویے کے حوالے سے ایک منفرد شناخت حاصل تھی۔ ان کے قلم میں ایسی تابانی اور فکر ونظر میں ایسی وسعت تھی کہ وہ جس موضوع پر قلم اُٹھاتے، اس کا حق ادا کردیتے تھے، علمی اعتبار سے اُن کی استنادی حیثیت یوں متشخص ہوتی ہے کہ ان کا خانوادہ دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں سے ایک مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ، ان کے صاحبزادگان مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جیسے نابغہ افراد کا خانوادہ ہے، خود عامر عثمانیؒ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز طالبِ علم رہے اور اعلیٰ نمبرات کے ساتھ ۱۹۳۸ء میں فضیلت کی تکمیل کی۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا اور مشاہدہ عمیق، وہ اسلامیات کے بھی رمز شناس تھے اور ادبیات سے بھی ان کی آگاہی بہت سے پیشہ ور اصحابِ ادب سے زیادہ اور اچھی تھی۔ رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے کسبِ معاش کے لیے متعدد سرگرمیوں میں ہاتھ ڈالا؛ لیکن ان کی عملی زندگی کا اصل دَورتب شروع ہوا، جب انھوں نے نومبر ۱۹۴۹ء میں ماہنامہ ''تجلی'' کا آغاز کیا، عام لوگوں کے لیے یہ امر موجب حیرت تھا کہ دیوبند سے شائع ہونے والے اس رسالے کو کیسے آناً فاناً ملک گیر شہرت ومقبولیت حاصل ہوگئی؛ حالاں کہ بنیادی طور پر یہ ایک مذہبی رسالہ تھا؛ اسکی وجہ یہ تھی کہ مذہبی ہونے کے باوجود اس رسالے کے مشمولات میں ایسا تنوع اور توسع ہوتا تھا کہ اس میں ہر قسم کے ذوق ودلچسپی رکھنے والے قارئین کو اپنی آسودگی فکر ونظر کا سامان بخوبی طور پر میسر آجاتا تھا۔

''تجلی'' نے مذہبی مجلاّتی صحافت میں ایک انقلاب کی نیو اُٹھائی اور اَدبی وتنقیدی مباحث میں دلچسپیوں کے نئے جہان تخلیق کیے، تجلی محض ایک رسالہ نہیں؛ بلکہ فکر ونظر کے نئے نئے زاویے تراشنے والا ایک مکمل ادارہ تھا، اس رسالے کے ذریعے عامر عثمانی نے بحث وتحقیق کے اُن گوشوں پر بھی کھل کر لکھا، جن پر لکھنے سے لوگ ہچکچاتے تھے یا اُن کی علمی نارسائی اُنھیں اس سے روکتی تھی، چاہے مذہبی مسائل ہوں یا ادبی نقطہ ہائے نظر؛ سب پر عامر عثمانی کا قلم بھرپور روانی سے چلتا تھا اور اپنے قاری کو غور وفکر کے نئے نئے عنوانات سے آگاہ کرتا تھا۔ مولانا

عامر عثمانیؒ کے نثری جہان کی دلکشی، تنوع اور خوبیوں کے ادراک کے لیے ماہنامہ ''تجلی'' کے شماروں پر ایک نظر ڈالنا کافی ہوگا، اُنھوں نے جس انداز سے اس رسالے کی ترتیب قائم کی تھی، جس طرح علمی وفنی باریکیوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ''تجلی'' کے کالموں کی تقسیم کی تھی اور پھر وہ جس خوبی سے انھیں برتتے تھے، وہ صرف ان ہی کا حصہ تھا۔ ہر ماہ نئے اور اَچھوتے مذہبی، علمی، سماجی وسیاسی موضوعات پر ان کے دلچسپ اور علم ریز اداریے قاری کے لیے فرحت وانبساط کا سامان کرنے کے ساتھ سوچنے اور سمجھنے کی تازہ قوتوں سے سرشار کرتے تھے، مذہبی رسائل عام طور پر اپنے ایک موضوعی ارتکاز کی وجہ سے چل نہیں پاتے اور ان کی تعدادِ اشاعت چند سیکڑوں سے تجاوز نہیں کر پاتی، اس کا احساس عامر عثمانیؒ کو بھی تھا اور انھوں نے تجلی کے پہلے شمارے میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا بھی تھا کہ: ''تجلی کا پہلا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے، ہم جانتے ہیں کہ سرِورق پر ''مذہبی'' کا لفظ دیکھ کر ہمارے نوّے فی صدی بھائی ورق گردانی کی زحمت گوارہ کیے بغیر ہی اسے ایک طرف ڈال دیں گے، ان کی طنزآلود نگاہیں زبانِ حال سے تحقیر آمیز انداز میں کہیں گی ''دقیانوسی، فضول، رجعت پسندانہ!'' پانچ فی صدی ایسے ہوں گے، جو محض عنوانات پر نگاہ ڈالنا کافی سمجھیں گے، ان کا اندازِ نظر کچھ ایسا ہوگا گویا صرف ورق گردانی ہی چھاپنے والے کی عرق ریزیوں کی مناسب قیمت ہے، پانچ فیصدی مشکل سے ایسے ہوں گے جو پورے مضامین کا مطالعہ فرماسکیں گے''۔ خود ان کے کئی ہمدردوں اور بہی خواہوں نے بھی ممکنہ خساروں کے پیشِ نظر انھیں اس مہم جوئی سے باز رہنے کی تلقین کی تھی؛ لیکن عامر عثمانی اوّلاً تو اپنی دُھن کے پکے آدمی تھے اور ثانیاً یہ کہ ان کے ذہن میں جس قسم کے رسالے کا خاکہ تھا، اس کو دیکھتے ہوئے انھیں بھی یقیناً یہ اُمید ہوگی کہ ''تجلی'' رسائل ومجلّات کی دنیا میں نقطۂ انقلاب ثابت ہوگا، سو ایسا ہوا بھی، اس رسالے کو سراہا بھی گیا اور علمی وادبی حلقوں میں اس کا ایک وقار واعتبار بھی قائم ہوا۔ یہ ایک ایسا مجلہ تھا، جسے عام رواج کے برخلاف لوگ پابندی سے خرید کر پڑھتے تھے؛ نتیجتاً چند شماروں کے بعد ہی اس رسالے کی تعدادِ اشاعت دسیوں ہزار سے زائد پہنچ گئی اور پورے برصغیر کی اُردو دنیا نہ صرف ''تجلی'' کے نام سے آشنا؛ بلکہ اس کے خوانِ علم وادب کی ریزہ چیں ہوگئی۔

عامر عثمانیؒ نے اس رسالے میں پوری بے باکی کے ساتھ بدعات وخرافات کے خلاف لکھا، مذہبی تقدس کی آڑ میں نفسانی خواہشات کی پرورش کرنے والے عناصر کی نشان دہی کی اور اس حوالے سے عام مسلمانوں کے فکری وشعوری جمود کو توڑا، ادب کو لامقصدیت اور تفریحِ طبع بنانے کی بجائے بامقصد بنانے پر زور دیا، ادبی و شعری تنقید کے بھی خوب سے خوب تر تجربے کیے اور ان کی دلچسپ، خوب صورت، معنویت سے لبریز شاعرانہ صلاحیتوں کا باقاعدہ ظہور بھی ''تجلی'' کے صفحات سے ہی ہوا۔

تحقیق عامر عثمانیؒ کا ایک خاص وصف تھا اور اپنی تحقیق کو پیش کرنے کا ان کا اسٹائل بھی نہایت ہی خوب

صورت تھا،عموماً تحقیقی تحریروں میں ایک قسم کی خشکی ہوتی ہے اور انھیں پڑھتے ہوئے آدمی بہت جلد اُکتا جاتا ہے؛ مگر جب تحقیق نگار عامر عثمانی ہوں، تو قاری کو بوریت محسوس ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جب وہ مذہبی اور علمی مسائل پر لکھتے، تو مکمل تیاری، مطالعہ اور موضوع کے مافیہ پر حاوی ہونے کے بعد ہی لکھتے اور پھر اسلوب بھی نہایت ہی شگفتہ اور ادبیت سے لبریز ہوتا، ان کی محققانہ صلاحیت و انفرادیت وہ لوگ خوب سمجھتے ہیں، جنھوں نے ''تجلی'' کا مطالعہ کیا ہے یا بعد میں کتابی شکل میں شائع ہونے والے اس کے بعض مشمولات کو پڑھا ہے، جب تک کہ کسی مسئلے کی مکمل تنقیح نہ کر لیتے، اس وقت تک اس پر اپنی کوئی رائے قائم نہیں کرتے، ان کا ایک مزاج یہ بھی تھا کہ وہ علما و اہلِ قلم کے عمومی مزاج کے برخلاف ثانوی مراجع و مآخذ پر انحصار کرنے کی بجائے اوّلین مراجع تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور مکمل انشراحِ قلب کے بعد ہی متعلقہ موضوع پر قلم اُٹھاتے۔ عام شماروں کے علاوہ خلافت و ملوکیت، طلاق، تنقید اور دیگر موضوعات پر جو انھوں نے ''تجلی'' کے خصوصی شمارے شائع کیے، ان کی ہر سطر عامر عثمانی کے ذوقِ تحقیق کی عمدہ مثال ہے۔

یوں تو ''تجلی'' کا مکمل سراپا ہی اپنے اندر بے پناہ حسن و کشش رکھتا تھا اور اسے پڑھنے کے لیے قارئین بے تاب رہتے تھے؛ مگر اس کے بعض مخصوص کالموں کی کچھ زیادہ ہی اہمیت تھی، مثلاً عامر عثمانیؒ صاحب کا اداریہ، جسے وہ ''آغازِ سخن'' کے عنوان سے تحریر کیا کرتے تھے، اس اداریے میں وہ عام طور پر تازہ شمارے کے مشمولات پر طائرانہ نظر ڈالتے تھے اور اس خوبی سے لکھتے تھے کہ قاری کے سامنے پورے رسالے کا خلاصہ اور نچوڑ آجاتا تھا۔ ''تجلی کی ڈاک'' بھی اس رسالے کا ایک دلچسپ کالم تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ جس طرح عامر عثمانیؒ کسی بھی مسئلے پر پوری بے باکی کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے تھے اور شخصی امتیاز کو خاطر میں لائے بغیر انھیں جو حق نظر آتا، اس کا اظہار کر دیتے تھے، اسی طرح ان کے یہاں اس حوالے سے مکمل فکری و نظری وسعت تھی کہ ان کا کوئی بھی قاری ''تجلی'' کے کسی بھی مشمولہ حصے سے متعلق اپنی رائے، اعتراض یا اشکال انھیں ارسال کرتا تھا؛ چنانچہ اس رسالے کے تقریباً ہر شمارے میں جہاں بہت سے مراسلات ماہ نامہ ''تجلی'' کی خوبیوں اور اس کے امتیازات کی مدح سرائی پر مشتمل ہوتے تھے، وہیں کئی مراسلے ایسے بھی ہوتے تھے، جن میں ''تجلی'' کے کسی مضمون، کسی کالم پر کوئی اشکال ہوتا تھا اور عامر عثمانی صاحب اہتمام سے اس کا جواب لکھتے اور اعتراض کرنے والے کے ذہنی خلجان کو دُور کرتے تھے۔ ''تجلی'' کا ایک اور خاص کالم، جو ملک گیر شہرت رکھتا تھا اور قارئین کی بہت بڑی تعداد اس کی ہر نئی قسط کے لیے چشم براہ رہتی تھی، وہ اس کا طنزیہ کالم ''مسجد سے مے خانے تک'' تھا، اس میں عامر عثمانی کا ایک نیا اوتار ''ملا ابن العرب مکی'' کے پیکر میں نظر آتا تھا، اس کالم میں عامر عثمانی اپنے مخصوص، مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں ملک کے ماحول، مسلمانوں کے معاشرہ اور اربابِ اقتدار سے لے کر صاحبانِ جبہ و دستار تک کے اصلی اور حقیقی چہرے سے نقاب اُٹھاتے تھے، اس کالم میں ''ملا ابن العرب مکی'' کے روپ میں انھوں نے بعض ایسے فکر انگیز مضامین لکھے اور

ایسی قیمتی باتیں تحریر کی ہیں کہ ان کو سمجھنے کے بعد انسان فکری وعملی تحریک اور بیداری کی نئی سمتیں حاصل کرسکتا ہے اور یہ تحریریں اس کی زندگی میں ایک صالح اور خوشگوار انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی ہیں۔ان کی وفات کے ایک عرصے کے بعد ''مسجد سے مے خانے تک'' کو کتابی شکل میں بھی شائع کیا گیا ہے، جو پانچ سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔

''کھرے کھوٹے'' بھی ''تجلی'' کا ایک بہت ہی ممتاز کالم تھا، جس میں مختلف موضوعات پر شائع ہونے والی نئی کتابوں پر تبصرے کیے جاتے تھے، تبصرہ نگاری میں بھی عامر عثمانی کا اپنا ایک خاص منہج تھا، وہ کسی بھی تصنیف کی قدر وقیمت مصنف کی شہرت ومقبولیت کے ذریعے طے کرنے کی بجائے اس کتاب کے مشمولات کے ذریعے طے کرتے تھے، تبصرہ نگاری کے مروج طریقے کے برعکس وہ کتاب کو پہلے مکمل دقتِ نظری سے پڑھتے اور پھر اس پر اظہارِخیال کرتے تھے، ان کی تنقید میں تعصب کی بجائے حقیقت پسندی ہوتی تھی، اسی طرح وہ کسی بھی تصنیف یا تخلیق کے محاسن کو بھی کھلے دل سے سراہتے تھے۔اُردو زبان کے تبصرہ نگاروں میں ماہر القادری کا نام نمایاں ترین ہے، انھوں نے اپنے رسالے ''فاران'' میں جو سیکڑوں علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی وسماجی موضوعات پر لکھی گئی کتابوں پر تبصرے کیے، وہ اہلِ علم وادب کے یہاں معرکۃ الآراء سمجھے جاتے ہیں اور وہ ''ماہر القادری کے تبصرے'' کے نام سے طبع شدہ بھی ہیں، انھیں بھی عامر عثمانی کی تنقید نویسی اور تبصرہ نگاری میں فنی مہارت کا اعتراف تھا، عامر عثمانی کی وفات پر اپنے تاثراتی مضمون میں ماہر القادری نے اس حوالے سے نہایت ہی وقیع الفاظ تحریر کیے، انھوں نے لکھا:

''فاران میں کتابوں پر جس انداز میں تبصرہ کیا جاتا ہے، یہ انداز کئی رسالوں نے اختیار کیا؛ مگر وہ نباہ نہ سکے، مولانا عامر عثمانی ؒ نے ''تجلی'' میں اس انداز کو پوری طرح برقرار رکھا، شعر وادب اور زبان پر ''فاران'' کی تنقیدیں شاید کچھ نکلی ہوئی ہوں؛ مگر علمی مباحث اور کتابوں پر ''تجلی'' کی تنقیدوں کا جواب نہیں''۔

(یادِ رفتگاں، جلد دوم، ص:۱۱، ط: مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی)

عامر عثمانی کی تنقیدی جولانیوں کا دائرہ زیادہ تر علمی موضوعات تک محدود رہا، وہ اگر باقاعدگی کے ساتھ زبان وادب اور شعر ونثر پر نقد وتبصرے کا سلسلہ جاری رکھتے، تو ان کا قد اِس حوالے سے بھی دراز ہی ہوتا؛ بلکہ حقانی القاسمی کے بقول:

''(عامر عثمانی کے علاوہ) شاید تنقید کے اُفق پر کوئی دوسرا نام نظر نہ آتا، نقاد یا تو تنقید لکھنا بھول جاتے یا پھر کوئی اور پیشہ اختیار کرتے، کہ عامر عثمانی کی علمیت کے سامنے ہمیشہ انھیں اپنی جہالت کا چراغ روشن ہونے کا خطرہ لاحق رہتا''۔ (دارالعلوم دیوبند: ادبی شناخت نامہ، ص:۸۲)

الغرض یہ واقعہ ہے کہ عامر عثمانی نے ''تجلی'' کے ذریعے سے اُردو کی مذہبی، علمی وادبی مجلاّتی صحافت میں ایک انقلاب برپا کردیا تھا، ان کے قلم سے جو مضامین وجود میں آئے، وہ آج بھی علمی وادبی شہ پارے ہیں اور اپنے اندر بے پناہ حسن وکشش رکھتے ہیں۔ (عکس ونقش، ص۸۵)

فی الوقت مولانا عامر عثمانی کے لیے اتنا تعارف کافی ہے، یہی سوچ کر ہم اور کوئی تعارفی خاکہ پیش نہیں کر رہے تھے۔ ورنہ ماہنامہ تجلی کے عامر عثمانی نمبر کی تین جلدیں مولانا کا تعارف پیش کرنے کے لیے کافی مواد فراہم کرسکتی ہیں؛ لیکن ایک مضمون ان تین جلدوں میں سے ہمیں اس قابل ضرور لگا کہ جسے اس کتاب میں شامل کیے بغیر ہم سے رہا نہ گیا؛ اس لیے پروفیسر عمر حیات غوری صاحب کا یہ مضمون ہم یہاں نقل کر رہے ہیں، آپ بھی اس کے مطالعہ سے مولانا کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرسکیں گے۔

....

''آج کیا چل ہی بسا بزمِ جہاں سے عامرؔ''

مولانا عامر عثمانی مرحوم سے وابستہ چند یادیں

مولانا عامر عثمانیؒ ہندوستانی علماء کی صفِ اوّل کے لوگوں میں شامل تھے، مرحوم نے عالمی اسٹیج پر اپنا مقام ہی پیدا نہیں کرلیا تھا؛ بلکہ اپنی انفرادیت بھی منوالی تھی، انھوں نے شرمندۂ ساحل رہنے کے بجائے اُچھل کر بیکراں ہونا پسند کیا اور تجلی کے ذریعہ سیاسی حدود کو توڑ کر علمی آفاقیت پر چھا گئے۔

مرحوم سے میری غائبانہ شناسائی تو اس وقت سے ہے جبکہ میں اپنی تعلیمی زندگی کے مراحل طے کر رہا تھا اور چھٹے یا ساتویں درجہ میں زیرِ تعلیم تھا۔ اُس وقت سے مجھے تجلی کے صفحات میں ذہنی اُلجھنوں کا علاج ''تجلی کی ڈاک'' میں ملتا رہتا تھا۔ میں اسے سب سے پہلے غور سے پڑھتا۔ اس کے بعد جس عنوان کو ہاتھ لگاتا وہ ملا ابن العرب کی مزاح نگاری تھی جو ''مسجد سے میخانے تک'' کے عنوان کے تحت مستقل شائع ہوتی رہتی ہے۔ اس کالم میں طنز کے تیر مزاح کی چاشنی میں لپٹ کر بڑے تعمیری و اصلاحی انداز سے ذہنوں کو متاثر کر رہے ہیں۔ میں ایسے بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں جو صرف ''ملامکی'' کے رشحاتِ قلم کی وجہ سے تجلی کے شائق بنے ہوئے ہیں۔ میرے اس ذوق کی تربیت میں جہاں میرے بہت سے مربیوں کے نام آتے ہیں، اُن ہی میں میرے ہائی اسکول کے استاد ماسٹر محمد ادریس صاحب کا نام سرِفہرست ہے جنھوں نے اپنی بے غرض اور پُرخلوص محبت سے میرے ذہن میں دینی کتب و رسائل کے مطالعہ کرنے کی ضرورت کا احساس بیدار کیا۔ موصوف ہی نے تجلی کے پرچے مجھے دیئے اور مطالعہ کا ذوق بیدار کر کے مولانائے مرحوم سے تعارف کرایا اور گرویدہ بنا دیا جو آج تک باقی اور قائم ہے۔

اس کے بعد جب علم اور تجربہ کی اگلی منزلوں میں قدم رکھا تو موصوف کی علمی بصیرت اور بے لاگ تبصروں نے اپنا گرویدہ بنالیا، خاص طور سے مولانا کے اُصولی اور علمی مباحث جن میں انھیں کسی شخصیت سے مرعوب اور متاثر

ہوتے نہیں دیکھا گیا؛ بلکہ حق گوئی و بے باکی کے معاملے میں مرحوم نے اپنا مقام پیدا کرلیا تھا۔لوگ اکثر کہا کرتے تھے کہ"اگر کسی معاملہ میں بے لاگ اور صحیح رائے معلوم کرنا ہو تجلی کو لکھو۔"اور اکثر معاملہ میں تجلی کی آراء حَکَم بن جاتیں۔اُصولی اور علمی مباحث میں مولانا کو کسی کے سامنے جھکتے بھی نہیں دیکھا؛ بلکہ اگر کہیں علمی بد دیانتی یا ہٹ دھرمی نظر آتی تو مولانا کو شمشیر برہنہ ہی پایا۔شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے اقبالؒ نے کہا تھا۔

آئین جواں مردی حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

تجلی کے صفحات شاہد ہیں کہ اللہ کے اس شیر کو روباہی کردار میں نہیں دیکھا گیا،جس کا اعتراف مولانا کے دوست وہمنوا ہی نہیں؛ بلکہ ان کے مخالفین اور دشمنوں تک نے کیا ہے۔مخالفین کے ایک گروہ نے تجلی کے آفس تک میں آگ تو لگادی؛لیکن کوئی شخص یہ الزام نہیں لگا سکا کہ مولانا نے کہیں بھی جانبداری کا رویہ اپنایا ہے۔

تجلی کے مسلسل مطالعہ سے مولانا سے خاص قسم کی عقیدت اور محبت کا پیدا ہوجانا لازمی امر تھا؛ چنانچہ ایک مرتبہ تجلی ایک کے بعد دوسرا خاص نمبر شائع کرنے کا اعلان کر رہا تھا۔میں بھوپال میں تھا چند احباب جن میں میرے دوست جناب عنایت علی اور نثار علی صاحبان بھی شامل تھے بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ تجلّی کا ذکر نکل آیا۔میں نے لوگوں سے کہا کہ بھئی! آپ تجلی کے اس کام سے خوش ہیں اور جب میں ایسے اعلان سنتا ہوں تو مجھے خطرہ کی گھنٹی سنائی دینے لگتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید مولانا کو نوٹس معلوم ہوگیا ہے کہ اپنا کام جلد تمام کرو تاکہ تمہارا بلاوا بھیجا جاسکے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید مولانا اپنے کام کی تکمیل کر رہے ہیں،تاکہ جلد فارغ ہوکر دنیا کے سفر کے مکمل ہونے کا اعلان کردیں۔بعد کے حالات نے بتایا کہ شاید مولانا اسی تکمیل میں لگے ہوئے تھے۔

مولانا کے حلیے کے بارے میں ذہن میں ایک خاص قسم کا ہیولا بن گیا تھا۔اور تصور کے پردہ پر ایک مولویانہ وضع قطع نے جگہ لے لی تھی کہ مولانا عامر عثمانی موٹے تازے،سرخ وسفید چہرہ کے مالک ہوں گے اور چہرہ پر ایک لمبی برف کی طرح سفید داڑھی ہوگی وغیرہ وغیرہ ابھی تک چونکہ مولانا کو چشم سر سے دیکھا نہیں تھا۔اس لیے ذہن میں ایک تصوراتی نقشہ مرتسم ہوگیا کہ مولانا کو ایسا ہونا چاہئے؛لیکن اسی کے ساتھ یہ خواہش بھی کروٹیں لینے لگی تھیں کہ کم ازکم ایک بار مولانا سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوجائے تو کیا ہی اچھا ہو؛لیکن بظاہر اس کے امکانات دُور دُور تک نظر نہ آتے تھے۔

غالباً ستمبر ۱۹۷۴ء میں بزمِ اُردو انجمن کالج بھٹکل نے ۲؍جنوری ۱۹۷۵ء کو ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اس مشاعرہ کا انتظام کرنے اور شعراء کو مدعو کرنے کی ذمہ داری ڈاکٹر سید انور علی صاحب (پرنسپل) کی نگرانی میں میرے ذمے آئی؛ چنانچہ شعراء کی تلاش ہوئی اور مشاعرہ کو کامیاب بنانے کے لیے بہتر سے بہتر اور اصلاحی

ذہن وفکر رکھنے والے شعراء کا انتخاب عمل میں آیا اور انھیں دعوت نامے جاری کر دیئے گئے، اتفاق سے اسی سال نومبر ۴۷ء میں مجھے اور ڈاکٹر صاحب کو ایک اجتماع کے سلسلے میں دہلی جانا پڑا۔ اس اجتماع کے اختتام پر ایک شعری نشست کا بھی اہتمام تھا۔ اس مشاعرہ میں جناب نسیمؔ صاحب اناؤنسنگ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مشاعرہ جاری تھا کہ یکایک نسیمؔ صاحب کی آواز کانوں سے ٹکرائی کہ اب مولانا عامرؔ صاحب تشریف لارہے ہیں۔ اس آواز پر میں نہ صرف ہمہ تن گوش ہوگیا؛ بلکہ ہمہ تن چشم بھی؛ کیونکہ یہ مولانا کو بچشم سر دیکھنے کا سب سے پہلا اتفاق تھا، مولانا کے بارے میں میری ذہنی تصویر ایک دم اُبھر آئی؛ لیکن جب اسٹیج پر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ بار بار آنکھیں مَل کر دیکھتا رہا کہ کیا ایسے دُبلے پتلے آدمی کو مولانا عامر عثمانی کہتے ہیں، جس کی کل کائنات ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہے جس پر بغیر گوشت کی کھال چڑھادی گئی ہے۔ ماننے کو جی نہیں چاہ رہا تھا کہ یہی شخص جس کی جولانیٔ طبع اور علمی وفکری صلاحیتوں کا مظہر ماہنامہ ''تجلی'' ہے، انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھا کہ لاؤڈ سپیکر نے رباعی کے اشعار کی ترسیل کے فرائض انجام دینا شروع کر دیے۔ آواز میں کڑک وقار اور مردانگی سب کچھ تھا۔ صرف آواز ہی میں نہیں؛ بلکہ کلام میں بھی مقصدیت، ادبیت اور ایک صالح اور تعمیری ذہن کے سارے ہی عناصر موجود تھے۔ تجلی کے صفحات میں مولانا کے کلام کو تو اکثر دیکھنے کا موقع ملا تھا؛ لیکن خود مولانا کو سننے کا یہ پہلا موقع تھا۔ خدا تعالیٰ کے نظامِ عدل کا قائل ہونا ہی پڑا۔ اگر جسم پر گوشت کی کمی رکھی گئی تھی تو اس کمی کو ذہنی وفکری صلاحیتوں سے پوری کر کے اپنی صفتِ عدل کا تقاضا پورا کر دیا تھا۔

دوسرے دن صبح کو ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ مشاعرہ کا تذکرہ آیا۔ میں نے مولانا کے کلام اور خاص طور سے پڑھنے کے انداز کی تعریف کی، تو کہنے لگے چلیے! مولانا کو بھی اپنے مشاعرہ میں مدعو کر لیتے ہیں؛ لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ مولانا اس پر تیار ہو جائیں گے؛ چنانچہ جواب دیا کہ مولانا اتنے مصروف آدمی ہیں کہ صرف مشاعرہ کے لیے اتنا طویل سفر کر سکیں گے؟ مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ویسے اگر مولانا قبول کر لیں تو اس سے بڑھ کر مسرت کی بات اور کیا ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب نے جانے کیا جادو کیا کہ مولانا تیار ہو گئے، اور یہ خوش خبری مجھے بھی سنادی۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی، میری دیرینہ آرزو بر آنے والی تھی اور مولانا سے زیادہ سے زیادہ قربت کے امکانات روشن نظر آرہے تھے؛ چنانچہ ۱۵ / نومبر ۴۷ء کو بمشکل سے مولانا کو آل انڈیا مشاعرہ کا باقاعدہ دعوت نامہ ڈاکٹر صاحب کے سفارشی خط کے ساتھ ارسال کر دیا گیا۔ بزم نے تمام شعراء کو سیکنڈ کلاس ریل کا کرایہ دینے کی پیشکش کی تھی۔ اس کا جواب مولانا کے شگفتہ و پُر مزاح قلم نے جس طرح دیا، آپ بھی سنیے:

''یہ لطیفہ ہے کہ آپ کی بزم اب تک ''سیکنڈ کلاس'' عنوان قائم کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ بندہ جس ہندوستان میں رہتا ہے وہاں کی ریلوں میں تو اب اس عنوان کی کوئی چیز رہی نہیں۔ دو ہی

درجے ہیں تھرڈ، یا فرسٹ۔ظاہر ہے میرے نصیب میں تھرڈ ہی آئے گا۔شکوہ وہ کرے جسے تقدیر پر یقین نہ ہو۔لکھنے والا جو کچھ لکھ چکا وہ اٹل ہے آپ کا یا کسی کا اس میں کیا قصور۔

بہر حال بشرط زندگی سر کے بل حاضر ہو رہا ہوں۔'' (ماخوذ از مکتوب مورخہ ۱۳ دسمبر ۷۴ء)

اگر یہ خط مولانا کے ذاتی پیڈ پر نہ آیا ہوتا تو یقیناً یہی تسلیم کیا جاتا کہ مولانا نے بذاتِ خود جواب دینا گوارہ نہیں کیا؛ بلکہ ملا ابن العرب مکی سے کہہ کر لکھوا دیا ہے۔زبان کی شوخی تو یہی دلالت کرتی ہے؛ مگر پیڈ کے ساتھ مولانا کے دستخط بھی ہیں؛ اس لیے اس بات کو تسلیم کرنے کے سارے امکانات موجود ہیں کہ یہ زبان بھی مولانا کی اپنی ہی ہے۔علمی مباحث کی بات الگ ہے۔

حسبِ وعدہ مولانا، حفیظ میرٹھی، شمسی مینائی اور ناظم ناگپوری کے ہمراہ ۳۰ر دسمبر ۷۴ء کو بھٹکل تشریف لے آئے۔ڈاکٹر صاحب کے دولت کدہ پر ملاقات ہوئی اور پہلی ہی ملاقات میں مولانا نے اپنی شخصیت کی سادگی اور زبان کی لطافت و شیرینی سے متاثر کر لیا۔مولانا سے گفتگو کرتے ہوئے یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ ہم کسی ایسی شخصیت سے گفتگو کر رہے ہیں جو عالمی شہرت کی حامل ہے، گفتگو کی لطافت اور اپنائیت سے محسوس ہوتا تھا کہ مولانا سے پہلی ملاقات نہیں ہے، کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد اسی دن ڈاکٹر صاحب کے مکان پر سب لوگ بیٹھے ہوئے گفتگو کر رہے تھے کہ تھوڑی ہی دیر میں اس نشست نے ''منی مشاعرہ'' (Mini Mushaira) کی شکل اختیار کر لی۔مشاعرہ شروع ہو گیا اور شعراء نے اپنا اپنا کلام سنایا مولانا بھی کسی سے پیچھے رہنے والے کب تھے؛ چنانچہ موصوف نے بھی کئی غزلیں سنا ڈالیں۔

اسی دن دورانِ گفتگو میں نے مولانا سے عرض کیا کہ ''مولانا! ہم نے سیکنڈ کلاس ریل کرایہ کی پیشکش اس لیے کی تھی کہ اب تھرڈ کلاس کو حکومت نے ختم کر دیا ہے۔کہنے لگے بھئی نام بدلنے سے کیا ہوتا ہے۔اس طرح حقیقت نہیں بدلتی ہے تو وہ تھرڈ ہی کلاس خواہ اسے فرسٹ کہیے یا سیکنڈ۔جس طرح گدھے کو گھوڑا کہنے سے وہ گھوڑا نہیں بن سکتا۔اسی طرح تھرڈ تو تھرڈ ہی رہے گا۔نام اس کا کچھ بھی رکھ لیجیے۔

شام کے وقت میں اور مولانا قیام گاہ کی طرف جا رہے تھے، راستے میں میں نے کہا مولانا تجلی کا فی عرصہ سے کہانی نمبر کا اعلان کر رہا ہے؛ لیکن نمبر ابھی تک نہیں نکل سکا۔آخر کیا رکاوٹ درپیش ہے؟ مسکرا کر کہنے لگے: ''بھئی! یہ کمبخت ملا بہت بدمعاش ہو گیا ہے ہاتھ ہی نہیں آتا۔بڑی مشکل سے پکڑ کر کچھ کام کراتا ہوں اور پھر چھوٹ کر بھاگ جاتا ہے۔اس مرتبہ اسے پکڑ کر کمرہ میں بند کر دوں گا اور جب تک کہانی نمبر مکمل نہیں ہو جاتا باہر نہیں نکلنے دوں گا''۔لیکن کس کو معلوم تھا کہ ملا مکی کو قید کرنے والا خود ہی اپنی قیدِ حیات سے آزاد ہو جائے گا، حضرت علیؓ نے کس قدر سچ فرمایا ہے: عُرِفْتُ بِاللّٰہِ بِفَسْخِ الْعَزَامًا (میں نے خدا کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا)

میں نے کہا مولانا ہم نے سنا ہے کہ ملامکی تو آپ ہی کا دوسرا نام ہے۔اس میں کہاں تک...مولانا اس سوال کو بڑی صفائی سے ٹال گئے اور کہانی نمبر کی یقین دہانی کر کے گفتگو کا رُخ بدل دیا۔

موصوف بڑے زاہد اور عبادت گزار ہی نہیں؛ بلکہ شب زندہ دار بھی تھے،اسی لیے احتیاطاً ہمیشہ ایک عدد تھرماس اور ایک ماچس اپنے ساتھ رکھتے تھے۔جب ہمیں اس کا علم ہوا کہ مولانا رات کو جلدی بیدار ہوتے اور چائے وسگریٹ سے تازہ دم ہوکر اپنے مشاغل نیم شبی میں مصروف ہونے کے عادی ہیں،تو ہم نے مرحوم کے لیے مخصوص اہتمام کی کوشش کی،تاکہ ان کے مشاغل میں دشواری نہ ہو؛ کیونکہ وہ کسی حال میں اپنے ان مشاغل سے غفلت پسند نہیں کرتے تھے۔

مرحوم کو تجلی سے عشق تھا۔ایک سے زیادہ باراس جملے کو دہراتے رہے کہ تجلی میری تجارت نہیں؛ بلکہ مقصدِ حیات ہے اور آخری دم تک اسی کی خدمت کرتے رہنا تصور کرتا ہوں۔ایک بار ڈاکٹر صاحب رشید کوثر فاروقی،قوی ٹونکی،بزمی ٹونکی،اور راقم بیٹھے ہوئے مولانا سے ملاقات کررہے تھے۔دورانِ گفتگو تجلی کی علمی تنقید کے معیار ومزاج کی بات چل نکلی۔مولانا سے کہا گیا کہ آپ کی پُر وقار سنجیدہ اور عالمانہ تنقید میں جب شخصیات پر بات چل نکلتی ہے تو اس کا علمی وقار مجروح ہوتا نظر آتا ہے۔لوگوں کو اس معاملے میں ایسی شکایت ہے کہ علمی اور اُصولی بحث کو اپنے حدود میں ہی رہنا چاہیے ورنہ اس کا علمی وقار اور تاثر دونوں مجروح ہوجاتے ہیں۔اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس براہِ راست تنقید پر یا تو خفا ہوجاتا یا پھر بہانے تراشنے لگتا۔ورنہ تاویلوں کا سہارا تو لے ہی لیتا؛ مگر مولانا نے ان اوچھے ہتھیاروں میں سے کسی کو استعمال نہیں کیا؛ بلکہ کہنے لگے کہ بھئی! پہلی بات تو یہ ہے کہ جب میں دیکھتا ہوں کہ لوگ عصبیت اور تنگ نظری کی وجہ سے حقائق سے پہلوتہی کرتے ہیں اور کٹ حجتی پر اُتر آتے ہیں تو مجھے غصہ آجاتا ہے اور اس قسم کی باتیں تجلی میں چھپ جاتی ہیں۔دوسرے یہ کہ میں تنہا آدمی ہوں اور پورا تجلی مجھی کو تیار کرنا پڑتا ہے اس لیے اپنی تحریر پر کبھی نظرِ ثانی کی نوبت ہی نہیں آتی۔بعض اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ کاتب کو اپنے پاس ہی بٹھالیتا ہوں۔صفحہ پورا بھی نہیں ہوپاتا کہ کاتب کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے اور کتابت ہوکر چھپائی کے مراحل طے ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔بعد میں جب نظر پڑتی ہے تو خود مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا؛ لیکن اب کیا کیا جاسکتا ہے۔بہرحال! آئندہ اور احتیاط برتوں گا۔تجلی ہی کے سلسلے میں میں نے ایک بار مولانا سے کہا کہ مولانا آپ نے اپنا کوئی جانشین بھی تیار کیا ہے یا نہیں؛ ورنہ آپ کے بعد تجلی بھی مرحوم ہوجائے گا۔بہت ہی رنجیدہ لہجے میں کہنے لگے کہ بھئی! میں خود بھی بہت دنوں سے کسی معقول آدمی کی تلاش میں ہوں جو تجلی کا بار سنبھالنے کی صلاحیتوں کا مالک ہو؛ لیکن ابھی تک کامیاب نہیں ہوسکا،اسی غرض کے لیے میں نے تجلی کے کچھ صفحات شمس نوید عثمانی صاحب کو دے رکھے ہیں؛ لیکن چونکہ وہ خود بہت مصروف آدمی ہیں،اُسی ذمہ داری کو نہیں سنبھال پارہے ہیں،تجلی کو کیسے سنبھال سکیں گے۔بہرحال! میں تلاش میں ہوں۔

ایک بار ادبی تنقید کے موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ مولانا سے کہا گیا کہ آپ یا تو اس میدان میں قلم نہ اُٹھایا کریں، یا اگر اُٹھائیں تو پوری تحقیق کے بعد ایسا کریں۔ اس میں بعض وقت ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں جو کم سے کم آپ کے قلم سے اچھی معلوم نہیں ہوتیں۔ ڈاکٹر انور علی (پرنسپل) نے مولانا کی توجہ تجلی کی ایک ادبی تنقید کی طرف مبذول کراتے ہوئے فرمایا کہ اس میں آپ نے ''باور آنا'' کو محاورہ تسلیم نہیں کیا ہے۔ مولانا کہنے لگے: ''ہاں! یہ محاورہ کب ہے''؛ لیکن ڈاکٹر صاحب نے غالب کے شعر ؎

ضعف سے گر یہ مبدل بہ دم سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

کو سند میں پیش کیا تو موصوف چونک پڑے اور بڑی صفائی سے غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے کہنے لگے کہ بھئی! کمال ہے اس شعر کی طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا۔ ہم لوگوں نے کہا مولانا غلطیاں تو سب سے ہو جاتی ہیں؛ مگر آپ کے قلم سے ایسی باتیں دیکھنے کو طبیعت نہیں چاہتی۔ آپ ادبی مسائل کو ہاتھ نہ لگائیں تو اچھا ہے خود آپ کا اپنا میدان ہی کیا کم ہے۔

چونکہ مشاعرہ ۲؍جنوری کو ہونے والا تھا؛ اس لیے یکم جنوری کی شام کو شعراء کو سمندر کے کنارے واقع لائٹ ہاؤس کی سیر کرانے لے جانے کا پروگرام بنالیا گیا۔ ایک ٹیکسی کرائے پر لی اور تمام شعراء کو لے کر لائٹ ہاؤس کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس وقت مولانا کے علاوہ جناب حفیظ میرٹھی، شمسی مینائی، ناظم ناگپوری اور مولانا منصور علی ندوی ہمارے ساتھ تھے۔ کار جس سڑک پر دوڑ رہی تھی وہ ایک پہاڑ کی وادی کے سہارے ناگن کی طرح بَل کھاتی چل رہی تھی، سڑک کے ایک طرف ایک پہاڑی سلسلہ سمندر تک چلا گیا تھا تو دوسری طرف وادی میں ناریل کے درخت سر اُٹھائے کھڑے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کہ پہاڑ کی بلندی سے شکست کھانے کو تیار نہیں ہیں اور جھوم جھوم کر اس کی سختی اور بے حسی کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ انھیں درختوں کے درمیان سے ایک صاف وشفاف ندی بھی جھومتی اور اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی سمندر کی بے کرانی میں مل کر بے کراں بننے کے لیے آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی، گویا کہ سمندر کی آغوش میں سما کر زندگی کی سب سے بڑی مسرت حاصل کرنا چاہتی ہے۔

ایسے پُر بہار ماحول میں چند شاعر جمع ہو جائیں تو بھلا وہ خاموش کیسے رہ سکتے ہیں؛ چنانچہ کار کے اندر ہی موبائل مشاعرہ شروع ہو گیا۔ کار فراٹے بھرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی، قدرتی مناظر کسی پردۂ فلم کی طرح مسلسل بدل رہے تھے، کار میں مزاحیہ شاعر ناظم ناگپوری غزل سرائی شروع کر چکے تھے۔ ماحول کی جادوگری غزل کا مزاح اور ترنم کی چاشنی نے مل کر عجیب لطف پیدا کر دیا تھا۔ پھر کار کے چلنے کی آواز اور ہوا کی سرسراہٹ بیک میوزک بنے ہوئے تھے سارے ہی ہم سفیر بڑی فیاضی سے داد دے رہے تھے کہ یکا یک گاڑی ایک جھٹکے سے

رُکی، تب معلوم ہوا کہ ہم لائٹ ہاؤس پہنچ گئے ہیں، ڈرائیور نے اُتر کر کار کا دروازہ کھولا اور سب لوگ کار سے اُتر پڑے، ہمارے ایک طرف ایک پہاڑ کھڑا تھا، جس کی بلندی پر لائٹ ہاؤس کا منار کھڑا سمندری ٹریفک کی رہنمائی کر رہا تھا تو دوسری جانب بڑے انداز و دلربائی کے ساتھ ندی سمندر سے ہم آغوش ہو رہی تھی۔ندی کا بہاؤ برائے نام ہی تھا،گویا کہ طویل مسافت طے کرنے کی وجہ سے اتنی چور ہوگئی ہے کہ مزید چلنے کی سکت اس میں باقی نہیں رہی۔ یہ ملاپ بھی عجیب سحر انگیز تھا۔ایک طرف سمندر اپنی ساری وسعتوں کے ساتھ آگے بڑھ کر استقبال کر رہا تھا،تو دوسری طرف ندی نے بڑی معصومیت کے ساتھ اس کی گود میں جانے کے لیے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیئے تھے؛ کیونکہ ندی کی منزل آچکی تھی اور اس کا مقصدِ حیات حاصل ہو رہا تھا۔

کار سے اُتر کر ہم لوگ پہاڑ پر بنی سڑک کے ذریعہ لائٹ ہاؤس جانے کے لیے روانہ ہو گئے۔اس سحر انگیز منظر سے مولانا سب سے زیادہ متاثر معلوم ہو رہے تھے۔دو تین بار مرحوم نے فرمایا کاش کہ میں اپنا کیمرہ لے آتا اور ان مناظر کے فوٹو لے لیتا۔ یہ بار بار دیکھنے کو کہاں ملیں گے"۔میں نے کہا: مولانا! آپ نے فرمایا ہوتا تو کیمرہ کا انتظام بھی ہو جاتا۔کہنے لگے: "یہ کس کو معلوم تھا کہ یہاں ایسے مناظر بھی ہیں"۔تھوڑی دیر میں کہنے لگے: "ہم لوگ شمالی ہند میں بیٹھ کر ان مناظر کا تصور بھی نہیں کر سکتے،یہ مناظر تو غزل کی جان ہیں،شاید اسی لیے اُردو غزل کی ابتدا جنوبی ہند سے ہوئی ہے۔" اسی قسم کی گفتگو ہوتی رہی، یہاں تک کہ ہم لائٹ ہاؤس کے پاس پہنچ گئے۔ یہ پہاڑ کی چوٹی پر بنا ہوا ایک منارہ ہے جس کے اوپری سرے پر ایک بہت بڑی سرچ لائٹ لگی ہوئی ہے،جو اپنی کیلی پر مسلسل گھوم کر دُور سمندر سے گزرنے والے جہازوں کی رہنمائی کرتی ہے۔مینارہ کے اندر جانے کے لیے انچارج انجینئر سے گفتگو کی،مینارہ کا دروازہ کھلے رہنے کا وقت ختم ہونے کے باوجود انجینئر نے دروازہ کھول کر ایک ایک کو اوپر لے جا کر دکھایا۔اتنا اونچا پہاڑ چڑھنے کے بعد بھی مولانا مینارہ کی پتلی لوہے کی سیڑھی پر چڑھ گئے اور اوپر جا کر سب دیکھ بھال کر آئے۔اسی مینارہ کے پاس ایک دوسرا مینارہ ہے،جس میں سمندر کی سمت اوپر سے نیچے کئی لاؤڈ اسپیکر کے ہارن لگے ہوئے ہیں۔انجینئر نے بتایا کہ جب سمندر کے ساحل میں طوفان ہوتا ہے تو ان ہارنوں سے مخصوص قسم کی آواز پیدا کر کے سمندر سے گزرنے والے جہاز کے کپتان کو اطلاع دی جاتی ہے،تا کہ وہ اپنا جہاز اور گہرے سمندر میں لے جا کر طوفان سے محفوظ کر لے۔اسی پہاڑ پر سمندر کی سمت ایک مستطیل (Rectangular) سفید روشنی لگی ہوئی ہے،جس میں کئی رنگین دھاریاں بنی ہیں،انجینئر نے بتایا کہ اس کی روشنی سمندر کے اندر تقریباً ۱۳ ر میل دو سطح آب پر اُبھری ہوئی چٹانوں پر پڑتی ہے،تا کہ کوئی جہاز غفلت میں اس سے ٹکرا کر پاش پاش نہ ہو جائے۔مولانا بھی ان ساری چیزوں کو بڑے غور اور دلچسپی سے دیکھتے رہے۔ پہاڑ کے اوپر ہی سے جب دائیں بائیں دیکھا تو حد نگاہ تک ناریل کے باغات پھیلے ہوئے نظر آئے،ایسا محسوس ہوتا تھا گویا کہ یہ درخت سمندر کے محافظ

چوکیدار ہیں، جو اپنے تنوں کی سینگیں لیے ہوئے لائن بنا کر حکم کے منتظر کھڑے ہیں۔ یہ سب دیکھنے کے بعد ہم سمندر کی طرف اُترنے کے لیے مُڑے ہی تھے کہ دیکھتے ہیں کہ مولانا تقریباً بھاگنے کی رفتار سے سمندر کی طرف اُترتے چلے جا رہے ہیں، میں نے پکار کر کہا: ''مولانا خدا کے لیے اپنے او پر رحم کیجیے اور سنبھل کر چلیے، اگر پیر پھسل گیا تو آپ سمندر میں نظر آئیں گے۔'' مگر مولانا کہاں سننے والے تھے، میں نے پھر کہا: ''اگر آپ اپنے او پر رحم نہیں کرتے تو ہم پر رحم کیجیے، ایسا نہ ہو ہمارا مشاعرہ بزمِ مشاعرہ کے بجائے جلسۂ تعزیت بن جائے۔'' اس پر بھی مولانا نے کان نہیں دھرا، تب میں نے پھر کہا: ''مولانا کم از کم تجلی کے لیے زندہ رہیے، ہمیں اس کی زیادہ ضرورت ہے''۔ مگر وہ اسی رفتار سے چلتے رہے، یہاں تک کہ ایک مسطح چٹان پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ میں سوچتا ہی رہ گیا کہ اس بوڑھے جسم اور مٹھی بھر گوشت سے محروم ہڈیوں کے اندر اتنا جوان دل اب بھی دھڑک رہا ہے، اگر بڑھاپا اسی کو کہتے ہیں تو اس کی تمنا کرنی چاہیے، وقت چونکہ تنگ ہو رہا تھا، اس لیے عصر کی نماز پڑھنے کا ارادہ کر کے شیریں پانی کے چشمے پر ہم لوگ وضو کرنے بیٹھ گئے، دیکھتے کیا ہیں، مولانا سمندر کے پانی کے قریب کائی جمی ہوئی چٹان پر ایک جگہ بیٹھ گئے، جہاں سمندر کی موجیں آب رسانی کا کام کر رہی تھیں، سمندر میں، اس وقت تموّج زوروں پر تھا، ایک بدمست موج نے چٹان سے سر ٹکرایا اور اس کے او پر اس طور سے چڑھتی چلی آئی کہ مولانا گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے کپڑے تو بھیگ گئے؛ لیکن بات یہیں تک رہی ورنہ خطرہ کی گھنٹی تو سنائی دینے لگی تھی، جب وضو کر کے واپس لوٹے تو میں نے کہا مولانا کھاری پانی کے بجائے شیریں پانی ہی سے وضو کر لیتے تو بہتر تھا۔ بلاوجہ خطرہ کو دعوت دینے سے کیا فائدہ؟ کہنے لگے: بھئی! یہاں آ کر بھی شیریں پانی سے وضو کرنا پڑی تو محرومی کی بات ہے۔ شیریں پانی سے تو ہمیشہ وضو کرتے ہی ہیں۔

واپسی پر منصور صاحب نے مولانا سے بیت المال کے اجتماعی قیام کے بارے میں پوچھا، مولانا نے فرمایا: کہ شریعت کا منشا تو اسی سے پورا ہوتا ہے اور اجتماعی بیت المال کی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے؛ مگر اس کے لیے قابل اعتماد اور دیانتدار افراد کا ہونا لازمی ہے، اگر یہ کہیں میسر ہوں تو کیا کہنا۔ کئی جگہ لوگوں نے اس کا انتظام کیا ہے اور اس کے مفید اثرات ظاہر ہو رہے ہیں، دیوبند کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں مرحوم نے کہا کہ اب دیوبند پہلے والا نہیں رہا۔ اس میں کافی تبدیلی آ چکی ہے، اپنے تحقیقی کام اور حوالوں کے لیے وہیں کے دار المطالعہ سے استفادہ کرتا رہتا ہوں، لوگ تجلی کے مُوقف کو پہلے سے زیادہ بہتر طور پر سمجھنے لگے ہیں۔

۲؍جنوری ۷۵ء کو مشاعرہ تھا، پنڈال میں سارے شعراء آ چکے تھے اور سامعین مولانا کو ایک نظر دیکھنے کے لیے بے چین نظر آ رہے تھے۔ مولانا تھوڑی دیر بعد تشریف لائے، جب اناؤنسر نے مولانا کے نام کا اعلان کیا، وہ مائک کے پاس پہنچ گئے، طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے معذرت کرتے ہوئے چند قطعات اور ایک غزل

سنانے کی اجازت چاہی اور پڑھنا شروع کر دیا؛ لیکن شروع کرنے کے بعد غالباً بھول ہی گئے کہ معذرت بھی کر چکے ہیں۔ کئی قطعات، رباعیات اور غزلیات سناڈالیں اور غیر معمولی طور پر داد وصول کی، ٹیپ ریکارڈر کے ایک پورے کیسٹ میں مولانا چھائے ہوئے ہیں، جسے اب بھی کبھی کبھی سُن کر یاد تازہ کر لیتے ہیں۔ پڑھتے وقت مولانا کا ایک فوٹو بھی لے لیا گیا، اس پر مولانا نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا۔ مشاعرہ صبح پانچ بجے تک جاری رہا، اور مرحوم بھی اسٹیج پر موجود رہے، مشاعرہ ختم ہونے کے بعد ہی سارے شعراء کے ساتھ قیام گاہ کی طرف گئے، دوسرے دن بزمِ اُردو نے مہمان شعراء کے ساتھ گروپ فوٹو لینے کا پروگرام رکھا تھا؛ مگر مولانا نے اس میں شرکت کرنا پسند نہیں کیا؛ بلکہ کہنے لگے: آپ نے رات میں جو فوٹو لیا تھا وہی کافی ہے، خود سے فوٹو کھچوانا مناسب نہیں۔

اسی دن مقامی حضرات کی نشست میں مولانا کو سوالات کے جوابات دینا تھے، بھٹکل میں جتنی مساجد ہیں سب میں شوافع ائمہ مقرر ہیں، ایک صاحب نے مولانا سے سوال کیا کہ کیا شافعی امام کے پیچھے حنفی مقتدی کی نماز ہو جاتی ہے؟ مولانا نے اس کا جواب نفی میں دیا اور وجہ یہ بیان کی کہ چونکہ شافعی امام سورۂ فاتحہ کے بعد کچھ دیر وقفہ کر کے قرأت کرتا ہے، جو سکتہ کی تعریف میں آجاتا ہے اور سکتہ سے حنفی مسلک میں نماز فاسد ہو جاتی ہے، جب موصوف سے کہا گیا کہ مولانا علی میاں اور مولانا ابواللیث صاحبانؒ تو نماز پڑھنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے، مولانا کہنے لگے: کہ میں مطمئن نہیں ہوں اور چونکہ اس قسم کا کوئی سوال ابھی تک میرے سامنے آیا بھی نہیں ہے؛ اس لیے اس کی تحقیق کا موقع بھی نہیں مل سکا۔ آپ ایک سوال تجلی کو لکھ دیجیے میں تحقیق کر کے اس کا جواب چھاپ دوں گا، اس سے اندازہ ہوا کہ موصوف فقہی مسلک میں شدت پر عامل تھے اور مکمل تحقیق کے بغیر فقہی معاملے میں بھی رائے دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ واقعہ دراصل ان کے احساسِ ذمہ داری اور علمی بلندی؛ نیز طالبِ علمانہ مزاج کا مظہر ہے۔

۴؍جنوری کو شعراء کی واپسی کا پروگرام تھا؛ مگر بھٹکل کے ایک باذوق نوجوان اور انجمن کے سرگرم رکن جناب عبدالغنی صاحب محتشم نے شعراء کے اعزاز میں ایک ظہرانہ کا اہتمام کر کے مہمانوں کو روکنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب ہو گئے۔ ظہرانہ کے لیے اپنے گھر کے بجائے سمندر کے کنارے بنے ہوئے ایک مقام پر اہتمام کیا گیا۔ تقریباً ۱۲ بجے سب لوگ وہاں پہنچے، یہاں پھر ایک مِنی مشاعرہ وجود میں آگیا؛ مگر گلے کی خرابی کی وجہ سے موصوف کچھ نہیں سنا سکے۔ اس موقع پر مولانا اور حاضرین میں سے ایک صاحب میں کچھ ناپسندیدہ گفتگو ہوگئی، جس کو مولانا نے بڑے ضبط اور عالی ظرفی سے نظر انداز کر دیا، جو اُن کی شانِ بزرگی پر دلالت کرتا ہے؛ لیکن تھوڑی ہی دیر میں انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور بڑی شرافت نفسی کے ساتھ اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے مولانا سے معذرت کر لی۔ جس سے حاضرین کے چہروں پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ دونوں طرف سے جس اعلیٰ اخلاقی و کرداری معیار کا مظاہرہ ہوا ہے وہ قابل مسرت ہی نہیں، قابل تقلید بھی ہے، اگر امتِ مسلمہ کے افراد اسی طرح عالی ظرفی کے ساتھ دوسروں کی غلطیوں کو

نظر انداز کرنے لگیں، دوسری طرف سے بھی غلطی کا احساس ہوتے ہی اس پر شرمساری کے ساتھ معذرت طلبی کا رویّہ اپنایا جانے لگے تو ہمارے بہت سے مسائل پیدا ہی نہ ہوں۔ کاش! کہ لوگ اسی طرح سوچنے کی عادت ڈالیں اور اس پر عمل کرنے لگیں۔ جناب غنی صاحب نے دعوت میں جس سلیقہ مندی اور مہمان نوازی کا ثبوت دیا ہے، اس کا اعتراف تو خود مولانا تجلی کے صفحات میں کر چکے ہیں، کھانوں میں شمالی ہند کے مذاق کو جس طرح ملحوظ رکھا گیا تھا، وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ کاش! کہ بھٹکل کے کچھ اور نوجوان اس دلچسپی کا مظاہرہ کرتے، تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد اس دن شام کو سارے شعراء گوا ہوتے ہوئے اپنے اپنے مستقر کو روانہ ہو گئے۔

ہم سمجھ رہے تھے کہ مولانا دیوبند پہنچ چکے ہوں گے؛ لیکن مولانا کے بمبئی کے لکھے ہوئے خط نے بتایا کہ:

"آج تک ہم یہیں دھرے ہوئے ہیں۔ مسلسل تین مشاعرے ہو چکے ہیں، پڑھتے پڑھتے گلا بیٹھ گیا ہے اور کھاتے کھاتے معدوں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں..... آپ کی پُرخلوص محبت، ضیافت، دوستداری اور بے تکلفی کے نقوش تا دیر دماغ پر مرتسم رہیں گے؛ بلکہ شاید زندگی بھر دُھندلے نہ ہوں..... ایڈیٹر تجلی کی مٹی پلید ہوگئی؛ مگر مجرم کوئی اور نہیں ہے، خود یہی نالائق ہے جو خواہ مخواہ شاعر بن بیٹھا ہے۔ بقول شخصے اس شاعری میں عزتِ سادات بھی گئی۔ گھر والے یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ شاعر صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ خطوط گھر ڈالے جا رہا ہوں، خدا کرے پہنچ رہے ہوں۔ نہ پہنچے تو گھر والے آپ ہی پر "قتل مومن" کا کیس دائر کر دیں گے۔"

(ماخوذ از مکتوب مورخہ ۱۰؍جنوری ۷۵ء بنام ڈاکٹر صاحب)

پھر اس کے بعد موصوف نے دیوبند پہنچ کر تفصیلی خط تحریر کیا، جس میں دیوبند پہنچنے کی رسید کے ساتھ تحریر تھا:

"آپ نے مجھ جیسے "گمنام" شاعر کو اتنی دُور دعوت دی، یہی منجملہ کرم تھا۔ پھر جس خلوص و مودت سے مہمان نوازی کی وہ مستزاد۔ جزوی طور پر مجھے یا کسی کو اگر کوئی معمولی تکلیف پہنچی ہو تو اس کا تعلق آپ کے قصد و ارادے سے نہیں، آپ کی مہمان نوازی، توجہ، قدر افزائی شبہ سے بالاتر ہے اور میں آپ کے حسنِ اخلاق سے بہت متاثر ہوا ہوں۔" (مکتوب مورخہ ۲۳؍جنوری ۷۵ء بنام ڈاکٹر صاحب)

مرحوم نے اس کے بعد پھر دیوبند سے ایک خط میں تحریر کیا:

"جن حالات اور ماحول میں آپ ہیں اس میں سنبھل سنبھل کر چلنا ہی دانشمندی ہے، کام کرنے والوں اور دُور اندیشوں کو گالیاں کہاں نہیں پڑتیں روڑے کہاں نہیں اٹکائے جاتے؛ مگر آپ اللہ کے بھروسہ پر عزم و ہمت کے ساتھ ڈٹے رہیے، اور دین و ملت کی بھلائی کے لیے جو بھی بن آئے کر گزر رئیے۔

بے تکلفانہ ایک بات پوچھنے کو جی چاہتا ہے، بھٹکل کے لیے ناچیز کو مدعو کرنے میں اصلاً آپ اور

طبعاً کالج کے انتظامیہ کے کچھ افراد شریک تھے۔ایڈیٹر تجلی کی حیثیت کو الگ رکھئے، جس میں وہ مدعو کیا گیا تھا اسی کے رخ سے یہ نالائق داعیانِ کرام کی توقعات پوری کر سکا یا نہیں کر سکا؟ ظاہری واہ واہ کی بات الگ ہے، میں قلوب واذہان کے حقیقی تاثرات معلوم کرنا چاہتا ہوں..... جواب بھی اتنا ہی صاف ہونا چاہئے جتنی صفائی خادم اپنی بکواس میں برتتا ہے۔

اہلیہ محترمہ کو بہت بہت سلام۔میرے گھر میں سے بھی انہیں اور آپ کو سلام پیش کرتی ہیں۔بھٹکل دوسرے کرّہ میں واقع نہ ہوتا تو عجب نہ تھا کہ نصف بہتر بغیر دعوت ہی کے آپ کی اہلیہ سے ملنے دوڑی چلی جاتیں۔میں نے انھیں بتادیا تھا کہ بالکل گھر کا سا آرام ملا۔بچوں کو بہت بہت پیار ''کوئی سی بچی'' بہت یاد آتی ہے؛مگر نام نہیں لوں گا ورنہ ''دوسرے'' بُرا مان جائیں گے۔''

(ماخوذ از مکتوب مورخہ ۶ ؍فروری ۵ ۷ ءبنام ڈاکٹر صاحب)

ان اقتباسات سے بھی ملامکیؔ کے قلم کی بازگشت ڈنکے کی چوٹ سنائی دیتی ہے؛مگر ''انداز زباں بندی، کا احترام کرتے ہوئے کچھ نہیں کہا جاتا۔

میں نے اس مضمون کی تیاری میں انھیں واقعات اور گفتگو کا تذکرہ کیا ہے جو خود میرے سامنے ہوئی ہیں، تاکہ مولانا کی سیرت اور مجلسی زندگی میں خلوص، محبت، شفقت، اپنائیت، حلم، بردباری، حوصلہ افزائی اور درگزر جیسی تمام اعلیٰ اخلاقی وانسانی صفات موجود تھیں، تو دوسری طرف دینی، اُصولی اور علمی مباحث میں شدت بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی اور انھیں دونوں صفات کا حسین امتزاج مومن کا مطلوبہ کردار ہے۔بقول علامہ اقبال ؎

ہو محفل یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

موصوف کی یہی صفات ممیزہ ہیں جن کی وجہ سے وہ یاد آتے رہیں گے اور انھیں آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔حال ہی میں مدرسہ سہارنپور کے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہٗ کی ایک کتاب ''فتنۂ مودودیت'' نظر سے گزری، کتاب کے مباحث اور لب ولہجہ علمی سنجیدگی اور عالمانہ وقار سے عاری نظر آیا۔اس میں دیے گئے اقتباسات کا اصل عبارتوں سے موازنہ کرکے دیکھنے پر افسوس بھی ہوا اور حیرت بھی۔مصنف نے کتاب ترتیب دیتے وقت جس بے دردی سے قینچی کا استعمال کیا ہے علمی دنیا اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔جوں توں کتاب آگے بڑھتی گئی، مرحوم کی یاد بھی اسی شدّت سے آتی چلی گئی۔اور اقبال کا شعر ذہنی اُفق پر اُبھر آیا ؎

خزاں میں بھی کب آ سکتا تھا میں صیاد کی زَد میں
مری غماز تھی شاخِ نشیمن کی کم اوراقی

بقول ڈاکٹر انور علی، ایسی صورت میں یہی کہا جاسکتا ہے۔

خوشی ہے بزم خرد میں کہ آج دیوانے
صلیب و دار سے مقتل سے ہمکنار ہوئے

اس لیے کہ۔

حقیقتوں کے سمجھنے کی کب انھیں فرصت
بنا کے شیش محل صاحب نگار ہوئے

جی چاہا، کاش! کہ مرحوم بقید حیات ہوتے تو کتاب کے تبصرہ کا حق ادا کر دیتے؛ اس لیے کہ ایسی کتابوں پر علمی محکمہ کرنے کے لیے وسعتِ مطالعہ کے ساتھ جس تعمق نظر اور جرأت کی ضرورت ہے وہ مرحوم میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ جغرافیہ بتانے میں تو مرحوم کو خاص ملکہ حاصل تھا، ایسے معاملات جب بھی سامنے آئیں گے، مرحوم یاد آتے رہیں گے۔

مولانا اگرچہ ہمارے درمیان نہیں رہے؛ لیکن ان کے علمی کارنامے بہر حال ہمارے پاس موجود ہیں، اِس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مضامین کے انتخاب مرتب کیے جائیں، فتاویٰ علیحدہ چھاپے جائیں، تجلی کے خاص نمبروں کو کتابی شکل دی جائے، مکتوبات جمع کیے جائیں اور مجموعہ کلام شائع کر کے محفوظ کرنے کی کوشش کی جائے، تا کہ خود بھی فائدہ اُٹھا سکیں اور آئندہ نسلوں کو بھی منتقل کیا جاسکے؛ کیونکہ ایسے قلم کار صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

خدا تعالیٰ مرحوم کے مدارج بلند کرے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

کیا ہی بہتر ہوا گر مرحوم کی لوح تربت پر انھیں کا قطعہ کندہ کر دیا جائے، جو انھوں نے مرنے سے ایک گھنٹہ قبل پونا کے مشاعرے میں سنایا تھا۔ اس میں عبرت و موعظت اور مومنانہ بصیرت کے ساتھ ساتھ حیات و کائنات کے چہرے سے بھی پردہ اُٹھایا گیا ہے۔

دھرا کیا ہے کراہوں کے سوا دنیا کے دامن میں
میں کیوں روؤں، مجھے کیا غم اگر تارِ قفس ٹوٹا
میری میّت پہ عامرؔ نوحہ گر ہیں جسم کے قیدی
مگر میں مسکراتا ہوں کہ مدّت میں قفس ٹوٹا

پروفیسر عمر حیات غوری
صدر شعبہ اردو انجمن کالج بھٹکل

حضرت مولانا شمس نوید عثمانیؒ

مطالعہ کا شوق اور علمی مزاج رکھنے والا کوئی بھی شخص مولانا شمس نوید عثمانی کی کتاب ''کیا ہم مسلمان ہیں'' سے نا آشنا نہیں ہوگا۔ پُرسوز و پُرخلوص ادبی تحریروں کا یہ مجموعہ جس نے بھی پڑھا ہے اس کی آنکھوں سے آنسو ضرور جاری ہوئے ہیں۔تحریر کی یہ تاثیر مولانا شمس نوید عثمانی کے اخلاص،تقویٰ اور زہد کا ثمرہ ہے۔مولانا کے بارے میں یہاں زیادہ تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں ہے، بس آپ اتنا جان لیں کہ گزشتہ پچاس ساٹھ سال میں دیوبند کیا پورے ملک میں بھی سنتوں پر اس درجہ شدت کے ساتھ عمل کرنے والا دیکھنے میں نہیں آیا۔اپنی زندگی کو اسوۂ نبی کے طرز پر خالص صحابہ کی طرح بسر کرنے والا ہم نے ان کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔صوم وصلاۃ کے پابند تو لاکھوں مل جاتے ہیں؛لیکن زندگی کے ہر گوشے میں رسول اللہ اور صحابہ کرام کے اُسوۂ کو برتنا مولانا شمس نوید عثمانی کی حیات کا مقصد تھا۔

آپ مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانی کے سب سے چھوٹے بھائی ہیں ۱۹۲۷ء میں دیوبند ہی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دارالعلوم میں ہوئی پھر لکھنؤ سے عصری تعلیم کی سند حاصل کرکے رامپور اسٹیٹ کے مدرسہ عالیہ میں ملازم ہوئے۔''کیا ہم مسلمان ہیں؟'' کے عنوان سے آپ کا مضمون ہر ماہ ماہنامہ'' تجلی'' میں شائع ہوتا تھا، جسے تمام قاری بڑے شوق اور اخلاص کے ساتھ پڑھتے تھے۔

آپ کا اصل مقصد غیر مسلموں میں دین کی دعوت دینا تھا، اس سلسلے میں آپ نے بہت سے پروگرام کیے اور ایک تحقیقی کتاب ''اگر اب بھی نہ جاگے تو'' کے نام سے تحریر کی۔ ۱۹۸۷ء میں اس کتاب کا پہلا ایڈیشن آیا تھا، اُس وقت اس کتاب نے ایک کہرام مچادیا تھا اور مشرکین کے لیے یہ کتاب آج بھی ایک چیلنج ہے۔ بہر حال! دیوبند کے عثمانی خاندان کے یہ ایک مایا ناز فرد ہیں جو گمنامی میں رہے۔زندگی رہی تو ان شاءاللہ پھر کبھی ان کے بارے میں تفصیل سے کلام کروں گا۔آپ کا انتقال ۱۹۹۳ء میں ہوا۔

حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہٗ

ہمیں تعجب ہے کہ کوئی عالم دین اس درجہ لاپرواہ اور خارج از دیانت بھی ہوسکتا ہے، دارالعلوم کی تاریخ مرتب کرنے والے فاضل مرتب نے بہت سارے نااہل اور بے وقعت لوگوں کا تذکرہ فقط جذبۂ چاپلوسی میں کرتے ہوئے دارالعلوم اور دیوبند کے ایسے ایسے اہم لوگوں کا ذکر چھوڑ دیا ہے جن کی حیثیت علمی اور عملی دونوں اعتبار سے قابل قدر اور قابل تحسین ہے۔ بلاشبہ فاضل مرتب کے اس عمل کو جہالت یا کم علمی تو نہیں کہہ سکتے؛ کیونکہ جو شخص تاریخ پہ کام کر رہا ہو اس کا مطالعہ اتنا قلیل اور معلومات اتنی کم تو نہیں ہوسکتیں، کہ اُسے مولانا عامر عثمانیؒ جیسے

معروف ترین انسان کا علم نہ ہو۔ اور دارالعلوم کی تاریخ پہ کام کرنے والے کو دارالعلوم میں پڑھانے والے کثیر التصانیف مفتی کا خیال تک مشاہیر دارالعلوم تحریر کرتے ہوئے نہ آئے۔ فاضل مرتب کا یہ عمل یقیناً تعصب اور غیر ذمہ داری کا مظہر ہے۔

جس کثیر التصانیف مفتی کا ذکر ہم کر رہے ہیں وہ مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی دامت برکاتہم ہیں کہ آپ نے سالہاسال دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات بھی انجام دی ہیں؛ لیکن دارالعلوم کی جدید تاریخ مرتب کرنے والے فاضل مرتب نے حضرت مفتی صاحب کا نام تک ۵۲۷ صفحات کی ضخیم کتاب میں کہیں لکھنا گوارا نہیں کیا۔

حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی ۱۹۳۷ میں دیوبند میں پیدا ہوئے اور دارالعلوم کے اوّل مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کے پوتے اور قاری جلیل الرحمٰن عثمانیؒ کے بڑے صاحبزادے ہیں، ۱۹۵۲ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، ۱۹۶۲ میں الجامعۃ الاسلامیہ مدینہ منورہ سے القسم العالی کا کورس مکمل کر کے ۱۹۶۵ میں علی گڑھ یونیورسٹی سے انگریزی زبان میں ہائی اسکول پاس کیا۔ آپ نے ۱۳۸۰ سے ۱۳۹۲ھ تک دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دیں، اس کے بعد آپ دیوبند چھوڑ کر پنجاب چلے گئے اور ۱۹۷۳ سے ۲۰۰۴ تک مفتیِ پنجاب کے عہدے پر فائز رہے۔

آپ نے مختلف موضوعات پر پچاس سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں، جن میں چند اہم کتابیں یہ ہیں: مسلم شریف کی شرح "تفہیم المسلم" کا ابتدائی حصہ، تذکرہ امام مسلم، دربارِ رسالتؐ اور ہماری مجلسیں، عورت اور مرد اسلام کی نظر میں، شادی مبارک، اسلام اور آدم، بندگی اور زندگی، اسلامی قانون، معمارِ انسانیت، حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ ایک شخصیت، جب رشتہ ٹوٹتا ہے، خطباتِ عثمانی، تفسیر روح القرآن جلالین شریف کی مکمل تفسیر، اسلام، اسلامی فکر اور مسلکِ دیوبند، وہ بندۂ مولا صفات، اسلامی عقیدے، اسلام نے عورت کو کیا دیا، تفسیر نور القرآن"۔

دیکھ لیجیے قارئین! جو شخص مفسر قرآن ہے، مفتیِ اعظم پنجاب ہے، دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دے چکا ہے، جس نے عربی و اُردو میں متعدد کتابیں تصنیف کر کے امت کے لیے ایک علمی ذخیرہ جمع کر دیا ہے، ایسے فعال اور مخلص انسان کا تذکرہ فاضل مرتب نے نہیں کیا۔

اب اسے بھول تو نہیں کہا جا سکتا، زیادہ سے زیادہ جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہی ہے کہ خوش نصیبی سے حضرت مفتی صاحب بھی علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے خانوادے کے فرد ہیں، اسی لیے اسی خاندان کے افراد کو فاضل مرتب نے دانستہ نظرانداز کیا ہے؛ کیونکہ دارالعلوم دیوبند کے عنوان پر اس خاندان کے افراد کی خدمات اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا تذکرہ کرنے میں ایک دو نہیں، بہت ساری شخصیات کا نام آجاتا ہے، اور فاضل مرتب جس خاندان کی چاپلوسی کر رہے ہیں، اس کے سامنے انھیں کسی اور کی خدمات کا اعتراف و اظہار کرنا ہے نہیں۔ اسی لیے

موصوف نے یہی روش اختیار کی کہ مولوی اسعد مدنیؒ جیسے نااہل اور علمی صلاحیت سے محروم شخص کو تو امیر الہند، فدائے ملّت اور نہ جانے کیا کیا بنا کے پیش کیا اور جو لوگ تاریخ کا اصل حصہ ہیں ان کو فراموش کر دیا۔

بہر حال! درج بالا حضرات کے علاوہ فاضل مرتب نے دَورِ حاضر کی جن اہم شخصیات کا ذکر اپنی غیر ثقہ کتاب میں نہیں کیا ہے ان کا تعارف موجودہ دَور کے علماء میں ضرور کرنا چاہیے تھا، ہم چند وہ نام لکھ رہے ہیں، جن کا ذکر کیے بغیر دَورِ حاضر میں نہ تو دارالعلوم کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے اور نہ ہی دیوبند کی۔

حضرت مولانا قمر عثمانی (استاذ دارالعلوم وقف دیوبند)، حضرت مولانا قاری ابوالحسن اعظمی (رکن رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ و سابق شیخ القراء دارالعلوم دیوبند)، حضرت مولانا مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی (سابق مفتی دارالعلوم دیوبند)، حضرت مولانا حسن الہاشمی (مدیر ماہنامہ طلسماتی دنیا دیوبند)، حضرت مولانا ندیم الواجدی (۵۰ سے زائد کتابوں کے مصنف و نامور ادیب)، حضرت مولانا نسیم اختر شاہ قیصر (استاذ دارالعلوم وقف دیوبند اور ۲۰ کتابوں کے مصنف)، حضرت مولانا عبید اقبال عاصم (کئی کتابوں کے مصنف)، حضرت مولانا حسیب صدیقی (سابق چیئرمین دیوبند، دارالعلوم دیوبند کا بجٹ پیش کرنے کے علاوہ آپ ایک بہترین منتظم اور ماہر حساب ہیں)، مولانا مفتی یاسر ندیم الواجدی دَورِ حاضر کی اہم شخصیت۔

ہائے یہ چاپلوسی!

قارئین! کتاب اختتام پر آ گئی ہے؛ لیکن فاضل مرتب کی چاپلوسی میں ذرہ برابر کمی نہیں ہے۔ صفحہ نمبر ۵۳۸ پہ موجودہ دَور کے علماء و اکابر کا تذکرہ کرتے ہوئے موصوف نے مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوریؒ کا تعارف پیش کیا ہے اور کہنا چاہئے واقعی کیا تعارف دیا ہے، جھوٹ اور غلو آمیز شخصیت پرستی کی ایسی مثال آپ کو بہت کم دیکھنے کو ملے گی۔

ہم ساڑھے چار صفحات پر مشتمل مکمل تعارف کو یہاں نقل نہیں کریں گے؛ البتہ چند نمونے آپ کو ایسے دکھائیں گے، جن سے آپ فاضل مرتب کی گل افشانیوں کا مظاہرہ ضرور کر سکیں گے۔ صفحہ نمبر ۵۴۰ پہ فاضل مرتب قصیدہ خواں ہیں:

> ''حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے دارالعلوم کی زمام اہتمام ایسے وقت میں سنبھالی جب وہ شدید خلفشار کے طویل دَور سے پوری طرح نکل نہیں سکا تھا؛ کیونکہ اس کے منفی اثرات کا تسلسل ہنوز باقی تھا، ایسے حالات میں سارے انتظامی شعبوں کو ازسرنو استوار کر کے انھیں سرگرم سفر کرنا، ملازمین و مدرسین کا اعتماد بحال کرنا اور طلبہ کو اپنے مقصد کی راہ پر سرگرم عمل ہونے کے لیے قدرتی فضا بنانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔''

حالات کا رونا روتے ہوئے فاضل مرتب نے جوئے شیر تو نکلوادی؛ لیکن پوری کتاب میں ایک سطر بھی اُس شدید خلفشار کے طویل دَور کی وضاحت کے لیے نہیں لکھی۔ کیا خلفشار تھا؟ کیسا طویل دَور تھا، جس کے سبب مہتمم صاحب کو جوئے شیر لانا پڑی؟ آخر کیوں فاضل مرتب نے اُس دَور کے احوال درج نہیں کیے ہیں۔ ہم بتاتے ہیں؛ کیونکہ وہ دَور دارالعلوم کی تاریخ کا سیاہ باب ہے اور دارالعلوم کے نام پر یہ سیاہ داغ لگانے والے وہی ہیں جن کی چاپلوسی میں فاضل مرتب سرتاپا لگے ہوئے ہیں۔ مولوی اسعد مدنی ؒ۔ جی ہاں! صد سالہ اجلاس کی کامیابی کے بعد دارالعلوم پہ جو قبضہ کیا گیا، اس کے حالات کتاب کے ابتدائی حصہ میں آپ پڑھ ہی آئے ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ایمانداری سے تاریخ مرتب کی جاتی تو وہ تمام حالات بھی درج کرنے تھے جو بلا شبہ دارالعلوم کی تاریخ کا حصہ ہیں؛ لیکن چاپلوسی کرنے والے حق بیانی سے کام نہیں لیتے۔ خیر آگے چلیے اسی صفحہ ۵۴۰ پہ آگے لکھتے ہیں:

”آپ کے دَورِ اہتمام میں تعلیمی معیار کی بلندی اور بہتری پر خصوصی توجہ دی گئی، اسی پس منظر میں عربی چہارم تک تعلیم کے لیے مدرسہ ثانویہ کا مضبوط نظم قائم کیا گیا اور ٹھوس بنیادی تعلیم کی طرف توجہ دی گئی“۔

اس کے بعد صفحہ ۵۴۱ پہ رقمطراز ہیں:

”آپ کے دَورِ اہتمام میں کئی اہم اور شاندار عمارتیں بھی تعمیر ہوئیں اور دارالعلوم کا زمینی رقبہ دوگنے سے زیادہ ہوگیا“ ”مسجد رشید، دارالتربیت، مدرسہ ثانویہ، دارالمدرسین، رواقِ خالد، شیخ الہند منزل، آسامی منزل، حکیم الامت منزل“ وغیرہ عمارتیں اسی دَور میں تعمیر ہوئیں“۔

قارئین! اب ہم کیا وضاحت کریں، اس کی حقیقت آپ مولانا وحید الزماں کیرانوی صاحب ؒ کے مضامین میں پڑھ ہی آئے ہیں، جن تعمیرات کو فاضل مرتب مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب ؒ کی طرف منسوب کر رہے ہیں، ان میں سے زیادہ تر تعمیرات مولانا وحید الزماں کیرانوی صاحب ؒ کے منتظم ذہن کی دین ہیں۔ ہنسی آرہی ہے درج بالا جھوٹ پڑھ کر، کہ کس ڈھٹائی کے ساتھ مولانا وحید الزماں صاحب ؒ کی محنت اور کارگزاری کو مہتمم صاحب ؒ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

اس کے بعد صفحہ ۵۴۲ پہ سطر نمبر تین اور چار میں لکھا ہے:

”امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند کے بعد آپ متفقہ طور پر امیر الہند ثالث منتخب ہوئے اور ہندوستان کی ملّتِ اسلامیہ کی قیادت و امارت کا فریضہ انجام دیا۔ مختلف کانفرنسوں اور اجلاسات میں آپ کے پیش کردہ خطباتِ صدارت کا مجموعہ طبع ہو چکا ہے۔“

پہلی بات تو یہ ہے کہ خود ساختہ القاب کو پوری امت پہ ثبت ہی نہیں کیا جاسکتا۔ مولوی اسعد مدنی ؒ کو کس نے

امیر الہند بنایا تھا، کم سے کم ہم نے تو نہیں، اور پھر مولانا مرغوبؒ فقط چند لوگوں کے کہنے سے پورے ہندوستان کے امیر کیسے بن جائیں گے، یہ خود ساختہ القابات کا سلسلہ دیوبند میں اس درجہ بڑھتا جارہا ہے کہ حد اور بس، کوئی خاتم المحدثین بن جاتا ہے، تو کوئی فدائے ملت۔ حیف صد حیف

رہی بات مولانا کے خطباتِ صدارت کی، تو مولانا کے اندر نہ تو تقریر کرنے کی صلاحیت تھی اور نہ ہی کچھ تحریر کرنے کی۔ یہ تمام خطبات دوسرے شخص کے لکھے ہوئے ہوتے تھے، جنھیں مولانا فقط بیان کرتے تھے، اس میں کوئی دورائے نہیں ہے، مولانا مرغوب الرحمٰنؒ بلاشبہ ایک شریف الطبع آدمی تھے، مرنجا مرنج شرافت کے پُتلے تھے، یہ حقیقت ہے کہ آپ خالص بے ضرر اور اچھے انسان تھے؛ لیکن یہ کیا ستم ہے کہ بلاوجہ کے القاب لگا کر انھیں ایک زبردست شخصیت باور کرایا جائے، جو خوبیاں ان میں نہیں تھیں؛ کیوں ان سے منسوب کی جارہی ہیں، آخر اس شخصیت پرستی سے دیوبند والے کب نجات حاصل کریں گے۔ اُن کے ساتھ رہنے والا ہر ایماندار، ہوش مند جانتا ہے کہ کوئی علمی صلاحیت یا انتظامی لیاقت ان کے اندر قطعاً نہیں تھی۔ مولانا ایک صفحہ تحریر کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے اور تقریر تو کبھی انھوں نے اچھی کی ہی نہیں، ایسے بولتے تھے کہ سامعین یا تو سوجاتے تھے یا چلے جاتے تھے یا پھر بے چارے از راہِ عقیدت بور ہوتے ہوئے بس بیٹھے رہتے تھے۔

یہ تمام باتیں ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں۔ نہ ہی یہ بے جا الزام ہیں؛ بلکہ یہ وہ حقائق ہیں جن کی تصدیق مولانا وحید الزماں کیرانوی صاحب کے مضمون میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ اگر مولوی مرغوب الرحمٰن صاحبؒ میں انتظامی صلاحیت ہوتی تو مولانا وحید الزماں صاحب کو ان کا معاون و مددگار نہ بنایا جاتا۔ جیسے دارالعلوم کے ابتدائی دَور میں حافظ محمد احمد صاحب کے اندر انتظامی صلاحیتوں کا فقدان دیکھ کر مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب نے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحب کو مددگار مہتمم بنایا تھا۔ ہم نے ابتدا میں بھی لکھا تھا، یہاں پھر درج کردیتے ہیں کہ مدد اُسی کی کی جاتی ہے جو کمزور ہوتا ہے، امداد کے قابل ہوتا ہے۔

بہر حال جن مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ کے دَورِ اہتمام کو فاضل مرتب نے مثالی بتایا ہے اس کی حقیقت کیا ہے، اس کے لیے ہم آپ کے سامنے ماہنامہ ''طلسماتی دنیا'' سے وہ خطوط یہاں نقل کر رہے ہیں، جو مولانا حسن الہاشمی صاحب نے دارالعلوم کے اہتمام میں ہو رہی خرابی کو دیکھ کر مولانا کے نام لکھے تھے، ان خطوط کو پڑھ کر آپ کے سامنے ساری حقیقت آئینہ ہوجائے گی، یہ جو مولوی مرغوب الرحمٰنؒ اور اُن کے دَورِ اہتمام کو فاضل مرتب نے جھوٹ بول کر مثالی بتایا ہے اصل میں اس کی سچائی کیا ہے، ہماری نہیں؛ بلکہ دارالعلوم کے پرانے فاضل اور دیوبند کے ایک معتبر عالم دین کی شخصیت کے طور پر مشہور زمانہ کی زبانی سنیے۔

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم
مولانا مرغوب الرحمٰن کے نام کھلا خط

حضرت! یہ کھلا خط لکھنے کی نوبت اس لیے آئی کہ میرے کئی خط آپ کے اُن چمچوں نے جو محض اپنے مفادات کی تکمیل کی خاطر آپ پر بھنوروں کی طرح منڈلاتے ہیں آپ تک پہنچنے نہیں دیئے کیونکہ ان خطوط کو پڑھنے کے بعد اگر آپ کی آنکھیں کھل جاتیں اور آپ اپنی غفلت سے بیدار ہو جاتے تو اس کا سب سے بڑا نقصان اُن لوگوں کو ہوگا جو ہر وقت آپ کی جی حضوری میں لگے رہتے ہیں اور آپ کی خوشامد اور چاپلوسی کر کے آپ کو اصل حالات سے بے خبر رکھتے ہیں۔ مجھے ایسی کوئی بڑی خوش فہمی آپ کے بارے میں نہیں تھی کہ آپ میرے خطوط پڑھ کر ایک دم بیدار ہو جائیں گے اور اُن خرابیوں کی اصلاح کرلیں گے جو آپ کے دورِ اہتمام میں تاحدِ نظر دارالعلوم دیوبند میں پھیلی ہوئی ہیں کیونکہ یہ خرابیاں اگر منجانب اللہ بطورِ سزا ہیں تو ان سے آپ کو نجات ملنا ممکن نہیں ہے لیکن ہلکی سی ایک اُمید تھی کہ شاید میرے خطوط پڑھ کر آپ کو اِس عمر میں جبکہ آپ کا سفرِ آخرت بہت قریب ہے اپنی کوتاہیوں کا احساس ہو جائے اور آپ اِس جہاں سے رخصت ہونے سے پہلے تائب ہو جائیں اور اپنے احوال پر نظرِ ثانی کرلیں لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ کی ڈاک بطورِ خاص چیک ہوتی ہے اور وہ ڈاک آپ تک نہیں پہونچائی جاتی جو اربابِ مفادات کو نقصان پہونچانے والی ہو۔ آپ کی طرف سے جب ایک طویل مدت تک مجھے کوئی جواب نہیں ملا تو میں نے آپ کے نام کھلے خط لکھنے کا ارادہ کیا۔ یہ میرا پہلا خط ہے ان شاء اللہ میں آپ کو پندرہ خط لکھوں گا۔

یادش بخیر ۱۹۸۱ء میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر یہ الزام تھا کہ وہ اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے دارالعلوم کے نظام کو صحیح معنوں میں نہیں چلا رہے ہیں اور کچھ لوگ حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی گرتی ہوئی صحت کا فائدہ اُٹھا کر دارالعلوم دیوبند کو نقصان پہونچا رہے ہیں اور رقومات میں خرد برد کر رہے ہیں۔ یہ الزامات اُن لوگوں کی طرف سے تھے جو کسی نہ کسی درجہ میں شریف اور خدا ترس سمجھے جاتے تھے جبکہ ایک طبقہ ایسا بھی تھا براہِ راست حضرت قاری طیب رحمۃ اللہ علیہ ہی کو موردِ الزام ٹھہراتا تھا؛ چنانچہ دارالعلوم دیوبند کی یہ بدنما تاریخ ہے کہ کچھ بے ایمان اور شرّی قسم کے لوگوں نے حضرت قاری طیب صاحبؒ پر بیس ہزار روپے کے غبن کا الزام لگایا اور انہیں عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا۔

آج کی صورتِ حال یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں خرد برد ہو رہا ہے۔آج سے کچھ ماہ قبل سات لاکھ روپئے کی رقم دارالعلوم دیوبند کے خزانے سے نکل کر سیدھی بجنور تک گئی اور اس رقم سے بجنور میں پلاٹوں کا کاروبار ہوا۔ یہ رقم اسی طرح نکالی گئی ہوگی جس طرح حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ اہتمام میں کسی نے کسی طرح حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دستخط حاصل کر کے خزانہ دارالعلوم سے نکالی تھی۔فرق صرف اتنا ہے کہ قاری طیب صاحب کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کرنے والا ایک گروہ دارالعلوم میں تھا اور آج آپ کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کرنے والا کوئی شخص دارالعلوم میں موجود نہیں ہے۔ حالانکہ آپ کی بھول قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بڑی ہے۔حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دَور میں فائدے اُٹھانے والا حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کوئی رشتہ دار نہیں تھا اور اس سات لاکھ روپے سے فائدہ اُٹھانے والا خود آپ کا اپنا خون ہے۔کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی بھی انسان اپنی چالاکی سے یا اپنی مضبوط لاٹھی کی بنا پر عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہونے سے محفوظ رہا تو وہ آخرت کی عدالت میں بھی حساب وکتاب سے محفوظ رہے گا؟ سچ تو یہ ہے کہ حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا دَورِ اہتمام دارالعلوم دیوبند کا سب سے قابلِ اعتبار اور سب سے زیادہ باوقار اہتمام تھا۔اس میں خلوص زیادہ تھا دکھاوا کم۔آپ کے دورِ اہتمام میں اخلاص برائے نام ہے اور دکھاوا حد سے زیادہ۔آپ کے دورِ اہتمام میں جسم پھیل رہا ہے لیکن روح سمٹ رہی ہے۔حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم دیوبند میں داخل طلباء کی تعداد دو ہزار تھی اور اُن میں سے بارہ سو طلباء کو کھانا دیا جاتا تھا۔جبکہ دارالعلوم دیوبند کا سالانہ بجٹ اڑتالیس لاکھ روپے تھا۔آپ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم دیوبند میں داخل طلبہ کی تعداد ڈھائی ہزار ہے اور ان میں سترہ سو پچاس طلباء کی امداد کی جاتی ہے اور دارالعلوم کا سالانہ بجٹ نو کروڑ روپے ہے۔اگر گرانی کی وجہ سے یا چند سو طلباء کی مزید امداد کی وجہ سے یا اساتذہ کی تنخواہیں دوگنی تگنی یا چارگنی کرنے کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند کا خرچہ دس گنا بھی بڑھ گیا ہوتا تب بھی سالانہ بجٹ چار کروڑ اسّی لاکھ بیٹھتا ہے۔نو کروڑ تو کسی بھی حالت میں نہیں بیٹھتا۔حیرت کی بات ہے کہ مجلس شوریٰ کے ممبران اس بجٹ کو کیسے پاس کرتے ہیں۔کیا یہ تمام ممبران حساب دنیا اور حسابِ آخرت سے اس درجہ بے خبر اور بے پرواہ ہیں کہ انہیں بے چاروں کو یہ تک معلوم نہیں کہ ڈھائی ہزار طلبہ کی تعلیم پر کل مصارف کتنے ہونے چاہئیں جبکہ طلبہ کو آج بھی وہ سہولیات میسر نہیں ہیں جن کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔

رہی تعمیر کی بات تو دارالعلوم دیوبند میں تعمیرات کا سلسلہ بھی از راہِ اخلاص نہیں ہے۔بلکہ از راہِ مفادات ہے۔ دارالعلوم دیوبند کو مزید تعمیرات کی ہرگز ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس تعمیر سے عزیز طلباء کو کوئی فائدہ نہیں ہے۔وہ آج بھی تنگ کمروں اور حجروں میں بڑی تکلیفوں کے ساتھ وقت گزار رہے ہیں۔اگر لائٹ بھاگ

جاتی ہے تو طلباء کے کمروں میں جنریٹر کے ذریعے بجلی سپلائی کرنے کا اہتمام نہیں ہے۔ جبکہ دارالعلوم دیوبند میں چندے کی اصل بنیاد یہ طلبہ ہی ہیں اور جو شخص بھی اپنی محنت کی کمائی دارالعلوم کے حوالے کرتا ہے وہ ان عزیز طلبہ کی خاطر ہی کرتا ہے۔ حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں جبکہ حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اہتمام سے محروم کرنے کی پلاننگ تھی اُس وقت مخالف گروہ نے اُس جمعیۃ الطلباء کے وجود کو ناگزیر قرار دیا تھا جو طلباء کے مطالبات اہتمام تک اور مجلسِ شوریٰ تک پہنچا سکے اور بزورِ قوت وسیاست جمعیۃ الطلباء قائم کر دی گئی تھی جس کا صدر عثمان انبیٹھوی کو بنایا گیا تھا اور اُس وقت ایک اصطلاح پورزور وشور کے ساتھ پورے ملک میں پھیلائی گئی اور وہ تھی ''مہمانانِ رسول'' کی اصطلاح۔ شور مچا مچا کر یہ باور کرایا جاتا تھا کہ یہ طلباء مہمانِ رسول ہیں اور ان کی مہمان نوازی ڈھنگ سے نہیں ہورہی ہے۔ اس ملک کے اکثر باشندے چکمے میں آگئے اور ملک کے مسلمانوں کی اکثریت حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بدگمان ہوگئی۔ مولانا منظور نعمانی جیسے خداترس لوگوں نے بھی قلم اُٹھایا اور حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

لیکن آپ کے دورِ اہتمام میں سب سے پہلے جمعیۃ الطلباء کا قتل عام ہوا۔ اس کے بعد ''مہمانانِ رسول'' والی اصطلاح کو بے گوروکفن قاسمی قبرستان میں بغیر نمازِ جنازہ پڑھے دفنا دیا گیا۔ آج ان طلبہ کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہے۔ اوسط درجے کی تعلیم کے سوا انہیں دارالعلوم دیوبند سے کوئی پذیرائی حاصل نہیں ہوتی۔ اگر کوئی طالبِ علم کوئی شکایت کرتا ہے تو اس کا نام کٹنے میں اتنی دیر بھی نہیں لگتی جتنی دیر کسی مکھی اور مچھر کو مارنے میں لگتی ہے۔

اِن طلبہ کو دونوں وقت ایسا کھانا دیا جاتا ہے جسے معیاری لوگ کھانا پسند نہیں کرتے۔ گوشت ایسا ہوتا ہے جیسے مرے ہوئے بیلوں یا بوڑھی بھینسوں کا خریدا جارہا ہو۔ شوربے میں گھی نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس شوربے کو اگر ایک گھنٹے کے بعد دوبارہ گرم کیا جاتا ہے تو اس کی تری اس طرح غائب ہوجاتی ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ روٹیاں ایسے آٹے کی بنائی جاتی ہیں جس میں بھوسی کی مقدار آٹے کے برابر ہوتی ہے۔ اکثر روٹیاں جلی ہوئی ہوتی ہیں، بے چارے طلبہ بھیک مانگنے کے سے انداز میں لائن میں لگتے ہیں اور جدوجہد کے بعد انہیں جو خوراک میسر آتی ہے وہ صرف پیٹ بھر سکتی ہے۔ بے چارے کتنے مظلوم ہیں دارالعلوم کے طلبہ۔ اور کتنے ستم توڑ رہی ہے ان پر دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ!

حضرت مہتمم صاحب! آپ اور آپ کے گھر والے اس کھانے کو ایک دن کھانا پسند نہیں کرسکتے، طلباء کو صرف صبر کرنا پڑتا ہے کیونکہ وہ بے چارے یہاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں۔ ''اچھی غذائی'' کھانے نہیں آئے۔ انہیں اچھی غذا آپ فراہم نہ کریں لیکن خدارا اتنا تو کریں کہ طلباء دووقت ڈھنگ سے اپنا پیٹ بھر سکیں۔ آپ ان بے چاروں کو مہمانِ رسول نہ سمجھیں اپنا مہمان تو سمجھیں۔

حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ اہتمام میں ممکن ہے کہ بدنظمی پیدا ہوگئی ہو لیکن ان کے دَور میں بے ایمانی اور کھائی باڑی نہیں تھی۔ ان کا دورِ اہتمام بد دیانتیوں اور جعل سازیوں سے محفوظ تھا۔ آپ کے دورِ اہتمام میں اس درجہ کھائی باڑی اور کمیشن خوری ہو رہی ہے کہ اللہ کی پناہ۔ اینٹ بھٹے سے ڈھائی روپے کی چل کر دارالعلوم دیوبند کی تعمیرات تک پورے پندرہ روپے کی ہو جاتی ہے۔ بھٹے سے دارالعلوم تک کئی کمیشن خوری کے ٹھیئے پڑتے ہیں۔ یہ اینٹ ہر ٹھیے پر کچھ نہ کچھ نذرانہ پیش کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ بالآخر پندرہ روپے کی ہو کر دارالعلوم کے کام آتی ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں تعمیرات کی دو ہی وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ جو عمارتیں حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ اہتمام میں بنیں ان کو ڈھا کر حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام کو مٹا دیا جائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جب عمارت بنے گی تو ہی کمیشن خوروں کو فائدہ پہنچے گا۔ پہلے یہ سنا کرتے تھے کہ سرکار سڑکیں بنانے کے لیے ٹھیکیداروں کو جو رقم عطا کرتی تھی اس کا اسّی فیصد لوگ ٹھیکیداروں اور مزدوروں کے گھر چلا جاتا ہے۔ اس لیے سڑکیں ایسی بنتی تھیں کہ وہ اگلے دو سال میں پھر کسی غریب کی بیوہ کی طرح اُجڑ جاتی تھیں۔ آج آپ کے دارالعلوم کی بھی یہی صورتِ حال ہے کہ جو رقم دفترِ اہتمام سے تعمیر کے لیے نکلتی ہے یا زمین کی خریداری کے لیے دی جاتی ہے اس کا اسّی فیصد کمیشن خوروں کے گھروں اور جیبوں میں جاتا ہے لیکن پھر بھی عمارتیں مضبوط رہتی ہیں کیونکہ دارالعلوم دیوبند کا سالانہ بجٹ کا نصف حصہ صرف غیر ضروری تعمیرات میں لگ رہا ہے۔ یہ کمیشن خوری کی اعلیٰ مثال ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ اب باب الظاہر کو بھی منہدم کرنے کا پروگرام بنا رہی ہے کیونکہ باب الظاہر کو توڑ کر بنائے جانے میں جو رقم خرچ ہوگی اس میں ایک اندازے کے مطابق ایک کروڑ روپے کا فائدہ کمیشن خوروں کو ہوگا۔ دنیا آثارِ قدیمہ کی حفاظت کرتی ہے۔ آپ کے اہتمام میں بزرگوں کی تمام نشانیوں کو ایک ایک کر کے منہدم کیا جا رہا ہے۔ یہ ہے آپ کا دورِ اہتمام! اور حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ مجلسِ شوریٰ کے ممبران آنکھیں موندے بیٹھے ہوئے ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا گیا تھا وہ فکرمند تھے اور انہوں نے صحابہ سے فرمایا تھا کہ اگر اب فرات کے کنارے پر کسی بھیڑیئے نے کسی بکری کو ہلاک کر دیا تو عمر ہلاک ہو جائے گا۔ اس کی آخرت تباہ ہو جائے گی۔ لیکن شوریٰ کے موجودہ ممبران کیا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے زیادہ متقی ہیں۔ کیا ان کی آخرت حضرت عمر فاروق کی آخرت سے زیادہ مضبوط ہے۔ آخر انہیں اس بات کی فکر کیوں نہیں کہ حشر کے میدان میں اُن سے بھی باز پرس ہوگی اور انہیں بھی احتساب کی گھاٹی سے گزرنا پڑے گا۔

آپ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم دیوبند پر سیاسی رنگ کا غلبہ ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد خلوص وللّٰہیت پر تھی اور یہاں کے طلبہ جنید وشبلی بن کر نکلتے تھے۔ اب یہ ہو رہا ہے کہ آپ نے انہیں سیاسی رنگ میں رنگ دیا ہے۔ حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں دارالعلوم دہشت گردی کے الزام سے اس لیے محفوظ تھا کہ

دارالعلوم کا مہتمم کسی سیاسی پارٹی کے لیے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ آپ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کو ریلیوں میں لے جایا گیا اور اس طرح دارالعلوم اور اس کے طلبہ دہشت گردی کا نشانہ بنے۔ حد تو یہ ہے کہ عزیزم محمود مدنی کا الیکشن جب لڑا جا رہا تھا آپ کا دولت کدہ بھی سیاسی اڈّہ بنا ہوا تھا۔ اور آپ کی ذاتی کاریں بھی اس الیکشن میں کام آرہی تھیں۔ محمود مدنی ہار گئے۔ یہ ہار صرف اُن ہی کی ہار نہیں تھی بلکہ یہ ہار دارالعلوم دیوبند کے مہتمم کی ہار تھی اور خود دارالعلوم کی بھی۔ سوچیئے آپ نے دارالعلوم دیوبند کو کہاں لے جا کر کھڑا کر دیا ہے۔

آج دارالعلوم دیوبند میں تعلیم کا معیار بھی وہ نہیں رہا جو پہلے کبھی تھا۔ مولانا وحید الزماں نے طلبہ کی تعداد چار ہزار کر دی تھی اور ان طلبہ کی تربیت کا بھی کچھ منصوبہ بنایا تھا۔ وہ سب آپ نے تہس نہس کر دیا اور اب طلبہ کی تعداد گھٹ کر ڈھائی ہزار رہ گئی ہے جبکہ ہر سال تقریباً پانچ ہزار طلبہ محروم ہو کر واپس چلے جاتے ہیں۔ اگر بے جا تعمیرات کے سلسلے کو روک دیا جائے تو دارالعلوم دیوبند میں دس ہزار طلبہ کی کھپت ہو سکتی ہے لیکن پھر ان کمیشن خوروں کا کیا ہوگا جو آپ کی سگی اولاد ہیں یا پھر آپ کی اولاد بننے کے بہانے تلاش کرتے ہیں۔

کمیشن خوری کی ایک تازہ مثال یہ ہے کہ ایک زمین دارالعلوم کو چار ہزار روپے گز مل رہی تھی تو دارالعلوم نے اسے نہیں خریدا اور جب یہی زمین دارالعلوم دیوبند کو کمیشن خوروں کی معرفت سات ہزار روپے گز ملی تو دارالعلوم نے خرید لی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کمیشن خوروں کی گرفت آپ پر کتنی مضبوط ہے۔ اب رہا تعلیم کا معیار تو طلبہ پر سختی اور چوکسی اور طلبہ کو فیل کرنے کی ادائیں تو اپنی جگہ لیکن حالات بتا رہے ہیں کہ رفتہ رفتہ آپ دارالعلوم دیوبند کو مدرسہ اصغریہ بنا رہے ہیں۔ کیونکہ اسی میں آپ کو اور آپ کے خوشامدوں کو اپنی عافیت نظر آرہی ہے۔ فقط

مادرِ علمی کا خیر خواہ حسن الہاشمی
(ماہنامہ طلسماتی دنیا جولائی ۲۰۰۷ء)

درج بالا خط میں طلبہ کے کمروں میں جنریٹر کی بجلی، اُس وقت نہیں تھی یاد رہے کہ یہ خطوط گیارہ سال قبل ۲۰۰۷ء میں لکھے گئے ہیں۔ اور طلبہ کے تنگ کمروں اور کھانے کے گرے ہوئے معیار کا ذکر بالکل حق ہے اُس وقت ایسا ہی تھا۔ ہوسکتا ہے اب روٹی اور بوٹی میں کچھ سدھار ہوگیا ہو۔ (ابوعکاشہ رحمٰن)

دوسرا خط

(۱) ایک بار عید الاضحیٰ کے موقعہ پر قربانی کا گوشت فروخت ہوا۔ جو شرعی اعتبار سے ایک بھیانک جرم تھا۔ قربانی کا گوشت شرعاً اپنے گھر استعمال کیا جاسکتا ہے احباب و متعلقین میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یا غرباء کو دیا جاسکتا ہے۔ اس کی تجارت شرعاً ناجائز ہے لیکن یہ ناجائز کام آپ کے دورِ اہتمام میں ہوا۔ جب یہ بات طشت از بام ہوئی تو (خود ساختہ فدائے ملّت) حضرت مولانا اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی حکمتِ عملی سے اس بات کو دبا دیا۔ اور غالباً غلطی کرنے والوں کی کچھ سرزنش بھی کی۔ لیکن غالباً انہوں نے از راہِ رشتہ داری آپ کو بچالیا۔ حالانکہ آپ کی غفلت بھی قابل باز پرس تھی۔ قربانی سے متعلق ابھی تک کچھ غلطیاں دارالعلوم میں برابر ہو رہی ہیں جس کی وضاحت میں بعد میں کروں گا۔

(۲) آپ کے دورِ اہتمام میں فتوے فروخت ہوئے اور اس کے افسوسناک مناظر ٹی وی پر دیکھنے کو ملے۔ ان افسوس ناک مناظر کو دیکھنے کے بعد علماء اور مفتیوں کا وقار خاک میں مل گیا اور عوام میں زبردست بدظنی پھیلی۔ اس موقعہ پر مفتی حضرات نے چھ سات دن کے بعد جو تاویلات کیں وہ اس درجہ بچکانہ اور مضحکہ خیز تھیں کہ انہیں صرف وہی لوگ قبول کر سکتے تھے کہ جن کے کاسۂ سر میں ایک رتی سے زیادہ عقل نہ ہو یا پھر وہ آپ کے حاشیہ بردار ہوں۔ آپ نے دنیا والوں کو مطمئن کرنے کے لیے ان مفتی حضرات کو معطل کرنے کا اعلان بھی کیا تھا اور یہ بھی فرمایا تھا کہ دارالعلوم دیوبند کی طرف سے آج تک ٹی وی چینل پر ہتک عزت کا مقدمہ دائر کیا جائے گا۔ لیکن آپ اس دعوے سے باز رہے کیونکہ آپ جانتے تھے کہ جھول کہاں ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ خیر اندیش قسم کے لوگوں نے آپ کو سمجھا دیا ہو کہ دعویٰ خود آپ کے خلاف بھی پڑ سکتا ہے، کیونکہ اس دعوے کے نتیجہ میں آپ کے کچھ اور پرَت بھی کھل جاتے اور آپ کے لیے جواب دہی مشکل ہو جاتی۔

(۳) آپ کے دورِ اہتمام میں یہ بھی ہوا کہ آپ نے مسٹر جناح کو کافر قرار دے دیا جبکہ پوری ملّت انہیں مسلمان سمجھتی تھی اور کفار و مشرکین بھی ان کے مسلمان ہونے کے قائل تھے۔ مسلمانوں میں کچھ لوگ مسٹر جناح کو شیعہ کہتے تھے لیکن اپنی وفات سے پہلے انہوں نے یہ وصیت کی تھی کہ ان کی نماز جنازہ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ پڑھائیں؛ چنانچہ وصیت کے مطابق ان کی نمازِ جنازہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھائی جو علمائے دیوبند کے اساطین میں شامل تھے۔ یہ وصیت یہ ثابت کرتی تھی کہ مسٹر جناح عمر کے آخر میں شیعیت سے تائب ہو گئے تھے لیکن اگر وہ شیعہ بھی تھے تو علمائے دیوبند نے شیعوں کی تکفیر نہیں کی ہے۔ انہیں اہلِ قبلہ ہونے کی وجہ سے مسلمان ہی مانا ہے ان کے مرنے کے پچاس سال کے بعد آپ کا انہیں کافر قرار

دینا ایک بھیانک غلطی تھی جس کی آپ کو معافی مانگنی چاہئے تھی لیکن آپ نے معافی نہیں مانگی حسبِ عادت تاویل کی اور تاویل بھی ایسی کہ جس پر ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے۔ جس وقت آپ نے مسٹر جناح کو کافر قرار دیا اس وقت پاکستان میں آپ کے پتلے جلائے گئے اور مرغوب الرحمٰن مردہ باد کے نعرے پاکستان میں لگے اس طرح آپ کا وقار مجروح ہوا اور دارالعلوم دیوبند کی بھی رُسوائی ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ میں ایسا پہلی بار ہوا کہ کسی مسلم ملک میں مہتمم دارالعلوم دیوبند کے پتلے جلائے گئے ہوں۔

(۴) آپ کے دورِ اہتمام میں ملازمین کے ساتھ ناروا سلوک ہوا۔ آپ نے کئی لوگوں کو عمر کی زیادتی کی وجہ سے ریٹائرڈ کر دیا حالانکہ آپ خود پچانوے سال سے زیادہ کے ہو چکے ہیں اگر عمر کی زیادتی کی وجہ سے ریٹائرڈمنٹ ضروری ہو تو پھر آپ کس دلیل کی بنیاد پر اب تک مہتمم بنے ہوئے ہیں۔ مولانا غلام رسول خاموش کو کارگزار مہتمم بنایا گیا تھا لیکن آپ نے انہیں کام کرنے کا موقعہ نہیں دیا۔ جب کہ آپ ارذل العمر کو پہنچ چکے ہیں۔ اور آپ کے قویٰ آپ کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ آپ کے دورِ اہتمام میں ناپنے کے پیمانے دو ہیں۔ دوسروں کے لیے ترازو دوسری ہے اور خود اپنے لیے ترازو دوسری اور اسے انصاف نہیں کہتے۔ یہ تقویٰ بھی نہیں ہے۔ اس کو اُصول پرستی بھی نہیں کہتے اسے کچھ اور کہتے ہیں کچھ اور کی میں تشریح نہیں کروں گا، آپ چراغ پا ہو جائیں گے اور آپ کو مسلسل غلط مشورے دینے والے پھر آستینیں سونت لیں گے۔ آپ خود ہی سمجھ لیں کہ اسے کیا کہتے ہیں اور اس کے معانی کیا ہیں۔ ملازمین کے ساتھ ناروا سلوک کی میں بے شمار مثالیں پیش کر سکتا ہوں لیکن سر دست میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔

مولوی انیس نامی ایک سفیر جو دارالعلوم دیوبند کے باقاعدہ سفیر تھے اور ان کو چندہ کے لیے آسام و بنگال کا حلقہ دیا گیا تھا۔ ۱۹۹۹ء میں جبکہ وہ دارالعلوم دیوبند کے لیے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے تھے کہ انہیں کلیا گنج کے علاقہ میں پولیس نے پکڑ لیا اور ان سے پوچھ تاچھ کی نیز ان کے بیگ کی تلاشی لی۔ جس میں سے دارالعلوم دیوبند کی رسیدیں برآمد ہوئیں۔ مولوی انیس نے پولیس کو بتایا کہ وہ دارالعلوم دیوبند کے سفیر ہیں اور چندے کی فراہمی کے لیے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں۔ پولیس کو یقین نہیں آیا اور انہوں نے دیوبند کے تھانے میں فون پر بات کی اور مولوی انیس کی بات کی تصدیق چاہی۔ دیوبند تھانہ کی طرف دارالعلوم کے اہتمام میں پولیس آئی اور آپ سے یا آپ کے نائبین سے تحقیقات کی۔ آپ نے یا آپ کے نائبین نے مولوی انیس کے بارے میں صاف صاف یہ فرما دیا کہ ان کا دارالعلوم دیوبند سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نتیجتاً مولوی انیس الرحمٰن گرفتار ہوئے اس وقت تک وہ دارالعلوم دیوبند کو ساڑھے تین لاکھ بذریعہ ڈرافٹ روپے بھجوا چکے تھے اور ان کے پاس ڈرافٹ کی رسیدیں بھی بطور ثبوت موجود تھیں۔ جیل سے چھٹنے کے بعد مولوی انیس نے دارالعلوم دیوبند سے اظہارِ وفاداری کے لیے دیوبند

کا سفر کیا اور وہ آپ کی خدمت میں پہنچے۔ انہوں نے دفتر اہتمام میں یا دفتر محاسبی میں دارالعلوم دیوبند کی چالیس رسید بکیں، نقد آٹھ ہزار اور ۳۰ ہزار روپے کے ڈرافت جمع کئے اور اپنا حساب پیش کیا۔ اس کے باوجود بھی ان کی ملازت بحال نہیں ہوسکی وہ ابھی تک بھٹک رہے ہیں اور ابھی تک آپ سے فریادیں کر رہے ہیں لیکن آپ کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔ کیا یہ ناانصافی نہیں ہے کیا اس کو ظلم نہیں کہتے۔ حق تو یہ ہے کہ اس طرح کی ناانصافیاں اور اس طرح کے ظلم وستم عہد قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں کبھی نہیں ہوئے۔ حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حال یہ تھا کہ وہ دربانوں کی دل شکنی سے بھی بچتے تھے اور آپ کے دورِ اہتمام میں صرف وہ لوگ محفوظ ہیں جو آپ کی بے جا خوشامدوں میں لگے ہوئے ہیں یا پھر وہ لوگ محفوظ ہیں جو کھلم کھلا کمیشن خوری میں مبتلا ہیں اور اپنے بچاؤ کے لیے وہ جی حضرت جی حضرت کی رَٹ لگاتے ہیں اور آپ کو اس طرح چکمہ دیتے ہیں کہ آپ کو اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ یہ لوگ آپ کو گمراہ کر رہے ہیں۔

(۵) آپ کے دورِ اہتمام میں طلباء کے ساتھ بھی ہمیشہ ناروا سلوک ہوا۔ اولاً تو انہیں کھانا ایسا دیا جاتا ہے جس کو خود آپ بھی کھانا پسند نہیں کر سکتے۔ میں نے دس بار مختلف طلباء سے کھانا لے کر کھایا ہے۔ میں اللہ کی گواہی میں بات کہتا ہوں کہ ایک دو بار کو چھوڑ کر شوربے میں ایسا گوشت تھا کہ جو انسانوں کے کھانے کا نہیں تھا۔ آپ کے بعض خوشامدیوں کا کہنا ہے کہ دارالعلوم دیوبند جیسا کھانا ملک کے کسی مدرسے میں نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر ملک کا کوئی بھی دینی مدرسہ ایسا نہیں ہے جو طلباء کے ساتھ انصاف کر رہا ہو۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ کی طرف سے کھانا خراب دیا جارہا ہے ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ دارالعلوم کی انتظامیہ کھانے کا معقول بندوبست کر رہی ہے لیکن درمیان میں کمیشن خوری کی وجہ سے ایسی گڑبڑی ہو رہی ہے کہ نہ گوشت ڈھنگ کا استعمال ہو رہا ہے اور نہ مصالحے پورے ڈالے جارہے ہیں۔ گھی کے کنستر انتظامیہ کی طرف سے پورے ملتے ہوں گے لیکن وہ نہ جانے کہاں غائب ہو جاتے ہیں اور طلباء کو جو کھانا میسر آتا ہے وہ صرف پیٹ بھرنے کے لیے ہوتا ہے وہ لنگر کا کھانا ہوتا ہے جو درگاہوں میں فقیروں کے لیے بٹتا ہے جبکہ دارالعلوم دیوبند کے طلباء یا کسی بھی دینی مدرسے کے طلباء منجملہ فقراء نہیں ہیں۔ یہ دین وشریعت کے طالبین ہیں اور یہ یقیناً مہمانانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں خود معیاری کھانا اور ان طلباء کو غیر معیاری کھانا کھلانا علم کی بھی توہین ہے اور رسالت کی بھی۔ اور اسے بے حسی بھی کہتے ہیں۔

طلباء کے ساتھ ایک ظلم یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی طالبِ علم غیر حاضر ہو جائے یا کوئی غلطی کر دے تو اس کا کھانا بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک غیر فطری سزا ہے۔ حق تعالیٰ بڑے بڑے کافروں اور بڑے بڑے نافرمانوں کا بھی رزق بند نہیں کرتے تو کسی دینی مدرسے کی انتظامیہ کو کیا حق ہے کہ وہ کسی غلطی کی بنا پر کسی طالب علم کا رزق بند کرے۔

اگر آپ کو سزا دینی ہو تو سزائیں اور بھی ہو سکتی ہیں چند روٹیوں کو بچا لینے سے دارالعلوم دیوبند کا یا کسی دینی مدرسے کا کیا بھلا ہو گا۔

آپ کے دَورِ اہتمام میں طلباء کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ ایک بار ایک ریلوے حادثہ میں چند طلباء جاں بحق ہو گئے۔ جب سرکاری پوچھ تاچھ ہوئی تو آپ کے زیرِ نگرانی کام کرنے والوں نے یہ کہہ کر جان چھڑانی چاہی کہ یہ شہید ہونے والے طلباء دارالعلوم دیوبند کے طلباء نہیں تھے اور ان کا ریکارڈ رجسٹروں سے غائب کرنے کی غلطی بھی کی۔ لیکن بات چلی نہیں تو پھر اپنے جھوٹ کی حسبِ عادت وہی تاویلیں کیں جو قابلِ ماتم ہوتی ہیں۔ ابھی حال میں دارالعلوم دیوبند کا ایک طالبِ علم ریلوے لائن پر اپنی جان گنوا بیٹھا۔ حسبِ معمول آپ لوگوں نے اس کو وقف کا طالب علم بتا دیا پھر اس کے پوسٹ مارٹم کے مسئلے کو لے کر اس کی توہین و تذلیل کرانے کا ارادہ کیا لیکن دارالعلوم دیوبند کے طلباء آڑے آ گئے اور اس وقت دارالعلوم دیوبند کے طلباء کی زبانی آپ کے اہتمام کی عام رُسوائی ہوئی اور اس کے چرچے پورے دیوبند میں ہوئے۔ اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر طلباء کا اخراج انہیں امتحانات میں فیل کرنے کی روِش اور انہیں ہراساں اور خوف زدہ کرنے کی اسکیمیں یہ آپ کے دَورِ اہتمام کا طرۂ امتیاز ہیں، حالانکہ آپ جیسے لوگوں کی چودھراہٹ اور آپ کی بڑائی ان بیچارے طلباء ہی کی دَین ہے۔ دینی مدارس میں جو بھی یافت ہوتی ہے وہ طلباء ہی کی مرہونِ منت ہے۔ اگر طلباء نہ ہوں تو نہ چندہ ملے نہ کوئی اہتمام چلے۔ طلباء کی خاطر ہی چندہ آتا ہے اور بے چارے طلباء ہی سب سے زیادہ محرومی کا شکار نظر آتے ہیں دوسرے لوگ عیش کرتے ہیں اور طلباء کی درگت بنتی ہے۔

اگر آپ دارالعلوم دیوبند میں پڑھنے والے ہر طالبِ علم کو کھانے کے علاوہ پانچ سو روپے فی طالبِ علم وظیفہ دینے لگیں اور طلباء کی تعداد ڈھائی ہزار کے بجائے تین ہزار بھی ہو تو دس ماہ میں دورانِ تعلیم دارالعلوم دیوبند کے بجٹ میں صرف ڈیڑھ کروڑ کا اضافہ ہو گا۔ غیر ضروری تعمیرات کو نظر انداز کر کے طلباء کو فائدہ پہنچانے کی اسکیم مرتب کرنی چاہئے لیکن ایسا تب ہو گا جب طلباء سے ہمدردی ہو اور کمیشن خوروں کی آپ ہاں میں ہاں نہ ملائیں۔ اور میں نے پچھلے خط میں عرض کیا تھا کہ دارالعلوم دیوبند اگر غیر ضروری تعمیرات سے صرفِ نظر کرلے تو اساتذہ کی تنخواہوں میں معقول اضافہ ہو سکتا ہے دیگر ملازمین کو بھی راحت مل سکتی ہے اور طلباء کی تعداد بھی دُگنی کی جا سکتی ہے لیکن تعمیرات کا فائدہ ان لوگوں کو ہوتا ہے جو آسیب بن کر آپ کے سر پر منڈلا رہے ہیں اور نہ جانے کیوں آپ ان کے سامنے حد سے زیادہ جھکتے ہیں اور ان کے غلط مشوروں کی پیروی کرتے ہیں۔

آپ کے دورِ اہتمام میں مجلسِ شوریٰ بھی مجبور و بے بس نظر آتی ہے۔ حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں یہ شوریٰ ہیئتِ حاکمہ ہوا کرتی تھی اب مہتمم کی غلامِ محض ہے۔ کوئی ایک ممبر بھی زبان کھولنے کی اور مشورہ

دینے کی غلطی نہیں کرتا بالکل ایسے بیٹھے رہتے ہیں، ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم۔ اس لیے دارالعلوم دیوبند میں ایسے ایسے شعبدے ہو رہے ہیں کہ الامان والحفیظ۔

(۶) ابھی حال ہی میں سہارنپور روڈ پر دارالقرآن کی جو عمارت بنی ہے اس کا نقشہ ایک محتاط اندازے کے مطابق کسی بھی اچھے نقشہ نویس سے دس ہزار روپے میں بنوایا جاسکتا تھا لیکن یہ نقشہ غالباً بجنور کے کسی نقشہ نویس سے تقریباً پونے چار لاکھ میں بنوایا گیا ہے جو کھائی باڑی کی اعلیٰ مثال ہے۔ اس طرح کے ناجائز مصارف کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند کا بجٹ ۹ کروڑ بنتا ہے اور شاید اس سال گیارہ، بارہ کروڑ تک پہنچ جائے۔

دارالعلوم دیوبند کو جو چندہ ملتا ہے اس میں چندہ دہندگان کے خون پسینے کی کمائی ہوتی ہے اور مہتمم اس موصول شدہ رقم کا امین ہوتا ہے اگر اس رقم کو کھائی باڑی کرنے والے اس طرح اُڑا رہے ہیں تو یہ ایک طرح کا ظلم ہے اور آخرت میں آپ بحیثیت مہتمم ایک ایک پیسے کا حساب دینے کے پابند ہیں۔ خدارا اپنی آنکھیں کھولیں۔ خیر خواہ اور بدخواہ کے فرق کو سمجھیں۔ آپ کا سفرِ آخرت قریب ہے۔ جو لوگ آپ کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں اور آپ کو اصل حالات سے بے خبر رکھ رہے ہیں وہ آپ کے خیر خواہ نہیں ہوسکتے۔ حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر ہزار طرح کے الزامات کے بعد آپ کو اہتمام نصیب ہوا تھا آپ کو تو اور زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی آج دنیا یہ کہنے پر مجبور ہے کہ آپ کے اہتمام سے لاکھ درجے بہتر تھا حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اہتمام کہ انہوں نے اہلِ دیوبند سے بگاڑ کیا نہ کسی طالبِ علم کو ستایا نہ کسی ملازم کو برطرف کیا نہ کسی کے خلاف دعوے کرنے کی دھمکیاں دیں۔

میں پہلے خط میں عرض کرچکا ہوں کہ اگر میرے خطوط کا جواب آپ اپنے قلم سے دیتے تو مجھے کھلے خط لکھنے کی ضرورت نہیں تھی اور اب بھی اگر آپ مجھ سے اپنے قلم سے مراسلت کریں گے یا مجھ سے براہِ راست رابطہ کریں گے تو میں کھلے خط لکھنے کے بجائے براہِ راست آپ سے بات کروں گا لیکن میری شرط یہ ہے کہ بات آپ کے میرے درمیان ہوگی دوسرے کا واسطہ درمیان میں نہیں ہوگا۔ میرا مقصد مادرِ علمی کی اصلاح ہے اور آپ کو صحیح حالات سے باخبر کرنا ہے جس سے قطعاً آپ بے خبر ہیں اور ایک مہتمم کی حیثیت سے آپ کا تمام حالات سے باخبر رہنا ضروری ہے ورنہ پھر بہتر یہ ہے کہ آپ مولانا غلام رسول خاموش کے حق میں اپنا استعفیٰ پیش کردیں اس لیے کہ وہ یقیناً ان غلطیوں کی تلافی کردیں گے جو دارالعلوم دیوبند میں پنپ رہی ہیں۔

(۷) تازہ ترین اطلاع کے مطابق آپ دربانوں کو ۱۲ گھنٹے ڈیوٹی دینے کے صرف اٹھارہ سو روپے دیتے ہیں جو ایک طرح کی زیادتی ہے۔ اس ہوشربا مہنگائی کے دَور میں اٹھارہ سو روپے میں کیا ہوتا ہے اور اگر اٹھارہ سو روپے ۱۲ گھنٹے ڈیوٹی کے عوض میں ہو تو ستم در ستم کے مترادف ہے۔ اس طرح کی زیادتیاں اس عظیم

الشان ادارے میں ہو رہی ہیں جو دنیا کی نظروں میں ۹ کروڑ کا بجٹ رکھتا ہے اور جس کا بجٹ ہر سال آندھی اور طوفان کی طرح بڑھ رہا ہے۔

کیا مجلسِ شوریٰ صرف نام کی ہے آخر مجلسِ شوریٰ کے ممبران کو آپ کی اور اپنی آخرت کی فکر کیوں نہیں ہے کیا بارگاہِ خداوندی میں اس بے تحاشہ مصارف کا کوئی حساب کتاب نہیں ہوگا؟ سوچیں! غور کریں! اللہ احتسابِ آخرت کی فکر کریں! اللہ کی پکڑ سے ڈریں۔!

مادرِ علمی کا خیر خواہ
حسن الہاشمی
(طلسماتی دنیا اگست ۲۰۰۷ء)

تیسرا خط

حضور! اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں آپ کو یہ بات یاد دلادوں کہ آپ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عہد میں ان کے مددگار بن کر دفتر اہتمام میں آئے تھے۔ مجلسِ شوریٰ نے آپ کو "مددگار مہتمم" بنایا تھا۔ لیکن اسلامی تاریخ میں ایسا مددگار پہلی بار دیکھنے کو ملا جس نے مدد کی آڑ میں اپنے مخدوم کی سلطنت ہی چھین لی۔ اور نہ صرف یہ کہ سلطنت چھین لی بلکہ ان کو اور ان کے خاندان کو رُسوا اور نااہل ثابت کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ جس وقت حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر جارحانہ حملے کئے جارہے تھے اور دیوبند کی گلی کوچوں میں کچھ لوگ کچھ اغراض پسند اور مفاد پرست لوگوں کا تعاون حاصل کر کے ان کے خلاف زہریلے قسم کے کتابچے اور پمفلٹ تقسیم کرنے میں مصروف تھے۔ اس وقت ان کی عمر ۸۵ سال تھی۔ اس طرح کسی کو بڑھاپے میں رُسوا کرنے کے طور طریقے ہم نے آپ ہی سے اور آپ کی جماعت سے سیکھے اور کسی کے مرنے کے بعد بھی اس کو معاف نہ کرنے کے طور طریقے بھی آپ ہی بتا رہے ہیں اور سکھا رہے ہیں۔ کاش آپ نے حکیم الاسلام کے بڑھاپے پر رحم کھایا ہوتا تو آج آپ کے ساتھ یہ نہ ہوتا جو ہو رہا ہے اور وہ بھی نہ ہوتا جو کچھ آپ کے ساتھ آئندہ ہونے والا ہے۔

حکیم الاسلام کے دادا نے دارالعلوم دیوبند جیسا عظیم الشان ادارہ اس ملّت کو دیا۔ حکیم الاسلام کے والد کے دسترخوان پر کھانا کھا کر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ جیسے اکابر پلے بڑھے اور انہوں نے اس خاندان کے احسان کو مانا۔ حکیم الاسلام نے ساٹھ سال تک دارالعلوم دیوبند کا اہتمام سنبھالا۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی دعائیں اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی معاونت ان کے ساتھ رہی۔ حکیم الاسلام نے اپنا بچپن اپنی جوانی اور اپنا بڑھاپا دارالعلوم دیوبند پر قرآن کر دیا۔ آپ کی آنکھوں پر تو نفرت کی پٹی بندھی ہوئی ہے لیکن دنیا جانتی ہے کہ دارالعلوم دیوبند حکیم الاسلام کا اوڑھنا بچھونا تھا وہ اپنے وجود سے زیادہ دارالعلوم دیوبند سے محبت کرتے تھے۔ لیکن عمر کے آخر میں آپ جیسے اقتدار پرست لوگوں نے دارالعلوم دیوبند کا اقتدار ان سے چھین لیا اور ان کو ناکارہ قرار دے کر پچاسی سال کی عمر میں انہیں ایک زبردست صدمہ پہنچایا اور وہ اس صدمہ کو برداشت نہ کرسکے۔ کیونکہ وہ دارالعلوم دیوبند کی روح تھے اور دارالعلوم دیوبند ان کی روح تھا۔ وہ گھٹیا قسم کے الزامات کی تاب نہ لاسکے اور اس جہان فانی سے رخصت ہوگئے۔ ان پر پابندی عائد کر دی گئی تھی کہ وہ دارالعلوم دیوبند میں داخل نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ وفات والی رات جب دارالعلوم دیوبند کو دیکھنے کی یعنی اس دارالعلوم دیوبند کو دیکھنے کی تڑپ ان کے دل میں پیدا ہوئی جس کو انہوں نے اپنے

خون سے سینچا تھا تو انہوں نے اپنے گھر کی چھت پر چڑھ کر دارالحدیث کا وہ گنبد دیکھا جس کو دیکھنے سے انہیں محروم کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے انتہائی عقیدت سے اس گنبد پر ایک نظر ڈالی اور آسمان کی طرف دیکھ کر اپنے رب سے کچھ کہا، شاید دارالعلوم دیوبند کی حفاظت کی دعا کی ہو اور اگلے ہی دن انہوں ے اس دنیا سے اپنا رختِ سفر باندھ لیا۔ دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ کی طرف سے یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ حضرت قاری طیب صاحب کا جنازہ احاطۂ مولسری میں نہیں آئے گا اور دارالعلوم دیوبند کی مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے ان کی وفات کا اعلان بھی نشر نہیں ہوگا لیکن اس وقت حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ بلبلا اُٹھے اور انہوں نے برجستہ یہ اعلان کیا کہ حضرت حکیم الاسلام کی نمازِ جنازہ احاطۂ مولسری میں ادا کیجائے گی ورنہ میں دارالعلوم دیوبند کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا۔ حضرت مولانا وحید الزماں کی یہ للکارسن کر دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ کو سانپ سونگھ گیا اور اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ دراصل دنیادار لوگ اسی طرح کے لب ولہجہ پر ایمان لاتے ہیں انہیں حساب آخرت سے نہیں ڈرایا جاسکتا۔ حکیم الاسلام کا حسنِ انجام ان کے بے قصور، مظلوم اور سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی طرح معصوم ہونے کی دلیل تھا۔ حضرت حکیم الاسلام کے چہرے پر اس قدر نُور تھا کہ اتنا نُور کسی بھی مرنے والے کے چہرے پر کبھی نظر نہیں آیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے آسمان سے نورِ رحمت ان کے چہرے پر موسلا دھار بارش کی طرح برس رہا ہے جوں جوں تدفین میں دیر ہو رہی تھی وُوں وُوں ان کے نُور میں اضافہ ہو رہا تھا اور موسم منجانب اللہ اس قدر خوشگوار ہو گیا تھا کہ دیوبند کے ہندوؤں تک نے اس موسم کی خوشگواری کا اعتراف کیا۔ بارش شبنم کے قطروں کی طرح دیوبند کی گلیوں پر ٹھنڈی چادریں بچھانے میں مصروف تھی اور ہوا نسیم سحر کی طرح خراماں خراماں چل کر اپنی خداداد صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہی تھی ایسا لگتا تھا کہ اس کائنات کو رحمت کے فرشتوں نے اپنے پروں سے ڈھانپ لیا ہے اور جنت الفردوس کو حضرت حکیم الاسلام کے لیے مزین کر دیا گیا ہے۔ دیوبند رو رہا تھا، دنیا رو رہی تھی، زمین بلک رہی تھی، آسمان تھرا رہا تھا، چمن کے پھول بھی افسردہ تھے اور آسمان کے ستارے بھی محوِ ماتم، لیکن آپ کی انتظامیہ اس وقت بھی حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بُری سوچ رکھتی تھی دراصل آپ بغض وعناد کی اس دلدل میں پھنس گئے تھے جس میں پھنسنے کے بعد کوئی بھی انسان، انسان نہیں رہتا، وہ نراحیوان ہو جاتا ہے اور بربریت اس کا مشن بن جاتی ہے۔ ان کی وفات پر تو کچھ عاقبت نااندیشوں نے بالو شائیاں تقسیم کی تھیں لیکن حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روح جو یقیناً کوثر و نسیم سے دھلی ہوئی تھی بوقتِ پرواز یہ کہہ رہی تھی۔

روشِ دہر کا ہر نقش پکارے گا مجھے
یہ نہ سمجھو کہ مجھی تک میرا افسانہ ہے

کاش ان کے حسنِ انجام سے آپ نے کوئی عبرت پکڑی ہوتی، کوئی سبق لیا ہوتا، کچھ سوچا ہوتا لیکن آپ پر تو اہتمام کا نشہ سوار تھا۔ آپ کے ہاتھ میں دولت وعزت کی کنجیاں آگئی تھیں اور آپ تو ایک نادان امت کے خزانوں کے مالک بن گئے تھے، آپ کیوں موت کو یاد کرتے آپ کیوں کسی بات سے سبق لیتے۔ آپ تو مطمئن ہو گئے تھے کہ اب دارالعلوم دیوبند ہمیشہ کے لیے آپ کی ذاتی جاگیر بن گیا ہے۔

حضور! آپ کے دورِ اہتمام میں حاملین مسلک دیوبند دو حصوں میں بَٹ گئے اور فارغین دیوبند کی کھیپ انتشار وافتراق کا شکار ہو کر رہ گئی؛ لیکن خاندانِ قاسمی کی کرامت دیکھئے کہ جو لوگ آپ کے کیمپ میں تھے وہ بھی خود کو قاسمی ہی کہلانا پسند کرتے تھے اور آج بھی۔ وہ لوگ جنہوں نے ایک مخصوص پروپیگنڈہ کا شکار ہو کر حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو دارالعلوم دیوبند کا بانی ماننے سے انکار کر دیا تھا اور وہ اس خوش فہمی کا شکار ہو گئے تھے کہ دارالعلوم دیوبند کے بانی مبانی حضرت عابد حسین رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ انہوں نے بھی زندگی میں ایک بار بھی یہ غلطی نہیں کی کہ خود کو عابدی بتایا ہو وہ بھی ہمیشہ خود کو قاسمی کہلاتے رہے اور قاسمی سمجھتے رہے۔ حضور! آپ کچھ بھی کرلیں۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند کے صفحات کے صفحات بدل دیں۔ حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں جو عمارتیں بنی تھیں انہیں ایک ایک کر کے سب کو منہدم کر دیں لیکن حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان کے تصور اور یادوں کو آپ دارالعلوم دیوبند کے در و دیوار سے کھرچ دینے میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ کاش آپ نے اس حدیث کا مطلب سمجھتا ہوتا: مَنْ لَّمْ یَشْكُرِ النَّاسَ وَلَا یَشْكُرُ اللّٰهَ۔ جس نے لوگوں کی قدر نہیں جانی اس نے اللہ کی بھی قدر نہیں جانی۔ خاندانِ قاسمی نے دارالعلوم دیوبند جیسا عظیم الشان ادارہ اس امت کو دیا۔ آج جب دفتر اہتمام میں بیٹھ کر آپ خود کو بے تاج بادشاہ سمجھ رہے ہیں یہ خاندانِ قاسمی کی دین ہے۔ جب آپ اس خاندان کے شکرگزار نہیں ہیں تو اس خدا کے کیا شکرگزار ہوں گے جو سات پردوں میں رہتا ہے۔

حق تعالیٰ نے آپ کو موقعہ دیا تھا۔ اس وقت جب صلح کا کارنامہ سامنے آیا رب العالمین نے حضرت مولانا سید اسعد مدنی کو اس بات کی توفیق عطا کی کہ انہوں نے مولانا سالم قاسمی سے صلح کرلی اور دنیا کے جھگڑوں کو اسی دنیا میں حل کرنے کی تمنائیں کی لیکن اس وقت بھی آپ نے اور آپ کے مداحوں نے اس صلح کو ذاتی صلح بتا کر اس صلح کی اور اس صلح سے پیدا ہونے والے نتائج کی اہمیت گھٹادی۔ مولانا اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو بانی بھی تسلیم کرلیا تھا اور مولانا سالم صاحب کے حسنِ ظرف کا اعتراف بھی کرلیا تھا۔ کاش اس سنہری موقعہ سے آپ فائدہ اُٹھاتے اور اس اختلاف کو ختم کر دیتے جو فاضلین دیوبند کے لیے سوہان روح بنا ہوا ہے۔ لیکن آپ کو اس کی توفیق نہ ہوسکی۔ آپ نے مولانا سالم صاحب کی آموں کی دعوت تو کر دی لیکن انہیں

شوریٰ کی رُکنیت سے محروم رکھا جب کہ اگر مولانا سالم صاحب کو شوریٰ کا ممبر بنالیا جاتا تو بے شمار اختلافات خود بخود ختم ہوجاتے اور آپ کے دورِ اہتمام میں ہونے والے بے شمار گھوٹالوں پر بھی پردہ پڑ جاتا۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند خاندان قاسمی کی جاگیر نہیں ہے یہ قوم کا ادارہ ہے اور قوم کی امانت ہے اور آپ کو بھی یہ بات تسلیم کرنی چاہئے کہ یہ دارالعلوم آپ کی بھی ذاتی جاگیر نہیں ہے یہ آج بھی قوم کا ورثہ ہے۔ اور قوم اس کو اپنے سرمائے سے چلا رہی ہے۔ آپ کو اللہ کی لاٹھی سے ڈرنا چاہئے۔ یہ لاٹھی کبھی نظر نہیں آتی لیکن کسی بھی وقت کسی کے بھی سر پر پڑ جاتی ہے اس لاٹھی کی آواز نہیں ہوتی یہ جب کسی کے سر پر پڑ جاتی ہے تو اُس کے زعم اور تکبر کے پرخچے اُڑا دیتی ہے۔

حضرت مولانا وحیدالزماں کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دریافت تھے لیکن جب انقلاب رونما ہوا تو وہ بوقتِ انقلاب حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف صف آراء ہوگئے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کے دَور میں آپ ہی کا کوئی معتمد ''وحیدالزماں'' بن جائے اور ایک بار پھر دارالعلوم دیوبند میں انقلاب برپا ہوجائے کیونکہ نظامِ قدرت یہ بتاتا ہے کہ تاریخ بالیقین خود کو دہراتی ہے جنہیں کمال نصیب ہوتا ہے انہیں ایک دن زوال بھی نصیب ہوتا ہے۔ حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب اپنوں کی سازش کا شکار ہوسکتے ہیں تو آپ کیوں نہیں ہوسکتے۔ میرے کھلے خط پڑھنے کے بعد آپ زمین دار کی طرح غیض وغضب کا شکار ہوگئے۔ آپ نے کسانوں کی طرح دعویٰ کرنے کی دھمکیاں دیں۔ آپ کے چمچوں نے قتل کرنے کے منصوبے بنائے۔ کاش آپ نے ایک بار بھی اپنی غفلتوں کو محسوس کیا ہوتا اور کاش آپ نے اپنے اہتمام کی اصلاح کی فکر کی ہوتی۔ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں بغیر ثبوت کے نہیں لکھ رہا ہوں لیکن میں ثبوت اس وقت دوں گا جب مجلسِ شوریٰ مجھ سے طلب کرے گی یا پھر میں ایک اجلاس طلب کر کے یہ ثبوت عوام کے سامنے پیش کروں گا۔ یہ ثبوت میں آپ کو بھی دے سکتا تھا اگر آپ نے میری بات پر کان دھرے ہوتے اور میرے ساتھ آپ کا معاملہ وہ ہوتا جو ایک فاضل دارالعلوم کے ساتھ ہونا چاہئے جس مادرِ علمی پر آج آپ کا قبضہ ہے یہ میری بھی مادرِ علمی ہے اور میں اسی کی خیرخواہی میں قلم اُٹھا رہا ہوں۔

ذرا دیکھئے کہ آپ کے دورِ اہتمام میں کیا کیا گل کھلے۔؟

(ا) آپ کے دورِ اہتمام میں صدقۂ جاریہ کی اہمیت ختم ہوگئی، بے شمار چندہ دہندگان نے اپنے خون پسینہ کی کمائی سے بہت سی عمارتیں، طلباء کے کمرے اور درسگاہیں اس نیت سے بنوائی تھیں کہ جب تک ان کا وجود رہے گا اور طلباء اور اساتذہ ان سے استفادہ کرتے رہیں گے تب تک انہیں ثواب ملتا رہے گا، لیکن آپ کے دورِ اہتمام میں یہ تمام عمارتیں ایک ایک کر کے منہدم کردی گئیں اور اس طرح صدقۂ جاریہ کی اُمید رکھنے والوں کی

اُمید یں تہس نہس ہو کر رہ گئیں ان عمارتوں کو اس لیے منہدم کیا گیا تھا کہ ان کے گرنے اور دوبارہ بننے میں جو کمیشن کھڑا ہوتا ہے اس سے کمیشن خوروں کے پیٹ پل رہے ہیں اور حد تو یہ ہے کہ اب وہ باب الظاہر بھی خطرے میں ہے جو ظاہر شاہ کے اُس دَور کی یادگار ہے جب انہیں افغانستان میں اقتدار نصیب ہوا تھا اور انہوں نے شکرانے کے طور پر دارالعلوم دیوبند کا یہ دروازہ بنایا تھا اور اس زمانے کے اکابرین دارالعلوم نے اس دروازہ کا نام ''باب الظاہر'' رکھا۔ یہ گیٹ ایک اعتبار سے دارالعلوم دیوبند کے آثارِ قدیمہ میں شامل ہے لیکن کمیشن خوروں کو نہ کسی کی نشانیوں کی پرواہ ہے نہ آثارِ قدیمہ کی۔ان کا بلڈوزر تو ہر اس جگہ چل کر رہے گا جو ان کی پانچوں اُنگلیاں تر کر سکے۔

اگر آپ کا اہتمام باقی رہا تو ایک دن وہ نودرہ بھی کمیشن خوروں کی زَد میں آئے گا جس کی بنیادوں کی نشاندہی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے وقت کے بزرگوں کے خواب میں آ کر کی تھی اور ایک دن وہ دارالحدیث بھی ظلم وستم کا شکار ہوگی جس میں بیٹھ کر شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے درسِ حدیث دیا تھا۔ ہر وہ عمارت جو چندہ دہندگان نے برائے صدقہ جاریہ بنوائی تھی ٹوٹ کر رہے گی۔ اور بزرگوں کی ہر نشانی کو مٹ جانے کے صدمات برداشت کرنے پڑیں گے اور وہ عمارتیں بننے کے بعد بھی بار بار ٹوٹ پھوٹ کر شکار ہوتی رہیں گی جس طرح مسجد رشید کا فرش کئی بار بن کر کئی بار مسمار کیا جا چکا ہے۔اس حساب سے دارالعلوم دیوبند کو صدقہ جاریہ کی نیت سے اپنے عطیات دینا شاید غلط ہے۔اس سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ دارالعلوم وقف کو صدقہ جاریہ کی رقومات دی جائیں۔وہاں کم سے کم یہ ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری نہیں ہے۔

(۲) آپ کے دورِ اہتمام میں طلباء کے ساتھ بے شمار زیادتیاں ہو رہی ہیں۔مختلف انداز سے طلباء کا استحصال کیا جاتا ہے۔مثلاً دونوں ٹائم انہیں جو روٹیاں دیجاتی ہیں وہ اکثر جلی ہوئی ہوتی ہیں اور وہ ایسے آٹے سے بنائی جاتی ہیں جو چھنا ہوا بھی نہیں ہوتا۔ یہ نان اتنے سخت ہوتے ہیں کہ ذرا سی دیر کے بعد ہی سوکھنے شروع ہو جاتے ہیں۔ طلباء کے پاس ہوٹ پوٹ نہیں ہوتے کہ وہ ان کو صحیح سالم رکھ سکیں۔جس وقت کھانا کھاتے ہیں ان کو از راہِ مجبوری ان سوکھے ہوئے نانوں کو جو لکڑی کی طرح سخت ہو جاتے ہیں کھانا پڑتا ہے۔اس سے طلباء کے معدوں میں ابخارات پیدا ہوتے ہیں اور اکثر و بیشتر طلباء احتلام کی بیماری کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ دنیا بدل گئی۔ پرانی عمارتیں توڑ توڑ کر نئی بنالی گئیں۔عمارتوں کے طرز بدل گئے۔ منتظمین کے رہن سہن بدل گئے لیکن دارالعلوم دیوبند کے طلباء کو ایک لاکھ روپے سالانہ سے شروع ہو کر ۹ کروڑ روپے سالانہ بجٹ ہونے تک وہی پتلی دال وہی بوڑھی بھینسوں کے گوشت کا شوربہ اور وہی ہیبت ناک قسم کے نان دیئے جا رہے ہیں کیا انتظامیہ طلباء کی خوراک پر قیامت تک نظر ثانی نہیں کرے گی۔آج کل تو معدے بھی اس قابل نہیں رہے کہ وہ اس طرح کی ثقیل غذاؤں کو برداشت کر سکیں۔؟ جب سب کچھ ہی بدل رہا ہے تو ذرا اس طرف بھی کچھ توجہ فرمالیں۔آخر انتظامیہ کو ان طلباء سے ہمدردی کیوں نہیں ہے۔

اگر روٹیاں طلباء دین کی تقدیر میں نہیں ہیں اور نان ہی مہمانِ رسول کا مقدر ہیں تو یہ نان ڈھنگ کے تو ہو جانے چاہئیں کیا ان نانوں کی صورت و سیرت نہیں بدلی جا سکتی۔؟ دوسری بات یہ ہے کہ اتنے بڑے دارالعلوم دیو بند میں طلباء کے لیے طبی سہولیات موجود نہیں ہیں۔ اگر اچانک رات کو کوئی طالب علم کسی شدید قسم کی بیماری کا شکار ہو جاتا ہے تو اس کی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ ایک دن راقم الحروف نے صبح ہی صبح لال مسجد پر ڈاکٹر شمیم صاحب کے کلینک کے سامنے چند طلباء کو دیکھا جو کسی بیمار طالبِ علم کو اُٹھائے ہوئے تھے اور ڈاکٹر صاحب کی کنڈی بجا رہے تھے ایسے نازک لمحوں میں اگر کوئی ڈاکٹر ہاتھ نہ لگے تو کیا ایک طالبِ علم کی قیمتی جان ضائع نہیں ہوگی! کیا طلباء کے لیے کسی ڈسپنسری کا انتظام دارالعلوم دیو بند کی چہار دیواری میں نہیں ہو سکتا۔ غیر ضروری تعمیرات کو نظر انداز کر کے اگر طلباء کو اس طرح کی سہولیات پہنچائی جائیں تو شاید چندہ دہندگان کی رقومات کا صحیح مصرف سامنے آسکے۔ تیسری بات یہ ہے کہ موسم سرما میں طلباء عزیز کو جو لحاف دیئے جاتے ہیں وہ پھر واپس لے لیے جاتے ہیں حالانکہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے شرط یہ ہے کہ زکوٰۃ جس مستحق کو بھی دی جائے اس کو مالک بنا دیا جائے۔ اگر مستحق کو مالک نہیں بنایا جائے گا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ واپس شدہ لحاف آئندہ سال دوسرے طلباء کو دیئے جاتے ہیں جو طبی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہیں۔ اس طرح سے طرح طرح کے امراض پھیلنے کا اندیشہ رہتا ہے اور صحت مند طلباء کی بھی صحت متاثر ہو سکتی ہے۔ بے شک دین اسلام چھوت چھات اور وبا لگنے کا قائل نہیں ہے لیکن وہ بداحتیاطی کی بھی مذمت کرتا ہے اور حزم و احتیاط کے ساتھ زندگی گزارنے کی تعلیم دیتا ہے۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں طلباء کو جو لحافظ دیئے جاتے تھے وہ لحاف طلباء کی ملکیت ہوتے تھے۔ چنانچہ طلباء عزیز اپنے گھر جاتے وقت ان لحافوں کو دیو بند کے غریب لوگوں کو فروخت کر دیا کرتے تھے اس طرح دہرا فائدہ ہوتا تھا۔ پہلے ان لحافوں کو طلباء استعمال کرتے تھے اس کے بعد سستے داموں میں وہ لوگ خرید لیا کرتے تھے جو بے چارے خود بھی زکوٰۃ کے مستحق ہوتے ہیں۔ اب آپ کے دورِ اہتمام میں صورتِ حال یہ ہے کہ غالباً واپس شدہ لحافوں کو دوبارہ حساب میں جوڑ لیا جاتا ہوگا۔ ورنہ پھر یہ خواہ مخواہ کی دردِسری ہے کہ آپ طلباء سے لحاف واپس لیں جب دینے والے دارالعلوم دیو بند کو دل کھول کر پیسے دے رہے ہیں تو آپ کنجوسی کا مظاہرہ کیوں کرتے ہیں۔ جب دارالعلوم دیو بند میں لحافوں کی مَد کا پیسہ آتا ہے یا زکوٰۃ کی رقم وافر مقدار میں موصول ہوتی ہے تو پھر اس کی ادائیگی میں کوئی ایسا غیر شرعی نظام بنانا جس سے چندہ دہندگان کی زکوٰۃ ہی ادا نہ ہو۔ حکمتِ عملی نہیں نادانی ہے اور اس نادانی کے تانے بانے تنگ دلی سے جُڑے ہوئے ہیں۔ سنا ہے کہ اگر کوئی طالبِ علم دارالعلوم دیو بند سے غیر لحاف واپس کئے چلا جاتا ہے تو اس کو سند اس وقت تک جاری نہیں کی جاتی جب تک وہ لحاف کی رقم ادا نہیں کر دیتا۔ یہ ایک طرح کا ظلم ہے۔ ایک طرف تو آپ طلباء سے لحاف واپس لے کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کو ملت کے خون پسینے کی کمائی کا احساس ہے اور دوسری طرف ان پر

آپ کی کوئی گرفت نہیں جو اللّے تللّے سے زمینوں کی خرید وفروخت کر رہے ہیں اور لاکھوں روپے کا سرمایہ کمیشن خوری کی نذر ہوتا ہے۔حضور!من پسند تقوے سے آخرتیں نہیں سدھرتیں۔متقی اس کہتے ہیں جس کا تقویٰ ہر جگہ یکساں ہوں کسی جگہ تنکے کو دیکھ لینا اور کسی جگہ شہتیر کو بھی نظرانداز کر دینا فنکاری ہے اسے پرہیزگاری نہیں کہتے۔

(۳) آپ کے دورِاہتمام میں کئی بار قبرستانوں کی زمینیں خریدی گئیں جبکہ قبرستان کی جگہ خریدنا اور بیچنا شرعاً ممنوع ہوتا ہے۔قبرستان وقف ہوتے ہیں اور ان املاک کی خریداری اور فروختگی جو وقف ہوں شرعاً جائز نہیں ہے لیکن یہ ناجائز کام آپ کے دورِاہتمام میں کھلم کھلا ہوتا رہا ہے۔حضرت شاہ ولایت کی زمین کو جب خریدا گیا۔اس وقت بعض قبروں میں سے صحیح سالم لاشیں برآمد ہوئیں اور اکثر قبروں میں سے انسانی ہڈیاں کثیر تعداد میں نکلیں،اخبارات لکھتے رہے،عوام چیختے رہے لیکن آپ پر جوں نہیں رینگی اور آپ نے بہت ہی بے دردی کے ساتھ قبرستانوں کے سودے کئے۔پھر ان زمینوں میں پھاوڑے چلوائے۔ایک نہیں آپ کئی قبرستان اسی طرح خرید چکے ہیں۔یا کم سے کم آپ کے علم میں قبرستانوں کا سودا ہوتا رہا ہے۔دارالعلوم دیوبند جیسا ادارہ بھی جب قبرستان کی زمین دھڑلے کے ساتھ خریدے گا تو دنیا میں کونسا قبرستان محفوظ رہ سکے گا۔علماء کی غلطیاں دیکھ کر عوام الناس گناہوں پر جری ہوجاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے دورِاہتمام میں جس طرح بعض زندوں پر ظلم وستم ہورہے ہیں اسی طرح بعض مُردوں پر بھی ظلم وستم ہورہا ہے۔آپ کے اہتمام میں نہ زندے محفوظ نہ مردے محفوظ جب چاہے آپ کی انتظامیہ کے لوگ قبرستان کی زمین خرید لیتے ہیں اور اس کے بعد بہت ہی بے دردی کے ساتھ قبروں کو مسمار کر دیا جاتا ہے۔یہ زعم اور آپ کے کارندوں کی یہ ڈھٹائی ایک دن آپ کو بھی لے ڈوبے گی۔زندوں کی نہیں کم سے کم مردوں کی آہوں سے تو ڈریئے۔

(۴) آپ کے دورِاہتمام میں جو عمارت شروع ہوتی ہے وہ کبھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔مسجد رشید کی تعمیر کو عرصہ دراز ہوچکا ہے لیکن اس کی تعمیر ابھی تک مکمل نہیں ہوسکی ہے۔اس کا تخمینی بجٹ شروع میں ۲۰ لاکھ روپے طے ہوا تھا لیکن تقریباً ۲۰ کروڑ اس مسجد کی تعمیر پر لگ چکا ہے۔لیکن ہنوز تعمیر جاری ہے اور تعمیر جاری رہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے فرش کو بار بار بنا کر بار بار اُدھیڑا جاتا ہے۔آپ طلباء کو لحاف دے کر تو اس لیے واپس لے لیتے ہیں کہ کہیں فضول خرچی کے دائروں میں نہ آجائے اور تعمیرات میں اس قدر پیسہ برباد ہوتا ہے کہ دیکھنے والوں کو بھی اذیّت ہوتی ہے وہاں آپ چپ سادھے بیٹھے رہتے ہیں ایسی کونسی کمزوری آپ کی ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو آپ کو لب کشائی نہیں کرنے دیتی۔مسجد رشید میں بجلی فٹنگ پر تقریباً ۱۸ لاکھ روپے خرچ ہوئے ہیں فی پوائنٹ =/350 کا حساب بنتا ہے جو بہت زیادہ ہے اور اس طرح کے مصارف کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند کا بجٹ کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ آپ کو ازخود یہ اندازہ ہی نہیں ہے کہ کہاں کتنی رقم خرچ ہونی چاہئے۔اگر دارالعلوم دیوبند میں رقومات بے حساب اور بے انتہا نہ وصول ہوتیں تو آپ اس نظام کو

ایک ماہ بھی نہیں چلا سکتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی وصولیابی اندرونِ ملک اور غیر ممالک سے اتنی ہو رہی ہے کہ اس رقم سے کئی مدرسے چلائے جاسکتے ہیں۔ اور اس رقم سے چھوٹے مدرسوں کو کمک بھی پہنچائی جاسکتی ہے لیکن تعمیرات کے اخراجات اس درجہ بڑھے ہوئے ہیں کہ ان کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے اور آپ سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں ہے۔ مجلسِ شوریٰ بھی صرف نام کی ہے یا پھر آپ مجلسِ شوریٰ کی سنتے ہی نہیں۔

(۵) آپ کے دورِ اہتمام میں ایک بار بھی سالانہ روداد نہیں چھپ سکی ہے، کیونکہ اگر روداد چھاپنے کی غلطی کرتے تو دنیا کو یہ بات سمجھ میں آجاتی کہ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پر کتنا خرچ ہو رہا ہے اور تعمیر پر کتنا۔ حضرت قاری طیب صاحب کے دَور میں سالانہ اخراجات کی روداد شائع ہوا کرتی تھی جس سے یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ طلباء پر کتنا خرچ ہو رہا ہے اور اساتذہ پر کتنا، ملازمت پر کتنے اخراجات ہو رہے ہیں اور دوسری مدات پر کتنے۔ روداد سے یہ بھی واضح ہو جاتا تھا کہ دارالعلوم دیوبند کی تعمیرات پر ایک سال میں کتنے اخراجات آئے نیز یہ بھی مترشح ہو جاتا تھا کہ کس علاقے سے کتنی یافت ہوئی اور اندرونِ ملک کے مسلمانوں نے کتنے عطیات دیئے اور بیرونِ ملک سے کتنا چندہ وصول ہوا۔ حد تو یہ ہے اگر کسی سفیر کو کوئی ایک روپیہ دیتا تھا روداد میں اس روپیہ دینے والے کا نام بھی چھپتا تھا۔ اب تو ایک لاکھ دینے والے کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے اور اب یہ بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ پیسہ کہاں سے آرہا ہے اور کس ذریعہ سے دارالعلوم دیوبند میں پہنچ رہا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مجلسِ شوریٰ کے ممبران کو بھی اس بات کی توفیق نہیں ہوتی کہ وہ حساب وکتاب کی دیکھ ریکھ کا کوئی نظام ترتیب دیں اور دارالعلوم کا سالانہ گوشوارہ شائع کرائیں۔ دارالعلوم دیوبند کی دیکھا دیکھی دیگر مدارس نے بھی روداد اور آمدنی وخرچ کے گوشوارے چھاپنے بند کر دیئے ہیں اور اس طرح دینی مدارس کا لین دین ایک معمہ بن کر رہ گیا ہے۔ حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ اہتمام کی رودادیں آج بھی موجود ہیں جو ان کی دیانت وامانت اور ان کے احساس ذمہ داری کو ثابت کرتی ہیں اور آپ کے دور میں اس طرح کی کوششوں سے اس لیے بھی دامن بچایا گیا ہے تاکہ قوم کو یہ اندازہ نہ ہو سکے کہ تعلیم پر کتنا خرچ ہو رہا ہے اور تعمیر پر کتنا۔ آپ کے اہتمام میں طلباء کی تعلیم وتربیت ثانوی درجہ رکھتی ہے اور اولیت غیر ضروری تعمیرات کو حاصل ہے اور اس غیر ضروری تعمیرات کا فائدہ ان لوگوں کو پہنچتا ہے جو آپ کے عہدۂ اہتمام کے اہم ستون ہیں۔

(۶) آپ کے دورِ اہتمام میں کرنل کے صاحبزادے تشریف لائے اور آپ نے ان کی خوب آؤ بھگت کی اور ان کی آمد کو بہت اہمیت دی حالانکہ ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو تحریف قرآن کے قائل ہیں اور جو کھلم کھلا یہ کہتے ہیں کہ قرآن حکیم کی اسّی (۸۰) آیات ایسی ہیں کہ انہیں قرآن حکیم میں سے نکال دینا چاہئے۔ ایسے لوگوں کو عزت اور اہمیت اس لیے دی گئی تھی کہ وہ اس ایک خطیر رقم عطا کرنے کی نیت لے کر آئے تھے۔ آپ کے دورِ اہتمام میں خاص طور پر پیسے کو اور پیسے والوں کو اہمیت دی جاتی ہے خواہ وہ اسلام کے دشمن ہوں اور خواہ ملّت کے بدخواہ ہوں۔

آپ کے دورِ اہتمام میں اُس بش کے نمائندوں کی بھی عزت افزائی کی گئی جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پوری دنیا میں ایک مہم چلا رہا ہے اور تمام مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دینے میں اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔ غالباً اُس کے نمائندے کی چاپلوسی بھی اس لیے کی گئی کہ وہ ایک مالدار ملک کا سربراہ ہے اور وہ ہاں میں ہاں ملانے والوں کو بن مانگے بھی عطا کرتا ہے۔ چنانچہ یہ بھی ہوا کہ ایک مہم جو امریکہ کی مصنوعات کے خلاف چل رہی تھی جس میں ۳۲ مصنوعات شامل تھیں اور جن میں پیپسی جیسی مشروبات بھی تھیں۔ ان کو خریدنے سے مسلمانوں کو روکا جا رہا تھا لیکن امریکہ کے نمائندے دارالعلوم دیوبند میں آئے پھر علماء کا ایک وفد امریکہ گیا۔ اور جارج بش کی ایک دعوت کے بعد دین وشریعت کے مسائل بدل گئے وہ ۳۲ مصنوعات جن کی مخالفت جمعہ کے خطبوں تک میں کی جا رہی تھی اچانک حلال ہوگئیں اور علماء بھی ان سے مستفیض ہونے لگے۔ یہ سب کیا ہے؟ یہ سب دولت کی برکتیں ہیں اور ان برکتوں نے ہمارے ضمیروں کو اور ہمارے عقائد کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ آپ کی انتظامیہ کا حال یہ ہے کہ وہ صرف دولت والوں سے متأثر ہوتی ہے اہلِ دولت خواہ ہندو ہوں خواہ عیسائی اور یہودی ہوں۔ آپ کی انتظامیہ ان کے قدموں میں اپنا سر رکھنے کے لیے تیار رہتی ہے۔ حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دَور میں دارالعلوم دیوبند غریب تھا۔ کبھی کبھی دارالعلوم کو دیوبند کے متمول حضرات سے قرض بھی لینا پڑ جاتا تھا لیکن اس دَور میں اگرچہ دارالعلوم دیوبند کی چادر چھوٹی تھی لیکن ظرف بہت بڑا تھا۔ اور دارالعلوم دیوبند کے در و دیوار دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ یہ ایک روحانی ادارہ ہے۔ عمارتیں قدیم طرز پر بنی ہوئی تھیں لیکن ان میں روحانیت تھی۔ اُس عمارت کے مکینوں میں اخلاص تھا اور حسنِ عقائد کی خُو بُو تھی، شرافت تھی، پرہیزگاری تھی، احتسابِ آخرت کی فکر تھی، خوفِ خداوندی تھا۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے دربان تک شب بیدار تھے اور اساتذہ کی اکثریت متجاب الدعوات تھی، کیونکہ یہاں کے ملازمین کو جو تنخواہیں ملتی تھیں وہ خالصتاً حلال کی ہوتی تھیں۔ چندہ دہندگان اپنی محنت کی کمائی کا ایک ایک روپیہ دارالعلوم دیوبند کو دیا کرتے تھے۔ چندہ ہزاروں میں آتا تھا لیکن محنت اور حلال کی کمائی کا ہوتا تھا اور وہ طلباء اور اساتذہ پر اثر انداز ہوتا تھا۔ وہ جب خوراک بن کر جزوِ بدن بنتا تھا تو ایمان وعقائد مضبوط ہو جاتے تھے اور خود بخود اللہ کی نافرمانی کرنے سے انسان باز رہتا تھا، کیونکہ رزق حلال کی خوبی یہ ہے کہ وہ انسان کو اللہ کی عبادت پر اُکساتا ہے اور معصیتوں سے باز رکھتا ہے۔ آپ کے دورِ اہتمام میں چندہ کروڑوں میں آ رہا ہے لیکن یہ حس ہی باقی نہیں رہی ہے کہ کہاں سے آ رہا ہے۔ نمبر دو کا دھندہ کرنے والے لوگ دارالعلوم دیوبند پر اپنے خزانے لٹا رہے ہیں اور ہم خوش ہو رہے ہیں کہ ہمارا بجٹ کروڑوں میں پہنچ گیا ہے اور توکل کی برکتوں سے دولت موسلا دھار بارش کی طرح برس رہی ہے لیکن جب سے رقومات بے تحاشہ برس رہی ہیں تب سے دارالعلوم دیوبند کی روحانیت نیست و نابود ہو کر رہ گئی ہے اور جب سے انتظامیہ کے دل و دماغ پر اربابِ دولت چھا گئے ہیں تب سے دارالعلوم دیوبند کے ملازمین کی بھی

سوچ وفکر بالکل بدل گئی ہے۔ پہلے دَور کے کارکنانِ دارالعلوم کی یہ خواہش ہوا کرتی تھی کہ وہ صاحبِ نسبت بنیں، ان میں دیانت، تورع اور تقویٰ پیدا ہو جائے ان کی دعائیں قبول ہوں اور ان میں مخلوق کی خدمت کرنے کا جذبہ پیدا ہو اور انہیں اپنے چھوٹوں کے ساتھ شفقت کرنے اور اپنے بڑوں کی توقیر کرنے کی توفیق نصیب ہو یہ خیالات پیدا ہوا کرتے تھے۔ ان لوگوں کے جو دارالعلوم دیوبند میں ملازمت کیا کرتے تھے اور اس دَور کے ملازمین کی صورتِ حال یہ ہے کہ ہر ایک کارکن کی یہ خواہش ہے کہ اس کا گھر ایک بنگلے جیسا ہو۔ اس میں معیاری قسم کا فرنیچر ہو اس کے پاس عمدہ قسم کی کار ہو اس کے بچے انگلش میڈیم اسکول میں زیرِ تعلیم ہوں اور اس کی دوڑ امریکہ اور لندن تک ہو۔ جب دارالعلوم کی انتظامیہ دولت پرست بنی تو ملازمین بھی غربت اور تنگدامانی پر قناعت نہ کر سکے انہوں نے بھی ایسے راستے ڈھونڈنے شروع کر دیئے جن پر چل کر انسان صاحبِ حیثیت بنتا ہے اور اس طرح رفتہ رفتہ خوف خدا ختم ہو گیا ار حلال وحرام کی تمیز اُٹھ گئی۔ بے شک دارالعلوم دیوبند کی شان وشوکت پہلے سے زیادہ محسوس ہوتی ہے جدید طرز کی عمارتوں نے دنیاداروں کو بہت متأثر کر رکھا ہے اور ان عمارتوں کو ایک نظر دیکھتے ہی مالدار لوگ کچھ عطا کرنے کے لیے بے اختیار اپنی جیب میں ہاتھ ڈال دیتے ہیں لیکن جس کو کہتے ہیں روحانیت اور اکابرین دیوبند کا ترکہ وہ تلاش کرنے سے بھی نظر نہیں آتا۔ نیکی اور تقوے کا پروپیگنڈہ بہت ہے لیکن نیکی اور تقویٰ بالکل عنقا ہو کر رہ گئے ہیں اور اس طرح آپ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم دیوبند کا مقصدِ حیات بُری طرح متأثر ہوا ہے۔ آج اگر طلباء اساتذہ کا اکرام واحترام نہیں کر رہے ہیں اور اپنے بڑوں کی عزت وتوقیر نہیں کر رہے ہیں۔ اگر آج وہ سڑکوں پر غیر اسلامی طریقے سے مٹرگشتی کر رہے ہیں تو اس میں اصل قصور آپ کی انتظامیہ کا ہے کہ آپ نے ان کے سروں پر بڑی بڑی کتابوں کا بوجھ تو لاد دیا ہے لیکن ان کی تربیت واصلاح کا کوئی پروگرام مرتب نہیں کیا۔ آج کے طلباء اپنی وضع قطع سے اسلامی درسگاہ کے اسٹوڈینٹس تو محسوس ہوتے ہیں لیکن ان کے اندر ان خوبیوں کا فقدان ہے جو خوبیاں قرآن وحدیث پڑھنے والوں میں ہونی چاہئیں۔ دارالعلوم دیوبند میں موبائلوں کی چوری، گھڑیوں کا گم ہو جانا اور طلباء کے کمروں سے طلباء کے پیسے گم ہو جانا، سب باتیں اس بات کی علامت ہیں کہ ہم نے اپنے ادارے میں طلباء تو جمع کر لئے لیکن ہم انہیں پیتل سے سونا اور سونے سے کندن نہ بنا سکے۔ جبکہ طلباء میں کندن بننے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ ہم انہیں مودودیوں سے مناظرے کرنے کی، قادیانیوں سے دست وگریباں ہونے کی، بریلویوں سے برسرِ پیکار ہونے کی مشقیں تو کراتے ہیں لیکن انہیں صحیح قسم کا مسلمان بننے کی، اشرف ورشید کے جانشین بننے کی تعلیم نہیں دیتے۔ انہیں اچھا انسان بنانے کی فکر نہیں کرتے۔

آپ نے دولت کا سہارا لے کر مادرِ علمی کو ریشمی چادر تو اُڑھا دی لیکن آپ نے ان خصوصیات سے اس مادرِ علمی کو تقریباً محروم کر دیا جو اس مادرِ علمی کی ذاتی خصوصیات تھیں اور ان خصوصیات کی کرنوں سے ہندوستان بھر کے دینی

مدارس میں اُجالے بکھرے ہوئے تھے۔جب مادرِ علمی سے وہ خصوصیات ختم ہوگئیں تو دیگر مدارس کا حال بھی قابل تعریف نہیں رہا۔وہاں بھی میدانِ دولت میں گھوڑے دوڑائے جارہے ہیں۔کاش آپ تعمیر سے تعلیم پر اور تعلیم سے زیادہ تربیت پر دھیان دیتے تو اس دارالعلوم کی طرف جو بے شک غیر قانونی طور پر آپ کو حاصل ہوا ہے جس پر اقتدار کرنے کا جواز شرعاً آپ کو حاصل نہیں ہے کوئی انگلی نہ اُٹھاتا۔لیکن ہوا یہ کہ حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے دارالعلوم چھیننے کے بعد آپ نے مسلکِ دیوبند کی ایسی کی تیسی کردی اور دارالعلوم دیوبند کے مقصدِ حیات کو پامال کر کے رکھ دیا۔آپ کو دارالعلوم دیوبند کی ظاہری شان وشوکت کی فکر ہے لیکن اس کی باطنی خوبیوں کو آپ نے یکسر نظر انداز کر دیا ہے جو آپ کے دورِ اہتمام کی سب سے بھیانک غلطی ہے۔یہ تو طے ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں انقلاب آئے گا اور دارالعلوم دیوبند میں کوئی وحید الزماں پھر پیدا ہوگا، تاریخ پھر اپنے آپ کو دوہرائے گی جب وہ لوگ دارالعلوم دیوبند کو اپنی جاگیر بنانے میں کامیاب نہیں ہوسکے جن کے آباء واجداد نے اس کی بنیاد ڈالی تھی اور سوا سو سال تک جو اس کے کرتا دھرتا رہے تھے تو پھر آپ اس عمارت کو کیسے ہضم کرلیں گے جس کی بنیادوں میں آپ کی اور آپ کے باپ دادا کی ایک اینٹ بھی لگی ہوئی نہیں ہے۔بے شک عقل عیار ہوتی ہے اور وہ سو بھیس بدل لینے کے فن سے واقف ہوتی ہے اس لیے انسان اپنی ہر غلطی کی اور اپنے ہر گناہ کی تاویل کر کے مگن نظر آتا ہے۔لیکن نظامِ قدرت یہ ہے کہ کچھ دنوں ڈھیل دینے کے بعد جب عتابِ الٰہی آسمان سے چلنے کا ارادہ کرلیتا ہے اور اللہ میاں کی وہ لاٹھی جو اچانک سروں پر پڑنے لگتی ہے جو نظر بھی نہیں آتی اور جس کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی پھر انسان کے لیے توبہ کے دروازے بھی بند ہوجاتے ہیں اور راہِ فرار کا راستہ بھی۔میں آپ سے اور ان تمام علماء سے جو آپ کے ہمنوا ہیں طالبِ علمانہ گزارش کروں گا کہ وہ اپنے احوال پر نظر ثانی کریں۔دارالعلوم دیوبند کا جدید ایڈیشن چھاپنے کی غرض سے اس کے ان اوراق کو پامال نہ کریں جو بزرگوں کی نشانی ہیں، جن میں کشش نہیں ہے لیکن روحانیت سے وہ مال مال ہیں۔اگر ہم نے دارالعلوم کا مقصد حیات فوت کردیا تو خواہ ہم اس کو دولت کا سہارا لے کر امریکہ کے وہائٹ جیسا کیوں نہ بنادیں، لیکن ہم حقیقتاً ناکام رہیں گے اور بزرگوں کی قائم کردہ اس عمارت کا قتل کرنے والوں میں شمار ہوں گے، کیونکہ ہمیں صرف اس ادارے کے ناک نقشے کی فکر ہے۔اور اس کے باطن کی خوبیوں کو ہم بہت بے دردی کے ساتھ ذبح کررہے ہیں اور یہ سب کام مجلسِ شوریٰ کی ناک کے نیچے ہو رہا ہے، افسوس فالافسوس۔

(مادرِ علمی کا خیر خواہ)
حسن الہاشمی
(طلسماتی دنیا ستمبر ۲۰۰۷ء)

چوتھا خط

آج سب سے پہلے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ذمہ دارانِ مطبخ کی سرزنش کر کے مطبخ کے نظام کو درست کرلیا ہے اور طلسماتی دنیا کے احتجاج کے بعد دارالعلوم دیوبند کے طلباء کو کھانا ان کی شان کے مطابق دیا جارہا ہے۔اب کھانے میں گوشت بھی ٹھیک ہے، گھی اور مصالحوں کا استعمال بھی معقول انداز میں کیا جارہا ہے جب کہ آج سے چند ماہ قبل کھانا غیر معیاری تھا اور طلباء از راہِ مجبوری اس کھانے کو برداشت کرتے تھے اگر آپ آئندہ بھی وقتاً فوقتاً کسی بھی طالبِ علم سے اچانک کھانا منگا کر کھالیا کریں یا اس کا معائنہ کرلیا کریں تو آپ پر خود بخود مطبخ کے کارکنان کی ایمانداری یا بے ایمانی کھلتی رہے گی اور ہمہ شمہ کو انگلی اُٹھانے کا حق نہیں رہے گا۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ آج کے دَور میں خوفِ خدا سے زیادہ خوفِ مہتمم اہمیت رکھتا ہے، جو لوگ اللہ کی گرفت سے نہیں ڈرتے وہ مہتمم کی پکڑ سے ضرور ڈر جائیں گے اور اشیاء خوردنی میں کٹوتی کرنے سے باز آجائیں گے۔

آج کی مجلس میں پھر آپ کی ان چند خامیوں پر سرسری سی نظر ڈال لیں جو آپ کے اہتمام کا ایک حصہ بن چکی ہیں اور نہ جانے کیوں آپ کو اپنی ان خامیوں کا نہ اندازہ ہوتا ہے اور نہ آپ ان سے گریز کرنے کی کوشش کرتے ہیں ابھی چند ماہ پہلے کی بات ہے کہ آپ کی خدمت میں ٹاٹ سینے والا ایک ٹٹپونجیا قسم کا انسان حاضر ہوا اور اس نے آپ کو بتایا کہ سردھنے میں ایک زمین ہے جو دارالعلوم دیوبند کی ہے۔اس زمین کے کاغذات اگر نکل آئیں تو آسانی سے اس پر دارالعلوم دیوبند کا قبضہ ہوسکتا ہے۔لیکن ان کاغذات کو نکالنے کے لیے دس ہزار روپے کی ضرورت پڑے گی۔آپ نے بغیر سوچے سمجھے اور بغیر کسی سے مشورہ کئے تقریباً پچاس ہزار روپے کا حکم جاری کردیا۔ چنانچہ وہ شخص دارالعلوم دیوبند کے پچاس ہزار روپے لے کر رفو چکر ہوگیا پھر آج تک اس کا کچھ پتہ نہیں۔ظاہر ہے کہ اس نے آپ کو فریب دیا۔اصل گناہگار تو وہی ہے لیکن کسی بڑے ادارے کے سب سے بڑے ذمہ دار کو کہاں ایسا کرنا چاہئے یہ تو ایک بچکانہ سی حرکت ہے۔جسے سن کر ہنسی بھی آتی ہے اور افسوس بھی ہوتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں چندہ دینے والے لوگ اپنی محنت اور خون پسینے کی کمائی برائے طلباء آپ کے حوالے کرتے ہیں اس کمائی کا کچھ تو درد ہونا چاہئے اس کو اس طرح لٹانا جیسے پیسے کی کوئی حیثیت ہی نہ ہو ایک افسوس ناک طرزِ عمل ہے اور اس پر آخرت میں بھی باز پرس ہوسکتی ہے۔اس طرح کی باتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے زمین آپ کی کمزوری ہے اور زمین کے نام پر آپ کو فریب دینا بہت آسان ہے۔

آپ کے دورِ اہتمام میں ردِّ قادیانیت کے نام پر قادیانیت کو ایک نئی زندگی ملی ہے۔قادیانیت کا وجود تقریباً ختم سا ہوچکا تھا۔حضرت مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے قادیانیت کے جیب و گریباں نام سے ایک کتاب

چھاپی تھی جس کا مثبت اثر پڑا تھا اور پاکستان میں جہاں قادیانیت کی باقاعدہ پرورش ہوتی تھی وہاں قادیانیوں کو کافر قرار دیدیا گیا تھا اس کے بعد ہندوستان و پاکستان میں قادیانیت اچھوت بن کر رہ گئی تھی۔کون اسے منہ لگا رہا تھا لیکن آپ نے باقاعدہ ردِ قادیانیت کے لیے ایک شعبہ دارالعلوم میں کھولا اور اس کی مخالفت اس انداز میں کی کہ قادیانیت کو ایک نئی زندگی مل گئی اور وہ پھر اپنا سر اُبھارنے لگے۔ہمیں حیرت ہے کہ دارالعلوم دیوبند یہودیت اور نصرانیت کے خلاف کوئی پلاننگ کیوں نہیں کرتا۔آج کے دَور میں ضرورت اس بات کی ہے کہ دارالعلوم دیوبند یہودیت اور نصرانیت کے خلاف شعبے قائم کرے، کیونکہ اسلام کے اصل دشمن یہی ہیں اور ان ہی کے تربیت یافتہ فرقہ پرست ہندوستان کے مسلمانوں کا قتل عام کرنا چاہتے ہیں، نیز دہشت گردی کو مطعون کرتے ہوئے وہ دین اسلام کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ان کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نہ نکالنا لاکھوں مسلمانوں کو شبہے میں ڈالتا ہے اور بعض باتوں سے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہودیت دارالعلوم دیوبند کی چہار دیواری میں داخل ہوگئی ہے اور آپ اس سے بے خبر ہیں۔ان شاء اللہ کسی دوسری مجلس میں ہم اس کی باقادہ تفصیل پیش کریں گے کہ پانی کہاں کہاں مر رہا ہے اور ہمارے بنیادی عقائد کو کس طرح نقصان پہنچا رہا ہے۔آپ یقین کریں کہ دولت کی ریل پیل نے علماء کے اوسان خطا کر دیئے ہیں اور حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد مسلکِ دیوبند کی ایسی کی تیسی ہو کر رہ گئی ہے۔آج سب کچھ ہے دارالعلوم میں شاندار عمارتیں ہیں۔علماء دیوبند کے پاس کاریں، عظیم الشان بنگلے ہیں۔مسجد رشید آگرہ کے تاج محل سے نظریں ملاتی ہے لیکن، روحانیت، دیوبند کی انفرادیت علماء کا وقار اور مسلکِ دیوبند نہ جانے کہاں سوگیا ہے۔ہم ان چیزوں کو کہاں تلاش کریں!

عالی جناب! ماہنامہ طلسماتی دنیا کی تحریک سے یہ تو اندازہ ہوگیا ہے کہ آپ کچھ تو چوکنا ہوئے ہیں اور آپ نے غلطیاں کرنے والوں کو کچھ تو سزا دی ہے۔ابھی حال ہی میں آپ نے ایک ایسے دربان کو ملازمت سے برطرف کیا ہے جو مدنی گیٹ پر ڈیوٹی دیتے ہوئے مسجد رشید کے آس پاس دکان لگانے والوں سے نگر پالیکا کی سڑک کا کرایہ وصول کرتا تھا اور جو مہمان مدنی گیٹ کے پاس اپنی گاڑیاں کھڑی کرتے تھے وہ ان سے بھی پیسے وصول کرتا تھا آپ نے جلد ہی اس کو ڈیوٹی سے ہٹادیا۔خوشی کی بات ہے لیکن ابھی آپ کو ایسے بہت سے لوگوں کے کان اینٹھنے ہوں گے جو دارالعلوم دیوبند کو مسلسل نقصان پہنچا رہے ہیں اور مادرِ علمی کی رُسوائی کا باعث بنے ہوئے ہیں جب تک آپ ان لوگوں کی بے ایمانی پر کوئی حد قائم نہیں کریں گے اور جب تک آپ ان حضرات کی پکڑ نہیں کریں گے اس وقت تک دارالعلوم دیوبند کروڑوں روپے کے نقصانات سے محفوظ نہیں ہوگا۔کسی غریب ملازم کو ''چند روپے'' وصول کرنے پر جس میں دارالعلوم دیوبند کا کوئی نقصان بھی نہیں ہے ملازمت سے الگ کر دینا اور

ان بڑے ملازمین کی بڑی بے ایمانیوں کو خاطر میں نہ لانا۔ جن سے دارالعلوم دیوبند کو مسلسل نقصان پہنچ رہا ہے اور چندہ دہندگان کی رقومات تباہ و برباد ہو رہی ہیں، انصاف نہیں ہے۔ از راہِ کرم مجرمین کو الگ الگ ترازو میں نہ تولیں یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔ آپ نے جس ترازو میں دربان کو تولا ہے اسی ترازو میں ان لوگوں کو بھی تولیں جو زمین کی خریداری میں بے انتہا کمیشن وصول کر رہے ہیں اور دارالعلوم کی مالیت کے ساتھ ساتھ آپ کی آخرت کو بھی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو جب خلیفہ بنایا گیا تو انہیں فکر لاحق ہوئی تھی اور انہوں نے فرمایا تھا کہ میں یوم انصاف سے ڈرتا ہوں اگر نہر فرات کے اس پار کسی بھیڑیئے نے کسی بکری کے بچے کو پھاڑ دیا تو میں آخرت کی باز پرس سے نہیں بچ سکوں گا۔ آپ کو بھی سوچنا چاہیئے۔ دارالعلوم دیوبند کا گیٹ کوئی سا بھی ہو۔ وہ معراج گیٹ ہو، صدر گیٹ ہو باب الظاہر ہو یا مدنی گیٹ ہو کسی بھی گیٹ پر یا دارالعلوم دیوبند کی کسی جائیداد میں کہیں دُور بھی اگر کوئی کھائی باڑی ہو رہی ہوگی تو آپ بھی اللہ کی پکڑ سے نہیں بچ سکیں گے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ اہتمام میں کوئی کتا دارالعلوم دیوبند میں داخل نہیں ہوتا تھا لیکن آپ کے دورِ اہتمام میں ایک بار ایک کتیا نے دارالعلوم میں بچے دے لیے اور وہ تقریباً بیس پچیس دن تک اپنے بچوں سمیت احاطۂ دارالعلوم دیوبند میں رہی بظاہر یہ ایک معمولی سی بات ہے لیکن یہ بات آپ کے اہتمام کی ایک بڑی خامی ہے کہ آپ کو یہی پتہ نہیں کہ دارالعلوم کی چہار دیواری میں کیا ہو رہا ہے۔

شاید آپ کو اس بات کی خبر نہ ہو کہ جب دارالعلوم دیوبند کا قضیہ شباب پر تھا اور چراغ حرم کے ایڈیٹر اظہر صابری مرحوم حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پگڑی اُچھالنے میں مصروف تھے۔ اس وقت حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے معتقدین نے حضرت سے فرمایا کہ اس شخص کے خلاف کوئی کارروائی ہونی چاہیئے۔ حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ اس کا اخبار کچھ بِک بھی رہا ہے نہیں؟

معتقدین نے فرمایا کہ جی ہاں، آپ کے کچھ مخالفین اس اخبار کو خرید کر پڑھتے ہیں۔

حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا۔ چلو ہمیں گالیاں دے کر اگر کوئی اپنے بچوں کا پیٹ پال رہا ہے تو یہ بھی ہمارے لیے باعثِ سعادت ہے اور یہ کہہ کر اس کے خلاف کسی بھی طرح کی کارروائی کرنے سے منع کر دیا۔

اور ایک آپ ہیں کہ آپ کی طرف سے اور آپ کے حواریوں کی طرف سے مسلسل طلسماتی دنیا کے خلاف مقدمہ قائم کرنے کی دھمکیاں دی جارہی ہیں آپ میں اور حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں کتنا واضح فرق ہے اور یہ فرق حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ممتاز بناتا ہے اور ان کا قد مرنے کے بعد بھی آپ کے قد سے بہت اونچا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار دارالعلوم دیوبند پر قبضہ ہونے کے بعد میں آپ سے ملنے کے لیے دفتر اہتمام میں گیا تو آپ حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جگہ چھوڑ کر بیٹھے تھے میں نے پوچھا تھا کہ آپ اس جگہ پر کیوں بیٹھے ہیں اور مہتمم کی نشست پر کیوں نہیں بیٹھتے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ یہ جگہ حضرت قاری طیب صاحب کی ہے۔ میں خود کو اس جگہ بیٹھنے کا اہل نہیں مانتا۔ کتنی اچھی بات تھی اس وقت آپ کی سوچ کتنی معیاری تھی! پھر کیا ہوا۔ نہ جانے آپ کو کس کی نظر لگ گئی۔ آپ نے نہ صرف حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جگہ کو ہتھیا لیا بلکہ آپ نے حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک ایک نشانی پر بلڈوزر چلوا دیئے۔

کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں بنی ہوئی عمارتوں کو مسمار کر کے آپ ان کا نام تاریخ دارالعلوم سے مٹا دیں گے۔ حضور! معذرت کے ساتھ عرض ہے آپ کچھ بھی کر لیں لیکن جب بھی اس مادرِ علمی کا تذکرہ ہوگا آپ کا کوئی نام لے یا نہ لے حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام ضرور لے گا اور ان کے خاندان کی عظمت کا ذکر ضرور کرے گا، کیونکہ ان کی اور ان کے آباء واجداد کی خدمات ہی سے یہ مادرِ علمی پروان چڑھا۔ اللہ گواہ ہے کہ میں آپ کی دل و جان سے عزت کرتا ہوں اور آپ کی رُسوائی مجھے گوارا نہیں ہے اس لیے میں نے آج تک آپ کے کردار اور کیریکٹر کے بارے میں ایک حرف بھی زبان سے نہیں نکالا جب کہ کچھ ایسی باتیں بھی مجھے بتائی گئی ہیں کہ اگر میں انہیں طشت از بام کرتا تو آپ کے لیے بجنور سے دیوبند آنا مشکل ہو جاتا لیکن میں نے ان باتوں کو سچ نہیں مانا اور میں آپ کو اس بڑھاپے میں وہ سب تکلیفیں نہیں دینا چاہتا جو آپ کے چاہنے والوں نے ۱۹۸۲ء میں حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو پہنچائی تھیں۔

آپ کے دورِ اہتمام کی یہ بھی ایک کرامت ہے کہ آپ عمر کی تقریباً ایک سو ایک منزلیں طے کرنے کے بعد ۶۰ سال کے لوگوں کو ریٹائرڈ کر رہے ہیں اور ہمارے نزدیک ارذل العمر کو پہنچنے کے بعد کسی مہتمم کا خود مستعفی نہ ہو کر اپنے سے کم عمر والوں کو ریٹائرڈ کرنا قانون نہیں لاقانونیت ہے۔ ابھی حال میں آپ نے شیخ الحدیث مولانا نصیر احمد خاں صاحب مدظلہٗ العالیٰ کو ریٹائرڈ کر کے گھر بٹھا دیا جبکہ ان کی خدمات یقیناً آپ کی خدمات سے زیادہ ہیں اسی طرح آپ کے نشانے پر کچھ اور حضرات بھی ہیں جنہیں آپ عنقریب گھر بٹھانے والے ہیں، یہ سب کیا ہے۔؟ اور یہ ریٹائرڈمنٹ کس کھیت کا بتھوا ہے۔؟ آنجہانی مہاتما گاندھی تو یہ کہا کرتے تھے کہ اگر حکومت کرنی ہو تو عمر فاروق کا طرز اختیار کرو۔ اور آپ کا طرزِ عمل یہ بتا رہا ہے کہ آپ صحابہ کرام کے طرز پر نہ چل کر انگریزوں کے طور طریقے اختیار کر رہے ہیں کیا عہد صحابہ میں کسی خلیفہ نے کسی صحابی کو عمر کے زیادہ ہونے کی وجہ سے ریٹائرڈ کیا ہے؟ اور اگر ریٹائرڈمنٹ آپ کے نزدیک بہرحال ضروری ہے تو آپ خود کیوں اہتمام سے مستعفی نہیں ہو جاتے۔ آپ کو جو بات اپنے لیے پسند نہیں اس بات کو آپ دوسرے مسلمانوں کے لیے کیوں پسند کرتے ہیں۔

ہمارا مشورہ ہے کہ حضرت مولانا غلام رسول خاموش صاحب کے حق میں یا پھر حضرت مولانا قاری عثمان صاحب کے حق میں اپنا استعفیٰ پیش کر دیں۔ ہم یہ بات دو سال پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب اپنی ذاتی شرافت، ذاتی وجاہت اور علم وفہم کی بنا پر اس قابل ہیں کہ انہیں دارالعلوم دیوبند کا اہتمام سونپ دیا جائے۔

اس خط کی آخری بات یہ ہے کہ جب حضرت مولانا اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا سالم قاسمی کے درمیان صلح صفائی ہوگئی تھی تو پھر مولانا سالم صاحب کو اور ان سے متعلق ملازمین کو بہ نظر مخالف دیکھنا درست نہیں ہے۔ دارالعلوم وقف کے ملازمین کو اپنا سمجھیں اور ان کے بارے میں کچھ سوچیں آپ کے پاس دولت برس رہی ہے اس ساری دولت کو تعمیر میں نہ کھپائیں۔ آپ نے باب الظاہر کی آس پاس کی عمارت کے لیے تقریباً ۱۴ کروڑ روپے منظور کرلیا ہے جب کہ اس رقم کے چوتھائی حصے سے سیکڑوں علماء اور طلباء کے گھر آباد ہو سکتے ہیں دارالعلوم دیوبند کو تاج محل بنانے سے زیادہ دارالعلوم دیوبند کے مسلک کی فکر کیجئے اور یاد رکھئے کہ اگر دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم وقف کے درمیان فاصلے کم نہیں ہوئے تو مسلک دیوبند چوں چوں کا مربہ بن کر رہ جائے گا۔

ماہ شعبان میں، میں حیدرآباد میں تھا مجلس شوریٰ کی میٹنگ ہوئی اور اس میٹنگ میں اچھی خاصی غیر سنجیدگی کا مظاہرہ ہوا۔ ممبران شوریٰ کی یا پھر دیگر حضرات کی چیخ و پکار کی آواز سڑکوں تک آئی اور سننے والوں کو بہت دُکھ ہوا اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ اس طرح کی باتیں حضرت قاری طیب صاحب کے دَور میں نہیں ہوتی تھیں۔ حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد مجلسِ شوریٰ مجلس شور بہ بن کر رہ گئی۔

میں نے سنا ہے کہ آپ نے کسی شخص کو طلسماتی دنیا دکھا کر فرمایا تھا کہ یہ ہے میری ۲۵ سالہ خدمات کا صلہ، آہ۔ کاش آپ اپنی زندگی میں ایک بار بھی یہ سوچ لیتے کہ اس قاری طیب پر کیا گزری ہوگی جس کے خاندان کی سو سالہ خدمات اور خود اس کی اپنی ساٹھ سالہ خدمات کو پیروں تلے روند دیا گیا تھا کیا آپ کا غم ان کے صدمات سے بڑا ہے۔:؟

زندگی میں کبھی حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں سوچیں جنہوں نے اپنوں کا دیا ہوا ہر صدمہ برداشت کیا اور اُف تک نہ کی۔ سچ تو یہ ہے کہ حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دورِ اہتمام میں دارالعلوم دیوبند کی تعمیر اور اس کی زیب و زینت سے زیادہ دین اسلام اور مسلکِ دیوبند کی حفاظت کی اور انہوں نے مسلکِ دیوبند کی حفاظت اس طرح کی کہ کسی بھی مسلک والے پر نہ اُنگلی اُٹھائی نہ کسی کو انگوٹھا دکھایا۔ چنانچہ حضرت قاری طیب صاحب کی عزت ان کے دشمن بھی کرتے تھے۔

آپ کے دورِ اہتمام میں مسلکِ دیوبند کے تانے بانے بکھر کر رہ گئے اور فاضل دیوبند کی ایک بڑی کھیپ آپ کی مخالف ہوگئی۔ ایک طرف تو آپ کا حال یہ ہے کہ آپ وفاقِ مدارس کے اجلاس کرتے ہیں اور مدارس کو متحد

کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور دوسری طرف آپ کا حال یہ ہے کہ آپ اجمیر میں بم پھٹنے کے بعد فاضلین دیوبند پر جو الزامات لگے ہیں آپ ان کی تردید تک نہیں کرتے اور فاضلین دیوبند کا کچھ دفاع کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔

ایک عدالت نے نکاح کے رجسٹریشن کو ضروری قرار دیدیا ہے جو ایک طرح سے مسلم پرسنل لاء میں تحریف کے مترادف ہے لیکن آپ اس بارے میں بالکل خاموش ہیں۔؟ کیا اس طرح کے معاملات میں دارالعلوم دیوبند کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔؟ کیا دین اسلام کا تحفظ آپ کا فرض نہیں ہے۔؟

مادر علمی کا خیر خواہ
حسن الہاشمی
(طلسماتی دنیا دسمبر ۲۰۰۷ء)

پانچواں خط

آپ کے دورِ اہتمام میں باشندگانِ دیوبند کی کھلی ناقدری کی جارہی ہے۔قاسمی خاندان کے ساتھ ساتھ خصوصی طور پر شیوخ برادری کے لوگ اور عمومی طور پر تمام اہلِ دیوبند آپ کے ظلم وستم کا ہدف بنے ہوئے ہیں اور آپ کے تیر ونشتر کی زد میں آرہے ہیں، حالانکہ دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی دَور میں جو قربانیاں خصوصاً شیوخ برادری کے لوگوں نے اور عموماً تمام باشندگانِ دیوبند نے دی تھیں ان کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔مادرِعلمی اہلِ دیوبند کے احسانات تلے دبی ہے۔لیکن آپ نے اہلِ دیوبند کو اچھوت قرار دے رکھا ہے۔دراصل آپ اہلِ دیوبند سے ڈرتے ہیں کیونکہ دارالعلوم دیوبند کی اچھی بری تاریخ سے یہ لوگ بخوبی واقف ہیں اور انہیں اندازہ ہے کہ تقوے کے تالاب میں کون کتنے پانی میں ہے۔اہلِ دیوبند کو یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کس طرح دارالعلوم دیوبند میں گھسے اور آپ نے خاندانِ قاسمی کو ڈنڈا ڈولی کرکے کس طرح دارالعلوم سے باہر نکالا۔آپ کو اس بات کا خوف رہتا ہے کہ یہ واقف لوگ کسی دن آپ کی مزاج پرسی نہ کر بیٹھیں اور تاریخ خود کو دہرانے پر مجبور نہ ہوجائے۔اس اَنجانے خوف کو لے کر آپ ایسے لوگوں کو قریب نہیں پھٹکنے دیتے جو آپ کی اصلیت سے واقف ہیں اور جنہیں خبر ہے کہ یہ مادرِعلمی کس خاندان کی جدوجہد سے وجود پذیر ہوئی ہے اور اب اسے کن لوگوں نے یرغمال بنالیا ہے۔وہ اہلِ دیوبند جنہوں نے دارالعلوم کی بنیاد میں اینٹ اور گارے کی جگہ اپنا خون پسینہ کھپایا تھا اپنی زمینیں اور جائیدادیں پیش کی تھیں وہ آج بھی دارالعلوم دیوبند کے ساتھ قابل قدر تعاون کرتے ہیں۔دیوبند میں سو سے زائد مساجد ہیں اور ہر مسجد میں ایک امام اور ایک مؤذن ہوتا ہے ان کا کھانا دونوں وقت اہلِ دیوبند کی طرف سے ہوتا ہے اور نہ صرف کھانا بلکہ سو سے زیادہ طلباء کے قیام کی ذمہ داری یہ اہلِ دیوبند ہی ادا کرتے ہیں اور یہ ایک قابل قدر تعاون ہے جو بارہ مہینے باشندگانِ دیوبند کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اہلِ دیوبند کو عزت دیتے تھے اور اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ اہلِ دیوبند دارالعلوم کے بہی خواہ ہیں اور انہوں نے ہر دَور میں دارالعلوم دیوبند کی اعانت کی ہے۔لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ آپ کے دورِ اہتمام میں باشندگانِ دیوبند کی کھلی توہین وتذلیل کی جارہی ہے اور ان کے ساتھ قطعاً وہی برتاؤ کیا جارہا ہے جو ایک سوتیلی ماں اپنے سوتیلے بچوں کے ساتھ کرتی ہے۔

دنیا کے تمام ہوش مند مسلمان مسجد نبوی کے ساتھ ساتھ مدینہ منورہ کا بھی احترام کرتے ہیں اور بیت الحرام کے ساتھ ساتھ مکہ مکرمہ کو بھی عزت دیتے ہیں۔لیکن آپ کی انتظامیہ کا حال یہ ہے کہ وہ دارالعلوم کو تو اہمیت دیتی ہے لیکن دیوبند کو نظر انداز کرتی ہے اور یہ ایک خلافِ انسانیت بات ہے۔کسی بھی جگہ کی مثال لے لیجئے۔وہاں کی مقدس

عمارتیں اپنی جگہ قابلِ احترام ہوتی ہیں لیکن وہ جگہ بھی باعثِ عزت مانی جاتی ہے جہاں یہ عمارتیں موجود ہوں ۔مثلاً ہریدوار میں ''ہری'' کا جو مندر ہے ہندوؤں کے نزدیک اصل تو وہی ہے لیکن اُس مندر کی وجہ سے ہندو پورے ہریدوار کو عزت دیتے ہیں اور پورے ہریدوار کو پوِتر سمجھتے ہیں ۔ہندو صرف رام مندر کا احترام نہیں کرتے بلکہ وہ پورے ایودھیا کو مقدس و محترم گردانتے ہیں ۔مولانا احمد رضا خاں کے ماننے والے صرف ان کے مزار کو مقدس نہیں سمجھتے بلکہ وہ بریلی کو بھی بریلی شریف کہتے ہیں ۔معاملہ کلیر کا ہو یا اجمیر کا، بات بنارس کی ہو یا تروپتی کی، ذکر مکے کا ہو یا مدینہ کا سبھی جگہ مقدس عمارتوں کے احترام کے ساتھ ساتھ ان مقامات کو بھی عزت دیجاتی ہے جہاں پر عمارتیں موجود ہوں ۔آپ بھی اسی دنیا کی مخلوق ہیں لیکن آپ کا حال یہ ہے کہ آپ دارالعلوم پر تو قبضہ کئے بیٹھے ہیں لیکن آپ اُس دیوبند کو ترچھی نظروں سے دیکھتے ہیں جس کی سرزمین مادرِ علمی کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اُٹھائے ہوئے ہے ۔آپ نے بظاہر دیوبند کو دارالعلوم سے کاٹ دیا ہے لیکن حقیقتاً دیوبند اور دارالعلوم کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کے خواب دیکھنے والا اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا ۔آج بھی ساری دنیا میں جبکہ دارالعلوم دیوبند کے دو ٹکڑے ہو گئے ہیں اور مادرِ علمی دو حصوں میں بٹ گئی ہے اور آپ نے قاسمی برادری کو دو پاٹوں میں تقسیم کر دیا ہے لیکن ساری دنیا آج بھی دارالعلوم کے مسلک کو وہ وقف دارالعلوم سے متعلق ہو یا سوسائٹی دارالعلوم سے ''مسلکِ دیوبند'' کا نام دیتی ہے ۔مسلکِ دارالعلوم دیوبند کا نام نہیں دیتی ۔

دارالعلوم دیوبند پر قبضہ کرنے کے پہلے دن سے آپ تاریخ کو بدل رہے ہیں ۔آپ آنے والی نسلوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دارالعلوم آپ کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے ۔آپ آہستہ آہستہ دارالعلوم کو اس کے ماضی سے الگ کر دینا چاہتے ہیں اور یہ ایک ایسا ظلم ہے کہ جس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے ۔

حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر حضرت مولانا سالم صاحب تک اور اس کے بعد بھی مولانا سفیان قاسمی صاحب تک اور مولانا فضل الرحمٰن عثمانی سے لے کر ان کے فرزندان مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی اور ان کے بعد مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانی، مفتی عتیق الرحمٰن، مولانا زبیر فضل عثمانی اور مولانا عامر عثمانی تک دارالعلوم دیوبند کی ایک تاریخ ہے ۔ایک مسلم تاریخ ۔ایک معتبر تاریخ ایک ناقابلِ فراموش تاریخ اور اس تاریخ کو بدل دینا آسان نہیں ہے ۔جو ظلم آپ کر رہے ہیں وہ ظلم تو کافر و مشرک بھی نہیں کرتے ۔

ہندوستان پر ہندوؤں کی حکومت و اقتدار کو ۵۰ سالوں سے زیادہ ہو گئے ہیں ۔انہوں نے لال قلعہ کی در و دیوار کی حفاظت کی ہے ۔قطب مینار، تاج محل اور دیگر تاریخی عمارتوں کو توڑ پھوڑ سے محفوظ رکھا ہے ۔دنیا جانتی ہے کہ لال قلعہ شاہ جہاں کی یادگار ہے ۔اسی طرح قطب مینار اور تاج محل وغیرہ مسلم حکمرانوں کی بادشاہت کا آئینہ

دار ہیں ۔ہندوؤں نے اس ملک میں اپنے اقتدار کے بعد بے شمار عمارتیں بنائیں لیکن ان عمارتوں کو نہیں توڑا کیوں کہ یہ عمارتیں کسی کی محنت، کسی کی محبت، کسی کے خلوص اور کسی کی عزت وعظمت کی یادگار ہیں اور آپ کا حال یہ ہے کہ آپ جب سے دارالعلوم دیوبند پر قابض ہوئے ہیں آپ نے دارالعلوم کو، اس کے بانیوں سے کاٹ کر رکھ دیا ہے۔آپ چن چن کر اور گن گن کر ہر اُس عمات کو مسمار کر رہے ہیں جو بانیوں کی اور بڑوں کی یاد دلاتی ہے۔آپ آنے والی نسلوں کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ یہ مادرِ علمی آپ کی پیدا کردہ ہے۔آپ ہر اُس نشان کو ختم کر دینا چاہتے ہیں جو خاندانِ قاسمی کی علامت بنا ہوا تھا اور توڑ پھوڑ کرتے وقت آپ کے دل میں درد اس لیے نہیں ہوتا کہ آپ اپنی محنت کی کمائی سے یہ سب کچھ نہیں کر رہے ہیں۔ دینے والے دارالعلوم کو دے رہے ہیں اور آپ انتہائی بے دردی کے ساتھ اس رقم کو غیر ضروری کاموں میں لگا رہے ہیں محض اس لیے تا کہ آپ کی تاریخ بنے اور بزرگوں کی تاریخ ختم ہو جائے،لیکن آپ کچھ کر لیں کتنے ہی پاپڑ بیل لیں، کتنے ہی بلڈوزر چلالیں آپ قاسمیت کو دارالعلوم سے جدا نہیں کر سکتے۔ یہ کرامت ہے حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی کہ دونوں دارالعلوم ان ہی کے خلوص کا نتیجہ ہیں اور ان کے فارغین خود کو قاسمی کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔کوئی خود کو عابدی نہیں کہتا، کوئی مدنی نہیں کہتا،کوئی مرغوبی کہنے کی غلطی نہیں کرتا۔

عالی جناب! تاریخ صرف عمارتوں سے نہیں بنتی۔تاریخ سوچ وفکر سے بنتی ہے۔نقطۂ نظر سے بنتی ہے۔زاویہ جدوجہد سے بنتی ہے اور عمارت کوئی بھی ہو اس کا روحانی تعلق اپنی بنیادوں سے ہوتا ہے۔آپ سارا دارالعلوم توڑ دیں لیکن آپ خاندانِ قاسمی کی خُوبُو کو دارالعلوم سے الگ نہیں کر سکتے۔

کسی بھی خوشبو اور کسی بھی رنگ کو اس کے پھول سے الگ کر دینا اگر ممکن نہیں ہے تو پھر یہ بات بھی ممکن نہیں ہے کہ آپ دارالعلوم دیوبند سے قاسمیت کو الگ کر دیں۔ دارالعلوم اگر ایک پھول ہے تو قاسمیت اس کی خوشبو ہے۔دارالعلوم اگر ایک ماں ہے تو قاسمیت اس کی ممتا ہے۔ماں کو ممتا سے الگ کرنے کے خواب وہی لوگ دیکھ سکتے ہیں جو نہ ماں کے مفہوم سے واقف ہوں نہ ممتا کے۔

آپ چلالیں کتنے بلڈوزر چلا سکتے ہیں۔اپنے جو بھی ارمان ہوں وہ آپ نکال لیں لیکن یہ بات یاد رکھیں کہ اس دنیا میں جب تک دارالعلوم کا وجود ہے تب تک خاندانِ قاسمی کو فراموش کر دینا ممکن نہیں ہے۔آپ کے مرنے کے بعد لوگ آپ کو یاد نہیں کریں گے اور صدیاں گزرنے کے بعد بھی حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد آتی رہے گی اور ہر طالبِ علم خود کو قاسمی ہی کہلاتا رہے گا۔مرنے کے بعد آپ کل کی بات بن جائیں گے اور خاندانِ قاسمی صدیاں گزرنے کے بعد بھی آج کی بات رہے گا۔

بقول شاعر ؎

روش دہر کا ہر نقش پکارے گا مجھے
یہ نہ سمجھو کہ مجھی تک مرا افسانہ ہے

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عہد اقتدار میں مجلس شوریٰ کے لیے ایسے لوگوں کا انتخاب کیا جاتا تھا جو مشاہیر امت میں شامل ہوں۔ جن میں لکھنے کی بھی صلاحیت ہو جو قادر الکلام بھی ہوں۔ جو دارالعلوم دیوبند کی عظمت کو، اس کے مسلک کو ثابت کرنے کے لیے گھنٹوں تقریر کر سکتے ہیں اور جو شرمِ دنیا اور خوفِ آخرت کا اثاثہ اپنے ساتھ رکھتے ہوں لیکن آپ کے دورِ اہتمام میں چن چن کر ایسے ممبران کا انتخاب کیا جا رہا ہے جو یا تو حاضر نہ ہو سکیں اور اگر حاضر ہو جائیں تو لب کشائی نہ کر سکیں۔ حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں اعتراضات اس لیے ہوتے تھے کہ مجلسِ شوریٰ کے ممبران میں جرأت ہوتی تھی۔ وہ کسی بھی غلطی کو دیکھ کر چپ نہیں رہتے تھے انہیں خوفِ خدا تھا۔ وہ دارالعلوم دیوبند سے وابستگی کو ضروری نہیں سمجھتے تھے اس لیے بروقت کہنا برملا کہہ دینا ان کی خصوصیت تھی۔ وہ سچ بولتے وقت اس بات کی پرواہ نہیں کرتے تھے کہ مہتمم صاحب کے چہرے پر کتنی سلوٹیں اُبھر رہی ہیں اور آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے یا پانی؟ انہیں تو ہر حال میں دارالعلوم دیوبند کے وقار اور اپنی آخرت کی فکر تھی۔ لیکن اب آپ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے ممبران منتخب کر رہے ہیں جو اولاً تو آتے ہی نہیں اور اگر توفیقِ خداوندی سے آجاتے ہیں تو نشستند و خوردند و برخاستند کے تحت آتے ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں کچھ باتیں کرتے ہیں اور رخصت ہو جاتے ہیں۔ ملازمین کے گلے شکوے، ان کی فریادیں اپنا سامنہ لے کر رہ جاتی ہیں اور مجلسِ شوریٰ ایک سال کے لیے ملازمین کو روتا بلکتا چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ اور بے چارے طلباء اور متعلقین یہ کہہ کر رہ جاتے ہیں وہ آئے بھی اور چلے بھی گئے اور ختم فسانہ ہو گیا۔ سال بھر تک مجلسِ شوریٰ کا انتظار ہوتا ہے۔ مجلسِ شوریٰ آتی ہے اور ہر بات کی تائید کر کے چلی جاتی ہے۔

پچھلے دنوں دارالعلوم دیوبند میں سات ارکان کی جگہ خالی تھی اور اُن میں سے دو ممبران دستورِ اساسی کی مجبوری کی وجہ سے ایسے منتخب کرنے تھے جو باشندگانِ دیوبند میں سے ہوں۔ آپ نے آناً فاناً ساتوں ممبران کی جگہ پُر کر دی اور ان میں سے حضرت مولانا طلحہ صاحب مدظلہ العالی کو بھی ممبر منتخب کر لیا۔ مولانا طلحہ صاحب کی بزرگی میں کوئی شک نہیں۔ بے شک وہ ایک بزرگ کے بیٹے ہیں اور خود بھی بزرگ ہیں لیکن محترم بزرگی اپنی جگہ ہے اور مشورے کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ دارالعلوم جیسے عظیم الشان ادارے میں ایسے لوگوں کو ممبر منتخب کرنا جو تنقید و تعریض کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں یا ازراہِ شرافت و تقویٰ کسی کی بُرائی بیان کرنے کی ہمت نہ کرتے ہو محض ایک دکھاوا ہے اور ساری امت کو بے وقوف بنانا ہے۔ مولانا طلحہ صاحب جیسے بزرگوں سے دعائیں لینی چاہئیں نہ کہ مشورے۔ دارالعلوم

دیوبند کو فرقہ پرست لوگ شک کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں اور مسلسل کچھ الزامات کی جگالی کر رہے ہیں۔ ایسے عالم میں مولانا طلحہ صاحب کیا مشورہ دیں گے؟ کیا انہیں فرقہ پرستوں کی تاریخ ازبر ہے؟ کیا وہ جانتے ہیں کہ سیاست کتنی گندی ہو چکی ہے؟ اور داڑھی والوں کو موردِ الزام ٹھہرانے والوں کی خباثتوں کا جغرافیہ کیا ہے؟ کیا مولانا طلحہ صاحب جیسے بزرگ کسی مہتمم کی کسی غلطی کو غلطی کہنے کی جسارت کر سکتے ہیں؟

آپ نے دیوبند کی خانہ پُری کرنے کے لیے حضرت مولانا سید خلیل حسین میاں صاحب کو بھی ممبر منتخب کیا ہے۔ یہ بھی صرف ایک دکھاوا ہے تاکہ دیوبندیوں کی منہ بھرائی ہو جائے جبکہ آپ جانتے ہیں کہ مولانا سید خلیل میاں صاحب دیوبند میں تر کاً آتے ہیں وہ تو عرصہ سے مدینہ میں مقیم ہو چکے ہیں جو بزرگ دیوبند آتے ہی نہ ہوں، جن کی سکونت مدینہ منورہ میں ہو وہ اہلِ دیوبند کی نمائندگی کیسے کریں گے؟ اور وہ بھی بزرگ ہیں اور بزرگ لوگ اعتراض نہیں کیا کرتے وہ تو ازراہِ مزاج اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا ہی کہتے ہیں۔ وہ کسی بات پر روک ٹوک کیوں کریں گے۔ بزرگوں کا مزاج تو چشم پوشی کرنا ہوتا ہے اور چشم پوشی سے نظام نہیں چلتے اور انتظام میں پھیلی ہوئی خرابیاں بھی رفع نہیں ہوتیں۔ مولانا سید خلیل صاحب مدظلہٗ العالی کا تو کسی میٹنگ میں آنا امرِ محال ہے۔ وہ دارالعلوم کی خاطر مدینہ کی بابرکت فضا کو کیوں چھوڑ دیں گے؟ پھر ایسی شخصیت کو مجلسِ شوریٰ کا ممبر منتخب کرنے پر دارالعلوم کا کیا فائدہ ہے؟ اور اس میں اہلِ دیوبند کی کیا بھلائی ہے؟ کیا اِس سادہ لوح امت کو مطمئن کرنے کے لیے ممبران منتخب کئے جا رہے ہیں۔ کیا مشورے کرنا اصل مقصد نہیں ہے؟ کیا آپ متعلقین دارالعلوم کو کھلونے تقسیم کر رہے ہیں؟ تقوے اور پرہیزگاری کا تقاضہ تو یہ ہے کہ مجلسِ شوریٰ میں ایسے لوگوں کا انتخاب کریں جو غلط کو غلط کہنے کی جرأت کر سکیں جو بروقت اور برملا رہنمائی کر سکیں اور آپ کی ناراضگیوں کی پرواہ نہ کریں جو حاضر ہی نہ ہوں یا پھر ہاں میں ہاں ملائیں یا تکلف اور بے جا طرف داریوں سے کام لیں تو ایسے ممبران رکھنے یا نہ رکھنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ۲۱ ممبران تو صرف خانہ پُری کے لیے ہیں اور بے شک خانہ پوری آپ نے کر دی ہے۔ مجلسِ شوریٰ کے انتخاب کا طریقہ قطعاً غیر شرعی اور غیر اسلامی ہے۔ جب مجلسِ شوریٰ کے سامنے آپ خود جواب دہ ہیں تو آپ کو مجلس کے ممبران منتخب کرنے کا حق نہیں ہے۔ ہونا یہ چاہیئے کہ ملازمین یا چندہ دہندگان ممبران کا انتخاب کریں۔ جس ممبر کو آپ خود منتخب کر رہے ہیں آپ تو اس کے محسن ہیں۔ وہ تو آپ کے احسان تلے دبا ہوا ہے۔ وہ آپ کے خلاف زبان کیوں کھولے گا اسے آپ کی غلطیاں کیوں نظر آئیں گی اور اگر نظر آ بھی گئیں تو وہ اعتراض کر کے کیوں آپ کو ناراض کرے گا؟

عالی جناب! آپ بزرگوں کی امانت کے امین بنے ہوئے ہیں دنیا والوں کو تو ایسے ممبران کی تعداد پوری کر کے آپ مطمئن کر سکتے ہیں لیکن میدانِ حشر میں جب داورِ حشر کے سامنے اعمال نامے پیش ہوں گے، جب

نیت، سوچ وفکر، رُجحانات اور خیالات پر بھی پکڑ ہوگی تب کیا ہوگا؟ دارالعلوم دیوبند ایک ایسا ادارہ ہے اگر یہاں کا انتظام درست ہو اور مجلسِ شوریٰ کے ممبران ہوش مند، فکر منداور صاحبِ تقویٰ ہوں تو اس ادارے کے ذریعہ پوری دنیا میں اسلام کی تبلیغ بہت آسانی سے ہو سکتی ہے اور بہت آسانی سے ہم ساری دنیا کو اسلام کی حقانیت کا قائل کر سکتے ہیں۔ لیکن افسوس آپ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم دیوبند سوچ وفکر کے اعتبار سے صرف ایک مکتب بن کر رہ گیا ہے۔ جس دارالعلوم دیوبند کے بڑوں نے اس ملک کی آزادی میں بھر پور حصہ لیا تھا آج وہی دارالعلوم اسلام اور مسلمانوں پر اُٹھائے گئے اعتراضات کے جواب نہیں دے سکتا کیونکہ پوری انتظامیہ کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور اگر دلچسپی ہے تو پدرم سلطان بود کی حد تک باقی اللہ اللہ خیر صلّیٰ۔

آپ کی ناانصافیوں کا حال یہ ہے کہ دیوبندی طلباء کا داخلہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے۔ آپ نے داخلے کے جو اُصول بنائے ہیں وہ اُصول اتنے ناقص ہیں کہ ان اُصولوں کی وجہ سے اچھے اور ہوشیار طلباء محروم ہو جاتے ہیں اور ایسے طلباء کی بھرتی ہو جاتی ہے جو مسلکِ دیوبند اور دین اسلام کے لیے کچھ کر سکنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے۔ چنانچہ جشن صد سالہ کے بعد جو فارغین ملک میں پھیلے ہیں انہوں نے کوئی قابل قدر کارنامہ انجام نہیں دیا ہے۔ ان ۲۵ سالوں میں کوئی ایسا مقرر، کوئی ایسا خطیب اور کوئی ایسا قلم کار پیدا نہ ہو سکا جو اس دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دے اور جو دین اسلام کے لیے ایک ڈھال بن جائے۔ اگر ایک سال میں ۱۰ کروڑ روپے خرچ کر کے اِس دنیا کو آپ ایک خطیب اور ایک قلم کار نہ دے سکیں تو آپ کی جدوجہد کا فائدہ کیا ہے؟

جہاں تک حُفاظ تیار کرنے کا معاملہ ہے تو چھوٹے چھوٹے مدرسے بھی یہ کام کر رہے ہیں اور کامیاب ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کا مقصد حافظِ قرآن تیار کرنا نہیں ہے۔ اس کا مقصد تو ایسے انسان تیار کرنا تھا جو ساری دنیا کے لیے مثال بن سکیں۔ جس طرح مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہما اللہ ایک مثال تھے۔ کیا اب مادرِ علمی بانجھ ہوگئی ہے یا پھر اس کے ذمہ داروں میں باصلاحیت افراد پیدا کرنے کے جراثیم نہیں رہے؟

آپ کے دورِ اہتمام میں مسلکِ دیوبند اپنی حقانیت کھو چکا۔ مسلکِ دیوبند کی اپنی ایک پہچان تھی۔ وہ احداث فی الدین سے کوسوں دُور تھا۔ بدعات اور نئی نئی باتوں سے خواہ وہ کتنی ہی خوش کن اور دلفریب کیوں نہ ہوں دیوبند دُور رہا کرتا تھا اور اب یہ حال ہے کہ جھگڑا صرف لفظوں کا ہے، تنازع صرف علاقوں کا ہے، دیوبندیت اور بریلویت کا شور آج بھی ہے لیکن سنت و بدعت کی کشمکش ختم ہوگئی ہے بلکہ ہمارے دیوبند میں اب سنت و بدعت ایک دوسرے سے گلے مل رہیں ہیں۔

عمرانہ والے کیس میں جبکہ میڈیا دین اسلام کو بدنام کرنے پر تلا ہوا تھا اور اس وقت مصلحت کا تقاضہ یہ تھا کہ

ہم ایک اختلافی مسئلہ کی وجہ سے دین اسلام کو داؤ پر نہ لگائیں وقتی طور پر ہم دوسرے ائمہ کے رجحانات کی تائید کر دیں اور حنفیت کو لے کر شدت کا مظاہرہ نہ کریں لیکن آپ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ دین اسلام بدنام ہوتا رہا مگر آپ حنفیت کی پشت پناہی کرتے رہے، لیکن ماہِ مبارک میں مسجد رشید میں کھلم کھلا تہجد کی نماز باجماعت ہوتی ہے کیا یہ طریقہ حنفیت کے خلاف نہیں ہے۔ اجتماعی اعتکاف، جہری دعائیں، کسی خاص مسجد کے لیے سفر؟ کیا حنفیت ان سب چیزوں کی تائید کرتی ہے؟ جس طرح عمرانہ والے مسئلے میں آپ پوری طرح حساس بنے ہوئے ہیں اور آپ کو دین اسلام کی رُسوائی کی بھی پرواہ نہیں تھی اسی طرح ان اُمور میں آپ حساس کیوں نہیں ہیں؟ امام ابوحنیفہ کا مقابلہ اگر دوسرے ائمہ سے ہو تو آپ اپنی ضد پر اَڑ جاتے ہیں اور مصلحتوں کی بھی پرواہ نہیں کرتے اور اگر امام ابوحنیفہ کا مقابلہ آپ کے مَن پسند طریقوں اور من پسند لوگوں سے ہو تو آپ چپ سادھ لیتے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ کیا دنیا والے ان باتوں کو محسوس نہیں کرتے؟ کیا اس طرح کی باتوں سے آپ کا اپنا مقام مجروح نہیں ہوتا؟

معافی مانگنے سے اللہ بھی بڑے سے بڑا گناہ معاف کر دیتا ہے۔ اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو غلطی کی معافی مانگنے پر نہ صرف یہ کہ معاف کیا بلکہ انہیں نبوت سے سرفراز کیا لیکن آپ کی تو سوچ وفکر نرالی ہے۔ آپ کے یہاں ان لوگوں کی بھی معافی نہیں ہے جو بے چارے ناکردہ گناہوں پر بھی شرمندہ ہیں۔ حضرت مولانا اسعد مدنی اور حضرت مولانا محمد سالم قاسمی کے درمیان جب شدید ترین اختلاف کے بعد معافی تلافی ہوگئی تھی اور انہوں نے ایک دوسرے کو معاف کر دیا تھا پھر آپ نے ان دونوں کو معاف کیوں نہیں کیا؟ مولانا سالم صاحب کتنے بھی بے صلاحیت ہوں اپنے خاندان کی وجہ سے اور خاندان کی بے مثال خدمات کی وجہ سے وہ رکن شوریٰ بننے کے بجا طور پر حق دار تھے لیکن آپ نے ان کو دانستہ طور پر نظر انداز کیا، حالانکہ اگر آپ انہیں شوریٰ کا ممبر منتخب کر لیتے تو سیکڑوں اختلافات خود بخود ختم ہو جاتے اور مادرِ علمی کو بھی سکون مل جاتا کیونکہ وہ بھی اپنے بانیوں کی توہین وتذلیل کی وجہ سے مضطرب ہے اور بانی دارالعلوم کے خاندان کے ساتھ جو کھلے ظلم وستم ہو رہے ہیں ان پر وہ بھی خون کے آنسو بہاتی ہے اور ماہی بے آب کی طرح تڑپتی ہے۔

عالی جناب! ہماری آپ سے درخواست ہے کہ آپ مولانا سالم صاحب کو مجلسِ شوریٰ کا ممبر منتخب کریں اور بغیر کسی شرط کے کریں۔ وہ آپ کے خلاف کیا کر سکیں گے وہ عمر کے اُس اسٹیج پر ہیں کہ وہ اب آپ کے خلاف یا کسی اور کے ساتھ کوئی جنگ نہیں کر سکتے اور لڑنا اور اُلجھنا ان کی فطرت نہیں ہے۔ بے شک انہوں نے ایک لڑائی لڑی ہے لیکن یہ لڑائی اُن پر مسلط کی گئی تھی۔ اگر فطری طور پر وہ جنگجو ہوتے تو مولانا اسعد مدنی سے ان کی صلح اتنی آسانی سے نہیں ہو جاتی۔

ہمارا مشورہ تو یہی ہے کہ آپ دونوں مدرسوں کو ایک کرلیں تا کہ مسلک کی مزید رُسوائی نہ ہو۔ اگر آپ نے یہ

کارنامہ انجام دے دیا تو دارالعلوم کی تاریخ میں آپ کا نام سنہرے الفاظ میں لکھا جائے گا۔آپ وقف دارالعلوم کے تمام ملازمین کو اپنے سینے سے لگالیں اور وقف دارالعلوم کے تمام طلباء کا داخلہ آپ دارالعلوم میں کر دیں۔ایسا کرنے سے آپ کا کچھ نہیں بگڑے گا،آپ کا بجٹ اب بھی ہر سال بڑھتا ہی جا رہا ہے۔اگر اس نیکی کے صدور کے بعد دو چار کروڑ بجٹ میں اضافہ ہوگا تو اس میں کیا پریشانی کی بات ہے۔کتنا اچھا ہوگا سب ایک ہو جائیں گے اور خاندانِ قاسمی کو بھی وہ انتساب عطا ہو جائے گا جس کا بجا طور پر وہ حق دار ہے کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا آپ ہماری اس درخواست کو تسلیم کرلیں گے؟ ظاہر ہے کہ نہیں کیونکہ ایسا کرنے سے آپ کو تو ایک طرح کی عظمت حاصل ہو جائے گی لیکن آپ کے وہ چمچے اور وہ کف گیر جو آپ کی ذات کی گہرائی سے تَری بٹور رہے ہیں وہ چراغ پا ہو جائیں گے اور آپ کو اس طرح ورغلائیں گے کہ آپ سمجھ ہی نہیں سکیں گے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا؟ آپ کے ساتھ خیر خواہی نہیں بدخواہی ہو رہی ہے۔خوشامد، چاپلوسی اور ریاکاری نے بڑے بڑے لوگوں کی مت ماری ہے اور عظیم ترین لوگ بھی اپنے چمچوں کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔اس لیے ہم یہ اُمید نہیں کر سکتے کہ سرزمین دیوبند کا وہ اختلاف جو محض اقتدار کی خاطر شروع ہوا تھا ختم ہو جائے گا اور مسلکِ دیوبند کے ہرے بھرے زخم مندمل ہو جائیں گے۔

''ابھی حال ہی میں یہ خبر سننے کو ملی کہ باب الظاہر کے برابر والی عمارت کو توڑنے کے لیے سوا دو لاکھ روپے کا ٹھیکہ دیا گیا جبکہ ٹھیکدار نے دوسرے ٹھیکیدار سے یہ کام غالباً ۸۵ ہزار روپے میں کرالیا۔اس طرح دارالعلوم دیوبند کے ایک لاکھ چالیس ہزار روپے ضائع ہوئے لیکن اس طرح کی باتوں کی نشان دہی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ اس طرح کے مسائل میں آپ کے وہ حاشیہ بردار بھی رِشوت سے متمتع ہو رہے ہیں جنہیں آپ کسی صورت بھی خود سے جدا نہیں کر سکتے۔جس بے ایمانی سے نجات ممکن نہیں ہے اس پر بار بار واویلا کرتے رہنے سے کچھ حاصل بھی نہیں ہے''۔

پچھلے دنوں آپ نے مختلف شعبوں میں مختلف لوگوں کا تبادلہ کر دیا غالباً اس لیے کہ آپ کو یہ شک ہے کہ دارالعلوم کے ملازمین اہم راز طشت از بام کر رہے ہیں۔بھلا اِن تبادلوں سے کیا ہوگا؟ جن لوگوں کو آپ اِدھر سے اُدھر کر رہے ہیں وہ بھی تو انسان ہی ہیں وہ فرشتے تو نہیں ہیں اور وہ بھی تو آپ سے ناخوش ہیں۔انہیں اگر کسی کمزوری کا علم ہوگا تو وہ کیوں بیان نہیں کریں گے۔ملازمین کی جاسوسی کرنے اور کمزوریوں کو پھٹکارنے اور دیوبندی ملازمین کو شک کی نظروں سے دیکھنے کے بجائے آپ اپنے انتظام کو درست کریں اور انصاف کی روش کو اپنالیں۔نظام درست ہو جائے گا،سب کے ساتھ عدل ہوگا تو پھر نہ ہمیں کسی کمزوری کا علم ہوگا اور نہ آپ کو تبادلے کرنے کی ضرورت پڑے گی۔

۱۲۰سال کے بعد خاندانِ قاسمی جب دارالعلوم دیوبند سے الگ کر دیا گیا تو آپ کب تک اس اقتدار پر متمکن رہ سکیں گے۔ایک دن آپ کو بھی یہ اقتدار چھوڑنا پڑے گا اور اگر آپ نے تازندگی یہ اقتدار چھوڑا نہیں تو ایک دن آپ اس جہان فانی سے رخصت ہوں گے اور اس اقتدار کی چمک دمک اسی دنیا میں رہ جائے گی۔

آپ ہمیں اپنا مخالف اور بدخواہ سمجھتے ہیں اور ہمارے مضامین کو پڑھ کر آپ کے دل و دماغ منتشر ہو کر رہ جاتے ہیں۔دوسرے یہ کہ آپ کے حاشیہ بردار آپ کے ذہن کو صحیح سمتوں میں چلنے نہیں دیتے۔اس لیے آپ کو کوئی بھی کوتاہی اور کوئی بھی لغزش، کوتاہی اور لغزش محسوس نہیں ہوتی۔آپ یہ سمجھتے ہیں کہ جو لوگ آپ کی بے جا خوشامد اور چاپلوسی میں لگے ہوئے ہیں بس وہی آپ کے خیر خواہ ہیں اور جو لوگ آپ کو آئینہ دکھا رہے ہیں وہ آپ کے دشمن ہیں۔اسی لیے آپ آئینے کے خلاف بھی بولتے ہیں اور آئینہ دکھانے والے کے خلاف بھی۔

آپ کو ''امیرالہند'' کا خطاب دیا گیا تو کیا یہ آپ کے ساتھ خیر خواہی تھی؟ کیا آپ ''امیرالہند'' بننے کے حق دار تھے؟ اس کا جواب ہم ان شاء اللہ اگلے خط میں دیں گے۔اس خط کی آخری بات یہ ہے کہ صالح تنقید کو الزام تراشی نہ سمجھیں اور ہمارے اعتراضات کو سنجیدگی سے پڑھیں۔اِس حدیث کو پیش نظر رکھیں: حَاسَبُوْا قَبْلَ اَنْ تَحَاسَبُوْا اپنا حساب کرلو اس سے پہلے کہ آخرت میں تمہارا حساب ہو۔

آپ چاہیں تو میں آپ کے نمائندوں سے گفتگو کرنے کے لیے تیار ہوں۔میرا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ آپ خاندانِ قاسمی اور اہلِ دیوبند کے ساتھ انصاف کریں۔

مادرِ علمی کا خیر خواہ
حسن الہاشمی
(طلسماتی دنیا جنوری، فروری ۲۰۰۸ء)

چھٹا خط

محترم! کچھ لوگوں نے حضرت مولانا سید اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد آپ کو امیر الہند بنادیا اور آپ کھٹ سے امیر الہند بن گئے۔ آپ نے ایک بار بھی انکار نہیں کیا اور آپ نے ایک بار بھی اس بارے میں غور نہیں کیا کہ اِس عظیم الشان لقب کے آپ مستحق ہیں یا نہیں۔ اگر کوئی آپ کو امیر دیوبند یا امیر ضلع بجنور بناتا تو قرین صواب ہوتی لیکن پورے ہندوستان کا آپ کو امیر بنادینا تو لفظِ امیر الہند کی توہین ہے یا آپ کی ہنسی اُڑانا ہے یا پھر ملتِ اسلامیہ کے ساتھ بھونڈا مذاق ہے۔ جس وقت آپ کو یہ خطاب دیا جارہا تھا اس وقت آپ کو یہ کہنا چاہئے تھا کہ بھائیو! میں تو ارذل العمر کو پہنچ گیا ہوں، میری ٹانگوں میں دم نہیں ہے۔ کسی طرح کی بھاگ دوڑ تو درکنار میں تو چل بھی نہیں سکتا، میں ثقل سماعت کا شکار ہو چکا ہوں، میری بینائی بھی حد سے زیادہ کمزور ہو چکی ہے، میرے اعضاء آہستہ آہستہ جواب دے رہے ہیں، میرے دل و دماغ بوجہ کمزوری کئی سالوں سے ہچکولیاں کھا رہے ہیں۔ میں امیر الہند کیسے بن سکتا ہوں۔ لیکن آپ نے ایک بار بھی منع نہیں کیا اور یہ نہ بجنے والا جھنجھنا لے کر آپ اس طرح خوش ہو گئے جیسے آپ سچ مچ امیر الہند بن گئے ہوں۔

شاید آپ کو اسلامی تاریخ یاد نہیں رہی۔ ذرا یاد کیجئے امیر المؤمنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے وصال کے بعد جب صحابہ میں ایک شوریٰ منعقد ہوئی اور نیا خلیفہ منتخب کرنے کا اس کو اختیار دیا گیا اُس رات صحابہ کرام بلک بلک کر رو رہے تھے اور سہمے ہوئے تھے کیوں؟ محض اس لیے کہ خلافت کا باران کی گردن پر نہ رکھ دیا جائے۔ حضرت عمر فاروق اعظم جیسا جلیل القدر اور صاحبِ صلاحیت انسان تھرّا رہا تھا۔ دراصل یہ لوگ سچ مچ کے متقی تھے، ان کا تقویٰ اور ان کا پہناوا از راہِ کاروبار نہیں تھا۔ یہ لوگ اللہ سے ڈرتے تھے، حسابِ آخرت سے ڈرتے تھے، انہیں اس بات کا خوف دامن گیر رہتا تھا کہ کسی کی دل شکنی نہ ہو جائے، کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو جائے، کوئی بے قصور کسی سزا کی بھینٹ نہ چڑھ جائے۔

آج کا دَور عجیب دَور ہے کسی کو بھی کوئی عہدہ پکڑا دیجئے نہ وہ عہدے کی طرف دیکھے گا اور نہ اپنی طرف۔ کھٹ سے اس عہدے کو اس طرح دبوچ لے گا جیسے جہان بھر میں یہی اس عہدے کا مستحق تھا۔ نہ اسے دنیا کا ڈر ہو گا نہ آخرت کا خوف۔

یہاں میں آپ سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ یہ لفظ امیر الہند ہے کیا؟ کیا یہ کوئی خطاب ہے؟ اگر یہ کوئی خطاب ہے تو یہ خطاب سب سے پہلے کس نے کس کو دیا؟ اور خطاب کا قاعدہ یہ ہے کہ خطاب جس کو مل جاتا ہے عمر بھر بلکہ مرنے کے بعد بھی وہ خطاب اسی انسان کی پہچان بنا رہتا ہے۔ یہ نسلاً بعد نسل منتقل نہیں ہوتا۔ یہ کوئی جائیداد نہیں ہے کہ

اس میں وراثت جاری ہو۔ملک کی آزادی کے وقت مولانا ابوالکلام آزاد کو'' امام الہند'' کا خطاب دیا گیا تھا اور آج ان کے پچاسوں برس کے بعد'' امام الہند'' کا لفظ ان ہی کی پہچان بنا ہوا ہے۔اگر کوئی صرف امام الہند کہہ کر بات کرے گا تو پڑھے لکھے اور تاریخ سے واقف سامعین سمجھ جائیں گے کہ ذکر مولانا ابوالکلام کا ہو رہا ہے۔اسی طرح دوسری شخصیتوں کو جو خطابات عطا ہوئے وہ خطابات ان کی زندگی میں بھی ان کی پہچان بنے رہے اور ان کے مرنے کے بعد بھی آج تک اور قیامت تک ان کی پہچان بنے رہیں گے۔فقیہ الملّت کا خطاب حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کو دیا گیا تھا اور یہ آج بھی ان کی پہچان ہے، حکیم الامت کا خطاب حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو دیا گیا تھا اور یہ آج تک ان کی پہچان ہے، شیخ الاسلام کا خطاب حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو دیا گیا تھا اور یہ آج تک ان کی پہچان ہے، مفکر اسلام کا خطاب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کو دیا گیا تھا اور یہ آج تک ان کی پہچان ہے، مفکر ملت کا خطاب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کو دیا گیا تھا اور یہ آج تک ان کی پہچان ہے، حکیم الاسلام کا خطاب حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیا گیا تھا اور یہ آج تک ان کی پہچان ہے، خطیب العصر کا خطاب حضرت مولانا محمد سالم صاحب کو دیا گیا تھا اور یہ آج تک ان کی پہچان ہے، سلطان القلم کا خطاب حضرت مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو دیا گیا تھا اور یہ آج تک ان کی پہچان ہے، سحبان الہند کا خطاب حضرت مولانا احمد سعید صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کو دیا گیا تھا اور یہ آج تک ان کی پہچان ہے۔اسی طرح فدائے ملّت کا خطاب حضرت مولانا سید اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو دیا گیا تھا (حالانکہ یہ غلط اور خالص بکواس پر مبنی تھا؛ لیکن پھر بھی (ابوعکاشہ رحمٰن)) یہ آج تک ان کی پہچان ہے اور بالکل اسی طرح شیخ الہند کا خطاب حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیا گیا تھا اور یہ خطاب آج بھی ان کی پہچان بنا ہوا ہے وغیرہ۔گویا کہ ہر ایک خطاب ایک ہی شخصیت سے جُڑا ہوا ہوتا ہے، یہ مارا مارا نہیں پھرتا۔یہ گیند کی طرح بار بار اُچھالا نہیں جاتا۔اس حساب سے جس انسان کو سب سے پہلے ''امیر الہند'' کا خطاب ملا یہ خطاب قیامت تک اسی کی پہچان بننا چاہئے تھا، یہ خطاب اگر مولانا سید اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بھی منتقل نہ ہوتا تو اچھا ہوتا لیکن آپ کی طرف تو اس خطاب کی نسبت ایک بھونڈا مذاق ہے جو دانستہ یا نادانستہ طور پر آپ کے ہاتھ ہوا ہے ممکن ہے اس کے پیچھے یہ سوچ کارفرما ہو کہ آپ کے مرنے کے بعد پھر یہ خطاب اپنے ہی گھر کے کسی کمرے میں بیٹھ کر کسی مَن پسند کو عطا کر دیں گے۔یہ سوچ بھی محض مفاد پرستی اور اغراض پسندی کی آئینہ دار ہے اور اسی طرح کی سوچوں نے اس ملّت کا بیڑہ غرق کیا ہے۔اور اگر یہ خطاب، خطاب نہیں کوئی عہدہ ہے جو ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہو رہا ہے تو پھر آپ اس کی وضاحت کریں کہ یہ عہدہ کس طرح کے لوگوں کو عطا ہوتا ہے؟ کون اس عہدے کے حق دار ہوتے ہیں؟ اور کون لوگ اس عہدے کو عطا کرتے ہیں؟ سب سے

پہلا ''امیرالہند'' سیاست سے بالکل دُور تھا، اسے سیاست کی الف، ب کی بھی خبر نہیں تھی۔ دوسرا ''امیرالہند'' بے شک ایک سیاسی انسان تھا اور جوڑ توڑ کی زبردست صلاحیت رکھتا تھا اور اسی جوڑ توڑ کے نتیجے میں دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔ تیسرا ''امیرالہند'' آپ ہیں۔ آپ بے شک ایک مسلمان ہیں، بے شک آپ نماز روزے کے بھی پابند ہوں گے لیکن آپ نے نہ میدانِ سیاست میں کوئی گل کھلایا ہے اور نہ ہی آپ نے راہِ دین میں کوئی کارنامہ انجام دیا ہے، آپ صرف ایک مدرسے کے مہتمم ہیں، اس طرح تینوں ''امیرالہند'' ایک دوسرے سے مختلف صلاحیتوں کے لوگ ہیں۔ کیا کوئی ایک عہدہ مختلف صلاحیتوں کے لوگوں کو ملتا ہے۔ بزرگوں کے منصب پر بزرگ ہی کو بٹھایا جائے گا، کسی سیاسی آدمی کو نہیں اور سیاست کی کرسی پر سیاسی رہنما ہی اچھا لگے گا کوئی پیری مریدی کرنے والا نہیں، لیکن ہمارے معاشرے کی صورتِ حال دگرگوں ہے۔ یہاں لیڈر بھی مرید بناتے ہیں اور مرید اس لیے بنائے جاتے ہیں کہ جب سیاسی ریلی ہو تو مریدوں کی تعداد دکھا کر حکومت وقت سے اپنا چیک کیش کرائیں، یہاں پیر کے دونوں ہاتھوں میں لڈو ہوتے ہیں اور مریدوں کو نہ دنیا ملتی ہے نہ آخرت، کیونکہ اسلام اہلِ عقل کا مذہب ہے، یہ ان لوگوں کا مذہب نہیں ہے جو عقل باختہ ہوں جو کسی کا مرید بنتے ہوئے اتنی بھی اہلیت نہ رکھتے ہوں کہ اس کو پہچان لیں کہ وہ دیندار ہے یا دنیادار؟ کسی دَور میں پیری مریدی بھی ایک باوقار سلسلہ تھا اور مرید بنانے والے شیخ الاسلام اور حکیم الامت جیسے بزرگ تھے اور آج کے دَور میں جب سے پیری مریدی محض کاروبار یا اپنے مفادات کے حصول کا ذریعہ بن گئی ہے تب سے اِس میدان میں بھی ایسے ایسے ٹٹ پونجیے مرید بنانے کی کارروائیاں کر رہے ہیں کہ بس اللہ دے اور بندہ لے۔

لیکن محترم! آپ تو ایک عظیم الشان مدرسے کے مہتمم ہیں۔ آپ کو ایسی غیر سنجیدگی کا مظاہرہ ہرگز ہرگز نہیں کرنا چاہئے تھا اور آپ کو ''امیرالہند'' کا خطاب واپس کر دینا چاہئے تھا۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں یہ عرض کروں کہ اس طرح کے خطابات جو آپسی رشتوں میں ایک دوسرے کو تقسیم کئے جاتے ہیں یہ ملّتِ اسلامیہ کے ساتھ بھونڈا مذاق ہے اور اس سے ملّت کی رُسوائی ہوتی ہے اور اگر آپ کی طرف سے اس بارے میں بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ ہوا اور لفظ ''امیرالہند'' کو اسی طرح زندگی ملتی رہی تو پھر یاد رکھیں کہ کسی شہر کی کوئی گلی ایسی نہیں ہوگی جہاں ایک ''امیرالہند'' نہ ہو۔

محترم! اس طرح یہ ''امیرالہند'' کیڑے مکوڑوں کی طرح پیدا ہونے لگیں گے اور یہ ایک اچھی خاصی برادری بن کر رہ جائے گی۔ اگر یہ خطاب صرف مولانا اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات تک بھی محدود رہتا تب بھی کوئی بات نہیں تھی۔ کچھ بھی تھا مولانا اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ میں بھاگ دوڑ کی صلاحیت تو تھی؛ لیکن آپ کو ''امیرالہند'' بنا کر اس خطاب کی ایسی کی تیسی کر دی گئی ہے۔ اسی لیے اس بات کا خطرہ ہے کہ گلی گلی اور کوچے کوچے میں نئے نئے ''امیرالہند'' آئے دن پیدا ہوں گے۔ جب ''امیرالہند'' کو کچھ کرنا ہی نہیں پڑتا تو پھر اس طرح کے ''امیرالہند''

ہندوستان میں حشرات الارض کی طرح پیدا ہونے لگیں گے اور ملّت کے کام آنے کے بجائے ملّت کا ناک میں دم کر دیں گے اور دامن صرف اپنا بھریں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب کوئی اپنے نام کے آگے یا پیچھے لفظ ''امیر الہند'' لکھے گا تو عوام الناس اس کو ''امیر الہند'' کہہ کر پکارنے لگیں گے چاہے عوام کو یہ خبر نہ ہو ''امیر الہند'' کا مطلب کیا ہے۔ عوام کی اس سادہ لوحی کا فائدہ اُٹھا کر ہی بڑے بڑے خطابات آج چھوٹے بچوں کو دیئے جا رہے ہیں۔ جس نے زندگی میں کوئی چھوٹا سا بھی کارنامہ انجام نہ دیا ہو وہ بھی خود کو فدائے قوم بقلم خود لکھنا شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح کی نازیبا حرکتوں کی وجہ سے خطابوں کی وہ اہمیت نہیں رہی ہے جو کبھی تھی۔

ایک دوسری افسوسناک بات یہ ہے کہ آپ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم دیوبند کا ریکارڈ خراب ہوگیا ہے۔ وہ تاریخی ریکارڈ جو دارالعلوم دیوبند کے یومِ اوّل سے حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دور تک ایک ایک کاغذ کے ساتھ محفوظ تھا وہ آپ کے دورِ اہتمام میں سب برباد ہوگیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند پر قبضہ ہوتے ہی کچھ ریکارڈ کو تو آپ نے شروع ہی میں اِدھر اُدھر کر دیا تھا تا کہ مقدمات وغیرہ میں وہ آپ کے خلاف نہ پڑ جائے۔ باقی ریکارڈ آہستہ آہستہ آپ نے دارالعلوم دیوبند کے محافظ خانہ سے ہٹا دیا۔ حد تو یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا دستورِ اساسی بھی آج محافظ خانہ میں موجود نہیں ہے اور جو دستورِ اساسی موجود ہے اس میں شروع کے وہ صفحات پھاڑ دیئے گئے ہیں جن میں اصولِ ہشت گانہ کا ذکر تھا۔

مادرِ علمی کے ساتھ کتنی بڑی زیادتی ہے کہ آپ مادرِ علمی کی بنیادیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ اونچی اونچی عمارتیں بنانے سے کیا حاصل ہے؟ جب آپ نے مادرِ علمی کی تمام بنیادوں کو منہدم کر دیا ہے۔ مادرِ علمی کا مقصد عمدہ اور دلنشیں عمارتیں بنانا نہیں تھا اس کا اصل مقصد تو وہ تھا جو اس کے بانیوں نے طے کیا تھا لیکن اس مقصد کے آپ نے پرخچے اُڑا دیئے اور وہ تمام ثبوت بھی مٹا دیئے جو اس مدرسے کے بانیوں کی امانت تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ اس قابل نہیں تھے کہ آپ کو مادرِ علمی کا محافظ بنایا جاتا۔ آپ کے اندر دیانت و امانت کا فقدان ہے۔ غالباً آپ کو یہ خوش فہمی رہی ہوگی کہ آپ کو مہتمم اس لیے بنایا گیا تھا کہ میں مہتمم بننے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ حضرت نہیں ہرگز نہیں۔ جس وقت آپ کو مہتمم بنایا گیا اس وقت مجلسِ شوریٰ میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا سعید اکبر آبادی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا قاضی زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ، مولانا ابوسعود رحمۃ اللہ علیہ، مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے اکابر موجود تھے ان سب کے ہوتے ہوئے آپ کو مہتمم محض اس لیے بنایا گیا تھا کہ آپ مولانا اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے سمدھی تھے اور آپ کو مہتمم بنانے میں اِن مفادات کا تحفظ ممکن تھا جن کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند پر قبضہ کیا گیا تھا۔

ایک رشتہ کو نبھانے کے لیے دارالعلوم دیوبند آپ کے حوالہ کیا گیا اور اسی رشتے کو نبھانے کے لیے آپ مولانا ارشد مدنی کے مقابلہ میں عزیزم محمود مدنی کو فوقیت دیتے ہیں۔ افسوسناک بات ہے کہ وہ مادرِ علمی جس کو ہزاروں اکابر نے اپنے خون سے سینچا تھا وہ بے چاری سسرالی رشتوں کے نذر ہو کر رہ گئی۔

ابھی حال ہی میں ہمیں یہ معلومات فراہم ہوئیں کہ آپ نے دارالعلوم دیوبند کے لیے تقریباً ایک کروڑ روپے کی لکڑی ضلع بجنور سے خریدی ہے۔ کیا ضلع مظفر نگر اور ضلع سہارنپور میں لکڑی ناپید ہوگئی تھی جو آپ نے لکڑی خریدنے کے لیے ضلع بجنور کا انتخاب کیا؟ ظاہر ہے کہ نہیں بلکہ ضلع بجنور سے لکڑی محض اس لیے خریدی گئی کہ وہاں سے لکڑی خریدنے میں اپنے کا کچھ فائدہ تھا۔ اگر یہ لکڑی آس پاس سے خریدی جاتی تو اس میں جو کمیشن ہاتھ میں آتا اس میں دوسرے بھی حصے دار ہو جاتے اور وہاں سے لکڑی خریدنے میں جو لاکھوں روپے کا کمیشن بنا ہوگا۔ وہ صرف اپنے رشتے داروں کے ہاتھ میں آیا ہوگا۔ کیا اِس طرح کے فیصلے جو آپ کر رہے ہیں دیانت کے منافی نہیں ہیں؟

عالی جناب! آپ نے ایک شخص کو دفتر محاسبی میں محض اس لیے ملازم رکھا تھا کہ وہ مختلف شعبوں کی جانچ پڑتال کر کے مختلف کارندوں کی صحیح صورتِ حال سے آپ کو آگاہ کریں گے۔ اُس شخص نے چند ماہ کے اندر کئی لوگوں کی بے ایمانیوں سے آپ کو آگاہ کیا اور ان کی صحیح رپورٹ بنا کر آپ کی خدمت میں پیش کی لیکن آپ نے اس کی رپورٹ پر دھیان نہیں دیا۔ اس نے بار بار آپ کی توجہ کچھ ایسے لوگوں کی طرف مبذول کرائی جو مختلف انداز سے بے ایمانیاں کر رہے تھے اور دارالعلوم دیوبند کے سرمائے کو اپنے ذاتی کاموں میں خرچ کر رہے تھے لیکن آپ نے پھر بھی اس کی رپورٹ پر توجہ نہیں دی۔ جب آپ کو یقین ہوگیا کہ یہ شخص جس کا نام فخر الاسلام ہے دیانت داری کی باتوں سے باز نہیں آئے گا تو آپ نے اس سے کہا کہ تم مکتبہ دارالعلوم میں شاداب نام کا جو آدمی کام کرتا ہے اس کی رپورٹ دو۔ دراصل شاداب سے آپ کو کسی بنا پر اختلاف تھا اور آپ اس کے خلاف رپورٹ لکھوانا چاہتے تھے۔ فخر الاسلام نے شاداب کے حسابات و معاملات پر غور و خوض کیا اور بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ شاداب ایک ایماندار انسان ہے اور دیانت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہا ہے۔ چنانچہ فخر الاسلام نے شاداب کی مثبت رپورٹ تیار کر کے آپ کو دیدی لیکن آپ نے اس رپورٹ کو بھی نہیں مانا۔ دراصل آپ جن لوگوں کو چاہتے ہیں خواہ وہ بے ایمان ہوں ان کے موافق رپورٹ لکھوانا چاہتے ہیں اور آپ جن لوگوں کے مخالف ہیں خواہ وہ ایماندار ہوں ان لوگوں کے خلاف رپورٹ لکھوانے کے خواہش مند رہتے ہیں۔ آپ نے فخر الاسلام کی دونوں رپورٹوں پر دھیان اس لیے بھی نہیں دیا کیونکہ جو رپورٹ اس نے ان لوگوں کے خلاف دی تھی وہ آپ کے اپنے لوگ تھے اور رپورٹ اس نے شاداب کی موافقت میں لکھی تھی وہ شاداب آپ کی نظروں میں ناپسندیدہ تھا۔ اس لیے آپ نے فخر الاسلام کی دونوں رپورٹوں کو مسترد کر دیا اور فخر الاسلام کو بہت مایوسی ہوئی بالآخر اس نے آپ سے یہ کہا کہ:

حضرت مہتمم صاحب! آپ اُن لوگوں کو دارالعلوم دیوبند سے الگ کرنا نہیں چاہتے جو مسلسل بے ایمانیاں کر رہے ہیں اور دارالعلوم دیوبند کو مستقل نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اور جب آپ میری رپورٹ پر عمل نہیں چاہتے تو پھر میری ضرورت ہی کیا ہے؟ اور فخرالاسلام نے استعفیٰ دے دیا۔

حضور! یہ واقعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ آپ دیانت کو پسند نہیں کرتے۔ اسی لیے دارالعلوم دیوبند میں بے ایمانیاں پل بڑھ رہی ہیں، میں راقم الحروف یہ سمجھتا تھا کہ آپ خود دیانت دار ہیں لیکن آپ کے چمچوں نے آپ کو غلط فہمیوں میں مبتلا کر رکھا ہے فخرالاسلام کی اچھی بُری رپورٹ اور اس کے استعفیٰ نے ہماری خوش فہمی کو ختم کر دیا اور ہمیں یہ یقین ہوگیا ہے کہ دیانت خود آپ کے اندر موجود نہیں ہے۔ اور جس انسان میں دیانت نہ ہو اس کو اتنے بڑے ادارے کا انتظام سنبھالنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ازراہِ کرم آپ فوراً استعفیٰ پیش کریں اور مرنے سے پہلے توبہ کرلیں ورنہ مرنے کے بعد کی زندگی میں جہاں نہ چمچے ہوں گے نہ اولاد آپ کو بہت کٹھنائیوں سے گزرنا پڑے گا۔

خدا حافظ
مادرِ علمی کا خیر خواہ
حسن الہاشمی
(طلسماتی دنیا مارچ ۲۰۰۸ء)

ساتواں خط

عالی جناب! دہشت گردی سے متعلق ہونے والی کانفرنس میں آپ اپنے خطبۂ صدارت میں فرماتے ہیں کہ:

> ''سب سے اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ مدارسِ اسلامیہ ہمارے ہاتھ میں ہمارے اسلاف اور ملّتِ اسلامیہ کی نہایت قیمتی امانت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس امانت کی ہر پہلو سے حفاظت کرنا اور اس کا حق ادا کرنا ہمارا سب سے اہم فریضہ ہے''۔

آپ نے بالکل بجا فرمایا ہے تمام دینی مدارس نہ کوئی جائیداد ہیں اور نہ کوئی مِلک یہ اسلاف کی امانت ہیں اور امانت کا قاعدہ یہ ہے کہ اس کو جوں کے توں ایک دن واپس کرنا ہوتا ہے اور اس میں کسی بھی طرح کی خیانت کرنے والا گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ مادرِ علمی جس کے آپ فی الحال منتظم ہیں وہ بھی اسلاف کی ایک امانت ہے وہ آپ کی اپنی جائیداد یا املاک نہیں ہے کہ آپ اس میں من مانیاں کریں اور اسلاف کی قدروں کو کھلم کھلا ملیامیٹ کریں۔ آپ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم دیوبند کا محافظ خانہ اور اس میں رکھی ہوئی امانتیں خرد برد ہوگئی ہیں وہ سارے ریکارڈ جو دارالعلوم دیوبند کی تاسیس سے لے کر حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ اہتمام تک پوری طرح محفوظ تھے اب محفوظ نہیں ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ وہ اُصولِ ہشت گانہ جو بانیٔ دارالعلوم دیوبند کی سب سے اہم امانت تھی اور جس کو روزِ اوّل سے روحِ دارالعلوم دیوبند سمجھا جاتا تھا آپ اس کا تحفظ بھی نہ کرسکے۔ کسی بھی ملک میں اور کسی بھی سلطنت میں اور کسی بھی ادارے میں قدیم عمارتیں جن کی تعمیر بزرگوں کے عہدِ مقدس میں کی گئی ہو وہ آثارِ قدیمہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک طرح کی یادگار ہوتی ہیں اور اس طرح کی یادگاروں کی حفاظت کرنا بھی صاحبِ انتظام کے لیے ضروری ہوتا ہے، کیونکہ ان عمارتوں سے قرونِ اولیٰ کی یادیں وابستہ ہوتی ہیں اور ان کے بوسیدہ در و دیوار میں ایک طرح کی روحانیت ہوتی ہے جو اسلاف کی امانت کا درجہ رکھتی ہے لیکن آپ کے دورِ اہتمام میں اس امانت کی حفاظت بھی نہ ہوسکی۔ بجائے اس کے آپ ان بوسیدہ عمارتوں کی اچھے پیمانے پر مرمت کراتے آپ نے ان عمارتوں کے ساتھ اور ان عمارتوں کے ساتھ وابستہ یادوں کے ساتھ ناقدری کا معاملہ کیا اور ان کو منہدم کرادیا اس طرح آپ عہدِ اسلاف کے رنگ و بُو کا تحفظ بھی نہ کرسکے۔

آپ دوسروں کو یہ بات سمجھا رہے ہیں کہ یہ مدارسِ اسلامیہ ہمارے ہاتھ میں اسلاف اور ملّتِ اسلامیہ کی امانت ہیں۔ لیکن یہ بات آپ خود کیوں نہیں سمجھ رہے ہیں۔ آپ کے ہاتھ میں تو مادرِ علمی کا انتظام ہے۔ آپ نے اس مادرِ علمی کو جو (اگر بُرا نہ مانیں) آپ کے ہاتھوں میں جائز طریقے سے نہیں آئی تھی اپنی مِلک اور اپنی ذاتی جاگیر سمجھ لیا ہے۔ آپ کو اس بات کا احساس کیوں نہیں ہے کہ یہ مادرِ علمی بھی اسلاف اور ملّتِ اسلامیہ کی ایک امانت

ہے اور اس میں کسی بھی طرح کی خیانت کرنا اخلاقاً، شرعاً اور قانوناً جائز نہیں ہے۔

قرآن حکیم میں فرمایا گیا: وَادْخُلُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا گھروں میں دروازے سے داخل ہو اور آپ کا پہلا دستہ ۲۳ مارچ ۱۹۸۲ء کی بھیانک رات میں دیواریں پھلانگ کر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا تھا۔ کسی ادارے میں جو ملّتِ اسلامیہ کی امانت کی حیثیت رکھتا ہو اس طرح داخل ہونا اور زور زبردستی کے ساتھ کسی ایسے انتظام کو ختم کرنا جو بزرگوں سے چلا آرہا ہو کیا شرعاً جائز تھا؟ یہ عمل اگر آج یا کل آپ کے ساتھ ہو تو کیا آپ کو تکلیف نہیں پہنچے گی؟

بے شک آپ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم دیوبند کا وجود وسیع بھی ہوا اور عریض بھی جو دارالعلوم دیوبند کسی دور میں ۱۴ بیگھے میں تھا وہ اب چالیس سے بھی زیادہ بیگھے میں ہے لیکن دارالعلوم دیوبند کا وہ مسلک جو اس کی اصل روح تھا وہ آپ کے دَور میں مطلقاً پامال ہو گیا ہے۔ اب مسلک نہیں صرف مسلک کی عصبیت نظر آتی ہے اور جہاں تک روحانیت کا تعلق ہے وہ تلاش کرنے سے بھی دکھائی نہیں دیتی۔ ایسی ناگفتہ بہ صورتِ حال میں آپ یہ دعویٰ کیسے کرسکتے ہیں کہ مادرِ علمی خیانتوں سے محفوظ ہے اور جب یہ مادرِ علمی خیانتوں سے محفوظ نہیں ہے تو آپ کا دوسروں کے لیے یہ نصیحت کرنا کہ وہ دینی مدارس کو بزرگوں کی امانت سمجھیں کس رو سے جائز ہے؟ کیا آپ کی نصیحت لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ کی زد میں نہیں آتی؟

آپ سے معذرت کے ساتھ میں عرض کردوں کہ مادرِ علمی جس کا انتظام آپ چلا رہے ہیں وہ آج بھی ایک اعتبار سے مقبوضہ ہے۔ یہ آپ کو اور آپ کے فرماں رواؤں کو بزرگوں سے حاصل نہیں ہوئی بلکہ اس کو ذاتی اور سیاسی طاقتوں کا سہارا لے کر کسی کے دستِ مقدس سے چھینا گیا تھا۔ اس لیے شرعی، قانونی اور لغوی اعتبار سے یہ مقبوضہ ہی کہلائے گی۔ یہ امانت جس کو آپ خود بھی امانت باور کرا رہے ہیں آپ کو ہاتھوں سے سونپی نہیں گئی تھی بلکہ اس پر اپنی حکمتِ عملی سے قبضہ کیا گیا۔ چنانچہ ۲۰۰۴ء تک آپ مقدمات کی لپیٹ میں رہے۔ اگرچہ حضرت مولانا اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد سالم قاسمی کی ذاتی صلح نے اس قبضے کی جو ادھورا تھا تکمیل کردی ہے لیکن حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حساب وکتاب ابھی باقی ہے۔ وہ ذات جو اپنے دربار میں ذرے ذرے کا حساب لے گی وہ حضرت قاری طیب صاحب کے ساتھ ہونے والے مظالم اور اُن پر لگائے گئے بے ہودہ الزامات کو نظرانداز نہیں کرسکتی اور خوشنما عمارتوں کے ذریعہ آپ ان اسلاف کے روبرو سرخرو نہیں ہوسکتے جنھوں نے ہزار جتن کرکے اِس مادرِ علمی کی بنیاد رکھی تھی اور اس کا اصل مقصد دین اسلام تھا۔ مسلکِ دیوبند تھا۔ علم ومعرفت تھا۔ تاج محل تعمیر کرنا نہیں تھا۔ اسی خطبۂ صدارت کے آخری صفحہ پر آپ فرماتے ہیں:

”اسی کے ساتھ اپنے داخلی نظام کو بہتر بنانا ازبس کہ ضروری ہے ہمارا مالیاتی نظام آئینہ کی طرح صاف

وشفاف ہونا چاہئے اسی طرح ہمارے مدارس کے ماحول کو ایک بہترین معیاری اسلامی ماحول کا نمونہ ہونا چاہئے جس میں حسنِ اخلاق، دیانت و امانت، ادائے حقوق، اتباعِ سنت اور خوفِ خدا کی حکمرانی ہو، اگر ہم اپنے معاشرے کو ان خطوط پر ڈھالنے میں کامیاب ہو گئے تو انشاءاللہ خطرات کے بادل چھٹ جائیں گے اور اس کے خلاف سازشیں اپنی موت آپ مرجائیں گی"۔

یہ بات، بات کی حد تک بہت خوبصورت، پرکشش اور دلفریب ہے لیکن اس میں تاثر اور افادیت اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب سب سے پہلے آپ خود اس پر عمل کریں۔ آپ کے دورِ اہتمام میں دیانت و امانت، اداءِ حقوق، اتباعِ سنت اور خوفِ خدا نامی چیزوں کا جو حشر ہوا وہ ہر ایک ہوش مند کی نظروں میں عیاں و بیاں ہے۔ دیانت و امانت کے بارے میں تو ہم بار بار لکھ رہے ہیں کہ آپ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم دیوبند کی قدیم عمارتیں اور دارالعلوم دیوبند کا نقطۂ نظر نیز دارالعلوم کے بنیادی بیع نامے اور ضروری کاغذات کچھ بھی محفوظ نہیں ہیں اور رقومات کے ساتھ بھی وہ سب کچھ ہوتا ہے جسے بے ایمانی اور خیانت کے سوا کسی اور نام سے موسوم نہیں کیا جاسکتا۔

ادائے حقوق کا معاملہ صرف دکھاوے کا ہے۔ آپ کے دورِ اہتمام میں ملازمین سہمے ہوئے ہیں۔ انہیں اپنی رائے کے اظہار کا حق نہیں ہے۔ وہ مجبور ہیں آپ کی خوشامد اور چاپلوسی کرنے پر کیونکہ اگر وہ آپ کے خلاف ایک حرف بھی نکالتے ہیں تو اپنی ملازمت کا خطرہ درپیش ہوتا ہے، چنانچہ کئی ملازم سچ بولنے کے نتیجے میں ملازمت سے محروم ہو چکے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے طلباء کے ساتھ جو حق تلفی کا مظاہرہ ہوتا ہے اس کو صاف طور پر محسوس کیا جاتا ہے۔ وہ دارالعلوم دیوبند جس کا بجٹ کروڑوں میں ہے اس دارالعلوم دیوبند کے طلباء اچھے کھانوں سے اور آرام دہ رہائش گاہوں سے آج بھی محروم ہیں کیا اسی کو ادائے حقوق کہتے ہیں؟

اتباعِ سنت صرف حلیے کا نام نہیں کہ چہروں پر داڑھیاں ہوں اور بدن پر کرتے اور لنگیاں ہوں تو بس اتباعِ سنت کا عمل پورا ہو گیا۔ اتباعِ سنت میں اور بھی اُمور آتے ہیں۔ ان کی طرف یکسر دھیان نہیں ہے۔ آج کل دارالعلوم دیوبند میں جو روش چل رہی ہے۔ ریٹائرمنٹ کا دستور، بے جا تعمیرات، فضول خرچیاں، خوشامد کرنے والوں کی پشت پناہی، صالح تنقید کرنے والوں پر مظالم، طلباء کے ساتھ جو مہمانِ رسول ہوتے ہیں ناروا سلوک ان کی سرِ محفل توہین و تذلیل کیا یہ سب اتباعِ سنت ہے؟

اور جہاں تک خوفِ خداوندی کا معاملہ ہے وہ شئے تو اب بالکل ہی عنقا ہو کر رہ گئی ہے۔ اگر خوفِ خدا نام کی کوئی چیز دارالعلوم میں ہوتی تو اللّے تللّے سے رقومات خرچ نہ کی جاتیں اور چندہ دینے والوں کے خون پسینے کی کمائی کو اس طرح نہ اُڑایا جاتا جس طرح آپ کے دورِ اہتمام میں اُڑایا جارہا ہے۔ بے شک ہمارے کھلے خطوط کے بعد آپ نے انتظام میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں لیکن وہ خوفِ خدا کی وجہ سے نہیں بلکہ محض اپنی حفاظت کے لیے اور اپنے اوپر لگائے گئے الزامات

کو روکنے کے لیے۔کاش آپ یہ سوچ کر کوئی اقدام کرتے کہ بزرگوں کی سب سے اہم اور قیمتی امانت آپ کے ہاتھوں میں ہے اور اس میں کسی بھی طرح کی خیانت اور کوتاہی آپ کو بروزِ محشر پریشان کر دے گی۔حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ اہتمام میں بجٹ معمولی تھا لیکن دارالعلوم دیوبند میں فضول خرچیاں نہیں تھیں۔طلباء کے ساتھ انصاف ہوتا تھا اور ملازمین کے سروں پر کوئی تلوار لٹکی ہوئی نہیں ہوتی تھی۔

آپ کا یہ غور کرنا کہ دارالعلوم دیوبند کی باتیں کون ہم تک پہنچا رہا ہے؟ اسے خوفِ خدا نہیں کہتے خوفِ خدا اسے کہتے ہیں کہ آپ یہ غور کریں کہ دارالعلوم دیوبند میں کون کون سی غلطیاں سر اُبھار رہی ہیں اور کون کون لوگ دارالعلوم دیوبند کی رقومات کو برباد کر رہے ہیں۔ہر انسان کو دنیا کی گرفت سے زیادہ آخرت کی گرفت کا احساس ہونا چاہئے اور اسی احساس کو خوفِ خدا کہتے ہیں اور جس ماحول میں احتساب آخرت کی فکر نہ ہو وہاں سب کچھ ہوتا ہے۔پکڑ دھکڑ بھی ہوتی ہے، اخراج بھی ہوتا ہے، اپنے بچاؤ کے لیے تبادلے بھی ہوتے ہیں، نکتہ چینیاں بھی ہوتی ہیں، مقدمات کی دھمکیاں بھی دی جاتی ہیں، وہاں سبھی کچھ ہوتا ہے اور اگر نہیں ہوتا تو خوفِ خدا نہیں ہوتا جبکہ خوفِ خدا دل سے ہر خوف کو نکال دیتا ہے اور خوف خدا پیدا ہوتے ہی انسان صرف اپنی کوتاہیوں کی تلاش شروع کر دیتا ہے۔وہ دوسروں کی تنقید کو تنقیص سمجھ کر مطمئن نہیں ہو جاتا۔

میں آپ کے خلاف اس سے پہلے چھ خطوط لکھ چکا ہوں۔آپ تو آپ دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کی آنکھیں بھی نہیں کھلیں، اس میں شاید اتنی اہلیت نہیں ہے کہ وہ اچھے برُے کو سمجھ سکے اور اسے بھی احتساب آخرت کی فکر نہیں ہے حالانکہ وہ ہیئتِ حاکمہ ہے اور سب سے زیادہ حساب وکتاب کی گھاٹیوں سے اُسی کو گزرنا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کی لائبریری کا کام چل رہا ہے اس میں جو کھدائی ہو رہی ہے اور مٹی کا جو ٹھیکا مشین والے کو دیا گیا ہے وہ تقریباً ۱۸ ہزار روپے میں دیا گیا ہے جب کہ دارالعلوم دیوبند کی طرف سے چار لاکھ روپے ادا کئے گئے ہیں۔تین لاکھ ۲۷ ہزار روپے کن لوگوں میں تقسیم ہوئے؟ یہ میں بھی بتا سکتا ہوں اور کچھ اور لوگ بھی لیکن یہ تو آپ کے سمجھنے اور دیکھنے کی بات ہے کیونکہ آخرت میں حساب وکتاب آپ کو ہی دینا ہے۔

اسی طرح ۲۵ فروری کو ہونے والی کانفرنس میں جلسے کے لیے جو اسٹیج بنایا گیا ہے اور اس میں جو کچھ بھی مصارف ہوئے وہ بھی بہت زیادہ ہیں۔اس اجلاس کے مصارف ۶۵ لاکھ روپے سے بھی زیادہ ہیں اور اس میں صرف ٹینٹ کا خرچ ہی نو لاکھ روپے کے قریب ہے۔کیا یہ سب کچھ فضول خرچی کے ضمن میں نہیں آتا۔قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے۔اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنَ بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔ہم جانتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند کو چندہ دینے والے دل کھول کر چندہ دیتے ہیں اور یہ کہ دارالعلوم دیوبند کے خزانے میں دولت کی کمی نہیں ہے پھر بھی اس رقم کو جو آپ کو چندے میں وصول ہوئی ہے بے تحاشہ نہیں خرچ کرنی چاہئے۔

ابھی حال ہی میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کا جو اجلاس ہوا ہے اس میں مولانا رابع ندوی مدظلہٗ العالی نے فرمایا ہے کہ جب بھی بے جا اسراف ہوگا تو اہلِ حقوق کے حقوق کی ادائیگی میں کمی آئے گی۔ ہم کہتے ہیں دارالعلوم دیوبند میں بے جا اسراف کی وجہ سے طلباء کو وہ رعایتیں نہیں دی جارہی ہیں جو ان کا جائز حق ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دَور میں بھی اجلاس ہوئے تھے اور اس میں بھی پبلک ٹوٹ کر آئی تھی لیکن ان کے دَور میں نہ پختہ اسٹیج بنتے تھے اور نہ ٹینٹ پر اتنا پیسہ برباد کیا جاتا تھا۔ دراصل انہیں چندہ دہندگان کے عطا کردہ پیسے کا درد تھا اور وہ ایک ایک روپے کو احتیاط سے خرچ کرنے کے قائل تھے۔ آپ کے دورِ اہتمام میں مختلف قسم کے ٹھیکیداروں کی پانچوں اُنگلیاں تر ہیں۔ انہیں ٹھیکیداری سے اس لیے کوئی نہیں ہٹا سکتا کیونکہ ان کے جو پشت پناہ ہیں وہ آپ کے اپنے خاص الخاص ہیں، اس لیے بزرگوں کی یہ امانت جسے مادرِ علمی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے بے چاری بذاتِ خود مخمصے کا شکار ہے اور آپ کی طرف انصاف طلب کرنے کی نظروں سے دیکھتی ہے۔ کاش آپ کی آنکھیں کھل جائیں اور آپ کو کچھ اندازہ ہوجائے کہ آپ کے دورِ اہتمام میں کیا کیا گل کھل رہے ہیں اور پانی کہاں کہاں مر رہا ہے۔

حالیہ مجلسِ شوریٰ میں ملازمین کی تنخواہوں میں ۵ فیصد کا اضافہ کیا گیا ہے جو خوشی کی بات ہے۔ اگر یہ اضافہ دس فیصد بھی کردیا جاتا تو اس کو بھی فضول خرچی نہ کہتے لیکن بے چارے طلباء اس بار بھی محروم رہے۔ ان کو صرف یہ کہہ کر بہلا دیا گیا کہ گیارہ کروڑ کے بجٹ میں ۷ کروڑ روپے طلباء کے لیے ہیں جس میں ان کی تعلیم، رہائش، کھانا، کتابیں اور ملازمین کے تمام مصارف کا ذکر آگیا ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ۱۱ کروڑ روپے میں سے باقی ۴ کروڑ کے مصارف کیا ہیں؟ جبکہ تعمیرات کا بجٹ مجلسِ عاملہ الگ سے پاس کرتی ہے؟

صحیح بات یہ ہے کہ طلباء پر دو کروڑ سے زیادہ رقم خرچ نہیں ہوتی۔ ان کو جو کھانا دیا جاتا ہے وہ بہت معمولی ہوتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے دن پھر گئے اور چندہ دینے والوں نے دارالعلوم دیوبند کو خوش حال کردیا لیکن اس خوش حال دارالعلوم میں بھی جس کی عمارتیں آنکھوں کو چکا چوند کررہی ہیں طلباء معمولی کھانے پر اور غیر آرام دہ رہائش گاہوں پر قناعت کررہے ہیں۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ جو کھانا طلباء بارہ مہینے دونوں وقت کھاتے ہیں وہ کھانا دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ ایک ہفتے لگاتار نہیں کھاسکتی۔ کاش مجلسِ شوریٰ ہی کو ان طلباء پر رحم آجاتا لیکن شاید دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ مشورے دینے نہیں آتی وہ فیصلوں کی تائید کرنے آتی ہے۔

ان شاء اللہ آئندہ میں یہ وضاحت کروں گا کہ آپ کے دورِ اہتمام میں دستورِ اساسی کی کتنی شقیں توڑ دی گئیں۔

خدا حافظ

(ماہنامہ طلسماتی دنیا اپریل ۲۰۰۸ء)

❖

دیکھ لیا قارئین آپ نے! سچ کیا ہے اور تاریخ کے نام پر کتاب چھاپ کر کیا باور کرایا جا رہا ہے، ان تمام حقائق سے آگاہی کے بعد کیا ہمارا ابتدائی عنوان غلط تھا، جو ہم نے کتاب کی ابتدا میں قائم کر کے چند صفحات تحریر کیے تھے۔

دارالعلوم دیوبند سے ایسی ایسی غیر معتبر کتابیں شائع ہونے کے بعد کیا یہ نہیں کہنا چاہئے کہ: ''دارالعلوم مر رہا ہے''

وہ دارالعلوم جو حق وصداقت کی آواز تھا، اہلِ باطل کے لیے صدائے حق کی تیغ برہنہ تھا، دیانت و ثقاہت کی پہچان تھا، ایمانداری اور دانشمندی کا مرکز تھا، ایسی غیر ثقہ کتابیں شائع کرنے کے بعد اپنے معیار سے گر نہیں گیا ہے؟ بے شک زیر تبصرہ کتاب دارالعلوم کی ثقاہت پر ایک بدنما داغ ہے۔

درج بالا خطوط میں مولوی مرغوب الرحمٰن کے کارناموں، انتظام میں اصلاح نہ کر پانے اور اہلِ دیوبند سے مخالفت کا جو ذکر کیا ہے وہ سب نتیجہ مولوی اسعد مدنی کی فرماں روائی کا تھا۔ مولوی مرغوب الرحمٰن صاحب کا ہر فیصلہ مولوی اسعد مدنی کی مرضی کے مطابق ہوتا تھا۔ شوریٰ بھی اُنھیں کے زیر اثر تھی جس کی تمام تفصیل آپ کتاب کے ابتدائی حصے میں پڑھ آئے ہیں۔ بے شک مولانا حسن الہاشمی صاحب کے یہ خطوط ہماری ایک ایک بات کی تصدیق کرنے کے لیے کافی ہیں۔ بتائیے ہم نے جو بھی لکھا کیا وہ مبنی برحقائق نہیں ہے؟ کیا مولوی مرغوب الرحمٰن کے بارے میں فاضل مرتب کے چاپلوس قلم نے جھوٹ ہی جھوٹ نہیں لکھا؟

دیکھ لیجیے حقیقت آپ کے سامنے آچکی ہے۔ اب اس سے زیادہ واضح دلائل ہم کیا پیش کریں۔

خالص بکواس:

یہ ہمارے جائزے کا آخری عنوان سمجھ لیجیے۔ ہم زیر تبصرہ کتاب کے صفحہ ۶۷۶ پہ ہیں۔ اس کے بعد چند شخصیات کا ذکر ہے اور پھر دارالعلوم سے منسلک حضرات کی فہرست دی گئی ہے جو ابتدا تا حال ہے۔ بس پھر اس کے بعد کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ ہمیں بھی اب زیادہ بات نہیں کرنی ہے؛ کیونکہ چاہے نہ چاہے یہ تبصرہ تجزیہ ہوتے ہوئے ایک ضخیم کتاب کی شکل اختیار کر گیا ہے؛ مگر کیا کریں ہمیں تحقیق کا حق ادا کرتے ہوئے فاضل مرتب کے جھوٹ اور خیانت کا پورا پوسٹ مارٹم کرنا تھا جو الحمدللہ ہم نے کیا۔ بلاشبہ یہ اللہ رب العزت ہی کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اس ناتواں سے یہ اہم اور چیلینجنگ کام لے لیا۔

ہمیں اُمید ہے کہ ہماری اِس کتاب کے بعد دارالعلوم کے ذمہ داران آئندہ کوئی بھی اس طرح کی غلو آمیز اور غیر ثقہ کتاب شائع نہ کریں گے۔

آئیے! اب کتاب کے صفحہ نمبر ۶۷۶ کا ذکر بھی کر دیں کہ فاضل مرتب نے یہاں مولوی اسعد مدنی'' کا

تذکرہ کیا ہے۔ اور آپ ملاحظہ کریں قارئین ایک ایک لفظ، ایک ایک سطر سے چاپلوسی اس طرح ٹپک رہی ہے جیسے کوڑے کے تھیلے میں سے ایک ایک بُوند مسلسل گندے پانی کی ٹپکتی ہے۔

گزشتہ صفحات میں ہم تفصیل کے ساتھ مولوی اسعد مدنی ؒ کی شخصیت کے بارے میں حقائق و واقعات بیان کرآئے ہیں؛ اس لیے یہاں کچھ بھی لکھنا بے سود ہوگا، بے کار ہوگا۔

آپ کے لیے ہم تین عبارتیں نقل کرتے ہیں تاکہ آپ دیکھیں کہ فاضل مرتب چاپلوسی کے نشے میں کیسے کیسے جھوٹ لکھ گئے ہیں۔ صفحہ ۶۷۶ پہ مولوی اسعد مدنی ؒ کا تعارف ان سطور سے شروع ہوتا ہے:

''۱- فدائے ملت، امیر الہند ثانی، ہندوستانی مسلمانوں کے عظیم قائد، ممبر پارلیمنٹ، حضرت مدنی کے جانشین، جمعیۃ علماء ہند کے صدر اور دار العلوم دیو بند کی مجلسِ شوریٰ کے رکن رکین تھے۔

۲- ۱۹۶۰ء میں آپ کو جمعیۃ علماء اُتر پردیش کا صدر منتخب کیا گیا۔

۳- تاعمر دار العلوم دیو بند کی تعمیر و ترقی میں بنیادی کردار ادا کیا۔ دار العلوم دیو بند میں شورائی نظام کی بحالی و بالادستی میں انھوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ دار العلوم دیو بند کی نشأۃِ ثانیہ کے بعد اس کی تعلیمی و تبلیغی خدمات کی توسیع و ترقی میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔''

''کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا''

کیوں قارئین! ہنسی آ رہی ہے نا؟... آنی بھی چاہیے! یہی ہوتا ہے جس انسان کے احوال و افعال مع سفاکیت و سیاست کے معلوم ہوں اور پھر اُس سیاسی اور شاطر دماغ شخص کو کوئی غیر ضروری القابات و خطابات سے نواز کر فرشتوں کی طرح اس کا ذکر کرنے لگے تو ہنسی ہی آتی ہے۔ مولوی اسعد مدنی ؒ کیا تھے یہ بڑی تفصیل کے ساتھ آپ گزشتہ صفحات میں پڑھ ہی آئے ہیں۔ اور وہ تمام تفصیل ہم نے اپنے قلم سے نہیں لکھی ہے تاکہ کوئی صاحب عقل ہم پہ بہتان تراشی کا الزام نہ لگائے؛ بلکہ تمام تر واقعات مستند اور مصدق علماء کرام کے رشحاتِ قلم کی سوغات ہیں۔ ایک ایک بات، ایک ایک قول حق و صداقت کی آواز ہے۔ آج بھی بہت سے لوگ زندہ ہیں، جو اُن تمام حقائق و واقعات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ بہرحال! ہمیں تو بس یہ عرض کرنا ہے کہ درج بالا نقل کردہ عبارتیں فاضل مرتب کے جھوٹے اور چاپلوس ہونے کی ایسی روشن دلیل ہیں جنھیں کسی طور بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

اوّل تا آخر آپ نے کتاب کا مطالعہ کر ہی لیا ہے۔ پوری کتاب میں یہی جھوٹ اور چاپلوسی کی روش کارفرما ہے۔ درج بالا عبارتوں کی اصلیت جاننے کے لیے آپ ایک بار اور پیچھے جا کر مولانا وحید الزماں کیرانوی کی تحریر ملاحظہ فرمائیں، جس میں انھوں نے بے باکی کے ساتھ مولوی اسعد مدنی کا اصلی چہرہ قوم کے سامنے ظاہر کیا ہے۔

اس کے علاوہ اکتوبر ۱۹۶۶ میں مجلسِ مشاورت کے جلسہ کا حال بھی آپ نے پڑھ لیا جس میں مولوی اسعد مدنی صاحب کا گھناؤنا چہرہ اور سفاکیت وعیاری کا نمونہ مختلف ثقہ لوگوں کے بیانات کی سند کے ساتھ ہم نے ہر ایمان والے کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

فاضل مرتب کی درج بالا سطور پڑھ کر بالکل ایسا لگتا ہے جیسے آنے والے وقت یعنی ۲۰۵۰ء یا ۲۰۴۰ء میں کوئی کم ظرف قلم کار ہندوستان کی تاریخ لکھے اور اس میں مودی اور یوگی کا تذکرہ اسی طرح کے ستائشی جملوں کے ساتھ کرتے ہوئے انھیں اپنی یعنی قومِ ہنود کا کامیاب و بہترین لیڈر و قائد ثابت کرے، تو ہم اور آپ جیسے لوگ جو ان دو حضرات کے تمام مظالم سے واقف ہیں کیا ہمیں اُس وقت اس طرح کی جھوٹی باتیں پڑھ کر ہنسی نہیں آئے گی؟

بالکل آئے گی، اسی طرح کی ہنسی ہمیں مولوی اسعد کے بارے میں درج بالا جملے پڑھ کر آ رہی ہے۔ واقعی دارالعلوم دیوبند کی تاریخ لکھنے والے فاضل مرتب نے بھی چاپلوسی کی حد کر دی ہے۔ فاضل مرتب نے دارالعلوم کی تاریخ نہیں لکھی ہے؛ بلکہ جھوٹ و افترا کا سہارا لے کر عوام کو غلط معلومات فراہم کرنے والا غلو آمیز عقیدتوں میں پنہاں شخصیت پرستی و مدح سرائی کا ایسا نمونہ پیش کیا ہے جس کی علمی حیثیت تو سرے سے کچھ ہے ہی نہیں؛ بلکہ یہ کتاب اس قدر جھوٹ اور واہیات باتوں کا پلندہ ہے کہ اسے اپنے گھر کی کسی بھی الماری میں رکھنا نہیں چاہیے۔ اسے فوراً آگ لگا دینی چاہیے؛ کیونکہ اگر یہ کتاب گھروں یا کتب خانوں میں رکھی رہی تو آنے والی نسلیں کبھی نہ کبھی اس گمراہ کن کتاب کا شکار ہو سکتی ہیں۔

......❖......

مولانا یا مولوی:

ایک بات کی وضاحت کرنا ضروری محسوس ہو رہا ہے، کہ اِس کتاب میں ہم نے اسعد مدنی صاحب ؒ کو ہر جگہ مولوی لکھا ہے مولانا نہیں، یہ بات بوقتِ مطالعہ آپ نے بھی محسوس کی ہوگی۔ اسی لیے اس کی وجہ بیان کرنا ضروری ہے۔ وجہ اس کی کوئی تعصب یا عناد نہیں ہے، بلکہ حقیقت ہے، مولانا اور مولوی دونوں الفاظ میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ مولوی کہا جاتا ہے ہر اُس شخص کو جس نے کسی دینی مدرسہ میں درسِ نظامی کی تعلیم حاصل کر کے فراغت کی سند پائی ہو۔ دورۂ حدیث پڑھ کر فارغ ہونے والا ہر شخص مولوی کہلائے جانے کا مستحق ہے؛ لیکن مولانا اُس شخص کو کہا جاتا ہے جس نے درسِ نظامی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد امت کی اصلاح اور دین کی خدمت کے جذبے سے اخلاص کے ساتھ اپنے قلم سے نمایاں خدمات انجام دی ہوں، جس نے قرآن و حدیث کے مطالب و مفاہیم کو

امت کے سامنے پیش کیا ہو۔ یاد رکھئے گا! علماء دیوبند کہے جانے والے اکابر نے اپنے قلم کے ذریعہ ہی امت کو اصلاحی و تعمیری کتابیں لکھ کر دی ہیں اور آج دنیا بھر میں امتِ مسلمہ انہیں علماء دیوبند کی کتابوں کو پڑھ کر اپنی جہالت کے اندھیرے کو علم کی روشنی سے تبدیل کر رہی ہے۔ اب بتائیے! آپ مولوی اسعد مدنی ؒ کو ہم کس طرح مولانا لکھ دیتے؛ جبکہ ہمیں خبر ہے کہ جناب فقط ایک سیاسی لیڈر تھے اور کچھ نہیں۔ ایک کتاب لکھنا تو دُور کی بات انہوں نے تو امت کی فلاح و بہبودی کی غرض اور ملک میں اپنی قوم کے حقوق کی بازیابی کی خاطر ایم پی رہتے ہوئے ایک ڈھنگ کی پُر اثر تقریر تک نہیں کی۔ مسلمانوں کو جلسے جلوس میں شامل ہونے والی ایک بھیڑ بنانے کے علاوہ موصوف نے اور کیا ہی کیا ہے۔

خیر! اللہ ان کی بشری لغزشوں کو معاف کرے اور انہیں وہاں کی راحتیں نصیب فرمائے، وہ چلے گئے؛ اس لیے ہم ان کی ذات پر کوئی کلام نہیں کریں گے۔ ہاں! ان کے افعال جو تاریخ کا حصہ ہیں وہ اسی لیے بیان کیے گئے ہیں، تاکہ لوگوں پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ دارالعلوم دیوبند سے شائع ہونے والی تاریخ کس قدر جھوٹی اور غیر معتبر ہے۔ اللہ رب العزت دارالعلوم دیوبند کی حفاظت فرمائے اور اسے نیک، صالح، مدبر و مفکر اور حق گو منتظم نصیب فرمائے۔ اور اہلِ علم کی صفوں میں شمار ہونے والوں کو قلم چلانے سے پہلے حق شناسی و حق گوئی کی توفیق سے نوازے، آمین۔

......❖......

وضاحت

ایک بات کی وضاحت کر دیں کہ ہم نے جو اس کتاب میں یہ لکھا ہے کہ مولانا مدنیؒ نے مولانا مودودی کی مخالفت سیاست کی بنا پر کی تھی اور جو بھی باتیں ہم نے لکھی ہیں، وہ تمام ہماری ذاتی رائے ہیں، اگر آپ کو یا کسی اور شخص کو اس سے اعتراض ہے تو بے شک وہ معترض ہو۔ ہم نے کوئی اُصولِ کلیہ بیان نہیں کیا ہے، اپنی فکر، اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔ جو ہماری اِس بات سے متفق ہو تو سبحان اللہ اور جو نہیں ہوتا اس سے بھی ہمیں کوئی شکایت نہیں، کہ اختلافِ رائے تو صحابہؓ میں بھی ہوا ہے، تو ہم کیا ہماری اوقات کیا۔ ہمیں جو محسوس ہوا وہ اِس کتاب میں ہم نے لکھ دیا، اب جسے ماننا ہے مانے، جسے نہیں ماننا نہ مانے۔

ہاں! اِس موضوع پر مطالعہ کرنے کے بعد اپنی دانست میں ہم خود کو صحیح مانتے ہیں۔ اب اگر کوئی ہماری فکر کارَد کرے تو ہمیں کوئی گلہ نہیں۔ آپ بہ خوشی ہمارے اس خیال سے اختلاف کر سکتے ہیں، بے شک سب کو اپنی اپنی قبر میں جانا ہے، اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ اور ہمیں حق بات کہنے، سننے کے ساتھ اسے قبول کرنے کی بھی توفیق بخشے۔ آمین یارب العالمین

ایک بات تو ہے جو ہر ایمان والے کو ماننا پڑے گی کہ ہماری اِس بات کے تو بہت سے دلائل موجود ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ مودودی کی مخالفت بر بنائے سیاست تھی اور کچھ نہیں؛ لیکن مخالفین کے عمل کی بنیاد اخلاص پر مبنی ہونے کی ایک بھی دلیل تاریخ کے اوراق میں نہیں ملتی۔ مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی کہتے رہے کہ نہ جانے کیوں حضرت مدنی اس طرح کے بے بنیاد اعتراض کر رہے ہیں؛ کیونکہ حقیقت میں تمام اعتراضات تھے ہی، اخلاص سے خالی، خالص مبنی بر سیاست۔ اگر مولانا مدنی کو امتِ مسلمہ کی اصلاح کرنے کا اتنا ہی خیال تھا تو انہوں نے فقط ایک مودودی ہی کے خلاف قلم کیوں چلایا؟ اس سے زیادہ ضرورت تو شیعیت، قادیانیت اور غیر مقلدیت کے فتنہ سے امت کو بچانے کی تھی، امت کی فکر کرتے ہوئے مولانا مدنی نے کیوں اور کوئی علمی تصنیف میں اپنا وقت نہیں لگایا؟ ایک کتاب ''الشہاب الثاقب'' لکھی، جسے آج بھی بریلوی دیوبندیت کے خلاف ہی اُٹھائے پھرتے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ دارالعلوم کے کم فہم اور حقیقت سے آنکھیں چرانے والے طلبہ اور بہت سے معتقدین ہماری معروضات پر صدق دل سے غور کرنے کے بجائے ہمیں گالیاں دیں گے اور اکابر کی توہین کرنے والا بھی کہیں گے؛ لیکن اللہ جانتا ہے ہم خود دارالعلوم دیوبند کے پڑھے ہوئے ہیں، ہم کبھی خواب میں بھی علماء دیوبند کی توہین نہیں کر سکتے، علماء دیوبند کا احترام و اکرام اور ان کی عظمت ہمارے دل میں ہمیشہ رہے گی؛ لیکن سیاسی علماء اور علماء کی متعصبانہ سیاست سے ہمیں اختلاف ہے اور رہے گا۔ آپ خود ہی بتائیں! مودودی کا کوئی اجتہاد ہو تو وہ تو

غلط عقیدہ ہوگیا۔ خارجی ہوگیا، اور حضرت حسین احمد مدنیؒ رمضان میں نوافل کی جماعت جیسا مکروہ عمل کریں جو حنفیہ کے نزدیک قطعاً مکروہ ہے، تو وہ حضرت کا تفرد ہوگا۔ یہ کیا بات ہوئی۔ دوسرا کرے تو مجرم خود کریں تو اعزاز۔ بہر حال! ہمارا مقصد حق و صداقت سب کے سامنے پیش کرنا تھا، سو کر دیا۔ اب جس کا دل چاہے ہمیں گالیاں دے، جس کا دل چاہے دعائیں۔

ویسے بھی اس پوری کتاب میں صرف ایک یہی مولانا مدنی کی مودودی سے مخالفت والی بات ہماری اپنی فکر اور اپنی دانست پر مبنی ہے، اس کے علاوہ ایک سطر، ایک جملہ یا ایک لفظ بھی ہم نے خیال آرائی یا لفاظی کے طور پر نہیں لکھا، مولوی اسعد مدنیؒ کی کارگزاریاں ہوں یا جمعیۃ علماء ہند کی ناکامیاں، مولوی مرغوب الرحمٰنؒ کے دَورِ اہتمام کی خامیاں ہوں یا مولوی محمود مدنی و فاضل مرتب کی غلط بیانیاں ہر ایک بات دلیل و برہان کے ساتھ صداقت کی کسوٹی پہ پرکھنے کے بعد ہی لکھی ہے۔ بے شک اب کوئی دارالعلوم کا طالبِ علم یا شخصیت پرستی کا اسیر ہماری معروضات کو قبول کرے یا نہ کرے، ہم بہر حال مطمئن ہیں کہ اللہ کے فضل و کرم سے ہم نے دیانت کے ساتھ حق ظاہر کر دیا ہے۔

....

گزارش

ہم تمام مسلمانوں خصوصاً طلبۂ مدارس سے یہ گزارش کرتے ہیں کہ اپنے وقت کی قدر کریں، مستقبل کے بارے میں سوچیں، خود کو مضبوط اور مستحکم کرنے کی فکر کریں، اپنی تاریخ سے واقف رہیں، اپنے اسلاف و اکابر کی علمی کاوشوں کو یاد رکھیں اور یہود و مشرکین کی ریشہ دوانیوں کے طفیل میڈیا کے ذریعہ کیے جانے والے مدارس اور علماء دین کے خلاف غلط پروپیگنڈے سے متاثر نہ ہوں۔

اسلام دشمن طاقتوں کا کام ہی یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان کے علماء سے بدگمان کر کے دین سے دُور کر دیا جائے تاکہ نہ یہ علماء سے قربت رکھیں اور نہ ہی دینی علوم سے رغبت۔ آج ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ امت علماء سے بدگمان ہو کر دین سے اتنی دُور ہوگئی ہے کہ فقط اسلامی طرز حیات اور دینی احکام ہی سے بے زاری عام نہیں؛ بلکہ میڈیا کے ذریعہ کی گئی جھوٹ کی کثرتِ تشہیر سے مسلمان خود کو قصوروار، مجبور اور غیر محفوظ سمجھنے لگا ہے۔ اور یہ سب ایک دم سے نہیں ہوگیا ہے؛ بلکہ مشرکین کی سالہاسال کی محنت اور مسلمین کی سالہاسال کی غفلت اس کی اصل وجہ ہے مشرکین نے یکسو ہو کر تسلسل کے ساتھ اپنے مقصد کے لیے جہد مسلسل کی ہے اور پانی کی ایک بوند سے پتھر پہ نشان پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ دوسری طرف مسلمانوں کی ناکامی کے ذمہ دار اُن کے وہ خود ساختہ قائد ملّت اور ملّت خود بزرگ ہیں جنھوں نے قومی یک جہتی کے نام پر بے سود اجلاس کر کر کے امت کو تعلیمی اور تعمیری استحکام کے بجائے فقط ایک بھیڑ کی شکل دے دی۔ امت کے پیسوں سے ان قائدین نے اپنے لیے زمین جائداد جمع کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ کیا۔ اس لیے ہماری یہ گزارش ہے کہ اے مسلمانوں اب بھی وقت ہے اپنے آپ کو سنبھالو اور تعلیم کے میدان میں خود کو مضبوط کرو۔ صاحب ثروت لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنی قوم کے لیے اچھے اسکولوں کا قیام کریں، معیاری ہسپتال بنائیں۔

ساتھ میں ہم طلبۂ مدارس اور نوجوان نسل کو ایک مشورہ بھی دیں گے کہ اے میری قوم کا مستقبل بنانے والو! اپنے اندر مطالعہ کا شوق پیدا کرو، پڑھو اور خوب پڑھو۔ فقط درسی نصاب کی نہیں؛ بلکہ دانشوران زمانہ کی کتابیں پڑھو۔ قسم کھالو کہ چاہے ایک وقت کھانا قضا ہو جائے؛ لیکن ایک دن بھی کوئی اچھی کتاب پڑھے بغیر نہیں گزاریں گے۔ چاہے پانچ دس صفحات پڑھو؛ لیکن روزانہ پڑھو ضرور۔ اور اِن لوگوں کی جو کتاب مل سکے وہ خرید لو اور اس کا مطالعہ کرو۔ وہ لوگ ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا عبدالماجد دریابادی، شورش کاشمیری، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، مولانا مودودی، مولانا حسن البنا، شہید محمد سید قطب، مفتی محمد تقی عثمانی، مفتی محمد رفیع عثمانی، ماہر القادری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عامر عثمانی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا ادریس کاندھلوی، علامہ

یوسف قرضاوی رحمہم اللہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے قلم سے آنے والی نسلوں کے لیے ایسا علمی ذخیرہ جمع کر گئے ہیں، جسے اسلامی تعلیمات کا ثمرہ کہا جاتا ہے۔ آپ ان تمام علماء کی تمام کتابیں پڑھیے۔ بس مولانا مناظر احسن گیلانی کی سوانح قاسمی چھوڑ دیجیے گا وہ ایک بے سود کتاب ہے۔ خود مصنف نے کتاب شائع ہونے کے بعد اسے دیکھ کر کہا تھا: ”میرے لکھے ہوئے تقریباً پانچ سو صفحات بدل ڈالے گئے“ اور دوسری بات چند سیاسی اور پارٹی باز علماء کے بے جا اعتراضات سے مرعوب ہو کر آپ مولانا مودودی سے قطعاً بدگمان نہ ہوں؛ بلکہ ان کی کتابیں پڑھیں؛ کیونکہ ان پہ اعتراض کرنے والا ہر شخص وہ ہے جس نے اِن کی کبھی کوئی کتاب پڑھی ہی نہیں۔ بس اِدھر اُدھر کی سنی سنائی باتوں پہ اعتراض کرتے رہتے ہیں۔

یاد رکھیے مشرکین کی سالوں کی محنت اور مسلمین کے رہنماء کی سالوں کی غفلت سے پیدا شدہ حالات دو چار دن میں نہیں بدل سکتے؛ لیکن اگر اب بھی ہم نے اپنی نسلوں کو بیدار اور صاحب فہم نہ کیا تو مستقبل انتہائی بھیانک اور وحشتناک ہونے والا ہے؛ اس لیے خود ساختہ اور مصنوعی قائدین کی باتوں میں آ کر خود کو فقط ایک بھیڑ مت بنائیے؛ بلکہ مستحکم ہو کر ایک مجاہد کی طرح اپنے وجود کا احساس کرائیے۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

ابو عکاشہ رحمٰن

۱۰/دسمبر ۲۰۱۸ء

آخری بات

دارالعلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ کا تنقیدی جائزہ پڑھنے کے بعد ہوسکتا ہے کسی نازک مزاج قاری کو ہم سے یہ شکایت ہوجائے کہ ہم نے کہیں کہیں تلخ لہجہ، نکیلے طنز اور سخت الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ شکایت بالکل بے جا نہیں ہوگی، ہاں! ہم نے درج بالا کام کیے ہیں؛ لیکن اِس کی وجہ ہے اور وہ وجہ بہت اہم ہے، وہ یہ کہ دارالعلوم کی تاریخ لکھنے والا شخص ہو یا اس کو شائع کرنے کی اجازت دینے والے لوگ تمام کے تمام علمِ دین کی سند سے سرفراز ہونے کا شرف رکھتے ہیں اور خود کو مولانا لکھتے ہیں۔ بلا شبہ مولانا ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ موصوف کو نیک و بد، خیر و شر، جھوٹ اور سچ، گناہ وثواب کا مکمل علم ہے۔

اب بتائیے قارئین! اگر ایک علمِ طب کا سند یافتہ ڈاکٹر مریض کو غلط دوا دینے ہی کو اپنا شعار بنالے تو کیا ایماندار اور مصلح قسم کے لوگ اُسے پہلی ہی ملاقات میں آکر ڈانٹ اور پھٹکار نہ لگائیں گے یا اس کے برعکس پیار سے بات کریں گے۔ ظاہری بات ہے جب کوئی پڑھا لکھا اور ہوش مند انسان کوئی غلطی کرتا ہے تو سامنے والے کو اس پر غصہ ہی آتا ہے پیار نہیں، اور اس غصہ کا سبب یہی ہوتا ہے کہ تم جانتے ہو یہ غلط ہے پھر بھی کر رہے ہو۔

ہماری تحریر میں آئی سختی کا بھی یہی سبب ہے۔ پھر یہ بھی تو دیکھئے اللہ رب العزت بھی ایسے لوگوں پر ہی شدید غصہ ہوتے ہیں۔ کیا بخاری کی یہ حدیث بھلائی جاسکتی ہے کہ: ''سب سے پہلے دوزخ میں عالم، حافظ اور شہید جائیں گے''۔ کیوں؟ اس لیے نا کہ ریا کے چکر میں انھوں نے اخلاص سے کام نہ کیا اور جانتے ہوئے بھی غلط کاری میں مبتلا رہے۔

دارالعلوم کی تاریخ مرتب کرنے والے فاضل مرتب اور اس کو شائع کرنے کی اجازت دینے والے شوریٰ کے ممبران نے بھی یہی گناہ کیا ہے، جانتے ہوئے بھی کہ کتاب میں سچ سے کہیں زیادہ جھوٹ لکھا ہے پھر بھی کتاب شائع کرادی۔ ایسے لوگ روزِ محشر خدا کو کیا جواب دیں گے۔

بس اس وجہ سے ہمارا دل تڑپتا رہا اور تحریر میں کہیں کہیں سختی آگئی۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ مصروفیت کے سبب ہمیں کتاب پر نظرِ ثانی کا موقع بھی نہیں ملا۔

(ابو عکاشہ رحمٰن)

۳۱ر دسمبر ۲۰۱۸ء

چلتے چلتے

اگر آپ نے کوئی بات کہی ہو اور اس کی تصدیق کوئی سرِعام یا سرِ محفل کر دے تو یقیناً خوشی ہوتی ہے۔ وہی خوشی ہمیں اس وقت ہو رہی ہے۔ کل ہی کی بات ہے یعنی ۱۵/ اکتوبر ۲۰۱۸ء واٹس ایپ پر مولوی محمود مدنی کی ایک کلپ آئی، جس میں موصوف حیدرآباد کے لیڈر اسدالدین اویسی صاحب کی مخالفت میں زبان دراز کر رہے ہیں، محمود مدنی صاحب کہہ رہے ہیں:

> مسلمان، بہ حیثیت مسلم اپنا کوئی پولیٹیکل لیڈر بنائے میں اس کا وِرودھی (مخالف) ہوں اور اس کو میں مسلمانوں کی مخالفت سمجھتا ہوں۔ میں اُن کو بہت اچھا آدمی مانتا ہوں۔ اسدالدین اویسی صاحب کو؛ لیکن یہاں پر میں اُن سے بالکل ڈس ایگری کرتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کے، انڈین مسلم کے پولیٹیکل لیڈر بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کو ہم کامیاب ہونے نہیں دیں گے، کسی بھی قیمت پر، بالکل نہیں ہونے دیں گے، آپ حیدرآباد کے پولیٹیکل لیڈر بن جائیے وہ ٹھیک ہے، مجھے وہاں تک بھی منظور ہے، وہ آندھرا اور تلنگانہ کے بن جائیں، اس سے آگے نہیں جانا چاہئے، مہاراشٹرا میں نہیں آنا چاہئے، بالکل نہیں آنا چاہئے۔ https://youtu.be/YHwivHftqRc

دیکھ لیجیے قارئین! باتیں کرنے والا شخص مشرک و ہندو یا مسلمانوں کی دشمن جماعت کا کوئی سربراہ نہیں ہے؛ بلکہ نہ یہ کہ مسلم ہے، ایک عالم دین کی ڈگری رکھنے کا بھی دعوے دار ہے۔ اپنے مسلم بھائی سے اس درجہ مخالفت، اتنی کبیدگی، ایسی نفرت استغفر اللہ۔ اور فقط مسلم بھائی سے ہی نہیں؛ بلکہ ایسے مسلم بھائی سے جو مسلمانوں کے حقوق کی خاطر اہلِ باطل کے سامنے برسرِ پیکار ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ پورے ہندوستان میں اس وقت سیاسی میدان میں مسلمانوں کا اگر سچا ہمدرد کوئی ہے تو وہ فقط اسدالدین اویسی ہے۔

تعلیم یافتہ، دانشمند، ذی شعور، دُور اندیش، باریک بیں، دلیر، بے خوف، بے باک اور اپنی بات کو جامعیت، وثوق و مستعدی اور مضبوط دلائل کے ساتھ حاکمِ وقت کے سامنے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے والا اسدالدین اُویسی کے علاوہ کوئی اگر کہیں ہے، تو ہمیں بھی بتایا جائے۔

بلاشبہ کوئی نہیں ہے۔ اسدالدین اویسی صاحب ہی حقیقت میں مسلمانوں کے سیاسی قائد اور لیڈر بننے کے مستحق ہیں۔

اسدالدین اویسی صاحب کو قوم کا پیسہ کھانے کا شوق نہیں ہے، نہ ہی میرے اس بھائی کو عوام کے چندے سے اپنے لیے پراپرٹی بڑھانے کی ہوس ہے۔ یہ انسان تو اپنی قوم اور دیگر پس ماندہ طبقات کی خدمت کے لیے ہی جیتا ہے۔ پورے ملک میں اس وقت ایک یہی تو ہے جو مسلمانوں کے حقوق کی بازیابی کے لیے سینہ سپر ہے۔ اہلِ باطل کے ایوانوں کی بنیادیں اسی اسد کی دہاڑ نے ہلا رکھی ہیں۔ اللہ پاک اس حاتمِ وقت کو سلامت رکھے کہ اسی کے حوصلے اور سربراہی میں ہندی مسلم قوم کے وجود کی تابناکی کا امکان روشن ہے۔

اسدالدین جیسے جیالے کے بارے میں مولوی محمود مدنی کا یہ بیان کس قدر گھٹیا اور منافرت پر مبنی ہے، اس کی وضاحت کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ہر ذی شعور جانتا ہے کہ محمود مدنی صاحب اپنی پسپائیت اور خود ساختہ قائد کی مسند کے چلے جانے کا خوف محسوس کر رہے ہیں۔

مضمون کی ابتدا میں ہم نے اپنی بات کی تصدیق سرعام ہونے کے بعد ملنے والی جس خوشی کا اظہار کیا ہے، اس سے ہماری مراد یہ بتانا ہے کہ اس کتاب میں ہم نے بارہا ایک بات لکھی ہے کہ: مولانا حسین احمد مدنی صاحبؒ نے مولانا مودودی کی مخالفت کسی اصلاحی جذبے کے تحت نہیں کی تھی؛ بلکہ اس لیے کی تھی کہ اگر جماعتِ اسلامی ہٹ Hit ہوگئی تو جمعیۃ علماء ہند پٹ جائے گی۔ اور ہمارا اقتدار کمزور پڑ جائے گا۔ اسی خوف میں مولانا مدنیؒ نے مولانا مودودی کے خلاف وہ پروپیگنڈہ کیا کہ دیانت شرم سار ہو کے گھر بیٹھ گئی اور خیانتوں نے جھوٹ کے ساتھ مل کر ہوا کا رُخ موڑ دیا۔ اگر مولانا مودودی کی تحریروں میں خرافات وخباثات ہوتیں تو دنیا میں کہیں اور کوئی عقل والا دوسرا بھی تو ہوتا جو ان کی تحریروں پر اعتراضات کرتا۔ مصر، شام، عرب، عراق، ایران، افریقہ، دنیا میں کہیں تو کوئی دوسرا ہوتا جس کو مولانا مودودی کی کتابوں میں وہ کیڑے نظر آجاتے، جن کے تعفن سے مولانا مدنیؒ کا ذہن اذیت محسوس کر رہا تھا۔ مولانا مدنیؒ بے شک ایک عالم دین اور نیک انسان تھے، اللہ ان کے درجات بلند فرمائے، ہمیں ان سے کوئی ذاتی اختلاف نہیں ہے، وہ بے شک ہم سے بہت بہتر تھے۔ یقیناً علم وعمل میں ہم ان کے جوتوں کی برابری بھی نہیں کر سکتے؛ لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ وہ دنیا میں عقلِ کل نہیں تھے، کہ جو انھوں نے کہہ دیا بس وہی حق ہو۔ بشری لغزشوں کا صدور ان سے بھی ہوا ہے۔ بہر حال! عرض یہ کرنا ہے، مثال مشہور ہے: ''جیسا باپ ویسا بیٹا''۔

مولانا مدنیؒ نے اپنی سیاست اور اقتدارانہ حیثیت بچانے کے لیے مودودی کی بلی چڑھائی، اس کے بعد مولوی اسعد مدنی نے اسی رَوش کو آگے بڑھاتے ہوئے نہ یہ کہ صرف جماعتِ اسلامی کی مخالفت کی؛ بلکہ مسلمانوں کی ہر اس سرگرداں تنظیم کے خلاف کھڑے ہوئے جس نے بھی مسلمانوں کے حق میں ملکی پیمانے پر کچھ

کرنے کی کوشش کی، جس کی تفصیل آپ گزشتہ صفحات میں پڑھ آئے ہیں کہ کیسے مسلم مجلسِ مشاورت کے جلسے کو برباد کر کے مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ؒ کو مارنے کی کوشش کی گئی تھی۔

اب وہی کام محمود مدنی کر رہے ہیں، یہ بھی اسدالدین اویسی کی مخالفت صرف اور صرف اسی لیے کر رہے ہیں، کہ اگر یہ شخص پورے ملک میں مشہور ہو کر اقتدار میں آگیا تو ہمارا دبدبہ کم ہو جائے گا، دوسری اور کوئی وجہ اس مخالفت کی نہیں ہے۔

گزشتہ صفحات میں ہماری بات سے جس کو بھی اختلاف رہا ہو گا وہ محمود مدنی کے اس بیان کے بعد یقیناً ختم ہو گیا ہو گا۔ اسی خوشی کا ہم اظہار کر رہے تھے، کہ ہماری بات کی تصدیق خود مولوی محمود مدنی صاحب نے سرِ محفل کر دی ہے۔ کہ یہ وہی ذہن کام کر رہا ہے جو ان کے باپ دادا کا تھا۔

دوسری ایک بات ہم نے پیچھے یہ بھی لکھی ہے کہ جمعیۃ علماء ہند نے گزشتہ ۷۰ ر سالوں میں کیا کیا ہے؟ دنیا کو ایک ڈھنگ کا عالم دین یا سیاست داں یا قلم کار تک یہ جمعیۃ نہیں دے سکی ہے۔ ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی جب اسی پروگرام میں مولوی محمود مدنی صاحب سے ایک صحافی نے سوال کیا۔

سوال سے پہلے ہم آپ کو بتا دیں کہ جس پروگرام میں محمود مدنی صاحب نے اسدالدین اویسی صاحب کے بارے میں یہ بیان دیا ہے وہ ۹ ر اکتوبر ۲۰۱۸ ر کو دہلی میں منعقد کیا گیا تھا، جس کا عنوان تھا:

Is Indian syncretism a Bulwark Against Redicalisation

ORF نامی تنظیم کی جانب سے اس پروگرام کا انعقاد کیا گیا تھا اور معروف صحافی مایا میر چندانی نے اس کی نظامت کی تھی۔

جس سوال کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے، وہ پروگرام میں پچپن منٹ پانچ سیکنڈ 55:05 پر خالد نام کے صحافی نے مولوی محمود مدنی صاحب سے پوچھا تھا۔ یہ وہی سوال تھا جو ہم نے بھی اس کتاب میں اُٹھایا ہے کہ آج تک جمعیۃ علماء ہند ورلڈ لیول (عالمی پیمانے) پر کوئی ایک بھی ایسا قائد، ایسا رہنما، ایسا اسکالر، ایسا عالم پیدا نہیں کر سکی جس کو پوری دنیا کے مسلمانوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔ مسلکی اختلاف سے اوپر اُٹھ کر جس کی فکر کو عملی طور پر دنیا بھر کے اکثر مسلمان تسلیم کرتے ہوں۔ مولانا مودودی اور ان کی فکر کو غلط کہنے والے یہ لوگ دراصل تمام امت کے لیے فکرمند کبھی رہے ہی نہیں ہے۔ انہیں صرف اپنی مسند اور دولت سے مطلب ہے، اسی لیے آج تک کوئی ایک بھی کام تو ایسا نہیں ہے جو گزشتہ ساٹھ ستر سالوں میں جمعیۃ کی طرف سے امتِ مسلمہ کی خیرخواہی یا ترقی کے لیے کیا گیا ہو۔ تفصیل ہم پیچھے لکھ آئے ہیں، اس لیے مزید اور کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

کمال تو یہ ہے کہ خالد صاحب کے سوال کا جواب مولوی محمود مدنی صاحب دے ہی نہیں پائے۔ آٹھ منٹ

بولنے کے بعد بھی جب جواب نہ مل سکا تو پروگرام کی ناظمہ میر چندانی نے خالد صاحب کا سوال دہرایا کہ اصل سوال یہ تھا جس کا آپ نے اب تک جواب نہیں دیا۔ دیتے بھی کیسے، اس کا جواب ان کے پاس ہے ہی نہیں۔

ہم یہاں پورا سوال اور جواب نقل نہیں کر رہے ہیں؛ کیونکہ یہ مکالمہ تقریباً تین صفحات کی جگہ لے لے گا۔ پورا پروگرام دیکھنے کے لیے آپ یوٹیوب پر اسے دیکھیے، یہ ایک اہم پروگرام ہے۔ ایک گھنٹے بیس منٹ کے اس پروگرام کو آپ ضرور دیکھئے اور محسوس کیجیے کہ ایک سوال کا بھی معقول جواب مولوی محمود صاحب نہیں دے سکے ہیں۔

آئیے خالد صاحب کا سوال پیش کرتے ہیں، خالد صاحب نے پوچھا:

میرا سوال یہ ہے، انڈین مسلم، آپ کے جیسے لوگ آئی سولیٹیڈ (Isolated) کیوں ہیں؟ گلوبل لیڈرشپ کیوں نہیں ہے؟ گلوبل لیڈرشپ کہیں اور سے کیوں آتی ہے؟ آپ ڈاکٹر اسرار احمد کو دیکھئے پوری دنیا میں مقبول ہیں۔ چاہے این آر آئی ہو، غیر پاکستانی ہو، غیر بنگلہ دیشی ہو، سب لوگ ان کو ایک طرح کا آئیڈیولوجیکل گرو مانتے ہیں۔ آپ بولتے ہیں کہ ذاکر نائک از ناٹ رونگ، میں کہتا ہوں وہ بھی ایک طرح کے آئیڈیولوجیکل گرو ہیں، ایک سید قطب انڈیا سے کیوں نہیں آیا ابھی تک۔ تو اُس پیش رفت میں .... اگر آپ کہتے ہیں کہ ہم کامیاب ہو گئے ہیں تو یہ انڈیا کی باؤنڈری تک ہی کیوں رکنا چاہیے؟ (سوال ختم)

اس سوال کے بعد لمحہ بھر کو تو مولوی محمود مدنی سمجھ ہی نہیں پائے کہ جواب کیا دیا جائے۔ قارئین! آپ یہ ویڈیو دیکھئے، اس سوال سے پہلے مولوی محمود مدنی صاحب بڑے مسکرا کر تمام سوالوں کا جواب دے رہے تھے، وہ الگ بات ہے کہ جواب دم دار نہیں تھے؛ لیکن خالد صاحب کے اس سوال کے بعد مولوی محمود مدنی صاحب کا چہرہ دیکھنے لائق ہے۔ اس کے جواب میں مولوی محمود مدنی صاحب نے بہت سی غیر ضروری باتوں کو گھما پھرا کر پیش کرنے سے پہلے یہ بھی کہا کہ:

> ''سید قطب کا حسن البنا کا مولانا مودودی کا حوالہ دیں گے تو وہ ایک رائٹ ونگ ایکسٹریم سوچ کی طرف لے جانے والے..... (لوگ ہیں)''

یہاں مولوی محمود مدنی صاحب کو اپنا جملہ پورا کرنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے، تو خالد صاحب نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا کہ اس طرح کی لیڈرشپ انڈیا سے کیوں نہیں آئی؟ اس کے بعد مولوی محمود مدنی صاحب نے جواب کو آگے بڑھاتے ہوئے جو باتیں کہی ہیں ان میں کہیں بھی اس سوال کا جواب نہیں ملتا۔ پھر 59:07 اُنسٹھ منٹ سات سیکنڈ پر خالد صاحب نے اپنا سوال دوبارہ وضاحت کے ساتھ دہرایا؛ لیکن بے چارے خالد صاحب کو کوئی معقول جواب نہ مل سکا۔

سوال بس وہی تھا کہ آپ کی طرف سے عالمی قیادت کیوں نہیں ہے۔ آپ کی یعنی جمعیۃ علماء ہند کی حد ہندوستان ہی تک کیوں محدود ہے؟ ایک بات اور! خالد میاں نے اپنے سوال میں سید قطب کا نام تو لیا تھا؛ لیکن حسن البنا اور مولانا

مودودی کا ذکر انھوں نے نہیں کیا۔مولوی محمود مدنی نے خود مولانا مودودی کا ذکر کر کے اُنہیں رائٹ ونگ ایکسٹریم کہا ہے۔ یہ بات خود واضح کرتی ہے کہ دل سے تو مولوی محمود مدنی بھی مولانا مودودی کو ایک صالح اور مجاہد قائد تسلیم کرتے ہیں؛لیکن فقط سیاست کے چکر میں ان کی بے جا و بے سود مخالفت کا ڈھونگ ان کا خاندانی شیوا ہے۔

قارئین! یہ سوال آج کا نہیں؛بلکہ سالوں پہلے کا ہے۔اور اس کا جواب ہم اپنی اس کتاب میں بار بار دے چکے ہیں۔ وہ یہ کہ عالمی قیادت تبھی ہوتی ہے جب اخلاص کے ساتھ امت کی فلاح و بہبودی کے لیے متفکرانہ طور پر عملی اقدام کیے جائیں اور عملی اقدام کے لیے ایئر کنڈیشن کمروں اور گاڑیوں سے نکل کر میدانِ عمل کے تپتے ہوئے ریگزاروں میں جہاد کرنا پڑتا ہے، آسائشوں کے نرم گداز گدوں کی نیند قربان کر کے زنداں کے پتھریلے فرش کو قبول کرنا پڑتا ہے، فائیو اسٹار ہوٹلوں اور صاحبِ اقتدار کے وسیع دسترخوان پر تندوری چکن و مکھن کی روٹیاں توڑنے کے بجائے بھوکے پیاسے رہ کر سلگتی ہوئی دھوپ میں پتھریلی زمین پر چلنا پڑتا ہے۔اسلام کے کھلے دشمنوں کے ساتھ بیٹھ کر قہقہہ لگانے کے بجائے اسلام مخالف طاقتوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے نبیوں کی سنت پر عمل کرنا پڑتا ہے۔قوم کو بیدار کرنے کے لیے کتابیں لکھنی پڑتی ہیں، پُرسوز و پُرتاثیر تقریریں کرنا پڑتی ہیں اور یہ سب جمعیۃ علماءِ ہند نے کبھی نہیں کیا،کبھی سے مراد جب سے جمعیۃ مدنی خاندان کی اسیر ہے۔خود ساختہ قائدِ ملّت کی تقاریریں اسلام دشمنوں کے ساتھ یک جہتی کے بے سود نعرے ہوتے ہیں۔فقط اپنے اجداد و اساتذہ کی تعریف و بے جا ستائش ہوتی ہے۔کل ملا کر کہا جائے تو بس''باتیں ہی باتیں ہوتی ہیں عمل کچھ نہیں''

مولانا محمود مدنی کے اسدالدین اویسی کی مخالفت میں دیے گئے بیان کے بعد ملک بھر میں ہی نہیں؛بلکہ دنیا بھر میں چہار جانب سے موصوف کی اس احمقانہ حرکت پہ کفِ افسوس بھی ملے گئے اور اظہارِ تاسف بھی کیا گیا۔اسی اظہار کی شکل میں مولانا یاسر ندیم الواجدی صاحب نے اپنے یوٹیوب چینل پر مدنی صاحب کے ساتھ سرجیکل اسٹرائک کی اور کچھ دوسرے لوگوں نے اخبارات میں اپنے افسوس کا اظہار کیا۔

مولانا یاسر ندیم الواجدی کے اعتراض کرنے کے بعد مدنی صاحب نے اپنے بیان سے رجوع کرنے ہی میں عافیت سمجھی اور بڑی صفائی کے ساتھ کہا میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔

ایک مضمون اسی ضمن میں کسی اخبار میں بھی شائع ہوا تھا،ہمیں اخبار کا نام تو نہیں معلوم؛لیکن ۱۲ر نومبر ۲۰۱۸ء کو ہمیں واٹس ایپ پر وہ مراسلہ کہیں یا مضمون،موصول ہوا۔مضمون پڑھا تو لگا جیسے لکھنے والے کے قلم نے ہماری زبان سے الفاظ لے لیے ہیں،سب کچھ وہی تھا جو ہم آپ کے سامنے لکھ آئے ہیں،اس سے واضح طور پر ایک بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ جو ہم نے لکھا ہے وہ سب سچ ہے اور مسلمانوں میں ابھی وہ لوگ زندہ ہیں جن کے ضمیر کو چاپلوسی کی دیمک یا دولت کے لالچ نے کھوکھلا نہیں کیا ہے۔آپ بھی عبدالسمیع قاسمی حیدرآبادی صاحب کا یہ مضمون ملاحظہ فرمائیے۔قلم کار نے ایک ایک بات حق لکھی ہے۔

ملّتِ اسلامیہ پر رحم کیجیے مولوی محمود مدنی صاحب!

۲۰۱۹ میں مرکزی انتخابات کی تیاریاں اپنے عروج پر ہیں، بھارتیہ جنتا پارٹی جن وعدوں پر پچھلے انتخابات میں برسراقتدار آئی تھی ان میں سے ایک بھی وعدہ پورا نہ کرسکی۔ صرف بیانات اور لفاظی میں ۲۰۱۹ سر پر آگیا۔ اب دھیرے دھیرے یہ سیاسی جماعت اور اس کے سرپرست ملک کے اندر ایک بار پھر افراتفری اور فرقہ وارانہ ماحول قائم کرکے اپنی انتخابی نیا کو پار لگانے کی جگت میں ہے۔ اس لیے انہوں نے پہلے امر سنگھ، شیو پال یادو اور مایاوتی کو ذہنی طور پر تیار کیا، ان تینوں لوگوں نے کم سے کم یوپی کی ۸۰ سیٹوں کو متاثر کرنے کے لیے اپنی سیاسی حکمتِ عملی شروع کردی جس سے یہ واضح ہوگیا یہ تینوں سیاسی شخصیات فرقہ وارانہ طاقتوں کے اشارے پر کام کررہی ہیں اور کسی بھی شکل میں یہ سیاسی گٹھ جوڑ جسے عام زبان میں ''مہاگٹھ بندھن'' نام دیا جارہا ہے اسے متاثر کرنے کا کام کر رہے ہیں۔ ابھی تین چار روز پہلے سوشل میڈیا پر یہ بات تیزی سے وائرل ہوئی کہ بھارتیہ جنتا پارٹی آنے والے انتخابات میں اسدالدین اُویسی کو بھی نشانے پر لے گی اور ان کے مقابلے پر ان کے انتخابی حلقہ سے کسی مسلمان کو کھڑا کرے گی۔ اسدالدین اُویسی سیاسی اعتبار سے کتنا وزن رکھتے ہیں یہاں پر اس کا تجزیہ ہم نہیں کر رہے ہیں؛ لیکن اتنا ضرور ہے کہ گزشتہ پانچ سال کے اندر بھاریہ جنتا پارٹی کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر اگر کسی مسلم سیاسی قائد نے بات کی ہے تو وہ صرف اسدالدین اُویسی ہیں۔ اس کی گفتگو یا بیان بازی کا کیا سیاسی اثر ہوا؟ یہ الگ موضوع ہے؛ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس نے مسلمانوں کے مسائل اور فسطائی طاقتوں کی کارگزاریوں پر ضرب ضرور لگائی۔ پارلیمنٹ کے اندر بھی جب کبھی بھی اسدالدین اُویسی نے تقریر کی تو انہوں نے سیدھے سیدھے نریندر مودی کو اپنا نشانہ بنایا اور یہ بتانے اور پیغام دینے کی کوشش کی کہ پارلیمنٹ کے اندر جمہوری نظام میں ہر شخص کو گفتگو کرنے اور حکومت کی خوبیوں اور خامیوں پر پذیرائی اور تنقید کرنے کا حق ہے۔

جیسا کہ اوپر تحریر کیا گیا کہ بھاریہ جنتا پارٹی گزشتہ پانچ سالوں میں اسدالدین اُویسی کی حق گوئی سے بے انتہا پریشان تھی اور وہ جانتی ہے کہ اسدالدین اُویسی کی آواز بہت دُور تک جاتی ہے اور اقلیتوں کی طاقت ہے۔ اس کو توڑنے کے لیے اس نے مسلمانوں کے درمیان میں سے ہی ایک ایسی شخصیت کا انتخاب کیا جس کا قد کسی بھی شکل کے اندر اسدالدین اُویسی کے برابر نہیں ہے۔ گزشتہ دنوں جمعیۃ علماء ہند (م) کے جنرل سکریٹری مولوی محمود مدنی

نے جس انداز سے ایک انٹریو کے دوران یہ گفتگو کی کہ ہم اسدالدین اُویسی کو مسلمانوں کا قائد نہیں بننے دیں گے اور ہم اسے مہاراشٹر میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔اس بیان نے بچے کچے ذی شعور مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ یہ زبان، یہ لہجہ، یہ گفتگو، یہ تیور، مولوی محمود مدنی کے نہیں ہیں؛ بلکہ ان سے یہ بات مرکز میں بیٹھی ہوئی وہ حکومت کہلوا رہی ہے جسنے اس وقت پورے ملک کے ماحول کو تہس نہس کر رکھا ہے۔افسوس صد افسوس شہرت اور اپنی ضرورت کے پیش نظر محمود مدنی بھی بھارتیہ جنتا پارٹی کا شکار ہو گئے۔مولوی محمود مدنی کا اگر ایک لفظ میں تعارف پیش کیا جائے تو صرف اتنا ہے کہ وہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے نبیرہ ہیں۔جن سے میں نے سند حدیث حاصل کی ہے۔اس کے علاوہ علمی، شخصی، سیاسی اور سماجی اعتبار سے محمود مدنی کے پاس جمعیۃ علماء ہند کا ایک عہدہ ہے جو انہیں وراثت میں ملا ہے۔

میرے چند سوال مولوی محمود مدنی سے ہیں، میں انہیں مسلسل مولوی اس لیے تحریر کر رہا ہوں کہ ان کی پیدائش دارالعلوم دیوبند سے میری فراغت کے بعد کی ہے اور اس لیے وہ مجھ سے بہت چھوٹے ہیں۔شاید لوگوں کو یہ بات غیر مناسب اور غیر اخلاقی لگے۔میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ ان کے والد محترم کو''امیر الہند'' کا لقب کس نے دیا تھا؟ اور ان کی وفات کے بعد قاری محمد عثمان صاحب استاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند کو''امیر الہند'' کا لقب کس نے دیا؟ کس حق سے وہ ایک جمہوری نظام میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسدالدین اُویسی کو ہم مسلمانوں کا قائد نہیں بننے دیں گے؟ کس حق سے وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اسدالدین اُویسی کو مہاراشٹر میں نہیں گھسنے دیں گے؟ شاید اپنی کم علمی اور ضرورتوں کی بنیاد پر میرے عزیز ہندوستان کے آئین سے قطعی طور سے ناواقف ہیں۔اسدالدین اُویسی کشمیر سے کنیا کماری تک کسی بھی حلقہ سے انتخابات میں حصہ داری کر سکتے ہیں اور اپنی جماعت کے ذریعہ حصہ داری کرا سکتے ہیں۔ساتھ ہی ساتھ وہ ملک کے کسی بھی گوشے میں جا کر سیاسی مجالس میں اپنی بات کو رکھنے، اپنی آواز کو بلند کرنے، حکومت کی خوبیوں اور خامیوں کو پیش کرنے کا مکمل حق رکھتے ہیں۔محمود مدنی کس بنیاد کے اوپر انہیں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اسدالدین اُویسی کو مسلمانوں کا قائد نہیں بننے دیں گے۔آزادی سے پہلے اور بابری مسجد کی شہادت تک جمعیۃ علماء ہند اور اس کے تمام تر اعلیٰ عہدیداران بالخصوص محمود مدنی کے والد محترم مولانا اسعد مدنیؒ نے اپنی تمام تر زندگی کانگریس کی حکومت بچانے کا کام کیا۔جمعیۃ کی تاریخ میں متعدد تحریکات ایسی ہیں جنھوں نے کانگریس کی حکومت کے لیے کام کیا۔بابری مسجد کی شہادت جیسے سنگین واقعہ پر بھی جس نے اس ملک کے اندر فرقہ پرست طاقتوں کی جڑوں کو مضبوط کیا اور جس کی مجرم کانگریس تھی مولانا اسعد مدنیؒ نے کانگریس کا دامن نہیں چھوڑا۔سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی کی ہلاکت کے بعد جب محترمہ سونیا گاندھی کانگریس کی صدر بنیں تو اس خاندان کی رسائی کانگریس کے اندر کمزور پڑ گئی اور اس گھرانے نے دوسری سیاسی جماعتوں کے اندر ٹھکانے تلاش کرنے

شروع کر دیئے اور آج انتہا یہ ہوگئی کہ بھٹکتے بھٹکتے یہ وہاں پہنچ گئے جس کو سیاسی زبان کے اندر بھارتیہ جنتا پارٹی کہتے ہیں، جس کا خواب اس ملک کے آئین کو تبدیل کرنا ہے، جس کا خواب اسے ہندوراشٹر بنانا ہے، جس کا خواب مسلمانوں کو غلام بنانا ہے، جس کا خواب ایک ایک مسجد اور ایک ایک مدرسہ کو مسمار کر دینا ہے، جس کا خواب مسلمانوں کی ادبی، سیاسی، سماجی تہذیب کو ختم کر دینا ہے۔ اُس سیاسی جماعت کی گود میں محمود مدنی کا بیٹھ جانا اہلِ سنت والجماعت اور ہندوستان کے ۳۵ کروڑ مسلمانوں کا ہلاک ہو جانا ہے۔ افسوس صد افسوس اس ہلاکت پر کسی نے بھی ابھی تک لب کشائی نہیں کی۔ کیوں ہے یہ خوف؟ اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ میں یہاں پر یہ بتادوں کہ ۳۵ کروڑ مسلمانوں کی یہ ہلاکت پہلی بار نہیں ہوئی ہے۔ ماضی میں ۱۹۶۷ میں رانچی میں ۱۸۴، ۱۹۶۹ میں گجرات میں ۵۱۲، ۱۹۷۷ میں بھاگلپور میں ۱۰۰۰، ۱۹۸۰ میں مرادآباد میں ۴۰۰، ۱۹۸۳ میں آسام میں، ۲۱۱۹ سرکاری غیر سرکاری ۱۰ ہزار، ۱۹۸۴ میں بھیونڈی میں ۲۷۸، ۱۹۸۵ میں احمدآباد میں ۲۷۵، ۱۹۸۷ میں میرٹھ میں ۳۴۶ مسلمانوں کی فسادات میں شہادت ہوئی۔ اُس وقت بھی جمعیۃ علماء ہند اور ان کے والدمحترم کانگریس کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلتے رہے۔ ۱۹۹۲ میں جب بابری مسجد کی شہادت ہوئی اور پورا ملک خون اور آگ میں جھلس رہا تھا اس وقت بھی جمعیۃ علماء ہند اور ان کے والدمحترم راجیہ سبھا کی سیٹ پر براجمان رہے؛ مگر مولوی محمود مدنی نے تو ان تمام اعداد وشمار کو پیچھے چھوڑ دیا اور سیدھے سیدھے ۳۵ کروڑ مسلمانوں کی قیادت پر سوالیہ نشان لگا دیا۔ حساس لوگوں کا احساس تو اسی وقت جاگ گیا تھا جب مولوی محمود مدنی نے اٹل بہاری واجپئی کی موت کے او پر مرثیہ خوانی کی تھی اور انھیں "انمول رتن" قرار دیا تھا؛ مگر یہ احساس نہیں تھا کہ وہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیے اس انداز سے بھی سیاسی پلیٹ فارم تیار کر سکتے ہیں۔ ایک جانب جمعیۃ علماء ہند یہ کہتی ہے کہ وہ غیر سیاسی تنظیم ہے، دوسری جانب وہ چار سال اور نو مہینے تک مسلمانوں کی قائد بنی رہتی ہے اور الیکشن سے تین ماہ پہلے وہ غنودگی کی چادر اوڑھ کر غیر ملکوں میں سو جاتی ہے۔ مولوی محمود مدنی کا یہ بیان مسلم قیادت کے لیے ایک ایسا خنجر ثابت ہوگا جو پیٹھ میں نہیں حکومت کی شہ پر سینے پے گھونپا گیا ہے۔ افسوس صد افسوس! ہزاروں علماء، ہزاروں مسلم صحافی، ہزاروں قلم کار، ہزاروں نقاد؛ مگر سب کے لبوں پر ضرورت کی ٹیپ لگی ہوئی ہے۔

....

حقائق تو اتنے ہیں کہ کئی جلدوں کی کتاب تیار ہو جائے گی؛ لیکن ہم اپنی اس کتاب کو اور ضخیم بنانا نہیں چاہتے؛ ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ ۹ر دسمبر ۲۰۱۸ء بروز اتوار اخبار مشرق میں شائع ہوا جناب عظیم اختر صاحب کا مضمون بھی یہاں پیش کر دیں؛ لیکن بس کتاب کی بڑھتی ہوئی ضخامت نے روک لیا ہے اخبار مشرق میں یہ مضمون اس عنوان کے ساتھ صفحہ ۷ پہ آیا تھا۔

''محمود مدنی ہندوستانی مسلمانوں کے نہیں، صرف ٹوٹی پھوٹی جمعیۃ کے مولویوں کے سنچالک ہیں''

کتاب ختم کرتے کرتے ہم آخر میں ایک تاریخی دستاویز اور پیش کرنا چاہتے ہیں، جو تاریخ کا اہم حصہ ہے۔ جس پروگرام کا حوالہ راقم نے اوپر دیا ہے، اسی میں اور بھی بہت سی باتیں مولوی محمود مدنی صاحب نے ایسی کہی ہیں جو بلاشبہ غلط ہیں، جیسے وطن پرستی اور آزادئ ہند کو لے کر کہہ گئے جملے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کے قیام کو لے کر مدنی خاندان نے بہت جھوٹ ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان پھیلایا ہے۔

اصل میں تو اہلِ اسلام اور علماء دیوبند کی مقتدر جماعت کے خلاف مشرکین وہنود اور کانگریس کا ساتھ دینے والے مولانا حسین مدنی صاحبؒ نے اپنی سیاست کے لیے مسلمانوں کو جس مصیبت میں ڈالا تھا، وہ آج لوگوں کو سمجھ میں آرہی ہے۔ آج ہندوستانی مسلمان دنیا کا مظلوم ترین انسان بن کے رہ گیا ہے۔ اور پاکستان کے حالات کی برائی کرنے والے لوگ فقط میڈیا کے غلط پروپیگنڈے سے متاثر ہیں۔ ورنہ پاکستان کے حالات یہاں سے بہت بہتر ہیں۔ وہاں کے مسلمان کو ٹرین یا بس میں سفر کرتے ہوئے یہ خطرہ لاحق نہیں ہے کہ وہ کس لمحہ کسی ہندو کی نفرت کا شکار ہو جائے گا۔

بہر حال! جس تاریخی دستاویز کی ہم بات کر رہے ہیں وہ ''مکالمۃ الصدرین'' ہے، یہ وہ مکالمہ ہے جو علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور کانگریس کی حمایت میں آنے والے چند علماء واکابر کے درمیان علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے گھر پر ہی ہوا تھا۔ جسے حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی مولانا محمد طاہر قاسمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قلم بند کر کے شائع کیا تھا۔ اس مکالے میں آپ دیکھئے کہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے کیسے کیسے زبردست دلائل سے پاکستان کے قیام کو حق ثابت کر کے کانگریس کی حمایت کرنے والوں کو ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے مستقبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حالات کی صحیح تصویر پیش کی ہے۔ آپ بھی یہ تاریخی بحث پڑھیے اور دیکھئے آج جو ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے، اس کی نشان دہی علامہ شبیر احمد عثمانی آزادی سے پہلے ہی کر گئے تھے۔

....

مکالمۃ الصدرین

وہ معرکہ آرا گفت وشنید جو یکم محرم ۱۳۶۵ھ مطابقت ۷ ردسمبر ۱۹۴۵ء کو حالاتِ حاضرہ پر بمقام دیوبند جانشین قاسمی وجانشین شیخ الہند امام المفسرین والمحدثین والمتکلمین شیخ الاسلام حضرت علامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی ؒ صدر کل ہند جمعیۃ العلماء اسلام اور وفد اکابر جمعیۃ العلماء ہند دہلی کے درمیان بروز جمعہ برمکان علامہ مرحوم تقریباً سوا تین گھنٹے جاری رہی۔ جس سے دونوں جماعتوں کے رجحانات قلبی ومضمرات باطنی پوری طرح ایک دوسرے کے سامنے آگئے۔ اور متلاشی حق کے لیے جس گفت وشنید نے بہت سی سہولتیں پیدا کردیں اور جس سے نظریہ پاکستان کی صحیح تصویر اور حقیقی شکل آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ عوام مسلمانوں کے لیے مسلم لیگ اور پاکستان کا راستہ صاف اور سیدھا ہے یا کانگریس کا اور یہ کہ ان کو مسلم لیگ میں شریک ہونے میں مسلمانوں کے لیے خسارے اور نقصان کے سوا کچھ حاصل نہیں۔

محمد انوار الحسن شیرکوٹی
مرتب خطباتِ عثمانی طبع شدہ مکتبہ دارالعلوم کراچی پاکستان

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

پیش لفظ

از: مولانا محمد طاہر حفید حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی ؒ

۷ر دسمبر ۱۹۴۵ء

وہ معرکہ آرا مکالمہ جو اس وقت ناظرین کے ہاتھوں میں ہے فی الحقیقت تمام مسلمانوں کے لیے ایک شمع ہدایت ہے جس سے بآسانی وہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کا استقلال کس راستے پر چلنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی ؒ جو اس وقت ہندوستان کے یگانہ روزگار علماء میں سے ہیں اور جو جماعت دیوبند کے مسلم اکابر میں سے ہیں، ان کا تبحر علمی محتاجِ تشریح نہیں۔ تبحر علمی کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی معلومات سونے پر سہاگہ ہیں۔

حضرت علامہ عثمانی اور وفد جمعیۃ العلماء ہند کے درمیان گفت وشنید کو احقر نے قلم بند کیا اور جہاں وضاحت کی ضرورت سمجھی وہاں قوسین میں عبارت کا اضافہ کر دیا۔ تاکہ مکالمہ کی اصل عبارت میں امتیاز رہے۔ احقر نے مزید احتیاط یہ کی کہ حضرت علامہ عثمانی ؒ کو یہ تمام مکالمہ قلمبند کر کے حرفاً حرفاً دکھلا دیا اور حضرت ممدوح نے جہاں جہاں ترمیم یا اضافہ کی ضرورت سمجھی وہ فرما دیا۔

اب یہ کہنا درست ہے کہ یہ مکالمہ حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی ؒ کا مصدقہ ہے۔ خدائے تعالیٰ اس کے ذریعہ سے سیاسی پیچیدگیوں میں اُلجھے ہوئے مسلمانوں کو صاف اور روشن راستہ دکھلائے اور مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں اپنے سیاسی وقومی پلیٹ فارم کی ضرورت واہمیت کو تسلیم کر کے دامے، درمے، قدمے، سخنے مساعی ہوں۔

طاہر احمد القاسمی

از: آستانہ قاسمی دیوبند

۱۹ر محرم الحرام ۱۳۶۵ھ، ۲۵ر دسمبر ۱۹۴۵ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مکالمۃ الصدرین

گفت وشنید کی ابتدا کیسے ہوئی؟

غالباً یکم دسمبر ۱۹۴۵ء کو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی ؒ ناظمِ اعلیٰ جمعیۃ العلماء ہند دہلوی اپنی کسی ضرورت سے دیوبند تشریف لائے تھے۔ اس وقت وہ حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی ؒ کے دولت کدہ پر بھی بغرضِ عیادت و مزاج پُرسی حاضر ہوئے۔ دورانِ مزاج پُرسی میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے حضرت علامہ عثمانی سے فرمایا کہ ہمیں کچھ آپ سے حالاتِ حاضرہ پر نیازمندانہ[1] گزارشات کرنی ہیں۔ مسئلہ پر شرعی حیثیت سے ہم آپ سے کیا گفتگو کرتے یہ درجہ تو ہمارا نہیں ہے؛ البتہ کچھ واقعات ایسے بیان کرنے ہیں جن کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ شاید وہ آپ کے علم میں نہ آئے ہوں، ممکن ہے کہ ان واقعات کو سن کر حضرت والا کی جو رائے قائم شدہ ہے اس میں تغیر ہو جائے۔

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ میں گفتگو کے لیے ہر وقت حاضر ہوں جب چاہیں تشریف لائیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ اس گفتگو میں میرے ساتھ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی (ناظم ندوۃ المصنفین دہلی برادرزادہ علامہ عثمانی) کوئی اور تیسرے صاحب جو مناسب ہوں شریک ہوں گے، اس کے بعد ۵/ دسمبر ۱۹۴۵ء کو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا دہلی سے ایک خط بذریعہ ڈاک بنام علامہ عثمانی موصول ہوا، جو بجنسہٖ درج ذیل ہے۔

---

(۱) مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اگرچہ مسلم لیگ کے مخالف تھے؛ لیکن علامہ عثمانی کے شاگرد ہونے کی وجہ سے ان کا بغایت ادب اور احترام کرتے تھے۔ (انوار الحسن)

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا خط بنام حضرت علّامہ عثمانیؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

از ندوۃ المصنفین دہلی

۲۷/ذی الحجہ ۱۳۶۴ھ

ذوالمجد والکرم استاذی ادام اللہ فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مزاج اقدس۔ کل دیوبند سے نو بجے صبح چل کر دہلی پہنچ گیا۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب سے شب میں گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ جمعیۃ العلماء ہند کی ایک خصوصی مجلس مشاورت وہ جمعرات کے روز دیوبند بلانا چاہتے ہیں، تاکہ جمعیۃ العلماء سے متعلق بعض اہم معاملات پر گفتگو ہو سکے۔ اس مشاورت میں غالباً مفتی صاحب (مولانا کفایت اللہ صاحب) مولانا احمد سعید صاحب بھی شرکت فرمائیں گے۔

میں نے اپنے اُس معروضہ کے پیش نظر جو حضرت والا میں حاضر ہو کر پیش کیا تھا اب یہ مناسب سمجھا کہ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اور میں جمعرات کو شب میں پہنچیں اور جمعہ کے دن گزارشات پیش کریں اب میری یہ سعی ہوگی کہ اکابر جمعیۃ العلماء بھی اس گفتگو میں حصہ لیں۔ تو اکابر علماء دیوبند کے سیاسی افکار کی یکجہتی میں ان شاء اللہ بہت مدد ملے گی۔ اگر میری گزارشات منظور ہو گئیں تو جمعہ کے دن آٹھ بجے یہ گفتگو آپ ہی کے دولت کدہ پر ہو جائے تو بہتر، باقی اپنی مشاورت تو شب میں اور باقی دوسرے وقت میں بھی ہو سکتی ہے۔

خادم محمد حفظ الرحمٰن کان اللہ لہ

۲۷/ذی الحجہ ۱۳۶۴ھ

اس پروگرام کے بموجب ۷/دسمبر ۱۹۴۵ء یوم جمعہ کو ساڑھے آٹھ بجے (۱) حضرت مولانا حسین احمد صاحب صدر جمعیۃ العلماء ہند (۲) حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب سابق صدر جمعیۃ علماء ہند (۳) حضرت مولانا احمد سعید صاحب سابق ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلماء ہند (۴) مولانا حفظ الرحمٰن صاحب حال ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلماء ہند (۵) مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی (۶) مولانا عبدالحنان صاحب (۷) مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، علامہ عثمانی کے دولت کدہ پر تشریف لائے، علامہ عثمانی نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ان حضرات سے ملے، کچھ دیر مزاج پرسی

ہوتی رہی، عیادت کے بعد چند منٹ مجلس پر سکوت طاری رہا۔ یہ خاموشی غالباً اس لیے تھی کہ کون ابتدا کرے اور کس نوعیت سے مسئلہ پر گفتگو کا آغاز ہو۔

چونکہ علامہ عثمانی کو ابتداء کرنا مقصود نہ تھا اور یہ حضرات از خود تشریف لائے تھے اس لیے علامہ عثمانی بھی خاموش رہے۔ آخر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے مسائل حاضرہ پر گفتگو کی ابتدا کی اور ایک طویل تقریر فرمائی جو تقریباً پون گھنٹہ جاری رہی۔ علامہ عثمانی برابر بغور سنتے رہے۔ جب وہ تقریر فرما چکے تو علامہ عثمانی نے فرمایا کہ مجھے پورے الفاظ اور اجزاء تو آپ کی لمبی چوڑی گفتگو کے محفوظ نہیں رہے؛ البتہ جو تلخیص میرے ذہن میں آئی ہے اس کے جوابات بلالحاظِ ترتیب عرض کروں گا۔ اگر کوئی ضروری بات رہ جائے تو آپ یاد دلا کر اس کا جواب مجھ سے لے سکتے ہیں۔

اس گفت وشنید کا سلسلہ سوا تین گھنٹہ مسلسل جاری رہا۔ اس مکالمہ میں سب سے زیادہ حصہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب لیتے رہے اور دوسرے درجہ میں مولانا احمد سعید صاحب ان کے شریک رہے، کبھی کبھی اور صاحب کچھ بول پڑتے تھے؛ لیکن مفتی کفایت اللہ صاحب نے جو مزاج پُرسی کے بعد سکوت اختیار فرمایا وہ ختم مجلس تک ختم نہیں ہوا۔ کسی موقعہ پر بھی ایک حرف نہیں بولے۔

علامہ عثمانی کو اس طویل سکوت پر خود حیرت تھی وہ بحث میں تو کیا حصہ لیتے اشارۃً وکنایۃً بھی کسی موضوع پر اثباتاً یا نفیاً کسی طرح کا اظہارِ خیال نہیں فرمایا۔ آخر مجلس میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کچھ بولے جو تقریباً دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں تھا۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی تقریر کا خلاصہ

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ کلکتہ میں جمعیۃ العلمائے اسلام حکومت کی مالی امداد اور اس کے ایما سے قائم ہوئی ہے۔ مولانا آزاد سبحانی جمعیۃ العلمائے اسلام کے سلسلہ میں دہلی آئے اور حکیم دلبر حسن صاحب کے یہاں قیام کیا، جن کی نسبت عام طور پر لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ سرکاری آدمی ہیں۔
مولانا آزاد سبحانی صاحب اسی قیام کے دوران میں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا کے ایک مسلمان عہدہ دار سے ملے، جن کا نام بھی قدرے شبہ کے ساتھ بتلایا گیا اور مولانا آزاد نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہم جمعیۃ العلماء ہند کا اقتدار توڑنے کے لیے ایک علماء کی جمعیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ گفتگو کے بعد طے ہوا کہ گورنمنٹ ان کو کافی امداد اس مقصد کے لیے دے گی؛ چنانچہ ایک بیش قرار رقم اس کے لیے منظور کرلی گئی اور اس کی ایک قسط مولانا آزاد سبحانی صاحب کے حوالہ بھی کردی گئی۔ اس روپیہ سے کلکتہ میں کام شروع کیا گیا۔ مولوی حفظ الرحمٰن صاحب

نے کہا کہ یہ اس قدر یقینی روایت ہے کہ اگر اطمینان فرمانا چاہیں تو ہم اطمینان کرا سکتے ہیں؛ چنانچہ مولانا آزاد سبحانی صاحب نے اس کے بعد کلکتہ میں جلسہ کیا۔ جلسہ میں جو کچھ انہوں نے بکواس کی وہ آپ کے علم میں ہے۔ ان کی تلون مزاجی بھی سب کو معلوم ہے۔ ایک زمانہ میں وہ گاندھی کے ساتھ سائے کی طرح رہتے تھے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد ان کے خلاف ہو گئے۔ بہر حال اس مسلمان افسر کا تبادلہ ہو گیا اور ایک ہندو اس کی جگہ آ گیا جس نے گورنمنٹ کو ایک نوٹ لکھا، جس میں دکھلایا گیا کہ ایسے لوگوں یا انجمنوں پر حکومت کا روپیہ صرف ہونا بالکل بے کار ہے۔ اس پر آئندہ کے لیے امداد بند ہو گئی اس ضمن میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے کہا کہ مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی تحریک کو بھی ابتداءً حکومت کی طرف سے بذریعہ حاجی رشید احمد صاحب کچھ روپیہ ملتا تھا پھر بند ہو گیا، اس کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے پاکستان کی صورت میں جو نقصانات ان کے نزدیک تھے وہ ذرا بسط کے ساتھ بیان کیے اور دکھلایا کہ مسلمانوں کے لیے نظریہ پاکستان سراسر مضر ہے۔

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ آپ نے کلام اس قدر طویل کر دیا ہے کہ نمبروار ہر ایک چیز کا جواب دینا مشکل ہے، جو کچھ یاد رکھ سکا ہوں ان کے جواب دوں گا۔ اگر کسی چیز کو بھول جاؤں تو آپ مجھے یاد دلا کر اس کا جواب لے لیں۔

علامہ عثمانی کا جواب

پہلے میں اس معاملہ کی نسبت گفتگو شروع کرتا ہوں جو آپ نے مولانا آزاد سبحانی کے متعلق بیان فرمایا ہے، جو روایت آپ نے بیان کی میں نہ اس کی تصدیق کرتا ہوں نہ تکذیب؛ ممکن ہے کہ آپ صحیح کہتے ہوں۔ مجھے اس سے پہلے ہی بذریعہ ایک گمنام خط کے (جو دہلی سے ڈالا گیا تھا) یہی بتلایا گیا تھا اور مجھے بھی اس خط میں دھمکی دی گئی تھی۔ یہ روایت صحیح ہو یا غلط بہر حال میرے علم میں آ چکی ہے؛ لیکن اس روایت سے مجھ پر کیا اثر پڑ سکتا ہے اور میری رائے کیا متاثر ہو سکتی ہے۔ میں نے جو رائے پاکستان وغیرہ کے متعلق قائم کی ہے وہ بالکل خلوص پر مبنی ہے، جمعیۃ العلمائے اسلام میں آزاد سبحانی رہیں یا نہ رہیں جمعیۃ العلمائے اسلام خود قائم رہے یا نہ رہے، میری رائے جب بھی یہی رہے گی کہ مسلمانوں کے لیے پاکستان مفید ہے یا اگر میں تھوڑی دیر کے لیے اس روایت کو بھی تسلیم کرلوں کہ جمعیۃ العلمائے اسلام گورنمنٹ کی ایماء سے قائم ہوئی ہے تو آپ سے پوچھتا ہوں کہ کانگریس کی ابتداء کس نے کی تھی اور کس طرح ہوئی تھی؟ آپ کو معلوم ہے کہ ابتداءً اس کا قیام ایک وائسرائے کے اشارہ پر ہوا تھا (اور برسوں وہ گورنمنٹ کی وفاداری کے راگ الاپتی رہی۔ مرتب)۔ بہت سی چیزوں کی ابتداء غلط ہوتی ہے؛ مگر انجام میں بسا اوقات وہی چیز سنبھل جایا کرتی ہے۔ ہم نے مولانا آزاد سبحانی یا جمعیۃ العلمائے اسلام کی وجہ سے مسلم لیگ کی تائید نہیں کی؛ بلکہ دیانتاً یہ رائے قائم کی ہے کہ مسلمانوں کا ایک مرکز اور ایک پلیٹ فارم ہونا چاہیے،

اور علماء امت کو اس کی پشت پناہی اور اصلاح میں جدو جہد کرنی چاہیئے۔ عام دستور ہے کہ جب کوئی شخص کسی سیاسی جماعت یا تحریک کا مخالف ہو تو اس قسم کی باتیں اس کے حق میں مشہور کی جاتی ہیں۔ دیکھئے! مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے آپ کے مسلم بزرگ و پیشوا تھے، ان کے متعلق بعض لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ان کو چھ سو روپیہ حکومت کی جانب سے دیے جاتے تھے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ گو مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کا علم نہ تھا کہ روپیہ حکومت دیتی ہے؛ مگر حکومت ایسے عنوان سے دیتی تھی کہ ان کو اس کا شبہ تک بھی نہ گزرتا تھا۔ اب اسی طرح حکومت مجھے یا کسی شخص کو استعمال کرے؛ مگر اس کو یہ علم نہ ہو کہ اسے استعمال کیا جارہا ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ شرعاً اس میں ماخوذ نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد علامہ عثمانی نے اشارہ کر کے فرمایا کہ ان مولوی عتیق الرحمٰن صاحب سے آپ پوچھئے کہ معاملات دارالعلوم کے سلسلہ میں دیوبند کے بعض پارٹی باز اشخاص نے ان کے سامنے نہایت قطعی الفاظ میں کیا یہ نہیں کہا تھا کہ وائسرائے کے دفتر میں ہم اپنی آنکھوں سے وہ چٹھی دیکھ کر آئے ہیں جس کے ذریعہ مولانا مدنی کو شبیر احمد عثمانی نے گرفتار کرایا ہے۔ (فلعنة الله على الكاذبين) لیکن میں پوچھتا ہوں کیا اس میں ذرا بھی کوئی اصلیت ہے؟ اس پر مولوی عتیق الرحمٰن صاحب نے آنکھیں نیچی کرلیں اور خاموش ہو رہے۔ اس کے بعد علامہ عثمانی نے فرمایا کہ آپ حضرات کے متعلق بھی عام طور پر مشہور کیا جاتا ہے کہ آپ ہندوؤں سے روپیہ لے کر کھا رہے ہیں، کیا یہ صحیح چیزیں ہیں، اب ہمیں ان سب قصوں سے بالکل علیحدہ رہ کر غور کرنا چاہیئے کہ کونسا راستہ اختیار کرنے میں مسلمانوں کا فائدہ ہے اور کس راستہ میں ان کا نقصان (قطع نظر اس سے کہ وہ بات انگریز کے ایجنٹ کی زبان سے نکلے یا کوئی ہندو کا دلال کہے۔ مرتب)

لہٰذا میں مزید گفتگو سے پہلے تین چیزیں دریافت کرنا چاہتا ہوں۔

گفتگو کا محور

مولانا عثمانی: پہلی چیز دریافت طلب یہ ہے کہ جو فارمولا جمعیۃ العلمائے ہند نے پاکستان کا نعم البدل ظاہر کر کے ملک کے سامنے پیش کیا ہے اور جس کا حوالہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اپنی تقریر میں بھی دیا ہے اس فارمولا کو آپ حضرات نے کم از کم کانگریس سے منوالیا ہے یا نہیں؟

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اس کا جواب نفی میں دیتے ہوئے کچھ اعذار بیان کیے۔ علامہ عثمانی صاحب کو چونکہ ان اعذار سے کچھ بحث نہیں تھی؛ اس لیے فرمایا کہ اعذار کچھ بھی ہوں میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کا فارمولا کانگریس نے تسلیم کرلیا ہے یا نہیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ ہمارا یہ اُصول نہیں ہے کہ ہم جنگِ آزادی کی شرط کے طور پر ہندوؤں سے کوئی شرط منوالیں۔

(۲) دوسری بات یہ معلوم کرنی ہے کہ آپ جوگفتگو اس وقت مجھ سے فرمانا چاہتے ہیں وہ کس تقدیر پر ہے۔آیا یہ فرض کرتے ہوئے کہ انگریز حکومت ہندوستان سے چلی گئی ہے یا جارہی ہے یا یہ مان کر کہ وہ ابھی موجود ہے اور سردست جانہیں رہی ،گویا جو کچھ لینا ہے اسی سے لینا ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ یہ تو ماننا پڑے گا کہ انگریزی حکومت ابھی ہندوستان میں موجود ہے، اس کی موجودگی تسلیم کرتے ہوئے جو کچھ لینا ہے،اسی سے لینا ہے۔

(۳) تیسری بات دریافت طلب یہ ہے کہ آپ حضرات جو انقلاب اس وقت چاہتے ہیں وہ فوجی انقلاب ہے یا آئینی ۔اس کا جواب دیا گیا کہ فوجی انقلاب کا تو اس وقت کوئی موقع ہی نہیں نہ فی الحال اس کا امکان نہ اس کے وسائل مہیا ہیں ۔اس وقت تو آئینی انقلاب ہی زیر بحث ہے۔

علامہ عثمانی نے بحث کا رُخ معین کرلیا

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ بس اب بحث کا رُخ متعین ہوگیا۔اب کلام اس پر رہے گا کہ سردست انگریزی حکومت کی موجودگی کے باوجود آئینی انقلاب میں کونسا راستہ مسلمانوں کے لیے مفید ہے آیا وہ راستہ جو جمعیۃ العلمائے ہند نے تجویز کیا ہے یا پاکستان کا راستہ جو مسلم لیگ اختیار کررہی ہے۔

پاکستان کے نقصانات کا اظہار وفد جمعیۃ العلمائے ہند کی طرف سے

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اپنی طویل تقریر میں فرمایا کہ پاکستان قائم ہونے میں مسلمانوں کا سراسر نقصان اور ہندوؤں کا فائدہ ہے۔ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ۵۳ فیصدی ہے۔فلاں صوبہ میں اس قدر،فلاں صوبہ میں اتنی اور آسام میں اکثریت دوسروں کی ہے۔ ہر جگہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں غیر مسلم اقلیت اتنی زبردست ہے کہ مسلمان اس سے کسی طرح بھی عہدہ برآنہ ہوسکیں گے اور بہت ہی تھوڑی اکثریت کچھ نہ کرسکے گی؛ بلکہ ہمیشہ معرض خطرہ میں رہے گی۔ادھر مسٹر جناح یہ کہہ ہی چکے ہیں کہ پاکستان میں جمہوری طرز کی حکومت ہوگی۔ایسی شکل میں ظاہر ہے مسلمانوں کی اکثریت ۷ ۴ فیصدی غیر مسلم اقلیت ہی کے عملاً تابع ومحکوم رہے گی۔سکھ نہایت جنگجو قوم ہے،وہ کسی طرح بھی پاکستان قائم نہ رہنے دے گی۔ادھر جاٹوں کی قوم ہے،وہ بھی مسلمانوں کو چین سے نہ بیٹھنے دے گی۔

پاکستان ہر ہر صوبہ کا جدا جدا بنے گا یا تمام مسلم صوبوں کا پاکستان ایک ہوگا

اس موقع پر علامہ عثمانی نے پوچھا کہ آپ کے نزدیک پاکستان کا مطالبہ کرنے والے صوبہ دار چھ پاکستان بنانا چاہتے ہیں یا تمام مسلم اکثریت والے صوبوں کا ایک پاکستان مطلوب ہے؟ جواب دیا گیا کہ نہیں پاکستان تو ایک ہی بنانا چاہتے ہیں ۔علامہ عثمانی نے فرمایا تب صوبہ جاتی اعداد وشمار کی گفتگو بے کار ہے۔

جمعیۃ العلماء اور مسلم لیگ کے فارمولا کے جدا جدا نتائج

مولانا عثمانی نے فرمایا تو اس وقت ہم کو پاکستان کی مرکزی حکومت میں یہ دیکھنا چاہئے کہ مسلم اور غیر مسلم آبادی میں کیا تناسب ہے، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی طرف سے کہا گیا کہ پاکستان میں مجموعی تعداد مسلمانوں کی چھ کروڑ ہوگی اور غیر مسلم تین کروڑ ہوں گے۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ یہ تعداد غلط ہے۔ مجموعہ میں مسلمان تقریباً سواسات کروڑ ہیں؛ لیکن ہم سات کروڑ تسلیم کیے لیتے ہیں اور غیر مسلم جو تین کروڑ سے کم ہیں ان کو پورے تین کروڑ فرض کرلیا جائے۔ اس تعداد سے سات اور تین کی نسبت مسلم وغیر مسلم کے درمیان ہوگی اور مجموعہ آبادی میں آپ کے فرمانے کے مطابق ساٹھ اور چالیس کی نسبت ہوگی۔ یعنی مسلمان ساٹھ فیصدی اور غیر مسلم چالیس فیصدی ہوں گے (حالاں کہ اس صورت میں مجموعہ میں مسلمان واقعۃً ستر فیصدی اور غیر مسلم تیس فیصدی ہوتے ہیں)

حضرت علامہ کا مسکت وحقیقت افروز جواب اور وفد جمعیۃ العلماء کی لاجوابی

مگر علامہ عثمانی نے اس وقت اس سے بھی اغماض کر کے اور ان کے ہی بیان کردہ تناسب کو صحیح مان کر اس پر کلام فرمایا۔ آپ نے فرمایا کہ اب آپ اپنے فارمولا پر نظر ڈالیے کہ اس میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا مرکزی حکومت میں کیا تناسب رہتا ہے، تو آپ کے فارمولا کی رو سے مرکز میں چالیس مسلمان ہوں گے اور چالیس ہندو اور بیس فیصدی دیگر اقلیتیں ہوں گی۔ اس طرح سے آپ کے فارمولا کے لحاظ سے غیر مسلموں کی تعداد ساٹھ فیصدی اور مسلمانوں کی تعداد چالیس فیصدی ہوئی۔ اور مسلم لیگ کے پاکستانی فارمولا میں (بقول آپ کے یہی نسبت علی العکس رہے یعنی) ساٹھ فیصدی مسلمان اور چالیس فیصدی غیر مسلم ہوں گے (حالانکہ حقیقی تناسب پاکستانی فارمولا میں ستر فی صدی اور تیس فی صدی کا ہوتا ہے) اب آپ ہی انصاف سے فرمائیے کہ آپ کے اس فارمولا سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچا (ہم اگر ساٹھ فی صدی رہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتے تو چالیس فیصدی میں کیا کرسکیں گے)

نوٹ: جمعیۃ العلماء کے فارمولا میں یہ بھی مندرج ہے کہ خالص اسلامی مسائل میں دوتہائی مسلمان اگر کسی چیز کے مخالف ہوں گے تو وہ چیز مسلمانوں کے لیے قبول نہیں کی جائے گی۔ اس شرط سے کسی درجہ میں مضر اُمور کا تدارک تو ہوسکتا ہے؛ لیکن خاص مسلمانوں کے حق میں ضروری یا مفید اُمور ہوں ان کے خاطرخواہ حاصل ہونے کی کوئی تدبیر نہیں؛ کیونکہ مرکز میں مسلم تعداد چالیس اور غیر مسلم تعداد ساٹھ فیصدی ہوگی۔ ایسی تمام تجاویز غیر مسلم اکثریت کے رحم وکرم پر رہیں گی اور یہ معاملہ بھی خالص اسلامی مسئلہ کون سا ہے اکثریت ہی طے کرے گی)

اس موقعہ پر کہا گیا کہ عیسائی ہمارے ساتھ ہوجائیں گے۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ یہ عجیب بات ہے کہ جب پاکستان کا فارمولا سامنے آتا ہے تو عیسائی مسلمانوں سے علیحدہ غیر مسلم بلاک میں شمار کیے جاتے ہیں اور جب

جمعیۃ العلمائے ہند کا (مقدس) فارمولا پیش کیا جاتا ہے تو وہی عیسائی (گویا کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتے ہیں اور) مسلمانوں کے سائڈ میں شمار کیسے جانے لگتے ہیں، اصل یہ ہے کہ غیر مسلم سب کے سب بہر صورت ایک ہی شمار ہوں گے۔ (الکفر ملّة واحدة) اور خالص مسلمانوں کو ان سب کے مقابل رکھ کر مسئلہ پر غور کرنا چاہئے۔ وفد جمعیۃ العلماء نے آخر کار اس کو تسلیم کرلیا۔

اگر پاکستان ہندو کے لیے مفید ہے تو وہ اس کی مخالفت کے لیے اس قدر مضطرب کیوں ہے؟

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ آپ کا یہ دعویٰ کہ پاکستان قائم ہونے میں سراسر مسلمانوں کا نقصان اور ہندوؤں کا فائدہ ہے۔ اگر صحیح تسلیم کرلیا جائے تو کیا آپ یہ بتلا سکتے ہیں کہ ہندو پاکستان سے پھر کیوں اس درجہ مضطرب و خائف اور اس کی انتہائی مخالفت پر تلا ہوا ہے کیا آپ باور کر سکتے ہیں کہ ہندو پاکستان کی مخالفت محض اس لیے کر رہا ہے کہ اس میں مسلمانوں کا نقصان ہے اور وہ کسی طرح بھی مسلمانوں کا نقصان دیکھنے کو تیار نہیں، ان کا تو اعلان یہ ہے کہ جو جماعت یا جو شخص بھی پاکستان اور مسلم لیگ کے خلاف کھڑا ہوگا کانگریس اس کی ہر طرح امداد کرے گی۔

(اس وعدہ کا تعلق کسی خاص شخص سے نہیں کانگریس کے پورے ادارے سے ہے) اور ان کا قول ہے کہ پاکستان ہماری لاشوں پر ہی بن سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ آخر یہ پُر زور اور انتہائی مخالفت کیوں ہے۔ اس کے جواب میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ ان کی کوئی مصلحت ہوگی؛ لیکن اس کا کوئی معقول جواب نہیں دیا گیا اور بار بار اس پہلو سے گریز کیا جاتا رہا۔

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ اس کی جو کچھ بھی مصلحت ہو آخر آپ حضرات نے بھی کچھ غور کیا کہ وہ مصلحت کیا ہو سکتی ہے، میرے نزدیک تو اس کی مخالفت کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ انگریز کی حکومت تو سر دست اوپر قائم ہے جسے آپ خود شروع میں تسلیم کر چکے ہیں۔ ہندو یہ چاہتا ہے کہ انگریزی حکومت کے زیر سایہ دس کروڑ مسلمانوں میں سے ایک شخص کی گردن پر سے بھی ہندو اکثریت کا جوا کبھی اور کہیں اُترنے نہ پائے اور اس طرح مسلمان ہمیشہ انگریز اور ہندو کی ڈبل غلامی میں باختیار خود پستے رہیں۔

علامہ عثمانی نے کئی بار اس چیز کو ان لوگوں سے پوچھا؛ مگر ادھر سے کوئی شافی جواب ہاتھ نہ آیا، اس کے بعد جمعیۃ العلماء ہند کے وفد کی طرف سے کہا گیا اچھا اگر پاکستان بن جائے تو تین کروڑ کی مسلم اقلیت ہندو صوبوں میں رہے گی اس کی حفاظت کا کیا انتظام ہوگا۔

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ ان کے لیے معاہدات ہوں گے، ان ہی معاہدات کے تحت مسلم اقلیت ان کے یہاں اور ہندو اقلیت ہمارے یہاں رہے گی۔ اور ہر ایک کا ہاتھ ایک دوسرے کے تلے دبا رہے گا۔ آخر اکھنڈ ہندوستان میں دس کروڑ مسلمانوں کی حفاظت کس طرح ہوگی۔ اس کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب نے موضوعِ گفتگو بدل کر کہا۔

علی گڑھ کالج پر اتہام

اجی حضرت یہ علی گڑھ کے نیچری، علماء کے وقار کے دشمن ہیں یہ لوگ اگر مسلمانوں کے رہنما بن گئے تو دین برباد کر دیں گے۔ علماء کو مٹا دیں گے۔ اسی سلسلہ میں ان بدتمیزیوں کا بھی ذکر کیا گیا۔ جو بعض مقامات میں مولانا حسین احمد صاحب کے ساتھ کی گئی تھیں۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی کہا کہ مسلم لیگ راجاؤں، نوابوں، خطاب یافتہ لوگوں کی جماعت ہے، سر فیروز خاں نون کے متعلق فرمایا کہ وہ حکومت کے اشارہ سے مستعفی ہو کر مسلم لیگ میں داخل ہوئے ہیں اور وہ کھلے طور پر سرکاری آدمی ہیں۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ سر فیروز خاں نون کے متعلق میں بحث نہیں کرتا۔ آپ جو جی چاہے کہیں؛ لیکن مسٹر جناح کے متعلق کبھی میرا یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ وہ سرکاری آدمی ہیں یا وہ کسی لالچ یا دباؤ میں آسکتے یا کسی قیمت پر خریدے جا سکتے ہیں۔

مولانا احمد سعید صاحب کے اس کہنے پر کہ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اور دوسرے بعض فرقے علماء کا اقتدار مٹانا اور دین کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ علامہ عثمانی نے ارشاد فرمایا کہ یہ تو مشکلات ہوئیں۔ ان کا حل آپ کے ذہن میں کیا ہے۔ وہ بھی تو فرمائیں۔ اس پر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور خاموشی سی طاری ہوگئی پھر وفد کی طرف سے کہا گیا کہ حضرت آپ ہی فرمائیں کیا حل ہے۔ حضرت علامہ نے فرمایا کہ یہ بھی خوب رہی مشکلات تو بیان فرمائیں آپ اور حل بتاؤں میں۔ آخر آپ نے بھی تو کچھ اس کا حل سوچا ہوگا۔

علماء کی مشکلات کا حل علامہ عثمانی کی طرف سے

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ اچھا لیجیے میں ہی اس کا حل عرض کرتا ہوں میرے نزدیک اس کا حل صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ سب حضرات مل کر مسلم لیگ میں داخل ہو کر اس پر قبضہ کر لیں اور ایک دو مہینے دُورہ کر تین چار لاکھ دو آنہ والے ممبر مسلم لیگ کے بھرتی کرائیں۔ جب ہمارے ہم خیال ممبران کی اتنی بھاری تعداد مسلم لیگ میں داخل ہو جائے گی تو پھر ہم عوام کے ذریعہ سے جو مفید صورت مسلمانوں کے لیے ہوگی بہ آسانی بروئے کار لاسکیں گے۔ کیا ہمارا اثر عوام پر اتنا بھی نہیں کہ ہم دو چار لاکھ ممبر بھرتی کرا سکیں گے۔ میں اس کے لیے تیار ہوں کہ آپ حضرات کے ساتھ مل کر اس کام میں حصہ لوں میرے نزدیک تو اصلاح کی یہ ہی بہترین شکل ہے۔ اس

پر مولانا احمد سعید صاحب نے فرمایا کہ یہ تو صحیح؛ لیکن جب ہم لوگ ایسا کریں گے تو یہ راجے مہاراجے نواب اور سر مسلم لیگ سے علیحدہ ہو کر دوسری مسلم لیگ بنالیں گے۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ اگر وہ نئی مسلم لیگ بنا ہی لیں گے تو اس سے کیا ہو گا عوام کی طاقت تو ہمارے ہی ساتھ رہے گی (سر شفیع مرحوم نے بھی تو ایک زمانہ میں شفیع لیگ بنائی تھی؛ لیکن اس کا حشر کیا ہوا۔ جب شفیع صاحب رحلت کر گئے، ان ہی کے ساتھ ان کی لیگ بھی ختم ہو گئی اور رابطۂ عوام وہ کبھی بھی پیدا نہ کر سکے)

رہا ان بدتمیزیوں کا قصہ جو آپ کے ساتھ ہوئیں، اس کے متعلق آپ کو معلوم ہے کہ میں نے جو پیغام جمعیۃ العلماء اسلام کے اجلاس کلکتہ کے موقع پر بھیجا تھا اس میں صاف طور سے لکھ دیا تھا کہ یہ پرلے درجہ کی شقاوت و حماقت ہے کہ قائدِ اعظم کو کافر اعظم کہا جائے یا مولانا حسین احمد وغیرہ کے ساتھ کوئی ناشائستہ سلوک کیا جائے۔

انگریزی خواں طلباء کی شکایت کرنے سے پہلے

طلباء دارالعلوم دیوبند کی اصلاح کیجیے

اس موقعہ پر مجھے ایک بات کہنی پڑتی ہے وہ یہ کہ جن انگریزی خواں طلباء کے رویہ کی شکایت فرمارہے ہیں وہ نہ تو آپ کے مرید ہیں نہ شاگرد۔ نہ انہوں نے کسی دینی ماحول میں تربیت پائی ہے (اور سمجھتے یہ ہیں کہ آپ مسلم قوم کو ہندوؤں کی دائمی غلامی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں) اس کے مقابلہ میں جو عربی مدارس کے طلباء آپ کے شاگرد آپ کے مرید اور دینی ماحول؛ بلکہ مرکزِ دین و اخلاق میں تربیت پانے والے ہیں ذرا ادھر بھی تو دیکھئے کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے طلباء نے جو گندی گالیاں اور فحش اشتہارات اور کارٹون ہمارے متعلق چسپاں کیے جن میں ہم کو ابوجہل تک کہا گیا اور ہمارا جنازہ نکالا گیا آپ حضرات نے اس کا بھی کوئی تدارک کیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اُس وقت دارالعلوم کے تمام مدرسین، مہتمم اور مفتی سمیت (باستثنا ایک دو کے) بالواسطہ یا بلاواسطہ مجھ سے تلمذ رکھتے تھے۔ دارالعلوم کے طلباء نے میرے قتل تک کے حلف اُٹھائے اور وہ فحش اور گندہ مضامین میرے دروازہ میں پھینکے کہ اگر ہماری ماں بہنوں کی نظر پڑ جاتی تو ہماری آنکھیں شرم سے جھک جاتیں۔ کیا آپ میں سے کسی نے بھی اس پر ملامت کا کوئی جملہ کہا؛ بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ بہت سے لوگ ان کمینہ حرکات پر خوش ہوتے تھے۔

حرّیت اخبار کے علامہ عثمانی پر رکیک حملے

''حریت'' اخبار دہلی (زیر ادارت عزیز حسن بقائی) آج کل جو میری ذاتیات پر نہایت رکیک مضامین لکھ رہا

ہے، کیا آپ حضرات میں سے کسی نے اس پر بیزاری کا اظہار کیا۔ اس پر سب کی آنکھیں شرم سے جھکی ہوئی تھیں۔
مولانا احمد سعید صاحب نے اتنا فرمایا کہ اجی حضرت عزیز حسن بقائی(۱) تو ہمیشہ اسی قسم کی بیہودہ بکواس کیا کرتا ہے، کیا آپ کو معلوم نہیں۔ علامہ عثمانی نے فرمایا اس وقت تو وہ آپ کی حمایت اور ہمنوائی میں سب کچھ کہہ رہا ہے۔ گو مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ایک زمانہ میں اس نے آپ صاحبان کو بھی بُری طرح مجروح کیا تھا؛ لیکن دکھلانا صرف یہ ہے کہ آپ حضرات نے کبھی اس قسم کی چیزوں سے جو ہمارے متعلق کہی گئیں۔ اظہارِ بیزاری نہیں کیا نہ کسی پر ملامت کی۔ ہم نے تو یہ کیا کہ ہم موقع ملنے پر ایسے اُمور سے پوری قوت کے ساتھ اظہارِ بیزاری کرتے رہے۔

فرقِ عمل

محلہ کسرول مراد آباد کے ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ کیا مولانا حسین احمد صاحب اور مفتی کفایت اللہ صاحب آپ کے نزدیک محض ذاتی مفاد کے لیے ہندوؤں کا ساتھ دے رہے ہیں یا ان کا اتباع بے دینی اور کفر ہے یا وہ اپنے استاد کے مسلک سے ہٹ گئے ہیں؟
میں نے جواب میں لکھا کہ میرے خیال میں نہیں آسکتا کہ یہ حضرات محض ذاتی مفاد کے لیے ایسا کریں وہ اپنے نزدیک جو حق سمجھتے ہیں کر رہے ہیں۔ اور اسی کو اپنے استاد کا مسلک سمجھتے ہیں۔ باقی یہ لازم نہیں کہ جو ان کا خیال ہے وہ واقع میں صحیح ہو نہ ان کی تقلید دوسروں پر واجب ہے۔ اُمور مذکورہ کا تذکرہ میں نے اس لیے نہیں کیا کہ مجھے کوئی انتقام لینا مقصود نہیں ہے میں تو بہر صورت ایسے امور کو برا سمجھتا ہوں۔ دکھلانا صرف یہ ہے کہ ہم نے اپنی بساط کے موافق اس قسم کے اُمور کو روکنے کی ہمیشہ سعی کی۔

مولانا مدنی کا پاکستان کے خلاف ایک استدلال اور علامہ عثمانی کی طرف سے اس کا مسکت جواب

آخر گفتگو میں مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے اپنی جیب سے دو تین کالم کا ایک مضمون نکال کر تقریباً آٹھ دس منٹ تک پڑھ کر سنایا۔ یہ مضمون ایک انگریز کی تجویز اور رائے پر مشتمل تھا جس میں اس نے ہندوستان کی سیاست

(۱) عزیز حسن بقائی دہلی کی مشہور صحافی شخصیت جس کی زبان اور قلم تہذیب کا دامن چھوڑ کر گندہ زبانی پر معروف ہے، انگریزی خیال کا انسان تھا۔ عرصے تک پیشوا رسالہ ان ہی کی ادارت میں نکلتا رہا، ایک زمانے میں کیا ۱۹۲۴ء اور اس کے پس وپیش کے عرصے میں سلطان ابن سعود عبدالعزیز کے متعلق وہ مولانا محمد علی جوہر کے سخت مخالف اور حسن نظامی کی موافقت میں مولانا محمد علی جوہر کے خلاف لکھتے رہے۔ (انوار)

پر بحث کرتے ہوئے حکومت برطانیہ کو اس کا حل بتایا تھا۔اس مضمون میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے،گویا مضمون کو سنانے کی غرض تھی کہ مسلم لیگ نے جو نظریہ پاکستان پیش کیا ہے وہ اس انگریز کی تجویز پر مبنی اور مسلم لیگ انگریزوں کے اشاروں پر چلنے والی جماعت ہے۔

اسی دوران میں مولانا احمد سعید کا ایک سوال اور اس کا جواب

مولانا احمد سعید صاحب نے سوال کیا کہ انگریز کی پالیسی ٹکڑے کرنے کی ہے یا جمع کرنے کی یعنی اس کا فائدہ کس جانب میں ہے۔مطلب یہ تھا کہ ہم جو فاروقی حکومت چاہتے ہیں۔انگریز کے لیے مہلک ہے اور آپ جو تقسیم ہند چاہتے ہیں یہ صورت حکومت کے لیے مفید اور معین ہے۔

علامہ عثمانی نے ارشاد فرمایا کہ میرے نزدیک آپ کے سوال کا ایک جواب نہیں ہوسکتا۔یعنی کہ سوال کے جواب میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انگریز کا فائدہ ہمیشہ ٹکڑے کرنے میں ہے یا نہیں۔میرا جواب یہ ہے کہ کبھی انگریز کا فائدہ ٹکڑے کرنے میں اور کبھی جمع کرنے میں ہوتا ہے؛ چنانچہ اس کی حالیہ نظیر ملاحظہ فرمائیے برطانیہ نے ترکی اور عرب کے ٹکڑے ٹکڑے کیے۔عراق،شام،لبنان،نجد،یمن سب کو علیحدہ علیحدہ حصوں میں منقسم کر دیا۔

ایک وقت میں یہ پالیسی تھی۔اب جو عرب لیگ قائم ہو رہی ہے،جس میں تمام عربوں کو روس کے خطرے سے انگریز متحد کرنا اور ان سب کا ایک بلاک بنانا چاہتا ہے کیا یہ بھی آپ کے نزدیک انگریز کے اشارہ سے نہیں ہو رہا؟ جس کا منشاء یہ ہے کہ تمام عرب ممالک کی ایک آہنی دیوار بنادی جائے،اس وفد نے تسلیم کیا کہ بیشک۔

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ پھر یہ کہنا صحیح نہیں کہ انگریز کی پالیسی ہمیشہ ٹکڑے کرنا ہے،معلوم ہوا کہ کبھی اس کی پالیسی جمع کرنے کی بھی ہوتی ہے۔اب ہمیں یہ تو سوچنا چاہئے کہ ہمارا فائدہ کس صورت میں ہے۔خواہ اس میں حکومت کا فائدہ ہو یا نقصان۔ظاہر ہے کہ ہندو یا مسلمان کسی کے مقابلہ میں گورنمنٹ اپنے مفاد کو بااختیار خود نظرانداز نہیں کرسکتی۔

نظریہ پاکستان کانگریس اور حکومت دونوں کے نظریوں کے مخالف ہے

اس کے بعد علامہ عثمانی نے فرمایا کہ مولانا حسین احمد صاحب نے جو انگریز کا مضمون پڑھ کر سنایا یہ انگریز کی شخصی رائے اور تجویز ہے جو اب سے چودہ برس پہلے پیش کی گئی تھی؛ لیکن حکومت برطانیہ کا سب سے بڑا نمائندہ وائسرائے لارڈ ویول جو ہندوستان میں اس وقت حکمران ہے اس نے اپنی تقریروں میں یہ برملا کہا ہے کہ اس ملک کا مرکز اور اس کی حکومت ایک ہی رہنی چاہئے۔اس ملک پر کوئی بڑا عمل جراحی نہیں ہوسکتا۔پہلی مرتبہ یہ تقریر کلکتہ کے کامرس آف چیمبر میں کی۔دوسری مرتبہ لیجس لیچر میں یہی مضمون ادا کیا اور ابھی دو تین ماہ ہوئے راولپنڈی

کے دورے میں لارڈ ویول نے یہی کہا کہ اس ملک کی تقسیم نہیں ہوسکتی اس سے پہلے سابق وائسرائے ہند اور لارڈ لنلتھگو نے بھی ۱۹۴۲ء میں اس قسم کی تقریر کی تھی اب آپ حضرات غور فرمائیں کہ آج وائسرائے ہند کے نظریہ کی حمایت کانگریس کررہی ہے یا مسلم لیگ۔

مولانا احمد سعید صاحب نے فرمایا کہ اجی حضرت یہ تو انگریزوں کی چالیں ہیں، کہتے تو کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔علامہ عثمانی نے فرمایا کہ اس انگریز کی تجویز میں تو یہی احتمال ہوسکتا ہے؛ لیکن حجت کے درجہ میں تو سب سے بڑے ذمہ دار ہی کا قول ہم پیش کرسکتے ہیں۔

پاکستان کے قیام پر مولانا مدنی کا ایک اشکال اور اس کا شافی جواب

اسی سلسلہ میں مولانا حسین احمد مدنی نے فرمایا کہ اچھا اگر پاکستان قائم ہوگیا تو ہندوستان کا دفاع کیسے ہوگا۔روس نے اگر حملہ کیا تو سرحد کے مسلمان پس جائیں گے۔سارا بوجھ ان پر پڑ جائے گا۔علامہ عثمانی نے فرمایا کہ یہ تو آپ مان ہی چکے ہیں کہ انگریز ابھی یہاں موجود ہے۔سردست اگر پاکستان بنائے گا تو وہی بنائے گا۔سرحدوں کی حفاظت کی بھی کوئی صورت ضرور نکالے گا اور اس کے چلے جانے کی صورت میں بیرونی قوت ہندوستان پر چڑھائی کرے گی تو دونوں منطقے مل کر اس کی مدافعت کریں گے اور ہر ایک دوسرے کی آدمی سامان اور اسلحہ اور روپے سے رَد کرے گا؛ کیونکہ یہ سب کا مشترکہ مفاد ہوگا۔ایسا نہیں کریں گے تو سب کا نقصان ہوگا۔اس قسم کے دفاع کے کام باہمی معاہدوں سے انجام پائیں گے۔مولانا احمد سعید صاحب نے فرمایا کہ حضرت معاہدوں کو آج کل کون پوچھتا ہے۔علامہ عثمانی نے فرمایا کہ جب بلا معاہدہ آپ سب کچھ کرنے کو تیار ہیں تو معاہدہ کی صورت تو بہر حال اس سے قوی تر ہونی چاہیے۔

جمعیۃ العلماء کی دفاعی طرزِ حکومت کی تائید کا خیال احتیاج ہنود پر مبنی ہے

پھر آپ کی تقریر کا حال تو یہ ہوا کہ ہم کسی حالت اور کسی وقت میں بھی ہندوؤں کی احتیاج سے باہر نہیں ہوسکتے اور نہ ان کے بدوں کبھی کوئی کام کرسکتے ہیں (یہ بات کم از کم شیر دل بہادروں کو زیب نہیں دیتی جو کہتے ہیں کہ ذرا انگریز سے آزادی مل جائے[1] تو پھر ہم ہندو وغیرہ کسی سے نہیں ڈرتے)۔

(۱) حلقۂ دیوبند کی خاص مجالس میں اکابر کی زبان پر یہ بات آتی رہی ہے کہ کسی صورت سے انگریزوں سے ملک کو آزاد کرالیا جائے پھر اسلامی ممالک کے سربراہوں سے ہندوستان پر حملہ کرا کے مسلمانوں کی ہندوستان میں حکومت قائم کی جائے۔یہی خیال علماء ہند دہلی کے دلوں میں تھا۔اس جملے میں اسی خیال کی طرف طنزیہ اشارہ کیا گیا ہے، یہ خیال یقیناً اکابر دیوبند کا تھا۔ہم نے اس خیال کا اظہار حیات امداد کے مقدمے میں حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی حمایت میں کیا تھا کہ ہمارے خلاف الجمعیۃ اخبار دہلی میں ایک صاحب نے مضمون لکھ کر شائع کرایا۔(انوار)

نیز آپ دیکھتے ہیں کہ معاہدات ہی کی طاقت تھی کہ روس اور برطانیہ نے مل کر جرمن اور جاپان کو کس طرح پیس ڈالا؛ کیونکہ تینوں کی غرض مشترک تھی۔ پاکستان اور ہندوستان کا مفاد جب مشترک ہوگا تو دونوں بذریعہ معاہدات عملی اتحاد کیوں نہیں کر سکتے (گو قومی اتحاد نہ ہو نہ سہی)۔

موجودہ الیکشن میں علامہ عثمانی کی حمایت لیگ کی کیا وجہ ہے

اس موقعہ پر مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے علامہ عثمانی سے کہا کہ آپ تو ہمیشہ سیاسیات سے یکسو رہا کرتے تھے۔ اس الیکشن میں کیا داعیہ ایسا پیش آیا جس کی وجہ سے آپ نے شرکت فرمائی۔

حضرت علامہ عثمانی نے فرمایا کہ اس الیکشن کی نوعیت پچھلے الیکشنوں سے بالکل مختلف ہے حکومت نے صاف لفظوں میں اس کا اعلان کر دیا ہے کہ اس مرتبہ منتخب ہونے والی اسمبلیاں ہی آئندہ ہندوستان کا مستقل دستور بنائیں گی؛ چونکہ اس الیکشن سے قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ وابستہ تھا اس بنا پر میں نے ضروری سمجھا کہ اس بنیادی موقع پر ان مسلمانوں کی مدد کی جائے جو استقلال ملت اور مسلم حق خود ارادیت کے حامی ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ آپ نے یہ کیا کہا کہ میں سیاست سے ہمیشہ علیحدہ رہا ہوں۔ گزشتہ چند سالوں کو چھوڑ دیجیے اس سے پیشتر جمعیۃ العلماء ہند میں ہماری بھی تو کچھ ناچیز خدمات رہی ہیں۔ ہم نے بھی تو کچھ معرکے سر کیے ہیں اور آپ حضرات طوفانی دَورہ کر رہے تھے، جس سے میرے نزدیک مسلمانوں کا نقصان تھا۔ تو ظاہر تھا کہ ایسے موقع پر سکوت کیسے باقی رکھ سکتا تھا۔

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است ❖ اگر خاموش نہ نشینم گناہ است

ان وجوہ کی بنا پر میں نے مسلم لیگ کی تائید و حمایت کی (پھر علامہ عثمانی نے یکا یک کوئی اعلان نہیں فرمایا؛ بلکہ مہینوں پاکستان کے نظریہ پر شرعی و سیاسی حیثیت سے انتہائی غور و تعمق کیا، جب کلکتہ کے اجلاس کل ہند جمعیۃ العلماء اسلام میں اپنا پیغام بھیجا تو استخارہ بھی فرمایا، مکمل بصیرت اور شرح صدر کے بعد یہ اقدام فرمایا گیا۔ مرتب)

اس کے بعد علامہ عثمانی نے فرمایا کہ پھر میرا اثر ہی کیا ہے ہندوستان میں اگر میری اپیل پر بیچارے نوابزادہ لیاقت علیخاں کو دس بیس ووٹ مل ہی گئے تو کیا ہوا۔ آپ حضرات تو ماشاءاللہ بااثر ہیں (موجودہ پروپیگنڈے کی طاقتیں آپ کے ساتھ ہیں)۔ میں تو اب آپ میں ایک اَچھوت کی حیثیت رکھتا ہوں کسی نے کہا یہ بات نہیں آپ کے اعلانات نے ملک میں ہل چل ڈال دی ہے۔

علامہ عثمانی سے سکوت کی درخواست

مولانا احمد سعید صاحب نے فرمایا کہ بہر حال یہ اختلافی مسئلہ ہے اس میں احتمال خطا کا دونوں طرف ہے؛ مگر آپ تو اس قوت سے بیان دے رہے ہیں کہ اپنے مخالفوں کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑتے ذرا کچھ تو نرمی

اختیار فرمائیں۔علامہ عثمانی نے فرمایا کہ آپ حضرات تو ماشاءاللہ سب اہلِ علم ہیں۔آپ کو معلوم ہے کہ جب احناف و شوافع وغیرہ کے باہمی اختلافی مسائل کی تقریریں آپ اور ہم کرتے ہیں تو باوجودیکہ سب ائمہ ہدیٰ ہیں؛ لیکن ہم میں سے کون اپنے مذہب کی تصویب و تائید میں کسر اُٹھا رکھتا ہے اور حنفی مذہب کو ترجیح دیتے ہوئے شافعی یا مالک یا احمد کے لیے اپنے زعم میں کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑتا ہے۔اس پر سب ہنسنے لگے۔علامہ عثمانی نے فرمایا کہ اس سلسلہ میں میرا تو وہی خیال ہے جو فقہائے کرام نے مقلد کے عقیدے کی نسبت لکھا ہے کہ اپنا امام جو مسئلہ بیان کرے اس کی نسبت یہ اعتقاد رکھے صواب یحتمل الخطأ (یعنی جو ہمارے امام نے مسئلہ بیان کیا وہ صحیح اور درست ہے۔ ہاں! اس میں خطا کا بھی احتمال ہے) اور دوسرے امام نے جو کہا خطأ و یحتمل الصواب یعنی وہ خطا ہے گو اس میں احتمال صواب کا بھی قائم ہے؛ کیونکہ معصوم ان میں سے کوئی نہیں۔آخر میں مولوی حفظ الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ جمعیۃ العلماء اسلام محض ہماری جمعیت کے مقابلہ میں اس کو توڑنے کے لیے قائم کی گئی ہے،مناسب ہوگا کہ آپ کم از کم اس کی صدارت قبول نہ فرمائیں،علامہ عثمانی نے فرمایا کہ میں نے ابھی صدارت کے قبول و عدمِ قبول کی نسبت کوئی باضابطہ فیصلہ نہیں کیا ہے؛لیکن کل کے لیے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کیا کروں گا۔

نوٹ: لیکن اس کے بعد علامہ عثمانی نے کل ہند جمعیۃ العلماء اسلام کے ناظم کے تار کے جواب میں باضابطہ صدارت کی منظوری کا تار روانہ فرما دیا ہے۔ (فللّٰہ الحمد۔مرتب)

جب یہ حضرات علامہ عثمانی سے رخصت ہونے لگے تو مولانا احمد سعید صاحب نے دریافت فرمایا کہ آپ کو حضور نظام نے حیدرآباد بھی تو بلایا تھا، آپ حیدرآباد کب تشریف لے جائیں گے،علامہ عثمانی نے فرمایا کہ میں نے حضور نظام کو لکھا ہے کہ ابھی دو تین ماہ تک مجھے یہاں بغرض علاج قیام کرنا ہے۔سردی کم ہونے پر اگر اجازت ہو تو حیدرآباد آؤں۔اب حضور نظام پر موقوف ہے کہ اگر اس کے باوجود انہوں نے مجھے طلب فرمایا تو مجھ کو بہرحال جانا پڑے گا اور اگر اجازت دے دی تو ٹھہر جاؤں گا۔

(الحمدللہ اس تحریر کے مرتب کرتے وقت ہی حضور نظام کے چیف سیکرٹری کا تار بنام علامہ عثمانی پہنچ گیا کہ آپ کو فروری تک قیام کی اجازت ہے۔مرتب)

چلتے چلتے وفد کا منشا یہ معلوم ہوتا تھا کہ جو تحریرات آپ کی شائع ہو چکی ہیں وہ بیان مسئلہ کے لیے کافی ہیں،اب اگر یکسوئی اختیار کرلی جائے تو کیا بہتر نہ ہوگا؛ لیکن علامہ عثمانی نے فرمایا کہ جس چیز کو میں حق سمجھتا ہوں ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں میرے لیے سکوت کیسے مناسب ہے۔

اس کے بعد وفد رخصت ہوگیا۔یہ تمام گفتگو نہایت خوشگوار فضا میں ہوئی کسی موقعہ پر بھی بحمداللہ ادنیٰ تلخی پیدا نہ ہوئی جب یہ تاریخی مجلس برخاست ہونے لگی علامہ عثمانی نے اپنے یہاں آنے والے علماء کے احترام میں اتنا

فرمایا کہ یہ سلسلہ گفتگو آخری سلسلہ نہیں ہے پھر جب چاہیں گفتگو کر سکتے ہیں۔ جانبین کو موقع غور وفکر کا حاصل ہے۔ اب تک کی صورتِ حال یہ ہے کہ آپ اپنی جگہ قائم ہیں اور میں اپنی جگہ پر رہا، اس کے بعد مجلس برخاست ہوگئی۔ شرعی حیثیت سے مسائل حاضرہ پر جمعیۃ العلماء ہند کے وفد کی طرف سے کوئی کلام نہیں ہوا۔

غالباً یہ حضرات یہ سمجھ کر آئے تھے کہ علامہ عثمانی کی سیاسی معلومات کم ہوں گی تو ہم اپنے بیان کردہ واقعات سے علامہ موصوف کی رائے کو متاثر کر دیں گے۔ شرعی حیثیت سے گفتگو کو تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ اس پر ہم آپ سے کیا بحث کرتے؛ لیکن اس مکالمہ سے غالباً ان پر یہ حقیقت بھی روشن ہوگئی کہ علامہ عثمانی نے مسئلہ پاکستان کو اپنی گفتگو میں اس طرح سے منقح کیا کہ جو لوگ سیاسی ہیں جب اس مکالمہ کو سنتے ہیں تو وہ خود بھی مسئلہ کے اس انداز پر عش عش کرتے ہیں۔ مرتب) (یہ مکالمہ مصدقہ ومرممہ علامہ عثمانی ہے)

تبصرہ از جامع خطبات

مکالمۃ الصدرین آپ نے پڑھ لیا اب آپ خود ہی فیصلہ کر لیجیے کہ مکالمے کے افراد میں ہر ہر فرد کے کلام میں سے کس کی گفتگو اور کس کے سوالات واعتراضات اور جوابات میں وزن زیادہ ہے اور ہمارے نزدیک اس مکالمہ میں علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کے دلائل اور جوابات میں جو استدلالی قوت ہے وہ اور کسی کی گفتگو میں نہیں۔ جتنے خدشات پاکستان کے بارے میں اکابر جمعیۃ العلماء ہند دہلی کی زبان پر آئے ان کے جس قدر مناسب، مدلل، ٹھوس اور موزوں جوابات علامہ عثمانی نے دیے ہیں وہ ان کی کلامی قوتوں اور سیاسی بصیرتوں کے آئینہ دار ہیں۔

اس مکالے کو پڑھ کر بہت سے سیاستدان اور غیر سیاسی لوگوں نے ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال، جمعیۃ العلمائے ہند کے فارمولے اور پاکستان کے نظریۂ آزادی کی حقیقت سے صحیح معنیٰ میں واقفیت حاصل کر کے مسلم لیگ کی تائید میں شفائے قلبی اور دلی اطمینان کے ساتھ شمولیت اختیار کی۔

یہ ناچیز انوارالحسن جامع خطبات ۲۴ر دسمبر ۱۹۴۵ء کو دسمبر کی تعطیل میں جب کپورتھلہ سے شیرکوٹ روانہ ہوا تو دیوبند اترا اور علامہ عثمانی سے ملا تو آپ اس مکالے پر نظر ثانی فرما رہے تھے۔ میں نے اُس وقت اِس کے مسودے کو علامہ سے لے کر پڑھا تھا۔

(خطباتِ عثمانی: ص ر ۱۳۳، ناشر: مکتبہ دارالعلوم کراچی پاکستان)

.....❖.....

خوشی

درج ذیل مضمون پیش کرتے ہوئے ہم خوشی محسوس کر رہے ہیں؛ کیوں کہ اپنی اس کتاب میں ہم نے مسلسل یہی لکھا ہے کہ جمعیۃ علماء ہند نے مولانا حسین احمد مدنی کی صدارت کے بعد یا یوں کہہ لیجیے کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد سے امتِ مسلمہ کے لیے کچھ بھی کارہائے نمایاں انجام نہیں دیے ہیں۔ ہم نے یہاں ''کارہائے نمایاں'' استعمال کیا ہے؛ اس لیے فقط زبان درازی کرنے والے اجہل مطلق لوگ جمعیۃ کے چند چھوٹے موٹے امدادی کام کا شمار نہ کرائیں، کہ کچھ نہ کچھ تو چھوٹی موٹی کوئی بھی تنظیم کرتی ہی ہے۔

دوسری بات انگریزوں سے آزادی کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے کیا حقوق رہیں گے۔ اِس بارے میں جمعیۃ کے پاس کوئی منصوبہ کوئی لائحہ عمل نہ اُس وقت تھا نہ آج ہے۔ گزشتہ ستر سالوں میں جمعیۃ علماء ہند نے مدنی خاندان کی سیاست چمکانے کے علاوہ اور کیا ہی کیا ہے۔ ان تمام باتوں کی تفصیل ہمیں بھوپال سے نکلنے والے ماہنامہ ''ندیم'' کے شماروں میں بھی ملی۔ اور کمال تو اِس بات کا ہے کہ یہ تمام تفصیل آج سے ۵۳ سال پہلے لکھی گئی ہے۔ جب تو مولوی اسعد مدنی کی ریشہ دوانیوں نے پر پھیلانے شروع ہی کیے تھے۔ آپ ماہنامہ ''ندیم'' کے یہ تینوں اداریے پڑھیے اور دیکھیے ہماری اِس کتاب میں جو بھی لکھا گیا ہے وہ سب کس تابناکی کے ساتھ حق معلوم ہوتا ہے۔

لاریب ماہنامہ ندیم کے یہ اداریہ ہم نے اپنی کتاب مکمل کرنے کے بعد ہی پڑھے ہیں اور ہمیں اسی لیے فاتحانہ مسرت کا احساس ہو رہا ہے کہ ہم نے بھی سچائی کو لکھنے میں جتنی ایمانداری سے کام کیا ہے وہ ان شاء اللہ ایمان کے دوسرے درجہ کی علامت کے حق میں ضرور قبول ہوگا۔

دارالعلوم دیوبند نے تاریخ شائع نہیں کی ہے؛ بلکہ تاریخ کے نام پر عوام کو گمراہ کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لے کر ظالم، سفاک اور سیاسی لیڈران کے علاوہ غیر صلاحیت منداور نااہل لوگوں کے چہروں پر اعلیٰ اوصاف و فرشتہ صفاتی کا پُرفریب نقاب ڈالنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ دارالعلوم کے مہتمم کی ایما پر تاریخ مرتب کرنے والے فاضل مرتب نے شاید یہی سوچ لیا تھا کہ اب قوم بالکل مردہ ہو چکی ہے اسے کچھ بھی اُلٹا سیدھا جھوٹ سچ دے دو یہ سب ہضم کر لے گی؛ لیکن یہ بھول گئے کہ جن کے بدن میں بہنے والا خون حلال کمائی کی غذاؤں سے بنتا ہے۔ اور جن کے والدین کی تربیت جی حضوری و چاپلوسی نہیں سکھاتی۔ جن کے اساتذہ صرف خدا کا خوف دلوں میں

جاگزیں کرتے ہیں وہ لوگ ابھی اسی دنیا اور اسی ملک میں زندہ ہیں۔ اللہ رب العزت کا لاکھ لاکھ شکر و کرم ہے کہ اُس نے ہم سے حق گوئی کی یہ خدمت لے لی۔ آپ سب کچھ کتاب میں پڑھ آئے ہیں۔ لیجیے بس اب آخر میں جمعیۃ علماء ہند کے بارے میں ماہنامہ ندیم کے اداریہ ملاحظہ فرمائیے اور پھر مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو ان اداریوں کا جواب دیا تھا وہ بھی پڑھیے۔

۲۰ صفحات کی یہ تحریریں پڑھنے کے بعد یقیناً آپ بھی اِس بات کو تسلیم ضرور کریں گے کہ ہم نے اپنی اِس کتاب میں جو بھی لکھا ہے سچ ہی لکھا ہے۔ اِس بات کا اظہار مکررات کے زُمرے میں بے شک شامل کیا جا سکتا ہے؛ لیکن جب بات بڑے لوگوں اور بڑے اداروں کے جھوٹ کی ہو تو دلائل و براہان پہ توجہ دلانے کے لیے حق گوئی کے احساس کا اظہار بار بار کرنا پڑ ہی جاتا ہے۔ پھر بھی ہم اس تکرار کے لیے معافی کے طلب گار ہیں۔

(ابوعکاشہ رحمٰن)

....

آج کی جمعیۃ علماءِ ہند

روزنامہ ''ندیم'' (بھوپال) کے مدیر جناب محمود الحسینی ایک دردمند اور صاحب نظر انسان ہیں جن کے اداریئے عموماً فکر انگیز ہوتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ ''جمعیۃ العلماءِ ہند'' سے متعلق ان کے حالیہ تین شذرے تجلی میں شائع کر دیے جائیں تا کہ بات دُور تک پہنچے اور اہلِ نظر وقت کے اس اہم موضوع پر اپنے اپنے انداز میں سوچیں ان کی خواہش یہ بھی ہے کہ تجلی کا مدیر بھی اپنا تبصرہ سامنے لائے۔ چنانچہ افادیت عامہ کے پیش نظر خواہش کی تکمیل کی جا رہی ہے۔ (عامر عثمانی)

پہلا اداریہ

ضبط سخن کے باوجود

حال ہی میں جمعیۃ العلماء بھوپال کی تنظیم جدید کے سلسلے میں دو مخصوص نشستیں ہوئیں، اِن مٹنگوں کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں راجدھانی کے مختلف الخیال اہل الرائے اصحاب کو مدعو کیا گیا تھا، ان نشستوں میں کھل کر باتیں کی گئیں ان باتوں کا لب لباب یہ ہے۔

❖ موجودہ حالات میں جمعیۃ ہی ایسی جماعت ہے جو مسلمانوں اور حکومت کے درمیان رابطہ کا کام دے سکتی ہے؛ کیونکہ جنگِ آزادی میں اس نے جو قربانیاں دی ہیں ان کی وجہ سے اس کی تاریخ تابناک ہے۔

❖ جمعیۃ کے اکابرین کے دو دل ہیں، دو دماغ ہیں، اور دو زبانیں ہیں، وہ قول و عمل کے نفاق میں مبتلا ہیں۔

❖ جمعیۃ کی قیادت میں نہ تو مسائل حاضرہ کا تجزیہ کرنے کی اہلیت ہے اور نہ مستقبل کے بارے میں پیش بینی کی صلاحیت اور نہ ان مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی لیاقت جس میں یہ امت گرفتار ہے، اپنی تاریخ پر فخر کرنے کے علاوہ اس جماعت کے پاس کوئی لائحہ عمل نہیں ہے۔

❖ مسلمانوں کے لیے صرف یہی ایک راہِ عمل ہے کہ وہ جمعیۃ کو طاقتور بنائیں؛ لیکن جمعیۃ کو سیاست میں ٹانگ اڑانے سے باز رکھا جائے، اپنے دستور کی رو سے بھی جمعیۃ ایک غیر سیاسی جماعت ہے، اس کا دائرہ

کار مسلمانوں کے تہذیبی و ثقافتی اُمور تک محدود ہونا چاہئے۔

ان نشستوں میں جو باتیں کی گئیں وہ نئی نہیں ہیں۔عام طور پر یہ باتیں کہی جارہی ہیں،جمعیۃ العلماء کے جمود و تعطل اور انتشار کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کے پاس ذرائع و وسائل کی کمی ہے اور اس کا تنظیمی ڈھانچہ کوئی کام نہیں کر رہا ہے،خرابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ دوسری جمہوری جماعتوں کی طرح جمعیۃ کے دروازے بھی نئے آنے والوں کے لیے چوپٹ کھول دیئے گئے ہیں،ظاہر ہے کہ کسی بھی عوامی جماعت میں مختلف الخیال،موقع پرست عناصر کا مجتمع ہونا کوئی انوکھی بات نہیں جمعیۃ بھی اس حادثہ کا شکار ہوئی۔اس کی صفوں میں وہ لوگ شامل ہو گئے جو اُسے اپنے اغراض و مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے؛چنانچہ انھوں نے اپنے اغراض کے لیے اُسے استعمال بھی کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کا اس پر سے رہا سہا اعتماد بھی جاتا رہا۔

جب تک مولانا حفظ الرحمٰنؒ بقید حیات رہے۔اپنی شخصیت کے سہارے جمعیۃ کی کشتی کو حوادث کے تھپیڑوں سے بچاتے رہے،ان کے سیاسی افکار سے اختلاف کے باوجود،ہر مکتب خیال کے مسلمانوں کو ان کی قائدانہ صلاحیتوں،خلوص،اور جرأت مندی پر پورا بھروسہ تھا۔مولانا کے بعد جمعیۃ انتشار کا شکار ہوگئی اور اس کے کارکن ایک صدر کا انتخاب نہیں کر سکے اور دو صدر منتخب کر کے گروپ بندی کی سیاست کا ایسا مظاہرہ کیا گیا کہ شاید ہی کوئی جماعت اس سے دو چار ہوئی ہو!

میرٹھ کے اجلاس میں جن لوگوں کو شرکت کا موقع ملا ہے اور جنھوں نے اس وقت کی فضاء کو دیکھا ہے وہ دل مسوس کر رہ گئے تھے کہ عالموں کی جماعت میں گروپ بندی کی سیاست یہ گل بھی کھلا سکتی ہے،آج بھی یہ کشمکش اپنے نقطۂ عروج پر ہے اور جمہوری نقطۂ نظر سے یہ بات چاہے قابل اعتراض نہ ہو؛لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے تو یہ بات سخت گراں گزرتی ہے کہ علماء حضرات قیادت کی سطح پر جوڑ توڑ کریں جو سیاسی جماعتوں کا طرۂ امتیاز ہے،اسلام کے نزدیک تو اس شخصیت کو کسی قیمت پر منتخب نہیں کرنا چاہئے،جو اپنے آپ کو کسی منصب کے لیے پیش کرے،افسوس یہ ہے کہ علماء کی جماعت میں کتاب و سنت کے پیش کردہ طریقۂ کار کے بجائے جمہوری طریقۂ کار کو اس ''شان'' کے ساتھ اپنایا جارہا ہے کہ عصر حاضر کے جمہوریت کے ''چمپین'' بھی حیران و ششدر ہیں،آزادی کے بعد ۱۷ سالوں کے تجربات کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مسلمانوں کی کوئی جماعت تنہا قیادت کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتی،کہیں اعلیٰ درجہ کی فکر ہے تو مسلمانوں کے روزمرہ کے مسائل کا حل نہیں ہے،کہیں اُس حل کی طرف توجہ دی گئی ہے تو نصب العین غائب ہے!کہیں پارلیمنٹ اور قانون ساز مجلسوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کا سوال ہے تو اِس بات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ شمال اور جنوب کے حالات میں زمین و آسمان کا فرق ہے،شمال میں سیاست کے قافلہ کو ان خطوط پر چلانا ممکن نہیں ہے۔خلاصۂ کلام یہ ہے کہ چلنے والوں کے لیے کوئی راہ بند نہیں ہے اور جو

چلنا ہی نہیں چاہتے ان کے لیے سیکڑوں راہوں کا ہونا بھی فضول ہے، مسلم قیادت کی ایک کمزوری یہ ہے کہ اس نے کبھی بھی مسلمانوں کے جذبات اور ان کی توانائیوں سے بھرپور فائدہ حاصل کرنے کا کوئی پروگرام نہیں بنایا یہ ایک تسلیم شدہ بات ہے کہ جن صلاحیتوں سے کام نہیں لیا جاتا، وہ مفلوج ہو جاتی ہیں۔ مسلم عوام آزادی کے بعد سے اب تک جن نامساعد حالات سے دوچار ہیں، اور ان حالات نے ان میں جو جذبات پرورش کرائے ہیں، ان سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ ایسا منصوبہ بھی بنایا جاسکتا تھا کہ مسائل میں سے کچھ کلیدی مسئلے منتخب کر کے ان کی بنیاد پر آئینی حدود میں رہ کر مؤثر اجتماعی احتجاج کیا جاتا۔ اس قسم کے احتجاج اور اس کی خاطر عملی سرگرمیاں دکھانے سے جو تصادم ہوتا ہے، وہ قوموں میں زندگی کی نئی روح پھونکتا ہے، گاندھی جی کی مثال زیادہ پرانی نہیں ہے، انھوں نے ستیہ گرہ کے ہتھیار کے ذریعہ ہندوستانی قوم کے دل سے انگریز سامراج کی قہرمانیت کا خوف نکال دیا تھا؛ لیکن ان خطوط پر وہ قیادت کس طرح چل سکتی ہے جو ذہنی مرعوبیت اور احساس کمتری کا شکار ہو۔ جس نے دین و دنیا کے علیحدہ ہونے کی غیر اسلامی فکر شعوری یا غیر شعوری طور پر قبول کرلی ہو۔ جو ایک طرف مسلمانوں کے مسائل کا رونا بھی روتی ہو، اور دوسری طرف اسی جماعت کے ہاتھ بھی مضبوط کرتی ہو جس کی ''قہرمانیوں'' سے یہ مسائل پیدا ہوئے ہیں، انگریزوں سے ٹکر لینے کے لیے تو ہمارے علماء جیلیں بھر سکتے تھے اور ہر قسم کی تکلیفیں برداشت کر سکتے تھے؛ لیکن موجودہ حالات میں جبکہ امت کے اس حصہ کو بھی نشانہ بنایا جارہا ہے، جس کو نشانہ بنانے کی جرأت انگریز نے بھی نہیں کی تو علماء کا جیلوں کا بھرنا تو بہت بڑی بات ہے، جرأت مندانہ احتجاج بھی نہیں کر سکتے۔ جمعیۃ کی تنظیم کو مؤثر بنانے کے لیے کتنے ہی اخلاص سے کوشش کی جائے؛ لیکن خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوگا؛ کیونکہ بے یقینی اور بے مقصدی کا زہر اس کے جسم میں خون کی طرح گردش کر رہا ہے، موجودہ حالات میں تو ہمارے نزدیک مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ جمعیت کو اس کے شاندار کارناموں کے ساتھ تاریخ کے صفحات پر محفوظ کر دیا جائے اور ملک وملت کے نئے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر کوئی لائحۂ عمل مرتب کیا جائے۔ یہ مشورہ ہم نے اس لیے دیا ہے کہ جمعیت میں زندگی کی روح پھونکنا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ گاندھی جی نے بھی آزادی کے بعد کانگریس کو یہی دردمندانہ مشورہ دیا تھا؛ لیکن ان کے مشورہ کو تسلیم نہیں کیا گیا اور کانگریس کا جو حشر ہو رہا ہے ظاہر ہے وہ تو یوں کہیے کہ نہرو جی کی طلسمی قیادت نے کانگریس کو بہت سہارا دیا ورنہ کانگریس کا جہاز کبھی کا غرق ہو چکا تھا، ہم جانتے ہیں کہ جذباتی تعلق انسان کی فطری کمزوری ہے اور یہی کمزوری اربابِ جمعیۃ کو جرأت مندانہ فیصلہ کرنے سے روک رہی ہے؛ لیکن بصیرت اور بصارت دونوں کا تقاضا یہی ہے کہ حقیقت پسندی سے کام لیا جائے اور قافلہ کو اس راستہ پر نہ چلایا جائے جس پر وہ ۷۰ سال سے چل رہا ہے؛ لیکن راہ کے پیچ وخم کا یہ حال ہے کہ منزل قریب ہونے کے بجائے اور دُور ہوتی جارہی ہے۔

دوسرا اداریہ

ضبطِ سخن کر نہ سکا

ہم نے اپنی ۳۱/مارچ کی اشاعت میں جمعیۃ العلماء ہند کے موجودہ انتشار کا جائزہ لیتے ہوئے یہ مشورہ دیا تھا کہ ہندوستان میں ملّتِ اسلامیہ کی سب سے بڑی خیر خواہی یہی ہے کہ اس تنظیم کو باقاعدہ طور پر ختم کرنے کا اعلان کر دیا جائے ہم نے یہ مشورہ پوری دردمندی اور اخلاصِ نیت کے ساتھ دیا تھا؛ کیونکہ ہمارے نزدیک کوئی تنظیم یا جماعت نہیں؛ بلکہ ملت کا مفاد اور اس کی اجتماعی فلاح نصب العین اور مقصود کی حیثیت رکھتی ہے، ہماری ان معروضات پر دونوں طرح کے ردِ عمل سامنے آئے ہیں، کچھ لوگوں نے اسے اپنے دل کی آواز سمجھا ہے اور اس کی تائید کی ہے، کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے ہمارے تجزیے سے اتفاق کیا ہے؛ لیکن ہمارے اخذ کردہ نتیجہ سے مطمئن نہیں ہیں۔ ہم نے ہمیشہ تعریف وتوصیف اور تنقید و مذمت سے بے پرواہ ہو کر ان خیالات کی ترجمانی کی ہے جنھیں ہم ملّت کے مفاد اور اس کی فلاح کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، ہم نے کبھی بھی گروہی تعصب کی عینک چڑھا کر مسائل کا جائزہ لیا ہے اور نہ کبھی گروہی مفادات کو حق و باطل کی کسوٹی قرار دیا ہے، جمعیۃ کے سلسلہ میں ہمارا مشورہ حالات کے حقیقت پسندانہ جائزہ کا منطقی نتیجہ ہے جو لوگ ہماری اس رائے سے مخلصانہ اختلاف کرتے ہیں ان کے لیے اپنے نقطۂ نظر کی ہم مزید وضاحت کر رہے ہیں۔

جمعیۃ علماء ہند کی تائید اور حمایت میں جو سب سے پہلی اور پُر زور دلیل پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس جماعت کا ایک شاندار ماضی ہے اس کے رہنماؤں نے کانگریس کے رہنماؤں کے شانہ بشانہ حصول آزادی کی جدو جہد میں بے مثال قربانیاں دی ہیں اور آج یہ رہنما کسی احساسِ کمتری کا شکار ہوئے بغیر حکومت کے ذمہ داروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتے ہیں اور انھیں مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لیے آمادہ کر سکتے ہیں بلا شبہ جمعیۃ کا ماضی بہت شاندار ہے اور اس کے رہنماؤں نے بڑی قربانیاں دی ہیں؛ لیکن گزشتہ سترہ سال کی تاریخ شاہد ہے کہ وہ اس سب کے باوجود مسلمانانِ ہند کا ایک بھی مسئلہ حل کرانے میں کامیاب نہیں ہوئی ہے، زبان کا مسئلہ، جان و مال کے تحفظ کا مسئلہ، نظامِ تعلیم کو مشرکانہ عقائد سے پاک کرانے کا مسئلہ، اقتصادی پسماندگی میں روز افزوں اضافہ کا مسئلہ غرض یہ کہ مسائل کا ایک جنگل ہے۔ جس میں ملتِ اسلامیہ سرگرداں و پریشاں ہے اور اسے کوئی راہ نظر نہیں آتی کہ کدھر جائے، اگر ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ اربابِ جمعیۃ اپنے شاندار ماضی کی وجہ سے کچھ مسائل حل کرانے میں کامیاب ہوئے ہیں تو کیا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ یہ صورت حال ہمیشہ باقی

رہے گی؟ بلاشبہ جمعیۃ کے بعض رہنماؤں نے ۱۹۴۷ء کے ہنگامی حالات میں مسلمانوں کی بڑی خدمت کی ہے اور حکومت کے ذمہ داروں سے اپنے روابط کا ملّت کو فائدہ پہنچایا ہے؛ لیکن آج نہ جمعیۃ کو وہ رہنما حاصل ہیں اور نہ حکومت کے ایوانوں میں وہ ذمہ دار موجود ہیں "شاندار ماضی" اور شخصی تعلقات کی بنیاد پر کوئی پالیسی وضع کرنا نہ تو حقیقت پسندی کی علامت ہے اور نہ دُور اندیشی کی۔ شخصیتیں بہر حال فانی ہیں اور ان کی ذات سے حاصل ہونے والے مفادات بھی عارضی اور ناپائدار۔ آج نہ تو کوئی شیخ الاسلام ہے اور نہ کوئی مجاہدِ ملّت جو اقتدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرسکے یہ تو "صاجزادوں" اور "جگر گوشوں" کا دَور ہے جن کی پیٹھ محبت سے تھپتھپائی تو جاسکتی ہے؛ لیکن جن کی بات کو ایک لاڈلے بچے کی ہٹ سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔

یہ سوچنا کہ جمعیۃ کے "شاندار ماضی" کی وجہ سے اس پر نہ تو فرقہ پرستی کا الزام عائد کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کی کسی اجتماعی جدو جہد کو ملک دشمن قرار دیا جاسکتا۔ خام خیالی اور حالات سے بے خبری کا نتیجہ ہے، اگر آج اس پر فرقہ پرستی کا الزام اس شدت اور زور سے نہیں لگایا جارہا ہے جتنا کہ دوسری جماعتوں پر تو اس کے ہرگز یہ معنیٰ نہیں کہ اس کے ماضی کا احترام کیا جارہا ہے اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ آج جمعیۃ جاندار اور متحرک جماعت نہیں رہی ہے اور وہ مسلمانوں کی خدمت اور ان کی ترجمانی کا حق ادا نہیں کر رہی ہے ایک تن مردہ اور ایک بے روح ڈھانچے کو لعنت وملامت کا نشانہ بنانے سے کیا حاصل؟ یہ شرف تو انھیں اداروں کو حاصل ہوسکتا ہے جو میدانِ کارزار میں اترے ہوئے ہیں اور مخالف قوتوں سے پنجہ آزمائی کر رہے ہیں کون نہیں جانتا کہ خود جمعیۃ نے جب کبھی ماضی میں کروٹ لی ہے اسے بھی انہیں گالیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ عوامی یادداشت اتنی کمزور نہیں کہ اس نے یہ فراموش کردیا ہو کہ مسلم کنونشن ۱۹۲۰ء یوپی کے فسادات اور حالیہ جمہوری کنونشن کے بعد جمعیۃ کے بارے میں کیوں کچھ نہیں کہا گیا اور چودھری چرن سنگھ اور مولانا حفظ الرحمٰن کے درمیان کس قسم کے بیانات کا تبادلہ ہوا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے شاندار ماضی اور قومی خدمات سے کون انکار کرسکتا ہے؛ لیکن اسے گزشتہ سترہ سال میں جن حالات کا سامنا کرنا پڑا ان سے کون باخبر نہیں؟

واقعہ یہ ہے کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کی کوئی بھی متحرک اور فعّال جماعت فرقہ پرستی اور قوم دشمنی کے الزامات سے بچ نہیں سکتی۔ مسلمانوں کی شیرازہ بندی اور خدمت اور ان کے مفادات کے تحفظ کے لیے جو بھی کوشش کرے گا اسے ان الزامات کا بہر حال سامنا کرنا پڑے گا۔ اکثریتی فرقہ پرستی کا نشانہ کوئی خاص جماعت یا تحریک نہیں؛ بلکہ مسلمانوں کا ملی وجود اور ان کی اجتماعی شیرازہ بندی ہے، اگر ایک بار یہ شیرازہ بندی ہوجائے اور مسلمان بحیثیت مجموعی فردِ واحد کی طرح اُٹھ کھڑے ہوں تو یہ سارے الزامات ہوا میں تحلیل ہوکر رہ جائیں گے اور وہی قوتیں ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں گی جو آج ان کی سب سے بڑی حریف نظر آرہی ہیں، مقابل قوتیں

اپنے حریفوں کے ماضی کا احترام نہیں کرتیں وہ صرف اتحاد اور یک جہتی ہی کی طاقت کو تسلیم کرتی ہیں۔

بعض مخلص حضرات کی جانب سے جمعیۃ العلماء کی تائید میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی، تہذیبی اور معاشی مسائل کے حل کے لیے بہر حال ایک جماعت کی ضرورت ہے اور نئی جماعت بنانے سے بہتر یہی ہے کہ اسی ڈھانچہ کو متحرک بنایا جائے اور اس سے وہی کام لیا جائے جو ہم ایک نئی جماعت سے لینا چاہتے ہیں۔

یہ خیال دراصل حالات کو خوش فہمی کی نظر سے دیکھنے کا نتیجہ ہے، حالانکہ ضرورت اِس بات کی ہے کہ حقیقت کو حقیقت تسلیم کیا جائے چاہے وہ کتنی ہی تلخ ہو۔

یہ بات کسی دلیل کے بغیر ظاہر ہے کہ جمعیۃ العلماء دو متضاد چیزوں کو لے کر ساتھ چل رہی ہے، چل نہیں رہی ہے؛ بلکہ بیٹھی ہے، ایک طرف وہ ماضی سے اپنا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے قوم پرستی اور سیکولرزم کی نہایت سرگرم وکالت کرتی ہے جس سے ہندوستان میں رہنے والے کسی فرقہ کے مفادات کی علیٰحدہ سے حفاظت وغیرہ کا کوئی جوڑ نہیں۔ سیکولرزم اور قوم پرستی کا تقاضا ہے کہ اس ملک میں رہنے والے تمام گروہوں کو ایک قوم مان کر پورے ملک اور پوری قوم کے مفادات کو پیش نظر رکھ کر سوچا اور کام کیا جائے، دوسری طرف اس نے مسلمانوں کے ملی مسائل کو اپنے سامنے رکھا ہے، یہی چیز ایک خالص قوم پرست کی نگاہ میں فرقہ پرستی ہے جو اکابر جمعیۃ کے نزدیک کفر سے کم نہیں۔ مسلم لیگ نے آخر اس سے زیادہ قصور کیا کیا تھا کہ اس نے صرف ایک ملّت کے مفادات کو سامنے رکھا تھا۔ آزادی سے پہلے اس نے ملّت کے سیاسی مفادات کی وکالت کی اور اب اس ملّت کے ملّی اور تہذیبی مفادات کی وکالت کر رہی ہے، دونوں میں فرق کیا رہا اور اگر یہاں کے غیر مسلم جمعیۃ پر اعتراض کریں کہ یہ لوگ قوم پرست ہوتے ہوئے بھی وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو مسلم لیگ فرقہ پرست ہوتے ہوئے کرتی ہے تو ان کے اس اعتراض کا کیا جواب ہے دراصل یہ وہ تضاد ہے جس نے جمعیۃ العلماء اور اس کے اکابر کو ایک ایسی اُلجھن میں مبتلا کر دیا ہے، جس سے نکلنے کے لیے طاقتور ایمان گہرے تدبر اور عصری تقاضوں سے واقفیت کی ضرورت ہے، قدوری اور شرح وقایہ کو حفظ کر لینے اور غسل و وضو اور نکاح وطلاق کے مسائل پر عبور حاصل کر لینے سے اس کھلے ہوئے تضاد کا علاج نہیں ہو سکتا۔ اگر جمعیۃ العلماء کے قابل فخر اکابر اس تضاد کو محسوس ہی نہیں کرتے تو بیچارے قابل رحم ہیں اور اگر اس تضاد کو محسوس کرتے ہیں؛ لیکن اپنے اسلاف کے شاندار ماضی سے اس خلاء کو پُر کرنا چاہتے ہیں تو یہ نرم سے نرم الفاظ میں انتہائی بھولا پن ہے، باغباں بھی خوش رہے اور صیاد بھی ناراض نہ ہو۔ یہ پالیسی کسی کے لیے ذاتی طور پر نفع بخش ہو تو ہو؛ لیکن اس پالیسی سے قوموں اور ملّتوں کے مسائل حل نہیں ہوا کرتے۔ اگر یہ طرزِ عمل نیک نیتی کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے، تو یہ ایسی سادہ لوحی ہے جس پر خود غیر مسلموں کو تعجب ہوتا ہے۔ آپ کسی واقف حال غیر مسلم سے گفتگو کیجیے وہ آپ کو بتائے گا کہ مسلم لیگ کی پالیسی چاہے ہم کو پسند نہ آئے؛ لیکن وہ سمجھ میں تو آتی ہے، سیدھی اور

صاف بات ہے کہ وہ اپنی ملّت کے مفادات کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں؛ لیکن یہ جمعیۃ العلماء والے تو ایک معمّہ ہیں، ایک طرف وہ متحدہ قومیت بنانا چاہتے ہیں دوسری طرف ایک فرقہ کے مفادات سے اُنھوں نے خود کو وابستہ کرلیا ہے۔ قوم پرست غیر مسلموں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ملّی مفادات کے محافظ ہیں جمعیۃ کی یہی دورُخی پالیسی ہے جو اسے صحیح معنوں میں نہ تو قومی جماعت بننے دیتی ہے اور نہ ملّی۔

آزادی کے بعد سے یہ جماعت جن راہوں پر چل رہی ہے اور اس کی بقاء سے صاحبانِ اقتدار کو جس نوعیت کی دلچسپی ہے وہ کسی بھی صاحب نظر مسلمان سے پوشیدہ نہیں ہے، اس دلچسپی کی موجدگی میں یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ اسے فکر وعمل کے اس تضاد سے نجات دلائی جاسکے اور اس میں کوئی صحت مند قیادت اُبھر سکے اور وہ پٹے ہوئے راستوں سے ہٹ کر کوئی نئی راہ تلاش کر سکے۔

ہمارے اس تجزیہ کی روشنی میں یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ جمعیۃ العلماء ہند فکری اعتبار سے دیوالیہ، اخلاقی نقطۂ نظر سے کھوکھلی اور تنظیمی پہلو سے تفریق اور انتشار کا شکار ہو چکی ہے۔ اب اس سے کسی بہتر نتیجہ کی توقع رکھنا محض ابلہ فریبی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اکابرین جمعیۃ نے مسلمانوں میں داخلی اتحاد اور ملّی یک جہتی کی نئی روح پھونکنے کے کتنے ہی نفسیاتی مواقع ضائع کر دیئے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ امتِ مسلمہ اپنے ہی وطن میں اجنبی بن کر رہ گئی ہے وہ کہنے کو تو ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہے، شریک سلطنت کہی جاتی ہے؛ لیکن عملاً صورتِ حال اس کے برعکس ہے، سیکولرازم اور نیشنل ازم کی ''فتوحات'' کا سلسلہ ختم ہی ہونے میں نہیں آتا اور جمعیۃ کے قائدین ہیں کہ اُلٹا سیکولرازم کو حامی دین سمجھ رہے ہیں ان کی یہی غلط اندیشی ہر بار اُنھیں اربابِ اقتدار کے ہاتھوں میں کھیلنے کے لیے مجبور کر دیتی ہے اس کی واضح مثال حالیہ جمہوری کنونشن کی ہے جس کا ابتدائی تصور کچھ اور تھا؛ لیکن ''نامعلوم ہاتھوں'' کی مداخلت کے بعد کچھ اور رنگ اختیار کر گیا۔

جمعیۃ العلماء کی تنظیم موجودہ حالات میں مفید ہونے کے بجائے اُلٹی مضر ثابت ہو رہی ہے؛ کیونکہ مسلم عوام اس سے اپنے مسائل کے حل کے لیے توقعات وابستہ کرتے ہیں؛ لیکن یہ توقعات پوری نہیں ہوتیں اور وہ دیکھتے ہیں کہ اربابِ جمعیۃ ان کے مسائل کی گتھیاں سلجھانے کے بجائے قیادت کی سطح پر عہدوں کی چھینا جھپٹی میں قلب کی پوری طمانیت کے ساتھ مصروفِ عمل ہیں۔ جس طرح ڈوبتے ہوئے جہاز میں سوار رہنا دیدہ و دانستہ اپنے آپ کو ہلاکت کے خطرے میں مبتلا کرنا ہے؟ یا شکستہ مکان میں رہنے کا اصرار کرنا موت کو دعوت دینا ہے۔ اسی طرح بار بار کی آزمائی ہوئی قیادت کے پیچھے پڑے رہنا ایسا اجتماعی گناہ ہے جسے قدرت کبھی معاف نہیں کرتی۔ مسجد قرطبہ اور قصر الحمرا کے دیوار و در اس حقیقت کو زبانِ حال سے بیان کر رہے ہیں۔

تیسرا اداریہ

باعثِ شرم؟

ان سطور کا عنوان ہماری ایجاد نہیں؛ بلکہ معاصر الجمعیۃ کے اس مضمون سے ماخوذ ہے جو معاصر نے ندیم کی پچھلی دردمندانہ گزارشات کے جواب میں سپردِ قلم فرمایا ہے، اس مضمون پر جو الجمعیۃ کی ۹/۱۰/۱۱ اپریل ۱۹۶۵ء کی اشاعتوں میں اداریہ کی جگہ شائع ہوا ہے، علماء اور ان کی جمعیۃ کے شایانِ شان "مہذب" اور "شائستہ" الفاظ میں جس طرح ندیم پر غصہ اُتارا گیا ہے اس کا نمونہ یہ ہے کہ دلائل کا جواب دلائل کے بجائے ندیم کی تنقید کو باعثِ شرم کہہ کر پیچھا چھڑا لیا گیا۔ جمعیۃ کی شان میں ہماری گستاخی چاہے معاصر کی نظر میں باعثِ شرم ہو؛ لیکن علماء کی زبان مبارک سے ایسے خطابات کا ملنا ہمارے لیے "باعثِ فخر" ہے۔

اس عزت افزائی پر ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور معاصر کا شکریہ۔ یہ عرض کرنا تو گستاخی ہوگی کہ عام طور پر آدمی دلائل کے افلاس کو ہی گرم گفتاریوں سے پورا کیا کرتا ہے، تو حسنِ ظن قائم رکھتے ہوئے یہی سمجھیں گے کہ معاصر نے شاید یہی سمجھا کہ ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس میں مخالفانہ جذبہ کام کر رہا ہے، اسی لیے معاصر کو غصہ آگیا اور بحالاتِ موجودہ ایسا سمجھنے میں معذور بھی ہے؛ کیونکہ جمعیۃ العلماء کے قیام کے کچھ ہی عرصہ بعد سے ایسے حالات ہو گئے اور ہمارے اکابر جمعیۃ کو ایسے مرحلوں سے گزرنا اور ایسے مشاغل میں مشغول ہو جانا پڑا جن میں اخلاص و دردِسری نہیں؛ بلکہ کچھ دوسرے حربے کارآمد ہوتے ہیں۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ جن مشاغل میں مصروف رہے گا ویسا اس کا مزاج بن جائے گا اور ہمارے اکابر جمعیۃ علماء ہونے کے باوجود انسان ہیں ان وجوہ سے اخلاص و دردمندی اب ان قابلِ احترام حضرات کے ذہنوں کی گرفت میں نہیں آتی۔ کوئی ان کا نیازمند چاہے کتنے ہی اخلاص کے ساتھ ان کی خدمت میں کچھ عرض کرے؛ لیکن اس کی معروضات میں اگر مدحیہ قصائد کی شان نہیں ہے، تو بس ان کو غصہ آجاتا ہے اور وہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ گستاخ جو ہمارے فرمودات پر آمنا نہیں کہتا یقیناً وہ بے ایمان ہے بدباطن ہے اور "ملّت کے لیے باعثِ شرم ہے" اور اس نفسیاتی کیفیت میں جب وہ جواب دیتے ہیں تو قدرتی طور پر ان کا ہاتھ اِنھیں ہتھیاروں کی جانب بڑھتا ہے، جن کو چلانے کے یہ حضرات اتنے عرصہ میں عادی ہو گئے ہیں ہم کو چونکہ "علماء" ہونے کا شرف حاصل نہیں ہے اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے؛ اس لیے ہم ان کے غصہ کا جواب دینے کی تو اہلیت نہیں رکھتے اور اپنی "خیریت" اسی میں سمجھتے ہیں کہ ان علماء کی خدمت میں جھک کر سلام عرض کریں اور خاموش ہو جائیں، لیکن چوکہ اب بھی یہ علماء کی جمعیۃ پوری ملّت کے سر پر تاج بن کر جگمگا رہی ہے یا جگمگانا چاہتی

ہے، اس لیے امت کا مفاد تقاضا کرتا ہے کہ ایک بار اور ہم اپنا نقطۂ نظر واضح کر دیں۔

البتہ اپنی ایک کوتاہی کا اعتراف نہ کرنا ظلم ہوگا، ہم نے اپنے زیر بحث مضمون میں جگہ جگہ علماء اور جمعیۃ العلماء کے شاندار کارناموں کا ذکر ہی نہیں اعتراف بھی کیا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس ملک میں امتِ مسلمہ پر جو بہار آئی ہوئی ہے اس کے لانے میں ان اکابر جمعیۃ کا حصہ کسی دوسرے سے کم نہیں ہے بلا استثناء ہر محاذ پر شکست کھانا اور اپنی شکست کو فتح قرار دینا اگر کارنامہ ہے تو کوئی شک نہیں کہ جمعیۃ علماء کی تاریخ ان کارناموں سے بھری ہوئی ہے، اسی طرح ہر اُبھرنے والی طاقت کے ہاتھ میں استعمال ہو جانا اور ہوتے رہنا اگر سیاست ہے تو اس سیاست سے بھی ہمارے علماء جمعیۃ کا مقدس دامن بھرا ہوا ہے، ہم کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں اور اپنے خدا سے اس کوتاہی پر استغفار کرتے ہیں کہ ہم علماء کے احترام کے جذبہ کا شکار ہو کر جس سے ہمارا دل اب بھی بھرا ہوا ہے وہ باتیں کہہ گئے ہیں جن کو تاریخ کی روشن حقیقتیں جھٹلا رہی ہیں، ہم سے یہ غلطی علماء کے احترام کے جذبہ سے ہوگئی ورنہ اگر کسی غلط جذبہ سے حقیقت فراموشی اور حق پوشی کا یہ جرم ہم سے سرزد ہوا ہوتا تو خود ہماری نظر میں باعثِ شرم ہوتا۔

ہم نے علماء کا احترام پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے نہایت ادب سے عرض کیا تھا کہ جمعیۃ العلماء جن عصری تقاضوں کا جواب دینے کے لیے وجود میں آئی تھی وہ تقاضے اب نہیں رہے، اس نے بڑی خدمات انجام دی ہیں؛ لیکن اب زمانہ بالکل منقلب ہوگیا ہے اور کچھ دوسرے عصری تقاضے اُبھر کر آئے ہیں، جو پوری ملّت سے جواب مانگ رہے ہیں۔ ہمارے علماء فقہ کی جزئیات پر یقیناً عبور رکھتے ہیں؛ لیکن سیاست ایک دوسرا میدان ہے۔ ضروری نہیں کہ ایک اچھا طبیب اچھا انجینئر بھی ہو۔ یہ حضرات اس بات سے بالکل ناواقف ہیں کہ عصری تقاضے بھی کوئی چیز ہوتے ہیں، جن کو دینی و ملّی تقاضوں کے قلب میں ڈھالنا دین و ملّت کی بھی سب سے بڑی ضرورت ہے، دوسری بات جو ہم نے کہی تھی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جمعیۃ العلماء دو مخالف سمتوں میں جانے والی کشتیوں پر سوار رہنا چاہتی ہے ایک طرف وطن پرستی اور متحدہ قومیت کے تقاضے ہیں دوسری طرف مسلم ملت کی ضروریات شب تار غلامی کا جگر چاک ہونے سے پہلے تو انگریز دشمنی نے ان دونوں چیزوں کا تضاد زیادہ نمایاں نہیں ہونے دیا تھا؛ لیکن آزادی ملنے کے بعد جوں جوں ملک آگے بڑھ رہا ہے ان دونوں تضادوں کا تضاد نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں سوال شخصیتوں اور ان کی عظمتوں کا نہیں؛ بلکہ واقعات اور حقائق کا ہے، اگر جنید و شبلی جیسے بزرگ بھی پیدا ہو جائیں تو انھیں بھی دو مخالف سمتوں میں جانے والی ان کشتیوں میں سے کوئی ایک ہی منتخب کرنا پڑے گی۔ ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ مسلم لیگ کا قصور اس کے سوا کیا تھا کہ اس نے بس مسلم ملّت کے مفادات کو سامنے رکھ کر اس کی واحد نمائندگی کا نعرہ لگایا تھا اب اگر جمعیۃ العلماء بھی مسلمانوں کی واحد نمائندگی کا دعویٰ کرے جیسا کہ وہ کر رہی ہے، تو آخر غیر مسلم اس دعوے پر کان کھڑے کیوں نہ کریں گے۔

ہماری اِس صاف اور سیدھی بات کے جواب میں معاصر الجمعیۃ نے بہت سے کاموں کا ذکر کر کے ان دونوں مخالف تقاضوں میں مطابقت دینے کی کوشش کی ہے "تطبیق مختلفات" کی باقاعدہ تعلیم تو دارالعلوموں میں ہی ہوتی ہے، اس لیے یہ علماء حضرات کا ہی حصہ ہے ہمارے جیسے عالم تو اس فن کو سمجھ بھی نہیں سکتے، اس لیے اس سلسلہ میں اپنے طور پر کچھ عرض کرنے کے بجائے ڈاکٹر سید عابد حسین کی تازہ کتاب "ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں" کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں اس سے صاف معلوم ہو جائے گا کہ حقیقت وہ ہے جو ہم پیش کر رہے ہیں یا وہ ہے جو علماء کے اس اخبار نے سمجھی ہے۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب شروع ہی سے کٹر قوم پرست اور گاندھی جی کے خاص چیلے ہیں اس لیے ان کی بات کو گالیوں میں نہیں اُڑایا جا سکتا۔

ڈاکٹر صاحب اپنی مذکورہ کتاب کے صفحہ ۲۳۰ پر لکھتے ہیں "دوسری طرف مذہبی طبقے کے لوگ انگریزی حکومت کو مسلمانوں کی مذہبی معاشی اور تہذیبی زندگی کے لیے مضر بلکہ مہلک جانتے تھے اور اس سے نفرت کرتے تھے۔ مغربی تہذیب سے دراصل انھیں زیادہ تر اس وجہ سے نفرت تھی کہ وہ اسے انگریزوں کے سیاسی اقتدار کے آلۂ کار کی حیثیت سے دیکھتے تھے یہی منفی انداز نظر قوم پروری کی تحریک میں نظر آتا ہے جس کے یہ علماء دین علمبردار تھے۔ انھوں نے بڑے جوش وخروش سے قومی اتحاد اور آزادی کی جدوجہد میں نیشنل کانگریس کا ساتھ دیا؛ لیکن انھیں یہ احساس نہیں تھا کہ قوم پروری محض اس جذبہ کا نام نہیں کہ ملک کو بدیسی قوم کی حکومت سے آزاد کرلیا جائے؛ بلکہ یہ ایک جزو ہے سیکولر جمہوریت کے سیاسی فلسفہ کا اور خود سیاسی فلسفہ جزو ہے جدید لبرل نظریہ زندگی کا اس لیے جب تک اس نظریۂ زندگی کو اختیار نہ کیا جائے۔ قوم پروری کوئی مضبوط اور مستقل بنیاد نہیں رکھتی جہاں تک سیکولر قوم پروری کا تعلق ہے ابتداء میں اس نے خود کو بڑی حد تک جدید لبرل نقطہ ہائے نظر سے ہم آہنگ کرلیا تھا۔ لیکن جب آگے چل کر خلافتِ تحریک قومی تحریک کی حلیف بن کر اُبھری تو عام طور پر مسلمانوں میں جن میں کانگریسی مسلمان بھی شامل تھے ایک عجیب قسم کی سیاسی مذہبیت پیدا ہوگئی اور بڑی دلچسپ تاویل سے کام لے کر کانگریس اور خلافت کمیٹیوں کی سیاسی پالیسیوں کے لیے مذہبی سند تلاش کیا کرتے تھے اور یہ نہیں سوچتے تھے کہ اس طرح ان کی سیکولر قوم پروری اور علماء دین کی مذہبی قوم پروری میں کوئی حد فاصل نہیں رہتی۔

یہ جو بے ربطی ان کے رجحان فکر میں تھی اس وقت تک چھپی رہی جب تک ان کی توجہ آزادی کی کشمکش پر مرکوز تھی اور کسی کے ذہن میں یہ بات صاف نہ تھی کہ آزادی کے بعد ملک کا سیاسی اور سماجی نظام کیا ہوگا جب آئین ساز اسمبلی نے آزاد ہندوستان کا آئین بنایا تو عام طور پر اس کے ممبران نے جن میں قوم پرور مسلمان بھی تھے، اسے محض آزادی کے چارٹر کی حیثیت سے دیکھا اور اس کی گرمجوشی سے تائید کی۔ کم ایسے تھے جنھوں نے اس بات کو پوری طرح سمجھا ہو کہ آئین جدید مغربی تہذیب کے بنیادی سیاسی وسماجی تصورات پر مبنی ہے اور ایک نئے دور کا نقیب ہے جس میں قومی زندگی

کی تنظیم سیکولر جمہوریت کے اُصول کے مطابق ہوگی۔ اب جبکہ یہ اہم حقیقت رفتہ رفتہ ظاہر ہو رہی ہے مسلمانوں کا ہر مکتب فکراُلجھن میں گرفتار ہے (اپنے مذہبی مزاج کی وجہ سے) یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ متضاد نقطہ ہائے نظر میں مصالحت کیونکر ہوسکتی ہے اس اُلجھن نے جمود اور بے عملی کی موجودہ کیفیت پیدا کردی ہے۔ (ص ر ۲۳۲)

''ہمارے قوم پرور مسلمانوں کو کئی مصلحتوں سے مسلمان عوام کی تالیفِ قلوب کا خیال رکھنا پڑتا ہے جن میں سب سے اہم مصلحت یہ ہے کہ مسلمانوں سے کانگریس کے لیے ووٹ حاصل کرنے کی ذمہ داری زیادہ تر ان ہی پر ہے، گو ہمارے علماء مجموعی طور پر سیکولر قومی ریاست کی پُرخلوص تائید کرتے ہیں؛ مگر اتنی گرم جوشی کے ساتھ نہیں جو عام مسلمانوں کے دلوں کو گرما سکے۔ غرض مذہبی اصلاحی اور سیاسی آزادی کی وہ مخلوط تحریک جو ہندوستان میں تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے شروع ہوئی تھی، اب اس مرحلہ پر پہنچ گئی ہے، جہاں اسے آگے بڑھنے کا راستہ نظر نہیں آرہا ہے؛ مگر وہ بجائے اس کے کہ صورتِ حال کا جائزہ لے کر نئے سرے سے اپنے مقاصد کا تعین کرے اور ان کے حاصل کرنے کے وسائل سوچے، اپنے آپ کو یہ کہہ کر بہلانا چاہتی ہے کہ جس مرحلہ پر وہ رُک گئی ہے وہی اس کی اصل منزل ہے''۔ (کتاب مذکور صفحہ ۲۱۲)

افسوس کہ زیادہ طویل عبارتیں نقل نہیں کی جاسکتیں۔ لیکن اوپر ڈاکٹر صاحب کی کتاب سے جتنا نقل کیا گیا اس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے علماء حضرات نے جب سے آزادی کی جنگ میں حصہ لیا اس وقت سے وہ سیکولر جمہوریت اور لبرل نظریہ زندگی اور اس کے تضمنات سے خالی الذہن تھے اور آزادیٔ وطن اور مذہبی جذبہ میں سرشار ہو کر انجام کو دیکھے بغیر آزادی کی جنگ میں کود پڑے اسی کا نتیجہ ہے کہ اب ٹھٹھکے کھڑے ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا کریں یہ ٹھیک وہی بات ہے جو ندیم نے نہایت ادب کے ساتھ عرض کی تھی اور جس کے جواب میں علماء کے ترجمان الجمعیۃ کے منہ میں جھاگ آرہے ہیں ہم نے جو یہ عرض کیا تھا اور اب بھی یہی رائے رکھتے ہیں کہ جمعیۃ العلماء کا کام ختم ہوگیا اس لیے اسے مقدس یادگار کے طور پر تاریخ میں محفوظ کردیا جائے۔ اور خدمت کے لیے وہ لوگ آگے بڑھیں جو وقت کی نبض پہچانتے ہیں۔ ہماری یہ بات گاندھی جی کے اس مشورہ سے مختلف نہیں ہے جو انھوں نے آزادی کے بعد کانگریس کو دیا تھا کہ اب کانگریس کا کام ختم ہوگیا ہے اس لیے اسے ختم کردیا جائے؛ لیکن افسوس کہ محترم معاصر نے ہماری اس مخلصانہ گزارش کو مخالف سمجھا۔

ڈاکٹر عابد حسین صاحب کے مذکورہ بالا اقتباس سے ہماری اس رائے کی تائید ہی نہیں ہوتی بلکہ ان ''کارناموں'' کی حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے جو ہماری جمعیۃ العلماء کا ایک ہی سرمایۂ حیات ہے ڈاکٹر صاحب قوم پرور مسلمان ہونے کے ناتے قوم پرور علماء اور ان کی جمعیۃ کے کٹر حامی ہیں، اس لیے کم سے کم ان کی بات کو تو خوب توجہ سے سننا چاہیئے، قرآن نے تو یہ تعلیم دی ہے کہ کسی بات کو اگر تم خود نہیں جانتے ہو تو جاننے والوں سے دریافت کرلو۔ اگر

علماء حضرات جدید لبرل نظریات سے اور قومیت کے جدید تقاضوں سے واقف نہیں ہیں۔ اور یہ نہیں جانتے کہ ان کی ضرب مسلمان اور ان کے ذہن پر کہاں اور کس طرح پڑتی ہے اور دین کے تقاضوں اور جدید قومیت کے تقاضوں میں کیا تضاد ہے تو اپنے ہی ہم خیال ڈاکٹر عابد حسین صاحب کے مشوروں پر کان دھریں اور مسلمانوں کو اپنے تقویٰ اور اپنے کارناموں کے سہارے لادینیت کی دوزخ میں نہ جھونک دیں۔ علماء کا پہلا کام تو مسلمانوں کے دین کو خطرات سے بچانا تھا لیکن اگر شفاخانہ ہی زہر تقسیم کرنے لگیں تو بیچارہ مریض کہاں جائے۔

لیکن اگر ڈاکٹر سید عابد حسین پر بھی علماء اور ان کے ترجمان کو اعتماد نہ ہو تو ہم ان کی نظر مبارک کے سامنے خود ان ہی علماء کا وہ مشہور فتویٰ لائیں گے جو ۱۹۲۱ء میں سیکڑوں علماء کرام کے دستخطوں سے شائع ہوا تھا جس میں انگریزوں کی حکومت سے تعلیمی امداد لینا، کونسلوں میں جانا، اعزازی عہدے خطابات عدالتوں میں مقدمات لے جانا اور پیشۂ وکالت اور ایسی سب چیزوں کو حرام کہا گیا تھا۔ ہم علماء کرام سے دریافت کرتے ہیں کہ اس حلت و حرمت کی علت کیا تھی؟ آیا یہ کہ انگریز انگلستان کا رہنے والا ہو کر ہندوستان پر حکومت کیوں کرتا ہے یا یہ کہ وہ اللہ کے بندوں پر اپنا حکم کیوں چلاتا ہے؟ اگر پہلی بات تھی تو براہِ کرم اس کی وضاحت فرمادیں اور اگر دوسری بات تھی تو براہِ عنایت یہ بتائیں کہ کیا حرمت کی وہ علت اب نہیں رہی؟ کیا باہر کے قیصر و کسریٰ تو از روئے شرح متین گردن زدنی ہوتے ہیں اور گھر کے ابوجہل اور ابولہب کو رہنما مان کر اعلان کرنا چاہئے کہ ہم ان کے بنائے ہوئے راستہ پر چل کر منزلِ مقصود پر پہنچ سکتے ہیں۔ اگر اس فتوے میں حرام ہونے کی علت کوئی سیاسی ضرورت نہیں بلکہ حکمتِ دین تھی تو مہربانی فرما کر یہ بتائیں کہ تاریخِ اسلام میں قرآن کے پیچھے چلنے کے بجائے قرآن کو اپنے پیچھے چلانے کی اس سے بہتر کوئی اور مثال ملتی ہے؟

رسائل و اخبارات کے فائل گواہ ہیں کہ آزادی سے پہلے جب علماء کرام سے کہا جاتا تھا کہ جانشین رسولؐ ہونے کی حیثیت سے آپ کا منصب تو یہ ہے کہ احیاءِ دین اور قیامِ دین کی کوشش میں اپنی اور ملت کی صلاحیتیں صرف کریں تو علماء کی جانب سے یہ جواب ملتا تھا کہ اس وقت ہم پر دو پتھروں کا بوجھ ہے ابھی ہم ایک کی مدد سے دوسرے پتھر کا بوجھ ہٹادیں اس کے بعد ایک کا مقابلہ آسان ہوگا اور اس وقت ہم اپنا اصل کام یعنی قیامِ دین کا کام کریں گے۔ علماء کرام کا وہ ارادہ پورا ہوئے اٹھارہ سالیں ہوتی ہیں اب سوال یہ ہے کہ ان اٹھارہ سالوں میں آپ نے وہ اصل کام کتنا کیا۔ یا اگر نہیں کیا تو کب تک ارادہ ہے؟ کیا عرسوں کا انتظام کرنا اور نئے مزاروں کی تعمیر جیسا کہ ابھی اُجین میں ہو رہی ہے یا مسلمانوں کی کسٹوڈین اور ملازمتوں وغیرہ اُلجھنوں میں مصروف ہو جانا ہی ہے وہ قیامِ دین کی کوشش جو آپ کو ایک پتھر ہٹ جانے کے بعد کرنا تھی ہم معاصر سے درخواست کریں گے کہ وہ اس مسئلہ پر ضرور روشنی ڈالے۔ تاکہ ہم جیسے بہت سے بندگانِ خدا کو تسکین ہو۔ جو علماء کی طرف اُمید بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔

محترم معاصر نے ندیم کے زیرِ نظر مضمون پر غصہ کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے کہ ''برتن میں سے وہی چیز ٹپکتی ہے جو اس میں ہوتی ہے'' یہ عربی مقولہ بیشک صحیح ہے۔ ندیم کے برتن میں سے جو چیز ٹپکی ہے وہ علماء کا احترام ان کی واقعی خدمت کا اعتراف جمعیۃ العلماء کی رائے اور روِش سے اختلاف ان کی خدمت میں مخلصانہ درخواست اور یہ تمنا و خواہش کہ علماء جیسی عظیم المرتبت ہستیوں کو وہی مقام ملے جو ان کا ہے یہ ہیں وہ چیزیں جو ندیم کے برتن سے ٹپکی ہیں جس کا دل چاہے وہ ہمارے مضمون کو اب بھی اس نقطۂ نظر سے دیکھ لے البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ہماری رائے میں بزرگی اور معصومیت لازم و ملزوم نہیں ہیں ہمارے نزدیک ایک شخص غلطی کرنے کے بعد بزرگ اور قابل احترام رہتا ہے جبکہ معاصر کا مسلک یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''جو شخص بزرگ ہے وہ غلطی نہیں کرتا اور جو غلطی کرتا ہے وہ بزرگ نہیں ہے'' یہ تو ہوا ندیم کے برتن کا معاملہ لیکن اگر کوئی شخص یہ جاننا چاہتا ہے کہ مسلمانوں کی سب سے زیادہ قابل احترام تنظیم جمعیۃ العلماء اور اس کے ترجمان الجمعیۃ کے برتن میں کیا بھرا ہے تو ہم اس کو مشورہ دیں گے کہ وہ ۱۹۶۲ء کے انتخاب کے زمانہ کے پرچے دیکھ لے۔ ان دنوں میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم کے انتخابات کے سلسلہ میں اس کے برتن میں سے کیسے کیسے موتی اور کیسے زندگی بخشنے والے آبِ حیات کی بارش ہوئی تھی، اگر معاصر کو یاد نہ رہا تو اس کے خاص خاص اقتباسات ندیم پیش کرسکتا ہے؛ لیکن اتنی دُور جانے کی ضرورت نہیں اور یہ بات تو تازہ اور موجودہ ہے کہ اکابر جمعیۃ کے دینی جذبہ اور جوشِ عمل نے جب تک نصف لی ونصف لکم کے اُصول پر صارف کو نصف نصف تقسیم نہیں کرلیا اس وقت تک ان کے جذبۂ عبودیت کو تسکین نہیں ہوئی۔

ایک ہوا ورکنگ صدر اور دوسرا حقیقی صدر یا نمائشی صدر جمعیۃ کا۔ یہ وہ کارنامہ ہے جس کی مثال نہ کسی جماعت میں ملتی ہے نہ کسی مملکت میں اور ان شاء اللہ آنے والی نسلیں بھی اس پر فخر کریں گی۔ پھر دونوں طرف کے زعماء کی جانب سے ایک دوسرے پر جو گُل افشانی ہورہی ہے اس پر تو ہفتے بھی نہیں گزرے ہیں۔

ایک گروپ کے بیان کے مطابق دستور کی ایک دفعہ ہی غائب ہوگئی۔ ایک نے اشارہ فرمایا۔ فلاں ناظم فلاں سابق ملازم ہیں، دوسرے نے اپنے ساتھی کو ڈنک مارنے والا بچھو بنا ڈالا۔ ہم کیا کیا پیش کریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''ایں خانہ تمام آفتاب است۔'' سچی بات یہ ہے کہ ہم تو اس برتن کی تراوش سے لطف لینے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے۔ البتہ کبھی کبھی بے تابانہ آہ کے ساتھ زبان سے نکل جاتا ہے کہ:

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا۔!

کار طفلاں تمام خواہد شد

ہماری ان سطور میں ان لوگوں کو تلخی و تیزی محسوس ہوگی جو اس کیفیت سے آشنا نہیں ہیں کہ جب ایسی محبوب شخصیتوں سے جن سے یہ توقعات وابستہ ہوں ایسی باتیں صادر ہونے لگیں جو خود ان کے حق میں مضر ہیں تو محبت و

عقیدت کی جلن وہ حق باتیں بھی کہہ گزرتی ہے، جو کڑوی ہوتی ہیں اگر معاصر کو اب بھی شکایت ہو تو ہم اس سے درخواست کریں گے کہ وہ ہماری گزارشات کو اپنے صفحات میں جگہ دے اور ہم اپنے پرچہ کو اس کے فرمودات سے زینت بخشیں گے، تاکہ دونوں پرچوں کے پڑھنے والے تصویر کے دونوں رُخ دیکھ سکیں۔ تصویر کا ایک رُخ پیش کرنا نہ تو دیانت ہے نہ بہادری۔

تجلی

معاصر ''ندیم'' نے اپنے تیسرے اداریہ میں علماء جمعیۃ کے جس ترش و تلخ جوابی مضمون کا ذکر کیا ہے وہ ہماری نظر سے بھی گزرا تھا۔ وہ دراصل دو اداریوں سے عبارت ہے جو ۹/اور ۱۰/اپریل کے الجمعیۃ میں شائع ہوئے ہیں۔

روزنامہ الجمعیۃ کا باقاعدہ مطالعہ کرنے والا کوئی بھی ہوش مند قاری یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا، کہ اس اخبار کے شذرات لکھنے والے مدیر جناب محمد عثمان فارقلیط کا ذہن، طرزِ فکر، طریق گفتگو اور اندازِ استدلال وہ نہیں ہے جس کے لیے جمعیۃ العلماء معروف ہے۔ جمعیۃ العلماء کی فکری ہیئت اور سیاسی تکنک میں خوف اور مرعوبیت کا جو عنصر عرصہ دراز سے کافی اُبھرا ہوا نظر آرہا ہے اس کی پرچھائیں تک جناب فارقلیط کے رشحاتِ قلم میں نظر نہیں آتی؛ بلکہ ان کے اداراتی نوٹ پڑھتے ہوئے تو اکثر و بیشتر یہ بات ذہن سے نکل ہی جاتی ہے کہ ہم جو اخبار پڑھ رہے ہیں وہ اس جمعیۃ العلماء کا اخبار ہے جس نے عرصہ دراز سے قوم پرستی کی پرچھائیوں کے پیچھے دوڑنا اپنا منتہائے فکر بنا رکھا ہے۔

اس صورت میں معاصر ندیم کا یہ خیال تو صائب نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی تنقید کا تعاقب علمائے جمعیۃ نے کیا ہے ہو سکتا ہے فارقلیط صاحب کے مذکورہ دونوں شذروں کے پیچھے جمعیۃ کے بھی کچھ مشورے شامل ہو گئے ہوں اور بعض فقروں کا زہریلا پن ان مشوروں ہی کا ایک جزو ہو؛ مگر نفس تعاقب کی ذمہ داری فارقلیط صاحب کے سر جاتی ہے نہ کہ علمائے جمعیۃ کے۔ علمائے جمعیۃ تو عموماً خود پرستی اور استغناء کی اُن بلند فضاؤں میں رہتے ہیں جہاں انھیں کسی بھی ناقد یا مشورہ پیش کرنے والے کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہی نہیں ہے انھیں بھلا اس کی کیا پروا ہوتی کہ ''ندیم'' کیا لکھ رہا ہے۔ ندیم کے فرمودات پر جزوی تعاقب کرنے کا فعل حقیقۃً جمعیۃ العلماء کا فعل نہیں بلکہ مدیر الجمعیۃ کا کارنامہ ہے اور ایمانداری کی بات یہ ہے کہ بعض تلخ جملوں کو چھوڑ کر مدیر الجمعیۃ نے سیکولرازم اور جمعیۃ العلماء کے موقف میں جو تطبیق کی ہے اور ندیم کے اعتراض کا جو جواب دیا ہے وہ خاصا وزنی ہے ہم اگر اس پوری بحث پر محاکمہ کریں گے تو بات بہت لمبی ہو جائے گی لہٰذا صرف بعض اجزاء پر اپنے خیالات پیش کرتے ہیں تاکہ لائق غور اور مستحق توجہ نکات طوالت میں گم نہ ہو جائیں۔

ڈاکٹر عابد حسین کا تجزیہ

بنیادی طور پر ڈاکٹر عابد حسین صاحب کی یہ بات بالکل درست ہے کہ جنگِ آزادی میں جمعیۃ العلماء کی ساری جدو جہد کسی ایجابی فکر پر مبنی نہیں تھی بلکہ وہ سرتاسر منفی بنیادوں پر استوار تھی۔ اور مستقبل کے بارے میں چند غیر منظم اور خواب آسا اُمیدوں کے سوا اس کے پاس واضح اور متین تصورات کا قطعی فقدان تھا اسی بات کو ہم اپنے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ جمعیۃ العلماء نے جنگِ آزادی میں جو بھی قربانیاں دی ہیں وہ کسی مقصد بلند کی محبت اور کسی اونچے اُصول کی حمایت میں نہیں دی ہیں بلکہ ''انگریز کی نفرت'' اس کی تمام سرگرمیوں کا ذہنی سنگِ بنیاد رہی ہے اور اسی نفرت کی شدت نے اسے ایک ایسی آزادی کے لیے لڑا دیا ہے جو بجائے خود نہ کوئی نعمت ہے نہ لعنت۔ جو اپنی اصلاحی حیثیت میں ایک سپاٹ شے ہے اور مجرد اس کے لیے مر مٹنا کم فہموں کا کام تو ہوسکتا ہے گہری نظر اور منطقی فکر رکھنے والوں کا کام نہیں ہوسکتا۔

استادِ محترم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی ؒ کے یہ الفاظ آج بھی تاریخ کے حاشیے میں کالی روشنائی سے لکھے دیکھے جاسکتے ہیں کہ:

''میں انگریز کے خلاف کتوں اور سوروں سے بھی تعاون کرسکتا ہوں''۔

ہوسکتا ہے الفاظ کی نقل میں کوئی شوشہ اِدھر اُدھر ہوگیا ہو لیکن ذہن جمعیۃ العلماء کا بہرحال یہی تھا جو اس فقرے میں منہ سے بول رہا ہے انگریز کتنا ہی بُرا رہا ہو؛ مگر اس سے نفرت کی بنیاد پر سیاست کا کوئی محل بنانا اور اس کی تعمیر پر اپنی بہترین قوتیں کھپا دینا ایسا کارنامہ نہیں جس پر اسلامی اخلاق کی روشنی میں فخر کیا جاسکے یا جسے ٹھوس فکر اور اونچی سیاست کا مظہر قرار دیا جاسکے۔

البتہ ڈاکٹر عابد حسین کے فکری تجزیہ کا دوسرا جزو ہماری نظر میں نہ صرف غیر منقول ہے بلکہ اصلی ظالموں کی طرف سے آنکھیں بند کرلینے کے مرادف ہے اصلی ظالم اور خائن تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے جنگِ آزادی کے دوران سیکولرازم اور جمہوریت کے جو معنیٰ لیے تھے انھیں آزادی ملنے کے بعد ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ اور اقتدار ملتے ہی وہ جارحانہ قوم پرستی اور مذہبی تعصب کی راہ پر سرپٹ دوڑنے لگے۔ بورڈ اب بھی ان کے ایوانِ گفتار پر وہی پرانا لٹک رہا ہے اور الفاظ اس پر وہی سیکولرازم اور جمہوریت کے مرقوم ہیں لیکن عملاً انھوں نے جمعیۃ العلماء سے، اپنے پچھلے دعاوی اور تصورات سے، واضح قراردادوں اور معاہدوں سے کھلا غدر اور انحراف کیا۔

ایک ناسمجھ آدمی کسی راہزن کو راہ نما سمجھ لے یہ اس کا بھولا پن ہے جسے آپ حماقت بھی کہہ سکتے ہیں؛ لیکن جب یہ راہزن اسے لوٹ لے گا تو فردِ جرم لٹنے والے کی حماقت پر عائد نہیں کی جائے گی بلکہ مجرم راہزن ہی کو مانا جائے گا۔

اسی طرح جمعیۃ العلماء نے اگرچہ منفی فکر کے خطوط پر چل کر مستقبل کے حسین خواب دیکھنے اور ابنائے وطن کی منصف مزاجی پر بھروسہ کرنے کی حماقت کا ارتکاب ضرور کیا تھا؛ لیکن یہ ابنائے وطن جب آزادی ملتے ہی سیکولرازم اور جمہوریت کی بالکل نئی تشریحوں پر اتر آتے ہیں اور قومی نقطۂ نظر کی جگہ مذہبی تنگ نظری کو زمامِ عمل سونپ دی جاتی ہے تو ڈاکٹر عابد حسین جیسے اہلِ نظر کو فردِ جرم جمعیۃ العلماء پر نہیں کانگریسی شہزادوں پر عائد کرنی چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب جدید لبرل نظریۂ زندگی کا حوالہ تو دیتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ خود نیشنل کانگریس کب اس نظریہ کو اپنا سکی ہے۔ قوم پروری کی تحریک کے پیچھے یہ جانے بغیر چل پڑنا کہ قوم پروری بجائے خود کوئی جامع فلسفہ نہیں بلکہ وہ جزو ہے سیکولر جمہوریت کے سیاسی فلسفہ کا بے شک ایک ناسمجھی کا کام تھا اور جدید لبرل نظریۂ زندگی سے ناواقفیت بھی علماء کی فہرستِ خطایا میں ضرور درج کیجیے؛ لیکن خدارا یہ تو بتادیجیے کہ کیا خود کانگریس نے بھی آزادی کے بعد سیکولر جمہوریت کا سیاسی فلسفہ برتنے کا فخر حاصل کیا ہے اور جدید لبرل نظریۂ زندگی سے سروکار رکھا ہے کانگریسی مسلمانوں کو چھوڑ دیئے وہ کس کھیت کے بتھوے ہیں اقتدار کی زمام تو غیر مسلم کانگریسیوں کے ہاتھ میں ہے کیا ان کے لیے جمیعۃ العلما کی فکری نارسائی اور تحریک خلافت کی تاریخ اُس انحراف اور جارحیت اور مذہبی جانبداری کا جواز پیدا کرسکتی ہے جس کا مظاہرہ وہ آزادی کے بعد دن کی روشنی میں مستقلاً کررہے ہیں۔ یہ بالکل غلط اور غیر معقول ہے کہ مسلمانوں کا ہر مکتب فکر محض اس لیے اُلجھن میں گرفتار ہے کہ آزادی کے دستور نے قومی زندگی کی تنظیم سیکولر جمہوریت کے اُصول پر کی ہے۔

اگر قومی زندگی کی تنظیم یہاں دستور کے کھینچے ہوئے خطوط اور خاکے کے مطابق ہوتی تو مسلمانوں کے کسی بھی مکتبِ فکر کو اُلجھن میں گرفتار ہونا نہ پڑتا۔ رونا تو اصل یہی ہے کہ مغربی تہذیب نے سیکولرازم اور جمہوریت کے جو سیاسی و سماجی تصورات دیئے ہیں ان کا نام ونشان تک یہاں کے سیاسی و سماجی دائروں میں نظر نہیں آرہا ہے یہاں چھوت چھات ہے۔ نفرت ہے مذہبی جارحیت ہے۔ تنگ نظری اور بخل ہے پراگندگی اور جذباتیت ہے یہ گندے عناصر کسی بھی تنظیم کو کس قدر بے معنیٰ اور بے اساس بناسکتے ہیں یہ ڈاکٹر عابد حسین جیسے اہلِ نظر سے مخفی نہیں ہونا چاہئے ایک قدم بڑھ کر ہم کہیں گے کہ یہاں تو سرے سے تنظیم کا ارادہ ہی نہیں پایا جاتا۔ لفاظی بہت ہے دعوے بے شمار ہیں لیکن قوم پرورانہ خطوط پر تمام اربابِ وطن کی تنظیم اور شیرازہ بندی کا حقیقی داعیہ کہیں نہیں پایا جاتا۔ اس کے برخلاف انتشار اور چھین جھپٹ اور تعصب وتغلب کی راہ میں کافی تیز قدمی دکھائی جارہی ہے۔

خود ڈاکٹر صاحب کے تجزیے کو بھی ہم اسی ظلم وتعصب کا ایک جزو قرار دیں گے جسے قوم پروری اور وطن پرستی و اصطلاحوں کی آڑ میں اپنایا گیا ہے ظلم کو ظلم نہ کہنا اور ظالم کے عوض مظلوم کو مجرم ٹھیرانا آج کی قوم پرستی کا ممتاز وصف ہے۔ یہی وصف موصوف کے ان الفاظ میں جلوہ گر ہے کہ:

''اب جبکہ یہ اہم حقیقت رفتہ رفتہ ظاہر ہو رہی ہے مسلمانوں کا ہر مکتبِ فکر اُلجھن میں گرفتار ہے''

ہم صاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ یہ ریمارک حقیقت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ مسلمانوں کو اُلجھن نہ لبرل نظریۂ زندگی سے ہے نہ مغربی تصورِ انصاف پر مبنی جمہوریت سے۔ انھیں الجھن ہے کھلے ظلم سے۔ منافقت سے۔ وشواس گھات سے۔ تہذیبی جارحیت اور مذہبی تعصب سے۔ انھیں اُلجھن ہے۔ کانگریس کی بے کرداری سے۔ بے اُصولی سے۔ کوئی مبصر غیر جانبدار نہیں سمجھا جاسکتا۔ جب تک کہ وہ سیاسی و سماجی حالات کی تہ میں کام کرنے والے موثرات میں اس سب سے بڑے مؤثر اور عامل کو نہ دیکھے جسے ہم نے ظلم و جارحیت کے نام سے موسوم کیا ہے، ڈاکٹر صاحب نے خدا جانے کس وجہ سے یہ بے بنیاد مفروضہ قائم کرلیا ہے کہ ہمارے یہاں جدید لبرل نظریۂ زندگی کی کاشت کی جارہی ہے حالانکہ یہاں ''نظریۂ زندگی'' نام کی کوئی ٹھوس چیز سرے سے موجود ہی نہیں اور جن غیر مربوط افکار کے مجموعے کو لیڈر لوگ بڑے طمطراق سے نظریۂ زندگی کے نام سے پیش کرتے ہیں اس کا سارا حسن سانپ کی کینچلی کا حسن ہے جو اپنے بطن میں زہر کے سوا کچھ بھی نہیں رکھتی۔

گاندھی جی کی مثال

فاضل مدیر ندیم کا یہ مشورہ کہ جمعیۃ العلما انگریز کی رخصت کے بعد خود کو ختم کردیتی ہے بیشک ایک معنیٰ تو رکھتا ہے خصوصاً جب اس پہلو کو نظر میں رکھا جائے کہ ایک گدھا بھی چار آنے دے کر جمعیۃ العلماء کا ممبر بن سکتا ہے تو بات بڑی تیکھی بن جاتی ہے؛ لیکن اس مشورے کی تائید میں گاندھی جی سے استشہاد کرنا ہماری ناقص رائے میں بے محل ہی تھا۔

ہمیں سچ پوچھئے تو اسی میں شک ہے کہ کانگریس اگر گاندھی جی کا مشورہ قبول کر کے خودکشی کرلیتی تو نتائج اس سے بہتر نکلتے جیسے کہ اب نکلے ہیں۔ آخر کیا دلیل ہے کہ جن خرابیوں کی بنا پر یہ حسرت کی جاتی ہے کہ کاش کانگریس گاندھی جی کا مشورہ قبول کرلیتی وہ خرابیاں مشورہ قبول کرلینے پر پیدا نہ ہوتیں۔ کانگریس کسی قائم بالذات وجود کا نام نہیں جو خرابیوں کی تولید کا ذمہ دار ہو۔ وہ تو فقط ایک نام ہے افراد و اشخاص کے ایک تنظیمی تصور کا، خرابیاں اِن افراد و اشخاص کے ذاتی کردار اور طرزِ فکر کی پیدا کردہ ہیں نہ کی اس نام کی، یہ نام گاندھی جی کے مشورے پر ختم ہی کردیا جاتا تو کیا کردار اور طرزِ فکر کی وہ کجی ختم ہوجاتی جو خرابیوں کا اصل سرچشمہ ہے۔

پھر گاندھی جی کے احترام میں ان کے مشورے کو برحق تسلیم کر بھی لیا جائے۔ تو اس بیّن فرق کو کہاں لے جائیں گے جو کانگریس اور جمعیۃ العلماء میں ہے۔ کانگریس کو اقتدار ملا تھا لہٰذا گاندھی جی یہ اندیشہ کرنے میں حق بجانب تھے کہ اقتدار کی دولت تقسیم کرنے میں کانگریسی حضرات اپنے جماعتی نام سے ناجائز فائدہ اُٹھائیں گے کانگریس آزادی حاصل کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ آزادی حاصل ہوگئی تو اس کا مقصدِ وجود بھی پورا ہوا اب اسے

باقی رکھنے کا اس کے سوا کوئی جواز نہیں کہ اس کی آڑ میں اغراض و مفادات کا استحصال کیا جائے۔ یہ تھا گاندھی جی کے مشورے کا فکری پس منظر۔

مگر جمعیت بیچاری کو تو کوئی اقتدار نہیں ملا۔ وہ مسلم لیگ سے بھی ہاری اور اُن دوستوں سے بھی جن پر اسے اعتماد تھا۔ آزادی کی جنگ میں اس نے اپنے ہم وطنوں کو بلاشبہ بڑی مدد دی ہے۔ اور تقویت پہنچائی ہے؛ لیکن اس کی حیثیت توپ اور بندوق سے زیادہ نہیں رہی۔ لوہے کے ہتھیار بیشک فوجوں کی جان ہیں اور میدانِ حرب میں وہ فیصلہ کن پارٹ ادا کرتے ہیں لیکن وہ خود نہیں چلتے چلائے جاتے ہیں انھیں جمادات ہی کے خانہ میں رکھا جائے گا چاہے ان کے ذریعہ ہزار قلعے فتح کر لیے جائیں۔

ایسی صورت میں جمعیت کو یہ مشورہ دینا تو معقول ہوسکتا تھا کہ وہ اپنی جماداتی حیثیت کو بدل کر ذی شعور اور ذی ارادہ انسانوں کی صف میں آئے تاکہ پچھلے نقصانات اور موجودہ حرماں نصیبوں کا علاج سوچا جاسکے؛ مگر یہ مشورہ بے جان سا ہے کہ وہ انگریز کے جاتے ہی اپنے نام کی ارتھی اُٹھا دیتی اس مشورے کی منطقی بنیاد شاید یہ دلچسپ خوش فہمی ہو کہ جس آزادی کی خاطر جمعیت بنی تھی وہ آزادی کانگریس ہی کی طرح جمعیت کو بھی وصول ہوگئی اگر سچ مچ ایسا ہوتا تو گاندھی جی کا حوالہ ایک وزن رکھتا۔ لیکن سچ مچ جو واقعہ ظہور پذیر ہوا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ آزادی کا سارا مکھن کانگریس کے اعیان سمیٹ کر لے گئے اور سفید رنگ کا پانی جمعیت کے حصہ میں آیا۔ اسے اس کی مجہول قوم پروری چاہے دودھ ہی کے نام سے موسوم کرتی رہے؛ لیکن فقط نام مکھن کا بدل نہیں ہوا کرتا۔ خوابوں کا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔ خوش گمانیوں کی قوسِ قزح کانچ کے دھاردار ٹکڑوں میں تبدیل ہو چکی ہے، جمعیت کو اپنا نام نہیں کام اور اندازِ نظر بدلنا چاہیے۔

اصل خرابی

معاصر ندیم نے جمعیت کی قوم پرستی اور دینی و ملّی تصورات کے مابین جس تضاد کی نشان دہی کی ہے اس کے بھی دو پہلو ہیں۔ متحدہ قومیت اور قوم پرستی کا اگر وہی مفہوم مان لیا جائے جو شری چھاگلہ اور گول والکر جیسے نام نہاد قوم پرست لیتے ہیں تو یقیناً معاصر کی نشان دہی درست ہوگی لیکن خود جمعیۃ العلماء جو مفہوم لیتی ہے اس کے لحاظ سے اس نشان دہی کو صحیح نہیں مانا جاسکتا؛ بلکہ تطبیق اور توجیہ کی وہی تکنک درست ماننی ہوگی جو محترم فارقلیط صاحب نے اپنے جوابی اداریوں میں اختیار کی ہے۔

ہمارے نقطۂ نظر سے قابل توجہ اور سب سے زیادہ فکر کے مستحق وہ نکات نہیں ہیں جو ندیم کے فاضل مدیر نے اٹھائے ہیں؛ بلکہ اہم تر نکتہ وہ اندرونی شدید اختلاف ہے جو جمعیت کے اندر پایا جاتا ہے آپس کا نزاع اور عناد و

مخالفت وہ بلا ہے کہ سونے کو مٹی میں تبدیل کردے۔ اُصول وافکار کے رُخ سے کوئی گروہ کتنا ہی شاندار کیوں نہ ہو؛ لیکن اس کے افراد میں اگر باہمی کشمکش اور ذہنی تفریق پائی جاتی ہے تو ان اُصول واذکار کی قیمت ایک خوبصورت لاش سے زیادہ نہیں۔ لاشیں مسالے لگا کر محفوظ تو کی جاسکتی ہیں، مگر کسی اکھاڑے میں نہیں اُتاری جاسکتیں۔

اس کے برخلاف افراد کی ذہنی ہم آہنگی اور ربط و اتحاد وہ قوت ہے جو کمزور سے کمزور اور ناقص سے ناقص افکار و اُصول کی گاڑی کو بھی طاقتور گھوڑے کی طرح کھینچ کر آگے بڑھالے جاتی ہے ماتم اور احتجاج اور واویلا اس پر کیجیے کہ جمعیۃ دو ایسے دھڑوں میں بَٹ گئی ہے جو ایک دوسرے سے بُری طرح متصادم ہیں۔ ان کے مابین مسلسل پیکار جاری ہے وہ ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ اس بنیادی فساد کا ایک مظہر تو وہی صدارتی ثنویت ہے۔ جس کا ذکر فاضل مدیر ندیم نے کیا۔ دوسرا نظارہ میرٹھ کے اجلاس میں سامنے آچکا ہے۔ اندر گھس کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَاتُخْفِىْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ۔ ہمارا مطالعہ یہ ہے کہ ایک دھڑے میں مفاہمت اور شیرازہ بندی کی پوری خواہش پائی جاتی ہے؛ کیونکہ اس کا سربراہ عزوجاہ کی ہوس اور گروہ بندی کی اسپرٹ سے طبعی اور خلقی طور پر تہی دامن ہے؛ لیکن دوسرا دھڑا اور ہی مزاج رکھتا ہے وہ سیاسی اجتماعیت میں پیری مریدی والی حلقہ بندی کا پیوند لگائے رکھنے کو ملّت کے مفاد سے بھی زیادہ ضروری خیال کرتا ہے۔ اس کا سربراہ اگرچہ ایک بہادر باپ کا بہادر بیٹا ہے اور بعض اور اوصافِ حمیدہ اس میں اللہ نے ودیعت فرمائے ہیں؛ لیکن چالیس سال سے کم عمر کو اگر اللہ نے انبیاء تک کے لیے نبوت کی ثقاہت اور متانت کے شایانِ شان نہیں سمجھا تو یہ کیسے سمجھ میں آسکتا ہے کہ چودھویں صدی ہجری کا ایک نونہال قوم وملت کی قیادت کا اہل بن جائے اور بعض غیر متعلق اوصاف تدبر وفراست کے خلا کو پُر کردیں۔ غلو کیش، خود پسند اور تاریک دماغ حوارئین نے اچھے اچھوں کو جنت الحمقاء تک پہنچایا ہے آج بھی یہی ہو رہا ہے سب سے اہم تر اور فیصلہ کن مسئلہ ہمارے نزدیک یہی مفاد پرستانہ اختلاف و افتراق کا مسئلہ ہے۔ اس کی موجودگی میں یہ بحث ہی بے کار ہے کہ جمعیۃ العلماء کا فکری اثاثہ قیمتی ہے یا بے قیمت۔ اُصول وافکار پر نظر ثانی ہوسکتی ہے۔ جہد وعمل کی نئی راہیں ڈھونڈی جاسکتی ہیں، حقوق کی جنگ ڈٹ کر لڑی جاسکتی ہے لیکن یہ سب تنظیمی ہیئت کے داخلی استحکام اور ذہنی و عملی ہم آہنگی پر منحصر ہے۔ ملّتِ مسلمہ آج بھی مردہ نہیں ہے؛ مگر اس کی توانائیوں سے کام لینے والا بھی تو کوئی ہو۔ ہم قومی وملی مفاد کی سطح پر جماعتی تعصب نہیں رکھتے۔ اگر جمعیۃ العلماء اپنی اصلاح اور شیرازہ بندی کرکے سارے ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ دہرائے تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا، ہمیں اس کی بھی تمنا نہیں کہ کوئی اونچا مقام ومنصب جماعتِ اسلامی کو بھی ضرور حاصل ہو۔ مقصود قوم وملّت کی فلاح ہے۔ یہ فلاح جمعیۃ العلماء کے ذریعہ روبہ کار آئے تو چشم ماروشن دل ماشاد۔ لیکن اپنی موجودہ حالت میں جمعیۃ کا کوئی دعویٰ اور ماضی کے کارناموں پر افتخار کا اعلان بالجہر وقت گزاری کا مشغلہ ضرور ہے افادیت اور اجتماعی رفاہ سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔

حاصل گزارش

ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ ندیم اور الجمعیۃ دونوں کے مدیر ہماری نگاہ میں ملّت کے اُن اہل اور دردمند افراد میں سے ہیں جنھیں ایک دوسرے کا خصم اور فریق گفتگو سننے کے عوض مشیر ومعاون بننا چاہیے۔ یہ حضرات نظریاتی مناظرے کے بجائے جمعیۃ العلماء کے داخلی انتشار اور بے کرداری اور تفریق پسندی کے علاج کی طرف توجہ فرمائیں تو ہوسکتا ہے کوئی فائدہ نکل ہی آئے۔ بغیر اس کے جمعیت کے تن مردہ میں جان نہیں آسکتی، چاہے آسمان سے فرشتے ہی اس کے لیے اعلیٰ اُصول ونظریات کے خوان لے کر نازل ہوجائیں۔

(تجلی دیوبند جون ۱۹۵۶ء)

ماخذ و مراجع

تاریخ دارالعلوم دیوبند	سید محبوب رضوی
ماہنامہ تجلی (مختلف شمارے)	مولانا عامر عثمانی
کشکول عثمانی	عبدالرحمٰن سیف عثمانی
مسلمانوں کے علمی اور سائنسی کارنامے	مسعود جاوید عثمانی
وہ بندۂ مولا صفات	مفتی فصیل الرحمٰن ہلال عثمانی
ردِّ فتنۂ مودودیت	ڈاکٹر سید انور علی
برہان کا مفکر ملّت نمبر	مولانا سعید احمد اکبر آبادی
صدسالہ اجلاس کی مختصر رپورٹ	اظہر صدیقی
روداد دارالعلوم دیوبند	
دارالعلوم کی صدسالہ زندگی	مولانا قاری محمد طیب قاسمی
تحدیثِ نعمت	مولانا منظور نعمانی
اکابر دیوبند کیا تھے	مفتی محمد تقی عثمانی
حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی	مولانا محمد اسحاق قاسمی
عکس و نقش	نایاب حسن قاسمی
ترجمان دارالعلوم کا مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر	
الفاروق	علامہ شبلی نعمانی
ملت خور بزرگ	صادق صابری
پوسٹ مارٹم	صادق صابری
ترجمہ شیخ الہند	مولانا محمود حسن عثمانی
تفسیر عثمانی	علامہ شبیر احمد عثمانی
تفسیر بیان القرآن	مولانا اشرف علی تھانوی

جن کتابوں کا حوالہ اس کتاب میں دیا گیا ہے اُن کی تصاویر ہم فقط اس غرض سے پیش کر رہے ہیں تا کہ کوئی بدگمان ذہنیت کا حامل یہ الزام نہ لگائے کہ حوالوں کے طور پر پیش کی گئی کتابیں اصل میں ہیں ہی نہیں، الحمدللہ یہ کتابیں ہمارے پاس موجود ہیں اور کسی متلاشی کو لائبریری یا بازار سے بہ آسانی دستیاب بھی ہو سکتی ہیں۔ باقی جن کی تصویر اس فوٹو میں نہیں ہے وہ سب عام کتابیں ہیں جو کسی بھی کتب خانے پر دیکھی جا سکتی ہے۔ جیسے: تحدیث نعمت، تفسیر عثمانی وغیرہ۔

مولوی اسعد مدنی کے انتقال سے پہلے حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کی قبر۔
لال دائرے میں دیکھیے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی قبر پر لگا کتبہ صاف نظر آ رہا ہے جس پر حبیب الرحمٰن کا الرحمٰن اور عثمانی کا عثما واضح
طور پر پڑھا جا رہا ہے نیچے کی طرف مہتمم دارالعلوم بھی لکھا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔ آج یہ کتبہ ناپید کر دیا گیا ہے۔
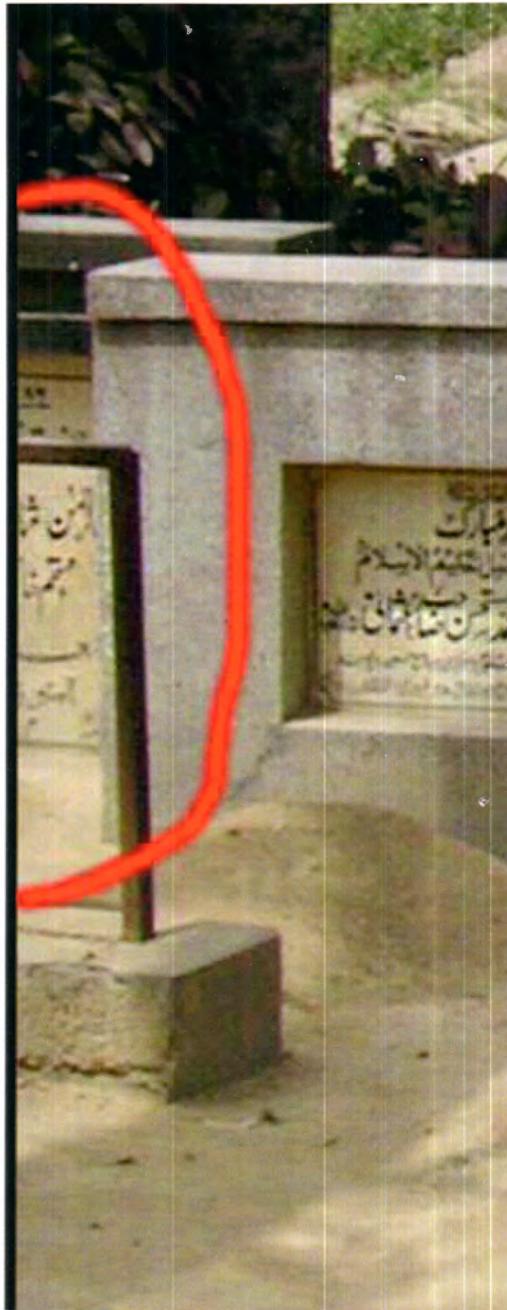
آپ دیکھ سکتے ہیں تصویر میں حبیب الرحمٰن عثمانی کے نیچے مہتمم خامس کا اکثر حصہ بھی صاف طور پر پڑھا جا سکتا ہے۔ یہی سچ تو چھپانا تھا جس کی وجہ سے قبر پر لگا کتبہ توڑ دیا گیا۔ اور یہ تصویر کوئی کمپیوٹر کی مکسنگ نہیں ہے بلکہ اتفاقی طور پر ہمیں ایک جگہ سے یہ پرانا فوٹو دستیاب ہوگیا، جو بالکل اصلی ہے۔
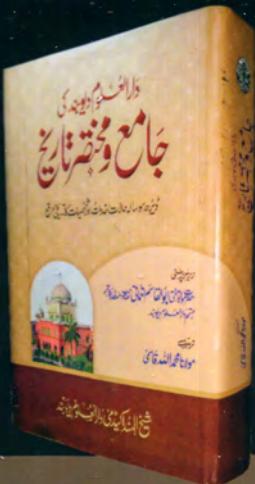
دارالعلوم دیوبند سے شائع شدہ غیر معتبر کتاب
"دارالعلوم دیوبند کی جامع و مختصر تاریخ"

سردست جس کتاب کی حقیقت بیان کرنے کے لیے قلم نے جنبش کی ہے وہ بھی جھوٹ، افترا، مکروفریب اور چاپلوسی کے جراثیم سے بھرے ذہن کی پیداوار ہے۔ گزشتہ صفحہ پر جس غیر معتبر تاریخی کتاب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ کتاب اس لائق ہرگز نہیں کہ اس پر کسی بھی طرح کے کلام کی ضرورت ہو، نہ ہی اُس کے مرتب اس قابل ہیں جن کے نام کی وجہ سے کتاب کو اہمیت حاصل ہو سکے۔ ہمیں کتاب کی اصلیت عوام کے سامنے لانے کے لیے جس چیز نے مجبور کیا، وہ ہے دارالعلوم جیسی عظیم درسگاہ سے اس کتاب کا منسوب ہونا۔ بدنصیبی یہ ہے کہ امتِ مسلمۂ ہند کی دینی حمیت اور آبرو سمجھے جانے والے دارالعلوم دیوبند نے اس پُرفریب کتاب کو شائع کیا ہے۔ مقامِ افسوس ہے کہ مولانا قاسم و حضرت شیخ الہند اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی و علامہ شبیر عثمانی رحمہم اللہ جیسے بہت سے عظیم المرتبت مفکر و مدبّر علماء کی امانت و یادگار یہ ادارہ اب ایسے ہاتھوں میں آچکا ہے جو دیانت کے قاتل اور امانت کے خائن ہیں۔ یہ الزام نہیں صداقت ہے جس کو آپ آئندہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ ملاحظہ کریں گے بے بنیاد الزام لگانے کے ہم قطعی قائل نہیں ہیں۔ اس کتاب کا آغاز ہی دیانت کی لاش پر پاؤں رکھ کر کیا گیا ہے اور آغاز کرنے والے دیانت کے یہ قاتل فاضل مرتب نہیں بلکہ وہ ہیں جن کے ہاتھوں میں دارالعلوم کی زِمام ہے۔

ہم ہرگز اس معمولی کتاب پر قلم نہ اُٹھاتے لیکن دارالعلوم کی نسبت کے علاوہ دوسری اہم وجہ یہ بنی کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد چند اہلِ بصیرت نے کتاب میں برتی گئی لاپرواہی اور تنگ نظری کی نشان دہی کرتے ہوئے مہتمم دارالعلوم دیوبند کو تحریری توجہ دلائی اور اس کتاب میں اصلاح کرنے یا اس کی اشاعت و فروختگی کو روکنے کی گزارش کی لیکن حیف صد حیف زعم اقتدار سے خرد کا مفلوج ہو جانا نئی بات نہیں۔ نہ تو کتاب میں تصحیح کی گئی اور نہ ہی اس کی اشاعت کو روکا گیا۔ اس کے برعکس طلبہ کو انعام میں یہ کتاب تقسیم کرکے مزید ترویج و تشہیر کی گئی۔ اور آج بھی یہ کتاب نسلِ نَو کے ذہنوں کو غلط معلومات کا زہر فراہم کر رہی ہے۔

(صفحہ: 28)

FĀRĀN PUBLICATIONS
HYDERABAD - INDIA

Rs. 2200/-